سلسلہ تاریخ اہل حدیث ۵

چمنستانِ حدیث

محمد اسحاق بھٹی

مکتبہ قدوسیہ

سلسلہ تاریخ اہل حدیث ۵

چمنستانِ حدیث

محمد اسحاق بھٹی

مکتبہ قدوسیہ

اہتمام طباعت

ابوبکر قدوسی

اشاعت ——— ۲۰۱۵ء

مکتبہ قدوسیہ

قدوسیہ اسلامک پریس

رحمان مارکیٹ ⊙ غزنی سٹریٹ ⊙ اردو بازار ⊙ لاہور پاکستان

Tel: +92-42-37351124,37230585
maktaba_quddusia@yahoo.com

فہرست

دیگر تیس (۳۰) خدام حدیث

موجودین خدام حدیث

کلماتِ تشکر

حضرت مولانا محمد اسحاق بھٹی حفظہ اللہ کی ایک اور تصنیف اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ غیر متوقع طور پر اس کی اشاعت میں تاخیر ہوگئی۔ ہمارے ممدوح جناب بھٹی صاحب نہ تو کسی تعارف کے محتاج ہیں اور نہ کوئی تقریظ ان کی قدآور شخصیت کو مزید بلند کر سکتی ہے۔ وہ اپنی عمر عزیز کی نو دہائیاں مکمل کر چکے ہیں اور بحمد اللہ سفر زیست جاری و ساری ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں عافیت و سلامتی سے رکھیں۔ ماشاء اللہ اس طویل سفر کا کثیر حصہ قلم اور کتاب کی رفاقت میں بسر ہوا ہے۔ حلقہ قارئین میں جو تنوع اور وسعت جناب بھٹی صاحب کے حصے میں آئی ہے، معدودے چند اہل قلم ہوں گے کہ ان کے ہم پلہ کہے جا سکیں۔ اس بڑھاپے میں وہ بغیر کسی معاون کے لکھتے چلے جا رہے ہیں، کتنے ہی مسودے ابھی اشاعت کے منتظر ہیں۔

برصغیر کے علمائے کرام بالخصوص علمائے اہل حدیث کا تذکرہ جناب بھٹی صاحب کا خصوصی مضمون ہے۔ علمائے اہل حدیث کے حالات پر مشتمل زیر تذکرہ کتاب سے پہلے قافلہ حدیث، اہل حدیث خدام قرآن، دبستانِ حدیث اور گلستانِ حدیث حضرت کی وہ تصنیفات ہیں، جن کی اشاعت کی سعادت مکتبہ قدوسیہ کو حاصل ہوئی۔ اب اس سلسلے کی نئی تصنیف ''چمنستانِ حدیث'' پیش خدمت ہے۔ اس چمنستان میں قسما قسم کے پھول مہک رہے ہیں اور اپنی سحر انگیز خوشبو سے ماحول کو معطر کر رہے ہیں۔ اس کے باغباں جناب مولانا محمد اسحاق بھٹی ہمارے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں۔ اس علمی دستاویز کی تیاری میں ہمارے مصنف کو کتنے ہی اعصاب شکن اور جاں گسل مقامات سے گزرنا پڑا، پھر کہیں یہ مجموعہ پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اس عظیم علمی خدمت پر ہم جناب بھٹی صاحب کو ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں۔ جمعیة احياء التراث الاسلامی کویت کی لجنة القارة الهندية کے مدیر شیخ ابو خالد فلاح خالد المطیری حفظہ اللہ کی سرپرستی اور محترم المقام حضرت مولانا عارف جاوید محمدی حفظہ اللہ کی خصوصی دلچسپی سے اس کام کی اشاعت ممکن ہوئی۔ دُعا ہے کہ ہم آئندہ بھی اپنے اسلاف کے کارہائے نمایاں اور علمی خدمات کی اشاعت کرتے رہیں کہ یہ ذوق الحمدللہ ہمیں اپنے والد مرحوم مولانا عبدالخالق قدوسی شہید رحمہ اللہ سے ورثے میں ملا ہے۔

عمر فاروق قدوسی

مارچ 2015ء

مولانا عبدالخالق (کویت)

دین اسلام میں سند کی اہمیت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ نَبِیِّنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی آلِهٖ وَصَحْبِهٖ أَجْمَعِیْنَ وَمَنْ سَارَ عَلٰی دربهم اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ ، وَاَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَمَّا بَعْدُ!

کسی خبر یا واقعہ پر اعتماد کے لیے اس کے مصدر کی ثقاہت کا علم یا اس کا باحوالہ مذکور ہونا ایک فطری تقاضا اور طبعی رجحان ہے، اسی لیے ہر دور میں سند اور حوالے کے ساتھ مذکور اقوال و افعال اور واقعات کو بے سروپا اور سنی سنائی باتوں پر ترجیح دی جاتی رہی ہے۔

علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((اِذَا قَلَّتِ الْعِنَايَةُ بِالسَّنَدِ اِنْخَفَضَ مُسْتَوَى الْعِلْمِ...... وَلِهٰذَا كَانَ السَّنَدُ فِي التَّعْلِيْمِ فِي كُلِّ عِلْمٍ أَوْ صَنَاعَةٍ اِلَى مَشَاهِيْرِ الْمُعَلِّمِيْنَ مُعْتَبَرًا عِنْدَ كُلِّ أُفُقٍ وَجِيْلٍ .)) ❶

''یعنی سند کے عدم اہتمام کی وجہ سے اخبار و معلومات کی قدر و قیمت اور اہمیت میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اسی لیے ہر زمان و مکان کے لوگوں کے ہاں تمام علوم و فنون کی سند کا ان کے مشاہیر علماء اور موجدین تک متصل ہونے کا اعتبار کیا جاتا رہا ہے۔''

علامہ ابن عبدالبر نے ''جامع بیان العلم وفضلہ'' میں اہل علم کا یہ مشہور قول نقل کیا ہے:

((اِنَّ مِنْ بَرَكَةِ الْعِلْمِ أَنْ تُضِيْفَ الشَّيْءَ اِلَى قَائِلِهٖ .))

''کسی قول کو اس کے قائل کے حوالے سے باسند ذکر کرنا علم کی برکات میں سے ہے۔''

کسی نے کیا خوب کہا ہے:

وَالْعِلْمُ اِنْ فَاتَهٗ اِسْنَادُ مُسْنِدِهٖ
كَالْبَيْتِ لَيْسَ لَهٗ سَقْفٌ وَلَا طُنُبُ

❶ مقدمہ ابن خلدون، ص: ۳۲۲، ۳۲۴۔

کیونکہ سند یا راوی کی ثقاہت معلوم کیے بغیر جہاں کسی خبر یا اطلاع کی قدر و قیمت گھٹ جاتی ہے، وہاں اس پر بلا تحقیق عمل کرنا یا ردّ عمل کا اظہار کرنا بسا اوقات ندامت اور پشیمانی کا باعث بنتا ہے، اسی لیے دین اسلام نے اس فطری اصول کو اپنانے کی ترغیب دلائی اور اس کی اہمیت کو اُجاگر کیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوٓا إِن جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوٓا أَن تُصِيبُوا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَـٰدِمِينَ﴾ (الحجرات : ٦)

''اے ایمان والو! اگر کوئی مجہول الحال (غیر معروف) شخص تمھارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو خوب تحقیق کر لیا کرو (مبادا) کہ کسی قوم کو حقیقت سے ناشنائی کی بنا پر نقصان پہنچا دو، پھر تم کو اپنے کیے پر نادم ہونا پڑے۔''

اور رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

((كَفَىٰ بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ .)) [1]

''کسی آدمی کے دروغ گو ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات (بغیر تحقیق کیے) آگے بیان کر دے۔''

جب عام وقائع و احداث، اور اخبار کی نقل و روایت میں سند اور حوالے کو اس قدر اہمیت حاصل ہے تو دین اور شریعت کے اُمور میں اس کا غایت درجہ اہتمام ایک لازمی امر ہے، کیونکہ دنیا و آخرت میں کامیابی و کامرانی کا انحصار عقیدہ و عمل اور عبادات و معاملات کے بارے میں صحیح رہنمائی اور وحی الٰہی کو بکمال امانت لوگوں تک پہنچانے پر ہے۔

اسلام اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین اور ایک عالم گیر اور کامل و اکمل دستورِ حیات ہے اور اس کی امتیازی خصوصیات میں سے ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا بندوبست اور انتظام و انصرام بھی خود فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُۥ لَحَـٰفِظُونَ۝﴾ (الحجر : ٩)

''بے شک ہم نے اس ذکر (شریعت) کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔''

علامہ ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((والذكر اسم واقع على كل ما انزل الله على نبيه من قرآن او من سنة))

یعنی آیت مبارکہ میں مذکور (اَلذِّکر) سے مراد وہ تمام وحی الٰہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن و حدیث کی

[1] اخرجه مسلم في المقدمة : ١/ ١٠

صورت میں اپنے نبی پر نازل کی ہے۔

عقلی طور پر بھی قرآن پاک کے محفوظ ہونے کا لازمی تقاضا ہے کہ اس کا بیان بھی محفوظ ہو کیونکہ قرآن کریم کی طرح اس کا بیان بھی منزل من اللہ ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۝ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ۝﴾

(القیامۃ: ۱۷ تا ۱۹)

''(اے پیغمبر!) بے شک اس (قرآن کریم) کا جمع کرنا اور آپ کو پڑھانا ہمارے ذمے ہے، لہٰذا جب ہم وحی کی تلاوت کریں تو آپ (اس کو سنا کریں اور) اسی طرح پڑھا کریں۔ پھر اس کا بیان (تفسیر) بھی ہمارے ذمے ہے۔''

دین حق کے خلاف سازشیں روز اوّل ہی سے جاری ہیں اور اسلام کی حقیقی شکل و صورت کو مسخ کرنے اور اس کے حسن کو گہنانے کی مساعیٔ ناتمام ہر دور میں ہوتی رہی ہیں۔ بقول شاعر مشرق ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ۝﴾

(الصف: ۸)

''وہ (مخالفین اسلام) اپنے منہ کی پھونکوں سے نور الٰہی کو بجھانا چاہتے ہیں جب کہ اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اپنے نور (دین اسلام) کو پھیلا کر رہے گا خواہ کفار کو یہ کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گزرے۔''

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کی حفاظت کے لیے ایسے وسائل اور ذرائع پیدا کیے ہیں، جو بے مثال اور انتہائی پائیدار ہونے کے ساتھ ساتھ محسوس و مشاہد اور فطری تقاضوں کے عین مطابق اور امت محمدیہ علی صاحبہا الصلاۃ والتسلیم کا قابل فخر امتیاز ہیں جنھیں (سند یا اسناد) کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے، جن کی روشنی میں ایک صاحب بصیرت شخص کھرے اور کھوٹے اور حق و باطل میں تمیز اور فرق معلوم کر سکتا ہے، نیز یہ دین اسلام میں رخنہ اندازی اور بدعات و محدثات کے سدباب کا مؤثر ترین ذریعہ ہیں جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مبارک (م ۱۸۱ھ) رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((اَلْاِسْنَادُ مِنَ الدِّيْنِ وَلَوْلَا الْاِسْنَادُ لَقَالَ مَنْ شَاءَ مَاشَاءَ)) ❶

''اسناد (سند) دین کا حصہ ہے، اگر سند نہ ہوتی تو ہر شخص اپنی مرضی سے جو چاہتا بیان کر دیتا ہے۔''

سند کی تعریف:

لغوی اعتبار سے لفظ (السند) کئی معنوں میں مستعمل ہے مثلاً: ۱۔ ((ما ارتفع من الارض)) ''زمین کا ابھرا ہوا حصہ''۔ ۲۔ ((ما ارتفع من الجبل عن سفحه)) ''پہاڑ کی بلند ترین چوٹی'' ۳۔((المعتمد)) ''اعتماد یا ٹیک کے قابل'' یعنی سند ایک قابل اعتماد اور خبر کو اس کے قائل کی طرف اٹھانے اور بلند کرنے والی چیز کو کہا جاتا ہے، کیونکہ سند بیان کرنے والا حدیث کو اس کے راوی تک پہنچاتا اور حفاظ حدیث صحیح اور ضعیف حدیث میں فرق کے لیے سند پر اعتماد کرتے ہیں۔ ❷

اور محدثین کے ہاں لفظ (سند) اور (اسناد) مترادفات میں سے ہیں جیسا کہ ابن جماعۃ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((المحدثون يستعملون السند والاسناد لشئى واحد)) ❸

محدثین کی اصطلاح میں سند:

علامہ سخاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: السند: الطريق الموصلة الى المتن۔ متن حدیث تک پہنچانے والے سلسلہ رجال کو سند کہا جاتا ہے۔ ❹

حافظ ابن جماعۃ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اما السند: فهو الاخبار عن طريق المتن۔ سند: متن حدیث کو روایت کرنے والے سلسلہ رجال کو بیان کرنے کا نام ہے۔ ❺

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: والاسناد: حكاية عن طريق المتن۔ اسناد: متن حدیث تک پہنچنے کے ذریعہ (راویوں کے سلسلے) کو کہا جاتا ہے۔ ❻

مذکورہ تعریفات سے واضح ہے کہ سند یا اسناد، متن (نص) حدیث تک پہنچانے والے سلسلہ رجال کا نام ہے یعنی وہ لوگ جنھوں نے اس روایت کو بیان کیا ہو، محدثین اسے (طریق یا اس کی جمع طرق) سے تعبیر کرتے ہیں، جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: والمراد بالطرق الاسانيد یعنی طرق حدیث سے

❶ مسلم بشرح نووی: ۱/۸۷۔

❷ دیکھیے: الصحاح للجوهري (مادة، سند: ۲/۴۰۸) والنهاية في غريب الحديث والاثر لابن اثير: ۲/۴۰۸)

❸ تدريب الراوي للسيوطي: ۱/۴۱۔ ❹ فتح المغيث: ۱/۱۴۔

❺ المنهل الراوي لابن جماعة ص: ۲۹۔

❻ نزهة النظر، ص: ۳۵۔

مراد اسانید ہیں۔ ❶

متن کی تعریف:

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: المتن هو غاية ما ينتهي اليه الاسناد من الكلام۔ ❷ متن اس مضمون یا کلام کو کہا جاتا ہے جو سلسلہ رجال کے ختم ہونے کے بعد شروع ہوتا ہے۔

سند کی ضرورت واہمیت:

دین اسلام چونکہ خاتمۃ الادیان ہے اور نبی اکرم ﷺ کی لائی ہوئی شریعت قیامت تک آنے والے لوگوں کے لیے واجب الاتباع ہے کیونکہ آپ خاتم النبیین ہیں لہٰذا دین اسلام کا بکمالہ محفوظ ہونا بدیہی اور لازمی امر ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا ایسا انتظام کیا ہے جس کی مثال گزشتہ اقوام وامم کے ہاں نہیں ملتی۔

امام ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((نقل الثقة عن الثقة يبلغ به النبي ﷺ مع الاتصال خص الله به المسلمين دون سائر الملل)) ❸

''ثقہ راوی کا اپنے ثقہ استاذ سے نبی اکرم ﷺ تک متصل سند کے ساتھ روایت نقل کرنا ایسی خصوصیت ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے تمام امتوں میں سے صرف امت محمدیہ کو نوازا ہے۔''

علامہ محمد بن حاتم بن مظفر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ان الله اكرم هذه الأمة وشرفها وفضلها بالاسناد وليس لأحد من الأمم كلها قديمها وحديثها اسناد موصول)) ❹

''اللہ تعالیٰ نے اس امت کو اتصال سند کے ذریعے جس شرف وفضیلت اور تکریم سے نوازا ہے یہ کسی دوسری امت کو نصیب نہیں ہوا۔''

محدث کبیر علامہ ابن قتیبہ الدینوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وليس لأمة من الأمم اسناد كا سنادهم ...... يعني هذه الأمة ...... رجل عن رجل و ثقة عن ثقة حتى يبلغ بذلك رسول الله ﷺ وصحابته (رضی اللہ عنہم) فيبين بذلك الصحيح والسقيم والمتصل والمنقطع والمدلس والسليم)) ❺

---

❶ نزهة النظر ص: ۳.
❷ نزهة النظر، ص: ۳.
❸ الفصل في الملل والأهواء النحل: ۲/ ۸۲.
❹ فتح المغيث للسخاوي: ۳/۳.
❺ مقدمه تهذيب الكمال بأسماء الرجال: ۱/ ۱٦٦.

یعنی سند، صدق و کذب اور حق و باطل میں تمیز کے لیے ایک شان دار معیار اور بہترین کسوٹی ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے حفظ دین کے لیے اس امت کو خصوصی طور پر نوازا ہے، لہٰذا جس دور میں بھی کسی نے دین میں ملاوٹ اور کمی بیشی کی مذموم جسارت کی، حفاظ حدیث اور خدام شریعت اسلامیہ نے فوری طور پر اس کی نشان دہی کر کے اس کے بطلان کو واضح کیا جیسا کہ اسماعیل بن ابراہیم رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ: ''خلیفہ ہارون الرشید رحمہ اللہ نے ایک زندیق (ملحد اور بے دین) کو گرفتار کیا اور اس کے قتل کا حکم صادر کیا، تو اس نے کہا: اے امیر المومنین آپ مجھے کیوں قتل کروانا چاہتے ہیں؟ خلیفہ ہارون الرشید نے جواب دیا: اس لیے کہ لوگوں کو تم سے چھٹکارا دلا سکوں (تمھاری گمراہ فکر سے بچا سکوں)، اس (زندیق) نے کہا: مجھے آپ قتل کرا دیں گے لیکن ان ایک ہزار موضوع روایات کا کیا کریں گے جن میں ایک حرف بھی رسول اکرم ﷺ کا فرمایا ہوا نہیں ہے (یعنی میں نے وہ روایات اپنی طرف سے گھڑ کر نبی اکرم کی طرف منسوب کی ہیں اور لوگوں میں پھیل چکی ہیں) ہارون الرشید نے کہا: او (بد بخت) اللہ کے دشمن! تجھے معلوم نہیں کہ محدث ابو اسحاق فزاری اور عبداللہ بن مبارک رحمہما اللہ ان تمام روایات کو آٹے کی طرح چھان ڈالیں گے (یعنی ان کی تحقیق کر کے) ان کا ایک ایک حرف ذخیرۂ احادیث سے نکال باہر کریں گے۔ [1]

چونکہ دین اسلام آخری اور کامل دین ہے اور اس کا قیامت تک محفوظ ہونا لازمی امر ہے اس لیے نبی اکرم ﷺ نے سلسلہ روایت اور سند حدیث کی اہمیت اور ضرورت کو واضح اور خدام دین حنیف میں یہ احساس و شعور بیدار کرتے ہوئے فرمایا:

((عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ: تَسْمَعُوْنَ وَيُسْمَعُ مِنْكُمْ، وَيُسْمَعُ مِمَّنْ سَمِعَ مِنْكُمْ)) [2]

''حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: آج تم احادیث پاک کا سماع کر رہے ہو اور تم سے بھی لوگ احادیث سنیں گے اور پھر تمھارے شاگردوں سے بھی اسی طرح احادیث مبارکہ کا سماع کیا جائے گا۔''

اس سلسلہ مبارکہ میں منسلک ہونے والے اور احکام دین کے مبلغین اور خدمت حدیث مصطفیٰ ﷺ کا عظیم الشان فریضہ ادا کرنے والے سعادت مند حضرات کے لیے دعا بھی فرمائی ہے:

((عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ يَقُوْلُ: نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَءً

---

[1] تاریخ دمشق لابن عساکر: ۷/۱۲۷۔

[2] صحیح سنن ابو داؤد ح: ۳۶۵۹۔

سَمِعَ مِنَّا حَدِيْثًا فَحَفِظَهُ حَتّٰى يُبَلِّغَهُ)) ❶

"حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کا چہرہ پر رونق بنائے جس نے ہم سے حدیث پاک کو سنا اور اسے حفظ کیا اور پھر آگے منتقل کیا۔"

اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں اپنے دین کی حفاظت کے لیے ایسے نابغہ روزگار اور عالی ہمت لوگ پیدا کیے ہیں جنھوں نے اس عظیم خدمت کو اپنے لیے سعادت خیال کیا اور عمر عزیز اسی میں کھپا دی، جن کے بارے میں یحییٰ بن یمان رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ان لهذا الحديث رجالا خلقهم الله عزوجل منذ خلق السموات والارض)) ❷

"حدیث پاک کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسی روز سے نابغہ روزگار اور عالی ہمت اشخاص کو مقرر کر رکھا ہے جب سے اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کی تخلیق کی ہے۔"

امام ابو حاتم رازی فرماتے ہیں:

((لم يكن فى أمة من الأمم منذ خلق الله آدم أمناء يحفظون آثار نبيهم الا فى هذه الأمة)) ❸

"تخلیق آدم علیہ السلام سے لے کر تادم زیست کسی امت میں ایسے امین لوگ نہیں پائے گئے جنھوں نے اپنے نبی کی سیرت واقوال کو بہ کمال امانت ودیانت محفوظ کیا ہو سوائے اس امت مرحومہ کے۔"

میراث انبیاء علیہم السلام کا استحقاق جس طرح بہت بڑا اعزاز اور باعث شرف وفضیلت ہے، اسی طرح یہ ایک بارگراں اور بڑی حساس ذمہ داری بھی ہے، جو بیداری مغز، عزم مصمم، جہد مسلسل اور پرخلوص جذبے کی متقاضی ہے۔

محدثین عظام رحمہم اللہ نبی اکرم ﷺ کی اس پیشین گوئی سے بھی بخوبی آگاہ تھے۔

((عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ يَقُوْلُ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَكُوْنُ فِيْ آخِرِ الزَّمَانِ

---

❶ صحیح۔ ابو داؤد، ح: ٣٦٦٠۔ وترمذی: ٢٦٥٦.
❷ الجرح والتعديل لابن ابي حاتم: ٢/١٨.
❸ شرف أصحاب الحديث، ص: ٤٣.

دَجَّالُوْنَ كَذَّابُوْنَ يَأْتُوْنَكُمْ مِنَ الْأَحَادِيْثِ بِمَا لَمْ تَسْمَعُوْا أَنْتُمْ وَلَا آبَاؤُكُمْ فَإِيَّاكُمْ وَإِيَّاهُمْ لَا يُضِلُّوْنَكُمْ وَلَا يَفْتِنُوْنَكُمْ))❶

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آخری دور میں کچھ ایسے دجال اور کذاب لوگ ہوں گے جو تمھارے سامنے ایسی (من گھڑت) روایات بیان کریں گے جو نہ کبھی تم نے اور نہ ہی تمھارے آباواجداد نے سنی ہوں، لہٰذا ایسے لوگوں سے خبردار رہنا، کہیں وہ تم کو گمراہی یا فتنہ میں مبتلا نہ کر دیں۔''

حدیث پاک کے تحمل ادا کی نزاکت اور معمولی لغزش یا تساہل کے بھیانک نتائج اور خطرناک انجام سے خوب آگاہ رہنا چاہیے، ارشاد نبوی ہے:

((عَنْ سَلْمَةَ رضي الله عنه قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: مَنْ يَقُلْ عَلَيَّ مَا لَمْ أَقُلْ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ))❷

''حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: جس شخص نے میرے حوالے سے وہ بات کہی جو میں نے نہیں فرمائی اسے اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لینا چاہیے۔''

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ: میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

((إِنَّ كَذِبًا عَلَيَّ لَيْسَ كَكَذِبٍ عَلَى أَحَدٍ، فَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ))❸

''یعنی میرے متعلق جھوٹ بولنا کسی عام شخص کے بارے میں جھوٹ بولنے کی طرح نہیں ہے، لہٰذا میرے بارے میں دروغ گوئی کرنے والے کو اپنا ٹھکانا آتش دوزخ میں سمجھ لینا چاہیے۔''

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹی روایت منسوب کرنے والا ضرور رسوا ہوتا اور لوگوں میں ناقابل اعتماد بن جاتا ہے جیسا کہ سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((مَا سَتَرَ اللّٰهُ أَحَدًا يَكْذِبُ فِي الْحَدِيْثِ))❹

---

❶ مسلم: ۱/۱۲۔ و صحيح الجامع الصغير: ۸۱۵۱۔

❷ بخاری: ۱/۱۱۳۔ ومسلم: ۱/۱۰۔

❸ بخاری، ح: ۱۲۹۱۔ ومسلم، ح: ٤ مقدمه۔

❹ الموضوعات لابن الجوزی: ۱/۳۹۔

''یعنی اللہ تعالیٰ روایت حدیث میں غلط بیانی کرنے والے کی کبھی ستر پوشی نہیں کرتا۔''

فن جرح وتعدیل:

علامہ نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ فن جرح وتعدیل کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''فن جرح و تعدیل وہ مہتم بالشان علم ہے جس میں راویان حدیث پر قبول ورد کے اعتبار سے مخصوص اصطلاحات کو ملحوظ رکھتے ہوئے گفتگو کی جاتی ہے اور جرح وتعدیل کے الفاظ کے استعمال اور مراتب پر بحث کی جاتی ہے۔'' ❶

ڈاکٹر صبحی صالح فن جرح وتعدیل کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حدیث کے راویوں کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کی تحقیق کرنے کا نام جرح وتعدیل ہے۔'' ❷

خدام دین اور پاسبانان شرع متین حضرات محدثین کرام رحمہم اللہ نے فقط سند کے حصول پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے بعد تمام رواۃ حدیث کے کوائف کی چھان بین اور تحقیق و تفتیش کی۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین چونکہ سب کے سب عادل و ثقہ اور صادق القول تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان کے ایمان و یقین اور صداقت و امانت کی خود شہادت دی ہے اور انھیں حسن سیرت کا سرٹیفکیٹ عطا کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ﴾ (الحشر : ٨)

''وہ (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) سبھی سچے لوگ ہیں۔''

حضرت قتادہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ایک حدیث بیان کی، تو ایک شخص نے ان سے دریافت کیا: ''کیا آپ نے یہ حدیث براہ راست رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی؟'' انھوں نے جواب دیا: ''جی ہاں! میں نے خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث کا سماع کیا ہو یا کسی صحابی کے توسط سے وہ حدیث سنی ہو، صحابہ کرام کبھی غلط بیانی نہیں کیا کرتے تھے، اللہ کی قسم! ہم جھوٹ نہیں بولا کرتے تھے اور نہ ہمیں معلوم تھا کہ جھوٹ کیا ہوتا ہے۔'' ❸

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ثقات و عدول ہونے کے باوجود روایتِ حدیث میں نہایت احتیاط سے کام لیتے تھے تاکہ بعد میں آنے والے لوگ اس عظیم ذمہ داری کو معمولی خیال کرتے ہوئے اس میں تساہل کا شکار نہ ہو جائیں۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ''میں انصار کی ایک مجلس میں بیٹھا تھا کہ حضرت ابوموسیٰ

---

❶ الحطة فی ذکر الصحاح الستة، ص : ٨٩. ❷ علوم الحدیث، ص: ١٠٩۔
❸ مفتاح الجنة للسیوطی، ص : ٣٦.

اشعری رضی اللہ عنہ وہاں آئے، وہ گھبرائے ہوئے تھے، ہم نے ان سے پریشانی کی وجہ پوچھی تو انھوں نے بتایا کہ: ''میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاں جا کر تین مرتبہ اندر جانے کی اجازت طلب کی تھی، لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں ملا تو میں واپس پلٹ آیا کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ((اِذَا اسْتَأْذَنَ أَحَدُكُمْ ثَلَاثًا فَلَمْ يُؤْذَنْ لَهُ فَلْيَرْجِعْ)) جب تم میں کوئی شخص (کسی کے ہاں جا کر) تین مرتبہ (ملاقات کے لیے) اجازت طلب کرے اور اسے اجازت نہ ملے تو اسے چاہیے کہ واپس لوٹ جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آپ کو اس حدیث کی تصدیق کے لیے گواہ پیش کرنا ہوں گے چنانچہ (حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے اہل مجلس سے پوچھا) کیا آپ میں کوئی ایسا شخص ہے جس نے یہ حدیث نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو؟ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ کی قسم! اس گواہی کے لیے تو تمھارے ساتھ وہ شخص بھی جا سکتا ہے جو ہم سب میں کم عمر ہے۔ چنانچہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں مجلس میں سب سے کم عمر تھا، میں فوراً اٹھا اور یہ شہادت دینے کے لیے حضرت ابوموسیٰ کے ساتھ چل دیا، اور جا کر حضرت عمر کو بتایا کہ واقعی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ سے فرمایا: ((أَمَا اِنِّي لَمْ أَتَّهِمْكَ، وَلَكِنْ خَشِيْتُ أَنْ يَتَقَوَّلَ النَّاسُ عَلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ)) میں آپ کو نا قابل اعتماد نہیں سمجھتا تھا، میں تو یہ طرز عمل اس خدشے کے پیش نظر اختیار کیا تھا کہ کہیں (بعد میں) لوگ رسول اکرم کی طرف جھوٹ منسوب نہ کرنے لگیں۔ (یعنی اگر انھیں تحقیق و تفتیش کا خوف ہوگا تو وہ روایت حدیث میں دروغ گوئی سے اجتناب کریں گے)۔ [1]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مبارک جلیل اور عالی مرتبت طبقے کے بعد ہر راوی سے حدیث کی سند کے بارے میں پوچھا جانے لگا۔

امام ابن سیرین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((لَمْ يَكُوْنُوا يَسْأَلُوْنَ عَنِ الْإِسْنَادِ، فَلَمَّا وَقَعَتِ الْفِتْنَةُ قَالُوا: سَمُّوا لَنَا رِجَالَكُمْ)) [2]

''لوگ ابتدائی دور (عہد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) میں عموی طور پر روایت حدیث میں سند کا مطالبہ نہیں کیا کرتے تھے لیکن جب (سیدنا عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد) فتنوں کا آغاز ہوا تو اہل علم رواتِ حدیث سے سند کا مطالبہ کرنے لگے۔''

---

[1] البخاري كتاب الاستئذان، ح: ٦٤٤٥ـ والموطا: ١٥٢٠.

[2] مقدمه صحيح مسلم: باب بيان ان الاسناد من الدين......، ص: ١١.

امام شعبی (عامر بن شراحیل رحمہ اللہ م۱۰۴ھ) بیان کرتے ہیں کہ ربیع بن خثیم رحمہ اللہ نے یہ حدیث بیان کی کہ جو شخص دس مرتبہ یہ کلمات کہتا ہے: لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ وَحْـدَهُ لَا شَـرِيْكَ لَـهُ، لَـهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، يحى ويميت وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ اسے اس قدر اجر وثواب ملتا ہے اور ان نیکیوں کا ذکر بھی کیا تو امام شعبی فرماتے ہیں کہ میں نے ربیع بن خثیم سے پوچھا آپ کو یہ حدیث کس نے بیان کی ہے؟ انھوں نے کہا عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ نے (امام شعبی فرماتے ہیں) میں عبدالرحمٰن بن لیلیٰ رحمہ اللہ کے پاس گیا اور ان سے پوچھا کہ آپ کو یہ حدیث کس نے بیان کی ہے؟ انھوں نے جواب دیا: صحابی رسول حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے۔

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد محدث یحییٰ بن سعید القطان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وهـذا اوّل مـن فتـش عن الاسناد۔ یعنی امام شعبی وہ پہلے محدث ہیں جنھوں نے سند حدیث کے متعلق بحث و تحقیق شروع کی تھی۔ [1]

چونکہ یہ احکام شریعت کو لوگوں تک منتقل کرنے کا معاملہ تھا اس لیے محدثین کرام اسے اہم دینی ذمہ داری تصور کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ امام عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں: (طـلـب الاسـنـاد الـمتصل من الـديـن) سند متصل کی طلب و جستجو یا مطالبہ کرنا دین کا حصہ ہے۔ (کیونکہ اس پر احکام شریعت کا دارومدار ہے)۔ (الکفایة للخطیب، ص: ۷۵۵) اور قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فـاعـلـم أن مـدار الـحـديث على الاسناد فيه، فبه تتبين صحته ويظهر اتصاله)) [2]

"حدیث کا انحصار اس کی سند پر ہوتا ہے اور اسی کے ذریعے سے اس کے صحیح اور متصل ہونے کا پتہ چلتا ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ علمائے حدیث نے حدیث صحیح کے لیے جو پانچ شرائط مقرر کی ہیں، ان میں سے چار کا تعلق صرف سند کے ساتھ ہے جیسا کہ حدیث صحیح کی تعریف سے ظاہر ہے: مَا اتَّصَلَ سَنَدُهٗ بِنَقْلِ الْعَدْلِ الضَّابِطِ عَنْ مِثْلِهٖ اِلٰى مُنْتَهَاهُ مِنْ غَيْرِ شُذُوْذٍ وَّلَا عِلَّةٍ۔ یعنی پانچ شرائط (۱: اتصال سند، ۲: عدالت راوی، ۳: ضبط راوی، ۴: عدم شذوذ) یہ چاروں شرائط سند یعنی راوی حدیث سے متعلق ہیں اور پانچویں (عدم علت) متن حدیث سے متعلق ہے لیکن بالواسطہ اس کا تعلق بھی سند کے ساتھ ہی ہے۔ اسی لیے محدثین کے نزدیک فقہ الحدیث نصف العلم اور معرفت رجال حدیث اس کا بقیہ حصہ (آدھا علم) ہے۔ جیسا کہ امام علی بن مدینی رحمہ اللہ کا قول ہے: (الـفـقـه فـي مـعـانـي الـحـديـث نصف العلم ومعرفة الرجال

[1] المحدث الفاصل للرامهرمزی: ۱/ ۲۱۔ [2] الالماع، ص: ۱۸۴۔

نصف العلم) ❶

قاضی عیاض رحمہ اللہ اپنی کتاب (الالماع) میں فرماتے ہیں:

اَلْعِلْمُ فِیْ أَصْلَیْنِ لَا یَعْدُوْهُمَا
اِلَّا الْمُضِلُّ عَنِ الطَّرِیْقِ اللَّاحِبِ
عِلْمُ الْكِتَابِ وَعِلْمُ الْآثَارِ الَّتِیْ
قَدْ أُسْنِدَتْ عَنْ تَابِعٍ عَنْ صَاحِبِ

امیر المومنین فی الحدیث حضرت امام بخاری رحمہ اللہ کی بخاری شریف اور ان کے شاگرد گرامی حضرت امام مسلم رحمہ اللہ کی مسلم شریف جنھیں امت نے ''صحیحین'' کے قابل فخر لقب سے نوازا اور تلقی بالقبول کا مقام دیا ہے، انہی قابل قدر خدمات اور جهود مبارکہ کا ثمرہ ہی تو ہیں۔ بخاری شریف جسے محدثین نے (أَصَحُّ الْكُتُبِ بَعْدَ كِتَابِ اللّٰهِ) قرار دیا ہے۔ سانید پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ الفضل بن اسماعیل الجرجانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

صَحِیْحُ الْبُخَارِیِّ لَوْ أَنْصَفُوْهُ
لَمَا خُطَّ اِلَّا بِمَاءِ الذَّهَبِ
أَسَانِیْدُ مِثْلُ نُجُوْمِ السَّمَاءِ
أَمَامَ مُتُوْنٍ كَمِثْلِ الشُّهُبِ

یعنی صحیح بخاری اس قابل ہے کہ اسے آب زر سے لکھا جائے، اس کی اسانید متون کے سامنے آسمان کے ستاروں کی مانند روشن ہیں۔ اور احمد بن عبدالغفار مالکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

صَحِیْحُ الْبُخَارِیِّ لَوْ أَنْصَفُوْهُ
لَمَا خُطَّ اِلَّا بِمَاءِ الْبَصَرِ
وَمَا ذَاكَ اِلَّا لِضَبْطِ الْأُصُوْلِ
وَعَدْلِ الرُّوَاةِ بِنَقْلِ الْخَبَرِ

مولانا الطاف حسین حالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

گروہ ایک جویا تھا علم نبی کا
لگایا پتہ جس نے ہر مفتری کا

❶ لمحات فی تاریخ السنة وعلومها، ص: ۸۰.

نہ چھوڑا کوئی رخنہ کذب خفی کا
کیا قافیہ تنگ ہر مدعی کا

علوم حدیث کا انشاء، تراجم رجال کا اہتمام اور فن جرح و تعدیل کی ایجاد مسلمانوں کا وہ عظیم الشان کارنامہ ہے جس میں دنیا کی کوئی قوم ان کی حریف نہیں ہے۔ محدثین کرام کے وضع کردہ قواعد جرح و تعدیل اور تنقیدی اصول اس قدر جامع، دقیق اور اپنے دامن میں تحقیق و تفتیش کے ایسے ایسے طرق و اسالیب سموئے ہوئے ہیں کہ آج تک اصحاب تاریخ اس سے بہتر اور جامع معیار اور کسوٹی پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ محدثین کرام نے تحقیق کے تمام امکانی ذرائع بڑی سخت پابندی اور بغیر کسی رعایت کے استعمال کر کے اس فن کو اس قدر نکھارا ہے کہ پوری تاریخ انسانیت میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

مخالفین اسلام نے بھی محدثین کرام رحمہم اللہ کی ان عظیم خدمات کو سراہا اور انھیں اس پر خراج تحسین پیش کیا ہے۔ چنانچہ ایک مستشرق (مارگولیس) لکھتا ہے: ''مسلمان اپنے علم حدیث پر جس قدر بھی فخر کریں، وہ اس کے حق دار ہیں۔''

دور حاضر میں ایک عیسائی عالم تاریخ (اسد رستم) نے اپنی تالیف (اصول الروایۃ التاریخیۃ) میں علم حدیث کے اصول وقواعد پر انحصار کیا اور اقرار کیا ہے کہ انھا طريقة علمية حديثة لتصحيح الأخبار والروايات یعنی اخبار و روایات کی تصحیح کے لیے محدثین کا وضع کردہ طریقہ اور ضابطہ انتہائی علمی اور اچھوتا ہے۔

مستشرق ڈاکٹر اسپرنگر لکھتا ہے: گزشتہ یا موجودہ اقوام عالم میں کوئی قوم ایسی نہیں جس نے مسلمانوں کی طرح علم اسماء الرجال جیسے عظیم الشان فن کا اہتمام کیا ہو، مسلمانوں نے اپنے نبی کی سیرت اور تعلیمات کی حفاظت کے لیے تقریباً پانچ لاکھ افراد کے احوال و کوائف کی جمع و تدوین کی ہے۔

خدام سنت مطہرہ اور محدثین کرام رحمہم اللہ کی عظیم کاوش (کتب جرح و تعدیل اور تراجم الرجال) اس کی شاہد عدل ہیں، جنھوں نے تراجم عامہ کے ساتھ ساتھ، مستفیدین کی سہولت کے لیے ثقہ اور ضعیف رواۃ کے تراجم اور سوانح حیات پر الگ الگ کتب بھی تالیف کی ہیں مثال کے طور پر: (الكمال في اسماء الرجال للمقدسي، تهذيب الكمال في اسماء الرجال للمزي، تقريب تهذيب الكمال لابن حجر) اور صرف ثقہ راویوں کے حالات زندگی پر (الثقات لابن حبان م ٣٥٤ ھ) اور (الثقات لابن شاهين ٣٨٥ ھ) اور (الثقات للعجلي م ٢٦١ ھ) اور صرف ضعیف راویوں کے کوائف پر کتب مثلاً: (الضعفاء الصغير للامام البخاري م ٢٥٦ ھ)، (الضعفاء

والمتروکین للامام النسائی م ۳۰۱ ھ)، (الضعفاء الکبیر للعقیلی م ۳۲۲ھ)اور (الضعفاء والمجروحین لابن حبان م ۳۵۴ ھاور الکامل لابن عدی م ۳۶۵ھ) وغیرہ۔

علم اسماء الرجال میں محدثین کرام نے رواۃ حدیث کے دیگر کوائف اور سیر و احوال کے ساتھ ساتھ فن تاریخ پر بھی خصوصی توجہ مبذول کی اور رجال حدیث کے موالید و وفیات اور خصوصی وقائع و احداث کی تواریخ کو ضبط تحریر میں لا کر اور اس فن میں مستقل کتب تالیف کر کے جہاں فن تاریخ کی حیثیت کو نکھارا اور اجاگر کیا ہے وہاں روایت کی صحت و ضعف تک رسائی میں بھی اس سے خصوصی مدد لی ہے، یعنی فلاں راوی کا فلاں سے سماع ممکن بھی ہے یا کہ نہیں۔ جیسا کہ حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: (لما استعمل الرواۃ الکذب، استعملنا لھم التاریخ) جب روایت حدیث میں لوگوں نے دروغ گوئی کرنا شروع کی تو ہم نے تاریخ کے ذریعے ان کا محاسبہ کیا۔ [1]

حافظ ابن حبان رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ: ''مأمون بن احمد الہروی نامی ایک شخص نے یہ دعویٰ کیا کہ اس نے ہشام بن عمار سے احادیث سنی ہیں تو (حافظ ابن حبان) نے اس سے پوچھا کہ: ''آپ ملک شام میں کب گئے تھے؟ انھوں نے جواب دیا: ''۲۵۰ھ میں۔'' میں نے کہا: جس ہشام سے تم روایت کرتے ہو وہ تو ۲۴۵ھ میں وفات پا گیا تھا۔ [2]

اسی طرح اسماعیل بن عیاش نے ایک ایسے شخص سے پوچھا جو کہ خالد بن معدان سے روایت کرتا تھا کہ آپ نے خالد بن معدان سے ان احادیث کا سماع کب کیا تھا؟ اس نے جواب دیا کہ: ''سن ۱۱۳ھ میں۔'' اسماعیل بن عیاش کہنے لگے اس کا مطلب ہے کہ آپ نے خالد بن معدان کی وفات کے سات سال بعد ان سے احادیث سنی تھیں، کیونکہ خالد بن معدان ۱۰۶ھ میں وفات پا گئے تھے۔

علامہ حالی مرحوم فرماتے ہیں:

کیے جرح و تعدیل کے وضع قانون
نہ چلنے دیا کوئی باطل کا افسون
اسی دھن میں آسان کیا ہر سفر کو
اسی شوق میں طے کیا بحر و بر کو
سنا خازن علم دیں جس بشر کو
لیا اس سے جا کر خبر اور اثر کو

[1] فتح المغیث: ۱/۳۱۱۔ والتقیید والایضاح، ص: ۳۲۹۔ [2] کتاب المجروحین لابن حبان: ۲/۳۸۳۔

پھر اس کو پرکھا کسوٹی پہ رکھ کر
دیا اور کو خود مزا اس کا چکھ کر
کیا فاش راوی میں جو عیب پایا
مناقب کو چھانا مثالب کو تایا
مشائخ میں جو قبح نکلا جتایا
ائمہ میں جو داغ دیکھا بتایا
طلسم ورع ہر مقدس کا توڑا
نہ ملا کو چھوڑا ، نہ صوفی کو چھوڑا
رجال اور اسانید کے جو ہیں دفتر
گواہ ان کی آزادگی کے ہیں یکسر

محدث یزید بن زریع رحمہ اللہ فرماتے ہیں: لکل دین فرسان و فرسان هذا الدين أصحاب الاسانيد ہر دین کے کچھ محافظ ہوتے ہیں اور اس دین (اسلام) کے محافظ اصحاب الاسانید ہیں۔ اور انہی کے بارے میں حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے فرمایا تھا: تَعِيْشُ لَهَا الْجَهَابِذَةُ یعنی حدیث پاک کے بارے میں چھان بین اور تحقیق کرنے والے ماہرین علوم حدیث ہر دور میں موجود رہیں گے جو دین میں ملاوٹ کرنے اور موضوع و من گھڑت روایات کو مشہور کرنے والوں کی تردید اور دین حق میں ملاوٹ کے خطرات سے مسلمانوں کو آگاہ کرتے رہیں گے۔ چنانچہ علمائے امت نے محنت شاقہ اور انتہائی محتاط بحث وتحقیق کے ذریعے اس موضوع پر مستقل کتب تالیف کر کے امت کے ساتھ کمال ہمدردی کا مظاہرہ کیا تاکہ ایک تو دین میں ملاوٹ سے بچا جا سکے اور دوسرے رسول اکرم ﷺ کی طرف جھوٹ منسوب کرنے کے جرم عظیم سے انسان محفوظ رہ سکے۔ مثال کے طور پر علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ کی (الموضوعات الکبری) اور حافظ سیوطی رحمہ اللہ کی (اللآلي المصنوعة في الاحاديث الموضوعة) علامہ شوکانی رحمہ اللہ کی (الفوائد المجموعة في الاحاديث الموضوعة) اور حافظ عراقی کی (الباعث على الخلاص من حوادث القصاص) علامہ العجلونی کی (كشف الخفا و مزيل الالباس) امام ابن القیم رحمہ اللہ کی (المنار المنيف) ملا علی القاری کی (الاسرار المرفوعة) اور اس فن کی دیگر تصانیف اور بالخصوص علامہ ناصر الدین الالبانی رحمہ اللہ کی شاہکار تصنیف (سلسلة الاحاديث الضعيفة والموضوعة) جو کہ سترہ مجلدات میں مطبوع ہے۔

محدثین کرام رحمہم اللہ نے اس فن کو اس قدر نکھارا کہ انھوں نے ہر طبقے کے رجال کی حیثیت کو واضح کرنے کے لیے اصطلاحات وضع کیں کہ یہ راوی ''ثقہ'' ہے، یہ ''ثقۃ ثبت'' ہے، یہ ''صدوق'' ہے وغیرہ اور اسی طرح علوم حدیث کے ماہرین کو ان کے علمی مرتبے کے مطابق موزوں القاب سے نوازا مثلاً:

۱۔ المسند: جو حدیث کو سند کے ساتھ بیان کرتا ہو۔

۲۔ محدث: (جو روایت و درایت کے اعتبار سے علوم حدیث میں مہارت رکھتا ہو اور کم از کم بیس ہزار روایات باسنداسے حفظ ہوں اور ان کے راویوں کے کوائف معلوم ہوں۔

۳۔ الحافظ: جسے ایک لاکھ احادیث باسند حفظ ہوں جیسا کہ امام ابوزرعہ اور عثمان بن ابی شیبہ وغیرہ۔

۴۔ الحجۃ: جو علوم حدیث میں اس قدر ماہر ہو کہ لوگ اسے حجت یا اتھارٹی تسلیم کرلیں اور اسے کم از کم تین لاکھ احادیث باسند حفظ ہوں۔

۵۔ الحاکم: جسے تمام روایات سنداً و متناً اور جرحاً و تعدیلاً یاد ہوں اور بعض نے کہا ہے کہ اسے آٹھ لاکھ احادیث یاد ہوں جیسا کہ امام علی بن المدینی، امام ابوداؤد، ترمذی نسائی اور الحاکم وغیرہم۔

۶۔ امیر المومنین فی الحدیث: یہ ماہرین فن حدیث میں سب سے اعلیٰ رتبہ ہے اور یہ لقب محدثین کے ہاں امام شعبہ، سفیان ثوری، امام احمد بن حنبل، امام بخاری وغیرہم رحمہم اللہ کو دیا جاتا ہے۔

اور پھر اسانید کی جانچ پڑتال کرکے رجال سند کے لحاظ سے ان کی درجہ بندی کی مثلاً اس سند کو سلسلۃ الذہب (یعنی سونے کی لڑی یا اصح الاسانید) قرار دیا جاتا ہے۔ ((مالك عن نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہما عن النبی ﷺ اور اسی طرح الزهری عن سالم عن ابن عمر رضی اللہ عنہما عن النبی ﷺ)) محدثین کی انہی جہود کے پیش نظر ان کی تالیف کردہ کتب حدیث کی اسانید کو ان کی کتب کا شجرۂ نسب کہا جاتا ہے، جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: الاسانید أنساب الکتب۔ امت کے ان محسنین نے باسند کتب تالیف کرکے جہاں حدیث مصطفیٰ ﷺ کی حفاظت کا حق ادا کردیا ہے وہاں یہ ذمہ داری اپنے سر لے کر بعد میں آنے والوں کو اس طلب اسناد کی تعب و مشقت سے مستغنی بھی کردیا ہے اور عمل بالحدیث کے لیے سہولت بھی مہیا کردی ہے۔ فجزاهم الله عن الاسلام والمسلمین خیر الجزاء۔

سند عالی:

کسی حدیث کی سند میں محدث اور رسول اکرم ﷺ کے درمیان راویوں کی تعداد جس قدر کم ہوگی اسی قدر وہ سند عالی شمار ہوگی اور سند عالی میں جہاں روایت میں غلطی یا تساہل کا خدشہ کم ہوتا ہے وہاں یہ محدث کے طبقے یا رتبے میں بلندی کا باعث بھی ہے، اس کی بدولت کتنے ہی سعادت مند لوگ تابعیت اور تبع تابعیت

کے شرف سے بہرہ ور ہوئے۔ جیسا کہ محمد بن اسلم الطوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قرب الاسناد قرب أو قربة الی اللہ عزوجل۔ یعنی سند میں راویوں کی تعداد کا کم ہونا اللہ تعالیٰ کے قرب یا تقرب کا ذریعہ ہے، اس قول کی توجیہہ کرتے ہوئے علامہ سخاوی فرماتے ہیں: فان القرب من الرسل بلاشك قرب الی اللہ۔ رسول کے قریب ہونا یقیناً اللہ تعالیٰ کے قرب کا باعث ہے۔ ❶

اسی لیے سند عالی کا حصول محدثین کرام رحمہم اللہ کا محبوب مشغلہ اور مطمح نظر رہا ہے جس کے لیے انھوں نے بڑی محنت شاقہ اور دور دراز کے سفر کی صعوبتیں برداشت کی ہیں۔ جیسا کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: طلب الاسناد العالی سنة عمن سلف کہ اسناد عالی کی طلب و جستجو سلف صالحین کا طریقہ چلا آیا ہے۔ (مقدمہ ابن الصلاح ص: ۲۱۶) اور علامہ خطیب بغدادی لکھتے ہیں: قد رحل خلق من العلماء قدیما و حدیثا الی الأقطار البعیدة طلبا للعلو یعنی علو سند کی خاطر گزشتہ اور موجودہ دور کے بہت سے علماء و محدثین نے دور دراز علاقوں کے سفر اختیار کیے۔ اسی محنت اور لگن اور جہد و کاوش کا نتیجہ ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ جن کی ولادت ۱۹۴ھ میں ہوئی وہ ایسے شیوخ سے روایت کرنے میں کامیاب ہوئے جو کہ امام مالک رحمہ اللہ کے اساتذہ میں سے تھے اور ان کی وجہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قدر قریب ہوگئے کہ آپ اور امام بخاری کے درمیان صرف تین واسطے بنتے ہیں یعنی وہ تابع تبع تابعیت کے شرف سے مشرف ہوئے اور ان روایات کو ثلاثیات (یعنی صاحب کتاب اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان تین واسطوں والی روایات) کہا جاتا ہے، اور بخاری شریف میں ایسی (۲۲) بائیس روایات ہیں۔ مثال کے طور پر امام بخاری رحمہ اللہ روایت کرتے ہیں کہ:

((حَدَّثَنَا الْمَكِّيُّ بْنُ إِبْرَاهِيمَ حَدَّثَنَا يَزِيدُ بْنُ عُبَيْدٍ عَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْأَكْوَعِ رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُولُ: مَنْ قَالَ عَلَيَّ مَا لَمْ أَقُلْ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ)) ❷

اسی طرح سنن الترمذی میں ایک (۱) سنن ابن ماجہ میں ثلاثیات کی تعداد (۵) مسند الدارمی میں (۱۵)، مسند امام احمد میں (۳۶۳)، مسند عبد بن حمید میں (۵۱) اور الطبرانی الصغیر میں ثلاثیات کی تعداد (۳) ہے، یہ سب خدام حدیث کی محنت و کاوش اور طلب و ہمت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

زیر نظر کتاب (چمنستان حدیث) میں مرجع خلائق شخصیت شیخ الکل فی الکل میاں سید نذیر حسین محدث رحمہ اللہ (م۱۹۰۲ء) کے ان متعدد تلامذہ کا تذکرہ ہے، جنھوں نے سند عالی کے حصول کے لیے حضرت

❶ فتح المغیث للسخاوی: ۳/۳۳۵۔ ❷ البخاری، کتاب العلم، ح: ۱۰۹۔

میاں صاحب سے شرف تلمذ حاصل کیا تھا، اور حقیقت یہ ہے کہ برصغیر میں حضرت میاں صاحب کی سند عالی شمار ہوتی ہے، جیسا کہ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں: ''شمالی ہندوستان میں اکثر علمائے اہل حدیث کا سلسلہ استناد آپ تک پہنچتا ہے اور اس وجہ سے آپ کو شیخ الکل بھی کہتے ہیں۔'' ❶

قارئین گرامی قدر! یہ حقیقت ہے کہ تذکرہ اسلاف سے روحوں کو جلا ملتی اور اپنے کردار و عمل کا محاسبہ کرنے کا داعیہ پیدا ہوتا اور اپنی اصلاح کرنے کا موقع فراہم ہوتا ہے۔ اور جمعیت اور معاشرے کے افراد کا ضمیر انھیں جھنجھوڑتا ہے کہ

تھے تو آباء وہ تمہارے ہی مگر تم کیا ہو
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا ہو

اور اپنی تاریخ کا مطالعہ ہی افراد میں یہ شعور بیدار کرتا ہے کہ ہماری پستی و تنزلی کے اسباب کیا ہیں؟

گنوادی ہم نے اسلاف سے جو میراث پائی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

اپنے اسلاف کے سوانح حیات کا مطالعہ ہی ہمیں اپنی عظمت رفتہ کی یاد دلاتا اور دور اسلاف کی شان و شوکت اور عروج و ارتقاء کا راز بتلاتا ہے۔

تجھے آباء سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
تو گفتار وہ کردار، تو ثابت وہ سیارہ

کلمہ تشکر:

نبی رحمت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ ، لَمْ يَشْكُرِ اللّٰهَ)) ❷

''یعنی جو لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا، وہ اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بھی نہیں ہوسکتا۔''

میں دل کی گہرائیوں سے مؤرخ اہل حدیث، برصغیر کے منفرد خاکہ نگار اور ادیب محترم مولانا محمد اسحاق بھٹی۔ متعنا الله بطول حياته۔ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جنھوں نے ہمارے اسلاف کی تاریخ سے ہمیں روشناس کروایا اور برصغیر کے علمائے اہل حدیث اور معروف علمی شخصیات کی جہود و خدمات اور ان کے سوانح حیات سے ہمیں متعارف کروایا، وہ یقیناً سوانح نگاری اور تاریخ نویسی کے فن میں ایک عظیم قائد اور پیشوا کی

❶ موج کوثر: ٦٨

❷ صحيح الجامع الصغير، ح: ٦٥٤١.

حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے اشہب قلم کا میدان تو بہت وسیع ہے لیکن ان کے سیال قلم سے رقم ہونے والے شخصیات کے سیر وسوانح پر مشتمل ان کے تیار کردہ چند گلدستے اور ان کے مرتب کردہ جواہر پاروں پر مشتمل ان کی چند تاریخی دستاویزات میرے سامنے ہیں جن سے ان کی تاریخ نویسی اور سوانح نگاری کے ذوق، ان کے اس فن میں شغف اور ان کی نگاہ میں اقوام و جماعات کی زندگی میں تاریخ نویسی کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ میری دانست کے مطابق انھوں نے شخصیات کے حوالے سے تقریباً پندرہ کتابیں تصنیف کی ہیں، جن میں بے شمار قابل قدر شخصیات کے تراجم و حالات زندگی قلم بند کیے ہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ ہر شخصیت کے تذکرے کے ضمن میں دسیوں دیگر شخصیات کا ذکر خیر بھی آ گیا ہے۔ اسی طرح انھوں نے اپنی سرگزشت ''گزر گئی گزران'' کے دلچسپ نام سے قلم بند کر کے قارئین کو بہت سی مفید تاریخی معلومات فراہم کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ مؤرخ اہل حدیث کو اپنی بہترین جزاؤں سے نوازے۔ آمین!

قارئین کرام! تاریخ نویسی اور سوانح نگاری ایک انتہائی مشکل، محنت طلب اور ذمہ دارانہ کام ہے کیونکہ مؤرخ کے قلم کی ذرا سی لغزش سے تخت سے تختہ، دعا سے دغا اور محرم سے مجرم بن جاتا اور تاریخ سے تنقیص بن جاتی ہے۔ اصحاب تراجم کے سوانح حیات اور واقعات زندگی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی غرض سے بعض اوقات مشکل اور طویل سفر اختیار کرنا پڑتے ہیں اور مختلف لوگوں سے بار بار رابطہ کرنا پڑتا ہے، جس کے لیے صحت و ہمت کے ساتھ وقت اور مالی وسائل کی شدید ضرورت ہے، اسی لیے جماعتوں کی تاریخ مرتب کرنا فرد واحد کے بس کا روگ نہیں بلکہ یہ تنظیمات اور جماعات کا کام ہے۔ کاش! من حیث الجماعت مختلف تنظیموں کے ذمہ داران اس حقیقت کا ادراک کریں اور ایسے باصلاحیت افراد کی سرپرستی کریں جو یہ اہم اور عظیم ذمہ داری ادا کرنے کی لیاقت اور اہلیت رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ مؤرخ اہل حدیث کی عمر اور صحت میں برکت کرے جو اس پیرانہ سالی میں وسائل یا کسی جماعتی سرپرستی کے معدوم ہونے کے باوجود اپنی دھن میں مگن کمال دل چسپی کے ساتھ جماعتی تاریخ مرتب کرنے میں مصروف ہیں اور اس غرض سے لمبے لمبے سفر کر کے معلومات اکٹھی کرتے، احباب سے رابطہ قائم کر کے مختلف شخصیات کے بارے میں معلومات جمع کرتے، پھر اپنے گھر میں بیٹھ کر سلیقے اور قرینے سے وہ معلومات مرتب کرتے اور کمپوزنگ کے لیے بھیجتے اور پھر کئی کئی بار خود اس کی پروف ریڈنگ کر کے انھیں ناشرین کے ہاں بارہا تصحیح اخطاء کی غرض سے جانا پڑتا ہے، ان تمام تھکا دینے والے مراحل کو طے کرنے کے بعد، گلہائے رنگا رنگ کا ایک خوشنما گلدستہ، معلومات کا ایک نادر مرقع اور ایک تاریخی دستاویز تیار کر کے قارئین کرام اور احباب جماعت کی خدمت میں پیش کرتے ہیں جسے لوگ آرام کرسیوں، نرم گدیلوں اور ٹھنڈی نشت گاہوں

میں بیٹھ کر پڑھتے اور محظوظ ہوتے اور اپنے اسلاف کے زریں کارناموں سے آگاہی حاصل کر کے مسرور ہوتے ہیں۔ ان شاء اللہ رب کریم مؤرخ اہل حدیث کو اس کی بہترین جزا اور بدلہ عطا کرے گا۔ گلستانِ حدیث کے بعد اب چمنستانِ حدیث کا خوشنما گلدستہ بھی قارئین کرام کی خدمت میں حاضر ہے۔ اس عظیم الشان پیش کش پر ہم مؤرخ اہل حدیث اور اس سلسلے میں تعاون کرنے والے عالم اسلام کی نامور شخصیت ابوخالد فلاح المطیری رئیس الجنة القارة الهندية (کویت) اور محترم شیخ عارف جاوید محمدی رئیس مرکز دعوۃ الجالیات (کویت) کے تہ دل سے شکر گزار ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کی اس کاوش کو شرف قبولیت سے نوازے۔ آمین!

طالب دعا
خادم العلم والعلماء
عبدالخالق بن محمد صادق غفر اللہ لہ ولوالدیہ
کویت۔ ۲۰۱۴/۱/۱۲ء

حرفے چند

اللہ تعالیٰ کا بہ درجہ غایت شکر گزار ہوں کہ اس نے برصغیر کی رفیع المرتبت شخصیات سے متعلق ''چمنستانِ حدیث'' کے نام سے خوانندگانِ محترم کی خدمت میں کتاب پیش کرنے کی سعادت بخشی۔ اس فقیر کی سابقہ کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی برصغیر کے اہل حدیث علمائے ذی وقار کے حالات کی نقاب کشائی کرتی ہے۔ یہ وہ بوریا نشین اور درویشانِ خدامست ہیں، جنھوں نے زندگی کے ہر موڑ پر اپنے آپ کو قرآن وحدیث کی خدمت کے لیے وقف کیے رکھا۔ کتاب میں ایک سو (۱۰۰) علمائے کرام کے واقعاتِ حیات ضبط تحریر میں لائے گئے ہیں، جن میں پندرہ حضرات کا تعلق تلمذ براہِ راست حضرت میاں سیّد نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ سے ہے۔ تینتیس (۳۳) وہ عالی قدر اصحابِ علم ہیں جو حضرت میاں صاحب کے شاگردوں کے شاگرد یا ان سے کچھ بعد کے اساتذۂ گرامی کے دائرۂ شاگردی میں رہے، اور باون (۵۲) وہ حضرات ہیں جو اللہ کے فضل سے زندہ ہیں اور مختلف مقامات میں تصنیفی و تدریسی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ لیکن ان کا سلسلہ شاگردی بھی آگے چل کر بالآخر حضرت میاں صاحب کے شاگردوں کی لڑی سے جا ملتا ہے۔ ہمارے ہاں مرحومین پر تو لکھا جاتا ہے، لیکن موجودین کے بارے میں یا تو لکھا ہی نہیں جاتا یا بہت کم لکھا جاتا ہے، دراں حالاں کہ ان کی علمی حیثیت اجاگر کرنا ضروری ہے تاکہ ان کی حوصلہ افزائی ہو اور وہ خوش دلی کے ساتھ اپنا علمی سفر طے کریں۔

اس فقیر کا نہ کسی سیاسی گروہ سے کوئی رابطہ ہے، نہ یہ کسی وزیر، مشیر، امیر سے کوئی علاقہ رکھتا ہے اور نہ کسی صاحب منصب سے اس کا کوئی واسطہ ہے۔ ان کی مجلسوں میں جانا بھی اس کے نزدیک پسندیدہ عمل نہیں۔ یہ صرف اصحابِ علم کا خادم اور اسی طائفۂ صالحیت کا مدح خواں ہے۔ ان کی بارگاہِ عالی میں اس کا قلم جھکا ہوا ہے اور اس کا زاویۂ فکر یہ ہے کہ ان کا احترام بجالانا لوازمِ حیات میں سے ہے، لہٰذا

از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس
ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم

حضرت میاں صاحب کے جن پندرہ شاگردانِ ذی مرتبت کے تذکار اس کتاب میں مرقوم ہیں، ان میں حضرت حافظ محمد لکھوی، ان کے سراپا صالحیت فرزند مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی، حضرت الامام سیّد عبدالجبار غزنوی، مولانا عبدالواحد غزنوی، مولانا سیّد امیر حسن سہوانی، سیّد امیر احمد سہوانی، قاضی ابواسماعیل

یوسف حسین خان پوری اور مولانا عبدالجبار عمر پوری شامل ہیں۔ رحمہم اللہ

جن دیگر تینتیس (۳۳) اہل علم کے واقعاتِ زیست کی کتاب میں نشان دہی کی گئی ہے ان میں حافظ عبدالستار عمر پوری، قاضی عبدالاحد خان پوری، مولانا کمال الدین ڈوگر فیروز پوری، مولانا عبداللہ الکافی القرشی، سیّد مولا بخش کوموی، سیّد اعجاز احمد نقوی سہوانی، مولانا نذیر احمد رحمانی املوی، مولانا عبدالرؤف خاں رحمانی جھنڈانگری، مولانا عبدالخالق جامعی اور سیّد عبدالباقی نقوی سہوانی جیسے عالی قدر لوگ شامل ہیں۔ غفر لهم الله تعالیٰ .

اور موجودین کی صف میں مولانا محمد اعظمی، مولانا عبدالحمید ہزاروی، مولانا عبدالحنان فیضی، حافظ عبدالرحمٰن سلفی، ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی، مولانا عتیق اللہ سلفی، مولانا عبدالرؤف خاں ندوی، مولانا عبدالمعید عبدالجلیل، قاری محمد ابراہیم میر محمدی، مولانا رفیق احمد رئیس سلفی، حافظ ریاض احمد عاقب اثری، قاری صہیب احمد میر محمدی، حافظ مسعود عالم اور دیگر اصحابِ تدریس وتصنیف علما کے نام آتے ہیں۔ حفظہم اللہ تعالیٰ

ان تمام حضرات میں جو کل سو (۱۰۰) افراد کے دل نواز مجموعے کی شکل میں ہمارے سامنے ہیں، پاکستانی، ہندوستانی اور بنگلہ دیشی شریک ہیں۔ یعنی کسی حد تک برصغیر کے اہل علم کی نمائندگی کتاب کے صفحات میں اللہ کی مہربانی سے کر دی گئی ہے۔ ان میں سے بعض بزرگان عظام کے حالات خاصی تفصیل سے آ گئے ہیں۔ مثلاً حضرت الامام عبدالجبار غزنوی اور مولانا عبدالواحد غزنوی کے متعلق جو تفصیل اس کتاب میں مذکور ہے، وہ پہلی مرتبہ قارئین کے علم میں آئے گی۔ ان کے مکتوبات سامی کا مطالعہ کرنے کا موقع بھی قارئین کو پہلی مرتبہ میسر آئے گا۔ ان مکتوبات کے حصول کے لیے میں ایک مدت سے کوشاں تھا، اللہ کا شکر ہے کہ متعدد مکتوبات مجھے حاصل ہو گئے۔ اپنے عزیز دوست مولانا عارف جاوید محمدی (کویت) کا ممنون ہوں کہ مولانا عبدالواحد غزنوی کے جو مکتوبات ان کے کتب خانے میں محفوظ تھے، وہ انھوں نے مجھے عنایت کر دیے اور کتاب کی زینت بن گئے۔ امام عبدالجبار غزنوی کے مکتوبات بھی اخبار ''الاعتصام'' اور دیگر ذرائع سے میسر آ گئے۔ امام صاحب اور مولانا عبدالواحد غزنوی (دونوں بھائیوں) کی اردو زبان بڑی دلچسپ ہے۔ قارئین کرام پڑھیں گے تو محظوظ ہوں گے۔ مولانا عبدالواحد غزنوی کے مکتوباتِ گرامی سے پتا چلتا ہے کہ سلطان عبدالعزیز (ابن سعود) مرحوم (یعنی موجودہ والی سعودی عرب شاہ عبداللہ کے والد مکرم) سے ان کے مراسم بہت گہرے اور نہایت مخلصانہ تھے۔ سلطان ابن سعود، مولانا عبدالواحد غزنوی کو اپنے والد کی طرح لائق تکریم گردانتے تھے۔ ان مکتوبات سے سعودی حکومت کی اس مالی حالت کا بھی اندازہ ہوتا ہے جس سے وہ شروع شروع میں دوچار ہوئے اور پھر جس طرح وہاں سرکاری عمارتوں اور شاہراہوں کی تعمیرات کے سلسلے کا آغاز ہوا، اس کی صراحت بھی ان خطوط سے ہو

جاتی ہے۔ غرض موجودہ سعودی حکومت کی ابتدائی تاریخ کو سمجھنے کے لیے جو فتح حجاز اور اس سے کچھ بعد کے زمانے سے تعلق رکھتی ہے، مولانا عبدالواحد غزنوی کے مکتوبات کا مطالعہ بڑی مدد دیتا ہے۔ معلوم نہیں ہمارے ہاں اس صورتِ حال کو کیوں دائرۂ تحریر میں نہیں لایا جاتا۔ اور تو اور میرا خیال ہے موجودہ دَور کے غزنوی حضرات بھی اپنے اسلاف کی زندگی کے اس پہلو سے واقفیت نہیں رکھتے۔

یہاں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ ''چمنستانِ حدیث'' کے ساتھ ساتھ اہل حدیث علماے کرام کے حالات میں ایک اور کتاب ''بوستانِ حدیث'' بھی تقریباً مکمل ہو چکی ہے اور اس کا خاصا حصہ کمپوزنگ کے مرحلے سے گزر چکا ہے۔ یہ کتاب بھی بڑے سائز کے کئی سو صفحات پر محیط ہو گی۔ چمنستان حدیث پہلے شائع ہو رہی ہے اور بوستانِ حدیث کی اشاعت ان شاء اللہ کچھ مدت بعد میں ہو گی۔ ان دونوں کتابوں کے متعلق معلومات فراہم کرنے کے لیے جن دوستوں نے مجھ سے تعاون کیا، میں ان کا بے حد شکر گزار ہوں۔ ان میں مندرجہ ذیل حضرات کے اسماے گرامی بالخصوص قابل تذکرہ ہیں۔ اس کتاب میں جن ہندوستانی اصحابِ علم کے حالات مرقوم ہیں، یہ زیادہ تر حالات مجھے کویت سے مولانا عارف جاوید محمدی نے ارسال کیے۔

❀ بعض ہندوستانی علماء کے تذکار ڈاکٹر عبدالوہاب انصاری (کا سگنج، یوپی) کی کوشش سے موصول ہوئے۔

❀ علی گڑھ اور بعض دیگر مقامات کے ہندوستانی اہل علم نے از خود یا میری درخواست پر اپنے واقعاتِ زندگی سے مطلع فرمایا۔

❀ ملتان اور اس کے نواح کے علماے کرام کی علمی سرگرمیوں کی ضروری تفصیلات حافظ ریاض احمد عاقب اثری (مدرس مرکز ابن القاسم ملتان) کی وساطت سے موصول ہوئیں۔ اس سلسلے میں حافظ صاحب موصوف مجھ سے باقاعدہ رابطہ رکھتے ہیں۔

❀ ڈیرہ غازی خاں اور اس اطراف کے بعض بزرگانِ عالی قدر کے حالات کا علم مجھے مولانا عبدالرحیم اظہر کی معرفت ہوا۔ اس باب میں انھوں نے مجھ سے جو تعاون کیا، اس پر میں ان کا شکر گزار ہوں۔

❀ احمد پور شرقیہ کے نوجوان عالم جناب حمید اللہ خاں عزیز (ایڈیٹر ماہنامہ ''تفہیم الاسلام'') علماے کرام کے سوانح حیات سے بے حد دلچسپی رکھتے ہیں اور خط کتابت اور ٹیلی فون کے ذریعے میرا ان سے رابطہ رہتا ہے، از راہِ کرم انھوں نے بھی بعض علما کے بارے میں معلومات بہم پہنچائیں۔

❀ یہاں جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) کے فاضل مدرس اور ماہنامہ ''ترجمان الحدیث'' کے مدیر محترم حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی کا ذکر ضروری ہے۔ اس نوجوان عالم کو اللہ نے توفیق بخشی کہ خطابت و تدریس کے میدان میں بھی خدمات سرانجام دے رہے ہیں اور قلم و قرطاس سے بھی ان کا تعلق قائم ہے۔ آج کل

جامعہ سلفیہ میں وہ دیگر فنون کی کتابوں کی تدریس کے علاوہ صحاح ستہ کی اہم کتاب سنن ابی داؤد طلبا کو پڑھا رہے ہیں۔ علمائے کرام کا انتہائی احترام کرتے اور ان کے واقعات و حالات سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے مجھ سے بہت تعاون کیا۔ جامعہ سلفیہ کے اساتذہ کے حالات بھی انھوں نے خود لاہور آ کر مجھے دیے جو اس کتاب (چمنستانِ حدیث) میں مندرج ہیں۔ فیصل آباد کے دار القرآن والحدیث کے معلمین کرام کے بارے میں بھی انھوں نے معلومات بھجوائیں جن کا اندراج ان شاء اللہ ''بوستان حدیث'' میں ہو گا۔ یزدانی صاحب لاہور تشریف لائیں تو اس فقیر کو ضرور یاد فرماتے ہیں اور ان سے ملاقات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ وہ کاغذ اور ڈاک لفافے بھی بسا اوقات عنایت کرتے ہیں۔

جماعت غربائے اہل حدیث کا مرکزی دفتر کراچی میں ہے اور اس کے امیر (یا امام) مولانا عبدالرحمٰن سلفی ہیں۔ اس جماعت کی تدریسی اور تصنیفی خدمات کا دائرہ ماشاء اللہ بڑا پھیلا ہوا ہے۔ اس کے تمام اکابر علمائے کرام کا تذکرہ میں اپنی مختلف کتابوں میں خاصی تفصیل سے کر چکا ہوں۔ اس کتاب میں بھی اس کے چند محترم اصحابِ علم کے تراجم مرقوم ہیں۔ اس جماعت کے زیادہ تر ارکان کے حالات مجھے فیصل آباد سے تعلق رکھنے والے مولانا محمد رمضان یوسف سلفی کی وساطت سے موصول ہوئے۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر سے نوازے۔

یہاں میں قابل تکریم علمائے کرام کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اپنے متعلق یا کسی اور سلسلے میں وہ کچھ تحریر فرمائیں تو اسے اخبار میں چھپوانے یا کسی کو بھجوانے سے پہلے دو تین مرتبہ غور سے پڑھ لیا کریں۔ الفاظ کے استعمال اور جملوں کی ساخت کا خیال رکھنا بالخصوص علما کے لیے نہایت ضروری ہے۔ میں کسی صاحب کا نام نہیں لینا چاہتا۔ بعض علما کے ارسال فرمودہ بعض واقعات کا طریق اظہار ان کے مرتبے سے ہم آہنگ نہیں ہوتا۔ میں بے شمار مرحومین و موجودین کے حالات سے ذاتی طور پر آگاہ ہوں، اور ان سے متعلق اپنی معلومات کے مطابق لکھتا ہوں، ان سے یا کسی اور سے ان کے بارے میں کچھ دریافت کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی لیکن جن واقعات کا مجھے زیادہ علم نہیں، مثلاً تاریخ ولادت، تعلیم، اساتذہ اور خاندانی پس منظر وغیرہ تو اس کے لیے ان کی طرف رجوع کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس کا جواب انھیں بہتر الفاظ و انداز میں دینے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ان کے ارسال کردہ واقعات میں خود اپنے الفاظ میں ڈھالتا ہوں اور یہ میرے فرائض میں شامل ہے۔

ہر لکھنے والا یا تو کسی کتاب سے پڑھ کر لکھتا ہے یا کسی سے پوچھ کر اسے کاغذ پر مرتسم کرتا ہے۔ اگر زندہ

شخصیت کے بارے میں لکھا جائے تو خود اسی سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جنھیں اپنے الفاظ میں منتقل کر کے قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ معلومات دینے والے کو خوب صورت الفاظ میں یہ فریضہ ادا کرنا چاہیے۔

اس موقعے پر یہ فقیر بالخصوص عرب ممالک کی یونیورسٹیوں کے لائق اکرام فارغ التحصیل حضرات سے یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ وہ اپنے متعلق معلومات ارسال فرمائیں تو ازراہِ کرم وہی تعلیمی اصطلاحات استعمال فرمائیں جو پاکستان میں مروج ہیں۔ مثلاً اگر کوئی صاحب پی ایچ ڈی کر رہے ہیں تو اس کے لیے پی ایچ ڈی ہی تحریر فرمایا جائے، اس لیے کہ یہاں کے لوگوں کو اسی اصطلاح کا علم ہے، ''دکتورہ'' سے عام لوگوں کا تعلق نہیں ہے۔ پی ایچ ڈی وغیرہ کے نگران کے لیے معروف اصطلاح نگران کی ہے، مشرف کی نہیں ہے۔ پی ایچ ڈی یا ایم فل کے لیے جو کچھ لکھا جاتا ہے، ہمارے یہاں اسے ''مقالہ'' کہا جاتا ہے، نہ کہ رسالہ۔ لفظ ''رسالہ'' کا اطلاق ہماری بولی میں پمفلٹ یا چند صفحات پر مشتمل کتابچے پر ہوتا ہے۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ وہی لفظ استعمال کرنا چاہیے جو یہاں کے لوگ آسانی سے سمجھ سکیں۔ جس لفظ کا عام قارئین کے لیے سمجھنا مشکل ہو، اسے لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ لوگوں کو سمجھانا مقصود ہے نہ کہ انھیں تکلیف میں ڈالنا۔

بہر حال اللہ کا شکر ہے کتاب مکمل ہوئی اور ایک سو مرحومین و موجودین علماے عالی مرتبت کے کوائف حیات اس میں اشاعت پذیر ہو گئے۔ اکثر موجودین کے حالات کے آخر میں تاریخ تحریر بھی لکھ دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان حضرات کا سلسلہ خدمتِ دین دراز ہو اور اسے بارگاہِ الٰہی میں شرفِ قبول سے نوازا جائے۔ یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ اس فقیر نے اپنی عادت کے مطابق پوری کتاب میں مثبت انداز میں اپنی جماعت کے بزرگانِ عالی قدر کے حالات بیان کیے ہیں، کسی پر نہ تنقید کی، نہ اس کی مخالفت میں لکھا۔

کتاب کی ترتیب و تحریر اور حصول معلومات میں اس خادمِ علما نے جو تگ و دو کی اس کی تفصیل میں جانا تو مشکل ہے، صرف ایک واقعہ بیان کرتا ہوں، جس سے قارئین کرام کو تفصیل کا کچھ سراغ مل جائے گا۔

ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی رفیع المنزلت محقق ہیں جو مدینہ منورہ میں قیام فرما ہیں، ان سے میری پہلی ملاقات فروری ۲۰۰۰ء میں ان کے لائق تلمیذ ڈاکٹر طاہر محمود کے ساتھ ہوئی تھی۔ اس کے بعد جون ۲۰۰۸ء میں ہوئی جو کئی گھنٹے جاری رہی۔ اس وقت وہ صحیح احادیث جمع کر رہے تھے، ان کا خیال یہ تھا کہ صحیح احادیث کی تعداد پندرہ ہزار تک پہنچ جائے گی اور یہ کام ۲۰۱۳ء کے آخر تک ختم ہو جائے گا۔ اس کا تذکرہ یہ فقیر ''چمنستانِ حدیث'' میں ڈاکٹر صاحب ممدوح سے متعلق مضمون میں کرنا چاہتا تھا اور ان سے دریافت کرنے کا خواہاں تھا کہ ان کے اندازے کے مطابق کام مکمل ہو گیا یا نہیں؟ لیکن ڈاکٹر صاحب کا فون نمبر میرے پاس

نہیں تھا، البتہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن فریوائی (پروفیسر امام محمد بن سعود یونیورسٹی ریاض) کا نمبر میرے پاس تھا جو ڈاکٹر اعظمی صاحب سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ میں نے ڈاکٹر فریوائی کو ریاض ٹیلی فون کیا تو ان کے صاحب زادے ڈاکٹر عبدالمحسن نے بتایا کہ وہ ہندوستان تشریف لے گئے ہیں۔ اب میں نے ان سے ہندوستان کا ٹیلی فون نمبر لیا اور ان سے علیک سلیک ہوئی تو وہ متعجب ہوئے کہ میں نے ان کو کہاں جا پکڑا۔ ان سے میں نے ڈاکٹر اعظمی صاحب کا نمبر لیا اور ان سے رابطہ کر کے ان کے کام کے بارے میں پوچھا۔ کافی دیر ان سے گفتگو جاری رہی۔ انھوں نے بتایا کہ کام اندازے کے مطابق مکمل ہو گیا ہے۔ ایک اور علمی کام کا تعلق ڈاکٹر عبدالرحمٰن فریوائی سے تھا، ڈاکٹر اعظمی سے گفتگو کے بعد اس کام کے سلسلے میں دوبارہ ہندوستان میں ڈاکٹر فریوائی سے رابطہ کیا اور اس کام کی تفصیل سے مطلع ہوا۔ اس طرح پندرہ سو روپے صرف ایک بات معلوم کرنے پر خرچ ہوئے۔ (ڈاکٹر اعظمی پر مضمون اس کتاب میں مرقوم ہے)

ہندوستان کے ایک اور شہر کا سکنج میں کئی دفعہ ڈاکٹر عبدالوہاب انصاری کو رجال سے متعلق معلومات کے لیے ٹیلی فون کیے، انھوں نے بھی مجھے ٹیلی فون کیے۔ اسی ضمن میں علی گڑھ، دہلی، اعظم گڑھ، مؤناتھ بھنجن اور کویت میں متعدد بار ٹیلی فون کرنے کی نوبت آئی۔

پاکستان کے مختلف مقامات میں رہنے والے علمائے کرام سے تو ٹیلی فون پر گفتگو کا سلسلہ اکثر جاری رہتا ہے۔ بعض اوقات ذہن میں آتا ہے کہ اپنی گرہ سے ٹیلی فون کرتا ہوں، بجلی کا بل خود ادا کرتا ہوں، علما کو خطوط لکھتا ہوں، کوئی جواب دیتا ہے، کوئی نہیں دیتا۔ ان کا یہ رویہ آخر کیوں ہے؟ خط کا جواب دینا تو اخلاقی فرض ہے۔ پھر جلد ہی یہ خیال دل سے نکال دیتا ہوں۔

جی چاہتا ہے، یہاں پاکستانی اور ہندوستانی علمائے کرام میں کچھ فرق کی نشان دہی بھی کر دی جائے۔ میں نے اپنی کتاب (گلستانِ حدیث) میں ایک ہندوستانی عالم مولانا احمد مجتبیٰ سلفی پر مضمون لکھا ہے۔ میری دوسری کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی ہندوستان میں چھپ گئی ہے۔ ایک ہندوستانی دوست کی معرفت پتا چلا کہ مولانا احمد مجتبیٰ سلفی نے ناشر سے اس کی دس کاپیاں خریدیں اور اپنے دوستوں میں تقسیم کیں۔ سوال یہ ہے کہ پاکستانی علمائے کرام بھی اس طرح کتاب خریدتے ہیں؟ جہاں تک میں جانتا ہوں، جواب نفی میں ہے۔ یہاں کے جن قابل احترام عالم کے بارے میں لکھا جائے وہ بڑی مشکل سے ایک کتاب خریدتے ہوں گے۔ بلکہ بعض حضرات تو یہ مطالبہ فرماتے ہیں کہ ان کے بارے میں جس کتاب میں مضمون لکھا گیا ہے، وہ کتاب ان کی خدمت میں پیش کی جائے۔ یعنی ان کے متعلق لکھوں بھی اور انھیں کتاب بھی دوں۔ اس پر پنجابی کی ایک کہاوت یاد آ رہی ہے: لیکن افسوس ہے وہ کہاوت لکھی نہیں جا سکتی، البتہ بے تکلف دوستوں کی مجلس میں بیان

کی جا سکتی ہے۔ یعنی گفتنی ہے، نوشتنی نہیں۔

بہر کیف اس فقیر کے نزدیک علمائے کرام کے حالات اور ان کی مساعیٔ علمیہ کو قلم بند کرنا خدمتِ دین کا ایک اہم ذریعہ ہے، جس کی انجام دہی میں یہ عاصی اپنی دانست میں نیک نیتی سے مشغول ہے۔ یقین رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اپنی بارگاہِ قدس سے اس کا بہتر صلہ عطا فرمائے گا۔

اپنے طور پر کوشش کرتا ہوں کہ کسی عالم دین سے متعلق کوئی بات لکھنے میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ ہو، ہر بات صحیح طریقے سے ضبطِ تحریر میں آئے، لیکن یہ انسانی کام ہے، اگر کہیں کوئی ایسی بات بھول چوک میں قلم کی زبان سے نکل جائے تو اللہ تعالیٰ سے معافی اور متعلقہ شخصیت سے معذرت کا خواست گار ہوں۔

میری ایک عادت جسے آپ غلط بھی قرار دے سکتے ہیں، لطیفہ بیانی یا لطیفہ بازی کی ہے، اگرچہ علما کا تذکرہ کرتے ہوئے، اس سے دامن بچانے کی سعی کرتا ہوں، تاہم کسی موقعے پر ایسی حرکت کا مرتکب ہو جاؤں تو براہِ کرم اسے لطیفہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے۔ (لیکن نظر انداز بھی وہی صاحب کریں گے جو لطیفہ سمجھنے کا فن جانتے ہوں، یعنی فنون لطیفہ سے باخبر ہوں)

آخر میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ میں اپنی ہر کتاب کی پروف ریڈنگ خود ہی کرتا ہوں اور اپنے خیال میں بڑی محنت اور غور سے کرتا ہوں، عین ممکن ہے اتنی بڑی ضخیم کتاب میں کمپوزنگ یا پروف ریڈنگ کی کوئی غلطی رہ جائے، اس کی قارئین کرام خود ہی تصحیح فرما لیں اور مجھے بھی مطلع کر دیں تو مہربانی ہوگی۔

مرحومین کا تذکرہ بہ ترتیب تواریخ وفات کیا گیا ہے اور موجودین کا بہ ترتیب تواریخ ولادت۔

میں اپنے عزیز دوست مولانا عبدالخالق مدنی (مقیم کویت) کا احسان مند ہوں کہ انھوں نے کتاب پر خالص علمی نوعیت کا مقدمہ لکھا اور اس میں اس فقیر کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا، انھیں میرے لیے تمغۂ امتیاز کی حیثیت حاصل ہے۔ جزاهم الله خير الجزاء .

بندۂ عاجز
محمد اسحاق بھٹی
اسلامیہ کالونی، ساندہ، لاہور

۱۰۔ مارچ ۲۰۱۴ء
۸۔ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ
ٹیلی فون: 042-37143677

حضرت میاں سیّد نذیر حسین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

کے

پندرہ رفیع المرتبت تلامذہ

سید امیر حسن سہسوانی

(وفات ۳۰ مارچ ۱۸۷۴ء)

ہندوستان کے صوبہ یوپی کے جن بلاد و قصبات اور دیہات میں زمانۂ قدیم سے علم کی نہریں بہتی اور معرفت و ادراک کے چشمے ابلتے رہے، ان میں ایک شہر کا نام "سہسوان" ہے، جو بدایوں سے پچیس میل بجانب غرب واقع ہے۔ یہ ایک تاریخی شہر ہے جو عرصۂ دراز تک علماء و مشائخ کا مرکز اور صلحا و فقہا کا مسکن رہا۔

اس میں تیرھویں صدی ہجری میں جن نادرۂ روزگار شخصیتوں نے جنم لیا اور فضیلت و کمال میں شہرت پائی ان میں امام المتکلمین حضرت علامہ سید امیر حسن حسینی سہسوانی رحمہ اللہ کا نامِ نامی سرِ فہرست ہے۔ مولانا ممدوح کی ولادت ۱۲۴۳ھ (۱۸۲۸ء) کے لگ بھگ ہوئی۔ عمر کا ابتدائی حصہ تحصیل علم کے شوق سے خالی رہا۔ عالم شباب میں جب ازدواجی ذمے داریاں بھی سر پر آ پڑی تھیں، غیرتِ نفس نے جوش مارا اور طلبِ علم کے لیے کمربستہ ہوئے۔ وطن سے نکلے اور علی گڑھ کی راہ لی، جہاں مولانا عبدالجلیل (شہید ۱۸۵۷ء) سرگرمِ تعلیم و تدریس تھے، ان سے استفادہ کیا۔ وہاں سے فرخ آباد گئے اور قاضی بشیر الدین قنوجی (متوفی ۱۲۹۶ھ) کے سلسلۂ تلامذہ میں شامل ہوئے۔ پھر لکھنؤ کا قصد کیا اور مولانا ابوالبرکات تراب علی فرنگی محلی (متوفی ۱۲ صفر ۱۲۸۰ھ) سے فنونِ عقلیہ و حکمیہ کی تکمیل کی۔ وہاں تشنگیٔ علم کم نہ ہوئی تو دہلی جا کر مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی (متوفی ۱۲۸۵ھ) کے خرمنِ علم سے خوشہ چینی کی۔ پھر استاذِ کل حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی (متوفی ۱۰ رجب ۱۳۲۰ھ) کے حلقۂ درس میں شمولیت کی اور ان سے کتبِ حدیث پڑھیں۔ مولانا شاہ عبدالغنی محدث مجددی (متوفی ۶ محرم ۱۲۹۶ھ) اور امام شوکانی (متوفی جمادی الاخری ۱۲۵۰ھ) کے تلمیذِ رشید مولانا عبدالحق بنارسی (متوفی ۲ ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ) کی خدمت میں بھی گئے۔ ان تینوں حضرات سے کتبِ صحاح اور بعض دیگر کتابیں سماعت و قراءت کی صورت میں پڑھنے کا شرف حاصل کیا اور سند و اجازہ سے بہرہ مند ہوئے۔

زمانہ قدیم میں علمائے عظام کا یہ شیوہ تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ ممتاز و مشہور علماء سے کسبِ علم اور حصول سند کی کوشش کرتے تھے۔ سید امیر حسن سہسوانی نے بھی اپنے عصر کے متعدد نامور حضرات سے تحصیل کی اور سند لی تاکہ ہر حلقۂ علم کے اکابر سے تعلق و قرب اور استفادے کے مواقع میسر آ سکیں۔

سید ممدوح کو اللہ تعالیٰ نے ذکاوت و فطانت، قوتِ حفظ، سرعتِ فہم اور ضبط الفاظ کی نعمت سے خوب نوازا تھا اور وہ کم سے کم وقت میں دقیق سے دقیق اور مشکل سے مشکل بات کو سمجھ لینے کی پوری استعداد رکھتے تھے، اس لیے چند ہی سالوں میں ان کا شمار متبحر اور وسیع النظر علما کی جماعت میں ہونے لگا اور تھوڑے عرصے میں شہرت و ناموری کی بہت سی منزلیں طے کر لیں۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد وطن واپس آئے تو دیکھا کہ جو شہر کسی زمانے میں دولتِ علم و عرفان سے مالا مال اور علما و فضلا کا گہوارہ تھا، اپنی رونق علم ختم کر چکا ہے اور جو روایات اس سے وابستہ تھیں، اس کے فقط نشانات رہ گئے ہیں باقی تمام سلسلہ معدوم ہو گیا ہے۔ پرانے اہل علم یا تو سفرِ آخرت اختیار کر گئے ہیں یا سہسوان کی سکونت ترک کر کے دیگر علاقوں اور شہروں میں جا بسے ہیں، یعنی پرانی بساط یکسر الٹ گئی ہے۔

اب انھوں نے از سرِ نو حالات کا جائزہ لیا اور شمعِ علم کو جو بجھ چکی تھی، دوبارہ روشن کرنے کی سعی کی۔ چنانچہ اللہ پر توکل کر کے وعظ و ارشاد کا سلسلہ شروع کیا اور لوگوں کو تدین و تقویٰ اختیار کرنے اور طلب علم کے لیے کمر بستہ ہونے کی تلقین کی۔

ان کی پر خلوص تقریروں اور اثر آفرین مواعظ کا یہ نتیجہ نکلا کہ لوگ ان کے گرویدہ ہو گئے اور ان کے نرم و متوازن طرزِ کلام کی وجہ سے انھوں نے راہ راست اختیار کر لی۔ اب سہسوان اور اس کے گرد و نواح میں علم کے چرچے ہونے لگے اور ہر معاملے میں پابندیٔ شرع کا التزام کیا جانے لگا۔ یہ تگ و تاز کئی سال جاری رہی، حتیٰ کہ شہر اور علاقے کی فضا بالکل بدل گئی۔

اسی اثنا میں بعض رؤسائے دہلی کے اصرار پر دہلی تشریف لے گئے۔ دہلی میں کئی سال دعوت و ارشاد اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا۔ بے شمار لوگ ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے اور متعدد طلبائے علم نے ان سے اخذِ فیض کیا اور مرتبۂ کمال کو پہنچے۔

قیام دہلی کے زمانے میں ان کا شہرۂ علم دُور دُور تک پہنچ گیا تھا اور لوگ ان کے اسلوبِ تدریس اور اندازِ وعظ و تبلیغ سے بہت متاثر تھے۔ میرٹھ کے لوگوں کو ان کی صدائے حق کی اثر آفرینیوں کا پتا چلا تو اپنے ہاں لے جانے پر مُصر ہوئے۔ اس کے لیے میرٹھ کے ایک رئیس شیخ الٰہی بخش مرحوم پیش پیش تھے۔ ان کے مخلصانہ اصرار سے مجبور ہو کر سید صاحب موصوف دہلی سے میرٹھ منتقل ہو گئے۔ وہاں ایک بہت بڑا دینی اور اسلامی مدرسہ قائم کیا۔ اس کا سنگِ بنیاد بھی خود رکھا اور اس کے اہتمام و نگرانی کے فرائض بھی خود ہی انجام دینے لگے۔ میرٹھ کا یہ مدرسہ ان کی وجہ سے بہت مشہور ہوا، اور دور دراز مقامات سے طلبا اس میں آنے اور ان سے مستفید ہونے لگے۔ ان کے وطن سہسوان کے متعدد طلبائے علم جن میں خاندانِ سادات اور ان کے قرابت دار بھی

شامل تھے، ان کے ساتھ میرٹھ چلے گئے۔ ان حضرات نے ان سے خوب استفادہ کیا اور اونچے مرتبے پر فائز ہوئے۔ میرٹھ میں ان سے استفادہ کرنے والوں میں بہت سے اکابر علماے کرام میں خود ان کے فرزند گرامی مولانا سید امیر احمد سہسوانی (متوفی ۱۳۰۶ھ) بھی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ مولانا سید عبدالباری سہسوانی (متوفی ۱۳۰۳ھ) مولانا سید سبط احمد سہسوانی (متوفی ۱۳۰۷ھ) مولانا سید محمد نذیر سہسوانی (متوفی ۱۲۹۹ھ) مولانا محمد تراب علی مرشد آبادی اور قاضی محمد احتشام الدین مراد آبادی وغیرہ حضرات خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

سید امیر حسن طویل عرصے تک میرٹھ میں مقیم رہے، اس اثنا میں کتاب وسنت کی خوب نشر واشاعت کی اور بے شمار لوگوں کو فیض پہنچایا۔ آخری دور میں مدرسۂ میرٹھ کا انتظام اپنے بعض لائق تلامذہ کے سپرد کر دیا تھا اور خود اس ذمے داری سے آزاد ہو گئے تھے۔ اس کے بعد میرٹھ میں کم اور علی گڑھ میں زیادہ قیام رہتا تھا۔

بعد ازاں پھر سہسوان میں اقامت گزین ہو گئے تھے۔ وہاں قرآن و حدیث کا درس دیتے، بحث و مناظرے میں حصہ لیتے، لوگوں کو وعظ ونصیحت کرتے، طلبا کو مخالفین سے مباحثوں کے لیے تیار کرتے اور احسن طریقے سے تبلیغ اسلام کی تربیت دیتے۔ وہاں کی مسجد غلام علی شاہ میں روزانہ درس ہوتا اور کثیر تعداد میں طلبا وعلما اور دیگر حضرات اس میں شریک ہوتے۔ نماز جمعہ میں بہت کثرت سے لوگ آتے، اور سید صاحب ممدوح نہایت حسن وخوبی سے قرآن و حدیث کی روشنی میں ان کو منہیات سے روکتے اور نیکی ومعروف کی تلقین فرماتے۔

مختلف مذاہب و مسالک کی کتابوں پر ان کی گہری نظر تھی اور ان کے اعتراضات کا جواب دینے میں ماہر تھے۔ کتب شیعہ کا بھی خوب مطالعہ تھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر کی تردید مضبوط دلائل سے کرتے تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جس زمانے میں دربار اودھ کی سرپرستی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نشانۂ طعن بنایا جانے لگا اور برسرِ عام تبرّیٰ بازی ہونے لگی تو حیدر آباد (دکن) کی ریاست کے اربابِ اختیار نے اس اہم مسئلے کو موضوعِ توجہ ٹھہرایا، اور علمی و تحقیقی رنگ میں ان کی تردید کا منصوبہ بنایا۔ اس کے لیے مولانا حیدر علی فیض آبادی (متوفی ۱۲۹۹ھ) کی خدمات حاصل کی گئیں، جو شاہ عبدالعزیز محدیث دہلوی کے شاگرد اور جلیل القدر عالم تھے۔ وہ بوڑھے ہو چکے تھے اور ضعف و کمزوری نے انھیں گھیر لیا تھا۔ لیکن خدمتِ دین کی غرض سے یہ ذمے داری اس شرط پر قبول فرمائی کہ ان کو کوئی صاحبِ بصیرت اور وسیع النظر عالم بہ طور معاون دیا جائے۔ ساتھ ہی فرمایا کہ یہ معاون سید امیر حسن سہسوانی ہونے چاہئیں، جن کا کثرتِ مطالعہ اور وسعتِ فکر ونظر میں کوئی حریف نہیں ہے۔ چنانچہ سید صاحب ممدوح سے رابطہ قائم کیا گیا اور کہا گیا کہ ابتدا میں اس خدمت کے لیے انھیں چار سو روپے ماہانہ دیے جائیں گے اور جلد ہی

اسے بڑھا کر ایک ہزار روپے ماہانہ کر دیا جائے گا۔ سب احباب اور اعزہ و اقارب نے سید صاحب سے حیدر آباد تشریف لے جانے کی درخواست کی اور اس کام کو تمام کاموں سے زیادہ اہم اور بنیادی قرار دیا لیکن انھوں نے انکار کر دیا اور فرمایا، میں اپنے اوقاتِ درس و وعظ کو مباحثات و مشاجرات میں صرف کرنا اور امرا و حکام کا تقرب اختیار کر کے اپنے آپ کو عیش و تنعم کا خوگر نہیں بنانا چاہتا۔ ایک عالم دین کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں کہ وہ سلاطین و حکام کی مجلس اختیار کرے، ان سے قرب و ربط رکھے اور علم کو مال و دولت کے لیے ضائع کرے۔ ❶

سید امیر حسن سہسوانی مروجہ علوم پر ماہرانہ نظر رکھتے اور مرتبۂ اجتہاد پر فائز تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ و اصول اور دیگر علوم و فنون پر دسترس تھی۔ اللہ نے ان کو قوتِ فہم اور بصیرت و دانش کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔ ان کی کوشش سے سہسوان اور ان کے اطراف میں علمِ حدیث کی اشاعت ہوئی اور لوگوں میں عمل بالحدیث کا جذبہ ابھرا۔ مولانا محمد بشیر سہسوانی (متوفی ۲۹ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۶ھ) نے جو خطۂ ہند کے مشہور عالم تھے، ان ہی کے فیضِ صحبت سے مسلکِ اہلِ حدیث اختیار کیا تھا۔

تصنیف و تالیف سے بھی سید صاحب ممدوح کو دلچسپی تھی۔ رد بدعات اور حمایتِ سنت میں کئی رسالے لکھے اور قرآن مجید، حدیثِ رسول اور کتبِ فقہ کے دلائل سے اپنے نقطۂ نظر کو واضح کیا۔ ایک رسالہ شیعہ کے رد میں لکھا اور ایک رسالہ اثباتِ حق کے نام سے تحریر کیا۔ طبعیاتِ شفا پر تعلیقات سپردِ قلم کیں۔

ان کی تصنیفات کے سلسلے میں یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کی معروف تصنیف معیار الحق شائع ہوئی تو اس کے جواب میں مولانا ارشاد حسین رام پوری (متوفی ۱۳۱۱ھ) نے انتصار الحق کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی۔ انتصار الحق کے رد میں حضرت میاں صاحب کے تلامذہ نے چار کتابیں لکھیں۔ ایک براہینِ اثنا عشر، دوسری تلخیص الانظار فی ما بنی علیہ الانتصار، تیسری اختیار الحق اور چوتھی بحرِ زخار...... ان میں سے اول الذکر تصنیف یعنی ''براہین اثنا عشر'' سید امیر حسن سہسوانی کی تصنیف ہے۔

براہین اثنا عشر کے معرضِ تصنیف میں آنے کا پس منظر یہ ہے کہ جس دن مولانا ارشاد حسین رام پوری کی کتاب انتصار الحق چھپ کر آئی، اسی دن سید امیر حسن سہسوانی نے اس کا مطالعہ کیا۔ اس میں حضرت میاں صاحب کے موقف کا مصنف نے بارہ دلائل سے رد کیا تھا اور لکھا تھا کہ جو شخص ان بارہ دلیلوں کا جواب دے گا سمجھا جائے گا کہ اس نے ان کی پوری کتاب کی تردید کر دی...... مصنف انتصار الحق کے نزدیک وہ دلائل اس قدر مستحکم اور مضبوط تھے کہ ان کا توڑ اور جواب محال تھا۔ لیکن سید امیر حسن نے اس کتاب کی اشاعت کے

❶ نزہۃ الخواطر میں حکیم عبدالحی حسنی نے تین سو روپے ماہانہ لکھا ہے۔

دوسرے ہی دن ''براہین اثنا عشر'' کے نام سے اس کا جواب لکھ کر شائع کرا دیا۔ اس کا ایک نسخہ چودھویں صدی ہجری کے ممتاز حنفی عالم مولانا عبدالحی فرنگی محلی لکھنوی (متوفی ۱۳۰۴ھ) کی خدمت میں ارسال کیا۔ حضرت ممدوح نے یہ رسالہ پڑھا تو سید صاحب کو حسب ذیل مکتوب تحریر فرمایا:

از محمد عبدالحی

''بہ مولوی صاحب مکرم معظم مجمع بحرین المعقول والمنقول، منبع نہرین الفروع والاصول مولوی سید امیر حسن صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ عنایت نامہ لطف شمامہ مورخہ ۲۰ ماہِ رواں بہ ورودِ خود ممتاز ساختہ و براہین اثنا عشر رسیدہ، اغلاط اسامی کتب و مؤلفین در انتصار لا تعد دہستند، شاید بہ نظر اختصار ہر چند کفایت شدہ۔'' ❶

یعنی ماہ رواں کی ۲۰ تاریخ کو مکتوب گرامی ملا، اور باعث افتخار ہوا۔ براہین اثنا عشر وصول پائی۔ انتصار الحق میں کتابوں اور مصنفین کے ناموں کی لاتعداد غلطیاں موجود ہیں۔ آپ نے شاید اختصار کے پیش نظر چند ہی غلطیوں کے ذکر کو کافی سمجھا ہے۔

مولانا عبدالحی لکھنوی جو خود بھی برصغیر کے جلیل القدر عالم اور رفیع المرتبت فاضل تھے، مولانا سید امیر حسن سہسوانی کو نہایت احترام کے ساتھ مخاطب فرماتے ہیں اور ان کو مجمع بحرین، جامع معقول ومنقول اور منبع فروع واصول قرار دیتے ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ سید صاحب ممدوح اپنے دور کے بہت بڑے فاضل اور محقق تھے، اور برصغیر پاک وہند کے اکابر علما ان کو حد درجے لائق تعظیم گردانتے تھے۔

سید امیر حسن کامیاب مناظر بھی تھے اور فن مناظرہ کے تمام پہلوؤں سے آگاہ تھے۔ مولانا عبدالحی فرنگی محلی سے بھی (جن کا سطور بالا میں ذکر ہوا) ان کے مناظروں کا سلسلہ جاری رہا۔ ان دونوں علمائے عصر کے درمیان مسئلۂ وجوب زیارت پر مباحثہ ہوا اور اس ضمن میں دونوں طرف سے کئی رسالے شائع ہوئے۔

سید صاحب کے بہت بڑے حریف عیسائی پادری تھے جو اس زمانے میں انگریزی حکومت کے ایما اور تعاون سے ہندوستان میں عیسائیت کی ترویج واشاعت کر رہے تھے۔ انگلستان سے بھی کئی مشہور پادری برصغیر میں آ کر سکونت پذیر ہو گئے تھے اور تبلیغ عیسائیت میں سرگرم تھے۔ ان میں ایک پادری ہاسکن تھا جو انگلستان کا باشندہ تھا اور بدایوں میں مقیم تھا۔ دوسرا پادری اسکاٹ تھا۔ یہ بھی انگریز تھا اور انگلستان کا رہنے والا تھا۔ یہ پادری بریلی میں اقامت پذیر تھا۔ ان دونوں پادریوں کو اپنے دور کے بہت بڑے مناظر اور محقق سمجھا جاتا تھا۔ ان کا اصل مقابلہ مسلمانوں سے تھا اور اسلام پر یہ مسلسل حملے کر رہے تھے۔ سید امیر حسن سہسوانی سے کئی مرتبہ

❶ الحیات بعد الممات ص ۵۹۲

ان کے مناظرے اور مباحثے ہوئے اور ہر مرتبہ سید صاحب کے مقابلے میں ان کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ سید صاحب کی وسعتِ نظر اور مذاہب کے بارے میں ان کی تحقیق سے یہ دونوں پادری بہت متاثر تھے اور ان کی تعریف کرتے تھے۔ ان کی حاضر جوابی اور قوتِ استدلال کے بھی معترف تھے۔ ان کی زندہ دلی اور فراخ حوصلگی کے بھی مداح تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے ملاقات کے لیے وہ سہسوان آتے، ان سے باتیں کرتے اور ان کی مجالسِ وعظ میں شریک ہوتے۔

پادری اسکاٹ ولایت میں تھا کہ اسے سید صاحب ممدوح کی وفات کی خبر پہنچی۔ اس نے نہایت افسوس کا اظہار کیا اور انگلستان کے ایک اخبار میں ان کے بارے میں مضمون لکھا، جس میں ان کے اسلوبِ بحث اور منہج استدلال کی تعریف کی اور ہندوستان کے علماء میں ان کو بے مثل اور منفرد حیثیت کے عالم قرار دیا۔

عمر کے آخر حصے میں سید صاحب موصوف تمام علائق سے منقطع ہو کر ذکر و عبادت میں مشغول ہو گئے تھے۔ علی گڑھ میں اکثر آمد و رفت رہتی تھی۔ وہیں دوشنبہ کے روز ۱۱ صفر ۱۲۹۱ھ (۳۰ مارچ ۱۸۷۴ء) کو معمولی ناسازئ طبع سے انتقال کیا۔ ❶

❶ حالات کے لیے ملاحظہ ہو، حیات العلماء، ص ۶۴ تا ۶۹ ...... الحیات بعد المماتِ ص ۵۹۲ و ۶۹۷ ...... نزہۃ الخواطر، ج ۷ ص ۷۹، ۸۰ ...... تراجم علمائے حدیث ہند: ص ۲۳۹ تا ۲۴۱ ...... مولانا محمد احسن نانوتوی ص ۵۹۔

سیّد عبدالباری نقوی سہسوانی

(وفات ۸ ستمبر ۱۸۸۶ء)

علماے سہسوان میں مولانا سید محمد عبدالباری نقوی سہسوانی کا علم و عمل میں بڑا نام تھا۔ وہ مولانا سید سراج احمد نقوی سہسوانی کے فرزند دلبند تھے۔ ۱۲۶۶ھ (۱۸۵۰ء) میں پیدا ہوئے۔ والد مکرم کی زندگی کا کچھ حصہ لکھنؤ، کاکوری اور بعض دیگر مقامات میں خدمتِ تدریس انجام دیتے گزرا۔ عبدالباری نے عمر کی چند منزلیں طے کیں تو وہ انھیں اپنے ساتھ لے گئے اور خاص اہتمام سے تعلیم دینا شروع کی۔ اللہ نے ان کو فہم و فراست کی نعمت سے خوب نوازا تھا، جو کچھ پڑھتے، اس کے مطالب، بلکہ الفاظ تک ذہن میں پیوست ہو جاتے۔ معقول و منقول کی متعدد کتابیں ان سے پڑھیں۔

والد کی وفات:

ابھی بارہ سال کی عمر کو پہنچے تھے اور تحصیل علم کا سلسلہ جاری تھا کہ والد وفات پا گئے۔ یہ بہت بڑا حادثہ تھا جو انھیں پیش آیا۔ اس وقت گھر کے یہ پانچ افراد تھے۔ ایک خود یہی عبدالباری، ایک والدہ، دو بہنیں اور آٹھ سال کا ایک بھائی عبدالباقی جو ان سے چار سال چھوٹا تھا۔ [1]

بے شک یہ ایک عظیم المیہ تھا، جس سے یہ خانوادہ دو چار ہوا۔ گھر کی مالی حالت بھی مستحکم نہ تھی، لیکن سید عبدالباری نے کم عمری کے باوجود ہمت نہیں ہاری۔ وہ والدہ مکرمہ اور بھائی بہنوں کو برابر تسلی دیتے رہے اور اللہ پر توکل رکھا۔ کچھ عرصے کے بعد حالات میں تبدیلی کے آثار پیدا ہو گئے اور اللہ نے سب کو صبر عطا فرما دیا۔

سید امیر حسن کی خدمت میں:

اب وہ مولانا سید امیر حسن نقوی سہسوانی کی خدمت میں حاضر ہوئے، جو اس وقت میرٹھ میں درس و تدریس کا فریضہ سرانجام دیتے تھے اور عبدالباری کی ذکاوت و فطانت سے باخبر تھے۔ وہ انھیں اپنے ساتھ میرٹھ لے گئے۔ ان سے وہ تعلیم بھی حاصل کرتے تھے، ان کی نگرانی میں تقریریں بھی کرتے تھے اور مختلف مذاہب کے مناظروں سے مناظرے بھی کرتے تھے۔ اپنی خداداد قابلیت کی وجہ سے انھوں نے بہت جلد

---

[1] یہ وہی سید عبدالباقی نقوی سہسوانی ہیں، جنھوں نے ''حیات العلماء'' کے نام سے علماے سہسوان کے حالات میں ایک مستقل کتاب تصنیف کی جو اپنے موضوع کی اہم دستاویز ہے۔ سید عبدالباقی کا تذکرہ آئندہ صفحات میں آ رہا ہے، ان شاء اللہ العزیز۔

اسلام کے بہت بڑے مبلغ کی حیثیت اختیار کر لی۔ مروجہ درسی علوم کی تحصیل مولانا سید امیر حسن سے کی۔ وہ اپنے اس شاگرد پر بہت خوش تھے اور ان کی تقریر و خطابت اور بحث و مناظرے کے اسلوب پر انھیں فخر تھا۔

سندِ فضیلت:

جس مدرسے میں وہ تعلیم پاتے تھے، اس مدرسے کا نام مدرسہ اسلامیہ تھا اور اس کے منتظم میرٹھ کے ایک تاجر و رئیس شیخ الٰہی بخش تھے۔ ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸ء) میں شیخ صاحب موصوف کی کوشش سے مدرسہ اسلامیہ کا ایک سہ روزہ جلسہ منعقد ہوا، جس میں رام پور، بریلی، لکھنؤ، دہلی، مراد آباد اور دیوبند وغیرہ کے بہت سے علمائے کرام نے شرکت کی۔ جلسے کے تیسرے روز مجمع عام میں جس میں علمائے مدعوین کے علاوہ میرٹھ شہر اور اس کے قرب و جوار کے زعما و عمائد کثیر تعداد میں موجود تھے، اس سال کے فارغ التحصیل طلبا کو پیش کیا گیا۔ سب سے پہلے مولانا سید امیر حسن اپنے شاگرد سید عبدالباری کو لے کر آئے اور فرمایا یہ میرا لائق شاگرد ہے۔ اس سے علوم متداولہ کی کتابوں میں سے ہر عالم جہاں سے جی چاہے، سوال کر سکتے ہیں۔ چنانچہ مختلف حضرات نے تفسیر، حدیث، فقہ، ادب، معانی و بیان اور صرف و نحو وغیرہ سے متعلق سوال کیے۔ انھوں نے ہر سوال کا صحیح جواب دیا۔ مجمع عام میں تقریر بھی کی۔ اس زمانے میں انھوں نے ایک انگریز نومسلم کی فرمائش پر ردِ شرک و بدعات میں ہدایۃ المبتدعین کے نام سے ایک رسالہ لکھا تھا۔ اس کے متعلق چند سوال کیے گئے، انھوں نے تمام سوالوں کے جواب دیے، اس کے بعد انھیں مدرسے کی طرف سے سندِ فضیلت دی گئی، جس پر متعدد علماء نے دستخط کیے اور مہریں لگائیں۔

حضرت میاں صاحب کی خدمت میں:

میرٹھ کے مدرسہ اسلامیہ سے سندِ فضیلت لے کر وہ استاذِ محترم مولانا سید امیر حسن سہسوانی کی اجازت سے عازم دہلی ہوئے اور شیخ الکل حضرت میاں سید نذیر حسین کی خدمت میں حاضری دی۔ انھیں کتب حدیث یعنی صحاح ستہ سنائیں۔ بعض دیگر مروجہ علوم کی کتابیں بھی ان سے پڑھیں اور سند لی۔ یہ ان کی دوسری سند تھی اور یہ بہت بڑا اعزاز تھا جو انھیں حضرت میاں صاحب کی بارگاہِ فضیلت سے حاصل ہوا۔

دہلی میں قیام:

اس وقت دہلی کے مسلمان تاجروں میں سے ایک معزز تاجر حاجی علی جان تھے جو علماء کا بے حد احترام کرتے اور ان کے قدر دان تھے۔ وہ مولانا سید عبدالباری کی تقریروں اور عالمانہ گفتگو سے بہت متاثر ہوئے اور خواہش ظاہر کی کہ وہ دہلی میں قیام کریں۔ چنانچہ حاجی صاحب کی خواہش کے احترام میں وہ دہلی میں

سکونت پذیر ہو گئے۔ یہ ان کی نوجوانی کا زمانہ تھا۔ وہ طلبا کو درس بھی دیتے تھے اور شہر کے مختلف مقامات میں وعظ بھی فرماتے تھے۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا اور دیگر مذاہب کی طرح عیسائیت کے متعلق بھی انھیں معلومات حاصل تھیں۔ اس زمانے میں عیسائی پادری جگہ جگہ جلسے کر رہے تھے۔ اسلام اور مسلمانوں کے وہ شدید مخالف تھے۔ مولانا ممدوح نے بعض سرکردہ مسلمانوں کے کہنے پر ان پادریوں سے مناظرے کیے اور اللہ کی مدد سے پادریوں کو ہر مناظرے میں شکست دی۔ ان کے زورِ بیان اور کثرتِ معلومات کا خود پادریوں نے اعتراف کیا اور اپنی شکست تسلیم کی۔ بے شبہ مولانا عبدالباری پُر تاثیر خطیب اور کامیاب مناظر تھے۔ دہلی میں ان کا قیام صرف پانچ مہینے رہا۔

دیانند سرسوتی سے مقابلہ:

دہلی سے مولانا عبدالباری اپنے وطن سہسوان کو روانہ ہوئے تو راستے میں علی گڑھ ٹھہرے۔ اس وقت ہندوؤں کے آریہ مذہب کے بانی دیانند سرسوتی بھی وہیں تھے۔ ان سے بھی مولانا کا مقابلہ ہوا۔ مولانا چاہتے تھے کہ باقاعدہ مناظرہ ہو اور مجمعِ عام میں ہو، لیکن دیانند اور ان کے حامیوں نے اس سے انکار کیا اور کہا کہ مناظرہ تحریری ہونا چاہیے۔ مولانا نے ان کی تجویز مان لی اور اسلام کی صداقت اور آریہ مذہب کی تردید میں ایک تحریر شہر کے چند سرکردہ لوگوں کی معرفت دیانند سرسوتی کو بھیجی، لیکن انھوں نے اس کا جواب نہیں دیا۔ پھر چوتھے روز ایک اور تحریر بھیجی جس میں آریہ کی مذہبی کتاب وید کی تعلیمات کو غلط قرار دیا گیا تھا، اس کا بھی جواب نہ آیا تو انھوں نے شہر کے مختلف مقامات میں جلسے کرنا شروع کیے اور جو تحریریں انھوں نے آریہ مذہب کے بانی کو بھیجی تھیں، وہ ہر مجمعے میں پڑھ کر سنائی گئیں، یہ سلسلہ کئی دن جاری رہا، لیکن دوسری طرف سے کسی اعتراض کا کوئی جواب نہ دیا گیا اور دیانند سرسوتی علی گڑھ سے چلے گئے۔

شادی اور بدایوں میں قیام:

علی گڑھ سے مولانا عبدالباری اپنے وطن سہسوان تشریف لے گئے اور تاج الاولیا مولانا سید تاج الدین نقوی نے اپنی صاحب زادی ان کے عقد میں دے دی۔ کچھ عرصہ وہاں رہے۔ پھر والدہ مکرمہ کی اجازت سے بدایوں کا قصد فرمایا۔ وہاں درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور ہنود و نصاریٰ اور اہل بدعت سے مباحث و مناظرات بھی ہوتے رہے۔ وہاں کے زیادہ تر لوگ عقائد و اعمال میں ان سے بالکل مختلف تھے۔ ان میں اشاعتِ توحید اور کتاب و سنت کی تبلیغ کی سخت ضرورت تھی، چنانچہ مولانا نے اپنے آپ کو اس کام کے لیے وقف کر دیا۔ وعظ و تقریر کی صورت میں بھی اور مناظرات کی صورت میں بھی۔

عبرانی زبان کی تحصیل:

اس زمانے بدایوں میں ایک انگریز پادری مقیم تھا، جس کا نام ہاسکن تھا۔ بحث و مباحثے کے دوران مولانا عبدالباری کی ان سے ملاقات ہوئی تو تحریف انجیل کا مسئلہ موضوع گفتگو بنا۔ مولانا نے دلائل سے ثابت کیا کہ انجیل میں تحریف کی گئی ہے اور اس کے بہت سے مقامات میں تبدیلی ہوئی ہے۔ وہ صاف دل پادری تھا۔ اس نے مولانا کے موقف کو تسلیم کیا اور واضح لفظوں میں اعتراف کیا کہ انجیل میں تحریف و تبدیلی کا عمل جاری رہا ہے۔

وہ مولانا کو اس دور کے بہت بڑے عالم اور محقق قرار دیتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے مولانا سے عربی کی تعلیم حاصل کی اور مولانا نے اس سے عبرانی زبان سیکھی۔

مولانا کا ذہن تعصب و عناد سے پاک تھا۔ ان کی ہر بات اخلاص پر مبنی ہوتی تھی۔ ان کے وعظ و مناظرے میں مخلصانہ جذبات کارفرما ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا وعظ اور ان کا طرز کلام لوگوں کے لیے قابل قبول اور موثر ہوتا تھا۔

جون پور میں قیام:

کچھ عرصہ مولانا عبدالباری نقوی نے بدایوں میں گزارا، پھر جون پور چلے گئے۔ جون پور اس وقت علماء کا مرکز اور اصحابِ فن کا مسکن تھا۔ وہاں انھوں نے درس و تدریس کا مشغلہ بھی جاری رکھا اور وعظ و تبلیغ میں بھی مصروف رہے۔ وہاں ان کا زیادہ تعلق بعض کتب درسیہ کے محشی اور انوار الحواشی کے مصنف حکیم محمد انور علی سے رہا۔ حکیم صاحب ممدوح سے انھوں نے فنِ طب میں استفادہ کیا اور اس کے بعض مسائل سمجھے۔ اس فن کی مشکل اصطلاحات حیطۂ فہم میں لائے۔ طب کی بعض کتابوں کے بارے میں بھی ان سے گفتگو کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ مولانا ممدوح ہر صاحبِ فن سے استفادے کی کوشش فرماتے۔ چنانچہ انھوں نے علمِ طب کے متعلق بھی اطباء سے معلومات حاصل کیں۔

آگرہ میں تدریس اور مناظرات:

جون پور سے مولانا سید عبدالباری نقوی آگرہ گئے اور وہاں کے عربی سرکاری مدرسے میں ملازمت کرنے لگے۔ حساب و ہندسہ اور علم ہیئت میں بھی دست گاہ رکھتے تھے۔ مدرسہ آگرہ میں عربی ادب اور ریاضی کے مضامین ان کے سپرد ہوئے۔ بلاشبہ وہ اپنے عہد کے مروّجہ علوم میں کامل اور اصول و فروع میں فائق الاقران تھے۔ اس سرکاری مدرسے میں بھی انھوں نے اسی طرح محنت اور انہماک سے طلبا کو تعلیم دینا

شروع کی، جس طرح اس سے قبل مختلف مدارس میں تعلیم دیتے رہے تھے۔ وہ کامیاب معلم اور لائق ترین استاذ تھے اور طلبا ان کے اسلوبِ تدریس اور طریقِ تفہیم سے مطمئن تھے۔

آگرہ میں ان دنوں عیسائی مبلغوں اور پادریوں کا بڑا زور تھا اور شہر کے ہر اہم مقام میں ان کی تقریروں کا سلسلہ جاری رہتا تھا، جن میں وہ اسلامی تعلیمات کو بالخصوص ہدفِ تنقید ٹھہراتے تھے۔ قرآن پر اعتراض، حدیث پر اعتراض، نبی ﷺ کی ذاتِ گرامی پر اعتراض ان کا وتیرہ بن چکا تھا۔

آگرہ میں اس وقت ایک عیسائی پادری عماد الدین کی بڑی شہرت تھی۔ وہ عربی زبان اور اسلامی کتابوں سے شناسا تھے اور اسلامی احکام و مسائل پر جارحانہ حملے کرنے میں مشہور تھے۔ مقامی پادریوں نے مسلمانوں کو مقابلے کا چیلنج کیا اور مدد کے لیے پنجاب کے پادریوں کو بھی بلا لیا گیا۔ آگرہ کے مشن کالج کے پرنسپل بھی میدان میں اترے اور انھیں مناظرے کے منتظم مقرر کیا گیا...... ان تمام پادریوں سے مناظرے کے لیے مسلمان عالم صرف ایک تھے اور وہ تھے مولانا سید عبدالباری نقوی سہسوانی۔

آگرہ شہر اور اردگرد کے لوگوں کو مناظرے کا پتا چل گیا تھا چنانچہ یوم موعود پر ہندو، مسلمان، عیسائی کثیر تعداد میں اس مقام میں جمع ہو گئے جہاں مناظرے کے انعقاد کا اعلان کیا گیا تھا۔ اب عام لوگوں اور عیسائی حضرات کی طرف سے متفقہ طور پر سب سے پہلے مولانا عبدالباری کو تقریر کی دعوت دی گئی۔ چنانچہ انھوں نے اسلام کی حقانیت، قرآن و حدیث کی صداقت، نبی ﷺ کی نبوت پر ایمان لانے کی فرضیت اور اس کے مقابلے میں دوسرے ادیان کے ابطال اور عیسائیت کی تردید میں دو گھنٹے تقریر کی اور اس موضوع سے متعلق مستحکم دلائل پیش کیے۔ انھوں نے جس احسن طریقے سے اسلام اور دیگر مذاہب کا موازنہ کیا، وہ حاضرین کے لیے نہایت اثر انگیز تھا۔

ان کی تقریر کے اختتام پر پادری حضرات کو اس کے جواب کے لیے دعوت دی گئی، بالخصوص پادری عماد الدین کو جو عربی زبان اور اسلامی کتابوں کے بارے میں معلومات رکھتے تھے، بار بار جواب کے لیے کہا گیا مگر کوئی پادری سٹیج پر نہ آیا۔ خود جلسے کے منتظم مشن کالج کے پرنسپل صاحب نے ان سے جواب کے لیے درخواست کی لیکن سب کی زبانوں پر سکوت کا تالا لگ چکا تھا۔ لوگوں کے انتہائی اصرار پر پادری عماد الدین اٹھے اور فرمایا تقریر اور زبانی مناظرہ فتنہ و فساد کا باعث ہے، اس میں ہم حصہ نہیں لینا چاہتے، البتہ تحریری مناظرہ کیا جا سکتا ہے...... منتظمینِ جلسہ اور خود عیسائیوں کے معززین اور شہر کے سرکردہ حضرات نے پادری عماد الدین کے اس اعلان کو مناظرے سے فرار قرار دیا اور مجلس برخاست ہو گئی۔ حاضرین نے اسے مسلمانوں کی

فتح سے تعبیر کیا...... اس جلسے کی پوری تفصیل ایک رسالے "فتح المبین علی اعداء الدین" (مطبوعہ آگرہ ۱۲۹۴ھ) میں درج ہے۔

اس جلسے کے بعد آگرہ کے کسی پادری اور عیسائی عالم نے مسلمانوں کو مناظرے کا چیلنج نہیں کیا اور ان کی تقریروں کا بازار بھی سرد پڑ گیا۔

سرسید کی تفسیری غلطیاں:

مولانا عبدالباری نقوی وسیع العلم بزرگ تھے اور مطالعہ کتب ان کا اصل مشغلہ تھا۔ سرسید احمد خاں نے اردو میں قرآن مجید کی تفسیر لکھی تو ان کے مطالعہ میں آئی اور اس پر انھوں نے مضمون لکھا جس میں سرسید کی تفسیری غلطیوں کی نشان دہی کی اور سخت الفاظ میں کی۔ یہ ناقدانہ مضمون انھوں نے سرسید کو بھیجا تو سرسید نے اسے لفظ بہ لفظ اپنے رسالے "تہذیب الاخلاق" میں شائع کر دیا۔

اس کے ساتھ ہی مولانا کے عمل و کردار کا ایک اور پہلو دیکھیے۔ جب سرسید محمڈن کالج کے لیے فراہمی زر کے سلسلے میں آگرے گئے تو سب سے پہلے انہی مولانا عبدالباری نقوی کو ملے اور انھیں ساتھ لے کر مولوی عبدالقیوم کے مکان پر گئے جہاں وہ مقیم تھے۔ پھر مولانا ممدوح سرسید کی رفاقت میں آگرہ کے بہت سے لوگوں کے پاس پہنچے اور کالج کے لیے رقم جمع کرنے میں سرسید سے بھرپور تعاون کیا۔

اس کے ساتھ ہی ایک اور پہلو ملاحظہ ہو۔ سرسید نے انھیں کالج میں عربی اور فارسی کا منصب پروفیسری قبول کرنے کے لیے کہا اور اس پر اصرار کیا، لیکن وہ اس پر رضامند نہ ہوئے، صرف اس وجہ سے کہ انھیں ان کے دینی عقائد سے اتفاق نہ تھا اور وہ برملا اس کی تردید کرتے تھے لیکن بایں ہمہ سرسید ہمیشہ ان کے علم و کمال، عزم و ہمت اور فکر و عمل کے مداح رہے۔

مولانا کا ایک تصنیفی کارنامہ:

قیام آگرہ کے زمانے میں مولانا عبدالباری نے "اعلام الاحبار و الاعلام ان الدین عند اللہ الاسلام" کے نام سے ایک ضخیم کتاب تصنیف کی اور طبع کرائی۔ اس کتاب میں انھوں نے اللہ کے نزدیک اصل دین اسلام ہی کو قرار دیا ہے، باقی تمام ادیان کا ابطال کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے بہ دلائل ثابت فرمایا ہے کہ نجات کا اصل ذریعہ اسلام ہے اور اس کے اوامر و نواہی پر عمل کرنا ضروری ہے۔ جو لوگ اسے مدار عمل نہیں ٹھہراتے، وہ اخروی نجات کے مستحق نہیں۔

سلطانِ ترکی کی امداد:

۱۸۷۷ء میں جب ترکی اور روس کی جنگ ہوئی اس وقت مولانا عبدالباری آگرہ کے سرکاری مدرسے میں عربی اور فارسی کے استاذ تھے۔ انھوں نے سلطان ترکی کی حمایت کا اعلان کیا۔ اس کے لیے آگرہ شہر اور اس کے مضافات میں تقریریں کیں اور لوگوں کو ترکوں کی مالی امداد کے لیے ترغیب دی۔ ترکوں کی حمایت کی غرض سے مجاہد بھی بھیجے جنھوں نے روس کے خلاف جنگ میں حصہ لیا۔ مختلف اوقات میں انھوں نے اچھی خاصی رقم سلطان ترکی کو بھیجی۔ اس سلسلے میں اپنے وطن سہسوان بھی گئے اور ہر ممکن طریقے سے ترکوں کی امداد کی۔ چوں کہ یہ وقت طلب کام تھا، اس لیے مدرسے کی ملازمت سے استعفا دے دیا اور اس مہم کو اپنے عہد کا اصل مسئلہ قرار دے لیا۔ وہ باہمت بزرگ تھے اور اسلام اور مسلمانوں کی مدد کے لیے ہر آن کمربستہ رہتے تھے۔ مسلمانوں کو جہاں بھی کوئی تکلیف پہنچتی وہ ان کی مدد کے لیے میدان میں نکل آتے۔

مراد آباد کے ہندو عالم سے مناظرہ:

مولانا ممدوح آگرہ کی ملازمت سے استعفا دے کر اپنے آبائی وطن سہسوان آئے۔ کچھ عرصہ اس نواح میں کتاب و سنت کی تبلیغ و تدریس میں گزارا۔ پھر صوبہ یوپی کے شہر مراد آباد تشریف لے گئے اور وہاں کے رئیس قاضی محمد عباس کے مہمان ہوئے۔ وہاں ایک ہندو اہل علم اندرمن مراد آبادی سے گفتگو ہوئی تو معاملہ مناظرے تک جا پہنچا۔ اندرمن کا دعویٰ تھا کہ اس نے ایک کتاب تحفۃ الاسلام تصنیف کی ہے۔ مولانا کا اندرمن مراد آبادی سے مناظرہ ہوا اور مجمع عام میں شکست دی۔ یہ بھی ثابت کیا کہ تحفۃ الاسلام اس کی تصنیف نہیں ہے۔ اس علاقے میں اندرمن کی بڑی شہرت تھی۔ اس مناظرے سے اس کے علم کا طلسم ٹوٹ گیا اور اس کے خوش گوار نتائج نکلے۔

لکھنؤ کا سفر:

مراد آباد سے لکھنؤ تشریف لے گئے۔ مولانا عبدالحی فرنگی محلی سے ان کے دوستانہ مراسم تھے، ان سے ملاقات کی اور انھی کے ہاں قیام فرمایا۔ لکھنؤ میں اتفاقاً ان کی ملاقات منشی نول کشور سے ہوئی، جن کا وہاں بہت بڑا مطبع تھا اور دینیات کی بہ کثرت کتابیں اس مطبع میں چھپ رہی تھیں۔ منشی نول کشور نے ان سے تصحیح کتب کی نگرانی قبول کرنے کی درخواست کی۔ وہ ان کی فضیلت علمی سے باخبر تھا، اس لیے مصر ہوا کہ یہ اہم ذمہ داری لازماً قبول فرمائی جائے۔ مولانا نے اس کی درخواست قبول تو فرمالی لیکن وہ اس کی ملازمت کرنا نہیں چاہتے تھے۔ تاہم کچھ عرصہ یہ خدمت انجام دیتے رہے، پھر اس سے علاحدگی اختیار کر لی۔ لکھنؤ سے ریاست ٹونک اور حیدر آباد کے سفر پر روانہ ہوئے۔ متعدد مقامات پر تقریریں کیں اور بہت سے اہل علم سے ملاقات

کے مواقع میسر آئے۔ ان کی تقریروں سے متاثر ہو کر بعض غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا، جن میں ایک انگریز بھی شامل تھا، جس کا نام جوزف تھا اور وہ لکھنؤ میں ان کے ہاتھ پر دائرۂ اسلام میں داخل ہوا تھا۔ اسے انھوں نے نواب صدیق حسن خاں کے پاس بھوپال بھیج دیا تھا۔ نواب صاحب نے اسے کسی اچھے منصب پر فائز کر دیا تھا۔

بے شمار لوگوں نے ان کی تقریریں سن کر بدعات و محدثات سے توبہ کی اور راہِ مستقیم پر گام زن ہوئے۔ مولانا عبدالباری نقوی بے شک جلیل القدر عالم اور اپنے زمانے کے معروف مقرر اور خطیب تھے۔

بھوپال میں ورود اور قیام:

۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) میں مولانا عبدالباری نقوی کا بھوپال میں ورود ہوا اور پھر نواب صدیق حسن خاں مرحوم و مغفور کی فرمائش پر اہل و عیال سمیت وہیں مستقل طور سے اقامت فرما ہو گئے۔ امور دینی میں وہ نواب صاحب کے مشیر و ندیم اور معتمد علیہ تھے۔ بھوپال کے مجمع علماء میں انھیں بے حد قدر و منزلت حاصل تھی۔ ہر معاملے میں نواب صاحب کو صحیح مشورہ دیتے اور جرأت و دلیری سے بات کرتے۔ بہت سے حاجت مند ان کے پاس آتے اور وہ نواب صاحب سے سفارش کر کے ان کی اعانت کا باعث بنتے۔ اسی طرح بعض لائق علمائے کرام ان سے رابطہ کرتے تو وہ ان کی علمی قابلیت کے مطابق ریاست کے کسی نہ کسی منصب پر انھیں متعین کرنے کی سعی فرماتے۔ ان کی وجہ سے بہت لوگوں کو فائدہ پہنچا۔

حج بیت اللہ:

۱۳۰۲ھ میں مولانا عبدالباری نقوی نے حج بیت اللہ کا عزم کیا۔ ریاست کے متعلقہ محکمے سے رخصت لی۔ اہل و عیال کو وہیں چھوڑا اور حج کے لیے روانہ ہو گئے۔ مکہ معظّمہ پہنچے اور عمرہ کیا۔ اس بلدۂ طیبہ کے متعدد علمائے کرام سے ملاقات کی۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے حلقۂ درس میں بھی پہنچے۔ حاجی صاحب اس وقت اپنے متعلقین کی ایک جماعت کو تصوف کی کسی کتاب کا درس دے رہے تھے۔ مولانا نے ان کے کسی فرمان پر اعتراض کیا تو حاجی صاحب برہم ہو گئے اور محدثین کے بارے میں نامناسب الفاظ ارشاد فرمائے۔ اس کا مولانا نے جواب دیا تو بات کچھ آگے بڑھ گئی۔ مولانا اپنے رفقاء سمیت وہاں سے چلے گئے۔ لیکن حاجی صاحب اور ان کے حلقے کے لوگوں نے شریف مکہ کے پاس شکایت کر دی کہ یہاں ایک وہابی ہندوستان سے آیا ہے جو فتنہ پھیلا رہا ہے۔

اس شکایت کی بنا پر ان کے بارے میں تحقیق ہوئی اور شریف مکہ کے دربار میں انھیں طلب کیا گیا۔ ان

کے عقائد کے متعلق دس بارہ تحریری سوال کیے گئے۔ انھوں نے قرآن و حدیث کے حوالے سے ان کے جواب دیے۔ شریف مکہ اور وہاں کے علما نے ان کے جواب کو صحیح تسلیم کیا اور معاملہ ختم ہو گیا۔ شریف مکہ نے ان کی بے حد تعظیم کی۔ اس کے مشیر اصحابِ علم نے بھی ان سے تکریم کا برتاؤ کیا۔

تعمیر مسجد کے لیے زکوٰۃ کا روپیہ:

مولانا عبدالباری نقوی کے قیام بھوپال کے زمانے میں سہوان میں جامع مسجد کی تعمیر ہو رہی تھی۔ مولانا نے نواب صاحب سے مسجد کے لیے تعاون کے لیے کہا تو انھوں نے جواب دیا کہ میرے پاس صرف زکوٰۃ کا روپیہ ہے اور تعمیر مسجد پر وہ روپیہ خرچ کرنا جائز نہیں۔ بعض علمانے نواب صاحب کی موافقت کی، لیکن مولانا عبدالباری نقوی نے فرمایا کہ زکوٰۃ کی رقم تعمیر مسجد پر خرچ ہو سکتی ہے۔ یہ بھی فی سبیل اللہ میں داخل ہے۔ مولانا نے اپنا موقف بہ دلائل بیان کیا اور تائید میں بعض صحابہ کرام اور سلف کے اقوال پیش کیے، تو مسئلہ واضح ہو گیا اور نواب صاحب نے ان سے اتفاق کیا اور دو ہزار روپے مسجد کے لیے عطا فرمائے۔

جسمانی حالت اور عادات واطوار:

مولانا عبدالباری نقوی کے حالات میں مرقوم ہے کہ وہ جسمانی اعتبار سے جفاکش اور صحت مند تھے۔ چست و توانا اور مستعد۔ روزانہ ورزش کرنا اور دوڑ لگانا ان کا معمول تھا۔ قریب کے سفر میں سواری کے بجائے پیدل چلنے کو ترجیح دیتے۔ کم کھاتے اور سادہ غذا استعمال کرتے، رحم دل، غریبوں کے ہم درد اور نرم خو تھے۔ متواضع، خوش اخلاق اور مہمان نواز۔ علماء کے قدر دان اور ان کی رفاقت کے خواہاں۔ سخی اور حوصلہ مند۔ مستحق کا خیال رکھتے اور اس پر خرچ کرنا ضروری سمجھتے۔ بہترین عادات واطوار کے مالک۔

حیات العلماء۔ کے مصنف شہیر مولانا سید عبدالباقی نقوی سہوانی (ان کے برادر خرد) نے انھیں "اشجع المناظرین" اور "برھان المتکلمین" لکھا ہے۔

وفات:

۱۳۰۳ھ کے ماہ ذیقعدہ کے آخر میں تپ محرقہ میں مبتلا ہوئے۔ تیرہ دن صاحب فراش رہے۔ ۹ ذی الحجہ ۱۳۰۳ھ کو جمعرات کے روز بعد نمازِ مغرب وفات پا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ عیسوی حساب سے یہ ۸ ستمبر ۱۸۸٦ء بنتا ہے۔ بھوپال میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے۔ نواب صدیق حسن خاں، علمائے بھوپال اور وہاں کے عوام و خواص نے ان کی وفات پر سخت حزن و ملال کا اظہار کیا۔ ریاست کی طرف سے ان کے اہل وعیال کے لیے معقول ماہانہ وظیفہ مقرر کیا گیا۔

حافظ سید محمد نے فدخل الجنۃ بلا حساب (١٣٠٣ھ) تاریخ نکالی۔ ان کے دوست سید ذوالفقار احمد نے "امیر المتقین مولانا سید عبدالباری" (١٣٠٣ھ) تاریخ کہی۔ سید اعجاز احمد نے قرآن کی آیت ﴿وَ حُلُّوْا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ﴾ سے (١٣٠٣ھ) تاریخ متخرج کی۔ ❶

❶ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: حیات العلماء از مولانا سید عبدالباقی نقوی سہسوانی، ص ٨٠ تا ٩٠ نیز دیکھیے: نزہۃ الخواطر، ج ٨، ص ٢٢٩-٢٣٠۔ تراجم علماے حدیث ہند ص ٢٤٣، ٢٤٤۔

سید امیر احمد سہسوانی

(وفات ۱۸۸۹ء)

ہندوستان کے صوبہ یوپی کے ضلع بدایوں میں سہسوان ایک مشہور قصبہ ہے، جس میں بے شمار علما وصلحا پیدا ہوئے۔ ان حضرات ذی شان کے حالات میں مولانا سید محمد عبدالباقی سہسوانی نے ''الیاقوت والرجان فی ذکر علماءِ سہسوان'' کے نام سے کتاب لکھی جو ''حیات العلماء'' کے نام سے معروف ہے۔ یہ کتاب ۱۹۲۲ء (۱۳۴۰ھ) میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ زیبِ عنوان سید امیر احمد سہسوانی کا تذکرہ اسی کتاب سے مستفاد ہے۔

سید امیر احمد سہسوانی کا سالِ ولادت ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۶ء) ہے۔ یہ سید امیر حسن سہسوانی کے فرزند گرامی تھے۔ کم عمری ہی میں والد مکرم کے ساتھ دہلی اور میرٹھ میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اس دور کے علماء میں جس طرح ان کے والد جودت ذہن اور قوت حافظہ میں عدیم المثال تھے، اسی طرح یہ بھی تیزیٔ فہم اور جولانیٔ طبع میں اپنے ہم عصروں اور ہم جماعتوں میں بے نظیر تھے۔ اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْہِ کا صحیح ترین نمونہ۔ حصولِ علم کے لیے مختلف اوقات میں دہلی، خورجہ، آگرہ، لکھنؤ، بریلی، بدایوں، آنولہ وغیرہ مقامات میں قیام رہا۔

صرف ونحو، فلسفہ ومنطق، ادبیات عربی وغیرہم علوم کی کتابیں نہایت محنت سے پڑھیں۔ کتب حدیث کی تکمیل کے لیے حضرت سید میاں نذیر حسین دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے سندِ حدیث لی۔ حضرت میاں صاحب ان پر انتہائی شفقت فرماتے تھے۔

بحث ومناظرہ کا بے حد شوق تھا۔ چوں کہ معقول ومنقول میں مہارت رکھتے تھے اور حاضر جواب بھی تھے، اس لیے عام طور سے آغازِ گفتگو ہی میں حریف پر قابو پا لیتے۔ مولانا محمد بشیر سہسوانی اس عہد کے ممتاز عالم اور نامور مناظر تھے، ان کے ہم وطن بھی تھے۔ سید امیر احمد سہسوانی بعض مسائل میں ان کے مقابلے میں بھی اتر آتے تھے۔

۱۸۷۵ء میں ہندوستان کی انگریزی حکومت نے عربی ورنیکولر مدارس جاری کیے۔ آگرہ میں بھی اس قسم کا مدرسہ جاری تھا۔ اس میں سید امیر احمد تین سال اول مدرس کی حیثیت سے فرائض تدریس سرانجام دیتے رہے۔ وہاں سید عبدالباقی سہسوانی نے ان سے استفادہ کیا۔ سید عبدالباقی کے بڑے بھائی سید عبدالباری

ادب اور ریاضی کے مدرس اعلیٰ تھے۔ مولانا محمد بشیر سہسوانی اس وقت وہاں کے سینٹ جونس کالج میں عربی اور فارسی کے پروفیسر تھے۔ بسا اوقات کسی مسئلے میں سید امیر احمد کی مولانا محمد بشیر سے بحث شروع ہو جاتی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بحث میں تیزی آ جاتی اور معاملہ باہمی خفگی پر پہنچ جاتا۔ پھر سید عبدالباری درمیان میں پڑتے اور دونوں طرف سے خفگی کے آثار ختم ہو جاتے۔

ایک مرتبہ سید امیر احمد بہ تقریب نکاح خیر آباد گئے۔ مولانا فضل حق خیر آبادی کے صاحب زادے مولانا عبدالحق خیر آبادی اپنے ممتاز شاگردوں کے ساتھ ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ مختلف مسائل پر گفتگو ہوئی اور مولانا خیر آبادی کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہا۔ ایک مرتبہ اثنائے کلام میں مولانا عبدالحق خیر آبادی نے اپنے والد کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی پر تنقید کرنا شروع کر دی۔ سید امیر احمد کے لیے یہ نہایت تکلیف دہ بات تھی۔ اس سے قبل مولانا فضل حق نے مولانا شہید کے خلاف ایک کتاب لکھی تھی۔ سید صاحب نے اس کی تردید میں ''نقض الاباطیل فی الذب عن الشیخ اسماعیل'' کے نام سے کتاب لکھی۔ یہ کتاب انھوں نے بعض ذمہ دار حضرات کے توسط سے مولانا عبدالحق کی خدمت میں بھیجی لیکن وہ اس کا کوئی جواب نہ دے سکے۔

بعد ازاں سید صاحب ممدوح نے مولانا فضل حق خیر آبادی کی درسی کتاب ہدیہ سعیدیہ پر جو فلسفے کے موضوع سے تعلق رکھتی ہے، دس اعتراضات کیے اور اس کتاب کا نام ''تلک عشرۃ کاملۃ'' رکھا۔ یہ منطقیانہ اور فلسفیانہ انداز کے اعتراضات تھے۔ لیکن مولانا عبدالحق خیر آبادی یا کسی طرف سے اس کا بھی کوئی جواب نہ آیا۔

اس کے بعد ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ء) میں مسئلہ امکان و امتناع نظیر کے موضوع پر قیام بدایوں کے زمانے میں مولانا عبدالقادر (بن مولانا محمد فضل رسول بدایونی) کے ساتھ شہر سے کچھ فاصلے پر محلہ شیخوپور میں سید امیر احمد کا مناظرہ ہوا۔ مناظرے کا اہتمام شیخ انتظام الدین رئیس شہر نے کیا تھا۔ سید امیر احمد چاہتے تھے کہ مناظرہ تقریری کیا جائے، لیکن مولانا عبدالقادر بدایونی اس پر رضا مند نہ ہوئے۔ پھر ان کی خواہش کے مطابق تحریری مناظرہ ہوا۔ تحریری صورت میں بھی بدایونی صاحب کے جواب بڑے انتظار کے بعد آتے تھے، وہ بھی بار بار طلب کرنے پر......!

یہ بھی عجیب بات ہے کہ مولانا عبدالقادر بدایونی بہت سی کتابیں لے کر آئے تھے اور ان میں حوالے تلاش کرنے والے کتنے ہی لوگ ان کے دائیں بائیں بیٹھے تھے لیکن سید امیر احمد کے پاس کوئی کتاب نہ تھی۔ وہ سب سوالوں کے زبانی جواب دیتے تھے اور ہر جواب باحوالہ ہوتا تھا۔ بلا تاخیر صفحے اور سطر تک بتاتے جاتے تھے۔ حاضرین مجلس سب کچھ سامنے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ شہر اور اس کے مضافات کے بے شمار

لوگ موجود تھے جو بے تابی کے ساتھ مناظرے کے نتیجے کا انتظار کر رہے تھے۔

کئی دن مناظرہ ہوتا رہا۔ پھر یہ ہوا کہ کسی قسم کا اعلان کیے اور کسی کو بتائے بغیر شدید گرمی میں دوپہر کے وقت مولانا عبدالقادر بدایونی کتابیں اٹھا کر پا پیادہ جلسہ گاہ سے نکلے اور اپنے مکان پر تشریف لے گئے۔ اس طرح مناظرہ اختتام کو پہنچا...... اس مناظرے کی تفصیل سید محمد نذیر سہسوانی نے ''مناظرہ احمدیہ'' کے نام سے شائع کی۔

سید امیر احمد نہایت ذہین تھے۔ عربی اور فارسی کی انشا نگاری میں مہارت کا یہ عالم تھا کہ دو کاتبوں کو سامنے بٹھا لیتے، ایک کو زبانی عربی کی اور دوسرے کو بے تکلفی سے فارسی کی عبارتیں لکھاتے جاتے جو مختلف مضامین پر مشتمل ہوتیں۔ نہ کسی عبارت کا ربط ٹوٹتا اور نہ کہیں تسلسل میں فرق پڑتا۔

تدریس کا بھی یہی عالم تھا۔ ان کے ہم عصر علما اور طلبا دیکھتے تھے کہ قرآن کی تفسیر میں بھی کامل مہارت ہے، کتب حدیث میں بھی پورا ادراک ہے، فقہ و کلام میں بھی یگانہ ہیں، عربی ادبیات بھی ازبر ہیں اور منطق و فلسفہ میں بھی درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے ہیں۔ تمام موضوعات کی چھوٹی بڑی سب کتابوں پر عبور حاصل ہے اور باقاعدگی سے طلبا کو پڑھاتے ہیں۔ پھر یہ خوبی بھی ان میں پائی جاتی تھی کہ فلسفہ پڑھاتے وقت حکمائے یونان اور حکمائے اسلام کے اختلاف کی وضاحت بھی کرتے جاتے تھے۔ اسی طرح مختلف مسائل کی تعبیر میں محدثین کے اختلاف سے بھی طلبا کو مطلع فرماتے تھے۔

ان سے اخذِ فیض کرنے والوں کی تعداد بتانا ممکن نہیں۔ البتہ ان کے مشہور تلامذہ میں ایک بزرگ مولوی محمد اسحاق خاں بریلوی تھے جو طلبِ علم کے بعد دہلی میں مقیم ہوئے۔ ایک مولوی عبدالکریم پنجابی جنھوں نے سندِ فراغ لے کر گنج مراد آباد میں سکونت اختیار کی۔ مولوی مشیت اللہ اترولی بھی ان کے شاگرد تھے جو ریاست رام پور کے مشہور علما میں سے تھے۔

ان کے سلسلۂ تصانیف کا عجیب معاملہ تھا، ایک کتاب ابھی مکمل نہیں ہوئی کہ کسی فوری پیش آنے والے حالات و مسائل سے متاثر ہو کر دوسری شروع کر دی۔ اس طرح تصنیف کا معاملہ محدود رہا۔

اس زمانے میں مفتی سعد اللہ رام پوری نے نماز کے بارے میں ایک فتویٰ جاری کیا تھا، وہ طبع ہوا اور سید امیر احمد کی نظروں سے گزرا تو اس کا ''ذوالحجلہ فی حکم الصلوٰۃ علی العجلہ'' کے نام سے جواب لکھا۔ یہ جواب طبع ہوا، مگر تکمیل کو نہ پہنچا۔

۱۳۰۲ھ میں وہ سفرِ حجاز پر روانہ ہوئے اور فریضۂ حج ادا کیا۔ واپسی پر ریاست بھوپال آئے اور نواب صدیق حسن خاں سے ملاقات کی۔ وہاں کے علمائے کرام سے بھی ملے۔ ان لوگوں نے ان سے نہایت احترام

کا برتاؤ کیا۔

بھوپال میں اس وقت ایک انگریز جج تھا جو عربی میں مہارت رکھتا تھا۔ وہ جج سید امیر احمد کا شاگرد تھا اور ان کی بے حد تعظیم کرتا تھا۔

سید ممدوح کی قابلیت اور علم و کمال کی وجہ سے انھیں حکومت کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب ملا تھا...... ان کے ساتھ جن حضرات کو یہ خطاب دیا گیا وہ تھے مولانا عبدالحق خیر آبادی، مولانا محمد نعیم فرنگی محلی لکھنوی اور مولانا فضل حق خیر آبادی کے شاگرد شاہ عبدالحق کان پوری۔ اپنے دور کے یہ رفیع المرتبت علمائے کرام تھے۔

صاحب نزہۃ الخواطر حکیم عبدالحی حسنی لکھنوی نے سید امیر احمد سہسوانی کی بڑی تعریف کی ہے۔ ان کے متعلق انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، ان میں سے چند الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

''وہ عربی ادبیات اور لغت میں مرتبۂ بلند پر فائز تھے۔ علومِ عقلیہ ونقلیہ میں مہارت کا یہ حال تھا کہ کسی کو اپنا ہم سر قرار نہ دیتے تھے۔ مناظرہ و مباحثہ میں نہایت تیز تھے۔ کتاب و سنت کی نصرت و اشاعت میں ہر آن پیش پیش رہتے اور عقیدۂ سلف پر سختی سے پابند تھے۔''

شمس العلماء کا خطاب ملنے سے صرف ایک سال بعد بخار اور اسہال کے مرض میں مبتلا ہوئے اور ۱۳۰۶ھ (۱۸۸۹ء) کو بدایوں میں بہ عمر پنتالیس سال وفات پا گئے۔

علامہ عزیز نے مادہ سالِ تاریخ عربی قطعۂ فارسی میں موزوں کیا۔

مولوی سید امیر احمد   کرد آہنگ روضۂ جنت
سال تاریخ زو رقم معجز   دَخَلُوا الْخُلْد زہے رحلت

ان کا بہت بڑا کتب خانہ تھا جو ضائع ہو گیا۔ [1]

[1] حیات العلماء: ص ۷۵ تا ۸۰۔ نزہۃ الخواطر: ج ۸ ص ۸۲۔ تراجم علمائے حدیث ہند: ص ۲۴۵، ۲۴۶۔

سیدہ لحاظ النساء

(تاریخ وفات ۱۶ ستمبر ۱۸۹۱ء)

اس عالمہ و فاضلہ خاتون کا وطنی تعلق سہسوان (ضلع بدایوں، صوبہ یوپی ہندوستان سے) تھا، جہاں بے شمار علما و صلحا پیدا ہوئے اور انھوں نے بے حد دینی خدمات سرانجام دیں۔ ان حضرات میں سے بعض حضرات کا تذکرہ میں نے اپنی کتابوں دبستان حدیث میں بھی کیا ہے اور گلستان حدیث میں بھی۔ زیر مطالعہ کتاب چمنستان حدیث میں بھی وہاں کے متعدد حضرات کے تذکار ضبطِ تحریر میں لائے گئے ہیں۔

سیدہ لحاظ النساء کے نانا کا اسم گرامی سید نیاز احمد تھا جنھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں درجہ شہادت پایا اور والد کا نام نامی منشی صابر حسین صبا صدیقی تھا۔ لحاظ النسا شوال ۱۲۹۰ھ (نومبر ۱۸۷۴ء) میں رام پور میں پیدا ہوئیں۔ ۱۳۰۱ھ (۱۸۸۴ء) میں والدہ محترمہ کے ساتھ سہسوان سے بھوپال گئیں۔ ان کے والد محترم اور متعدد دیگر متعلقین و اقربا بھوپال ہی میں تھے۔

بھوپال میں انھوں نے اپنے بعض بزرگ اہل علم سے اردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ عربی صرف ونحو اور ترجمہ قرآن مجید بھی پڑھا۔ مولانا محمد بشیر محدث سہسوانی اس زمانے میں وہیں تھے، ان سے بلوغ المرام سے لے کر صحاح وسنن کی بعض کتابوں کا درس لیا۔ شیخ حسین یمنی بھی ان دنوں وہیں تشریف فرما تھے، ان سے بعض کتب حدیث میں استفادہ کیا اور سند واجازہ سے مفتخر ہوئیں۔ حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی سے بھی بہ سلسلہ حدیث اخذِ فیض کیا اور مستحقِ سند و اجازہ قرار پائیں۔ اس طرح ان کے پاس مذکورہ بالا ان تین رفیع المنزلت علمائے حدیث کی اسناد موجود تھیں۔

وہ نہایت ذہین، سریع الفہم اور جید الحفظ خاتون تھیں۔ سیکڑوں احادیث انھیں زبانی یاد تھیں۔ ان کا شب و روز کا مشغلہ مطالعہ کتبِ تفسیر و حدیث تھا۔ اس کے علاوہ انھیں کسی کام سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ تہجد گزار اور اعمال خیر کی پابند تھیں۔ اللہ نے انھیں بہت سے اوصاف سے متصف فرمایا تھا۔

ان کے نکاح کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی۔ اس کے لیے وہ اپنی والدہ کے ہمراہ بھوپال سے سہسوان کے لیے روانہ ہوئیں۔ اثنائے راہ میں اپنے اعزہ کے ہاں مراد آباد میں قیام کیا۔ وہیں یکا یک مرضِ ہیضہ میں مبتلا ہوئیں اور ۱۲ صفر ۱۳۰۹ھ (۱۶ ستمبر ۱۸۹۱ء) کو وفات پا گئیں۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔ ❶

❶ حیات العلماء: ص ۱۴۴-۱۴۵۔

حافظ محمد لکھوی

(وفات ۲۷ اگست ۱۸۹۳ء)

حافظ محمد لکھوی ۱۲۲۱ھ (۱۷۹۷ء) کو بمقام لکھو کے پیدا ہوئے جو مشرقی پنجاب کے ضلع فیروز پور کا مشہور گاؤں تھا۔ والد کا نام نامی حافظ بارک اللہ تھا۔ تفسیر و حدیث، فقہ و اصول، منطق و فلسفہ، صرف و نحو، بیان و معانی، عربی ادبیات وغیرہ تمام علوم مروجہ کی تحصیل اپنے والد مکرم حافظ بارک اللہ لکھوی سے کی۔ انہی کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوئے۔ فن قرأت و تجوید بھی انہی سے سیکھا۔ والد سے حصولِ علم کے بعد لدھیانہ گئے۔ وہاں کے علما سے بعض کتابیں پڑھیں۔

لدھیانہ سے واپس آئے تو عازم دہلی ہوئے۔ وہاں شاہ عبدالغنی مجددی، مولانا احمد علی سہارن پوری اور میر محبوب علی کے حلقہ ہائے درس میں رہے اور ان بزرگانِ ذی شان سے علوم حدیث اور بعض دیگر علوم میں استفادہ کیا۔

دہلی میں حضرت میاں سید نذیر حسین کے حضور بھی زانوئے شاگردی تہہ کیے اور ان سے بہت کچھ حاصل کیا۔ مولانا محمد علی لکھوی کے بقول حافظ صاحب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے قبل پچاس برس کی عمر میں دہلی جا کر حضرت میاں صاحب کے دائرۂ تلامذہ میں شامل ہوئے اور ان سے سندِ حدیث لی۔ ❶

ذہانت اور قوت حفظ:

ذہانت اور قوتِ حفظ میں حافظ محمد لکھوی کا مقام بہت بلند تھا۔ جو کتاب ایک مرتبہ نظر سے گزر جاتی، اس کے تمام مشمولات لوحِ ذہن پر مرتسم ہو جاتے۔ جب ضرورت پڑتی پوری تفصیل سے کتاب کے صفحے اور سطر تک بتا دیتے۔ حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی ان کی یادداشت اور قوتِ حفظ سے بہت متاثر تھے۔ فرمایا کرتے میرے حلقۂ درس میں ایک پنجابی طالب علم حافظ محمد آیا ہے جو میرے منھ سے بات نکلنے سے پہلے ہی سمجھ لیتا ہے کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔

انھیں مختلف فنون کی کتابوں کے صفحوں کے صفحے زبانی یاد تھے اور ضرورت کے وقت انھیں مسلسل پڑھتے جاتے۔ حضرت میاں صاحب ازراہِ تفنن طبع انھیں مہتمم کتب خانہ کہا کرتے تھے۔ ❷

❶ ہفت روزہ "اہل حدیث" (امرتسر) ۱۸ مارچ ۱۹۲۱ء ❷ پنجاب کا عظیم مصلح (از مولانا معین الدین لکھوی)

یہاں یہ بھی عرض کر دیں کہ حضرت میاں صاحب کا مطالعہ ان سے بھی وسیع تھا اور ان کی یادداشت کا دائرہ بہت پھیلا ہوا تھا۔ اس کی شہادت اس واقعہ سے ملتی ہے کہ ایک مرتبہ دورانِ درس حافظ صاحب نے کسی فقہی مسئلے سے متعلق چودہ کتابوں کا حوالہ دیا، لیکن میاں صاحب نے اسی بحث پر چالیس کتابوں کے نام گنوا دیے۔

مولانا معین الدین لکھوی، حضرت حافظ محمد لکھوی کی صاحب زادیوں کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں کہ آخرِ عمر میں جب حافظ صاحب تفسیر محمدی لکھا کرتے تھے تو کتنی ہی کتابیں ان کے سامنے کھلی ہوتی تھیں۔ وہ بعض اوقات لکھتے لکھتے ان میں سے کسی کتاب پر نظر ڈالتے، پھر لکھتے چلے جاتے۔ انھیں مسودے پر نظر ثانی کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔

مولانا محمد علی لکھوی ان کی کثرتِ معلومات اور متعلقہ مضمون پر احتضار کا حوالہ دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''قصور کے سجادہ نشینوں کا حافظ بارک اللہ صاحب سے "یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئًا للہ" مسئلے پر مباحثہ ہوا تو حافظ محمد صاحب مرحوم نے اس کی حرمت پر کتب فقہ کے حوالہ جات از بر سنائے۔ ان کے صفحات کے صفحات انھیں زبانی یاد تھے۔'' ❶

والدین کی اطاعت:

قرآن و حدیث میں والدین کی خدمت اور فرماں برداری کا خاص طور سے حکم دیا گیا ہے۔ حافظ محمد لکھوی اس کا بہ درجہ غایت التزام کرتے۔ وہ اپنے والد کو صاحبِ کرامات قرار دیتے تھے اور وہ جو کچھ ارشاد فرماتے اس پر عمل کرتے۔ ان کی کوئی بات بہ ظاہر ان کے نزدیک قابلِ عمل نہ بھی ہوتی تو اس پر بھی عمل پیرا ہوتے اور خیال فرماتے کہ میرے والد چوں کہ صاحبِ کرامات ہیں، اس لیے ان کی بات میں ضرور کوئی حکمت پنہاں ہوگی۔ اس قسم کا ایک واقعہ مولانا عبدالرحمٰن بن حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کے حوالے سے مولانا محمد ابراہیم خلیل مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ''ایک مرتبہ حافظ صاحب نے حصولِ غلہ کے لیے کچھ جوار کی فصل کاشت کی۔ جب وہ پکنے کے قریب ہوئی تو حافظ بارک اللہ نے اپنے بیٹے حافظ محمد کو بلا کر حکم دیا کہ جوار کی فصل کاٹ دو۔ اس وقت اس کی پختگی میں چند روز باقی تھے۔ لیکن حافظ محمد صاحب نے باپ کے حکم کی تعمیل کی اور اسے کاٹ دیا۔ حافظ صاحب فرماتے ہیں، میں فصل کاٹ بھی رہا تھا اور سوچ بھی رہا تھا کہ والد محترم نے اسے کاٹنے کا حکم کیوں دیا جب کہ یہ ابھی تک پختہ نہیں ہوئی۔ پھر خیال کیا کہ اس میں

❶ اخبار اہل حدیث (امرتسر) ۱۸ مارچ ۱۹۲۱ء۔

ضرور کوئی حکمت ہوگی، جس کا مجھے علم نہیں۔ فرماتے ہیں اس سے صرف تین دن بعد ایسا سخت طوفان آیا کہ سب کی فصلیں تباہ ہوگئیں اور وہ فصل سے محروم ہوگئے۔ صرف ہماری جوار محفوظ رہی۔ تب مجھے ان کے اس ارشاد کی حکمت کا پتا چلا۔'' [1]

حضرت حافظ محمد لکھوی اپنے والد مکرم کا اسم گرامی ہر مقام پر بے حد احترام کے الفاظ میں لکھتے ہیں۔ کہیں تحریر فرماتے ہیں: ''محمد بن مخدومی وافتخاری، عمدۃ الاتقیاء، زبدۃ الاصفیاء، صفوۃ الفقہاء مولوی محمد بارک اللہ۔''

کہیں رقم کرتے ہیں: ''جناب مولانا مخدومی ووالدی واستاذی......''

ایک جگہ لکھتے ہیں: ''حافظ محمد خلف زبدۃ فقہاءِ محققین وعمدۃ اتقیاءِ متشرعین حضرت مولانا مولوی محمد بارک اللہ صاحب۔''

ایک جگہ یہ الفاظ مرقوم ہیں: ''محمد بن مقبول بارگاہِ الٰہ مخدومی ومولائی بارک اللہ عفا اللہ عنہما۔''

اونٹنی سے متعلق ایک واقعہ:

مولانا محمد ابراہیم خلیل فیروز پوری اپنے تایا مولوی صوفی محمد فیروز پوری کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ حافظ محمد لکھوی اونٹنی پر سوار کہیں جا رہے تھے کہ راستے میں نماز کا وقت ہوگیا۔ قریب ہی قبرستان تھا، وہاں حافظ صاحب نے وضو کیا اور اونٹنی قبرستان میں چھوڑ دی جو درختوں کے پتے وغیرہ کھانے لگی۔ خود حافظ صاحب نماز میں مشغول ہوگئے۔

قبرستان کے مجاوروں نے حافظ صاحب سے کہا کہ قبرستان میں اونٹنی کو اس طرح کھلی نہ چھوڑیں، یہاں قبر والا بابا اسے مار دے گا۔ حافظ صاحب نے ان کی بات کی طرف توجہ نہیں کی اور نماز کی نیت باندھ لی۔ نماز سے فارغ ہوئے تو دیکھا کہ اونٹنی واقعی زمین پر بے ہوش گری پڑی ہے اور مجاور ہنس رہے ہیں۔ انھوں نے حافظ صاحب سے کہا ہم نے آپ سے کہا تھا کہ اونٹنی قبرستان میں نہ چھوڑیں، اسے قبر والا بابا مار ڈالے گا۔ آپ نے ہماری بات نہیں مانی اور اونٹنی مر گئی۔

حافظ صاحب اونٹنی کے پاس آئے تو دیکھا کہ اس پر شیطانی اثر ہے۔ انھوں نے پاؤں سے جوتی اتاری اور اونٹنی کو مارنا شروع کر دیا۔ وہ اسے جوتے بھی مار رہے ہیں اور ساتھ ہی ''لا حول و لا قوۃ الا باللہ العلی العظیم'' بھی پڑھ رہے ہیں۔ چار پانچ جوتے مارے ہوں گے کہ شیطان بھاگ گیا اور اونٹنی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اب مجاور حیران کہ یہ کیا ہوگیا۔ بولے: لکھوی حافظ صاحب بہت بڑے بزرگ ہیں جنھوں نے مری

[1] الفیوض المحمدیہ: ص ۷۶.

ہوئی اونٹنی زندہ کر دی ہے۔

اساتذہ کے نزدیک قدر و منزلت:

حضرت حافظ محمد لکھوی کے اساتذہ کرام بھی ان کی بے حد قدر کرتے تھے۔ اس کی وجہ ان کی وسعتِ مطالعہ، قرآن و حدیث میں مہارت، بے پناہ ذہانت اور تقویٰ و صالحیت تھی۔

حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کا دہلی میں بہت مشہور مدرسہ تھا جس میں ہزاروں علما و طلبا نے تحصیل علم کی۔ حضرت حافظ محمد لکھوی بھی ایک سال وہاں حضرت میاں صاحب کے حلقۂ تلامذہ میں رہے اور ان سے سندِ حدیث لی۔ حافظ صاحب کے فرزند گرامی حضرت مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی نے بھی ان سے اکتسابِ علم کیا، لیکن اس کے باوجود میاں صاحب نے دہلی سے اپنے ایک شاگرد کو ان دونوں باپ بیٹا سے حصول علم کے لیے لکھو کے بھیجا اور انھیں احترام کے الفاظ میں سفارشی خط لکھا۔ ❶

شاہ عبدالغنی مجددی، مولانا احمد علی سہارن پوری اور میر محبوب علی جلیل القدر علما تھے اور حافظ صاحب کے لائق احترام اساتذہ تھے۔ لیکن مولانا عبدالحق مالیر کوٹلوی لکھتے ہیں کہ یہ حضرات فتویٰ پوچھنے والوں کو حافظ صاحب کے پاس بھیجتے اور فرمایا کرتے کہ ''یہ شخص صاحب الہام ربانی ہے۔'' ❷

قرآن کا ترجمہ اور تفسیر:

حافظ محمد لکھوی بے شمار اوصاف کا رفیع الشان مجموعہ تھے۔ ان کا ایک بہت بڑا علمی کارنامہ قرآن مجید کا ترجمہ و تفسیر ہے۔ برصغیر میں پورے قرآن مجید کا سب سے پہلے فارسی زبان میں ترجمہ حضرت مخدوم نوح بن نعمت اللہ سندھی نے کیا جو صوبہ سندھ کے ایک گاؤں ''ہالہ کندی'' کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے ۲۶ ذیقعدہ ۹۹۸ھ (۱۵ ستمبر ۱۵۹۰ء) کو اپنے مسکن ہالہ کندی میں وفات پائی۔ یہ ترجمہ پندرھویں صدی ہجری کی تقریب کے موقعے پر سندھی ادبی بورڈ حیدر آباد نے ۱۴۰۱ھ میں شائع کیا۔

دوسرا فارسی ترجمہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے کیا۔ ان کے ترجمہ و تفسیر کا نام فتح الرحمٰن ہے۔

فارسی زبان میں تیسرا ترجمہ حضرت حافظ محمد لکھوی نے کیا۔ لیکن ان کا یہ فرمان ہے کہ میرا ترجمہ دراصل شاہ ولی اللہ کا ترجمہ ہے۔ میں نے اس میں تغیر الفاظ کیا ہے۔ گزارش یہ ہے کہ تغیرِ الفاظ کا نام ہی ترجمہ ہے۔ بے شمار اہل علم نے بے شمار زبانوں میں ترجمے کیے۔ یہ سب ترجمے ایک دوسرے سے تغیرِ الفاظ کا نتیجہ ہیں۔ میں نے متعدد مقامات پر شاہ صاحب اور حافظ صاحب کے فارسی ترجموں کا تقابل کیا ہے۔ حافظ صاحب کا

---

❶ ملاحظہ ہو پنجاب کے عظیم مصلح از مولانا معین الدین لکھوی۔
❷ الفیوض المحمدیہ: ص ۷۷۔

ترجمہ شاہ صاحب کے ترجمے سے زیادہ واضح ہے۔ یہ ترجمہ ان کی تفسیر محمدی میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ تفسیر بڑے سائز کی سات جلدوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اسی میں قرآن کا پنجابی ترجمہ ہے جو پنجابی زبان میں قرآن کا اولیں ترجمہ ہے۔ اس سے پہلے اس زبان میں قرآن کا ترجمہ نہیں کیا گیا۔ پنجابی نظم میں حافظ صاحب نے قرآن مجید کی تفسیر لکھی جو اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ کسی زمانے میں یہ تفسیر بہت چھپی اور بہت پڑھی گئی۔ پنجاب میں اس کی بہت مانگ تھی۔ خطیب اور واعظ بالخصوص اس کی روشنی میں خطبہ دیتے اور وعظ کرتے۔ لوگ اس سے بے حد مستفید ہوتے تھے۔

اب قرآن مجید کے چند مقامات سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور حضرت حافظ محمد لکھوی کے ترجمے نذرِ قارئین کیے جاتے ہیں، جن سے دونوں عظیم المرتبت بزرگوں کے ترجموں میں تھوڑے بہت فرق کا اندازہ ہو سکے گا۔ ملاحظہ ہو پہلے سورہ فاتحہ کا ترجمہ:

ذیل میں بسم اللہ سمیت نمبر وار سورہ فاتحہ کی سات آیتیں پڑھیے۔

۱ — بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

۲ — اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

۳ — اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

۴ — مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ○

۵ — اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ○

۶ — اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ○

۷ — صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ○ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ ○

اب اسی ترتیب سے ملاحظہ ہو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا ترجمہ:

۱ - بنام خداوند بخشایندہ ومہربان۔

۲ - ستائش خدائے راست پروردگارِ عالمیاں۔

۳ - بخشایندہ مہربان۔

۴ - خداوندِ روزِ جزا۔

۵ - ترا می پرستیم واز تو مدد می طلبیم

۶ - بنما ما را راہِ راست۔

۷ - راہ آنانکہ اکرام کردہ بر ایشاں، بجز آنانکہ خشم گرفتہ شد بر آنہا و بجز گمراہاں۔

اب حافظ محمد صاحب کا ترجمہ پڑھیے۔ بسم اللہ سمیت:

۱- آغاز می کنم بنام خدائے بخشندہ مہربان۔

۲- ستائش مر خدائے راست کہ پروردگار عالمیاں۔

۳- بخشایندہ مہربان۔

۴- خداوند روزِ جزاست۔

۵- مرترا می پرستیم وازتو یاری می خواہیم۔

۶- بنما مارا راہِ راست۔

۷- راہ آں کساں کہ انعام کردہ براایشاں بجز آنانکہ خشم گرفتہ برآنہا و بجز گمراہاں۔

سورہ بقرہ کی ابتدائی دو آیتوں کا ترجمہ پڑھیے۔

﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ۝﴾

﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۝﴾

حضرت شاہ صاحب کا ترجمہ:

ایں کتاب ہیچ شبہ نیست دراں، رہنماست پرہیز گاراں را۔

آنانکہ ایمان می آرند بہ نادیدہ، و برپامی دارند نماز را و از آنچہ ایشاں را روزی دادہ ایم خرچ می کنند۔

اب حافظ صاحب کا ترجمہ:

ایں کتاب ہیچ شبہ نیست در آں، رہنماست برائے پرہیز گاراں۔

آنانکہ ایمان می آرند بنادیدہ، و برپا دارند نماز را، واز آنچہ روزی دادیم ایشاں راہ خرچ می کنند۔

اب سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۴۶ کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔ آیت یہ ہے:

﴿الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ۝﴾

شاہ صاحب کا ترجمہ:

کسانیکہ دادہ ایم ایشاں را کتاب می شناسند ویرا چنانکہ می شناسند فرزندانِ خویش را و ہر آئینہ گروہے از ایشاں می پوشند حق را دانستہ۔

اب حافظ صاحب کا ترجمہ:

آنانکہ دادیم ایشاں را کتاب می شناسند اوراچناں کہ می شناسند فرزندان خودرا، والبتہ گروہے از ایشاں می

پوشند حق را وایشاں می دانند۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ حافظ صاحب کا ترجمہ شاہ صاحب کے ترجمے سے نسبتاً صاف اور واضح معلوم ہوتا ہے۔ اسی آیت میں وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ کا ترجمہ شاہ صاحب نے ''دانستہ'' کیا ہے اور حافظ صاحب نے ''وایشاں می دانند'' کیا ہے جو الفاظِ قرآن کے عین مطابق ہے...... بہرحال غور کیا جائے تو حافظ صاحب کا ترجمہ اپنی ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن انھوں نے اسے شاہ صاحب کا ترجمہ ہی قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ الفاظ کی تبدیلی کا مقصد اسے آسان بنانا ہے، حالاں کہ الفاظ کی تبدیلی کا مطلب ایک الگ ترجمہ قرار پاتا ہے...... میں نے یہاں چند مثالیں دی ہیں۔ اس طرح کا فرق بے شمار مقامات پر پایا جاتا ہے۔

ابو داؤد کے حواشی:

حضرت حافظ محمد لکھوی نے ۱۲۷۱ھ میں صحاح ستہ کی مشہور کتاب سنن ابی داؤد پر عربی میں حواشی لکھے۔ حضرت مولانا شمس الحق ڈیانوی فرماتے ہیں کہ جب انھوں نے ابو داؤد کی شرح عون المعبود لکھنا شروع کی تو حافظ محمد لکھوی کے حواشی ان کے سامنے تھے اور انھوں نے ان حواشی سے استفادہ کیا۔ یہ حواشی ۱۲۷۲ھ میں چھپ بھی گئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ برصغیر کے علمی حلقوں میں حضرت حافظ صاحب کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور ان کی قلمی کاوشوں کو انتہائی لائق اعتماد قرار دیا جاتا تھا۔ وہ فارسی میں لکھتے یا عربی اور پنجابی میں، ان کی سب تحریروں کو یکساں قابل پذیرائی گردانا جاتا تھا۔

حواشی مشکوۃ المصابیح:

حافظ صاحب نے ۱۲۷۲ھ میں مشکوۃ شریف پر عربی میں حواشی تحریر فرمائے۔ تدریسی اور تحقیقی حلقوں میں ابوداؤد کے حواشی کی طرح ان حواشی کو بھی بے حد قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا اور جس سال مکمل ہوئے، اسی سال ان کی طباعت کا مرحلہ طے ہو گیا۔

حافظ محمد لکھوی پنجاب کے پہلے عالم ہیں جنھوں نے مشکوۃ کے عربی میں حواشی لکھے۔ مشکوۃ شریف حدیث کی ایک اہم تریں کتاب ہے جو صدیوں سے برصغیر کے نصاب درس میں شامل ہے۔ سنن ابو داؤد کے عربی حواشی لکھنے والے بھی حافظ صاحب پہلے پنجابی عالم ہیں۔

بہرحال حافظ محمد لکھوی کو اللہ تعالیٰ نے علم و عمل کی دولت سے بھی نوازا اور تحریر و نگارش کے اوصاف بھی ان کی ذات میں ودیعت فرمائے۔ ان کا قلم ہر علمی موضوع کے اظہار کی بے پناہ صلاحیت رکھتا تھا اور وہ اپنے عہد کی تینوں زبانوں (عربی، فارسی، پنجابی) میں لکھنے پر قادر تھے۔ پھر ان کا حلقۂ قارئین بھی بہت پھیلا ہوا تھا اور ان سے استفادہ کرنے والے کثیر تعداد میں موجود تھے۔

بعض دیگر تصانیف:

مذکورہ کتب وحواشی کے علاوہ حافظ صاحب نے چھوٹی بڑی بہت سی کتابیں تصنیف کیں، جن میں انواعِ محمدی، احوال الآخرت، زینت الاسلام، دین محمدی، (جس کا ایک نام محامد الاسلام ہے) رد نیچری، محاسن الاسلام (یا عقائد محمدی) وغیرہ شامل ہیں۔ پھر بعض پنجابی نظم کی کتابوں پر انھوں نے حواشی بھی لکھے، جن میں انواع عبداللہ لاہوری اور مولانا نور محمد سوتری کی شہبازِ شریعت شامل ہیں۔ حافظ صاحب کثیر العلم اور وسیع الجہات مصنف تھے۔ انھوں نے مختلف زبانوں میں اسلام کی جو خدمت کی اور جس نہج سے حالات کے مطابق دینی مسائل کی وضاحت فرمائی، اس میں ان کا کوئی حریف نہیں۔

وہ پنجاب کے رہنے والے تھے اور پنجاب کے لوگوں کی نفسیات کو خوب سمجھتے تھے، انھوں نے عربی اور فارسی کے جلیل المنزلت عالم ہونے کے باوجود زیادہ تر پنجابی زبان کو ذریعہ اظہار بنایا۔ ان کے زمانے میں پنجابی اشعار سے لوگ خاص طور سے دلچسپی رکھتے تھے، اس لیے انھوں نے اپنے مخاطبین کو اشعار کی صورت میں سمجھانے کی کوشش کی اور اس میں اللہ تعالیٰ نے ان کو کامیابی سے نوازا۔

صرف ونحو پر عبور:

حافظ صاحب کو صرف ونحو کے علوم پر بھی عبور حاصل تھا۔ انھوں نے اس موضوع پر بہت کام کیا اور متعدد رسائل لکھے۔ ان رسائل میں ایک رسالہ (بلکہ کتاب) ابواب الصرف ہے جو ضَرَبَ یَضْرِبُ اور نَصَرَ یَنْصُرُ وغیرہ ابواب پر مشتمل ہے۔

اسی سلسلے کا ایک چھوٹا سا رسالہ قوانین الصرف ہے، جس میں فارسی اشعار میں علم صرف کے قوانین و قواعد بیان کیے گئے ہیں۔ یہ دونوں کتابیں (ابواب الصرف اور قوانین الصرف) طلبا کو زبانی یاد کرائی جاتی ہیں۔ یہ یاد ہو جائیں تو عربی زبان کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ رسالہ قوانین الصرف سے پتا چلتا ہے کہ فارسی شاعری میں بھی حافظ صاحب کا مقام بڑا بلند ہے۔

حافظ محمد لکھوی کے بعد لکھوی علما و مدرسین کو صرف ونحو کے بارے میں مستند سمجھا جاتا ہے۔ حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کو تو اس موضوع پر امامت کا درجہ حاصل تھا اور بڑے بڑے اصحابِ علم اس ضمن میں ان سے رجوع کرتے اور مشکل ترین مسائل سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔

حافظ محمد صاحب نے جس طرح تفسیر محمدی کے نام سے قرآن مجید کی تفسیر لکھی، اسی طرح وہ صحیح بخاری کا ترجمہ وشرح لکھنا چاہتے تھے، لیکن افسوس کہ ان کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی اور وہ وفات پا گئے۔

سادہ زندگی:

حافظ صاحب نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ وعظ وتقریر کے لیے آسان زبان استعمال کرتے اور ایسا انداز اختیار فرماتے جسے سب لوگ سمجھ سکیں۔ مولانا محمد علی لکھوی کے بقول ان کا رہن سہن بھی سادہ تھا اور عام گفتگو میں بھی سادگی سے کام لیتے تھے۔ کسی قسم کا کوئی تکلف کسی معاملے میں نہ تھا۔ رشتے داروں اور غیر رشتے داروں سب سے ہم دردانہ سلوک روا رکھتے اور ہر ایک سے نرم زبان میں مخاطب ہوتے۔

مدرسے کا اجرا:

واقعات سے پتا چلتا ہے کہ لکھوکے میں مدرسہ تو حافظ احمد صاحب کے زمانے (۱۷۲۰ء) سے جاری تھا، لیکن اس کا نام ''مدرسہ محمدیہ'' حافظ بارک اللہ اور حافظ محمد نے ۱۸۴۰ء یا شاید اس سے بھی پہلے رکھا، جس میں وہ خود اور بعض دیگر لکھوی علمائے کرام طلبا کو تعلیم دیتے تھے۔ اس مدرسے اور اس کے بانیوں کے بارے میں ایک بزرگ سید نثار علی کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> ''یہ بہت نیک اور مشہور لوگ ہیں۔ ذی علم ہونے کی وجہ سے مولوی کہلاتے ہیں۔ اکثر لوگ انھیں وہابی کہتے ہیں۔ دیہ ہذا میں ان کے خاندان میں عالم ہوتے رہے ہیں اور مولوی صاحب حافظ محمد کے باعث چرچا علم بھی (بہت) اچھا رہتا ہے، بلکہ بعض طلبا سوائے فارسی کے علمِ عربی بھی تحصیل کرتے ہیں اور ان کو سرکار ممدوٹ کی طرف سے دو چاہ معافی ملے ہوئے ہیں، گاؤں کچا ہے مگر وہاں کی مسجد پختہ ہے جو حافظ محمد صاحب کے اہتمام میں فیض بخش قوم کمبوہ ارائیں ساکن فیروز پور تھانیدار ضلع نے تعمیر کرائی ہے۔'' ❶

اس مدرسے کے اجرا پر کم وبیش تین سو سال کا طویل عرصہ بیت چکا ہے۔ اس عرصے میں اس میں لاتعداد اصحابِ علم نے اخذِ فیض کیا، جن میں قدیم دور کے حضرات میں سے مولانا عبدالواحد غزنوی، مولانا احمد علی غزنوی، مولانا عبدالوہاب دہلوی، مولانا حافظ عبداللہ روپڑی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ ان کے بعد مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی، مولانا عبداللہ اوڈ وغیرہ بزرگوں کے نام آتے ہیں۔ پھر مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، حافظ عبداللہ بڈھیمالوی، حافظ محمد اسحاق (حسین خاں والا) حافظ محمد بھٹوی، حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی اور دیگر بے شمار حضراتِ گرامی ہیں۔

تقسیم ملک کے بعد یہ مدرسہ پاکستان کے شہر اوکاڑہ میں منتقل ہوا جو جامعہ محمدیہ کے نام سے جاری ہے۔

---

❶ تاریخ پرگنہ مکتسر وممدوٹ: ص ۱۸ از سید نثار علی، مطبوعہ وکٹوریہ پریس، لاہور، ۱۸۷۳ء۔

حافظ محمد لکھوی کے تلامذہ گرامی:

لکھو کے میں خود حافظ محمد لکھوی سے جن علما وطلبا نے تحصیل علم کی، انھیں گنتی شمار میں لانا ممکن نہیں۔ ان میں ان کے فرزندانِ گرامی قدر مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی، مولانا محمد حسن لکھوی اور مولانا محمد حسین لکھوی کے علاوہ مولانا عبدالقادر لکھوی، مولانا غلام نبی ربانی سوہدروی، مولانا عبدالحق مالیر کوٹلوی، مولانا عبدالغنی دہلوی، مولانا رحیم بخش لاہوری (مصنف اسلام کی کتاب جلد اول تا جلد چودہ) مولانا خدا بخش واعظ اور دوسرے بہت سے اصحابِ فضل شامل ہیں۔

حافظ صاحب کی وفات:

آخر عمر میں حافظ صاحب کی بصارت جواب دے گئی تھی اور مثانے میں پتھری پیدا ہوگئی تھی۔ علاج معالجہ ہوتا رہا۔ لیکن افاقہ نہ ہوا۔ پھر فیروز پور کے سرکاری ہسپتال میں آپریشن کرایا گیا، لیکن آپریشن کامیاب نہ ہوا۔ بالآخر اسی مرض سے ۲۷ اگست ۱۸۹۳ء (۱۳ صفر ۱۳۱۱ھ) کو ۹۰ برس کی عمر میں وفات پا گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

وفات کے بعد ایک تعجب انگیز واقعہ:

حضرت مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے ایک ارادت مند بزرگ مولانا الٰہی بخش تھے جو موضع کلیر کلاں متصل منڈی ہیرا سنگھ ضلع اوکاڑہ کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے پنجابی نظم میں ایک کتاب ''کرامت نامہ'' لکھی تھی۔ اس میں انھوں نے ایک تعجب انگیز واقعہ تحریر کیا ہے جو حضرت حافظ محمد لکھوی کے وفات کے بعد پیش آیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ حافظ صاحب کی قبر کچھ نشیب میں تھی۔ تدفین سے ڈیڑھ برس بعد اس میں پانی بھر گیا۔ لوگوں کو اس کا پتا چلا تو ایک عالم دین کے کہنے سے قبر کھولی گئی۔ دیکھا تو حضرت کا جسم مبارک صحیح سلامت تھا۔ کسی قسم کا داغ دھبا نہ تھا۔ جسم کو قبر سے نکالا گیا اور نیا کفن پہنا کر انھیں دفن کیا گیا۔

اولاد:

حضرت حافظ صاحب کی نرینہ اولاد چھے بیٹے تھے۔ فتح دین، محمد حسن، محمد حسین، محی الدین عبدالرحمٰن، زین العابدین اور نور الدین۔ سب بیٹے علماے دین تھے۔

تین بیٹیاں تھیں علی الترتیب ان کے نام یہ تھے کلثوم، رقیہ، سائرہ۔

بڑی بیٹی کا نکاح ایک بزرگ صوفی ولی محمد سے ہوا۔

دوسری بیٹی استاذِ پنجاب حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کے عقد میں آئیں۔

تیسری بیٹی مولوی نور محمد ساکن موضع موکل ضلع قصور سے بیاہی گئیں۔

مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی

(۱۰ مئی ۱۸۹۵ء)

مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی، حضرت حافظ محمد لکھوی کے فرزندِ گرامی تھے۔ ان کے حالات پنجابی نظم میں ''تحفہ واعظ'' کے عنوان سے ان کے ایک شاگرد اور مرید مولانا خدا بخش واعظ نے لکھے تھے۔ یہ بڑے سائز کا اٹھارہ صفحات کا ایک رسالہ ہے جو آج سے تقریباً سوا سو سال قبل ۱۳۱۴ھ (۱۸۹۶ء) میں مطبع وزیر ہند میں چھپا۔ اس میں مولانا محی الدین عبدالرحمٰن کے علاوہ متعدد لکھوی علما اور دیگر حضرات کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔

تحفۂ واعظ کے علاوہ بھی اس عہد کی چند پنجابی نظم کی کتابوں میں نہایت عقیدت و محبت سے مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ بعض اردو کتابوں میں بھی ان کے مریدوں اور شاگردوں نے ان کے واقعاتِ زندگی تحریر کیے۔ لیکن ان کتابوں کا ملنا اب بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ ان کے عقیدت مند زبانی بھی ان کی بہت سی باتیں سنایا کرتے تھے، خود مجھے بھی چھوٹی عمر میں ان کے چند مبایعین کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان کی زبان سے اپنے عظیم القدر مرشد سے متعلق ارشادات سننے کی سعادت حاصل ہوئی۔

ولادت اور تعلیم:

مولانا محی الدین عبدالرحمٰن ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۷ء) میں بمقام لکھو کے پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی۔ یعنی قرآن مجید سمیت علمِ نحو کی انتہائی کتاب کافیہ تک کتابیں اپنے والد محترم سے پڑھیں۔ پھر مزید تعلیم کے لیے دہلی کا عزم کیا۔ ان کے والد گرامی حافظ محمد لکھوی بھی بیٹے کے ساتھ دہلی گئے۔ وہاں قاضی بشیر الدین قنوجی سے قطبی، میر قطبی، صدرا، میبذی، حمد اللہ، نور الانوار کتابیں پڑھیں۔ مولانا عبدالرحمٰن اور مولانا نوازش علی سے بھی کسبِ فیض کیا۔ حضرت میاں سید نذیر حسین کے بابِ فضیلت پر بھی دستک دی، ان سے درسِ حدیث لیا اور حصول سند کی سعادت سے بہرہ ور ہوئے۔

وطن واپسی اور مردِ کامل کی تلاش:

دہلی کے جلیل المرتبت اساتذہ سے استفادے کے بعد وطن تشریف لائے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا آغاز ۱۰ مئی کو ہوا تھا، حضرت ممدوح اس سے پہلے ہی صرف سترہ (۱۷) سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے

تھے۔ اپنے اسلاف کی طرح بے حد ذہین بھی تھے اور بہ درجہ غایت زاہد و عابد بھی۔ کچھ عرصہ اپنے آبائی مدرسے لکھو کے میں تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ ذہن میں زہد و عبادت کے آثار تیزی سے کروٹ لینے لگے تھے۔ ایک دن خواب میں قرآن کی یہ آیت سامنے آئی:

﴿رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰہُ وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِکَ فِیْ عِبَادِکَ الصّٰلِحِیْنَ﴾ (النمل : ۱۹)

''اے میرے پروردگار! مجھے توفیق دے کہ میں تیری ان نعمتوں کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے ماں باپ کو عطا فرمائیں اور یہ کہ میں نیک کام کرتا رہوں جس سے تو خوش ہو، اور آخرت میں مجھے اپنی رحمت کے ساتھ اپنے نیک بندوں میں شامل فرمائیو۔''

اس کے کچھ دن بعد خواب میں یہ آیت دکھائی دی:

﴿وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًا﴾ (المزمل : ۸)

''اور تو اپنے رب کا نام لے اور سب طرف سے منقطع ہو کر صرف اسی کا ہو جا۔''

اب کسی ولی اللہ سے ملنے اور مردِ کامل سے حصولِ فیض کا شدید جذبہ دل میں ابھرا۔ اسی اثنا میں مولانا غلام رسول قلعوی اور انہی جیسے بعض صالح ترین حضرات سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ غزنی کے رہنے والے حضرت سید عبداللہ غزنوی کا شمار اولیاء اللہ میں ہوتا ہے اور ان کا چشمۂ فیض جاری ہے۔ اس سے سیراب ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اب حضرت سید عبداللہ صاحب سے ملاقات کے لیے دل میں آرزو بھڑکی اور استخارہ کر کے حضرت ممدوح کے قصرِ صالحیت پر حاضری کا عزم کیا۔

ان کے ایک شاگرد اور مرید مولانا الٰہی بخش تھے جو موضع کلیر متصل منڈی ہیرا سنگھ (ضلع اوکاڑہ) کے رہنے والے تھے۔ وہ مولانا ممدوح کے بے حد عقیدت مند تھے۔ سفر و حضر میں بالعموم ان کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ ان کے والد مکرم حافظ محمد لکھوی کے بھی شاگرد تھے۔ مولانا نے ان سے اپنے ساتھ غزنی جانے کے لیے بات کی تو وہ فوراً تیار ہو گئے۔

غزنی کو روانگی:

یہ آج سے کم و بیش ایک سو ساٹھ (۱۶۰) برس قبل (۱۲۷۵ھ/ ۱۸۵۷ء) کا واقعہ ہے۔ مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی اس وقت بائیس برس کے جوانِ رعنا تھے۔ انھوں نے اپنے شاگرد مولوی الٰہی بخش کلیروی کو رفیقِ سفر بنایا اور حضرت سید عبداللہ غزنوی کے آستانہ فیض پر حاضری دینے اور ان کے حلقۂ بیعت میں شامل ہونے کی غرض سے غزنی کو روانہ ہوئے۔

اس وقت موجودہ دور کی طرح نہ سڑکیں تھیں، نہ موٹریں تھیں، نہ ریلیں چلتی تھیں۔ کچے راستے، لوگ پیدل یا گھوڑوں، اونٹوں اور بیل گاڑیوں پر سفر کرتے تھے۔ یہ دونوں مسافرانِ راہِ حق لکھو کے سے چلے اور ملتان پہنچے۔ ملتان سے ڈیرہ اسماعیل خاں کا عزم کیا اور وہاں سے غزنی کو روانہ ہوئے جو افغانستان کا ایک مشہور شہر ہے۔ راستے میں بلند و بالا پہاڑ بھی آئے، ندی نالے اور دریا بھی آئے۔ دور تک پھیلے ہوئے صحرا بھی عبور کیے۔ یہ طویل سفر انھوں نے تقریباً دو مہینوں میں طے کیا۔

استقبال:

حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی خاندانِ لکھویہ کے بزرگوں اور ہم عصر علمائے کرام کا بے حد احترام کرتے اور ان کے چھوٹوں سے شفقت کا برتاؤ فرماتے تھے۔ حضرت سید عبداللہ غزنوی ان کے دادا تھے۔ انھوں نے مختلف اوقات میں مجھے کئی دفعہ مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے غزنی جانے اور حضرت عبداللہ صاحب سے ملنے کا واقعہ سنایا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ دادا صاحب کو اللہ تعالیٰ کی طرف الہام ہو گیا تھا کہ پنجاب سے ایک صالح ترین عالم دین آ رہے ہیں، چنانچہ وہ غزنی کے قریب پہنچے تو حضرت عبداللہ صاحب ان کے استقبال کے لیے گئے اور جاتے وقت گھر میں فرمایا کہ ایک بزرگ آ رہے ہیں، ان کے لیے اچھا سا کھانا تیار کرو۔ ''اچھا سا کھانا تیار کرو'' کے الفاظ کہہ کر مولانا داؤد غزنوی مسکراتے ہوئے فرماتے کہ اس سے مراد حلوہ یا بٹیر کا گوشت ہو گا۔

مولانا یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ حافظ محمد لکھوی نے زادِ راہ کے طور پر مولانا محی الدین عبدالرحمٰن کو سو روپے دیے تھے۔ سو روپے پر وہ خاص طور سے زور دیتے اور دو دفعہ فرماتے۔ ''سو روپے دیے، سو روپے''...... یہ الفاظ کہتے ہوئے مولانا کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں سو روپے بہت بڑی رقم تھی۔ اتنی بڑی رقم کے مالک کو امیر آدمی سمجھا جاتا تھا۔ اندازہ فرمایئے جہاں مرشد (سید عبداللہ غزنوی) پیکرِ حسنات تھے، وہاں ان کی بیعت کے لیے حاضر ہونے والے (مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی) بھی مجسمۂ خیر تھے۔

حضرت عبداللہ غزنوی کی مخالفت:

اس وقت غزنی اور افغانستان کے مختلف مقامات میں جہاں بے شمار لوگ حضرت سید عبداللہ غزنوی کے دائرۂ عقیدت میں شامل تھے، وہاں ان کی تبلیغ توحید کی وجہ سے کچھ لوگ ان کے شدید مخالف بھی تھے۔ بالخصوص افغانستان کے علمائے سوء ہر وقت ان کی مخالفت پر کمر بستہ رہتے اور جو لوگ کسی علاقے سے ان کی خدمت میں حاضری کا قصد کرتے، ان سے بھی ان کے خلاف باتیں کرتے اور انھیں حاضری اور حصولِ فیض

سے روکنے کی کوشش کرتے۔

اس کا ذکر حضرت عبداللہ صاحب کے صاحب زادے حضرت امام سید عبدالجبار غزنوی نے اپنی کتاب سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی میں کیا ہے۔

مخالفوں کی باتیں سن کر مولانا محی الدین عبدالرحمٰن بہت متحیر ہوتے۔ اثنائے راہ میں انھیں ایک رات میں تین مرتبہ اللہ کی طرف سے الہام ہوا اور قرآن مجید کی آیات اِن کے پردۂ سماع سے ٹکرائیں، جن کا مطلب یہ تھا کہ اپنا سفر جاری رکھو اور عبداللہ سے ملو۔ وہ بہت نیک شخص ہیں۔

اس کا ذکر حضرت سید عبداللہ صاحب کے فرزند گرامی حضرت امام سید عبدالجبار غزنوی نے فرمایا ہے۔ ان کے فارسی الفاظ کا اردو ترجمہ یہ ہے:

''مولوی عبدالرحمٰن بن شیخ محمد بن بارک اللہ جو اپنے دور کے علما میں بہت مشہور عالم ہیں اور زہد و تقویٰ اور رشد و صلاح میں اپنے زمانے کے امام ہیں، وہ حضرت عبداللہ صاحب کی صحبتِ بابرکت سے فیض حاصل کرنے کے لیے ملک پنجاب سے سفر کر کے ملک غزنی تک گئے۔ یہ دو ماہ کی مسافت ہے جو انھوں نے طے کی۔ راستے میں انھوں نے حضرت مولانا کے متعلق مخالفوں سے جو باتیں سنیں، ان سے حیران ہوئے، پھر اسی رات انھیں یہ الہام ہوا:

﴿فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ۝﴾ (الذاریات: ۲۳)

''سو قسم ہے آسمان اور زمین کے پروردگار کی، وہ برحق ہے، اسی طرح جیسے کہ تم بات چیت کر رہے ہو۔''

دوسری مرتبہ یہ الہام ہوا:

﴿وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ۝﴾ (ص: ۴۷)

''اور بے شک یہی لوگ ہمارے ہاں منتخب اور سب سے اچھے لوگوں میں ہیں۔''

تیسری بار یہ الہام ہوا:

﴿اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ﴾ (الزخرف: ۵۹)

''وہ تو ہمارے ایک بندے ہیں، جن پر ہم نے فضل کیا۔'' [1]

حضرت امام عبدالجبار صاحب غزنوی کے ان الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ اس طویل سفر کے مختلف مقامات میں بعض لوگوں نے حضرت سید عبداللہ غزنوی کے بارے میں مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی سے

---

[1] سوانح عمری حضرت عبداللہ غزنوی: ص ۲۔

جو باتیں کیں، ان سے وہ پریشانی میں مبتلا ہو گئے تھے اور ان کے عقاید و افکار کے متعلق کئی قسم کے خیالات ان کے ذہن میں گردش کرنے لگے تھے۔ لیکن ان کی پریشانی اس وقت رفع ہوگئی، جب اللہ تعالیٰ نے ان کی راہنمائی فرمائی اور قرآن مجید کی مندرجہ بالا آیات یکے بعد دیگرے بہ صورتِ الہام و القا ان کے ذہن میں پیوست ہوئیں۔ ❶

محی الدین سے عبدالرحمٰن:

مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی غزنی کے قریب پہنچے تو حضرت سید عبداللہ صاحب نے بڑے احترام سے ان کا استقبال کیا اور انھیں گھر لے گئے۔ کھانا کھلایا اور ان سے گفتگو شروع ہوئی۔

مولانا کے ساتھی مولانا الٰہی بخش کلیروی نے ان کا تعارف کراتے ہوئے حضرت عبداللہ صاحب سے کہا کہ ان کے والد (حافظ محمد) پنجاب میں چراغ ہیں۔

حضرت نے فرمایا:

''ایں آفتاب خواہد شد''

''اگر وہ چراغ ہیں تو یہ آفتاب ثابت ہوں گے۔''

مولانا کا نام ان کے والد حافظ محمد لکھوی نے محی الدین رکھا تھا اور وہ اپنے حلقہ تعارف میں اسی نام سے مشہور تھے۔ حضرت عبداللہ صاحب نے ان کا نام پوچھا تو انھوں نے یہی نام بتایا۔ حضرت سید صاحب نے فرمایا والدین نے میرا نام محمد اعظم رکھا تھا، اگرچہ اعظم کا اطلاق نبی ﷺ کی ذات اقدس پر ہوتا ہے، لیکن میں نے اپنا نام عبداللہ رکھ لیا۔ اس سے اللہ کی الوہیت اور بندے کی عبودیت کا اظہار ہوتا ہے۔ آپ کا نام محی الدین اچھا نام ہے۔ لیکن آپ اپنا نام عبدالرحمٰن رکھ لیجیے۔ عبداللہ اور عبدالرحمٰن اللہ کے نزدیک پسندیدہ نام ہیں، چنانچہ اس دن سے انھوں نے اپنا نام عبدالرحمٰن رکھ لیا اور انھیں محی الدین عبدالرحمٰن کہا جانے لگا۔

مولانا لکھوی نے حضرت سید صاحب کی بیعت کی، ان سے شب و روز میں پڑھنے کے لیے بہت سے وظائف سیکھے اور تین مہینے حضرت کی خدمت میں غزنی ان کا قیام رہا۔

حضرت عبداللہ صاحب کی بیعت کے بعد مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کو اللہ کی طرف سے بشارت ہوئی:

❶ میں نے اپنی ایک کتاب فقہائے پاک و ہند تیرھویں صدی ہجری کی جلد دوم میں حضرت سید عبداللہ غزنوی پر طویل مضمون لکھا ہے جو کتاب کے صفحہ ۱۴۷ سے ۲۱۹ تک چلتا ہے۔ یہ کتاب آج سے تقریباً تیس سال قبل ۱۹۸۴ء میں ادارۂ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے چھپی تھی۔ اس میں اس قسم کے تمام واقعات تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔ یہ کتاب دار العلوم تقویۃ الاسلام (لاہور) کے نصاب تعلیم میں بھی شامل رہی۔ لکھوی اور غزنوی خاندانوں کے باہمی تعلقات کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب بڑی مدد دیتی ہے۔ حال ہی میں یہ کتاب نہایت خوب صورت انداز سے کتاب سرائے اُردو بازار، لاہور نے شائع کی ہے۔

﴿فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ﴾ (التوبة: ١١١)

''پس اس بیعت پر جو تم نے کی خوش ہو جاؤ۔''

پھر اللہ کی طرف سے الہام ہوا:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا﴾ (الشورىٰ: ٣١)

''اللہ نے تمھارے لیے وہ دین مقرر کیا جس دین پر نوح علیہ السلام کو چلنے کا حکم دیا۔''

واپسی کی اجازت:

اس وقت افغانستان کے علماے سوء حضرت عبداللہ صاحب کی شدید مخالفت کر رہے تھے۔ اب مولانا لکھوی نے واپس وطن آنے کے لیے ان سے اجازت چاہی تو استخارہ کیا اور یہ آیت القا ہوئی:

﴿وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا﴾ (البقرة: ١٢٥)

''اور اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے بیت اللہ شریف کو لوگوں کے لیے ثواب اور امن کی جگہ بنا دیا۔''

اس آیت سے یہ اشارہ ملا کہ اب اپنے گھر جاؤ، وہی تمھارے لیے ثواب اور امن کا مقام ہے۔ وہاں تحمل اور بردباری کے ساتھ اسلام کی تبلیغ کرو۔

اس کے بعد حضرت مولانا مراجعت فرماے وطن ہوئے۔ لکھو کے سے غزنی تک آمد و رفت اور وہاں قیام کی مدت چھے مہینے بنتی ہے۔ ایک روایت کے مطابق مولانا ممدوح دو مرتبہ غزنی گئے اور حضرت سید صاحب سے بے حد فیض پایا۔

سلسلۂ بیعت:

مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی نے سب سے پہلے اپنے والد گرامی حضرت حافظ محمد لکھوی کے دستِ حق پرست پر بیعت کی تھی۔ پھر غزنی جا کر حضرت سید عبداللہ صاحب غزنوی کی بیعت سے سعادت اندوز ہوئے۔ انھوں نے اپنے مرشد ملا حبیب اللہ قندھاری سے جو فیض پایا تھا، اس سے انھیں مطلع فرمایا۔

خود مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کا سلسلۂ بیعت بھی جاری تھا۔ بیعت کرنے والے کو وہ درمیانی آواز سے کلمہ طیبہ پڑھاتے، استغفر اللہ کا ورد کراتے۔ یا حی یا قیوم برحمتك استغیث پڑھنے کی تاکید فرماتے۔ اکتالیس دفعہ روزانہ سورہ فاتحہ پڑھنے کی تلقین کرتے۔ [1]

حلیہ اور لباس:

مولانا خدا بخش واعظ جو مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے شاگرد اور مرید تھے، پنجابی اشعار میں ان کا

[1] تحفۂ واعظ از مولانا خدا بخش واعظ: ص ۲

حلیہ اس طرح بیان کرتے ہیں: رنگ نہ بالکل سفید نہ سرخ (اسے گندمی رنگ کہنا چاہیے) میانہ قد، بدن تھوڑا سا مائل بہ فربہی، گوشت سے بھرا ہوا جسم، پنڈلیاں ابھری ہوئیں، پیشانی پر سجدے کا نشان، مہندی سے رنگیں ڈاڑھی۔

لباس یہ تھا: تہبند یا لنگی، کرتہ، جمعے کہ روز چوغہ پہنتے، سر پر ٹوپی اور ٹوپی پر تین چار گز کا عمامہ، سردیوں میں گرم واسکٹ، جوتی کبھی پوٹھوہاری، کبھی دوسری۔

مہمان نوازی:

جو لوگ بہ طور مہمان آتے، ان کا کھانا مولانا لکھوی اپنے گھر سے خود لاتے۔ اپنا کام خود کرتے، کسی کو اپنے کام کے لیے نہ کہتے، اپنے کپڑے خود ہی دھو لیتے، مجلس میں نمایاں ہو کر نہ بیٹھتے، کوئی مہمان جانا چاہتا تو اسے رخصت کرنے کے لیے چند قدم اس کے ساتھ جاتے اور رخصت کرتے وقت یہ دعا پڑھتے استودع الله دينك و امانتك و اخر عملك . ❶

زبان ہر وقت ذکر الٰہی سے تر رہتی۔ سب سے نرم الفاظ میں بات کرتے۔ آنے والوں کو پیار کے لہجے میں برائی سے رکنے اور نیک کام کرنے کی تاکید فرماتے۔

نماز میں خشوع وخضوع:

نماز نہایت خشوع وخضوع سے پڑھتے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ نمازی کو ان دعاؤں کے معنوں سے بھی آگاہ ہونا چاہیے جو وہ نماز میں پڑھتا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا نواب وحید الزمان خاں حیدر آبادی تحریر فرماتے ہیں:

”ہمارے شیخ اتقی زماں مولوی عبدالرحمٰن صاحب ساکن لکھو کے رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص نماز کے معنیٰ نہیں جانتا اس کی نماز نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ جو شخص اس مسئلے میں ان کے خلاف اصرار کرتا تو اس سے مباہلے پر تیار ہو جاتے۔“ ❷

مرزا قادیانی کے متعلق الہامات:

مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کا وہ زمانہ تھا جب انگریز کے ذہنِ فتنہ پرور نے قادیانیت کا فتنہ پیدا کر دیا تھا اور مرزا غلام احمد قادیانی مجدد، مسیح اور مثلِ مسیح وغیرہ دعاوی سے گزرتا ہوا، نبوت کا دعویٰ کرنے لگا تھا۔ اس وقت مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم ومغفور نے مرزا قادیانی کے افکار کو ترتیب دے کر حضرت میاں سید

---

❶ تحفۂ واعظ از مولانا خدا بخش واعظ: ص۲۔

❷ تسہیل القاری (اردو ترجمہ صحیح بخاری پارہ پنجم ص ۱۴۰، ۱۴۱ طبع اول لاہور۔

نذیر حسین دہلوی کی خدمت میں پیش کیا اور ان سے فتویٰ پوچھا کہ ان افکار کا حامل شخص دائرۂ اسلام سے خارج ہے یا نہیں؟ حضرت میاں صاحب نے اسے کافر قرار دیا اور پھر مولانا محمد حسین بٹالوی نے اس فتوے پر ملک کے کم وبیش دو سو علماء کی مہریں لگوائیں اور دستخط کرائے۔ اسے ''اولیں فتوائے تکفیر'' کہا جاتا ہے۔ اس پر مرزا قادیانی نے اپنی چھوٹی بڑی مختلف کتابوں میں بڑا شور مچایا اور مولانا محمد حسین بٹالوی کے بارے میں کہا کہ وہ ''اول المکفرین'' ہیں یعنی پہلے شخص ہیں جنھوں نے مجھ پر کفر کا فتویٰ لگایا۔

مولانا محی الدین عبدالرحمٰن کے الہام:

اسی زمانے میں حضرت مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی نے فرمایا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے یہ بتا کہ مرزا قادیانی کا کیا معاملہ ہے؟ اللہ تعالیٰ نے خواب میں بہ صورت الہام فرمایا:

﴿إِنَّ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِئِيْنَ۝﴾ (قصص: ۸)

''بے شک فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر غلط کار تھے۔''

اس سے یہ مطلب اخذ کیا گیا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کا تعلق فرعون اور ہامان اور ان کے گروہ سے ہے اور جس طرح وہ کافر اور اللہ کے نافرمان تھے، اسی طرح مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے متعلقین کافر اور احکامِ الٰہی کے منکر ہیں۔

مرزا کے بارے میں پھر الہام ہوا۔

﴿وَ مَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا۝﴾ (النساء: ۱۲۰)

''اور شیطان ان سے جو وعدہ کرتا ہے وہ سراسر دغا ہے۔''

پھر الہام ہوا۔

﴿وَ اتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَ رُسُلِيْ هُزُوًا۝﴾ (الكهف: ۱۰۶)

''اور انھوں نے میری آیتوں اور میرے رسولوں کی ہنسی اڑائی۔''

مرزا قادیانی کے بارے میں ایک اور الہام ہوا۔

﴿وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا۝﴾ (النساء: ۲۸)

''اور وہ ہماری آیتوں کو قطعی طور سے جھٹلاتے ہیں۔''

ایک اور الہام:

﴿هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا۝﴾ (النساء: ۱۵)

''یہی لوگ ہیں جو پکے کافر ہیں۔''

ایک اور الہام ملاحظہ ہو:

﴿وَ اِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا﴾ (الکہف: ۵۷)

''اے پیغمبر! تو اگر انھیں ہدایت اختیار کرنے کی دعوت دے تو وہ کبھی ہدایت یاب نہیں ہوں گے۔''

ایک دفعہ فرمایا: دعا کردم یا اللہ حکم تو دربارہ مرزا چیست؟

الہام شد: ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا﴾ (النساء: ۱۵)

میں نے دعا کی یا اللہ! مرزا کے بارے میں تیرا کیا ارشاد ہے؟

الہام ہوا: ''یہ لوگ پکے کافر ہیں۔''

اس طرح مرزا غلام احمد قادیانی کے متعلق حضرت مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے بہت سے الہام ہیں۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے عصاء موسیٰ علیہ السلام مظہر حقیقۃ البیعت و الالہام فی جواب رسالہ ضرورت الامام۔ مطبوعہ جمادی الاولی ۱۳۱۸ھ مطابق ستمبر ۱۹۰۰ء مطبع انصاری دہلی)

مرزا قادیانی کے بارے میں چند اور باتیں:

مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے ایک عقیدت مند اور شاگرد مولانا عبدالحق مالیر کوٹلوی نے اپنی دو کتابوں (ایقاظ غفلاء الزمان اور اربعین مظہری) میں حضرت مولانا لکھوی کے واقعاتِ زندگی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ اربعین مظہری ۱۳۱۳ھ (۱۸۹۶ء) میں چھپی۔ اس کتاب میں مرزا غلام قادیانی کے بارے میں چند اور باتیں پڑھیے۔

☆...... ایک دفعہ حضرت ممدوح (مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی) کی مجلس میں اس بات کا ذکر ہوا کہ مرزا ملائکہ کے وجود سے انکار کرتا ہے۔ حضرت نے فرمایا ''اسے کہو کہ میرے پاس آئے۔ ہم اسے اس کی آنکھوں سے فرشتہ اترتا ہوا دکھا دیں گے۔'' پھر بذریعہ رجسٹری خود حضرت مولانا نے اور آپ کے بعض خدام نے مرزا کو لکھا کہ ''تو ایک امر مقرر کر لے جس کا وقوع زمانے کے عقلاء کے نزدیک خارج از طاقت ہو اور وہ نشان مانا آسمانی جاوے، پھر اگر تو سچا ہے تو اس کو دس ہفتے میں دکھلا دے، ورنہ ہم اسی امر مقرر شدہ کو پانچ ہفتے میں دکھلا دیں گے۔''

☆...... یہ بھی مرزا غلام احمد کو لکھا کہ ''تو اور میں ایک کوٹھڑی میں بند ہو جاتے ہیں۔ دو گھڑی بعد اگر باہر نکلتے ہی تو نے اپنے عقاید جدیدہ سے توبہ نہ کی اور انہی پر مصر رہا تو سمجھو تو سچا ہے اور ہم تیری بیعت کر لیں گے۔''

حضرت کی بیان فرمودہ یہ بات ''ایقاظ غفلاء الزمان'' میں چھپی اور مرزا نے پڑھی، لیکن وہ ایسا مبہوت ہوا کہ اس نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔

☆......حضرت مولانا فرمایا کرتے تھے کہ ''مرزا اگر ہمارے مقابلے میں آوے تو قسم ہے خدا کی جب تک خدا ہمارے درمیان فیصلہ نہ کرے تو ہم مصلے پر سے قدم نہ اٹھاویں۔'' ❶

﴿وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا۝﴾ (الفرقان: ۲۳)

''اور انھوں نے جو کام کیے، ان پر ہم متوجہ ہوں گے اور ان کو اڑتی خاک کی طرح کر دیں گے۔'' ❷

☆......اس سلسلے میں مرزائیوں کی طرف سے شورش کی اطلاع ملی تو اللہ کی طرف سے القا ہوا:

﴿جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ۝﴾ (صٓ: ۱۱)

''لشکروں میں سے یہ بھی ایک چھوٹا سا لشکر ہے جو یہیں شکست کھائے گا۔'' ❸

☆...... مولانا عبدالحق مالیرکوٹلوی لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک شخص کے متعلق بتایا جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا کہ اس نے لاہور کی مسجد لسوڑیاں والی میں، مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی کی موجودگی میں مرزا کی کفریات سے بیزار ہو کر میرے ہاتھ پر بیعت کی۔ ❹

مولانا عبدالحق مالیرکوٹلوی نے اپنی کتابوں (ایقاظ غفلاء الزمان اور اربعین مظہری) میں مولانا لکھوی سے متعلق بہت سی باتیں بیان کی ہیں جو لائق مطالعہ ہیں۔

حضرت مولانا کے بارے میں حضرت عبداللہ غزنوی کے ارشادات:

مولانا عبدالحق مالیرکوٹلوی نے لکھا ہے کہ حضرت مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی نے ''تقریباً عمر ۲۲ سال میں غزنی پہنچ کر حضرت عبداللہ صاحب سے بیعت طریقت کی۔'' ❺

☆...... وہ لکھتے ہیں: ''آپ غزنی میں جب اول اول بخدمت مولانا عبداللہ صاحب حاضر ہوئے تو انھوں نے آپ کو دیکھتے ہی فرمایا:

درمیان ما وشما مناسبت در ازل بود۔ ❻

''آپ کے اور ہمارے درمیان ہمیشہ سے مناسبت ہے۔''

☆......حضرت کے رفیق سفر (مولانا الٰہی بخش کلیروی) نے حضرت عبداللہ صاحب سے ان کے متعلق عرض کیا کہ ''ان کے والد پنجاب میں چراغ ہیں تو حضرت عبداللہ صاحب نے آپ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا ''این آفتاب خواہد شد'' ❼

❶ اربعین مظہری: ص ۵۸۔ ❷ اربعین مظہری: ص ۵۹۔
❸ اربعین مظہری: ص ۵۹۔ ❹ ایضاً: ص ۵۴۔
❺ ایضاً: ص ۵۹۔ ❻ اربعین مظہری: ص ۵۴۔ ❼ ایضاً

یعنی ”والد چراغ ہیں تو ان کے یہ بیٹے آفتاب ثابت ہوں گے۔“

☆ ...... اجازتِ طریقت دینے کے لیے حضرت عبداللہ صاحب نے استخارہ فرمایا تو الہام ہوا:

﴿وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا﴾ (البقرۃ: ۱۲۵)

”اور جب ہم نے بیت اللہ شریف کو ثواب اور امن کی جگہ ٹھہرایا۔“

مطلب یہ کہ مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کا گھر ان کی بیعت کے لیے آنے والوں کے لیے روحانی سکون اور حصول اجر کا ذریعہ ثابت ہوگا۔

مولانا فرماتے ہیں: ”حضرت عبداللہ صاحب کے اس الہام کی برکت وصداقت کی وجہ سے میرا کوئی یار وعقیدت مند دامِ کیدِ قادیانی میں نہیں پھنسا اور مرزا کے بہت سے مرید اس کے کفر و ارتداد سے بیزار ہو کر ہمارے زمرے میں داخل ہوئے۔“ ❶

مولانا لکھوی، حضرت عبداللہ صاحب سے بیعت کے کچھ عرصے بعد غزنی سے رخصت ہونے لگے تو حضرت نے فرمایا:

”یک بار ضرور بیا۔“ ❷

”ایک مرتبہ ضرور دوبارہ آنا۔“

☆ ...... پھر جب وہ غزنی سے ہجرت کر کے کچھ دن پشاور ٹھہرے تو مولانا لکھوی ان کی زیارت کے لیے لکھو کے سے پشاور گئے۔ حضرت ممدوح دور سے ان کو دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور گلے لگا کر فرمایا:

نور علیٰ نور شد

☆ ...... ایک دفعہ مولانا لکھوی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا:

ایں برادر ما است وحبیب اللہ استادِ ما بود

مارا گفت مربی شما خداے تعالیٰ است

”یہ ہمارے بھائی ہیں اور (ملا) حبیب اللہ (قندھاری) ہمارے استاد تھے۔ انھوں نے ہمیں کہا تھا کہ آپ کا مربی اللہ تعالیٰ ہے۔“

☆ ...... ایک مرتبہ مولانا لکھوی سے فرمایا:

امشب مولوی اسماعیل رحمہ اللہ نزدِ ما نشستہ بود شما باشید، شما را خداے تعالیٰ شجاعت نصیب خواہد کرد۔ ❸

❶ اربعین مظہری: ص ۵۴۔ ❷ اربعین مظہری: ص ۵۴۔
❸ ایضاً: ص ۵۵۔

''آج رات خواب میں مولانا اسماعیل رحمہ اللہ میرے پاس تشریف فرماتے تھے۔ آپ بھی ہیں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ جرأت نصیب فرمائے گا۔''

مولانا اسماعیل شہید دہلوی مراد ہیں۔ ان کا وجود استعارہ ہے اس جرأت سے جو کلمۂ حق بلند کرنے کے سلسلے میں حضرت مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی میں پائی جاتی تھی۔

☆......ایک شخص نے مولانا لکھوی سے کوئی وظیفہ پوچھا۔ اس کے بعد حضرت عبداللہ صاحب سے بھی وہی وظیفہ پوچھا اور انھیں بتا بھی دیا کہ یہ وظیفہ اس نے مولانا محی الدین عبدالرحمٰن سے بھی پوچھا تھا۔

فرمایا: ما و عبدالرحمٰن یکے است۔

''ہم اور عبدالرحمٰن ایک ہی ہیں۔''

پھر مولانا ممدوح سے فرمایا:

درمیانِ ما و شما مناسبت در ازل بود۔ ●

''ہمارے اور آپ کے درمیان ہمیشہ سے مناسبت پائی جاتی ہے۔''

مولانا کی اپنے متعلق بشارتیں:

حضرت مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کی بعض بشارتوں کا تعلق خود ان کی اپنی ذات گرامی سے بھی ہے۔ مثلاً

﴿يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ○ ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ○ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ○ وَادْخُلِي جَنَّتِي ○﴾ (الفجر: ٢٧-٢٩)

''اے اطمینان سے رہنے والی جان تو اپنے رب کی طرف لوٹ جا، تو اس سے خوش، وہ تجھ سے خوش۔ میرے نیک بندوں میں شامل ہو جا، اور میری جنت میں داخل ہو جا۔''

یہ کیسی عمدہ ترین بشارت ہے جو اس طرح پوری ہوئی کہ وہ بیت اللہ شریف میں گئے اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق اس کا طواف کیا۔ پھر مدینہ منورہ میں حاضری دی اور مسجد نبوی میں حالت سجدہ میں وفات پا گئے۔ جنت البقیع میں تدفین ہوئی۔

☆......الہام ہوا یا اللہ کی طرف سے خوش خبری سنائی گئی۔

﴿إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا﴾ (البقرة: ١٢٤)

''میں تجھے لوگوں کا امام (سربراہ) بناؤں گا۔''

● یہ الہامات یا بشارتیں اربعین مظہری میں مرقوم ہیں، دیکھیے ص ۵۵۔

اور وہ واقعتاً صالحین کے سربراہ اور امام تھے۔ اس خاندان میں سربراہی اور امامت کا سلسلہ اللہ کے فضل سے اب بھی جاری ہے۔

☆......الہام ہوا: ﴿عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا﴾ (بنی اسرائیل: ۷۹)

''قریب ہے کہ تیرا رب تجھے مقام محمود تک پہنچا دے۔''

اللہ نے انھیں بیت اللہ اور مسجد نبوی تک پہنچایا اور لوگوں نے ان کے محامد و محاسن بیان کیے۔

☆...... بشارت ہوئی: عد نفسك من اصحاب رسول الله ﷺ.

''اپنے آپ کو نبی ﷺ کے صحابہ میں شمار کرو۔''

وفات کے بعد انھیں جنت البقیع میں دفن کیا گیا، جہاں بے شمار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مدفون ہیں، اس طرح ان کا ساتھ صحابہ رضی اللہ عنہم کی پاک باز جماعت میں ہوا۔

☆...... دعا: یا جامع الناس لیوم لا ریب فیه فاجمع بینی و بین محمد فی الدنیا و الاخرة.

''اے لوگوں کو اس دن میں جمع کرنے والے، جس میں کوئی شک نہیں، مجھے دنیا اور آخرت میں محمد ﷺ کے ساتھ جمع فرما دے۔''

ان شاء اللہ یہ دعا قبول ہوگی اور انھیں نبی ﷺ کی رفاقت نصیب ہوگی۔

☆......الہام ہوا: و رضوان الله اکبر

''اللہ کی رضا مندی سب سے بڑھ کر ہے۔'' [1]

فرید کوٹ میں مناظرہ:

حضرت مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے لاتعداد واقعات مختلف کتابوں میں مرقوم ہیں، جن میں ایک واقعہ فرید کوٹ میں مناظرے کا ہے، جو احناف اور اہل حدیث کے درمیان ہوا تھا۔ یہ مناظرہ ۳ جنوری ۱۸۸۳ء کو شروع ہوا تھا اور کئی مہینے جاری رہا تھا۔ مناظرے کا اہتمام اس دور کی ریاست فرید کوٹ کے حکمران راجا بکرم سنگھ نے کیا تھا، اسی کی صدارت میں مناظرہ ہوا تھا اور اس کے تمام اخراجات اسی نے برداشت کیے تھے۔ وہ اس قسم کے خالص دینی مباحث سے دلچسپی رکھتا تھا۔

مناظرے کا موضوع حسب ذیل پانچ مسائل تھے:

[1] اس قسم کی بشارتوں اور الہامات والقا کے لیے دیکھیے اربعین مظہری صفحہ ۵۶، ۵۷، ۵۸ نیز ملاحظہ ہو۔ ایقاظ غفلاء الزمان ص ۱۸ تا ۲۱۔ اس میں اربعین مظہری سے زیادہ بشارتوں کا ذکر ہے۔

۱- بے نماز کی نمازِ جنازہ پڑھنی جائز ہے یا نہیں؟

۲- تقلید شخصی

۳- رفع الیدین

۴- امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنا

۵- آمین بالجہر

مناظرے میں اہل حدیث اور احناف دونوں فریقوں کے سولہ سولہ علماء شامل تھے۔ یعنی شریک مناظرہ علماء کی کل تعداد بتیس ۳۲ تھی۔ احناف کی طرف سے مناظر مولانا احمد حسن جالندھری تھے اور اہل حدیث کی طرف مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی۔ ان کی غیر موجودگی میں مناظرہ مولانا عبدالقادر لکھوی یا مولانا نور احمد لکھوی کرتے تھے۔ راجا فرید کوٹ باقاعدگی سے مناظرے میں شامل ہوتا اور بڑے غور سے پوری کارروائی سنتا۔ علمائے کرام کی گفتگو اور ان کی حرکات وسکنات پر بھی نگاہ رکھتا۔

مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے دو عمل خاص طور پر راجا فرید کوٹ کے مرکز توجہ رہے۔

ایک یہ کہ تمام علمائے کرام کو کھانا راجا صاحب کی طرف سے دیا جاتا تھا اور وہ اسی کے دستر خوان پر کھانا کھاتے تھے، لیکن مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی اور ان کے کوٹ کپورہ کے رہنے والے ایک مرید حاجی نور الدین وہ کھانا نہیں کھاتے تھے۔ اس وقت فرید کوٹ میں موضع بڈھیمال کا ایک حجام رہتا تھا۔ ان دونوں نے کھانے کے پیسے اسے دے دیے تھے۔ وہی ان کا کھانا تیار کرتا تھا اور یہ اس کے گھر میں اپنی گرہ سے کھانا کھاتے تھے۔

دوسری بات یہ کہ جب مجلس مناظرہ میں راجا صاحب آتے تو علمائے کرام سمیت تمام حاضرین اس کے احترام میں کھڑے ہو جاتے لیکن مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کھڑے نہیں ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ راجا صاحب نے مولانا سے کھڑے نہ ہونے کی وجہ دریافت کی تو فرمایا ہمارے مذہب میں غیر مسلم کی تکریم کرنا اور ادب سے اس کے لیے کھڑا ہونا جائز نہیں۔

مولانا کے یہ الفاظ سن کر راجا خاموش ہو گیا اور اس کے بعد وہ لوگوں کو اکثر یہ واقعہ سنایا کرتا اور کہا کرتا تھا کہ میں نے اپنی زندگی میں صرف ایک عالم دین مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کو دیکھا ہے جو صحیح معنوں میں اپنے مذہب پر عامل تھے۔ [1]

اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں جن سے مولانا ممدوح کا پاکیزہ ترین عکسِ حیات واضح طور سے

[1] ملفوظ الحمدیہ: ص ۱۸۴-۱۸۷۔

ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔

اس زمانے میں ہندوستان کے شہر مدراس سے ”شمس الاخبار“ کے نام سے ایک اخبار شائع ہوتا تھا۔ اس کی جلد پنجم کے شمارہ نمبر ۲۶ (بابت جون ۱۸۸۳/شعبان ۱۳۰۰ھ) میں اس مناظرے کی تفصیل چھپی تھی۔

تصانیف:

حضرت مولانا لکھوی نے بہت سی مصروفیات کے باوجود بعض تصنیفی خدمات بھی سرانجام دیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱- حل مشکلات ایسا غوجی: اثیر الدین ابہری (متوفی ۶۶۳ھ) کی تصنیف ”ایسا غوجی“ جو علم منطق کی ابتدائی کتاب ہے، کسی زمانے میں دینی مدارس کے نصاب میں شامل رہی تھی، مولانا لکھوی نے عربی میں اس کے مشکل مقامات کی وضاحت فرمائی۔

۲- حاشیہ کشف المبہم مافی المسلّم: مولانا لکھوی کے استاذِ محترم قاضی بشیر الدین محدث قنوجی نے قاضی محبّ اللہ بہاری کی کتاب مسلّم الثبوت کی شرح کشف المبہم کے نام سے لکھی تھی۔ مولانا لکھوی نے اس پر حاشیہ تحریر فرمایا۔

۳- شرح شرح الوقایہ: مولانا نے عربی زبان میں علم فقہ کی مشہور درسی کتاب شرح الوقایہ کی شرح لکھنا شروع کی تھی، لیکن مکمل نہ ہو سکی۔

۴- حاشیہ مختصر المعانی

۵- ردِ وظیفہ یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ

۶- ترجمہ اربعین نووی (بہ زبان پنجابی)

۷- نماز کا پنجابی ترجمہ

۸- محامد الاسلام

جیسا کہ اختصار کے ساتھ گزشتہ صفحات سے معلوم ہوا حضرت مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار محاسن سے نوازا تھا۔ وہ مبلغ اسلام، مستجاب الدعوات، صاحب کرامات اور ولی اللہ تھے۔ ان اوصاف حمیدہ کے ساتھ ساتھ وہ مصنف بھی تھے، لیکن افسوس ہے ان کی بعض تصانیف دست بردِ زمانہ کی نذر ہو گئیں۔

حج بیت اللہ کی لیے روانگی:

مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی حج بیت اللہ کی شدید خواہش رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی

طرح جلد از جلد مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ پہنچیں اور ان مقدس مقامات کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی سعادت حاصل کریں جہاں اللہ کے رسول ﷺ سکونت فرما تھے، جہاں آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے شب و روز گزرتے تھے۔ چنانچہ اللہ نے کرم فرمایا اور ۹ شعبان ۱۳۱۲ھ (۵ فروری ۱۸۹۵ء) کو اپنے تیرہ رفقا کی معیت میں گھر سے روانگی کا فیصلہ ہوا، لیکن اس دن کسی وجہ سے روانگی نہ ہو سکی تو دوسرے دن یعنی ۱۰ شعبان کو عصر کے وقت فیروز پور کو روانہ ہوئے۔ پہلی رات ایک گاؤں میں بسر کی۔ دوسرے دن ۱۱ شعبان کو فیروز پور پہنچے۔ فیروز پور سے ریل کے سیکنڈ کلاس کے ٹکٹ لیے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لیتے، اس کا کرایہ کم ہے، فرمایا بے شک اس کا کرایہ کم ہے، لیکن اس میں بھیڑ کی وجہ سے نماز پڑھنا مشکل ہوتا ہے۔ دوسرے درجے میں بھیڑ نہیں ہوتی اور نماز آرام سے پڑھی جا سکتی ہے۔

مولانا سید محمد داؤد غزنوی بھی ریل کا سفر سیکنڈ کلاس میں کیا کرتے تھے۔ اگر کوئی اس کی وجہ پوچھتا تو یہی جواب دیتے جو مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی نے دیا تھا کہ تھرڈ کلاس میں آرام سے نماز نہیں پڑھی جا سکتی، سیکنڈ کلاس میں نماز پڑھنے کی سہولت حاصل ہوتی ہے۔

بہر حال مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی فیروز پور سے دہلی گئے۔ وہاں چند روز قیام کیا۔ پھر ۲۵ شعبان ۱۳۱۲ء کو بمبئی پہنچے۔ اس زمانے میں سمندری جہاز پر سفر کیا جاتا تھا۔ جدہ کے لیے ''حسینی جہاز'' تیار تھا۔ مولانا کے ایک ساتھی نے اس جہاز کے ٹکٹ بھی لے لیے۔ لیکن کسی وجہ سے اس پر سوار نہیں ہوئے۔ بعد ازاں ۱۸ رمضان ۱۳۱۲ھ کو ناصری جہاز پر سوار ہوئے اور ایک مقام پر اپنے قافلے کے ساتھ عید الفطر کی نماز پڑھی۔

اس دور کی تاریخ کو تازہ کرنے کے لیے ان کے اس مبارک سفر کے رفقائے کرام کے نام بھی پڑھ لیجیے۔

۱- مولانا الٰہی بخش ساکن کلیر۔ ضلع قصور: یہ غزنی کے سفر میں بھی ان کے ساتھ تھے۔
۲- نور الدین موضع بڈھی مال: اس وقت یہ گاؤں ضلع فیروز پور کی تحصیل مکتسر میں تھا۔
۳- مولوی غلام حسین امام مسجد موضع موکل ضلع قصور
۴- لقمان ساکن موکل ضلع قصور
۵- محمود ساکن موکل ضلع قصور
۶- قادر بخش ساکن تاڑا
۷- مولوی امام الدن ساکن راجووال ضلع اوکاڑہ۔
۸- غلام ساکن مصری (اس سے زیادہ ان کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکا)
۹- حافظ عبدالرحمٰن (یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کہاں کے رہنے والے تھے)

۱۰- عبداللہ بن خان محمد (ان کے مقام سکونت کا بھی علم نہیں ہو سکا)

۱۱- رمضان (ان کے بارے میں بھی اس سے زیادہ پتا نہیں چلا)

۱۲- اللہ دین۔ ساکن کوٹ کپورہ۔ ریاست فرید کوٹ

۱۳- حلیم ساکن کھپیاں والی ضلع فیروز پور

مولانا سمیت یہ کل چودہ آدمی ہوئے جن کے نام مولوی خدا بخش واعظ نے ''تحفہ واعظ'' میں لکھے ہیں۔ بعض نام پورے نہیں ہیں، آدھے ہیں مثلاً رمضان، حلیم، محمود، بعض کی سکونت کا پتا نہیں ملتا۔ بعض ناموں کے ساتھ تحصیل اور ضلع میں نے خود لکھے ہیں جو کہ مجھے معلوم تھے۔ کتاب پنجابی اشعار میں ہے اور بسا اوقات شعر میں پورا نام ذکر کرنا مشکل ہوتا ہے۔

چودہ افراد کا یہ قافلہ ناصری جہاز سے جدہ کی بندرگاہ پر اترا اور وہاں سے ۱۶ شوال جمعرات کو شب کے دو بجے کے قریب مکہ مکرمہ پہنچا۔ عمرہ کر کے احرام کھولا اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے ان کو اپنے گھر میں حاضری اور اس کے طواف و زیارت کا شرف بخشا۔

مدینہ کو روانگی اور وفات:

عمرے سے فارغ ہو کر مولانا ممدوح نے پانچ ساتھیوں کو مکہ مکرمہ چھوڑا اور باقیوں کی رفاقت میں مدینہ منورہ کو روانہ ہوئے۔ اس وقت بالکل تندرست تھے۔ راستے میں بیمار ہو گئے۔ بیماری کی حالت میں مدینہ منورہ پہنچے۔ مسجد نبوی میں نمازیں پڑھنے اور نبی ﷺ کے روضۂ مبارک کو دیکھنے کا شدید جذبہ دل میں موجزن تھا۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ اسہال آنے لگے۔ پوری کوشش کی کہ کسی کو بیماری کا پتا نہ چلے۔ اپنا کام خود کرتے رہے۔ پیاس لگتی تو خود ہی اٹھ کر پانی پیتے۔ کسی ساتھی کو کسی قسم کی تکلیف نہ دیتے۔ جمعرات کے دن ۱۴ ذیقعدہ کو مدینہ منورہ پہنچے۔ جب پیاس سے نڈھال ہو گئے تو اپنے ایک ساتھی عبداللہ سے فرمایا مجھے ٹھنڈا پانی پلاؤ یا کہیں سے کوئی شربت لاؤ۔ عبداللہ فوراً بازار گئے اور انار لائے۔ اس کا شربت بنا کر انھیں پلایا۔ جمعۃ المبارک کے دن ۱۵ ذیقعدہ ۱۳۱۲ھ (۱۰ مئی ۱۸۹۵ء) کو مسجد نبوی میں حالتِ سجدہ میں ساٹھ (۶۰) سال کی عمر پا کر انتقال فرما گئے اور قبرستان جنت البقیع میں دفن کیے گئے۔

اللھم وسع مدخله و نور قبره و ارفع درجته و ادخله جنت الفردوس.

مولانا منہاج الدین ہزاروی

(وفات ۲- جنوری ۱۸۹۹ء)

برصغیر کے ممتاز علماے دین میں سے ایک جید عالم دین مولانا منہاج الدین ہزاروی تھے، جنھوں نے حضرت سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید دہلوی کی جماعت مجاہدین سے بھی وابستگی اختیار کی اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بھی حصہ لیا۔ وہ حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی اور دیگر متعدد اصحابِ علم سے مستفید ہوئے۔ حضرت سید عبداللہ غزنوی اور مولانا سید عبدالجبار غزنوی سے ان کی خط کتابت رہی۔ علم وعمل میں ان کا مرتبہ بڑا بلند تھا۔ ان کے اخلاف میں سے جناب عبدالرشید قریشی ایک مخلص ترین ذی علم شخصیت ہیں۔ انھوں نے ان کے حالات میں ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے، جس کا نام ''۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا مردِ مجاہد مولانا منہاج الدین ہزاروی'' ہے۔ کتاب ۲۴۶ صفحات پر مشتمل ہے اور بہت سے واقعات کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختون خوا) سے انگریزوں کے ظلم و ستم کی بنا پر عبدالرشید قریشی کا خاندان جلا وطن ہوا اور ان کے جدِّ امجد مولانا منہاج الدین اس علاقے سے نکلنے پر مجبور ہوئے۔ ان کی جاداد ضبط ہوئی اور مکانات مسمار کر دیے گئے۔

اس کتاب میں متعدد حضرات کے مکتوبات درج ہیں جو انھوں نے مولانا منہاج الدین کے نام ارسال کیے۔ محترم عبدالرشید قریشی نے کتاب میں مولانا ممدوح کے آبا و اجداد کا تذکرہ بھی کیا ہے اور ان کے اخلاف کا بھی۔ آئندہ سطور میں یہ تذکرہ انھی کے الفاظ میں درج کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ فرمایے:

مولانا منہاج الدین صاحب ایک منفرد اور دینی اخلاق و اوصاف سے متصف عظیم گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے والد محترم مولانا سراج الدین بن حافظ مستقیم بن شاہ ناصر الدین قریش النسب تھے۔

ناصر الدین شاہ:

آپ کے پردادا ناصر الدین شاہ ملتان سے راولپنڈی کے نواح میں دریاے سواں کے کنارے ایک گاؤں ''میاں احمدہ'' (علاقہ چونترہ اڈیالہ جیل سے دس کلومیٹر آگے) تشریف لائے۔ یہ اللہ کے ایک عظیم ولی اور تارک دنیا بزرگ تھے۔ اس علاقے میں اعلاے کلمۃ اللہ اور دین کی سربلندی کے لیے ساری زندگی مصروف عمل رہے۔ اسی جگہ انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا اور یہیں دفن ہوئے۔ اس علاقے کے لوگ آج بھی ان

کی بزرگی اور للّٰہیت کے بہت سے واقعات سناتے ہیں۔

حافظ مستقیم صاحب:

شاہ ناصر الدین صاحب نے اپنے بیٹے ''حافظ مستقیم'' کو تبلیغ جہاد کے لیے گاؤں گاؤں بھیجا۔ آپ یہ عظیم الشان فریضہ انجام دیتے ہوئے پہاڑی علاقہ ناڑہ میں تشریف لائے۔ اسی دوران میں علاقہ گلیات اور ہری پور میں سکھ وارد ہوئے تو یہاں انھوں نے سکھوں کے خلاف جہاد شروع کر دیا، آپ کی وفات ۱۷۴۰ء میں ہوئی۔

مولانا سراج الدین:

حافظ مستقیم صاحب نے اپنے بیٹے مولانا ''سراج الدین'' کو سکھوں کے خلاف جہاد کے لیے ہری پور بھیج دیا۔ آپ نے یہاں آ کر ہری پور کے قریب ایک گاؤں ''ڈھینڈہ'' کو اپنا مرکز اور قیام گاہ بنا لیا۔ جہاں آپ درس و تدریس کے ساتھ ساتھ اپنے طلبہ اور دیگر مجاہدین کے ہمراہ سکھوں کے خلاف جہاد میں بھی مصروف ہو گئے۔ چونکہ مسلمانوں پر سکھ قوم کی زیادتیاں اور قتل و غارت انتہاء کو پہنچ چکا تھا اس لیے آپ نے ان کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔ روزانہ ٹیکسلا کے قریب مارگلہ میں سکھوں پر شب خون مارتے اور واپس ہری پور چلے جاتے۔ درس و تدریس اور تبلیغ کا کام بھی ساتھ ساتھ انجام دیتے رہے۔ وہ بہت بڑے عالم و فاضل بزرگ تھے۔ ان کے بہت سے خطوط اور دیگر نادر مخطوطات اب تک محفوظ ہیں۔

ادھر گلیات میں سردار حسن علی خان اور سردار نواب خان کی حکومت تھی، یہ بھی سکھوں کے خلاف حافظ مستقیم صاحب کی راہنمائی میں جنگ میں مصروف تھے۔ سردار صاحب نے پورا جنگی سامان اور بہت بڑی فوج تیار کر رکھی تھی۔ آپ دن کو ہندوؤں اور سکھوں سے جنگ کرتے اور رات کو اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول رہتے۔ یہ ان کا روزانہ کا معمول تھا۔ مولانا سراج الدین صاحب اپنے والد حافظ مستقیم صاحب کی وفات کے بعد اپنے شاگرد مولانا عبدالرب صاحب (جن کی ہمشیرہ آپ کے نکاح میں تھی) کو ساتھ لے کر سردار حسن علی کے پاس علاقہ گلیات میں تشریف لے آئے اور مصروف جہاد ہو گئے۔

ایک دفعہ سردار حسن علی کے بھائی سردار نواب خان کو سکھوں نے گرفتار کر کے قلعہ ہری سنگھ میں قید کر دیا۔ قلعے کے گرد چاروں طرف خندق کھودی ہوئی تھی (جو اب تک اسی صورت میں قائم ہے اور تحصیل و تھانہ ہری پور کا دفتر ہے) سکھ رات کو اس خندق میں پانی چھوڑ دیتے اور پل کو کھینچ لیتے۔ سردار حسن علی خان اپنے معاونین مولانا سراج الدین وغیرہ کے ساتھ رات کو قلعے پر حملہ آور ہوئے تو چاروں طرف پانی دیکھا، اندر جانے کا کوئی راستہ نہ مل سکا۔ اس کی گہرائی بھی بہت زیادہ تھی مگر رسّوں کی مدد سے خندق عبور کر گئے اور

پہرے دار کے ساتھ معمولی مزاحمت کے بعد اس سے زنداں کی چابیاں لے کر اپنے بھائی کو نکال کے راتوں رات گھوڑوں پر واپس گلیات آ گئے۔ اس واقعے سے سکھوں کے دلوں پر ان کی ہیبت طاری ہوگئی۔

مولانا منہاج الدین:

اس کے بعد مولانا سراج الدین صاحب وفات پا گئے اور ان کے دو بیٹے منہاج الدین اور وہاج الدین پیچھے رہ گئے۔ ثانی الذکر جلد ہی وفات پا گئے اور منہاج الدین صاحب اور مولانا عبدالرب صاحب فریضہ تبلیغ و جہاد میں مصروف رہے۔

اسی اثنا میں جناب سید احمد صاحب رحمہ اللہ اور شاہ اسماعیل صاحب رحمہ اللہ کا اس علاقے میں ورود مسعود ہوا تو ان کے بالاکوٹ پہنچنے سے پہلے ہی یوسف زئی کے مقام پر مولانا عبدالرب صاحب اور مولانا منہاج الدین صاحب ان سے جا ملے۔ سید صاحب اور شاہ صاحب کے ساتھ ہو کر جہاد کرنے کا عزم ظاہر کیا تو سید صاحب نے انھیں ہدایت فرمائی کہ واپس جا کر اپنے ہی علاقے میں تبلیغ اور جہاد کا کام جاری رکھو۔ ہم بھی عنقریب تمھارے پاس آ رہے ہیں۔ مولانا قاسم کو ان کے ہمراہ کیا تاکہ یہ لوگوں کو منظم طریقے سے سکھوں کے خلاف جہاد کے لیے تیار کر سکیں اور آگے کشمیر کی طرف پیش قدمی کی جائے۔ انگریزوں نے ہزارہ گزٹیئر میں اس کا ذکر کیا ہے اور ان کی سرگرمیاں بیان کی ہیں۔

۲۴ ذی القعدہ ۱۲۴۲ء مطابق ۶ مئی ۱۸۳۱ء جمعۃ المبارک کے دن سید صاحب اور شاہ صاحب تبلیغ دین حق اور اعلاے کلمۃ اللہ کرتے ہوئے اپنے رفقاء کے ساتھ بالاکوٹ کے مقام پر شہید ہو گئے۔ تمام مسلمانان ہند کے لیے یہ بہت بڑا المیہ تھا۔ دو تین دن کے بعد اس فوج کے بقیہ تقریباً ۸۰ آدمی علاقہ گلیات میں آ گئے۔ یہ لوگ سردار حسن علی خان صاحب کے ساتھ ہو کر سکھوں کے خلاف معرکہ آرا ہوئے جن میں شاہ رمضان اور مولانا خرم علی بھی شامل تھے۔ ان میں سے کچھ تو دیوال منال میں فوت ہو گئے اور کچھ لوگ واپس ہندوستان چلے گئے۔

ہزارہ میں انگریزوں کی آمد:

اس کے بعد ہزارہ میں انگریز داخل ہونا شروع ہوئے تو ان مجاہدین نے انگریزوں کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔ ۵ مئی ۱۸۴۸ء کو کڑلال قوم کی انگریزوں سے لڑائی ہوئی اور سردار حسن علی خان، سردار سکندر خان، سردار طوباز اور سردار کرم خان، مولانا منہاج الدین اور مولانا عبدالرب گرفتار ہوئے اور علیحدہ علیحدہ ایبٹ جیمز (ڈپٹی کمشنر ہزارہ) کے پیش کیے گئے۔ اس نے منہاج الدین اور عبدالرب صاحب کو کہا کہ ”سب قوموں نے ہمارے ساتھ لڑائی نہ کرنے کا عہد کر لیا ہے۔ اگر آپ بھی چاہیں تو دوسروں کی طرح آپ کو گزارا

دے کر معاف کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی ایسی صورت ہوسکتی ہے تو بتائیں!'' انھوں نے کہا کہ ''ملک ہمارا ہے اور ہم مسلمان ہیں، جب کہ تم سب غاصب ہو۔ اگر تم ہمارے ملک سے نکل جاؤ تو ہمارا تم سے کوئی جھگڑا نہیں۔'' ایبٹ غصے میں آ گیا اور منہاج الدین صاحب سے کہنے لگا ''جاؤ لکڑی گھاس بیچا کرو۔'' ایبٹ کے ہمراہ اس علاقے کا جاگیردار قاضی میر عالم ہری پور اور جاگیردار راجہ جہاں داد خان بھی تھے۔ ایبٹ ان کو کالا پانی اور جزائر انڈیمان کی طرف جلا وطن کرنا چاہتا تھا۔ مگر قاضی میر عالم جاگیردار ہری پور نے ایبٹ کو مشورہ دیا کہ آپ نے انھیں کالا پانی جلا وطن کر دیا تو کالا باغ کے کڑلال کبھی جنگ بند نہ کریں گے اور ان پر کنٹرول کرنا مشکل ہو جائے گا۔ ان کو اپنے علاقے سے دور کہیں سامنے ہی جلاوطن کر دیں اور اگر پسند ہو تو ہمارے علاقے میں جلا وطن کر کے بھیج دیں۔

جلا وطنی:

ایبٹ نے یہ مشورہ مان لیا اور مولانا منہاج الدین صاحب کو موضع ڈھیری سکندر پور ہری پور میں جلا وطن کر کے قاضی میر عالم کی زیرِ نگرانی نظر بند کر دیا اور ڈھیری میں پہرہ سرکار لگا دیا جو کہ سات سال قائم رہا، جب کہ مولانا عبدالرب صاحب کو راجہ جہاں داد کے علاقے کوٹ نجیب اللہ میں قوم مقدم گجروں کی نگرانی میں نظر بند کر دیا۔

ضروری وضاحت:

یہاں یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ مولانا منہاج الدین صاحب چونکہ انگریز کے ہاتھوں جلا وطن ہو کر ہری پور ڈھیری سکندر پور میں رہائش پذیر تھے بنا بریں ان کے نام کوئی جائیداد وغیرہ انگریزی قانون کے مطابق نہیں ہوسکتی تھی۔ اس لیے انھوں نے نبی ﷺ کی حدیث ابن اخت القوم منہم کے پیش نظر انگریزوں کا نشانہ بننے اور ان کے قانونی دباؤ سے تحفظ کے لیے اپنی نسبت امہات کی طرف کرتے ہوئے قوم میاں لکھوا دی اور اگر ہو سکے تو کاغذات مال میں اس کی تصحیح کا ارادہ تھا۔

قاضی میر عالم نے مولانا منہاج الدین صاحب کے عالم دین ہونے کی وجہ سے ان کی قربت چاہی اور قرآن و حدیث پڑھانے کی درخواست کی تو آپ نے ان کی درخواست قبول کر لی۔ چنانچہ اس نے انھیں ڈھیری میں مسجد تعمیر کروا دی۔ ان پر سے پابندیاں نرم کر دیں اور خود اہل حدیث ہو گیا اور منہاج الدین کے کہنے پر کافی کتابیں لکھیں جن میں ایک کتاب ہزارہ یونیورسٹی (مانسہرہ) حلت سماع (مترجم بشیر احمد) بھی ہے۔

مجاہدین نے انگریزوں کے خلاف جہاد جاری رکھا اور اپنے مراکز چمرکنڈ اور اسمس کالا ڈھاکہ بنا لیے۔ وہ ہندوستان سے اپنے مراکز کی طرف ڈھیری کے راستے سے آتے جاتے رہے۔ ۱۷ مجاہدین ڈھیری سے

تقریباً ۴/۱ میل کے فاصلے پر چھوٹی سی مسجد میں شہید کر دیے گئے۔ وہاں اب بھی ان کی قبریں موجود ہیں اور ''شہیدوں کی قبریں'' کے نام سے مشہور ہیں۔ وہ مسجد بھی موجود ہے۔

حضرت مولانا عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ کابل سے ہجرت کر کے آئے تو ایک مجاہد ''حیات گل'' نے ہزارہ میں ڈھیری سکندر پور آنے کا مشورہ دیا اور وہ تقریباً ایک سال مولانا منہاج الدین کے پاس رہے اور گم نامی کی صورت میں وہاں تبلیغ و جہاد کا سلسلہ جاری رہا۔ پھر وہاں سے دہلی روانہ ہو گئے۔ [1]

بعد میں مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی مجاہدین کے ساتھ سرگرم عمل رہے اور انھوں نے جہاد کا پرچم سرنگوں نہیں ہونے دیا۔

جب تمام برصغیر میں انگریزوں کے قدم مضبوط ہو گئے اور انھوں نے مجاہدین کے نئے مراکز چمرکنڈ وغیرہ کو بھی تباہ کر دیا تو مجاہدین ادھر ادھر سرگرداں رہے۔ انگریز کے خلاف جہاد کی سکت نہ رہنے کے باوجود بھی آخر دم تک تحریک جہاد کا پرچم بلند کیے رکھا۔

یہ سب اکابر مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی، صبغۃ اللہ، عبدالکریم چمرکنڈی وغیرہ حضرات وقتاً فوقتاً ہمارے (مولانا منہاج الدین کے) گھر آتے رہے۔ سب سے بڑی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ پورے ہندوستان (دہلی سے ہزارہ تک) میں یہ مرد مجاہد خدمت مجاہدین میں نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ چندے جو دہلی، بمبئی، بھوپال، لکھنؤ، امرتسر وغیرہ اور نواب وزیر الدولہ وغیرہ کی طرف سے آتے، یہ ڈھیری کے راستے ہی اٹمس (کالا ڈھاکہ) چمرکنڈ میں پہنچتے۔

---

[1] سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی تصنیف مولوی غلام رسول صاحب ساکن قلعہ میہاں سنگھ صفحہ ۲۹ مطبع القرآن والسنۃ امرتسر۔ اس کتاب میں مولانا عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ کا ایک خط بنام مولانا منہاج الدین بھی موجود ہے جو یہاں درج کیا جا رہا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ!

از عائذ باللہ و معتصم بحبل اللہ عبداللہ ہر ایک از اہل اخلاص و ارباب اختصاص مولوی منہاج الدین و حافظ محمد عظیم و سلطان محمد و محمد اکبر و دین محمد قاسم و فتح نور و نور محمد و گامہ و بختار و انور و فضل و جمال الدین خصوصاً زبدہ اخلاص منہاس مولوی عبدالرب۔ بعد از سلام مسنون و ادعیہ مودت مقرون واضح آں کہ در باب تمسک بکتاب و اعتصام سنت رسول اللہ ﷺ چہ گویم و چہ نویسم کہ صفحہ کاغذ از بیان است و پائے قلم از تگ و دو در میدان آں لنگ۔ اخوان عزیز دنیا دنی را روز چند دانستہ در طلب مرضیات او تعالیٰ بجان و دل کوشند و زندگانی ایامی را اندک دانستہ در ابتغاء وجہ اللہ کمر ہمت را چست بندند و کتاب اللہ و سنت رسول اللہ ﷺ تا روح مستعار علیہ و اعلیٰ پرواز نمودہ شغل ضروری باشتغال لا طائل و مال و منال بے حاصل غافل نشود و مرضیات و مکروہات او تعالیٰ را ازیں اصلین راسخین معلوم کردہ در امتثال اوامر حسب تعظیم آں و اجتناب و انتہاء از نواہی و بغض و نفرت ازاں سعی بیش از بیش کنند فقیر خود را ہمیشہ بترویج کلام اللہ و ابتغاء مرضات ماموری بیند پس لابد آشنا و بیگانہ را ترغیب ی دہم و از غیر آں بتغیر و تکراری نویسم کہ در تدبر کلام اللہ و تذکیر از مواعظ اں و تفکر و تاثر از نصائح آں اوقات عزیزہ خود را معمور گردانند۔ (سوانح مذکور ص ۴۷)

مختصر تعلیمی پس منظر اور اولاد:

۱- مولانا منہاج الدین صاحب ڈھیری سکندر پور نے ایک سند حدیث شیخ الکل مولانا سید نذیر حسین صاحب رحمہ اللہ سے لی۔

۲- اور ایک سند حضرت مولانا عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ سے لی۔

۳- ایک سند حضرت مولانا عبدالجبار صاحب غزنوی سے ملی۔

۴- اور ایک سند حسین بن محسن انصاری یمانی سے لی۔

آپ کے بیٹے عبدالوہاب اور محمد اسماعیل نے ایک سند حضرت شیخ الکل مولانا سید نذیر حسین صاحب سے لی اور ایک سند حسین بن محسن انصاری یمانی سے لی، جب کہ آپ کے بیٹے محمد اسحاق نے آپ ہی سے سند لی اور آپ کے ماموں زاد عبدالرحمٰن بن عبدالرحمٰن بن عبدالرب نے بھی آپ ہی سے سند حاصل کی۔

مولانا منہاج الدین کی وفات:

مولانا کی وفات ۱۷ شعبان ۱۳۱۶ھ (۲ جنوری ۱۸۹۹ء) کو ہوئی۔ ان کے بیٹے محمد اسماعیل کے زمانے میں یہ تحریکی سلسلہ جاری رہا۔ (دیکھیے تعارف جماعت مجاہدین چودھری عبدالحفیظ۔ سید بادشاہ کا قافلہ آباد شاہ پوری ص ۳۸۸)

مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی فرماتے ہیں: ہری پور سے کوئی دو میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا گاؤں ڈھیری ہے۔ یہاں ایک مجاہد بھائی مولوی محمد اسماعیل (بن مولانا منہاج الدین) رہتے تھے۔ ان کا گھر گویا ایک طرح کا سفری کیمپ تھا اور مولوی محمد اسماعیل صاحب مع مال وغیرہ مجاہدین کو سرحد پار کراتے اور ان کو اُس کے مقام پر پہنچاتے۔

اس کے ثبوت میں ہمارے پاس علماء اور مجاہدین کے کافی خطوط اب بھی موجود ہیں جن میں حضرت مولانا عبداللہ غزنوی، مولانا عبدالجبار غزنوی، مولانا عبدالواحد غزنوی، سید عمر شاہ، محمد شاہ، سید عبداللہ شاہ، مولانا محمد حسین ہزاروی ڈھینڈہ، احمد خان، عبدالرحمٰن بن عبدالرب، عبداللہ عطار مکہ مکرمہ، شاہ ولی اللہ دہلوی، محمد خان پوری، عبدالغفور پٹنہ، شاہ محمد اسحاق صاحب، امجد بیگ، اسعد بیگ، محمد اکبر ساکن مکہ، غلام حسن خان پوری، محمد افضل امرتسری، عبدالاحد اور عبدالمجید دہلوی وغیرہم شامل ہیں۔

مولانا منہاج الدین صاحب کے تین بیٹے تھے محمد اسماعیل، محمد اسحاق اور عبدالوہاب ...... محمد اسحاق اور عبدالوہاب تو جوانی میں ہی طاعون کے مرض سے وفات پا گئے۔ البتہ محمد اسماعیل صاحب زندہ رہے جنھوں نے تمام تعلیم اپنے والد محترم سے حاصل کی اور اسی طرح اپنے پیش روکی سی مجاہدانہ زندگی بسر کی۔ اپنے وقت

کے بہت بڑے طبیب بھی تھے۔ تمام عمر غرباء کی امداد اور علاج معالجے کا کام مفت جاری رکھا۔ امیر المجاہدین صوفی محمد عبداللہ صاحب (اوڈاں والا) بھی ان کے ہاں کافی دیر تک رہے یہاں تک کہ انگریزوں نے انھیں گرفتار کر کے سزا دی اور ان کے نازک اعضاء پر ضربیں لگا کر ناکارہ کر دیا۔ پاکستان بننے سے قبل جماعت مجاہدین کے کچھ اختلافات کی وجہ سے آپ اوڈاں والا چلے گئے تھے۔

مولانا فضل الٰہی صاحب وزیر آبادی بھی ان کے ہاں آتے رہے۔ آپ کی وفات ۱۹۵۱ء میں ہوئی اور قبر بالاکوٹ میں ہے۔

محمد ادریس:

مولانا محمد اسماعیل نے اپنے پیچھے ایک بیٹے محمد ادریس کو چھوڑا جو انتہائی ذہین اور عالم دین تھے۔ انھوں نے تمام تعلیم اپنے والد سے حاصل کی ۔ وہ طبیب بھی تھے۔ خدمت دین اور تبلیغ و جہاد کے علاوہ بلا معاوضہ لوگوں کے علاج معالجہ میں مصروف رہے۔

۱۹۴۷ء میں مجاہدین کے ساتھ ہو کر امیر رحمت اللہ کی امارت میں جہاد کشمیر میں حصہ لیا اور تمام مجاہدین (جو کالا ڈھاکہ سے قافلہ در قافلہ آتے وہ) موضع ڈھیری سے ہوتے ہوئے علاقہ کڑلال کے راستے مظفر آباد پہنچتے۔ چار دن کے اندر اندر کشمیر کا وہ حصہ جو اس وقت پاکستان میں شامل ہے حاصل کیا۔ اس کے بعد محمد علی جناح، لیاقت علی اور عبدالقیوم خان نے ان سے کہا کہ اگر آپ نے جہاد جاری رکھا تو پاکستان بھی ہمارے ہاتھوں سے نکل جائے گا اس لیے انھوں نے پیش قدمی روک دی۔

خان عبدالقیوم خان کے وعدہ کرنے پر کہ ''اسلحہ روپیہ و دیگر اخراجات گورنمنٹ پاکستان دے گی اور علاقہ کڑلال اور مجاہدین مل کر دوبارہ جہاد جاری کریں گے''، حکومت پاکستان نے مجاہدین کو پیچھے ہٹا لیا۔ اس طرح مجاہدین واپس اَمس (یعنی کالا ڈھاکہ) چلے گئے۔

مولانا محمد ادریس صاحب نے درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور لوگوں کو اجتماعی سٹیج پر لانے کے لیے دین کی بے لوث خدمت کی۔ تنظیم سازی اور رفاہی کام تمام زندگی انجام دیتے رہے۔ آپ مورخہ ۶۔ ذی الحجہ ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۹۸۲ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اپنے پیچھے دو بیٹے احمد اور عبدالمتین چھوڑے۔

مولانا محمد ادریس ایک مجاہد، جید عالم اور درویش منش انسان گزرے ہیں۔ میرا ان کے ساتھ کافی وقت گزرا۔ حد درجہ متوکل علی اللہ تھے۔ کسی سے کھانا، چائے اور پیسے یا کوئی اور دنیاوی امداد نہ لیتے تھے، کوئی دینے کی کوشش کرتا تو اس کو سختی سے منع کرتے کہ تم مجھے اللہ کے دروازے پر رہنے سے دور کر رہے ہو، تم میرے دوست نہیں، دشمن ہو۔

ایک دفعہ سلطان خان آف بگڑا تانگے پر سوار شہر سے گزر رہا تھا۔ اس کی نظر محمد مولانا ادریس پر پڑی تو تانگے سے نیچے اتر کر سلام کیا۔ پھر اس نے کہا کہ میں ایک گزارش کرنا چاہتا ہوں اگر آپ قبول فرمائیں۔ کہا فرمائیے۔ اس وقت میری عمر ۱۲ یا ۱۴ سال کی ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ ایک کپ چائے میرے ساتھ پئیں۔ محمد ادریس صاحب نے کہا کہ خان صاحب آپ مجھے اتنا بتا دیں کہ کل اس وقت آپ کہاں ملیں گے۔ اس نے کہا اللہ جانتا ہے۔ میرے دادا محمد ادریس نے کہا کہ آپ کو یہ پتا نہیں تو کل پھر اس وقت مجھے چائے کی طلب ہو گی تو آپ کو کدھر ڈھونڈوں گا۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ جس دروازے پر بلاناغہ اور ہر وقت ہر چیز مل جاتی ہے، اسی دروازے پر مجھے رہنے دیں۔ آپ کی مہربانی ہوگی۔ اس نے معافی مانگی اور چل دیا۔ اس طرح کے روزانہ واقعات میری آنکھوں کے سامنے سے گزرتے تھے۔ میری تربیت بھی ایسی ہی تھی۔ جب سکول جاتا، راستے میں کوئی باغ پھل والا آتا تو کہتے بیٹا پرایا باغ آ گیا ہے۔ اپنی آنکھیں بند کر لو۔ میں ان کی انگلی پکڑ کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا۔ جب باغ ختم ہوتا تو کہتے آنکھیں کھول لو۔ یہ آنکھیں بند کرنا اور کھولنا میرا معمول ہوتا۔ کسی غریب کو صدقہ خیرات میرے ہاتھ سے دلواتے تاکہ میرا ہاتھ کشادہ ہو اور میں سخی بنوں۔ مجھے کہتے کسی مانگنے والے کو خالی ہاتھ مت بھیجنا۔ یہ اللہ کی آزمائش ہوتی ہے۔ میں نے ایک دفعہ ان کو کہا کہ کاکا جی جب ہم باہر نکلتے ہیں تو لوگ ہمیں ولیوں کی اولاد کہتے ہیں۔ یہ ولی کیا ہوتے ہیں اور ہمیں یہ لوگ کیوں ولی کہتے ہیں؟ وہ خاموش ہو کر چلتے رہے۔ آخر ایک دکان چارپائی کے پائے بنانے والی آئی۔ ایک بوڑھا شخص پائے بنا رہا تھا۔ وہاں کھڑے ہو گئے۔ پھر جب وہ پائے بنا چکا تو مجھے اپنے ساتھ بٹھایا اور کہا کہ یہ پائے تو بنا سکتا ہے؟ میں نے کہا نہیں۔ پھر کہا کیا میں بنا سکتا ہوں؟ میں نے کہا نہیں۔ فرمایا دیکھو بیٹا جب آپ اللہ کی بندگی اور اس کی رضا اور اس کی حمد و ثنا پر قائم رہو تو اللہ تعالیٰ انسان کو ایک خاص رتبہ عنایت کر دیتا ہے جو عام لوگوں میں نہیں ہوتا۔ یہی ولی کی تعریف ہے۔ آج تک میں نے یہ واقعہ یاد رکھا۔ ان کا درس دینا بھی مثالی تھا۔ علماء میں رہتے تو عالمانہ باتیں کرتے اور کبھی ان پڑھ کے ساتھ ہوتے اس کو اس کے لہجے میں سمجھاتے۔ بلند اخلاق کے مالک تھے۔ ان کی علمی بصیرت کے چند خطوط بھی ہیں جو کہ انھوں نے مجھے لکھے۔ بہت اچھے حکیم تھے۔ سب کا مفت علاج کرتے۔ کوئی پیسہ نہ لیا کرتے تھے، جن کے پاس پیسے نہ ہوتے ان کو اپنے پاس سے کرایہ اور دوا کے پیسے عنایت کرتے۔ ۱۳۱۷ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۱۴۰۳ ہجری میں وفات پائی۔ اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں جگہ دے (آمین)۔

مولانا محمد ادریس نے تمام زندگی قناعت اور عزت کے ساتھ کسی رئیس کی طرح گزاری۔ ان کے گزر اوقات کا ذریعہ اپنی زمینیں فروخت کرنا تھا، جو کہ موضع گاربہ اور چھپڑی تحصیل ایبٹ آباد وادی نیلاں میں

تقریباً ۵۰۰ کنال تھیں، جن میں سے اب تقریباً ۳۰۰ کنال کے ہم مالک ہیں۔ گھوڑے رکھنے کا شوق تھا اور گھوڑوں پر سفر بھی کیا کرتے تھے اور مجھے کہا کرتے تھے کہ بچہ گھوڑے ضرور رکھنا۔ تمام زندگی باہتھیار رہے۔ میں نے کبھی ان کو بغیر اسلحے کے نہیں دیکھا۔ موزر اور بندوق اپنے ساتھ رکھتے اور ساتھ میں گارڈ بھی ہوتے۔ ایوب خان صاحب نے لودھراں اور بہاول پور میں مجاہدین کو زمین دی مگر انھوں نے زمین لینے سے انکار کر دیا اور اپنا حصہ دوسرے لوگوں کو دینے کے لیے کہا اور فرمایا کہ ہمارا گزارا اچھا ہے جس کو ضرورت ہو اسے دے دیں۔ دین کے کام پر اجرت زیب نہیں دیتی۔ وہ باوقار اور اچھی زندگی گزارتے رہے۔ مختلف رسائل میں لکھتے رہے۔ مجھے یاد ہے جناب احسان الٰہی ظہیر صاحب لاہور سے ہمارے گھر آئے اور کہا کہ میں نے ترجمان اہل حدیث میں جو بھی آپ کا مضمون آیا دیکھا اور سوچا اتنا بڑا عالم ایک گوشے میں پڑا ہے۔ آپ لاہور کیوں نہیں آ جاتے۔ وہ کافی ناراض ہوئے اور کہا کہ آپ مجھے کیوں دربدر کرتے ہیں۔ وہ دنیا داری سے بہت دور تھے۔

احمد بن مولانا محمد ادریس جو میرے والد تھے، وہ اپنے والد کے ہر وقت خدمت گار تھے اور ریا سے پاک صاف تھے۔ تمام زندگی لوگوں کو حکمت کی دوا دیتے رہے اور کسی سے ایک پائی تک نہ لی۔ وہ مکہ مکرمہ بھی رہے۔ ۱۰ حج کیے۔ پاکستان آنے کا نام نہ لیتے اور کہتے خدا مجھے یہیں مار دے تاکہ میں اسی پاک سرزمین میں دفن ہو جاؤں اور میری بخشش ہو جائے۔ آخر وہ بھی باعارضہ فالج ۶ مارچ ۲۰۰۱ء کو عیدالاضحیٰ کے دن فوت ہو گئے۔

خاندانی لائبریری:

اس علمی خاندان کی لائبریری میں بہت قدیم نادر قلمی اور مطبوعہ کتب کا ایک بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے جو اس وقت میرے (عبدالرشید بن احمد ساکن اسلام آباد شہزاد ٹاؤن مکان نمبر ۵۲۴ گلی نمبر ۱۸ فون: ۲۶۱۴۷۷۸-۵۱-۹۲-۰۰۹۲، موبائل ۵۱۰۱۸۱۴-۰۳۰۰) کے پاس ہے اور کچھ کتب موضع ڈھیری سکندر پور پرانی لائبریری میں موجود ہیں۔ کتب کے علاوہ شاہ اسماعیل شہید کی کچھ نادر یادگار اشیاء بھی وہاں محفوظ ہیں۔

عبدالرشید (راقم) بھی اپنے آباؤ اجداد کے نقش قدم پر چلنے کی دل میں تڑپ رکھتا ہے۔ لوگوں کی بے لوث خدمت، ان کا مفت علاج اور رفاہ عامہ کے دیگر کام تو بحمداللہ جاری ہیں، البتہ مستقبل میں افادہ عام کے لیے ایک لائبریری اور ایک عظیم الشان دینی درس گاہ کی تاسیس کا ارادہ ہے جو دینی و دنیاوی علوم پر مشتمل ہو گی، جس سے مستفید ہو کر اچھی اور اعلیٰ زندگی بسر کی جا سکے گی اور نفاذ اسلام میں کچھ معاونت ہو سکے گی۔ اپنے والد کی وفات کے بعد مجھے اپنی لائبریری دیکھنے میں ۶ ماہ لگ گئے۔

عدنان رشید اور بلال رشید:

عدنان رشید اور بلال رشید میرے بیٹے ہیں جو اس وقت لندن میں پڑھ رہے ہیں۔ عدنان رشید Master کرنے کے بعد PHD کر رہا ہے۔ ویب سائٹس ان کے کارناموں کی شاہد ہیں۔ برطانیہ میں ان کا چرچا ہے۔ یہ دونوں بھائی تبلیغ اسلام میں کوشاں رہتے ہیں۔ عدنان رشید جنوری ۲۰۱۲ء میں شفاء سٹوڈنٹس سوسائٹی اور یوتھ کلب کی دعوت پر پاکستان آئے اور مختلف یونیورسٹیوں میں لیکچر دیے۔ ان یونیورسٹیوں میں پشاور میڈیکل کالج، قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد، لمز یونیورسٹی لاہور، گرام سکول فیصل آباد، فوجی فاؤنڈیشن راولپنڈی وغیرہ شامل ہیں۔ یہ تقاریر یوٹیوب You-Tube پر Adnan Rashid کے نام سے موجود ہیں۔ عدنان رشید اسلامی تاریخ وتہذیب وتمدن، سائنس اور آثار قدیمہ کے فن پاروں، قلمی نسخوں پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ پی ایچ ڈی کرنے کے بعد ان کا مقصد تبلیغ اسلام پر کام کرنا ہے۔ آج بھی تعلیم کے دوران ان کے مجاہدانہ کارناموں اور معرکوں پر برطانیہ اور یورپ کے مسلمان رشک کرتے اور ان کی کاوشوں کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ عدنان رشید ہائیڈ پارک لندن اور دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں میں عیسائی راہبوں اور پادریوں سے مناظرے کر چکے ہیں۔ ان معرکوں کا حال آپ ویب سائٹ پر دیکھ سکتے ہیں۔ اکیڈمیوں میں ان کی تقریریں اسلامی جذبے کی عکاسی کرتی ہیں۔ متعدد ریڈیو پروگراموں میں وہ اپنی علمی مہارت کا ثبوت پیش کر چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی ہمت اور حوصلے میں اضافہ کرے۔

عبدالصمد صاحب ریالوی:

یہ ایک مشہور عالم ہیں اور میری لائبریری کو مرتب کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ انھوں نے مجھے اس کی پوری تاریخ سے روشناس کروایا اور لائبریری کی فہرست مرتب کی۔ اس کام کی اللہ ان کو جزا دے۔ لائبریری میں ہزاروں کتابیں تھیں۔ قلمی اور ہندوستان کی مطبوعہ۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی کے تمام خطوط ان کتابوں سے نکالے، تب یہ خطوط محفوظ رہے ورنہ ضائع ہو جاتے۔ ہمارے بڑوں کے رابطے اور کام ان خطوطوں سے ظاہر ہوئے جو خطوط میرے پاس موجود ہیں ان کو ہو بہو شائع کرنے کا ارادہ ہے۔

عارف جاوید محمدی گوجراں والا حال کویت:

ان خطوطوں کا ترجمہ کرانے میں مجھے تکلیف ہوئی مگر اللہ نے سبب پیدا کیا اور ایک ولی اللہ شخص کو میرے غریب خانے میں بھیج دیا۔ اسلام آباد میرے گھر کی گھنٹی بجی۔ ایک باریش آدمی دروازے پر دیکھا۔ تعارف ہوا تو جناب عارف جاوید محمدی ساکن گوجراں والا حال کویت نے میرا تاریخ کا رسالہ نکال کر مجھے دکھایا اور کہا میں نے کویت میں آپ کی تاریخ پڑھی۔ ملنے کا شوق ہوا، اجازت ہو تو اندر آ جاؤں۔ میں نے آہستہ آہستہ

ان کے پیچھے قدم رکھ کر اجازت دی۔ پہلے ملاقات میں تھوڑا محتاط تھا۔ مگر اللہ نے ایک فرشتہ سیرت انسان میرے غریب خانے پر بھیج دیا۔ انھوں نے خطوط وغیرہ دیکھے۔ پھر الحسن بن محسن الیمانی کی تاریخ دیکھی اور منہاج الدین کو جو سند عطا کی وہ دیکھی تو ان کا اشتیاق مزید بڑھا۔ میں نے ان کے سامنے کچھ خطوط رکھے۔ انھوں نے خطوط کی اور سند کی کاپیاں مجھ سے حاصل کیں اور کویت میں دو عدد کتابیں لکھ کر ان میں اسناد چھپوا دیں۔ کتابوں کے نام یہ ہیں ثبت الکویت اور دوسری کتاب تذکرہ مولانا نذیر حسین المحدث الدھلوی (تالیف محمد اسرائیل بن محمد ابراہیم السّلفی الندوی) مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ انھوں نے کافی محنت کی ہے۔ پھر اپنے فرزند ارجمند اور جناب فرقان صاحب کو بھیجا۔ انھوں نے دو دن میرے غریب خانے پر رہ کر خطوط کی کاپیاں حاصل کیں۔ پھر ان کاپیوں کا جناب عارف جاوید محمدی صاحب نے ترجمہ کروا کر مجھے روانہ کر دیا اور میرے ساتھ رابطے میں رہے۔ ان کی اس کاوش نے مجھے شوق دلوایا۔ خدا تعالیٰ ان کو سلامت رکھے۔ پھر وہ میرے گاؤں ہری پور ڈھیری سکندر پور گئے۔ وہاں پر بوسیدہ کتب خانہ دیکھا اور میں نے ان کو بتایا کہ اس غریب خانے میں بڑے بڑے لوگ آ کر ٹھہرے ہیں جن میں مولانا نذیر حسین دہلوی، عبداللہ غزنوی، مولانا خرم علی، مولانا عنایت علی، مولانا محمد قاسم، مرزا مبارک شاہ، عبدالکریم لالی صاحب، مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی، صوفی عبداللہ صاحب اوڈاں والا، امیر عبداللہ صاحب، امیر عبدالکریم، امیر رحمت اللہ صاحب اور ان گنت لوگ آتے رہے۔ تفصیل میں جانا مقصود نہیں ہے۔ اب یہ خطوط میں شائع کرنا چاہتا ہوں۔ عارف جاوید محمدی صاحب نے فرمایا تھا کہ یہ کام میں کروں گا۔ پھر مجھے فرمایا کہ آپ گوجراں والا چلے جائیں مگر مصروفیت کی وجہ سے میں اسلام آباد سے چھپوا رہا ہوں۔ اللہ ان کو سلامت رکھے۔

۲۰۰۱ء میں جناب محمد اسحاق بھٹی صاحب لاہور والوں سے ملا تو انھوں نے بڑا افسوس کیا کہ غلام رسول مہر صاحب کو یہ مواد مل جاتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ وہ ہمارے گھر بھی گئے مگر میرے دادا نے ان کو کچھ مہیا نہ کیا۔ میں عبدالجبار شاکر صاحب کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے میری تاریخ کے چند اوراق اخبار الاعتصام میں لکھے۔ اب چند خطوط کے عکس چھاپ رہا ہوں۔ اصحابِ علم لوگ دیکھ لیں گے، مجھے صرف اپنے خطوط مرتب کرنے کا شوق ہے تاکہ یہ ضائع نہ ہو جائیں اور بزرگوں کی یادداشتیں محفوظ رہیں۔ کسی کی دل آزاری میرا مقصد نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں قرآن اور حدیث کے مطابق زندگی بسر کرنے کی توفیق دے۔ اللہ مجھ گناہ گار کو اپنی بخشش میں رکھے اور ہر مسلمان پر اللہ اپنا فضل و کرم فرمائے۔ بس وہی کریم ہے۔ ہماری طلب اسی سے ہے اور اسی کے دروازے کے ہم غلام ہیں۔ گھریلو اور ذاتی ڈائریوں کو چھاپنے کی ضرورت نہیں، اس لیے چند خطوط شائع کر رہا ہوں۔

مختلف کتابوں میں ہمارے تاریخی حوالا جات:

- سید بادشاہ کا قافلہ
- مسئلہ جہاد کشمیر (مصنف: مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی)
- جمعیت مجاہدین کا سلسلہ صد سالہ اسمس و چرکنڈ (مصنف مولوی فضل الٰہی)
- تاریخ گکھڑاں وخط مولانا عبدالرب منال دیوال
- تذکرہ مولانا نذیر حسین دہلوی
- حلت سماع (ہزارہ یونیورسٹی، مترجم پروفیسر بشیر احمد سوز)
- الاعتصام لاہور (۱۱ مئی ۲۰۰۱ء)
- ترجمان اہل حدیث (مارچ ۱۹۷۲ مصنف مولانا محمد ادریس صاحب)
- سوانح عبداللہ غزنوی (مصنف غلام رسول قلعہ والے گوجراں والا)
- فرقہ وہابیانِ ہند کے سرکردہ علماء (مصنف ابوالبرکات گوجراں والا)

مولانا عبدالجبار غزنوی

(وفات ۲۸- اگست ۱۹۱۳ء)

حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی جنھوں نے اپنی صالحیت اور جلالتِ قدر کی بنا پر امام صاحب کے پُر عظمت لقب سے شہرت پائی، ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۲ء) میں افغانستان کے قریہ صاحب زادگان میں پیدا ہوئے جو اعمالِ غزنی میں واقع تھا۔ آپ حضرت سید عبداللہ غزنوی کے فرزندِ دلبند تھے، جن کی ولایت اور قبولیتِ دعا و ظہورِ کرامات کے بہت سے واقعات زبان زدِ عوام وخواص ہیں۔ محض تبلیغ توحید کی وجہ سے اس عہد کے والی افغانستان نے ان کو جیل میں بند کر دیا تھا اور اس مرد درویش کو شدید ترین سزائیں دی گئی تھیں۔ والدِ ذی شان کے ساتھ ان کے تین بیٹے (مولانا محمد، مولانا عبداللہ اور زیب عنوان مولانا عبدالجبار غزنوی دو سال) جیل میں قید رہے۔ پھر ایسا ہوا کہ اس خاندان کو افغانستان کے حکمرانوں نے وہاں سے نکال کر پشاور کی طرف دھکیل دیا۔ اس جلا وطن مظلوم قافلے میں مرد بھی تھے، عورتیں بھی تھیں، بچے بھی تھے، بیمار بھی تھے اور تندرست بھی۔ پہلے یہ لوگ افغانستان کی سرحد پار کر کے پشاور پہنچے۔ وہاں کچھ عرصہ قیام کیا۔ پھر لاہور آئے۔ یہاں کچھ عرصہ سکونت اختیار کیے رکھی۔ پھر لاہور سے چلے اور امرتسر کے قریب ایک گاؤں خیردی کے میں مقیم ہوئے۔ وہاں کچھ مدت قیام کے بعد امرتسر شہر گئے اور پھر مستقل طور پر وہیں سکونت اختیار کر لی۔ [1]

حصول علم:

مولانا عبدالجبار غزنوی نے ابتدائی اور اس سے کچھ آگے کے درجات کی کتابیں اپنے دو بڑے بھائیوں سید محمد غزنوی اور سید احمد غزنوی سے پڑھیں۔ بعد ازاں والدِ رفیع المنزلت حضرت سید عبداللہ غزنوی سے حصول فیض کیا۔ پھر دہلی کو روانہ ہوئے اور حضرت میاں سید نذیر حسین کے حلقۂ درس میں شرکت فرمائی۔ اس سے قبل ان کے والد عالی قدر بھی ان سے بعض کتب حدیث پڑھ چکے تھے۔ حضرت میاں صاحب سے مولانا عبدالجبار غزنوی نے کتبِ حدیث کی تکمیل بھی کی اور بعض دیگر علوم بھی پڑھے۔ ابھی بیس سال کو نہیں پہنچے تھے کہ فارغ التحصیل ہو گئے اور حضرت میاں صاحب سے سند لی۔ [2]

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب فقہائے ہند جلد ۹ صفحہ ۱۲۷ تا ۲۱۹ مطبوعہ ۱۹۸۴ء۔

[2] نزہۃ الخواطر: ج ۸ ص ۲۳۴ طبع ملتان ۱۹۹۳ء

مسند درس:

نہایت ذہین اور کثیر المطالعہ تھے۔قوت ادراک اور سرعتِ فہم میں اپنے تمام ہم درس طلبا سے بازی لے گئے تھے۔سندِ فراغ لینے کے بعد امرتسر آئے اور امورِ دنیا سے منقطع ہو کر قرآن و حدیث کی تدریس میں مشغول ہو گئے۔ ❶

دنیوی مال و منال سے کوئی تعلق نہ تھا۔حریم قلب میں صرف ایک ہی جذبہ کارفرما تھا اور وہ تھا اللہ کی عبادت اور شائقینِ علوم کو مستفید فرمانے کا جذبۂ صادقہ۔ چنانچہ بے شمار لوگوں نے ان کی خدمت میں حاضری دی جنھوں نے ان سے تحصیل علم بھی کی اور اعمال خیر کی دولتِ بے بہا سے بھی مالا مال ہوئے۔ان خوش بخت حضرات کی طویل فہرست میں حضرت حافظ محمد گوندلوی، مولانا نیک محمد، مولانا محمد علی لکھوی مدنی، استاد پنجاب مولانا عطاء اللہ لکھوی، مولانا محمد حسین ہزاروی، مفتی محمد حسن امرتسری جیسے جلیل المرتبت حضرات شامل ہیں۔ انھوں نے اپنے استاذ عالی قدر سے حصول فیض کے بعد خود تدریس کی مسندیں آراستہ کیں اور لاتعداد علما وطلبا کو مستفید فرمایا اور ان کی ذہنی وفکری تربیت کی۔

حیرت انگیز سہو:

حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی ایک عظیم خاندان کے عظیم فرد تھے۔ان کی آل اولاد پر اللہ کا یہ خاص کرم ہے کہ ان کے تمام ارکان (مرد و زن) علم کی نعمتِ فراواں سے متمتع ہیں اور حضرت مرحوم و مغفور کے فیض یافتگان اور تلامذہ کی تعداد بھی ہمارے جیسے لوگوں کی گنتی سے باہر ہے، لیکن حیرت کی بات ہے کہ ان میں سے کسی نے ان کے حالاتِ زندگی تحریر نہیں کیے۔نزہۃ الخواطر کی آٹھویں جلد میں چند سطروں میں ان کا ذکر کیا گیا ہے، جن کا ترجمہ ابھی خوانندگانِ محترم کی نظر سے گزرا، لیکن یہ ایک چھوٹا سا متن ہے، جس کی شرح کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ان کے والدِ گرامی حضرت سید عبداللہ غزنوی کے تو بہت سے واقعاتِ حیات سے ہم مطلع ہیں جو میں نے اپنی کتاب فقہائے ہند کی نویں جلد میں لکھے ہیں اور صفحہ ۱۴۷ سے ۲۱۹ تک ۷۳ صفحات پر مشتمل ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۸۴ء میں چھپی اور کچھ عرصہ (سید عثمان غزنوی مرحوم کے دورِ اہتمام میں) دار العلوم تقویۃ الاسلام کے نصاب میں بھی شامل رہی۔اس کتاب کے علاوہ سید ابوبکر غزنوی مرحوم نے بھی اپنی تالیف تذکرہ حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی میں ان پر لکھا ہے اور خوب صورت اسلوب میں لکھا ہے، اللہ انھیں اس خدمت پر جزائے خیر عطا فرمائے۔لیکن کسی لائقِ احترام بزرگ نے حضرت سید عبداللہ صاحب کے فرزندانِ گرامی میں سے نہ حضرت مولانا عبدالجبار غزنوی کے متعلق کچھ تحریر فرمایا، نہ مولانا عبدالواحد

❶ نزہۃ الخواطر: ج ۸ ص ۲۳۴ طبع ملتان ۱۹۹۳ء۔

غزنوی کے بارے میں کچھ لکھا اور نہ حضرت کے کسی اور فرزند کے بارے میں معلومات بہم پہنچانے کی کوشش فرمائی، حالاں کہ ان سب سے شائقین علم نے استفادہ کیا۔ ہم اسے ان حضرات کا سہو ہی قرار دے سکتے ہیں جو بہ ظاہر حیرت انگیز سہو ہے۔

چند واقعات:

تاہم مندرجہ ذیل سطور میں حضرت امام صاحب سے متعلق چند واقعات درج کیے جاتے ہیں جو مختلف اوقات میں بعض بزرگوں سے تحریری طور پر یا زبانی گفتگو میں میرے علم میں آئے۔ یہ واقعات اگرچہ میں اپنی بعض کتابوں (فقہائے ہند اور نقوش عظمت رفتہ وغیرہ) میں ان حضرات کے حوالے سے لکھ چکا ہوں، تاہم اس کتاب میں بھی لکھ رہا ہوں تاکہ یک جا محفوظ ہو جائیں۔ ان میں دو واقعات وہ ہیں جو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے سید ابوبکر غزنوی کی مرتبہ کتاب ''حضرت مولانا داؤد غزنوی'' میں تحریر کیے۔ مولانا ابوالحسن رقم فرماتے ہیں:

☆...... ''مولانا عبدالجبار صاحب کے متعلق میں نے عرصہ ہوا دو واقعات سنے تھے، جن کے راوی نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی مرحوم ہیں۔ ایک واقعہ یہ ہے کہ جب ندوۃ العلماء کا امرتسر میں پہلا جلسہ ہوا تو مولانا سید عبدالجبار صاحب بقیدِ حیات تھے اور قرآن مجید کا درس دیتے تھے۔ یہ درس بہت سادہ اور بے تکلف ہوتا تھا۔ مولانا شبلی نعمانی ایک مرتبہ اس درس میں شریک ہوئے۔ واپس آ کر انھوں نے شیروانی صاحب سے بیان کیا کہ مولانا عبدالجبار صاحب اپنی زبان سے جب اللہ تعالیٰ کا نام لیتے تھے اور نام پاک اللہ ان کی زبان سے نکلتا تھا تو بے اختیار جی چاہتا تھا کہ سر ان کے قدم میں رکھ دیا جائے۔''

دوسرا واقعہ یہ تھا کہ:

☆...... ''ندوۃ العلماء کے اس جلسے میں شریک ہونے والے علماء اور باہر کے مہمانوں کی کسی جگہ دعوت تھی۔ ایک بہت بڑا طویل دالان تھا جس میں کئی درجے تھے۔ ایک طرف کے بیٹھنے والے دوسری طرف کے بیٹھنے والوں کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ ایک درجے میں مولانا محمد علی مونگیری بانی و ناظم ندوۃ العلماء شریک دسترخوان تھے۔ دوسری طرف ایک دوسرے درجے میں کچھ اور مہمان تھے۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد مولانا محمد علی صاحب مونگیری نے شیروانی صاحب سے پوچھا کہ جس طرف آپ بیٹھے تھے، اس طرف اور کون کون تھا۔ انھوں نے چند معزز ین علماء کے نام لیے۔ مولانا محمد علی صاحب ہر ایک کے نام پر فرماتے تھے کہ کوئی اور بھی تھا؟ جب انھوں نے مولانا عبدالجبار صاحب غزنوی کا نام لیا تو مولانا نے فرمایا کہ ہاں اسی وجہ سے میرا دل بے اختیار اس طرف کھنچ رہا تھا۔'' [1]

---

[1] حضرت مولانا داؤد غزنوی: ص ۲۳، ۲۴.

مولانا محی الدین احمد قصوری فرماتے ہیں:

☆......"۱۹۰۶ء میں مَیں میٹرک پاس کر کے لاہور گورنمنٹ کالج میں داخل ہوا تو حسنِ اتفاق سے دو تین ایسے اچھے رفقاء مل گئے جو ہم مشرب تھے اور عقاید اور اعمال کے لحاظ سے بھی منجھے ہوئے تھے۔ پہلا سال تو یوں گزر گیا، لیکن دوسرے سال سے تو میرا اور میرے دو دوستوں (مولوی عبدالعزیز اور منہاج الدین رجسٹرار پشاور یونیورسٹی، دونوں اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں، اللہ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں قبول فرمائے) کا عام طور سے وتیرہ یہ ہو گیا تھا کہ جمعہ کے روز کالج میں ایک آدھ لیکچر سنا اور پھر کھسک گئے اور جمعہ کی نماز امرتسر جا کر حضرت مولانا عبدالجبار رحمہ اللہ کے ہاں پڑھتے اور پھر دو ایک گھنٹے ان کی صحبتِ بابرکت سے فیض یاب ہو کر لاہور واپس آ جاتے۔ میرے خاندانی روابط کی وجہ سے میں خاص طور پر موردِ عنایات تھا۔"

☆......"ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضرت مولانا مرحوم پاک پتن تشریف لے جا رہے تھے۔ ان دنوں بذریعہ ریل امرتسر سے قصور اور قصور سے پاک پتن جایا کرتے تھے۔ اس دن اتفاق ایسا ہوا کہ پاک پتن کی گاڑی لیٹ تھی یا شاید نکل چکی تھی تو بجائے سٹیشن پر ٹھہرا رہنے کے حضرت والد صاحب مرحوم و مغفور کا پتا پوچھ کر ہمارے ہاں تشرف لے آئے اور والد صاحب قبلہ سے فرمایا کہ میں آپ کے صاحب زادہ مولوی محی الدین سے ملنے کے لیے آ گیا ہوں۔ واضح رہے کہ اس وقت میں پورا فیشن ایبل نوجوان تھا۔ ڈاڑھی وغیرہ نہ تھی مگر خدا کے فضل سے نماز بہ طریقِ سنت ادا کرتا تھا۔"

☆......ایک عجیب بات یہ ہے کہ ہم تینوں دوست ڈاڑھی منڈواتے تھے لیکن مجھے نہیں یاد کہ ان دو تین سالوں میں مولانا مرحوم نے ہم میں سے کسی ایک کو ڈاڑھی منڈوانے پر ڈانٹا ہو۔ اگر کہا تو عام اتباعِ سنت پر زور دیا کہ دین سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ آپ نے خطبے میں کسی قسم کی درشت نکتہ چینی کسی شخص یا کسی فرقے پر کی ہو۔ رحمہ اللہ علیہ و علی آبائہ

☆......حضرت عبداللہ غزنوی اور ان کے فرزندانِ گرامی سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ یہی ان کا شعار اور یہی ان کی پہچان تھی۔ وہ بہت بارعب، خوب رو، وجیہ اور حسین و جمیل لوگ تھے۔ علم و فضل اور فہم و ذکاوت سے بھی اللہ نے ان کو خوب نوازا تھا۔ للّٰہیت، خوفِ خدا اور تقوے کی نعمت سے بھی مالا مال تھے۔ عزت و تکریم میں بھی بارگاہِ الٰہی سے حصہ وافر عطا ہوا تھا۔ لیکن اس کے باوجود نہایت منکسر اور متواضع تھے۔ ان سے برصغیر کے بعض نوابوں اور رئیسوں نے رشتے داریاں قائم کرنے کی کوشش کی اور کئی اونچے خاندان ان سے تعلقاتِ مناکحت پیدا کرنے کے لیے ساعی ہوئے، مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ نہ کسی دولت مند کو لڑکی دی اور نہ کسی امیر کے گھر اپنے کسی بیٹے کی شادی کی۔ شادی اور نکاح کے سلسلے میں ان کا ایک ہی معیار تھا اور وہ تھا تقویٰ، نیکی

اور صالحیت۔ ذات پات یا دنیا کے مال و دولت کو اس باب میں ان کے نزدیک کوئی حیثیت حاصل نہ تھی۔ جو شخص ان کے خیال میں ان اوصاف کا حامل ہوتا، اس سے رشتے داری قائم کر لیتے۔ اس سلسلے کا ایک واقعہ (یا لطیفہ) مجھے مولانا سید داؤد غزنوی کے بھتیجے مرحوم عثمان غزنوی صاحب نے سنایا۔

یہ حضرت مولانا عبدالجبار غزنوی کے حقیقی پوتے تھے اور انھوں نے اپنے جدِّ امجد کو دیکھا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ حضرت دادا صاحب کے مدرسے میں ایک شخص مولانا محمد حسین ہزاروی تھے، جو حضرت سے تعلیم حاصل کرتے رہے تھے۔ ان میں دنیوی وجاہت کی کوئی چیز نہ تھی، البتہ نیک اور عالم دین تھے۔ ایک دن حضرت مولانا نے ان سے فرمایا مولوی محمد حسین آج عصر کے بعد میں تجھ سے اپنی بیٹی کا نکاح کرنا چاہتا ہوں، اگر تم اس پر راضی ہو تو یہیں مسجد میں رہنا۔ مولانا محمد حسین ہزاروی کے لیے یہ بات بالکل خلافِ توقع تھی، وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، حضرت کی زبان سے یہ لفظ سن کر (عثمان غزنوی کے بقول) وہ کانپنے لگے اور ان پر اتنی دہشت طاری ہوئی کہ حضرت کے فرمان کا جواب نہ دے سکے۔ انھوں نے تسلی دی اور فرمایا گھبراؤ نہیں، عصر کے بعد یہیں یہ سنت ادا ہو گی۔ [1]

☆...... مئی ۱۹۴۹ء کی بات ہے، مولانا سید محمد داؤد غزنوی ضلع شیخوپورہ کے ایک قصبے فیروز وٹواں جانے کے لیے تیار ہوئے تو از راہِ کرم مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ ہم وہاں ایک بزرگ ملک احمد خاں کے مہمان تھے جو وٹو برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ وہاں کے وہ نمبردار تھے اور مولانا کے والدِ گرامی حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی مرحوم و مغفور کے مرید تھے۔ اب وہ اور ان کے خاندان کے لوگ مولانا داؤد غزنوی کے حلقۂ عقیدت و ارادت میں شامل تھے۔ ملک احمد خاں بوڑھے آدمی تھے۔ دراز قامت اور وجیہ۔ ہم دو دن وہاں رہے۔ مجھ سے وہ مانوس ہو گئے تھے۔ میں نے باتوں باتوں میں ان سے پوچھا کہ آپ غزنوی خاندان کے حلقہ ارادت میں کیسے شامل ہوئے اور ان کی کون سی ادا آپ کو پسند آئی؟ اس کا انھوں نے جو جواب دیا، وہ انھی کے الفاظ میں عرض کرتا ہوں، فرق صرف یہ ہے کہ انھوں نے یہ باتیں پنجابی میں بیان کی تھیں، میں اردو میں ان کا ترجمہ کر رہا ہوں۔

بولے: میں اٹھارہ سال کی عمر کا تھا کہ گھٹیا کے موذی مرض میں مبتلا ہو گیا۔ والد نے بہت علاج کرائے، مگر آرام نہ آیا۔ وہ حضرت مولانا عبدالجبار غزنوی کے عقیدت مند تھے۔ انھیں یقین تھا کہ ان کی دعا کو اللہ شرفِ قبولیت سے نوازتا ہے اور وہ بیمار کے لیے دعا کریں تو اللہ اسے صحت عطا فرماتا ہے۔

اس زمانے میں گھوڑے کے سوا ہمارے گاؤں سے امرتسر جانے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ شام کے وقت

[1] فقہائے ہند نویں جلد ص ۲۱۶، ۲۱۷۔

میرے والد نے گٹھڑی کی شکل میں مجھے گھوڑی پر رکھا اور امرتسر کو چل پڑے۔ ہم امرتسر مسجد غزنویہ میں پہنچے تو فجر کی جماعت ہو رہی تھی۔ والد نے مجھے گھوڑی کی پیٹھ سے اٹھایا اور مسجد کے صحن میں رکھ دیا۔ گھوڑی باہر باندھی اور خود وضو کر کے جماعت میں شریک ہو گئے۔ جو بزرگ جماعت کرا رہے تھے، وہ اس قدر درد اور سوز سے قرآن مجید پڑھتے تھے کہ دل ان کی طرف کھنچا جاتا تھا۔ نماز کے بعد اس بزرگ نے میری طرف دیکھا تو پوچھا یہ کون شخص ہے؟ والد نے کھڑے ہو کر تمام صورت حال بیان کی اور نہایت ادب سے دعا کے لیے درخواست کی۔ پاک باز بزرگ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ جیسے جیسے وہ دعا مانگ رہے تھے، مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جوڑوں کی بندش کھل رہی ہے۔ تین دن اور تین راتیں ہم وہاں رہے ہمارا کھانا ان کے گھر سے آتا تھا۔ گھوڑی کے لیے چارے کا انتظام بھی وہی کرتے تھے۔ تین دن کے بعد اللہ کے فضل سے میں تندرست تھا۔ گھوڑی پر سوار ہو کر امرتسر سے اپنے گاؤں فیروز وٹواں آیا۔ دعا کرنے والے شخص مولانا داؤد غزنوی کے صاحبِ تقوی والد مولانا عبدالجبار غزنوی تھے، جن کی صالحیت کی بنا پر لوگ انھیں امام صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ اس کے بعد اللہ کے بے پایاں فضل اور امام صاحب کی دعا سے جسمانی حالت کے ساتھ ساتھ ہماری روحانی دنیا بھی بدل چکی تھی۔ ہم ان کے مرید ہیں اور یہ ہمارے مرشد۔ [1]

☆......ایک بزرگ عزیز اللہ صاحب ۱۹۵۸ء میں اپنے عزیزوں سے ملاقات کے لیے ہندوستان کے شہر مدراس سے کراچی آئے۔ کراچی سے عازم لاہور ہوئے۔ لاہور کے سفر کا مقصد مولانا داؤد غزنوی اور علمائے اہل حدیث سے ملاقات تھا۔ وہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے خریدار تھے اور میں اس وقت اس اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ وہ ''الاعتصام'' کے دفتر آئے اور اپنا نام اور پتا بتایا۔ میں ان کے نام سے واقف تھا۔ الاعتصام کے ایڈیٹر کی حیثیت سے وہ بھی میرے نام سے آشنا تھے۔ میں نے ان کو اعزاز سے بٹھایا اور مدراسی ہونے کی وجہ سے ان کی خدمت میں مچھلی پیش کی۔ مولانا غزنوی اس دن لاہور سے باہر تشریف لے گئے تھے۔ میں نے مولانا کے ساتھ ان کی عقیدت کی وجہ پوچھی تو انھوں نے بتایا کہ ۱۹۱۰ء کے آس پاس مدراس سے تین آدمی چمڑے کی تجارت کے سلسلے میں امرتسر آئے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام اسماعیل تھا۔ اسماعیل فجر کی نماز روزانہ مسجد غزنویہ میں حضرت الامام مولانا عبدالجبار غزنوی کی اقتدا میں پڑھتے تھے۔ ایک روز امام صاحب نے ان سے پوچھا ''آپ کون ہیں؟ کہاں کے رہنے والے ہیں اور یہاں کیا کام کرتے ہیں؟''

انھوں نے جواب دیا ''میرا نام اسماعیل ہے، مدراس کا رہنے والا ہوں اور یہاں چمڑے کی تجارت کی غرض سے آیا ہوں۔''

---

[1] نقوشِ عظمت رفتہ: ص ۲۸، ۲۹.

ان کی بات سن کر امام صاحب نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ اگر دعا خلوص قلب سے کی جائے اور گڑگڑا کر اللہ کے حضور کسی چیز کی التجا کی جائے تو لازماً اپنا رنگ دکھاتی ہے اور خارج میں اس کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ اس دعا کا نتیجہ بھی یہی نکلا اور اللہ نے اسے شرف قبول سے نوازا۔ عزیز اللہ اور اس کے بعد مولانا داؤد غزنوی نے بتایا کہ اسماعیل کہا کرتے تھے کہ جب امام صاحب دعا مانگ رہے تھے، مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ گویا دولت میری جھولی میں گر رہی ہے۔ وہ بزرگ ''کاکا اسماعیل'' تھے۔ مدراس کی بولی میں ''کاکا'' سیٹھ کو کہا جاتا ہے۔

کاکا اسماعیل مسلکاً اہل حدیث تھے اور نہایت نیک آدمی تھے۔ صوبہ مدراس کے ضلع ارکاٹ کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد کا نام محمد عمر تھا۔ وہاں کئی ایکڑ زمین خرید کر اسے آباد کیا گیا اور محمد عمر کے نام کی مناسبت سے اس قصبے کا نام ''عمر آباد'' رکھا گیا۔ پھر ''جامعہ دار السلام'' کے نام سے وہاں ایک بہت بڑا دار العلوم قائم کیا جو اب تک کامیابی سے چل رہا ہے اور اس کا شمار ہندوستان کے مشہور اسلامی مدارس میں ہوتا ہے۔ مولانا داؤد غزنوی نے ایک مرتبہ بتایا کہ آزادی ملک سے پہلے جامعہ دار السلام کے سالانہ جلسۂ تقسیم اسناد میں انھیں باقاعدہ دعوت شرکت دی جاتی تھی۔ وہ وہاں جاتے تو کاکا اسماعیل اور ان کے خاندان کے لوگ انتہائی احترام سے پیش آتے اور امام صاحب کی دعا کا واقعہ ضرور بیان کرتے۔ [1]

☆......۱۹۱۰ء کے لگ بھگ کی بات ہے کہ لاہور کی چینیاں والی مسجد پر بعض منکرین حدیث نے قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ مسجد کی مجلس انتظامیہ کے چند ارکان حضرت مولانا عبدالجبار غزنوی کی خدمت میں امرتسر پہنچے کہ اس موقعے پر ان کی مدد کی جائے۔ حضرت مولانا نے جمعۃ المبارک کے روز مسجد چینیاں والی آنے اور اس میں جمعہ پڑھانے کا فیصلہ کیا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ وہاں فساد کا خطرہ ہے، آپ تشریف نہ لے جائیں۔ حضرت نے فرمایا اللہ کے دین کا معاملہ ہے، ان شاء اللہ فساد نہیں ہوگا، اللہ مدد فرمائے گا۔ چنانچہ جمعے کا خطبہ شروع ہونے سے پہلے آپ تشریف لائے اور جو مخالف لوگ مسجد میں بیٹھے تھے حضرت کو دیکھ کر ان پر اتنا رعب طاری ہوا کہ فوراً مسجد سے نکل گئے۔ حضرت مولانا نے وہاں جمعہ پڑھایا تو مسجد کی انتظامیہ کے ارکان نے ان سے درخواست کی کہ وہ مستقل طور پر یہیں تشریف لے آئیں۔ انھوں نے فرمایا میں امرتسر میں مدرسے میں پڑھاتا بھی ہوں اور بعض دیگر خدمات بھی سرانجام دیتا ہوں، لہٰذا میں تو یہاں نہیں آ سکتا، البتہ اپنے چھوٹے بھائی مولانا عبدالواحد غزنوی کو یہاں بھیج دیتا ہوں، چنانچہ ۱۹۱۰ء میں مولانا عبدالواحد غزنوی اس مسجد کے خطیب و امام کی حیثیت سے یہاں آ گئے اور تادم آخریں (۱۹۳۰ء تک) امامت و خطابت کا

[1] نقوش عظمت رفتہ: ص ۲۹، ۳۰۔

فریضہ سرانجام دیتے رہے۔

مکتوباتِ گرامی:

حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی نے ہفت روزہ الاعتصام کے دو شماروں (۲ جولائی و ۹ جولائی ۱۹۷۱) میں حضرت امام سید عبدالجبار غزنوی کے تین مکتوبات گرامی درج کیے ہیں۔دو اردو زبان میں ہیں اور ایک فارسی زبان میں۔ پہلا مکتوب ایک بزرگ عبدالواحد کے نام ہے،مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف کے خیال میں یہ بزرگ عبدالواحد المعروف نظام الدین ساکن مہدی پور ہیں جو اس وقت امرتسر میں مقیم تھے۔ حضرت امام صاحب کے ایک چھوٹے بھائی حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی تھے،ممکن ہے ان کے نام ہو۔اس مکتوب پر تاریخ مرقوم نہیں۔

دوسرا خط بھی اردو میں ہے اور یہ ایک شخص عبدالستار صاحب کے نام لکھا گیا ہے۔حضرت امام صاحب کے ایک بھائی کا نام بھی عبدالستار تھا۔

تیسرا خط منشی محمد علی صاحب کے نام ہے اور اس پر تاریخ ۲۹ جنوری ۱۸۹۳ مرقوم ہے۔ یہ خط فارسی میں ہے۔منشی محمد علی کا پتا نہیں چل سکا کہ کون بزرگ ہیں۔اب ملاحظہ فرمایے تینوں مکتوبات:

پہلا مکتوب:

از عبدالجبار بہ برادر بہ ... عبدالواحد سلمہ اللہ رب العلمین۔

آمین

السلام علیکم و رحمة الله و بر کاته.

اما بعد و الحمد لله علی العافية ، عافيتك مطلوبة.

بھائی! میں تم سے بہت خوش ہوں۔ اللہ تم سے خوش ہو اور اپنی محبت دے اور رضامندی کے کام لے اور سب آفتوں سے بچاوے اور دونوں جہان کی خوبیاں عنایت فرمادے۔ آمین

بھائی! زندگانی فانی ہے اور موت بالیقین آنی ہے۔ ہر شخص کو مرنا ہے اور اللہ سے ملنا ہے اور موت کا وقت کسی کو معلوم نہیں۔پس اس کی تدبیر وقت سے پہلے ضرور ہے۔موت کے بعد تو کچھ بن نہ سکے گا۔

بھائی! اس کی تدبیر یہ ہے ایمان کامل، اعمال صالح، اخلاص نیت، اتباع سنت، آخرت کی رغبت، دنیا کی نفرت، نیک صحبت کی محبت، بدصحبت سے عداوت، قرآن کی تلاوت، حدیث کی مزاولت، ذکر اللہ کی کثرت، لغو کلام کی قلت، خلق کی نصیحت، علما و صلحا کی صحبت، عبادت کی ہمت، حق کہنے کی جرأت، عفو و سماحت، حلم و سخاوت، فہم و فراست، خلق و مروت، زہد و تقویٰ، تواضع و حیا، قناعت و شکر، شجاعت، خوف و خشیت،

استغفار و انابت، رجوع الی اللہ، بے تعلقی از ما سوی اللہ، دعاے حسن ختام وتمناے موت بر اسلام۔

بھائی! صحت و جوانی اور فراغت اور بے فکری کو غنیمت جانو اور آخرت کا توشہ اور اللہ کی رضا مندی اس میں حاصل کرو۔

بھائی! علم دین کے برابر دنیا میں کوئی دولت نہیں، اسی سے بندہ اللہ و رسول کو پہچانتا ہے اور شرع کے احکام جانتا ہے۔ اسی علم سے آدم علیہ السلام کو فرشتوں پر شرف ہوا۔ اسی علم سے انسان حضرت آدم علیہ السلام کا خلیفہ ہوا۔ اسی علم سے عالم ورثۃ الانبیاء ہیں۔ اسی علم سے عالمِ ہادیٔ راہِ ہدیٰ اور مقبول خدا ہیں۔

بھائی! پس اس علم کی تحصیل میں بہت محنت و کوشش کرو تاکہ علما کو اہل حق کے رتبے نصیب ہوں۔

بھائی! آدمی بغیر علم کے نکما ہے اور عالم بغیر عمل کے ہمیشہ خوف و خطر میں رہتا ہے جو مقتضا ہے کمال ایمان کا۔ قال اللہ تعالیٰ: وَمَا أُمِرُوٓا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ (الزمر: ۵)

بھائی! علم پڑھ کر بندگان خدا کو تعلیم کرو اور بھولے ہوؤں کو راہ بتاؤ اور آپ پاک کمائی کھاؤ اور نیک عمل کرو اور دنیا سے جتنا ہو سکے الگ رہو اور دعائے خیر میں مجھ کو ہمیشہ یاد رکھو۔ غفور رحیم مجھ کو اور تم کو بخشے اور اپنی رحمت سے سب کی مشکلیں آسان کرے اور جنت الفردوس میں ملا دے اور اپنا دیدار اور اپنا اور صلحا کا جوار عنایت فرمائے۔ آمِيْن اَللّٰهُمَّ آمِيْن ثُمَّ آمِيْن وَ آخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ .

دوسرا مکتوب:

از عبدالجبار برادر عزیز عبدالستار سلمہ اللہ وحفظہ فی اللیل والنہار۔ آمین

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، اما بعد یک جبہ بنات سیاہ کا تمھارے لیے بھیجتا ہوں۔ پہنو! اللہ مبارک کرے اور دنیا میں تقویٰ کا لباس اور آخرت میں جنت کی پوشاک عنایت فرما دے۔ آمین

بھائی! اللہ سے بہت ڈرتے رہو اور صحت اور فراغت کو غنیمت سمجھو۔ زندگی، بندگی کے واسطے ہے اس میں صرف کرو۔ دنیا فانی ہے، اس میں دل نہ لگاؤ۔ آخرت کا توشہ حاصل کرو۔ نیک عمل میں رغبت اور برے کام اور بدصحبت سے نفرت رکھو۔ چھوٹوں پر رحم کرو اور بڑوں کی توقیر کیا کرو اور آپس کے اتفاق کو غنیمت جانو اور خوش گزران اور صاف معاملہ رہو اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ سلوک اور احسان کرو۔

و قال اللہ تعالیٰ: وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ (النساء: ۱۹)

”یعنی گزران کرو ان کے ساتھ اچھی طرح۔“ اور بے تکلف اور سادہ وضع اور محنت کش اور سخت گزران رہو اور تن پروری اور آرام طلبی کی عادت نہ کرو...... قال رسول اللہ ﷺ ((لیسوا عباد اللہ بمتنعمین)) (مسند احمد) یعنی حضرت محمد ﷺ نے فرمایا کہ ”اللہ کے بندے تن پرور نہیں ہوتے۔“

اور لہو ولعب میں عمر ضائع نہ کرو۔ علم نافع حاصل کرو اور اتباع سنت اور اخلاص نیت کو ہمیشہ لازم سمجھو اور مجھ عاجز کے لیے دعاے مغفرت کیا کرو۔ غفور رحیم مجھ کو اور تم سب کو اپنی رحمت سے بخش دے اور جنت الفردوس میں ملا دے اور ﴿إِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقَابِلِيْنَ﴾ (الحجر: ٤٧) کا مصداق فرما دے۔ سب بھائیوں کو میری وصیت یہ ہے ﴿إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ إِلَّا وَ أَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ (البقرۃ: ۱۳۲) اللهم امتنا مسلمين و الحقنا بالصلحين امين و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمين اللہ بن باقی ہوس۔ والسلام سب عزیز و اقارب و احباب اور نمازیانِ مسجد کو سلام مسنون۔

تیسرا مکتوب (فارسی):

برادر دینی و رفیق اسلامی مکرمی منشی محمد علی صاحب در حفظ حافظ حقیقی محفوظ باشند و محبت و حلاوت عبادتِ مالکِ قوی محظوظ۔

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔ بعد از سلام مسنون معروض آنکہ الحمد للہ احوال احقر مستوجب حمد و شکر است۔ صحت و عافیت آں مکرم مدعو و مطلوب۔ افسوس کہ آن مہربان وارد امرتسر گردیدہ بودید مگر اتفاق لقابا ہم میسر نشد ما شاء الله كان و مالم يشاء لم يكن. خیر بہ ہر صورت حضرت حق جل وعلا آں اخوی را از حلاوتِ ایمانی و محبتِ الٰہی و انوار غیبی حظِ وافر و نصیب کامل عنایت فرماید۔ فرحتِ قلبی و سرورِ دلی و خوشی ظاہری و باطنی و بہجتِ صوری و معنوی و راحت روحی و نفسی در یاد الٰہی و محبت مالکِ حقیقی و عبادتِ ربِ غنی، مومن راسخ الاعتقاد، بلاشبہ حاصل شدنی ست، علامتِ سعادت دینوی و اخروی توجہ عبد است بہ اصلاح قلبی و تصفیۂ باطنی و سیر و سلوک بطرف رب العزت و سفر الی دار الاخرۃ و قرینۂ شقاوت دارین و بدبختی کونین انسان را غفلت است از اصلاح نفس و تہذیب اخلاق و تہاون و تکاسل در سیر الی اللہ و صرف ہمت در تحصیل دار فانی و استغناء و بے پروائی از دار اخروی۔

مومن را لازم است کہ ہر وقت ترساں و ہراساں باشد و بر درگاہ مالکِ خود بہ ہزار عجز و انکسار و ذلت و افتقار نالاں و گریاں ماند، باشد کہ ارحم الراحمین بر حال زارش رحم فرماید و از غفلت و حرص دنیا و حبِ جاہ و عزت نجات بخشد بمحبت خود ممتاز و مفتخر گرداند۔ ﴿إِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ فقط عبدالجبار عفی عنہ ۲۹ جنوری ۱۸۹۳ء۔

(خلاصہ ترجمہ: خیر خیریت اور دعاؤں کے بعد فرمایا) ''حضرت حق جل وعلا آپ کو ایمان کی حلاوت اور اپنی محبت سے حصۂ وافر و کامل عنایت فرمائے۔ (یاد رکھو!) ''پختہ اعتقاد والے مومن کو اپنے مالک حقیقی کی محبت اور اس بے نیاز پروردگار کی عبادت میں قلبی فرحت و سرور، ظاہری و باطنی اور روحانی و جسمانی راحت بلاشبہ حاصل ہوتی ہے۔''

”دنیا اور آخرت کی سعادت کی علامت یہ ہے کہ انسان کی توجہ اپنے دل کی اصلاح وتزکیہ، رب العزت کی جانب سیر وسلوک اور سفر آخرت کے فکر کی طرف رہے اور بدقسمتی کی نشانی یہ ہے کہ انسان اصلاح نفس، تہذیب اخلاق اور آخرت سے تو غفلت و بے پروائی برتے لیکن مادیات کے حصول میں کمر بستہ ہو کر لگا رہے۔“

”مومن کے لیے ضروری ہے کہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے لرزاں وترساں رہے۔ اس کی بارگاہ میں بہ ہزار عجز وانکسار، گریہ وزاری کرے۔ ارحم الراحمین ہماری حالت زار پر رحم فرمائے۔ دنیا کی حرص، جاہ ومرتبہ کے لالچ اور غفلت کی بیماریوں سے نجات دے اور اپنی محبت بخشے بلکہ اس میں ممتاز ومفتخر فرمائے۔

عبدالجبار عُفی عنہ ۲۹۔ جنوری ۱۸۹۳ء

تصانیف:

حضرت امام صاحب رحمہ اللہ نے درس وتدریس اور وعظ وتقریر کے علاوہ تصنیفی خدمات بھی سرانجام دیں۔ ان کی عربی اور اردو کی چار کتابوں کا پتا چل سکا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱- اثبات علو الرب و مباينة عن الخلق: حضرت مرحوم کی یہ تصنیف عربی میں ہے۔

۲- اعـانة الملت الاسلاميه: یہ ایک رسالہ ہے جو انھوں نے اردو زبان میں تصنیف فرمایا۔ اس میں کفار کی ملازمت کے عدم جواز پر بحث فرمائی گئی ہے۔

۳- اثبـات الالهـام و البيعة: یہ رسالہ اردو زبان میں ہے اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے الہام وبیعت کے جواز سے متعلق ہے۔

۴- الاربـعين بان ثناء الله ليس على مذهب المحدثين: حضرت مولانا کا یہ رسالہ عربی میں ہے۔ اس میں ان چالیس مقامات کی نشان دہی کی گئی ہے، جہاں ان کے نقطۂ نظر کے مطابق حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم نے اسلاف کے متعین کردہ خطوط سے مختلف زاویۂ فکر کا اظہار کیا۔ یہ تعبیر کا اختلاف ہے اور اہل علم کے درمیان بہت سے مسائل میں تعبیر کا اختلاف ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔ اب بھی یہ سلسلہ چلتا ہے۔

نکاح کے بارے میں ایک فتویٰ:

نکاح کے بارے میں حضرت امام صاحب کا یہ فتویٰ جو غیر مطبوعہ ہے اور حضرت مرحوم کے دستِ مبارک کا تحریر فرمودہ ہے، ملتان کے مرکز ابن القاسم الاسلامی کے نوجوان مدرس حافظ ریاض احمد عاقب نے مجھے بھیجا ہے۔ حافظ صاحب کے شکریہ کے ساتھ اسے یہاں درج کیا جا رہا ہے۔

سوال: ......اگر کسی عورت یا اس کا ولی کسی لڑکی یا اس کے ولی کو کہے کہ میں تیرے ساتھ اس شرط پر نکاح

کرتا ہوں کہ تو چوری، زنا یا شراب نوشی یا قمار بازی سے باز آ ؤ، اگر تو نے ان کبائر گناہوں سے آئندہ کوئی کام کیا تو یہ نکاح فسخ ہے۔ اگر وہ شخص باز نہ آیا اور وہ کبائر کرتا رہتا ہے تو یہ نکاح فسخ ہوسکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا......

جواب: ......صورتِ مذکورہ میں عورت اور اس کا ولی نکاح کا فسخ کرسکتا ہے۔ صحیح بخاری میں ہے: باب الشروط فی النکاح اور اس باب میں ایک حدیث شریف ((احق ما اوفیتم فی الشروط أن تومنوا به ما ستحللتم به من الفروج .)) اور ایک اثر عمر رضی اللہ عنہ کا مقاطع الحقوق عند الشروط اور یہی اثر سعید بن میتب نے مفصل طور پر لایا عن عبدالرحمن بن غنم ، قال: کنت مع عمر حیث تمس رکبتی رکبته فجاء ہ رجل فقال یا امیر المؤمنین تزوجت ھذہ و شرطت لھا دارھا وإلی اجمع لأمری أو لشأنی أن انتقل إلی أرض کذا وکذا فقال لھا شرطھا: فقال الرجل: ھلك الرجال إذا و تشاء امراۃ أن تطلق زوجھا إلا طلقت فقال عمر، المؤمنون علی شروطھم عندہ قاطع حقوقھم . غرض کہ جو شرط کہ عقد کے وقت ہو جائے اس پر فیصلہ ہوتا ہے۔ حافظ ابن قیم ''اعلام'' میں لکھتے ہیں:

((إذا تزوجت المرأۃ و خانت أن یسافر عنھا الزوج و یدعھا أو یسافر بھا ولا ترید الخروج فی دارھا أو أن یتزوج علیھا أو یترکھا أو یشرب المسکر أو یضربھا من غیر جرم فالحیلة لھا فی ذٰلك کله أن تشرط علیه أنه متٰی وجد شیئاً من ذلك فامرھا بیدھا إن شاء ت اقامت معه و إن شاء ت فارقته و تشھد علیه بذلك فإن خافت أن لا یشرط ذلك بعد لزوم العقد فلا یمکنھا إلزامه بالشرط فلا یؤذن بولیھا أن یزوجھا معه إلا عمل علی ھذا الشرط فیقول زوجتکھا علی آن أمرھا بیدھا إن کان الأمر کیت و کیت فمتی کان الأمر کذلك ملکت تطلیق نفسھا .))

غرض کہ یہ نکاح ولی نے اس شرط پر کیا کہ لڑکی کا ولی غیر شرعی کام چھوڑ دے اور لڑکی کا ولی نکاح پر بایں شرط راضی ہوا تھا، جب لڑکے کے ولی نے اس شرط پر وفا کیا تو عقد بالتراضی نہ ہوا اور نہیں۔ جب بالتراضی نہیں تو نکاح کس طرح رہے گا۔ ولی نے تو اپنی لڑکی کا بضع اس شرط پر وفا کیا۔ پس اس لڑکی کا بضع کیوں کر اس لڑکی کے واسطے جائز ہوسکتا ہے۔

ھذا ما ظھر لی واللّٰہ أعلم بالصواب . عبدالجبار بن عبداللہ الغزنوی عفی اللہ عنھما .

بیعت وارادت:

حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی ؒ کے دستِ حق پرست پر لوگ بیعت بھی کرتے تھے۔ ہمارے خاندان کے بھی بعض لوگ ان کے مبایعین میں شامل تھے۔

اس فقیر کو ان کے خوش نصیب مبایعین میں سے چند بزرگوں کی زیارت اور ان کی مجلس میں حاضری کا شرف حاصل ہے۔ وہ نہایت مسرت کے ساتھ اپنے پاک سیرت مرشد کے احوال بیان فرمایا کرتے اور لوگ انتہائی توجہ سے ان کی باتیں سنتے اور ان کا بہ درجہ غایت احترام کرتے اور ایک دوسرے کو بتاتے کہ یہ بزرگ مولانا داؤد غزنوی کے والد حضرت امام سید عبدالجبار غزنوی کے بیعت یافتہ ہیں۔ میں نے دیکھا کہ خود مولانا داؤد غزنوی اپنے والدِ مکرم کے مبایعین کا بے حد احترام کرتے تھے۔ ان میں ایک بزرگ میاں نور الدین بھوجیانی تھے جنھوں نے عالم جوانی میں حضرت امام صاحب کی بیعت کی تھی۔ وہ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے سسر تھے اور قیام پاکستان کے بعد اپنے خاندان سمیت ضلع گوجراں والا کے قصبہ گوندلاں والا میں آ بسے تھے۔ ان کی مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے ہاں لاہور آمد و رفت رہتی تھی۔ نماز دار العلوم تقویۃ الاسلام میں پڑھتے تھے۔ مولانا داؤد غزنوی انھیں بڑے اکرام سے امامت کے لیے کہتے اور ان کی اقتدا میں نماز ادا کرتے۔

ایک دن میاں نور الدین مرحوم نماز کے لیے تشریف لائے تو دار العلوم کے دروازے سے باہر سید ابوبکر غزنوی مرحوم چند دوستوں سے باتیں کر رہے تھے۔ کچھ فاصلے پر میاں صاحب بھی کھڑے ہو گئے۔ اس وقت سید صاحب مرحوم کی وہ حالت نہ تھی جو بعد میں ہوئی۔ وہ میاں صاحب کو جانتے بھی نہ تھے۔ انھوں نے میاں صاحب سے کہا کیا بات ہے؟ آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟

فرمایا: کوئی بات نہیں، صرف اس لیے کھڑا ہو گیا ہوں کہ یہاں سے میرے مرشد کی خوشبو آ رہی ہے۔

سید ابوبکر غزنوی ذہین شخص تھے۔ اصل بات سمجھ گئے۔ میاں صاحب کو سلام کیا اور مؤدب ہو کر کھڑے ہو گئے۔

مولانا سید داؤد غزنوی کے فرزندِ کبیر سید عمر فاروق غزنوی مرحوم بھی اپنے جدِّ امجد کے مبایع میاں نور الدین بھوجیانی اور دیگر مبایعین کا بڑا احترام کرتے تھے۔

مولانا غزنوی کی دوسری بیوی سے نرینہ اولاد دو بیٹے ہیں سید محمد یحییٰ غزنوی اور سید محمد غزالی غزنوی۔ یہ ابھی بچے تھے کہ مولانا ۱۶ دسمبر ۱۹۶۳ء کو وفات پا گئے۔ دونوں خوش اخلاق اور ملنسار ہیں۔ اپنے والد گرامی سے ملنے والوں کی بڑی تکریم کرتے ہیں۔

اس خاندان کے افراد کی یہ خوبی ہے کہ اپنے بزرگوں سے تعلق رکھنے والوں سے اعزاز کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

حضرت امام سید عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ نے ۲۵ رمضان المبارک ۱۳۳۱ھ کو جمعۃ الوداع کے روز وفات پائی۔ عیسوی حساب سے وہ ۲۸- اگست ۱۹۱۳ء کو اس دنیاے فانی سے عالم جاودانی کو روانہ ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

نرینہ اولاد:

حضرت عبدالجبار غزنوی مرحوم کی نرینہ اولاد پانچ بیٹے تھے، جن کے نام علی الترتیب یہ تھے: مولانا احمد علی، مولانا عبدالستار، مولانا محمد داؤد، مولانا عبدالغفار اور حافظ محمد سلیمان۔

ان اصحاب خمسہ میں سے مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے برصغیر کے علمی اور سیاسی حلقوں میں بے حد شہرت پائی۔ ان کے مفصل حالات میں نے اپنی ایک کتاب ''نقوشِ عظمتِ رفتہ'' میں بیان کیے ہیں۔

مولانا عبدالکریم گرنتھی

حضرت امام صاحب رحمہ اللہ کے بے شمار شاگردوں میں سے ایک شاگرد مولانا عبدالکریم گرنتھی فیروز پوری تھے۔ انھیں ''گرنتھی'' اس لیے کہا جاتا تھا کہ وہ سکھوں کی مذہبی کتاب گرنتھ صاحب کے عالم تھے اور اس بنا پر سکھ ان کا بہت احترام کرتے تھے۔

مولانا عبدالکریم سے متعلق میں اپنی ایک کتاب ''بزم ارجمنداں'' میں مضمون لکھ چکا ہوں۔ یہاں ان کے بارے میں چند مزید معلومات ملاحظہ فرمائیے۔

مولانا عبدالکریم کو خود اپنی پیدائش کا صحیح طور سے علم نہ تھا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ اوائل عمر میں بازار سے ضرورت کی چیزیں خریدنے کے لیے جو سکے وہ استعمال کرتے تھے، وہ سکھ حکومت کے جاری کردہ تھے۔ پنجاب میں سکھوں کی حکومت ۱۸۵۷ء سے پہلے انگریزوں نے ختم کی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سکھ راج کے آخری دور میں پیدا ہوئے۔ ان کی جاے ولادت موضع علی آباد تھا جو ضلع نارووال کا ایک گاؤں ہے۔ ان کے والد کا نام نبی بخش تھا اور وہ پیر جماعت علی شاہ کے مرید تھے۔ لیکن بیٹے کو باپ کے فکر و عمل سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ مسلک اہل حدیث سے وابستہ تھے۔ باپ نے اور دوسرے رشتے داروں نے انھیں اپنا ہم خیال بنانے کی بہت کوشش کی، لیکن یہ اہل حدیثیت پر عامل رہے۔

اب سوال یہ ہے کہ عبدالکریم اہل حدیثیت سے کیوں کر مانوس ہوئے اور اس مسلک کو انھوں نے

کیوں اپنایا؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ان کے گاؤں کے ایک بڑے زمیندار چودھری عبدالحفیظ تھے جو حضرت مولانا عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ کے ارادت مند اور ان کے حلقۂ بیعت میں شامل تھے۔ عبدالکریم ان سے اور ان کے رفقا سے متاثر ہوئے اور ان حضرات سے کچھ تعلیم بھی حاصل کی۔ اس اثنا میں وہ مختلف مذہبی حلقوں میں بھی گئے۔ سلطان باہو کے ایک مریدِ خاص سے بھی ملاقات کی۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے دعوائے نبوت سے پہلے وہ قادیاں گئے اور اس سے ملے۔ فرماتے ہیں، اس کی گفتگو سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ بہت بڑا فریبی اور مکار شخص ہے۔

اسی اثنا میں انھیں حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کا پتا چلا تو وزیر آباد پہنچے اور ان سے متاثر ہوئے اور بعض درسی کتابیں ان سے پڑھیں۔ اس طرح ان کا شمار حضرت حافظ صاحب وزیر آبادی کے اوّلیں شاگردوں میں ہوا۔

بعد ازاں مدرسہ غزنویہ امرتسر کا قصد کیا اور حضرت الامام عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضری دی۔ طویل عرصے تک ان کے حضور میں رہنے کا شرف حاصل کیا اور ان سے خوب فیض یاب ہوئے۔ ان کی بیعت کی، سفر و حضر میں ان کی رفاقت میں رہے۔ ان کے گھر میں سودا سلف لانے کی ذمہ داری ان کے سپرد تھی اور انھیں حضرت امام سے اتنی قربت حاصل تھی کہ انھیں "امین خاندان غزنویہ" کہا جانے لگا اور پھر یہ ان کا مستقل لقب قرار پا گیا۔ وہ مدرسہ غزنویہ کے سفیر بھی تھے۔

مولانا عبدالکریم گرنتھی اپنے دور کے مشہور واعظ اور پنجابی کے شاعر تھے۔ میٹھی زبان، پیارا اسلوبِ بیان، دلنشین گفتگو۔! ان اوصاف کے حامل لوگ اب کہاں ملیں گے۔

ان کی شادی خود حضرت الامام مولانا عبدالجبار غزنوی نے ضلع فیروز پور کی تحصیل زیرہ کے موضع گھدووالا کے رہنے والے ایک بزرگ مولانا عبداللہ مرحوم و مغفور کی صاحب زادی سے کی۔

مولانا عبداللہ کی طرف سے شرط یہ عائد کی گئی تھی کہ شادی کے بعد مولانا عبدالکریم ان کے پاس موضع گھدووالا میں رہیں گے۔ مولانا عبداللہ صاحب، حضرت الامام صاحب کے مرید خاص اور اپنے عہد اور علاقے کے جلیل القدر عالم تھے۔

مولانا عبدالکریم گرنتھی متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ ایک دو کے علاوہ یہ کتابیں پنجابی نظم میں ہیں اور تاریخی نوعیت کی ہیں۔ تقسیم ملک سے قبل یہ کتابیں کئی دفعہ چھپیں اور بہت پڑھی گئیں، کتابیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ پیروی صحابیات: پنجابی نظم کی اس کتاب میں صحابیات رضی اللہ عنہن کی اخلاقی، علمی، عملی اور تبلیغی کوششوں کا

تذکرہ کیا گیا ہے۔ اپنے موضوع کی پنجابی اشعار میں یہ ایک اہم کتاب ہے۔

۲۔ گورونانک جی اور اسلام: اپنے انداز کی یہ اولیں اور مشہور کتاب ہے، جس میں سکھوں کی مذہبی کتاب گرنتھ صاحب کی روشنی میں سکھوں کے اولیں گورو بابا نانک جی کی بنیادی تعلیم کا تذکرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ قرآن کو سچی کتاب قرار دیتے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کرتے تھے۔ ان کے نزدیک اسلام ہی صحیح مذہب ہے۔ سکھوں کے جلسوں میں مولانا اس کتاب کے پنجابی اشعار پڑھتے تو سکھ نہایت خوش ہوتے اور داد دیتے۔ بہت سے سکھوں نے یہ اشعار سن کر اسلام قبول کر لیا تھا۔ چند اشعار یہاں درج کیے جاتے ہیں:

مَن لے قرآن۔ پاویں اوئے سرگ دوارامَن لے قرآن۔

پاک قرآن کتیب جگت میں یہ بھی گُر کی بانی

وہ کب ساچا سیوک جس نے گور کی بات نہ مانی۔ مَن لَے قرآن۔

یعنی اے گورونانک جی کے چیلو۔ قرآن کی تعلیم کو قبول کرو تا کہ تمھیں جنت میں گھر مل جائے۔ اس فانی دنیا میں قرآن ایک پاکیزہ کتاب ہے۔ بتاؤ وہ چیلا کیسا چیلا ہے جو گورو کی بات نہ مانے، جب کہ گورو جی بھی اسے سچی کتاب مانتے ہیں۔

۳۔ مجاور نامہ: پنجابی نظم کا یہ رسالہ مولانا نے ایک گدی نشین کے خلاف لکھا تھا، جس نے اپنی ایک کتاب میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ہدفِ طعن ٹھہرایا تھا۔ اس کے دو حصے ہیں۔ ایک حصے میں جعلی سیّدوں اور پیروں کی تردید کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں قبروں پر بیٹھے نذر نیاز کھانے والے مجاوروں کی غلط حرکات کی نشان دہی کی گئی ہے۔

۴۔ فتنہ لواری دا: صوبہ سندھ میں ایک درگاہ ''لواری'' کے نام سے موسوم ہے۔ انگریزی حکومت کے زمانے میں لواری کے ایک پیر نے اس مزار کو نعوذ باللہ حج بیت اللہ کا درجہ دے دیا تھا اور کہا تھا کہ یہاں مناسک حج ادا کیے جائیں تو وہ صحیح حج ہو گا۔ یہ ایک بہت بڑا فتنہ تھا، جس کے خلاف مسلمانوں نے زبردست تحریک چلائی تھی۔ مولانا عبدالکریم گرنتھی نے اس کی تردید میں پنجابی نظم لکھی تھی جو اس زمانے میں بڑی مقبول ہوئی تھی۔

۵۔ عقائد اہل حدیث: یہ کتاب اردو نثر میں ہے جو اہل حدیث کے عقائد پر مشتمل ہے۔

۶۔ ترغیب الحج والزیارہ وکیفیۃ الامن والامارہ: یہ کتاب پنجابی نظم میں سعودی حکومت کے قیام کے ابتدائی دور میں لکھی گئی تھی، جب سلطان عبدالعزیز ابن سعود نے حجاز پر قبضے کے بعد قبے اور مزار منہدم کرا دیے

تھے اور ہندوستان کے بعض لوگوں نے اس پر سعودی حکومت کے خلاف محاذ قائم کر لیا تھا۔ مولانا عبدالکریم گرنتھی کے داماد مولانا عبدالحکیم ندوی نے اس کا عربی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔

۷۔ نیک بی بی: یہ ایک پنجابی نظم ہے جو مولانا نے لڑکیوں کی اصلاح کے لکھی۔ اس نظم میں انھیں نیک اعمال کی ترغیب دی گئی ہے اور غلط باتوں سے روکا گیا ہے۔

۸۔ تحفہ از عاجزہ حنیفہ: یہ انھوں نے اپنی چھوٹی بیٹی حنیفہ کی درخواست پر پنجابی نعت کی صورت میں رسالہ لکھا۔ یہ رسالہ تقسیم ملک سے پہلے چھپا تھا۔

۹۔ شانِ مسلم: پنجابی نظم کے اس رسالے میں مولانا نے مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا تذکرہ خوب صورت انداز میں کیا ہے۔

۱۰۔ سوزشِ فراق: یعنی جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی۔

پنجابی شعرا نے بہت سی ''جھوکیں'' لکھی ہیں۔ اسے مرثیہ کی ایک قسم قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب مولانا عبدالکریم گرنتھی نے اپنے استاذ و مرشد حضرت امام عبدالجبار غزنوی کی وفات (۲۸۔ اگست ۱۹۱۳ء) کے فوراً بعد لکھی تھی۔ لیکن شائع اس سے چوبیس سال بعد (۲۰۔ اگست ۱۹۳۷ء) کو کی گئی۔ اتنی بڑی تاخیر کی وجہ مولانا مرحوم کے بڑے صاحب زادے نصر اللہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ''والد محترم نے یہ نظم اس زمانے میں لکھی تھی جب حضرت امام صاحب مرحوم کا انتقال ہوا تھا، بہت دفعہ احباب نے تقاضا کیا کہ اس کو طبع کرا دیا جاے۔ ہم بھی بہت اصرار کرتے رہے لیکن جواب میں فرماتے کہ یہ صرف میں نے اپنے دل کی تسکین کے لیے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ چوں کہ میں حضرت امام صاحب کا آخری اور منظورِ نظر شاگرد تھا، علاوہ تربیت روحانی کے آپ کا مجھ پر ظاہری برتاؤ بھی نہایت مشفقانہ تھا۔ آپ نے اپنی کوشش اور اپنے اخراجات سے مولانا عبداللہ مرحوم گھدوی کے ہاں میرا تعلق فرزندی قائم کیا۔ نیز آپ نے مجھ کو امین کا لقب دیا۔ آپ مجھے اپنا بازو فرمایا کرتے تھے۔ خاص امور میں مجھ پر بھروسا کرتے تھے۔ آپ سے اتنی محبت تھی کہ دنیا کے کسی انسان سے اتنا دلی تعلق نہ تھا۔ میں نے یہ چند ٹوٹے پھوٹے بے جوڑ اشعار اپنے دل کو بہلانے کے لیے لوگوں کی دیکھا دیکھی جھوک کی طرز پر بنا رکھے ہیں، چھپوا کر کیا لینا ہے۔ لیکن ہم نے بہت کہا۔ آخر اب آپ کی اجازت سے خاکسار طبع کرا کر اپنے بزرگوں کی یادگار آپ کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو بھی صالحین کا ساتھ نصیب فرمائے۔ آمین''

اس کتاب کے اشعار میں نے اپنے فیروز پور کے زمانۂ طالب علمی میں بارہا خود مولانا عبدالکریم گرنتھی مرحوم کی زبان سے سنے۔ وہ مجھ پر بے حد شفقت فرماتے تھے اور اپنے خاص انداز میں یہ اشعار پڑھتے اور پڑھتے پڑھتے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے۔ مولانا مرحوم کے دو فرزند تھے، بڑے نصر اللہ اور چھوٹے محمد یحییٰ۔ دونوں میرے دوست تھے۔ محمد یحییٰ نے قیامِ پاکستان کے بعد قصور میں اور نصر اللہ نے کھڈیاں خاص (ضلع قصور) میں وفات پائی۔ میں نے اپنی ایک کتاب ''بزم ارجمنداں'' میں مولانا کے کوائف حیات بیان کیے ہیں۔

اس کتاب (سوزش فراق) کی مجھے شدید ضرورت تھی۔ میں چاہتا تھا کہ حضرت امام سید عبدالجبار غزنوی کے حالات لکھوں تو یہ پوری کتاب بھی درج کر دوں تاکہ لوگوں کے مطالعہ میں آئے اور محفوظ بھی ہو جائے۔ اس کتاب کو پنجابی کے شعری ادب کا شاہ کار کہنا چاہیے۔ نہایت شان دار اور عمدہ تریں اشعار ہیں۔

میں نے اس کتاب کے لیے بہت لوگوں سے کہا، لیکن نہ ملی۔ بالآخر اخبار ''الاعتصام'' میں اشتہار دیا تو جناب حافظ عبدالستار صاحب نے ٹیلی فون پر اطلاع دی کہ یہ کتاب ان کے پاس موجود ہے۔ ٹیلی فون پر انھوں نے اس کے بعض اشعار بھی سنائے۔ میرے لیے یہ بہت بڑی خوش خبری تھی۔ میں ان کا بے حد احسان مند ہوں۔ حافظ عبدالستار صاحب ہمارے مرحوم دوست ڈاکٹر عبدالرشید اظہر کے بھائی ہیں۔ انھوں نے کتاب ارسال فرمائی اور مندرجہ ذیل خط بھی تحریر فرمایا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محترم جناب مولانا صاحب!

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔

الاعتصام میں آپ کی طرف سے ''سوزش فراق'' کے متعلق پڑھا۔ خوشی محسوس ہوئی کہ میں آپ کے دینی، تاریخی، علمی کام میں معاونت کر سکوں۔

والسلام! دعاؤں کا طلب گار

حافظ عبدالستار

چک 7/8AR کرملی والا۔ میاں چنوں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی

رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

واہ سبحان حق سچا معبود اے — اس دے بغیر دو جافانی مقصود اے
ذات تبارک اکو لائق سجود اے — موت حیاتی جس دے ہتھ سنسار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی — رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی
پھیر دُرود کل نبیاں دے تاج نوں — قمر منیر روشن شمس سراج نوں
آل اصحاب اہل بیت ازواج نوں — صبروں منائی جھاں مرضی دل دار دی

جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

بعد نبی دے عالم قطب زمانے دے — کنجی بردار پاک نوری خزانے دے
نبیاں دے وارث خادم دین ربانے دے — ٹولی مبارک واقف مخفی اسرار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی — رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی
عالم طبیب باقی لوک بیمار نے — خیر دے طالب سدا لیل و نہار نے
محنت بغیر لوکاں خدمت گزار نے — عالم دی موت گویا موت سنسار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی — رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی
طبیب روحانی میرا شیخ رئیس سی — عمر وچہ فیض جس دا نبوی حدیث سی
کتے نہ رُلدا اس دا مخلص انیس سی — رنگ چڑھاوے نوری مجلس اس یار دی

جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

چشمہ ہدایت سُکا وچہ رمضان دے — قدر دی رات پوہتا پاس رحمٰن دے
آخری دھاکا ویکھو فضل سبحان دے — وصل مراد پوہتی یار دے یار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی — رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی
رحمت دیا باراں کوئی غزنی تھیں اٹھیا — فضل الٰہوں خیریں ہند تے وکھیاں
کتھے اوہ سوہنا جھیندے ہجروں میں کھٹیاں — ماری جدائی مینوں کانی پرکار دی

جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

جس دن دا سوہنا ساتھوں لَد سدھایا اے — خوشیاں تے عیشاں کدی پھیرا نہ پایا اے
درداں دا بدّل سر تے رکھ دا سایہ اے — داغ جدائی سینے ٹوٹ دیدار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی — رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

داغ جدائی سینے سانگ پئی وجدی جگ دی چیز کوئی اچھی نئیں لگدی
نیکاں دے باجھوں بھلی موت ہے اج دی غلبہ کریندی جاندی ٹولی اشرار دی

جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

جاندیاں راہیاں کولوں پچھاں میں رو کے ماہی دی گل، ہنجوں ہار پرو کے
دس کے جانا ذرا کول کھلو کے ٹھیک تیاری ہو گئی ساڈے سردار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی
موت ماہی دی سانوں مار مکایا اے درداں دا پتھر سینے مار بہایا اے
اگ وچھوڑے سنجاں جیوڑا جلایا اے ہو گئی میرے مولا پوری مہلت بیمار دی

جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

دکھاں دی بھٹھی وچہ بالن جدائی دا یاد ماہی دی رگڑا دیا سلائی دا
جسم کڑاہی خو نو کلیا تلائی دا جندڑی کباب ہو گئی طالبِ دیدار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی
تن مہینے موتوں پہلے پیارے نے لکھ وصیت رکھی پاس سوہارے نے
حساب کتاب اٹھ دن اگے سوارے نے قرضہ امانت پچھ رہے نہ ادھار دی

جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

چوی رمضانو سوہناں مسجد نوں آیا نور دی بارش چھم چھم وعظ سنایا
بھر بھر کے چھابے موتی ہٹ لٹایا لوٹی دا ہوکا چھیکڑ بولی ونجار دی

جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

سچا سوداگر اج چلیا دیس نوں موڑ مہاراں چھڈی جاندا پردیس نوں
ڈھونڈو گے لوکو تسیں ویلڑے ایس نوں بند دکان جدوں سچے بیوپار دی

جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

کوڑ فریب والے بہت دکان نے سچ دا ہوکا دیندے تھوڑے انسان نے

اکثر فرشتے اتوں، وچوں شیطان نے بھولی مخلوق باغی کیتی سرکار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

غزنی دی ہٹوں لگا بھاگ جہان نوں کابل کشمیر سارے ہندوستان نوں
دور دے طالب پاون ایتھوں عرفان نوں عالم تے صوفی برکت ایسے دربار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

ایس زمانے اکثر عالم پنجاب دے جگ دے واگی فتوے دیون صواب دے
اکثر شاگرد خادم غزنی اصحاب دے قسمت اندازوں پائیو نے چمک انوار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

واہ وا گھرانا غزنی والیاں پیراں دا رہبر علماواں اتے سچے فقیراں دا
رو کریندے کھوٹے ملحد شریراں دا مٹی خراب ہووے حاسد خوار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

حصہ عرفانوں جھناں مولا دیاں تاریاں بھاں کریندے نیکاں رب دیاں پیاریاں
غضب ہیڑن والے پاپی ہتھیاریاں پلک چمکارا مجلس نیکاں دی تار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

پھٹ نہ ملدا وڈا گھاٹا ایہ دین دا ساتھ لدایا رو رو پیر امین دا
سوہنا پڑھادے سانوں سبق یقین دا مٹھی زبان شیریں سینہ پئی ٹھار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

ڈٹھے برکات اکھیں نال میں آپ دے نور برسے اُتے ایس جماعت دے
اصلی تے نقلی کمیں پیاں سنجھاپ دے ڈھول سوہانے دوروں بولی سنسار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

جس دن دا سوہنا ستا جا کے وچہ گور اے — رنگ وٹایا غزنی والیاں ہور اے
باغ ماہی دے وچ خزاں دا زور اے — رونق تے برکت مٹ گئی مرضی کرتار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

مولیٰ وساوے ساڈی ایہو دعا اے — بعد کمالوں ہر اک چیز فنا اے
عملاں دی شامت آخر پیندی وبا اے — نعمت ناشکراں کھسے عادت قہار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

دور داؤدی پھر بھی قابل تسلی اے — جس دی بدولت نہر علم دی چلی اے
سارے گھرانے دی ایہ پونی تے چھلی اے — عمر دراز قومی خدمت گزار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

رہبر بتھیرے ڈِٹھے وچہ جہان دے — ہاتھی دے دنداں والا عمل کماوندے
وچوں کچھ ہور اتوں ہور دساوندے — لوں لوں وچہ دنیا داری موجاں پئی ہار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

لوک وچارے اصلی حال کی جاندے — گھراں دے بھیدی تانا پیٹا پچھاندے
لا کے کسوٹی کھرا کھوٹا بتاوندے — اُنھی مریدی عادت نہیں دین دار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

حق دے طالب شکلاں ویکھ نہیں بھلدے — رنگ حقیقی ویکھ قدماں وچہ رلدے
یاد اماموں نیئی نیر پے ڈھلدے — مثل نہ ڈیکھی اکھیں عبدالجبار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

گدی توں جھیڑا چھڑیا سنگرہ دے پیراں دا — چودہ لکھ لگا دونوں طرف تدبیراں دا
دنیا دے نائب ویکھو جوڑ تقدیراں دا — پانی دے وچوں بجلی حکمت کرتار دی

جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

مرن چنگیرے پچھے رہن مندیڑے آٹا جیوں چھن دا آوے چھان اتیڑے
مولیٰ نہ بھاون ایسے پھرن بتیڑے سچی زبان نبی ﷺ خیر الاخیار دی

جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

بُریاں نوں مندا اللہ آپ الاوندا نیکاں دی حُب لوکاں دلیں بٹھاوندا
کون صلحاواں تائیں عیب لگاوندا سچ توں چڑنا عادت فاسق فجار دی

جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

میری نہ من، منّی اللہ رسول دی کھوٹا بنا دے بھاویں صورت مقبول دی
عملوں جے گھاٹا رووے بیٹی رسول دی بھاویں اولاد وڈے سید ابرار دی

جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

چوری جے کردی میری بیٹی پیاری ہتھ کٹیندا کردا حد میں جاری
حکم الٰہی اگے سبناں لاچاری کھڑے گھرانے بدیوں معافی سرکار دی

جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

ایسی ہوا وگی وچہ جہان دے وڈ کے جنھاں دے لوکی بزرگ پچھان دے
نام اونھاں دے پچھلے ویچ کے کھاوندے سوچی بے ہنراں کھٹی ایسے بیوپار دی

جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

گدیاں بنیاں اج ہڈاں دیاں منڈیاں ہڈ بزرگاں تولن جھکویاں ڈنڈیاں
مورکھ مریداں پاون ٹھگ بپے ونڈیاں آپس دی چغلی دوہاں مطلب سوار دی

جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

مجھی وڈیری جیویں مجھیاں کھاوندی سنڈھے دی طاقت شامت کٹے دی آوندی

گدی نشیناں اپنی نسل نہیں بھاوندی انھاں حسوداں لوکی بزرگ شمار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

اک دے ول لوکی ٹور جے کر دے نے باقی دا کنبہ سارا دیکھ کے سڑدے نے
اوڑک وتیرا گھر دی چغلی دا پھڑدے نے صوفی وگاڑے لالچ دنیا مردار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

چغلی تے جھوٹھ ایسا سکھیا صوفیاں آیا یزید تے نہ آیا سی کوفیاں
اجہیاں مراقبے وچہ لا دندے لوطیاں سن کے نہ دِسے کوئی جاگہ انکار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

جھوٹ صریحوں ایسا سچ بناوندے سارے ملمعے ایس نوں ویکھ شرماوندے
دنیا دے ٹھگ کسب گھول گھماوندے اکھیں وچہ مٹی پاون عالم ہوشیار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

حق ناحق کملے لوک نہیں کھول دے جس نے پھسایا اوسے نال ہو بول دے
سنت موافق کیوں نہیں گل نوں تول دے انھیں مریدی ماری مت سنسار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

بعض مریداں آیا اکوئی ول اے روٹی جو دیوے کرنی اوس دی گل اے
دین اوھناں دا روٹی منجی محل اے جاگہ بنائی اپنی رات گزار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

جان کے حق آکھن سانوں کی جھیڑا اے آپس دے وچہ آپے کرن نبیڑا اے
آل بزرگاں مندا آکھے کیہڑا اے چھوڑ قرآن پکڑی گل انکار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

امر قرآنوں ویکھیں خالق علیم دا — پوے تنازعہ کوئی دنیا یا دین دا
فیصلہ مہرے سب توں ذکر الحکیم دا — منصف حدیث دوجی مومن سچیار دی

جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

جیوں جیوں انسان دیندا حق دی داد اے — نور عرفان دل نوں کردا آباد اے
کھوٹے دے حامی تیرا خانہ برباد اے — فہم الٹا یا شامت ربی پھٹکار دی

جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

دین جے ہندا کسے پیر مرید دا — وچ ایمان کاہنوں زہر خرید دا
رت سکاوے قرب حبل الورید دا — دل توں نہ جاندی ہیبت غالب قہار دی

جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

عزت تے ذلت ساری اللہ دے وس اے — پیر مریداں ہتھ مٹی تے بھس اے
بندے دا غصہ تیرا لیندا کی کھس اے — خلقت محتاج ساری ربی دربار دی

جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

نبی ﷺ فرمایا اپنے بھائی چچیرے نوں — دلتے لگا دیں میرے سخن بھلیرے نوں
مولا سوارن چاہے کم جے تیرے نوں — ساری مخلوق رل کے نہیں وگاڑ دی

جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

مولیٰ جے آپ چاہے دکھ پہنچاونا — خلقت اکٹھی ہو کے چاہے بچاونا
کون جو موڑے جو کجھ رب دا بھاونا — اوڑک اوہ ہوسی جو لکھی قلم سرکار دی

جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

نبیاں تھیں جیویں لوکی کردے بغاوتاں — سچیاں نال کوڑے رکھن عداوتاں
دین نوں پھڑیاں ٹٹ جان سکاوتاں — ڈولیں نہ مومن دنیا دو تے دن چار دی

جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

پیر اساڈے دکھاں ویکھ نہ ڈول دے — کھنڈے دی چھاویں کلمہ حق دا بول دے
حُب الٰہی لالچ دنیا نوں تول دے — جھک دا اوہ چھابا جس وچ مرضی سرکار دی

جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

دین دی خاطر کٹی قید شریفاں نے — طلب رضائیں جھلے دُرّے ظریفاں نے
دیس نکالا اوڑک دِتا حریفاں نے — طلب ودھیری ہو گئی موسیٰ نوں نار دی

جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

باپ تے دادے بھاویں ولی الٰہی — جدی گھرانا اُچا کسر نہ کائی
دل تے نہ لیاندی کدی قومی وڈیائی — عادت ایہہ ویکھی سوہنے عبدالجبار دی

جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

فخر بزرگاں اللہ آپ کلاہیا اے — حق یہوداں ویکھو صاف فرمایا اے
عملاں وچہ پچھے جو کوئی نبی بتایا اے — اگے نہ کر دی اس نوں نسبت ابرار دی

جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

جنھاں نوں وَلّ آوے گل نہ بات دا — علم نہ دین نبی ﷺ رب دی ذات دا
فخر کریندے اوہ بھی اس واردات دا — وڈکے اساڈے رکھن خوبی ہرکار دی

جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

فخر جیوں کھڑا کردا دوسرے بھائی دا — نفع کی حاصل وچوں ایس وڈیائی دا
اک دی طاقت تے نہ دوجا ویاہی دا — اپنی طاقت اپنا خانہ سوار دی

جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

باجھ مبشراں قطعی نا جی نہ کوئی اے — اک نوں پاک دوجا آکھے نہ کوئی اے

صاف قرآنوں گل فیصل ایہ ہوئی اے ظنّ دی ریتوں لوکی محل اسار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

اتنا ای کہیئے میرا نیک گمان ہے حالت دا واقف اصلی اللہ سبحان ہے
بندہ کمزور ممکن خطا نسیان ہے نبیاں دی ٹولی ربّ سلّم پکار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

باراں ستارے چمکن فلک عبداللہ جی ڈلکاں مریندا جھرل نور تجلّا جی
جس نوں کوئی دیکھے دل نوں آوے تسلّا جی چمک انوکھی اے پر عبدالجبار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

پاک مصور ایسی کٹی تصویر سی چہرا شاہانہ نالے لگ دا فقیر سی
دوویں پٹے ٹپکن ایسی کیتی تدبیر سی صفت عجیبہ دیکھی سُر جن ہار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

یوسف دا جیویں اللہ شان ودھایا اے بھایاں دا ویر اگے اونھاں دے آیا اے
پیر میرے نوں اللہ بھاگ اوہ لایا اے طیّب حیاتی گزری رحمت غفار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

رتبہ ودھایا مولیٰ آپ غلام دا ایس زمانے جس نوں لقب امام دا
قبہ شریعت واقف قلبی مقام دا وانگ کم ظرفاں نہ کجھ عادت تکرار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

سلف بزرگاں وانگوں عادتاں ساریاں زہد عبادت رغبت رقت تے زاریاں
ذوق حلاوت دل نوں دائم سرشاریاں نرمی دے نال کر دے گل پیار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

خوبیاں گھنیاں میتھوں گنیاں نہ جاندیاں چھوٹے رسالے وچہ نہیں سماندیاں
ذکر کریاں مولیٰ رُتاں جے آندیاں پورے سوانح بارش نوری فہار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

پنیاں زمانہ چھانے مذہب بہتیرے میں خالق نوں ڈھونڈاں کیتے جتن گھنیرے میں
چین نہ آوے لائے چکر چوفیرے میں کر گئی تسلی مجلس عبدالجبار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

نال تحقیق ڈِٹھا لا کے زور اے اہل حدیث جیہا مذہب نہ ہور اے
بھاویں مخالف پاوے کتنا شور اے حق دا غلبہ آخر دنیا سب ہار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

نبی نوں بھاویں اِنھاں نہیں تگاھیا اے اے پر جو قول نبی ﷺ پاک دا آیا اے
جان تے مال اس توں گھول گھمایا اے نبی ﷺ دی گل بدنوں لوں لوں پئی ٹھار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

جیویں صحابا کر کے مجلس رسول دی عادت تے خصلت ساری سکھی مقبول دی
تابعداری اینویں کیتی سنت منقول دی عادت محدث پکڑے احمد ﷺ مختار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

حق دے راہوں کدی قدم نہ اکھڑے وانگ اصحاباں پاون دین تو دُکھڑے
صبر کماون نوروں چمک دے مکھڑے ٹولی محافظ ایہو نبوی اخبار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

چھڈی تقلید نالے پیر پرستیاں طعنے سناون کل قوماں تے وستیاں
مولیٰ جے حاصل، کل سختیاں سستیاں دولت تے عزت گھولی خاطر اس یار دی

جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

ہر ہر حالت دل نوں طلب حدیث دی وچہ ورتارے ویکھن سیرت رئیس دی
ڈھونڈھ تے بھال ہر دم اوسے انیس دی دوجے دی گل وچوں کلیجہ نہیں ٹھار دی

جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

سنت دے سچے عاشق، گوراں دی کُھیے نے اہل حدیث زادے رہ گئے اج پچھے نے
دینوں بے رغبت پھردے تھچے تے مچھے نے کانواں نے جگہ ملّی ہنساں دی ڈار دی

جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

منگ فقیرا مولیٰ کولوں دعائیں یا رب مینوں سنگ نیکاں ملائیں
لَے گل لاوے سوہنا امت دا سائیں حمد صلواتاں جھولی ڈالی سرکار دی

جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

خدمت احباب عرض عبدالکریم دی نصرت دعاؤں کرنی خادم اثیم دی
دنیا تھیں رحلت جدوں ہووے مقیم دی کفن چھپاوے رحمت ارحم ستار دی

جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لدائی چٹھی آ گئی سرکار دی

مولانا عبدالجبار عمرپوری

(وفات اگست ۱۹۱۶ء)

ہندوستان کے صوبہ یوپی کے بے شمار مقامات میں بے شمار علمائے دین نے جنم لیا، جنھوں نے تحریر و تقریر اور تدریس و تصنیف کے ذریعے کتاب و سنت کی بے پناہ خدمت کی اور اس خدمت کی وجہ سے ان کا نام ہمیشہ تاریخ کے صفحات میں جگمگاتا رہے گا اور ان کے حالات کا مطالعہ کرنے والے ان سے استفادہ کرتے رہیں گے۔ خدامِ دین کے اس گروہِ باصفا میں عمرپوری خانوادہ کے اصحابِ علم کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان میں ایک بزرگ مولانا عبدالجبار عمرپوری تھے۔

عمرپور ضلع مظفرنگر میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، جس میں ایک ذی علم شخص منشی بدرالدین سکونت فرماتھے جو اس نواح میں اپنی علمیت و شرافت کی بنا پر احترام و اکرام کے مقام پر فائز تھے۔ صاحب ترجمہ مولانا عبدالجبار عمرپوری انھی کے فرزندِ دلبند تھے جو جمادی الاخریٰ ۱۲۷۷ھ (جنوری ۱۸۶۱ء) کو عمرپور میں پیدا ہوئے۔ حصولِ علم کا آغاز گھر میں کیا اور والدِ مکرم سے مختلف علوم کی بعض کتابیں پڑھیں۔ پھر کچھ بڑے ہوئے تو گھر سے نکلے اور اس عہد کے مشاہیر اساتذہ سے حصولِ فیض کیا، جس کی روداد کچھ اس طرح ہے۔

☆...... امرتسر میں اس وقت علمائے غزنویہ کا سلسلۂ تدریس بڑی شہرت رکھتا تھا، جس میں حضرت الامام مولانا سید عبدالجبار غزنوی، مولانا عبدالرحیم غزنوی، مولانا عبدالغفور غزنوی، مولانا عبدالاوّل غزنوی اور بعض دیگر اساتذۂ فن کے تدریسی حلقے قائم تھے۔ مولانا عبدالجبار عمرپوری وہاں حاضر ہوئے اور تحصیل علم میں مشغول ہو گئے۔

☆...... امرتسر ہی میں مولانا غلام العلی قصوری کی مسندِ درس آراستہ تھی، ان سے صرف و نحو اور فن بلاغت کی کتابیں پڑھیں اور علم منطق کے بعض رسائل پڑھے۔

☆...... امرتسر ہی میں ایک حنفی عالم مولانا عبدالعلی اور ایک شیعہ استاد مولانا محمد ابراہیم پانی پتی سے بعض کتابیں پڑھیں۔

☆...... اس کے بعد امرتسر سے کوچ کیا اور سہارن پور پہنچے، وہاں مولانا محمد مظہر نانوتوی سے فقہ اور اصول فقہ کی چند کتابیں پڑھنے کی سعادت حاصل کی۔

☆......وہیں مولانا احمد علی سہارن پوری سے حدیث کی بعض کتابوں کا درس لیا۔

☆......علوم حکمیہ یعنی منطق و فلسفہ کی مروّجہ کتابوں کی تکمیل مولانا احمد حسن سے کی۔

☆......مولانا فیض الحسن سہارن پوری سے عربی ادبیات اور بلاغت و معانی کی کتابیں پڑھیں۔

☆...... بعد ازاں عازمِ دہلی ہوئے اور حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کی خدمت اقدس میں پہنچے۔ ان سے صحیح بخاری، صحیح مسلم، نسائی، ابو داؤد اور ابن ماجہ وغیرہ کتبِ حدیث کا درس لیا۔ کتبِ تفسیر کی تکمیل بھی حضرت میاں صاحب سے کی اور ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء) میں ان سے سند و اجازہ کی سعادت سے بہرہ مند ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر بیس سال کی تھی۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد دہلی ہی میں سکونت اختیار کر لی اور اسی شہر کو مرکزِ تدریس قرار دے لیا۔ دہلی کے علاقہ کشن گنج میں (جسے اس وقت حسن گنج بھی کہا جاتا تھا) مدرسہ دار الہدیٰ میں مسندِ درس بچھائی اور شائقین علم کو پڑھانا شروع کیا۔ نمازِ فجر کے بعد عام نمازیوں کے لیے درسِ قرآن دیا کرتے تھے۔ بہت سے علما و طلبا نے ان سے اخذِ علم کیا، جن میں علامہ عبدالعزیز میمنی (متوفی ۲۷- اکتوبر ۱۹۷۸ء) مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی (متوفی ۴- اگست ۱۹۶۲ء) حافظ عبدالستار عمر پوری (متوفی ۶- مارچ ۱۹۱۶ء) شامل ہیں۔

مولانا عبدالجبار عمر پوری نے تدریس کے ساتھ ساتھ صحافتی خدمات بھی سر انجام دیں۔ ۱۹۰۲ء میں انھوں نے کلکتہ سے ''ضیاء السنۃ'' کے نام سے ماہانہ رسالہ جاری کیا۔ یہ رسالہ ان کے چھوٹے بھائی مولانا ضیاء الرحمٰن کی نگرانی میں شائع ہوتا تھا۔ اس رسالے کی کئی قسطوں میں مولانا عبدالجبار عمر پوری کے منکر حدیث عبداللہ چکڑالوی کے خلاف زوردار مضامین شائع ہوئے۔ قادیانیوں کی تردید میں بھی انھوں نے اس رسالے میں مقالات سپردِ قلم کیے جو اس کے حلقۂ قارئین میں دلچسپی سے پڑھے گئے۔ علاوہ ازیں نبی ﷺ کی سیرتِ مبارکہ، خلافتِ اسلامی، معجزاتِ نبوی، عصمتِ نبوی، عربی زبان کی خصوصیات، فصاحت و بلاغت وغیرہ موضوعات پر اہم مضامین معرضِ اشاعت میں آئے۔ روزمرہ پیش آنے والے مسائل کی وضاحت کے لیے ''باب الفتاوی'' اس رسالے کا مستقل عنوان تھا۔

''ضیاء السنہ'' میں لکھنے والوں کی فہرست میں حضرت مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری، مولانا حکیم عبیدالرحمٰن عمر پوری، مولانا عبدالسلام مبارک پوری، مولانا حافظ ابو یحییٰ شاہ جہان پوری، مولانا ابو النعمان اعظم گڑھی، اور دیگر متعدد حضرات شامل تھے، جو اس زمانے کے جید اصحابِ علم تھے۔

مولانا عبدالجبار عمر پوری نامور مصنف بھی تھے۔ انھوں نے مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف فرمائیں:

۱۔ صمصام التوحید فی رد التقلید

۲- ارشاد السائلین فی مسائل الثلاثین

۳- تذکیر الاخوان فی خطبۃ الجمعۃ بکل لسان

۴- تبصرۃ الانام فی فرضیۃ الجمعۃ فی کل مقام

۵- ارشاد الانام فی فرضیۃ الفاتحۃ خلف الامام

حضرت مولانا عبدالجبار عمر پوری تفسیر و حدیث اور دیگر علوم کی طرح شعر و شاعری سے بھی دلچسپی رکھتے تھے اور عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ ماہنامہ ''ضیاء السنہ'' میں ان کا کلام چھپتا رہتا تھا۔

وہ تبلیغی جلسوں میں تشریف لے جاتے تو تقریر کے علاوہ اپنا کلام بھی بڑی خوشی سے سناتے، جس سے سامعین محظوظ ہوتے۔

اس زمانے میں ندوۃ العلماء لکھنؤ کا سالانہ جلسہ ملک کے مختلف شہروں میں منعقد ہوتا تھا۔ مولانا عبدالجبار عمر پوری اس میں باقاعدہ شرکت فرماتے۔ جلسے میں تقریر بھی کرتے اور اپنے اشعار بھی سناتے۔ حسبِ مواقع کہیں عربی کے شعر پڑھتے، کہیں فارسی اور کہیں اردو کے۔

تقویٰ اور پرہیزگاری کی نعمت سے بھی اللہ تعالیٰ نے انھیں نوازا تھا۔ اس عالم دین نے شوال ۱۳۳۴ھ (اگست ۱۹۱۶ء) میں دہلی میں وفات پائی اور اپنے استاذِ مکرم حضرت میاں سید نذیر حسین کے قریب شیدی پورہ کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔ صرف ۵۷ سال عمر پائی۔ وہ مولانا عبدالغفار حسن مرحوم و مغفور کے جدِّ امجد تھے۔ [1]

[1] نزہۃ الخواطر: ج ۸ ص ۲۳۳-۲۳۴۔

نواب وحید الزمان خاں حیدر آبادی

(وفات ۱۵- مئی ۱۹۲۰ء)

نواب وحید الزمان خاں حیدر آبادی مرحوم و مغفور کی خدمتِ قرآن کا تذکرہ یہ فقیر اپنی ایک کتاب ''برصغیر کے اہل حدیث خدام قرآن'' میں کر چکا ہے۔ یہ کتاب ۲۰۰۵ء میں مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور کی طرف سے شائع ہوئی تھی۔ ان کی خدمتِ حدیث کا دائرہ بھی اللہ کی مہربانی سے بہت پھیلا ہوا ہے۔ اس لیے اس کتاب میں عرض کیا گیا تھا کہ ان کی خدمتِ حدیث کی تفصیل ''دبستان حدیث'' میں بیان کی جائے گی، لیکن اس میں بھی نہیں کی گئی اور اس کے بعد ''گلستان حدیث'' شائع ہوئی، اس میں بھی افسوس ہے کہ اس طرف توجہ مبذول نہیں ہوئی۔ اب یہ فریضہ ''چمنستان حدیث'' میں ادا کیا جا رہا ہے۔

نواب صاحب مرحوم کی خدماتِ حدیث کا مطالعہ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ چند الفاظ میں ان کے حالات پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

ان کے اسلاف درحقیقت افغانستان کے رہنے والے تھے۔ ان میں سے ایک بزرگ کسی زمانے میں اپنے اصل وطن سے نکلے اور ملتان آ کر آباد ہو گئے، انھیں ملتانی کی نسبت سے پکارا جانے لگا۔ نواب صاحب کے پردادا مولانا احمد فاروقی تھے۔ انھوں نے اپنے علم و کمال کی وجہ سے بڑی شہرت پائی اور ان کا شمار وقت کے ممتاز علما میں ہوا۔ نواب صاحب کے دادا مولانا نور محمد تھے۔ وہ بھی نامور عالم تھے اور درس و تدریس ان کا اصل مشغلہ تھا۔ ملتان میں طلبا کو معقولات کی کتابیں پڑھاتے تھے اور اس موضوع میں ان کی بڑی شہرت تھی۔ ایک مرتبہ کسی کام سے لکھنؤ گئے۔ وہاں کے حلقۂ علما میں غائبانہ طور پر متعارف تھے۔ اب ان سے براہِ راست ملاقات کا موقع ملا اور باہم بات چیت کا سلسلہ چلا تو لکھنؤ کے علما ان سے بے حد متاثر ہوئے، انھوں نے ان کو وہیں روک لیا اور مسندِ درس پر بٹھا دیا۔ طالبانِ علم ان کے گرد جمع ہو گئے اور وہ انھیں معقولات کی کتابیں پڑھانے لگے۔ اب ملتان سے ان کا تعلقِ سکونت ختم ہو گیا تھا اور انھوں نے لکھنؤ کو اپنا مسکن قرار دے لیا تھا۔

لکھنؤ میں ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء) کو مولانا نور محمد کے بیٹے مسیح الزمان پیدا ہوئے۔ مسیح الزمان نے علوم مروّجہ کی تمام کتابیں باقاعدہ پڑھیں، لیکن درس و تدریس کے بجائے وہ تجارت میں مشغول ہو گئے اور لکھنؤ کے کشمیری محلے میں اپنا پریس قائم کیا اور عربی، فارسی، اردو کی کتابیں چھاپنے لگے۔ اسی اثنا میں انھوں نے ایک

پریس کان پور میں بھی لگا لیا اور پھر یہ ہوا کہ ۱۲۶۷ھ (۱۸۵۰ء) کے لگ بھگ اپنا تمام کاروبار لکھنؤ سے کان پور لے گئے اور اسی شہر میں سکونت اختیار کر لی۔

مسیح الزمان کے چار بیٹے تھے، جن کے نام علی الترتیب یہ تھے: بدیع الزمان، حسام الزمان، وحید الزمان اور فرید الزمان۔ آئندہ سطور میں نواب وحید الزمان کی خدمتِ حدیث کا ذکر کیا جائے گا۔ لیکن پہلے ان کے مختصر حالات اور تحصیل علم کا ذکر ملاحظہ ہو:

نواب وحید الزمان ۱۲۶۷ھ (۱۸۵۰ء) کو کان پور میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے زمانے میں مسیح الزمان نے اپنے اہل و عیال کو کان پور شہر سے موضع ''پنڈوریاں'' بھیج دیا تھا۔ ایک سال کے بعد حالات اعتدال پر آئے تو انھیں پھر کان پور بلا لیا تھا۔

وحید الزماں نے حصولِ علم کا آغاز اپنے بڑے بھائی حافظ بدیع الزمان سے کیا۔ اس کے بعد جن اساتذہ سے کسبِ فیض کیا وہ ہیں مفتی عنایت احمد کاکوروی، سید حسین شاہ بخاری، مولانا لطف اللہ علی گڑھی۔ طب کی کتابیں حکیم احمد علی خاں سے پڑھیں۔ کتبِ فقہ مولانا عبدالحی فرنگی محلی سے پڑھیں۔ تفسیر اور حدیث کی کتابوں کے لیے مولانا بشیر الدین قنوجی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے بابِ عالی پر بھی دستک دی اور ان سے سندِ حدیث لی۔ شیخ حسین بن محسن انصاری اور مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی سے بھی استفادہ کیا۔ مدینہ منورہ میں مولانا عبدالغنی مجددی سے مستفید ہوئے۔ حرمین شریفین کے علما میں سے شیخ احمد بن عیسیٰ بن ابراہیم شرقی حنبلی اور شیخ بدرالدین مدنی سے سند لی۔

حضرت میاں صاحب نے اپنی سند میں ان کے متعلق یہ الفاظ تحریر فرمائے:

لقد اجزت لجمیع مرویاتی من کتب الحدیث اعنی الصحاح الستة وغیرها للمولوی الالمعی الذی له رأی صائب و ذهن ثاقب وحید الزمان بن مسیح الزمان......

نواب وحید الزمان نے بہت سی کتابیں لکھیں اور متعدد عربی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا، لیکن ذیل میں ان کی صرف حدیث کی کتابوں کے ترجمے کا تذکرہ کیا جاتا ہے یا ان کتابوں کا جن میں مندرج احادیث کی انھوں نے تخریج کی۔

۱- احسن الفوائد فی تخریج احادیث شرح العقائد: یہ رسالہ عربی زبان میں ہے اور بڑی تقطیع کے سولہ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۲۸۴ھ میں مطبع علوی سے چھپ کر شائع ہوا۔ اس رسالے میں علم العقائد کی مشہور کتاب شرح العقائد النسفیه کی حدیثوں کی تخریج کی گئی ہے یعنی یہ بتایا

گیا ہے کہ کتاب مذکور میں جو حدیثیں درج ہوئی ہیں وہ حدیث کی کن کن کتابوں میں ہیں اور کہاں کہاں ہیں۔

۲- اشراق الابصار فی تخریج احادیث نور الانوار: یہ کتاب عربی زبان میں ہے۔ اس میں موصوف نے اصول فقہ کی مشہور درسی کتاب نورالانوار (جو اورنگ زیب عالم گیر کے استاد احمد المعروف بہ ملا جیون المتوفی ۱۱۳۰ھ کی تالیف ہے) میں درج حدیثوں کی تخریج کی ہے۔ یہ تخریج بڑی تقطیع کے ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۱ء) میں مطبع مصطفائی لکھنؤ سے چھپ کر شائع ہوئی تھی۔

۳- تشریح الحج و الزیارة: یہ رسالہ اردو زبان میں ہے اور حج کے ضروری مسائل اور مسجد نبوی کی زیارت کے فضائل پر مشتمل ہے۔ متوسط تقطیع کے ۵۲ صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔ ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۶ء میں قاضی محمد ابراہیم کے زیر اہتمام بمبئی سے چھپا اور مفت تقسیم ہوا۔

۴- کشف المغطاعن الموطا: یہ حدیث کی مشہور کتاب موطا امام مالک کا اردو ترجمہ اور مختصر شرح ہے۔ متوسط تقطیع کے ۶۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ پہلی بار ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) میں مطبع مرتضوی دہلی میں چھپی۔ پھر متعدد مطابع سے شائع ہوئی۔ اصح المطابع کراچی نے بھی شائع کی۔

۵- الهدی المحمود ترجمه سنن ابی داؤد: یہ سنن ابی داؤد کا اردو ترجمہ ہے جو بڑی تقطیع کی دو ضخیم جلدوں میں مطبع صدیقی لاہور سے ۱۳۰۱ھ (۱۸۸۴ء) میں چھپ کر شائع ہوا۔ پہلی جلد ۶۳۸ اور دوسری جلد ۶۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

۶- روض الربٰی من ترجمة المجتبٰی: یہ امام نسائی کی سنن المجتبٰی کا اردو ترجمہ ہے اور متوسط تقطیع کی دو ضخیم جلدوں میں ۱۳۰۲ھ میں مطبع صدیقی لاہور سے شائع ہوا۔

۷- المعلم ترجمه صحیح مسلم: یہ صحیح مسلم کا اردو ترجمہ اور مختصر شرح ہے۔ متوسط تقطیع کی چھ ضخیم جلدوں میں ۲۸۷۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۳۰۶ھ میں مطبع صدیقی لاہور سے چھپ کر شائع ہوا۔

۸- تسہیل القاری ترجمہ اردو صحیح البخاری: (مع الشرحین فتح الباری و ارشاد الساری یعنی قسطلانی مع نيل الاوطار شرح منتقى الأخبار)

۱۰- رفع العجاجه عن ترجمة سنن ابن ماجه: یہ سنن ابن ماجہ کا اردو ترجمہ ہے اور متوسط تقطیع کی تین ضخیم جلدوں میں مطبع صدیقی لاہور سے ۱۳۱۰ھ میں چھپ کر شائع ہوا۔

۱۱- تیسیر الباری ترجمة صحیح البخاری: یہ صحیح بخاری کا اردو ترجمہ ہے اور اس پر مختصر فوائد ہیں، چوں کہ یہ کتاب تیس پاروں میں ہے اس لیے ہر ایک پارہ ترتیب کے ساتھ جدا جدا، مطبع احمدی

لاہور سے چھپ کر شائع ہوا تھا۔

نواب وحید الزمان خاں جلیل القدر عالم اور رفیع المنزلت مترجم تھے۔ کتب حدیث کا اردو ترجمہ ان کا بہت بڑا علمی کارنامہ ہے۔

ان کا حلیہ یہ تھا جو حیات وحید الزمان میں بھی مرقوم ہے اور نزہۃ الخواطر میں بھی۔ طویل قامت، کشادہ پیشانی، موٹی آنکھیں، لمبی اور ستویں ناک، کان پتلے اور لمبے، کتابی چہرہ، گھنی بھویں، پتلی اور لمبی گردن، باریک ہونٹ، چوڑا چہرہ، گول داڑھی، جسم گھٹا ہوا اور ورزشی۔

کھانا کم کھاتے۔ ملازموں پر شفقت کرتے۔ دوستوں سے احترام کے ساتھ پیش آتے۔ خوش خصال اور مہمان نواز تھے۔

وفات سے ایک سال پہلے اپنے والد ماجد مولوی مسیح الزمان کو خواب میں یہ فرماتے ہوئے دیکھا "اب گھڑے میں حیات کا پانی خالی ہو گیا ہے۔"

اس کی تعبیر یہ کی کہ اب موت کا وقت قریب ہے۔ چنانچہ اس سے ایک سال بعد ۱۵ مئی ۱۹۲۰ء (۲۵ شعبان ۱۳۳۸ھ) کو انتقال کر گئے۔

سید عبدالرحیم شاہ امرتسری

(وفات ۲۵ اگست ۱۹۲۰ء)

برصغیر کے مختلف علاقوں میں بے شمار ایسے اصحابِ علم ہوں گے جو اپنے عہد کے رفیع المرتبت لوگ تھے اور ان کا دائرۂ عمل بے حد وسیع تھا لیکن افسوس ہے ہم ان سے بہت سے بزرگوں کے نام اور کام سے آگاہ نہیں ہیں۔ اہل قلم کو کوشش کر کے ان بزرگانِ دین کے احوالِ زندگی منظر عام پر لانا چاہیے۔ ہمارے عزیز دوست حمید اللہ خاں عزیز (ایڈیٹر ماہنامہ ''تفہیم الاسلام'' احمد پور شرقیہ) مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اپنے علاقے سے اس مہم کا آغاز کر دیا ہے۔ وہ (سابق ریاست) بہاول پور کے علما و صلحا کے حالات جمع کر رہے ہیں۔ یہ اگرچہ بہت مشکل کام ہے لیکن ناممکن نہیں ہے۔ استقلال اور عزم کے ساتھ اس کی تکمیل کے لیے کوشاں ہوا جائے تو ان شاء اللہ ضرور کامیابی ہوگی۔ جس قدر بھی کام ہو سکے کرنا چاہیے۔ موجودہ دور کے علما بھی منزلِ بزرگی کی طرف بڑھ رہے ہیں، انھیں جہاں تک ممکن ہو، اپنے واقعاتِ حیات خود قلم بند کرنے چاہئیں یا کسی سے لکھوانے کی سعی کرنا چاہیے تاکہ آئندہ نسلیں ان سے مستفید ہو سکیں۔ اگر اس طرف توجہ نہ کی گئی تو تاریخ منجمد ہو جائے گی اور لوگ اپنے اسلاف کے حالات سے بے خبر ہو جائیں گے۔ ہم مشہور علماء کے حالات تو بار بار لکھتے ہیں لیکن غیر مشہور کی طرف ہمارا دھیان نہیں جاتا۔ ضروری ہے کہ اس طرف بھی عنان توجہ مبذول کی جائے۔

زیب عنوان عالم سید عبدالرحیم شاہ امرتسری کے حالات سے ہمیں جناب حمید اللہ خاں عزیز نے مطلع کیا۔ آئندہ سطور کا ماخذ ان کا یہی مرقومہ و مرسلہ مضمون ہے۔

شاہ صاحب مرحوم ۱۸۵۷ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسم گرامی سید عبداللہ شاہ تھا اور جدِّ امجد کا سید محمد صالح۔ یہ علوی خاندان ہے اور تیس واسطوں سے ان کا سلسلہ نسب حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔

سید محمد صالح ۲۵ دسمبر ۱۷۵۰ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ اس خاندان کے لوگوں کا شمار امرتسر کے رؤساء میں ہوتا تھا۔ ان کے بہت سے افراد ضلع کرنال کے موضع کاچھوہ میں آباد تھے۔ اب یہ علاقہ ہندوستان کے صوبہ ہریانہ میں شامل ہے۔ تقسیم ملک کے زمانے میں یہ مشرقی پنجاب کا حصہ تھا۔

سید عبداللہ شاہ عالم و فاضل بزرگ تھے اور ان کا تعلق سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید دہلوی کی

جماعتِ مجاہدین سے رہا تھا۔ ان کے فرزندِ گرامی سید عبدالرحیم شاہ بھی اسی جماعت سے منسلک تھے۔ انھوں نے درسِ نظامی کی تکمیل اپنے والد مکرم سید عبداللہ امرتسری سے کی۔ اس کے بعد دہلی جا کر حضرت میاں سید نذیر حسین کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور ان سے اخذِ فیض کیا۔ مولانا عبدالحی فرنگی محلی لکھنوی سے بھی علومِ مروجہ کی چند کتابیں پڑھیں۔

بھوپال بھی تشریف لے گئے، وہاں نواب صدیق حسن خاں کی خدمت میں حاضری دی اور علوم حدیث میں ان سے حصولِ فیض کیا۔ سید عبدالرحیم شاہ امرتسری مشہور خطاط بھی تھے، چنانچہ نواب صاحب کی بعض تصانیف کی انھوں نے کتابت کی۔ فنِ خطاطی میں مہارت کی وجہ سے نواب صاحب نے انھیں ''یاقوت قلم'' کا خطاب دیا۔ وہ پچیس سال کی عمر میں نواب صاحب کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہوئے تھے۔ نواب صاحب کی وفات ۲۹ جمادی الاخریٰ ۱۳۰۷ھ کو ہوئی تھی۔ اس سے صرف ایک سال قبل ان کی خواہش اور حکم پر ریاست بہاول پور آئے۔ ❶

سید عبدالرحیم شاہ صاحب کے بہاول پور آنے کی وجہ یہ ہوئی کہ ریاست کے نواب صادق محمد خاں عباسی رابع کے دورِ حکومت میں عیسائی مشنریوں نے ریاست میں عیسائیت کی تبلیغ کی اور لوگوں کی مالی مدد بھی کی جس کی وجہ سے بعض مسلمانوں نے عیسائیت قبول کر لی۔ اس سے نواب صاحب کو بڑا دکھ پہنچا اور یہاں کے علما اور عام مسلمانوں کو بھی شدید صدمہ ہوا۔ انھوں نے نواب صاحب سے ریاست میں عیسائیت کی تبلیغ پر پابندی عائد کرنے اور عیسائی مبلغوں کو اپنی قلمرو سے نکال دینے کا مطالبہ کیا۔

نواب بہاول پور کے نواب صدیق حسن خاں والیِ بھوپال سے اچھے مراسم تھے۔ انھوں نے ۱۸۸۷ء میں ان کو اپنے سفیر کے ذریعے خط بھیجا کہ ریاست بھوپال سے یہاں کسی ایسے عالم دین کو بھیجا جائے جو عیسائی مذہب پر عبور رکھتا ہو۔ چنانچہ نواب صدیق حسن خاں نے سید عبدالرحیم شاہ صاحب کا انتخاب کیا اور کچھ عرصے کے لیے انھیں بہاول پور بھیج دیا۔

حضرت شاہ عبدالرحیم مرحوم اگست ۱۸۸۷ء میں بہاول پور تشریف لائے۔ نواب صاحب بہاول پور نے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا اور اپنے وزراء و مصاحبین سے ان کا تعارف کرایا۔ نور محل کے ایک حصے میں ان کے قیام کا انتظام کیا اور شاہی کتب خانے کی چابیاں ان کے حوالے کیں۔ اپنے قیام کے دوران میں انھوں نے عیسائی پادریوں سے مناظرے بھی کیے اور عیسائیت کے خلاف کتابیں بھی لکھیں۔ لیکن اس کی تفصیل کا علم نہیں ہو سکا۔

۱۸۹۰ء میں نواب صدیق حسن خاں کی وفات پر وہ بھوپال گئے۔ کچھ عرصہ وہاں ان کا قیام رہا۔ پھر

❶ ملاحظہ ہو ''صادق دوست'' صادق دوست اکیڈمی، ڈیرہ نواب صاحب، تحقیق صاحب زادہ بازید عباسی، اشاعت جون ۱۹۹۱ء۔

امرتسر چلے گئے۔ اسی اثنا میں مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کا دعویٰ کیا تو اس کی تردید میں سرگرم عمل ہو گئے۔ بعد ازاں ۲۰ جنوری ۱۸۹۱ء کو وہ بہاول پور آ گئے۔ اس وقت ان کی دو بیٹیاں، دو بیٹے اور بیوی یعنی پانچ افراد ان کے ہم رکاب تھے۔ اب وہ مستقل طور پر بہاول پور آ گئے تھے۔ اس کا ذکر انھوں نے نواب صادق محمد خاں رابع سے کیا تو وہ نہایت خوش ہوئے اور ان کی رہائش کا انتظام کر دیا۔ نیز ڈیرہ نواب صاحبؒ کی شاہی جامع مسجد کی خطابت اور درس قرآن و حدیث کی مسند ان کے سپرد کی۔ دو سال انھوں نے یہ خدمت سرانجام دی۔ پھر ۱۸۹۳ء میں انھیں جامع مسجد احمد پور شرقیہ (چوک بازار) کے مستقل خطیب اور مدرس مقرر کر دیا گیا۔ اُس وقت احمد پور شرقیہ میں جماعت اہل حدیث کی دو بڑی مسجدیں تھیں۔

ایک جامع مسجد ٹاہلیاں والی واقع محلہ کٹڑہ احمد خا۔ اس کی بنیاد ۱۷۲۰ء میں رکھی گئی تھی۔ حضرت شاہ عبدالرحیم کے دور میں اس کے خطیب مولانا احمد واعظ تھے، جو اس علاقے کے مشہور عالم تھے اور حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے شاگرد تھے۔

دوسری چوک بازار والی الصادق مسجد تھی۔ اس کی بنیاد ۱۷۸۲ء میں نواب بہاول خاں ثانی نے رکھی تھی۔ اس مسجد کے اولیں خطیب اور مدرس وہاں کے معروف اہل حدیث عالم محمد اسماعیل مرحوم تھے۔

حضرت شاہ عبدالرحیم امرتسری احمد پور شرقیہ تشریف لانے کے بعد تا دم واپسیں یہاں کتاب و سنت کی دعوت کا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔

جناب حمید اللہ خاں عزیز نے شاہ صاحب مرحوم کے بارے میں ڈیرہ نواب صاحب کے ایک بزرگ حکیم بدر حسین چشتی کے تاثرات ان الفاظ میں بیان کیے ہیں:

> ”سید عبدالرحیم شاہ امرتسری ڈیرہ نواب صاحب میں ایک ممتاز عالم ہو گزرے ہیں۔ اہل حدیث مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ زندگی بھر اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں مصروفِ عمل رہے۔ انھوں نے انتہائی سادہ زندگی بسر کی۔ ”صادق سرائے“ کے قریب ان کی رہائش تھی، جس پر امرتسری منزل لکھا تھا جو کم و بیش پچیس سال ان کا مسکن رہی۔
>
> ”حضرت شاہ صاحب اول وقت نماز ادا کرتے۔ شاہی مسجد میں خطابت اور امامت کے دوران شعار اہل حدیث کے پابند رہے۔ مختلف نقطہ ہائے فکر کے لوگ ان کے نظریات سے اختلاف کر سکتے ہیں، لیکن جہاں تک ان کی علمی فضیلت کا تعلق ہے، شاید ہی کسی کو اس سے انکار ہو۔
>
> شاہ صاحب مرحوم کو والیٔ بھوپال نواب صدیق حسن خاں سے خاص نسبت تھی۔ ان کا شمار نواب صاحب ممدوح کے لائق تریں شاگردوں میں ہوتا تھا۔ ان کے پاس نواب صاحب کے دس خطوط

تھے، جنھیں وہ بہت بڑا علمی خزانہ قرار دیتے تھے۔ ان کے پاس بہت سی ایسی کتابیں بھی تھیں جن پر نواب صاحب کے دستخط تھے۔ امرتسر سے شاہ صاحب کا کتب خانہ نواب صاحب بہاول پور نے دو گاڑیوں پر منگوایا تھا۔ اس کتب خانے میں علم حدیث بالخصوص فنِ رجال پر بہت سی کتابیں تھیں۔ شاہ صاحب جہاں درس و تدریس اور وعظ و خطابت میں یگانہ تھے، وہاں وہ مشہور مصنف بھی تھے۔ ایک درجن سے زائد کتابیں ان کی تصانیف میں شامل ہیں، جن میں بعض مطبوعہ تھیں اور بعض غیر مطبوعہ۔ ان کا رہن سہن بالکل سادہ تھا۔ وہ پرانی وضع کے باوقار عالم تھے۔ اس دور کے مشہور علماء ان کی خدمت میں آتے اور ان سے حصول فیض کرتے۔ زاہد و متقی اور متوکل علی اللہ بزرگ تھے۔ عمر کے آخری حصے میں وہ نقاہت کی وجہ سے گوشہ گیر ہو گئے تھے۔ تاہم مختلف مقامات سے لوگ ان کی خدمت میں حاضری دیتے اور مستفیض ہوتے تھے۔'' [1]

شاہ عبدالرحیم امرتسری کے شاگردوں کا علم نہیں ہو سکا۔ صرف ایک شاگرد کا پتا چلا ہے، جن کا نام مولانا محمد شریف علی گڑھی تھا۔ وہ عربی، اردو، فارسی، انگریزی کے ماہرین میں سے تھے اور علی گڑھ کالج کی تاسیس کے سلسلے میں سر سید احمد خاں مرحوم کے معاون تھے۔ ریاست بہاول پور سے ''عربی ادب'' کے نام سے ایک ماہنامہ رسالہ انھوں نے جاری کیا تھا۔ وہ ریاست بہاول پور کے سرکاری چھاپے خانے ''صادق الانوار'' کے ناظم بھی رہے۔

مولانا محمد شریف علی گڑھی اپنے استاذ مکرم سید عبدالرحیم شاہ امرتسری مرحوم کے متعلق لکھتے ہیں:

كان الشيخ سلفي المنهج و الاعتقاد على طريق اهل السنة و الحديث و كان شديد التاثر بشيخ الاسلام نواب صديق حسن خان كما يرى من مصنفاته.

یعنی ''شیخ صاحب موصوف عقیدے کے اعتبار سے حدیث و سنت پر عامل تھے اور جیسا کہ ان کی تصانیف سے پتا چلتا ہے وہ حضرت نواب صدیق حسن خاں سے بے حد متاثر تھے۔''

اب آیئے سید عبدالرحیم شاہ امرتسری کی آل اولاد کی طرف۔ ان کے دو بیٹے تھے اور دو بیٹیاں۔ بیٹیوں کے نام تھے سیدہ فاطمہ اور سیدہ رقیہ۔ دونوں کی شادی بہاول پور کے ہاشمی خاندان میں ہوئی...... اور بیٹوں کے نام تھے سید محمد حسن شاہ اور سید محمد محسن شاہ......!

سید محمد حسن شاہ نے ایف اے تک تعلیم حاصل کی۔ پھر فوج میں کمیشن لیا اور بریگیڈیئر کے عہدے پر

[1] شاہ صاحب موصوف کے بارے میں حکیم بدر حسین چشتی کے مضمون کا یہ خلاصہ ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو روز نامہ ''کائنات'' بہاول پور مورخہ ۲۰ ستمبر ۱۹۶۴ء۔ مضمون بہ عنوان ''یادِ رفتگان''

ریٹائر ہوئے۔ تقریباً ستر سال کی عمر میں وفات پائی۔

سید محمد محسن شاہ ریاست کے محکمۂ تعلیم میں ملازم ہوئے۔ صادق پبلک سکول بہاول پور میں انگریزی کے استاد تھے۔ بہاول پور میں مسلک اہل حدیث کی ترویج و اشاعت میں سرگرم رہے۔

سید عبدالرحیم شاہ صاحب کی بیوی نے ۱۹۳۰ء میں وفات پائی۔

سید صاحب ممدوح نے قادیانیت کی تردید کے سلسلے میں ریاست بہاول پور میں تحریری اور تقریری صورت میں بڑی خدمات سر انجام دیں۔ اس موضوع پر ان کے مضامین مولانا محمد حسین بٹالوی کے رسالہ ''اشاعۃ السنۃ'' میں بھی شائع ہوتے رہے اور مولانا ثناء اللہ امرتسری کے ہفت روزہ ''اہل حدیث'' میں بھی۔ ردِّ قادیانیت میں انھوں نے کتابیں بھی تصنیف کیں۔

۱۹۰۲ء میں بہاول پور میں ردِّ قادیانیت سے متعلق پہلا جلسہ عام سید عبدالرحیم شاہ صاحب کی تحریک سے منعقد ہوا، جس میں ملک کے مشہور علمائے کرام نے شرکت کی اور تقریریں کیں۔ اس جلسے کا اشتہار ریاست کے سرکاری خبرنامہ ''صادق الاخبار'' میں چھپا۔ مولوی عبدالعزیز بہاول پوری مرحوم لکھتے ہیں:

> ''ریاست بہاول پور میں مرزائیت کی تردید میں تمام مکاتب فکر کی کاوشیں یک جا کریں، اور مولانا سید عبدالرحیم شاہ صاحب کی محنت کو ایک پلڑے میں ڈالا جائے تو پھر بھی ان کا مقام زیادہ ہوگا۔'' ❶

حضرت شاہ صاحب نے ۱۰ ستمبر ۱۹۱۸ء کو اپنے تلمیذ مولانا محمد شریف علی گڑھی کے نام ایک خط تحریر فرمایا جس میں لکھا:

> ''طبعی عمر کو پہنچ چکا ہوں ...... بس دعا کریں اللہ تعالیٰ میری نجات فرمادے۔ قادیانیت کا فتنہ اٹھا۔ اللہ کی توفیق سے اس کی سرکوبی میں اپنا حصہ ڈال چکا ہوں۔ باری تعالیٰ سے امید واثق ہے کہ عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ کے لیے میری اس ادنیٰ سی کوشش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرما کر بخشش کا ذریعہ فرمادے۔'' ❷

نواب صادق محمد خاں عباسی پنجم کے دور میں ڈیرہ نواب صاحب میں تحفظ ختم نبوت کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں برصغیر کے مشہور خطیب سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی تشریف لائے۔ صادق گڑھ پیلس میں نواب صاحب نے ان کو خاص طور پر دعوت دی۔ انھوں نے شاہی مسجد میں قرآن مجید کا درس دیا اور ان کی لائبریری میں سید عبدالرحیم شاہ صاحب کی قلمی کتابیں اور ان کے مضامین پڑھنے کی خواہش ظاہر کی۔ ان کی اس

❶ مضمون حمید اللہ خاں عزیز۔ ❷ مضمون حمید اللہ خاں عزیز بحوالہ رسالہ ''عربی ادب'' اپریل ۱۹۲۸ء۔

نیک خواہش کا احترام کرتے ہوئے ان کے لیے صادق گڑھ پیلس کا کتب خانہ کھول دیا گیا۔ انھوں نے نواب صاحب سے سید عبدالرحیم شاہ صاحب کی دو قلمی کتابیں "قادیانیت اور احادیث نبویہ" اور "شہادت القرآن بر رسالہ مسیح موعود" لے جانے کی اجازت چاہی۔ وہ یہ دونوں کتابیں مجلس احرار کی طرف سے شائع کرنا چاہتے تھے۔ نواب صاحب نے اجازت دے دی اور وہ کتابیں لے گئے۔ کاتب سے کتابت کرا کے چند روز کے بعد قلمی کتابیں واپس کر دی گئیں۔ ❶

سید عبدالرحیم شاہ امرتسری مرحوم متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ لیکن ان کی تمام تصانیف کا پتا نہیں چلتا۔ بعض کتابوں کے کچھ حصے کرم خوردہ ہیں اور مولانا شرف الحق مرحوم کی لائبریری میں موجود ہیں۔ انھوں نے اپنے عہد کے معروف محقق مولانا فیض الرحمٰن ثوری مرحوم و مغفور کو ان قلمی کتابوں پر کام کرنے کے لیے کہا تھا، لیکن اس پر عمل نہ ہو سکا۔

حضرت سید صاحب موصوف کے شاگردِ رشید مولانا محمد شریف علی گڑھی نے اپنے رسالہ "عربی ادب" کے اپریل ۱۹۲۸ء کے شمارے میں سید صاحب مرحوم سے متعلق ایک مضمون لکھا تھا۔ اس مضمون میں انھوں نے ان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کی ایک فہرست پیش کی تھی۔ یہ رسالہ سنٹرل لائبریری میں موجود ہے اور اس میں مرقوم فہرست مندرجہ ذیل ہے:

۱- حواشی و تعلیقات صحیح مسلم (غیر مطبوعہ)
۲- تفسیر سورہ البقرۃ: (مطبوعہ)
۳- القول المختار فی قراءت خلف الامام
۴- تحقیق کنز العمال
۵- عمدۃ الحقائق فی مسئلۃ رفع الیدین
۶- شہادۃ القرآن بر رسالہ مسیح موعود
۷- البحث المفید بر رسالہ اجتہاد و تقلید
۸- احکام اسلام فی مسئلۃ الطلاق
۹- نجات دارین
۱۰- سبیل ہدایت
۱۱- ضیاء نبوت

❶ رجسٹر روایات بہاول پور (قلمی) از مولوی عبدالحنان گولڑوی احمد پوری۔

۱۲- قادیانیت اور احادیث نبوی ﷺ

۱۳- مرزا غلام احمد قادیانی کی قرآن دشمنی

۱۴- الاسلام ہو الطریق التوحید

۱۵- مزاعم طائفۃ الشیعہ

۱۶- خطبہ صدارت (یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ خطبہ صدارت انھوں نے کہاں پڑھا اور کب پڑھا)

۱۷- قادیانی جماعت کا جھوٹا سربراہ

ان کتابوں کے علاوہ ان کے بہت سے مضامین و مقالات اخبار اہل حدیث (امرتسر) اخبار وکیل (امرتسر) ماہنامہ تبلیغ، ضیاء السنۃ اور اشاعۃ السنہ میں شائع ہوئے۔

اب مولانا سید عبدالرحیم شاہ صاحب کی حیاتِ مستعار کا آخری وقت آتا ہے اور یہ وہ وقت ہے جو کسی نہ کسی عمر میں ہر شخص پر آتا ہے۔

۲۵- اگست ۱۹۲۰ء کو انھوں نے جامع مسجد احمد پور شرقیہ میں ظہر کی نماز پڑھی اور اپنی دنیوی اقامت گاہ ڈیرہ نواب صاحب تشریف لے گئے۔ اچانک انھیں دل میں شدید درد اٹھا اور ان کے بیٹے سید محمد حسن شاہ نے باپ کو سنبھالا اور ڈیرہ نواب صاحب کے ڈاکٹر خلیق الرحمٰن کو بلایا گیا۔ انھوں نے کچھ دوائیں دیں اور آرام کرنے کا مشورہ دیا۔

دواؤں سے فوری طور پر افاقہ ہوا۔ نماز عصر بیٹھ کر پڑھی۔ اس دوران لوگوں کو پتا چلا تو وہ مزاج پرسی کے لیے آئے۔ مرحوم سب سے ملے اور دعا کی درخواست کی۔ تیمار داروں نے بھی ان سے اپنے لیے دعا کی درخواست کی۔ ہر شخص اپنے لیے دعا کی التجا کر رہا تھا۔

مغرب کی نماز کے بعد پھر تکلیف ہوئی جو یکا یک بہت بڑھ گئی۔ اب فیصلہ ہوا کہ کل علی الصبح انھیں وکٹوریہ ہسپتال بہاول پور لے جایا جائے۔ لیکن افسوس کہ عشاء سے پہلے ہی وفات پا گئے۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔

ان کی تجہیز و تکفین اور جنازے کا اہتمام ریاستی حکام نے کیا۔ نمازِ جنازہ احمد پور شرقیہ کے معروف عالم مولانا احمد اعظم نے عیدگاہ ڈیرہ نواب صاحب میں پڑھائی۔ نمازِ جنازہ میں علمائے بہاول پور کے ایک وفد نے خاص طور پر شرکت کی۔ خانوادۂ نوابانِ بہاول پور کے ارکان اپنے مصاحبوں کے ساتھ شریکِ جنازہ ہوئے۔ مرحوم کی وصیت کے مطابق ان کی میت قدیمی قبرستان عظمت سلطان لائی گئی جہاں انھیں دفن کیا گیا۔

ان کی وفات پر ریاست بہاول پور کے سرکاری خبرنامہ ”صادق الاخبار“ نے مندرجہ ذیل خبر شائع کی:

”ریاست بہاول پور بہت بڑے عالم دین اور تحمل و بردباری اور یگانگت و اخوت کے علم بردار سے محروم ہوگئی۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے کہا گیا ہے کہ ایک عالم کی موت پورے عالم کی موت ہے۔ حضرت شاہ صاحب اپنے عہد کی جامع الصفات شخصیت تھے۔ وہ نصف صدی تک دینی و علمی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ عربی ادبیات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کا تصنیفی سرمایہ خاصا وسیع ہے۔ سوائے چند ایک کے تمام کتابیں عربی میں ہیں۔“

اللهم اغفرله و ارحمه و عافه و اعف عنه

قاضی محمد خان پوری

(وفات ۹ نومبر ۱۹۲۹ء)

قاضی محمد صاحب خان پوری ہندوستان کی مغل حکومت کے بالکل آخری دور میں ۴-شعبان ۱۲۷۰ھ (۳ مئی ۱۸۵۴ء) کو موضع خان پور تحصیل ہری پور ضلع ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ قاضی عبدالاحد خان پوری کے برادر صغیر اور قاضی محمد حسن خان پوری کے فرزند ارجمند تھے۔ سات ماہے پیدا ہوئے تھے اور بہت کمزور تھے، اس لیے ولادت کے بعد انھیں روئی میں لپیٹ کر رکھا گیا تھا۔ راجا علی گوہر اس وقت خان پور کے راجوں میں معمر تریں بزرگ تھے اور قاضی محمد حسن کے شاگرد...... جب انھیں پتا چلا کہ ان کے استادِ عالی قدر کے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہے تو وہ مبارک باد دینے اور لڑکے کو دیکھنے کے لیے آئے۔ انھیں بتایا گیا کہ لڑکا بہت کمزور ہے اور اسے روئی میں لپیٹ کر رکھا گیا ہے لیکن انھوں نے اصرار کیا کہ وہ نومولود کو ضرور دیکھیں گے، چنانچہ بچہ انھیں دکھایا گیا۔ انھوں نے بڑے ادب سے بچے کو سلام کیا اور قاضی محمد حسن کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ قیافہ یہ بتا رہا ہے کہ یہ نومولود بہت بڑے قاضی اور عالم ہوں گے اور بڑی شہرت پائیں گے۔

قاضی محمد صاحب کے واقعاتِ حیات جو آئندہ صفحات میں مذکور ہیں ان کے صاحب زادۂ گرامی قاضی محمد عبداللہ ایم اے ایل ایل بی علیگ مرحوم کی تصنیف ''تذکرہ علماے خان پور'' سے ماخوذ ہیں۔

صابر و شاکر بچہ:

قاضی محمد صاحب کی والدہ بیان کرتی ہیں کہ محمد بچپن ہی میں صابر و شاکر تھے۔ ان کی شیر خوری کے زمانے میں وہ فجر کی نماز کے بعد وظیفہ پڑھ رہی ہوتیں اور وہ جاگ اٹھتے تو ان کی طرف دیکھتے، جب تک وہ نماز کی ہیئت میں بیٹھی رہتیں، وہ خاموشی سے لیٹے رہتے اور جب وہ ہیئت بدل لیتیں تو دودھ کے لیے رونے لگتے۔ ابتدائی عمر ہی میں اللہ کی مہربانی سے صبر و شکر کی عادت پڑ گئی تھی جو تمام عمر ان کا لازمۂ حیات رہی۔ جیسے کپڑے بنا دیے پہن لیے، جو کچھ کھانے کو دے دیا، خوشی سے کھا لیا۔ کبھی کسی چیز پر ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا۔ نہ عام بچوں کی طرح کسی معاملے میں ضد کی۔

ابتدائی تعلیم:

ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگ وار (قاضی محمد حسن) سے گھر میں حاصل کی۔ پھر والد محترم کے فرمان کے

مطابق اپنے برادرِ کبیر قاضی عبدالاحد کے ساتھ حضرت سید عبداللہ غزنوی کی خدمت میں موضع خیر دی (امرتسر) پہنچے اور ان کے دستِ حق پرست پر بیعت کی۔ وہ امرتسر چلے گئے تو وہاں بھی ان کے حضور کافی عرصہ رہے اور ان سے بعض کتابیں پڑھیں۔

مزید تعلیم اور سند حدیث:

قاضی محمد نے مختلف اساتذہ کرام سے تحصیل علم کی۔ انھوں نے علم حدیث حضرت عبداللہ غزنوی کے علاوہ ان کے صاحب زادے حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی سے بھی پڑھا اور حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی سے بھی۔ بعد ازاں حضرت میاں سیّد نذیر حسین کی خدمتِ اقدس میں حاضری دی اور ان سے حدیث کی بعض کتابیں پڑھیں۔ اس وقت مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی ان کے ہم سبق تھے۔ قاضی صاحب نے ۱۲۹۲ھ (۱۸۷۵ء) میں حضرت میاں صاحب سے سندِ حدیث لی۔ معقولات کی کتابیں مولانا عبداللہ ٹونکی سے پڑھیں۔

قاضی صاحب کے ایک ہم سبق میر صاحب:

قاضی صاحب نہایت ذہین تھے اور میاں صاحب کے درس میں صحیح بخاری کی عبارت زیادہ تر وہی پڑھتے تھے۔ وہ تیز بھی پڑھتے اور صحیح بھی۔ ان کے ہم سبق ایک طالب علم کو میر صاحب کہا جاتا تھا۔ قاضی صاحب کے ذہانت اور صحتِ عبارت کی بنا پر وہ قاضی صاحب سے حسد کرنے لگے تھے۔ ایک دن قاضی صاحب نے صحیح بخاری کی عبارت شروع کی اور ایک حدیث پڑھی تو میر صاحب نے بلند آواز سے کہا: ''اضطراب ہے''۔ قاضی صاحب نے اس کی کوئی پروا نہ کی اور دوسری حدیث پڑھی تو میر صاحب کی طرف سے پھر آواز بلند ہوئی ''اضطراب ہے''۔ قاضی صاحب نے اب بھی انھیں کوئی اہمیت نہ دی اور تیسری حدیث پڑھی تو پھر وہی آواز آئی ''اضطراب ہے''۔ اب قاضی صاحب ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ فرمایا: میر صاحب آپ بار بار کہہ رہے ہیں ''اضطراب ہے''۔ میں نے اس طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ اضطراب یا متن حدیث میں ہوتا ہے یا سند میں، فرمایے یہاں اضطراب کہاں ہے؟

میر صاحب بولے: ''ارے میاں تم کیا جانو لغوی اضطراب ہے''

قاضی صاحب نے جواب دیا: ''یہاں لغوی اضطراب کہاں سے آ گیا؟''

میر صاحب بگڑ کر بولے: ایک مشکوٰۃ عبدالجبار سے پڑھ کر تم بھی باتیں بنانے لگے۔

عبدالجبار سے حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی مراد تھے، جن کے قاضی صاحب بے حد معتقد تھے۔ ان کے متعلق انھوں نے میر صاحب کے ان الفاظ کو گستاخی پر محمول کیا اور طیش میں آ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میر

صاحب اٹھ کر باہر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد انھیں واپس لایا گیا تو حضرت میاں صاحب نے دونوں کو سمجھایا اور بات ختم ہوگئی۔ اس کے بعد میر صاحب نے دورانِ سبق کبھی کوئی بات نہیں کی۔

علاقہ ہزارہ میں سلسلہ تبلیغ:

حضرت میاں صاحب سے سندِ حدیث لینے کے بعد قاضی محمد صاحب اپنے وطن خان پور واپس آئے اور سلسلۂ تبلیغ شروع کیا۔ ان دنوں اس علاقے میں جمعہ نہیں پڑھا جاتا تھا بلکہ بقول قاضی عبداللہ علیگ ''جمعہ پڑھنا ایک جرمِ عظیم سمجھا جاتا تھا۔'' جمعہ پڑھنے کا آغاز خان پور یا ہری پور کے مضافات کے ایک گاؤں سکندر پور سے ہوا تھا۔ لیکن احناف کے نزدیک دیہات میں جمعہ پڑھنا جائز نہ تھا، اس لیے اہل حدیث اور احناف کے درمیان یہ بحث جاری رہتی تھی کہ "جمعہ فی القریٰ" کی کیا حیثیت ہے۔ اہل حدیث جمعہ پڑھنا ضروری قرار دیتے تھے اور احناف کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ دیہات میں جمعہ ہرگز نہیں پڑھنا چاہیے۔

اس مسئلے پر اہل حدیث اور احناف کے درمیان مناظرے ہونے لگے۔ اہل حدیث کی طرف سے بالعموم قاضی محمد صاحب خان پوری مناظر ہوتے تھے اور ان کے مناظروں کی اس نواح میں بڑی شہرت تھی۔ ''جمعہ فی القریٰ'' کے مسئلے پر انھوں نے اپنے علاقے کے اس دور کے مشہور علمائے احناف سے مناظرے کیے اور اللہ نے ان کو ہر مناظرے میں کامیابی سے نوازا۔ وہ چھوٹی عمر ہی میں تبلیغ کے میدان میں اتر آئے تھے اور مناظروں کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ لوگ ان کے اسلوب وعظ و خطابت سے بھی متعجب ہوتے اور ان کے مناظرانہ انداز سے بھی انھیں حیرانی ہوتی۔ کم عمری میں اپنے سے بڑے اور شہرت یافتہ عالم سے بحث کرنا مشکل ہوتا ہے، لیکن قاضی صاحب کو اس باب میں اللہ نے بڑی جرأت سے نوازا تھا اور وہ دھڑلے سے ہر بات قرآن و حدیث کی روشنی میں کرتے اور کامیاب رہتے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ان پر خاص کرم تھا۔

درس و تدریس:

قاضی محمد صاحب نے تعلیم سے فراغت کے بعد وعظ و تبلیغ کے ساتھ خان پور میں درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ مختلف مقامات سے طلبا ان کی خدمت میں آتے اور قرآن و حدیث اور دیگر علوم مروّجہ کی تعلیم حاصل کرتے۔ طلبا میں ان قبائل سے تعلق رکھنے والے بھی تھے جہاں سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید دہلوی کا قیام رہا تھا اور وہاں ان کی جماعت کے لوگوں کی انگریزی حکومت کے خلاف جنگیں ہوئی تھیں۔ قاضی صاحب کے مخالفوں نے بار بار انگریزی حکومت سے ان کی شکایت کی اور یہ اطلاع پہنچائی کہ ان کے پاس طلب علم کے بہانے مجاہدین آتے ہیں اور یہ ان کی مالی مدد کرتے ہیں۔ اس طرح یہ حکومت کے باغی ہوئے۔ لہٰذا انھیں سزا ملنی چاہیے۔ اس شکایت کے نتیجے میں کئی دفعہ سرکاری افسر آئے اور تفتیش ہوئی، لیکن انھیں

کوئی ثبوت نہ ملا تو واپس چلے گئے۔ پھر حالات ایسے پیدا ہوئے کہ خود تفتیش کرنے اور شکایت کرنے والے قاضی صاحب کے حلقۂ معتقدین میں شامل ہو گئے۔ اس طرح علاقہ ہزارہ کے بھی بے شمار لوگ ان سے مستفید ہوئے اور کشمیر کے بھی لاتعداد لوگوں نے ان سے کسبِ فیض کیا اور کتبِ حدیث پڑھیں۔

راولپنڈی میں قیام:

اس زمانے میں ان کے بڑے بھائی قاضی عبدالاحد خان پوری راولپنڈی میں قیام فرما تھے۔ وہاں وعظ و خطابت کے علاوہ وہ طبابت بھی کرتے تھے اور اس کی وجہ سے ان کا دائرۂ اثر بہت وسیع ہو گیا تھا۔ انھوں نے چھوٹے بھائی قاضی محمد کو بھی وہیں بلا لیا۔ وہ راولپنڈی گئے اور طبابت کرنے لگے، لیکن یہ کام ان کے مزاج سے ہم آہنگ نہ تھا۔ وہ تبلیغ و تدریس ہی کو بنیادی کام سمجھتے تھے، اس لیے جلد ہی واپس خان پور آ گئے اور وہی سلسلۂ درس دوبارہ شروع کر دیا جو ان کے نزدیک اصل اہمیت رکھتا تھا۔

پشاور میں قیام:

اس وقت پشاور میں بھی قرآن و حدیث کی روشنی میں وعظ و خطابت کی سخت ضرورت تھی اور وہاں وہی شخص صحیح مبلغ ثابت ہو سکتا تھا جو قرآن و حدیث کے علاوہ فقہ میں بھی عبور رکھتا ہو، زوردار مقرر بھی ہو، صاف ستھرے انداز میں اپنی بات لوگوں تک پہنچانے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہو اور منقولات و معقولات کا بہت اچھا مدرس بھی ہو۔

قاضی محمد صاحب میں یہ تمام اوصاف پائے جاتے تھے، چنانچہ اپنے استاذ اور مرشد زادہ حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ کے حکم سے وہ ۱۸۹۴ء کے لگ بھگ پشاور چلے گئے۔ ۱۹۰۸ء تک تقریباً تیرہ چودہ سال وہ پشاور رہے۔ اس عرصے میں انھوں نے وہاں بے حد خدمات سر انجام دیں۔ ان کا تقریر و خطابت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ درس و تدریس کا ہنگامہ بھی بپا کیے رکھا۔ بحث و مناظرے کی ضرورت پڑی تو بھی میدان میں نکل آئے۔ مختلف مسالک فقہی کے علما و زعما سے ملاقاتیں بھی جاری رکھیں، عام لوگوں کی مجلسوں میں بھی شرکت فرماتے رہے، بوقت ضرورت کسی حد تک تحریری کام بھی جاری رہا۔ غرض انھوں نے پشاور شہر اور اس کے قرب و جوار میں کتاب و سنت کی خوب تبلیغ کی۔ اس نواح کے لوگ ان کے مواعظ سے بھی متاثر ہوئے، ان کی خطابت نے بھی ان پر اثر ڈالا اور ان کی فراوانی علم اور ہر دینی مسئلے میں ان کے مستحکم دلائل سے بھی وہ لوگ مرعوب ہوئے۔ وہ صحیح معنوں میں مبلغ دین اور قرآن و حدیث کے مخلص ترین خادم تھے۔ پشاور میں ان کی تبلیغ و خطابت کے بہت اچھے نتائج نکلے اور متعدد ایسے لوگ عامل بالحدیث ہوئے جو آگے چل کر اس کے بہت بڑے داعی ثابت ہوئے۔

ایک عمر رسیدہ پٹھان طالب علم:

تذکرہ علمائے خان پور کے مصنف قاضی عبداللہ ایم اے علیگ (جو قاضی محمد صاحب کے فرزند ارجمند ہیں) ایک عمر رسیدہ پٹھان طالب علم کا دلچسپ واقعہ تحریر کرتے ہیں۔ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن قاضی صاحب پشاور کے ڈبگری بازار سے گزر رہے تھے۔ وہاں ایک بالا خانہ میں ایک بزرگ عالم سکونت پذیر تھے جو ''اماز و ملا'' کے نام سے معروف تھے۔ قاضی صاحب ان سے ملاقات کے لیے بالا خانے پر تشریف لے گئے۔ ملا صاحب ایک سفید ریش پٹھان طالب علم کو اصولِ حدیث کی کتاب شرح نخبۃ الفکر پڑھا رہے تھے اور ایک مقام پر رکے ہوئے تھے جو استاذ اور شاگرد دونوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ملا صاحب نے طالب علم سے کہا یہ مقام قاضی صاحب سے حل کرالو۔ قاضی صاحب نے کتاب دیکھی تو فوراً مسئلہ حل کر دیا۔ اب شاگرد نے استاد سے درخواست کی کہ وہ اجازت دیں تو باقی کتاب قاضی صاحب سے پڑھ لی جائے۔ انھوں نے بخوشی اجازت دے دی۔ اس طالب علم کا گاؤں پشاور سے کافی دور تھا اور ہفتے میں دو دن پڑھنے کے لیے آیا کرتا تھا۔ نہایت کند ذہن تھا۔ کتاب کا کوئی مقام اسے سمجھایا جاتا تو کہتا میں بالکل سمجھ گیا ہوں، لیکن تھوڑی دیر بعد بھول جاتا اور پھر وہی مسئلہ پوچھنے لگتا جو ابھی اسے سمجھایا گیا تھا۔ قاضی صاحب کو اس پر غصہ بھی آتا لیکن اس کی عمر اور علم کے شوق کی وجہ سے خاموش رہتے۔ ''جی قربان'' کا لفظ وہ اکثر استعمال کرتا۔ ایک بات غور سے سنتا اور کہتا جی قربان میں سمجھ گیا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد پھر وہی سوال دہراتا۔ قاضی صاحب اسے دوبارہ سمجھاتے اور پوچھتے سمجھ گئے ہو؟ جواب دیتا جی قربان سمجھ گیا ہوں۔ لیکن چند ثانیوں کے بعد پھر وہی سوال۔ اور سمجھانے کے بعد پھر وہی جی قربان اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ اس طرح ''جی قربان'' اور ''سمجھ گیا ہوں'' کے تکرار میں اس نے کتاب تو ختم کر لی لیکن اس کے پلے کچھ نہیں پڑا۔

پشاور میں قاضی صاحب سے بہت سے طلبا نے استفادہ کیا، لیکن ان کی تعداد کا علم نہیں ہو سکا۔

خان پور واپسی:

۱۹۰۸ء کے قریب قاضی صاحب ممدوح پشاور سے خان پور تشریف لائے۔ پشاور سے آنے کی اصل وجہ یہ ہوئی کہ خان پور کے راجے قاضی خاندان کے علمائے کرام کا بے حد احترام کرتے تھے۔ راجہ جہاں داد خاں کی بیگم (جو قاضی صاحب کے خاص شاگردوں راجہ محمد سرور اور راجہ عبدالعزیز خاں کی ہمشیرہ تھیں) کے تینوں بیٹے حیدر زمان خاں، صفدر زمان خاں اور منوچہر خاں کچھ عرصہ قاضی صاحب سے تعلیم حاصل کرتے رہے تھے، وہ چاہتی تھیں کہ یہ تینوں ان سے مزید استفادہ کریں، چنانچہ ان کی درخواست پر قاضی صاحب پشاور سے خان پور آئے اور یہاں انھوں نے ان تینوں حضرات کو بھی پڑھانا شروع کیا اور ان کے علاوہ دیگر متعدد تشنگانِ علوم

نے بھی ان سے تحصیل علم کرنے لگے۔ تقریباً دو سال وہ خان پور میں مصروفِ درس وافادہ رہے۔

دوبارہ راولپنڈی میں:

اب قاضی محمد صاحب پھر راولپنڈی کا عزم کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ۱۹۱۰ء میں راولپنڈی کی مسجد اہل حدیث کے خطیب مولوی حافظ عبدالہادی صاحب وفات پا گئے تو ان کی جگہ نئے خطیب کی ضرورت پڑی جو حالات اور ماحول کے مطابق بہتر انداز میں فریضۂ خطابت سرانجام دے سکے۔ قاضی عبدالاحد صاحب اس وقت راولپنڈی میں مقیم تھے، انھوں نے اس کام کے لیے اپنے برادرِ صغیر قاضی محمد کو وہاں بلا لیا کہ وہ اس وقت مسلک اہل حدیث کے بہترین ترجمان تھے۔ وہاں انھوں نے خطابت کے ساتھ تدریس کا سلسلہ بھی شروع کر دیا اور بہت سے طلبا وہاں جمع ہو گئے۔ انہی دنوں ان سے راولپنڈی صدر کی مسجد اہل حدیث کے امام حکیم عبدالرحمٰن بن مولانا ہدایت اللہ نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کا درس لیا، نیز علم طب کی آخری درجے کی کتابیں ان سے پڑھیں۔ ایک اور بزرگ مولوی عبدالرحیم کشمیری تھے جو قاضی صاحب کے پرانے شاگرد تھے، وہ بھی اسی مسجد میں سکونت رکھتے تھے اور قاضی صاحب سے اکتسابِ علم کرتے تھے۔

پگڑی کا چور:

ایک دفعہ قاضی صاحب حسبِ معمول راولپنڈی کی اس مسجد میں نماز ظہر کے لیے آئے جس کے وہ خطیب تھے۔ پگڑی اتار کر صف پر رکھی اور وضو کرنے لگے۔ اس اثنا میں ایک شخص ان کی پگڑی اٹھا کر لے گیا۔ دو دن کے بعد ایک آدمی اسی وقت مسجد میں وہی پگڑی لے کر آیا اور قاضی صاحب سے پوچھا کیا یہ آپ کی پگڑی ہے؟ فرمایا ہاں میری ہے۔ اس نے کہا جو شخص یہ پگڑی لے گیا تھا وہ جاتے ہی ایسے شدید درد میں مبتلا ہوا کہ اسے کسی علاج سے کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ اب اس کی حالت اتنی نازک ہوگئی ہے کہ اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں رہی۔ اس نے مجھے یہ پگڑی دے کر بھیجا ہے اور اس کے مالک کا حلیہ بھی بتایا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ پگڑی کسی بہت نیک آدمی کی ہے۔ اسے دے دی جائے اور درخواست کی جائے کہ اللہ کے لیے اسے معاف کر دیں۔ وہ معاف کر دیں گے تو میں زندہ رہ سکوں گا، ورنہ زندگی کی امید نہیں۔ قاضی صاحب نے فرمایا میں نے اسے معاف کیا۔ [1]

رات کے سفر میں شیر کو دیکھنے کا واقعہ:

ایک دفعہ قاضی صاحب کے والد راولپنڈی تشریف لے گئے۔ چند روز کے بعد کسی نے ان کو بتایا کہ

[1] تذکرہ علمائے خان پور: ص ۱۶۹۔

آپ کے والد راولپنڈی میں بیمار ہیں۔ انھوں نے والد صاحب کی عیادت کے لیے راولپنڈی جانے کا ارادہ کیا۔ خان پور سے راولپنڈی بائیس تئیس میل کے فاصلے پر ہے۔ قاضی صاحب کا ارادہ یہ تھا کہ رات کو خان پور سے پیدل روانہ ہوں گے اور صبح کو راولپنڈی پہنچ جائیں گے۔ چنانچہ تھوڑی دیر سوئے اور پھر اٹھ کر روانہ ہو گئے۔ خان پور سے متصل نالہ ہرو آتا ہے، جسے عبور کر کے انھیں جنوب کی جانب جانا تھا۔ جب نالہ ہرو کے کنارے پہنچے تو اس وقت دُم دار ستارہ طلوع ہوا۔ ستارہ دیکھ کر خیال کیا کہ بہت پہلے گھر سے نکل آئے ہیں، ابھی رات کا کافی حصہ باقی ہے، لیکن وہاں سے واپس جانا بھی مناسب نہ سمجھا۔ اللہ پر توکل کر کے ہرو پر وضو کیا اور چل پڑے۔ چاندنی رات تھی۔ قرآن مجید اور مختلف ادعیہ ماثورہ پڑھتے ہوئے جا رہے تھے۔ کچھ فاصلے پر نظر پڑی تو دیکھا کہ راستے کے عین وسط میں ایک شیر سو رہا ہے۔ اب انھوں نے پاؤں سے جوتے اتارے اور دعائیں پڑھتے ہوئے اس مقام سے ہٹ کر چکر کاٹتے ہوئے پھر اسی راستے پر پہنچ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے مہربانی فرمائی کہ جان بچ گئی۔

وہاں سے کوئی تین میل کے فاصلے پر گئے ہوں گے کہ شیر نیند سے بیدار ہوا اور اس زور سے گرجا کہ ان کے قریب کی پہاڑی سے پتھر لڑھک کر نیچے آ گرے۔

قاضی صاحب صبح کے وقت راولپنڈی والد صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ انھوں نے فرمایا تم یہاں کیسے آئے؟ عرض کیا آپ کی علالت کا سنا تھا، مزاج پرسی کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ فرمایا کیا یہاں مسلمان نہیں بستے؟ اگر میں مر جاتا تو وہ دفن کر دیتے۔ تم کیوں گھر خالی چھوڑ کر آئے ہو؟ پھر کہا اسے کھانا کھلاؤ۔ یہ اسی وقت واپس چلا جائے۔ ناچار اسی راستے سے واپس چلے گئے، جس راستے سے آئے تھے۔

صحیح بخاری پڑھنے والا طالب علم:

ایک شخص جن کا گاؤں خان پور سے سات آٹھ میل کے فاصلے پر تھا، روزانہ قاضی صاحب سے صحیح بخاری پڑھنے آیا کرتے تھے۔ وہ سید تھے۔ قاضی صاحب کے مکان پر آتے، دروازے پر دستک دیتے اور قاضی صاحب کتاب پکڑ کر مسجد چلے جاتے اور انھیں پڑھانا شروع کر دیتے۔ قاضی صاحب کی عادت یہ تھی کہ طالب علم جتنا پڑھتا جائے، وہ اسے روکتے نہ تھے۔ جب وہ خود ہی کہتا کہ اب میں بس کروں تو فرماتے: تمھاری مرضی۔ صحیح بخاری پڑھنے والے اس طالب علم کے ساتھ بھی ان کا یہی رویہ تھا۔ وہ پڑھتے پڑھتے جب بس کہتا تو فرماتے تمھاری مرضی۔

ایک دن قاضی صاحب کو بخار تھا۔ وہ طالب علم وقت مقررہ پر آئے اور دروازے پر دستک دی تو قاضی صاحب سمجھ گئے کہ یہ وہی اخوندزادہ ہے جو روزانہ آتا ہے۔ لیکن قاضی صاحب کے صاحب زادے عبدالرحمن

باہر نکلے اور طالب علم کو یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ آج والد صاحب کو بخار ہے۔

قاضی صاحب نے عبدالرحمٰن سے کہا جس نے دروازے پر دستک دی تھی وہ اخوند زادہ تو نہیں تھا جو روزانہ صحیح بخاری پڑھنے آتا ہے؟ جواب دیا وہی تھا، لیکن آپ چوں کہ بیمار ہیں، اس لیے میں نے اسے واپس لوٹا دیا ہے۔ قاضی صاحب نے یہ سن کر بیٹے پر خفگی کا اظہار کیا اور فرمایا وہ بے چارہ اتنی دور سے پڑھنے کے لیے آتا ہے اور تم نے مجھ سے پوچھے بغیر اسے واپس بھیج دیا۔ اب جاؤ اسے فوراً واپس بلا لاؤ۔ چنانچہ اسے واپس لایا گیا تو قاضی صاحب نے فتح الباری کی ایک جلد اٹھائی اور اسے پڑھانے کے لیے باہر نکلے۔ انھیں دیکھ کر طالب علم نے بھی عرض کیا کہ آپ بیمار ہیں، آرام فرمائیں۔ قاضی صاحب نے فرمایا صحیح بخاری پڑھانے سے مجھے راحت ہوگی اور تکلیف رفع ہو جائے گی۔ چنانچہ مسجد میں بیٹھ کر اسے پڑھانا شروع کیا۔ جب اس نے بس کہا تو حسب معمول فرمایا: تمھاری مرضی۔

انھی دنوں موضع ڈھینڈہ (ہزارہ) سے حضرت مولانا عبدالجبار غزنوی کے شاگرد مولانا عبدالمجید صاحب تشریف لائے۔ مسجد میں قاضی صاحب کا درس حدیث دیکھ کر خوش ہوئے اور فرمایا خدا جانے یہ چشمۂ فیض کب تک جاری رہے گا...... افسوس اس کے چند روز بعد قاضی صاحب وفات پا گئے اور وہ چشمۂ فیض جو طویل مدت سے جاری تھا بند ہو گیا۔

مقدمات کے فیصلے:

قاضی صاحب کا وجود خان پور اور اردگرد کے علاقے کے مسلمانوں کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ تھا۔ اکثر مسلمان ان کی وجہ سے سرکاری عدالتوں کے بے جا اخراجات سے محفوظ تھے۔ اس لیے کہ سب کو یقین تھا کہ وہ کسی رورعایت کے بغیر شریعت کے مطابق صحیح فیصلہ کریں گے۔ اس لیے وہ اپنے مشاجرات و تنازعات ان کے سامنے پیش کرتے اور بعد فیصلہ وہ شخص بھی جس کے خلاف فیصلہ دیا جاتا، باہر جا کر اعتراف کرتا کہ فیصلہ بالکل صحیح ہوا ہے۔

بعد نماز جمعہ اکثر تین چار مقدمات ضرور آجاتے جن کا قاضی صاحب فیصلہ کرتے۔ ان کی وفات کے بعد جب لوگوں کو سرکاری عدالتوں کے اخراجات برداشت کرنا پڑے تب ان کو بہت یاد کیا گیا۔

حرف ایک تصنیف:

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا قاضی صاحب نے قرآن و حدیث کی تعلیم کو ہمیشہ اپنا فرض سمجھا۔ کسی طالب علم کو تعلیم دینے سے کبھی انکار نہیں کیا۔ طالب علم جب تک خود سبق ختم نہ کرتا، وہ اسے سبق ختم کرنے کو نہ کہتے۔ جب وہ کہتا کہ آج اتنا کافی ہے تو فرماتے اچھا تمھاری مرضی۔

بے شمار طلباے علم نے ان سے فیض پایا، لیکن انھوں نے اپنے تلامذہ کی کوئی فہرست مرتب نہیں کی۔ اکثر طالب علم مدتوں ان کے زیر تعلیم رہتے، کسی کو ان کے ناموں کا بھی پتا نہ تھا، کیوں کہ قاضی صاحب انھیں اخوند زادہ ہی کہتے جو عزت کا خطاب تھا۔ قاضی صاحب کی وجہ سے ان کے گھر کے لوگ بھی انھیں اخوند زادہ کہہ کر پکارتے۔ صرف ایک دوسرے سے امتیاز کے لیے ان کے مقام سکونت یا علاقے کا نام معلوم کر لیا جاتا۔

تدریس میں ہمہ وقت کی مشغولیت کے باعث وہ کوئی تصنیفی کام نہیں کر سکے۔ بعض متعصب لوگوں کی تحریروں کے جواب میں ایک کتاب جس کا نام "صاعقة الرحمن علی حزب الشيطان الملقب به كشف التلبيس على اخوان ابليس" رکھا۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے اور فل سکیپ کے ۱۳۷ صفحات پر مشتمل۔ ہر صفحے کی انیس سطریں ہیں۔ اس پر حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی، سید شریف حسین، ابوعبیداللہ احمد، محمد بن ظل الرحیم المنکلوئی البردوانی، محمد فضل الکریم البردوانی، ابوعبداللہ محمد عبدالرحمٰن، مولانا محمد صدیق پشاوری، سید عبدالواحد غزنوی اور قاضی عبدالاحد خان پوری کی تقریظات ہیں۔ نیز دہلی اور دیگر مقامات کے علما کی (بشمول مہر سید نذیر حسین صاحب) بیس مہریں بھی ثبت ہیں۔ یہ کتاب طبع نہیں ہو سکی۔ قلمی مسودہ ہے۔ [1]

ایک مجلس کی تین طلاقیں:

اکثر حنفی ایک مجلس کی تین طلاقیں دینے کے بعد بغرضِ رجوع قاضی صاحب کی خدمت میں آتے تو وہ رجوع کا فتویٰ دے دیتے۔ آخر عمر میں ان لوگوں کو فتویٰ دینا اس خیال سے ترک کر دیا تھا کہ یہ لوگ کوئی شرعی مسئلہ تو ہم سے پوچھتے نہیں بلکہ ہمیں برا بھلا کہتے ہیں، لیکن بہ یک وقت تین طلاق دے کر ہمارے پاس دوڑے آتے ہیں کہ رجوع کی اجازت مل جائے۔ آئندہ انھیں یہ فتویٰ نہیں دیا جائے گا۔

اس کے بعد کوئی حنفی اس فتوے کے لیے ان کے پاس آتا تو فرماتے تمھارے مذہب کی رو سے طلاق بائن ہو چکی ہے، اس لیے تم عورت کی خاطر اپنا مذہب ترک نہ کرو۔ مذہب بڑی قیمتی چیز ہے، اسے چھوڑنا نہیں چاہیے۔

آخری مرض اور وفات:

قاضی صاحب عرصۂ دراز سے مرضِ دمہ میں مبتلا تھے۔ ان کے فرزند گرامی قاضی عبداللہ تحریر فرماتے ہیں کہ ہم حکیموں سے نسخے لکھوا کر لاتے اور انھیں بتاتے کہ فلاں حکیم صاحب نے اس نسخے کو صحیح قرار دیا ہے تو فرماتے نسخہ پڑھ کر سناؤ، ہم سناتے تو ارشاد ہوتا یہ نسخہ میرے لیے مفید نہیں۔ صرف معجون فلاسفہ کبھی کبھی

[1] تذکرہ علمائے خان پور: ص ۱۸۶.

استعمال کرتے۔

ان کے بڑے بھائی قاضی عبدالاحد مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو اس کی اطلاع آئی، باوجود سخت کم زوری کے راولپنڈی کو روانہ ہو گئے۔ جب ان کے مکان پر پہنچے تو ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ مولوی محمد اسماعیل صاحب ڈھیری (سکندر پور) والے بھی جو ان کے مخلص دوست تھے ان کے ساتھ ہی بغیر اطلاع وہاں پہنچے، دونوں نمازِ جنازہ میں شریک ہوئے۔

بڑے بھائی کے انتقال کے بعد شدید مغموم رہنے لگے تھے۔ اسہال کا عارضہ بھی لاحق ہو گیا تھا۔ علاج کرائے لیکن افاقہ نہ ہوا۔ صاحب فراش ہو گئے تھے اور بستر پر ہی نماز پڑھتے تھے۔ ایک دن ظہر کی نماز پڑھی۔ نماز کے بعد فرمایا: یوسف حسین سے پوچھو نماز عصر کا وقت ہو گیا ہے یا نہیں؟ ہو گیا ہے تو میں نماز عصر پڑھوں۔ (یوسف حسین ان کے چھوٹے بھائی تھے) ان سے پوچھا گیا تو کہا ان کا کون سا وقت ہے، انھیں نماز پڑھنے دو۔ جواب ملنے پر نماز عصر پڑھی اور تشہد میں بلند آواز سے دعائیں پڑھیں۔ آخر میں اللھم اغفرلی ولوالدیّ و لخالتی کے الفاظ کہے جو سب نے سنے۔

نماز پڑھنے کے بعد لیٹے ہوئے دو تین مرتبہ سر سے ٹوپی اتار کر اپنے پاس ہی رکھ لی۔ دوبارہ جب رکھی گئی تو پھر اتار کر علیحدہ رکھ دی۔

حاضرین نے کہا ہمیں کہا سنا معاف فرما دیجیے۔ غیر حاضرین کے لیے بھی معافی کی استدعا کی۔ فرمایا میں سب سے راضی ہوں، اور سب کے لیے دعا فرمائی۔ اس سے تھوڑی دیر بعد اپنے اللہ کے حضور پہنچ گئے۔ زندگی کی آخری نماز بڑے اطمینان سے پڑھی۔

ہفتے کے روز ۶ جمادالاخریٰ ۱۳۴۸ھ (۹-نومبر ۱۹۲۹ء) کو وفات پائی۔ آبائی قبرستان میں اپنے والدین کے قریب دفن کیے گئے۔

قبر قاضی صاحب کے شاگردوں نے کھودی۔ ان میں ایک شخص مستری کریم بخش تھے جو ان کے نہایت مخلص اور نیک ترین شاگرد تھے۔ جب لحد تیار ہو گئی تو قبلے کی جانب اس میں ایک چوکور سوراخ دکھائی دیا۔ اسے بند کرنے کی بڑی کوشش کی گئی لیکن بند نہیں ہوا۔ ایک شخص نے اس میں ہاتھ ڈالا تو اتنی ٹھنڈی ہوا آئی کہ اس کا ہاتھ ٹھٹھر گیا۔ اس پر قاضی صاحب کے شاگرد مستری کریم بخش نے کہا اسے رہنے دو، یہ کوئی سرِّ الٰہی ہے، جسے ہم نہیں سمجھ سکتے۔ اس پر سب خاموش ہو گئے اور تدفین عمل میں آ گئی۔

مستری کریم بخش کی وفات:

کچھ عرصے کے بعد مستری کریم بخش بھی وفات پا گئے۔ قاضی عبداللہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ کریم

بخش کی وفات کی خبر سن کر ان کی والدہ نے بتایا کہ آج رات میں نے خواب میں تمھارے والد (قاضی محمد) کو دیکھا کہ ایک عالی شان مکان بنوا رہے ہیں اور تیزی سے اس کی تعمیر ہو رہی ہے۔ میں نے پوچھا یہ مکان آپ کس کے لیے بنوا رہے ہیں؟ جواب دیا یہ مکان کریم بخش کے لیے بنایا جا رہا ہے۔

قاضی صاحب کی تاریخ وفات:

قاضی محمد صاحب خان پوری کی تاریخ وفات قرآن کے الفاظ "وجوہ یومئذ ناعمہ" سے نکلتی ہے۔ (۱۳۴۸ھ)

ان کے برادرِ صغیر قاضی یوسف حسین نے ایک نظم میں ان کی تاریخ وفات اس طرح لکھی:

ساری بستی میں غم ہوا پیدا
کس امین ہدیٰ کا کوچ ہوا
چل بسا غم گسارِ محتاجاں
مرجع طالبان دینِ خدا
ورّ فشاں وقت گفتگوئی سبز
شعلہ زن وقت قمع اہل ہوئی
بازوئی حق برائے عبدالاحد
یک دل و یک زبان بہر مبتدئی
وہ خلف بضعۂ غلام حسن
وہ محمد ہے صدق کا ہمتا
مدح خواں اس کا ہر کس و ناکس
دور تک اس کا فیض علم رسا
ہے وفات اس کی علم کا مرنا
اتقاء اب یہاں سے فوت ہوا
اوس کی اولاد میں خداوندا
جانشین کوئی دیندار بنا
اشکبار آنکھوں سے یہ دو مصراع
لکھے صابر نے وصل میں ہمتا

خلد منزل ہوا گرامی قدر
خلد منزل ہے عالم یکتا
(۱۳۴۸ھ، ۱۳۴۸ھ)

قاضی عبداللہ علیگ:

قاضی محمد صاحب کے ایک فرزند گرامی قاضی عبداللہ علیگ تھے۔ مجھے ان کی زیارت کا شرف ۱۹۵۰ء میں گوجراں والا میں حاصل ہوا۔ اس وقت اخبار ''الاعتصام'' گوجراں والا سے شائع ہوتا تھا اور میں اس میں خدمات سرانجام دیتا تھا۔ گرمیوں کا موسم تھا اور شام کا وقت ایک صاحب حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کی جامع مسجد اہل حدیث (چوک نیائیں) میں تشریف لائے۔ میانہ قد، چوڑا چہرہ، گندمی رنگ، گداز جسم، قمیص اور کھلے پائنچے کا پائجامہ پہنے ہوئے۔ سر پر قراقلی ٹوپی۔ داڑھی منڈی ہوئی تھی یا شاید خشخشی ہوگی۔ مولانا محمد اسماعیل سلفی اور مولانا محمد حنیف ندوی انھیں دیکھ کر نہایت خوش ہوئے اور بے حد احترام سے ملے۔ میں نے بھی آگے بڑھ کر ان سے مصافحہ کیا۔ میں اس سے قبل قاضی عبدالاحد خان پوری کے بارے میں بعض باتیں سن چکا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ ان کے بھتیجے ہیں۔ آواز قدرے اونچی اور کھنک دار۔ تینوں بزرگ بے تکلفی سے باتیں کرتے تھے۔ دوران گفتگو دو تین دفعہ آپس میں ہنسی مذاق بھی ہوا۔ پتا چلا کہ یہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ ہیں اور وکیل ہیں۔ مجھے انھیں دیکھ کر اور ان کی باتیں سن کر بے حد مسرت ہوئی۔ اس کے بعد ان کی زیارت کا موقع نہیں ملا۔

قاضی عبداللہ خان پوری ۵ ستمبر ۱۸۸۸ء (یکم ربیع الثانی ۱۳۰۵ھ) کو پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی۔ پھر سکول میں داخل کرا دیے گئے۔ پڑھنے میں تیز تھے۔ پشاور میں وہاں کے مشہور اہل حدیث عالم حافظ محمد رمضان سے دینیات کی کتابیں پڑھیں۔ اس وقت ان کے والد قاضی محمد پشاور میں تھے۔ پشاور کے علاوہ ہری پور اور ایبٹ آباد میں بھی پڑھتے رہے۔

مڈل کے درجے پر پہنچے تو تعلیم چھوڑ دی۔ ان کے نانا حافظ محمد غوث مرحوم عرائض نویس تھے۔ انھوں نے فرمایا اگر مڈل پاس کر لیتے تو کہیں عرائض نویس لگا دیتا۔ اس کے بعد عربی تعلیم حاصل کی۔ پھر سکول میں داخلہ لیا۔ میٹرک فرسٹ ڈویژن میں پاس کی اور وظیفہ بھی لیا۔ پشاور ایڈورڈ کالج سے ایف اے کیا۔ جے وی کا امتحان دیا جس میں اول آئے اور تمغہ ملا۔ اس سے دو سال بعد ایس اے وی فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ پھر محکمہ تعلیم میں پندرہ سال ملازمت کی۔ بعد ازاں علی گڑھ گئے اور مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ وہاں ایم اے کا امتحان پاس کیا اور ایل ایل بی میں بھی کامیابی حاصل کی۔ علی گڑھ کے زمانہ تعلیم میں ''زیـارۃ القبور''

کے نام سے ایک عربی رسالے کا ترجمہ کیا جو ان کے بزرگوں بالخصوص قاضی عبدالاحد خان پوری نے بہت پسند کیا۔

علی گڑھ سے واپس آ کر ہری پور، ایبٹ آباد اور صوبہ پختون خوا کے مختلف مقامات میں وکالت کرتے رہے۔ آخر کار مانسہرہ (ضلع ہزارہ) میں مستقل طور سے سکونت اختیار کر لی۔ قیام مانسہرہ کے زمانے میں اپنے آبائی مسکن خان پور بھی آمد و رفت رہی۔ اپنے والد اور چچا قاضی یوسف حسین کی وفات کے بعد تو بہ طورِ خاص عیدین کے موقعے پر خان پور تشریف لے جاتے اور نماز عید پڑھاتے۔ خاندان اور متعلقین کی شادی غمی میں شرکت کرتے۔ خان پور کے راجگان ان کے بزرگوں کے انتہائی معتقد تھے، ان کی طلب و خواہش پر بھی اپنے قدیم وطن کا چکر لگاتے۔ حکیم محمد یحییٰ خاں کے بقول قاضی عبداللہ مرحوم باعمل عالم، سنت کے شیدائی اور توحید کے عاشق تھے۔

ذہن مناظرانہ تھا۔ اہل بدعت کے خلاف کہیں نہ کہیں مورچہ لگائے رکھتے تھے۔ مرزائیوں سے شدید نفرت تھی اور ان سے پنجہ آزمائی کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ مرزا صاحب کی عربی عبارتوں کے متعلق کسی مرزائی سے بحث کرتے تو وہ سخت پریشان ہو جاتا۔

حکیم محمد یحییٰ خاں رقم طراز ہیں کہ ”ایک خط میں لکھتے ہیں، یہ حسنِ اتفاق ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور جواہر لال نہرو دونوں کا سنِ پیدائش بھی وہی ہے جو میرا ہے یعنی ۱۸۸۸ء (۱۳۰۵ھ) اور میری طویل العمری والدہ مرحومہ کی دعا کا نتیجہ ہے۔“

تقریباً اکیانوے (۹۱) برس کی عمر پا کر ۲۰- اپریل ۱۹۷۹ء (۲۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۹ھ) کو جمعۃ المبارک کے روز رحلت فرمائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

ان کی آخری تصانیف دو کتابیں ہیں۔ ایک ”بطش قدیر برمہر منیر“ اور دوسری ”تذکرہ علمائے خان پور“

ان کے یہ مختصر حالات قاضی عبدالاحد خان پوری مرحوم و مغفور کے تلمیذ رشید حکیم محمد یحییٰ شفا کے رقم کردہ مضمون (بہ عنوان قاضی محمد عبداللہ بن قاضی محمد) سے ماخوذ ہیں۔ جو تذکرہ علمائے خان پور کے صفحہ ۲۵۱ سے ۲۵۴ پر مندرج ہیں۔

مولانا عبدالواحد غزنوی

(وفات ۲۹-دسمبر ۱۹۳۰ء)

حضرت سید عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ کے بارہ بیٹے تھے، جن کے نام یہ تھے: (۱) مولانا محمد (۲) مولانا عبداللہ (۳) مولانا احمد (۴) مولانا عبدالجبار (۵) مولانا عبدالواحد (۶) مولانا عبدالرحمٰن (۷) مولانا عبدالستار (۸) مولانا عبدالقیوم (۹) مولانا عبدالعزیز (۱۰) مولانا عبدالحی (۱۱) مولانا عبدالقدوس (۱۲) مولانا عبدالرحیم۔ ان بارہ میں سے پانچ بیٹوں نے حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی سے کتب حدیث پڑھیں اور سند لی۔ وہ مندرجہ ذیل تھے:

۱- مولانا محمد غزنوی: حضرت عبداللہ صاحب غزنوی کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ انھوں نے تفسیر جامع البیان پر حاشیہ لکھا۔ والد مکرم کی زندگی میں ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) میں وفات پائی۔

۲- مولانا عبدالجبار غزنوی درس و تدریس اور رشد و ہدایت میں اپنے والد کے جانشین ہوئے اور عبادت و زہد کی بنا پر امام صاحب کے لقب سے شہرت پائی۔ رمضان المبارک کے آخری جمعے ۲۵ رمضان ۱۳۳۱ھ (۲۸- اگست ۱۹۱۳ء) کو فوت ہوئے۔

۳- مولانا عبدالواحد غزنوی: ۱۹۱۰ء میں لاہور کی چینیاں والی مسجد کے امام و خطیب مقرر کیے گئے۔ ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو رحلت فرمائی۔

۴- مولانا عبداللہ: ان کا نام والد عالی قدر حضرت عبداللہ غزنوی نے اپنے نام پر عبداللہ رکھا۔ ان کی تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا۔ ان کی اولاد سے ایک بیٹے تھے اور وہ تھے حافظ عبداللہ غزنوی۔ یہ اسلامیہ کالج پشاور میں پروفیسر تھے۔ یعنی باپ، بیٹا، پوتا تینوں عبداللہ تھے۔

۵- مولانا عبدالقدوس غزنوی: ان کے حالات کا کہیں سے پتا نہیں چلا۔

حضرت کے باقی بیٹوں کی طرح افسوس ہے مولانا عبدالواحد غزنوی کے کوائف حیات بھی کسی نے قلم بند نہیں کیے۔ ایک دو مرتبہ میں نے ان کے پوتوں (ڈاکٹر خالد غزنوی مرحوم اور جناب محمد ابراہیم غزنوی) سے ان کے حالات معلوم کرنا چاہے تو پتا چلا کہ وہ بھی اس سلسلے میں خالی ہاتھ ہیں۔ بلکہ محمد ابراہیم غزنوی صاحب نے جواب دیا کہ میں تو خود آپ سے ان کے حالات معلوم کرنے کا خواہاں ہوں۔

بہرحال مجھے مختلف حضرات سے ان کے متعلق جن چند واقعات کا پتا چلا وہ یہاں عرض کر رہا ہوں۔

☆...... انھیں ۱۹۱۰ء میں لاہور کی چینیاں والی مسجد کے امام و خطیب مقرر کیا گیا تھا۔ اس زمانے میں سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید دہلوی کی جماعت مجاہدین آزاد قبائل میں ہندوستان کی انگریزی حکومت سے برسرِ پیکار تھی اور اس کی کسی صورت میں بھی مالی مدد کرنا نہایت مشکل تھا۔ انگریزی حکومت کو اگر اس کے کسی معاون کا علم ہو جاتا یا کسی کے متعلق شبہ پڑ جاتا کہ یہ اس جماعت کی کسی نہ کسی شکل میں مدد کرتا ہے تو اسے سخت سزا دی جاتی تھی، لیکن اس کے باوجود بے شمار لوگ (بالخصوص اہل حدیث) اس کی مالی مدد بھی کرتے تھے اور افرادی مدد بھی۔ یعنی انگریزوں سے لڑائی کے لیے مرکز مجاہدین میں لوگوں کو بھیجتے تھے، جو ٹریننگ لے کر حالات اور موقعے کے مطابق انگریزی حکومت سے جہاد کرتے تھے۔ مالی معاونین میں مولانا عبدالواحد غزنوی بھی شامل تھے۔

حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے ایک مرتبہ فرمایا کہ حکومت کے اعلیٰ افسروں کو معلوم ہو گیا تھا کہ مولانا عبدالواحد غزنوی جماعت مجاہدین کی مالی مدد کرتے ہیں اور جماعت کے کارکن اس سلسلے میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ اس وقت کی سی آئی ڈی کے ایک افسر کا نام شیخ عبدالعزیز تھا۔ اس کی ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ مولانا عبدالواحد غزنوی سے ملیں اور کسی طرح ان سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ کیا واقعی وہ اس جماعت کی مدد کرتے ہیں۔ مولانا چینیاں والی مسجد ہی کے ایک مکان میں سکونت پذیر تھے۔ شیخ عبدالعزیز دو تین مرتبہ مسجد میں آئے، لیکن مولانا سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ایک دن انھوں نے ان کے گھر والوں سے کہا کہ میرا نام شیخ عبدالعزیز ہے اور فلاں جگہ میرا مکان ہے، میں کئی دفعہ ان سے ملنے کے لیے حاضر ہوا، لیکن ملاقات نہ ہو سکی، مہربانی فرما کر وہ تکلیف کریں اور میرے گھر تشریف لائیں۔

مولانا کو گھر سے اس کی اطلاع ملی تو کسی نے ان کو بتایا کہ یہ شخص خفیہ پولیس کا افسر ہے اور آپ سے جماعت مجاہدین کی اعانت کے سلسلے میں بات کرنا چاہتا ہے۔

مولانا ایک دن اس کے گھر تشریف لے گئے۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو شیخ صاحب باہر آئے اور انھیں سلام کیا۔ مولانا نہایت بارعب شخصیت کے مالک تھے اور بارعب ہی ان کی آواز تھی...... اپنے خاص لہجے میں فرمایا:

"شیخ صاحب اللہ عزوجل سے ڈر جاؤ۔"

یہ بارعب آواز شیخ صاحب کی بیوی کے کان میں پڑی تو وہ دوڑ کر آئی۔ خاوند کو اندر بلا کر کانپتی ہوئی آواز میں کہا:

"خدا کے لیے اس بزرگ کو کچھ نہ کہو۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ انھیں کچھ کہا گیا تو ہم مارے

جائیں گے۔"

شیخ عبدالعزیز بھی انھیں دیکھ کر اور ان کی آواز سن کر مرعوب ہو گئے اور کوئی بات نہ کر سکے۔ صرف یہ کہا کہ تشریف رکھیے، میں صرف آپ کی زیارت کرنا اور آپ سے دعا کرانا چاہتا تھا۔ اس کے سوا کوئی کام نہ تھا۔

☆......مولانا عبدالعظیم انصاری مرحوم نے ایک دفعہ بتایا کہ وہ ایک دن ضلع امرتسر کے ایک شہر ترنتارن گئے۔ اہل حدیث حضرات کی مجلس میں وہ بیٹھے تھے، وہاں حسنِ اتفاق سے حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی بھی تشریف لے آئے۔ مولانا نے ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی۔ وہ اس انداز سے رو رو کر دعا کر رہے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا واقعتاً اللہ تعالیٰ دعا قبول فرما رہا ہے۔ دعا کے الفاظ سن کر سب حاضرین مجلس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

☆......اپنے والد مکرم حضرت سید عبداللہ غزنوی اور اپنے بڑے بھائی حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی کی طرح مولانا عبدالواحد غزنوی بھی بیعت کے قائل تھے اور لوگ ان کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوتے تھے۔ ہمارے خاندان کے بھی بعض بزرگوں نے ان کی بیعت کی تھی اور ان کی صالحیت کا تذکرہ وہ لوگ اکثر کیا کرتے تھے۔

☆......پروفیسر عبدالقیوم مرحوم کے والد منشی فضل الدین مرحوم یا کسی اور صاحب کا بیان ہے کہ ۱۹۲۰ء میں جب مسجد مبارک اہل حدیث تعمیر ہوئی اور لوگ اس میں جمعہ و جماعت کے لیے آنے لگے تو ابتدا میں مولانا عبدالواحد غزنوی اسے مسجد ضرار قرار دیا کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسجد مبارک، چینیاں والی مسجد کے مقابلے میں بنائی گئی ہے۔ لیکن جب ان سے عرض کیا گیا کہ لاہور شہر کی آبادی بہت بڑھ گئی ہے اور اہل حدیث مسلک سے تعلق رکھنے والوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا ہے، اس لیے نئی مسجد کی تعمیر ضروری ہو گئی تھی۔ نیز چینیاں والی مسجد تنگ گلیوں میں ہے، وہاں زیادہ لوگوں کا جانا مشکل ہے، اس کے برعکس مسجد مبارک کھلی جگہ میں ہے، یہاں دور کے اور اس کے قرب و جوار کے لوگ آسانی سے آ جاتے ہیں تو خاموش ہو گئے۔ پھر کبھی کبھی مسجد مبارک میں تشریف لے آتے اور نماز ادا فرماتے۔

☆......منشی فضل الدین مرحوم نے بتایا کہ ایک دن مولانا عبدالواحد غزنوی ان کے پاس آئے۔ کچھ دیر بیٹھے اور چلے گئے۔ چند منٹ کے بعد پھر آ گئے، ان سے ایک روپیہ ادھار لیا اور تشریف لے گئے۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد پھر آ گئے اور جو روپیہ ادھار لے گئے تھے، وہ واپس کیا۔

منشی صاحب سے ادھار روپیہ لینے کی وجہ یہ تھی کہ جب وہ ان کے گھر سے نکلے تو گلی میں ایک فقیر بیٹھا مانگ رہا تھا اور آنے جانے والوں سے کہہ رہا تھا "بابا اللہ کے لیے ایک پیسا دے دو۔ بابا اللہ کے لیے ایک

پیسا دے دو۔“ وہ مسلسل یہ صدا لگائے جا رہا تھا۔ حضرت مولانا کے پاس اس وقت کچھ بھی نہ تھا۔ انھوں نے منشی صاحب سے اودھار روپیہ لے کر اس مانگنے والے کو دیا اور فرمایا دیکھو بھائی! اللہ سے تھوڑی چیز نہیں مانگنی چاہیے، زیادہ مانگنی چاہیے...... اور ایک روپیہ اس زمانے میں بہت بڑی شے تھی...... پھر گھر جا کر روپیہ لیا اور منشی صاحب کو واپس کیا۔ منشی صاحب نے کہا اتنی جلدی کیا پڑی تھی، کل واپس کر دیتے۔ فرمایا اودھار جلد واپس کرنا چاہیے۔ زندگی کا کیا پتا کتنی ہے۔ کل اگر موت آ جائے تو مقروض مرا۔ اس کی اللہ کے ہاں باز پرس ہوگی۔

یہ تھے حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی رحمہ اللہ۔

☆...... مولانا عبدالواحد غزنوی کے بارے میں مولانا محی الدین احمد قصوری کے الفاظ پڑھیے، فرماتے ہیں:

”حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی رحمہ اللہ سے ہمارے بہت روابط ہو گئے تھے۔ کئی ایک رشتے بھی باہمی ہو گئے تھے۔ انھیں علم کے لحاظ سے میں نے بہت بلند اور وسیع النظر پایا۔ خاص کر حضرت امام ابن تیمیہ اور حضرت امام ابن قیم رحمہما اللہ کی کتابوں کے تو وہ حافظ معلوم ہوتے تھے۔ خشیت و تقویٰ ان میں بہت زیادہ تھا اور ان کی گفتگو اور مواعظ بھی خشیت اللہ میں ڈوبے ہوئے ہوتے تھے۔ میری پہلی شادی کی تقریب میں نکاح خوانی خود انھی کی زبان مبارک سے ہوئی تھی۔ میرے سر پر جو ہار یا سہرا تھا، وہ انھوں نے اپنے ہاتھ سے اتار کر اپنے پاس رکھ دیا۔ پھر نکاح پڑھایا۔ میرے خسر منشی اللہ داد مرحوم و مغفور بھی متشدد اہل حدیث تھے اور سخت درجہ پرہیز گار۔ انھوں نے مجھے سہرا باندھے ہوئے دیکھا تو بگڑ گئے، لیکن قابل ذکر چیز یہ ہے کہ یہ پھولوں کا ہار قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری رحمہ اللہ نے برات کی روانگی کے وقت اپنے دست مبارک سے مجھے پہنایا تھا۔“ [1]

مولانا محی الدین احمد قصوری مزید فرماتے ہیں:

☆...... ”برادرم مولوی محمد علی قصوری (ایم اے کینٹب) کی شادی پر مولانا عبدالواحد غزنوی برات کے ساتھ فرید آباد تشریف لے گئے اور نکاح بھی انھوں نے پڑھایا۔ نکاح سے فارغ ہو کر ہم واپس آ رہے تھے۔ مولانا فرید آباد کے ریلوے سٹیشن پر تشریف فرما تھے کہ مولانا آزاد رحمہ اللہ کا ذکر آ گیا۔ اس وقت مولانا آزاد کا ابتدائی دور تھا۔ میرے منہ سے آزاد کا لفظ سن کر بگڑے اور فرمانے لگے:

”آزاد کیا؟ کیا مسلمان اپنے آپ کو آزاد کہہ سکتا ہے، وہ تو عالم سنا جاتا ہے۔“

”میں نے فوراً جواب دیا: وہ کفر کی حکومت سے آزادی کے داعی اور مجاہد ہیں۔ مجاہدین کے معاونین

[1] حضرت مولانا داود غزنوی: ص ۱۸، ۱۹۔

کے سرخیل بھی۔"

"یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ رحمة الله علیه و علی آبائه الکرام" ❶

☆......حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی مروجہ تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۹۲۱ء میں گوجراں والا تشریف لائے تو وہاں تدریس و خطابت کا سلسلہ شروع کیا۔ حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی کی وفات کے بعد مولانا غزنوی سے متعلق اخبار الاعتصام (مورخہ ۲۷- دسمبر ۱۹۶۳ میں) ان کا پہلا مضمون "اخاء اربعین سنہ" کے عنوان سے چھپا۔ اس کا ایک اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے جس میں مولانا ابوالکلام آزاد سے حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی کی ملاقات کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

"انہی دنوں لاہور میں جمعیت علماے ہند کا اجلاس منعقد ہوا، جس کی صدارت مولانا ابوالکلام آزاد نے فرمائی۔ میاں عبدالعزیز بیرسٹریٹ لا کی کوٹھی میں مولانا آزاد نے صبح کی نماز پڑھائی۔ اس کے بعد لوگوں نے اسلام کی سربلندی اور استحکام وطن کے لیے بہت بڑی تعداد میں ان کی بیعت کی۔ اس بیعت میں مولانا داؤد غزنوی بھی شامل تھے۔ میں نے اور میری طرح کے بہت سے لوگوں نے بیعت کی۔ حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی زندہ تھے۔ وہ مولانا آزاد سے ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ مولانا آزاد ان سے بڑے تپاک سے ملے۔ مولانا عبدالواحد صاحب نے ان کو بہت دعائیں دیں۔" ❷

اب مولانا عبدالواحد غزنوی کے بارے میں عبداللہ ملک مرحوم کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔ وہ تحریر کرتے ہیں:

☆......"میرے دادا منشی نور الٰہی بڑے متشدد اہل حدیث تھے اور لاہور شہر کی مسجد چینیاں والی اس وقت اہل حدیث کی سب سے بڑی مسجد تھی۔ اس مسجد کے وہ ٹرسٹی تھے۔ ۱۹۴۲ء میں ان کی وفات ہوئی تو ان کی جگہ مجھے ٹرسٹی چن لیا گیا۔ لیکن بعد میں میری سیاست نے مجھے اس سے قدرے بے تعلق کر دیا۔ میرے دادا غزنوی خاندان کے بہت معتقد تھے۔

میری جب چشم ہوش وا ہوئی تو اس وقت اہل حدیث جماعت کے مشہور عالم مولانا عبدالواحد غزنوی رحمہ اللہ مسجد چینیاں والی میں خطابت کے فرائض ادا کیا کرتے تھے۔ اس وقت ان کی عمر ستر (۷۰) برس سے تجاوز کر چکی تھی لیکن مجھے ان کی امامت میں نمازیں ادا کرنے کی سعادت حاصل رہی ہے۔ میں نے ان کے پیچھے فجر کی نمازیں ادا کی ہیں جو کہ خاصا مشکل کام تھا اور اس وقت میری عمر پانچ یا چھے برس کی ہو گی۔ اس وقت نیند سے بے دار ہونا بڑا دقت طلب معاملہ ہوتا تھا۔

❶ حضرت مولانا داؤد غزنوی: ص ۱۹۔ ❷ نقوش عظمت رفتہ: ص ۱۹۵۔

لیکن دادا مرحوم مجھے ساتھ لے جایا کرتے تھے اور سحر خیزی کی عادت اسی بچپن کی مرہون منت ہے۔ آج جب میں اپنی عمر کے اٹھاون سال گزار چکا ہوں تو سحر خیزی کی یہ عادت اب بھی اسی طرح قائم ہے۔

''مولانا عبدالواحد غزنوی نمازیں بہت ہی خشوع وخضوع سے ادا کیا کرتے تھے۔ فجر کی نماز میں تو وہ بالالتزام کافی طویل آیات کی تلاوت فرماتے اور تلاوت میں ان پر شدید رقت طاری رہتی تھی۔ سجدوں میں بھی کافی دیر لگاتے اور مسلسل ان کے رونے اور گریہ وزاری کی آوازیں آتی رہتیں، جس سے مقتدیوں پر بھی یہی کیفیت طاری ہو جاتی۔ چناں چہ میری رقیق القلبی بھی انہی ابتدائی ایام اور اسی تربیت کی یادگار ہے۔

''مولانا عبدالواحد غزنوی کے جمعہ اور عیدین کے خطبے مجھے اب بھی یاد ہیں۔ وہ ہمیشہ اللہ کے ساتھ عزوجل کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ ان کی کھنک دار اور بارعب آواز کی گونج نصف صدی گزر جانے کے بعد بھی میرے کانوں میں محفوظ ہے۔ ان کا نورانی چہرہ، سفید و شفاف رنگ، سفید دودھیا داڑھی، قد آدم عصا، سفید لباس، تنگ پائنچے کی شلوار اور ٹخنوں تک عربوں کا سا کرتہ اور جمعے کے خطبے کے دوران عربی عبا زیب تن کرنا، یہ سب باتیں مجھے اب تک یاد ہیں۔ مولانا عبدالواحد غزنوی سے میرے خاندان کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ جب مولانا بیمار پڑے اور ان کی بیماری شدت اختیار کر گئی تو میرے دادا مولانا کو اپنے گھر لے آئے اور خود ان کی دیکھ بھال کرتے رہے۔'' [1]

☆...... مولانا عبدالواحد غزنوی نے اردو زبان میں ایک رسالہ بھی لکھا تھا، جس کا نام ہے ''معارج الوصول بان الاصول والفروع بینہ الرسول''

☆...... حضرت مولانا سے متعلق ایک واقعہ ملک حسن علی جامعی شرق پوری مرحوم نے یا کسی اور بزرگ نے سنایا اور یہ واقعہ میں نے کہیں لکھا بھی ہے...... واقعہ یہ ہے کہ لاہور کا ایک شخص میاں شیر محمد شرق پوری کا مرید تھا۔ وہ شرق پور جاتا تو میاں صاحب سے مولانا عبدالواحد غزنوی کے بارے میں کہتا کہ لاہور کی چینیاں والی مسجد کے یہ وہابی آپ کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ اس نے بار بار یہ بات کی تو میاں شیر محمد ایک دن لاہور آئے اور صبح کی نماز کے لیے چینیاں والی مسجد گئے۔ مولانا عبدالواحد غزنوی کی اقتدا میں نماز پڑھی اور نماز کے بعد ان کا درسِ قرآن سنا۔ مولانا کو دیکھ کر، ان کی اقتدا میں نماز پڑھ کر، پھر ان کا درس سن کر نہایت متاثر

[1] داستان خانوادہ مولانا احمد علی لاہوری: ص ٦-٨.

ہوئے۔ درس میں حضرت مولانا نے ان کو دیکھا تو خیال کیا کہ یہ کوئی اجنبی شخص ہے۔ وہ اٹھ کر جانے لگے تو مولانا نے ان کو روک لیا اور فرمایا: بھائی آپ مہمان معلوم ہوتے ہیں، ناشتہ کر کے جانا۔ انھوں نے جانے کے لیے بہت کہا لیکن مولانا نے نہیں جانے دیا۔ ناشتے کے بعد جانے کی اجازت دی۔ متاثر تو وہ پہلے ہی تھے، اب ان کے اخلاق حسنہ اور مہمان نوازی کا ان پر مزید اثر پڑا۔

دوسرے دن وہی شخص شرق پور گیا تو پھر مولانا کے متعلق میاں صاحب سے باتیں کرنے لگا۔ میاں صاحب نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا: خاموش ہو جاؤ اور یہاں سے چلے جاؤ۔ میں نے خود ان سے مل کر جان لیا ہے کہ وہ کس قدر بلند کردار عالم دین ہیں۔

مولانا عبدالواحد غزنوی نے ۲۹- دسمبر ۱۹۳۰ء (۲۸- رجب ۱۳۴۹ھ) کو وفات پائی۔

مولانا کے چند مکتوبات گرامی:

اب حضرت مولانا عبدالوحد غزنوی رحمہ اللہ کے چند مکتوبات گرامی ملاحظہ فرمایے جو انھوں نے مختلف اوقات میں بعض حضرات کے نام تحریر فرمائے:

پہلا مکتوب:

یہ مکتوب انھوں نے عام لوگوں کے نام لکھا۔ اس میں سورہ فاتحہ کی فضیلت اور اس کے وِرد کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ یہ مکتوب ۲۲ جون ۱۹۶۱ء کے اخبار الاعتصام میں چھپا۔ مولانا کی اردو زبان عجیب قسم کی ہے جو بڑی دلچسپ ہے۔ ملاحظہ فرمایے:

((بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ كَفٰى وَ سَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى))

میرے پیارے اخوان! اللہ عزوجل تم کو اپنی ہی نظر رحمت میں رکھ کر اپنی ہی مرضیات کی توفیق مرحمت کر دے...... السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

يَا اَللّٰهُ يَا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ يَا رَحْمٰنُ يَا رَحِيْمُ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ تو اپنی مبارک سورت کی برکات کے ساتھ میرے سینے کو کھول کر مجھ بے علم سے، وہی لکھا لے، جس سے تیری ہی رضا مندی مجھ کو کامل طور پر حاصل ہو کہ تیرے بندوں کو اس سے کامل فوائد نصیب ہو جائیں۔ آمین یَا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ

فصل در بیان فضائل فاتحہ شریفہ: ﴿وَ لَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ○ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ﴾ (الآية)

”یعنی جب ہم تجھ کو فاتحہ شریفہ کی سات آیتیں عطا کر چکے ہیں، جو تم الٰہی دربار عالی قدر میں حاضر ہو کر

ہر رکعت کے درمیان، ان ہی کو بطریق وسیلہ وتحیہ شاہانہ پیش کر کے عرض حوائج خود کرتے رہتے ہو اور جب ہم تجھ کو، وہ قرآن عظیم (یعنی فاتحہ شریفہ) عطا کر چکے ہیں، جس کے ساتھ ہر ایک مشکل حل ہو سکتی ہے، ہر ایک قسم کی بیماری دور ہو سکتی ہے اور وہ ہر قسم کی ترقی کے لیے کامل زینہ اور ہر ایک خزانے کے لیے اعلیٰ مفتاح و چابی ہے، تو پھر تم کیوں کسی کے مال و متاع یا کسی اور قسم کی عزت اور ترقی کی طرف (بخیال تمنا و آرزو) آنکھیں اٹھا کر دیکھو، کیونکہ ہر ایک قسم کے مطالب اور ہر قسم کے مقاصد حاصل کرنے کے لیے تو یہی فاتحہ شریفہ اعلیٰ وسیلہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تو نماز میں کیا پڑھا کرتا ہے۔ یعنی جب تو نماز کے درمیان ما سوائے اللہ کے تمام تعلقات کو قطع کر کے، تمام خیالات کو پس پشت ڈال کر اپنے حاکم اعلیٰ رب العزت (اللہ عزوجل) کے دربار کے اندر داخل ہو کر اس کے سامنے غلامی لباس میں کھڑا ہو جاتا ہے، تو اس وقت تو اس کے اعلیٰ جناب میں برطریق نذرانہ، غلامانہ و پیش کشی آں دربار عالی شان، کیا تحیہ پیش کرتا رہتا ہے۔

اس نے فاتحہ شریفہ سنا کر کہا کہ: میں اس موقعہ پر اس تحیہ کو پیش کرتا رہتا ہوں۔ آپ سن کر خوش ہوئے، اور اس کی بشارت اور مزید ترغیب کے لیے اور اپنی باقی امت مرحومہ کی خیر خواہی اور ہدایت کے لیے حلفیہ بیان فرمایا:

((و الذی نفسی بیده ما نزل فی التوراة و لا فی الانجیل و لا فی الزبور و لا فی القران مثله، انها السبع المثانی و القران العظیم الذی اعطیته))
(رواه اهل السنن و المسانید)

”مجھ کو اس رب کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ نہ تو تورات میں اور نہ انجیل اور نہ زبور میں، اور نہ قرآن میں اس کی مثل کوئی سورت نازل ہوئی ہے، اور وہی السبع المثانی (سات آیتیں ہیں) جو ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہیں اور یہ وہی القرآن العظیم ہے جو مجھ کو عطا ہوا ہے اور ہمارے رب عزوجل نے اس عظیم الشان عطاء کو آیۂ کریمہ وَ لَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ (الآیہ) میں بہ طریقِ تذکرہ احسانات عظیمہ خود ذکر کیا ہے۔

جاننا چاہیے کہ فاتحہ شریفہ ہی اجل و اعلیٰ مقصود ہے۔ چونکہ وہ مقصود اعلیٰ ہے، اسی طرح اس کے حصول کے لیے پہلے چند اعلیٰ وسائل ہیں۔ اعلیٰ سے مقصود یہ ہے کہ ہم کو ہمارا رب ہی (عزوجل) مل جاوے اور وہی رب سبحانہ وتعالیٰ ہمارے سروں پر اپنا دستِ رحمت و رأفت رکھ کر اپنی ہی (طرف پھیر کر) بہ ایں طور اپنے ہی کنفِ عطوفت میں جگہ دے دے، کہ اس کے بعد جدائی مطلق نہ ہو۔

((اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا بِرَحْمَتِكَ الَّتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ))

تمام عبادات اور دعاؤں میں سب سے اعلیٰ اور اقرب الی الاجابت والقبول یہی عریضہ مبارک فاتحہ شریفہ ہے، جس کے درمیان ہم:

اولاً: اپنے رب عزوجل کے ان اعلیٰ محامد، اعلیٰ صفات، اعلیٰ اسمائے حسنٰی کے ساتھ توسل کرتے ہیں، جن کے اندر اس کی توحید الوہیت بھی ہے اور توحید ربوبیت بھی ہے، اور توحید فی الاسماء والصفات بھی ہے اور اسی کی عزت اور عظمت اور کبریائی اور اسی کی وسعت رحمت اور کمال مہربانی کا ذکر بھی ہے۔ قال اللہ عزوجل وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا.

اور ثانیاً: ہم اسی کے آگے اپنی قلبی محبت اور چاہ اور اپنے دلی اخلاص کو بکمال عاجزی اور زاری بہ ایں طور ظاہر کرتے ہیں، کہ ہم تو اب بھی تیرے ہی در کے غلام ہیں اور آئندہ بھی تیرے ہی در کے غلام بنے رہیں گے۔ سو تو ہی ہم کو ان اعلیٰ صفات کے طفیل اور برکت سے بہ ایں طور کامل توفیق اور اعانت اور کامل امدادِ عبادت ومحبت خود مرحمت فرما کر، ہمارے دلوں سے تمام دنیوی حاجتوں کو دفع کر دے، اور ہم کو اپنے ساتھ لگا کر اپنی نظرِ رحمت میں رکھ کر ہر ایک قسم کی تربیت فرما۔

ثالثاً: اور پھر بڑی محبت اور کمال عاجزی سے بلکہ اگر ہو سکے تو رو رو کر ہم اپنے ہی رب عزوجل کی قدر دانی اور شکر گزاری کے لیے اسی کے اللہ اور رب اور رحمان اور رحیم اور مالک یوم الدین ہونے کی خوشیاں کر کر بہ لحاظ معانی وتکرار الفاظ پڑھا کریں۔

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ o اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ o مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ o﴾ کو بایں مراقبہ، اور بایں حضور کہ یارب العالمین ہم تو تیرے ہی اللہ ہونے کی خوشیاں کر کر بطریق شکریہ وقدردانی تیری حمد اس قدر پڑھتے ہیں جس قدر تیری شان الوہیت ہے۔

یارب العالمین! ہم تو تیرے ہی رب ہونے کی خوشیاں کرتے، تیرے ہی معبود ہونے کا شکر بجا لاتے، تیری حمد اسی قدر پڑھتے ہیں جس قدر تیری شارع رحیمیت ہے۔

یارب العالمین! ہم تو تیرے ہی اللہ ہونے کی خوشیاں کرتے، تیرے ہی مقصود قلبی ہونے کی شکر گزاری کے لیے تیری حمد اس قدر پڑھتے ہیں، جس قدر تیری شانِ مالکیت ہوگی روزِ قیامت میں۔

ان الٰہی اسماء میں

ایک اسم اللہ

دوم اسم رب

سوم اسم رحمان ہیں۔

جو اللہ عزوجل کے باقی اسماء کے لیے بمنزلہ امہات و اصول ہیں۔ یعنی اس کے باقی اسماء کے معانی اور مضامین ان ہی تینوں کے درمیان موجود ہیں اور فاتحہ شریفہ کے تمام مقاصد اور تمام مطالب ان ہی تینوں پر مبنی ہیں۔ اسی قسم کے اسرار اور حکمتوں کی حیثیت اور اعتبار سے تو یہ ام الکتاب اور تمام آسمانی مقدس کتابوں اور تمام قرآنی سورتوں سے افضل بلکہ خود ہی قرآن عظیم ہے۔ فالحمد لله الذی من بها علینا.

دوسرا مکتوب:

حضرت مولانا نے یہ مکتوب ایک خاتون مساۃ محترمہ قریشہ کے نام تحریر فرمایا جو ان کے حلقۂ بیعت میں شامل تھیں۔ (مطبوعہ ''الاعتصام'' ۱۴ جولائی ۱۹۶۱ء)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○

عزیزہ! اللہ عزوجل اپنی ہی نظرِ رحمت میں رکھے۔

بعد السلام علیکم کسی کو کعبہ وقبلہ نہ لکھا کریں۔ نیز بسم اللہ لکھا کریں۔

عزیز عبدالحی جان ملا۔ بارک اللہ فیہ ان شاء اللہ۔ شریف لڑکا ہے۔ تم تقوی اور دعاؤں سے زیادہ کام لیا کرو۔

۴۱ مرتبہ الحمد شریف کو صبح ۴۱ مرتبہ رات کو بعدۂ درود شریف کو سو مرتبہ پڑھا کریں۔ بعد ازاں جو دعا چاہو، کرلیا کرو اور پانی پر دم کر کے پی لیا کرو۔

تعویذ بھیجتا ہوں۔ باقی حوالہ خدا۔

میں ان شاء اللہ ہفتہ کے دن حج کو روانہ ہو جاؤں گا۔

عبدالواحد غزنوی عفی عنہ

تیسرا مکتوب:

یہ مکتوب حضرت مولانا نے اپنے فرزند گرامی مولانا اسماعیل غزنوی کے نام تحریر فرمایا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○

الی الولد اسماعیل، و الولد اسماعیل سلمهما الله تعالی۔ السلام علیکم و رحمة الله و برکاته، جاء جواب المحمدی، و الغزنوی سکت ......

اللہ تعالیٰ کے لحاظ ملاحظہ میں ہر وقت رہا کرو۔ بشریت کی وجہ سے اگر کوئی برائی ہو جاوے تو اس کو نیکی اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے عملوں سے محو کرلیا کرو۔ جھوٹ بولنے کو بالکل ترک کر دو۔ ایک دل میں ایمان اور کذب جمع نہیں ہوتے۔ ہر معاملہ میں صفائی کو اپنے اوپر لازم کر دو۔ اپنے سے زیادہ اپنے بھائی کی خیر خواہی

کیا کرو۔ بلکہ ہر شریک کی اسی طرح خیر خواہی کیا کرو۔ رب اپنے کو ہر وقت یاد کرلیا کرو۔ اسلام کو ایک خیمہ جان لو، جس کے درمیان ایک ستون اور چاروں طرف سے چار پردے ہوں۔ جب تک درمیانہ ستون قائم نہ ہو ان چار پردوں سے خیمہ قائم نہ ہوگا۔ اسی طرح نماز اسلام کا درمیانہ ستون ہے۔ اور زکوۃ، روزہ، حج وغیرہ پردوں کی طرح ہے۔ جب تک ان میں نماز نہ ہو، اسلام کا خیمہ قائم نہ ہوگا۔

نماز ذکرِ الٰہی کے لیے ہوتی ہے۔ لہٰذا بڑی عاجزی کے ساتھ زبان سے اللہ تعالیٰ کے اوصاف بیان کرنے چاہئیں اور بدن کے ساتھ جھک جھک کر اس کے دربار میں آداب بجالانے چاہئیں اور دل سے اس کے آگے عاجزی کرنی چاہیے، بایں طور کہ وہ عاجزی نمازی کے بدن سے ظاہر ہو۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اخبات کہتے ہیں زمین کے دبانے کو جو بہ نسبت اور زمین کے دب کر نیوی ہو جائے۔ اس طرح نمازی کو بایں طور عاجزی سے کھڑا ہونا چاہیے جو بدن کے دب جانے سے معلوم ہو۔ خصوصاً جب بازار میں نکلو تو اس وقت بڑے زور سے یعنی کثرت سے اپنے رب کو یاد کرلیا کرو۔ اور بندوں اور حیوانات کو دیکھ کر اپنے رب کی عظمت وقدرت وتربیت کو یاد کر کے وہاں ہی پکار کر فریاد واستغاثہ کرو کہ اللہ تعالیٰ تو نے ہی ان کو پیدا کیا۔ تو ہی ان سب کو پالتا ہے، تو ہی سب کو قائم رکھتا ہے، تو ہی ہر ایک کی حاجت براری کرتا ہے۔ حالانکہ ان میں مجھ سے بڑھ کر غافل، مجھ سے بدرجہا زیادہ گناہ گار، مجھ سے بڑھ کر خطا کار ہوں گے۔ اللہ تو مجھ پر رحم کر، میری روسیاہی کو بہ آبِ رحمت خود دھو ڈال۔ مجھ کو معاف فرما۔ میرے دین ودنیا کو قائم کردے۔ اس طرح پر بازار میں جانا عبادت ہے اور بازاروں کی غفلت میں اپنے رب کو اس طرح انابت سے یاد کر لینا، اولیاء اللہ کا کام ہے۔ نیز عجائبات قدرت کو دیکھ کر اپنے رب کی عزت وعظمت کی طرف پکار کر دعا کر لیا کرو۔ وہ اجابت کا وقت ہوتا ہے۔

زکریا علیہ السلام نے مریم علیہا السلام کے غیبی میووں کو دیکھ کر رب کی قدرتِ کاملہ کو یاد کر کے بے اختیار ہو کر دعا کی:

هنالك دعا زكريا ربه اللہ عزوجل نے فوراً اس کی دعا قبول کر لی اور سخت مایوسی کی عمر میں اس کو یحییٰ علیہ السلام مرحمت کر دیا۔ نیز بازار والے سب کے سب غفلت اور سخت حرص میں مبتلا ہوتے ہیں، اس وقت تم اپنے رب کو یاد کرو گے تو اللہ کے دربار میں تمھاری بڑی قدردانی ہوگی، پھر کیوں دعا قبول نہ ہوگی۔ ہاں دنیا کو مقصودِ اصلی مت گردانو۔ کیونکہ دنیا تو اللہ عزوجل کی طرف میر کرنے والوں کے لیے خرچِ راہ ہے اور مقصود اصلی رب ہی ہے عزوجل۔ نہ خرچ راہ۔

ہر روز صبح کی نماز کے بعد اولاً تسبیحات وادعیہ ماثورہ پڑھا کرو۔ پھر قرآن مجید کا حلقہ بنا کر دو چار آیتوں کو بطریق درس اسماعیل پڑھا دیا کرے اور تم ہر ایک قرآن شریف میں دیکھ کر سنا کرو۔ تا کہ تم رب عزوجل

کے حکموں سے واقف ہو جاؤ اور دن کے شروع میں تمھاری زبان، آنکھیں، دل، دماغ، قلب و قالب اللہ تعالیٰ کے کلام مجید کے ساتھ مبارک ہو جاوے۔ رحمت کا ذکر قرآن شریف میں آ جاوے تو اللہ تعالیٰ سے رحمت کا سوال کرو۔ عذاب کا ذکر ہو تو اللہ کے ساتھ پناہ پکڑو۔ فرائض کے علاوہ رات کو تہجد کے لیے اٹھا کرو اور اس اٹھنے سے قیامت کے اٹھنے کو یاد کر لیا کرو کہ اس طرح قیامت میں ہم کو رب العالمین اٹھاوے گا۔ اسی واسطے رسول اللہ ﷺ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَ اِلَیْهِ النُّشُوْرُ نیند سے اٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔ مخلوقِ خدا پر رحم کر لیا کرو۔ تم پر اللہ رحم کرے گا۔ رحم اعلیٰ یہ ہے کہ دینداری سکھاؤ، نماز پڑھواؤ۔ ذکر الٰہی تعلیم کرو، نہ یہ کہ آپس میں بے دینی، بے نمازی، تمباکو نوشی و چائے وقہوہ و مجلس آرائی پر وقت ضائع کرو کیونکہ شرط ایمان ہے کہ اللہ کے دوستوں سے محبت ہو اور بے دین و آزاد لوگوں سے انقطاع و مخالفت ہو۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ ایمانِ کامل کے باوجود کوئی شخص اللہ اور رسول ﷺ کے مخالفوں سے دوستی کرے۔ اگر ایسا کرے گا تو کامل ایمان دار نہ ہو گا۔ غرض یہ ہے کہ ہم اللہ ہی کی پیدائش ہیں۔ ہمارے پیدا کرنے میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی شریک نہیں تھا۔ اسی طرح ہم کو لازم ہے کہ ہم اپنی تمام ہستی اس کے تابعدار کر دیں۔ اسی کو اسلام کہتے ہیں۔

چوتھا مکتوب:

حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی کا یہ مکتوب گرامی ۱۲ اکتوبر ۱۹۶۱ء کے الاعتصام میں شائع ہوا۔ ملاحظہ فرمایے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○

بھائی جان (قربان علی) بعد از سلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ اللہ عزوجل ہمارے دلوں کو اپنی ہی محبت کے ساتھ بایں طور بھر کر معمور کر دے، جس کے سبب سے ہمارے دلوں میں غیر اللہ، ما سوی اللہ کے لیے کوئی جگہ نہ رہے، بلکہ غیر اللہ کے تمام افکار، تمام خیالات ہمارے دلوں سے نسیاً منسیا ہو جاویں، بھائی جان! ہمارے ارحم الراحمین رب عزوجل نے تو ہمارے دلوں کو اپنی ہی محبت، توکل، انابت، اخلاص، مقام احسان و دیگر اعمالِ قلوب ہی کے واسطے پیدا کیا ہے، چنانچہ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

اَلْقَلْبُ بَیْتُ الرَّبِّ جَلَّ جَلَالُهٗ
حُبًّا وَّ اِخْلَاصًا مَعَ الْاِحْسَانِ

ف- چنانچہ ہمارے ارحم الراحمین رب عزوجل نے ہمارے ابدان میں ہر ایک عضو کو ایک خدمت، ایک کام کے واسطے پیدا کیا ہے۔ وہی کام، وہی خدمت اس سے لی جاوے تب تو یہ علالت سبب آرام اور راحت

ہے۔ غیر کام اس سے کرالو، غیر جگہ میں اس کو استعمال میں لاؤ، تو یہ سببِ بے آرامی اور مصائب ہو گا۔
مثلاً آنکھیں دیکھنے کو، کان سننے کو، ہاتھ پکڑنے کو، قدم چلنے کو پیدا ہوئے ہیں۔ اگر یہ کام ان سے لو گے تو آرام سے رہو گے۔ اگر ان سے وہ غیر کام لو گے جن کے واسطے وہ پیدا نہیں ہوئے، تو تکلیف میں تمام وجود کو ڈالو گے اور شکار مصائب بن کر ہمیشہ مصیبتوں میں مبتلا رہو گے۔

اسی طرح دلوں کو (جو ہمارے ارحم الراحمین نے ان کو اپنے ہی ذکر اور محبت اور اخلاص ہی کے واسطے پیدا کیا ہے) اگر ان سے تعلق غیر اللہ اور محبت غیر اللہ اور طلب غیر اللہ اور تلاش غیر اللہ وغیرہ وغیرہ امور دنیا لی جاویں تو دل ہمیشہ تکالیف اور عذابوں اور مصائب ہی میں رہیں گے۔

چنانچہ ہمارے رب عزوجل نے کفار کے اموال اور اولاد کے بارے میں فرمایا ہے:
﴿فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَ لَآ اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ تَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَ هُمْ كٰفِرُوْنَ﴾ (التوبة: ٥٥)
''کہ ان کے مال اور ان کی اولاد کو دیکھ کر تم تعجب میں نہ گرفتار ہو، اس کے سوائے اور کوئی بات نہیں کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ان مالوں اور ان اولادوں کے ساتھ ان کو اس دنیوی زندگانی میں معذب گردانے بایں طور کہ ان کے دل جو الٰہی تعلق، الٰہی محبت کے واسطے پیدا کیے گئے تھے اس سے تو انھوں نے اپنے دلوں کو پھیر لیا اور ایسی غیر چیزوں (اموال، اولاد وغیرہ) کے ساتھ لگا لیا۔''
تو اب بہ دو سبب وہ معذب ہوں گے:

ایک تو بایں سبب کہ اعلیٰ امور کے واسطے دل پیدا کیے گئے تھے، انھوں نے اپنے دلوں کو ان اعلیٰ امور میں استعمال نہ کیا۔ بلکہ ان امور کے اضداد میں استعمال کر لیا۔ چنانچہ کوئی شخص اپنے پاؤں کے بدلے ہاتھوں کے ساتھ چلنا اختیار کر لے اور مصداق ﴿اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖۤ اَهْدٰۤى اَمَّنْ يَّمْشِيْ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ کا مصداق ہو جاوے کیا اس کو عذاب نہ ہو گا، کیا وہ سخت تکلیف میں مبتلا نہ ہو گا۔

دوئم بایں سبب کہ مالوں اور اولادوں میں تو ہمیشہ امتحانات اور مصائب بر طریقِ لزوم جاری رہتے ہیں۔ لہٰذا جس نے ان ہی کے ساتھ اپنے دل کو لگا لیا، وہ ان مصائب اور امتحانات کے سبب سے ہمیشہ غم میں، ہمیشہ دکھ میں گرفتار رہے گا۔ عیاذاً باللہ تعالیٰ

لہٰذا ہمارے ارحم الراحمین نے آیۂ ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ میں (بر طریق اعلان) فرمایا کہ دلوں کا اطمینان تو ہمارے ہی ذکر، ہماری ہی عبادت، ہمارے ہی ساتھ انس والفت میں ہے۔ بہ دو سبب:
ایک تو بایں وجہ کہ جس اعلیٰ کام کے لیے دل پیدا کیے گئے تھے ہم نے ان ہی اعلیٰ امور میں ان کو استعمال

کرلیا۔ بایں سبب ہمارے دل اطمینان اور آرام اور راحت میں ہوں گے۔

دویم بایں سبب کہ ہمارے رب العالمین عزوجل کے ذکر میں اسی کی عبادت اور اطاعت میں اور اسی کی محبت میں اور اسی کے ساتھ انس و الفت میں تو ایک نور اور سرور اور ایک حلاوت اور لذت اور ایک انشراح صدر اور اطمینانِ قلب ہوتا ہے جو بیان نہیں ہوسکتا:

((کما قال النبی ﷺ: لقد وجد حلاوة الایمان من رضی بالله ربا و بالاسلام دینا و بمحمد نبیا[ﷺ]))

پھر تمام اذکار میں قرآن مجید کی تلاوت اعلیٰ ذکر ہے اور پھر قرآن مجید کی تلاوت میں سب سے اعلیٰ اور افضل تلاوت سورہ فاتحہ یعنی الحمد شریف ہے۔

بایں طور کہ ہم اپنے ارحم الراحمین کو مقصود اصلی اور مطلوب قلبی اور مراد حقیقی ٹھہرا کر ہر وقت اسی کے ذکر میں، اسی کی عبادت میں، اسی کی تلاش اسی کی چاہ، اسی کی طلب میں رہا کریں اور وہی عمل کرلیا کریں جس سے وہی عزوجل راضی ہوکر مل جاوے۔

بھائی جان! ہم تو موافق آیہ ﴿وَ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا﴾ نہایت کم زور و عاجز ہیں۔ یا اللہ پھر ہم باوجود اس ضعف کے اس اعلیٰ مطلب میں کس طرح کامیاب ہوسکتے ہیں جب تک کہ تو خود ہی رحم فرما کر ہم کو اپنے ہی ساتھ ملا نہ لو۔

بناء علی ذالک تو ہمارے ارحم الراحمین ہی نے ہم کو فاتحہ شریفہ یعنی ام القرآن عطا فرمائی ہے۔ اس میں اولاً ہمارے ارحم الراحمین کے وہ اعلیٰ صفات ہیں جو اسی کے تمام اسماءِ حسنیٰ اور تمام صفاتِ علیا میں بمنزلہ امہات ہیں اور تماموں کے معانی ان ہی کے درمیان جمع ہیں۔ سو ام القرآن کے ساتھ توسل کرنا، گویا ہمارے ارحم الراحمین رب عزوجل کے تمام اعلیٰ صفات کے ساتھ توسّل ہے، بلکہ تمام مقدس کتابوں (قرآن مجید، توراۃ شریف، انجیل شریف وغیرہ) کے ساتھ توسل ہے۔

(تتبعها الرادفه)

پانچواں مکتوب:

یہ مکتوب انھوں نے اپنی صاحب زادی محترمہ صفیہ صاحبہ کے نام لکھا تھا جو ۱۵ دسمبر ۱۹۶۱ کے الاعتصام میں چھپا۔ ملاحظہ فرمایئے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○

عزیزۂ من السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

یہاں خیر ہے فالحمد للہ حق حمدہ۔ اللہ عزوجل تم سبھوں کو خیر کے ساتھ رکھے، آمین۔ اپنا حال اپنے ہاتھ سے لکھا کرو۔ آج مریم جان کا خط آیا کہ صفیہ سخت بیمار ہے۔ وہ عورت جو آئی ہے، اسی کا بیان ہے سوائے ارحم الراحمین تو خود رحمان بھی اور رحیم بھی اور یہ ماہِ رحمت ہے۔ پس برحمتِ واسعۂ خود میری پردیسن لڑکی کو اپنے ہی شفاخانہ غیب سے، اپنی ہی عبادت کے واسطے شفاءِ کامل، شفاءِ عاجل مرحمت کر۔ الٰہ الحق آمین

جانِ من! یہی تو ماہِ دعا، ماہِ عبادت، ماہِ مسئلت ہے۔ افطار کے وقت بھی، تراویح کے وقت بھی، سحری کے وقت بھی۔ سحری کے وقت تو ہمارا ارحم الراحمین عزوجل آسمان دنیا پر نزول کرتا ہے اور فرماتا ہے کیا ہے کوئی معافی مانگنے والا، کہ میں اس کو معاف کر دوں۔ کیا ہے کوئی سوال کرنے والا کہ میں اس کے سوال، اس کی حاجت کو ادا کر دوں۔

لہٰذا اللہ عزوجل کے درِ رحمت پر گر کر، رو رو کے توبہ و استغفار کر کے اسی سے، اسی کی عبادت کے واسطے صحت اور تندرستی طلب کر کے اسی کو، عزوجل کو طلب کرو۔ کیونکہ ہم اس سے (معاذ اللہ) جدا رہیں گے تو کسی طرح سے بھی نہیں رہ سکتے۔ لہٰذا اسی کو مقصودِ اصلی ٹھہرا کر، اسی کو، اسی سے رو رو کے مانگا کرو اور اسی سے، اسی کو طلب کر لیا کرو اور الحمد شریف کو رو رو کر بایں طور کہ اللہ عزوجل کے اعلیٰ صفات کا جو اسی کے ابتداء میں ہیں، شکریہ ادا کرنے کو دس (۱۰) بیست (۲۰) مرتبہ مکرر بھی پڑھا کرو۔

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَo اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِo مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِo﴾ اسی طرح دس (۱۰) بیست (۲۰) مرتبہ جو الحمد میں اللہ عزوجل کے اعلیٰ صفات پڑھے گی، تو اپنے رب عزوجل کو یہ دکھلایا کرو کہ میں تیری ان ہی اعلیٰ صفتوں کی خوشیاں کرتی ہوں اور بار بار الحمد پڑھتی ہوں کہ ہمارے رب العالمین عزوجل کے یہ اعلیٰ صفات ہیں اور میں ان ہی اعلیٰ صفات کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔

پھر ان ہی اعلیٰ صفتوں کے ساتھ توسل کر کے ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ میں اپنے رب العالمین عزوجل سے اسی کو (بہ طفیل اور وسیلہ اور برکت ان ہی اعلیٰ صفات) بکمال تضرع و کمال عاجزی (رو، رو کے) مانگنا چاہیے اور اسی کو دس (۱۰) بیست (۲۰) مرتبہ پڑھنا چاہیے اور اپنے رب عزوجل کو اپنا دل دکھایا کرو کہ یا رب عزوجل تو میرے دل کو دیکھ رہا ہے کہ میرے دل میں یہی خواہش، یہی طلب، یہی سوال، یہی عشق ہے کہ تو ہی ملجا ہے۔ چوں کہ یہ سب سے اعلیٰ مقصود ہے اور میں تیری ہی عاجز بندی، ناتواں لونڈی (علاوہ براں بیمار بھی) ہوں، لہٰذا اعانت اور امداد بھی تجھ ہی سے مانگتی ہوں۔ پھر دس (۱۰) بیست (۲۰) مرتبہ ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ میں یہ اظہار کرو کہ وہ امداد، وہ اعانت مرحمت کر دے جو تو نے اپنے انعام والے بندوں کو (بر طریق فضل و انعام) عنایت کر دی تھی اور ان کو اپنے

ہی ساتھ ملا دیا تھا اور ان کو اپنی ہی نظر رحمت میں رکھ کر پالا تھا۔ پھر ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ آمین دس (۱۰) بیست (۲۰) مرتبہ یہی عرض کرو کہ ارحم الراحمینا، غضب والوں اور گمراہوں کی راہ سے تو ہم کو بچا دے۔ غضب نہ اللہ عزوجل کا ہو اور نہ کسی اور کا ہو۔ کیوں کہ ہم تو عاجز مخلوق ہیں۔ نہ اپنے رب کے غضب کی طاقت رکھتے ہیں اور نہ کسی اور کے غضب کی۔ ہاں پڑھنے کے وقت نیت وسیع رکھو۔ اپنی اولاد، اپنے گھر والوں، اپنے والدین اپنے خاندان، بلکہ تمام اسلام، تمام مسلمانوں کے واسطے، خاص کر تمام بیماروں کے واسطے، وغیرہ وغیرہ کے واسطے کہ گویا یہ دعا، یہ مبارک فاتحہ شریف پڑھ رہی ہو۔ جس قدر نیت وسیع ہوگی، اسی قدر رحمت الٰہی وسعت کے ساتھ آئے گی۔ بلکہ جس نے تم پر ظلم کیا ہو، اس کے واسطے بھی نیت کر لو اور جس پر تم نے کوئی ظلم کیا ہو اس کے لیے بھی نیت دعا ہو۔

میری جان اللہ عزوجل کے پاس ہم سب نے حاضر ہونا ہے۔ سو یا ارحم الراحمین ہم تجھ کو کیا منہ دکھلاویں گے۔ الٰہی ارحم الراحمین گناہوں کے تو پہاڑ ہوں گے اور اعمال صالحہ اور خالصہ کا نام ندارد ہوگا۔ پھر یا ارحم الراحمین ہمارا کیا حشر ہوگا اور کیا حساب ہوگا۔

سو یا ارحم الراحمین تو بمحض فضل اور بمحض کرم خود ہمارے اسی عمل کو مقبول فرماؤ کہ ہم تمام اسلام اور تیرے تمام بندوں کے واسطے دعا کرتے ہیں۔ اسی طرح درود شریف کو کثرت کے ساتھ پڑھا کرو اور یہی نیت رکھو کہ اللہ عزوجل اپنے رسول ﷺ کو اور ان کے آل، ان کی امت کو اپنی عزت اور برکت اور ترقی مرحمت کر دے، جس سے دنیا بھی بھر جاوے اور آخرت بھی۔

چونکہ دنیا میں رسول اللہ ﷺ کی عزت اسی میں ہے کہ جس خدمت دینی کے واسطے وہ پیغمبر ہو کر مبعوث ہوئے تھے اب ان کے بعد وہی قرآن مجید، وہی دین اسلام، وہی سنت نبوی، وہی کلمۂ توحید کامل طور پر شرقاً و غرباً و جنوباً و شمالاً و براً و بحراً جاری ہو جاوے۔ رسول اکرم ﷺ کی عزت اسی میں ہے۔

لہٰذا دورد شریف میں گویا یہی دعا، یہی سوال، یہی التجاء ہے کہ ہمارا رب العالمین عزوجل اپنے رسول ﷺ کو دنیا میں یہی عزت ان ہی کو مرحمت کر دے کہ ان کے انتقال کے بعد قرآن مجید، و حدیث شریف اعلیٰ طور پر جاری رہیں۔ اور توحید الٰہی اور سنت نبوی ﷺ اعلیٰ درجے پر جاری ہوں اور اسلام اور مسلمانوں کو اعلیٰ غلبہ اور ترقی دینی و دنیوی و نیک بختی و صلاحیتِ ظاہری و باطنی اور حکومت و بادشاہی ہو اور آخرت میں ہمارا رب العالمین عزوجل ان کو وہ عزت و مقام محمود، مقامِ شفاعتِ کبریٰ مرحمت کر دے جب تمام انبیاء علیہم السلام نفسی نفسی کہیں گے اور وہ ﷺ شفاعت کریں اور دروازۂ شفاعت کھول دیں گے، جس کے سبب سے تمام محشر والے سب کے سب ان ہی کی تعریف کریں گے۔

غرض یہ ہے کہ دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ و تقدس ان ہی ﷺ کو وہ عزت مرحمت کر دے جو ان ہی کی امت دیناً بھی ترقی کریں اور دنیاً بھی۔

لہٰذا درود شریف میں نہایت اعلیٰ ثواب اعلیٰ درجہ ہے اور اسی کے ساتھ اور دعا بھی قبول ہو جاتی ہے۔ لہٰذا کثرت سے درود کو پڑھا کرو۔ بلکہ ماثور دعاؤں کے علاوہ، جو کچھ تم اوراد اور وظائف پڑھا کرتی ہو، ان میں اکثر حصہ درود ہو۔ مجھ کو بھی دعاؤں میں یاد رکھا کرو۔ امۃ الرحمان جان کو بعد سلام یہ سنا دو۔ حفیظ جان کو بھی سمیت سلام و دعا کے۔ تمام گھر والوں سے سلام و دعا برسد۔ مولوی شرف دین (رحمہ اللہ) کے گھر میں میرا اسلام و دعا کہہ دیں اور یہ کہ مجھ کو دعا میں یاد رکھیں۔ ۴- رمضان ۱۳۴۶ھ۔ لاہور۔

آج سے کم و بیش سو سال پہلے گوندلاں والا (ضلع گوجراں والا) میں ایک صالح ترین بزرگ میاں عبداللہ ٹھیکے دار قیام فرما تھے۔ وہ حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ کے مرید اور شاگرد تھے۔ سرحد پار کی جماعت مجاہدین سے ان کا تعلق تھا جو پہلے راجا رنجیت سنگھ کی سکھ حکومت سے، پھر ہندوستان کی انگریزی حکومت سے برسرِ پیکار رہی۔ اس جماعت کی میاں عبداللہ دل کھول کر مالی مدد کرتے تھے۔ اپنے دور کے علمائے کرام سے ان کے قریبی روابط تھے۔ طلبائے علم کو بھی انھوں نے ہمیشہ شفقت اور تعاون کے مستحق گردانا۔ حضرت حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ کے والد مکرم (مولوی فضل الدین) کی وفات کے بعد یہ گھرانا پریشانی کا شکار ہوا تو میاں عبداللہ ٹھیکے دار ان کے معاون بنے اور حافظ صاحب کی جو ابھی کم عمر تھے، تعلیم کا انتظام کیا اور انھیں امرتسر کے مدرسہ غزنویہ میں داخل کرایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت حافظ صاحب نے تعلیم حاصل کر کے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے ذریعے کتاب و سنت کی بہ درجہ غایت خدمات سرانجام دیں۔ وہ صحیح معنوں میں محدث العصر تھے۔ یہ خدمت جہاں حضرت حافظ صاحب کے لیے صدقہ جاریہ ہے، وہاں میاں عبداللہ مرحوم کے لیے بھی باعثِ اجر و ثواب ہے۔

حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی سے میاں عبداللہ صاحب کے گہرے قلبی تعلقات تھے، جن کا اصل محور دو چیزیں تھیں اور وہ تھیں ان دونوں بزرگوں کی صالحیت اور خدمتِ قرآن و حدیث کا جذبہ صادقہ۔! مولانا غزنوی مرحوم نے ان کے نام متعدد خطوط لکھے۔ ان خطوط کے عکس مجھے کویت سے مولانا عارف جاوید محمدی نے ارسال کیے، اس عنایت پر میں ان کا شکر گزار ہوں۔ ان خطوط سے پتا چلتا ہے کہ سلطان عبدالعزیز (ابن سعود) اور مولانا عبدالواحد غزنوی مرحوم کے باہم نہایت مخلصانہ مراسم تھے۔

سلطان موصوف نے جب حجاز فتح کیا اور سعودی حکومت کا قیام عمل میں آیا، اس وقت اس حکومت کی مالی حالت کمزور تھی۔ متحدہ ہندوستان کے جن لوگوں نے کوشش کر کے فوری طور پر مالی اعتبار سے اس حکومت کو

کچھ سہارا دیا ان میں مولانا عبدالواحد غزنوی کی ذات گرامی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ سلطان عبدالعزیز اور ان کے والدِ محترم امیر عبدالرحمٰن سے ان کے تعلقات کا آغاز کویت میں ہوا تھا۔ یہ باپ بیٹا کویت میں اقامت گزیں تھے اور نجد پر حملے کی تیاری کر رہے تھے۔ مولانا عبدالواحد غزنوی اور ان کے برادر مکرم مولانا عبدالرحیم غزنوی کی تجارت کے سلسلے میں وہاں آمد و رفت رہتی تھی۔ وہیں ان باپ بیٹے سے ان کی ملاقات ہوئی جو آگے چل کر مضبوط تعلقات کا باعث بنی۔ قیامِ کویت کے زمانے میں انھوں نے ان غزنوی برادران سے علمی استفادہ بھی کیا اور ان کی فضیلتِ علمی اور تقویٰ شعاری سے وہ بے حد متاثر ہوئے۔ فتح نجد کے بعد سلطان عبدالعزیز (ابن سعود) نے ان کو نجد میں قیام کی دعوت دی۔ کچھ عرصہ وہ وہاں رہے، پھر واپس آ گئے۔ انھوں نے ہندوستان ہی میں رہنا مناسب سمجھا۔

۱۹۲۸ء میں حضرت مولانا عبدالجبار غزنوی کے فرزندِ گرامی مولانا سید محمد داؤد غزنوی اور مولانا عبدالواحد غزنوی کے لائق بیٹے مولانا اسماعیل غزنوی امرتسر سے غلاف کعبہ تیار کر کے مکہ مکرمہ لے کر گئے اور وہ بیت اللہ شریف کی زینت بنا۔

مولانا عارف جاوید محمدی کے ذخیرۂ مکاتیب میں مولانا عبدالواحد غزنوی کے ایک مکتوب کا عکس موجود تھا جو انھوں نے اپنے ایک دوست کو لکھا تھا کہ میں ملک عبدالعزیز کے لیے رقوم جمع کر رہا ہوں، آپ بھی اس میں اپنا حصہ ڈالیں۔

اب ذیل میں مولانا عبدالواحد غزنوی کے چند وہ مکتوبات ملاحظہ فرمایے جو انھوں نے مختلف اوقات میں میاں عبداللہ ٹھیکے دار مرحوم کے نام لکھے۔ میاں صاحب کو وہ ''بھائی جان'' کے الفاظ سے خطاب کرتے ہیں:

پہلا مکتوب:

اس خط میں مولانا نے کئی باتیں مختصر الفاظ میں بیان کی ہیں۔

☆...... ایک بات غلاف کعبہ کی تیاری کے متعلق ہے۔

☆...... دوسری بات مکہ مکرمہ میں سڑکوں اور عمارتوں کی تعمیر کے لیے آدمی بھیجنے سے تعلق رکھتی ہے۔

☆...... تیسری بات وہاں ڈاکٹر اور دائیاں بھیجنے کے بارے میں ہے۔

☆...... چوتھی بات ہے جماعت اہل حدیث کی تنظیم کے سلسلے میں۔

یہ پوسٹ کارڈ ہے۔ تاریخ پڑھی نہیں جاتی۔ کارڈ میاں عبداللہ ٹھیکے دار کے نام لکھا گیا ہے۔ پتا اس طرح لکھا ہے: ''ضلع منٹگمری، تحصیل پاکپتن، ڈاکخانہ ماچھی سنگھ والا، معرفت دفتر نہر عبداللہ ٹھیکے دار کو ملے۔''

میاں عبداللہ مرحوم نہروں کی کھدائی وغیرہ کے سرکاری ٹھیکے دار تھے اور اس سلسلے میں انھیں مختلف

مقامات میں جانا اور قیام کرنا پڑتا تھا۔ کچھ عرصہ وہ کسی نہر کی کھدائی سے متعلق پاک پٹن کے قریب مقیم رہے۔ اس لیے یہ خط اور بعض دیگر خطوط انھیں اسی پتے پر بھیجے گئے۔

معلوم ہوتا ہے یہ ۱۹۲۶ء کے لگ بھگ کا خط ہے جب کہ سلطان عبدالعزیز (ابن سعود) نے حجاز فتح کیا تھا اور انھوں نے وہاں سڑکوں اور اہم سرکاری عمارتوں کی تعمیر کے لیے مولانا عبدالواحد غزنوی کی معرفت پنجاب سے کچھ لوگوں کو مکہ مکرمہ بلایا تھا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ مولانا پر سلطان ممدوح کو بہت اعتماد تھا۔ مولانا کی اردو بڑی دلچسپ ہے اور طرزِ املا بھی ایسا ہی ہے۔ یہ کئی خطوط ہیں۔

پہلا خط ملاحظہ فرمایئے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحمٰن

بھائی جان تم کو اللہ عزوجل اپنے نظرِ رحمت میں رکھ کر توفیقِ مرضیاتِ خود مرحمت کرے۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اسماعیل جان سے کب ایسے کام ہو سکتے ہیں۔ [1] اللہ عزوجل جس کے ہاتھ میں آسمانوں اور زمین کے خزائن ہیں ﴿وَلِلَّهِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ﴾ وہی دست گیری فرماوے آمین۔ میں نے عبدالغفار جان کو بلایا تھا۔ کل سمیت عبدالقدوس، دو اور لڑکوں کے آیا۔ میں نے بایں طور کہا کہ میں نے تمھارے والد کو لکھا ہے کہ تم مکہ میں جا کر بمع کام ٹھیکہ وغیرہ کرنا اختیار کر لو۔ وہاں سڑکوں کا کام اب شروع ہو گیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ تم عبدالغفار جان صاحب کو لکھ کر سمجھا دو۔ میں نے بلایا۔ کہا کہ انھوں نے مجھ کو علاحدہ کر دیا۔ میں نے کہا تم نے کوئی غلطی کی ہو گی، جس کے سبب سے انھوں نے علاحدہ کر دیا۔ عبدالقدوس نے کہا بہت خرچ کر چکے۔ اچار سے بھی کھایا کہ کم خرچ کر سکیں۔ میں نے سمجھا دیا کہ قرضوں کا یہ حال ہے تو پھر اتنا زیادہ خرچ کس قدر برا کام ہے۔ میں نے سمجھایا کہ میں ان کو کہوں گا۔

ہم نے لکھا کہ جس طرح ان کی مرضی ہو، جس طرح وہ حکم فرماویں۔ کل ظہر کے بعد آئے اور چلے گئے۔

اسماعیل کشمیر گیا تھا سرکاری کام کے لیے، غلاف بیت اللہ کے واسطے مصالح وغیرہ جمع کرنے کو۔ سنتا ہوں کہ سلطان صاحب ایدہ اللہ چاہتے ہیں کہ مکہ میں کارخانہ غلاف بُننے کا تیار ہو جاوے۔

ڈاکٹروں کا حکم آیا تھا۔ دائیوں کا حکم آیا تھا۔ باغبانوں کا حکم آیا تھا۔ تو یہ پہنچ گئے اور پہنچ رہے ہیں۔ سڑکوں کے واسطے تجویز کر رہے ہیں۔ عرفات تک سڑک تیار ہو چکی ہے۔ جدہ، مدینہ تک سڑک بنے گی۔ ہذا والسلام

رُپیہ دیو گے تو کب تک فک کراؤ گے۔ آپ مدرسہ کے واسطے دعا کرو کہ اللہ عزوجل اللہ دے اپنی

---

[1] اسماعیل جان سے مراد خود ان کے بیٹے مولانا اسماعیل غزنوی ہیں۔

طرف سے۔

پرسوں حافظ عبداللہ روپڑ والا و مولوی اسماعیل گوجرانوالہ میرے پاس آئے کہ ہم چند شہروں والے آپس میں اتفاق کر لیں اور ایک امیر مقرر کر لیں اور انتظام مشورہ سے کر لیا کریں۔ تم امرتسر جاؤ، اپنے خاندان، اپنی جماعت سے منظور کروا کر ہم کو تاریخ بتاؤ تا کہ ہم جمع ہو کر انتظام کے واسطے قواعد بنا لیں۔ میں نے تو اتفاق کر لیا۔ لیکن ہمارے خاندان اور جماعت واللہ عالم نہ عبدالغفور جان نے اور نہ احمد علی جان نے اور یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کس کو امیر ٹھہراویں گے اور کیا انتظام کریں گے۔ آپ کیا رائے، کیا مشورہ دیتے ہیں۔ میرے فہم میں آپ عبداللہ صاحب، سید محمد شریف گھڑیالا والا اس میں ضرور حاضر ہوں۔

والسلام، لاہور

دعا گو عبدالواحد بن عبداللہ الغزنوی [1]

دوسرا مکتوب:

یہ دوسرا خط ہے جو مولانا نے ۲۴- اپریل ۱۹۲۸ء کو میاں عبداللہ ٹھیکے دار کے نام بھیجا اور انھیں ۲۶ اپریل کو ملا۔ پتا یہ لکھا ہے: ضلع منٹگمری، تحصیل پاکپتن، ڈاک خانہ ماچھی سنگھ والا، دفتر نہر، عبداللہ ٹھیکے دار کو ملے۔

بھائی جان! اللہ عزوجل ہم کو اپنے ہی نظر رحمت میں رکھ کر توفیقِ مرضیاتِ خود کر دے۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

انگریزی ماہ کے اخیر میں جانا کہتے ہیں۔

---

[1] اس مکتوبِ گرامی میں مولانا عبدالواحد غزنوی نے پانچ حضرات کے نام تحریر فرمائے ہیں۔ وہ ہیں حافظ عبداللہ روپڑی، مولانا محمد اسماعیل سلفی (گوجراں والا)، حضرت سید محمد شریف شاہ گھڑیالوی، مولانا احمد علی اور مولانا عبدالغفور۔

حافظ عبداللہ روپڑی جلیل القدر عالم تھے۔ انھوں نے حضرت سید عبدالجبار غزنوی اور دیگر متعدد حضرات سے تعلیم حاصل کی۔ ۲۰- اگست ۱۹۶۴ء کو وفات پائی۔ ''روپڑی علمائے حدیث'' کے نام سے ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے، جس میں اس خاندان کے علمائے کرام کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان حضرات کی تصنیفی، تدریسی، خطابتی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ناظم اعلیٰ بھی رہے اور امیر بھی۔ ۲۰ فروری ۱۹۶۸ء کو حضرت مرحوم کا انتقال ہوا۔ اس خاک نشین نے اپنی ایک کتاب ''نقوشِ عظمت رفتہ'' میں ان پر طویل مضمون لکھا ہے۔ وہ بہت بڑے مصنف اور خطیب تھے۔

سید محمد شریف گھڑیالوی نہایت متقی عالم دین تھے۔ کچھ عرصہ انجمن اہل حدیث پنجاب کے منصب امارت پر فائز رہے۔ ۲۵ مئی ۱۹۴۴ کو فوت ہوئے (تفصیل کے لیے دیکھیے راقم کی کتاب ''کاروانِ سلف'')

مولانا احمد علی غزنوی رحمہ اللہ، مولانا عبدالواحد غزنوی کے بھائی تھے۔ ان کے حالات کا علم نہیں ہو سکا۔ مولانا عبدالغفور غزنوی مرحوم و مغفور، حضرت مولانا عبدالواحد کے بھتیجے تھے۔ ۲۸- جون ۱۹۳۵ء کو رحلت فرمائی۔ (دیکھیے راقم کی کتاب ''گلستان حدیث'')

اخباروں میں تاریخ روانگی بتائی ہے۔ یا اللہ مجھ کو تو وہ بھی یاد نہیں۔

یا اللہ مجھ کو تو بعض خیر خواہ منع کرتے ہیں اور میں یا ارحم الراحمین خیر وشر کو نہیں جانتا۔ سو یا حی یا قیوم میں سوائے اس کے کہ اپنے آپ کو تیرے ہی سپرد کر رکھا ہے۔ وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ سو الھا ارحم الراحمینا تو ہی میری سفید ریش وضعیفی و عمر خوردگی و عیالداری وغیرہ تعلقات پر نظر رحمت فرما کر مجھ سے وہی کام کرایا کرو۔ اور اسی پر مجھ کو خاتمہ نصیب کردو جو تیرے ہی رضا کا موجب ہو اور گناہوں کا کفارہ ہو۔ الہ الحق آمین۔ آپ بھی اپنے مشورہ سے مطلع کریں اور دعا کریں۔ اللہ عزوجل اپنے ہی رضا کی توفیق مرحمت کردے۔

میں امرتسر گیا تھا، لہذا جواب میں دیری ہوگئی۔ معاف کردیں۔

...... کا کام بہت ہی نرم پڑ گیا ہے۔ اللہ ہی رحم فرما کر ......

کے مطابق اس کو قائم رکھیو۔ الہ الحق امین۔ عبدالواحد عفی عنہ

لاہور منگل

حضرت الامام عبدالواحد غزنوی رحمہ اللہ کا اصل مکتوب مولانا عارف جاوید محمدی (کویت) کے پاس ہے جو میاں عبداللہ ٹھیکے دار گوندلوی رحمہ اللہ کے نام ہے۔ خط کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے حضرت کا سفر حج کا ارادہ تھا۔ اس سے قبل ۱۹۲۶ء میں حج پر گئے تھے۔ خط کے بعض الفاظ پڑھے نہیں گئے۔ وہاں نقطے لگا دیے ہیں۔

تیسرا مکتوب:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بھائی جاں! اللہ عزوجل اپنی ہی عزت کی برکات کے ساتھ تم کو اور ہم کو اور تمام اسلام اور مسلمانوں کو عزت دارین مرحمت فرما کر بتوفیقِ مرضیاتِ خود عنایت کردے۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اسماعیل جان کشمیر گیا۔ مجھ کو تمھارے آپس کی باتوں کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔ اگر ہوتی تو اس کو تاکید کرتا۔ حرمین شریفین (شرفھما اللہ و کرمھما) میں آپ جیسے کارکن اور مخلصین کی ضرورت شدید ہے۔ آگے تم استخارے کرتے جاؤ۔ وہ نہ بھیجے تو میں بھیجنے کے لیے ان شاء اللہ تعالیٰ موجود ہوں۔ میں سلطان صاحب کو لکھا کرتا ہوں اور وہ جواب دیا کرتے ہیں۔ چند اشخاص بھیج چکا ہوں اور وہ وہاں کام کر رہے ہیں۔

اب کے دفعہ سلطان صاحب (ایدہ اللہ تعالیٰ بروح القدس) نے میری نسبت چند موقعوں پر فرمایا کہ وہ تو میرے والد ہیں۔ کل ہی ان کا ایک خط آیا کہ میں آپ لوگوں سے بہت خوش ہوں۔ میری دانست میں تم

عبدالغفار جان کو بھی ہمراہ لے جاؤ۔ ہذا والسلام

لاہور۔ ہفتہ　　　　دعا گو عبدالواحد عفا اللہ عنہ

اس خط سے واضح ہوتا ہے کہ سلطان عبدالعزیز (ابن سعود) اور مولانا عبدالواحد غزنوی کے درمیان خط کتابت کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ افسوس ہے یہ خطوط محفوظ نہیں رہے۔ یہ چند خطوط جو ملے ہیں اور خوانندگانِ محترم کی خدمت میں پیش کیے جا رہے ہیں، بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے مولانا عارف جاوید محمدی کو کہ انھیں کہیں سے یہ خطوط میسر آ گئے، ورنہ مولانا عبدالواحد غزنوی کے اخلاف میں سے کسی کے پاس اس قسم کی کوئی چیز نہیں ہے۔

چوتھا مکتوب:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بھائی جان! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔

تمھارا خط مکہ شریف کو لے گیا تھا اور سامنے رکھتا تھا اور ہر وقت دعا کرتا تھا اور اب بھی کرتا رہتا ہوں۔ تم اپنا حال لکھو۔ آپ کب ملیں گے۔ میں ان شاء اللہ تعالیٰ پچھلے ماہ سے آیا ہوں۔ مدینہ منورہ میں نہ جا سکا۔ کمزور بہت ہو گیا تھا۔ اونٹ پر سفر کرنے کا تاب نہ لا سکا۔ وہاں خوب امن ہے۔ سلطان صاحب اعلیٰ دماغ کا انسان ہے۔ نہایت حلیم ہے۔ محمد علی شوکت علی وہاں ہیں۔ لوگوں کو برانگیختہ کرتے تھے۔ سلطان صاحب کو خبریں ملتی ہیں۔ لکن فرماتے تھے۔ کچھ فکر نہیں۔ سب چلے جاویں گے۔ کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔

الحمد للہ رب العالمین سلطان صاحب ہم سے محبت کرتے تھے بلکہ مجھ کو تو بیعت لینے کی بھی اجازت فرمائی۔ زمیندار اخبار، توحید اور سنت کی امداد اور اہل توحید اہل حدیث میں یکتا اخبار ہے۔ اس میں ہمارے حجاز اور موافقین اور مخالفین کے حالات درج ہوتے ہیں اور اعلیٰ جوابِ مخالفین۔ لہٰذا جماعتِ مخالفان کوشش میں ہیں کہ اس کو مت خریدو، تاکہ بند ہو جاوے۔ آپ اس کو خریدیں اور دوسروں کو بھی ترغیب دیا کریں۔

سب دوستوں کو سلام و دعا برسد۔　　　　عبدالواحد غزنوی لاہور

مولانا عبدالواحد غزنوی کا یہ خط بھی واضح ہے۔ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی وغیرہ انہدام قبہ جات کے سلسلے میں سلطان عبدالعزیز (ابن سعود) کی شدید مخالفت کر رہے تھے، جب کہ مولانا ظفر علی خاں سلطان کے اس اقدام کے حامی تھے اور وہ اپنے اخبار ''زمیندار'' میں سلطان کی حمایت میں مضامین بھی لکھتے تھے اور نظمیں بھی۔ اس خط میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پانچواں مکتوب:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بھائی جان! اللہ عزوجل تم کو اپنے حفظِ رحمت میں رکھ کر توفیقِ مرضیاتِ خود مرحمت کر دے۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تم نے برائے عیادت خط بھیجا۔ جزاک اللہ فی الدارین خیراً

میں الحمد للہ رب العالمین اب اچھا ہوں۔ دست آتے ہیں۔ اللہ عزوجل شفا دیوے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ آپ دعا کریں۔

اسماعیل جان آیا نہیں۔ لاہور آوے گا تو ان شاء اللہ عزیز کے بارے میں دریافت کروں گا۔

وہاں کے احباب متعلقان کو سلام و دعا کہہ دیں۔

ہذا والسلام

الفقیر الی اللہ الحمید الغنی عبدالواحد بن عبداللہ الغزنوی.

لاہور یوم السبت

چھٹا مکتوب:

یہ مولانا عبدالواحد غزنوی کے فرزندِ گرامی عبدالحمید غزنوی کا مکتوب ہے جس میں انھوں نے میاں عبداللہ ٹھیکے دار کو مولانا کی بیماری کے متعلق تحریر کیا۔ اس پر کوئی تاریخ مرقوم نہیں ہے البتہ پتا وہی پاک پٹن کا ہے جو پہلے خطوط کا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم عبداللہ ٹھیکے دار صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

والد صاحب عرصہ پندرہ یوم سے سخت بیمار ہیں۔ موقع دیکھ کر آپ کا خط سنا دیا جائے گا۔ سخت کمزور ہو گئے ہیں۔ اٹھنے بیٹھنے کی بالکل ہمت نہیں ہے۔ اٹھا کر اوپر نیچے لے جاتے ہیں۔ الغرض خود اٹھ نہیں سکتے۔ حکیم فقیر محمد کا علاج شروع ہے۔ بخار بدستور ہو جاتا ہے۔ اسہال کی بھی بدستور شکایت ہے۔ کھانسی بھی ہے۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ والد محترم کو شفا دے اور ہمارے سروں پر ان کا سایہ ہمیشہ کے لیے قائم رکھے۔

المرسل عبدالحمید غزنوی پسر مولانا عبدالواحد غزنوی۔ از لاہور

ساتواں مکتوب:

اب ملاحظہ ہو میاں عبداللہ صاحب ٹھیکے دار کے نام مولانا عبدالواحد غزنوی کے صاحب زادے مولانا اسماعیل غزنوی کا مکتوب جو انھوں نے اپنے لیٹر پیڈ پر ۱۰۔ اکتوبر ۱۹۲۶ء کو امرتسر سے تحریر فرمایا۔ اس مکتوب کا تعلق میاں صاحب ممدوح کے بھتیجے عبداللطیف کی ملازمت سے ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عمِ محترم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں اس سے پہلے عریضۂ نیاز ارسال کر چکا ہوں۔ شاید ملا نہیں۔ عبداللطیف حضرت سلطان صاحب کے ساتھ ملازم ہو کر نجد چلا گیا۔ [1] افسوس ہے اسے کام نہیں آتا تھا۔ دعا فرمائیں کہ کامیاب واپس آئے۔ میں نے چند ماہ اس کو عمداً بیکار رکھا۔ آپ اس کی طرف سے مطمئن رہیں۔ میں آپ کو خط لکھنا اپنی عزت سمجھتا ہوں۔ آپ میرے بزرگ ہیں۔ بعض وقت طبیعت کی خرابی یا کثرتِ مشاغل کی وجہ سے دیر ہو جاتی ہے، جس پر میں نادم ہوں۔ میری صحت خراب ہے، دعا فرمائیں۔ کارِ لائق سے یاد فرمائیں۔

والسلام

آپ کا

اسماعیل غزنوی

میاں عبداللہ ٹھیکے دار مرحوم کے نام یہ سات مکتوبات ہیں، جن میں پانچ حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی کے ہیں اور دو ان کے فرزندان گرامی عبدالحمید اور مولانا اسماعیل غزنوی کے۔ یہ تمام مکتوبات کویت سے اس فقیر کو مولانا عارف جاوید محمدی کی طرف سے موصول ہوئے۔ معلوم نہیں کس کس کے نام اور کتنے مکاتیب ہوں گے، جو ضائع ہو گئے۔ یہ بھی علم نہیں کہ میاں عبداللہ کے نام انھوں نے کتنے مکتوب ارسال کیے جو دست برد زمانہ کی نذر ہو گئے۔

مولانا عارف جاوید محمدی کو اللہ تعالیٰ نے اس خصوص سے نوازا ہے کہ وہ علما کے تراجم و حالات سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں، ان کے سلسلۂ اسناد سے آگاہی کا بھی انھیں بے حد شوق ہے اور ان کے مکتوبات جمع کرنا اور انھیں محفوظ رکھنا بھی ان کے نزدیک ضروری ہے۔ اس قسم کا اچھا خاصا ذخیرہ ان کے کتب خانے (کویت) میں جمع ہے۔

[1] ''حضرت سلطان صاحب'' سے سلطان عبدالعزیز ابن سعود مرحوم و مغفور مراد ہیں۔

وفات:

حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی برصغیر کے عظیم خاندان کے عظیم فرد تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت سے کمالات سے نوازا تھا۔ ان کے متعلق جو کچھ معلوم ہوا، قارئین کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ انھوں نے ۲۹- دسمبر ۱۹۳۰ (۲۸- رجب ۱۳۴۹ھ) کو سفرِ آخرت اختیار فرمایا۔

اللھم اغفرلہ و ارحمہ و ادخلہ جنت الفردوس .

نرینہ اولاد:

حضرت مرحوم کی نرینہ اولاد چار بیٹے تھے، جن کے نام یہ تھے: مولانا اسماعیل غزنوی، مولانا عبدالحمید، مولانا محمد ابراہیم اور مولانا عبدالوالی۔ ان میں سے مولانا اسماعیل غزنوی کے متعلق جو کچھ مجھے معلوم تھا وہ اپنی کتاب ''گلستانِ حدیث'' میں بیان کر دیا گیا۔ انھوں نے ۱۳- جون ۱۹۶۰ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ ان کے دوسرے بھائیوں کے بارے میں کسی بات کا علم نہیں ہو سکا۔

قاضی ابواسماعیل یوسف حسین خان پوری

(وفات یکم جون ۱۹۳۳ء)

قاضی محمد حسن خان پوری کے تین بیٹے تھے، بڑے قاضی عبدالاحد خان پوری۔ ان سے چھوٹے قاضی محمد خان پوری اور سب سے چھوٹے اور تیسرے یہی زیب عنوان قاضی ابواسماعیل یوسف حسین خان پوری۔ تینوں کا شمار اپنے دور کے جلیل المرتبت علمائے کرام میں ہوتا تھا۔ قاضی محمد خان پوری کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ اب قاضی ابواسماعیل یوسف حسین کے واقعاتِ حیات بیان کیے جاتے ہیں ان کا شمار بھی قاضی محمد صاحب کی طرح حضرت میاں صاحب کے تلامذہ میں ہوتا ہے۔ قاضی عبدالاحد خان پوری کا تذکرہ آئندہ صفحات میں آئے گا۔ یہ حضرت میاں صاحب کے تلمیذ نہیں تھے۔

ولادت اور تعلیم:

قاضی یوسف حسین خان پوری جمعۃ المبارک کے دن ۲۸ جمادی الاخری ۱۲۸۵ھ (۱۶- اکتوبر ۱۸۶۸ء) کو اپنے آبائی قصبے خان پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد اور بڑے بھائیوں سے حاصل کی۔ نہایت ذہین تھے۔ چودہ برس کی عمر میں علوم آلیہ اپنے والد اور بھائیوں سے حاصل کر لیے تھے۔ ان کی قابلیت اور ذہانت کا شہرہ کم عمری ہی میں اہل علم کے حلقوں میں پھیل گیا تھا۔ ان کے زمانۂ طفولیت میں ایک بزرگ حافظ محمد رمضان پشاوری خان پور تشریف لائے۔ انھوں نے بہ صورتِ امتحان ان سے چند باتیں پوچھیں تو ان کے جواب سے خوش ہو کر فرمایا کہ ایک وقت آئے گا، ان شاء اللہ یہ بچہ علم و تحقیق کی رو سے یکتائے زمانہ ہو گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ان کے سوانح نگار قاضی عبداللہ ایم اے ایل ایل بی علیگ لکھتے ہیں کہ ان کی ”عربی کتاب اتمام الخشوع بوضع الیمین علی الشمال بعد الرکوع حافظ صاحب کے پاس پہنچی اور راقم الحروف نے حافظ صاحب کو پڑھ کر سنائی تو فرمایا اس میں شک نہیں کہ یوسف حسین مجتہد ہے۔ اور فرمایا اس کے آثار بچپن میں ہی ظاہر ہو گئے تھے۔ ❶

قاضی محمد حسن خان پوری کے تلمیذ مولوی امام الدین بیان کرتے ہیں کہ مسجد پیراں والی میں جہاں قاضی محمد حسن مرحوم درس دیا کرتے تھے، شمال سے جنوب تک مختلف موضوعات کی کتابیں ایک قطار میں پڑی ہوتی

❶ تذکرہ علمائے خان پور: ص ۱۹۴۔

تھیں، قاضی یوسف حسین ابھی کم عمر تھے کہ ان کتابوں کو پڑھتے اور اپنی دلچسپی کے مسائل ان سے تلاش کرتے رہتے تھے۔

جماعت مجاہدین میں:

۲۰ شعبان ۱۳۰۱ھ کو (پیر کے دن) جب کہ ان کی عمر سولہ سال کی تھی، کسی کو اطلاع دیے بغیر گھر سے نکلے اور سرحد پار کی جماعت مجاہدین کے مرکز مولانا عبدالکریم صادق پوری کے پاس پہنچ گئے اور ان سے سنن نسائی پڑھی اور بعض دیگر کتب حدیث کے کچھ حصے پڑھے۔ گھر کے لوگ نہایت پریشان۔ کچھ پتا نہیں کہ کدھر گئے۔ بڑے بھائیوں نے ادھر ادھر سے تلاش کیا لیکن کوئی سراغ نہ ملا۔ قاضی عبدالاحد کشمیر کو روانہ ہوئے اور سری نگر تک گئے لیکن بھائی کی تلاش میں ناکام رہے۔ دوسری طرف قاضی محمد غیر علاقہ میں داخل ہوئے اور مرکزِ مجاہدین میں پہنچے، وہاں انھیں جا پکڑا۔ واپس گھر جانے کو کہا۔ اس وقت تو نہ گئے۔ پھر کچھ عرصے کے بعد گھر پہنچ گئے۔

دورانِ سفر کا ایک واقعہ:

جب وہ گھر سے نکل کر جماعت مجاہدین کے مرکز کی طرف جا رہے تھے تو راستے میں چند روز ایک گاؤں کی مسجد میں قیام کیا۔ ایک دن مسجد میں ایک بڑی ڈاڑھی والا طالب علم فقہ کی کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ انھوں نے کہا تم نے یہ عبارت غلط پڑھی ہے۔ وہ حیران ہوا کہ ایک بے ریش لڑکا اس کی غلطی نکال رہا ہے۔ دو تین دفعہ اسے غلطی پر متنبہ کیا تو اس نے درخواست کی کہ مجھے اس کتاب کا ایک ورق پڑھا دو۔ انھوں نے پڑھا دیا تو اس نے پوچھا تم نے یہ کتاب پڑھی ہے؟ جواب دیا نہیں۔ وہ حیران ہوا کہ اس نے یہ کتاب پڑھی نہیں اور مجھے پڑھا رہا ہے۔

قاضی صاحب بیان کرتے ہیں کہ پھر اس طالب علم نے علم نحو کی ایک کتاب نکالی۔ پڑھنے لگا تو غلط پڑھا، میں نے اس پر بھی اسے ٹوکا تو کہا اس کتاب کا بھی ایک ورق مجھے پڑھا دو۔ میں نے پڑھایا تو پوچھا تم نے یہ کتاب پڑھی ہے؟ میں نے نفی میں جواب دیا تو وہ متعجب ہوا کہ یہ کتاب بھی اس نے نہیں پڑھی، لیکن آسانی سے پڑھا رہا ہے۔

قاضی صاحب ممدوح ان لوگوں کے ساتھ کبھی عربی میں بات کرتے، کبھی اردو میں اور کبھی فارسی میں تاکہ انھیں پتا نہ چلے کہ یہ کس ملک کے رہنے والے ہیں۔ اب گاؤں میں مشہور ہو گیا کہ یہاں ایک عجیب لڑکا آیا ہے، جو عربی، فارسی، اردو تینوں زبانیں جانتا ہے اور بغیر پڑھے ہر کتاب پڑھ بھی سکتا ہے اور پڑھا بھی سکتا ہے۔ معلوم نہیں وہ کس ملک سے تعلق رکھتا ہے۔ اب وہ انھیں ایک خان کے حجرے میں لے گئے اور بڑی

عزت سے چارپائی پر بٹھایا۔ ایک عالم دین نے کئی کتابیں ان کے سامنے رکھیں۔ جس کتاب کے کسی مقام سے انھوں نے کچھ پوچھا، انھوں نے تفصیل سے اس مقام کا مطلب بیان کر دیا۔ یہ بھی بتایا کہ یہ کتاب میں نے نہیں پڑھی۔ اس سوال و جواب کے بعد ان لوگوں نے ان کی بڑی خاطر مدارات کی اور نہایت تکریم کا برتاؤ کیا۔

رفع سبابہ کا واقعہ:

قاضی یوسف حسین کو اسی گاؤں میں با جماعت نماز پڑھتے وقت تشہد میں رفعِ سبابہ کا واقعہ بھی پیش آیا۔ اس علاقے کے اکثر لوگ حالت تشہد میں انگشت اٹھانے کو بہت بڑا گناہ قرار دیتے ہیں۔ بعض مقامات پر اس کی پاداش میں لوگوں کی انگلیاں توڑی بھی گئیں۔ ایک بہت بڑے حنفی عالم ملا علی قاری نے ''تزیین العبارہ لتحسین الاشارہ'' کے نام سے ایک رسالہ لکھا ہے، جس میں ثابت کیا ہے کہ تشہد میں انگشت شہادت اٹھانی چاہیے یعنی رفع سبابہ کرنا چاہیے۔ یہ نبی ﷺ کی سنت ہے، لیکن علاقہ خیبر پختون خوا کے اکثر لوگ رفع سبابہ کے سخت مخالف ہیں۔ بہر حال عرض یہ کرنا ہے کہ قاضی یوسف حسین نے حالتِ تشہد میں رفع سبابہ کیا تو ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے نمازی نے ان کی انگلی دبا دی۔ اس نے انگلی اٹھائی تو قاضی صاحب نے پھر رفع سبابہ کیا لیکن اس نے پھر ان کی انگلی دبا دی۔ اس طرح دو تین مرتبہ ہوا۔ نماز کے بعد بات امام صاحب کے علم میں لائی گئی تو انھوں نے انگلی دبانے والے شخص کو ڈانٹا اور کہا تم نے اس کی انگلی دبائی، تمھاری نماز نہیں ہوئی۔ دوبارہ نماز پڑھو۔ جس کی تم نے انگلی دبائی، یہ مسافر ہے، معلوم نہیں کس ملک اور کس فقہی مسلک سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ مجتہد ہے اور اسے آزادی ہے، جس طرح چاہے نماز پڑھے۔ کوئی شخص اس سے تعرض نہ کرے۔

قاضی صاحب ممدوح فرماتے ہیں میں نے اپنی زندگی میں عمل بالسنہ کبھی ترک نہیں کیا۔

ایک خواب اور اس کی تعبیر:

علاقہ غیر یا مرکز مجاہدین سے قاضی صاحب دو سال بعد اواخر ۱۳۰۲ھ یا ابتدائے ۱۳۰۳ھ میں واپس وطن آئے اور دو سال یہاں ٹھہرے۔ ۱۳۰۵ھ کے ماہِ ذیقعدہ یا ذی الحجہ میں وہ خان پور کی مسجد پیراں والی میں سوئے ہوئے تھے کہ خواب میں دو جلیل القدر علما کو دیکھا اور ان سے کچھ فیض بھی حاصل کیا۔ اس کی تعبیر انھوں نے یہ کی کہ وہ اپنے عہد کے دو رفیع المرتبت علما سے اخذِ فیض کریں گے۔ ان میں ایک حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی ہوں گے اور دوسرے کوئی اور۔

اب انھوں نے خان پور سے دہلی جانے کا عزم کیا۔ بقول ان کے دہلی خان پور سے پانچ سو میل کے فاصلے پر ہے۔ وہ گھر سے پیدل چل پڑے اور محرم ۱۳۰۶ھ میں دہلی پہنچ گئے۔ وہاں حضرت میاں سید نذیر حسین صاحب سے علم تفسیر اور علم حدیث پڑھا اور ۱۳۰۷ھ میں سند و اجازہ سے مفتخر ہوئے۔ اس وقت مولانا

عبدالغفور غزنوی ان کے ہم سبق تھے۔ انھوں نے بھی ان کے ساتھ حضرت میاں صاحب سے سندِ حدیث لی۔

اسی سال قاضی صاحب نے مولانا محمد شاہ جہان پوری سے بھی سندِ حدیث لی اور پھر ۱۳۰۸ھ میں علامہ حسین بن محسن یمانی سے اجازہ حاصل کیا۔ اس طرح ان کے خواب کی تعبیر صحیح ثابت ہوئی۔

سفرِ دہلی کے دوران کا ایک واقعہ:

قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ خان پور سے دہلی جاتے ہوئے ایک بڑا نشانِ الٰہی ظہور پذیر ہوا۔ وہ دہلی سے تھوڑے فاصلے پر ہی تھے کہ سحری کے وقت پیٹ میں اتنا سخت درد اٹھا کہ ہلنے جلنے کی سکت نہ رہی۔ اس وقت انھیں قرآن کا حکم ﴿وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ﴾ یاد آیا تو لیٹے لیٹے تیمم کیا اور اشارے سے دو رکعت نماز ادا کی۔ نماز کے بعد قدرے افاقہ محسوس ہوا۔ دوبارہ دو رکعت نماز پڑھی۔ تیسری یا چوتھی دفعہ پڑھی تو درد بالکل ختم ہو گیا۔ ❶

دہلی کا یہ سفر قاضی صاحب نے (جیسا کہ عرض کیا گیا) پا پیادہ کیا تھا۔ اس وقت آبادیوں کا یہ حال نہ تھا جو اب ہے۔ دور دور تک نہ گاؤں نظر آتے تھے، نہ انسان۔ کبھی کہیں سے بھنے ہوئے دانے لے لیے اور اس سے گزارا کرتے۔ کبھی جنگل میں درختوں کے پتے کھانا پڑتے۔ کسی وقت اور کسی حال میں، ہمت نہیں ہاری اور چلتے چلتے دہلی پہنچ گئے۔

مولانا محمد حسین بٹالوی سے ملاقات:

جس زمانے میں قاضی یوسف حسین دہلی میں حضرت میاں صاحب سے اکتسابِ علم کر رہے تھے، اس زمانے میں ایک دن مولانا محمد حسین بٹالوی میاں صاحب کے مدرسے میں تشریف لائے۔ نماز میں مقتدیوں کے ایک دوسرے سے پاؤں ملانے کا ذکر آیا تو مولانا بٹالوی نے کہا انسان بہ شکل مثلث ہے، اس لیے مقتدیوں کے آپس میں پاؤں نہیں مل سکتے۔ قاضی صاحب نے کہا: آپ مولانا محمد حسین بٹالوی ہیں؟ یہ آپ نے کیا کہہ دیا؟

ذرہ اٹھیے! چند اور حاضرینِ مجلس کو بھی اٹھا لیا اور صف میں کھڑے کر کے عملاً سب کے پاؤں ملا دیے۔

کہا ''لیجیے جناب یہ ناممکن عمل نہیں۔ مجھے آپ جیسے عالم سے یہ بات سن کر سخت تعجب ہوا۔''

مولانا بٹالوی نے جواب میں کوئی بات نہیں کی۔

جب وہ تشریف لے گئے تو قاضی صاحب نے حضرت میاں صاحب سے عرض کیا:

بٹالوی صاحب سے جو معاملہ ہوا، اس میں میں نے کوئی غلطی تو نہیں کی اور جو کچھ کہا، وہ نامناسب تو نہ تھا؟

❶ تذکرہ علمائے خان پور: ص ۱۹۸ بحوالہ اتمام الخشوع (عربی) ص ۲۔

میاں صاحب نے فرمایا: نہیں تو، تم نے اسے خوب لیا۔

ڈپٹی نذیر احمد سے استفادہ:

قیامِ دہلی کے زمانے میں قاضی یوسف حسین نے ڈپٹی نذیر احمد سے بھی کچھ استفادہ کیا۔ وہ ڈپٹی صاحب کی بہت تعریف کرتے تھے اور فرماتے: ''طلبا ڈپٹی صاحب سے مشکل سے مشکل شعر کا مطلب دریافت کرتے۔ وہ اس میں ایک مشکل و مغلق مقام کی نشان دہی کر دیتے جس سے پورے شعر کا مطلب حل ہو جاتا۔ ان دنوں طالب علم ڈپٹی نذیر احمد کو پالکی میں بٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے۔''

بلاشبہ ڈپٹی نذیر احمد عربی کے بہت بڑے عالم تھے اور اللہ نے انھیں بڑی فراست سے نوازا تھا۔

ایک شیعہ مجتہد سے مناظرہ:

دہلی میں حضرت میاں صاحب سے حصولِ علم کے زمانے میں ایک مرتبہ قاضی صاحب کا ایک شیعہ مجتہد سے مناظرہ ہوا۔ مجتہد صاحب نے دورانِ مناظرہ میں ایک حدیث پڑھی۔ قاضی صاحب نے اس کا حوالہ پوچھا تو جواب دیا یہ حدیث مسند امام احمد میں ہے۔ قاضی صاحب فوراً میاں صاحب کے مدرسے سے مسند امام احمد لے آئے اور مجتہد سے کہا یہ ہے مسند امام احمد۔ اس سے یہ حدیث نکال لیے جس کا آپ نے حوالہ دیا ہے۔ کچھ دیر انھوں نے کتاب کی ورق گردانی کی لیکن حدیث نہ ملنا تھی نہ ملی۔ اس پر بات ختم ہو گئی اور مجلس برخاست ہو گئی۔ بعد ازاں شیعہ حضرات میاں صاحب کی مسجد میں آتے تو قاضی صاحب کی طرف انگلیوں سے اشارہ کر کے ایک دوسرے کو بتاتے کہ یہ شخص ہے جس نے ہمارے قبلہ و کعبہ کو بھری محفل میں شکست دی۔ ان کا مقصد دراصل قاضی صاحب کو تکلیف پہنچانا تھا لیکن اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اللہ نے ان کی ضرر رسانی سے قاضی صاحب کو محفوظ رکھا۔

ذریعہ معاش:

قاضی صاحب خوش نویس تھے۔ عربی، فارسی، اردو کا خط نہایت عمدہ تھا بلکہ انگریزی بھی خوب صورت اسلوب میں لکھتے تھے۔ قیامِ دہلی کے زمانے میں یہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔ فراخ حوصلہ اور دل کے سخی تھے۔ جو کچھ کماتے، ضرورت مندو اور دوستوں پر خرچ کر دیتے۔ دہلی کے کرزن پریس میں عرصہ دراز تک اردو کی کتابت ان کا مشغلہ رہا۔ قرآن مجید اور کتبِ حدیث کی تصحیح بھی کرتے رہے۔ صحیح بخاری کا ایک نسخہ جو مجتبائی پریس دہلی میں چھپا، انہی کا کتابت شدہ تھا۔ ان کے وطن خان پور میں وہاں کے راجگان کے گھر ایک معرّیٰ قرآن مجید ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود تھا۔

اعلام الموقعین (عربی) مطبوعہ انصاری پریس دہلی ان کے قلم اعجاز رقم کا بہترین نمونۂ کتابت ہے۔ یہ

بہت بڑا ہنر تھا جو اللہ کی مہربانی سے انھیں عطا ہوا تھا۔ ❶

وہ بے حد ذہین اور صاحبِ فراست عالم تھے اور متعدد اوصافِ حسنہ کا مجموعہ۔

ورودِ گنّور:

دہلی سے وہ صوبہ یوپی کے ایک شہر گنّور تشریف لے گئے۔ تذکرہ علمائے خان پور میں قاضی شمشاد علی گنّوری کی روایت سے مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی لکھتے ہیں: ''اوائل موسم گرما میں ایک اجنبی شخص مسجد میں داخل ہوا۔ لباس بالکل سادہ، سر پر چادر لپیٹے ہوئے، ہاتھ میں ببول کی سٹک، ارشاد علی صاحب نے جَو کی روٹی اور میتھی کا ساگ حاضر کیا۔ اس طرح تین روز یہ سلسلہ جاری رہا۔''

اس زمانے میں وہاں کی مسجد کے امام مولانا عبدالتواب غزنوی تھے۔ ان سے قاضی صاحب کی بعض مسائل میں بحث ہوئی۔ انھی دنوں وہاں مولانا حمید اللہ سراوی میرٹھی تشریف لائے۔ ان سے بھی قاضی صاحب کی گفتگو ہوئی۔ وہ مولانا حمید اللہ صاحب کے سامنے اس طرح ادب سے بیٹھے جس طرح شاگرد استاد کے سامنے بیٹھتا ہے۔ لیکن فرمایا مسائل میں بات دلیل سے ہوگی۔ بالآخر مولانا حمید اللہ صاحب نے گنّور کے لوگوں سے کہا کہ ان سے بحث نہ کرو، ان سے کچھ سیکھو۔

گنّور میں قاضی صاحب نے تقریباً بیس سال قیام کیا۔ اس اثنا میں ان سے کثیر تعداد میں لوگ مستفید ہوئے۔ پھر وہ اپنے وطن خان پور تشریف لے گئے۔ ان کے ساتھ وہاں کے ایک شخص حبیب بن ابی حبیب انصاری تعلیم حاصل کرنے کے لیے خان پور آئے۔

سہوان کی مسجد کا مقدمہ:

ہندوستان کے صوبہ یوپی میں سہوان ایک مشہور قصبہ ہے، جہاں بہت سے علمائے کرام پیدا ہوئے اور انھوں نے بے حد دینی خدمات سرانجام دیں۔ وہاں اہل حدیث کی ایک مسجد پر احناف نے قبضہ کرلیا۔ قاضی یوسف حسین صاحب وہاں پہنچ گئے۔ انھوں نے جمعۃ المبارک کی نماز کے موقعے پر بہت سے اہل حدیث جمع کیے اور انھیں ساتھ لے کر اس مقبوضہ مسجد میں چلے گئے۔ امام صاحب نے جب ولا الضالین کہا تو ان لوگوں نے بلند آواز سے آمین پکاری۔ یہ سن کر امام صاحب پر اتنی گھبراہٹ طاری ہوئی کہ وہ قراءت بھول گئے۔

اب عدالت میں مقدمہ شروع ہوگیا۔ مخالفین نے متعلقہ حکام سے کہا کہ صوبہ سرحد کے ایک شخص نے یہاں آ کر فساد برپا کر دیا ہے اور وہ مسلمانوں کو آپس میں لڑانا چاہتا ہے۔ اس کی تحقیق کے لیے سہوان کی انتظامیہ نے پولیس کی وساطت سے خان پور کی پولیس اور وہاں کے لوگوں سے قاضی صاحب کے چال چلن اور ان

❶ تذکرہ علمائے خان پور: ص ۲۰۱، ۲۰۲.

کے ذاتی اور خاندانی حالات دریافت کیے تو وہاں کی انتظامیہ، وہاں کی پولیس اور وہاں کے جدّی پشتی مالک راجوں نے لکھا کہ قاضی یوسف حسین ذاتی طور پر بھی اور خاندانی طور پر بھی اس قصبے اور علاقے میں بہت اچھی شہرت رکھتے ہیں اور سب کے نزدیک نہایت معزز ہیں۔ کئی پشتوں سے اس نواح کے لوگ ان کے آباواجداد کے عقیدت مند ہیں۔ اس خاندان کے تمام افراد علم و فضل اور زہد و تقویٰ میں اپنی مثال آپ ہیں۔

اس رپورٹ کے بعد ان کے متعلق سہوان کی انتظامیہ کے خیالات بالکل بدل گئے اور ان کی عزت بہت بڑھ گئی۔ مقدمہ چلا اور بالآخر مسجد اہل حدیث کو مل گئی۔

سفرِ عراق:

پھر حالات ایسے پیدا ہوئے کہ قاضی صاحب عراق تشریف لے گئے۔ عراق جاتے ہوئے جہاز میں ان کی کچھ رقم اور چند کتابیں چوری ہوگئیں۔ جب وہ بغداد پہنچے تو کوئی پیسا جیب میں نہ تھا۔ ایسا بھی ہوا تین تین دن کوئی چیز کھانے کو نہ ملی لیکن انھوں نے کسی سے سوال نہیں کیا۔ وہ بغداد کی اس بہت بڑی مسجد میں مقیم تھے جس کے متصل شیخ عبدالقادر جیلانی کی قبر ہے اور عام طور پر مسافر اسی مسجد میں ٹھہرتے تھے۔

ایک روز وہ مسجد کے ایک برآمدے میں بیٹھ گئے۔ کتابوں کا بستہ کھولا اور وقت گزارنے کے لیے کاغذ پر کچھ لکھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ایک شخص وہاں سے گزرا تو انھیں کچھ لکھتے دیکھ کر وہیں رک گیا۔ بولا میرے پاس کاغذ پر ایک وظیفہ لکھا ہوا ہے لیکن وہ کاغذ اب بہت بوسیدہ ہوگیا ہے۔ اگر مجھے وہ وظیفہ آپ نئے کاغذ پر لکھ دیں تو آپ کو میں دو آنے (عربی سکے کے) دوں گا۔ قاضی صاحب نے سوچا یہ اللہ تعالیٰ نے میرے کھانے کا انتظام فرمایا ہے۔ کہا وظیفہ لاؤ میں نئے کاغذ پر لکھ دوں گا۔ وظیفہ لکھ کر دیا تو اسے لکھائی بہت پسند آئی اور دو آنے کے بجائے چار آنے دیے اور گھر سے کھانا لا کر انھیں کھلایا۔

اس مسجد میں نماز پڑھنے کے فوراً بعد لوگ قبر کی طرف دوڑتے تھے، لیکن قاضی صاحب ایسا نہ کرتے، وہ اپنی جگہ بیٹھے رہتے۔ ایک شخص کئی دن سے انھیں دیکھ رہا تھا کہ یہ قبر کی طرف نہیں جاتے۔ ایک دن اس نے ان سے سوال کیا۔

آپ ابن عربی کو کیسا آدمی سمجھتے ہیں؟

جواب دیا: میری اس سے ملاقات نہیں ہوئی، اس لیے اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔

اس نے بہت اصرار کیا تو جلال میں آ گئے اور فرمایا بعض لوگ اس کی تکفیر کرتے ہیں، لیکن عدم ملاقات کی وجہ سے میں ذاتی طور پر اسے نہیں جانتا۔

اس نے کہا: میں آپ سے یہی معلوم کرنا چاہتا تھا۔

شخص تھے اور مجاہد فی سبیل اللہ تھے۔ یہ وہی مہدی سوڈانی تھے، جن سے لارڈ کچز نے (جو ایک عرصے تک ہندوستان کا کمانڈر ان چیف رہا تھا) جنگ کی تھی اور جب وہ شہید ہوئے تو اس نے ان کی میت کی انتہائی بے حرمتی کی تھی اور اسے جلا دیا تھا۔ پھر یہی لارڈ کچز جنگ عظیم میں جرمن آب دوزوں کے حملے سے سمندر میں غرق ہوا اور اس کی لاش بھی نہ ملی۔ علامہ اقبال نے عالم برزخ میں لارڈ کچز سے ایک بزرگ کا مکالمہ اس طرح لکھا ہے:

گفت اے کچز اگر داری خبر
انتقامِ خاک درویشے نگر
آسماں خاکِ ترا گورے نہ داد
مرقدے جز دریم شورے نہ داد

یعنی اس بزرگ نے عالم برزخ میں کچز کو مخاطب کر کے کہا: اے کچز! ایک درویش (مہدی سوڈانی) کی مٹی (نعش) کی بے حرمتی کا بدلہ دیکھو کہ آسمان نے تیری مٹی (نعش) کو زمین میں ایک قبر بھی نہ دی اور تمھیں آخری سونے کی جگہ سوائے شور دریا (نمکین سمندر) کے اور کوئی جگہ نہ ملی۔

صحاح ستہ کے ایک حافظ سے اجازۂ حدیث:

قیام بغداد کے زمانے میں قاضی یوسف حسین خان پوری کو ایک ایسے عالم سے بھی اجازۂ حدیث کا شرف حاصل ہوا جو پوری صحاح ستہ کے حافظ تھے یعنی انھیں حدیث کی مشہور چھے کتابیں زبانی یاد تھیں اور وہ تھیں صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داوٗد، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ اور سنن نسائی۔ وہ تُرک عالم تھے اور ملک شام میں سکونت پذیر تھے۔

تذکرہ علمائے خان پور کے مصنف بیان کرتے ہیں کہ ترکی کے بعض علما نے ائمہ حدیث کے حفظ حدیث پر شک کا اظہار کیا اور کہا کہ اس قدر احادیث محدثین کو کیسے یاد ہو سکتی ہیں؟ یہ بات ماننے کی نہیں۔ اس پر ایک ترک عالم نے کہا کہ اہل علم کی ایک مجلس منعقد کرو اور مجھے جتنی حدیثیں یاد ہیں، مجھ سے سنو۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اس مجلس میں سننا پڑیں گی اور تا اختتامِ احادیث تم میں سے کوئی شخص مجلس سے اٹھ کر نہیں جائے گا۔ یہ شرط اس خیال سے سب نے منظور کر لی کہ انھیں زیادہ سے زیادہ سو دو سو حدیثیں یاد ہوں گی اور وہ ہم آسانی سے سن لیں گے۔

مجلس منعقد ہوئی اور سماعت کا آغاز صحیح بخاری سے ہوا۔ سامعین میں سے جو لوگ حدیث کا علم رکھتے تھے، ان کے سامنے صحیح بخاری کے نسخے رکھ دیے گئے۔ اب اس ترک عالمِ حدیث نے اپنی یاد کی ہوئی صحیح

شخص تھے اور مجاہد فی سبیل اللہ تھے۔ یہ وہی مہدی سوڈانی تھے، جن سے لارڈ کچز نے (جو ایک عرصے تک ہندوستان کا کمانڈر ان چیف رہا تھا) جنگ کی تھی اور جب وہ شہید ہوئے تو اس نے ان کی میت کی انتہائی بے حرمتی کی تھی اور اسے جلا دیا تھا۔ پھر یہی لارڈ کچز جنگ عظیم میں جرمن آب دوزوں کے حملے سے سمندر میں غرق ہوا اور اس کی لاش بھی نہ ملی۔ علامہ اقبال نے عالم برزخ میں لارڈ کچز سے ایک بزرگ کا مکالمہ اس طرح لکھا ہے:

گفت اے کچز اگر داری خبر
انتقامِ خاک درویشے نگر
آسماں خاکِ ترا گورے نہ داد
مرقدے جز دریم شورے نہ داد

یعنی اس بزرگ نے عالم برزخ میں کچز کو مخاطب کر کے کہا: اے کچز! ایک درویش (مہدی سوڈانی) کی مٹی (نقش) کی بے حرمتی کا بدلہ دیکھو کہ آسمان نے تیری مٹی (نقش) کو زمین میں ایک قبر بھی نہ دی اور تمھیں آخری سونے کی جگہ سوائے شور دریا (نمکین سمندر) کے اور کوئی جگہ نہ ملی۔

صحاح ستہ کے ایک حافظ سے اجازۂ حدیث:

قیام بغداد کے زمانے میں قاضی یوسف حسین خان پوری کو ایک ایسے عالم سے بھی اجازۂ حدیث کا شرف حاصل ہوا جو پوری صحاح ستہ کے حافظ تھے یعنی انھیں حدیث کی مشہور چھے کتابیں زبانی یاد تھیں اور وہ تھیں صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ اور سنن نسائی۔ وہ ترک عالم تھے اور ملک شام میں سکونت پذیر تھے۔

تذکرہ علمائے خان پور کے مصنف بیان کرتے ہیں کہ ترکی کے بعض علما نے ائمہ حدیث کے حفظ حدیث پر شک کا اظہار کیا اور کہا کہ اس قدر احادیث محدثین کو کیسے یاد ہو سکتی ہیں؟ یہ بات ماننے کی نہیں۔ اس پر ایک ترک عالم نے کہا کہ اہل علم کی ایک مجلس منعقد کرو اور مجھے جتنی حدیثیں یاد ہیں، مجھ سے سنو۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اس مجلس میں سننا پڑیں گی اور تا اختتامِ احادیث تم میں سے کوئی شخص مجلس سے اٹھ کر نہیں جائے گا۔ یہ شرط اس خیال سے سب نے منظور کر لی کہ انھیں زیادہ سے زیادہ سو دو سو حدیثیں یاد ہوں گی اور وہ ہم آسانی سے سن لیں گے۔

مجلس منعقد ہوئی اور سماعت کا آغاز صحیح بخاری سے ہوا۔ سامعین میں سے جو لوگ حدیث کا علم رکھتے تھے، ان کے سامنے صحیح بخاری کے نسخے رکھ دیے گئے۔ اب اس ترک عالمِ حدیث نے اپنی یاد کی ہوئی صحیح

بخاری سنانا شروع کی۔ جب کچھ حصہ سنا دیا گیا تو حاضرین نے کہا کہ ہم نے اپنا اعتراض واپس لیا اور تسلیم کر لیا کہ محدثین کو بے شمار حدیثیں یاد تھیں۔ لیکن اس بزرگ نے کہا کہ اب معاہدے پر قائم رہنا اور پوری کتاب سننا پڑے گی اور اس کے علاوہ بھی وہ حدیثیں سننا ہوں گی جو مجھے یاد ہیں۔ اس طرح انھوں نے پوری صحیح بخاری سنا دی۔

اس کے بعد صحیح مسلم پکڑی اور سنانے لگے۔ سننے والوں نے ان کے حفظ حدیث کو تسلیم کیا اور بار بار مجلس برخاست کرنے کی درخواست کی، لیکن وہ نہیں مانے اور فرمایا اپنے عہد پر قائم رہو اور سنو! اس طرح انھوں نے ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور سنن نسائی بھی سنا دیں۔

قاضی یوسف حسین نے ان عالمِ حدیث کے متعلق یہ واقعہ سنا تو ان سے ملاقات کا شوق پیدا ہوا۔ پتا چلا کہ وہ بغداد کے فلاں مقام پر مقیم ہیں۔ وہاں پہنچے تو وہ وہاں سے رخصت ہو چکے تھے۔ انھوں نے ایک شخص کو جو وہیں جانے والے تھے، جہاں وہ حافظِ حدیث گئے تھے، ان کے نام ایک خط دیا جس میں لکھا تھا کہ میں آپ کی تشریف آوری کا سن کر اس لیے حاضر ہوا تھا کہ آپ سے اجازہ حدیث حاصل کروں گا، لیکن آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ شیخ ممدوح نے خط دیکھ کر قاصد سے پوچھا کیا یہ خط اس نے خود لکھا ہے؟ جواب دیا: یہ خط انھوں نے میرے سامنے اپنے ہاتھ سے لکھ کر مجھے دیا ہے۔ یہ سن کر انھوں نے اجازۂ حدیث لکھ کر قاضی یوسف حسین کو بھجوا دیا۔

قاضی صاحب کے سوانح نگار قاضی عبداللہ خان پوری لکھتے ہیں ''میرا غالب گمان یہ ہے کہ ان کا اسم گرامی بدرالدین تھا، کیوں کہ کاغذات میں ان کا تحریر کردہ اجازہ ان کے دستخط اور مہر سے مزین موجود ہے۔''[1]

تذکرہ علمائے خان پور کے ناشر حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی حاشیہ (صفحہ ۲۱۳) میں اس حافظِ حدیث شیخ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''شیخ بدرالدین بن الشیخ یوسف بن عبدالرحمٰن المراکشی المالکی الدمشقی۔ یہ بزرگ شام کے جید اہل حدیث عالم اور صحاح ستہ کی احادیث کے حافظ تھے۔ دمشق میں علامہ رشید رضا بصری بھی ان کی زیارت سے مشرف ہوئے۔''

بغداد سے واپسی:

تقریباً سات آٹھ سال قاضی یوسف حسین صاحب کا بغداد میں قیام رہا۔ وہاں سے دوبارہ گنگور چلے گئے اور کئی سال وہاں قیام کیا۔ ۱۷-۱۹۱۶ء میں گنگور سے اپنے آبائی وطن خان پور تشریف لائے اور درس و

[1] تذکرہ علمائے خان پور: ص ۲۱۲، ۲۱۳۔

تدریس اور وعظ و تذکیر میں مشغول ہو گئے۔ وہاں ان کے بڑے بھائی قاضی محمد صاحب امامت و خطابت کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ انھوں نے یہ ذمہ داری اب قاضی یوسف حسین کے سپرد کر دی۔

انھوں نے خان پور کی مسجد پیراں والی میں اپنے والد گرامی اور بڑے بھائیوں (قاضی عبدالاحد اور قاضی محمد) سے تعلیم حاصل کی تھی۔ گکھڑ سے واپس آ کر اس مسجد میں خطبۂ جمعہ دینا شروع کیا۔ خطباتِ جمعہ میں پورا قرآن شریف از اول تا آخر مع تفسیر بیان فرمایا۔ ان کے بڑے بھائی قاضی عبدالاحد اس وقت راولپنڈی کی جامع مسجد میں خطبۂ جمعہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ ان کے حکم سے کچھ عرصہ یہ وہاں بھی خدمت خطابت انجام دیتے رہے۔

دھوپ گھڑی:

قاضی یوسف حسین بے شمار خوبیوں کے مالک تھے۔ گکھڑ کے زمانۂ قیام میں انھوں نے وہاں کی جامع مسجد اہل حدیث کے صحن میں ایک دھوپ گھڑی بنائی تھی۔ اس کی تکمیل پر ان کے چھ مہینے صرف ہوئے تھے۔ وہ گھڑی اتنی صحیح تھی کہ لوگ اس پر وقت دیکھ کر ریل پر سوار ہونے کے لیے ریلوے اسٹیشن جایا کرتے تھے۔ خان پور کی مسجد قاضیاں والی میں بھی وہ اسی قسم کی دھوپ گھڑی بنانا چاہتے تھے۔ لیکن افسوس ہے ان کی یہ تمنا پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔

پابندیٔ اوقات:

قاضی یوسف حسین وقت کے انتہائی پابند تھے۔ لوگوں سے میل جول، سیر و تفریح، درس و تدریس میں وقت کا پورا خیال رکھتے۔ اذان اور فرض نمازوں کے متعینہ اوقات میں بالکل آگا پیچھا نہ ہونے دیتے۔ کسی سے کوئی وعدہ کرتے تو اس میں فرق نہ آنے دیتے۔ زندگی بڑی منضبط تھی اور تمام کام طے شدہ وقت پر انجام پاتے تھے۔ ہر معاملے میں خاص نظام میں بندھے ہوئے۔ اس میں چند ثانیوں کی تقدیم و تاخیر بھی گوارا نہ تھی۔ وقتِ مقررہ پر کام کی انجام دہی میں بڑے چھوٹے کسی کی پروا نہ کرتے۔ اس سلسلے میں نہایت صاف گو اور سخت مزاج تھے۔

جنات پر گرفت:

جنات اللہ کی ایک خاص مخلوق ہیں۔ انسانی مخلوق کی طرح اس مخلوق میں بھی صالح اور غیر صالح لوگ موجود ہیں۔ بعض جنات نے قاضی صاحب سے علم بھی حاصل کیا۔ اس قسم کے کئی واقعات تذکرہ علمائے خان پور میں مرقوم ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ بعض جنات ان کی گرفت میں تھے اور ان کے تابع فرمان تھے۔ اگر کسی جن نے کسی مرد یا عورت کو پریشان کیا اور اسے کوئی تکلیف پہنچائی تو قاضی صاحب کو بلایا گیا اور جن ان کا نام سنتے ہی بھاگ گیا۔ یہاں یہ واقعات لکھنے کی ضرورت نہیں اور نہ یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ کس موقعے

پر کس مرد یا عورت کو جن کا عارضہ لاحق ہوا اور قاضی صاحب کے تشریف لانے سے یہ عارضہ ختم ہوا۔ یہ دلچسپ واقعات ہیں جو مذکورہ کتاب میں بیان کیے گئے ہیں۔

شعر و شاعری:

قاضی صاحب ممدوح عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں کے شاعر تھے اور بہت اچھے شاعر تھے۔ ان کے عہد کے شاعر ان کی شاعری کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ عرب ان کی عربی شاعری کی تعریف کرتے ہیں۔ فارسی اور اردو کے شاعر ان کی دونوں زبانوں کی شاعری کے مداح ہیں۔ اللہ نے ان کو بہت سی خصوصیات سے نوازا تھا اور وہ نہایت لائق اور فاضل شخص تھے۔ تحریر اور تقریر میں ان کا مقام بڑا بلند تھا۔ وہ صحیح معنوں میں باعمل عالم تھے۔

تصانیف:

قاضی صاحب مصنف بھی تھے۔ ان کی تصانیف میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

۱۔ تقویم دار العلوم دہلی مطبوعہ ۱۹۰۷ء: اس میں سال بھر کے اوقاتِ نماز پنجگانہ درج ہیں۔

۲۔ ترویح الموحدین: یہ ایک حنفی عالم کے رسالے کا جواب ہے۔ قاضی صاحب نے اس میں احادیث اور اجلّہ فقہاے حنفیہ کے اقوال سے آٹھ رکعت تراویح کے مسنون ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

۳۔ اتمام الخشوع بوضع الیمین علی الشمال بعد الرکوع: یہ رسالہ عربی زبان میں ہے۔

۴۔ اسی نام سے اردو زبان میں بھی انھوں نے ایک رسالہ لکھا۔

۵۔ زبدۃ المقادیر: یہ رسالہ بزبان اردو اوزان کے بارے میں ہے۔ بالخصوص شرعی اوزان کی تحقیق سے متعلق عمدہ رسالہ ہے۔ (مطبوعہ)

۶۔ العقیدۃ الواسطیہ: (از امام ابن تیمیہ) کا اردو ترجمہ (غیر مطبوعہ)

۷۔ دعوۃ الحق: یہ عربی رسالہ باب الایمان، باب الطہارۃ، باب الصلوۃ پر مشتمل ہے۔

۸۔ اید الحوب باکل ما جی من الکسب الحرام بعد التوب: اس میں بتایا گیا ہے کہ زانیہ کی کمائی اس کے توبہ کرنے کے بعد بھی حرام ہے۔ مطبوعہ ۱۳۳۲ھ

قاضی صاحب کی چند اور کتابیں بھی ہیں جن میں سے بعض مطبوعہ ہیں اور بعض غیر مطبوعہ۔

وفات:

بالآخر وقتِ اخیر آ پہنچا۔ مرضِ معدہ میں مبتلا ہوئے۔ علاج کرایا گیا لیکن افاقہ نہ ہوا۔ یکم جون ۱۹۳۳ء (۶-صفر ۱۳۵۲ھ) کو خان پور میں وفات پا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

ان کی وفات سے خان پور کا قاضی خاندان ایک ناشرِ توحید باعمل عالم سے محروم ہو گیا۔ انگریزی حساب سے ۶۴ برس چند ماہ اور قمری حساب سے ٦٦ سال چند ماہ عمر پائی۔ اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے اور سب سے کم عمر پائی۔

اللهم اغفر له و ارحمه و ادخله جنت الفردوس.

۱۹۱۸ء میں یورپ کی دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی تو ہندوستان میں انگریزی حکومت کے خلاف تحریکیں شروع ہوگئیں۔ ۱۹۱۹ء میں تحریک خلافت اٹھی تو ہندوستان کے تمام شہروں میں اس کے دفاتر قائم ہو گئے۔ مئو ناتھ بھنجن میں بھی اس کا دفتر قائم ہوا۔ مولانا محمد نعمان کو اس سیاست سے خاص دلچسپی تھی جو انگریزی حکومت کے خلاف تھی اور جس سے آزادیٔ ملک کی منزل تک پہنچنے کی راہ ہم وار ہوتی تھی۔ چنانچہ مولانا ممدوح تمام امور سے منقطع ہو کر سیاست کی وادی میں آ گئے۔ اس وقت بہت سے شہروں میں عدالتیں بھی قائم کی گئی تھیں یعنی انگریزی حکومت سے عدم تعاون کا فیصلہ کیا گیا تھا اور طے پایا تھا کہ لوگوں کے چھوٹے بڑے باہمی تنازعے انگریزوں کی عدالت میں نہیں لے جائے جائیں گے بلکہ شہروں کی پنچائتوں میں ان کے فیصلے کیے جائیں گے۔ اس قسم کی پنچایت مئو ناتھ بھنجن میں بھی بنائی گئی تھی، جس کے ایک رکن مولانا محمد نعمان تھے۔

اسی اثنا میں مولانا ممدوح کانگرس میں شامل ہو گئے اور آزادیٔ وطن کے لیے اس میں خدمات انجام دینے لگے اور کچھ عرصہ یہ سلسلہ جاری رہا۔

۱۹۲۴ء میں ان کا ذہن بدل گیا اور آئندہ پوری زندگی تدریسی خدمت کے لیے وقف کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس وقت ان کے ایک دوست مولانا محمد اسحاق آروی (جو آرہ میں حضرت حافظ عبداللہ غازی پوری کے مدرسے میں ان کے ہم سبق تھے) کلکتہ میں مقیم تھے، یہ ان کے پاس پہنچے اور اپنا مقصد بیان کیا۔ حسنِ اتفاق سے انھی دنوں دربھنگا کے مدرسہ احمدیہ سلفیہ کے مہتمم ڈاکٹر سید محمد فرید صاحب نے مولانا محمد اسحاق آروی کو اپنے مدرسے کے لیے ایک لائق مدرس کی فوری ضرورت کے لیے خط لکھا تھا۔ مولانا محمد اسحاق آروی نے مولانا محمد نعمان سے بات کی اور انھیں وہاں جانے کے لیے کہا اور وہ وہاں پہنچ گئے۔ شروع شروع میں ابتدائی کتابیں پڑھاتے تھے۔ پھر جب مدرسے کے ارکانِ انتظام کو ان کی غیر معمولی قابلیت کا علم ہوا تو بڑی جماعتوں کے طلبا کو پڑھانے کی درخواست کی اور وہ نہایت مسرت سے یہ خدمت انجام دینے لگے۔ لیکن وہاں اچانک وہ بیمار پڑ گئے۔ بہت علاج کرایا۔ مگر افاقہ نہ ہوا، بالآخر اپنے وطن آ گئے۔ مدرسہ احمدیہ سلفیہ کے اربابِ اہتمام اور اساتذہ طلباء ان کی قابلیت کی بنا پر ان کا بے حد احترام کرتے تھے اور ان کے طریقِ تدریس سے مطمئن تھے، ان کی بیماری سے انھیں بہت تشویش ہوئی اور ان کا وہاں سے رخصت ہو جانا ان کے لیے ایک المیہ تھا۔

اللہ نے انھیں صحت عطا فرمائی تو مدرسہ احمدیہ سلفیہ دربھنگا کے منتظمین نے ان کو واپس آ کر تدریسی خدمات انجام دینے کے لیے اصرار کیا۔ اس کے علاوہ اور بھی بعض مدارس کی طرف سے انھیں دعوت دی گئی۔ لیکن وہ سوچ میں پڑ گئے کہ کہاں جانا چاہیے۔

۱۹۱۸ء میں یورپ کی دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی تو ہندوستان میں انگریزی حکومت کے خلاف تحریکیں شروع ہو گئیں۔ ۱۹۱۹ء میں تحریک خلافت اٹھی تو ہندوستان کے تمام شہروں میں اس کے دفاتر قائم ہو گئے۔ مئو ناتھ بھنجن میں بھی اس کا دفتر قائم ہوا۔ مولانا محمد نعمان کو اس سیاست سے خاص دلچسپی تھی جو انگریزی حکومت کے خلاف تھی اور جس سے آزادیٔ ملک کی منزل تک پہنچنے کی راہ ہم وار ہوتی تھی۔ چنانچہ مولانا ممدوح تمام امور سے منقطع ہو کر سیاست کی وادی میں آ گئے۔ اس وقت بہت سے شہروں میں عدالتیں بھی قائم کی گئی تھیں یعنی انگریزی حکومت سے عدم تعاون کا فیصلہ کیا گیا تھا اور طے پایا تھا کہ لوگوں کے چھوٹے بڑے باہمی تنازعے انگریزوں کی عدالت میں نہیں لے جائے جائیں گے بلکہ شہروں کی پنچائتوں میں ان کے فیصلے کیے جائیں گے۔ اس قسم کی پنچایت مئو ناتھ بھنجن میں بھی بنائی گئی تھی، جس کے ایک رکن مولانا محمد نعمان تھے۔

اسی اثنا میں مولانا ممدوح کانگرس میں شامل ہو گئے اور آزادیٔ وطن کے لیے اس میں خدمات انجام دینے لگے اور کچھ عرصہ یہ سلسلہ جاری رہا۔

۱۹۲۴ء میں ان کا ذہن بدل گیا اور آئندہ پوری زندگی تدریسی خدمت کے لیے وقف کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس وقت ان کے ایک دوست مولانا محمد اسحاق آروی (جو آرہ میں حضرت حافظ عبداللہ غازی پوری کے مدرسے میں ان کے ہم سبق تھے) کلکتہ میں مقیم تھے، یہ ان کے پاس پہنچے اور اپنا مقصد بیان کیا۔ حسنِ اتفاق سے انھی دنوں دربھنگا کے مدرسہ احمدیہ سلفیہ کے مہتمم ڈاکٹر سید محمد فرید صاحب نے مولانا محمد اسحاق آروی کو اپنے مدرسے کے لیے ایک لائق مدرس کی فوری ضرورت کے لیے خط لکھا تھا۔ مولانا محمد اسحاق آروی نے مولانا محمد نعمان سے بات کی اور انھیں وہاں جانے کے لیے کہا اور وہ وہاں پہنچ گئے۔ شروع شروع میں ابتدائی کتابیں پڑھاتے تھے۔ پھر جب مدرسے کے ارکانِ انتظام کو ان کی غیر معمولی قابلیت کا علم ہوا تو بڑی جماعتوں کے طلبا کو پڑھانے کی درخواست کی اور وہ نہایت مسرت سے یہ خدمت انجام دینے لگے۔ لیکن وہاں اچانک وہ بیمار پڑ گئے۔ بہت علاج کرایا۔ مگر افاقہ نہ ہوا، بالآخر اپنے وطن آ گئے۔ مدرسہ احمدیہ سلفیہ کے اربابِ اہتمام اور اساتذہ طلباء ان کی قابلیت کی بنا پر ان کا بے حد احترام کرتے تھے اور ان کے طریقِ تدریس سے مطمئن تھے، ان کی بیماری سے انھیں بہت تشویش ہوئی اور ان کا وہاں سے رخصت ہو جانا ان کے لیے ایک المیہ تھا۔

اللہ نے انھیں صحت عطا فرمائی تو مدرسہ احمدیہ سلفیہ دربھنگا کے منتظمین نے ان کو واپس آ کر تدریسی خدمات انجام دینے کے لیے اصرار کیا۔ اس کے علاوہ اور بھی بعض مدارس کی طرف سے انھیں دعوت دی گئی۔ لیکن وہ سوچ میں پڑ گئے کہ کہاں جانا چاہیے۔

۱۹۲۸ء کے اواخر کی بات ہے کہ جامعہ دار السلام عمر آباد (مدراس) سے ایک وفد مئو ناتھ بھنجن پہنچا۔ وفد میں جامعہ دار السلام کے بانی کے منجھلے فرزند کاکا محمد ابراہیم ❶ اور جامعہ دار السلام کے صدر مدرس مولانا فضل اللہ شامل تھے۔ یہ حضرات وہاں جامعہ دار السلام کے لیے کسی لائق مدرس کی خدمات حاصل کرنے کے لیے آئے تھے۔ مختلف حضرات سے اس سلسلے میں بات ہوئی تو سب نے مولانا محمد نعمان کا نام لیا اور ان کے طریق تدریس کی تعریف کی اور بتایا کہ وہ قابل ترین مدرس ہیں۔ ارکانِ وفد اور مئو ناتھ بھنجن کے لائق اساتذہ نے مولانا محمد نعمان سے گفتگو کی، تو وہ رضا مند ہو گئے۔ وفد دہلی چلا گیا۔ بعد میں مولانا ممدوح بھی ان کے پاس دہلی پہنچ گئے اور وفد کے ساتھ بمبئی، رائچور اور مدراس ہوتے ہوئے ۱۵۔ دسمبر ۱۹۲۸ء کی شب کو عمر آباد پہنچے اور دوسرے دن مسندِ درس پر متمکن ہو گئے۔

ابتداء میں عمر آباد کا ماحول ان کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ یہ شمالی ہند سے جنوبی ہند گئے تھے، جہاں کی زبان، خوراک، لباس، رہن سہن، تہذیب، بات چیت وغیرہ کا معاملہ ان کے آبائی وطن سے بہت حد تک مختلف تھا۔ شروع شروع میں اس ماحول سے صلح کرنے میں بڑی دقت پیش آئی اور پھر آہستہ آہستہ اللہ کے فضل سے سلسلہ ٹھیک ہو گیا۔

زبان کے بارے میں بعض دلچسپ لطیفے میں پیش آئے۔ مثلاً

ایک مرتبہ مسجد سے نکلتے ہوئے ایک شخص سے ملاقات ہوئی اور کافی دیر گفتگو کے بعد وہ صاحب جانے لگے تو کہا: ''میں آتا ہوں۔'' اب مولانا وہیں رک گئے اور ان کے آنے کا انتظار کرنے لگے، بہت دیر وہاں کھڑے رہے، وہ نہ آئے تو مایوس ہو کر چلے گئے۔ دوبارہ ان سے ملاقات ہوئی تو اس واقعہ کا ذکر کیا۔ وہ بہت نادم ہوئے اور ساتھ ہی ہنستے بھی رہے۔ پھر بتایا کہ یہاں کا رواج یہ ہے کہ رخصت ہونے والا یہ نہیں کہتا کہ میں ''جا رہا ہوں'' بلکہ کہتا ہے کہ ''میں آتا ہوں۔'' بات چیت کے اس لطیفے سے مولانا بہت محظوظ ہوئے۔

ایک مرتبہ نماز مغرب کے بعد مسجد سے باہر آئے تو ایک لڑکا برتن میں پانی لیے کھڑا تھا۔ اس نے مولانا سے کہا اس پر دم کر دیں۔ مولانا نے پوچھا ''کیا بات ہے؟'' جواب دیا: ''بیل دودھ نہیں دیتا۔'' فرمایا: ''بیل کہاں سے دودھ دے گا۔'' اس نے کہا ''پہلے ٹھیک سے دودھ دیتا تھا، لیکن اب لات مارتا ہے۔'' اُدھر وہ لڑکا اپنی بات پر مصر تھا اور ادھر مولانا محوِ حیرت تھے۔ اسی اثنا میں ایک شخص آئے۔ انھوں نے واقعہ کی تفصیل سننے کے بعد بتایا کہ یہاں گائے اور بھینس کو بیل ہی کہا جاتا ہے۔

---

❶ کاکا مدراس کی بولی میں سیٹھ کو کہا جاتا ہے۔ جامعہ دار السلام عمر آباد کے بانی کاکا محمد عمر تھے جو ۱۹۲۷ء میں فوت ہوئے۔ یہ کاکا محمد ابراہیم کے جدِّ امجد تھے۔

مولانا کو یہ لطیفہ ہمیشہ یاد رہا اور احباب کی مجلس میں اسے بیان کر کے خود بھی محظوظ ہوتے اور حاضرین مجلس کو بھی محظوظ کرتے۔

مولانا محمد نعمان ہر موضوع کی درسی کتابوں پر عبور رکھتے تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، عربی ادب، صرف ونحو وغیرہ علوم کی جو کتابیں مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں، وہ انھیں متعدد مرتبہ پڑھا چکے تھے اور طلبا ان کے اسلوب تدریس سے نہایت متاثر تھے۔ سالانہ تعطیلات کے زمانے میں کوئی طالب علم ان سے کسی موضوع کی کوئی کتاب پڑھنا چاہتا تو وہ خوش دلی سے پڑھاتے۔

درسیات کے علاوہ بھی ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ امام ابن تیمیہ، امام ابن قیم، امام ابن حزم، امام شوکانی اور دیگر مصنفین کی کتابیں ان کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ اردو ادب کی کتابوں کا مطالعہ بھی بڑے شوق سے کرتے تھے اور اردو میں مضامین بھی لکھتے تھے۔ شعر و شاعری سے بھی لگاؤ تھا۔ کسی زمانے میں شعر کہتے بھی تھے اور مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ ناصح تخلص تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور اس ذہن کے دیگر حضرات سے انھیں قلبی تعلق تھا۔ ان حضرات کی رفاقت میں انھیں سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے مواقع میسر آئے تھے۔

مہمان نواز، وسیع القلب، تقویٰ شعار، حوصلہ مند، جرأت پیشہ، بذلہ سنج اور باوقار عالم دین تھے۔ گھر میں ہوتے تو خیرکم خیرکم لاھلہ کی خوب صورت تصویر ہوتے۔ طلبا کے بے حد مشفق اور ان کے خیرخواہ۔

زندگی کے آخری دنوں میں ان پر جسمانی ضعف نے غلبہ پالیا تھا اور بصارت کمزور ہوگئی تھی۔ مطالعہ کتب سے معذور ہو گئے تھے، لیکن قوتِ حافظہ تیز تھی، طلبا کو باقاعدہ پڑھاتے تھے۔ صحیح بخاری کی تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ کوئی طالب علم عبارت غلط پڑھتا تو فوراً گرفت کرتے۔

اب آیے ان کے آخری ایام حیات کی طرف۔!

۱۹۵۱ء کے اوائل کی بات ہے کہ ایک دن صبح کے وقت صحیح مسلم پڑھا رہے تھے کہ اچانک زبان لڑکھڑانے لگی۔ یہ ان پر فالج کا حملہ تھا۔ فوراً انھیں گھر پہنچایا گیا۔ ہاتھ اور پیر بھی فالج سے متاثر ہوئے۔ یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ پھر سنبھل نہیں سکے۔ تقریباً گیارہ مہینے حالت مرض میں چارپائی پر لیٹے رہے۔ بالآخر ۲۹۔ ربیع الاول ۱۳۷۱ھ (۲۸۔ دسمبر ۱۹۵۱ء) کو جمعۃ المبارک اور ہفتے کی درمیانی شب کو ٹھیک بارہ بجے اپنے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

عیسوی حساب سے تقریباً پچھتر (۷۵) اور قمری حساب سے اناسی (۷۹) سال عمر پائی۔ وفات سے دوسرے دن ۲۹۔ دسمبر کو نماز ظہر کے بعد عمرآباد کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔ کم و بیش پچیس سال جامعہ

دارالسلام عمر آباد کی مسندِ تدریس پر فائز رہے۔ ہندوستان کے شمالی افق سے ابھرنے والا یہ ماہِ درخشاں ارضِ دکن میں روپوش ہوگیا۔

اللّٰهم اغفرله و ارحمه و عافه و اعف عنه .

مولانا مرحوم نے دو شادیاں کیں، پہلی شادی مئوناتھ بھنجن میں کی تھی۔ اس سے ان کی نرینہ اولاد پانچ بیٹے تھے۔ عبدالمنان، عبدالحنان، عبدالسبحان، محمد عرفان اور فضل الرحمٰن۔ پانچوں کا شمار اہل علم میں ہوتا تھا۔ سبھی وفات پا چکے ہیں۔ آگے ان کے بیٹے بھی اصحابِ علم میں سے تھے۔

حضرت مولانا مرحوم کی پہلی بیوی ان کے عمر آباد آنے سے قبل مئوناتھ بھنجن ہی میں فوت ہوگئی تھیں۔ عمر آباد آ کر دوسری شادی شمالی آرکاٹ کے شہر پرنام بٹ میں کی۔ اس خاتون سے ان کی نرینہ اولاد چار بیٹے ہوئے، جن کے نام یہ ہیں: حبیب الرحمٰن، عزیز الرحمٰن، حفیظ الرحمٰن اور عتیق الرحمٰن۔ چاروں اللہ کی مہربانی سے جدید وقدیم علوم کی نعمت سے بہرہ ور ہوئے۔ [1]

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر محمد ثناء اللہ عمری ایم اے عثمانیہ کی کتاب ''بات ایک مسیحا نفس کی'' شائع کردہ ادارہ تحقیقات اسلامی عمر آباد (مدراس) مئی ۱۹۹۹ء

دیگر تینتیس (۳۳)

خدام حدیث

حافظ عبدالستار عمر پوری

(وفات ٦ مارچ ١٩١٦ء)

یہ مولانا عبدالجبار عمر پوری کے فرزند تھے، جن کا تذکرہ خوانندگانِ محترم نے حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے تلامذۂ کرام کی فہرست میں پڑھا۔

حافظ عبدالستار عمر پوری ۱۳۰۱ھ (۱۸۸۴ء) میں بمقام عمر پور (ضلع مظفر نگر صوبہ یوپی) پیدا ہوئے۔

جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

۱- مولانا عبدالرحمٰن معین الدین عمر پوری (یہ ان کے نانا تھے)

۲- مولانا عبدالرحمٰن عمر پوری (یہ ان کے ماموں تھے)

۳- مولانا عبدالجبار عمر پوری (یہ ان کے والدِ محترم تھے)

۴- مولانا محمد بشیر سہسوانی (جلیل القدر عالم اور مفسر و محدث تھے)

حافظ عبدالستار نہایت ذہین تھے۔ صرف تین ماہ میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔

درس نظامی کی مروجہ تعلیم سے فراغت کے بعد درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی تھی۔ چنانچہ ایک رسالہ "اثبات الخبر فی ردمنکری الحدیث والاثر" کے نام سے لکھا اور ایک رسالہ مرزا قادیانی کی تردید میں تحریر فرمایا۔

حافظ عبدالستار عمر پوری بہت اچھے مدرس بھی تھے۔ جن عالی قدر حضرات نے ان سے تحصیل علم کی، ان میں حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ کا نام نامی بھی شامل ہے۔ مولانا سلفی نے ان سے تفسیر ابن کثیر درساً درساً پڑھی۔

آغازِ عمر ہی سے حافظ عبدالستار عمر پوری زہد و پارسائی کا مرقع تھے۔ یہ دولت انھوں نے اپنے آبا و اجداد سے ورثے میں پائی تھی۔

اسلام کا ایک بہت بڑا عمل اور ضروری حکم حالات کے مطابق جہاد ہے۔ حافظ صاحب مرحوم کو اس پر عمل کے لیے ہمیشہ بے تاب پایا گیا۔ تمنائے شہادت ہر وقت ان کے دل میں موجزن رہتی تھی۔ ورزش اور جہاد کے اس وقت جو طریقے رائج تھے، وہ سب انھوں نے سیکھ لیے تھے۔ مثلاً تیراکی، گھڑ سواری، بنوٹ یعنی گتکا

بازی، لاٹھی چلانا، تیر اندازی، پہلوانی وغیرہ میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ ان کا اصل مقصد ان لوگوں کے ساتھ مل کر انگریزوں سے جہاد کرنا تھا جو سرحد پار کی جماعتِ مجاہدین کے نام سے مصروفِ جہاد تھے اور یہ مولانا اسماعیل شہید دہلوی اور سید احمد شہید بریلوی کی تیار کردہ جماعت کے لوگ تھے۔

حافظ عبدالستار عمر پوری سرحد پار کے مجاہدین سے مالی تعاون کرتے تھے۔ برصغیر کے اور بھی بہت لوگ تھے جو ہندوستان کی انگریزی حکومت سے جہاد کرنے والوں کو رقم جمع کر کے بھجواتے تھے۔ اس رقم سے مجاہدین اسلحہ خرید کر میدانِ عمل میں اترتے تھے۔ مجاہدین کی مالی امداد کرنے والوں پر انگریزی حکومت پوری نگاہ رکھتی تھی اور جو لوگ اس جرم میں پکڑے جاتے انھیں شدید سزائیں دی جاتی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود لوگ مجاہدین کی مالی مدد کرتے رہتے تھے۔ پکڑے بھی جاتے تھے اور مستوجبِ سزا بھی قرار پاتے تھے۔ اس کی تفصیلات اس موضوع کی کتابوں میں مرقوم ہیں۔ مولانا غلام رسول مہر نے اپنی تصانیف (سیرت سید احمد شہید، جماعت مجاہدین اور سرگزشتِ مجاہدین) میں بالخصوص اس سلسلے کے بہت سے گوشوں کی وضاحت کی ہے۔

حافظ عبدالستار عمر پوری کا نام بھی انگریزی حکومت کی تیار کردہ اس فہرست میں شامل تھا، جنھوں نے سرحد پار کے مجاہدین کی مالی اعانت کو اپنا فریضۂ حیات قرار دے رکھا تھا اور ان کے وارنٹ گرفتاری بھی جاری ہو چکے تھے۔

حافظ عبدالستار عمر پوری نے یکم جمادی الاولیٰ ۱۳۳۴ھ (۶ مارچ ۱۹۱۶ء) کو صرف ۳۴ سال عمر پا کر عین عالم جوانی میں سفر آخرت اختیار کیا۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ جس دن انھیں دفن کیا گیا اسی دن شام کو انگریزی پولیس والے ان کی گرفتاری کے وارنٹ لے کر ان کے گھر پہنچے۔ انھیں بتایا گیا کہ آج صبح وہ تمھاری بھاگ دوڑ سے آزاد ہو کر جنت الفردوس کو تشریف لے گئے ہیں۔ [1]

---

[1] یہ باتیں حافظ صاحب مرحوم کے صاحب زادے مولانا عبدالغفار حسن مرحوم نے اپنی کتاب عظمتِ حدیث کے آغاز میں تحریر فرمائی ہیں جو ان کو ان کی دادی مرحومہ نے بتائیں۔ مرحومہ کی وفات ۱۹۲۸ء میں ہوئی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون.

قاضی عبدالاحد خان پوری

(وفات ۸ دسمبر ۱۹۲۸ء)

صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختون خوا) کے ضلع ہزارہ کی تحصیل ہری پور میں ایک قصبہ خان پور کے نام سے موسوم ہے۔ تاریخی اعتبار سے یہ قدیم دور کا قصبہ ہے جس کے مضافات میں زمانۂ بدھ کے آثار پائے جاتے ہیں۔ پہاڑوں کے خوش گوار مناظر میں گھرا ہوا یہ ایک پر فضا مقام ہے۔ اس قصبے میں ایک قاضی خاندان آباد تھا۔ اس خاندان میں متعدد علمائے کرام پیدا ہوئے جنھوں نے تصنیف و تالیف اور تقریر و خطابت میں بے حد خدمات سرانجام دیں۔

اس خاندان کے ایک بزرگ قاضی محمد حسن خان پوری تھے جو راجپوت برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے حضرت سید عبداللہ غزنوی سے اخذِ فیض کیا تھا۔ قاضی صاحب موصوف نے ۳- شعبان ۱۳۰۱ھ (۲۶- مئی ۱۸۸۴ء) کو وفات پائی۔ ان کی نرینہ اولاد تین بیٹے تھے قاضی عبدالاحد، قاضی محمد اور قاضی یوسف حسین۔ آئندہ صفحات میں قاضی عبدالاحد خان پوری کے حالاتِ زندگی بیان کرنا مقصود ہے۔ قاضی محمد اور قاضی یوسف حسین کے حالات گزشتہ صفحات میں حضرت میاں سیّد نذیر حسین دہلوی کے تلامذہ کی فہرست میں معرضِ بیان میں آ چکے ہیں۔

ولادت:

قاضی عبدالاحد ۴- جمادی الاخریٰ ۱۲۶۸ھ (۲۶- مارچ ۱۸۵۲ء) کو خان پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے برادرِ صغیر قاضی محمد خان پوری کی معیت میں والدِ مکرم قاضی محمد حسن خان پوری سے حاصل کی۔ بعد ازاں دونوں بھائیوں نے پنجاب کا رخ کیا اور اس صوبے کے مختلف اساتذہ سے اکتسابِ علم کرتے رہے۔ لیکن کس استاذ سے کون کون سی کتابیں پڑھیں اور کب پڑھیں، اس کا پتا نہیں چل سکا۔ ان کے اور خاندان کے دیگر بزرگوں کے واقعات قاضی محمد خان پوری کے صاحب زادۂ گرامی قاضی عبداللہ خان پوری ایم اے ایل ایل بی علیگ نے ''تذکرۂ علمائے خان پور'' کے نام سے لکھے ہیں۔ یہ کتاب جولائی ۱۹۸۵ء (شوال ۱۴۰۵ھ) میں مکتبہ سلفیہ لاہور کی طرف سے شائع ہوئی۔ ''گزارشِ احوالِ واقعی'' کے عنوان سے مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی نے اس پر مقدمہ لکھا۔ انھوں نے کتاب میں بعض اضافے بھی کیے لیکن ان بزرگانِ عالی

قدر کے ان اساتذہ کا انھیں بھی علم نہیں ہو سکا، جن سے انھوں نے پنجاب میں اخذِ فیض کیا۔ آئندہ سطور اسی کتاب سے مستفاد ہیں۔

حضرت عبداللہ غزنوی کی خدمت میں:

پنجاب کے اساتذہ سے استفادے کے بعد والد محترم (قاضی محمد حسن) کے حکم سے دونوں بھائی (قاضی عبدالاحد اور قاضی محمد) حضرت سید عبداللہ غزنوی کی خدمت میں بستی خیر دی (امرتسر) حاضر ہوئے اور ان سے تکمیل تعلیم کی۔ وہ طویل مدت تک حضرت عبداللہ صاحب کی خدمت میں رہے اور ان سے فیض یاب ہوئے۔ اس سے پیشتر ان کے والد قاضی محمد حسن بھی ہری پور میں حضرت عبداللہ صاحب غزنوی سے استفاضہ کر چکے تھے۔ ان دونوں بھائیوں کو دیکھ کر حضرت عبداللہ صاحب نے فرمایا تھا کہ ان کا خاص طور سے خیال رکھا جائے، یہ اس شخص کے بیٹے ہیں جس کے دل جیسا صاف دل میں نے کسی کا دل نہیں دیکھا۔ وہ ان کو نہایت توجہ سے تعلیم دیتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ لوگ جب دیکھیں گے کہ میں تمھیں پڑھاتا ہوں تو تعجب کریں گے کہ یہ کسی اور کو تو پڑھاتے نہیں لیکن انھیں پڑھا رہے ہیں۔

دیگر کتابوں کے علاوہ دونوں بھائیوں نے حضرت عبداللہ صاحب سے شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کی کئی کتابیں سبقاً سبقاً پڑھیں۔ حضرت مرحوم نے قاضی عبدالاحد سے فرمایا کہ امام ابن قیم کے قصیدہ نونیہ کا ترجمہ کر دو تو یہ بہت اچھا کام ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے اس کے کچھ حصے کا فارسی ترجمہ کر کے انھیں سنایا تو بہت پسند کیا، لیکن افسوس ہے ترجمہ مکمل نہ ہو سکا۔ قاضی صاحب کا خط نستعلیق بھی بہت اچھا تھا اور خطِ نسخ بھی۔ انھوں نے امام ابن تیمیہ کی کتاب العقل والنقل اپنے ہاتھ سے لکھی۔ اسی طرح بعض دیگر کتابوں کے کچھ حصے نقل کیے۔

قاضی صاحب پر حضرت عبداللہ غزنوی بے حد اعتماد کرتے تھے۔ گھر کے لیے وہ بسا اوقات سودا بھی لایا کرتے تھے۔ ایک دن چند کام کرتے ہوئے دیر ہوگئی۔ گھر آئے تو سب لوگ کھانا کھا چکے تھے۔ حضرت نے فرمایا: عبدالاحد تمھارے پاس پیسے تو ہوتے ہی ہیں، کبھی ایسی صورت پیش آجائے تو بازار سے روٹی ملتی ہے، تم کھا لیا کرو۔ عرض کیا آپ کا فرمان صحیح ہے لیکن آپ چیزیں خریدنے کے لیے پیسے دیں اور میں ان سے کھانا شروع کر دوں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کبھی ایک وقت کا کھانا نہ کھایا جا سکے تو کیا فرق پڑتا ہے۔

حضرت عبداللہ صاحب کو ان دونوں بھائیوں سے بہت اُنس تھا اور وہ ان پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔ کافی عرصہ دونوں بھائی حضرت کی خدمت میں امرتسر رہے اور ان سے فیض یاب ہوئے۔ پھر اجازت لے کر اپنے وطن خان پور چلے گئے تھے۔

دوبارہ طلبی:

وفات سے چند روز پیشتر حضرت نے پھر دونوں کو امرتسر طلب فرمایا اور وہ حاضر خدمت ہو گئے۔ وفات کے وقت دونوں بھائی امرتسر میں موجود تھے۔ جس رات حضرت کا انتقال ہوا، یہ دونوں مسجد میں تھے۔ معمولی بارش ہوئی لیکن آسمان پر بادل کا کوئی ٹکڑا نظر نہ آیا۔ قاضی محمد نے بڑے بھائی قاضی عبدالاحد سے کہا میرے خیال میں عبداللہ صاحب وفات پا گئے ہیں اور یہ رحمت کی بارش ان کے استقبال کے لیے ہوئی ہے۔ قاضی عبدالاحد نے یہ الفاظ سن کر ان کو ڈانٹ دیا۔ لیکن صبح کی نماز کے لیے حضرت کے فرزند مولانا عبدالواحد غزنوی مسجد میں تشریف لائے تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ بابا جان کا کیا حال ہے؟ تو فرمایا جس وقت تھوڑا سا ترشح ہوا تھا، اسی وقت بابا جان کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

یہ حادثہ ۱۵- ربیع الاول ۱۲۹۸ھ (۱۵- فروری ۱۸۸۱ء) کو آدھی رات کے وقت پیش آیا۔ نمازِ ظہر کے بعد جنازہ پڑھا گیا۔ امیر، غریب، رئیس، علما و طلبا، ہر طبقے کے بے شمار لوگ جنازے میں شامل تھے۔

تبلیغ توحید:

قاضی صاحب کے زمانے میں خان پور اور اس کے گرد و نواح میں غیر اسلامی رسوم و رواج کا زور تھا۔ لوگ قرآن و حدیث کے احکام سے ناواقف تھے اور پیر پرستی و قبر پرستی کو اپنا معمول قرار دے رکھا تھا۔ اللہ کی توحید سے جو اسلام کا اولین رکن ہے، انھیں تعلق نہ تھا۔ قاضی صاحب نے اپنے وعظوں میں انہی باتوں کو موضوع بنایا جن کی وہاں ضرورت تھی۔ بالخصوص توحید کے موضوع پر مختلف لوگوں سے ان کے مناظرے بھی ہوئے اور چھوٹی بڑی مجلسوں میں گفتگو بھی ہوئی۔ ایسا بھی ہوا کہ بعض مسجدوں میں انھیں مناظرے کے لیے دعوت دی گئی۔ وہ مسجد میں وقت مقررہ پر بلکہ اس سے پہلے ہی پہنچ گئے لیکن فریق مخالف کا بلکہ خود انھیں دعوت دینے والوں کا کوئی شخص وہاں نہیں پہنچا اور قاضی صاحب ان کا انتظار کرتے رہے۔ اس زمانے میں خان پور اس علاقے میں تبلیغ توحید کا مرکز قرار پا گیا تھا اور قاضی عبدالاحد اس کے جرأت مند مبلغ تھے۔

راولپنڈی میں قیام:

پھر حالات ایسے پیدا ہوئے کہ قاضی صاحب خان پور سے راولپنڈی تشریف لے گئے اور وہیں مستقل طور سے سکونت اختیار کر لی۔ وہ توحیدِ خالص کے پہلے زوردار خطیب تھے، جو راولپنڈی میں قیام پذیر ہوئے۔ وہ وہاں کے لوگوں سے ملتے اور مسجدوں میں جاتے، اپنے انداز سے خلافِ اسلام رسوم و رواج کے ارتکاب سے لوگوں کو روکتے، بدعات سے منع کرتے اور اللہ کی وحدانیت کا قرآن و حدیث کی روشنی میں درس دیتے۔

"تذکرہ علمائے خان پور" کے مصنف قاضی عبداللہ ایڈووکیٹ جوان کے حقیقی بھتیجے تھے تحریر فرماتے ہیں:

"آپ کے نزدیک اس وقت سب سے زیادہ ضروری کام شرک کا رد تھا اور اس مقصد کے لیے آپ نے ہر طبقے سے رابطہ قائم کیا۔ شہر کی مختلف مساجد میں نماز کے لیے جاتے اور جو کچھ وہاں دیکھتے، وہاں کے امام سے چند سوالات کر کے اسے سیدھی راہ پر لے آتے۔ اس غرض کے لیے احناف کی مساجد میں وہ آمین بالجہر اور رفع یدین بھی نہ کرتے تھے، کیوں کہ اصل مقصد آپ کے سامنے توحید تھا۔ ایک دفعہ ایک طالب علم خان پور سے آیا۔ آپ نے اس سے کہا کہ اس مسجد میں آمین بالجہر نہ کہنا، نبی ﷺ نے آمین اور رفع یدین کی وجہ سے ہجرت نہیں کی تھی بلکہ توحید کی خاطر کی تھی۔" [1]

پیر مہر علی شاہ اور قاضی صاحب:

پنجاب کے پیروں میں "گولڑہ" کے پیر صاحب کی بڑی شہرت ہے۔ قاضی صاحب کے زمانے میں گولڑہ کی گدی پر پیر مہر علی شاہ صاحب متمکن تھے جو کثیر المطالعہ اور مشہور عالم تھے۔ قاضی صاحب بھی علم و کمال میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ قاضی صاحب راولپنڈی آئے تو دونوں میں خوش گوار تعلقات پیدا ہو گئے۔ قاضی صاحب کا خیال تھا کہ پیر صاحب تبلیغ توحید کے لیے کمر بستہ ہوں گے۔ اس ضمن میں ملاحظہ ہوں "تذکرہ علمائے خان پور" کے فاضل مصنف کے الفاظ:

"اسی غرض کے پیش نظر آپ نے پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی کے ساتھ دوستانہ راہ و رسم پیدا کی۔ ان کو ملنے کے لیے گولڑہ بھی چلے جایا کرتے اور علمی مباحث ہوا کرتے۔ پیر صاحب اس تاک میں تھے کہ اگر ایسا عالم ہمیں ہاتھ لگ جائے تو بہت مفید ہوگا اور قاضی صاحب یہ چاہتے تھے کہ پیر صاحب توحید پر پکے ہو گئے تو ایک جمِ غفیر حلقہ بگوش توحید ہو جائے گا، لیکن تقدیر میں کچھ اور لکھا تھا۔"

نہ پیر صاحب نے قاضی صاحب کا مسلک اختیار کیا، نہ قاضی صاحب نے پیر صاحب کی طرف رجوع کیا۔ لیکن پھر ایک وقت آیا کہ دونوں ایک دوسرے کے مخالف ہو گئے۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ قاضی صاحب نے تحریری اور تقریری صورت میں پیر مہر علی شاہ صاحب کی شدید مخالفت کی اور پیر صاحب نے قاضی صاحب کے خلاف محاذ قائم کر لیا اور معاملہ بہت آگے بڑھ گیا۔

اس اثنا میں ایک صاحب نے قاضی صاحب سے کہا کہ پیر صاحب کے خلاف لکھنا بند کر دو ورنہ وہ آپ کو قتل کرا دیں گے۔ قاضی صاحب نے اس کا طنزاً جواب دیا: "ہاں صاحب میں راولپنڈی کے کسی بازار میں جاتا ہوں تو مجھے سڑک کے دائیں بائیں مُردے ہی مُردے نظر آتے ہیں۔ دریافت پر معلوم ہوتا ہے کہ ان کو

[1] تذکرہ علمائے خان پور: ص ۴۸۔

پیر صاحب نے مروا دیا ہے۔'' بہر حال دونوں کے درمیان اختلاف و نزاع کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ نہ کوئی قتل ہوا، نہ کسی طرف سے کسی کو کوئی نقصان پہنچا۔

پیر مہر علی شاہ صاحب کے علاوہ علی پور کے پیر جماعت علی شاہ اور بعض دیگر پیروں سے بھی کسی نہ کسی صورت میں قاضی صاحب کا اختلاف رہا۔

ایک واقعہ:

اب ایک واقعہ ملاحظہ فرمایے، جسے ''تذکرہ علمائے خان پور'' کے لائق مصنف نے ''قاضی صاحب کی کرامت'' کا عنوان دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ایک دفعہ قاضی صاحب عشاء کی نماز پڑھ کر مسجد سے گھر جا رہے تھے کہ ایک کوچے کے موڑ پر ایک قد آور شخص آیا اور ان کے پاؤں پر گر پڑا۔ عاجزی سے عرض کیا کہ خدا کے لیے مجھے معاف کر دیں۔

قاضی صاحب نے فرمایا تم نے میرا کیا قصور کیا ہے کہ جس کی معافی مانگ رہے ہو۔ میں تو تمھیں جانتا بھی نہیں۔

اس نے کہا آج یہ تیسری رات ہے کہ میں آپ کو قتل کرنا چاہتا تھا (اس کے ہاتھ میں اس وقت خنجر بھی تھا) مجھے میرے بعض بزرگوں اور دوستوں نے یہ کہہ کر آپ کے قتل پر آمادہ کیا تھا کہ اسے قتل کرنا بڑے ثواب کا کام ہے۔ چنانچہ پہلی رات اسی وقت جب آپ یہاں سے گزر رہے تھے تو میں نے آپ پر حملے کا ارادہ کیا لیکن میرا ہاتھ جس میں خنجر پکڑا ہوا ہے چل نہیں سکا۔ میں نے بڑی کوشش کی لیکن ہاتھ میں بالکل حرکت پیدا نہیں ہوئی اور میں نے واپس جا کر ان لوگوں سے کہا کہ وہ تو کوئی اللہ کا ولی معلوم ہوتا ہے جس پر میرا ہاتھ نہیں پڑ سکا۔ تم نے کہا تھا کہ وہ بہت برا آدمی ہے۔ وہ برا آدمی نہیں بہت نیک آدمی ہے۔

انھوں نے مجھے ملامت کی اور کہا تمھارا ایمان کم زور ہے۔ پھر جاؤ اور دل مضبوط کر کے اسے قتل کر دو۔

چنانچہ ان کے کہنے پر میں پھر آیا اور کوشش کے باوجود میرے ہاتھ نے حرکت نہ کی اور میں ناکام واپس چلا گیا۔

ان کے کہنے اور زور دینے پر آج تیسری دفعہ آیا اور آپ کو قتل کرنے کے لیے چھپ کر کھڑا ہو گیا لیکن آپ کے سامنے آتے ہی میرے ہاتھ کی طاقت پھر سلب ہو گئی ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ اللہ کے سچے ولی ہیں، جنھیں میں پوری کوشش کے باوجود کوئی نقصان نہیں پہنچا سکا۔ اللہ کے لیے مجھے معاف کر دیں تاکہ اللہ میرے اس گناہ کی مجھے سزا نہ دے۔

قاضی صاحب نے فرمایا: جاؤ میں نے تمھیں معاف کیا۔ [1]

---

[1] تذکرہ علمائے خان پور: ص ۴۷، ۴۸.

ایک اور واقعہ:

قاضی صاحب کے مخالفین انھیں اذیت پہنچانے کے منصوبے بناتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ گلی میں جا رہے تھے کہ کسی نے پیچھے سے لاٹھی ماری اور بھاگ کر تنگ گلیوں میں غائب ہو گیا۔ اگر سامنے سے وار کرتا تو قاضی صاحب سے بھاگ نہیں سکتا تھا، اس لیے کہ وہ بنوٹ (گتکے) کے ماہر تھے اور ہاتھ میں مضبوط لاٹھی رکھتے تھے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ وہ شخص گھر جاتے ہی چارپائی پر گر گیا اور پیٹ میں شدید درد ہونے لگا۔ بہت علاج کرایا گیا لیکن افاقہ نہ ہوا اور پیٹ پھول گیا۔ شور مچانے لگا کہ میں نے غلط لوگوں کے کہنے پر غلط کام کیا اور ایک مردِ مومن پر لاٹھی ماری۔ اس گناہ میں پکڑا گیا ہوں۔ یہاں حکیموں اور ڈاکٹروں کی دواؤں سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اسی طرح چیختا چلاتا ہوا مر گیا۔

اس کا یہ اعترافِ جرم سارے راولپنڈی میں مشہور ہو گیا۔ اس کے بعد کسی کو ان پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ [1]

قاضی صاحب زیرہ ضلع فیروز پور میں:

مشرقی پنجاب کے ضلع فیروز پور کی سرحدیں ضلع قصور سے ملی ہوئی ہیں۔ اس ضلع کی پانچ تحصیلوں میں سے ایک تحصیل زیرہ تھی۔ زیرہ خاصا بڑا شہر تھا اور پوری تحصیل میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ معلوم نہیں کیا وجہ ہوئی کہ زیرہ کے کچھ لوگ مرزائیوں کے ہتھے چڑھ گئے۔ اس کی اطلاع مولانا عبدالجبار غزنوی کو پہنچی تو انھوں نے قاضی عبدالاحد خان پوری کو خط لکھا کہ وہ جلد از جلد زیرہ جائیں اور لوگوں کو مرزائیوں کی گرفت سے نکالیں اور مناظرے اور تقریریں کر کے مرزائیوں کو وہاں سے بھگانے کی کوشش کریں۔

قاضی صاحب نے تعمیلِ حکم کی اور زیرہ جا پہنچے۔ مرزائیوں کا مولوی محمد علی بھی وہیں تھا، قاضی صاحب کی آمد سے مرزائی مبلغ سخت پریشان ہوئے، انھیں معلوم تھا کہ ان کا مقابلہ کرنا ان کے لیے آسان نہیں۔ لیکن مسلمان خوش تھے اور سمجھتے تھے کہ اب مسلمانوں کو دھوکا دینا اور مرزائیت کی تبلیغ کرنا مرزائی مبلغوں اور خود مولوی محمد علی کے لیے مشکل ہوگا۔

قاضی صاحب نے وہاں پہنچتے ہی مرزائیت کے خلاف تقریریں شروع کر دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند روز میں میدان گرم ہو گیا اور محمد علی سمیت تمام مرزائی مبلغ ان کی باتوں کا جواب دینے سے عاجز آ گئے۔

---

[1] تذکرہ علمائے خان پور: ص ۴۹۔

انھوں نے بار بار مرزائیوں کو مناظرے کی دعوت دی۔ لیکن کسی کو ان کا سامنا کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اسی اثنا میں قاضی صاحب کو اپنے وطن میں کوئی ایسا ضروری کام پڑ گیا کہ مجبوراً واپس آنا پڑا۔ ان کی واپسی پر زیرہ کے مسلمانوں نے پریشانی کا اظہار کیا تو فرمایا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں میں تھوڑے دنوں بعد واپس آ جاؤں گا۔

چنانچہ اپنا کام مکمل کر کے قاضی صاحب حسبِ وعدہ دوبارہ زیرے پہنچ گئے اور پھر وہی سلسلہ شروع ہو گیا اور مولوی محمد علی مرزائی کو مناظرے کا چیلنج کیا۔ ان کی تقریروں سے متاثر ہو کر بہت سے لوگ مرزائیت سے تائب ہو گئے۔ اب مولوی محمد علی براہ راست قاضی صاحب سے مقابلے میں آئے اور بات مباہلے تک جا پہنچی۔ چنانچہ محمد علی نے مباہلہ کیا اور پھر وہ بمرضِ طاعون ہلاک ہوا۔ جو لوگ مرزائی ہو گئے تھے، وہ بھی ہلاک ہو گئے، البتہ جنھوں نے مرزائیت سے توبہ کر لی تھی اور دوبارہ اسلام قبول کر لیا تھا، وہ محفوظ رہے۔ ❶

حج بیت اللہ اور سلطان ابن سعود سے ملاقات:

قاضی صاحب نے اپنی اہلیہ محترمہ کے ساتھ حج بیت اللہ بھی کیا۔ حج کے موقع پر انھوں نے سلطان عبدالعزیز ابن سعود سے ملاقات کی۔ سلطان کے سامنے بعض مسائل پر تقریر بھی کی۔ سلطان ان کی عربی تقریر سن کر نہایت متعجب ہوئے۔ صاف زبان اور عربوں جیسا لہجہ۔ اس وقت متعدد علمائے کرام موجود تھے۔ قاضی صاحب کی پرجوش تقریر سلطان کے دربار میں ایک گھنٹا جاری رہی۔

واپسی کے وقت سلطان موصوف نے ان کو خلعت پیش کی اور ان کی اہلیہ محترمہ کے لیے سونے کی گھڑی بہ طور تحفہ عنایت کی اور اپنی موٹر میں سوار کر کے انھیں جدہ تک پہنچانے کا حکم دیا۔

حمیت دینی کا ایک عجیب واقعہ:

ایک دن قاضی صاحب راولپنڈی کے ایک بازار سے گزر رہے تھے کہ اچانک ان کی نظر ایک ہندو کتب فروش پر پڑی جو اپنی دکان میں الماری کی اونچی جگہ سے کوئی کتاب اتار رہا تھا اور اس جگہ تک ہاتھ پہنچانے کے لیے قرآن شریف کے ایک بنڈل پر پاؤں رکھے ہوئے تھا۔ یہ دیکھ کر قاضی صاحب نے اسے برا بھلا کہا اور زد و کوب بھی کیا۔ اس دوران انھوں نے اسے چٹیا سے پکڑ کر خوب جھنجھوڑا اور مکے مارے۔ وہ چٹیا جو انھوں نے پکڑی ہوئی تھی، اکھڑ کر ان کی مٹھی میں آ گئی۔ چٹیا ہندوؤں کا مذہبی شعار ہے جس کی وہ ہر قیمت پر حفاظت کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ انھوں نے بھی اس بے ادبی پر دکان دار کو ملامت کی اور معاملہ ختم ہو گیا۔ لیکن قاضی صاحب کے بعض مخالف لوگوں نے دکان دار کو اکسایا اور معاملہ عدالت میں چلا

❶ تفصیل کے لیے دیکھیے تذکرہ علمائے خان پور: صفحہ ۳۸-۴۰۔

گیا۔ عدالت نے بھی کوئی کارروائی نہیں کی اور دونوں فریقوں میں صلح کرادی۔

تصانیف:

جس طرح قاضی صاحب تقریر و خطابت میں تیز تھے اور ان کی زبان حق گوئی میں مشہور تھی، اسی طرح تصنیف و تالیف میں بھی انھیں خاص شہرت حاصل تھی اور ان کا قلم صدق و انصاف کے اظہار میں اپنی مثال آپ تھا۔ ان کی تصانیف مندرجہ ذیل موضوعات پر مشتمل ہیں:

۱- ردِ مرزائیت میں انھوں نے بہت کچھ لکھا۔ اس زمانے میں اپنے حریف کے رد و تردید میں اشتہارات شائع کرنے کا بھی رواج تھا۔ قاضی صاحب نے اس موضوع کی چھوٹی بڑی تصانیف کے علاوہ اشتہارات بھی شائع کیے۔ مصنف تذکرہ علمائے خان پور کو مرزائیت سے متعلق ان کا جو مطبوعہ مواد ملا، وہ چار کتابوں اور اشتہارات پر مشتمل ہے۔

۲- ردِ بدعات و اہل بدعت کے سلسلے میں ان کی سولہ کتب و اشتہارات کا علم ہو سکا ہے۔

۳- ردِ شیعیت کے موضوع پر ان کے چار اشتہارات و کتب کا پتا چلا۔

۴- ردِ تقلید میں دو کتابیں۔

۵- بعض مسائل کی تعبیر میں اہل علم کے درمیان اختلاف کا سلسلہ ہمیشہ سے جاری ہے۔ ان اختلافات سے بہت سی نئی چیزیں سامنے آتی ہیں اور مسائل نکھرتے ہیں۔ قاضی صاحب اور مولانا ثناء اللہ امرتسری کے درمیان بھی بعض مسائل میں اختلاف تھا۔ اس اختلاف کا اظہار قاضی صاحب نے چھوٹی بڑی چھے کتابوں میں کیا۔ دونوں جلیل القدر عالم اور وسیع المطالعہ بزرگ تھے۔ دونوں کی خدمات کا دائرہ بے حد وسعت پذیر تھا۔

ایک خواب:

ایک دفعہ جب کہ مخالفین نے قاضی صاحب کے خلاف بہت بڑا ہنگامہ بپا کر رکھا تھا اور قاضی صاحب اس کی وجہ سے پریشان تھے، ان کے چھوٹے بھائی قاضی محمد صاحب نے فرمایا بھائی صاحب! کیا آپ کو حضرت عبداللہ صاحب مرحوم کا خواب اپنے متعلق یاد ہے؟ آپ نے فرمایا: ''نہیں تو۔'' قاضی محمد صاحب نے کہا: ایک دفعہ انھوں نے آپ سے فرمایا تھا: ''عبدالاحد میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تمھاری ڈاڑھی بالکل میری ڈاڑھی کی طرح ہے۔'' اس پر آپ نے ان سے پوچھا تھا کہ پھر آپ نے اس کی کیا تعبیر فرمائی ہے؟ تو فرمایا کہ: ''اللہ جل شانہٗ تم سے حمایت توحید و سنت کی بڑی خدمت لے گا۔'' یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ اب میرا دل اس مقابلے کے لیے پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گیا ہے اور ان شاء اللہ مجھے مخالفین پر فتح نصیب ہو گی۔

چناں چہ ایسا ہی ہوا۔

حکیم اجمل خاں کی رائے:

حکیم محمد اجمل خاں دہلوی مشہور طبیب تھے۔ قاضی محمد اعظم مرحوم رئیس کھلابٹ بیان کرتے ہیں کہ حکیم صاحب ممدوح فرمایا کرتے تھے کہ قاضی عبدالاحد صاحب نے اپنی تحریروں میں فقہ کی کتابوں کے اس قدر حوالے دیے ہیں جو کسی اور جگہ یک جا نہیں مل سکتے۔ ایک طالب علم اور عالم دونوں اس سے بدرجہ اتم مستفید ہو سکتے ہیں۔

مرض اور وفات:

اب قاضی عبدالاحد صاحب کے مرض اور وفات کے متعلق سنیے!

قاضی عبداللہ علیگ لکھتے ہیں: ایک رات حسب معمول نماز تہجد کے لیے اٹھے۔ سرد ہوا لگنے سے شاید سرسام کی شکایت ہوگئی۔ اس کے بعد انھوں نے کبھی کھل کر باتیں نہیں کیں۔ کوئی سوال کیا جاتا تو ہاں یا نہ کے الفاظ میں بہت مختصر جواب دیتے۔ البتہ ہر نماز کے لیے خود کہتے کہ اب فلاں نماز کا وقت ہوگیا ہے، میں نماز پڑھوں گا۔ تیمّم کرکے بستر پر ہی نماز ادا کر لیتے۔

حکیم عبدالرحمٰن بن مولانا ہدایت اللہ ان کے شاگرد تھے، جو علاج میں مصروف رہتے اور جو دوا دیتے آپ سے پوچھ کر دیتے اور آپ حکیم صاحب کے مشورے سے اتفاق کرتے۔ تقریباً دو ہفتے یہی حالت رہی اور مرض میں کوئی افاقہ نہ ہوا۔ آخر ۲۵- جمادی الاخریٰ ۱۳۴۷ھ بروز شنبہ (۸- دسمبر ۱۹۲۸ء) کو صبح آٹھ بجے اس جہان فانی سے رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون.

پیر صاحب کی دعائے مغفرت:

قاضی صاحب کی خبرِ وفات پیر مہر علی شاہ صاحب کو پہنچی تو انھوں نے افسوس کیا اور مغفرت کی دعا کی۔ اس کا ذکر ''تذکرہ علمائے خان پور'' کے مصنف نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''جب قاضی صاحب کا انتقال ہوا تو سنا ہے پیر صاحب نے بہت افسوس کیا اور ان کے لیے دعائے مغفرت کی اور حاضرین کو بھی دعا میں شامل کیا۔ خبر دینے والے نے اپنے متعصّبانہ جوش میں یہ خبر یوں سنائی کہ عدوّ الاحد (خاکش بدہن) فوت ہوگیا۔ اس پر پیر صاحب نے اسے ڈانٹ پلائی اور کہا کہ تم نے بہت بری بات کہی۔ ایسے علما کی برکت سے دین قائم ہے۔ اگر یہ علما نہ ہوں تو ہم گمراہی کے گڑھے میں جا پڑیں۔''

اللہ تعالیٰ ہر دو کو مغفرت نصیب کرے۔ اب وہ باری تعالیٰ کے حضور جا چکے ہیں۔ فانهم افضوا الى

ما عملوا. [1]

تاریخ وفات:

قاضی صاحب کی تاریخ وفات بہ قول قاضی عبداللہ علیگ "خاتمہ مکارم اخلاق" ...... "گیا محمود وہ باغ جناں میں" ...... اور بہ ترکِ ہمزہ درحساب ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ﴾ سے نکلتی ہے۔

ان کے چھوٹے بھائی یوسف حسین صابر نے ان کی تاریخ وفات نظم میں اس طرح لکھی ہے:

سنو صابر یہ کیا نغمے میں غل میں
عنادل چہچہاتی شاخِ گل میں
لگی ہے بھیڑ کیا جنت کے پل میں
ہوا شور و فغاں بانگِ دہل میں
کہ سالِ وصلِ بحر الہند بولو
گیا عبدالاحد باغ و نزل میں

۱۳۴۷ھ

کتب خانہ:

قاضی صاحب کی وصیت کے مطابق ان کی کتابیں بذریعہ مولانا محمد اسماعیل غزنوی مرحوم حرمین شریفین پہنچا دی گئی تھیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں اس کی جزائے خیر عطا فرمائے۔ ان کتابوں کے ساتھ چند وہ کتابیں بھی چلی گئیں جو انھوں نے برائے مطالعہ اپنے چھوٹے بھائی قاضی محمد صاحب سے منگوائی تھیں۔

اللهم اغفرلهم و ارحمهم و عافهم و اعف عنهم.

[1] تذکرہ علمائے خان پور: صفحہ ۵۴، ۵۵.

مولانا عبدالعزیز ڈیروی

(وفات ۳ جنوری ۱۹۳۲ء)

آج سے کم و بیش ڈیڑھ سو سال پیشتر جنوبی پنجاب کے شہر ڈیرہ غازی خاں میں ایک عالم دین مولانا حافظ گل محمد سکونت پذیر تھے۔ ان کے تین بیٹے تھے حکیم غلام رسول، عبدالحکیم وثیقہ نویس اور مولوی عبدالرحیم۔ سب سے بڑے حکیم غلام رسول تھے جو ڈیرہ غازی خاں شہر کے ایک محلے چورہٹہ میں رہے۔ ان سے چھوٹے دونوں بھائی عبدالحکیم اور عبدالرحیم قصبہ یاروکھوسہ چلے گئے جو ڈیرہ غازی خاں سے سولہ سترہ میل کے فاصلے پر ہے۔

غلام رسول اس نواح کے مشہور طبیب بھی تھے اور عالم دین بھی۔ یہ اپنے علاقے کے پہلے شخص ہیں جنھوں نے وہاں مسلکِ اہل حدیث کی تبلیغ و اشاعت کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کے دو بیٹے تھے، بڑے عبدالعزیز اور چھوٹے حکیم عبدالمجید۔

ان سطور میں عبدالعزیز کے بارے میں چند باتیں بیان کرنا مقصود ہے جو ۱۸۷۷ میں پیدا ہوئے۔ حکیم غلام رسول نے خاص طور سے بیٹے کو تعلیم دلانے کا اہتمام کیا۔ ابتدائی تعلیم مقامی علما سے حاصل کی۔ اس کے بعد مولانا عبدالحق ملتانی کی خدمت میں ملتان بھیج دیے گئے، جن کا وہاں سلسلۂ تدریس جاری تھا اور مختلف مقامات کے طلبا ان سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اس زمانے میں ڈیرہ اسماعیل خاں میں وہاں کے ایک جلیل القدر عالم مولانا سلطان محمود صاحب کی بڑی شہرت تھی، عبدالعزیز نے ان کی خدمت میں بھی حاضری دی اور ان سے استفادہ کیا۔ بعد ازاں دہلی کے لیے رختِ سفر باندھا اور مولانا عبدالوہاب صاحب کے بابِ علم پر حاضر ہوئے۔ ان سے تفسیر و حدیث اور دیگر علومِ درسیہ کی تحصیل کی۔ اس وقت مولانا احمد اللہ صاحب پرتاب گڑھی دہلوی اور مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی ان کے ہم درس تھے۔

مولانا عبدالوہاب دہلوی سے سندِ فراغ لینے کے بعد کان پور گئے اور وہاں مولانا احمد حسن صاحب سے منقولات یعنی منطق و فلسفہ اور فلکیات وغیرہ علوم میں استفادہ کیا۔ اب انھوں نے علومِ مروجہ کی تحصیل کر لی تھی اور وعظ و تقریر کا باقاعدہ سلسلہ شروع فرما دیا تھا۔

یہ سطور ۳۔ستمبر ۲۰۱۲ء کو لکھی جا رہی ہیں۔ اب سے ایک سو چھے سال قبل دسمبر ۱۹۰۶ء میں ہندوستان کے صوبہ بہار کے شہر آرہ میں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کا قیام عمل میں آیا تو مولانا عبدالعزیز ڈیروی کا رابطہ

مولانا ثناء اللہ امرتسری (کانفرنس کے ناظم اعلیٰ) اور دیگر علمائے کرام سے ہوا، اور ملک کے مختلف مقامات میں کانفرنس کی طرف سے تنظیمی اور تبلیغی جلسوں کا انعقاد ہونے لگا۔ مولانا عبدالعزیز بھی ان جلسوں میں شامل ہوتے اور تقریریں کرتے تھے۔ ان کے اندازِ وعظ و خطابت سے متاثر ہو کر انھیں کانفرنس کی طرف سے مبلغ مقرر کر دیا گیا۔ مبلغ کی حیثیت سے انھوں نے دہلی اور پنجاب کے بہت سے بلاد و قصبات (بالخصوص جنوبی پنجاب) حیدر آباد دکن، کلکتہ، یوپی، سندھ اور صوبہ بہار کے متعدد مقامات میں تقریریں کیں اور مسلک اہل حدیث کی اشاعت کے لیے سرگرم رہے۔ پچیس سال انھوں نے یہ خدمت سرانجام دی۔ سرائیکی زبان کے یہ مشہور واعظ تھے۔ یہ ان کی مادری زبان تھی۔ اس زبان میں وہ بڑا موثر وعظ کرتے تھے۔

آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کے بہت سے مبلغ تھے جو برصغیر کے مختلف علاقوں کے لیے مقرر کیے گئے تھے اور کانفرنس کی طرف سے ان کی ماہانہ مدد کی جاتی تھی۔ ان میں سے بعض حضرات نے طویل عمر پائی اور قیام پاکستان تک نہایت ذوق و شوق سے یہ اہم خدمت سرانجام دیتے رہے۔ جولائی ۱۹۴۸ء میں مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان قائم ہوئی اور مولانا سید محمد داؤد غزنوی کو اس کے صدر منتخب کیا گیا تو مختلف اوقات میں صوبہ سرحد سے تعلق رکھنے والے کئی مبلغ مولانا غزنوی کے پاس آئے۔ میں اس وقت مرکزی جمعت کا ناظمِ دفتر تھا، مجھ سے بھی ان کی ملاقات ہوتی تھی اور وہ اپنے سلسلۂ تبلیغ سے متعلق پرانے دور کے علمائے کرام کی باتیں سنایا کرتے تھے۔ باتیں کرتے ہوئے بسا اوقات ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔

بہر حال عرض یہ کرنا ہے کہ مولانا عبدالعزیز ڈیروی کو آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کی طرف سے مبلغ ہونے کا شرف حاصل تھا اور یہ ایک جماعتی اعزاز تھا جو ان کے حصے میں آیا۔

مولانا عبدالعزیز ڈیروی اپنے عہد اور علاقے کے معروف مناظر بھی تھے۔ وہ مناظروں کا دور تھا اور مختلف مذاہب کے اہلِ علم کے درمیان یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ وہ امن کا زمانہ تھا اور مناظروں اور مباحثوں میں امن کی فضا قائم رہتی تھی۔ مسلمان علما کے مناظرے ہندوؤں اور عیسائیوں کے ساتھ بھی ہوتے تھے لیکن کسی مناظرے میں دنگا فساد کی نوبت نہیں آتی تھی۔

مولانا عبدالعزیز ڈیروی نے قادیانیوں، شیعوں اور احناف کے دونوں گروہوں (دیوبندی اور بریلوی حضرات سے) بھی مناظرے کیے اور ہندوؤں کے مختلف فرقوں آریوں اور سناتن دھرمیوں سے بھی ان کی پنجہ آزمائی ہوئی۔

ڈیرہ غازی خاں کے چوک چورہٹہ میں ایک مرتبہ ایک ہندو اہل علم سے مولانا ممدوح کا ”گائے ذبح کرنے اور اس کا گوشت کھانے“ کے موضوع پر مناظرہ ہوا۔ مولانا ہندی زبان جانتے تھے۔ انھوں نے ہندو

مذہب کی قدیم کتابوں سے ثابت کیا کہ گائے ذبح کرنا اور اس کا گوشت کھانا فطرت انسانی کے عین مطابق ہے۔ انھوں نے ہندو مذہب کی کتاب مہا بھارت اور ویدوں کی عبارتیں پڑھ کر بتایا کہ ہندو خود بھی گائے کا گوشت کھاتے تھے اور مہمانوں کی تواضع بھی اس کے گوشت سے کرتے تھے۔ ہندو مناظر مولانا کی کسی بات کا جواب نہ دے سکے اور مناظرے کا فیصلہ مولانا کے حق میں ہوا۔

ہندوستان کے مشہور عالم مولانا مقتدیٰ حسن اثری عمری نے ایک کتاب تذکرۃ المناظرین تالیف کی ہے جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس میں برصغیر پاک و ہند کے متعدد اہل حدیث علمائے کرام کے مناظروں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو انھوں نے ملک کے مختلف مسالک و مذاہب کے اہل علم سے کیے۔ یہ کتاب پہلی دفعہ ۲۰۰۲ء میں ادارہ تحقیقاتِ اسلامی جامعہ اثریہ دار الحدیث مئو یوپی (ہندوستان) میں چھپی۔ اس کے بعد پاکستان کے بعض ناشروں نے بھی شائع کی۔ اپنے موضوع کی یہ دلچسپ کتاب ہے۔ اِس کی جلد اول کے صفحہ ۴۱۳ پر مولانا عبدالعزیز ڈیروی کے بعض مناظروں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

وعظ و خطابت اور مناظروں کے علاوہ مولانا عبدالعزیز ڈیروی اپنے وقت کے اچھے طبیب اور نامور مدرس بھی تھے۔ ان کے شاگردوں میں مولانا الٰہی بخش، مولانا محمد اسماعیل جھنگوی، حکیم عبدالجبار چرٹوی، حاجی محمد ابراہیم، ملک محمد موسیٰ، حکیم نور احمد بھٹہ، میاں عبدالقادر بھٹہ اور مولانا ابوحفص عثمانی شامل ہیں۔ ان میں سے ایک دو کے سوا باقی سب ڈیرہ غازی خاں اور اس کے قرب و جوار کے علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ جس طرح ان کا وعظ پر تاثیر ہوتا تھا اسی طرح ان کا طریق تدریس بھی طلباء کے لیے بڑا موثر تھا اور وہ آسان الفاظ میں اپنے شاگردوں کو تعلیم دیتے تھے۔

مولانا عبدالعزیز مرحوم و مغفور کو تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی تھی۔ ان کی تصانیف میں ایک رسالہ ''سراج الوہاج فی اصلاح فصل الخطاب'' ہے جو بڑے سائز کے ۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس رسالے کی تصنیف کا پس منظر یہ ہے کہ ایک حنفی عالم قاضی عبیداللہ ڈیروی نے روایت اتبعوا السواد الاعظم کو موضوع بنا کر ''فصل الخطاب'' کے نام سے رسالہ لکھا، جس میں مسئلہ اجتہاد و تقلید پر بحث کی اور بتایا کہ سواد اعظم احناف ہیں اور یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مقلد ہیں، لہٰذا اس روایت کی رو سے سب کو تقلید کرنا چاہیے۔ مولانا عبدالعزیز کے پاس یہ رسالہ ۲۰ شعبان ۱۳۴۹ھ (۲۴- دسمبر ۱۹۳۰ء) کو پہنچا تو انھوں نے اس کا جواب ''السراج الوہاج فی اصلاح فصل الخطاب'' کے نام سے لکھا۔ مدلل اور تحقیقی رسالہ ہے۔ فاضل مصنف کی اردو زبان بہت صاف ہے۔ سرورق پر لکھا ہے: مؤلفہ عبدالعزیز واعظ آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس ڈیرہ غازی خاں نے...... محمدی پریس ڈیرہ غازی خاں سے باہتمام حکیم محمد خاں چھپوا کر شائع کیا۔

اس رسالے کی فوٹو کاپی مجھے ڈیرہ غازی خاں سے مولانا عبدالرحیم اظہر نے ارسال کی، جس پر میں ان کا شکر گزار ہوں۔

ان کی دوسری تصنیف ''العتاب فی ردّ العقاب'' ہے۔ خلافت راشدہ اور مسئلۂ فاتحہ خلف الامام کے موضوع پر بھی انھوں نے کتابچے لکھے۔

تبلیغ دین کے بارے میں مولانا عبدالعزیز ڈیروی کے دو واقعے قابل ذکر ہیں:

ایک واقعہ کا تعلق موضع پیر قتال سے ہے جو ڈیرہ غازی خاں کا ایک اہم علاقہ ہے اور جہاں ہر سال میلہ لگتا ہے۔ مولانا عبدالرحیم اظہر ڈیروی اپنے والد مکرم مولانا عبدالکریم ڈیروی مرحوم (سابق مدرس جامعہ سلفیہ فیصل آباد) کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ان کو ایک شخص حاجی مانجھی کھلول (مندرانی) مرحوم نے بتایا کہ ایک مرتبہ پیر قتال کے میلے میں بے شمار لوگ موجود تھے: ''ہم بھی میلے میں گئے تھے اور میلے کی گہما گہمی میں مست تھے کہ اچانک دل کو تڑپا دینے والا ایک منظر دیکھا۔ لوگ ایک درویش عالم دین مولانا عبدالعزیز کو پتھر مار رہے تھے اور وہ اپنی تبلیغ مسلسل جاری رکھے ہوئے تھے اور کہہ رہے تھے لوگو! اللہ تعالیٰ کے دین پر آ جاؤ...... بے حیائی کے کاموں کو چھوڑ دو...... بزرگوں کی قبروں پر جاؤ مگر شرک کے کاموں سے اجتناب کرو...... اس کائنات کا پیدا کرنے والا اور ہر قسم کی ضرورتیں مہیا کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے...... وہ پوری دنیا کی زبانیں جانتا ہے...... ہر شخص کے دل کے راز سے واقف ہے...... اسی کو پکارو...... اسی کے آگے ہاتھ پھیلاؤ...... اور اسی سے مانگو۔ اس کی عاجز، بے جان اور لاچار مخلوق کے درباروں میں جا کر ان سے مدد نہ مانگو۔''

حاجی مانجھی کہتے ہیں کہ لوگ انھیں مسلسل مار رہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر انھیں طائف کے لوگ یاد آ گئے، جنھوں نے نبی ﷺ کو اس وقت پتھر مارے تھے، جب آپ انھیں اسلام کی دعوت دینے وہاں گئے تھے۔ حاجی مانجھی نے دوڑ کر مولانا کو اپنے بازوؤں میں لے لیا، اور پھر حاجی صاحب مرحوم نے مسلک اہل حدیث قبول کر لیا۔ [1]

دوسرا واقعہ دربار پیر عادل کا ہے جو ڈیرہ غازی خاں شہر سے بجانب شمال تقریباً بارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ وہاں بھی سالانہ میلہ لگتا ہے، جس میں ہزاروں لوگ شامل ہوتے اور بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ وہاں ایک رقاصہ رقص کر رہی تھی اور بے شمار لوگ یہ رقص دیکھ رہے تھے۔ مولانا عبدالعزیز کو اس کا پتا چلا تو بے چین ہو گئے اور ان لوگوں سے جہاد کا فیصلہ کر لیا۔ جب وہاں پہنچے تو محفلِ رقص عروج پر تھی۔

---

[1] ملاحظہ ہو ہفت روزہ الاعتصام (لاہور) مورخہ ۳۱ جولائی تا ۶ اگست ۲۰۰۹ء، مضمون بہ عنوان مولانا عبدالعزیز ڈیروی، از مولانا عبدالرحیم اظہر ڈیروی۔

مولانا نے اس محفل سے قریب ہو کر انتہائی خوش الحانی سے قرآن شریف کی تلاوت شروع کر دی۔ اللہ کی مہربانی سے وہ مجمع اسی وقت ختم ہو گیا اور رقاصہ وہاں سے چلی گئی۔ [1]

کسی زمانے میں ڈیرہ غازی خاں میں اہل حدیث کی ایک ہی مسجد تھی، جسے مسجد عزیز کہا جاتا تھا۔ پھر ایک بزرگ حاجی محمد حسام الدین ملتانی ڈیروی نے ۱۹۱۵ء میں ایک مسجد بنائی۔ بعد ازاں بہت سے اہل حدیث علمائے کرام وہاں آئے۔ خود اس شہر اور علاقے میں بھی متعدد حضرات نے علم دین حاصل کیا۔ مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ناظمِ اعلیٰ حافظ ڈاکٹر عبدالکریم نے مسلک اہل حدیث کی اشاعت اور اس شہر اور علاقے میں مساجد کی تعمیر کے لیے بے حد کوشش کی۔ اب اللہ کی مہربانی سے ڈیرہ غازی خاں شہر میں بھی بہت سی مسجدیں تعمیر ہو گئی ہیں اور ضلع کے مختلف مقامات میں بھی اہل حدیث کی بے شمار مسجدیں تعمیر ہو گئی ہیں اور تعمیر ہو رہی ہیں۔ مدارس بھی جاری ہیں۔

مولانا عبدالعزیز ڈیروی نے صرف ۵۵ برس عمر پائی۔ ۳-جنوری ۱۹۳۲ء کو ان کا انتقال ہوا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون.

[1] ایضاً.

سید عبدالباقی نقوی سہسوانی

(وفات ۱۵- ستمبر ۱۹۳۵ء)

سہسوان کے علمائے کرام میں ایک مشہور عالم دین مولانا سید عبدالباقی نقوی تھے جو ۲۷ مئی ۱۸۵۷ء (۴- شوال ۱۲۷۳ھ) کو سہسوان میں پیدا ہوئے۔ والد مکرم کا اسم گرامی سید سراج احمد نقوی تھا اور بڑے بھائی کا نام نامی تھا سید عبدالباری۔ ابھی چار برس کے بچے تھے کہ والد وفات پا گئے۔ بڑے بھائی ان سے آٹھ سال بڑے تھے اور عمر بارہ سال تھی۔ ان کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے تلامذہ کرام کی فہرست میں قارئین کے مطالعہ میں آ چکا ہے۔

ان کے وادھیال اور ننھیال کے سب لوگوں کا شمار علما و صلحا میں ہوتا تھا۔

بڑے بھائی نے ان کی بہترین انداز میں تربیت کی اور سفر و حضر میں اپنے ساتھ رکھا۔ مختلف اوقات میں ان کا قیام بدایوں، دہلی، آگرہ، جون پور، لکھنؤ، بھوپال وغیرہ شہروں میں رہا۔ یہ بھی ہر جگہ ان کے ہم رکاب رہے اور پوری مروجہ تعلیم حاصل کی۔

بعض متوسطات اور انتہائی کتابوں کی تحصیل مولانا سید امیر حسن سہسوانی سے، بعض کی مولانا محمد بشیر سہسوانی محدث سے اور بعض کی شمس العلما مولانا سید امیر احمد سے کی۔ یہ سلسلہ ۱۲۹۴ھ/ ۱۸۷۸ء تک جاری رہا۔ اس کے بعد ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۹ء میں سید عبدالباری بھوپال تشریف لے گئے تو سید عبدالباقی بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہاں انھوں نے شیخ حسین عرب یمنی، قاضی بھوپال مولانا محمد مچھلی شہری اور مولانا محمد بشیر سہسوانی سے تفسیر و حدیث اور بعض دیگر کتابیں دوبارہ پڑھیں اور سند لی۔

بھوپال میں انھوں نے ملازمت بھی کر لی تھی اور مدرسہ سلیمانیہ میں درس و تدریس میں مشغول ہو گئے تھے۔ طلبا کی اچھی خاصی تعداد ان کے گرد جمع ہو گئی۔ بھوپال میں علما کی کثرت تھی اور مختلف مسائل میں باہم بحث و مباحثے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اس لیے جو شخص وہاں گیا، اس کے علم و مطالعہ میں وسعت آئی۔ سید عبدالباقی میں بھی یہ جوہر پیدا ہوا۔

سید عبدالباقی نے طبیعت موزوں پائی تھی اور وہ شاعر بھی تھے۔ عالی مرتبت عالم، بہت اچھے مدرس اور خوش گفتار خطیب۔ نظم، غزل، مثنوی، حمد، ہر صنفِ شعر میں مہارت رکھتے تھے۔ صالحیت اور امور خیر کی انجام

دہلی میں بھی ان کا ایک مقام تھا۔

تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی تھی۔ تاریخ پر بھی عبور حاصل تھا، قرآن و حدیث میں بھی درک تھا اور دیگر علوم پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کی تصانیف میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

۱- مجموعۂ اشعار، جس میں فارسی مثنوی اور دیگر اصنافِ شعر شامل ہیں۔

۲- بھوپال کے آثار قدیمہ

۳- بھوپال کے علاقہ رائے سین کی تاریخ

۴- تاریخ علاقہ مالوہ

۵- قول فیصل یعنی سورہ صٓ میں جو حضرت داوٗد علیہ السلام کے فیصلے کا ذکر کیا گیا ہے، اس کی تفسیر۔

۶- تنقید الانتقاد فی تحریم الربوا بالاستناد: یہ ایک رسالہ ہے۔ امرتسر کے ایک شخص عطا محمد نے ۲۷- دسمبر ۱۹۱۳ء کے اخبار ''وکیل'' میں ایک مضمون لکھا، جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ربا (سود) حرام نہیں ہے، سید صاحب نے اس رسالے میں اس کا جواب دیا اور سود کی قلیل مقدار کو بھی حرام قرار دیا اور کثیر کو بھی۔ انھوں نے اپنا موقف قرآن و حدیث کی روشنی میں نہایت وضاحت سے پیش کیا ہے، فرماتے ہیں:

''محقق امرتسری نے اپنے زعم میں اصل مسئلہ حرمت قطعیہ منصوصہ ربا کو حلت سے بدلنا چاہا ہے جو صریح خلاف و منافی آیات و احادیث و آثارِ صحابہ و اقوالِ فقہا ہے۔'' ❶

مسئلہ ربا کے موضوع پر یہ رسالہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

۷- الیاقوت المرجان فی ذکر علماءِ سہوان المعروف حیات العلماء۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ کتاب سہوان کے علمائے کرام کے حالات پر مشتمل ہے اور اس کا مختصر نام ہے ''حیات العلماء''۔ اپنے موضوع کی یہ نہایت اہم کتاب ہے۔ آغاز کتاب میں اس کی تصنیف کا پس منظر مصنفِ نام دار (سید عبدالباقی) ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

''باقتضائے مشیت الٰہی ۲۷- ماہ ذیقعدہ ۱۳۲۹ ہجری مطابق ۱۹-نومبر ۱۹۱۱ء روز یکشنبہ سے لغایت ۲- جمادی الاخریٰ ۱۳۳۱ ہجری مطابق ۹- مئی ۱۹۱۳ء روز جمعہ تک محلّہ لال باغ حضرت گنج شہر لکھنؤ میں میرا قیام رہا۔ اس زمانہ میں وہاں کے اکثر نامور علمائے دین و اولائے متقین کی مجالس مذاکرہ علمیہ میں بطور تفنن طبع شریک ہوتا تھا، جیسے مشہور مقتدائے قوم مولانا عبدالباری

❶ ضمیمہ حیات العلماء، صفحہ ۳۔

صاحب فرنگی محلی جو خدمات قومی و مذہبی میں نمایاں دلچسپی رکھتے ہیں اور حاجی مولانا شاہ عین القضاۃ صاحب جن کا زہد وتقویٰ اس دور آخر میں غنیمت سمجھا جاتا ہے۔ آپ کے ذاتی مصارف سے ایک مدرسہ تعلیم قرآن مجید و قراءت و تجوید وعلوم صرف ونحو و حدیث بڑے پیمانہ پر جاری ہے، جس میں صدہا طلبہ غیر مستطیع تعلیم پاتے ہیں اور ان کے لیے قیام وخوراک و پوشاک کا انتظام بھی مدرسہ ہی کی جانب سے ہے جزاہ اللہ خیراً۔ اور گاہ گاہ محبّ مکرم مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب ناظم ندوۃ العلمائی صحبتِ علمی میں اتفاقِ شرکت ہوا۔ آپ نے ایک مرتبہ باثنائے تذکرہ اہل علم فرمایا کہ ''ہم نے علماے ہند کا ایک مبسوط تذکرہ بزبان عربی لکھنا شروع کیا ہے۔ آپ اپنے وطن سہسوان کے علماے نامور کے حالات تحریر کر دیجیے تا کہ تذکرۂ مذکورہ میں درج کیے جائیں۔ سہسوان میں بکثرت علما وفضلاے کاملین گزرے ہیں، مگر ان کا ذکر کہیں تفصیل کے ساتھ نہیں دیکھا گیا۔'' میں نے ہر چند اپنی ناواقفی کا عذرِ واقعی پیش کیا۔ فرمایا جو کچھ حالات کم و بیش معلوم ہو سکیں وہی سہی۔ بحسنِ اتفاق دو مہینہ کے اندر ہی میرا وطن جانا ہوا اور اس خیال کو اپنے ساتھ لیتا گیا۔ بعض اعزہ سے اس امر خیر میں امداد کا خواہاں ہوا، مگر انھوں نے ایک بے اعتنائی کے ساتھ روکھا سوکھا جواب دیا، جس سے شوق وارادہ میں کمی پیدا ہوگئی۔ اسی حالتِ امید و یاس میں مخدومی مولوی سید ابن حسن صاحب ومکرمی منشی محمد فاخر حسین صاحب صدیقی فاخر تخلص سے کچھ تذکرہ آ گیا۔ ہر دو اصحاب نے میرے خیال کو بنظر استحسان دیکھا اور سرسری طور پر کچھ یادداشتیں بزور قوت حافظہ ایک ورق پر لکھ کر راہنمائی کی اور بعض مسودات غیر مطبوعہ کا پتا بتایا جن سے بہت کچھ مادہ تالیفِ کتاب راقم کے ہاتھ آیا۔ بس اسی ورق کو اس عظیم الشان عمارت کا سنگ بنیاد سمجھنا چاہیے۔ اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ افسردہ طبیعت کا حوصلہ پھر تازہ ہو گیا اور اسی دن سے احوال علما کی تلاش وجستجو شروع ہوگئی۔ مجھ کو فخر خاندان علامہ زمان عزیزی مولوی سید اعجاز احمد سلمہ ربہ کا بمزید ادعیہ ماثورہ صلاح وسعادت شکر گزار ہونا چاہیے جنھوں نے بکمال محنت و عرق ریزی بہت سے علماے کرام کے حالات اجمالی وتفصیلی تحریر کر کے مقام بسولی ضلع بدایوں سے میرے پاس قصبۂ رائے سین علاقۂ ریاست بھوپال میں بھیجے۔ اس تحریر سے واقعی تصنیف کتاب کو بہت بڑی مدد ملی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ایک سرسبز وشاداب چمن آپ کے پیش نظر ہے۔ اس کے سوا ترتیب وتہذیب کتاب میں بھی عزیز موصوف نے خاص حصہ لیا۔'' [1]

[1] حیات العلماء: ص ۱-۳.

سید اعجاز احمد کتاب کے فاضل مصنف سید عبدالباقی کے بڑے بھائی مولانا عبدالباری کے فرزند تھے۔

یہ کتاب ہمیں سہسوان کے کل ۸۴ افراد (علما، صلحا اور اطبا) کے حالات سے مطلع کرتی ہے۔ ان میں ۷۷ مرد ہیں اور سات خواتین۔ ایک خاتون کا نام لحاظ النساء ہے جو منشی شیخ صابر حسین صبا صدیقی کی صاحب زادی ہیں اور حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی، شیخ حسین عرب یمنی اور مولانا محمد بشیر سہسوانی کی شاگرد ہیں۔ ان تینوں حضرات سے انھیں اسنادِ حدیث عطا ہوئیں۔ اس خوش بخش خاتون کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں حضرت میاں صاحب کے تلامذہ کی فہرست میں کیا جا چکا ہے۔

شخصیات پر لکھنا اور رجال کا تذکرہ کرنا کتنا مشکل ہے، اس کا ذکر مصنف شہیر ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

> ''جن حضرات نے کوئی سوانح عمری لکھی ہے وہ خیال کر سکتے ہیں کہ ایک شخص کے حالات لکھنے میں کس قدر خونِ جگر کھانا اور دماغ سوزی کرنا پڑتا ہے، چہ جائیکہ ستر اسّی علما کے حالات جمع کرنا اور صحیح واقعات کو غیر صحیح سے بہ تحقیق و تنقید جدا کرنا، اس میں کیا کچھ مصائب کا سامنا نہ ہوا ہوگا۔'' ❶

مصنف رحمہ اللہ نے یہ بالکل صحیح فرمایا ہے۔ لکھنا بہت مشکل ہے، بالخصوص شخصیات کے حالات بیان کرنا بے حد دشوار ہے۔ معلومات جمع کرنے کے لیے مختلف لوگوں سے رابطہ کرنا اور حاصل شدہ معلومات کو خاص انداز سے ترتیب دینا، ذہنی اور عملی اعتبار سے نہایت پریشان کن معاملہ ہے۔

حیات العلما ۱۶۴ صفحات پر محیط ہے۔ مصنف نے یہ کتاب اواخر ۱۳۳۴ھ (۱۹۱۴ء) میں بمقام بھوپال لکھنا شروع کی تھی اور اواخر ۱۳۳۷ھ (۱۹۱۹ء) میں بقول مصنف ''مسودہ سے مبیضہ کی صورت جلوہ گر ہوئی۔'' ❷

کتاب کی تصنیف کے زمانے میں لائق تکریم مصنف اپنے وطن سہسوان سے سات سو میل (موجودہ حساب سے کم و بیش ایک ہزار کلومیٹر) دور ریاست بھوپال کے ایک قصبے رائے سین میں سکونت فرما تھے۔ کتاب کا زیادہ حصہ وہیں معرضِ تصنیف میں آیا اور یہ ۱۹۲۲ء (۱۳۴۰ھ) میں مطبع نول کشور لکھنؤ میں چھپی۔ ❸

مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی نے لکھا ہے کہ سید عبدالباقی سہسوانی نے ۱۶ جمادی الاخری ۱۳۵۴ھ (۱۵ ستمبر ۱۹۳۵ء) کو فیض آباد میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے۔ ❹

❶ حیات العلماء: ص ۳۔ ❷ حیات العلماء: ص ۱۵۰۔
❸ حیات العلماء: ص ۱۵۱-۱۵۸۔ ❹ تراجم علمائے حدیث ہند: ص ۲۵۷۔

مولانا کمال الدین ڈوگر فیروز پوری

(وفات ۱۹۴۴ء)

چھوٹا قد، لاغر اندام، کچھ سانولا سا رنگ، پتلی سی مہندی سے رنگین ڈاڑھی، شیریں گفتار اور کم گو۔ ہاتھ میں عصا، چلتے وقت کسی کے سہارے کے خواہاں۔ سادہ لباس کرتا، سفید تہبند اور سفید ململ کے عمامے پر مشتمل۔ یہ تھے ۱۹۳۹ء کے مولانا کمال الدین ڈوگر جن کو میں نے پہلی مرتبہ اسی سال فیروز پور کی جامع مسجد اہل حدیث گنبداں والی میں دیکھا۔ اس وقت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی وہاں تدریس و خطابت کا فریضہ انجام دیتے تھے اور میں ان کے حلقۂ درس میں شامل تھا۔ وہیں میں نے مولانا کمال الدین ڈوگر کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ان کی نیکی اور تقوے کی اس علاقے میں بڑی شہرت تھی۔ مختلف مقامات سے آ کر لوگ ان کے حلقۂ بیعت میں شامل ہوتے اور ان سے دعا کی درخواست کرتے۔

اسی زمانے میں ایک مرتبہ میں ان کے گاؤں گیا۔ سردیوں کا موسم تھا۔ وہاں کثیر تعداد میں لوگ مسجد میں ان کے اردگرد جمع تھے اور وہ انھیں وعظ فرما رہے تھے۔ میں نے اسی مسجد میں رات گزاری۔ ساری رات مسجد میں سرسوں کے تیل کی مدھم روشنی میں لوگ قرآن پڑھتے اور ہاتھ اٹھا کر اللہ سے دعائیں مانگتے رہے۔ نفل پڑھنے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اس ماحول میں دعا مانگتے وقت ایسا محسوس ہوتا تھا کہ واقعی اللہ تعالیٰ دعا قبول فرما رہا ہے۔ ساری فضا پر نورانیت کی چادر تنی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ اس چھوٹی عمر میں جی چاہتا تھا کہ مستقل طور پر یہیں سکونت اختیار کر لی جائے، لیکن میں ایک ہی رات وہاں رہا، دوسرے دن واپس فیروز پور آ گیا۔

یہ مولانا کمال الدین ڈوگر کون تھے؟ کہاں کے رہنے والے تھے؟ اور انھوں نے کن حضرات سے تحصیل علم کی؟

سنیے!

یہ ضلع فیروز پور کی تحصیل مکتسر کے ایک گاؤں چھینبیاں والی میں ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام ''رانا'' تھا، جنھیں لوگ ''سردار رانا'' کہا کرتے تھے۔ اچھی خاصی زمین جاداد کے مالک تھے۔ مولانا نے ابتدائی تعلیم موضع ''پنجے کے'' (ضلع فیروز پور کے) ایک عالم مولانا محمد دین سے حاصل کی۔ علمی اور تدریسی لحاظ سے اسی ضلع کے موضع لکھو کے کا بڑا شہرہ تھا۔ روحانیت اور صالحیت میں بھی لکھو کے کو بے حد اہمیت

حاصل تھی۔لوگ وہاں حصولِ تعلیم کے لیے بہ کثرت جاتے تھے۔روحانی فیض حاصل کرنے کے لیے بھی دور دراز سے لوگ اس چھوٹے سے گاؤں کا رخ کرتے تھے۔مولانا کمال الدین ڈوگر بھی لکھو کے پہنچے اور مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی سے فیض یاب ہوئے۔

مولانا کمال الدین ابتدائے عمر ہی سے متوکل علی اللہ اور قناعت پیشہ تھے۔ان کا زیادہ تر وقت تلاوتِ قرآن اور تدریسِ قرآن وحدیث میں گزرتا۔نہایت عابد وزاہد اور مستجاب الدعوات تھے۔

ان کے ایک خالہ زاد بھائی احمد الدین تھے۔وہ بھی مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے تلمیذ اور ارادت مند تھے۔۱۸۵۵ء میں ان کی ولادت اور ۱۹۴۰ء میں وفات ہوئی۔ایک مرتبہ مولانا کمال الدین اور مولانا احمد الدین کا اس مسئلے میں اختلاف ہوگیا کہ کراماً کاتبین یعنی وہ فرشتے جو دن رات انسانوں کے اچھے اور برے اعمال لکھتے ہیں، وہ روزانہ صبح وشام بدلتے ہیں یا آٹھ دن کے بعد بدلتے ہیں۔مولانا کمال الدین فرماتے تھے کہ آٹھ دن کے بعد ان کی ڈیوٹی بدلتی ہے اور مولانا احمد الدین کا موقف یہ تھا کہ روزانہ صبح وشام بدلتی ہے۔عصر کی نماز پڑھ کر مولانا کمال الدین گھوڑے پر سوار ہوئے اور گھر کو روانہ ہوگئے۔تھوڑی دور آگے گئے تو راستے میں اچانک آسمان کی طرف نظر اٹھی تو وہیں رک گئے اور دیر تک اوپر کو دیکھتے رہے۔اس وقت ایک شخص ان کے ساتھ تھا۔اس نے آواز دی مولوی صاحب رک کیوں گئے ہیں، آگے چلیں۔فرمایا: نہیں اب آگے نہیں، پیچھے چلیں۔چنانچہ واپس مولانا احمد الدین کے پاس آئے اور فرمایا بھائی میں نے مشاہدہ کر لیا ہے۔آپ کی بات صحیح ہے۔میں نے خود دیکھا کہ دن کے فرشتے (کراماً کاتبین) اوپر جارہے ہیں اور رات کے نیچے آرہے ہیں۔ ❶

مولانا موصوف صاحبِ کرامات بزرگ تھے۔ان کا یہ واقعہ بڑا مشہور ہے کہ ایک مرتبہ کھڈیاں خاص (ضلع قصور) میں ایک تبلیغی جلسہ منعقد ہوا، جس میں مولانا کمال الدین ڈوگر بھی تشریف فرما تھے۔جلسہ مسجد میں ہو رہا تھا اور خاصی تعداد میں لوگ شریکِ جلسہ تھے۔مسجد میں بہت سے کیڑے تھے، جن سے لوگ پریشان تھے۔اس کا ذکر مولانا سے کیا گیا تو فرمایا ایک کیڑا پکڑ کر مجھے دو۔چنانچہ کیڑا پکڑ کر مولانا کو دیا گیا تو انھوں نے اسے ہتھیلی پر رکھا اور فرمایا: بھائی وعظ ونصیحت کی ضرورت تو انسانوں کو ہے، اسی لیے یہ لوگ یہاں جمع ہوئے ہیں اور قرآن وحدیث کے مسائل سن رہے ہیں۔تمھیں تو اس کی ضرورت نہیں، تم یہاں کیوں آئے ہو۔پھر کچھ پڑھ کر اس پر پھونک ماری اور ایک شخص سے کہا جاؤ اسے گاؤں سے باہر چھوڑ آؤ۔

وہ شخص کیڑا لے کر باہر چلا گیا اور تمام کیڑے اسی وقت غائب ہوگئے۔

---

❶ الفیوض المحمدی (از مولانا محمد ابراہیم خلیل فیروز پوری): ص ۲۱۸۔

ضلع فیروز پور اور موجودہ ضلع قصور میں ان کے بے شمار عقیدت مند موجود تھے جن کی ان کے ہاں آمد و رفت رہتی تھی۔ وہ ان سے مسائل دریافت کرتے اور مختلف اوقات میں پڑھنے کے لیے وظائف پوچھتے تھے۔ ان کی مسجد میں مقامی اور غیر مقامی طلبا بھی تعلیم حاصل کرتے تھے۔

اس صالح ترین عالم نے ۱۹۴۴ء میں وفات پائی۔

مولانا مرحوم و مغفور کے بڑے بیٹے مولوی فقیر اللہ تھے۔ ان کو مختلف درسی علوم کی کتابیں خود مولانا نے پڑھائیں۔ پھر لکھو کے جا کر حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی سے کتب حدیث اور بعض انتہائی کتابوں کی تکمیل فرمائی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے گاؤں میں مدرسہ جاری کیا، جس سے طلبا مستفید ہوئے۔ افسوس ہے مولانا کی زندگی ہی میں عین عالم جوانی میں بہ عمر پینتیس (۳۵) سال ۱۹۴۲ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ یہ بہت بڑا صدمہ تھا جو مولانا کو بڑھاپے میں پہنچا۔

اللهم اغفرلهما و ارحمهما و عافهما و اعف عنهما.

مولانا عبداللہ معمار امرتسری

(وفات ۲۶-اپریل ۱۹۵۰ء)

درمیانہ قد، دبلے پتلے، سادہ مزاج، پیکر انکسار، نرم کلام، مرزائی لٹریچر پر عبور اور مرزائیت کے خلاف بہت بڑے مناظر، یہ تھے مولانا عبداللہ معمار امرتسری۔ ۱۸۹۵ء کے لگ بھگ امرتسر کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ تعلیم صرف چار جماعت تک حاصل کر سکے۔ پھر غربت نے محنت مزدوری کی راہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ مکانوں کی تعمیر کا کام سیکھا اور لفظ معمار ان کے نام کا جز بن گیا۔

اس زمانے میں بالخصوص پنجاب میں مرزائیت کا بہت چرچا تھا اور مباحث و مناظرات کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ مناظرین کی وسیع فہرست میں حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم و مغفور کا نام بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ عبداللہ معمار اگرچہ مزدوری کرتے تھے، لیکن نہایت ذہین تھے اور مرزائیوں کے خلاف مناظروں میں شامل ہونے اور ان کی مخالف و موافق کتابوں کا مطالعہ کرنے کا انھیں بے حد شوق تھا۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری سے ان کا کچھ قرب ہوا تو مولانا نے ان کے اندر چھپے ہوئے جوہر کو پا لیا اور انھیں مناظرے کے فن سے آگاہ کیا۔ اس انداز سے ان کی تربیت کی کہ بہت جلد ایک تجربہ کار مناظر کے روپ میں عوام کے سامنے آ گئے۔ وہ دھیمے لہجے میں مؤثر تقریر کرتے تھے اور یہی اسلوب ان کے مناظرے کا تھا۔

میں نے ان کو اوّلیں مرتبہ اپنے وطن (کوٹ کپورہ ریاست فرید کوٹ) میں ۱۹۳۵ء میں دیکھا تھا۔ میری عمر اس وقت دس گیارہ برس کی تھی۔ ہمارے ہاں ایک گھر مرزائیوں کا تھا۔ ان کی لڑکی کی شادی کے موقعے پر بارات میں مرزائیوں کے ایک مبلغ عبدالغفور بھی آئے تھے۔ انھوں نے وہاں تقریر کی اور مناظرے کا چیلنج کیا۔ اس زمانے میں حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی وہاں خطابت و تدریس کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ عبدالغفور کے چیلنج کے فوراً بعد وہ مولانا عبداللہ معمار کو لانے کے لیے امرتسر روانہ ہوئے اور شام کی ٹرین سے انھیں اپنے ساتھ لے کر کوٹ کپورہ پہنچ گئے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ مولانا معمار کے مکان پر گئے تو پتا چلا کہ وہ کسی کے مکان کی تعمیر میں مصروف ہیں۔ اب وہ اس مکان پر پہنچے اور انھیں صورتِ حال سے آگاہ کیا تو وہ کام چھوڑ کر اپنے گھر آئے اور لباس بدل کر مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ آتے ہی مرزائی مبلغ کے ساتھ مناظرے کے متعلق گفتگو شروع ہو گئی۔ مناظرہ تو نہ ہوا البتہ مرزائیوں کے مکان کے

قریب ہی عید گاہ میں جلسے کا انتظام کیا گیا، جس میں مولانا عبداللہ معمار نے دو گھنٹے تقریر کی اور مرزائیوں کو بار بار مناظرے کی دعوت دی مگر کوئی میدان میں نہ آیا۔

کوٹ کپورہ سے سات آٹھ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں ''شیر گھری'' تھا۔ وہاں دو تین گھر مرزائیوں کے تھے۔ انھوں نے کسی مرزائی مبلغ کو اپنے ہاں بلایا بھی تھا جو وہاں تقریریں کر رہا تھا۔ وہاں کے ایک با اثر زمین دار مسلمان ثناء اللہ صاحب اپنے ساتھ مولانا عبداللہ معمار کو لے گئے۔ مولانا نے وہاں تقریر کی اور مرزائیت کی تحریک اور تاریخ معرضِ بیان میں لائے، لیکن مرزائی مبلغ مقابلے میں نہ نکلا۔

مولانا عبداللہ معمار مناظرے کے علاوہ تحریر کا بھی صاف ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ انھوں نے مرزا غلام احمد قادیانی سمیت چھوٹے بڑے مرزائیوں کی تقریباً تمام تحریریں جمع کر رکھی تھیں اور پھر مرزائیت کے خلاف انھوں نے مختصر یا مفصل کئی رسالے لکھے جو لوگوں کے مطالعہ میں آئے، لیکن اس موضوع پر ان کی ایک نہایت اہم کتاب ''محمدیہ پاکٹ بک'' ہے۔ اس کتاب میں مرزائیت کے بارے میں جو مواد جمع کر دیا گیا ہے اتنا مواد شاید ایک جگہ کسی اور کتاب میں نہیں مل سکے گا۔ یہ کتاب بہت چھپی اور بہت پڑھی گئی۔

تقسیم ملک کے زمانے (اگست ۱۹۴۷ء) میں مولانا عبداللہ معمار امرتسر سے نکلے تو گھر کی کوئی چیز نہیں اُٹھائی، لیکن مرزائیت سے متعلق انھوں نے جو کچھ جمع کر رکھا تھا، اس میں سے کوئی چھوٹا موٹا کاغذ تک وہاں نہیں چھوڑا، سب کچھ بوریوں میں ڈالا اور کسی نہ کسی طرح اُٹھا کر پاکستان پہنچ گئے۔ وہ اسے اپنی اصل جاداد قرار دیتے تھے۔

مرزا غلام احمد قادیانی کی کتابیں بہت سے عجیب وغریب مواد پر مشتمل ہیں۔ ان کی موت کے بعد یا تو انھیں شائع ہی نہیں کیا گیا یا پھر ان کے مندرجات میں تبدیلی کر دی گئی، لیکن مولانا عبداللہ معمار کے پاس مرزا صاحب کی تمام اصل مطبوعات موجود تھیں، جن کی عبارتوں کے وہ مناظروں اور تقریروں میں حوالے دیا کرتے تھے۔ ان کتابوں کی وہ بے حد حفاظت کرتے تھے۔

تقسیم ملک کے بعد وہ گوجراں والا آ گئے تھے اور یہیں سکونت اختیار کر لی تھی، لیکن چوں کہ مرزائیوں نے چنیوٹ کے قریب اچھی خاصی زمین خرید کر ''ربوہ'' کے نام سے ایک قصبہ آباد کر کے اسے اپنا مرکز بنالیا تھا، اس لیے مرزائیوں سے مقابلے کے لیے چنیوٹ کی انجمن اہل حدیث مولانا عبداللہ معمار کو اپنے یہاں لے گئی تھی۔ بہ طور مبلغ بعض اور لوگوں کی خدمات بھی اس انجمن نے حاصل کر لی تھیں۔ مولانا عبداللہ معمار کے اہل وعیال گوجراں والا ہی میں مقیم تھے، وہ تنہا چنیوٹ میں اقامت گزیں تھے۔

۱۹۵۰ء کے وسط اپریل میں وہ بیمار ہوئے۔ کمزور تو پہلے ہی سے تھے، بیماری کی وجہ سے مزید کمزور ہو

گئے۔آخر ۲۶ اپریل ۱۹۵۰ء کو پچپن (۵۵) سال کی عمر پا کر رہگرائے عالم بقا ہوئے۔انّا للّٰہ و انا الیہ راجعون.

ان کی میت چنیوٹ سے گوجراں والا لائی گئی۔نمازِ مغرب کے بعد آٹھ بجے نمازِ جنازہ حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی مرحوم نے پڑھائی اور دس بجے شب انھیں گوجراں والا کی خاک کے سپرد کر دیا گیا۔
اللّٰھم اغفر لہ وارحم و عافہ واعف عنہ.

ڈاکٹر سید محمد فرید

(وفات ۲۸- جون ۱۹۵۱ء)

ڈاکٹر سید محمد فرید ہندوستان کی جماعت اہل حدیث کے مشہور اور نامور راہنما تھے۔ ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھے۔ صوبہ بہار کی اسمبلی کے رکن تھے۔ کتاب و سنت کے متبع اور مخلص ترین مبلغ تھے۔ اپنے ملک کے بعض دینی اور تعلیمی اداروں کے بانی اور معاون تھے۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں مؤثر تقریر کرتے تھے۔ اسمبلی کے رکن کی حیثیت سے انھوں نے صوبہ بہار کے مسلمانوں کی بڑی خدمت کی۔ صادق پور (عظیم آباد) کے ان اہل حدیث علمائے کرام سے تعلق رکھتے تھے، جنھیں انگریزی حکومت نے بغاوت کے جرم میں گرفتار کر کے عمر قید کی سزا دی تھی اور ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑ کر کالا پانی بھیجا تھا۔ پھر ان میں سے بعض وہیں وفات پا گئے تھے اور بعض کو بیس سال کی سخت سزا کے بعد اپنے وطن آنے کی اجازت دی گئی تھی۔

ڈاکٹر سید محمد فرید کے حالات میں ہفت روزہ ''الہدیٰ'' دربھنگہ (بہار) کے دار العلوم نمبر بابت اپریل مئی ۱۹۵۵ء میں ان کے فرزند گرامی ڈاکٹر سید عبدالحفیظ سلفی کا مضمون چھپا تھا جو مولانا عارف جاوید محمدی نے مجھے کویت سے ارسال کیا۔ الفاظ کے رد و بدل کے ساتھ وہی مضمون اس کتاب (چمنستانِ حدیث) میں درج کیا جا رہا ہے۔ مضمون بہت سے واقعات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ افسوس ہے ڈاکٹر سید عبدالحفیظ سلفی بھی بہت عرصہ ہوا وفات پا گئے ہیں۔ اب ملاحظہ فرمایے ان کا مضمون:

دنیا میں جو آیا ہے، اسے یہاں سے جانا ہے، لیکن خوش بخت ہیں وہ ہستیاں جن کی زندگیاں اور صلاحیتیں خدا کی راہ میں صرف ہوئیں۔ یہ شخصیتیں اگرچہ دنیا سے اٹھ جاتی ہیں لیکن ان کی یاد ہمیشہ دلوں میں تازہ رہتی ہے۔ بلاشبہ موت ان کے جسموں کو فنا کر دینے پر قدرت رکھتی ہے مگر ان کی عظمت و رفعت اس کی دست برد سے ہمیشہ محفوظ رہتی ہے۔ یہ عظیم روحیں اپنے رفیق اعلیٰ سے ملنے کے باوجود بھی دنیا والوں کے لیے ہمیشہ ہدایت و راہنمائی کا کام دیتی ہیں اور ان کے نقشِ پا کو دیکھ کر ہر گزرنے والا بے ساختہ پکار اٹھتا ہے۔

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے

والد مرحوم جناب ڈاکٹر سید محمد فرید رحمہ اللہ کی ذاتی گرامی انہی چند خوش نصیبوں میں سے ہے کہ جن کی یاد کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی۔ ان کی شخصیت درحقیقت ایک تاریخی معمار قوم کی معلوم ہوتی ہے کہ ایک وہ شخص

جس کی تعلیم و تربیت انگریزی ماحول میں ہوئی ہو کس طرح دین کا خادم اور قوم کا محبوب راہنما بن گیا اور اس نے اپنی ساری زندگی اعلاے کلمۃ اللہ، امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور قرآن مجید کی پاک تعلیمات کو پھیلانے میں وقف کر دی۔ جس نے کسی مدرسے میں کسی استاد کے سامنے باقاعدہ زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا لیکن ایسا مفسرِ قرآن بن گیا کہ جس کے نکاتِ قرآنی پر بڑے بڑے علما اور فضلا رشک کرنے لگے۔ ایک مرتبہ آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ آرہ میں مرحوم نے ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ پر ایسی پر اثر تقریر فرمائی کہ مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری رحمہ اللہ نے تقریر کے بعد بیان فرمایا کہ آج ہم یہ اعلان کرنے میں فخر محسوس کر رہے ہیں کہ علما کی صف میں ڈاکٹر فرید صاحب جیسے عالم دین کا ایک بہتر اضافہ ہوا۔ مولانا عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ "ایک مرتبہ ایک آیت کا ایسا مطلب انھوں نے بیان فرمایا کہ مجھے رشک ہوا۔" مولانا عبدالجبار صاحب محدث کھنڈیلوی ان کے درس قرآن میں کئی سال تک پابندی سے شرکت فرماتے رہے۔ لکھتے ہیں "ڈاکٹر صاحب موصوف درس قرآن میں ایسے معانی و مطالب پر روشنی ڈالتے کہ میرے لیے بیان کی کوئی گنجائش نہ رہتی۔ قرآنی لغات پر انھیں عبور تھا۔"

مرحوم کو جس چیز نے اپنے ہم عصروں میں اس قدر بلند کر دیا تھا، اس کا اگر حل ڈھونڈنا ہو تو دو حقیقتوں پر نظر رکھنی چاہیے۔ ایک ان کا سچا خلوص اور دوسرے دیانت جو عام طور سے آج کل کے راہنماؤں میں مفقود ہے۔ ان کی زندگی کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ دنیا اور آخرت کے کاموں کی انھوں نے تقسیم نہیں کی بلکہ ہر کام کو عبادت اور رضاے الٰہی کے جذبے سے انجام دیا کرتے تھے۔

غرض مرحوم کی زندگی آئینۂ کمالات اور مسلمانوں کے لیے نمونۂ عمل تھی اور بلاشبہ یہ مقام ایسے ہی لوگوں کو نصیب ہوتا ہے جو خدا کے محبوب ترین بندے ہوتے ہیں۔

والد مرحوم کی جس طرح قومی زندگی کامیاب تھی، ٹھیک اسی طرح ان کی خانگی اور تاہل کی زندگی بھی بڑی کامیاب گزری۔ گھریلو تربیت کا یہ انداز رہا کہ ان کی عظمت و ہیبت کے ساتھ ساتھ خاندان کے ہر فرد کے دل میں ان کی ایک خاص محبت تھی اور ان کی رضامندی کے خلاف کوئی کام کرنے کی کسی کو جرأت نہیں ہوتی تھی۔ گھر میں ایسا اتفاق و اتحاد قائم رہا جس کی نظیر دنیا میں مشکل ہی سے ملا کرتی ہے، ہم ان کے حالات پر نہایت اختصار کے ساتھ روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

ابتدائی زندگی اور تعلیم:

ولادت کی تاریخ تو محفوظ نہیں لیکن تعلیم سے یہ اندازہ کیا جاتا ہے ۱۸۸۰ء سے کچھ قبل یا بعد کا زمانہ ہے

کہ جس میں ان کی پیدائش ہوئی۔ مڈل تک کی تعلیم پٹنہ ضلع کی ایک مشہور بستی سائیں میں ہوئی۔ یہاں سے فراغت کے بعد اپنے رشتہ کے ماموں مولوی محمد یعقوب صادق پوری کے یہاں تشریف لائے اور محمڈن ہائی اسکول گلزار باغ پٹنہ میں داخلہ لیا۔ انھوں نے اپنے ہونہار بھانجے کی تربیت کا بھی حق ادا کر دیا اور نہ صرف پوری کفالت فرمائی بلکہ رات کی تاریکیوں میں نام لے لے کر دعائیں دیتے رہے اور بحمداللہ وہ دعائیں بہ درجہ اتم قبولیت کو پہنچیں۔ خدائے تعالیٰ کی یہ بھی ایک بڑی مصلحت تھی کہ اس نے ان کو صادق پور جیسے اسلامی مرکز میں پہنچا دیا، جہاں حادثۂ بالاکوٹ کے بعد پوری اسلامی تحریک سمٹ کر آ گئی تھی۔

چونکہ انھوں نے آئندہ چل کر علاقہ ترہت کی تحریک اہل حدیث کا پورا بار اٹھانا تھا اور مولانا عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی رحمہ اللہ کی صحیح جانشینی کرنی تھی، اس لیے ان کی تربیت کے لیے صادق پور کا مقام ہی زیادہ مناسب تھا۔ یہاں رہ کر وہ صادق پور کے فیوض و برکات سے مستفیض ہوئے اور اس اسلامی تحریک کے تمام عمومی و خصوصی حالات کا جائزہ لیتے رہے جو کسی زمانے میں یہاں سے شروع ہوئی تھی۔ پھر اسی جذبے سے سرشار ہو کر مدت العمر خلوص وللہیت کے ساتھ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جدوجہد فرماتے رہے۔ ذلك فضل الله يوتيه من يشاء۔

ابتداء ہی سے کھیل کود سے نفرت تھی۔ تعلیم سے جو کچھ بھی وقت بچتا، اس میں ہمسائیوں کی ضروریات کے لیے نکل جاتے۔ غریبوں کے خطوط لکھنا، بیواؤں کی خدمت گزاری اور اس طرح کے بہت سے ایسے کام تھے جو ان کے ہاتھوں انجام پاتے بلکہ ضرورت مند ان کے منتظر رہا کرتے اور وہ ان کے کاموں کو بڑی خندہ پیشانی اور خوشی سے انجام دیتے، چونکہ خدا کو ان سے آئندہ اپنے دین کی بیش بہا خدمات انجام دلانی تھیں اس لیے طبیعت میں سادگی اور تواضع کا عنصر غالب تھا اور خدمت خلق کی لگن ابتدا ہی سے فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی۔

ہائی اسکول میں انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ فارسی کی تعلیم مولانا یحییٰ علی صاحب کے فرزند مولانا عبدالقیوم صاحب سے حاصل کرتے رہے۔ اس دوران میں انھیں مولانا اسحاق صاحب مرحوم سے بھی استفادے کا کافی موقع ملا۔ مولانا موصوف نہایت نرم مزاج اور ناصح بزرگ تھے۔ قرآن مجید اور عبادتِ الٰہی سے خاص شغف رکھتے تھے، ایک طرف وہ ان کی کیمیا ساز نصیحتوں سے عرصے تک مستفیض ہوتے رہے تو دوسری طرف مولانا عبدالقیوم صاحب کی نصیحتیں گھر پر اور اسکول میں فردوس گوش بنتی رہیں۔ جمعے میں ان کا خطبہ ہمیشہ سننے کا اتفاق ہوتا رہا۔ علاوہ ازیں مولانا عبدالحکیم صاحب صادق پوری رحمہ اللہ کے مواعظ حسنہ ہفتہ وار نماز مغرب کے بعد صادق پور کی مسجد میں ہوا کرتے تھے۔ سبحان اللہ کیا اچھا ماحول تھا۔ ان باتوں کے مجموعی اثرات نے ان کو ایک ایسی شخصیت کے روپ میں نمایاں کیا جس میں تقویٰ، انابت الی اللہ، رحم دلی، تواضع،

حلم اور خدا شناسی کے جوہر پائے جاتے تھے۔ یہ چیزیں ان کی سیرت کا عنوان بن گئیں اور ان کی زندگی ان صفات کے آئینہ میں نکھر کر دنیا کے سامنے اس طرح آئی کہ لوگ حیرت زدہ ہو گئے۔

اسی کے ساتھ ساتھ مولانا عبدالسلام صاحب رحمہ اللہ مبارک پوری (مصنف سیرت البخاری) کی صحبتوں میں رہ کر ان کو قرآن مجید کے رموز و غوامض اور اس کی تفسیروں کے سننے کا بھی اکثر اتفاق ہوتا رہتا۔ رفتہ رفتہ اس لذتِ قرآن دانی نے انھیں اتنا محبِ قرآن بنا دیا کہ وہ متعدد تراجم، تفاسیر اور حواشی کو سامنے رکھ کر کتاب اللہ کی آیتوں پر تنہائی میں گھنٹوں غور فرماتے۔ کارسازِ حقیقی نے ان کی طبیعت میں ایسی جولانی رکھی تھی کہ قرآن مجید کے رموز و اسرار ان پر کھلتے گئے اور آہستہ آہستہ ان کی معرفت و بصیرت ایک ایسے نقطۂ کمال پر پہنچ گئی، جہاں خدا کی عنایتوں سے خاص خاص لوگ ہی پہنچ سکتے ہیں۔ ان کی زندگی کے مشاغل میں کتاب اللہ کی تلاوت کو جتنا دخل تھا کسی دوسری چیز کو نہیں تھا۔ ان کے معمولات میں ہمیشہ یہ چیز داخل رہی کہ نماز فجر کے بعد متعدد تفاسیر و تراجم کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت فرماتے۔ ایک مضمون کی متعدد آیتوں کی تلاش و تفحص کے بعد ان کے مفہوم پر غور کرتے اور تمام باریکیوں کو عمیق نظر سے ملاحظہ فرماتے۔ خاص خاص اشارات کو نوٹ فرماتے جاتے اور ان کی کنہ تک پہنچنے میں پوری توجہ سے کام لیتے۔ آیتوں کے رموز تک پہنچنے کے بعد ان کو جو خاص لذت و فرحت محسوس ہوتی وہ احاطۂ تحریر میں نہیں آ سکتی۔

قرآن مجید کی پاک تعلیمات کو بندگانِ خدا تک پہنچانے میں بھی قدرت نے ان کو خاص کمال عطا کیا تھا، یوں تو ہر اتوار کو محلے کی مسجد میں ان کا درس قرآن ہوتا اور بدھ کو دار العلوم کے طلبا کو قرآن کے رموز و غوامض سے روشناس کراتے مگر اپنی نجی صحبتوں اور مطب کی نشستوں میں بھی بالعموم یہ فیض جاری رہتا اور ہر مریض و ضرورت مند کے جسمانی معالجہ کے ساتھ ساتھ روحانی علاج کا بھی اہتمام فرماتے رہتے۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد میڈیکل سکول میں داخلہ لیا۔ یہاں داخل ہو جانے کے بعد صادق پور سے منتقل ہو کر سبزی باغ میں اقامت گزیں ہو گئے۔ اگرچہ صادق پور کی وہ بابرکت صحبتیں جدا ہو گئی تھی، لیکن اس کے باوجود حضرت مولانا عبدالحکیم صاحب رحمہ اللہ صادق پوری کے وعظ میں پابندی کے ساتھ شریک ہوتے۔ اس وقت مولانا مرحوم جامع مسجد مراد پور کے امام تھے اور ہر پندرھویں شب میں درسِ قرآن دیا کرتے تھے۔ ان کا بیان نہایت پر اثر اور قرآنی نکات سے بھرپور ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ مولانا عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی رحمہ اللہ سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ جلسوں میں دوسرے علما کے وعظ میں شرکت نہیں فرماتے اور پھر جب مولانا عبدالحکیم صاحب کا بیان ہوتا ہے تو خصوصیت کے ساتھ آتے ہیں۔ اس کے جواب میں مولانا رحیم آبادی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ علما اپنے اپنے وعظ میں بہت کچھ بیان کرتے ہیں لیکن مولانا عبدالحکیم کے وعظ میں

صرف قرآن کا بیان ہوتا ہے اسی لیے میں اس میں شریک ہوتا ہوں اور استفادہ کرتا ہوں۔ بحمد اللہ یہی رنگ ہم لوگوں نے حضرت مولانا عبدالحکیم کے خلف الرشید حضرت مولانا عبدالخبیر صاحب میں پایا۔ قرآن مجید کی جو معرفت وبصیرت اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمائی، اس میں ان کا ثانی کوئی نظر نہیں آتا ہے۔

ڈاکٹری کی تعلیم کے زمانے میں حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری رحمہ اللہ مدرسہ احمدیہ آرہ سے بانکی پور قرآن مجید کے درس کے لیے تشریف لایا کرتے تھے۔ والد صاحب بالالتزام ان کی علمی مجالس میں شرکت فرماتے۔ جناب حافظ صاحب رحمہ اللہ کے درس میں شریک ہونے کا نتیجہ تھا کہ اپنے بچوں کو حافظِ قرآن کے ساتھ ساتھ عالم بنانے کا شوق دل میں پیدا ہوا۔ اکثر صحبتوں میں جناب حافظ صاحب کے تقویٰ اور تدین کا ذکر فرمایا کرتے۔

غرضیکہ صادق پور سے الگ ہو جانے کے بعد بھی والد صاحب کا روحانی تعلق وہاں سے باقی رہا اور یہاں بھی ان بزرگوں کی صحبتوں سے فیض یاب ہوتے رہے۔ اس طرح ان کی دنیاوی تعلیم دینی تعلیم وتربیت کے پہلو بہ پہلو ترقی کرتی رہی اور ڈاکٹری کی تعلیم میں نمایاں کامیابی حاصل کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فراغت کے بعد ہی ملازمت مل گئی اور دربھنگہ کے ایک گاؤں موضع بجولی میں پہلی تقرری ہوئی۔ ان کی فطری ذہانت اور صلاحیت سے سول سرجن اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے ان کو جلد ہی دربھنگہ بنواری لال اسپتال کا انچارج بنا دیا۔ یہاں آکر ان کے جوہر نمایاں ہونے لگے۔ ان کی شہرت اطراف و جوانب میں پھیل گئی۔ اسپتال کے اوقات کے علاوہ مریضوں کا ہجوم مکان پر بھی رہا کرتا۔ رفتہ رفتہ مریضوں کی کثرت کا یہ انداز ہو گیا کہ بسا اوقات اسپتال وقت پر پہنچنا مشکل ہو جاتا۔ اس صورت حال کو انھوں نے دیانت کے خلاف سمجھا اور بالآخر اپنا استعفا حکومت کے سامنے پیش کر دیا۔ ملازمت سے سبک دوشی کے بعد ان کو خدمت دین کا بھی موقع ملنے لگا اور پوری توجہ کے ساتھ اس طرف مشغول ہو گئے۔ اسی دوران میں مولانا عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی رحمہ اللہ کو خبر مل گئی کہ دربھنگہ میں ایک کامیاب ڈاکٹر آرہے ہیں جو علمائے صادق پور سے تعلق رکھتے ہیں اور تحریک اسلامی سے پوری طرح متاثر ہیں اور جماعت اہل حدیث سے بڑی محبت رکھتے ہیں۔ چنانچہ مولانا رحیم آبادی رحمہ اللہ نے علاج کے سلسلے میں ان کی طرف رجوع کیا۔ اس وقت تک والد مرحوم بزرگانِ صادق پور کے مسلک کے مطابق اصول کے پابند تھے۔ لیکن مولانا عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ رحیم آبادی کی صحبت کا مزید اثر ہوا۔ پھر چند ہی سال بعد مولانا کے فیوض و برکات کا سایہ سر سے اٹھ گیا، ہر طرف مایوسی کی لہر دوڑ گئی اور ہر شخص پریشان تھا کہ مولانا مرحوم کا یہ لگایا ہوا باغ کس طرح سرسبز وشاداب رکھا جائے گا لیکن خدا جس کو محبوب رکھتا ہے اپنے دین کے کام کے لیے چن لیتا ہے۔

ویسے تو مولانا رحیم آبادی رحمہ اللہ کی زندگی ہی میں ان کے متبنیٰ بابو عبداللہ صاحب رحیم آبادی سربراہ منتخب ہو گئے تھے اور ماشاء اللہ بابو مرحوم بھی مولانا کی طرح حد درجہ خلیق اور مہمان نواز تھے۔ لیکن والد صاحب کو ایسے معاون کی ضرورت تھی جو رفتارِ زمانہ سے واقف ہو اور اس مشن کو آگے بڑھا سکے۔ چنانچہ قدرت نے ایسا ہی انتظام کیا۔ وہ بابو مرحوم کے ساتھ ساتھ جماعت اور مدرسہ کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ کچھ ہی عرصے بعد بابو مرحوم کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد جماعت نے اس اہم خدمت کے لیے والد صاحب ہی کو اپنا سربراہ منتخب کر لیا او پوری ذمہ داری ان کے سپرد کر دی۔ خدا کا شکر ہے کہ انھوں نے جماعت کی اس گراں مایہ امانت کو ہمیشہ جان سے زیادہ عزیز سمجھا اور اسے اس معراج ترقی تک پہنچایا کہ اس کا پورا پورا حال تو دیکھنے سے ہی تعلق رکھتا ہے۔

جماعت کو منظم رکھنے کے لیے انجمن اہل حدیث کی بنیاد رکھی، جس کا اجتماع پندرہ روزہ ہوا کرتا تھا اور بحمد اللہ آج تک یہ انجمن قائم ہے اور اپنا کام کر رہی ہے۔ سال میں کم سے کم ایک بار ضرور علاقہ ترہت کی بستیوں کا دورہ فرماتے۔ لوگوں کو پند و موعظت سے مستفیض کرتے اور جہاں کہیں اختلاف ہوتا اسے حتی الامکان دور کرتے۔ دل میں سچا خلوص اور درد تھا۔ جہاں کہیں پہنچ جاتے، اختلاف دور کر کے اٹھتے۔ مرحوم کی انتھک کوششوں ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ اس پُر آشوب اور فتنہ فساد کے دور میں بھی جیسی جماعت اس علاقے کی منظم ہے، اس کی مثال دوسری جگہ ملنی مشکل ہے۔

موصوف کی یہ خدمات صرف جماعت تک محدود نہیں تھیں بلکہ اپنی زندگی میں مسلمانوں کے سیکڑوں متنازع فیہ مسائل کو حل کیا اور بے شمار مقدمہ بازیاں ان کے تصفیہ سے ختم ہو گئیں۔ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں نے بھی ان سے استفادہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے قضایا جن کے فیصلے کچہری میں ناتمام رہتے، ان کی ذاتِ گرامی انھیں سلجھا دیتی، اس لیے اکثر مواقع پر عدالت کے منصف اور جج نے آپ کو ثالث بنایا۔ صلح کن ایسے کہ اپنے ضلع میں کبھی ہندو مسلم فساد ہونے نہیں دیا۔ عین وقت پر کان میں بات پڑی اور فوراً کلکٹر اور ایس پی سے مل کر امن و امان کی کوشش کی اور فتنہ و فساد فرو کیا اور فریقین کو گلے ملایا۔ یہی سبب ہے کہ وہ صرف مسلمانوں کے محبوب قائد اور راہنما نہ تھے، بلکہ غیر مسلم بھی ان سے حد درجہ عقیدت اور محبت رکھتے تھے، بلکہ اپنے فاسد عقیدے کے مطابق انھیں دیوتا اور اوتار تک سمجھتے تھے۔ (خدا اس قوم کو اچھی سمجھ دے اور خالقِ حقیقی کی معرفت نصیب کرے۔ آمین)

مطب اور دعوت و تبلیغ:

مطب کیا تھا درحقیقت یہ بھی رشد و ہدایت اور دعوت و تبلیغ کا ایک مرکز تھا۔ دورانِ تشخیص لوگوں کو اچھی

باتوں کی تلقین فرماتے۔ استغفار کی بکثرت تاکید کرتے، تعلق باللہ پر زور دیتے اور موقع مناسب سے قرآنی آیات اور احادیث پڑھ کر ان کے مطالب سناتے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے مریض انھیں نہ صرف کامیاب ڈاکٹر بلکہ اپنا روحانی طبیب سمجھتے تھے اور اس طرح انھیں جسمانی صحت کے ساتھ ساتھ یہاں روحانی غذا بھی نصیب ہوا کرتی تھی۔ مریض پر شفقت کا یہ عالم تھا کہ نمازوں کے بعد ان کی شفا کے لیے دعائیں کرتے اور اس پر انھیں سچا یقین تھا کہ شانِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔ اسی نے دوا میں تاثیر پیدا کی ہے اور وہی ہمیں بہتر شفا عطا کرنے والا ہے۔ ہمیشہ فرمایا کرتے وَ اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ (جب میں مریض ہوتا ہوں تو وہی شفا دیتا ہے) مطب میں مجھے چند سالوں تک ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ سخت سے سخت اور مہلک سے مہلک مرض والوں کو میں نے دیکھا کہ والد صاحب سے ملتے ہی نصف بیماری غائب ہوگئی اور وہ یہ محسوس کرنے لگتے کہ یہاں آ کر ہم ضرور شفایاب ہوں گے۔ نسخہ نویسی کا ایک خاص کمال یہ تھا کہ نہایت ہی کم قیمت نسخہ ہوتا، کبھی مریض پر اس کا خریدنا گراں نہ گزرتا بلکہ بسا اوقات تو کروڑ پتی اور لکھ پتی مریض آتے لیکن کم قیمت نسخہ دیکھ کر انھیں حیرت ہوتی اور دواؤں کو استعمال کرنے میں تامل ہوتا لیکن چونکہ مختلف مقامات سے مایوس ہو کر پہنچتے تھے، اس لیے بطور تجربہ اسے استعمال کرتے اور اسی سے جب صحت یاب ہو جاتے تو سخت حیران ہوتے۔

ایک مرتبہ ایک غیر مسلم نہایت مال دار مریض کھانسی کا مرض لے کر میرے پاس آیا۔ حسب دستور میں نے نسخہ تجویز کر دیا۔ کھانسی میں کچھ کمی تو ضرور ہوئی لیکن اس نے کہا "دیکھیے ان شاء اللہ کہہ کر ہم کو نسخہ دیجیے، آپ کے باپو جی کہا کرتے تھے کہ جاؤ ان شاء اللہ ضرور اچھے ہو جاؤ گے اور ہم ان سے برابر اچھے ہوتے رہے۔" اس کی اس تلقین اور راسخ عقیدگی کو دیکھ کر مجھے بڑی عبرت ہوئی۔ خدا کا کرنا دیکھیے کہ اسی وقت میں نے کہا جائیے ان شاء اللہ اس مرتبہ آپ کو پوری صحت ہو جائے گی۔ چنانچہ پھر وہ بڑی خوشی اور مسرت سے ملا۔

گھر میں والد صاحب تشخیص مرض اور نسخہ نویسی کی فیس نہیں لیا کرتے تھے لیکن باہر بھی جب مریضوں کو دیکھنے جاتے تو کبھی فیس میں سختی نہ کرتے، جو پیش کرتا اسے رکھ لیتے، گرانی بڑھی تو تمام ڈاکٹروں نے اپنی فیس تین گنا اور چار گنا بڑھا دی لیکن والد صاحب نے اپنی سابق فیس بحال رکھی۔ ہم پیشہ حضرات نے بسا اوقات مجبور بھی کیا لیکن والد صاحب یہی فرماتے رہے کہ بھائی آخر غریبوں کا گزر کیسے ہوگا۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ہیضے کا ایک مریض مجھے بلانے آیا۔ اسے میرے کمپونڈر نے کہا کیا فیس دو گے؟ پہلے طے کر لو کیونکہ بعد میں حیلہ و حوالہ ٹھیک نہیں ہے۔ والدِ مرحوم اندر سے نکل رہے تھے۔ کمپونڈر کی یہ گفتگو سن کر بہت برا فروختہ اور رنجیدہ ہوئے۔ فرمانے لگے کیا تمھارے ہاتھ میں اس کی جان ہے، کیا تم اس کی گارنٹی لیتے ہو کہ اس کو ضرور بچا دو گے، جاؤ اس کا کام کر دو۔ اللہ تعالیٰ تمھاری مزدوری ضرور دلائے گا۔ اللہ اللہ! کیسے مقدس اور پاک

طبیعت تھے یہ لوگ خدا کی ان گنت رحمتیں ان پر نازل ہوں۔

قومی وملی خدمات:

اوپر اس بات کا ذکر آ چکا ہے کہ ابتدا ہی سے والد صاحب کی طبیعت میں خدمتِ خلق کا جذبہ پایا جاتا تھا لیکن عملی میدان میں آنے کے بعد تو آپ کا مشغلہ ہی قومی خدمت اور افادۂ عوام تھا جس کی فہرست بڑی طویل ہے۔

والد صاحب مرحوم کی زندگی کا واحد مقصد اعلائے کلمۃ اللہ تھا، جس کے لیے انھوں نے ساری زندگی وقف کر دی اور تا دم زیست اس مقصد کو پورا کرتے رہے۔ دار العلوم احمدیہ سلفیہ کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ یہ تو مجسم ان کے فیض کا مظہر اور ان کی توجہ کی زندہ نشانی ہے۔ اس کی خاطر والد صاحب نے بہت سی کلفتیں مول لیں، اور اپنے راحت و آرام کو خیر باد کہا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس شخص نے اپنے بڑھاپے اور خرابیِ صحت میں وہ کام کیے جو بہت سے لوگ صحت مند اور تندرست رہ کر نہیں کر سکتے۔ مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی رحمہ اللہ نے تو اپنی زندگی میں اس کے قیام کی صرف منصوبہ بندی کی تھی لیکن چونکہ اس منصوبے میں سچا اخلاص تھا، خدا نے اس منصوبے کی تکمیل والد مرحوم کے ہاتھوں کرائی۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ایک طرف مدرسہ کے بانی حضرت مولانا رحیم آبادی رحمہ اللہ تھے تو دوسری طرف اس کے حقیقی معمار ڈاکٹر سید محمد فرید تھے۔ رحمہما اللہ تعالیٰ

والد صاحب کی خصوصی توجہ کا مرکز دارالعلوم احمدیہ سلفیہ رہا لیکن انھوں نے اپنے تعاون سے کبھی دوسرے مدارس کو محروم نہیں فرمایا بلکہ ہر موقع پر ان کی امداد وعنایت فرماتے رہے اور ماہانہ وسالانہ امداد کرتے رہے۔ یتیم خانہ کے مستقل صدر رہے۔

مسلم اسکول دربھنگہ کے بانیوں میں درحقیقت دو ہی شخصیتیں تھیں، ایک والد مرحوم، دوسرے مسٹر محمد شفیع مرحوم۔ ایک تا زندگی اس کے صدر رہے اور دوسرے اس کے سیکرٹری رہے۔ یہ دونوں بانی ہم سے جدا ہو گئے لیکن بحمد اللہ ان کی یادگار آج بھی نہایت آب و تاب کے ساتھ قائم ہے۔ مسلم اسکول پر بھی کیسا کیسا کٹھن وقت گزرا ہے لیکن ہمیشہ ان بزرگوں نے اسے بادِ سموم کے جھونکوں سے محفوظ رکھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ۱۹۳۵ء کا وہ زمانہ کہ جس وقت اسکول محض پھونس کے جھونپڑوں میں قائم کیا گیا تھا۔ لڑکوں کو سخت تکلیف تھی اور حکومت سے اسکول کی منظوری نہیں مل رہی تھی۔ لڑکے تبادلہ سرٹیفکیٹ لے کر دوسرے اسکولوں میں جانے لگے تھے۔ مسٹر شفیع پریشان ہو کر والد صاحب مرحوم کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ اس وقت کوئی قرض دینے کو بھی تیار نہیں کہ اسکول بنایا جائے۔ والد مرحوم اندر گئے اور پانچ سو روپے لا کر مسٹر شفیع کے حوالے کیا کہ جائیے جس صورت سے بھی ہو کچھ حصہ تعمیر کرا دیجیے اور اسکول کو منظور کرا لیجیے۔ چنانچہ اسی پیسے سے اسکول کی سابق

عمارت جس میں آج کل انجمن اسلامیہ ہے، تیار کی گئی اور اسکول منظور ہوا۔

اسمبلی میں جانے کا قصد:

وہ صوبہ بہار کی اسمبلی کے ممبر تھے اور اسی جذبے کے تحت اسمبلی میں گئے تھے کہ اس بہانے سے مسلمانوں کی خدمت کرسکیں گے۔ چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کے لیے وہاں بھی اعلیٰ خدمات انجام دیں۔ کئی مواقع پر کئی مفید تجاویز پیش کیں۔ اسمبلی کے مسلم ممبران کو بے لوث خدمات کی تلقین کرتے رہے اور وہاں بھی نماز باجماعت قائم کی۔ اسمبلی کی حاضری کے سلسلے میں اکثر پٹنہ آمد ورفت رہا کرتی تھی، وہاں مولوی عبدالرشید صاحب وکیل کے مکان پر قیام رہا کرتا تھا، لیکن درزی ٹولہ کی مسجد میں نماز باجماعت ادا کرتے اور فجر کی نماز کے بعد نمازیوں کو ترجمۂ قرآن مجید سناتے اور اس کی تفسیر بیان کرتے، آخر انھوں نے وہاں باقاعدہ درس قرآن کی بنیاد ڈال دی جو بحمد اللہ آج تک جاری ہے۔

غرضیکہ والد مرحوم جہاں کہیں بھی رہے، قرآن مجید کی پاک تعلیمات کو پھیلانا ان کا مشن تھا اور اس سے ہزاروں افراد کی، انھوں نے اصلاح کی اور توحید وسنت کا لوگوں کو پابند اور دلدادہ بنا دیا۔

درس قرآن:

حدیث شریف میں آیا ہے ﴿مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ جس شخص کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا کرتا ہے۔ والد مرحوم کی زندگی پر یہ حدیث پوری طرح صادق آتی ہے۔ ابھی جیسا کہ ذکر کیا قرآن مجید سے انھیں خاص شغف تھا۔ پٹنہ میں درسِ قرآن کا سلسلہ قائم کیا۔ پھر محلے کی مسجد میں ہفتہ وار ترجمہ قرآن کا دن مقرر فرمایا جس میں شرکت کے لیے شہر کے معززین اور انگریزی داں حضرات برابر شریک ہوتے رہے، خدا کا شکر ہے کہ آج تک یہ سلسلہ قائم ہے۔ اس سلسلے میں ایک تفصیلی نوٹ بھی لکھا جس کا مسودہ محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ ہفتہ وار قرآن مجید کا درس دارالعلوم کے طلبہ کو بھی دیا کرتے تھے، جس میں طلبا کے علاوہ اساتذہ بھی شرکت کرتے۔ اس مجلس میں بچوں کی اصلاح کا خاص خیال رکھتے، ان میں تبلیغ اسلام کا جذبہ پیدا کرتے اور انھیں عالم باعمل بننے کی تلقین کیا کرتے۔

انجمن اہل حدیث کے جلسوں میں بھی یہی رنگ تھا۔ ہمیشہ تفسیر قرآن کے ساتھ ابتدا فرماتے۔ اس کے بعد ضروری کارروائیاں عمل میں آتیں۔ غرض قرآن مجید ان کی روحانی غذا تھی۔ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے ہر حالتِ زندگی میں قرآن کو اپنا امام اور پیشوا سمجھتے، اکثر فرماتے تھے اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ قرآن مجید پڑھنے سے میرے دل کو سکون نصیب ہوتا ہے۔

ذاتی اوصاف:

مرحوم کے ذاتی اوصاف کے متعلق ہم متحیر ہیں کہ کیا لکھیں اور کہاں تک لکھیں۔ میں نے ان کی زندگی کا مطالعہ بہت قریب سے کیا ہے۔ ان کی خانگی زندگی سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ ان کو خلوت میں جلوت میں غرضیکہ ہر جگہ اور ہر مقام پر دیکھا ہے اور ان کی سیرت و کردار کا بڑی گہری نظر سے جائزہ لیا ہے۔ حد درجہ کریم النفس اور شریف الطبع تھے۔ اپنے پہلو میں دردمند دل رکھتے تھے۔ دوستوں کے دکھ درد میں شریک ہوتے، بیواؤں اور یتیموں کی مالی امداد کیا کرتے۔ ان کی راحت و تکلیف کا ہمیشہ خیال رکھتے، طبیعت میں قناعت تھی، جاہ و امارت کے کبھی طالب نہیں ہوئے لیکن عزت و بلندی نے ہمیشہ ان کے قدموں کو چوما۔

تقویٰ، پرہیز گاری، انابت الی اللہ کا یہ عالم تھا کہ معمولی تکلیف پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے، استغفار کرتے اور اسی سے مدد طلب کرتے۔ سخاوت و صداقت اور عدالت جیسے اوصافِ حمیدہ میں ممتاز تھے۔ اولوالعزمی اور بلند ہمتی کا یہ حال تھا کہ جب بھی کسی نیک کام میں قدم رکھا اسے جب تک پورا نہیں کیا، چین نہیں لیا۔

اکثر ہم لوگوں کو نصیحت فرماتے کہ عزائم کی بلندی، حوصلے کی پختگی اور خدا پر کامل اعتماد ہی انسان کو بلند مدارج تک پہنچانے کا ذریعہ ہیں۔

ان کے اوصاف حمیدہ کے بے شمار واقعات ہیں۔ خدا نے موقع دیا اور اس کی توفیق بخشی تو ان شاء اللہ مستقل سوانح حیات میں تمام واقعات درج کیے جائیں گے۔ آخر وہ فضل و کمال اور علم و حکمت کا آفتاب دیکھتے ہی دیکھتے دنیا والوں کی نگاہوں سے ۲۴- رمضان ۱۳۷۰ھ (۲۸- جون ۱۹۵۱ء) کو غروب ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

اللهم اغفرله و ارحمه و عافه و اعف عنه .

نہایت افسوس ہے یہ مضمون لکھنے والے ان کے صاحب زادے سیّد عبدالحفیظ سلفی بھی دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔ رحمہ اللہ تعالی .

حافظ عبدالرحمٰن چنگوانی

(وفات ۱۹۵۶ء)

حافظ عبدالرحمٰن چنگوانی کا سلسلۂ نسب یہ ہے: عبدالرحمٰن بن حافظ نصیر احمد بن احمد خاں بن محمد خاں بن ہیبت خاں چنگوانی۔ یہ بلوچ تھے اور بلوچوں کے ایک خاندان یا گوت کو چنگوانی کہا جاتا ہے۔ حافظ عبدالرحمٰن ۱۸۵۰ء کے آگے پیچھے پیدا ہوئے۔ ان کا مولد و مسکن ڈیرہ غازی خاں کا شہر ''چوٹی زیریں'' تھا۔ پاکستان کے ایک سابق صدر فاروق احمد خاں لغاری اسی شہر کے رہنے والے تھے۔ ڈاکٹر احسان احمد چنگوانی نے لکھا ہے:

> ''چوٹی زیریں بہت پرانا شہر ہے، جس کو اقوام چنگوانی نے آباد کیا اور اپنی عمل داری شروع کی۔ اقوام چنگوانی کی عمل داری اس شہر پر ۱۷۵۳ء تک قائم رہی۔'' ❶

چوٹی زیریں میں کئی ممتاز علمائے کرام پیدا ہوئے، جنھوں نے اسلام کی بڑی خدمت کی، ان میں ایک یہی حافظ عبدالرحمٰن چنگوانی تھے جن کا ان سطور میں تذکرہ کیا جارہا ہے۔

حافظ عبدالرحمٰن نے ابتدائی تعلیم اپنے والد مکرم حافظ نصیر احمد خاں سے حاصل کی جو دیوبند کے فاضل تھے۔ مزید تعلیم کے لیے علاقے کے مختلف علما کی خدمت میں حاضری دی۔ مسلک اہل حدیث انھوں نے اس وقت اختیار کیا جب ان کا تعارف مولانا عبدالعزیز ڈیروی واعظ و مبلغ آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس سے ہوا اور ان سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے حضرت مولانا عبدالتواب ملتانی سے ملاقات کی اور ان سے مستفید ہوئے۔ مختلف اوقات میں یہ تدریسی خدمت بھی سرانجام دیتے رہے۔

حافظ عبدالرحمٰن چنگوانی متقی عالم دین تھے۔ قرآن مجید کی تلاوت ان کا روزانہ کا معمول تھا۔ اس دوران ان کا کوئی دنیوی نقصان ہوجاتا تو کوئی پروانہ کرتے، تلاوت کا سلسلہ بہ دستور جاری رکھتے۔ وہ لوگوں کے ہم درد اور نرم دل عالم دین تھے۔ تقسیم ہند کے زمانے میں ڈیرہ غازی خاں میں جب مہاجرین کا پہلا قافلہ آیا اس وقت وہ سورہ حشر کی آیت نمبر ۹ تلاوت کر رہے تھے:

﴿وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوْتُوا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ

❶ ماہنامہ آثار میگزین بابت ماہ نومبر ۲۰۰۶ء۔

﴿وَمَنْ يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾

اس آیت کا ترجمہ یہ ہے:

''اور اموالِ غنیمت کے وہ لوگ بھی مستحق ہیں جو ان مہاجرین سے پہلے دار الہجرت (مدینہ) میں مقیم ہیں اور وہ ایمان میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ جو لوگ ہجرت کرکے ان کے پاس آتے ہیں، وہ ان سے محبت کرتے ہیں اور مہاجرین کو جو کچھ دیا جاتا ہے، اس سے یہ اپنے دلوں میں کوئی خلش محسوس نہیں کرتے اور مہاجرین کو اپنی ذات پر ترجیح دیتے ہیں خواہ خود محتاج ہی کیوں نہ ہوں اور جو لوگ اپنے طبعی بخل وحرص سے بچا لیے گئے تو ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

حافظ عبدالرحمٰن ہندوستان سے آنے والے مہاجرین سے محبت اور احترام سے پیش آتے تھے۔ وہ اپنے علاقے کے نمبردار بھی تھے۔ ان کی برادری کے اکثر لوگ مسلکی اعتبار سے ان کے مخالف تھے، لیکن وہ اس مخالفت کی پروا نہیں کرتے تھے۔ اگر کوئی شخص ان میں سے بیمار ہوتا تو وہ اس کی مزاج پرسی کے لیے جاتے اور اسے توحید وسنت پر عمل کی دعوت دیتے۔

انھوں نے اپنی زمینیں کاشت کے لیے علاقے کے بعض لوگوں کو حصے پر دی تھیں۔ ان سے غلہ وغیرہ میں سے اپنا حصہ لینے جاتے تو انھیں نماز پڑھنے کی تاکید فرماتے۔ وہ لوگ جواب دیتے کہ ہم نماز پڑھیں یا مزدوری کریں۔ اس میں سے ہم نے آپ کو بھی حصہ دینا ہے۔ یہ سن کر وہ حصہ معاف کر دیتے اور فرماتے مجھے حصہ بے شک نہ دو لیکن نماز ضرور پڑھو۔ ان کے اس طرح کے اندازِ کلام اور طرزِ عمل سے وہ لوگ باقاعدہ نماز پڑھنے لگے تھے۔

حافظ عبدالرحمٰن چنگوانی توحید وسنت کے سرگرم مبلغ تھے۔ ایک مرتبہ سخی سرور کے میلے کے موقعے پر وہاں تبلیغ فرمانے گئے۔ ایک جگہ تقریر کرنا چاہتے تھے کہ قریب ہی بعض لوگوں کے کہنے پر ایک مغنیہ نے گانا شروع کر دیا اور لوگ ادھر چلے گئے۔ حافظ صاحب نے یہ منظر دیکھا تو اللہ سے دعا کی ''یا اللہ! اس مغنیہ کی آواز بند فرما دے اور توحید وسنت کی آواز بلند فرما دے۔'' واقعۃً مغنیہ کی آواز فوراً بند ہوگئی اور اس کے لیے گانا ناممکن ہوگیا۔ اب لوگ حافظ صاحب کی طرف آئے اور انھوں نے ان کو وعظ فرمایا۔

اس علاقے میں ایک بزرگ پیر جندوشاہ رہتے تھے جو دیوبندی حنفی تھے۔ چوٹی زیریں کے لوگ ان کے پاس دعا کرانے کے لیے جایا کرتے تھے۔ وہ ان لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ تم میرے پاس کیوں آتے ہو، خود تمھارے شہر چوٹی زیریں میں ایک اللہ کا ولی موجود ہے، اس سے دعا کیوں نہیں کراتے؟ ان کی خدمت میں حاضری دیا کرو، اللہ ان کی دعا قبول فرماتا ہے۔

وہ پیر صاحب سے پوچھتے کہ وہ کون شخص ہے تو وہ بتاتے کہ وہ حافظ عبدالرحمٰن چنگوانی ہیں، ان سے دعا کرایا کرو۔

لوگ جواب دیتے کہ وہ وہابی ہے۔ یہ جواب سن کر پیر صاحب ازراہِ افسوس فرماتے، کسی کو چوری کا طعنہ، کسی کو کسی اور برائی کا طعنہ لیکن حافظ عبدالرحمٰن کو اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث پر عمل کرنے کا طعنہ دیا جا رہا ہے۔ وہ لوگوں سے کہا کرتے تھے ان کی خدمت میں جاؤ اور ان سے میرا سلام کہو۔

حافظ عبدالرحمٰن چنگوانی کا حلقۂ تدریس بھی تھا اور ان سے متعدد اہل علم نے استفادہ کیا جن میں مولانا مشتاق احمد ڈیروی سابق شیخ الحدیث مدرسہ محمدیہ حافظ آباد، مولانا حکیم شاکر محمد سابق امیر جمعیت اہل حدیث ضلع ڈیرہ غازی خاں، مولانا ابوحفص عثمانی سابق ناظم جامعہ سلفیہ فیصل آباد اور مولانا عبدالکریم ڈیروی سابق مدرس جامعہ سلفیہ فیصل آباد و سابق شیخ الحدیث دار الحدیث ملتان۔

یہ سب حضرات وفات پا چکے ہیں۔ رحمهم الله تعالى.

حافظ عبدالرحمٰن چنگوانی ۱۹۵۶ء میں فوت ہوئے۔ لیکن اس سال کے کس مہینے کی کس تاریخ کو فوت ہوئے، اس کا علم نہیں ہو سکا۔

حافظ صاحب مرحوم کے دو بیٹے تھے مولانا عبدالاحد اور عبدالصمد۔ چار بیٹیاں تھیں۔ ان میں سے ایک مولانا حافظ محمد شریف چنگوانی ناظم مرکز ابن القاسم الاسلامی ملتان کی والدہ تھیں اور ایک تھیں مولانا عبدالحمید چنگوانی خطیب جامع مسجد اہل حدیث گرائی ڈیرہ کی والدۂ محترمہ! [1]

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' (لاہور) مورخہ ۱۲ تا ۱۸۔اگست ۲۰۱۱ء، مضمون مولانا عبدالرحیم اظہر ڈیروی۔

مولانا عبداللہ الکافی القرشی

(وفات ۴- جون ۱۹۶۰ء)

مولانا عبداللہ الکافی کا شمار برصغیر کے ممتاز علماے دین میں ہوتا تھا۔ وہ مشرقی پاکستان کی جمعیت اہل حدیث کے صدر تھے۔ انھوں نے آزادیٔ برصغیر کی تحریک میں بھرپور حصہ لیا۔ اس سلسلے میں کانگرس میں بھی شمولیت کی اور مجلس خلافت اور جمعیت علماے ہند سے بھی وابستہ رہے۔ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور بالآخر اس قسم کے مجاہدین آزادی کی کوششوں سے برصغیر آزاد ہوا اور پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔ آزادیٔ وطن سے تھوڑا عرصہ پہلے وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے۔

۱۱رجون ۱۹۴۵ء کو مولانا عبداللہ الکافی، مولانا راغب احسن صاحب، مولانا عبدالرؤف داناپوری اور دیگر حضرات نے جمعیت علماے اسلام کی بنیاد رکھی، جس کا پہلا اجلاس ۲۵، ۲۶، ۲۷- اکتوبر ۱۹۴۵ء کو کلکتہ میں ہوا اور اس کے صدر مولانا شبیر احمد عثمانی کو منتخب کیا گیا۔ مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی بھی اس اجلاس میں شریک تھے۔

مولانا عبداللہ الکافی نے ۴ جون ۱۹۶۰ء کو وفات پائی۔ اس وقت مشرقی پاکستان کے بہت سے علما و زعما ان کے دولت کدہ پر موجود تھے، جو مولانا کی دعوت پر تشریف لائے تھے اور ۱۹۶۰ء میں سابق صدر ایوب خان نے ملک کو جو آئین دیا تھا، اس پر غور کر رہے اور اس کی مختلف شقوں کو ضبطِ تحریر میں لا رہے تھے۔ مولانا الکافی کے دیرینہ دوست مولانا راغب احسن بھی اس مجلس میں شامل تھے۔ ان کی وفات کے بعد مولانا راغب احسن نے ان پر ایک مضمون لکھا جو ہفت روزہ ''الاعتصام'' کی یکم اور ۸ جولائی ۱۹۶۰ء کی دو اشاعتوں میں چھپا۔ میں اس وقت ''الاعتصام'' کی خدمتِ ادارت پر مامور تھا اور مولانا راغب احسن نے یہ مضمون میرے نام ہی ڈھاکا سے ارسال فرمایا تھا۔ مضمون میں مولانا عبداللہ الکافی کے حالات کافی تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ اس میں ان کی سیاسی، تصنیفی اور صحافتی سرگرمیوں کا تذکرہ مناسب تفصیل سے کیا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

یوم النحر یعنی قربانی کے دن ۴ جون ۱۹۶۰ء کو جب کہ مسلمانانِ عالم قربان گاہ مکہ منیٰ میں بھیڑوں، بکروں اور اونٹوں کی قربانیاں پیش کر رہے تھے، اس وقت اللہ کے بندے، اسلام کے مجاہد عبداللہ الکافی نے ڈھاکہ میں اپنی جان کی قربانی ملت اسلامیہ کے لیے پیش فرمائی اور ۲۵ مئی ۱۹۶۰ء کی رات کو جو قول دیا تھا اس کو پورا کر دکھایا۔

تحریک خلافت اور جنگ آزادی کے مجاہد اعظم علامہ عبداللہ الکافی ایڈیٹر ''عرفات'' و ''ترجمان الحدیث'' ڈھاکہ وصدر جمعیت اہل حدیث مشرقی پاکستان نے ایک سچے شہید ملت کی شہادت حاصل کی۔ تفصیل اس اجمال کی ملک وقوم کے لیے ایمان وعزیمت، ایثار وقربانی واستقامت علی الحق کی درخشندہ وزندگی پرور مثال ہے۔

۲۴ مئی ۱۹۶۰ء کو علامہ عبداللہ الکافی مدیر عرفات کے دو قاصد (حاجی محمد عقیل رئیس بنگشال و قاضی عبدالشہید سابق ایڈیٹر روزنامہ نجات ڈھاکہ) راقم الحروف کے گھر ۴۵ میاں صاحب میدان ڈھاکہ تشریف لائے اور علامہ الکافی کا سلام و پیام پہنچایا کہ ممدوح راقم کے گھر پر آنے اور پاکستان کانسٹی ٹیوشن کمیشن کے متعلق مشورہ کرنے کو بے چین ہیں۔ لیکن بوجہ شدید علالت و درد جگر اب تک نہیں آ سکے ہیں۔ راقم نے عرض کیا کہ مولانا کے آپریشن اور نازک علالت کی اس کو خبر ہے۔ مولانا تکلیف نہ فرمائیں، ان شاء اللہ بندہ خود ۲۵ مئی کو حاضر ہوگا۔

۲۵ مئی ۱۹۶۰ء کو بندہ بعد عصر دفتر عرفات ڈھاکہ حاضر ہوا اور مولانا کو دیکھا تو ان کو سخت زار ونزار وخستہ پایا۔ مولانا نے فرمایا کہ آپریشن ناکام رہا۔ پتے سے کوئی پتھری نہیں نکلی۔ درد پہلے سے بڑھ گیا۔ کمزوری روز بروز زیادہ ہے۔ لیکن پاکستان کی حالت نے مجھ کو ماہیٔ بے آب کر رکھا ہے۔ پاکستان کو ایک لادینی ریاست بنانے کے منظر کی میں تاب نہیں لاسکتا۔ کانسٹی ٹیوشن کمیشن کے سوال نامے کا جواب دینا چاہیے۔ اس کام میں آپ مشورہ بھی دیں اور مدد بھی فرمائیں۔ بندہ نے عرض کیا کہ وہ ہر خدمت کے لیے حاضر ہے۔ لیکن مناسب ہے کہ اہل الرائے علما وفضلا سے مشورہ لے لیا جائے۔ خصوصاً ان سے جو دستور کے سلسلے میں ۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۳ء میں کراچی کے اجتماع علما میں بنگال کی نمائندگی کر چکے ہیں۔ علامہ الکافی نے فرمایا کہ اس قسم کے اجتماع میں طوالت کا خوف ہے۔ اگر ڈھاکہ کے چند مقامی اہل الرائے علما وفضلا کی طرف سے سوال نامہ کا جواب دے دیا جائے تو کافی ہوگا۔ راقم نے اپنی رائے دوبارہ عرض کی تو علامہ نے فرمایا کہ اصل یہ ہے کہ میں عید قربان اپنے آبائی گھر نور الہدیٰ ضلع دیناج پور میں کرنا چاہتا ہوں، اس لیے آپ اس کام کو جلد انجام دیں۔ راقم (راغب احسن) نے اس پر کہا کہ:

''حضرت یہ ملت کا بڑا ہی اہم و نازک کام ہے۔ اس کے واسطے تو آپ کو عید قربان کی قربانی دینا ہوگی۔''

بولنے کو بندہ یہ بڑا بول بول گیا لیکن دل دھک سے ہوگیا۔ محسوس ہوا کہ کوئی غیر معمولی بات، بے اختیار جذبِ باطن سے زبان سے نکل گئی ہے۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ اس وقت راقم قبلہ رخ کرسی پر بیٹھا تھا۔ داہنے حاجی محمد عقیل صاحب اور بائیں قاضی عبدالشہید صاحب دو کرسیوں پر تھے۔ مولانا مختصر احمد رحمانی فرش

پر تھے۔ مولانا الکافی سامنے بستر علالت پر بیٹھے تھے۔ آخر سکوت ٹوٹا اور مولانا الکافی نے ایمان وعزم کی قوت قلب سے زوردار آواز میں جواب دیا:

''ان شاء اللہ قربانی کے لیے حاضر ہوں۔ اس کام کے لیے ان شاء اللہ عید قربان کی قربانی بھی پیش کر دوں گا۔ مگر جس طرح ہو آپ اس کام کو انجام دیں۔''

۲۸ مئی ۱۹۶۰ء کو ۲۵ مئی کے فیصلے کے مطابق ڈھاکہ کے چند اہل الرائے مولانا الکافی کے کمرۂ علالت میں جمع ہوئے۔ ۱۱ بجے رات تک دستوری مسائل پر باتیں ہوتی رہیں۔ مولانا نے شکایت کی کہ اس کام میں کئی مقامات پر دوڑ دھوپ اور کاوش کے باعث پھر درد کے دورے پڑنے لگے ہیں۔ بخار بھی آ گیا ہے اور طبیعت خراب ہے۔ مولانا الکافی کی تحریک اور سب کے اتفاق رائے سے طے پایا کہ راقم راغب احسن کمیشن کے سوال نامہ کے مفصل جواب میں ایک خاکہ تیار کرے گا اور جمعہ ۳ جون ۱۹۶۰ء کو علما وفضلا کی منتخب مجلس دفتر عرفات میں ہوگی، جس کا دعوت نامہ مولانا کافی جاری کریں گے۔ راقم اپنا خاکہ اس مجلس میں پیش کرے گا۔ آخر میں مولانا نے بار بار خادم پر زور دیا کہ اسلامی اور جمہوری، ملی وملکی دونوں نقطۂ نظر سے سوال نامے کا مفصل ومدلل جواب تحریر کرے۔ راقم نے رضامندی ظاہر کی۔ ساڑھے گیارہ بجے رات کو جب سب رخصت ہوئے تو مولانا بندہ کو اپنے کمرے کے دروازے تک پہنچانے آئے۔ آخری مصافحہ کرتے ہوئے راقم نے مولانا سے پرزور درخواست کی کہ اس اہم مسئلے پر وہ بھی ضرور کچھ تحریر فرمائیں۔ وہ علالت کا عذر کرتے رہے۔ لیکن بظاہر نیم راضی ہو گئے۔

۲۸ مئی کو مولانا نے فرمایا تھا کہ اس کام کے لیے وہ مولانا اکرم خان کے پاس علالت کی حالت میں جا چکے ہیں اور بھی کئی جگہ جا رہے ہیں جس سے بخار آ گیا ہے۔ دردِ جگر، درد گردہ بڑھ گیا ہے اور وہ ڈاکٹروں کے حکم کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ لیکن جب اسلام اور پاکستان کا سوال آ جائے تو پھر وہ اپنی صحت اور جان کی مطلق پروا نہیں کر سکتے ہیں۔ ہر چیز پر ملت مقدم ہے اور دراصل وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہیں۔

دردِ جگر اور دردِ ملت کی جنگ:

علامہ عبداللہ الکافی کو سالہا سال سے دردِ گردہ کے دورے پڑ رہے تھے۔ ایک دفعہ کلکتہ میں ڈاکٹر بی سی رائے وزیر اعلیٰ مغربی بنگال کی نگرانی میں آپریشن ہو چکا تھا۔ لیکن پورا افاقہ نہ ہوا تھا۔ ادھر آخر میں خرابی جگر، یرقان، ذیابیطس، بلڈ پریشر اور ضعف بصارت کے عوارض بھی لاحق ہو چکے تھے۔ لیکن رفتار اور گفتار و کردار سے ذرا بھی کمزوری ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ علمی، اسلامی اور تاریخی نکات کے بیان میں دماغ بدستور تیز و ذکی تھا اور کام کر رہے تھے۔

ڈھاکہ میڈیکل کالج کے اعلیٰ ترین معالج ڈاکٹر شمس الدین اور ڈاکٹر اسیر الدین نے کئی بار ایکسرے کرانے اور ہر طرح کے ٹیسٹوں کے بعد رائے دی تھی کہ گال بلیڈر پتا میں پتھری ہے اور آپریشن کے سوا چارہ نہیں ہے۔ مولانا آپریشن کے لیے راضی ہوئے۔ ڈاکٹر اسیر الدین نے آپریشن کیا۔ لیکن یا للعجب کہ آپریشن کے بعد کوئی پتھری نہیں نکلی۔ مولانا کئی ماہ ڈھاکہ میڈیکل کالج ہسپتال کے خاص کیبن میں موت اور زندگی کے درمیان معلق رہے۔ روزانہ قریباً پچاس روپیہ خرچ ہوتے رہے۔ کئی ماہ بعد کچھ زخم مندمل ہوئے تو گھر (عرفات منزل) آئے لیکن افسوس کہ درد کے دوروں کا سلسلہ جاری رہا۔ بلکہ پہلے سے زیادہ شدید اور جلد جلد دورے پڑنے لگے اور تکلیف اتنی بڑھ جاتی تھی کہ اکثر بے ہوشی کے انجکشن دینے کی ضرورت پڑتی تھی۔ لیکن واہ رہے ہمت و استقلال، ان کی ملی سرگرمیوں میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ ہفتہ وار عرفات اور ماہنہ ترجمان الحدیث کی ادارت، مقالات کی تحریر، اسلامی کتابوں کی تصنیف، مدرسۃ الحدیث ڈھاکہ کی نگرانی اور جمعیۃ اہل حدیث مشرقی پاکستان کی صدارت کے گراں بار فرائض آخر دم تک اپنے سر پر اٹھائے رہے۔

ان پر پاکستان کانسٹی ٹیوشن کمیشن کے سامنے بنگال کے علما، فضلا اور اہل اسلام کی طرف سے ایک سنجیدہ دستوری خاکہ کی ترتیب وتقدیم کا مسئلہ مستزاد ہوگیا اور بالآخر یہی جاں گسل مسئلہ علامہ الکافی کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ مختلف طبقات کے علما وفضلا و اہل الرائے کو جمع کرنا اور شوریٰ کے ذریعے ان کے خیالات میں توافق پیدا کرنا کتنا مشکل وصبر آزما کام ہے۔ ظاہر ہے آخر وقت مولانا کافی نے اپنی صحت اور جان کی بازی لگا کر اس کارِ دشوار کا بیڑا اٹھالیا۔ بے ہوشی سے دو دن پہلے مولانا نے راقم کے پاس قاصد اور خط بھیج کر پیر سرسینہ مولانا شاہ ابوجعفر محمد صالح اور مولانا عزیز الرحمٰن مہتمم مدرسہ عالیہ دار السنّت سرسینہ کے تلغرافی پتے منگوائے اور ان کو تلغرافی دعوت نامے ارسال کیے۔ مجلس شوریٰ کے سارے انتظامات اسی نازک علالت کے اندر کرتے رہے۔

پھر اس راقم کی درخواست پر خود بھی سوال نامے کا جواب لکھنے بیٹھ گئے۔ حالانکہ اب ان کا درد جگر بہت بڑھ گیا تھا۔ لیکن دیکھا گیا کہ مولانا اپنے بستر علالت سے متصل ایک چھوٹی سی میز پر کتابوں کے انبار میں جوابات لکھ رہے تھے۔ داہنے ہاتھ سے قلم چلا رہے ہیں اور بائیں ہاتھ سے جگر کو تھامے، دبائے اور درد کو مسوسے ہوئے ہیں جو ہر لحہ ناقابل برداشت ہوتا جا رہا ہے۔ مولانا الکافی کے درد جگر اور درد ملت کے درمیان جنگ جاری ہے۔ اللہ کے بندے عبداللہ الکافی کا عزم بالجزم ہے کہ وہ یہ کام کر کے اٹھیں گے۔ چاہے اس کام میں وہ خود کام آ جائیں۔

یکم جون ۱۹۶۰ء کو جمعیۃ کے سیکرٹری مولانا میزان الرحمٰن بی-اے، بی-ٹی نے اوپر آ کر دیکھا تو مولانا

درد سے کراہ رہے ہیں۔ ایک ہاتھ سے دل و جگر کو مضبوط تھامے ہوئے ہیں اور دوسرے ہاتھ سے دستوری سوالوں کے جواب لکھ رہے ہیں۔ کتابوں کے حوالے بھی تلاش کر رہے ہیں۔ مولانا میزان الرحمٰن نے عرض کی ''حضرت کچھ تو اپنے اوپر رحم فرمائیے۔ صحت کا خیال فرمائیے۔ ڈاکٹروں کا سخت حکم ہے کہ آرام فرمائیے۔''

مولانا الکافی نے جواب دیا ''بس آپ لوگوں کو تو صحت صحت کی رٹ لگی ہے اور مجھ کو تو صحت کیا، جان کی بھی پروا نہیں ہے۔ سب اسلام اور پاکستان پر قربان ہیں۔ بس آپ جائیے، نیچے دفتر کا کام دیکھیے اور مجھ کو کام ختم کرنے دیجیے۔'' مولانا اس طرح بائیں ہاتھ سے قلب و جگر کو دبائے، انتہائی درد و کرب کے عالم میں کام کرتے رہے۔ کمیشن کے سوال نامے کے چالیس سوالوں میں سے اڑتیس سوالوں کے جوابات لکھنے کے بعد بالکل نڈھال ہو گئے۔ شدت درد سے بے بس اور بے قابو ہو کر پلنگ پر جو میز سے لگا تھا گر گئے اور ایسے گرے کہ پھر نہ اٹھے۔ بس یہی دنیا میں ان کا آخری کام تھا۔ ۲ جون کو درد شدید ترین اور برداشت سے باہر ہو گیا۔ ضعف بڑھتا گیا۔ ڈاکٹروں نے قلب کو سنبھالنے کے لیے خون کے انجکشن دیے۔ لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ بے ہوشی طاری ہونے لگی۔

جمعہ ۳ جون ۱۹۶۰ء کو حج اکبر یعنی عرفات کا یومِ اجتماع تھا اور مولانا کی موجودہ مجلس شوریٰ کا بھی یوم اجتماع تھا۔ مولانا کے مطبوعہ دعوت نامے پر بنگال کے علما و فضلا و اہل الرائے مولانا کے کمرۂ علالت سے متصل بڑے کمرے میں جس کو مولانا نے ابھی ابھی مرمت کر کے آراستہ و پیراستہ کروایا تھا جمع ہو چکے تھے۔ صد ہزار افسوس کہ مولانا کے مدعوین سب مولانا کے گرد جمع تھے۔ لیکن داعی و روحِ مجلس مولانا الکافی بالکل بے ہوش پڑے تھے۔ لمبی لمبی سانسیں لے رہے تھے۔ ڈاکٹر، علما، فضلا، طلبا و احباب ان کو گھیرے ہوئے تھے۔ ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ بس وہ ایک دو گھنٹوں کے مہمان ہیں۔ سب زار و قطار رو رہے تھے۔ دل دوز سماں تھا۔ ایسا منظر کبھی نہ دیکھا تھا۔

بہرحال اس کام کو انجام دینا تھا، جس کا ذمہ مولانا الکافی نے اٹھایا تھا اور جس کی خاطر وہ اپنی جان قربان کر رہے تھے۔ راقم کی تحریک پر مولانا اکرم خان مجلس شوریٰ کے صدر منتخب ہوئے۔ راقم نے مولانا الکافی کی دعوت اور مجلس کی ابتدا اور اصل غرض و غایت بیان کی۔ گزشتہ جلسوں کی روئداد عرض کی اور ایک سب کمیٹی بنا کر دستوری کام اس کے حوالے کرنے کی تجویز پیش کی جو پاس ہوئی۔ حاجی محمد عقیل صاحب نے لا کر وہ مسودہ پیش کیا جو علامہ الکافی نے اسلامی دستور پر اپنے خونِ جگر کے آخری قطرے کی روشنائی سے لکھا تھا۔ مولانا محمد اکرم خان نے کہا کہ یہ مسودہ یادگار اور تاریخی ہے۔ اس کو محفوظ رکھنا چاہیے۔ راقم نے عرض کیا کہ مولانا الکافی نے اسی طرح یہ مسودہ لکھا ہے، جس طرح رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے اپنی انتہائی

خطرناک و نازک علالت کے عالم میں ڈاکٹروں کے حکم کے خلاف یکم و ۲ جنوری ۱۹۳۱ء کو ہندوستان اور ملت اسلامیہ کی آزادی پر ہائیڈ پارک ہوٹل لندن سے مسٹر رامزے میکڈانلڈ وزیر اعظم برطانیہ کے نام اپنا طویل آخری مکتوب لکھا تھا۔ پھر اس کی محنت شاقہ سے ۳ جنوری کو بے ہوش ہو گئے تھے اور ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کی صبح صادق کو شہید ہو گئے تھے۔ اس وقت علامہ الکافی بھی دراصل اسی حالت میں ہیں۔ مولانا اکرم خان اور سب حاضرین مجلس نے اس سے اتفاق کیا۔

راقم کی تحریک سے طے پایا کہ مجلس شوریٰ کا آئندہ جلسہ عید قربان کے بعد دس جون ۱۹۶۰ء کو رکھا جائے اور اس کے سامنے راقم کا مفصل دستوری خاکہ اور مولانا کافی کے مرتبہ نکات دونوں پیش کیے جائیں۔

آخر میں سب نے گریہ و زاری کے ساتھ علامہ الکافی کے لیے دعا کی۔ صدر مجلس مولانا محمد اکرم خان نے رقت کے ساتھ فرمایا "یہ قابل رشک موت ہے۔ یہ موت کسی کو نصیب ہوتی ہے کہ یہ عظیم الشان اسلامی خدمت کرتے ہوئے اور اس پر اپنی قوت اور اپنے خون کا آخری ذرہ صرف کرتے ہوئے اپنی بلائی ہوئی مجلس میں جان دے رہے ہیں۔ دیکھیے ان کے خون کا آخری قطرہ بھی اسلام کے کام آ گیا ہے۔"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اچانک زور سے رونے کی آوازیں آئیں۔ سب جلسہ چھوڑ کر مولانا کے کمرہ میں دوڑے۔ دیکھا کہ آنکھیں کھل گئی ہیں۔ مولانا بالکل بے ہوش ہیں۔ کراہنے کی آواز آ رہی ہے۔ پہلی دفعہ منہ سے خون جاری ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے کبھی منہ سے خون نہیں آیا تھا۔ ڈاکٹر کہتے ہیں داخلی جریان خون ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ مولانا کے آپریشن کی اندرونی سیون ٹوٹ گئی ہے اور غالباً خون وہاں سے جاری ہے۔ اب سب مایوس ہو جاتے ہیں۔ آہ و بکا سے بزم درہم برہم ہو جاتی ہے۔ جمعہ کا دن ہے۔ عصر کا وقت ہے۔ جمعہ کا دن اور سنیچر کی رات گزار کر یوم النحر (قربانی کے دن) سنیچر ۴ جون ۱۹۶۰ء کی صبح کو چار بج کر ۲۵ منٹ پر جب کہ مسجدوں میں اذان ہو چکی ہے اور جماعت کی تیاری ہو رہی ہے، علامہ عبداللہ الکافی نے داعی حق کو لبیک کہا۔ بنگال بے چراغ ہوا۔ پاکستان بے نور ہوا۔ مجلس علم و دین برہم ہوئی۔ دنیائے اسلام ایک عالم باعمل، مجاہد حق و حریت، ادیب شہیر، محدث و مفسر جلیل، محقق بے عدیل، اسلامی علم السیاست کے ممتاز ماہر، جادو اثر خطیب اعظم، سراپا سوز و درد، محب ملک و ملت کی روح بلالی و کہرایائی شخصیت سے جس نے لاکھوں دلوں کو زندہ، ہزاروں دماغوں کو روشن اور بے شمار جوانوں کو شعلۂ جوالہ بنایا تھا، محروم ہو گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

نماز جنازہ جامع مسجد بنگشال ڈھاکہ میں مولانا کبیر الدین رحمانی نے پڑھائی، جس میں دیگر حضرات کے علاوہ خواجہ ناظم الدین سابق گورنر جنرل پاکستان اور مسٹر نور الامین سابق وزیر اعلیٰ مشرقی پاکستان شریک تھے۔ رات کی ٹرین سے میت حسب وصیت موضع نور الہدیٰ ضلع دیناج پور روانہ کی گئی۔ میمن سنگھ بہار آباد،

رنگپور، پاربتی پور، دیناج پور سے سیکڑوں مسلمان جنازے کے ساتھ ہو گئے۔ دوسرے دن اتوار ۵ جون ۱۹۶۰ء کی شام کو نور الہدیٰ پہنچے۔ ہزاروں مسلمان نماز جنازہ میں شریک ہوئے۔ کثرت ازدحام کے باعث دو بار جنازے کی جماعتیں نور الہدیٰ میں ہوئیں۔ غروب آفتاب کے قریب اس آفتاب علم و جہاد کو ان کی والدہ ماجدہ کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔ اس عید قربان کی قربانی دستور اسلامی کے لیے پیش کرنے کے عزم بالجزم اور نور الہدیٰ میں عید قربان سے پہلے پہنچنے کی تمنا، دونوں عجیب انداز سے پوری ہوئیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد سے خاص تعلق:

مولانا عبداللہ الکافی ۱۹۰۱ء میں نور الہدیٰ دیناج پور کے ایک ممتاز عالم و مجاہد خاندان میں پیدا ہوئے۔ جہاد و انقلاب حریت و استقلال، قال اللہ و قال الرسول ﷺ کی فضاؤں میں آنکھ کھولی۔ مدۃ العمر شادی نہیں کی۔ ساری زندگی قرآنی مثال "سَيِّدًا وَّ حَصُوْرًا" کی مثال طہارت و پاکیزگی کے ساتھ دین وملت کے لیے وقف کیے رکھی اور کامل یک سوئی کے ساتھ خدمت اسلام میں گزاری۔ ملت ان کا خاندان، ملت ان کی محبوب، ملت ان کی ابتدا، ملت ان کی انتہا، ملت ان کی زندگی، ملت ان کی موت تھی۔ ملت سے باہر اور ملت کے علاوہ انھوں نے کسی مقصود کا خیال نہ فرمایا۔ ان کے والد ماجد مولانا عبدالہادی استاد العرب والعجم مولانا سید نذیر حسین بہاری المعروف بہ حضرت میاں صاحب دہلوی کے شاگرد رشید اور بڑے محدث، عالم، مجاہد و ماحی بدعت و داعیٔ سنت تھے۔ حضرت میاں صاحب موصوف دراصل دور جدید میں عاملین بالحدیث کے مجدد تھے۔ عبداللہ الکافی صاحب نے تعلیم اپنے برادر کبیر مولانا عبداللہ الباقی سے حاصل کی۔ مولانا الباقی تحریک آزادی کے نامور قائد، مرکزی انڈین اسمبلی کے ممبر اور پھر پاکستان پارلیمنٹ کے ممبر اور مشرقی پاکستان مسلم لیگ کے صدر اور پاکستان مسلم لیگ کے نائب صدر اور صوبائی اسمبلی کے ممبر تھے۔ مولانا عبداللہ الکافی نے اپنے برادر کبیر کے علاوہ ایک صاحب حال نابینا محدث سے بھی کسب فیض کیا تھا۔ پھر مدرسہ عالیہ کلکتہ اور سینٹ ربور کالج کلکتہ سے علوم عربیہ اسلامیہ اور علوم عصریہ انگلشیہ میں مہارت تامہ حاصل کی تھی۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ مولانا الکافی کے جوہر ذاتی کو مولانا ابوالکلام آزاد کے فیض صحبت نے چمکا کر ذرہ سے آفتاب کیا تھا۔ قریب تیس سال وہ مولانا آزاد کے ساتھ رہے اور ان کا ایسا اعتماد و احترام حاصل کیا جو شاید کسی اور کو کبھی حاصل نہ ہوا۔ مولانا آزاد مولانا کافی کو اپنا عزیز ترین شاگرد اور اطاعت گزار خیال کرتے تھے۔ الکافی، الہلال والبلاغ میں دل و جان سے ڈوب گئے تھے اور مولانا ابوالکلام کا رنگ ایسا اختیار کیا کہ وہ بنگالہ کے ابوالکلام کہلائے۔ بے شک حریت خواہی و استقلال طلبی علم و ادب، خطابت و صحافت، طرز تحریر و آواز تقریر میں وہ دوسرا ابوالکلام تھے۔ مولانا آزاد کی طرح رہن سہن اور معاشرت میں بڑی صفائی اور ستھرائی

رکھتے تھے۔ لطافت و نفاست پسند تھے۔ خوش پوش و خوش باش تھے۔ لیکن کم آمیز نہیں تھے۔ زندگی کے کسی دور میں جادۂ شریعت سے سرمو تجاوز نہیں کیا۔ ان کی پوری زندگی متشرع، متدین و متقی مسلمان کی زندگی تھی۔ ظاہراً و باطناً وہ سنت رسول علیہ السلام کے پابند تھے۔ دنیاوی جاہ و منصب اور شہرت و نمائش سے ہمیشہ بے پروا رہے۔ حریت و استقلال، جرات و ہمت، بلند خیالی و عالی دماغی، طہارت و شرافت، اخلاص و محبت، ان کی طبیعت میں راسخ تھی۔ سوز و گداز، ایمان و ایقان، عشق اسلام اور حب رسول علیہ السلام ان کا سرمایۂ حیات تھا۔

۱۹۲۰ء میں خلافت کمیٹی نے کلکتہ سے اردو روزنامہ ''زمانہ'' جاری کیا تو مولانا محمد اکرم خان اس کے ایڈیٹر اور مولانا عبداللہ الکافی اور مولانا شائق احمد عثمانی اس کے نائب و معاون ایڈیٹر مقرر ہوئے۔

قیام پاکستان کے بعد مولانا عبداللہ الکافی جمعیۃ اہل حدیث مشرقی پاکستان کے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں پبنا میں اپنا پریس قائم کیا اور ایک بلند پایہ مجلہ اسلامیہ ترجمان الحدیث جاری کیا، جس نے اعلیٰ علمی و ادبی حلقوں میں بلند مقام حاصل کیا۔

۱۹۵۲ء کے بنگلہ بھاشا اندولن کے طوفانی دور میں جب کہ بڑے بڑے علما و فضلا کے قدم جادۂ حق و صواب سے ڈگمگا گئے مولانا الکافی نے اردو کی پرزور حمایت فرمائی اور اردو کی حمایت میں بنگلہ، انگلش و اردو میں تین رسالے شائع کیے۔ پاکستان میں اسلامی اصول پر مبنی جمہوریت و نظام شریعت کے موضوع پر بہت سے مقالات و رسائل شائع کیے اور ممبران دستور یہ اور سیاسیین کے درمیان تقسیم کرائے۔

اسلامی ریاست و آئین پر پانچ سو صفحات سے اوپر ایک محققانہ کتاب، علمی و ادبی بنگلہ زبان میں شائع کی۔ بنگلہ زبان میں علمی و ادبی ہر لحاظ سے یہ کتاب ایک شاہ کار تسلیم کی جاتی ہے۔

ام الکتاب کے نام سے سورہ فاتحہ کو بنیاد بنا کر پورے قرآن کی تفسیر لکھی اور شائع کی، جو ہزار صفحات سے اوپر ضخامت کی ہے۔ افسوس کہ یہ دونوں کتابوں کے پہلے ایڈیشن ختم ہو چکے ہیں اور اب تازہ طباعت کی حاجت وطلب شدید ہے۔ راقم نے کئی بار مولانا سے عرض کیا تھا کہ وہ ان کتابوں کے اردو ایڈیشن جلد شائع فرمائیں۔ مولانا بہ یک وقت عربی، فارسی، اردو و بنگلہ کے مسلمہ ادیب تھے اور انگریزی و سنسکرت بھی جانتے تھے۔

مارچ ۱۹۵۶ء میں راقم نے ڈھاکہ میں آل پاکستان ملت اسلام کنونشن کی تنظیم کی۔ قومی ہفتہ منایا اور اس کے ماتحت (۱) اسلامی ریاست و معاشرت کانفرنس (۲) اسلامی دستور و شریعت کانفرنس (۳) اسلامی تعلیم و ثقافت کانفرنس (۴) اتحاد و استخلاص عالم اسلام کانفرنس (۵) مہاجر، انصار، اخوت کانفرنس (۶) آزادیٔ کاشمیر کانفرنس کے شان دار اجلاس منعقد کیے۔ علامہ عبداللہ الکافی نے اسلامی دستور شریعت کی صدارت فرمائی اور اردو و بنگلہ میں نہایت عالمانہ و فاضلانہ، فصیح و بلیغ، روح پرور و خیال افروز خطبہ ارشاد فرمایا، جس کی سب

حاضرین خصوصاً سردار عبدالرب نشتر، میجر جنرل اکبر خان، سردار عبدالقیوم خان صدر آزاد کاشمیر گورنمنٹ، مولانا اکرم خان، ڈاکٹر محمود احمد، ڈاکٹر افضال حسین قادری، علی الترتیب ڈین فیکلٹی آرٹ و ڈین فیکلٹی سائنس کراچی یونیورسٹی وسید محمد عثمان سابق میئر کلکتہ نے بہت تحسین فرمائی۔ مولانا نے اپنی بنگلہ واردو خطابت، علمیت وفضیلت کا سکہ بٹھا دیا۔

۱۹۵۶ء میں مولانا الکافی نے مستقلاً ڈھاکہ کو اپنا مستقر بنا لیا۔ پریس اور ترجمان الحدیث کو ڈھاکہ میں منتقل کر لیا۔ ڈھاکہ میں مدارس کے فارغ وسند یافتہ طلباء کے لیے ایک مدرسۃ الحدیث قائم کیا۔

۱۹۵۸ء میں الہلال کی لائن پر ہفتہ وار عرفات ڈھاکہ سے جاری کیا۔

متروکات:

مولانا الکافی مدۃ العمر مجرد رہے، اس لیے کوئی اولاد ظاہری نہیں چھوڑی۔ البتہ روحانی و معنوی اولاد کے طور پر (۱) ہفتہ وار عرفات (۲) ماہنامہ ترجمان الحدیث (۳) پریس (۴) قیمتی آراستہ لائبریری (۵) منظّم دفتر (۶) مدرسۃ الحدیث جمعیۃ اہل حدیث مشرقی پاکستان (اوراب بنگلہ دیش) (۸) مطبوعہ وغیر مطبوعہ تصنیفات و مقالات عالیہ کا ذخیرہ (۹) شاگردوں اور کارکنوں کی تربیت یافتہ جماعت (۱۰) اسلامی آئین و دستور پر صحائف و رسائل (۱۱) ملت اسلامیہ کے لیے وقف فی سبیل اللہ سراپا ایمان و اخلاص، مجسم سوز و گداز اوصاف و پاکیزہ متشرع زندگی اور اعلیٰ سیرت و اخلاق، علم وفضل، تہذیب و ثقافت، دین و دیانت، ثقاہت و امانت، ہمت و جرات، ایثار نفس، ملت پر ذاتی راحت و مفاد قربان کرنے اور جہاد وشہادت فی سبیل اللہ، اسلام کے لیے جینے اور اسلام ہی کے لیے مرنے کے بے پناہ جذبۂ صادق کی روشن مثال اپنے پیچھے چھوڑی ہے جو ابدالآباد تک زندہ و زندگی بخش رہے گی اور ہاتف غیب دائماً زمزمہ سنج رہے گا کہ

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

سید اعجاز احمد نقوی سہسوانی

(وفات ۱۷ جنوری ۱۹۶۳ء)

مولانا سید اعجاز احمد حسنی نقوی بن سید عبدالباری نقوی بن سید سراج احمد حسینی نقوی ۱۲۹۴ھ (۱۸۷۸ء) کو اپنے آبائی قصبے سہسوان (ضلع بدایوں ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام مختار احمد تھا۔ ان کی ولادت کے زمانے میں والد گرامی (سید عبدالباری نقوی) ریاست بھوپال میں علمی خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ ساتویں سال میں قدم رکھا تو والد کے پاس بھوپال پہنچ گئے اور ان سے تحصیل علم کرنے لگے۔ لیکن ابھی وہاں گئے دو سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ والد مکرم ۱۳۰۳ھ (۱۸۸۶ء) کو وفات پا گئے اور یہ حالتِ یتیمی میں حزن و ملال کا بوجھ اٹھائے واپس سہسوان آ گئے۔ اب تعلیم و تربیت کی ذمہ داری عارف باللہ مولانا حکیم سید محمد نذیر احمد شاہ نقوی نے سنبھالی جو ان کے دادا سید سراج احمد نقوی کے چھوٹے بھائی تھے۔

سہسوان آ کر انھوں نے سید محمد نذیر نقوی کی زیر نگرانی باقاعدہ حصولِ تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ فارسی کی بعض کتابیں اور صرف و نحو کی چند ابتدائی اور انتہائی کتب مولانا سید عبدالحسیب سے پڑھیں۔ منطق و حکمت اور فقہ و کلام کے مروّجہ علوم کی تحصیل کے لیے مولانا سید محمود عالم کے حلقۂ شاگردی میں داخل ہوئے۔

ان سب علوم درسیہ کی تکمیل ہو چکی تو ۱۳۱۱ھ (۱۸۹۴ء) میں بھوپال کو روانہ ہوئے۔ وہاں مولانا محمد بشیر فاروقی سہسوانی سے توضیح و تلویح، مسلم الثبوت اور تفسیر بیضاوی وغیرہ کتابیں پڑھیں۔ مولانا عبدالحق کابلی سے جو ریاست بھوپال کے عہدۂ قضا پر فائز تھے، قاضی مبارک، صدرا اور علمِ معانی و بیان کی مطوّل وغیرہ کی تکمیل کی۔ کتب حدیث کے لیے شیخ حسین عرب یمنی کی خدمت میں حاضری دی اور ان کے حضور زانوئے شاگردی تہ کیے۔ اس طرح علوم متداولہ کی تمام درسی کتابوں کی تکمیل اس عہد کے جلیل المرتبت اساتذہ سے فرمائی۔

اللہ تعالیٰ نے انھیں جودتِ طبع سے بھی نوازا تھا، ذکاوتِ ذہن کی دولت بھی فراوانی سے عطا فرمائی تھی اور قوّتِ حافظہ کی نعمت سے بھی بہرہ مند فرمایا تھا۔ وہ مروّجہ علوم میں مہارت رکھتے تھے۔ عربی، فارسی اور اردو کے ادیب اور شاعر تھے۔ معجزؔ تخلص کرتے تھے۔ علمِ طبّ میں بھی کامل تھے۔

وہ طلبا کو پڑھاتے بھی تھے اور مطب بھی کرتے تھے۔ علوم قرآن و حدیث میں وہ یگانۂ روزگار تھے اور عربی ادبیات حماسہ، متنبّی، مقامات حریری اور سبع معلقات وغیرہ درسی کتابیں یوں سمجھیے کہ انھیں زبانی یاد تھیں۔

عربی لغات ومحاورات میں اس عہد کا کوئی عالم ان کا ہم سر نہ تھا۔ مولانا محمد طیب مکی، شیخ حسین عرب کے بڑے بیٹے شیخ محمد اور سید ذوالفقار احمد نقوی کو اس وقت ریاست بھوپال کے ماہرینِ ادب عربی مانا جاتا تھا، وہ سب سید اعجاز احمد نقوی کی عربی زبان میں دست رس کے معترف ومداح تھے۔ استخراج مادۂ تاریخ میں انھیں کمال حاصل تھا۔

امام ابن تیمیہ، امام ابن قیم اور امام ذہبی سے بے حد متاثر تھے اور ان کی کتابوں کا مطالعہ نہایت اہتمام اور دلچسپی سے کرتے۔ عقائد میں ان کے نقطۂ نظر کی زوردار الفاظ میں تائید فرماتے۔ معتزلہ، شیعہ اور مذاہب باطلہ کا بہ دلائل رد کرتے۔ بدعات اور خلافِ شرع رسوم ورواج کی تردید میں خاص شہرت کے حامل تھے۔ زکی، جامع کمالات اور وسیع النظر عالم تھے۔ بدایوں، بسولی، فیض آباد اور لکھنؤ میں ان کا سلسلہ تدریس جاری رہا۔ دو سال آگرہ کے سینٹ جونس کالج میں عربی کے پروفیسر رہے۔ خوش اخلاق، خوش مزاج، شگفتہ کلام، کھلی پیشانی، نیک سیرت، خوب صورت، وجیہ، بذلہ سنج، حسد وبغض سے نفور، ہم درد ِخلائق، شیریں عادات کے مالک، اوصافِ حمیدہ کے حامل، ملنسار اور خندہ رو۔

اپنے علاقے اور عہد کے نامور طبیب تھے۔ تشخیص مرض میں ممتاز اور حذاقت وتجربہ میں شہرت رکھتے تھے۔ دور دور سے مریض ان کے پاس آتے اور اللہ کی مہربانی سے شفایاب ہو کر جاتے۔ ان کے قیام بریلی کے زمانے میں ۱۹۱۹ء میں وہاں طاعون کا مرض پھیلا تو بے شمار لوگوں کو ان کے علاج سے اللہ نے شفا بخشی۔ ان دنوں ہسپتالوں میں زیادہ تر انگریز ڈاکٹر ہوتے تھے۔ مرض کا دور ختم ہوا تو ضلع بریلی کے حکام اور کمشنر نے مریضوں کی خدمت اور علاج معالجے کے سلسلے میں جس طرح کا سرٹیفکیٹ انگریز ڈاکٹر کو دیا، انھی الفاظ پر مشتمل سید اعجاز احمد نقوی کو دیا۔ بریلی میں ان کا درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا اور مطب بھی تھا جو مرجعِ خواص وعوام تھا۔

اس زمانے میں مختلف مذاہب کے اہل علم کے درمیان مناظروں کا بڑا زور تھا۔ لوگ دیکھتے تھے کہیں مسلمان علما کی عیسائیوں اور ہندوؤں سے بحثیں ہو رہی ہیں، کہیں شیعہ، حنفی اور اہل حدیث مناظرین ایک دوسرے سے پنجہ آزمائی کر رہے ہیں۔ پھر یہ مناظر حضرات اپنے حریف سے سرکاری سندوں کا مطالبہ کرتے تھے۔ سید اعجاز احمد بھی چوں کہ مناظرانہ ذہن رکھتے اور مناظرے کرتے تھے، اس لیے مارچ ۱۹۱۸ء میں انھوں نے منشی فاضل کا امتحان دیا جسے اب فارسی فاضل کہا جاتا ہے اور اس سے اگلے سال مارچ ۱۹۱۹ء میں مولوی فاضل کا امتحان دیا جو اب عربی فاضل کے نام سے موسوم ہے۔ دونوں امتحانوں میں بہتر پوزیشن حاصل کی اور سرکاری سند کے مستحق قرار پائے۔

سید اعجاز احمد معجز نقوی مصنف بھی تھے۔ ان کی بہت سی تصانیف میں چند کتابیں مندرجہ ذیل ہیں:

☆......رشحات الکرم فی شرح فصوص الحکم: یہ عربی کتاب ہے فارابی کی فصوص الحکم کی شرح ہے۔

☆......توقیع الفرندفی تذکار ادباء الہند: یہ عربی میں ہے اور ہندوستان کے ادیبوں کا خوب صورت تذکرہ ہے۔

☆...... براءۃ التحقیق: یہ بھی عربی زبان میں ہے اور اجتہاد وتقلید کے موضوع پر محققانہ کتاب ہے۔

☆......الدراری المضیۃ: عربی

☆......شعر العرب

☆......تسلیۃ الفواد بترجمۃ بانت سعاد: فارسی نظم میں

☆......قند فارسی: مجموعہ اشعار فارسی، ان کا اپنا دیوان

☆......تذکرہ شعرائے سہسوان: اردو

☆......دیوان اردو: اپنے اردو اشعار کا مجموعہ

☆...... ہندوؤں کے فرقہ آریہ کی تردید میں چند اردو رسائل

☆......مرض طاعون کے علاج کے بارے میں ایک کتاب

☆......بعض طبی مسائل کے موضوع پر ایک رسالہ

☆...... پردہ راز: یہ اردو میں ایک اخلاقی ناول ہے جو آگرہ میں چھپا

☆......وجاریہ: یہ بھی اخلاقی ناول ہے، بریلی میں طبع ہوا۔

☆......مومن و غالب: دونوں شاعروں کے کلام پر محاکمہ کرتے ہوئے مومن کو غالب پر فائق ثابت کیا ہے۔

مولانا سید اعجاز احمد معجز نقوی سہسوانی عربی، فارسی، اردو کے شاعر بھی تھے اور مصنف بھی۔ نظم اور نثر دونوں اصناف تحریر میں ان کا قلم رواں تھا۔ انھوں نے ۸۸ سال کی عمر پائی اور ۱۷ جنوری ۱۹۶۳ء (۲۱ شعبان ۱۳۸۲ھ) کو اپنے آبائی وطن سہسوان میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ [1]

انا للہ و انا الیہ راجعون.

---

[1] حیات العلماء: ص ۱۲۷ تا ۱۳۳۔ نزہۃ الخواطر: ۸/ ۷۰، ۷۱۔ تراجم علماے حدیث ہند: ص ۲۵۹، ۲۶۰.

مولانا نذیر احمد املوی رحمانی

(وفات ۳۰-مئی ۱۹۶۵ء)

۱۹۴۵ء کے ماہِ اکتوبر میں یہ فقیر حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے ساتھ جمعیت علمائے ہند کی ایک میٹنگ میں شرکت کے لیے دہلی گیا تو وہاں دارالحدیث رحمانیہ میں حاضری کا شرف بھی حاصل ہوا۔ مقصد حضرت مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوری اور مولانا نذیر احمد رحمانی املوی کی زیارت تھا۔ اس فقیر کے لیے ان کی زیارت کا یہ پہلا موقع تھا اور آخری بھی یہی تھا۔ حضرت مولانا عبیداللہ رحمانی کا تذکرہ میں اپنی ایک کتاب ''دبستان حدیث'' میں کر چکا ہوں۔ مولانا نذیر احمد رحمانی سے متعلق ایک مطبوعہ مضمون میرے دوست مولانا عارف جاوید محمدی نے کویت سے ارسال فرمایا ہے جو ہندوستان کے ایک اہلِ قلم مولانا عبدالحی انصاری کا تحریر فرمودہ ہے۔ اس طویل مضمون کے مندرجہ ذیل مآخذ ہیں:

۱- پندرہ روزہ ''اہل حدیث'' دہلی کی ۱۹۶۵ء کی فائل

۲- پندرہ روزہ ''ترجمان'' دہلی کی فائل ۱۹۶۵ء

۳- چند رجال اہل حدیث (از مولانا ابوعلی اثری) شائع کردہ ندوۃ المحدثین گوجراں والا

۴- اہل حدیث اور سیاست (از مولانا نذیر احمد رحمانی)

۵- ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور، نومبر ۱۹۹۴ء شمارہ ۴۵

مولانا عبدالحی انصاری کا یہ مضمون مولانا نذیر احمد رحمانی مرحوم کے بارے میں مختلف حضرات کے تاثرات کا خوب صورت مجموعہ ہے۔ یہ حضرات ہیں مولانا رئیس احمد احرار، مولانا آزاد رحمانی، مولانا عبدالصمد رحمانی، ڈاکٹر سید عبدالحفیظ سلفی، مولانا عبدالمبین منظر، مولانا ابوعلی اثری، مولانا ابوالقاسم خالد العربی رحمانی، ڈاکٹر محمد یونس محمدی کان پوری اور بعض دیگر اہل علم۔ ان سب بزرگانِ عالی قدر کا تعلق ہندوستان سے ہے اور میری معلومات کے دو ایک کے سوا یہ حضرات اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

حضرت مولانا نذیر احمد نے ۳۰ مئی ۱۹۶۵ء کو وفات پائی۔ یہ کم و بیش ۴۵-۴۶ سال قبل کے تاثرات ہیں۔ میں نے ان میں کافی کانٹ چھانٹ بھی کی ہے اور الفاظ میں کچھ تغیر و تبدل بھی کیا ہے۔ ان حضرات میں سے جو حضرات زندہ ہیں، اللہ ان کی زندگی دراز فرمائے اور انھیں اپنے دین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کی

توفیق بخشے اور جو حضرات اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے ہیں، انھیں جنت الفردوس عطا فرمائے۔

اب آئندہ صفحات میں مولانا نذیر احمد رحمانی کے متعلق ان حضرات کے تاثرات پر مشتمل اس فقیر کے مضمون کا مطالعہ فرمایئے:

شیخ الحدیث مولانا نذیر احمد رحمانی املوی ۱۰ ذی الحجہ ۱۳۲۳ھ مطابق ۶ فروری ۱۹۰۶ء کو ''املو'' نزد مبارک پور ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ شیخ برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ والد کا نام عبدالشکور اور دادا کا نام جعفر تھا۔

ابتدائی تعلیم:

ابتدائی تعلیم املو، مبارک پور اور مدرسۃ الاصلاح سرائے میر (ضلع اعظم گڑھ) سے حاصل کی۔ کچھ عرصہ مدرسہ فیض عام مئوناتھ بھنجن میں داخل رہے۔ بعد ازاں دار الحدیث رحمانیہ دہلی پہنچے۔

دستار فضیلت اور سند فراغت یہیں سے حاصل کی۔ خود مولانا املوی فرماتے ہیں:

''دار الحدیث رحمانیہ کا افتتاح ۱۳۳۹ھ (۱۹۲۱ء) میں ہوا۔ میں اسی سال تقریباً دو مہینے کے بعد ذی الحجہ میں اس میں داخل ہو گیا۔ ابتدا سے انتہا تک اپنی تعلیم کا بیشتر حصہ مکمل کرنے کے بعد شعبان ۱۳۴۶ھ (۱۹۲۸ء) میں سند فراغت حاصل کی۔''

استعداد و قابلیت:

مولانا نذیر احمد املوی مرحوم کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ رحمانیہ میں تعلیم کے دوران ہمیشہ ہر جماعت میں اوّل آتے اور انعامات حاصل کرتے رہے۔ جس سال تعلیم کی تکمیل کی، دار الحدیث کی طرف سے انھیں بخاری شریف، ۴۰ روپے اور ایک جیبی گھڑی انعام کے طور پر دی گئی۔

۱۹۶۲ء میں وہ آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے جو رحمانیہ کے نصاب کی آخری جماعت تھی۔ سالانہ امتحان کا نتیجہ سنایا گیا تو ممتحن مدرسہ حضرت مولانا عبداللہ روپڑی نور اللہ مرقدہ نے یہ الفاظ کہے:

''نذیر احمد مدرسہ میں اول ہیں اور مجموعی طور پر جو نمبر حاصل کیے ہیں جب سے مدرسہ قائم ہوا ہے اتنے نمبر کوئی لڑکا حاصل نہ کر سکا۔ ہر کتاب میں وہ امتیازی نمبروں میں پاس ہوئے ہیں۔''

مولانا املوی کی قابلیت و استعداد کا اعتراف مہتمم دار الحدیث رحمانیہ جناب شیخ عطاء الرحمٰن کو بھی تھا بالخصوص معقولات میں۔ چنانچہ انھوں نے مولانا املوی کو اپنے خرچ پر معقولات کی تعلیم کے لیے مدرسہ شمس العلوم بدایوں بھیج دیا۔ مولانا املوی نے ایک سال میں علم ریاضی و علوم عقلیہ میں اپنی استعداد اور لیاقت کا لوہا منوا لیا۔ تحصیل علوم میں انہماک اور استغراق کا یہ عالم تھا کہ عصر کے بعد فراغت کے وقت بھی کتب بینی اور مطالعہ میں مصروف رہتے۔ مولانا نے بتایا کہ ایک دن بعد نماز عصر میں کتابوں کے مطالعہ میں مشغول تھا کہ

کچھ افغانی لڑکے کمرے میں داخل ہوئے اور مجھے مطالعہ میں مشغول دیکھ کر انتہائی حیرت سے بولے: آپ ایسے وقت میں مطالعہ کر رہے ہیں۔ انھوں نے فرمایا: اس میں کیا حرج ہے؟ یہ سن کر ایک افغانی نے انتہائی جوش کے عالم میں کہا: کیا آپ کو معلوم نہیں کہ امام اعظم کا قول ہے کہ جو شخص عصر کے بعد مطالعہ کرے وہ کند ذہن ہو جاتا ہے۔ مولانا کو ان کی گفتگو سے حیرت ہوئی لیکن ان اکھڑ مزاجوں سے الجھتا کون؟ کتاب بند کر دی اور کمرے سے باہر نکل آئے۔

تکمیل تعلیم:

دار الحدیث رحمانیہ میں مولانا املوی رحمہ اللہ نے سات سال تک تحصیل علم کی۔ یعنی ۱۳۳۹ھ (۱۹۲۱ء) میں رحمانیہ میں داخلہ لیا اور ۱۳۴۶ھ (۱۹۲۸ء) میں سند فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد مدرسہ شمس العلوم بدایوں سے علم ریاضی اور معقولات کی تحصیل کی۔

اساتذہ:

مولانا احمد اللہ محدث پرتاب گڑھی، مفسر قرآن مولانا محمد ابراہیم رحمہ اللہ میر سیالکوٹی، مولانا غلام یحییٰ کان پوری رحمہ اللہ، مولانا عبدالغفور جیراج پوری رحمہ اللہ، مولانا اصغر علی بہاری رحمہ اللہ، حافظ الحدیث مولانا عبدالتواب رحمہ اللہ علی گڑھی، مولانا محمد اسحاق آروی، مولانا عبدالرحمٰن نگرنہسوی رحمہ اللہ اور مولانا عبدالوہاب آروی رحمہ اللہ مولانا کے اساتذہ میں سے قابل ذکر ہیں۔ مولانا املوی رحمہ اللہ کو شارح ترمذی مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری رحمہ اللہ سے بھی شرف تلمذ حاصل ہوا۔ علامہ مبارک پوری رحمہ اللہ کی صحبت نے مولانا املوی رحمہ اللہ کو بہت متاثر کیا۔

درس و تدریس:

مولانا نذیر احمد املوی رحمہ اللہ رقم طراز ہیں:

> ”شعبان ۱۳۴۶ھ میں میں نے مدرسہ رحمانیہ سے سند فراغت حاصل کی اور پھر اسی سال مدرس کی حیثیت سے مدرسے کی خدمت پر مامور ہو گیا اور اب تک بحمد اللہ اسی درجے پر فائز ہوں اور اس اٹھارہ سالہ زندگی میں شاید ایک آدھ سال مدرسہ سے غیر حاضر رہا ورنہ اکثر حصہ اسی گلشن علم کی بلبلوں، باغ حکمت کے پھولوں اور ریاض ملت کی کیاریوں میں گزرا۔“

دار الحدیث رحمانیہ کی کل عمر ۲۷ سال ہے۔ رحمانیہ کے معرض وجود میں آنے کے دو ماہ بعد ہی مولانا نے رحمانیہ میں داخلہ لیا اور ابتدائی سات سال تحصیل علم کی غرض سے رحمانیہ میں گزارے جب کہ اٹھارہ سال اس میں تدریس فرمائی۔

۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان تقسیم ہوا تو دار العلوم رحمانیہ اپنا وجود برقرار نہ رکھ سکا۔ ۱۹۴۸ء میں مولانا نذیر احمد نے دار العلوم احمدیہ سلفیہ دربھنگہ میں صدر المدرسین کی حیثیت سے سلسلہ تدریس شروع کیا۔ لیکن یہاں کی آب و ہوا انھیں راس نہ آئی، جس کی وجہ سے یہاں زیادہ دیر نہ رہ سکے اور ۱۹۵۰ء میں اہل بنارس نے صدر الاساتذہ کی حیثیت سے ان کی خدمات حاصل کر لیں، پھر تاحیات اسی درس گاہ سے وابستہ رہے۔

انداز تدریس:

مولانا نذیر احمد املوی ایک مشفق استاذ، مربی اور محسن کی حیثیت سے طلبا کی تربیت ونگرانی کرتے۔ انھیں مطالعہ کی تلقین فرماتے۔ عربی عبارات کی تصحیح پر خصوصی توجہ دیتے۔ دوران تدریس طلبا کے جان دار سوالات سے خوش ہوتے، کیوں کہ یہ اس بات کی علامت ہوتی کہ طلبا نے مطالعہ کیا ہے اور جب طلبا کی طرف سے کوئی معقول سوال نہ ہوتا تو کبیدہ خاطر ہوتے کیوں کہ یہ اس بات کی دلیل ہوتی کہ طلبا مطالعہ نہیں کرتے۔ طلبا کو اپنی طرف متوجہ رکھتے، عدم توجہ پر سرزنش فرماتے اور بعض دفعہ سزا بھی دیتے۔ بحث کے ہر گوشے کو واضح کرتے۔ تفسیر و حدیث کے بیان میں مختلف ادیان و مذاہب اور ان کے مدار و ماخذ کی تشریح فرماتے۔ صحیح مذہب کو دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے۔ مولانا کی تدریسی خصوصیات کے بارے میں مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری رحمہ اللہ نے پندرہ روزہ اخبار ''اہل حدیث'' دہلی، ۱۵-اگست ۱۹۶۵ء کے شمارے میں بڑی تفصیل کے ساتھ نکتہ آفرینی کی ہے۔

> ''حضرت مولانا مرحوم جب سے مسند درس پر بیٹھے تب ہی سے اونچی اور منتہی کتابیں پڑھانے لگے۔ چنانچہ دار الحدیث رحمانیہ سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ انھیں مادر علمی میں معلم مقرر کیا گیا اور نور الانوار اور رشیدیہ تک کے اسباق ان کے سپرد کیے گئے۔ مفوضہ خدمات کو بڑی توجہ اور دلچسپی سے انجام دیتے۔ بڑی تیاری اور مطالعہ کر کے دلکش، دلنشیں اور دلچسپ انداز میں اسباق پڑھاتے۔ اپنے اس طرز عمل سے انھوں نے طلبا میں ایسی روح پیدا کر دی تھی کہ تلامذہ بلا مطالعہ کیے درس گاہ میں حاضر نہ ہوتے تھے اور سوائے شدید عذر کے غیر حاضر ہونے کی ہمت بھی نہ کر سکتے تھے۔ انداز تدریس ایسا تھا کہ سبق کے مفہوم ومطالب بہت جلد طلبا کے ذہن نشین ہو جاتے اور مشکل سے مشکل مقامات کے معانی نہایت آسانی سے ان کے دل و دماغ پر نقش ہو جاتے۔
> مولانا نے طالب علمی کے بعد عمر بھر گلشن تدریس کی آب یاری کی اور یہ دور تقریباً ۳۸ سال پر محیط ہے۔ مولانا کی تعلیم و تدریس میں ہر وہ خصوصیت وخوبی پائی جاتی تھی جو ایک اچھے اور کامیاب مدرس ومعلم میں ہونی چاہیے۔ اس دوران ان گنت تشنگان علم نے مولانا سے اپنی علمی تشنگی کو دور

کیا۔ مولانا باکمال معلم و مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ مایہ ناز مربی و مصلح بھی تھے۔
جس طرح طلبا کی اخلاقی تربیت اور تعلیم کی دیکھ ریکھ دار الحدیث رحمانیہ میں ان کے سپرد تھی، اس طرح جامعہ سلفیہ بنارس میں بھی ان امور میں انھیں پورا اختیار حاصل تھا۔ انھوں نے ان امور کو جس خلوص اور للّٰہیت کے ساتھ انجام دیا وہ انہی کا حصہ تھا۔"

مولانا آزاد رحمانی تحریر کرتے ہیں:

"مولانا کے تربیت یافتہ علما ملک کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں کتنے ہی ایسے ہیں جن کے زور بیان اور خطابت کا سکہ ہر طرف جما ہوا ہے۔ کتنے ہی ایسے ہیں جو صاحب قلم اور انشا پرداز ہیں۔ نہ معلوم کتنوں نے مسند درس و تدریس کو زینت دے رکھی ہے۔ کتنے صاحبِ محراب و منبر ہیں۔ کچھ صاحبِ تصنیف و تالیف بھی ہیں۔ یہ سب مولانا موصوف کے خلوص، اور تربیت کا کرشمہ تھا کہ ۳۸ سال کی تدریسی زندگی میں آپ نے اتنے اہل علم اور اصحابِ فضل و کمال پیدا کیے۔

مولانا اور شیخ عطاء الرحمٰن:

مولانا رئیس الاحرار ندوی لکھتے ہیں: مولانا املوی رحمہ اللہ کے جملہ اساتذہ نے ان کو گہوارۂ علم و فن میں تربیت دے کر لعل درخشاں بنا دیا مگر ان کے علمی ارتقا اور فکری جلا میں شیخ عطاء الرحمٰن مرحوم کی کیمیا گری کو بھی بڑا دخل ہے، جس کا اظہار مولانا املوی مرحوم نے رسالہ "محدث" دہلی میں بڑے شرح و بسط کے ساتھ پر اثر انداز میں بیان فرمایا ہے۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"محترم و مرحوم (شیخ عطاء الرحمٰن) کے لطف و کرم کی بدلیاں میری جسمانی و روحانی اصلاح و فلاح، انجاح و بہبود کے لیے مجھ پر جس طرح جھوم جھوم کر برسی ہیں، بخدا اس کے شکریہ کے لیے اگر میرے جسم کا ایک ایک بال اور رگوں میں دوڑنے والے خون کا ایک ایک قطرہ مجسم دعا بن جائے تب بھی کبھی اس کا معاوضہ نہیں بن سکتے۔ اللہ اللہ جس کے فیض نے جہل و نادانی کی تاریک گہرائیوں سے نکال کر علم و ہدایت، عزت و رفعت کے بلند میناروں پر پہنچا دیا تھا، اس کا معاوضہ کس انسانی طاقت کے بس میں ہے؟"

دورِ ابتلاء و آزمائش:

اگست و ستمبر ۱۹۴۷ء میں دہلی کا ہولناک انقلاب وہاں کے مسلمانوں کے لیے قیامت صغریٰ سے کم نہ تھا۔ اس وقت دہلی کے مسلمان جس مصیبت سے گزرے دار الحدیث رحمانیہ دہلی بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ اس سلسلے

میں میں نے دارالعلوم نمبر کے لیے مولانا نذیر احمد رحمانی کی اپنی سوانح حیات سے متعلق عنایت کی ہوئی تحریر کی بنیاد پر جو مضمون مرتب کیا تھا (اور جو مولانا کے ملاحظہ کے بعد شائع ہوا تھا) اس کا اقتباس یہاں درج کر رہا ہوں:

"اگست ۱۹۴۷ء میں جب ملک تقسیم ہوا اور اس کے نتیجے میں دہلی کے مسلمانوں پر قیامت ٹوٹی تو اس زمانے میں مولانا نذیر احمد دہلی ہی میں تھے۔ مدرسے کا اٹھائیسواں سال شروع تھا۔ تعطیل کلاں کے بعد آپ مدرسے پہنچ چکے تھے۔ کیوں کہ طلبا کے داخلے کا کام آپ ہی کے ذمہ تھا۔ دوسرے مدرسین ابھی نہیں پہنچے تھے۔ ستمبر کے شروع میں مختلف حملوں سے گڑبڑ کی خبریں ملنے لگیں، یہاں تک کہ ۵ ستمبر ۱۹۴۷ء کو آٹھ بجے شب مدرسے پر جنوبی طرف ہندوؤں نے خشت باری شروع کی۔ مدرسے کے لوگوں نے بھی اپنی مدافعت کی۔ دیر تک معرکہ آرائی رہی۔ مدرسے کا پھاٹک بند تھا۔ مولانا املوی مدرسے کے لوگوں کے ساتھ مدرسے کی چھت پر تھے اور وہیں سے مدافعت کر رہے تھے۔ نعرہ تکبیر کی صدا سن کر ملٹری پہنچ گئی۔ اس نے مدرسے کے باہر سے کئی مرتبہ اشک آور گیس چھوڑی، گولیاں چلائیں، مگر الحمد للہ کوئی زخمی نہ ہوا۔ جب ہنگامہ فرو ہوا تو مولانا املوی عشاء کی نماز کے لیے مسجد تشریف لے گئے جو مدرسے کے قریب اور اس کے احاطہ سے باہر تھی۔ مولانا کے ساتھ دو آدمی اور تھے۔ یہ لوگ نماز سے جوں ہی فارغ ہوئے، مسلح پولیس پہنچ گئی۔ اس نے مسجد کو گھیر لیا۔ محلے کے کچھ دوسرے آدمیوں کی گرفتاری بھی ہوئی۔ سب کو پولیس کی لاری میں بٹھا کر تھانے پہنچایا گیا۔ تھانے والے شہر کے ہنگاموں کی وجہ سے اس قدر مصروف تھے کہ ان کو ان اسیروں کے متعلق ضابطے کی کوئی کارروائی کرنے کی فرصت ہی نہ ملی۔ چنانچہ دوسرے دن آٹھ بجے صبح کو ان لوگوں کے پتے وغیرہ لکھے گئے اور پھر یہ لوگ دوپہر کے بعد حوالات میں بند کیے گئے۔ سنا ہے کہ چوبیس گھنٹے سے زیادہ حوالات میں رکھنے کا قانون نہیں۔ لیکن یہ لوگ تین دن تک حوالات ہی میں رہے۔ حوالات کی لمبائی زیادہ سے زیادہ چار گز اور چوڑائی ڈھائی گز ہوگی۔ شہر میں برابر گرفتاریاں ہو رہی تھیں اور سب کو اسی میں لا کر بند کیا جا رہا تھا۔ کمرہ بالکل بھر گیا۔ چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک مرتبہ قضائے حاجت کے لیے باہر نکالا جاتا تھا۔ پیشاب کے لیے مٹی کی ایک چھوٹی سی ناند رکھی ہوتی تھی جو پیشاب سے بھر جاتی تھی تو سارا کمرہ متعفن ہو جاتا تھا۔ تین دن میں صرف ایک دفعہ حوالاتیوں کی چیخ پکار کے بعد پولیس نے انھیں چنے ابال کر کھانے کو دیے۔ طلبا بے چارے صبح کے وقت جب کرفیو کھلتا تھا تو کچھ

روٹیاں پہنچا جاتے تھے مگر دوسرے حوالاتیوں کے گھروں سے کچھ نہیں آتا تھا۔ اس لیے وہ بھی بھوکے تھے۔ انھی چند روٹیوں کے ٹکڑے ٹکڑے بانٹ کر کھالیا کرتے تھے۔

ایسی گندی اور بدبو دار جگہ میں مولانا نذیر احمد کو لیٹنے کی ہمت نہ ہوتی۔ جب نیند کے غلبے سے مجبور ہو جاتے تو ایک کونے میں ٹیک لگا کر سہارا لے لیا کرتے اور کچھ دیر تک تھوڑا سا سو جاتے۔ حوالاتیوں میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اس سے پہلے جیل جا چکے تھے اور وہاں کی زندگی کا تجربہ رکھتے تھے۔ انھوں نے مولانا سے کہا کہ تھانے دار سے کہیے کہ ہم لوگوں کو جیل بھیج دیا جائے، وہاں آرام رہے گا۔ چنانچہ سب لوگوں نے بہ اتفاق اور بہ اصرار مطالبہ کیا کہ ہم کو یہاں سے نکال کر جیل بھیج دیا جائے۔ اس کے بعد سب کو دتی سنٹرل جیل بھیج دیا گیا۔

ایک مہینے کے بعد جب عدالتیں کھلیں تو ان زندانیوں کا مقدمہ پیش ہوا۔ عدالت کے سامنے جب آپ لائے گئے تو اس نے مولانا کا نام لے کر کہا کہ آپ پر چھے ہندوؤں کے قتل کا الزام ہے۔ اتنا کہہ کر عدالت خاموش ہو گئی اور مولانا بھی چپ رہے۔ دو منٹ کی خاموشی کے بعد عدالت نے خود کہا کہ پولیس کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس لیے میں آپ کو بری کرتا ہوں۔ پولیس کو حکم دیا کہ ہتھکڑیاں کھول دی جائیں۔ چنانچہ مولانا کی ہتھکڑیاں کھول دی گئیں اور مجسٹریٹ کے اشارے سے آپ ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ رہائی کے بعد جب آپ مدرسے پہنچے تو معلوم ہوا کہ مہتمم صاحب مدرسہ اور اس کے کتب خانے کو جامعہ ملیہ کے حوالے کر کے مع اہل و عیال کراچی چلے گئے ہیں۔ چنانچہ چند دنوں کے بعد جامعہ کی لاری آئی اور کتابیں بھر بھر کر لے گئی۔

اوپر کی تحریر سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ذمہ داروں میں مولانا مرحوم ہی کی ذات گرامی تھی جو اس اجڑے ہوئے گلشنِ علم پر آنسو بہاتی تھی۔ ان شدائد و مصائب میں تپ کر مولانا کی امانت و دیانت اور نکھر گئی۔ ان کا یہ حال تھا کہ پورے کتب خانے کو از اول تا آخر جامعہ کے سپرد فرما دیا۔ اگر کسی نے کام کی کوئی کتاب یا کاغذ کا ٹکڑا رکھنا چاہا اور آپ کو خبر ہو گئی تو بڑی سختی کے ساتھ اس حرکت سے روک دیا۔ گویا اس وقت آپ ﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلٰى أَهْلِهَا﴾ کی پوری عملی تفسیر تھے۔ رہائی کے بعد دار الحدیث رحمانیہ کی خانہ ویرانی کو مولانا املوی کس دل و جگر سے دیکھتے تھے، اس کا بچپن، شباب اور اس کے اخیر دور کی تمام بہاریں آپ کے سامنے گزری تھیں۔ جہاں آپ نے اپنی عربی تعلیم کا ابتدائی دور بھی گزارا تھا، وسطی دور بھی اور اخیر زمانہ بھی۔ اس کے ذرے ذرے سے آپ کو محبت تھی۔ اس لیے اسیری سے رہائی کے بعد اپنے گھر میں

اجنبی بن کر رہنا کیسے گوارا ہوتا؟ مجبوراً آپ نے دھڑکتے دل اور غم ناک آنکھوں کے ساتھ اسے الوداع کہا اور گھر جانے کے لیے روانہ ہوئے۔ اللہ کی جانب سے آپ کا ذہنی اور جسمانی امتحان تو ہو چکا تھا۔ مگر ابھی مالی امتحان باقی تھا۔ ایک دن پورے سامان کے ساتھ اسٹیشن پر پہنچے۔ ریلوے افسروں نے کہا کہ آگے کا راستہ محفوظ نہیں ہے۔ ٹرینیں لوٹ لی جاتی ہیں اور مسافروں کو قتل کر دیا جاتا ہے، اس لیے ٹکٹ نہیں ملے گا۔ مجبوراً مدرسے میں واپس آنے کے لیے ایک تانگے میں سامان بار کیا اور اسٹیشن سے واپس ہوئے۔ تانگے والا شاید غنڈوں سے ملا ہوا تھا۔ واپسی میں وہ آپ کو اسٹیشن سے کمپنی باغ لایا۔ یہاں غنڈوں نے آپ کو گھیر لیا اور چشم زدن میں سارا سامان لوٹ لیا۔ اس طرح تباہی کی رہی سہی داستان بھی پوری ہوگئی اور آپ کے پاس بدن کے کپڑوں کے سوا کچھ نہیں رہ گیا تھا۔

ایک مہینے کے بعد جب ٹرینوں کے ڈبے مسلمانوں کے لیے محفوظ کیے گئے اور حفاظتی پولیس کا انتظام ہوگیا تب آپ نومبر ۱۹۴۷ء میں اپنے وطن واپس پہنچے۔

ایک اور آزمائش:

مولانا کو ایک اور آزمائش سے اس وقت گزرنا پڑا جب جامعہ رحمانیہ مدن پورہ (بنارس) میں تدریسی خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ کسی دشمن کی غلط اطلاع پر حکومت نے ان کو پاکستانی قرار دے کر کسٹوڈین کی عدالت میں ان پر مقدمہ دائر کر دیا۔ حالانکہ متحدہ ہندوستان میں بھی ان کو شاید کبھی ان علاقوں میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا جو آج پاکستان کے زیرنگیں ہیں، تقسیم کے بعد پاکستان جانا تو بہت دور کی بات تھی۔ مولانا پر اگر پاکستان جانے کا الزام ثابت ہو جاتا تو اس کا صاف اور واضح مطلب یہ ہوتا کہ ان کا مکان، جاداد اور باغات سب کی مالک حکومت ہند ہو جاتی اور نیلام پر چڑھا کر انھیں اونے پونے فروخت کر دیا جاتا۔ اس کے علاوہ ان پر وطن دشمنی کا داغ الگ سے لگ جاتا۔ اعظم گڑھ میں کسٹوڈین کی عدالت اندرونِ شہر ایک بڑی کوٹھی میں قائم تھی۔ اس عدالت میں پبلک کیسوں کے خاص پیروکار ایک مشہور وکیل شاہ عبدالخالق مرحوم تھے۔ مولانا کا کیس بھی انہی کے سپرد تھا۔ حاکم ایک رفیوجی سندھی تھا، جس کے بارے میں مشہور تھا کہ جلاوطنی کی زندگی گزارنے کے باعث وہ اعصابی اور ذہنی تناؤ کا شکار ہے اور کسی مسلمان کے حق میں اس نے تعصب سے بری ہو کر حق و انصاف کے مطابق کبھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔

دہلی میں واپسی کے بعد سے تاریخ مقدمہ تک مولانا کو اپنے ہندوستان میں رہنے کا ثبوت دینا تھا۔ یعنی ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۳ء تک ہندوستان میں رہے، اس سے باہر نہ جانے کے بارے میں ثبوت آپ کے ذمے

تھا۔ ۶-۷ سال کی طویل مدت اور یہ ثابت کرنا کہ اس پورے زمانے میں آپ نے ایک دن کے لیے بھی ملک نہیں چھوڑا، کس قدر دردسری کی بات تھی۔ لیکن مولانا اس مشکل کے وقت بھی ثابت قدم رہے۔ آپ نے عدالت میں ۱۱۰۰ سے زیادہ خطوط، منی آرڈر کی ابتدائی اور واپسی کی رسیدیں اور دوسرے ثبوت کے کاغذات اتنی وافر مقدار میں پیش کیے کہ حاکم کے ہوش اڑ گئے۔ ان خطوط میں ملک کی مشہور ہستیوں سے لے کر غیر معروف لوگوں کے خطوط تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک خط جب عدالت کو پڑھ کر سنایا گیا تو اس نے کہا کہ اس مقدمے میں ثبوت کے جو کاغذات داخل کیے گئے ہیں ان سے ان چھ سات سالوں کی ملک کی تاریخ مرتب ہوسکتی ہے۔ میری خواہش ہے کہ میں ان تمام خطوں کو پڑھوں لیکن میں اردو سے ناواقف ہوں۔ اس لیے اصل کے ساتھ ان تمام کاغذات کے انگریزی یا ہندی ترجمے بھی داخل عدالت ہوں۔

یہ مضمون لکھنے والے مولانا عبدالحئ انصاری تحریر کرتے ہیں کہ مجھے بھی اس مقدمے میں بطور گواہ پیش ہونا تھا۔ اس لیے کہ مولانا ۴۹-۱۹۴۸ء میں ایک سال دارالعلوم احمدیہ سلفیہ (دربھنگہ) میں مقیم رہ چکے تھے۔ وہاں کا رجسٹر حاضری، قبض الوصول اور معائنہ کا وہ رجسٹر جس پر اسلامک اسٹڈیز صوبہ بھارت کے رجسٹرار کے معائنہ کے وقت کے دستخط تھے، سب داخل عدالت تھے اور میں اس وقت جا سلفیہ (بنارس) میں ملازم تھا۔ مولانا نے مہتمم سلفیہ کو لکھا کہ تاریخ مقدمہ سے دو روز پیشتر مجھے ان رجسٹروں کی تصدیق کے لیے بھیج دیں۔ اس طرح وہاں سے میں آیا۔ بنارس میں ماسٹر عبدالحمید جون پوری جامعہ رحمانیہ کے بہت سے کاغذات لے کر پہنچے۔ اس طرح عدالت پر کاغذات اور گواہوں کی ایک یلغار ہوگئی اور حاکم حیران وششدر ہو کر کہنے لگا کہ آج تک میرے سامنے ایسا کوئی کیس پیش نہیں ہوا جس میں اتنے ثبوت دیے گئے ہوں۔

حاکم نے اپنے فیصلے میں مولانا کو ان پر لگائے گئے الزام سے بے داغ بری کر دیا اور اس طرح مولانا اس دوسری آزمائش میں بھی بحمد اللہ پوری طرح کامیاب ہو کر نکلے۔ یہ دو واقعات ان کی زندگی میں بڑے دشوار گزار اور پریشان کن اور اضطراب انگیز تھے۔ جب خدا کی امداد شامل حال ہو تو دہکتے انگارے اور بھڑکتی ہوئی آگ بھی گلزار بن جاتی ہے۔ ان حالات میں جس طرح رحمت خداوندی نے مولانا کی دست گیری کی اس پر بے اختیار دل سے اللہ کی تعریف اور اس کی سپاس گزاری کی دعائیں نکلتی ہیں۔

مولانا کی شخصیت:

مولانا کی شخصیت کے بارے میں مولانا عبدالصمد رحمانی لکھتے ہیں:

مولانا مرحوم کو کارساز فطرت نے جو کچھ دیا تھا وہ ہر شخص کو نہیں ملتا۔ جہاں تک نفس علم دین کا تعلق ہے، اس میں تو مولانا کی طرح آج ملک میں سیکڑوں علما موجود ہیں، مگر اس کے علاوہ جو گوہر

نایاب اور متاع بیش بہا مولانا مرحوم کو رب کی طرف سے خصوصی طور پر ملے تھے وہ دوسروں میں بہت کم نظر آتے ہیں۔ حضرت مولانا کی ذات گرامی میں علم وفضل کے ساتھ ساتھ بہت سے اہم ترین کمالات تھے جن سے مولانا شرف ومجد اور احترام وعزت کی اس بلندی پر پہنچے جہاں سیکڑوں علماء سعی پیہم کے باوجود نہیں پہنچ سکتے۔"

مولانا عبدالصمد رحمانی مزید رقم طراز ہیں:

"دنیا میں جن شخصیتوں کو تاریخ انسانیت اپنی امانت سمجھ کر محفوظ رکھتی ہے اور ضائع نہیں ہونے دیتی ان شخصیتوں میں حضرت مولانا نذیر احمد رحمانی نور اللہ مرقدہ کی بھی شخصیت بھی ہے۔ بڑے بڑے محدثین اور مفسرین کی صف میں آپ کا مقام ہے۔ درس وتدریس میں جو کمال اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیا تھا اس کی نظیر جلدی نہیں مل سکتی۔ فن تفسیر ہو یا حدیث، فقہ ہو یا ادب ومنطق ہو، فلسفہ ومعانی ہو یا بلاغت، جس فن کو دیکھیے اس میں وہ اپنے وقت کے امام نظر آ رہے ہیں۔ دقیق سے دقیق مسئلہ منٹوں میں سمجھ لیتے اور سمجھا دیتے۔ تمام دینی علوم کے اصول پر اتنی گہری نظر تھی کہ بڑے بڑے گھبرا جاتے اور تعجب کرنے لگتے تھے۔ تقریر کا میدان ہو یا تحریر کا انداز، بیان اس قدر دلکش اور طرز تحریر ایسی انوکھی کہ قاری وسامع سر دھننے لگ جاتا۔ پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل مولانا مرحوم کے سامنے آتے مگر چند ساعت سے زیادہ وقت نہیں لگتا تھا کہ حل کر لیتے۔"

مولانا عبدالغفار حسن سابق رکن اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان فرماتے ہیں:

"جس وقت میں دارالحدیث رحمانیہ میں داخل ہوا مولانا نذیر احمد املوی ساتویں سال کے طالب علم تھے۔ یعنی فارغ ہونے میں دو سال باقی تھے۔ مولانا مرحوم سے راقم الحروف نے متعدد کتابیں پڑھی ہیں، جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں: سلم العلوم، صحیح مسلم جزوی طور پر، اور بعض صرف ونحو کی کتب، مولانا ممدوح میں خطابت اور انتظامی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ تحریری ملکہ بھی حاصل تھا۔ جس زمانے میں راقم الحروف جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں مدرس تھا، کچھ طلبا نے کوشش کی کہ مولانا موصوف تدریس کے لیے جامعہ میں تشریف لے آئیں اور ان کے وسیع علم سے طلبا فائدہ اٹھائیں لیکن افسوس ہے کہ ان کی زندگی نے وفا نہیں کی اور وہ تمیں مئی ۱۹۶۵ء کو وفات پا گئے۔"

شیخ عطاء الرحمٰن صاحب انتظامی معاملات میں زیادہ تر مولانا نذیر احمد صاحب سے ہی مشورہ کیا کرتے تھے اور زیادہ تر مدرسے کا انتظام ان کے ہی سپرد تھا۔

مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری نے مولانا نذیر احمد املوی رحمہ اللہ کو حریری کے ان اشعار کا مصداق قرار دیا ہے:

فما راقنی من لاقنی بعد بعده

و لا شاقنی من شاقنی لوصاله

و لا لاح لی مذ ندند لفضله

و لا ذو خلال حاز مثل خلاله

یعنی اس کی دُوری کے بعد کوئی ملنے والا مجھے خوش گوار نہ معلوم ہوا اور نہ اپنے وصال کا داعی پرکشش نظر آیا اور اس کی جدائی کے بعد نہ اس کے فضل کا کوئی ہم سر ظاہر ہوا، نہ اس جیسی خصلتوں کا کوئی جامع خصال۔

مولانا عبیداللہ ٹونکی رحمانی کے بقول:

''حقیقت یہ ہے کہ مولانا نذیر احمد املوی رحمہ اللہ میں قیادت کے پورے جوہر موجود تھے۔ وہ زبان وقلم کے دھنی، فکر و تدبر کے مالک، ہر دلعزیز اور مقبول سیرت تھے۔ رواداری اور سیر چشمی، قناعت و بردباری اور انکسار آپ کی فطرت ثانیہ تھی۔ بزرگوں کا احترام کرنا، چھوٹوں پر شفقت کرنا اور ان کو ترقی کرتا دیکھ کر خوش ہونا ان کا شیوہ تھا۔ آپ کی اصابت رائے کے سب قائل ہیں۔ دو متصادم فریقین میں تصفیہ کرانے کا آپ میں خاص ملکہ تھا۔ نظر میں اتنی وسعت تھی کہ ملکی اور جماعتی مسائل ہر وقت آپ کے سامنے رہتے اور ان کے بارے میں فیصلہ کن رائے رکھتے تھے۔ خصوصاً جماعت کی فلاح و بہبود کے لیے مولانا کے دل میں بڑی تڑپ تھی۔ بستر علالت پر بھی جماعت کے غم سے بے نیاز نہیں رہے...... ان کی علمی بصیرت اور تفقہ فی الدین اپنوں اور پرایوں سب کے نزدیک مسلم تھی۔''

مولانا کا رعب وجلال:

مولانا عبدالعلیم صاحب ماہر سمراوی نے مولانا عبدالغفور صاحب کا یہ بیان اپنے مضمون میں قلم بند کیا ہے کہ:

''میں نے چھے سال تک مولانا کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیے ہیں۔ اس مدت میں مولانا کا رعب وجلال ایک منٹ کے لیے بھی ہمارے دل سے محو نہیں ہو سکا۔''

مولانا عبدالصمد رحمانی لکھتے ہیں:

''حضرت شیخ طلبا کو اپنے ہمراہ لے جاتے تھے اور جو آپ کے ساتھ نہ جا سکتا تو اس سے عدم شرکت کی وجہ دریافت کرتے۔ طلبا آپ کی معیت میں شوخی سے اجتناب کرتے۔ کوئی ایسی

حرکت نہ کرتے جو آپ کی مرضی کے خلاف ہوتی۔ حالانکہ آپ انتہائی خلیق اور شفیق استاذ تھے۔ اس کے باوجود کچھ قدرتی رعب و جلال جو آپ کے چہرۂ انور سے مترشح ہوتا تھا، طلبا کو بے جا حرکت کرنے سے باز رکھتا تھا۔"

مولانا رئیس الاحرار رقم کرتے ہیں:

"ایک مرتبہ آپ کے ایک شاگرد رشید جنھیں فارغ التحصیل ہوئے ۵-۶ سال گزر چکے تھے اور فراغت کے بعد سے درس و تدریس اور تعلیم و تعلم کا مشغلہ رکھتے تھے، جمعہ کے روز منبر پر خطبہ دے رہے تھے۔ تقریر زور شور سے جاری تھی۔ اس موقع پر غیر متوقع طور پر اچانک حضرت مولانا سفر کرتے کراتے اس مسجد میں داخل ہوئے۔ مولانا کو خطیب صاحب نے دیکھا تو زبان لڑکھڑانے لگی، ہونٹ خشک ہونے لگے۔ چہرے پر مرعوبیت چھا گئی۔ پیشانی عرق ریزی کرنے لگی۔ سامعین حیران تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ اور تقریر کرتے کرتے زبان کیوں رکنے لگی ہے؟ جوں توں کر کے نماز جمعہ ختم ہوئی تو حقیقت حال منکشف ہوئی۔ یہ رعب اس فارغ التحصیل شاگرد پر چھایا جو ۵-۶ سال سے اونچی کتابوں کا درس اور بڑی محفلوں میں وعظ و خطبہ دیا کرتا تھا۔ یہ میرا چشم دید واقعہ ہے۔"

اسی طرح مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈانگری کا بیان ہے:

"مولانا نذیر احمد کا رعب و جلال مجھ پر آج تک ایسا ہی تھا جیسا کہ زمانہ طالب علمی میں تھا۔ آپ نے کہا کہ لوگ مجھے غلط یا صحیح خطیب الہند کہتے ہیں مگر خطیب الہند جیسا آدمی ان کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کانپتا تھا۔"

وسعت ظرفی اور اخلاق:

مولانا عبدالصمد بیان کرتے ہیں:

"ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ محرم کا مہینا تھا۔ ایک شیعہ کچھ سوال کرنے کے لیے آیا۔ کسی نے اسے آپ تک پہنچا دیا۔ یہ وقت مولانا کے آرام فرمانے کا تھا۔ مگر آپ نے سائل کو اپنے پاس بٹھایا اور اس نے سوال کرنے شروع کر دیے۔ ہم کئی طالب علم اس وقت وہاں موجود تھے۔ وہ شیعہ سوال میں کج بحثی کرتا اور ادب و سلیقہ کو خیر باد کہہ دیتا۔ مگر حضرت مولانا کی خوش خلقی کا یہ عالم تھا کہ اس کے ہر سوال کا انتہائی مشفقانہ انداز میں جواب دیتے جاتے۔ بالآخر اس نے اعتراف کیا کہ مولانا نذیر احمد رحمانی کے اس افہام و تفہیم سے میرے دل کو اطمینان حاصل ہوا ہے۔"

زہد و ورع:

ڈاکٹر سید عبدالحفیظ صاحب سلفی مہتمم دارالعلوم دربھنگہ کا بیان ہے:

''دربھنگہ کے بعض دیہات کے لوگ مولانا نذیر احمد املوی کو مدعو کر کے اپنے گھر لے گئے۔ گنے کا موسم تھا، مولانا نے رس پینے کی خواہش کی چنانچہ فوراً اس حاضر کیا گیا۔ جوں ہی پینے کے لیے آپ نے برتن منہ سے لگایا تو ایک شخص کو یہ کہتے سنا گیا کہ گنا ایسے آدمی کے یہاں کا تھا جو شوگر مل کی گنا ڈھونے والی ٹرالی کا ڈرائیور ہے۔ ہوسکتا ہے کہ گنا ٹرالی سے مل مالک کی اجازت کے بغیر حاصل کیا گیا ہو۔ اتنی سی بات پر آپ نے برتن زمین پر رکھ دیا اور باوجود اصرار کے پینے پر آمادہ نہ ہوئے۔ اللہ اکبر، یہ احتیاط ...... ہمارے علما کو دعوتوں اور نذرانوں کے سلسلے میں مولانا کے اس طرزِ عمل سے ایک قابلِ عمل سبق ملتا ہے۔''

مولانا عبدالمبین منظر ناظم شمس العلوم سمرا لکھتے ہیں:

''مجھے براہ راست مولانا کی شاگردی کا شرف حاصل نہیں لیکن حضرت کے شاگردوں کا شاگرد ہوں اور اس پر فخر ہے کہ مولانا بالکل اپنے ہی شاگردوں کی طرح مجھ پر نظرِ عنایت فرماتے تھے۔ میں نے اپنی کتاب ''سبیل الرشاد'' پر تقریظ کے لیے خط لکھا تو اخبار ''اہل حدیث'' سے اس کے فائل نکلوا کر کتاب سے متعلق مضمون کی بعض قسطیں ملاحظہ فرمائیں اور ایک تعارف نامہ روانہ فرمایا جو زیب کتاب ہے۔ اس میں میں نے ان کے نام کے ساتھ بالکل بجا طور پر علامۃ العصر لکھ دیا تھا اور سہو کتابت سے نیچے خاکسار کے بعد (اپنے نام کے ساتھ بریکٹ میں) لفظ ''مولانا'' بھی زیرِ تحریر آ گیا تو اس پر نجی خط میں سخت خفگی کا اظہار فرمایا کہ میرے نام کے ساتھ جو غلو سے کام لیا گیا ہے کیا اس سے آپ کے جذبات کی تسلی نہ ہوئی جو خاکسار کے ساتھ (اپنے لیے) مولانا کا جوڑ ضروری سمجھا گیا۔''

مولانا عبدالمبین ہی کا بیان ہے:

''مولانا کی عیادت کے سلسلے میں ایک رقعہ خاکسار نے ارسال کیا جس میں آپ کے ساتھ دلی محبت اور خلوص کا اظہار کرتے ہوئے مخدومنا منتہیٰ امالنا لکھ دیا گیا تھا۔ اس کا جواب آپ کی طرف سے اس وقت دیا گیا جب کہ دو ایک یوم میں ہسپتال سے نکلنے والے تھے۔ وہ جواب ان کے اخلاق و اخلاص کا آئینہ ہے۔''

خط یہ ہے:

اخی مولانا منظر صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا خط ملا، آپ نے میری علالت کے سلسلے میں اپنی جس محبت کا اظہار کیا ہے اس کا شکر گزار ہوں، لیکن ساتھ ہی اس کا شکوہ بھی ہے کہ آپ نے میرے متعلق اپنے جذبات کے اظہار میں غلو سے کام لیا ہے، جو آپ جیسے اہل علم کی شان کے مناسب نہیں۔ ہمارا سہارا بہر حال اللہ تبارک وتعالیٰ ہی ہے، اس لیے دوسری شخصیت کو امیدوں کی اماج گاہ (قرار دینا) ایک موحد کو زیب نہیں دیتا...... بفضلہٖ تعالیٰ روبہ صحت ہوں۔ تدریجاً روز بروز صحت میں اضافہ ہو رہا ہے تاہم آپریشن کی وجہ سے ضعف لاحق ہو گیا ہے۔ اس کی تلافی شاید مہینوں نہ ہو سکے۔ صحت یابی کے لیے دعا جاری رکھیے۔

والسلام!

نذیر احمد رحمانی (۶- ذی الحجہ ۱۳۸۴ھ)

تعلق باللہ:

مولانا ابوالقاسم خالد العربی رحمانی فرماتے ہیں:

''مولانا کی روحانی قوت کا یہ عالم تھا...... جس روز آپ کی پیشی مجسٹریٹ کی عدالت میں سنٹرل جیل سے ہوئی، آپ کے ہاتھ میں ہتھکڑی تھی۔ اس کو کھولا گیا، عدالت کے برآمدے میں مولانا نے دو رکعت پڑھنے کی اجازت مانگی۔ مجسٹریٹ کی نظر مولانا کے چہرے پر پڑی۔ مجسٹریٹ اجازت دے کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ مولانا صاحب نماز سے فارغ ہو کر کٹھرے میں پہنچے اور مجسٹریٹ بھی عدالت کی کرسی پر پہنچا۔ اس وقت جتنے مجرم مجسٹریٹ کی عدالت میں پہنچا کرتے تھے، ان کا فیصلہ پہلے ہی لکھا ہوتا تھا۔ اس طرح مولانا کا بھی فیصلہ پہلے ہی سے لکھا ہوا تھا۔ دو رکعت نماز میں مولانا نذیر احمد رحمہ اللہ اور رب کے درمیان کون سی راز و نیاز کی باتیں ہوئیں، اللہ ہی کو اس کا علم ہے۔ مجسٹریٹ کو بحالت مجبوری اپنے فیصلہ کیے ہوئے کاغذات کو مسترد کرتے ہوئے نئے فیصلہ سے رہا کرنا پڑا۔ اس پر ایس پی نے بہت مخالفت کی، کیوں کہ مولوی نذیر احمد پر جرم کی چودہ دفعات (چودہ آدمیوں کے قتل کرنے کے الزام میں) تھیں۔ مگر مجسٹریٹ نے ایک نہ سنی اور مولانا کو بری کرتے ہوئے بلاضمانت یہ کہا کہ کل عدالت میں حاضر ہویئے۔ (گویا مولانا نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی عملی تفسیر پیش کی: وَ اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ)''

مولانا کا ایثار:

ڈاکٹر محمد یونس صاحب محمدی کان پوری فرماتے ہیں:

''حوالات کے دنوں میں پولیس کو حوالاتیوں کے کھانے پینے کی کوئی خبر نہ تھی۔ تین دن قیدیوں کی چیخ پکار کے بعض صرف ایک وقت ابلے چنے پولیس نے لا کر دیے۔ البتہ مولانا کے رفیق طلبہ جس وقت کرفیو سے مہلت پاتے تو مولانا کو چند روٹیاں دے جاتے لیکن اس کا بھی یہ حال تھا کہ جن حوالاتیوں کے گھر سے روٹی ٹکڑے کا کوئی سہارا نہ تھا طلبہ کی لائی ہوئی یہ روٹیاں مولانا ان بے سہارا حوالاتیوں کو دے دیتے اور وہ آپس میں بانٹ لیتے۔ مولانا کی یہ مومنانہ شان تھی۔ معذور و مجبور کی بھوک کے سامنے اپنی بھوک و پیاس کی پروا نہیں کی۔ مولانا موصوف اس آیت کریمہ کے صحیح مصداق تھے: ﴿وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾

جماعتی درد:

مولانا مختار احمد ندوی لکھتے ہیں:

''مولانا نذیر احمد املوی کی وفات کا سب سے بڑا اثر جماعت اہل حدیث ہند کے تنظیمی اور تعمیری منصوبوں پر پڑا ہے۔ جماعت ایک ایسے مخلص اور فعال راہنما سے محروم ہو گئی جن کا بدل اب ملک میں کوئی نظر نہیں آ رہا۔ کتنے لوگ ایسے ہیں جو مولانا کی وفات کی خبر پا کر سر تھام کر بیٹھ گئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہماری جماعت کے متفق علیہ راہنما تھے۔ سب کی نگاہیں ان پر پڑتی تھیں۔ سب ان کا احترام کرتے تھے اور وہ خود جماعت کی نشاۃِ ثانیہ کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا مشن بنا چکے تھے۔ وہ زندگی کے آخری ایام تک جماعت کو اپنی زریں ہدایات سے نوازتے رہے۔ وہ بستر علالت پر بھی جماعت کی تنظیم کے لیے اس طرح کوشاں رہے جیسے ایک مجاہد میدان رزم میں فتح مندی کے لیے سرگرم کار رہتا ہے۔ افسوس صد افسوس کہ وہ اپنی محبوب جماعت کو مکمل طور پر منظم نہیں دیکھ سکے اور تنظیم جماعت کی حسرت دل ہی میں لیے ہوئے ہم سے رخصت ہو گئے۔''

دوسری جگہ مولانا مختار احمد لکھتے ہیں:

''مولانا رئیس نہیں تھے اور نہ انھوں نے کبھی اپنی علمی زندگی کو دنیا طلبی کا ذریعہ بنایا حالانکہ اگر وہ چاہتے تو کیا کچھ نہیں کر سکتے تھے لیکن جاننے والے جانتے ہیں اور نہ جاننے والوں کو جان لینا چاہیے کہ مولانا نے اپنا دل و دماغ، علم و فکر، جذبات و احساسات کے سارے گنج ہائے گراں مایہ کو

اللہ کی رضا اور اس کے دین کی سربلندی اور ہندوستان میں جماعت موحدین کی ترقی کے لیے نثار کر دیا اور تمام عمر معمولی مشاہرے پر ہنس ہنس کر گزار دی۔ اس تھوڑے سے مشاہرے کا بھی خاصا حصہ وہ جماعتی امور کی نگرانی پر کسی نہ کسی حیثیت سے خرچ کرتے رہتے اور اس پر خوش ہوتے۔''

مولانا مختار احمد ندوی ان سے آخری ملاقات کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''مولانا کو ایک نظر دیکھتے ہی دل کانپ اٹھا تھا۔ مصافحے کے لیے ہاتھ سے ہاتھ ملے تو محسوس ہوا کہ جو ہاتھ پوری جماعت کی نبض پر رہا کرتا تھا اب خود اس ہاتھ کی نبض ڈوبتی جا رہی ہے، جس چراغ سے پوری جماعت روشن تھی اب اس کی لو ٹمٹمانے لگی ہے۔ کمرے میں بیٹھتے ہی مرض الموت کے اثرات محسوس ہونے لگے تھے۔''

فرماتے ہیں:

''مجھے تھوڑی دیر بعد بمبئی کے لیے روانہ ہونا تھا اس لیے ان سے اجازت چاہی تو شدت ضعف کے باوجود اٹھ بیٹھے اور فرمایا مجھے امید ہے کہ جماعت کی تنظیم کا کام اب ادھورا نہیں رہے گا اور آپ حضرات اپنے علم اور صحت کا پورا حق ادا کریں گے۔ پھر ہمارے اقبال اور ترقی درجات کے لیے دعائیں دیں اور فرمایا: ''خدا حافظ۔''

مولانا آزاد رحمانی لکھتے ہیں:

''انقلاب ۱۹۴۷ء کے بعد جماعت اہل حدیث کا واحد تبلیغی ادارہ ''آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس'' انحطاط کی زد میں آ گیا۔ تقسیم کی وجہ سے جماعت کے بہت سے علما ہندوستان سے کٹ گئے۔ جو لوگ یہاں رہ گئے تھے ان میں سے بھی بہت سے لوگ ترک وطن کر کے پاکستان کے شہری بن گئے۔ دہلی کا شہر جو جماعت کا علمی گہوارہ تھا تقریباً قابل ذکر علما سے خالی ہو گیا۔ یوپی اور بہار وغیرہ میں چند گنی چنی شخصیتیں رہ گئی تھیں۔ اس لیے کانفرنس بھی انحطاط کا شکار ہو گئی۔ سالہا سال تک اس کی تمام سرگرمیاں موقوف رہیں۔ بالآخر مولانا نذیر احمد اور ان کے کچھ رفقاء، نیز مولانا عبدالوہاب آروی مرحوم کو کانفرنس کے احیا کا خیال پیدا ہوا۔ کافی جدوجہد کے بعد اس کا دستور اساسی مرتب ہوا۔ ممبر سازی ہوئی۔ نئے انتخابات عمل میں آئے اور حرکت و عمل کے آثار پیدا ہوئے۔ مولانا نذیر احمد صاحب نے اس سلسلے میں زبان و قلم اور دوا و دوش سے کانفرنس کی جو خدمات انجام دیں ان کی تفصیلات ایک مستقل عنوان کی طالب ہیں۔''

ڈاکٹر محمد یونس صاحب محمدی کان پوری بیان کرتے ہیں:

حضرت مولانا مرحوم و مغفور پچھلے کئی برسوں سے سرزمین ہند کے تمام اخوان اہل حدیث کی باضابطہ ایک دستوری تنظیم واتحاد کے لیے بے چین تھے۔ ۱۹۵۹ء سے لے کر آج (۱۹۶۵ء تک) چھ برسوں کے اخبارات (ترجمان اور اہل حدیث دہلی) کے صفحات دیکھتے جایے اور مضامین پر غور کیجیے۔ مرحوم کا زور بس اسی پر تھا کہ وہ جماعت حقہ جس کی بنیاد کلمہ جامعہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر ہے، وہ جماعت جس کا نصب العین محض عمل بالقرآن والسنۃ ہے، اس جماعت کو شعوری طور پر مثالی بن کر اپنے نصب العین کے مطابق باہم متحد اور مضبوط ہونا چاہیے۔ قارئین کرام خوب جانتے ہیں کہ مرحوم ان دنوں اپنی علالت کی وجہ سے بے حد کمزور و مضطرب تھے لیکن اس اضطراب میں ایک اضطرار اور پریشانی یہ بھی تھی کہ مرحوم نظم واتحاد کا باغ و بہار اپنی زندگی میں دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ حضرت مرحوم نے ۳۰ مئی ۱۹۶۵ء کو اتر پردیش کی ضلعی جمعیتوں کے صدور اور ناظمین کو بنارس میں تشریف لانے کی ان الفاظ میں دعوت دی:

”ضلعی جمعیتوں کی طرف سے موصول شدہ جوابات کی روشنی میں صوبائی جمعیۃ کی تشکیل کی غرض سے صوبہ یوپی کے نمائندوں کے اجتماع کے لیے شہر بنارس موزوں معلوم ہوتا ہے اس لیے اطلاعاً عرض ہے کہ ۳۰-مئی ۱۹۶۵ء بروز یک شنبہ بوقت دس بجے صبح برمکان حاجی محمد صدیق (صدر ضلعی جمعیۃ اہل حدیث بنارس) واقع مدن پورہ تشکیل کی جائے گی۔ آپ اپنے تمام منتخب نمائندوں کے ساتھ شریک اجتماع ہو کر ممنون فرمائیں۔“

مولانا عبدالصمد رحمانی ان کی وفات پر رقم کردہ مضمون میں لکھتے ہیں:

”چند دن پہلے حضرت العلام بنارس سے تنظیم تنظیم کا نعرہ اس طرح بلند فرما رہے تھے کہ سمجھا جا رہا تھا مولانا آناً فاناً جماعت کو متحد کر دیں گے اور یہ قدرتی بات تھی کہ مولانا کی دعوت میں بہت اثر تھا مگر آہ پورے ملک کو دعوت اتحاد و تنظیم دیتے دیتے خود ہی قیامت کی نیند سو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

ڈاکٹر عبدالمجید صاحب اصلاحی بیان کرتے ہیں:

”جماعت اہل حدیث کی حالیہ تنظیم میں مولانا کے تنظیمی تصورات بڑی حد تک شامل ہیں۔ وہ جماعت اہل حدیث کی نشاۃ ثانیہ کے لیے بے چین اور مضطرب رہتے تھے۔ وہ اس جماعت کی خاکستر میں پھونکیں مار کر ہر روح کو گرما اور ہر قلب کو تڑپا دینا چاہتے تھے۔ یہ جماعت کسی زمانے میں مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح و تربیت کے لیے ایک متحرک اور فعال جماعت تھی۔

مولانا مرحوم اس میں پھر اسی حرکت اور فعالیت کی روح پھونکنے کے متمنی تھے۔“

حق گوئی و بے باکی:

ڈاکٹر سید عبدالحفیظ صاحب سلفی مہتمم دارالعلوم احمدیہ سلفیہ دربھنگا مولانا کی حق گوئی کے بارے میں لکھتے ہیں:

”طلبا نماز جمعہ میں اذان کے بعد آیا کرتے تھے۔ حضرت مولانا (نذیر احمد رحمانی رحمہ اللہ) طلبا کی اس روش پر بے حد رنجیدہ ہوئے اور ڈاکٹر فرید صاحب (جو اس وقت مہتمم دارالعلوم تھے) نے طلبا کو اذان سے پہلے حاضر مسجد ہونے کے لیے حکم دیا کہ گھنٹی بجائی جائے اور گھنٹی کی آواز سنتے ہی لازمی طور پر سب طلبا مسجد میں پہنچ جائیں گے، لیکن حضرت مولانا مرحوم نے فرمایا کہ یہ طریقہ خلاف سنت ہونے کی وجہ سے غلط ہے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم اس حق گوئی سے بے حد متاثر ہوئے اور فوراً ہی انابت الی اللہ اختیار کی۔“

مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی فرماتے ہیں:

”جو مقدس علم اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیا تھا، آپ نے صحیح معنوں میں اس کا حق ادا کر دیا۔ حق گوئی اور بے باکی آپ کی فطرت ثانیہ تھی۔ تحریر کا موقع ہو یا تقریر کا آپ انجام کی پروا کیے بغیر فوراً حق کا اعلان فرما دیتے۔“

مولانا آزاد رحمانی مولانا نذیر احمد رحمانی کی حق گوئی کی ایک مثال یوں ذکر فرماتے ہیں:

”مولانا لکھنؤ کی دینی تعلیمی مجلس کے ممبر تھے۔ علی میاں، مولانا منظور نعمانی، قاضی عدیل عباسی اور دوسرے نامور اہل علم کے ساتھ آپ بھی اس کی نشستوں میں شریک ہوتے رہے۔ بچوں کے لیے ابتدائی نصاب تعلیم کی ایسی کتابوں کی تصنیف کا مسئلہ درپیش تھا جو سب کے لیے قابل قبول ہو۔ بات یہ چل رہی تھی کہ دینیات کی تصنیف کس ڈھنگ سے کی جائے۔ کسی ممبر نے مشورہ دیا کہ دیوبندی عقائد کے مطابق انھیں لکھوایا جائے۔ مولانا نے فرمایا: اس میں تمام فقہی مسالک کی نمائندگی نہیں ہوتی، اس لیے یہ کتابیں دوسروں کے لیے قابل قبول نہ ہوں گی۔ اس پر یہ ترمیم پیش ہوئی کہ دوسرے مسالک کی باتیں حاشیہ پر لکھ دی جائیں۔ مولانا نے فرمایا کہ سب سے بہتر یہ ہے کہ کتابیں قرآن و سنت کے مطابق لکھائی جائیں اور دیوبندی اور دوسرے مکاتب فکر کی وضاحت اس کے حاشیہ پر کر دی جائے۔ بالآخر بات اس پر ختم ہوئی کہ ہر مکتبِ فکر کو آزادی دی جائے کہ وہ اپنے مسلک کے مطابق اپنی کتابیں تصنیف کر کے داخل نصاب کریں۔“

مندرجہ بالا مثال مولانا کی حق گوئی اور اصابت رائے کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ اصحاب کلاہ و دستار اور

صاحبان جبہ وقبہ کی موجودگی مولانا کو حق گوئی سے نہیں روک سکی۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

مولانا آزاد رحمانی نے مولانا کی حق گوئی و بے باکی کی ایک اور مثال یہ ذکر فرمائی ہے کہ:

''مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے انتقال پر بنارس میں ایک تعزیتی جلسہ ہوا، صدر مولانا عبدالمتین صاحب مرحوم رئیس بنارس تھے۔ مقررین میں ہر طبقہ اور ہر خیال کے لوگ موجود تھے، اس لیے یہ جلسہ ہر فرقے کا نمائندہ جلسہ تھا۔

ایک مقرر نے مولانا حفظ الرحمٰن کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے جنگ آزادی سے متعلق دارالعلوم دیوبند کی طرف کچھ غلط باتوں کا انتساب کیا۔ اس کے بعد مولانا کی باری تھی۔ آپ نے جنگ آزادی کی پوری تاریخ ادھیڑ کر رکھ دی اور اچھی طرح واضح کر دیا کہ فرطِ عقیدت میں لوگ کتنی غلط بیانیاں کرتے ہیں۔ آپ کی تقریر سے جلسے کی فضا بدل گئی اور لوگوں کو جنگ آزادی کی صحیح تاریخ معلوم ہوگئی۔

مولانا کی ہر دل عزیزی:

مولانا نذیر احمد رحمانی کی ہر دل عزیزی کا تذکرہ مولانا ابو علی اثری نے اپنے ایک خط میں کیا ہے جو انھوں نے مولانا ممدوح کو نوگڑھ کانفرنس سے واپس آنے کے بعد لکھا تھا۔ اس خط کے الفاظ یہ ہیں:

''اہل حدیث طبقے میں آپ دونوں صاحبوں (مولانا نذیر احمد املوی رحمہ اللہ اور مولانا عبیداللہ رحمانی رحمہ اللہ) کی عزت، مقبولیت، محبوبیت دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا اور یہ نظارہ دیکھنے کے بعد میری سمجھ میں آیا کہ انجمن تعلیمات دین کی کونسل میں آپ دونوں حضرات کو جو لیا گیا ہے تو بلاشبہ آپ لوگ ان تمام لوگوں سے زیادہ اس کی رکنیت اور نائب صدارت کے ہر طرح سے مستحق ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر آپ دونوں صاحبوں کی اپنے حلقے میں غیر معمولی مقبولیت دیکھ کر شبہ ہو رہا ہے کہ آیا خود علی میاں بھی جن کو اس ادارے کا مستقل صدر بنایا گیا ہے اور ندوہ جیسی عظیم الشان درس گاہ کو کامیابی کے ساتھ چلا رہے ہیں، اپنے حلقے میں اس قدر احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں یا نہیں۔ میں نے دیکھا کہ نوگڑھ کے اجلاس کے لاکھوں کے مجمعے میں جس طرف سے بھی یہ دونوں حضرات گزرتے تھے انگلیاں اٹھ جاتی تھیں کہ دیکھو یہ جو جا رہے ہیں؟ یہ جامعہ رحمانیہ بنارس کے شیخ الحدیث مولانا نذیر احمد املوی رحمہ اللہ ہیں۔ یہ شارح مشکوٰۃ مولانا عبیداللہ رحمانی رحمہ اللہ ہیں۔ یہ بہت بڑی بات ہے جس کے لیے خدائے ذو العزۃ والجلال کا جتنا بھی شکریہ ادا کیا جائے

کم ہے۔

مجھے اہل حدیث علما کے ایک ایک کر کے دنیا سے اٹھ جانے اور اہل حدیث طبقے کا ان کے فیوض و برکات سے محروم ہو جانے کا بڑا ماتم رہتا ہے اور سوچا کرتا تھا کہ جو لوگ اٹھ گئے ہیں ان کا نعم البدل اس جماعت میں ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے تو اس کی قیادت کون کرے گا؟ مگر نوگڑھ پہنچا تو مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ میری مایوسی اپنی جماعت سے ناواقفیت پر مبنی تھی۔ اس جماعت میں الحمد للہ آج بھی وہی جوش و خروش اور زندگی کی تاب و توانائی ہے جو مولانا ثناء اللہ امرتسری اور ان کے رفیق کار مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی کے زمانے میں موجود تھی۔ ان دونوں صاحبوں نے علم و فضل، شہرت و عزت، مقبولیت و ہر دلعزیزی میں ان بزرگوں کی جگہ لے لی ہے، اور اس وقت اس جماعت میں ان دونوں کو الحمد للہ وہی حیثیت حاصل ہے جو مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی اور مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا قاضی محمد سلیمان منصور پوری اور سلسلہ محمدیات کے مؤلف مولانا محمد جوناگڑھی جیسے خوش بیان عالم کو حاصل تھی۔ خدا سے بہ صمیم قلب دعا گو ہوں کہ ان کی عمریں دراز فرمائے اور اس جماعت کی قیادت کے لیے انھیں تا دیر زندہ و سلامت رکھے، اور انھیں کتاب و سنت کی تبلیغ و اشاعت اور درس و تعلیم کی زیادہ سے زیادہ توفیق ارزانی فرمائے۔''

افسوس ہے اپنی اپنی باری سے وہ دونوں بزرگ مولانا عبیداللہ رحمانی اور مولانا نذیر احمد رحمانی بھی وفات پا گئے اور یہ خط لکھنے والے مولانا ابوعلی اثری بھی اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔

مولانا عبدالمبین منظر لکھتے ہیں:

''مولانا نذیر احمد املوی رحمانی کی علالت کی خبر جب خطوط اور اخبارات کے ذریعے مشتہر ہوئی تو ملک کے گوشہ گوشہ سے عیادت اور بیمار پرسی کے سیکڑوں خطوط پہنچنے لگے۔ اکثر مدارس میں دعائیں کرائی گئیں۔ اسپتال میں ملاقاتیوں کا اس قدر ہجوم رہتا کہ ڈاکٹر حیران ہو کر کہتا تھا کہ ایسا محبوب اور عظیم انسان جس کے اتنے قدر دان اور فدا کار و جاں نثار ہوں ابھی تک ہمارے اسپتال میں نہیں آیا۔''

مولانا منظر دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''جب سے مولانا نذیر احمد رحمانی کی موت کی خبر آئی ہے، اسی طرح ان کی زندگی تصویر بن کر سامنے موجود ہے جیسے ان کی حیات میں تھی۔''

اريــد لأنســـى حبهـــا فــكـــأنـمـــا
تــمثــل لـــى ليـلـى بـكـل مـكـــان

''میں لیلیٰ کو بھلانا چاہتا ہوں لیکن اس کی تصویر ہر جگہ اور ہر مقام پر دکھائی دیتی ہے۔''

شوقِ مطالعہ:

مولانا عبدالصمد رحمانی ان کے شوقِ مطالعہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

''کتب بینی آپ کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان کے شوق مطالعہ کا صحیح علم ان ہی لوگوں کو ہے جنھیں ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ گرمی اپنے شباب پر ہے مگر ہاتھ میں پنکھا لیے ہوئے مطالعہ میں مصروف ہیں۔ بعد میں جب نقاہت بڑھنے لگی تو مطالعہ میں کچھ کمی آ گئی۔ تضییع اوقات سے ہمیشہ بچتے۔ اسی بنا پر عام لوگوں سے ملاقات کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ آپ کی کیفیت کسی صاحبِ دل کے ان اشعار کے عین مطابق تھی:

لــقـــاء الـنـــاس لـيـس يـفـيـد شـيـئـا
ســوا الـهـذيــــان مـــن قـيـل و قـــال
فـــأقـــلـــل مـــن لـــقـــاء الـنـــاس الا
لأخـــذ الـــعـــلـــم او اصـــلاح حــــال

یعنی ''لوگوں کی ملاقات سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا سوائے بکواس اور قیل وقال کے۔ لہٰذا جہاں تک ہو لوگوں سے ملاقات کم کر دے۔ ہاں اگر علم حاصل کرنا ہو یا اصلاح حال مقصود ہو تو ایسی ملاقات میں کوئی حرج نہیں۔''

مولانا کا تبحر علمی:

مولانا کی تصنیفات و تالیفات، مولانا کی وسعت مطالعہ اور تبحر علمی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اس کے دو ثبوت مولانا رئیس الاحرار ندوی نے مولانا املوی رحمہ اللہ کے ایک شاگرد رشید کے حوالے سے ذکر کیے ہیں:

۱۔ ''حضرت مولانا کے ایک شاگرد نے بیان کیا کہ قرآن کے سبق میں ایک مرتبہ ''رؤف رحیم'' دو لفظوں پر اتنی لمبی چوڑی اور بصیرت افروز تقریر فرمائی کہ پورا گھنٹا اسی میں صرف ہو گیا اور شرکاے درس کے لیے تمام آیات کے اختتامی الفاظ پر محققانہ نظر ڈالنے اور ان کے رموز و نکات سمجھنے کے لیے دماغوں کے دروازے کھل گئے۔ مولانا کی یہ تقریر کیا تھی، طریق تحقیق و تفہیم قرآن کی ایک کلید تھی جس سے سیکڑوں الجھی ہوئی گتھیاں سلجھ جائیں اور درجنوں مسائل حل ہو جائیں۔''

۲۔ ''اسی طرح اس شاگرد رشید نے بتایا کہ ایک مرتبہ ''خاتم النبیین'' میں لفظ خاتم کی لغوی تحقیق وتشریح اور نحوی وصرفی توضیح وتدقیق میں پورا گھنٹا صرف کر دیا اور ایسی تقریر فرمائی کہ بہت سے ذہنی وفکری شکوک رفع ہو گئے اور اس تقریر سے حل لغات میں بڑی مدد ملی۔ ایک لفظ کیا پڑھایا کہ حل لغات کی کنجی مرحمت فرما دی۔''

مولانا رئیس الاحرار ندوی مزید لکھتے ہیں:

''میں نے یہ بھی دیکھا کہ اچھے اچھے ماہرین فن بعض مغلق عبارتوں اور علمی مباحث سمجھنے کے لیے مولانا املوی کی طرف رجوع کرتے اور مولانا مرحوم بڑی بے تکلفی سے سارے عقدے کھولتے جاتے اور حاضرین اہل علم اس کیفیت کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے۔ اس نحیف وناتواں جسم اور دبلے پتلے انسان میں کس بلا کی علمی صلاحیت وقابلیت تھی کہ بذات خود ایک عظیم کتب خانہ معلوم ہوتے تھے۔

جن طلبا نے مولانا سے کسب فیض کیا ہے وہ مولانا کے تبحر علمی کے گواہ اور معترف ہیں۔ مولانا کے حالات زندگی لکھتے ہوئے مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری نے اپنے ایک مضمون میں اس بحر بے کراں کی بعض جولانیوں کا ذکر ''درس حدیث کی بعض خصوصیات'' کے ضمن میں کیا ہے۔'' [1]

اندازِ تقریر:

مولانا آزاد رحمانی ان کے اندازِ تقریر کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''آپ کی تقریر میں بلا کی اثر انگیزی تھی، جو بات کہتے دلوں میں اتر جاتی۔ زور بیان ایسا کہ سننے والے دم بخود رہ جاتے۔ اظہار حق میں کبھی آپ نے مداہنت نہیں کی۔ نہ ملامت گروں کی ملامت کا ڈر، نہ کسی کی خوشی نہ ناخوشی کی پروا۔ غیروں کے بھرے مجمعوں میں اظہار حق فرماتے۔ بنارس کی مسجد اہل حدیث میں جب آپ نے پہلا خطبہ دیا تو لوگ کہنے لگے کہ تقریریں تو بہت سنی ہیں لیکن مولانا نذیر احمد کا انداز بیان جداگانہ اور نرالا ہے۔ ایسی تقریر زندگی میں پہلی بار سننے کا اتفاق ہوا ہے۔

شیخ عطاء الرحمٰن کی وفات کے بعد دار الحدیث میں دو ایک روز تعلیم بند رہی۔ اس کے بعد شیخ عبدالوہاب اور شیخ حبیب الرحمٰن (پسران شیخ عطاء الرحمٰن مرحوم) رحمانیہ تشریف لائے ...... مدرسے کی گھنٹی بجی اور رحمانیہ کا ہر متنفس خاموشی کے ساتھ شیخ الحدیث کی درس گاہ میں سمٹ آیا۔

[1] دیکھیے پندرہ روزہ اہل حدیث: ۱۵- اگست ۱۹۶۵ء ص ۱۳۔

مولانا نے غم و اندوہ میں ڈوبی ہوئی ایک اثر انگیز تقریر کی جس میں طلبا اور اساتذہ سے مرحوم کی شفقت اور محبت کا ذکر تھا۔ ان سے فرزندوں اور عزیزوں کی طرح مرحوم کے برتاؤ کی یاد تھی۔ ان کی لغزشوں اور معمولی غلطیوں پر مرحوم کے عفو و درگزر کے تذکرے تھے۔ مرحوم کی نوازش و اکرام کے نہ بھلائے جانے والے واقعات کا اعادہ تھا۔ شیخ صاحب کی وفات سے ملت اسلامیہ کو جو صدمہ پہنچا تھا، اس کے واضح اشارے تھے اور مرحوم کے حق میں دعائے مغفرت تھی۔ غرضیکہ مولانا کی اس تقریر نے ہر شخص کو آب دیدہ کر دیا۔ شیخ عبدالوہاب اور شیخ حبیب الرحمٰن کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسوؤں کا منظر اب تک میری نگاہوں میں گھوم رہا ہے۔“

مولانا عبدالصمد رحمانی لکھتے ہیں:

”جس نامور ہستی نے علم و دانش کے پورے ملک میں دریا بہائے، تبلیغ وارشاد سے ملک کو جگایا، آہ وہ بلبل شیریں نوا اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے۔“

اس طرح چپ ہے گویا سکوت کی قسم کھا لی ہے اور ایسی نیند سو گیا ہے کہ پھر اس کے بعد کوئی بیداری نہیں۔ آہ وہ قلم کا سلطان، تقریر کا شہنشاہ، وہ مفکر اعظم و فاضلِ اجل جو کل تک دنیا کو صور اسرافیل بن کر متنبہ کر رہا تھا، آج وہ شہر خموشاں میں جا چھپا۔

مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری کے الفاظ ہیں:

”مولانا رحمہ اللہ کی حرکات وسکنات کی ایک ایک تصویر نظروں کے سامنے گھوم رہی ہے...... یہ ایک عظیم مجمع سے خطاب فرما رہے ہیں۔ آپ کی قوت استدلال نے سامعین پر اس طرح سکوت طاری کر دیا ہے گویا ان کے سروں پر پرند ہیں۔“

اندازِ تحریر:

ان کے اندازِ تحریر کے بارے میں مولانا آزاد رحمانی کا فرمان ہے:

مولانا نذیر احمد رحمانی کی تحریر بڑی دل گداز، پر اثر اور حشو و زوائد سے پاک ہوتی تھی۔ جب کسی کی بات کی گرفت کرتے تو اس کے فرار کے تمام راستے مسدود ہو جاتے۔ تردید میں دلائل کے انبار لگا دیتے اور تمام دلیلیں مستند اور معتبر ہوتی تھیں۔ حوالوں میں بڑی احتیاط برتتے۔ کسی کی کوئی بات کسی دوسرے کی تحریر سے ثبوت میں پیش کرنی ہوتی تو جب تک اصل مرجع سے اس کا مقابلہ نہ کر لیتے مطمئن نہ ہوتے۔ ایک مرتبہ ایک بڑے مصنف کے بارے میں فرمایا کہ ان کے حوالوں پر مجھے اعتماد نہیں ہے۔ بار بار کے تجربوں کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ تم بھی اصل سے مقابلہ

کیے بغیر ان کے حوالوں پر اعتماد نہ کرو۔ غرضیکہ مولانا اپنی خصوصیات کے اعتبار سے یگانہ روزگار شخصیت کے مالک تھے۔ مجھ سے بار بار فرمایا کہ جب کسی کے رد میں مجھے کوئی جوابی مضمون لکھنا ہوتا ہے تو جب تک تمام دلائل نہ لکھ لوں' مجھے چین نہیں آتا۔ ایسا ٹھوس، معقول اور دندان شکن جواب دیتے کہ آپ کی قادرالکلامی پر حیرت ہوتی۔

مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈانگری نے مولانا مرحوم کے زورِ قلم اور قوتِ تحریر کے بارے میں مولانا قاری عبدالرشید صاحب شاہ جہاں پوری کی ایک روایت نقل کی۔ فرماتے ہیں:

''ایک مرتبہ مجھے دیوبند جانے کا اتفاق ہوا تو اپنے دوست مولانا فرید الوحیدی کے توسط سے مولانا عامر عثمانی مدیر تجلی سے بھی ملاقات کی۔ دورانِ گفتگو میں میں نے عامر صاحب سے پوچھا میدان صحافت میں آپ اتنی مدت سے سرگرمِ عمل ہیں، کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ہند اور پاکستان میں آپ کی نظر میں قابل تذکرہ اہل قلم کون کون ہیں؟ عامر صاحب نے اس ذیل میں کئی نام لیے اور ساتھ ہی کہا کہ بنارس میں ایک مولانا نذیر احمد صاحب ہیں جن کا زورِ قلم لامثال ہے۔ ان کا قلم اختلافی مسائل میں نہایت مضبوط اور لاجواب ہے۔ دوسرے مسلک کا کوئی بھی عالم ہماری نظر میں ایسا نہیں جو اپنے مسلمات کی حمایت میں مولانا نذیر احمد کا مقابلہ کر سکے۔''

مولانا آزاد رحمانی کا بیان ہے:

''یکم جون ۱۹۳۸ء کو آپ کے مربی و محسن جناب شیخ عطاء الرحمٰن نے جب دار آخرت کا سفر اختیار کیا تو دار الحدیث رحمانیہ دہلی کے فرزندوں اور ہمدردوں پر جو کچھ گزری اس کے بیان سے قلم کی زبان قاصر ہے۔ ماہنامہ محدث (دہلی) کے جولائی ۱۹۳۸ء کے شمارے میں مولانا نذیر احمد نے اس سلسلے میں اپنی قلبی واردات کو جن الفاظ میں قلم بند کیا آج بھی اسے پڑھ کر آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں۔''

محدث کی ادارت:

مولانا آزاد رحمانی فرماتے ہیں:

''دار الحدیث رحمانیہ (دہلی) کا مشہور ماہنامہ ''محدث'' اس کے ایڈیٹر مولانا عبدالحلیم ناظم صدیقی کے انتقال کے بعد مولانا نذیر احمد رحمانی کی ادارت میں آ گیا۔ اس وقت سے آخر تک آپ برابر اس کے مدیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ آپ کی ادارت کے زمانے میں اس میں دوسرے اہل قلم کے بیش قیمت مضامین کے علاوہ آپ کے اثر انگیز، دل گداز اداریوں اور مختلف

مسائل پر محققانہ مضامین نے محدث کی قدر و قیمت کو بہت بڑھا دیا۔ آپ کی ادارت کے زمانے میں محدث میں فتاویٰ کے باب کا اضافہ ہوا۔ استفسارات کے جواب میں حضرت مولانا عبیداللہ رحمانی صاحب کی جامع اور پر از تحقیق نگارشات نے اس رسالے کی افادیت میں بہت اضافہ کر دیا تھا۔"

مولانا رئیس الاحرار ندوی کا بیان ہے:

مولانا نذیر احمد مرحوم زمانہ طالب علمی ہی سے بزم صحافت میں شریک ہو کر علمی کام کرنے لگے تھے اور اپنی دل کش تحریروں کے ذریعے اہل علم کے دلوں میں گھر کرتے جا رہے تھے۔ ان کی تحریری صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے مہتمم دار الحدیث رحمانیہ نے ان کو مؤقر جریدہ "محدث" دہلی کا ایڈیٹر بنا دیا اور ان کے معزز و مکرم دوست و رفیق کار حضرت شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ صاحب مبارک پوری کو اس کا نگران اعلیٰ مقرر کر دیا۔ ان دونوں کی تحریری خدمات نے محدث کو چار چاند لگا دیے اور پرچہ بہت مقبول و مشہور ہوا۔"

دیگر اخبارات میں مولانا کے مضامین:

مولانا آزاد رحمانی فرماتے ہیں:

"دار العلوم احمدیہ سلفیہ در بھنگا میں قیام کے دوران مولانا نذیر احمد املوی نے "الہدیٰ" کی خدمت بھی کی۔ اس میں کتنے ہی مضامین ایسے ہیں جن پر موصوف کا نام نہیں ہے۔ مثلاً ۱۶- مئی ۱۹۴۹ء کا افتتاحیہ بعنوان "تذکار شہیداں اور اہل حدیث" اور ۱۶- مئی ۱۹۴۹ء کی اشاعت میں "فتنہ اشتراکیت" کے عنوان سے جو مضمون شروع ہوا اور پانچ قسطوں میں اختتام پذیر ہوا (وہ بھی) مولانا املوی کا لکھا ہوا ہے۔ ملک کے دوسرے اخبارات اور رسائل مثلاً "زندگی" رام پور، اخبار "مدینہ" بجنور، "مصباح" "ششماہیاں"، "انصاف"، الہ آباد، "اہل حدیث" امرتسر، موجودہ "اہل حدیث" دہلی، "ترجمان" دہلی، "الاعتصام" لاہور، اخبار "محمدی" وغیرہ میں بھی وقتاً فوقتاً مولانا موصوف کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔"

تصانیف:

مولانا نذیر احمد رحمانی کی تصانیف کا بالاختصار تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے:

۱- انوار المصابیح: ڈاکٹر محمد یونس صاحب محمدی مولانا کی اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"یہ کتاب مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کے رسالہ "رکعات التراویح" کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ "انوار المصابیح" کے پڑھنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ علم کا دریا ہے جو نہایت سکون و وقار کے

ساتھ بہتا چلا جا رہا ہے، درمیان میں کوئی پیچ وخم نہیں اور نہ کہیں رکاوٹ ہے۔ ہر بات کے ہر پہلو کو واضح کرتے ہوئے احقاق حق کرتے جا رہے ہیں اور جہاں بھی گرفت کی ہے انتہائی مضبوط ہے۔ کسی لفظ سے مخاطب کی تنقیص مترشح نہیں ہوتی۔

''رکعات التراویح'' ان کے ذوق تصنیف کی غماز ہے جس کے مداح مولانا شاہ معین الدین ندوی ایڈیٹر ''معارف'' اعظم گڑھ اور مولانا عامر عثمانی ایڈیٹر تجلی دیوبند جیسے مصنف واہل قلم ہیں۔ ان کی اس کامیاب تصنیف پر انھوں نے ان کو مبارک باد دی۔''

۲- اقتداء مفترض فی خلف المتنفل بھی مولانا کی کی معرکہ آرا تصنیف ہے۔

۳- اہل حدیث اور سیاست: مولانا نذیر احمد رحمانی نے اس کتاب میں تحریک اہل حدیث کے شان دار ماضی اور اس کے مجاہدانہ کارناموں کا اہم تاریخی حوالوں سے ذکر کیا ہے۔ علما نے اس کتاب کی بہت تحسین کی ہے۔ جب یہ کتاب بالاقساط ''ترجمان'' (دہلی) میں شائع ہو رہی تھی تو پاکستان سے مولانا امام خاں نو شہروی نے مولانا کو خط لکھا کہ آپ اس سلسلہ (اہل حدیث اور سیاست) کو ضرور پایہ تکمیل تک پہنچا کر کتابی شکل میں شائع فرمائیں۔ یہ ہماری دلی تمنا ہے۔ اگر خدانخواستہ ہم تکمیل سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کے ہاں بلا لیے جائیں تو ایک نسخہ ہماری قبر کے سرہانے رکھا دیجیے گا تاکہ ہماری روح کی تسکین کا باعث ہو۔

۴- مولانا مرحوم کے نادر جواہر پاروں میں مئی ۱۹۳۹ء کا افتتاحیہ ''(الہدیٰ در بھنگا) ہے جو بعنوان ''تذکار شہیداں اور اہل حدیث'' شائع ہوا تھا۔

۵- پانچواں شہرہ آفاق مقالہ ''تحریک اہل حدیث'' ہے جو ہفت روزہ اخبار ''الہدیٰ'' ۱۹۵۵ء کے دار العلوم نمبر میں مرحوم نے سپرد قلم فرمایا تھا جو تقریباً ۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مضمون کا عنوان تھا ''تحریک اہل حدیث......تاریخ ماضی کا ایک ورق''۔

۶- الہدیٰ ۱۶ مئی ۱۹۴۹ء کی اشاعت میں ایک اور مضمون ''فتنہ اشتراکیت'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ یہ بھی ایک اہم مضمون ہے۔

۷- مولانا مرحوم کا ایک نہایت علمی مضمون بصورت فتویٰ ہے جو ''ترجمان'' ۱۹۵۶ء میں بعنوان ''فرائض کے ایک مسئلے کی تحقیق'' شائع ہوا تھا۔ یہ ایک سائل کا جواب ہے۔

مرکزی دار العلوم بنارس اور مولانا:

بابو محمد شفیع مالیر کوٹلوی لکھتے ہیں:

''مولانا عبدالمتین اور قاری احمد سعید صاحب کی جدائی کے بعد سرزمین بنارس میں مرکزی دار العلوم کے سلسلے میں تو پوری جماعت کی امیدیں مولانا نذیر احمد رحمانی مرحوم سے وابستہ تھیں لیکن افسوس کہ وہ بھی داغ مفارقت دے گئے۔''

مولانا مختار احمد ندوی کا بیان ہے:

''مولانا مرحوم کو ان علما سے بڑی وحشت تھی جو امراء کے درباری اور ان کے کاسہ لیس بن کر دین و جماعت کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں، جس کی وجہ سے علم دین کی شان اور علما کے وقار کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ مولانا اکثر و بیشتر کہا کرتے تھے کہ ہمیں مدارس اسلامیہ سے دین وملت کے ایسے بے باک داعیوں کو پیدا کرنا چاہیے جو پوری جرأت و جسارت کے ساتھ دین کا علم بلند کر سکیں اور قوم کی قیادت کے فرائض پوری اولوالعزمی کے ساتھ انجام دے سکیں۔ ان جذبات کی تکمیل کے لیے وہ مرکزی دار العلوم کے تعمیری اور تعلیمی مراحل کو جلد از جلد طے کرانے کی فکر میں تھے اور لاریب کہ انھوں نے اپنی زندگی کی آخری سانس تک جماعت کے اس عظیم علمی منصوبے پر اپنی تمام توانیاں صرف کر ڈالیں۔

۵ر مئی ۱۹۶۵ء کو مرکزی دار العلوم کی تعلیمی کمیٹی کا جلسہ ہوا۔ اس وقت مرحوم اس لائق نہیں تھے کہ دماغی کام سرانجام دے سکیں۔ وہ کسی پہلو تھوڑی دیر بیٹھ بھی نہیں سکتے تھے۔ اس کے باوجود ان کے عزم و ایثار کا یہ عالم تھا کہ دار الاقامہ بنارس میں دار العلوم کی تعلیمی کمیٹی کے جلسے میں بحیثیت کنوینر ۹ بجے سے ۱۲ بجے تک مسلسل تین گھنٹے نہ صرف شریک رہے بلکہ جلسے کی ایک ایک بحث میں حصہ لیا اور ان کی راہنمائی میں کمیٹی نے مرکزی دار العلوم کے نصاب کا ایک خاکہ تیار کیا۔''

مولانا عبدالوحید ناظم انجمن جامعہ رحمانیہ مدن پورہ بنارس ''مرکزی دار العلوم سے متعلق ایک ضروری اعلان'' کے ضمن میں مولانا نذیر احمد رحمانی کی ایک وصیت کا تذکرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مرحوم نے بنارس سے رخصت ہوتے وقت ہمیں جو وصیت فرمائی تھی وہ یہ تھی:

''ہم نے قوم اور جماعت سے وعدہ کیا ہے کہ مرکزی دار العلوم ایک مثالی درس گاہ ہوگی اور اس میں ایسے علماء کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جائے گا جو دینی اور دنیاوی دونوں حیثیتوں سے اپنے اندر ملت کے مسائل حل کرنے کی صلاحیت پیدا کر سکیں۔ اس لیے کسی طرح کی ترغیب یا تحریص میں آ کر عجلت پسندی سے کام نہ لیں اور جب تک ایسا عملہ فراہم نہ ہو جائے جو ہمارے اس وعدے کو پورا کرنے کا اہل ہو اس وقت تک مرکزی دار العلوم کے افتتاح کے لیے جلدی نہ کرنا۔

اگر ایسا کیا گیا تو یہ ایک غلط اقدام ہوگا جس کی تلافی تا زیست نہیں ہو سکے گی۔‘‘

مولانا ابوعلی اثری رقم طراز ہیں:

’’بنارس میں مرکزی دار العلوم اہل حدیث کی عمارت کے سنگِ بنیاد کا جلسہ ہونے والا تھا۔ مولانا نذیر احمد رحمانی نے جامعہ رحمانیہ کے لائق مدرس مولانا آزاد رحمانی کو میرے پاس یہ دستی گرامی نامہ دے کر بھیجا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مکرم و محترم جناب مولانا ابوعلی صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

فضل الٰہی سے امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ آپ کو اطلاع ہو چکی ہوگی کہ بنارس میں اہل حدیث کے ’’ایک مرکزی دار العلوم‘‘ کے قیام کا فیصلہ کیا گیا ہے جس کی تاسیس ۲۹ نومبر ۱۹۶۳ء کو ہونے والی ہے۔ اس سلسلے کے بعض پوسٹر بنارس میں چھپوائے گئے ہیں مگر وہ کاتب چلا گیا ہے۔ اب کوئی دوسرا اچھا کاتب نہیں مل رہا۔ مولانا آزاد رحمانی کو آپ کی خدمت میں بھیجا جا رہا ہے کہ وہاں آپ کی توجہ سے خاطر خواہ طریقے پر یہ کام انجام پا جائے تو ہم آپ کے ممنون ہوں گے۔ مولانا مجیب اللہ صاحب کی خدمت میں سلام مسنون عرض ہے۔

والسلام

نذیر احمد بنارس

مولانا کے مکتوب گرامی سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ مولانا کو مرکزی دار العلوم سے کس حد تک تعلق خاطر اور دلچسپی تھی کہ سنگ بنیاد کے پوسٹر تک چھپوانے کے لیے خود نگرانی فرما رہے ہیں۔ نیز یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ مولانا کتابت کے معاملے میں بڑے باذوق تھے۔

شادی اور اولاد:

مولانا آزاد رحمانی فرماتے ہیں:

مولانا نذیر احمد رحمانی نے تین شادیاں کیں۔ پہلی شادی موضع کاٹھ تراؤں میں ہوئی۔ اس شادی سے مولانا کی ایک لڑکی پیدا ہوئی جو سات آٹھ سال کی عمر میں انتقال کر گئی۔ بیوی بھی وفات پا گئی۔ اس بیوی کے انتقال کر جانے کے بعد دوسری شادی بھوجا پور ہوئی جو ضلع غازی پور کا ایک موضع ہے۔ اس شادی سے بھی ایک لڑکی تھی جس کا نام زیب النساء تھا لیکن یہ بچی بھی کم عمری ہی

میں انتقال کر گئی۔ یہ بیوی خوش آئند ثابت نہ ہوئی۔ اس لیے مولانا نے طلاق دے کر اسے علیحدہ کر دیا۔ تیسری شادی گاؤں کے شیخ عبدالرحمٰن کی لڑکی صالحہ خاتون سے ہوئی۔ ان سے مولانا کی تین اولاد نرینہ اور دو لڑکیاں ہیں۔ لڑکوں کے نام علی الترتیب آفتاب احمد، ہلال احمد، اور نہال احمد ہیں۔ بڑی لڑکی کا نام عابدہ خاتون اور چھوٹی کا رضیہ خاتون ہے۔ آفتاب احمد مئو ناتھ بھنجن میں ایک جگہ ملازم ہیں اور نہال احمد دکان داری میں مصروف ہیں۔ البتہ ہلال احمد جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے فراغت کے بعد جامعہ ہی کے تبلیغی مشن پر نائیجریا (افریقہ) میں مامور ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں مولانا کا صحیح جانشین بنائے، آمین۔!

سفر آخرت:

مولانا عبدالوحید ناظم انجمن جامعہ رحمانیہ بنارس تحریر فرماتے ہیں:

''۳۰رمئی ۱۹۶۵ء کو مولانا نذیر احمد رحمانی کی حالت تشویش ناک ہو گئی۔ آواز بالکل بند ہو گئی۔ اس دوران شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوری کو اطلاع دی گئی۔ وہ تشریف لائے، بنارس فون کیا گیا۔ وہاں کی سب سربرآوردہ شخصیات اور جامعہ رحمانیہ کے اساتذہ پہنچ گئے۔ مئو ناتھ بھنجن سے بھی اکابر کے کئی قافلے آ چکے تھے، جن میں مقامی علمائے اہل حدیث، مدارس کے ناظمین، مقامی و بیرونی مدرسین اور مقامی رؤسا بھی شامل تھے۔ ان تمام علما و مشائخ اور صالحین و متعلمین کی موجودگی میں تین بج کر پینتیس منٹ پر یہ بطل جلیل اللہ کے حضور جا پہنچا۔ موت سے قبل مولانا کے چہرے پر ایسی رونق و شادابی اور نورانیت آ گئی تھی کہ ہر شخص کا دل گواہی دے رہا تھا کہ مولانا پر انوار و برکات الٰہیہ کا نزول ہو رہا ہے۔

مولانا کو بعد نماز عشاء غسل دیا گیا اور کفنانے کے بعد آپ کا جسد خاکی رونمائی کے لیے رکھ دیا گیا۔ آس پاس کی بستیوں کے علاوہ بنارس کے کچھ لوگوں کی آمد کا انتظار تھا۔ اس لیے جنازہ ساڑھے گیارہ بجے شب اٹھا۔ جنازے میں کئی ہزار آدمی شریک تھے۔ نماز جنازہ شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی نے پڑھائی۔ ساڑھے بارہ بجے شب تدفین عمل میں آئی۔ اس کے بعد سوگوار آہستہ آہستہ اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔

تقریباً ۱۵ سال سے مولانا بنارس کو اپنا وطن بنا چکے تھے مگر انتقال سے کچھ دن پہلے ان کے دل میں تبدیلی آب و ہوا کی غرض سے اپنے وطن موضع املو جانے کی شدید خواہش پیدا ہوئی۔ چنانچہ ۲۱-مئی کو ایمبولینس کار سے آپ کو وطن پہنچا دیا گیا۔ بالآخر ۳۰-مئی ۱۹۶۵ء کو یہ درخشندہ آفتاب

ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔

دہلی میں غائبانہ نماز جنازہ مندرجہ ذیل مقامات میں مندرجہ ذیل حضرات نے پڑھائی:

۱- مسجد کلاں صدر بازار دہلی	مولانا سیّد تقریظ احمد صاحب
۲- مسجد محتسب پھاٹک حبش خاں	مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی
۳- مسجد حضرت مولانا عبدالوہاب رحمہ اللہ	مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی
۴- مسجد حاجی علی جان رحمہ اللہ چاندنی چوک	مولانا عبدالحفیظ
۵- مسجد و مدرسہ ریاض العلوم اردو بازار	مولانا لال محمد صاحب بستوی
۶- مسجد اہل حدیث گلی عبدالقادر صاحب	جناب مولانا محمد داؤد صاحب جی بی روڈ
۷- مسجد اہل حدیث حویلی حسام الدین صدر	مولانا عبداللطیف صاحب
۸- مسجد اہل حدیث بازار اجمیری گیٹ	مولانا حبیب الرحمٰن صاحب

مولانا کی نماز جنازہ میں کثیر تعداد میں علماء و مشائخ شریک ہوئے۔ جو لوگ وفات کی اطلاع نہ پانے کی وجہ سے جنازے میں شریک نہ ہو سکے ان کو وفات کی اطلاع کے ساتھ غائبانہ نماز جنازہ کی تلقین بھی کی گئی، جیسا کہ مولانا ابوعلی اثری لکھتے ہیں:

وفات کے دوسرے دن مولانا عبدالوحید ناظم اعلیٰ مرکزی دار العلوم بنارس کی طرف سے مولانا کے انتقال پُر ملال کی اطلاع میرے پاس بھی آ گئی جس میں مرحوم کے غائبانہ نماز جنازہ اور ان کے حق میں تمام لوگوں کے ساتھ دعاے مغفرت کی ہدایت فرمائی گئی تھی۔

اسی طرح مولانا عبدالوحید صاحب نے مولانا کے بارے میں تحریر کردہ مضمون میں بھی لوگوں سے مولانا کے لیے دعاے مغفرت اور نماز جنازہ غائبانہ کی اپیل کی۔

مندرجہ بالا فہرست صرف دہلی کی چند مساجد کی ہے۔ معلوم نہیں پاک و ہند اور بیرونی ممالک میں کہاں کہاں مولانا مرحوم کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی۔ غفرہ اللہ تعالیٰ.

اللہ تعالیٰ مرحوم کی خدمات جلیلہ اور مساعی جمیلہ کو شرف قبولیت سے نوازے۔ بشری غلطیوں سے صرف نظر فرما کر اعلیٰ علیین میں مقام عطا فرمائے۔ آمین

چند خطوط:

اب آخر میں مولانا نذیر احمد رحمانی کے چند خطوط ملاحظہ فرمایے جو انھوں نے مولانا عبدالسلام رحمانی کے نام تحریر فرمائے۔ یہ خطوط مجھے مولانا عارف جاوید محمدی نے کویت سے بھجوائے ہیں:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزم مولوی عبدالسلام سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، تمھارا کارڈ ملا، خیریت اور دیگر تفصیلات معلوم کر کے اطمینان ہوا۔ مولانا عبدالصمد صاحب کی صحبت و رفاقت بجائے خود مفید تھی، مزید براں جو کام تم کو ملا ہے وہ تمھاری علمی ترقی کا ان شاء اللہ ایک اچھا ذریعہ ثابت ہوگا۔ محنت، شوق اور دل چسپی سے کام کرو۔ ''تحفۃ الاشراف'' اس اضافہ کے ساتھ جو مولانا عبدالصمد صاحب کر رہے ہیں، شائع ہو جانے کے بعد اہل علم کے لیے بڑی قابل قدر چیز ہو جائے گی۔

مولانا سے میرا اسلام کہہ دو۔

میں رمضان ہی میں بیمار ہوا۔ لرزہ بخار کی شکایت تھی۔ لرزہ تو بند ہو گیا مگر بخار کا سلسلہ باقی تھا۔ اسی حالت میں بنارس چلا آیا۔ یہاں آ کر ریاحی درد گردہ کا شدید دورہ ہونے لگا، اب الحمد للہ افاقہ ہے مگر نقاہت کی وجہ سے ابھی کام نہیں کر رہا ہوں۔ نعمانی صاحب کا علاج ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ شفائے کامل عاجل عطا فرمائے۔

مولوی عبدالمتین صاحب کو بھی ایک مہینے سے بخار آ رہا ہے۔ بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ ان کی صحت یابی کی دعا کی ضرورت ہے۔

والسلام
نذیر احمد رحمانی، بنارس
۹ر مارچ ۱۹۶۴ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزم مولوی عبدالسلام سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا کارڈ ملا، آپ کے والد صاحب کے حادثۂ وفات کی اطلاع مولوی عابد صاحب کی زبانی ملی تھی، بڑا افسوس ہوا۔ بلاشبہ والدین کا سایہ اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت ہے بشرطیکہ ان کی خدمت کی توفیق بھی حاصل ہو جائے۔ اب آپ لوگ صلاح وتقویٰ کی راہ اختیار کر کے ان کے لیے دعا کریں، یہی ان کے لیے صدقہ جاریہ ہے۔

میری صحت ابھی تک قابل اطمینان نہیں ہے، تین چار روز کے لیے وطن گیا تھا، وہاں تو طبیعت اچھی رہی مگر واپس آنے کے بعد پھر بخار آ گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنا فضل شامل حال رکھے۔ آمین

''انتقاد صحیح'' ایک نسخہ آپ کے لکھے ہوئے پتے پر بھیج دی گئی ہے مگر بذریعہ بک پوسٹ بھیجا ہے، وی، پی

نہیں بھیجا ہے۔ وی، پی میں خرچ زیادہ پڑ جاتا۔ ان کو خط لکھ دیا ہے کہ کتاب وصول ہو جانے پر قیمت اور محصول ڈاک وغیرہ کے لیے دو روپے تیس نئے پیسے منی آرڈر سے بنارس کے پتے پر بھیج دیں۔ آپ بھی ان کو یہی لکھ دیں۔

مولوی عابد صاحب، ان کے والد اور مولوی اقبال صاحب، مولوی نذیر احمد صاحب وغیرہ کو میرا اسلام کہہ دیجیے۔

والسلام

نذیر احمد رحمانی، بنارس

۵؍رمضان ۱۳۸۴ھ شنبہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزم محترم سلمکم اللہ تعالیٰ وعافاکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، آپ کا لفافہ ملا۔ تفصیلات و کیفیات معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی۔ بستی کانفرنس کے موقع پر بہت سے اخوان واحباب سے ملاقات ہوئی۔ آپ سے ملاقات نہ ہونے کا افسوس رہا۔

اس کانفرنس میں ہماری شرکت کا محرک محض یہ احساس تھا کہ یہ وقت کا بڑا اہم دینی کام ہے، اور ہم جس حد تک اس میں تعاون کر سکتے ہیں، کریں۔ ورنہ ہم اپنی نااہلیتوں کو خوب سمجھتے ہیں اور یہ نااہلیتیں وہی ہیں جن کا مظاہرہ اس موقع پر ہوا، اور جس کے احساس سے جماعت کے لوگ مایوس اور ناراض ہوئے۔ آپ لوگوں میں سے بہت سے لوگ ہمارے متعلق بہت سی غلط حسن ظنیاں قائم کیے ہوئے ہیں۔ خدا کرے کہ ان غلط حسن ظنیوں کو بار بار ٹھیس لگے، تاکہ یہ جتنی جلد دور ہو جائیں، اچھا ہے۔ اور اتنا ہی جماعت کے لیے مفید ہے۔

میں نے کانفرنس کے موقع پر یہ سنا تھا کہ جماعت کے کچھ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ جب نماز کا اول اور افضل وقت اہل حدیث مسلک کے مطابق آ جائے تو اذان دلوا کر ہمیں اپنی جماعت الگ کروانی چاہیے۔ حنفیوں کے پیچھے نماز پڑھنے کا انتظار کیوں کیا جائے۔

لیکن ایک ایسے موقع پر جب کہ کفر بواح کے مقابلہ میں ہم ایک مشترکہ محاذ جنگ کا مظاہرہ کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے، یہ بات کس طرح مناسب ہو سکتی تھی۔ جہاں نفس اسلام کے تحفظ کا سوال ہو، وہاں سنت اور ایک افضل عمل کی خاطر باہمی اختلاف ونزاع کے ظاہر کرنے کا موقع ہمارے نزدیک صحیح نہیں تھا۔ ہماری جماعت کا ذہن ''لڑاکو'' بن گیا ہے۔ مگر صرف حنفیوں کے مقابلے میں۔ اور وہ بھی کچھ مخصوص سنتوں کے لیے۔

...... اندازہ کر لیجیے کہ سرکاری تعلیم سے جو ذہنی ارتداد سرعت کے ساتھ پھیل رہا ہے، اس کے متعلق ہماری

جماعت کو جماعتی حیثیت سے کتنا احساس اور کتنی تشویش ہے؟ اور اس کے دفاع کی کتنی فکر ہے؟

''الجمعیۃ کی غلط بیانی'' کے عنوان سے میرا جو مراسلہ شائع ہوا ہے میں تو سمجھتا ہوں کہ بہت سے ''خالص اہلحدیثوں'' کو اس سے تکلیف ہی ہوئی ہوگی۔ کیونکہ اس سے جماعت اسلامی کے بعض کاموں کی تحسین کا پہلو نکلتا ہے۔

فرض نمازوں کے بعد رفع الیدین کے ساتھ دعا کرنے کی عجلت تحفۃ الاحوذی کی پہلی جلد میں صفحہ ۲۴۵، ۲۴۶ پر دیکھیے۔ اس میں حافظ ابن القیم کا مسلک بھی نقل کیا ہے اور اس پر تنقید بھی منقول ہے اور مولانا (عبدالرحمٰن مبارک پوری) نے اس کے متعلق اپنا فیصلہ بھی لکھا ہے۔

میرے خیال میں (اسے) نہ بدعت کہنا صحیح ہے اور نہ ایسا التزام صحیح ہے جیسا حنفیوں کے یہاں مروج ہوگیا ہے۔

اب آخر میں جو بات آپ نے اپنے متعلق لکھی ہے اسی کا مجھے خیال ہے۔

احباب و اخوان کو سلام کہیے۔

والسلام

نذیر احمد رحمانی از بنارس

یکم فروری ۱۹۶۰ء دوشنبہ

جیسا کہ ابتداء میں عرض کیا گیا مولانا نذیر احمد رحمانی کی زیارت کا شرف مجھے ایک ہی مرتبہ اکتوبر ۱۹۴۵ء میں دارالحدیث رحمانیہ دہلی میں حاصل ہوا۔ اس سے بیس برس بعد ۳۰ مئی ۱۹۶۵ء کو انھوں نے وفات پائی۔ ان کی وفات کے بعد متعدد ہندوستانی اصحابِ علم نے مختلف رسائل و جرائد میں ان پر مضامین لکھے۔ میں نے مولانا مرحوم سے متعلق اس طویل مضمون میں انہی حضرات کے مضامین سے استفادہ کیا ہے اور جیسا کہ خوانندگانِ محترم کے مطالعہ میں آیا ہر مضمون نگار کا حوالہ دیا ہے۔

ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے زمانۂ ادارت میں (جو اگست ۱۹۴۹ء سے ۳۰ مئی ۱۹۶۵ء تک کم و بیش سولہ سال پر محیط ہے) مولانا مرحوم کے چند مکاتیب گرامی میرے نام آئے، میں نے بھی ان کو خطوط لکھے۔ ان کے مکاتیب میں سے صرف ایک مکتوب میرے پاس محفوظ ہے جو انھوں نے ۲۳ مارچ ۱۹۶۲ء کو میرے نام ارسال فرمایا۔ ۵۲ برس قبل کا یہ مکتوب تبرکاً ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۲۳/ مارچ ۱۹۶۲ء

مکرمی! السلام علیکم

ایک خاص امر کی تکلیف دینے کے لیے یہ عریضہ لکھ رہا ہوں، امید کہ توجہ فرمائیں گے۔ مولانا راغب احسن صاحب ڈھاکہ کا پتا اگر آپ کو معلوم ہو تو ازراہ عنایت مجھے اس سے بواپسی ڈاک مطلع فرمائیں۔

یہ بتایئے کہ مولانا عبداللہ الکافی مرحوم کی کتاب ''تاریخ تحریک اہل حدیث ومجاہدین'' چھپ چکی ہے یا نہیں؟ اگر چھپ چکی ہو تو کیا وہ کہیں سے دست یاب ہو سکتی ہے؟

مولانا راغب احسن صاحب کا ایک مضمون مولانا عبداللہ الکافی کے متعلق الاعتصام جلد ۱۱ نمبر ۵۱، ۲۲ جولائی ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کے صفحہ ۸ پر اس کتاب کا ذکر ہے۔

آپ کے جواب کا شدت سے انتظار رہے گا۔ والسلام

نذیر احمد رحمانی

مکان ۵۷/۱۶ پانڈے ہولی بنارس

مولانا نذیر احمد رحمانی جلیل القدر عالم، ممتاز مدرس اور نامور مصنف تھے۔ ان کا ہینڈ رائٹنگ بہت عمدہ تھا۔ میرے نام غالباً ان کا مذکورہ بالا مکتوب اس وقت آیا تھا جب وہ اہل حدیث اور سیاست کے موضوع پر کتاب لکھ رہے تھے۔ میں نے ان کے ارشاد کی تعمیل کر دی تھی۔ مولانا راغب احسن صاحب کے جس مضمون کا انھوں نے حوالہ دیا ہے، وہ زیر مطالعہ کتاب (چمن ستان حدیث) کے گزشتہ صفحات میں (بہ عنوان: مولانا عبداللہ الکافی القرشی) چھپ گیا ہے۔ قارئین کرام نے پڑھ لیا ہوگا۔

مولانا عبدالرحمٰن اوڈ

(وفات اکتوبر ۱۹۷۲ء)

۱۹۵۵ء میں یہ فقیر ہفت روزہ ''الاعتصام'' کی خدمت ادارت پر مامور تھا اور اخبار کا دفتر اس وقت لاہور شیش محل روڈ پر دار العلوم تقویۃ الاسلام کی بلڈنگ میں تھا۔ ایک دن گیارہ بجے کے قریب ایک صاحب تشریف لائے۔ انھوں نے اپنا تعارف نہایت مختصر الفاظ میں کرایا: ''میرا نام عبدالرحمٰن اوڈ ہے، بہاول نگر رہتا ہوں''۔

میانہ قد، گندمی رنگ، کسرتی سا جسم، ستویں چہرے پر مسکراہٹ طاری، میٹھا طرز کلام، سر پر سفید عمامہ، تہبند اور قمیص پہنے ہوئے۔ بہ ظاہر بے حد منکسر۔ یہ مولانا عبدالرحمٰن اوڈ تھے جو ۱۹۴۷ء میں مالیر کوٹلہ (مشرقی پنجاب) سے نقل مکانی کر کے پہلے لاہور آئے اور دو سال یہاں رہے۔ اس کے بعد بہاول نگر چلے گئے۔

تقسیم ملک کے بعد اوڈ قوم منتشر ہوگئی۔ یہ دراصل راجپوت لوگ ہیں۔ بہادر اور جفاکش۔ تقسیم ملک سے قبل ان کی زیادہ تعداد مشرقی پنجاب میں تھی۔ صوبہ سندھ کے بعض مقامات میں بھی مقیم تھے۔ یہ لوگ بھیڑ بکریاں پالتے اور چراتے تھے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ ان کے ڈیرے منتقل ہوتے رہتے تھے۔ بے خوف اور لڑاکے لوگ۔ اس راجپوت گروہ کے کئی خاندان یا ''گوت'' تھے۔ ایک گوت کا نام ''ٹیل'' تھا۔ اس گوت سے تعلق رکھنے والے اوڈ بے حد ضدی اور اڑیل تھے۔ لیکن دوستوں کے دوست اور خیر خواہ کے خیر خواہ۔ مولانا عبدالرحمٰن کا تعلق اوڈوں کے اسی خاندان اور گوت سے تھا اور ان کے والد کا نام برکت علی تھا۔

عبدالرحمٰن ستمبر ۱۹۰۲ء میں بمقام مالیر کوٹلہ پیدا ہوئے۔ تقسیم ملک سے قبل مالیر کوٹلہ کو پنجاب میں ایک مسلمان ریاست کی حیثیت حاصل تھی۔ تقسیم ملک کے بعد حکومت ہند نے ریاستیں ختم کر دیں تو مالیر کوٹلہ کو ضلع سنگرور میں شامل کر دیا گیا۔ تقسیم ملک سے پہلے سنگرور بھی پنجاب کی ایک ریاست تھی۔

عبدالرحمٰن اوڈ نے ابتدائی تعلیم مالیر کوٹلہ کے اسلامیہ ہائی سکول میں حاصل کی۔ پھر دہلی جا کر جامعہ رحمانیہ میں داخل ہوئے اور وہاں کے اساتذۂ گرامی سے تحصیل علم کی۔ پڑھنے میں تیز اور ذہین تھے۔ میٹرک کا امتحان لاہور آ کر دیا۔ اپنے وطن اور جامعہ رحمانیہ دہلی میں کس استاد سے کیا پڑھا؟ اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔

جس زمانے میں وہ بہاول نگر گئے تھے، اس زمانے میں وہاں اہل حدیث کی کوئی مسجد نہ تھی۔ ۱۹۵۰ء میں

انھوں نے کوشش کر کے شہر کے وسط میں اپنی ذاتی زمین پر مسجد اہل حدیث تعمیر کرائی اور یہ اوڈاں والی مسجد کہلائی۔ اس مسجد میں انھوں نے باقاعدہ امامت وخطابت کا سلسلہ شروع کیا جوان کی وفات (۱۹۷۲ء) تک جاری رہا۔ کئی سال سے اس مسجد کی خطابت کا فریضہ مولانا محمد اکرم طارق سکھیرا انجام دے رہے ہیں۔ وہ قریب ہی کے ایک گاؤں کجیانی کے رہنے والے ہیں۔ یہ گاؤں ہارون آباد روڈ پر واقع ہے۔ مولانا محمد اکرم سکھیرا کو اللہ نے بہت سی خصوصیات سے نوازا ہے۔ علم، حلم، انکسار، تواضع یہ سب اوصاف ان کی فطرت میں جمع ہیں۔

مولانا عبدالرحمٰن اوڈ کسی نہ کسی کام سے اکثر لاہور آیا کرتے تھے اور مجھے ضرور ملتے تھے۔ وہ جب آتے مجھے بہاول نگر آنے اور اپنی مسجد دیکھنے کی ضرور دعوت دیتے، لیکن افسوس ہے میں ان کی زندگی میں نہ بہاول نگر جا سکا اور نہ ان کی مسجد دیکھ سکا۔ اپریل ۱۹۸۸ء میں میری بیٹی سمیہ زیرک کی شادی وہاں ہوئی تو اس کے بعد میں کئی دفعہ وہاں گیا اور متعدد مرتبہ اس مسجد میں نماز پڑھی اور بارہا مولانا محمد اکرم سکھیرا کی امامت میں جمعہ کی نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ میرا داماد میرا ہم نام ہے یعنی محمد اسحاق بھٹی!

اب بہاول نگر میں اہل حدیث کی میرے خیال میں دس بارہ مسجدیں ہوں گی، لیکن پہلی اور جامع مسجد یہی ہے جو مولانا عبدالرحمٰن اوڈ نے تعمیر کرائی۔ مولانا محمد اکرم طارق سکھیرا موثر وعظ فرماتے ہیں اور بہت لوگ ان کے خطبۂ جمعہ میں شریک ہوتے ہیں۔ جمعے کے علاوہ بھی ہر نماز میں خاصی تعداد میں لوگ آتے ہیں۔ نمازیوں کی کثرت کی وجہ سے مسجد کا حجم بھی کافی بڑھ گیا ہے۔

مسجد کی طرح مولانا عبدالرحمٰن اوڈ بہاول نگر میں ایک دینی مدرسہ بھی جاری چاہتے تھے اور اس کی بنیاد بھی رکھ دی تھی۔ اس کا بھی انھوں نے اس زمانے میں مجھ سے ذکر کیا تھا لیکن سنا ہے کہ بعض لوگوں نے اس پر قبضہ کر لیا تھا، پھر ان کا قبضہ مولانا کے بیٹے عبدالعزیز اوڈ کی کوشش سے ختم ہوا۔ یہ مدرسہ ''جامعۂ رحمانیہ'' کے نام سے بہاول نگر کے محلہ گئوشالہ میں قائم ہے اور اس کے ناظم قاری عبدالحمید صدیقی ہیں جو مدرسہ چلا رہے ہیں۔

یہاں یہ عرض کر دوں کہ جب مولانا عبدالرحمٰن اوڈ سے میرا تعلق ہوا، وہ میری جوانی کا زمانہ تھا اور میری داڑھی چھوٹی تھی جو ہمیشہ عمل مقراض کی زد میں رہتی تھی اور میں مونچھیں چڑھا کر رکھتا تھا۔ اس کا اصل پس منظر یہ تھا کہ جب میں نے پہلی دفعہ کسی اخبار میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تصویر دیکھی تو ان کی داڑھی چھوٹی تھی اور انھوں نے مونچھوں کو تاؤ دے رکھا تھا۔ ان کی تصویر دیکھ کر میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ جب مجھے داڑھی آئے گی تو اسی قسم کی داڑھی اور اسی قسم کی مونچھیں رکھوں گا۔ ۱۹۴۳ء میں میرا چہرہ بالوں سے آشنا ہوا تو میں نے یہی کیا اور پھر یہ عمل ۱۹۹۵ء تک جاری رہا۔ اس کے بعد میں نے یہ عمل ترک کر دیا۔ اب میرے چہرے نے میری داڑھی کے طول وعرض سے مکمل صلح کر لی ہے اور دونوں پیار محبت سے ایک ہی جگہ زندگی بسر کر رہے

ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ میرے چہرے کے بال اب میرے چہرے کا اٹوٹ انگ ہیں۔ پہلے میں نے مونچھیں چھوٹی کیں، پھر داڑھی بڑھائی۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مولانا عبدالرحمٰن اوڈ کو پہلی دفعہ دیکھ کر میرا دل دھڑکا اور خیال ہوا کہ یہ میری داڑھی کو ہدفِ اعتراض ٹھہرائیں گے۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ انھوں نے اس معصومہ کے متعلق مجھے کچھ نہیں کہا یا تو مجھ سے گفتگو میں مصروفیت کی وجہ سے انھوں نے اسے دیکھا ہی نہیں یا دیکھ تو لیا لیکن یہ سمجھ کر خاموش رہے کہ یہ تو بے چاری پہلے ہی چھوٹی سی ہے، اس کے متعلق جھگڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ مرے کو مارے شاہ مدار والا معاملہ نہیں ہونا چاہیے۔

اس سے قبل ایک اور بڑی اور گھنی داڑھی والے اوڈ عالم دین سے میرے مراسم طویل مدت سے قائم تھے۔ وہ لاہور تشریف لاتے تو مجھے ضرور یاد فرماتے۔ وہ تھے مولانا عبداللہ اوڈ۔ فاضل کا بنگلہ والے۔ ان کے متعلق میں اپنی کتاب ''کاروان سلف'' میں مضمون لکھ چکا ہوں۔ یہ کتاب مکتبہ اسلامیہ فیصل آباد (اور اردو بازار، لاہور) نے شائع کی ہے۔ انھوں نے بھی میری ننھی منی سی داڑھی کو ہمیشہ قابل معافی سمجھا۔ وہ جماعت غرباءِ اہل حدیث پنجاب کے امیر (یا امام) تھے اور حضرت مولانا عبدالوہاب دہلوی کے شاگرد۔ ان سے انھوں نے کتب حدیث کی تکمیل کی تھی۔ مدرسہ غزنویہ امرتسر میں بھی وہ تعلیم حاصل کرتے رہے تھے اور لکھو کے میں بھی۔ چودھری قسم کے عالم دین تھے۔ ان کی اپنی کارتھی اور گلے میں پستول ہوتا تھا۔ ان کا مسلکی تعلق جماعتِ غرباء سے تھا اور معاشرتی تعلق جماعتِ امراء سے۔ !اللہ کی مہربانی سے اب جماعت غربائے اہل حدیث، جماعت امراء یا اہل حدیث ہوگئی ہے اور میرا اس جماعت کے امراء و غرباء سے بہت دوستانہ ہے۔ اپنی مختلف کتابوں میں میں نے اس کے تقریباً تمام علمائے کرام کے حالات بیان کر دیے ہیں۔

بہر کیف ابتدا میں میرا تعلق اوڈ برادری کے علما میں سے انھی دو علما سے ہوا۔ ایک کا نام عبداللہ تھا اور ایک کا عبدالرحمٰن۔ یہ دونوں مجھ بے عمل پر شفقت فرماتے تھے۔ دفتر ''الاعتصام'' تشریف لاتے اور بڑے پیار کی باتیں کرتے۔ وہ اوڈ تھے اور راجپوت تھے، ممکن ہے وہ مجھے راجپوت سمجھ کر قابل رحم قرار دیتے ہوں۔ حالانکہ میرا کہیں کوئی چھوٹا موٹا ''راج'' نہیں ہے، صرف ''پوت'' ہوں۔

میں ۱۹۸۷ء میں پہلی مرتبہ بہاول نگر گیا تو مولانا عبدالرحمٰن کی مسجد میں نماز پڑھنے کو جی چاہا۔ وہ تو اس سے بہت پہلے وفات پا چکے تھے۔ میں نے مسجد میں ان کے بیٹے کے بارے میں پوچھا تو ایک شخص نے مہربانی کی، وہ ان کے بیٹے عبدالعزیز کو گھر سے بلا لایا۔ میں کافی دیر مسجد میں ان سے ان کے والد مولانا عبدالرحمٰن کے بارے باتیں کرتا اور ان کی سنتا رہا۔ انھوں نے گھر جانے اور چائے وغیرہ پینے کے لیے بار بار

کہا، لیکن میں نہیں گیا۔ یہ عبدالعزیز اوڈ سے میری پہلی اور آخری ملاقات تھی۔

مولانا عبدالرحمٰن اوڈ کو کتابیں خریدنے اور پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ لاہور تشریف لاتے تو مجھ سے اس موضوع پر ضرور گفتگو کرتے۔ ان کا اصل موضوع علم حدیث تھا اور ان کی گفتگو کا محور یہی موضوع رہتا تھا۔ تقسیم ملک سے قبل مالیر کوٹلہ میں بھی ان کا اچھا خاصا کتب خانہ تھا۔ وہ گھر کا کوئی سامان پاکستان نہیں لائے، صرف کتابیں لے کر اپنے آبائی گھر سے نکلے۔ لیکن راستے میں ان کی بہت سی کتابیں ضائع ہو گئیں۔ جو کتابیں لانے میں وہ کامیاب ہوئے۔ وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) صحیح بخاری مع فتح الباری (۲) صحیح مسلم مع شرح نووی (۳) سنن ابی داؤد مع عون المعبود (۴) جامع ترمذی مع تحفۃ الاحوذی (۵) ابن ماجہ (۶) سنن نسائی (۷) موطا امام مالک (۸) مشکوٰ شریف (۹) بلوغ المرام (۱۰) ریاض الصالحین (۱۱) زاد المعاد (۱۲) تفسیر خازن (۱۳) تفسیر ابن کثیر (۱۴) تہذیب التہذیب (۱۵) تقریب التہذیب (۱۶) مجمع البحار (۱۷) غنیۃ الطالبین (۱۸) تفسیر محمدی پنجابی (۱۹) قرأۃ خلف الامام امام بخاری (۲۰) جزء رفع الیدین امام بخاری (۲۱) اصول نسخ فن خطاطی کے متعلق (۲۲) شجرۃ الانساب۔ ان کے علاوہ چند اور کتابیں۔

مولانا عبدالرحمٰن اوڈ مناظر بھی تھے اور تقسیم ملک سے پہلے نوجوانی کے عالم میں بعض مسائل سے متعلق بعض مذاہب کے اہل علم سے ان کے مناظروں کا سلسلہ جاری رہا۔

اس عالم دین نے تقریباً ۷۲ سال کی عمر کو پہنچ کر اکتوبر ۱۹۷۲ میں وفات پائی۔ اللھم اغفرلہ و ارحمه و عافه و اعف عنه.

مولانا عبدالرحمٰن اوڈ کے ایک ہی بیٹے تھے، جن کا نام عبدالعزیز اوڈ تھا۔ وہ دراز قامت اور خوب صورت شخص تھے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا میری ان سے پہلی اور آخری ملاقات ۱۹۸۷ء میں بہاول نگر کی اسی جامع مسجد اہل حدیث میں ہوئی تھی جو ان کے والد (مولانا عبدالرحمٰن اوڈ) نے تعمیر کرائی تھی۔ اس وقت عبدالعزیز کی جوانی ڈھل چکی تھی اور ان کی داڑھی پر سفیدی چھا گئی تھی۔ انھوں نے ٹخنوں سے اوپر تہبند باندھ رکھا تھا اور سر پر پٹکا سا لپیٹا ہوا تھا۔ گندمی رنگ اور تیکھے نقوش۔ انھیں دیکھ کر پتا چلتا تھا کہ جوانی بڑی طاقت ور اور مردم مار قسم کی ہوگی۔ اور واقعی ایسی ہی تھی۔

کسی زمانے میں ہندوستان کی حکومت نے کسی جرم میں عبدالعزیز کو گرفتار کر لیا تھا۔ معلوم نہیں وہ پاکستان کی طرف سے جاسوسی کرنے ہندوستان گئے تھے یا غیر قانونی طور پر اس ملک میں داخل ہوئے تھے یا کسی حادثے کے نتیجے میں وہاں پہنچ گئے تھے۔ مجھے اس کی تفصیل کا صحیح طور سے علم نہیں، البتہ باتیں کئی قسم کی

سننے میں آئی تھیں۔ وہ فیروز پور، گنگا نگر، بیکانیر، نابھہ، لدھیانہ، روپڑ اور انبالہ وغیرہ کی جیلوں میں قید رہے اور جیلوں سے فرار بھی ہوئے۔ ہندوستان کی پولیس کے نزدیک وہ نہایت خطرناک شخص تھے۔

آخر میں انھیں صوبہ راجستھان کے شہر اجمیر کی جیل میں بند کر دیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ جیل سنگلاخ پہاڑوں کے درمیان پتھروں کو تراش کر بنائی گئی ہے اور چاروں طرف سے قلعے کی طرح بند ہے۔ اس جیل میں خطرناک قیدیوں کو رکھا جاتا ہے اور مشہور ہے کہ یہاں سے کسی قیدی کا فرار ہونا ممکن نہیں۔ لیکن یہ فرار ہوئے۔ کس طرح فرار ہوئے؟ اس کی تفصیل سنیے!

اس جیل میں عبدالعزیز اوڈ کی ملاقات ایک اٹھائیس سالہ راجپوت قیدی پرتاپ سنگھ سے ہوئی جو فوج سے فرار ہو کر ڈاکو بن گیا تھا۔ پورے علاقے میں اس کی دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ جیل کے اندر اور باہر ہر جگہ کے لوگ اس سے خوف کھاتے تھے۔ وہ کئی دفعہ پولیس کی حراست سے بھاگا اور جیل سے فرار ہوا تھا۔ اسی لیے اسے اجمیر کی جیل میں قید کیا گیا تھا کہ وہ بھاگ نہ سکے۔ پرتاپ سنگھ سے عبدالعزیز کی ملاقات جلد ہی دوستی میں بدل گئی۔ وہ ہندو راجپوت تھا اور بہادروں کی قدر کرتا تھا۔ اس دوستی کی ایک وجہ تو دونوں کی بہادری تھی اور دوسری وجہ ان کا راجپوت ہونا تھا۔ اب دونوں ایک دوسرے کے راز دان اور خیر خواہ تھے۔ عبدالعزیز اوڈ کی عمر اس وقت پینتیس چھتیس سال کے لگ بھگ تھی۔

ایک روز ایک مقدمے کی پیشی بھگتنے کے لیے پولیس پرتاپ سنگھ کو اجمیر سے چالیس میل دور ''بنادر'' نام کے ایک قصبے میں لے کر گئی۔ وہ پیشی بھگت کر واپس آیا تو اس کے پاس چھوٹی سی آری کے دو ٹکڑے تھے۔ اس نے آری کا ایک ٹکڑا کسی طرح عبدالعزیز کے سیل میں پہنچایا اور دوسرا ٹکڑا اپنے پاس رکھا۔ پھر ایک منصوبے کے تحت یہ دونوں قیدی اپنے اپنے سیل کی سلاخیں کاٹنے لگے۔ تین دن اور تین راتوں میں انھوں نے سیل کی ایک ایک سلاخ کاٹ ڈالی۔ یہ ۳۱ر اکتوبر اور یکم نومبر ۱۹۷۰ء کی درمیانی شب تھی، جس میں کسی نہ کسی طرح یہ جیل سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

جیل سے نکل کر دونوں قیدی پہاڑی کی ایک کھوہ میں چھپ گئے اور تمام دن وہیں بیٹھے رہے۔ سورج غروب ہونے کے قریب ہوا تو کھوہ سے نکلے اور دشوار گزار اونچے نیچے پہاڑی راستوں سے نامعلوم منزل کی طرف چل پڑے۔ تین دن اور تین راتیں سفر میں گزاریں۔ اس اثنا میں بھوک مٹانے کے لیے گھاس پھونس کھاتے اور پیاس ختم کرنے کے لیے گڑھوں کا پانی پیتے رہے۔ آخر اِدھر اُدھر چلتے پھرتے سو میل سے زیادہ سفر کر کے موضع بنجاری پہنچ گئے جو پرتاپ سنگھ کا علاقہ تھا۔ پرتاپ سنگھ کو اس علاقے میں کوئی خطرہ نہ تھا اور اس نواح کے لوگ اس کے حامی تھے۔ پولیس اودھر کا رخ کرنے سے ڈرتی تھی۔

پرتاپ سنگھ نے اپنے گھر جا کر عبدالعزیز کو نئے کپڑوں کے ایک دو جوڑے اور کچھ نقد روپے دیے اور عزت کے ساتھ وہاں سے رخصت کیا۔ عبدالعزیز اپنے محسن کے گھر سے روانہ ہوئے تو ان کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ اب دونوں بہادر راجپوت جوان جو الگ الگ مذہب رکھتے اور الگ الگ ملکوں کے رہنے والے تھے، ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے تھے۔

عبدالعزیز وہاں سے پیدل چل کر پہلے جودھ پور پہنچے۔ جودھ پور سے پوہ کرن آئے۔ پھر پلودی اور جیسلمیر سے ہوتے ہوئے پانچ سو میل کا صحرائی سفر طے کر کے ۱۶ فروری ۱۹۷۱ء کو اپنے گھر (بہاول نگر) آئے۔ ان کا یہ پیدل سفر ۳۱/ اکتوبر اور یکم نومبر ۱۹۷۰ء کی درمیانی رات کو اجمیر جیل سے شروع ہوا تھا جو ساڑھے تین مہینے کے بعد ۱۶ فروری ۱۹۷۱ء کو بہاول نگر میں ختم ہوا۔ راجستھان کی حکومت نے عبدالعزیز کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنے والے کے لیے پچاس ہزار روپے نقد انعام اور ایک مربع زرعی زمین دینے کا اعلان کیا تھا۔

جب عبدالعزیز ہندوستان میں پانچ سال اور تین ماہ کی قید کاٹ کر اور بہت سی سختیاں جھیل کر گھر پہنچے تو ماں بیٹے کے غم میں مرچکی تھی اور بوڑھا باپ عبدالرحمٰن اوڈ موت کی راہ تک رہا تھا۔ گھر برباد ہو چکا تھا اور بیوی بچے محنت مزدوری کرنے پر مجبور تھے۔

عبدالعزیز ۳/ مارچ ۱۹۳۳ء کو مالیر کوٹلہ (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے اور مالیر کوٹلہ کے اسلامیہ سکول میں مڈل تک تعلیم حاصل کی۔ لاہور آ کر میٹرک کا امتحان دیا۔ کچھ دینیات کی تعلیم بھی پائی۔ وہ ۱۹۶۵ء کی جنگ سے کئی سال پہلے ۱۹۵۸ء کے لگ بھگ ہندوستان چلے گئے تھے۔ وہاں خفیہ طور پر مختلف مقامات میں گھومتے اور تھوڑا بہت کاروبار کرتے رہے۔ پھر جاسوسی کے الزام میں گرفتار کر لیے گئے۔ کچھ عرصہ نابھہ جیل میں رہے۔ نابھہ جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے ان کو چکی پیسنے کا حکم دیا۔ انھوں نے چکی پیسنے سے انکار کیا تو سپرنٹنڈنٹ نے کہا میں بہت سخت آدمی ہوں۔ جیل میں جو حکم دوں، اس کی تعمیل کرنا پڑے گی۔ سوچنے کے لیے تمھیں تین دن کی مہلت دیتا ہوں۔ عبدالعزیز نے جواب دیا میں بھی بہت سخت طبیعت کا مالک ہوں۔ چکی پیسنے کا حکم ہرگز نہیں مانوں گا۔ بالآخر سپرنٹنڈنٹ جیل کے غرور کی گردن ٹوٹ گئی اور اس نے نابھہ جیل سے تبادلہ کرا لیا۔

عبدالعزیز نے صرف ۵۷ برس عمر پائی۔ یکم مارچ ۱۹۹۰ء کو ان کا بہاول نگر میں انتقال ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

عبدالعزیز کی اولاد دو بیٹیاں اور چار بیٹے تھے۔ بیٹوں کے نام علی الترتیب یہ تھے: محمد عمر، محمد عثمان، عبداللہ اور اسماعیل۔ محمد عثمان سعودی عرب گئے اور وہاں وفات پا گئے۔

محمد عمر کے تین بیٹے ہیں اور ایک بیٹی۔ بڑا بیٹا عبیداللہ ہے اور اس سے چھوٹا عبدالرحمٰن۔ عبدالرحمٰن نے

دینی علوم کی تحصیل جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن (ضلع فیصل آباد) میں کی۔ اس کے علاوہ ایم اے (اسلامیات) کا امتحان دیا۔ آج کل جامعہ اسلامیہ بہاول پور میں پڑھاتے ہیں۔ یہ مولانا عبدالرحمٰن اوڈ کے پڑپوتے اور عبدالعزیز اوڈ کے پوتے ہیں۔ لائق اور ذہین۔

اس نوجوان پروفیسر عبدالرحمٰن سے تقریباً گیارہ سال قبل میری پہلی ملاقات نماز عصر کے بعد اس جامع مسجد اہل حدیث میں ہوئی تھی جو ان کے پڑدادے مولانا عبدالرحمٰن اوڈ نے تعمیر کرائی تھی۔ پروفیسر عبدالرحمٰن مجھے اپنے گھر لے گئے۔ انھوں نے اپنے بعض عزیزوں کو بھی بلا لیا اور مولانا عبدالرحمٰن اوڈ اور مالیر کوٹلہ کے متعلق باتیں شروع ہوگئیں۔ مالیر کوٹلہ کے بعض لوگوں کو میں بھی جانتا ہوں، جن میں سے کچھ لوگ مالیر کوٹلہ، کچھ لاہور اور کچھ دہلی رہتے ہیں اور میری ان سے جان پہچان ہے۔ اسی اثنا میں عبدالعزیز اوڈ کے بارے میں گفتگو کا سلسلہ چلا جو گزشتہ سطور میں قارئین کے مطالعہ میں آیا۔

بہرحال مولانا عبدالرحمٰن اوڈ مرحوم و مغفور باہمت عالم دین تھے، جنھوں نے تقسیم ملک کے بعد مالیر کوٹلہ سے نکل کر بہاول نگر کو اپنا مسکن بنایا اور اپنی کوشش سے یہاں مسجد اہل حدیث تعمیر کرائی۔ اس شہر میں اہل حدیث کی یہ مرکزی مسجد ہے۔ اس مسجد کے اردگرد کی دو تین گلیوں میں مولانا عبدالرحمٰن اوڈ کے رشتے دار سکونت پذیر ہیں اور وہ عددی اعتبار سے بھی اپنا اثر رکھتے ہیں اور تعلیمی میدان میں بھی انھیں اہمیت حاصل ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مولانا عبدالرحمٰن اوڈ کی آل اولاد میں سے جو لوگ وفات پا گئے ہیں ان کی مغفرت فرمائے اور جو زندہ ہیں، ان کو اعمال خیر کی توفیق سے نوازے۔

جامع مسجد اہل حدیث کے بالکل متصل ایک صاحب محمد یاسین رہتے ہیں۔ کئی سال پہلے ان سے اچانک ملاقات ہفت روزہ اخبار ''الاعتصام'' (لاہور) کے دفتر میں ہوئی تھی۔ انھوں نے مجھے فرمایا تھا کہ میں بہاول نگر آؤں تو ان سے ضرور ملوں۔ چنانچہ میں نے ایک دفعہ نماز مغرب کے بعد ان کے مکان پر حاضری دی۔ ان کا کتب خانہ دیکھا جو فارسی، اردو اور انگریزی کی منتخب کتابوں کا خوب صورت مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں اسلامیات، دینیات، تاریخ، شعر و شاعری، لغات وغیرہ ضرورت کے مطابق بہت کچھ موجود ہے اور ہر علمی ذوق کا آدمی اس سے استفادہ کرسکتا ہے۔ میں محمد یاسین صاحب کے حسن انتخاب سے بہت متاثر ہوا۔ اس کتب خانے میں اس فقیر کی بعض تصانیف بھی موجود ہیں۔ محمد یاسین صاحب کا اردو اور انگریزی کا خط بہت عمدہ ہے۔

آبائی اعتبار سے محمد یاسین کا وطنی تعلق مشرقی پنجاب کے شہر بھٹنڈہ سے ہے جو ہندوستان میں ریلوے کا مشہور مرکز ہے۔

سید مولا بخش کوموی

(وفات ۱۲۔ مئی ۱۹۷۵ء)

میں نے اپنی کتاب ''گلستان حدیث'' میں سید مولا بخش کوموی مرحوم و مغفور کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن یہ تذکرہ بہت مختصر ہے، صرف ڈیڑھ صفحے پر مشتمل۔ اس اختصار کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت حضرت مرحوم کے حالات میں کوئی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ مواد میرے سامنے نہیں تھا۔ میں ان کی خدمت میں حاضری سے بھی محروم رہا۔ مجھے ان کی زیارت کا شرف صرف ایک مرتبہ حاصل ہوا۔ ۳،۴۔ اپریل ۱۹۵۵ء کو لائل پور میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کی تیسری سالانہ کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اسی موقعے پر ۴۔ اپریل کو جامعہ سلفیہ کا سنگِ بنیاد رکھا گیا تھا۔ اس وقت انھیں مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے پاس بیٹھے ہوئے دیکھا۔ بس یہی ان کی پہلی رؤیت تھی جو مجھے نصیب ہوئی اور یہی آخری۔

''گلستان حدیث'' میں ان کے متعلق کچھ لکھنے سے پہلے میں نے متعدد حضرات سے ان کے حالات معلوم کرنے کی کوشش کی۔ سب کا ایک ہی جواب تھا کہ بڑے متقی بزرگ تھے، کتاب و سنت کے مبلغ تھے، نرمی سے بات کرتے تھے اور اللہ ان کی دعائیں قبول فرماتا تھا۔ ان کے متعلق یہ چند لفظی متن تھا جس سے میں آگاہ ہوا۔ یہ متن ''کافیہ'' کے متن سے بھی مشکل تھا۔ اس کی تشریح کسی نے نہیں کی۔ نہ کسی نے ان کے تحصیل علم کے متعلق کچھ بتایا، نہ کسی نے ان کے تقوے اور پرہیزگاری کی تفصیل بیان کی، نہ ان کی تبلیغ کتاب و سنت کی صراحت کی، نہ ان کی نرم کلامی کی وضاحت کی اور نہ ان کی زندگی کے کسی اہم واقعہ سے مطلع فرمایا۔

۲۰۱۰ء کے ماہ اپریل کی کوئی تاریخ تھی کہ مرکز القادسیہ (چوبرجی لاہور) کے جناب سیف اللہ خالد صاحب اپنے چند رفقاء کے ساتھ میرے گھر تشریف لائے۔ انھوں نے ''دعوۃ القرآن'' کے نام سے قرآن مجید کی تفسیر لکھی ہے جو پانچ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ اردو زبان کی یہ عمدہ تفسیر ہے جو احادیث صحیحہ کی روشنی میں لکھی گئی ہے۔ محترم سیف اللہ خالد صاحب نے ازراہِ کرم مجھے یہ تفسیر عنایت کی۔ اس سے چند روز بعد مرکز القادسیہ میں اس تفسیر کے متعلق ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا تھا، اس میں انھوں نے مجھے حاضر ہونے اور تفسیر کے بارے میں گزارشات پیش کرنے کی دعوت دی، چنانچہ میں وقتِ مقررہ پر حاضر ہوا اور چند باتیں کیں۔ وہیں مجمعے میں سے ایک صاحب تشریف لائے اور مجھے ایک کتاب ''جدی و مرشدی سید مولانا بخش ترمذی

کو موئی" دے کر کہیں غائب ہو گئے۔ یہ کام انھوں نے اتنی عجلت سے کیا کہ مجھے بات کرنے کا موقع بھی نہیں دیا۔ ۱۲۶ صفحات کی یہ کتاب شروع سے آخر تک میں نے دل چسپی سے پڑھی۔ کتاب سید مولانا بخش مرحوم کے نواسے سید عبدالخالق شاہ ترمذی کی تصنیف ہے اور سید صاحب ممدوح کے متعلق بہت سے واقعات پر محیط ...... بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کتاب مجھے خود اس کے لائق مصنف سید عبدالخالق نے ہی عطا فرمائی تھی۔ لیکن کتاب مجھے اس وقت ملی جب میری کتاب "گلستان حدیث" چھپنے کے لیے پریس بھیجی جا چکی تھی۔ افسوس ہے میں سید صاحب کے حالات کے سلسلے میں اس کتاب (جدی ومرشدی) سے استفادہ نہ کر سکا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مرحوم سے متعلق میری گزارشات بہت محدود رہیں۔ اب "چمنستان حدیث" میں "جدی ومرشدی" کے مندرجات کی روشنی میں سید صاحب کا قدرے تفصیل سے تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔

سید مولا بخش کے اسلاف:

سید مولا بخش کا تذکرہ کرنے سے پہلے ان کے حلیے اور لباس کا ذکر کرنا ضروری ہے، جس سے مجھے ان کے نواسے سید عبدالخالق نے بذریعہ خط مطلع فرمایا۔

تقریباً ساڑھے پانچ فٹ قد، گوشت سے بھرا ہوا مضبوط کسرتی جسم، گندمی رنگ، گول نورانی چہرہ، کھلی پیشانی، چوڑا سینہ، لمبی لیکن ذرہ موٹی ناک، متوسط ہونٹ نہ بہت باریک نہ موٹے، قدرے چھوٹی آنکھیں، سرخ مہندی لگی ہوئی گھنی ڈاڑھی جو زیادہ لمبی نہ تھی۔ رخساروں تک داڑھی کے بال، داڑھی کا اوپر یا نیچے سے کبھی خط نہیں بنوایا۔ مونچھیں ہمیشہ کترواتے، ہاتھ میں اکثر پونے پانچ فٹ کی بانس کی لاٹھی رکھتے، جس کے نیچے لوہے کی سم لگی ہوتی، سفر پر جاتے تو بید کی چھڑی۔ لباس سادہ۔ زیادہ تر تہبند اور قمیص پہنتے، سردیوں میں پاجامہ بھی پہن لیتے، سر پر کپڑے کی ٹوپی اور کندھے پر رومال، جوانی میں کلے والی پگڑی باندھتے، عیدین کے موقع پر شیروانی پہن کر عید کی نماز پڑھاتے، ضروری اور مختصر بات کرتے۔

سید مولا بخش کا تعلق ترمذی سادات سے تھا۔ ان کے اسلاف میں سے کوئی بزرگ ترمذ سے نقل مکانی کر کے ہندوستان آ بسے تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی وساطت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ سید مولا بخش سے کئی پشتیں پیشتر ایک بزرگ حاجی سید خضر الدین ترمذی گزرے ہیں۔ ان کے زمانے میں ہندوستان کا بادشاہ علاؤ الدین خلجی تھا، جو ۶۹۱ھ میں تخت ہند پر بیٹھا اور بیس سال حکومت کر کے ۷۱۱ھ میں فوت ہوا۔ اس نے حاجی سید ظفر الدین کو موجودہ جغرافیائی حساب سے مشرقی پنجاب کے ضلع لدھیانہ کی تحصیل سمرالا میں دریائے ستلج اور بیاس کے علاقے میں ایک قطعہ اراضی دیا۔ وہ وہاں آباد ہوئے اور اپنے گاؤں کا نام انھوں نے "کرودیاں" رکھا۔ وہاں مسجد تعمیر کی اور اسلام کی تبلیغ کرنے لگے۔

سید مولا بخش اپنے اکابر کی روایت سے بیان کرتے ہیں کہ حاجی سید خضر الدین نہایت پارسا، بے حد فیاض اور صاحب کرامات بزرگ تھے۔ ان کے گاؤں کرودیاں میں کوئی چور چوری کر لیتا تو اندھا ہو جاتا اور مالِ مسروقہ لے کر گاؤں سے باہر نہ نکل سکتا۔ ان کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ چوروں نے وہاں چوری کی لیکن گاؤں سے نکل نہ سکے، ساری رات گلیوں میں چکر لگاتے رہے۔ صبح ہوئی تو چوری شدہ سامان سمیت پکڑے گئے۔ واللہ اعلم بالصواب

ولادت:

سید مولا بخش ۱۸۸۸ء کے لگ بھگ اپنے اسی آبائی گاؤں کرودیاں میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حاجی سید کرم نواز تھا۔ حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ اس خاندان میں اب تحصیلِ علم کا شوق نہیں رہا تھا۔ سب افراد کھیتی باڑی اور کاشت کاری وغیرہ میں مشغول ہو گئے تھے۔ بچے عموماً کھیتوں میں مال مویشی چرانے کا کام کرتے اور اسی میں مگن رہتے۔ بعض افراد البتہ حافظ محمد لکھوی کی کتابیں احوال الآخرت اور زینت الاسلام یا مولوی عبدالستار کی اکرام محمدی وغیرہ خوش الحانی سے پڑھنے کی کوشش کرتے اور سننے والے ان کے گرد جمع ہو جاتے۔ ان کے خاندان میں دو آدمی حافظ قرآن تھے۔ ایک ان کے چچا جن کا نام کرم علی تھا۔ وہ نابینا تھے اور انھیں قرآن مجید حفظ تھا۔ دوسرے ان کے بڑے بھائی محمد ابراہیم تھے، جنھیں اللہ تعالیٰ نے حفظ قرآن کی نعمت عطا فرمائی تھی۔ خود سید مولا بخش حصول علم کے لیے نہایت بے تاب تھے، لیکن انھیں اس کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ وہ نوجوانی کی حدوں کو چھو رہے تھے، مگر بے علم تھے اور دل میں اس کے حصول کی شدید خواہش رکھتے تھے۔

علم کے لیے گھر سے روانگی:

پھر ایک دن آیا کہ اس خواہش کو عملی صورت دینے کا فیصلہ کر لیا۔ دل میں یہ جذبہ شدت سے ابھرا کہ کسی نہ کسی طرح علم ضرور حاصل کرنا چاہیے، لیکن معاملہ یہ تھا کہ نہ کسی درس گاہ کا پتا تھا اور نہ کسی قصبے یا شہر کی راہ معلوم تھی۔ اب انھوں نے اپنی والدہ کے عطا کردہ بھنے ہوئے چنوں کے تھوڑے سے دانے صافے کے پلو میں باندھے، کسّی کندھے پر رکھی اور حسب معمول کھیتوں میں پہنچ گئے۔ پھر کسّی کھیت میں رکھی اور کسی کو بتائے بغیر انجانی راہوں پر روانہ ہو گئے۔ کچھ پتا نہیں کہ کدھر کا رخ ہے اور منزل کون سی ہے۔ زادِ راہ وہی بھنے ہوئے چنوں کے چند دانے ہیں۔ کوئی پیسا پلے نہیں، خالی ہاتھ اور خالی جیب، بالکل یہی حالت کہ ؎

پلے خرچ نہ بنھدے پنچھی تے درویش
جنھاں تقویٰ رب دا اونھاں رزق ہمیش

ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں اور دوسرے سے تیسرے گاؤں چلے جا رہے ہیں۔ بھوک نے بھی زور

باندھ رکھا ہے۔ مگر یہ کہیں ٹھہرتے ہیں اور نہ کسی سے روٹی کا ٹکڑا مانگتے ہیں۔ بالآخر ایک گاؤں کی مسجد میں جا رکے اور نمازیوں سے کہا کہ وہ انھیں مسجد کے طہارت خانوں کی صفائی اور نمازیوں کے وضو کے لیے پانی بھرنے کے لیے بطور خادم رکھ لیں۔ نمازیوں نے ان کے نام اور خاندان کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے اپنا تعارف کرایا۔ اس پر جواب ملا کہ ہمیں خادم کی ضرورت تو ہے لیکن آپ سید زادے ہیں اور ہم سید زادے سے یہ خدمت نہیں لے سکتے۔

لکھوکے میں تحصیلِ علم:

اب پھر وہاں سے چل پڑے اور روپڑ کے قریب موضع ''سنانا'' جا پہنچے۔ وہاں ایک عالم دین مولوی دین محمد رہتے تھے، ان سے دینیات کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اسی دوران میں موضع ملک پور کے مولوی عبدالجبار سے کچھ کسب فیض کیا۔ وہاں ایک فائدہ یہ ہوا کہ گردو پیش کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوئیں اور یہ بھی پتا چلا کہ ضلع فیروز پور کے ایک گاؤں لکھوکے میں ایک مدرسہ جاری ہے، جس میں بہت بڑے عالم مولانا عطاء اللہ لکھوی طلبا کو تعلیم دیتے ہیں۔ اب یہ موضع ''سنانا'' سے نکلے اور چلتے پھرتے کسی نہ کسی طرح لکھوکے جا پہنچے۔ وہاں انھیں داخل تو کر لیا گیا اور تعلیم کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا لیکن کھانے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ یہ طلبا کے بچے کھچے ٹکڑے اکٹھے کرتے اور پانی میں بھگو کر ان سے اپنی بھوک مٹاتے اور استاد سے علمی پیاس بجھاتے۔ چونکہ علم کے لیے گھر سے بھاگے تھے لہٰذا اس صورت حال سے ہم آہنگی پیدا کر لی تھی اور دونوں طرف سے صلح و صفائی کے ساتھ معاملہ چل رہا تھا۔ [1]

اب تک گھر والوں کو کچھ علم نہ تھا کہ ہمارا بیٹا کہاں ہے اور کس طرف چلا گیا ہے۔ انھوں نے ان کو بہت تلاش کیا اور اپنے ملنے والوں اور رشتے داروں سے جو مختلف مقامات میں سکونت پذیر تھے، خود جا کر یا کسی ذریعے سے رابطہ کیا لیکن بیٹے کا کچھ پتا نہ چل سکا۔ ظاہر ہے ان کے لیے یہ سخت پریشانی کی بات تھی۔ اب وہ مایوس ہو گئے تھے اور معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا تھا۔ ایک عرصے کے بعد ان کے گاؤں میں ایک کپڑا بیچنے والا گیا، اس سے ان کے والد نے بات کی اور بیٹے کا حلیہ بتایا تو اس نے کہا کہ تمھارا بیٹا میں نے ضلع فیروز پور کے گاؤں لکھوکے میں دیکھا ہے۔ والد صاحب وہاں پہنچے تو مسجد میں بیٹے سے ملاقات ہوئی، جہاں وہ طلب علم میں مصروف تھا۔

والد نے بیٹے کو گھر جانے کے لیے کہا اور فرماں بردار بیٹا باپ کے ساتھ چل پڑا۔ لیکن اس طرح تعلیم

---

[1] لکھوکے کا مدرسہ پنجاب کا قدیم ترین مدرسہ تھا جو ۱۷۰۲ء کے لگ بھگ حافظ بارک اللہ لکھوی مرحوم کے والد محترم حافظ احمد نے محدود سے پیمانے پر جاری کیا تھا۔ بعد ازاں اس مدرسے نے بڑی شہرت پائی اور بے شمار مشہور علما نے یہاں تعلیم حاصل کی۔

چھوڑ کر جانے کا انھیں سخت افسوس تھا۔ باپ آگے آگے جا رہا تھا اور بیٹا ان کے پیچھے چل رہا تھا۔ تھوڑی دور جا کر باپ نے پیچھے کو دیکھا تو بیٹے کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ پوچھا: "مولیا روندا کیوں ایں؟" (مولا بخش تم کیوں رو رہے ہو؟)

جواب دیا: علم حاصل کرنے کے لیے گھر سے بھاگا تھا۔ لیکن تعلیم مکمل نہیں ہوئی اور آپ واپس لے جا رہے ہیں۔ اس کا مجھے افسوس ہے اور یہی رونے کی وجہ ہے۔

بیٹے کی یہ بات سن کر والد کو ترس آ گیا اور کہا اچھا جاؤ جو کچھ پڑھنا چاہتے ہو پڑھ لو...... یہ کہہ کر والد اپنے گھر کو روانہ ہو گئے اور مولا بخش واپس لکھنو کے آ گئے۔

صحیح بخاری پڑھنے کا قصہ:

لکھنو کے میں انھوں نے وہاں کے نصاب کے مطابق تفسیر قرآن بھی پڑھی، حدیث کی کتابیں بھی پڑھیں، فقہ، اصول فقہ اور صرف ونحو کی کتابیں بھی پڑھیں۔ دیگر علوم کی نصابی کتابیں بھی مکمل کیں۔ اس سے آگے خود انہی کے الفاظ پڑھیے۔ فرماتے ہیں:

"اب اصح الکتب بعد کتاب اللہ یعنی صحیح بخاری پڑھنا تھی۔ دل میں خیال آیا کہ استاذ محترم مولانا عطاء اللہ لکھوی منطق، فلسفہ، صرف ونحو کے بلند پایہ استاذ ہیں۔ ان کے درس میں طویل فلسفیانہ بحثیں چل نکلتی ہیں تو انہی پر وقت صرف ہو جاتا ہے، کیوں کہ وہ ان علوم کے بحرِ بے کنار تھے، میرا مزاج ان مباحث کو قبول نہیں کرتا تھا۔ معاملہ صحیح بخاری کی تدریس کا تھا۔ دل میں سوچ پیدا ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کوئی ایسا استاد دے جو رسول اللہ ﷺ کی حدیث کو حدیث ہی کی روشنی میں پڑھائے۔ وہ صاحبِ دل اور صاحبِ سلوک بھی ہو اور اس کی تدریس میں منطق و فلسفہ کی آمیزش نہ ہو۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے میں نے آیت کریمہ کا وظیفہ کیا...... غالباً دس روز یا کچھ زیادہ میں سوا لاکھ مرتبہ آیت کریمہ پڑھ لی۔ جوں ہی میرا وِرد مکمل ہوا مجھے رات سوتے میں کسی نے بتایا کہ تیرے استاذ کا نام عبداللہ ہے۔ اس سے اگلی صبح یا ایک دو دن بعد کھیاں والی کے شیخ الحدیث مولانا عبداللہ لکھو کے تشریف لائے۔ طلبا سے پوچھا: مولا بخش کون ہے؟ جب میرے ساتھ ملاقات ہوئی تو فرمایا: مولا بخش تو میرے ساتھ چل، میرا بھائی (غالبا عبدالرحمٰن نام تھا) اس سال صحیح بخاری پڑھے گا، وہ اکیلا ہے۔ تم دونوں مجھ سے صحیح بخاری پڑھو۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول فرمائی۔ میرے استاد مجھے لینے کے لیے خود تشریف لائے۔ پھر انھوں نے اس قدر شفقت اور محبت سے حدیث پڑھائی کہ میری زندگی کا وہ

قابلِ رشک سال تھا۔'' ❶

سید محبوب شاہ کی بیعت اور وظائف:

سید مولا بخش صحیح النسب سید تھے اور نہایت نیک اور صالح فطرت......! زندگی کے ابتدائی دور ہی سے انھیں عمل خیر سے رغبت تھی، لیکن ماحول ایسا تھا کہ اس راہ پر چلنے کی بہ ظاہر کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ جب وہ لکھو کے پہنچے تو وہاں نیا ماحول میسر آیا اور واقعات کا دھارا بالکل بدل گیا۔ اب ان کے ذہن میں مزید بیداری پیدا ہوئی اور خیال آیا کہ علم کے ساتھ عمل بھی ضروری ہے اور روحانی قوت کا ارتقا بھی بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے لیے کسی مردِ کامل کے حلقۂ بیعت میں داخل ہونا چاہیے۔ ان دنوں ضلع فیروز پور کے ایک مقام موضع ''مکھو'' میں ایک زاہد و عابد بزرگ سید محبوب شاہ بخاری سکونت پذیر تھے جو مشہور واعظ اور مناظر بھی تھے۔ وہ اتفاق سے لکھو کے تشریف لائے۔ انھوں نے فجر کی نماز پڑھائی تو یہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ حضرت! میں آپ کی صحبت کا طالب ہوں۔

فرمایا: مجھے تم اپنا نام بتا دو، میں خود ہی تمھیں مل لوں گا......انھوں نے نام بتایا اور اسباق میں مصروف ہو گئے۔ ادھر دو اڑھائی گھنٹے کے بعد سید محبوب شاہ اپنے معمول کے وظائف سے فارغ ہوئے تو پوچھا: مولا بخش کون ہے؟

یہ فوراً حاضر ہو گئے۔

فرمایا: بتاؤ تمھارا کیا مقصد ہے؟

عرض کیا میرا مقصد صرف پاکیزگی قلب اور اصلاح باطن ہے۔

انھوں نے ان کو دیکھا اور حلقۂ بیعت میں لے لیا۔ فرمایا: صبح پانچ ہزار مرتبہ لا الہ الا اللہ پڑھا کرو اور شام کو بارہ ہزار مرتبہ اللہ اللہ کا ورد کیا کرو۔ یہ عمل مسلسل پانچ مہینے کرنا چاہیے۔

سید مولا بخش بیان کرتے ہیں کہ مرشد کی ہدایت کے مطابق میں نے یہ عمل نہایت شوق اور یقین کے ساتھ کیا۔ اس اثنا میں بہت سی قلبی وارادات ہوئیں اور بے شمار چیزیں ظہور میں آئیں۔ لیکن میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا تا کہ دل میں کوئی تعلّی یا غرور پیدا نہ ہو۔

ایک بہت بڑے سانپ کے بارے میں:

ان کے سوانح نگار بیان کرتے ہیں کہ وہ اپنے روحانی واقعات کسی کو نہیں بتاتے تھے، لیکن کسی واقعہ کے بتانے سے کوئی دینی فائدہ مدِ نظر ہوتا تو بتا بھی دیتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ اس وظیفے کی برکات کا ذکر کرتے

---

❶ جدی و مرشدی سید مولا بخش صفحہ ۲۵، ۲۶.

ہوئے فرمایا کہ ایک دن میں گاؤں سے باہر ایک راستے سے گزر رہا تھا۔ رات کا اندھیرا چھا چکا تھا۔ دیکھا کہ سامنے ایک بہت بڑا سانپ راہ روکے کھڑا ہے۔ سانپ کیا تھا ایک بڑی بلا تھی۔ اتنا بڑا سانپ نہ کبھی پہلے دیکھا تھا، نہ اس کے بعد دیکھا۔ اسے دیکھ کر جب میں نے اپنا ورد شروع کیا تو معلوم نہیں کس چیز نے مجھے اٹھایا اور اس سے دوسری طرف لا کھڑا کیا۔ میں اللہ کی حفاظت میں اپنے راستے پر چلنے لگا۔ من کان للہ کان اللہ لہ۔

تحصیل علم کے بعد:

کھپیاں والی ایک مشہور قصبہ تھا جو تحصیل مکتسر ضلع فیروز پور میں واقع تھا۔ اس میں نصرۃ الاسلام کے نام سے ایک مدرسہ حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کے شاگرد رشید مولانا عبداللہ صاحب نے جاری فرمایا تھا۔ یہ مدرسہ اگست ۱۹۴۷ء تک جاری رہا اور اس میں بے شمار علما و طلبا نے تحصیل علم کی۔ مولانا ممدوح کو قیام پاکستان کے زمانے میں اگست ۱۹۴۷ء میں سکھوں نے شہید کر دیا تھا۔ ان کے بھائی بھی جو عالم دین تھے، جام شہادت نوش کر گئے تھے۔ لیکن ان کا کتب خانہ جو ایک علم دوست فوجی کے علم میں آیا کھپیاں والی سے مولانا کے بیٹے حافظ عبدالمنان کے پاس ساہی وال پہنچ گیا تھا۔ یہ کتب خانہ اب مولانا محمد یوسف کے دار الحدیث راجووال میں محفوظ ہے اور اصحابِ علم اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ سید مولا بخش مرحوم و مغفور نے انہی مولانا عبداللہ صاحب سے سندِ فراغ لی اور پھر اپنے آبائی گاؤں کرودیاں چلے گئے۔

ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ جو کچھ پڑھا ہے اس پر خود بھی عمل کیا جائے اور لوگوں کو بھی اس پر عمل کرنے کی تبلیغ کی جائے اور تبلیغ کا سلسلہ قرآن کے حکم ﴿وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾ کے مطابق گھر سے اور قریبی رشتے داروں سے شروع کیا جائے۔ [1]

سید مولا بخش نے اس حکم خداوندی پر عمل کیا اور اپنی برادری اور دوسرے لوگوں کو قرآن و حدیث کے احکام سنانا شروع کیے اور ان پر عمل کی تلقین کی، وہ نمازِ فجر کے بعد قرآن مجید کا درس دیتے تھے۔ ان کا انداز بیان بالکل سادہ اور عام فہم تھا۔ دیہاتی لوگوں کی سمجھ کے مطابق آسان زبان میں بات کرتے اور خلاف شرع رسوم و رواج کے ارتکاب سے روکتے۔ یہ رسوم و رواج چوں کہ طویل عرصے سے ان میں رائج تھیں اور وہ انھیں صحیح سمجھتے تھے، لہٰذا انھیں ترک کرنا ان کے لیے مشکل تھا۔ ابتدا میں انھوں نے اس معاملے میں سید صاحب ممدوح کی مخالفت کی اور اپنے عمل کو مبنی بر صحت قرار دیا لیکن آہستہ آہستہ معاملات ٹھیک ہو گئے اور وہ

[1] یہ سورہ شعراء کی آیت نمبر ۲۱۴ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر ﷺ اپنے قریبی رشتے داروں کو وعظ و نصیحت کے ذریعے اللہ سے ڈراؤ۔

سید صاحب کی شب و روز کی تبلیغ سے بے حد متاثر ہوئے۔ سید صاحب تبلیغ کے لیے اردگرد کے دیہات میں بھی جاتے اور دیہات کے لوگ غور سے ان کی بات سنتے اور اس سے اثر پذیر ہوتے۔

سید مولا بخش کوم کلاں میں:

ضلع لدھیانہ کے قصبہ کوم کلاں میں طویل مدت سے راجپوت برادری کے لوگ آباد تھے اور ان میں اس دور اور علاقے کے مشہور علمائے کرام بھی شامل تھے۔ ایک عالم دین وہاں مولانا علاء الدین گزرے ہیں جن کا دائرۂ علم بہت وسیع تھا اور عیسائیوں سے ان کے مناظروں کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ اس عہد کے ہندوستان میں ایک پادری فنڈر کا نام بہت چلتا تھا۔ ان کے مناظروں کی بڑی شہرت تھی۔ مولانا علاء الدین نے ان کے ساتھ بھی مناظرے کیے اور کامیاب رہے۔ مولانا علاء الدین درحقیقت جہلم سے تعلق رکھتے تھے، پھر خطابت و امامت کے لیے کوم چلے گئے تھے۔ مولانا علاء الدین کے تین بیٹے تھے مولانا عبدالعزیز، عبدالرحیم اور عبدالحمید۔ یہ خاندان اچھی خاصی زمینوں اور جائدادوں کا مالک تھا اور لوگوں پر ان کا بہت اثر تھا۔ مولانا عبدالعزیز سابق ریاست پٹیالہ میں امور شرعیہ کے جج تھے۔ پٹیالہ میں دیگر لوگوں کے علاوہ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری نے بھی ان سے استفادہ کیا تھا۔ بہرکیف یہاں عرض یہ کرنا مقصود ہے کہ کوم کلاں میں ایک دینی مدرسہ جس کا نام دار الحدیث تھا بہت مدت سے جاری تھا۔ اس مدرسے کے لیے ایک لائق مدرس کی ضرورت تھی۔ اس کے مہتمم مولانا ضیاء الدین کو موضع کٹالا کے مولانا محمد یعقوب نے بتایا کہ موضع کرودیاں کے سید مولا بخش بہت اچھے مدرس بھی ہیں اور صالحیت میں بھی ان کا ایک مقام ہے۔ چنانچہ مولانا ضیاء الدین نے سید صاحب ممدوح سے رابطہ پیدا کیا اور وہ انھیں کوم کلاں لے گئے۔ یہ ۱۹۲۰ء کی بات ہے۔ پندرہ روپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی، جو اس انتہائی سستے زمانے میں معقول تنخواہ تھی۔

کچھ عرصہ تنخواہ کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد مدرسے کا پورا اہتمام و انتظام سید صاحب کے سپرد کر دیا گیا۔ تنخواہ کا معاملہ ختم ہوا۔ البتہ مسجد کی وقف زمین ان کے سپرد کر دی گئی، جس سے ہر قسم کے اخراجات کی ذمہ داری سید صاحب خود ہی نبھاتے رہے۔ اب ان کی نسبت کوم کی طرف ہوگئی تھی اور لوگ انھیں سید مولا بخش کوموی کہنے لگے تھے۔

سلسلۂ تدریس:

تدریس ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ اس دور کے تمام دینی مدارس کے مدرسین کی طرح وہ صرف نحو کی کتابیں بھی پڑھاتے تھے، عربی ادبیات کی تعلیم بھی وہی دیتے تھے اور تفسیر و حدیث کی کتابوں کی تدریس بھی انھی کے فرائض میں شامل تھی۔ یعنی ہر موضوع کی کتابیں ایک ہی مدرس پڑھاتا تھا۔ سید صاحب نے علم صرف

کی ابتدائی کتاب صرف بہائی سے لے کر شافیہ تک، علم نحو کی نحو میر سے لے کر کافیہ اور شرح جامی تک، حدیث کی بلوغ المرام سے لے کر صحیح بخاری تک، تمام کتابیں کئی کئی مرتبہ طلبا کو پڑھائیں۔ پھر مسجد کی امامت و خطابت بھی انہی کے ذمے تھی اور نماز فجر کے بعد وہ قرآن مجید کا درس بھی دیتے تھے۔ بسا اوقات دیہات میں وعظ وتبلیغ کے لیے بھی جاتے تھے۔ وہ کتنے عظیم لوگ تھے جو یہ تمام کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے۔ اللہ نے ان کو ہمت عطا فرمائی تھی اور دینی کاموں میں پیش پیش رہنا وہ اپنی زندگی کا اہم فریضہ قرار دیتے تھے۔ انتہائی مخلص اور نہایت پرعزم لوگ۔!

معمولاتِ تدریس:

ان کی تدریس کے معمولات یہ تھے کہ فجر کی نماز پڑھانے کے بعد مسندِ درس پر بیٹھ جاتے۔ پہلے قرآن کا درس دیتے۔ پھر مدرسے کا تدریسی عمل شروع ہو جاتا جو دوپہر تک جاری رہتا۔ کھانے کے تھوڑی دیر بعد ظہر کی نماز کا وقت ہو جاتا اور پھر نماز کے بعد عصر تک طلبا کو مختلف موضوع کی کتابیں پڑھائی جاتیں۔ عصر سے مغرب تک چھٹی۔ مغرب کے بعد کھانا اور پھر عشا تک دوسرے دن پڑھائے جانے والے اسباق کا مطالعہ جو نمازِ عشا کے بعد بھی کافی دیر جاری رہتا۔

یہ ہر روز کا معمول تھا۔ طلبا بھی اس پر عامل تھے اور اساتذہ بھی باقاعدگی سے یہ سلسلہ جاری رکھتے تھے۔ اساتذہ اس باب میں طلبا کی نگرانی بھی کرتے تھے۔

سید صاحب کا ایک اور معمول:

سید صاحب ممدوح کا ایک اور معمول یہ تھا کہ سال میں ایک یا دو مہینے کے لیے طلبا کو کوم سے اپنے گاؤں کرودیاں لے جاتے۔ بیل گاڑی پر ان کی کتابیں اور سامان لایا جاتا اور طلبا مسجد میں ڈیرے ڈال لیتے۔ وہاں ان کی پڑھائی بھی جاری رہتی اور روزانہ وعظ وتقریر کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ طلبا کی تعداد ستر اور اسی کے درمیان ہوتی تھی۔ لوگ طلبا کی روزانہ دعوت کرتے اور ان کی تقریریں سنتے۔ تقریریں سننے کے لیے اردگرد کے دیہات کے لوگ بھی آ جاتے۔ مقرر پنجابی میں سامعین کی سمجھ کے مطابق تقریر کرتا۔ خواتین بھی کسی قریب کے مکان میں بیٹھ کر تقریریں سنتیں اور ان سے اثر پذیر ہو کر اپنے بچوں کو اس راہ پر لگانے کی کوشش کرتیں۔

سید صاحب طلبا کے نہایت شیریں زبان استاد تھے۔ وہ ہر مقرر کی تقریر بڑے غور سے سنتے اور اس کی حوصلہ افزائی کرتے۔ اگر کسی کی تقریر میں کوئی کمی ہوتی تو فرماتے تم نے اچھے انداز میں بات کی ہے، بس ذرہ مطالعہ کی مزید ضرورت ہے۔ تقریر میں قرآن کی آیات اور احادیث زیادہ پڑھا کرو تاکہ لوگوں پر تقریر کا زیادہ

اثر پڑے۔

ایک عبرت ناک واقعہ:

سید صاحب نہایت نرم خو اور بے حد متواضع و منکسر تھے۔ نرمی سے بات کرتے اور میٹھے الفاظ میں سمجھانے کی کوشش کرتے۔ اگر کتاب و سنت پر مبنی کوئی ان کی بات نہ مانتا تو اس سے تعلق نہ رکھتے۔ جس زمانے میں وہ کوم تشریف لے گئے تھے۔ اس زمانے میں وہاں ایک جعلی پیر سالانہ میلہ لگایا کرتا تھا، جس میں بھانڈ اور گوّیے آتے اور غیر شرعی اور غیر اخلاقی حرکات کا ارتکاب کرتے۔ سید صاحب نے اسے منع کیا لیکن وہ اپنی حرکات سے باز نہ آیا۔ اگلے سال اس کا میلہ ہوا تو سیّد صاحب طلبا کو لے کر وہاں پہنچ گئے اور میلہ اکھاڑ دیا۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر ایک نوجوان میلے کے شرکا کو اپنے ڈیرے پر لے گیا اور کہا میں اپنے گھر میں میلہ لگاتا ہوں، دیکھوں گا کہ مجھے کون روکتا ہے۔ اس نے تکبر اور رعونت کے ساتھ میلہ کرایا۔ سید صاحب نے اس متکبر اور سرکش کی گرفت کے لیے اللہ کے دربار میں ہاتھ اٹھائے۔ سید صاحب کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ ''لوگوں کا عینی مشاہدہ ہے کہ اس کے پاؤں کے انگوٹھے سے درد اٹھا اور بڑھتا اور چڑھتا ہوا ٹانگ میں آیا۔ جب پیٹ تک پہنچا تو وہ اپنے انجام کو پہنچ گیا۔'' اس کے بعد یہ میلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

سوانح نگار سید عبدالخالق شاہ لکھتے ہیں:

''یہ واقعہ کوم سے ملحق گوجر برادری کے گاؤں کھبایت میں رہنے والے عمر رسیدہ افراد نے سنایا جو خود اس میلے میں شرکت کیا کرتے تھے۔'' ❶

پاکستان کو روانگی:

قیامِ پاکستان کے وقت سید مولا بخش کی برادری کے لوگ تین مقامات میں مقیم تھے۔ خود سید صاحب کوم میں خدمتِ تدریس انجام دیتے تھے۔ ان کی اہلیہ بھی وہیں تھیں۔ ان کے داماد سید محمد شاہ موضع کٹالا میں ان کے حکم کے مطابق خطابت و امامت کا فریضہ انجام دے رہے تھے اور باقی اکثر لوگ اپنے آبائی گاؤں کرودیاں میں تھے۔ جو لوگ جہاں تھے، وہیں سے قافلوں کے ساتھ پاکستان کو روانہ ہو گئے۔ ایک دوسرے کا کسی کو کوئی علم نہ تھا۔ سید صاحب نے ایک ٹرنک میں کچھ کتابیں ڈالیں، اسے سائیکل پر رکھا اور قافلے کے ساتھ چل پڑے، اور کوئی چیز نہیں لی۔ ان کے داماد سید محمد شاہ صاحب نے بھی اسی طرح کیا، کتابیں ٹرنک میں ڈال کر سائیکل پکڑا اور وہاں کے لوگوں کے ساتھ نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ اسی طرح ان کے گاؤں کرودیاں کے لوگوں نے کیا۔ نفسانفسی کے عالم میں کسی کو کسی کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ چلتے چلتے

❶ جدّی و مرشدی: ص ۴۳

لاہور پہنچے تو کچھ لوگوں کی ایک دوسرے سے ملاقات ہوئی۔

سید محمود میں قیام:

لاہور سے ٹوبہ ٹیک سنگھ آئے جو اس وقت ضلع لائل پور کی تحصیل تھا، اب اسے کئی سال سے مستقل ضلع کی حیثیت حاصل ہے۔ وہاں کے ایک گاؤں چک ۲۹۲ ج ب سید محمود میں زمین الاٹ کرائی اور آباد ہو گئے۔ ان کی برادری کے بعض اور لوگ بھی وہاں آ بسے۔ وہیں ان کے داماد سید محمد شاہ کی سکونت تھی، افسوس ہے، وہ جلد ہی وفات پا گئے۔ سید صاحب کو ان کی وفات سے بے حد صدمہ پہنچا، اس لیے کہ وہ ان کے پڑھے لکھے داماد تھے اور ہر معاملے میں ان کے بہت بڑے مشیر۔

شاگردوں اور طالب علموں کی آمد:

جیسے ہی ان کے پرانے شاگردوں کو (جو پاکستان آ گئے تھے) پتا چلا کہ ان کے استاد مکرم چک ۲۹۲ ج ب سید محمود تشریف لے آئے ہیں، وہ حصول تعلیم کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ وہ ان کے طریق تعلیم سے بہت متاثر تھے، لیکن یہاں کسی قسم کا کوئی انتظام نہ تھا۔ نہ کتابیں، نہ مسجد، نہ رہائش کے لیے کوئی مکان، نہ کھانے کی کوئی صورت۔ سب لوگ خالی ہاتھ اور تہی جیب۔ جو طالب علم ان کی خدمت میں آتا، اسے صوفی عبداللہ مرحوم کے جاری کردہ دار العلوم تعلیم الاسلام میں اوڈاں والا بھیج دیتے۔ یہ دار العلوم تقریباً ۱۹۲۲ء سے قائم تھا اور اس کا تدریسی نظام بہت اچھا تھا۔

تلاوتِ قرآن:

سید صاحب موصوف قرآن مجید کی روزانہ تلاوت کرتے۔ گھر میں بھی اور کھیت جاتے ہوئے بھی۔ بسا اوقات کوئی تفسیر ساتھ لے جاتے اور قرآن کی تلاوت کے علاوہ تفسیر کا مطالعہ بھی فرماتے۔ ایک ایک سپارہ تین تین مرتبہ پڑھتے۔ پہلی مرتبہ دل میں پڑھتے، دوسری مرتبہ تفسیر وحواشی پر نظر ڈالتے جاتے اور تیسری مرتبہ قدرے اونچی آواز سے تلاوت فرماتے۔ قرآن مجید سے انھیں انتہائی لگاؤ تھا اور اس کتابِ ہدیٰ کی تلاوت وہ بڑے غور اور شوق سے کرتے تھے۔ بہت کم لوگ ہوں گے جنھیں اس انداز سے قرآن پڑھنے کی عادت ہو گی۔ اس طرح روزانہ قرآن پڑھنے سے پورے قرآن کے مضامین ذہن میں راسخ ہو جاتے ہیں۔

صحیح بخاری کا سالانہ دور:

سید مولا بخش مطالعہ حدیث کا بھی پورا التزام کرتے اور مختلف اوقات میں صحاح کی کتابیں پڑھتے رہتے۔ بالخصوص صحیح بخاری روزانہ پڑھتے۔ شروع سے لے کر آخر تک ایک سال میں یہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ ختم ہو جاتی۔ کیسا موسم ہوتا، کیسے حالات ہوتے، ان کا یہ بابرکت سلسلہ ہر صورت میں ہر روز جاری رہتا

اور ہر سال صحیح بخاری کا ایک دور ہو جاتا۔

حج بیت اللہ:

قیام پاکستان سے پہلے انھوں نے دو مرتبہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی تھی۔ پہلی مرتبہ اکیلے حج کیا۔ دوسری مرتبہ اپنے والد گرامی کو بھی ساتھ لے گئے۔ وہ نابینا تھے۔ حج کے دوران سفر میں والد کی بڑی خدمت کی۔ اس وقت جدہ سے مکہ مکرمہ تک اور مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ تک اونٹوں پر سفر کیا جاتا تھا اور کئی کئی دن میں یہ سفر طے ہوتا تھا۔ ان کے سوانح نگار بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے سعودی عرب کے فرماں روا شاہ عبدالعزیز (ابن سعود) کو عام لوگوں میں بیت اللہ کا طواف کرتے دیکھا۔ وہ دراز قامت اور مضبوط جسم کے شخص تھے۔ ان کے لیے بیت اللہ کا دروازہ کھولا گیا تو سید صاحب بھی ان کے ساتھ بیت اللہ شریف میں داخل ہو گئے۔ وہاں نوافل ادا کیے اور کافی دیر بیٹھے رہے۔ کسی نے ان کو بیت اللہ سے باہر نہیں نکالا، خود ہی باہر نکلے۔ ایک دفعہ پھر انھیں بیت اللہ میں داخل ہونے اور وہاں نوافل پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔

قیام پاکستان کے بعد بھی وہ اور ان کی اہلیہ حج و عمرے کی سعادت سے بہرہ مند ہوئے۔ ان کی اہلیہ گھر میں چرخہ کاتتیں اور اپنے کام خود ہی کرتی تھیں۔ بھینسوں کو چارہ ڈالتیں اور نہایت سادہ زندگی بسر کرتیں۔ اسراف اور فضول خرچی کا کوئی تصور نہ تھا۔ نہ کھانے پینے میں نہ لباس میں۔

صبح کا معمول:

فجر کی سنتیں گھر میں پڑھ کر مسجد تشریف لے جاتے۔ کبھی مسجد میں جا کر سنتیں پڑھتے۔ امام کی غیر موجودگی میں کبھی فجر کی جماعت کراتے تو قراءت مختصر کرتے۔ نماز کے بعد اکثر درس قرآن دیتے۔ اپنے پرانے ہم عمروں کے ساتھ ہلکی پھلکی مزاحیہ گفتگو بھی ہو جاتی۔ طلوع آفتاب سے پہلے گھر آ جاتے اور چائے کے ساتھ رات کی باسی روٹی کھاتے۔ سردیوں میں عموماً چائے کے ساتھ مکئی کی روٹی تناول فرماتے۔ پھر کچھ پڑھ پڑھا کر اپنی زمین پر چلے جاتے۔

دوپہر کا کھانا کبھی گھر آ کر کھاتے، کبھی وہیں منگوا لیتے۔

مہمانوں کی آمد و رفت:

ان سے میل ملاقات کے لیے عام لوگ بھی آتے اور علمائے کرام بھی تشریف لاتے۔ تعویذ وغیرہ لینے والوں کی آمد و رفت بھی رہتی۔ علمائے کرام میں مولانا عبداللہ ویرووالوی، حکیم عبدالرحیم اشرف، مولانا عبداللہ لائل پوری جھال والے، حافظ عبداللہ بڈھیمالوی، دارالعلوم تعلیم الاسلام اوڈاں والا کے مدرسین اور دیگر بہت سے حضرات تشریف لاتے۔ مولانا محمد اسحاق چیمہ تو اکثر ان کی خدمت میں جاتے، وہ انھیں پیر صاحب کہا

کرتے تھے۔ ان کے ہاتھ پر انھوں نے بیعت بھی کی تھی۔ ایک مرتبہ سید ابوبکر غزنوی بھی تشریف لے گئے تھے۔ سید ابوبکر غزنوی صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا: آپ داڑھی رکھ لیں۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: حضرت داڑھی تو میں نے رکھی ہے، آپ یہ فرمایے کہ داڑھی بڑھالو۔

سلسلۂ تدریس:

سید مولا بخش صاحب نے محدود سے پیمانے پر سلسلۂ تدریس بھی شروع کر دیا تھا۔ مختلف مقامات سے طالبانِ علم آتے اور ان سے کتب حدیث پڑھتے۔ لیکن ان میں سے وہاں کوئی طالب علم قیام نہیں کرتا تھا۔ پڑھنے کے بعد سب واپس اپنے ٹھکانوں پر چلے جاتے۔ ان طلبا میں سید عبدالشکور شاہ صاحب کا اسمِ گرامی بھی شامل ہے۔ وہ اپنے گاؤں بیریاں والا سے روزانہ آتے تھے۔ شاہ صاحب مشہور عالم اور مدرس تھے۔ کئی سال ستیانہ کے مرکز الدعوۃ السّلفیہ میں ان کا سلسلۂ تدریس جاری رہا تھا۔ پھر یہ سلسلۂ تدریس سرگودھا چلے گئے تھے۔ ۲۹۔ اگست ۲۰۱۲ء کو وفات پائی اور چک نمبر ۳۶ گ ب میں دفن کیے گئے۔

اوراد و وظائف:

سید مولا بخش مرحوم و مغفور کے سوانح نگار سید عبدالخالق نے ان کے روزانہ کے اوراد و وظائف بھی بیان کیے ہیں اور بتایا ہے کہ کیا کچھ کتنی دفعہ پڑھتے تھے۔ لکھتے ہیں:

☆...... لا الـه الا الـلـه وحـده لا شريك له له الملك و له الحمد و هو على كل شيء قدير فجر اور مغرب کی نماز کے بعد روزانہ سو سو مرتبہ۔

☆...... سبـحـان الـلـه و الحمد لله و لا اله الا الله و الله اكبر و لا حول و لا قوة الا بالله العلى العظيم گیارہ سو مرتبہ روزانہ

☆...... درود شریف ہر روز کثیر تعداد میں

☆...... استغفار کی کثرت بالخصوص سید الاستغفار جس کے الفاظ یہ ہیں: اللهم انت ربى لا اله الا انت خلقتنى و انا عبدك و انا على عهدك و وعدك ما استطعت و اعوذبك من شر ما صنعت ابوء لك بنعمتك على و ابوء بذنبى فاغفرلى فانه لا يغفر الذنوب الا انت .

☆...... سبحان الله و بحمده سبحان الله العظيم .

☆...... يـا حـى يـا قيوم برحمتك استغيث...... فلا تقلنى الى نفسى طرفة عين و اصلح لى شأنى كله لا اله الا انت .

☆...... سورہ اخلاص دو سو مرتبہ روزانہ۔

نبی ﷺ کی زیارت:

سید عبدالخالق لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت سید صاحب نے تحدیثِ نعمت اور ترغیب عمل کے لیے بیان کیا کہ:

''ایک رات مجھے رسول اللہ ﷺ کی زیارت ہوئی تو حضور ﷺ نے فرمایا مولا بخش قرآن سناؤ۔ میں نے سورہ اخلاص پوری سنائی تو حضور ﷺ نے فرمایا: ہاں ٹھیک ہے ہم بھی اسی طرح پڑھتے ہیں۔ اس دن سے آج تک میرا معمول ہے کہ دو سو دفعہ روزانہ سورہ اخلاص پڑھتا ہوں۔''

مزید لکھتے ہیں کہ سید صاحب نے فرمایا:

''ایک رات مجھے نبی ﷺ کی زیارت ہوئی۔ آپ نے فرمایا کیا چاہتا ہے؟ میں نے عرض کیا حضور! قلبی طہارت اور پاکیزگی میرا مطلوب ہے۔ نبی ﷺ نے میرے چہرے سے لے کر سینے تک بابرکت ہاتھ پھیرا اور فرمایا دل تو صاف ہے۔'' [1]

کرامات:

سید مولا بخش صاحب سے ملنے والے ان کی بہت سی کرامتیں بیان کرتے ہیں۔ خود سید صاحب کا یہ فرمان بھی ان کی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ جب وہ سید محبوب صاحب کا تلقین فرمودہ وظیفہ لا الہ الا اللہ شام کے وقت بارہ ہزار مرتبہ پڑھا کرتے تھے، اس دوران بہت سے مکاشفات اور قلبی واردات حاصل ہوئیں اور بہت سی خرقِ عادت یعنی کرامات کا ظہور ہوا، لیکن وہ ایسی باتوں کو مخفی رکھا کرتے تھے۔ اگر اظہار میں کوئی دینی فائدہ ہوتا تو اظہار بھی کر دیتے۔ لیکن مصنف نے کسی کی بیان کردہ کرامات کتاب میں لکھی نہیں۔

بیعت:

سید صاحب کی خدمت میں لوگ بیعت کے لیے بھی حاضر ہوتے تھے، جن میں اس عہد کے مشہور علمائے کرام کے نام بھی آتے ہیں، لیکن وہ حتی الامکان علما کو اپنے حلقۂ بیعت میں نہیں لیتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا محمد اسحاق چیمہ حاضر خدمت ہوئے اور کہا کہ میں آپ کی بیعت کرنا چاہتا ہوں۔ فرمایا: آپ اتنے بڑے عالم ہیں، میں ایک فقیر آدمی ہوں، آپ کی بیعت کیوں کر لے سکتا ہوں۔ غرض انھوں نے چیمہ صاحب کو ٹالنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن جب چیمہ صاحب نے زیادہ اصرار کیا تو فرمایا آپ آج واپس چلے جائیں۔ تین دن استخارہ کریں۔ اگر تین روزہ استخارے کے بعد آپ کا قلبی رجحان بیعت کی طرف ہو تو آ جائیں۔ چنانچہ تین دن کے بعد چیمہ صاحب آئے اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔

[1] سید و مرشدی: ص ۱۱۱

سید صاحب کے اساتذہ:

اپنی دانست میں ہم نے گزشتہ صفحات میں سید صاحب کی حیاتِ مبارکہ کے بہت سے ضروری واقعات بیان کر دیے ہیں۔ اب اس اہم شخصیت کے اساتذہ کرام کے اسمائے گرامی سے مطلع ہونا ضروری ہے۔ اساتذہ کی تعداد بہت کم ہے۔ صرف پانچ۔

جب وہ حصولِ علم کے لیے گھر سے بھاگ کر سنانا پہنچے تو وہاں مولوی دین محمد طلبا کو تعلیم دیتے تھے، سید صاحب ان کے حلقۂ شاگردی میں شامل ہوئے۔ یہ ان کے پہلے استاذ تھے۔

وہیں ایک اور بزرگ مولانا عبدالجبار ملک پوری سے بھی کسبِ فیض کیا۔ یہ ان کے دوسرے استاد ہوئے۔

سنانا سے لکھو کے کا عزم کیا تو وہاں استاذِ پنجاب حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کے آستانۂ فضیلت پر حاضری دی۔ کئی سال وہاں رہے اور ان سے مختلف مروجہ درسی علوم کی تحصیل کی۔ حضرت ممدوح ان کے تیسرے استاد قرار پائے۔

لکھو کے ہی میں حضرت مولانا محمد علی لکھوی مدنی سے انھیں اخذ علم کا موقع ملا اور وہ ان کے چوتھے استاد ٹھہرے۔ استادی شاگردی کے اس تعلق کی بنا پر سید صاحب ممدوح مولانا کے صاحب زادوں مولانا محی الدین اور مولانا معین الدین لکھوی کا بے حد احترام کرتے تھے۔

پانچویں استاد تھے مولانا عبداللہ صاحب (ساکن کھپیاں والی) ان سے صحیح بخاری کا درس لیا۔

تلامذہ:

تقسیم ملک سے قبل سید صاحب سے بے شمار تشنگانِ علوم نے کوم کلاں کے دار الحدیث میں تعلیم حاصل کی، ان سب کا ذکر کرنا تو مشکل ہے البتہ چند حضرات کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

۱- مولانا محمد صدیق:...... یہ دراصل ضلع فیروز پور کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے حضرت حافظ عبداللہ روپڑی سے روپڑ میں خوب استفادہ کیا۔ ان کا "فتاویٰ اہل حدیث" دو جلدوں میں مرتب کیا۔ کوم کلاں میں حضرت سید مولا بخش سے اخذِ علم کرتے رہے۔ لدھیانہ کے ایک مدرسے میں مدرس رہے۔ تصنیف و تدریس اور خطابت میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد سرگودھا کو مرکز بنایا اور وہیں ۱۶۔ اپریل ۱۹۸۸ء کو وفات پائی۔ خوش اخلاق اور عالی ہمت عالم دین تھے۔

۲- مولانا محمد زکریا سنانوی:...... انھوں نے بھی ان سے کوم کلاں میں اخذِ علم کیا۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستان آئے اور چک ۱۲۰ جنوبی (ضلع سرگودھا) میں سکونت اختیار کی۔ چک ۱۲۶ جنوبی کے سکول میں معلم رہے۔ تدریس کے ساتھ خطابت و تقریر میں بھی نام پایا۔ ان کے خطبات کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔

۳- سید محمد شاہ:...... یہ سید صاحب کے داماد تھے اور ان کے سوانح نگار سید عبدالخالق شاہ ترمذی کے والد گرامی۔ انھوں نے سید صاحب سے کتب حدیث پڑھیں۔ لائق اور صاحبِ مطالعہ بزرگ تھے۔ بہت اچھے خطیب اور واعظ تھے۔ قیامِ پاکستان کے تھوڑا عرصہ بعد موضع سید محمود میں وفات پائی۔ ان کی وفات سید صاحب کے لیے بہت بڑے صدمے کا باعث تھی۔

۴- مولانا شیر محمد:...... صالح عالم دین تھے۔ انکسار و تواضع کا پیکر، ماڑی اثاری میں تاحیات فریضہ خطابت انجام دیتے رہے۔

ان کے علاوہ بہت سے حضرات نے ان سے کوم کلاں میں استفادہ کیا۔

تقسیم ملک کے بعد موضع سید محمود میں ان سے جن علما وطلبا نے حصولِ فیض کیا ان میں سید عبدالشکور شاہ اثری (سابق مدرس مرکز الدعوۃ السّلفیہ ستیانہ ضلع فیصل آباد) مولوی محمد دین مالو وال، مولوی محمد عمر فیصل آباد، مولانا محمد طیب معاذ فیصل آباد اور دیگر بہت سے حضرات شامل ہیں۔

مرض اور وفات:

سید مولابخش صاحب کی عادت تھی کہ جب زادِراہ میسر آتا تو حج یا عمرے کی تیاری کر لیتے۔ آخری حج کے لیے وہ ۱۸ رمضان المبارک ۱۳۹۴ھ (۸- اکتوبر ۱۹۷۴ء) کو گھر سے روانہ ہوئے۔ ان کی اہلیہ اور بیٹی (سوانح نگار سید عبدالخالق کی والدہ) بھی ساتھ تھیں۔ کراچی سے جدہ تک کا سفر سمندری جہاز (الشمس) کے ذریعے طے ہوا۔ مکہ مکرمہ جا کر شدید مرض کی گرفت میں آ گئے۔ مگر اللہ کی مہربانی سے تمام مناسک حج ادا کر لیے۔

پروگرام کے مطابق ۸ فروری ۱۹۷۵ کو واپسی تھی۔ ان کے نواسے سید عبدالخالق شاہ انھیں لینے کراچی پہنچے تو معلوم ہوا کہ حضرت بیمار ہیں۔ بیماری کی حالت میں جہاز سے باہر لائے گئے اور ۹ فروری کو ریل کے ذریعے گھر پہنچ گئے۔ اب میل ملاقات کے لیے آنے والوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا اور بیماری میں بھی تیزی آ گئی۔ بالآخر پیر کے روز ۲۹ ربیع الثانی ۱۳۹۵ھ (۱۲ مئی ۱۹۷۵ء) کو نمازِ مغرب کے بعد پونے آٹھ بجے وفات پا گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

دوسرے دن نمازِ ظہر کے بعد پہلا جنازہ مولانا عبداللہ ویرو والوی نے پڑھایا۔ جنازے میں بے شمار لوگ شامل تھے۔

اس کے بعد فیصل آباد سے مولانا محمد اسحاق چیمہ، مولانا محمد صادق خلیل اور دیگر بہت سے لوگ آئے تو دوسرا جنازہ مولانا محمد اسحاق چیمہ نے پڑھایا۔

ابھی جنازے سے فارغ ہوئے تھے کہ سرگودھا سے ان کے شاگرد مولانا محمد صدیق اپنے متعدد رفقاء

کے ساتھ آ گئے۔ اسی وقت گوجراں والا سے بھی کتنے ہی لوگ پہنچ گئے۔ اب تیسرا جنازہ مولانا محمد صدیق کی اقتدا میں پڑھا گیا۔

اسی اثنا میں اوڈاں والا سے مولانا محمد یعقوب ملہوی مدرسے کے اساتذہ اور طلبا کی اچھی خاصی تعداد کے ساتھ تشریف لائے۔ چوتھی نمازِ جنازہ انھوں نے پڑھائی۔ اس کے بعد اس رفیع المنزلت عالم کو دفن کر دیا گیا۔

اللهم اغفرله و ارحمه و عافه و اعف عنه .

سید مولا بخش مرحوم و مغفور کی نرینہ اولاد نہ تھی۔ ایک بیٹی تھیں جو سید عبدالخالق صاحب کی والدہ ہیں۔ آگے ماشاء اللہ اس بیٹی کی اولاد کا سلسلہ چلتا ہے۔

چند الفاظ سید عبدالخالق کے بارے میں:

سید عبدالخالق ترمذی نے حضرت سید مولا بخش کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی۔ ۱۹۶۵ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا تو سید صاحب مرحوم انھیں اوڈاں والا (ضلع فیصل آباد) میں صوفی عبداللہ مرحوم کے سپرد کر آئے۔ پھر اوڈاں والا کا مدرسہ جامعہ تعلیم الاسلام کے نام سے ماموں کانجن منتقل ہوا تو یہ وہاں چلے گئے اور وہاں پیر محمد یعقوب قریشی، مولانا محمد صادق خلیل، مولانا عبدالرشید ہزاروی، مولانا عبدالرشید اثاروی اور حافظ محمد بنیامین سے کسبِ فیض کیا۔ ۱۹۷۱ء میں وہاں سے سندِ فراغت لی تو جماعت اہل حدیث کے مختلف مدارس میں تدریسی خدمات سرانجام دیں۔ ۱۹۷۹ء میں جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) میں پڑھا رہے تھے کہ مولانا محمد اسحاق چیمہ اور قاضی محمد اسلم سیف نے ان کو بہ طور مدرس جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن بھیج دیا۔ پھر ۱۹۸۴ء میں گوجرہ کے ایک سکول میں پڑھانے لگے۔ ۲۰۰۹ء میں اس سکول سے ریٹائر ہو گئے۔ اس طرح ہمیشہ تعلیم و تعلم سے تعلق رہا اور یہی ان کی دلچسپی کا اصل محور تھا۔ اس کی وجہ سے اہلِ علم سے میل ملاقات کا سلسلہ جاری رہا۔ ماشاء اللہ نیک خاندان کے نیک فرد ہیں۔ ان کی اچھی خاصی لائبریری ہے اور مطالعہ کتب میں مصروف رہتے ہیں۔ زندگی کے لیل و نہار عالی مرتبت نانا سید مولا بخش مرحوم و مغفور کی آغوشِ تربیت میں گزرے اور یہ آثار ان کے ذہن و قلب پر چھائے ہوئے ہیں۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ اس خاندان کے فوت شدگان کو جنت الفردوس نصیب فرمائے اور زندوں کو عمل خیر کی توفیق سے نوازے۔

مولانا محمد زمان رحمانی

(وفات ۱۶۔ اپریل ۱۹۷۸ء)

ہندوستان کے صوبہ یوپی کے بعض اضلاع گورکھ پور، گونڈہ، بستی وغیرہ اور ان سے متصل نیپال کے اضلاع میں کسی زمانے میں سید احمد شہید کے مرید سید قطب علی اور سید جعفر علی نقوی، اور حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے تلامذہ کرام مولانا عباد اللہ، مولانا اللہ بخش بسکوہری، مولانا محمد اسحاق بانسوی، مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری، مولانا عبدالسلام مبارک پوری، مولانا ثناء اللہ امرتسری اور دیگر بہت سے علمائے کرام کی تبلیغی اور دعوتی جلسوں کے سلسلے میں آمد و رفت رہی اور ان علاقوں کے لوگ ان کے مواعظ سے متاثر ہو کر کتاب و سنت کے احکام پر عمل کرنے لگے۔

ان بزرگانِ دین کے بعد مولانا سید ممتاز علی، سید عابد علی، مولانا عبدالغفور بسکوہری اور ان جیسے علمائے عظام کا دور آیا، انھوں نے بھی اس نواح میں تبلیغی مہم جاری رکھی اور اس میں کامیاب رہے۔ مبلغینِ توحید اور داعیانِ قرآن و حدیث کے اس پاک باز گروہ کے ایک اہم رکن مولانا محمد زمان رحمانی تھے جو اپنے عہد اور علاقے کے مستند عالم اور مشہور مدرس و مقرر تھے۔ ان سطور میں انھی کے حالات بیان کرنا مقصود ہے جو مجھے مئی ۲۰۱۳ء میں ان کے پوتے مولانا عبدالمنان سلفی (ایڈیٹر ''السراج'' جھنڈانگر نیپال) نے ارسال کیے۔ مولانا محمد زمان رحمانی کا مولد و مسکن ضلع بستی (موجودہ ضلع سدھارتھ نگر) کا قصبہ ''انتری بازار'' تھا جو اس علاقے میں مسلم اکثریت کا مشہور قصبہ ہے۔ یہ قصبہ جماعت اہلِ حدیث کے متعدد علما و صلحا کا مرز بوم ہے اور یہاں طویل مدت سے ''مدرسہ بحر العلوم'' کے نام سے جماعت کا تدریسی ادارہ قائم ہے، جس میں بے شمار علما و طلبا نے تحصیلِ علم کی اور کر رہے ہیں۔

مولانا محمد زمان کے والد گرامی کا نام نبی احمد تھا۔ وہ پڑھے لکھے تو نہ تھے، لیکن صالح اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ علمائے کرام کی مجلسوں میں بیٹھتے، ان کے وعظ سنتے اور ان سے دینی مسائل سیکھتے۔ وہ زیادہ تر نیپال کے علاقوں میں جا کر تجارت کرتے تھے۔ اپنے علاقے اور قصبے میں انھوں نے چند رفقا کے ساتھ مل کر تعلیم یافتہ نہ ہونے کے باوجود سادہ انداز میں کتاب و سنت کی بڑی تبلیغ کی۔

مولانا محمد زمان رحمانی کی صحیح تاریخ ولادت کا تو علم نہیں ہو سکا، لیکن ان کے پوتے مولانا عبدالمنان سلفی

کا کہنا ہے کہ ''بعض قرائن کی بنیاد پر ایک محتاط اندازے کے مطابق ان کی پیدائش بیسویں صدی عیسوی کے بالکل شروع میں یعنی ۱۹۰۲ء کے آس پاس ہوئی ہوگی۔'' ان کی تعلیم کے لیے کوئی خاص انتظام نہ ہوسکا۔ تقریباً بارہ سال اسی طرح گزر گئے۔ پھر ۱۹۱۴ء کے لگ بھگ انھیں گاؤں کے ایک بزرگ میاں عبدالغفور مرحوم کے سپرد کیا گیا تو ان سے انھوں نے ناظرہ قرآن مجید اور اردو کی چند ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد ۱۹۱۷ء میں موضع یوسف پور کے مدرسہ دار الہدیٰ میں چلے گئے۔ یہ مدرسہ ۱۸۵۴ء میں قائم ہوا تھا۔ اس مدرسے میں انھوں نے ایک سال مولانا سید عابد علی سے تعلیم حاصل کی۔ اسی اثنا میں ان کے گاؤں انتری بازار کی جماعت کے لوگ مولانا سید عابد علی کو اپنے ہاں لے آئے اور انھوں نے مسجد میں بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا۔ محمد زمان بھی استاذ کے ساتھ گاؤں آ گئے۔ مولانا سید عابد علی بڑی محنت سے پڑھاتے تھے۔ طلبا کی تعداد بڑھی تو ایک اور استاذ مولانا عبدالغفور بسکوہری کی خدمات حاصل کی گئیں۔ یہی مدرسہ بعد میں ''مدرسہ بحر العلوم'' کے نام سے موسوم ہوا۔

۱۹۲۵ء تک مولانا محمد زمان نے اس مدرسے میں مولانا سید عابد علی اور مولانا عبدالغفور بسکوہری سے جو استفادہ کیا، اس کی تفصیل یہ ہے:

پورا ترجمہ قرآن، بلوغ المرام، صرف و نحو اور ادب و انشا کی بنیادی کتابیں۔

۱۹۲۵ء ہی میں اساتذہ نے ان کو ٹانڈہ ضلع فیض آباد کے مدرسہ کنز العلوم میں بھیج دیا۔ اس وقت یہ بہت اچھا اور مشہور مدرسہ تھا۔ اس مدرسے میں وہ صرف ایک سال رہے۔ ۱۹۲۶ء میں مئو ناتھ بھنجن کے مدرسہ فیض عام کا قصد کیا۔ یہ مدرسہ ۱۹۰۲ء میں جاری ہوا تھا۔ جب مولانا محمد زمان یہاں آئے اس وقت وہاں مولانا احمد مئوی اور مولانا عبدالرحمٰن مئوی، مولانا عبداللہ شائق مئوی، مولانا عصمت اللہ رحمانی ایسے جید اساتذہ فرائض تدریس انجام دیتے تھے۔ ان محترم اساتذہ سے مولانا محمد زمان نے دو سال اخذ فیض کیا اور ۱۹۲۸ء میں وہ یہاں سے جامعہ سراج العلوم جھنڈا نگر نیپال چلے گئے۔ یہ جامعہ مولانا عبدالرؤف خاں جھنڈانگری کے والد مکرم حاجی نعمت اللہ خاں صاحب نے اپنی ذاتی زمین میں ذاتی خرچ پر ۱۹۱۴ء میں جاری کیا تھا اور مولانا محمد زمان کے زمانۂ طالب علمی میں مولانا عبدالرحمٰن بجواوی اور مولانا عبدالغفور بسکوہری جیسے ممتاز اصحابِ علم اس کی مسندِ تدریس پر فائز تھے۔

۱۹۳۰ء میں یا اس سے کچھ آگے پیچھے دار الحدیث رحمانیہ دہلی کے بانی شیخ عطاء الرحمٰن مرحوم کی دعوت پر مولانا عبدالغفور بسکوہری تدریس کے لیے جامعہ سراج العلوم جھنڈانگر سے دار الحدیث رحمانیہ تشریف لے گئے، مولانا محمد زمان بھی استاذِ مکرم کے ساتھ وہیں چلے گئے۔ وہاں دو سال ان کا قیام رہا اور اس اثنا میں

انھوں نے مولانا احمد اللہ پرتاپ گڑھی دہلوی، مولانا نذیر احمد املوی رحمانی، مولانا عبید اللہ مبارک پوری رحمانی، مولانا عبداللہ پرتاپ گڑھی، مولانا سکندر علی ہزاروی، مولانا عبدالغفور بسکو ہری سے استفادہ کیا اور ۱۹۳۲ء میں سندِ فراغ لی۔ ان کی دستار بندی حضرت مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری نے کی۔ سند الاجازہ پر دار الحدیث رحمانیہ کے مہتمم شیخ عطاء الرحمٰن اور نامور اساتذہ کے دستخطوں کے ساتھ بحیثیت ناظر تعلیمات مولانا حافظ عبداللہ روپڑی کے دستخط ثبت ہیں۔

دستار بندی اور تقسیم اسناد کے موقعے پر دار الحدیث رحمانیہ میں عظیم الشان جلسہ منعقد کیا گیا تھا۔ اس جلسے میں ملک کے بہت سے علما و مشائخ تشریف لائے تھے، جن میں مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا محمد جونا گڑھی دہلوی، مولانا شرف الدین دہلوی اور دیگر متعدد حضرات شامل تھے۔

۱۹۳۲ء میں مولانا محمد زمان رحمانی نے دار الحدیث رحمانیہ سے سندِ فراغت لی تو اسی سال مولانا عبدالرؤف خاں رحمانی کے والد مکرم حاجی نعمت اللہ خاں نے اپنی جاری کردہ ''جامعہ سراج العلوم'' (جھنڈا نگر) میں ان کو مدرس مقرر کر لیا۔ حاجی صاحب مرحوم مولانا موصوف کی علمی قابلیت سے ان کے زمانۂ طالب علمی سے آگاہ تھے اور انھیں معلوم تھا کہ وہ محنتی اور باصلاحیت عالم ہیں۔ مولانا نے اس مدرسے میں طلباء کو تفسیر و حدیث، فقہ و کلام، ادب و انشاء، صرف و نحو اور معانی و بیان غرض ہر موضوع کی کتابیں پڑھائیں۔ وہ نمازِ فجر کے بعد مسندِ درس پر بیٹھ جاتے اور طلوعِ آفتاب تک سلسلۂ تدریس جاری رہتا۔ تھوڑی دیر ناشتے کا وقفہ کیا جاتا تو پھر تدریس شروع ہو جاتی۔ وہ انفرادی طور پر ہر طالب علم کا خیال رکھتے اور ہر فن کی کتاب پورے اہتمام سے پڑھاتے۔ نماز ظہر تک یہ کام جاری رہتا۔ کھانے اور نماز کے بعد پھر مسندِ درس آراستہ ہو جاتی جو نماز عصر تک باقاعدگی سے جاری رہتی۔ اگلے دن کے سبق کے لیے وہ اپنی نگرانی میں طلبا کو ہر فن کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کا حکم دیتے۔ مدرسے کے مہتمم اور طلبا ان کے طریق تدریس سے مطمئن اور خوش تھے۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۹ء تک مسلسل سات سال انھوں نے جامعہ سراج العلوم (جھنڈا نگر) میں یہ خدمت سرانجام دی۔

اب ان کے گاؤں سے اطلاع آئی کہ یہاں مولانا سید عابد علی مرحوم نے بحر العلوم کے نام سے جو مدرسہ قائم کیا تھا اور جس میں خود وہ اور دیگر بے شمار طلبا تعلیم حاصل کرتے رہے تھے، اس کی رونقیں ختم ہو رہی ہیں اور وہ گلستانِ علم جس کے گل بوٹے علاقے میں ایک عرصے تک مہکتے رہے تھے، اب وہ تیزی سے مرجھا رہے ہیں اور ان کی خوشبو قصہ پارینہ کا حصہ بنتی جا رہی ہے۔ آپ یہاں آیئے اور اس کی آب یاری کیجیے۔ چنانچہ ۱۹۳۹ء میں مولانا محمد زمان موضع ''انتری بازار'' چلے گئے اور اس نیم جان مدرسے کو جسے خود ان کی مادرِ علمی کی حیثیت حاصل تھی، زندگی سے ہم کنار کرنے کی کوشش کی، جس میں اللہ نے ان کو کامیابی عطا فرمائی۔

اس کے لیے نئی زمین خریدی، مسجد اور مدرسے کی الگ الگ عمارتیں تعمیر کیں۔ دار الاقامہ بنایا۔ بعض نئے اساتذہ کی خدمات حاصل کیں اور اللہ کی مہربانی سے مدرسہ جلد ہی ترقی کی نئی منزلیں طے کرنے لگا۔

مولانا محمد زمان رحمانی نے وہاں آٹھ سال (۱۹۴۶ تک) خدمتِ تدریس انجام دی۔ اسی سال یعنی ۱۹۴۶ء میں ان سے مولانا عبدالجلیل رحمانی نے رابطہ کیا۔ انھوں نے اس سے دو سال پیشتر ۱۹۴۴ء میں موضع ششہنیاں میں ایک دار العلوم قائم کیا تھا، انھیں وہاں ایک لائق منتظم اور مدرس کی ضرورت تھی، وہ مولانا محمد زمان کو مجبور کر کے ششہنیاں لے گئے۔ وہاں وہ ۱۹۴۹ء تک تین سال رہے۔

اس کے بعد پھر انتری بازار آ گئے اور ۱۹۴۹ء سے ۱۹۶۴ء تک پندرہ سال مدرسہ بحر العلوم میں ان کا سلسلہ تدریس و انتظام جاری رہا۔ ۱۹۶۴ء ہی میں انھیں حاجی نعمت اللہ خاں صاحب مرحوم کے صاحب زادۂ گرامی مولانا عبدالرؤف خاں رحمانی نے اپنے ''جامعہ سراج العلوم'' (جھنڈا نگر) میں تشریف لانے کی دعوت دی۔ یہ وہی جامعہ ہے جس میں انھوں نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ۱۹۳۲ء میں اس کے بانی حاجی نعمت اللہ خاں مرحوم کے فرمان کے مطابق تدریس کا آغاز کیا تھا۔ ۱۹۶۴ء میں وہ دوبارہ خدمتِ تدریس کے لیے یہاں تشریف لائے اور ۱۹۷۰ء تک بحیثیت صدر مدرس اور منتظم ان کا سلسلہ خدمت جاری رہا۔ اس وقت ان کے صاحب زادے مولانا عبدالحنان فیضی جامعہ سراج العلوم (جھنڈا نگر) میں تدریس و افتا کی خدمت پر مامور تھے۔

۱۹۷۰ء میں مولانا محمد زمان رحمانی پھر اپنے گاؤں انتری بازار آ گئے اور مدرسہ بحر العلوم کے انتظام و تدریس کی زمام ہاتھ میں لی۔ لیکن دو سال بعد ۱۹۷۲ء میں انھیں شوگر کا عارضہ لاحق ہو گیا اور وہ بری طرح اس مرض کی گرفت میں آ گئے۔ اس کے ساتھ بعض اور عوارض نے بھی انھیں آ پکڑا۔

مولانا محمد زمان رحمانی کا شمار صوبہ یوپی کے ممتاز علما و مدرسین میں ہوتا ہے۔ وہ اچھے واعظ اور مبلغ بھی تھے۔ بستی، بلرام پور، گونڈہ وغیرہ اضلاع میں ان کے مواعظ و تبلیغ کا سلسلہ طویل عرصے تک جاری رہا۔ نیپال کے علاقے میں بھی بسلسلہ تبلیغ ان کی آمد و رفت رہی۔

وہ عام فہم انداز میں وعظ فرماتے تھے۔ تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ لوگ یکساں ان سے مستفید ہوتے تھے۔ وہ متقی اور پرہیز گار عالم تھے۔ وضع دار اور منکسر مزاج، لیکن نہایت خود دار۔ صحیح معنوں میں عالمِ باعمل۔ طلبا پر شفقت فرماتے اور علما سے بے حد تکریم سے پیش آتے۔

مولانا محمد زمان رحمانی نے غربت کے سایہ اور مشکل حالات میں تعلیم حاصل کی، لیکن کسی کے آگے کبھی اپنی ضرورت کا اظہار نہیں کیا۔ کسی سرمایہ دار کے دروازے پر دستک نہیں دی۔ انھوں نے اپنے علمی وقار کی

ہمیشہ حفاظت کی۔ وہ صاف کلام اور حق گو عالم دین تھے۔ ان کا انکسار نہایت غیرت مند تھا اور ان کی تواضع میں بے حد حمیت پائی جاتی تھی۔ ان کی غربت نے امارت کو ہمیشہ ٹھوکر پر رکھا۔

ان کا ذاتی کتب خانہ اگرچہ مختصر تھا، لیکن ان کے ذوق کی بہترین کتابوں پر مشتمل تھا۔ وہ اپنے گاؤں کے زمانۂ قیام میں اپنے پوتے پوتیوں کی مدد سے تھوڑے عرصے کے بعد ان کتابوں کو دھوپ لگاتے رہتے تھے اور ہر کتاب کا ہر ورق انتہائی احتیاط سے الٹتے تھے۔ وہ مطالعہ کے شائق اور اپنی معلومات میں ہر وقت اضافے کے متمنی رہتے تھے۔

اس جید عالم دین نے ۱۶۔ اپریل ۱۹۷۸ء کو نماز فجر کے وقت وفات پائی۔ تجہیز و تکفین کے بعد ان کے جسد خاکی کو مدرسہ بحر العلوم میں لایا گیا۔ نمازِ ظہر کے بعد مولانا محمد خلیل رحمانی نے نماز جنازہ پڑھائی، جس میں ہزاروں لوگوں نے شرکت کی۔ نمازِ عصر سے قبل انھیں مقامی قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

انا للہ و انا الیہ راجعون ......اللھم اغفرلہ و ارحمہ و عافہ و اعف عنہ .

حافظ محمد ابراہیم کمیر پوری

(وفات ۱۹- جولائی ۱۹۸۹ء)

۲۰؍فروری ۱۹۵۰ء کو میں عارضی طور پر لاہور سے رخصت ہوا اور مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے حکم سے ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے دفتر (گوجراں والا) حاضری دی۔ اس وقت یہ اخبار مولانا محمد حنیف کی ادارت میں شائع ہوتا تھا اور میرا کام مولانا کی نگرانی میں اس اخبار میں خدمت سرانجام دینا تھا۔ وہاں مولانا محمد اسماعیل سلفی کے پاس بھی بہت سے لوگ آتے تھے اور مولانا محمد حنیف ندوی سے ملاقات کے لیے بھی لوگوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ اخبار ''الاعتصام'' مرکزی جمعیت اہل حدیث کا ترجمان تھا اور اس کا دفتر مولانا محمد اسماعیل سلفی کی جامع مسجد سے متصل تھا۔ بعض حضرات مضامین یا جماعتی خبروں کی اشاعت کے لیے بھی مختلف مقامات سے تشریف لاتے تھے۔ ان سب حضرات سے میری ملاقات بھی ہوتی تھی۔ اس طرح ان دنوں بے شمار لوگوں سے ملاقات کے مواقع میسر آئے اور ان سے تعلقات استوار ہوئے جو اللہ کی مہربانی سے ہمیشہ قائم رہے۔

ایک دن میں اکیلا دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ ایک نوجوان تشریف لائے۔ پورا قد، گداز جسم، گول چہرہ، گندمی رنگ، چوڑا سینہ، قمیص کے ساتھ اس زمانے کے رواج کے مطابق سفید تہبند باندھے ہوئے۔ سر پر قراقلی ٹوپی۔ نہایت تپاک سے ملے۔ گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا کہ خوش مزاجی اور حسن گفتار کے اوصاف ان کی ذات میں جمع ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ضلع سیالکوٹ کے قصبہ بدوملہی سے تعلق رکھتے ہیں اور وہاں کی جامع مسجد اہل حدیث میں فریضۂ خطابت انجام دیتے ہیں۔ یہ تھے حافظ محمد ابراہیم کمیر پوری جو تقسیم ملک سے کئی سال پہلے سے بدوملہی کے منصب خطابت پر فائز تھے۔ انھوں نے اخبار ''الاعتصام'' میں تبصرے کے لیے مجھے اپنی ایک کتاب ''فسانۂ قادیان'' عطا کی۔ یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی جو آگے چل کر گہرے تعلقات کا پیش خیمہ ثابت ہوئی......اب حافظ محمد ابراہیم کمیر پوری کے حالات ملاحظہ ہوں۔

وہ ضلع امرتسر کی تحصیل اجنالا کے ایک گاؤں کمیر پور میں ۱۹۲۱ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام میاں دین محمد تھا۔ کمیر پور اس وقت اہل علم کے حلقوں میں ایک مشہور گاؤں تھا۔ حافظ عبداللہ روپڑی، حافظ محمد حسین روپڑی، حافظ عبدالقادر روپڑی اور حافظ محمد اسماعیل روپڑی خاندانی اعتبار سے اسی گاؤں سے تعلق رکھتے تھے اور پھر یہیں سے روپڑ گئے اور وعظ و تقریر، درس و تدریس اور مناظروں میں شہرت پائی۔

حافظ محمد ابراہیم نے ناظرہ قرآن مجید اسی گاؤں میں حافظ عبداللہ روپڑی کے چھوٹے بھائی حافظ عبدالرحمٰن کمیر پوری سے پڑھا، جن کا وہاں دینی مدرسہ جاری تھا اور ان سے مقامی اور اردگرد کے دیہات کے بے شمار طلبا تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ناظرہ قرآن پڑھنے کے بعد حافظ ابراہیم نے قرآن مجید اسی مدرسے میں حفظ کیا۔

بعد ازاں انھیں مزید تعلیم کے لیے امرتسر (شہر) بھیج دیا گیا۔ وہاں انھوں نے دو مدرسوں میں تعلیم حاصل کی، مدرسہ غزنویہ میں اور مسجد قدس میں۔ مدرسہ غزنویہ میں ان کے اساتذہ تھے مولانا عبداللہ بھوجیانی، مولانا عبدالمجید ہزاروی، مولانا محمد خاں اور شیخ الحدیث مولانا نیک محمد۔ امرتسر میں انھوں نے حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری سے بھی استفادہ کیا اور ان سے مباحثہ و مناظرہ کے گُر سیکھے۔ ذہن مناظرانہ پایا تھا، جلد ہی اس فن کے ضروری پہلوؤں سے آگاہ ہو گئے اور پھر جلد ہی اس میدان میں اتر آئے۔

امرتسر کے بعد گوجراں والا کا عزم کیا۔ وہاں حضرت حافظ محمد گوندلوی، مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی اور بعض دیگر اساتذہ سے استفادہ کیا۔

جس زمانے میں حافظ ابراہیم کمیر پوری فارغ التحصیل ہوئے، وہ مناظروں اور مباحثوں کا زمانہ تھا۔ کہیں آریہ سماجیوں اور مسلمانوں کے مناظرے ہو رہے تھے، کہیں مرزائی اور مسلمان مناظر ایک دوسرے سے بحث کر رہے تھے۔ ضلع سیالکوٹ کی تحصیل نارووال کے قصبے بدوملہی میں ان دنوں مرزائی خاصی تعداد میں آباد تھے اور عوام اور حکام پر ان کا اثر تھا۔ ان کے مبلغوں کا بھی وہاں بہ کثرت آنا جانا تھا۔ حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری کے حکم سے حافظ ابراہیم کمیر پوری نے اس قصبے میں ٹھکانا بنایا اور تقریر و خطابت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ وہ اچھے خطیب بھی تھے اور مرزائیوں کے متعلق معلومات بھی رکھتے تھے۔ انھوں نے وہاں خطیبانہ انداز اور مناظرانہ اسلوب میں مرزائیوں کا خوب تعاقب کیا۔

وہ تقسیم ملک سے پہلے بدوملہی گئے تھے۔ اس وقت ہندو بھی وہاں موجود تھے، جن کا تعلق یا تو آریہ سماج سے تھا یا سناتن دھرم سے۔ ان کے بھی وہاں جلسے ہوتے تھے اور ان کے پرچارک مسلمانوں کی شدید مخالفت کرتے تھے۔ حافظ ابراہیم کمیر پوری ان کے اعتراضات کا بھی جواب دیتے تھے۔ حافظ صاحب مختلف مقامات سے تعلق رکھنے والے ہم عصر و ہم مسلک مقرروں کو بھی وہاں آنے کی دعوت دیتے اور ان سے اسلام کی حقانیت کے موضوع پر تقریریں کراتے تھے۔ ان تقریروں میں مخالف و موافق سامعین کثرت سے شامل ہوتے تھے، جس کے بہت اچھے نتائج نکلتے تھے۔ تقسیم ملک سے کچھ عرصہ بعد تک وہ بدوملہی کی مسجد اہل حدیث میں فریضہ خطابت انجام دیتے رہے۔

حافظ صاحب تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف کیں:

۱- مقالات محرم

۲- مرزا قادیانی کے دس جھوٹ

۳- فسانۂ قادیان

۴- ثناء اللہ اور مرزا

۵- قربانی اور پرویزی دلائل کا جائزہ

۶- ماہِ رمضان المبارک اور اس کے احکام و مسائل

حافظ صاحب کا صحافت سے بھی تعلق رہا۔ سب سے پہلے انھوں نے جھنگ کے ہفت روزہ "صنعتی پاکستان" کی ادارت کی۔ یہ جمعیت الانصار کا ترجمان تھا۔ حافظ صاحب کافی عرصہ اس کے ایڈیٹر رہے۔

پھر ہفت روزہ "تنظیم اہل حدیث" کا اجرا لاہور سے ہوا تو انھیں اس اخبار کے ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ یہ اخبار سب سے پہلے ۱۹۳۲ء میں حضرت حافظ عبداللہ روپڑی نے روپڑ سے جاری کیا تھا۔ یہ خالص علمی اور تحقیقی اخبار تھا۔ تقسیم ملک کے زمانے میں جو افراتفری ہوئی، اس کے نتیجے میں یہ اخبار بند ہو گیا تھا۔ پھر جب حالات اعتدال کے دائرے میں داخل ہوئے تو اسے دوبارہ لاہور سے حضرت حافظ عبداللہ روپڑی کی نگرانی اور حافظ محمد ابراہیم کمیرپوری کی ادارت میں جاری کیا گیا۔

کچھ عرصہ وہ مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ترجمان ہفت روزہ "اہل حدیث" کے ایڈیٹر بھی رہے۔ ان کا اسلوب تحریر بڑا صاف تھا۔ اپنا نقطۂ نظر وضاحت سے پیش کرتے تھے۔

وہ کامیاب مناظر بھی تھے۔ تقسیم ملک سے قبل بھی ان کے مرزائیوں اور بعض دیگر فرقوں کے مناظروں سے مناظرے ہوئے اور تقسیم ملک کے بعد بھی۔ تقسیم ملک سے قبل انھوں نے اجنالہ (ضلع امرتسر) اور بٹالہ (ضلع گورداس پور) میں مرزائیوں سے مناظرے کیے اور تقسیم ملک کے بعد بھوئے آصل، جلال آباد، (ضلع ملتان) اور فاروقہ (ضلع سرگودھا) وغیرہ مقامات میں مختلف فرقوں کے مناظروں سے مناظرے کیے۔

انھوں نے ۱۹۵۳ء کی اس تحریک میں بھی حصہ لیا جو مرزائیوں کے خلاف شروع کی گئی تھی۔ اس تحریک میں انھیں گرفتار کیا گیا اور وہ چار مہینے ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ میں قید رہے۔

۱۹۶۱ء میں انھوں نے ٹوبہ ٹیک سنگھ کے ایک جلسے میں سیرۃ النبی (ﷺ) کے موضوع پر تقریر کی۔ یہ ایوب خاں کے مارشل لا کا دور تھا۔ اس تقریر کے نتیجے میں انھیں گرفتار کر لیا گیا اور فوجی عدالت نے چودہ سال قید بامشقت کی سزا سنائی، جسے بعد میں چھ ماہ میں بدل دیا گیا۔

۱۹۷۴ء میں مرزائیوں کے خلاف جو تحریک جاری ہوئی تھی، اس میں ان کا کردار بڑا اہم رہا۔ ارکانِ اسمبلی کو مرزائیوں کی پوری تاریخ سے آگاہ کیا اور مرزا غلام احمد اور دیگر بڑے چھوٹے مرزائیوں نے مسلمانوں کے خلاف جو کچھ لکھا، پھر نبی ﷺ اور آپ کے اہل بیت اور انبیاء علیہم السلام کی جس انداز میں توہین کی، حافظ صاحب موصوف وہ سب تحریریں مرکزی اسمبلی کے ارکان اور اہم شخصیات کے علم میں لائے۔

ان کی خطابت کا دائرہ بھی وسیع تھا۔ جماعت کے عام جلسوں میں تو ان کا سلسلۂ خطابت جاری رہتا ہی تھا، لیکن متعدد مساجد میں باقاعدہ خطباتِ جمعہ بھی وہ دیتے رہے۔ یہ سلسلہ انھوں نے آزادیٔ ملک سے قبل بدوملہی کی جامع مسجد اہل حدیث سے شروع کیا تھا۔ اس کے بعد جامع مسجد اہل حدیث جھنگ، چینیاں والی مسجد لاہور، سرگودھا اور پتوکی میں یہ خدمت سرانجام دی۔ چینیاں والی مسجد کے خطبۂ جمعہ کے زمانے میں وہ مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ناظم دفتر تھے۔ میں اس وقت مرکزی جمعیت کے ترجمان اخبار ''الاعتصام'' کا ایڈیٹر تھا۔ جمعیت اور اخبار کے دفاتر شیش محل روڈ پر دار العلوم تقویۃ الاسلام کی بلڈنگ میں تھے۔ دراصل اسی زمانے میں ہمارے آپس میں قریبی تعلقات پیدا ہوئے جو ہمیشہ قائم رہے۔ اگرچہ ان کی دفتر کی نظامت اور مسجد کی خطابت زیادہ عرصے پر محیط نہیں تھی، لیکن ہمارے مراسم کا عرصہ ان کی وفات تک قائم رہا۔ ان کا آخری زمانہ پتوکی میں گزرا۔ ایک مرتبہ میں ان سے ملاقات کے لیے وہاں گیا۔ یہ جمعۃ المبارک کا دن تھا۔ جب میں ان کی مسجد میں پہنچا وہ خطبہ جمعہ ارشاد فرمار ہے تھے۔ جمعے کے بعد ان سے ملاقات ہوئی تو وہ مجھے اپنے گھر لے گئے، جس کے دروازے پر ''مقام ابراہیم'' کی تختی لگی ہوئی تھی۔ یہ بہت اچھا نام تھا جو ان کے حسنِ ذوق کا آئینہ دار تھا۔

حافظ صاحب کو شوگر کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ بہت سے معالجوں سے علاج کرایا گیا لیکن افاقہ نہ ہوا بلکہ بیماری بڑھتی چلی گئی۔ مولانا محمد حنیف ندوی نے ۱۲- جولائی ۱۹۸۷ء کو نمازِ مغرب کے بعد وفات پائی۔ ۱۳- جولائی کو انھیں دفن کیا گیا۔ ۱۴- جولائی کو حافظ صاحب ایک عزیز کے ساتھ پتوکی سے تعزیت کے لیے مولانا کے گھر تشریف لائے۔ میں بھی اس وقت وہیں تھا۔ عرض کیا آپ بیماری کی حالت میں تکلیف کر کے آئے۔

اس کے جواب میں انھوں نے حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کا واقعہ بیان کیا کہ وہ بیمار تھے۔ اسی حالت میں کسی شخص کے جنازے میں شریک ہوئے۔ ایک آدمی نے کہا، آپ خود بیمار ہیں، نہ تشریف لاتے۔

مولانا نے فرمایا: بھائی میں کسی کے جنازے میں آؤں گا تو لوگ میرے جنازے میں آئیں گے۔ حافظ صاحب نے کہا یہی میرا معاملہ ہے۔ میں جنازے میں تو شریک نہیں ہو سکا۔ تعزیت کے لیے تو آنا چاہیے تھا سو آ گیا تاکہ لوگ میرے بھی جنازے یا کم از کم تعزیت میں شرکت کریں۔

حافظ صاحب کو بیماری کے آخری دنوں میں لاہور کے شیخ زید اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ انھوں نے وہیں ۱۹- جولائی ۱۹۸۹ء کو وفات پائی۔

ان کی میت ان کے دنیوی مسکن پتوکی لے جائی گئی۔ شیخ الحدیث مولانا عبداللہ صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔ تدفین کے بعد قبر پر حافظ عبدالقادر روپڑی نے دعا کی۔ بہت بڑا جنازہ تھا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ.

حافظ صاحب کی اولاد دو بیٹے تھے اور دو بیٹیاں۔ بڑے بیٹے کا نام حافظ خالد محمود ثاقب ہے (یہ سطور ۲۰- جولائی ۲۰۱۲ء کو لکھی جا رہی ہیں) حافظ خالد محمود ثاقب گزشتہ بارہ سال سے فالج کے مرض میں مبتلا ہیں اور پتوکی میں اسی مکان میں مقیم ہیں، جس میں ان کے والد مرحوم رہتے تھے۔

چھوٹے بیٹے حافظ حسن محمود کمیر پوری ہیں۔ یہ ایم اے ایم ایڈ ہیں اور سکول ٹیچر ہیں۔ نسبت روڈ لاہور کی مسجد المکرّم میں گزشتہ بائیس سال سے خطابت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ مرکزی جمعیت اہل حدیث ضلع قصور کے ناظم ہیں۔ پتوکی میں بڑے بھائی سے علیحدہ مکان میں ان کی رہائش ہے۔ ملنسار اور خوش اخلاق عالم دین ہیں۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ اس خاندان کے فوت شدگان کی مغفرت فرمائے اور زندوں کو صحت و عافیت سے نوازے۔ آمین

حافظ علم الدین

(وفات ۳۰۔ دسمبر ۱۹۸۹ء)

تقسیم ملک سے قبل ضلع لاہور کے ایک قصبے کا نام ''پٹی'' تھا جو تقسیم کے نتیجے میں ضلع امرتسر میں شامل کیا گیا۔ اس قصبے میں اہل حدیث بہت بڑی تعداد میں آباد تھے، جن میں متعدد علمائے کرام بھی تھے۔ ان میں ایک بزرگ حافظ علم الدین تھے جو قابل مدرس اور درویش صفت عالم تھے۔ وہ ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت سے قبل ان کی والدہ نے خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ نے انھیں گلاب کا پھول عطا کیا جو بڑا خوشبودار ہے۔ یہ خواب انھوں نے اپنے مرشد سے بیان کیا تو انھوں نے تعبیر دی کہ اللہ تمھیں صالح فطرت بیٹا عطا فرمائے گا۔ بیٹے کی پیدائش کے بعد اسے مرشد کے پاس لے جایا گیا تو انھوں نے بچے کو اپنی گود میں رکھا اور فرمایا اس کے چہرے پر علم کے آثار پائے جاتے ہیں، اس کا نام علم الدین رکھنا چاہیے۔ چنانچہ یہی نام رکھا گیا اور حفظِ قرآن کے بعد انھوں نے حافظ علم الدین کے نام سے شہرت پائی۔

حافظ علم الدین کے خاندان میں کوئی شخص اہل حدیث نہ تھا بلکہ حافظ صاحب کے والد میاں اللہ بخش کے ایک بھائی شیعہ مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ حافظ صاحب کے بڑے بھائی میاں فضل الدین تھے۔ وہ دینی کتابیں فروخت کیا کرتے تھے۔ انھوں نے مڈل پاس کرنے کے بعد مختلف دیہات اور مدارس میں جا کر مترجم قرآن مجید اور کتب دینیہ کی فروخت کا سلسلہ شروع کیا۔ اسی دوران میں جب وہ امرتسر، ویرووال اور کیر پور کے دینی مدرسوں میں جانے لگے تو انھیں وہاں کے علمائے اہل حدیث سے واسطہ پڑا اور ان کے وعظ سننے کا موقع ملا۔ اس طرح انھوں نے مسلکِ اہل حدیث اختیار کر لیا۔

حافظ علم الدین نے سرکاری سکول میں پرائمری تک تعلیم پائی۔ اس کے بعد کیر پور کے مدرسے میں حضرت حافظ عبداللہ محدث روپڑی کے برادرِ صغیر حافظ عبدالرحمٰن کیرپوری سے قرآن مجید حفظ کرنا شروع کیا۔ ان کے علاوہ انھوں نے حافظ عبداللہ بہاول پوری کے والد مولانا نور محمد اور حاجی حسن دین مرحوم، مولانا عبداللہ ویرووالوی اور مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف سے استفادہ کیا۔ اس طرح اللہ نے ان کو حفظ قرآن کی توفیق بھی عطا فرمائی اور دینی علوم کے حصول کی نعمت سے بھی نوازا۔

حفظِ قرآن میں ان کے ساتھی تھے حافظ عبداللہ بہاول پوری، حافظ محمد ابراہیم کیرپوری، مولانا سلیم اللہ

کمیر پوری اور مولوی عبدالحفیظ کمیر پوری۔ یہ سب حضرات جو اپنے وقت کے مشہور مقرر اور خطیب تھے، اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں۔ رحمہم اللہ تعالیٰ.

حافظ علم الدین کے دوستوں اور مخلص ترین معاصروں میں مولانا ثناء اللہ ہوشیار پوری (سابق مدرس جامعہ سلفیہ فیصل آباد) اور مولانا محمد حسین شیخوپوری کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

تقسیم ملک کے بعد وہ چک ۱۴۳ گ ب (تحصیل سمندری فیصل آباد) آئے اور یہاں وعظ و تبلیغ اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ بے شمار لوگوں نے ان سے اخذِ فیض کیا۔ بعد ازاں جامعہ سلفیہ کے قریب سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ جامعہ سلفیہ میں وہ پچیس سال بچوں کو قرآن مجید حفظ کراتے رہے۔ جامعہ میں خطبہ جمعہ بھی وہ ارشاد فرماتے تھے۔ وہ اچھے واعظ اور مبلغ تھے، اس لیے اردگرد کے دیہات میں بھی ان کا سلسلہ تبلیغ دین جاری رہتا تھا۔

مولانا عبداللہ ویروالوی کے مدرسہ دار القرآن والحدیث میں تقریباً بارہ سال وہ طلباء کو قرآن مجید حفظ کراتے رہے۔ وہاں ان سے مولانا صوفی عائش محمد، مولانا عبدالرشید جھنگوی مرحوم، مولانا عتیق اللہ سلفی، مولانا عبداللہ ویروالوی کے دونوں بیٹوں حافظ عبدالرحمٰن اور حافظ محمد داؤد نے کسب فیض کیا۔ ان کے علاوہ مولانا حافظ عبدالرزاق سعیدی اور ان کے بھائی مولانا محمد یحییٰ بھی ان کے حلقۂ شاگردی میں شامل ہوئے۔ تدریس اور تبلیغ کے سلسلے میں ان کی بڑی خدمات ہیں۔

ان کے دور کے ممتاز علما و مدرسین بھی ان کی تقریر دلچسپی اور شوق سے سنتے تھے۔ ایک مرتبہ جامعہ سلفیہ کے اردگرد کی آبادی کے لوگوں نے اکٹھے عید الفطر کی نماز پڑھنے کا پروگرام بنایا۔ اس موقعے پر مولانا محمد عبدہ الفلاح، مولانا محمد صادق خلیل، پیر محمد یعقوب قریشی اور بعض دیگر علمائے کرام موجود تھے، لیکن ان سب حضرات نے عید کے امام حافظ علم الدین کو بنایا اور ان کی اقتدا میں نماز پڑھی۔ وہ صلح جو، معتدل مزاج اور صاف بیان واعظ تھے۔

۱۹۷۹ء میں وہ برطانیہ کی جماعت اہل حدیث کی دعوت پر برمنگھم گئے۔ ان کے صاحب زادے قاری عبدالقیوم بھی ان کے ساتھ تھے۔ ان دنوں مولانا محمد حسین شیخوپوری اور میاں فضل حق بھی برمنگھم تشریف لے گئے تھے۔ حافظ صاحب کئی دن وہاں رہے اور پروگرام کے مطابق مختلف مقامات میں ان کی تقریروں کا سلسلہ جاری رہا۔

ضلع فیصل آباد اور شہر میں ان کا قیام زیادہ رہا اور یہاں کے بہت سے دیہات و قصبات میں انھوں نے کتاب و سنت کی اشاعت کی۔ وہ باہمت مبلغ دین تھے اور لوگ ان کی باتیں سنتے اور ان پر عمل

کرتے تھے۔

جامعہ سلفیہ کی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو کر وہ لاہور آ گئے تھے۔ یہاں انھوں نے جامع مسجد مزمل اہل حدیث بند روڈ میں بچوں کو ناظرہ قرآن مجید پڑھانا شروع کیا۔ اس کے ساتھ ہی سعودی عرب کے مکتب الدعوۃ والارشاد کی طرف سے اردگرد کے دیہات میں کتاب وسنت کی تبلیغ کی ذمہ داری ان پر عائد کی گئی۔ اس بنیادی خدمت کے لیے مکتب کی جانب سے انھیں جیپ دی گئی تھی۔ ان کے صاحب زادے قاری عبدالشکور مدنی بھی (جو سعودی حکومت کی جانب سے مبعوث تھے) ان کے ساتھ تبلیغ کے لیے جاتے تھے۔

حافظ علم الدین نے دو شادیاں کیں۔ ان کی اولاد پانچ بیٹے ہیں اور تین بیٹیاں۔ بیٹوں کے نام یہ ہیں: حاجی عبدالغفور، قاری عبدالشکور مدنی فاضل مدینہ یونیورسٹی اور مدرس جامعہ اہل حدیث قدس لاہور۔ (ان کا تذکرہ اس کتاب میں کیا گیا ہے)، قاری عبدالقیوم، ماسٹر محمد احمد عربی ٹیچر اور محمود احمد (دار الہدیٰ کیسٹ سنٹر چوبرجی لاہور)

اب آیئے حافظ علم الدین کے آخری دور کی طرف۔!

ان کے گردوں میں پتھری کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا اور وہ شیش محل روڈ پر دار العلوم تقویۃ الاسلام کے قریب اپنے صاحب زادے قاری عبدالشکور کے پاس قیام پذیر تھے۔ شیخ زید اسپتال میں آپریشن کرایا گیا، لیکن افاقہ نہ ہوا اور کمزوری بہت بڑھ گئی۔ بالآخر ۳۰۔ دسمبر ۱۹۸۹ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

حافظ صاحب کی بیماری کے دنوں میں مولانا محمد حسین شیخوپوری اپنے بیٹے عطاء الرحمٰن کے ساتھ عیادت کے لیے آئے۔ دونوں پرانے دوست تھے۔ جوانی کے زمانے کی باتیں ایک دوسرے کو سناتے اور روتے رہے۔ اللہ مغفرت فرمائے ان کے تمام ساتھی وفات پا گئے ہیں۔

حافظ صاحب کا جنازہ مولانا غلام اللہ (فیصل آباد) نے پڑھایا جس میں بے شمار لوگوں نے شرکت کی اور انھیں لاہور کے قبرستان میانی صاحب میں دفن کیا گیا۔ مولانا غلام اللہ بھی عرصہ ہوا انتقال کر گئے ہیں۔

اللھم اغفرلھم و ارحمھم و عافھم و اعف عنھم۔

مولانا محمد داؤد رحمانی بھوجیانی

(وفات ۵/نومبر ۱۹۹۵ء)

تقسیم ملک سے قبل متحدہ پنجاب میں بے شمار مدارس جاری تھے جن میں علمائے کرام درس و تدریس کے فرائض سرانجام دیتے تھے اور لاتعداد مساجد تھیں جو نمازیوں سے بھری رہتی تھیں اور ان میں دن رات قال اللہ وقال الرسول کی صدائیں گونجتی تھیں۔

مشرقی پنجاب کے شہر امرتسر کو بھی علم و عرفان کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی اور اس ضلعے کے بھی مختلف مقامات میں قرآن و حدیث کی تعلیم و تعلم کے سلسلے باقاعدگی سے جاری تھے اور بہت بڑی تعداد میں شائقین علم وہاں کے اساتذہ سے اخذِ فیض کرتے تھے۔ ان مقامات میں ایک مشہور مقام کا نام ''بھوجیاں'' تھا جو ضلع امرتسر کی تحصیل ترنتان میں واقع تھا۔

یہ گاؤں بہت سے علمائے کرام کا مسکن تھا، جن میں حضرت مولانا فیض اللہ خاں، ان کے تین فرزندانِ گرامی مولانا عبدالرحمٰن بھوجیانی، مولانا عبداللہ بھوجیانی اور مولانا عبدالرحیم بھوجیانی بھی شامل تھے۔ مولانا فیض اللہ خان تو ۱۹۲۵ء کے لگ بھگ وفات پا گئے تھے، لیکن ان کے تینوں فرزندانِ گرامی کو اس سے بائیس تیئیس سال بعد اگست ۱۹۴۷ء میں سکھوں نے بھوجیاں میں شہید کیا۔

ان کے علاوہ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کا مولد بھی یہی گاؤں تھا۔ ان تمام حضرات نے مختلف مقامات کے مدارس میں تدریسی خدمات بھی انجام دیں اور تصنیف و تالیف کے حلقوں میں بھی بڑی شہرت پائی، مثلاً حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی نے ''التعلیقات السلفیہ'' کے نام سے عربی میں سنن نسائی کی شرح لکھی، جسے علمی حلقوں میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، اُردو زبان میں بھی انھوں نے بہت کچھ لکھا۔

بھوجیاں ہی کے رہنے والے ایک عالم دین مولانا محمد داؤد تھے جو انصاری برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے دہلی کے دارالحدیث رحمانیہ سے سند فراغ لی تھی، اس لیے مولانا محمد داؤد بھوجیانی رحمانی کی نسبت سے شہرت پائی۔

مولانا محمد داؤد بھوجیانی ۱۹۴۷ء کو بھوجیاں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بھوجیاں میں حاصل کی۔ پھر امرتسر کے مدرسہ غزنویہ میں داخل ہوئے اور وہاں کے اساتذہ کرام مولانا نیک محمد، مولانا محمد حسین ہزاروی،

مولانا عبداللہ بھوجیانی اور بعض دیگر بزرگان گرامی کے حضور زانوئے شاگردی تہہ کیے۔ بعد ازاں دہلی تشریف لے گئے اور وہاں کے دارالحدیث رحمانیہ میں داخلہ لیا۔ اس دارالحدیث میں انھوں نے حضرت مولانا احمد اللہ پرتاپ گڑھی دہلوی اور مولانا عبیداللہ مبارک پوری رحمانی سے تحصیل علم کی۔ مولانا احمد اللہ صاحب اس وقت دارالحدیث رحمانیہ کے صدر مدرس اور شیخ الحدیث تھے ان سے سند فراغت لی۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد مختلف مدارس میں تدریسی خدمات کی انجام دہی میں مشغول ہوئے۔ کچھ عرصہ یہاں محمد باقر مرحوم کے جاری کردہ مدرسہ جھوک داؤد چک ۴۲۷ میں تدریس کی اور ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۲ء میں صوفی عبداللہ مرحوم کے جاری فرمودہ مدرسہ تعلیم الاسلام اوڈاں والا (ضلع فیصل آباد) میں خدمت تدریس انجام دیتے رہے۔

تقسیم ملک کے بعد اپنے خاندان کے ساتھ گوجراں والا آ گئے اور دو سال وہاں کی جامعہ اسلامیہ میں تدریس کی۔ ان مدارس میں ان سے بے شمار طلباء نے مختلف علوم کی کتابیں پڑھیں۔

مولانا محمد داؤد رحمانی بھوجیانی متواضع، نرم خو، حلیم الطبع اور خوش اخلاق عالم دین تھے۔ میانہ قد، گندمی رنگ اور خوش کلام بزرگ۔ ۵ نومبر ۱۹۹۵ء کو گوجراں والا میں فوت ہوئے۔

اَللّٰھم اغفر له وارحمه و عافه واعف عنه .

مولانا عبدالصمد شرف الدین

(وفات ۱۶ر فروری ۱۹۹۶ء)

زمانۂ طالب علمی کے ابتدائی دور میں شیخ عبدالصمد شرف الدین تاجر کتب بھنڈی بازار بمبئی کا نام پہلی مرتبہ استاذِ محترم مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے اپنے آبائی وطن کوٹ کپورہ میں سنا۔ وہ ان سے بذریعہ ڈاک عربی کتابیں منگوایا کرتے تھے۔ نہایت شان دار چھپی ہوئی کتابیں۔ ان کتابوں میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی تصانیف بھی ہوتی تھیں۔ خالص علمی نوعیت کی کتابوں کی طباعت و تجارت کے سلسلے میں اس ادارے کی بڑی شہرت تھی اور اس کے مالک عبدالصمد شرف الدین دنیائے اسلام کی مشہور شخصیت تھے، لیکن ان کے حالات کا علم نہیں تھا۔ جی چاہتا تھا کہ ان کے متعلق کچھ لکھا جائے۔ میں شکر گزار ہوں اپنے دوست مولانا عارف جاوید محمدی کا کہ انھوں نے ان کے متعلق کچھ ضروری معلومات بہم پہنچائیں۔ مندرجہ ذیل مضمون انہی معلومات کی روشنی میں لکھا گیا ہے۔

تعلیم:

شیخ عبدالصمد ۱۹۰۱ء میں بمبئی کے علاقہ بھیونڈی شہر میں پیدا ہوئے اور وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ والد کا اسم گرامی شیخ شرف الدین تھا جو علم و فضل کے ساتھ دنیوی اعتبار سے بھی اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ اور اس دور میں عربی کتابوں کی طباعت کے معروف ناشر اور تاجر بھی تھے۔ ۱۹۱۰ء میں وہ بھیونڈی کی سکونت ترک کر کے بمبئی تشریف لے گئے۔ وہاں عبدالصمد کو انھوں نے الفسٹن ہائی سکول میں داخل کرا دیا۔ سکول کے یہ نہایت ذہین طالب علم تھے۔ میراٹھی، انگریزی، عربی اور فارسی میں ہمیشہ سکول میں اول پوزیشن حاصل کی۔ ۱۹۱۵ء میں میٹرک کا امتحان امتیازی حیثیت میں پاس کیا۔ فارسی میں ۹۸ فی صد نمبر حاصل کیے، جس پر انھیں اعلیٰ تعلیم کے لیے اسکالرشپ کی پیش کش کی گئی لیکن ان کے والد (شیخ شرف الدین) نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ اس وقت بمبئی میں چند عرب علما قیام پذیر تھے۔ انھوں نے بیٹے کو ان علما سے عربی سیکھنے اور اس میں مہارت حاصل کرنے کی ترغیب دی چنانچہ وہ دن میں عرب اہل علم سے عربی سیکھتے اور حدیث کی کتابیں پڑھتے اور شام کو جے جے اسکول آف آرٹس میں آرٹ اینڈ آرکیٹیکچر (J.J School of Arts and Architecture) کورس کرتے۔ دو سال میں انھوں نے یہ کورس مکمل کر لیا۔

اپنے والد کے ساتھ وہ عربی کتابوں کی تجارت بھی کرتے تھے۔ ۱۹۱۸ء میں ان کے والد نے بمبئی کے بھنڈی بازار میں شرف الدین و اولادہ کی بنیاد رکھی۔ یہ پورے ہندوستان میں اپنی نوعیت کا عربی کتابوں کا اولیں کتب خانہ تھا۔ اس کتب خانے (یا ادارے) نے ہندوستان کے علاوہ عرب ملکوں میں بھی شہرت پائی۔ ان دنوں یہاں عرب علما کی بہ کثرت آمد و رفت رہتی تھی اور وہ اسی کتب خانے میں قیام کرتے تھے۔

کتابوں کی طباعت و فروخت:

مولانا عبدالصمد والد کے ساتھ کاروبار بھی کرتے تھے اور تحصیل علم کا سلسلہ بھی باقاعدہ جاری رکھتے تھے۔ مولانا محمد سورتی جو عربی ادب و علم کے بہت بڑے عالم کی حیثیت سے مشہور ہوئے، مولانا عبدالصمد کو کتبِ حدیث پڑھانے پر مامور تھے۔ جو اہل علم اس کتب خانے میں خاص طور پر تشریف لایا کرتے تھے، ان میں مولانا ابوالکلام آزاد، بمبئی کے نامور صحافی و عالم، حافظ علی بہادر خاں، احمد الشبیلی، مولانا محی الدین احمد قصوری، مولانا اسماعیل ٹونکی، پروفیسر سرفراز، مولانا عبدالرزاق حیدر اور دیگر بہت سے حضرات شامل ہیں۔ ایک جلیل القدر عالم ابوالخلیل تھے جو دراصل بھوپال سے تعلق رکھتے تھے اور بمبئی یونیورسٹی میں عربی کے ممتحن تھے، وہ سال میں دو دفعہ بمبئی آیا کرتے تھے اور ان کا قیام اسی کتب خانہ عبدالصمد شرف الدین میں ہوتا تھا۔ وہاں کتب خانے میں ہر اتوار کو مختلف اسلامی موضوعات پر اہل علم لیکچر دیا کرتے تھے، جس میں بہت سے اصحابِ علم شرکت فرماتے اور کثیر تعداد میں لوگ ان کی تقریریں سننے کے لیے آتے۔

۱۹۵۴ء میں شاہ سعود ہندوستان کے دورے پر آئے تو وہ اپنے صاحب علم مصاحب شیخ محمد نصیف کے ہمراہ اس کتب خانے میں بھی تشریف لائے تھے اور اسے دیکھ کر مسرت کا اظہار کیا تھا۔

مولانا عبدالصمد کتاب و سنت پر شدت سے عامل تھے اور جو شخص کتاب و سنت پر عامل ہوتا، اس سے تعلقات وابستہ کر لیتے۔ وہ بہت اچھے خطیب بھی تھے۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۶ء تک بمبئی کی بنگالی مسجد مومن پورہ میں خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے رہے۔ ان کا خطبہ جمعہ بمبئی میں بڑا مقبول تھا اور بے شمار لوگ اس میں شریک ہوتے تھے۔

۱۹۴۹ء میں مولانا عبدالصمد شرف الدین اہل و عیال سمیت بمبئی سے مستقل طور پر بھیونڈی چلے گئے اور وہاں انھوں نے عیدگاہ روڈ پر الدار القیمہ کی بنیاد رکھی، جس میں عربی، انگریزی، اردو، فارسی اور ترکی زبانوں میں تصنیف و تالیف اور طباعت و اشاعت کا کام شروع کیا۔ یہ نہایت اہم کام تھا، جس کا دائرہ ہند اور بیرونِ ہند میں پھیلا۔ اس میں ایک مشہور کتاب ہالینڈ کے بریل پریس سے چھپنے کے لیے آئی جو سات جلدوں پر مشتمل تھی۔ اس کے ابتدائی حصے ہالینڈ میں چھپے اور آخری حصے بھیونڈی کے الدار القیمہ میں طبع

ہوئے، اس طباعت کی بڑی تحسین کی گئی۔

ساتویں صدی ہجری کے ایک مشہور عالم حافظ المزّی ہیں جن کی ایک غیر مطبوعہ کتاب ''تحفۃ الاشراف بمعرفۃ الاطراف'' تیرہ جلدوں پر محیط ہے۔ اپنے موضوع کی یہ اہم ترین کتاب اسی ادارے الدار القیمہ میں چھپی۔ اس کے بعد السنن الکبریٰ کی طباعت کا مرحلہ طے ہوا۔ علاوہ ازیں مندرجہ ذیل کتابیں شائع کی گئیں:

۱- کتاب الرد علی المنطقیین ابن تیمیہ

۲- مجموعہ تفسیر ابن تیمیہ

۳- انواع الاستفتاح ابن تیمیہ

۴- کتاب مجابی الدعوۃ ابن ابی الدنیا

۵- الکشاف

یہ چند کتابوں کے نام ہیں، ان کے علاوہ بے شمار کتابیں عبدالصمد شرف الدین کے مرکزِ طباعت الدار القیمہ کی طرف سے شائع کی گئیں اور شائقینِ علم کے مطالعہ میں آئیں۔

اسلام کے عظیم مبلغ:

مولانا عبدالصمد ذی عزم عالم اور اسلام کے مخلص ترین خادم تھے۔ ۱۹۴۸ء میں انھوں نے اپنے خرچ سے مسجد الدار القیمہ تعمیر کرائی، جس میں وہ خطباتِ جمعہ ارشاد فرماتے رہے۔ پھر انھوں نے انجمن اسلام ہائی سکول بمبئی میں ہر اتوار کو انگریزی میں لیکچر دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ ان لیکچروں میں بہت سے لوگ شمولیت کرتے اور مولانا ممدوح کے اسلوبِ بیان اور تحقیقی انداز کلام سے متاثر ہوتے۔ انھوں نے انگریزی اور اردو میں کتابچے چھاپنے اور مختلف غیر مسلموں کے نام خطوط لکھنے کی مہم بھی شروع کی۔ یہ اپنے نہج کا اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا موثر ترین سلسلہ تھا۔

انگریزی میں جو کتابچے چھاپ کر انھوں نے غیر مسلموں اور مسلمانوں کو بھیجے، ان کے عنوان اس قسم کے تھے: بت پرستی اور خدا پرستی، اسلام کیا ہے؟، کیا سیاہ پتھر (حجر اسود) ایک بت ہے، بین الاقوامی اسلام، عظمتِ خدا، انسان اور شیطان، روحِ انسانی، خدا اور حیات بعد الموت پر ایمان، اسلامی دعوت، منصوبہ بندی، انقلابِ محمد (ﷺ)، خدا کا وجود اور اس کی عظمت، آفاقی مذہب، وجدانی خواہشات کا بھید، اسلام کی سچی کہانی، انسان کی ترقی اور قرآنی اقدار، بائبل اور قرآن۔

اسلام کی تبلیغ کا یہ بہت اچھا طریقہ تھا جو نہایت موثر ثابت ہوا۔ مطبوعہ مواد صرف وہی شخص نہیں پڑھتا جسے وہ بھیجا جائے بلکہ اسے بہت لوگ پڑھتے ہیں۔ جس گھر میں وہ بھیجا گیا ہے، اس گھر کے چھوٹے بڑے

سب افراد اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اگر سب افراد نہیں تو دو چار افراد تو اس سے متاثر ہوتے ہی ہوں گے۔

مولانا عبدالصمد بڑے متحرک اور تیز عمل شخص تھے۔ انھوں نے مختلف ملکوں کی سیاحت بھی کی جس سے ان کا مقصد اسلام کی ترویج اور تحصیلِ علم تھا۔ آیئے اس پر بھی نظر ڈالتے جایئے:

۱۹۳۱ء میں وہ حجاز، دمشق اور مصر کے دورے پر گئے۔ مصر میں ایک سال ان کا قیام رہا۔ اس اثنا میں عربی زبان میں مہارت حاصل کی۔

۱۹۴۸ء میں سعودی عرب کا عزم کیا۔ وہاں ڈیڑھ سال اقامت گزیں رہے۔ اس دوران میں مشہور عالم شیخ عبدالرزاق حمزہ سے کتبِ حدیث پڑھیں۔

۱۹۶۲ء میں یورپ کا دورہ کیا۔ ہالینڈ گئے تو وہاں کے روٹری کلب کے ارکان کے مجمعے میں اسلام کی حقانیت کے موضوع پر تقریر کی جو نہایت غور سے سنی گئی۔ حاضرین نے ان کے مخلصانہ جذبات اور زبان واسلوب کی بڑی تعریف کی۔

اسلام کے اس بہت بڑے داعی و مبلغ نے سوویت روس کے صدر خروشیف کو قبولیتِ اسلام کی دعوت دی۔ ہندوستان کی (سابقہ وزیر اعظم) اندرا گاندھی اور وہاں کے ایک اور سابق وزیر اعظم مرار جی ڈیسائی کو بھی دعوتِ اسلام دی۔ دنیا کے مختلف سربراہوں اور اسلام کے شدید مخالفوں کو اسلام پیش کر کے ان پر حجت قائم کی۔

۱۹۵۲ء میں دہلی میں مذہبی عالمی کانفرنس منعقد ہوئی تو اس میں خطاب کیا اور اسلام کی حقانیت سے متعلق مدلل مقالہ پڑھا۔

غرض وہ بلا جھجک ہر مجمعے میں اسلام کی صداقت کا اعلان کرتے اور اس کی خصوصیات کا خوب صورت الفاظ میں تذکرہ فرماتے۔ وہ اسلام کے صاف ذہن اور جرأت مند مبلغ تھے۔

اس مبلغ اسلام کے میرے سامنے دو غیر مطبوعہ خط ہیں۔ ایک خط انھوں نے اپنے ایک ملنے والے ہندو جناب کوی راج بھاٹیہ کو الدار القیمہ بھیونڈی سے ۲۱ جنوری ۱۹۷۳ء کو لکھا۔ یہ خط ان کی اس خط کتابت کا حصہ ہے جو پہلے سے جاری تھی اور قرآن مجید سے متعلق تھی۔

دوسرا خط ۱۹ر دسمبر ۱۹۸۰ء کا رقم کردہ ہے جو نئی دہلی کے جناب بی-کے- نارائن کے نام ہے۔ یہ خط نارائن صاحب کے ۶-دسمبر ۱۹۸۰ء کے خط کے جواب میں لکھا گیا۔ یہ دونوں خط بہت سی معلومات کا احاطہ کیے ہوئے ہیں اور کافی طویل ہیں۔ دیارِ ہند میں اس قسم کے مبلغ اسلام ہمیشہ موجود رہے ہیں، یہ دونوں خطوط یہاں درج کیے جا رہے ہیں۔ پہلے کوی راج بھاٹیہ کے نام ۲۱۔ جنوری ۱۹۷۳ء کا خط پڑھیے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الدار القیمۃ بھیونڈی ۲۱-جنوری ۱۹۷۳ء

محترم جناب کوی راج بھاٹیہ صاحب! السلام علی من اتبع الھدیٰ!

آپ کا خط مؤرخہ ۱۸؍جنوری کل وصول ہوا۔ میں نے پورا پڑھ لیا۔ یہ آپ کا چوتھا خط ہے۔ ان خطوط کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ قرآنِ پاک کے سمجھنے کی آپ کو دلی خواہش ہے، مگر اس راہ میں کافی رکاوٹیں حائل ہیں۔ میں صدقِ دل سے چاہتا ہوں کہ ان رکاوٹوں کو دور کرسکوں۔ میں ان شاء اللہ اس کی ضرور کوشش کروں گا، مگر جب تک آپ کا پرتپاک عملی تعاون مجھے حاصل نہ ہوگا، یہ امر کسی طرح ممکن نہیں۔

اگر آپ اس کے لیے تیار ہوں تو میں جو کچھ لکھوں گا اسے غور سے سنیئے!

سب سے پہلی بات جسے سمجھنا ازبس ضروری ہے وہ یہ ہے کہ یہ قرآن کوئی مسلمانوں کی اپنی پراپرٹی نہیں ہے۔ بلکہ یہ بنی نوع انسان کے ہر فرد کے لیے اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ ﴿اِنْ ھُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾ یہ کوئی ضروری نہیں کہ صرف مسلمان ہی قرآن کو سمجھ سکیں اور مشرک اور غیر مسلم اسے نہ سمجھ پائیں۔ ﴿وَ فَوْقَ کُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ۔﴾ حقیقی مسلمان تو وہ ہیں جو اس قرآن کو سمجھنے کے بعد مسلمان ہوتے ہیں۔ اس لیے مسلمان کہلا کر قرآن کو نہ سمجھنا سراسر خلافِ قیاس ہے۔ ایسے لوگ مسلمان ہی کب ہوئے؟

قرآن ان نام نہاد مسلمانوں کے خلاف ایک کھلی حجت (دلیل) ہے، ٹھیک جس طرح توراۃ اور انجیل یہود و نصاریٰ کے خلاف کھلی حجت ہیں۔ اس بارے میں مسلمان اور اہلِ کتاب دونوں برابر ہیں، دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

لہٰذا آپ کا بار بار مسلمانوں کی مثال دینا، اور ان کے خلاف شکایت کرنا، کوئی معنیٰ نہیں رکھتا۔

یاد رکھنے کے قابل دوسری حقیقت یہ ہے کہ قرآن ایک سراپا ہدایت بخشنے والی کتاب ہے۔ ﴿ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَo﴾ یعنی یہ کتاب جو برحق ہے، ہر شبہے سے خالی، متقین کو ہدایت دینے والی ہے۔ کیا معنیٰ؟ یہ کہ جو بھی اسے پڑھے گا متقی بن جائے گا، چاہے وہ کافر اور مشرک رہا ہو، یا فاسق و فاجر۔ جیسا کہ مشرکینِ عرب نے جب اسے سنا اور پڑھا تو وہ مومن اور متقی بن گئے، اور وہ ہدایت یافتہ ہوگئے۔

نیز ہدایت پانے والوں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو پیشتر ہی سے متقی اور ہدایت یافتہ تھے۔ ایسے لوگوں کے لیے یہ کتاب مزید ہدایت کا باعث بنتی ہے۔ کیوں کہ ہدایت کے مختلف درجے ہیں۔ اسی طرح ہدایت کم یا زیادہ ہوتی رہتی اور گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ اس لحاظ سے ہر شخص کو ہر وقت ہدایت حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ ہدایت کی مختلف اور اقسام بھی ہیں، اور ہر قسم کی ہدایت کی انسان کو ضرورت ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے

نماز کو فرض کر دیا ہے، اور ہر نماز میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا اور اس دعا کا مانگنا کہ اِہْدِ نَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ یعنی ہم کو ہدایت دے صراطِ مستقیم کی۔ وہ صراط مستقیم جو گوناگوں ہدایتوں پر مشتمل ہے۔ پھر ہدایت کی دو موٹی موٹی قسمیں ہیں، ایک ہدایت علم حق و باطل، دوسری ہدایتِ عمل اور توفیق، یعنی راہِ حق پر چلنا اور باطل سے بچنا۔ کیونکہ صرف حق و باطل کی پہچان کافی نہیں ہے، جب تک کہ صحیح راستے پر عمل کر کے چل نہ سکے۔ ہدایتِ صراط مستقیم میں یہ دونوں ہدایتیں شامل ہیں اور نمازی دونوں ہدایتیں اللہ سے طلب کرتا ہے۔ اس طرح اللہ کی یہ کتاب یعنی قرآن مکمل ہدایت کی کتاب ہے۔

قرآن سے متعلق تیسری بات جو یاد رکھنی چاہیے یہ ہے کہ وہ ایک اصول و قوانین والی کتاب ہے، جو زندگی کے تمام شعبوں کے قاعدے قانون، حقائق وضوابط، اصول ومبادی، اس محکم طریقے پر بتلاتی ہے کہ ان میں کبھی بھی کوئی فرق نہیں آ سکتا۔ مثلاً فرمایا ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝﴾ جو کوئی ذرہ برابر خیر کرے گا اسے دیکھ لے گا، اور جو ذرہ برابر شر کرے گا اسے بھی دیکھ لے گا۔ اسی طرح فرمایا: ﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ اور فرمایا اَلَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ وغیرہ وغیرہ۔

قرآن کی چوتھی بے نظیر خصوصیت اس کا کمالِ ایجاز ہے، اور یہی اس کا اعجاز ہے۔ اسی لیے اس کے مانند کوئی بھی ایک آیت نہیں لا سکتا۔ حتیٰ کہ کسی بھی دوسری آسمانی کتاب میں بھی یہ بلاغت موجود نہیں ہے۔ ضرورت سے زائد ایک لفظ بھی کہے بغیر مکمل مطلب ادا کر دینا یہ محض قرآن کا ہی معجزہ ہے۔

مثال کے طور پر سورہ فاتحہ ہی کو لیجیے، جس میں چھوٹی چھوٹی سات آیتیں ہیں۔ مگر ان سات آیات میں قرآن مجید کا مکمل خلاصہ سمو دیا گیا ہے۔ پہلی تین آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی کل صفات بیان ہوئی ہیں، نیز اللہ تعالیٰ کی کمالِ حمد وثنا وتمجید، اور روزِ قیامت، حیاتِ آخرت، جزاوسزا کا تذکرہ۔

ان تین آیتوں میں اللہ کے چار اسماء حسنیٰ مذکور ہیں: اللہ، رب، الرحمٰن، الرحیم، اور مالک یا ملک۔ اللہ اسم علَم ہے جو اللہ کی الٰہیت کے لیے مخصوص ہے۔ یہ نام اتنا جامع ہے کہ اس میں اللہ کے کل اسماء حسنیٰ آ جاتے ہیں۔ اسی لیے سورۂ حشر کے آخر میں کہا ﴿لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى﴾ پھر الٰہیت ہی وہ صفت ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو سزاوار نہیں۔ یہی ہے کلمۂ توحید لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اس اسم کے تحت اللہ کی کل صفاتِ کمال و جمال، عظمت وجلال، تعظیم ومحبت، قابل توکل وانابت آ جاتی ہیں۔

رب العالمین میں مکمل ربوبیت کا مجموعہ آ گیا۔ یعنی اللہ کا کل مخلوقات کا خالق و مالک، رازق و مددگار،

محیی ومميت، قادر وقاہر، عالم وحاکم، قوی وحکیم، سمیع وبصیر وغیرہ ہونا۔ ساتھ ہی تمام مخلوقات کا محکوم ومربوب، عاجز وناتواں، محتاج وفقیر، مغلوب ومقہور، عبد وبندہ ہونا آ گیا۔

الرحمٰن الرحیم میں اللہ کی عالم گیر رحمت کا ذکر ہے جو کائنات کے ہر ذرے پر محیط ہے۔ نیز جملہ صفات رحم وکرم، عفو ومغفرت، احسان واکرام، عطاء ودہش، داد وفریاد، رأفت ورحمت، بخشش وبخشائش، ستاری وغفاری، حلم وبردباری وغیرہ وغیرہ ضمناً اس کے تحت آ گئیں۔

اسی طرح مالک یوم الدین میں خدا کی ہمہ گیر بادشاہت، عدل وفضل، حکم اور فیصلہ، قدرتِ جزا وسزا، عطاء جنت اور انتقام دوزخ، اور دوام حکومت ومملکت کے کل اوصاف آ گئے۔ نیز روزِ قیامت کا بیان، حساب وکتاب، ہول محشر، پل صراط اور جہنم کی کامل یاددہانی آ گئی۔

یہ تو ہوئی اللہ کی توحید علمی۔ چوتھی آیت کامل درجے کی توحید عملی پر مشتمل ہے، جب کہ بندے کی زبانی خود اللہ تعالیٰ نے سکھلا کر کہلوایا ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ٥﴾ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔

اس توحیدِ عملی کے بغیر کوئی شخص بھی مومن تو مومن، معمولی مسلم تک نہیں بن سکتا۔ اتنے سے ایک ٹکڑے میں انسان خدا کے سوا ہر معبود کو چھوڑ کر صرف اسی کا سچا بندہ بن جاتا ہے۔ اس میں ایک طرف انسان اللہ کی طرف بکمال وتمام جھک کر اسی کی عبادت کو اپنا مقصودِ زندگی بنا لیتا ہے، تو دوسری طرف وہ اس مقصد کی براری کے لیے بھی صرف اسے ہی چن لیتا ہے۔ یعنی خدا ہی مقصود بھی ہے اور وہی اس کا ذریعہ۔

آیت نمبر ۵ میں انسان سب سے جامع دعا جو ہو سکتی ہے اسے مانگتا ہے، یعنی صراطِ مستقیم کی ہدایت۔ صراط مستقیم تفصیل ہے کل عبادت الٰہی کی، جس کا اعتراف پچھلی آیت میں بندہ کر چکا ہے۔ یہ بھی توحید ہی ہوئی۔ یا یوں کہیے کہ توحید علمی اور توحید عملی کے لوازمات، شرائط اور حقوق والا مکمل سیدھا راستہ طلب کرنا۔ ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾

چھٹی آیت ان لوگوں کے بیان میں ہے جو اللہ کے موحد، عبادت گزار، مطیع اور فرماں بردار بندے ہیں، جو حق کو جانتے بھی ہیں اور حق کی کامل پیروی بھی بجا لاتے ہیں۔ جو اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ ان لوگوں میں سے کسی ایک کا بھی نام لیے بغیر ہی ان سب کی طرف مکمل اشارہ کر دیا۔ حالانکہ اس گروہ میں اللہ کے کل پیغمبران اور کل صدیقین، کل شہداء اور کل صالحین شامل ہیں۔ یہ ہے کمالِ ایجاز۔ پھر یہ کہ توحید والوں ہی کی کل سرگزشت اس آیت میں آ گئی اور یہ کہ ان لوگوں کا دنیا میں اور آخرت میں انتہائی نیک انجام ہوتا ہے اور ہوگا، اور ان کا ہی جنتی ہونا سب کچھ آ گیا اور یہی لوگ ہمارے لیے نمونہ بن جائیں۔ اس کی دعا:

﴿صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ﴾

اور آخری ساتویں آیت میں ان دو گروہوں کا ذکر آیا جو اللہ کے غضب کے مستحق ہوئے اور سراسر گمراہ۔ پہلا فرقہ وہ ہے جنھوں نے حق کو جان کر دیدہ و دانستہ حق کی مخالفت کی اور دوسرا گروہ جو حق کو نہ جان کر گمراہ ہوئے۔ دنیا کا ہر گمراہ فرقہ ان دو اوصاف سے یا ان میں سے ایک وصف سے خالی نہیں ہوتا۔ یہی جہنمی لوگ ہیں جنھوں نے توحید کو ٹھکرایا اور اس کی خلاف ورزی کی۔ ﴿غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ﴾۔

اسی لیے سورہ فاتحہ مکمل قرآن کے جملہ مضامین کا مختصر خاکہ ہے۔ قرآن کی جو آیت بھی آپ لے لیں، یا تو وہ توحید علمی پر ہوگی یا توحید عملی پر یا توحید کی تفاصیل پر یا ان لوگوں کے حالات پر جو توحید والے ہیں اور ان کا انجام و انعام یا ان لوگوں کے واقعات پر جنھوں نے توحید کو جھٹلایا اور ان کا انجام کار اور آخری ٹھکانا۔ اس طرح کل قرآن اور الفاتحہ سراسر توحید ہی توحید کی داستان اور کارگزاری ہے۔

نیکوکاروں میں کل انبیائے کرام مثل نوح و ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ و محمد آ گئے، کل صدیقین مثل ابوبکر صدیق اکبر آ گئے، کل شہداء مثل عمر فاروق آ گئے اور کل صالحین و اولیاء اللہ، شیخ عبدالقادر جیلانی، و علماء و فضلاء آ گئے۔ اور کسی ایک کا بھی نام لینا نہ پڑا۔

اسی طرح بدکاروں میں ہر ظالم و مشرک و کافر آ گئے، چاہے وہ نمرود رہا ہو یا فرعون یا ہامان یا قارون، ہر گمراہ قوم مثل عاد و ثمود، قوم لوط یا قوم فرعون ان میں سے بھی کسی کا خاص نام لینا لازم نہ ہوا۔

اس ایجاز کو دیکھیے، اس بلاغت کی داد دیجیے اور صرف ایک ہی بات لے کر نہ چلیے کہ قرآن میں نمرود کا ذکر کیوں نہیں آیا، یا فلاں کا اور فلاں کا۔ انبیاء کرام ہوں، یا ظالم و جاہل، ان کے قصوں سے عبرت حاصل کرنا مقصود ہے اور ہدایت۔ ان کی ذاتوں اور شخصیتوں سے کوئی خاص سروکار نہیں۔ الا اس وقت جب کہ کسی کا نام لینا ہی ضروری ہو جائے۔

یہ قرآن کل کا کل محمد ﷺ پر نازل ہوا، مگر اس میں آپ کا نام صرف چار جگہ آیا ہے اور جہاں بھی نام لیا ہے وہاں کسی نہ کسی عظیم مصلحت کے تحت لیا ہے۔

قرآن میں اعلام بہت کم آئے ہیں۔ صرف ایک جگہ زید بن حارثہ کا نام آیا ہے، سارے قرآن میں نہ ابوبکر صدیق کا نام آیا ہے، نہ عمر بن خطاب کا، اور نہ دیگر خلفائے راشدین کا، نہ عشرۂ مبشرہ میں سے کسی کا، نہ ازواج مطہرات میں سے، نہ دیگر عام صحابہ کرام میں سے کسی کا۔

انبیائے کرام کا کثرت سے ذکر آتا ہے، مع ناموں کے۔ ایسے انبیاء کا ذکر بھی کیا ہے جن کے نہ نام لیے اور نہ ان کے قصے بیان کیے۔ موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں فرعون کا ذکر بارہا آیا ہے، اس لیے کہ اس نے

حضرت موسیٰ اور ان کی قوم سے باقاعدہ لڑائی کی تھی اور پھر فرعون کو مع اس کی قوم کے غرق کر دیا گیا۔ ابراہیم علیہ السلام کے مقابلے میں نمرود کا ذکر نہیں کیا، کیونکہ اس کے ساتھ صرف مناظرہ ہوا تھا۔ لڑائی کی نوبت نہیں آئی۔ مناظرے میں بھی نمرود کی صفت جباریت بیان کی، نیز اس کی حماقت اور انتہائی بے وقوفی کا مذمت آمیز ذکر آیا ہے۔ گویا وہ اس قابل ہی نہ تھا کہ اس کا نام بھی لیا جائے۔

ابوجہل کا کہیں ذکر نہیں ہے، مگر ابولہب کا ہے جو آپ کا سگا چچا تھا اور اس نے کمربستہ ہو کر آپ کی مخالفت کی تھی، اس لیے اس کا ہمیشہ جہنم واصل ہونے کا ذکر قیامت تک تلاوت ہوگا۔

قرآن پاک کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ اللہ کی سب سے آخری کتاب ہے اور کل دیگر سابق کتابوں پر حاوی اور حاکم۔ بلکہ کل سابق کتابوں کو منسوخ کر دینے والی، قیامت تک کے لیے جاری و ساری رہنے والی ایک ہی کتاب اپنی نوعیت میں ممتاز ولاجواب کتاب ہے۔

سب سے بڑی شان قرآن کی یہ ہے کہ جملہ دیگر کتب میں انسانوں کے ہاتھوں تحریف و تبدیل ہوئی ہے، چاہے وہ وید رہے ہوں، تورات و انجیل و زبور ہوں یا کوئی اور کتاب۔ ان میں سے کوئی بھی کتاب جوں کی توں محفوظ اور مصوؤن نہیں ہے۔ کسی بھی کتاب کو قرآن کے سوا کامل وثوق کے ساتھ غیر محرف نہیں ٹھہرا سکتے۔ اس کے برخلاف قرآن کا ایک ایک حرف، بلکہ شوشہ، ہر طرح محفوظ کر دیا گیا ہے، اور خدا نے اس کی حفاظت کی مکمل ضمانت لے لی۔ چاہے دنیا بھر کے ہندو اسے جلاتے پھریں، یہود اس کی جھوٹی تبدیل شدہ اشاعتیں چھاپ دیں، مگر اس کتاب کی آیات و نصوص ہمیشہ کے لیے ناقابل تبدیل بنا دی گئیں۔

اس لیے ہر قاری قرآن کو چاہیے کہ اسے اللہ کا کلام تصور کرے، انسان و فرشتے کا نہیں، نہ ہی جنوں اور شیاطین کا۔ یہ سراپا کلام حق ہے۔ غیر مخلوق۔ اس کی جو بات سمجھ میں آئے سمجھ لے، جو نہ آئے اسے اس کے جاننے والے پر چھوڑ دے۔ اس کی کسی بھی آیت کو غلط اور جھوٹ نہ جانے۔ اس پر اعتراض کرنے کی بجائے اپنی ناقص فہم و سمجھ پر تہمت دھرے اور اپنے قصور فہم کا اعتراف کرے۔

آپ کا آخری خط قرآن پر اعتراضات سے پُر ہے۔ آپ نے بظاہر مسلمانوں پر اعتراض جڑے ہیں، مگر درحقیقت یہ اعتراضات خود قرآنِ پاک پر ہیں اور سب کے سب لایعنی اور لغو اعتراضات ہیں۔

اگر آپ میرے اس مقدمے کو غور اور دھیان سے پڑھ لیں گے اور پڑھنے کے بعد قرآن کو سمجھنے کی کوشش کریں گے تو ان سارے اعتراضوں کے جوابات خود آپ ہی نکال لیں گے۔ میرے یا کسی اور کے بتلانے کی آپ کو ضرورت نہ ہوگی۔ اس لیے میں آپ کا آخری خط (دو اوراق والا) جوں کا توں واپس کرتا ہوں۔ یہ آئندہ کام آئے گا۔

اگر میرے اس تمہیدی بیان سے آپ کو تشفی ہوتی ہے اور آپ غور سے سننے کے لیے تیار ہوں تو مجھے لکھتے رہیں۔ ان شاء اللہ آپ کے لیے اس آیت کی تشریح لکھوں گا جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کا مناظرہ ہے اور اس میں کیا کچھ علم و ہدایت مضمر ہے۔ آیت نور کی تفسیر کا موقع ابھی نہیں آیا ہے۔

میرے عزیز کوی راج! یہ خوب یاد رہے کہ جب تک کوئی بھی شخص قرآن کو بالکل بے لاگ، بے لوث، بے غرض اور بے تعصب ہو کر نہیں پڑھے گا تب تک اسے ہرگز نہیں سمجھے گا۔ بلکہ قرآن اس کے لیے باعثِ گمراہی بنے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا وَّ یَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا ''اللہ اس قرآن سے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو اس سے ہدایت دیتا ہے۔''

ایک اور ہندو کے نام خط:

اب ملاحظہ ہو دوسرا خط جو بی- کے نارائین کے نام ۱۹- دسمبر ۱۹۸۰ء کو لکھا۔

جدہ ۱۹ دسمبر ۱۹۸۰ء

عزیزی جناب بی- کے- نارائن صاحب شاد باد! نیو دہلی

نامۂ گرامی مؤرخہ ۶ر دسمبر سے متعلق کل والے خط میں کتابچہ ''مراسلت'' کی مدح سرائی والی میٹھی چھری سے ذبح ہونے والی شیطانی چال کا پول کھول چکا ہوں۔ و للہ الحمد۔ آج حسب وعدہ دوسری چھری کے تذکرے کا دن ہے، جو نہایت تلخ و تیز چھری ہے۔ اس چھری کی حقیقت جاننے کے لیے ہمیں ''مراسلت'' کے ص ۴۸ کے فقرۂ ثانی کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ اس فقرے کی عبارت حسب ذیل ہے:

> ''ویسے ہندو مسلمانوں کے خون کے پیاسے سہی، مگر کم از کم میں چاہتا ہوں کہ ہر ہندو کو جہنم کی دہکتی ہوئی آگ سے بچا سکوں، اور جنت فردوس میں داخل کرا سکوں، تاکہ جنت کی شرابِ طہور، اور آبِ کوثر، سے ان کی پیاس بجھا سکوں۔''

فی الحقیقت یہ فقرہ غیر شعوری طور پر میرے قلم سے نکل گیا تھا، جو میرے ہندو احباب کو بجا طور پر کھل رہا ہے، اور جسے وہ ''غیر متوازن'' اور ''یک طرفہ'' محسوس کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ ''یہ فقرہ باقی کتابچہ سے اور اس کی روح سے ہٹا ہوا ہے۔''

مگر اب سوچ رہا ہوں کہ مشیتِ الٰہی میں جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ لیکن مشیتِ الٰہی میں ہمیشہ وہی ہوا کرتا ہے جو در حقیقت ہونا چاہیے۔

بات دراصل یہ ہے کہ حقیقتِ اسلام پر میں نے یہ کتابچہ لکھنے کو تو لکھ دیا، مگر سارا زورِ قلم اسلام کے مبادیات اور اصول کے بیان پر خرچ ہو گیا اور اس حد تک وہ بالکل ٹھیک ہے۔ یہاں تک کہ اس کے پڑھ لینے

اور ہضم کرنے میں آپ لوگوں کو بھی کوئی اعتراض نہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ حضرات اسلام اور قرآن کی اصطلاح میں نرے کافر، مشرک اور جہنمی لوگ ہیں۔

تو پھر جب یہ کتابچہ ہندو حضرات کو اسلام کی حقیقت سمجھانے کے لیے لکھا گیا ہے تو کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ ان کو کفر کی حقیقت اور کفر و اسلام کے درمیان تضاد و مخالفت کو بھی کھول کر بیان کر دیا جائے۔ یقیناً یہ ہونا چاہیے اور یہ فقرہ اسلام کے اسی بظاہر ناگوار اور نیش دار پہلو کے بیان کا پیش خیمہ ہے۔

آیئے اس ناگوار پہلو کا بھی ڈٹ کر مقابلہ کریں تاکہ اسے کماحقہٗ سمجھ سکیں۔ حقائق کے سمجھنے کے لیے حقائق کا مقابلہ کرنا چاہیے، نہ کہ ان سے کترا کر پہلو تہی کرنا۔ ہم کفر اور اسلام کی حقیقت کو جاننا چاہتے ہیں تو اسے کھول کھول کر جان لیں، نہ کہ میاں مٹھو تو میرا پٹھو کہہ کر اسے ٹال دیں۔

یہ بالکل ظاہر اور عیاں ہے کہ اسلام اور کفر دو متضاد اور مخالف ملتیں ہیں جو ایک دوسرے کے دشمن ہیں اور کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ صرف سیاسی طور پر کہہ دینا کہ ''ہندو مسلم بھائی بھائی'' کبھی درست نہیں ہو سکتا، بلکہ یوں کہنا چاہیے ''ہندو مسلم الگ تھلگ''۔ ظاہر ہے کہ ایک اور صرف ایک خدا کے پوجنے والے اور ۳۳ کروڑ دیوتوں کے پوجنے والے کیسے برابر ہو سکتے ہیں۔

اسلام اور کفر کے درمیان کا صحیح نقشہ دیکھنا ہو تو آج سے ۱۴۰۰ سال قبل والے شہرِ مکہ میں چلے چلیے، جب کہ اسلام کا نام و نشان موجود نہ تھا اور عرب کے کل باشندے ہندوؤں کی طرح کافر اور مشرک تھے، الا چند گنتی کے یہود و نصاریٰ جو جہاں تہاں خال خال نظر آتے تھے، یہ بھی اگرچہ اہلِ کتاب کہلاتے تھے، تاہم عملاً و اعتقاداً صحیح موحد نہ تھے۔

اس گھٹا ٹوپ کفر و شرک کی فضا میں حضرت محمد بن عبداللہ ﷺ، بانی اسلام، مبعوث ہوتے ہیں، اس وقت جب کہ ایک بھی فردِ بشر مسلم موجود نہ تھا، بلکہ سب کے سب اہلِ مکہ بت پرست مشرک تھے۔

جیسے ہی آپ ﷺ نے اپنی نبوت کا اعلان کیا اور دعوتِ حق پیش کی، لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہونے لگے۔ مسلم اور مشرک، مؤمن اور کافر۔ ساتھ ہی دونوں گروہوں کے درمیان اختلاف و افتراق، نفرت و عناد، ظلم و استبداد کا بازار گرم ہو گیا جو روز بروز بڑھتا ہی گیا۔

ظاہر ہے کہ اکثریت بت پرستوں کی تھی، نیز حکومت و سلطنت، حرفت و تجارت، طاقت و سطوت بھی انھی کی تھی۔ اگرچہ مسلمانوں کی تعداد، کمزوری کے باوجود بڑھتی ہی گئی مگر مشرکین کا ظلم و ستم کسی طرح کم نہ ہوا اور جب یہ ظلم و ستم حد سے بڑھ گیا تو اللہ کی طرف سے حکم آیا کہ اللہ کے لیے ملک و وطن چھوڑ کر ہجرت اختیار کر لو۔ پہلی ہجرت حبشہ کو ہوئی اور دوسری یثرب (یعنی مدینہ) کو۔ وہاں بھی ظالموں نے ان جویائے حق کا پیچھا نہ

چھوڑا۔ یہاں تک کہ مجبوراً اپنی اور اپنے دین کے تحفظ میں ہتھیار اٹھا کو لڑنے کا حکم نازل ہوا۔

یہ تھے وہ حالات جن کے تحت مسلمانوں کو تلوار اٹھانی پڑی، نہ یہ کہ اسلام بزور شمشیر پھیلایا گیا، جیسا کہ دشمنانِ اسلام آئے دن کہا کرتے ہیں۔ جو لوگ اس وقت تک اسلام لا چکے تھے وہ کون سی تلوار کے ڈر سے لائے تھے؟ نہیں، بلکہ خود ان پر تلوار کھینچی گئی تھی، تب اپنے تحفظ کے لیے انھیں تلوار کھینچنی پڑی۔ اسلام تو ایک کھلا ہوا سچا مذہب ہے جو خود بخود دل میں اتر جاتا ہے۔

اب دیکھیے حق میں کتنی طاقت ہے اور باطل کتنا بودا؟ جوں ہی خدا نے ان مظلوم حق پرستوں کو اس کی راہ میں دفاع کرتے ہوئے لڑنے کی اجازت دے دی، تو پھر کیا ہوا؟ مکہ سے جلا وطن ہو کر مدینہ میں آئے ہوئے یہ مومن موحّد مسلمان ہجرت کے دوسرے ہی سال میں مدینہ سے قریب بدر نامی مقام پر سب سے پہلے معرکے میں کفارِ مکہ سے جب بھڑ جاتے ہیں تو کیا غضب ڈھاتے ہیں؟ تعداد ان کی کل ۳۱۳ اور دشمن ایک ہزار سے اوپر مسلمان ساز و سامان میں بھی مقابلتاً بہت کم۔ مگر جب لڑائی ہوتی ہے تو صرف ۸ یا ۹ شہید ہوتے ہیں، مگر ۷۰ کفار کو قتل کرتے ہیں، اور ۷۰ کو قید کر کے مدینہ لے جاتے ہیں۔

اور کیوں نہ ہو؟ یہ اللہ والے لوگ تھے، اللہ ان کے ساتھ تھا اور جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔

جنگِ بدر سے متعلق ایک عجیب واقعہ آتا ہے جو سننے کے قابل ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے جن لوگوں کو قید کر لیا تھا ان کو آزاد کرانے کے لیے مکہ سے جو لوگ گئے تھے ان میں ایک بڑے قریشی سردار بھی تھے جن کا نام تھا جبیر بن مطعم جو علم انساب کے مشہور علما میں سے تھے۔ جس وقت یہ مدینہ پہنچے تو مغرب کا وقت ہو چکا تھا اور رسول اکرم ﷺ مسجد نبوی میں نماز مغرب پڑھا رہے تھے اور ان کی تلاوت کی آواز باہر آ رہی تھی۔

آپ نماز میں سورۂ طور تلاوت کر رہے تھے۔ جبیر بن مطعم جو کافر تھے کہتے ہیں کہ جب آپ ان آیتوں پر پہنچ کر پڑھنے لگے ﴿اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخَالِقُوْنَ ۝ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ۝﴾ تو انھیں سن کر قریب تھا کہ میرا دل اڑنے لگ جائے (کاد قلبی أن یطیر) یعنی ان آیتوں کے معنی و مطلب اس قدر رقت آمیز اور ایمان پرور تھے کہ ان کا دل پگھل گیا۔ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے ان آیتوں کو سن کر ہی دل میں ایمان اتر آیا تھا۔ حالانکہ چھے سال بعد فتح مکہ (۸ ہجری) میں وہ مشرف باسلام ہوئے تھے۔

آیتوں کا ترجمہ یہ ہے ''کیا بے کسی کے پیدا کیے (یہ آپ) پیدا ہو گئے ہیں؟ یا یہی (مخلوقات کو) پیدا کیا کرتے ہیں؟ یا انھوں نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا ہے؟ (ان کا تو کیا مقدور تھا) مگر یوں (کہو کہ یہ

لوگ خدا پر) یقین ہی نہیں لانا چاہتے۔" (الطور: ۲۵-۲۶)

خوب غور کیجیے کہ یہ کفار اور مسلمین کے درمیان عینِ جنگ کا موقع ہے، جبیر بن مطعم جیسا کافر سردار اپنے قیدی چھڑانے کی غرض سے اسلامی کیمپ میں آیا ہے، اور وہاں پہنچ کر اچانک غیر اختیاری طور پر قرآن کی آواز اس کے کان میں پڑتی ہے، جس سے ایمان کی جھلک اسے نظر آتی ہے۔ تو کیا یہ ایک کرشمۂ جنگ نہیں ہوا؟ نہ جنگ بدر جیسی خوں خوار لڑائی ہوتی، نہ کفار قید ہوتے، نہ قیدیوں کو چھڑانے پہنچتے اور نہ یہ ندائے حق سنتے اور بالآخر ایمان لا کر جنت میں پہنچتے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ (آل عمران: ۱۱۰)

یعنی "لوگوں (کی راہنمائی) کے لیے جس قدر امتیں پیدا ہوئیں ان میں تم (مسلمان) سب سے بہتر ہو۔"

اس آیت کی تفسیر میں امام بخاری رحمہ اللہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث لاتے ہیں کہ ((خير الناس للناس، تأتون بهم في السلاسل في اعناقهم حتى يدخلوا في الاسلام)) (البخاري، كتاب التفسير، سوره آل عمران، باب ٧) ترجمہ: "یعنی تم میں سے بعض لوگ بعض لوگوں کے حق میں بہترین ثابت ہوتے ہو، کیونکہ تم ان کو ان کی گردنوں میں زنجیریں پہنا کر لے آتے ہو تا کہ وہ اسلام میں داخل ہو جائیں۔" مراد ان سے وہ کافر ہیں جو لڑائی میں قید ہو کر آتے ہیں اور اس طرح آ کر اسلام قبول کرتے ہیں۔ لڑائی میں قید کیا جانا باعث اسلام ہوا۔

اسلام میں جہاد کی بڑی فضیلت آئی ہے، جو دراصل کافروں کی تعدی اور زیادتی کی وجہ سے فرض ہوا تھا۔ مگر وہی جہاد کفار کے حق میں باعثِ خیر بن گیا اور یہی چیز فلسفۂ جہاد کو واضح کرتی ہے کہ فی الحقیقت وہ خیر ہی خیر ہے۔ اس مجسم خیر کی مذمت میں یہ کہنا کہ اسلام محض بزور شمشیر پھیلایا جاتا ہے اس کی عین ہتک ہے۔

یہ ایک جملۂ معترضہ تھا۔ قصہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو جبراً و قہراً مکہ سے نکال دیا گیا، اور زاں بعد ان کے ساتھ لڑائیاں لڑی گئیں۔ ان خدا واسطے کی لڑائیوں میں مسلمانوں ہی کا پلہ بھاری رہا اور وہ قوی سے قوی تر ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ۸ ھ میں وہی مکہ ان کے ہاتھوں فتح ہو گیا۔ اور ۹ ھ کے حج کے موقع پر سورۂ براءت کی آیتیں پڑھ کر سنائی گئیں اور اعلان ہوا کہ آج کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا۔ بلکہ دنیا کے کل مشرکین اور کفار کو ہمیشہ کے لیے حسب ذیل الٹی میٹم دے دیا گیا کہ:

﴿وَأَذَانٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ أَنَّ اللَّهَ بَرِيءٌ مِّنَ

الْمُشْرِكِيْنَ وَ رَسُوْلُهٗ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ (التوبة : ۳)

''اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے لوگوں کو (آگاہ کرنے کے لیے) حج اکبر کے دن (عام) منادی کی جاتی ہے کہ اللہ اور اس کا رسول مشرکین سے دست بردار ہیں۔ پس (اے مشرکو) اگر تم توبہ کرو تو یہ تمھارے حق میں بہتر ہے اور اگر (اب بھی خدا اور رسول سے) پھرے رہو تو جان رکھو کہ تم اللہ کو (کسی طرح) ہرا نہیں سکو گے اور (اے پیغمبر) کافروں کو عذابِ دردناک کی خوش خبری سنا دو۔''

اس آیت میں اس بات کا اظہار ہے کہ اللہ اور رسول کے نزدیک شرک اور کفر کرنا کسی کے لیے بھی کسی طرح جائز نہیں ہے، بلکہ یہ سب سے بڑا گناہ ہے، شرک اور کفر سے ہر شخص کو اور ہر قوم کو توبہ کر کے ایمان اور اسلام لانا چاہیے۔ اس سے کسی کو بھی مفر نہیں ہو سکتا۔ اس کی بھی وضاحت ہے کہ اگر کوئی اس حکم کو قبول نہیں کرتا ہے تو پھر اللہ سے، اس کے رسول سے اور کل مومنین سے لڑنے مارنے کے لیے تیار ہو جائے، اور یہ جان رکھے کہ وہ کبھی کامیاب نہ ہو سکے گا، بلکہ وہ عذابِ دردناک کا، شکستِ فاش کا اور ہلاکت ہی ہلاکت کا شکار ہو گا۔ اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ الٹی میٹم خود خدا کی طرف سے دیا جا رہا ہے اور کل دنیا کے کل مشرکین اور کل کفار کو دیا جا رہا ہے۔

یہ الٹی میٹم صرف کفارِ مکہ کے لیے مخصوص نہیں ہے۔

اس شرح و بسط کے بعد ہمیں ہند کے بسنے والے جملہ مسلمان اور کافر انسانوں کی طرف متوجہ ہو کر اس مسئلے کا حل تلاش کرنا ازبس ضروری ہے۔

ظاہر ہے کہ اس آخری آیت کے تحت مسلمانانِ ہند کا اگر وہ حقیقۃً مسلمان ہیں، تو یہ فریضہ ہے کہ ہند کے کل ہندوؤں کو وہ یہی الٹی میٹم دے ڈالیں۔ گویا بالفاظ دیگر وہ ان پر اسلام کو پیش کریں اور دیکھیں کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ اگر انھوں نے قبول کر لیا تو دونوں بھائی بھائی ہیں۔ اگر قبول نہیں کیا تو اس حالت میں دو صورتیں ہیں یا تو وہ حکومتِ اسلامی کو جزیہ ادا کر کے بھلے ہندو رہیں، حکومت ان کی ہر طرح حفاظت کرنے کی ذمہ دار ہو گی اور اگر جزیہ دینے پر تیار نہیں ہوتے تو پھر صرف ایک ہی صورت رہ جاتی ہے، یعنی باقاعدہ کھلی ہوئی جنگ، یا تو مریں یا ماریں اور دراصل اسی طرح جنگ ہونی چاہیے، نہ کہ آج کل کی طرح کہ جب ہندوؤں کا جی چاہا فساد کرا کے مارا پیٹا، یا جلا دیا۔

اس بارے میں یہ ہے اسلام کا صحیح نقشہ، جس کے بیان سے ہمارا کتابچہ بالکل خالی ہے۔ اگر کچھ اشارہ

موجود ہے تو وہ وہی صفحہ ۴۸ پر دوسرا فقرہ ہے۔

اس طویل تفصیل میں نہ جاتے ہوئے میں نے اس فقرے میں اپنے ذاتی جذبے کو کس ہمدردی اور فراخ دلی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ بہرحال میں ہندوؤں کا محض خیر خواہ رہتے ہوئے ان کے قبولِ اسلام اور دائمی نجات کا خواہاں ہوں اور بس۔ اس جذبے پر آپ لوگوں کی طرف سے مجھے داد ملنی چاہیے، یا نفرت، اس کا فیصلہ آپ لوگوں ہی پر چھوڑتا ہوں۔

فقط عبدالصمد

مولانا عبدالصمد کے یہ دونوں خط بہت زبردست اور بالکل صاف ہیں۔ موجودہ دور کے ہندوستان میں رہ کر کسی مسلمان کا کسی ہندو کو اس قسم کا خط لکھنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ اس مردِ جلیل کی مغفرت فرمائے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا سفارشی خط:

اب عبدالصمد شرف الدین تاجر کتب بمبئی کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک مکتوب ملاحظہ ہو جو انھوں نے ۱۹۳۸ء میں بمبئی سے مولانا امتیاز علی عرشی (متوفی ۲۵-فروری ۱۹۸۱ء) کو تحریر فرمایا جو اس وقت کتب خانہ عالیہ رام پور کے مہتمم تھے۔

۷-۱-۱۹۳۸ء

جنابِ من!

مولوی عبدالصمد شرف الدین صاحب سے مجھے معلوم ہوا کہ ریاست رام پور نے کوئی کتاب چھپوائی ہے اور اس کی ایجنسی کے لیے نقد ضمانت کی شرط قرار دی گئی ہے۔ میں مولوی عبدالصمد صاحب کو ان کے والد مرحوم کے زمانے سے جانتا ہوں۔ انھوں نے کتابوں کی تجارت کا سلسلہ میرے ہی ایما سے شروع کیا تھا۔ یہ کاروباری معاملات میں ہر طرح قابل اعتماد اور دیانت دار ہیں۔ بے عنوانی اور بے قاعدگی کے کسی اندیشے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ یہ بالکل غیر ضروری ہوگا کہ ان سے ضمانت کی رقم کا مطالبہ کیا جائے۔ اگر ممکن ہو تو کوشش کیجیے کہ اس شرط سے یہ مستثنیٰ کر دیے جائیں۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے مکتوبات کے کئی مجموعے شائع ہوئے ہیں، معلوم نہیں یہ مکتوب کسی مجموعے میں چھپا ہے یا نہیں۔ مجھے یہ مکتوب کویت سے میرے دوست مولانا عارف جاوید محمدی نے بھیجا ہے

جو بھیونڈی (بمبئی) کے اخبار ''صبح وشام'' میں طبع ہوا۔

یہ کتاب جس کا مولانا آزاد نے ذکر کیا ہے، مکاتیب غالب تھی یعنی غالب کے وہ خطوط جو مولانا امتیاز علی عرشی نے ۱۹۳۷ء میں مرتب کیے اور ریاست رام پور کی طرف سے چھپے۔ مولانا عرشی کے صاحب زادے ابوعلی خاں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ کتاب مولانا عبدالصمد کے مطبع قیمہ میں چھپی تھی اور انھی کو اس کے سول ایجنٹ مقرر کیا گیا تھا اور سول ایجنٹ کی حیثیت سے ان کا پتا کتاب کے فلیپ پر چھپا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نہ صرف مولانا کی سفارش مان لی گئی بلکہ انھیں کتاب کے سول ایجنٹ بھی مقرر کر لیا گیا تھا۔

انتقال:

یہ جلیل القدر عالم دین اور عظیم مبلغ اسلام جنھیں مولانا عبدالصمد نَرْوِلْ کہا جاتا ہے ۱۶-فروری ۱۹۹۶ء کو فوت ہوئے۔ نَرْوِلْ شاید ان کی برادری کا نام تھا۔ اس وقت میرے سامنے بھیونڈی کے ایک روزنامہ اخبار ''صبح وشام'' کا شمارہ پڑا ہے۔ اس اخبار میں ان کی وفات کی خبر ان کی تصویر کے ساتھ مندرجہ ذیل الفاظ میں چھپی ہے:

مولانا عبدالصمد نَرْوِلْ کی رحلت:

بین الاقوامی سطح پر اپنا ایک منفرد مقام رکھنے والی بھیونڈی کی اہم علمی شخصیت حضرت مولانا عبدالصمد شرف الدین نرول (نور اللہ مرقدہ) نے جمعۃ الوداع ۲۶- رمضان ۱۴۱۶ھ مطابق ۱۶ فروری ۱۹۹۶ء کو صبح دس بجے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کردی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مولانا کی عمر اس وقت ۹۵ برس تھی۔ وہ تاحیات توحید کے علم بردار رہے اور اپنی پوری زندگی دعوت الی اللہ کے لیے صرف کردی، جس کے نتیجے میں کثیر تعداد میں لوگ ان کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہوئے۔

مولانا کی کوششوں ہی کے نتیجے میں بمبئی کی عیدگاہ روڈ پر واقع ''الدارالقیمہ'' نامی اشاعتی ادارہ قائم ہوا، جو برسوں سے دنیا کے مختلف ممالک میں اپنی جداگانہ حیثیت رکھتا ہے اور جہاں سے لاتعداد دینی وعلمی کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ مولانا عبدالصمد نرول بھیونڈی کی ایسی شخصیت تھے جو ملک اور بیرونِ ملک میں بھیونڈی کی شناخت مانے جاتے تھے۔ گزشتہ کئی برسوں سے مولانا موصوف سعودی عرب کی شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی میں دینی خدمات کی انجام دہی پر مامور تھے اور اب چھ ماہ سے ان کا قیام پونہ میں تھا، جہاں انھوں نے اپنی زندگی کی آخری سانس لی۔

مولانا عبدالصمد نرول کے انتقال کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور سوگ واروں کا جمِ غفیر عیدگاہ روڈ پر الدارالقیمہ کے سامنے واقع ان کے آبائی مکان پر دعاے مغفرت کے لیے جمع ہوگیا۔ مولانا کی تدفین

عید گاہ سے متصل قبرستان میں بعد نماز تراویح عمل میں آئی۔ نمازِ جنازہ مولانا مختار احمد صاحب ندوی نے پڑھائی، جس میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ شریک تھے۔

مولانا عبدالصمد نزول کی رحلت پر ادارہ صبح و شام اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرنے کے ساتھ دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو غریق رحمت کرے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔"

مولانا عبدالصمد کی جو تصویر اس اخبار میں ان کی خبر رحلت کے ساتھ چھپی ہے وہ کم و بیش ان کی ۴۵ برس کی عمر کی ہوگی۔ طویل قامت کسرتی جسم، گندمی رنگ، تھوڑا سا لمبا متانت سے بھرپور چہرہ، تیکھی ناک، موٹی آنکھیں، بالوں سے بھری ہوئی بھویں، پوری داڑھی جس میں چند سفید بال جھانک رہے ہیں۔ سر پر کپڑے کی ٹوپی، ململ کا کرتا۔

اس کتاب (چمن ستانِ حدیث) میں مولانا عبدالصمد کے حالات لکھ کر اور ان کے والد گرامی مولانا اشرف الدین کا تذکرہ کر کے مجھے بے حد مسرت ہو رہی ہے۔ میں نے ان بزرگانِ عالی کے نام تقسیم ملک سے بہت پہلے چھوٹی عمر میں استاذِ محترم حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے سنے تھے۔ اس وقت یہ تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ان کے متعلق کچھ لکھنے کی سعادت اس گناہ گار کو حاصل ہوگی۔

اللھم اغفرلھم و ارحمھم و عافه و اعف عنھم و ادخلھم جنت الفردوس.

اُسامہ موعود

(وفات ۲۴۔ فروری ۱۹۹۷ء)

کشیدہ قامت، چھریرا بدن، گورا رنگ، موٹی آنکھیں، تیکھی کچھ ابھری ہوئی سی ناک، کتابی چہرہ، باریک ہونٹ، سفید چمکتے ہوئے دانت، پتلی سی پوری ڈاڑھی، جس میں سفید بال بھی جھانکنے لگے تھے۔ شلوار قمیص پہناوا۔ چہرے پر متانت کے آثار۔ کم گو اور متحمل مزاج۔ یہ تھے اُسامہ موعود، لیکن ان کا تذکرہ کرنے سے قبل میرے خیال میں چند الفاظ میں ان کے ننھیالی بزرگوں کا تذکرہ ضروری ہے۔ نیز اختصار کے ساتھ ان کے والد محترم کا تعارف بھی ہمارے فرائض میں شامل ہے۔ ان کی آل اولاد کے سوا میرا خیال ہے انھیں جاننے والے اب کم ہی لوگ دنیا میں ہوں گے۔

متحدہ پنجاب کے جو خاندان کتاب وسنت کی ترویج واشاعت کا بہت بڑا ذریعہ ثابت ہوئے، ان میں ایک خاندان کا نام ''قصوری خاندان'' ہے، جس نے ماضی قریب میں اس میدان میں بڑی جدوجہد کی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا اس خاندان کے ارکان بے پناہ احترام کرتے اور ہر موقعے پر ان کی آواز پر لبیک کہتے تھے۔ مولانا بھی ان سے بہت تعلق رکھتے تھے۔ وہ اس خاندان کو ''خاندانِ سعادت قصور'' کے نام سے موسوم فرماتے ہیں۔

مولانا عبدالقادر قصوری اس خاندان کے اولیں جلیل القدر رکن تھے، جو برصغیر کے مذہبی اور سیاسی حلقوں میں بڑے نامور ہوئے۔ وہ ۱۸۶۳ء کے لگ بھگ موضع دلاور چیمہ (ضلع گوجراں والا) میں پیدا ہوئے اور ۱۶۔ نومبر ۱۹۴۲ء کو لاہور میں ان کا انتقال ہوا۔ انھیں قصور میں دفن کیا گیا۔

مولانا عبدالقادر قصوری کے بہ ترتیب ذیل چار بیٹے تھے۔

(۱) سب سے بڑے مولانا محی الدین احمد قصوری تھے، جن کی ولادت اپریل ۱۸۸۹ء میں بمقام قصور ہوئی اور انھوں نے ۲۴۔ جنوری ۱۹۷۱ء کو وفات پائی۔ والدین نے ان کا نام برکت علی رکھا تھا، لیکن ۱۹۱۵ء میں وہ مولانا ابوالکلام آزاد کے پاس کلکتے گئے تو مولانا کے نام (محی الدین احمد) کی مناسبت سے انھوں نے اپنا نام محی الدین احمد رکھ لیا اور پھر اسی نام سے شہرت پائی۔

(۲) ان سے چھوٹے مولانا محمد علی قصور ایم اے کینٹب تھے جو اگست ۱۸۹۲ء کو قصور میں پیدا ہوئے اور ۱۲۔ جنوری ۱۹۵۶ء کو انھوں نے سفر آخرت اختیار کیا۔ ان کے حالات کا مطالعہ کریں تو پتا چلتا ہے کہ ان کی

سیاسی اور دینی خدمات کا دائرہ دور تک پھیلا ہوا ہے۔

جی چاہتا ہے کہ مولانا محمد علی قصور کے متعلق یہاں مولانا دین محمد وفائی کی ایک تحریر درج کی جائے۔ مولانا دین محمد وفائی صوبہ سندھ سے تعلق رکھتے تھے۔ مسلکاً اہل حدیث تھے۔ اپنے عہد کے مشہور عالم، بہت بڑے مصنف اور صحیح بخاری کے شارح تھے۔ مختلف اوقات میں متعدد اخباروں کے ایڈیٹر رہے۔ سیاسیات سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اور آزادیٔ وطن کے سلسلے میں کانگرس کے نقطہ نظر کے حامی تھے۔ ۱۹۵۰ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ذیل میں مولانا محمد علی قصوری کے بارے میں ان کی چند سطور پڑھیے جو ۱۹۳۰ء میں لکھی گئیں۔

''دہلی میں مولوی محمد علی قصوری ایم۔ اے (کینٹب) سے ملاقات ہوئی۔ ان سے پہلی ملاقات ۱۹۲۲ء میں بمبئی میں فقط چند منٹ کے لیے ہوئی تھی، مگر اس شخص کا حافظہ بھی غضب کا ہے۔ حیرت ہوئی کہ مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ محمد علی عربی کے فاضل اور قرآن مجید کے زبردست ماہر ہیں۔ انگریزی زبان کی مہارت میں پورے ہندوستان میں ان کے پائے کا مشکل ہی سے کوئی آدمی ملے گا۔ قصوری مولویوں کا یہ وہ خاندان ہے جس کا ۱۹۱۷ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے ''تذکرہ'' میں نہایت محبت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

''مولوی محمد علی کے حافظے کا کمال یہ ہے کہ اگر وہ ایک مرتبہ سرراہ کوئی شعر سن لیتے ہیں تو وہ شعر انھیں تمام زندگی یاد رہتا ہے۔ اس طرح ہزاروں شعر انھیں برزبان یاد ہیں۔ کابل اور سرحد میں بہت دنوں تک رہے ہیں۔ سندھ کے حالات سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ محمد علی قصوری صاحب ''جردمرد'' ہیں، یعنی نہ ان کے سر پر بال ہیں، نہ بھویں ہیں، نہ داڑھی مونچھیں ہیں۔ یعنی قدرتی طور پر وہ بالوں کی مصیبت سے آزاد ہیں۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ تاریخ میں آیا ہے کہ حضرات صحابہ کرام میں جناب عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ بھی ''جردمرد'' یعنی بالوں کے جنجال سے آزاد تھے۔''

(۳) مولانا محمد علی قصوری سے چھوٹے مولوی احمد علی تھے۔ ان کا سال پیدائش ۱۸۹۵ء ہے، لیکن سال وفات کا پتا نہیں چل سکا۔

(۴) سب سے چھوٹے میاں محمود علی قصوری بار ایٹ لا تھے۔ وہ ۳۱۔ اکتوبر ۱۹۱۰ء کو پیدا اور ۱۳۔ اپریل ۱۹۸۷ء کو فوت ہوئے۔

ان سب مرحومین کے حالات میں نے اپنی ایک کتاب ''قصوری خاندان'' میں تفصیل سے لکھے ہیں اور ان کی دینی، معاشرتی اور سیاسی مساعی کے بہت سے اہم گوشوں کی وضاحت کی ہے۔ یہ کتاب ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے جو مکتبہ تعلیمات اسلامیہ ماموں کانجن ضلع فیصل آباد کی طرف سے ۱۹۹۴ء میں شائع ہوئی۔

مولانا عبدالقادر قصور کے چار بیٹوں میں سے دوسرے بیٹے مولانا محمد علی قصوری ایم اے کینٹب کی اولاد

چھے بیٹیاں تھیں۔ وہ اولادِ نرینہ سے محروم تھے، بہ ترتیب ولادت ان کی دوسری بیٹی کا نام خالدہ تھا، جن کی شادی مرزا صلاح الدین موعود سے ہوئی تھی۔ مرزا صاحب سرخی مائل گورے رنگ کے طویل قامت خوب صورت اور خوش لباس آدمی تھے۔ کمرشل بلڈنگ (لاہور) میں کاروبار کرتے تھے۔ گرمیوں میں پینٹ بوشرٹ اور سردیوں میں انگریزی سوٹ پہنتے تھے۔ گول سی قراقلی ٹوپی گرمی سردی دونوں موسموں میں ان کے سر پر سجی رہتی تھی۔ سنجیدہ مگر خوش مزاج شخص تھے۔ لوگ انھیں بالعموم موعود صاحب کہہ کر پکارتے تھے اور ہم انھیں مزاحاً مسیح موعود کہا کرتے تھے۔ وہ اس کا جواب دلآویز مسکراہٹ اور خاموش زبان سے دیتے تھے۔ میں کبھی کبھی صبح سیکرٹریٹ سے اپنے دفتر ادارہ ثقافت اسلامیہ (کلب روڈ) پیدل جایا کرتا تھا، بارہا ایسا ہوتا کہ مال روڈ پر ریگل کے قریب وہ بھی پیدل اپنے کاروبار کے سلسلے میں کمرشل بلڈنگ کی طرف آتے ہوئے مل جاتے اور ان سے دعا سلام ہو جاتی۔

افسوس ہے دیکھتے ہی دیکھتے وہ دور بھی ختم ہو گیا اور وہ لوگ بھی، جن سے تقریباً روزانہ ملاقات ہوتی تھی، سفر آخرت پر روانہ ہو گئے اور میں گھر میں بیٹھا کاغذ پر ان کے حلیے بیان کر رہا ہوں، ان کے چہروں کے نقشے بنا رہا ہوں، ان کے لباس کی کتر بیونت اور ان کے قد و قامت کی پیمائش میں مشغول ہوں، جب کہ نہ ان کے وارثوں میں سے کوئی مجھے جانتا ہے اور نہ میں ان میں سے کسی سے تعلق رکھتا ہوں۔ میری لکھی ہوئی چند سطور بھی شاید ان میں سے کسی کی نظر سے نہیں گزرتی ہوں گی۔ سچی بات ہے میں ان کے لیے لکھتا بھی نہیں۔ میرا مقصد تو اپنی جماعت اور اہل علم کی تاریخ محفوظ کرنا ہے۔ ممکن ہے آئندہ کسی کو اس سے فائدہ پہنچ جائے اور وہ اس گناہ گار کے لیے دعائے خیر کر دے۔

میں نے بغیر کسی کے کہنے کے ''قصوری خاندان'' کتاب لکھی جسے اہل حدیث کے حلقوں میں بالخصوص پسند کیا گیا۔ یہ کتاب لکھنے کا ایک خاص پس منظر تھا اور کچھ جذبات تھے جو اس کی تصنیف کا محرک بنے۔ ۱۸۔ جولائی ۱۹۹۳ء کو معین الدین قریشی پاکستان کے نگران وزیر اعظم بنائے گئے تھے۔ وہ مولانا محی الدین احمد قصوری کے فرزند گرامی ہیں اور امریکا رہتے ہیں۔ اپنا زمانہ وزارت ختم کر کے وہ واپس امریکہ چلے گئے تھے۔ انھی دنوں میرے ایک ملنے والے نے ایک جنازے کے موقعے پر مجھے کہا کہ یہ معین قریشی جنھیں نگران وزیر اعظم بنایا گیا تھا، مولوی غلام محی الدین قصوری کے بیٹے ہیں جو انجمن حمایت اسلام کے صدر تھے اور صبح کے وقت لارنس باغ میں سیر کرتے ہوئے سکوٹر کی زد میں آ کر فوت ہو گئے تھے، میں نے ان کو سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ مولوی غلام محی الدین قصوری کے بیٹے نہیں بلکہ مولانا محی الدین احمد قصوری کے بیٹے ہیں جو مولانا ابوالکلام آزاد کے پاس کلکتے رہے تھے اور میاں محمود علی قصوری کے بڑے بھائی اور مولانا عبدالقادر قصوری کے

فرزند گرامی تھے۔ لیکن وہ صاحب سمجھنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ انھوں نے معین قریشی کا ذکر بھی نامناسب الفاظ میں کیا جس سے مجھے غصہ تو آیا، لیکن میں نے اپنے آپ پر جبر کیا اور خاموش رہا۔ اسی وقت میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اس خاندان کے حالات ضرور لکھوں گا۔ حالاں کہ اس سے کافی عرصہ پیشتر متعدد مرتبہ میاں محمود علی قصوری نے اپنے اسلاف کے سوانح حیات لکھنے کے لیے مجھے کہا بلکہ اصرار کیا اور یہ بھی اشارہ کیا کہ اس کا حقِ خدمت تمھاری توقع سے زیادہ دیا جائے گا۔ لیکن میں یہ خدمت سرانجام نہ دے سکا۔ اب ان صاحب کے الفاظ سن کر میں نے یہ کام مکمل کرنے کی ٹھان لی۔ چناں چہ شام کو گھر آیا اور لکھنا شروع کر دیا۔ رات کے ساڑھے گیارہ بجے تک تقریباً بیس صفحے لکھ لیے۔ دوسرے دن دفتر سے آ کر پھر اسی کام میں مصروف ہو گیا، غرض ایک ہفتے میں کتاب مکمل کر لی اور میرا غصہ ختم ہو گیا۔ مجھے اس کے شائع کرنے کی کوئی جلدی نہ تھی۔ بس ایک جذبے کی تسکین تھی جو پوری ہو گئی تھی اور غصہ تھا جو ختم ہو گیا تھا۔

ایک دن مجھے ملنے کے لیے ماموں کانجن (ضلع فیصل آباد) سے میرے مرحوم دوست قاضی محمد اسلم سیف تشریف لائے۔ انھوں نے میری میز پر اس کتاب کا مسودہ دیکھا اور اس کے بعض مقامات کا مطالعہ کیا تو کہا یہ کتاب آپ مجھے دے دیں، میں اسے چھاپ دیتا ہوں۔ اس طرح ۱۹۹۴ء میں مکتبہ تعلیماتِ اسلامیہ (ماموں کانجن ضلع فیصل آباد) کی طرف سے کتاب شائع ہوئی۔ جو دو سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ وہ کام ہے جس کا معاوضہ کسی نے جزاک اللہ کی شکل میں بھی نہیں دیا۔

میں نے کاتب کو اس کی کتابت کی اجرت دی اور کاغذ، طباعت وغیرہ کے اخراجات مکتبہ تعلیمات اسلامیہ نے ادا کیے۔ کتاب پر "سرآغاز" کے عنوان سے میں نے مقدمہ لکھ دیا تھا، لیکن اس کے علاوہ کتاب کے ناشر قاضی محمد اسلم سیف نے بھی مقدمہ تحریر کیا اور ہمارے دیرینہ دوست مولانا مجاہد الحسینی نے ایک اور مقدمے کا اضافہ کر دیا۔ قاضی صاحب مرحوم اور مولانا مجاہد الحسینی کے مقدمات تقریباً ایک ہی نوعیت کے ہیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ مولانا عبدالقادر قصوری اور ان کے فرزندانِ عالی قدر کے لائق تکریم اخلاف میں سے کسی نے یہ کتاب پڑھی ہے یا نہیں پڑھی۔ اگر پڑھی ہے تو اس سے انھوں نے کیا تاثر لیا یا کچھ بھی نہیں لیا۔

بات دائرۂ گفتگو سے تھوڑی سی باہر ہو گئی۔ میں عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ مرزا صلاح الدین موعود کی اولاد تین بیٹے تھے اور ایک بیٹی۔ یعنی مولانا محمد علی قصوری کے نواسے......!

مرزا صاحب کے بڑے بیٹے کا نام اظہر موعود ہے۔ حصولِ تعلیم کے بعد یہ ائیر فورس کی انجینئرنگ برانچ میں ملازم ہوئے اور پھر ملازمت پوری کر کے بہ حیثیت ائیر وائس مارشل ریٹائر ہوئے۔ اس کے بعد اسلام آباد میں سکونت اختیار کی۔ ان کی اولاد دو بیٹے ہیں اور ایک بیٹی۔

دوسرے بیٹے اُسامہ موعود تھے، جن کا آئندہ سطور میں ذکر کرنا مقصود ہے۔ وہ ۲۸۔ اگست ۱۹۵۰ء کو پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش کے زمانے میں لاہور میں سیلاب آیا تھا۔ اس مناسبت سے اسامہ موعود کی نانی یعنی مولانا محمد علی قصوری کی اہلیہ مرحومہ کے بھائی نے حسب ذیل شعر کہا تھا۔

ایسے مولود ہوا کرتے ہیں کم تر پیدا
جن کی تعظیم میں ہو فتنۂ محشر پیدا

اسامہ موعود سے چھوٹی ایک بہن ہیں جن کا نام ماریہ ہے اور وہ علاء الدین صابری سابق ڈائریکٹر جنرل (آئل) منسٹری آف پٹرولیم (اسلام آباد) کی اہلیہ ہیں۔ اللہ نے ان کو تین بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا ہے۔

اسامہ موعود کے سب سے چھوٹے بھائی ڈاکٹر محمد علی ہیں، جن کا نام ان کے نانا مولانا محمد علی قصوری کے نام پر رکھا گیا۔ وہ سائنس کے آدمی ہیں اور انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور کے شعبہ کمپیوٹر سائنس کے چیئرمین رہے۔ وہ طویل قامت اور خوب صورت شخص ہیں۔ لباس اور وضع قطع احکام شریعت سے ہم آہنگ، وضع دار اور ملنسار۔ اہل علم کے قدر دان اور بے حد متواضع......! تین بیٹوں اور ایک بیٹی کے باپ......!

اسامہ موعود کے اس خاندانی پس منظر اور بہن بھائیوں کے مختصر تعارف کے بعد، آیئے اب خود اسامہ کا تذکرہ کرتے ہیں۔

اسامہ موعود کی تعلیم کا آغاز سیکرڈ ہارٹ کنونٹ سکول سے ہوا۔ یہاں انھوں نے کے۔ جی تک تعلیم حاصل کی۔ پھر سینٹ انتھونی سکول سے میٹرک پاس کیا۔ انٹرمیڈیٹ کیتھیڈرل سکول سے پاس کیا اور بی اے میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ (لاہور) سے اعلیٰ پوزیشن میں کامیاب ہوئے۔

مسجد مبارک میں (جو اسلامیہ کالج ریلوے روڈ سے بالکل متصل ہے) ان دنوں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی خطبہ جمعہ ارشاد فرمایا کرتے تھے، اسامہ بھی وہیں نمازِ جمعہ پڑھتے تھے، ان کا اس زمانے میں مولانا ممدوح سے رابطہ پیدا ہو گیا۔ وہ پہلے ہی دینی ذہن رکھتے تھے، لیکن مولانا سے رابطے کے بعد اس میں مزید پختگی آ گئی۔

اس زمانے میں ضلع قصور کے قصبہ کھڈیاں کے مولانا محمد رفیق مسلم لیگ ہائی سکول (ایمپرس روڈ لاہور) میں مدرس تھے اور دھیمے مزاج کے صالح بزرگ تھے۔ اسلامیہ کالج کی تعلیم کے دوران اسامہ موعود نے ان سے دینی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔ مولانا ممدوح مدرسۃ البنات کے مہتمم عبیداللہ ندوی مرحوم کی کوٹھی (لیک روڈ) کے احاطے میں دینی تعلیم کے شائق طلبا کو مغرب اور عشا کے درمیان تعلیم دیا کرتے تھے۔ یہ

۱۹۶۰ء کے اواخر کی بات ہے۔ اس طرح اسامہ موعود نے بہت حد تک دینی تعلیم حاصل کر لی تھی۔ ان کے ذہن وفکر میں بھی اسلام راسخ تھا اور عقیدہ وعمل میں بھی وہ مضبوط تھے۔

اسلامیہ کالج ریلوے روڈ سے بی اے پاس کرنے کے بعد انھوں نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا اور پولیٹیکل سائنس کے موضوع پر اعلیٰ درجے میں ڈگری حاصل کی، پھر سی ایس، ایس کا امتحان دیا اور پورے پاکستان میں نمایاں رہے۔

۱۹۷۵ء میں سی، ایس، ایس اکیڈمی میں داخل ہوئے اور فراغت کے بعد ڈی، ایم، جی گروپ میں شرکت کی۔

اس کے بعد ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا، جس کی تفصیل اس طرح ہے۔

(۱) ۱۹۷۶ء میں سرگودھا میں اے، سی (انڈر ٹریننگ) مقرر ہوئے۔ اس کے بعد لیہ اور پھر بورے والا کے اے، سی رہے۔ ۱۹۷۷ء میں وہ بورے والا میں تھے اور کچھ مذہبی اور سیاسی جماعتوں کے ہنگامے کے نتیجے میں ضیاء الحق نے جمہوری حکومت ختم کر کے مارشل لاء نافذ کیا تو نئے انتظام کے تحت اسامہ موعود کو لاہور بھیج دیا گیا اور وہ سیکرٹریٹ میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔

(۲) ۱۹۸۰ء میں راجن پور کے اے، سی متعین ہوئے۔

(۳) پروموشن کے بعد ۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۵ء تک (دو سال) راولپنڈی کے اے، ڈی، سی، جی رہے۔

(۴) ۱۹۸۵ء سے ۱۹۸۷ء تک شیخوپورہ کے ڈی، سی کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

(۵) ۱۹۸۸ء میں پھر لاہور بھیج دیے گئے اور سیکرٹریٹ میں بعض محکموں کے سیکرٹری رہے۔

اُسامہ موعود صلح جو شخص تھے۔ صلہ رحمی کے لیے کوشاں رہتے اور تمام رشتہ داروں سے رابطہ رکھتے تھے۔ اپنے بھائیوں کا بالخصوص انھیں خیال رہتا، ڈاکٹر محمد علی سب سے چھوٹے تھے، ان کی فکری اور علمی تربیت میں ان کی کوششوں کو بڑا دخل ہے۔

وہ نہایت محنتی، دیانت دار اور ذمہ دار افسر تھے۔ مختلف اوقات میں مختلف محکموں کے سربراہ رہے۔ حکومت نے جب بلدیاتی ادارے توڑ دیے تھے تو انھیں لاہور کے چیف ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا گیا تھا۔ کچھ عرصہ وہ حکومت پنجاب کے تعلیمی شعبے سے بھی وابستہ رہے، اس کے غالباً وہ ایڈیشنل سیکرٹری تھے۔ ہر محکمے میں ہر کام انھوں نے میرٹ کے مطابق کیا اور دفتری قواعد کی پوری پابندی کی۔ ان کا محکمانہ کردار ہمیشہ بے داغ رہا۔ ان کا وجود عام لوگوں کے لیے بہت بڑا سہارا تھا۔ حکومتوں میں سیکرٹری اپنے محکمے کا مالک ہوتا ہے اور اسے بہت بڑی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ وہ ٹھاٹھ سے رہتا ہے اور جو جی چاہے کرتا ہے۔ حکومتی نظام میں سیکرٹری کے

سامنے عام آدمی کا گفتگو کرنا بہت مشکل ہوتا ہے، لیکن اسامہ موعود کی زندگی بہت سادہ تھی۔ وہ ہر شخص کے خیر خواہ تھے، اور ہر جائز کام کرانے والے کی مدد کرتے تھے۔ مظلوم، غریب اور بے سہارا لوگوں کا وہ بالخصوص خیال رکھتے تھے۔

وہ تقویٰ شعار اور صالحیت اطوار افسر تھے۔ چھوٹے بڑے شرعی احکام کی پابندی ان کے نزدیک ضروری تھی۔ دینی کتابوں کا مطالعہ ان کے مشاغل میں شامل تھا۔ اہل علم کی مجلس میں شریک ہوتے اور ان سے استفادہ کرتے تھے۔ حلیم الطبع اور صاف گو تھے۔

میرا دفتر (ادارہ ثقافت اسلامیہ) جی او آر ون میں کلب روڈ پر تھا۔ میں وہاں ریسرچ فیلو کے طور پر تصنیفی خدمات انجام دیتا تھا۔ اسامہ موعود صاحب کی سکونت بھی حکومت پنجاب کے ایک سیکرٹری کی حیثیت سے اسی علاقے میں تھی۔ وہ بعض اوقات کسی کتاب کے بارے میں کوئی بات کرنے کے لیے سیکرٹریٹ جاتے ہوئے، میرے پاس تشریف لے آتے تھے۔ وہ آہستہ کلام اور گفتگو میں نہایت محتاط تھے۔ اس قسم کی باتوں کی ان لوگوں کو خاص طور سے تربیت دی جاتی ہے۔

ایک دن وہ میرے دفتر آئے، چند منٹ ٹھہرے اور ایک کام کے سلسلے میں مجھے ڈھائی بجے اپنے دفتر آنے کے لیے کہا۔ ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد اتفاق سے پروفیسر محمد یحییٰ (انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور) آ گئے۔ وہ مجھے ''المعارف'' میں شائع کرنے کے لیے اپنا ایک مضمون دینے آئے تھے، میں اس مجلّے کا ایڈیٹر تھا۔ میں نے یحییٰ صاحب کو دو بجے آنے کے لیے کہا۔ وہ وقت مقررہ پر آئے اور ہم دونوں اسامہ موعود کے پاس سیکرٹریٹ پہنچے اور ان سے چند باتیں کیں۔ انھوں نے ہمیں چائے پلائی اور ہم اجازت لے کر وہاں سے آ گئے۔ یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی۔

چند روز کے بعد اخبارات میں نمایاں طور سے یہ خبر شائع ہوئی کہ حکومت پنجاب کے ایک محکمے کے سیکرٹری اسامہ موعود کو قتل کر دیا گیا ہے۔ یہ نہایت اندوہناک اور انتہائی افسوس ناک خبر تھی۔

۱۹۹۷ء کی ۲۴ فروری تھی اور پیر کا دن۔ وہ معمول کے مطابق تین بجے کے لگ بھگ سیکرٹریٹ سے نکلے اور اس کے بالکل قریب چوک میں فائرنگ کر کے اس انتہائی دیانت دار افسر کو کسی نے قتل کر دیا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ ہمیں یقین کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو درجہ شہادت پر فائز کر دیا ہے۔ ان کی شہادت کے بعد اس سڑک کا نام اسامہ موعود روڈ رکھا گیا۔

قاتل معلوم نہیں کون تھا، ایک تھا یا دو تھے۔ ان کا آج تک پتا نہیں چلا۔ وجہ قتل بھی معلوم نہیں ہو سکی۔ دوسرے دن دس بجے مرحوم کی سرکاری اقامت گاہ پر ان کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر محمد علی موعود نے نماز جنازہ

پڑھائی اور انھیں میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

اللھم اغفرلہ و ارحمہ و عافہ و اعف عنہ و ادخلہ جنت الفردوس ۔

اسامہ موعود کی اولاد دو بیٹے ہیں اور دو بیٹیاں۔ بڑے بیٹے کا نام محمد خبیب موعود ہے۔ وہ آئل کمپنی میں ملازمت کر رہے ہیں۔ ان سے چھوٹے محمد زید موعود ہیں۔ وہ بھی کسی محکمے میں ملازم ہوں گے۔

بیٹیاں امیمہ موعود اور ہادیہ موعود ہیں۔

عاجزانہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس خاندان کے وفات شدگان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے زندہ حضرات کو ہمیشہ اپنے سایۂ رحمت میں رکھے، آمین یا رب العالمین۔

(یہ سطور اسامہ موعود مرحوم کی وفات سے کئی سال بعد لکھی گئی تھیں۔ جن افراد کے نام اس تحریر میں درج ہیں، معلوم نہیں اب وہ کس حال میں ہیں اور کہاں ہیں، اِن میں سے کون زندہ ہیں اور کون اس دنیاے فانی سے رخصت ہو گئے ہیں۔)

حافظ خواجہ محمد قاسم

(وفات ۱۹- دسمبر ۱۹۹۷ء)

میانہ قد، سرخی مائل گندمی رنگ، گول معصومانہ سا چہرہ، موٹی آنکھیں، کشادہ پیشانی، صحت مند، ہنس مکھ، نرم دمِ گفتگو، خوش اخلاق، ملنسار، سر پر قراقلی ٹوپی، شلوار قمیص میں ملبوس، معتدل جسم، نہ موٹے نہ پتلے۔ یہ تھے حافظ خواجہ محمد قاسم۔ لیکن ان کے حالات بیان کرنے سے پہلے ان کے خاندانی پس منظر سے آگاہ ہونا ضروری ہے۔

یہ لوگ دراصل علاقہ کشمیر سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے اسلاف میں سے ایک شخص ولی داد کشمیر کی سکونت ترک کر کے گوجراں والا آئے اور پھر اسی شہر میں سکونت پذیر ہو گئے۔ ولی داد کے بیٹے خواجہ اللہ دتا تھے جو نہایت نیک اور بلند کردار بزرگ تھے۔ خواجہ اللہ دتا محکمۂ ریل میں اسٹیشن ماسٹر کے عہدے پر فائز رہے۔ ہم نے ان کو نہیں دیکھا۔

مولانا محمد حنیف ندوی نے ایک مرتبہ بتایا کہ میرے لاہور کی مسجدِ مبارک کے زمانۂ خطابت میں خواجہ اللہ دتا میری اقتدا میں نماز جمعہ پڑھا کرتے تھے اور منبر کے بالکل قریب بیٹھتے تھے۔ دورانِ خطبہ میں میرا پائجامہ ٹخنے سے کچھ نیچے ہوتا تو خواجہ صاحب اپنے ہاتھ سے اس کو دوہرا کر دیتے اور وہ ٹخنے سے اونچا ہو جاتا۔ نماز کے بعد بہ طور نصیحت مجھے فرماتے کہ "آپ خطبے میں جب لفظ "اللہ" کہتے ہیں تو اس کے ساتھ "تعالیٰ" کہا کریں یعنی "اللہ تعالیٰ نے فرمایا" یا "اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔"

خواجہ اللہ دتا دینی معاملات میں انتہا درجے کے حساس تھے۔ گھر میں کسی کو کوئی خلافِ شرع کام کرتا دیکھتے تو سخت ناراض ہوتے۔ بعض اوقات اس سے تعلق منقطع کر لیتے۔ ان کے فرزندِ گرامی خواجہ عبدالعزیز تھے۔ دونوں باپ بیٹے کا تعلق مولانا فضل الٰہی وزیرآبادی (متوفی ۵ مئی ۱۹۵۱ء) سے تھا اور ان کی وجہ سے یہ دونوں سرحد پار کی جماعت مجاہدین سے مالی تعاون کرتے تھے۔

یہ جماعت انگریزی حکومت سے مصروفِ جہاد رہتی تھی۔ اس سے کسی قسم کا تعاون کرنا اور اس کی تھوڑی یا زیادہ مالی مدد کرنا یا اس سے تعلق رکھنے والے شخص کو اپنے ہاں ٹھہرانا انگریزی حکومت سے بغاوت قرار پاتا تھا۔ جن معاونین جماعت کا حکومت کو پتا چل جاتا انھیں سخت سزا دی جاتی تھی، لیکن خواجہ اللہ دتا اور ان کے فرزند خواجہ عبدالعزیز اس کی پروا کیے بغیر جماعت مجاہدین کی مدد کرتے تھے۔

مولانا غلام رسول مہر جب اس موضوع سے متعلق کتابیں لکھ رہے تھے تو اس فقیر نے ان کو مجاہدین کے بعض معاونین کے بارے میں معلومات بہم پہنچائی تھیں۔ اس ضمن میں خواجہ اللہ دتا اور خواجہ عبدالعزیز کی کوششوں سے بھی میں نے ان کو مطلع کیا تھا۔ اس کا تذکرہ انھوں نے اپنی ایک کتاب ''سرگزشتِ مجاہدین'' میں کیا ہے جو ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔ ملاحظہ فرمایے:

''جماعت مجاہدین کے معاونوں اور کارکنوں میں سے جن جن کے حالات معلوم ہو سکے، بیان کر دیے گئے۔ مجھے یقین ہے کہ معاونوں کی تعداد ان سے بدرجہا زیادہ ہوگی، لیکن ان سب کے حالات یا نام معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ میسر نہ آ سکا۔ بعض دوستوں نے اپنے اپنے دائرے میں بڑی سعی فرمائی، جن میں سے جناب محمد اسحاق صاحب مدیر ''الاعتصام'' کا ذکر ایک سے زیادہ مرتبہ آ چکا ہے۔ خواجہ اللہ دتا اور خواجہ عبدالعزیز کے حالات بھی موصوف ہی نے خواجہ عبدالعزیز کے صاحب زادے خواجہ محمد یوسف سے لکھوائے۔''

خواجہ عبدالعزیز اکونٹنٹ جنرل کے دفتر میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ ۱۹۴۳ء میں پنشن لی لیکن ۱۹۴۶ء میں دوبارہ ملازمت کر لی۔ ۴۸-۱۹۴۷ء میں ریاست قلات کے فنانشل سکرٹری تھے۔ تریسٹھ سال کی عمر پا کر ۱۶- جون ۱۹۵۲ء کو وفات پائی۔''

''خواجہ عبدالعزیز کے والد خواجہ اللہ دتا ریل کے محکمے میں اسٹیشن ماسٹر تھے۔ میرا خیال ہے کہ جماعت مجاہدین سے تعلق خواجہ اللہ دتا نے پیدا کیا، پھر یہ میراث خود خواجہ عبدالعزیز نے سنبھال لی۔ خواجہ صاحب، ان کے والد اور والدہ کے سوا کسی کو اس تعلق کا علم نہ ہو سکا اور یہ تینوں باضابط، دور اندیش اور محتاط تھے۔''

''مولوی فضل الٰہی وزیر آبادی سے ان کا تعلق بہت گہرا تھا۔ خود مولوی صاحب موصوف نے سنایا کہ میں ۱۹۱۹ء میں ہجرت کر کے گھر سے نکلا تو قدم قدم پر گرفتاری کا اندیشہ تھا۔ پشاور پہنچا تو کوئی ایسا آدمی نظر نہ آیا جو مجھے پناہ دیتا۔ خواجہ عبدالعزیز ان دنوں پشاور میں تھے۔ رات کے وقت ان کے پاس پہنچا اور پورے حالات بیان کر دیے۔ انھوں نے بے تکلف ٹھہرا لیا۔ دفتر جاتے تو باہر سے قفل لگا جاتے، واپس آتے تو دن بھر کے حالات سنا دیتے۔ کئی روز کے بعد مختلف لوگوں سے مل ملا کر رات کے وقت مجھے سرحد سے پار کر دیا۔ وہ سرکاری ملازم تھے، راز کھل جاتا تو ملازمت بھی جاتی اور اسیر بھی ہوتے، تاہم کوئی خطرہ انھیں قومی فرض سے روک نہ سکا۔''

''ایک واقعہ خود خواجہ عبدالعزیز صاحب نے سنایا کہ ۱۹۱۷ء میں ہم کوچہ بلوچاں مزنگ، لاہور میں

رہتے تھے، جماعت مجاہدین کے چند کارکن قومی سرمایہ کے پونڈ والد کے حوالے کر گئے۔ ان میں سے ایک کارکن پکڑا گیا اور خدا جانے پولیس نے کس تدبیر سے کام لیا کہ اس بے چارے نے پونڈوں کی مقدار بھی بتا دی اور ہمارے گھر کا پتا بھی دے دیا۔ چنانچہ پولیس ہمارے گھر پہنچی اور پوچھا تو ہم نے انکار کر دیا۔ والد کو لائے اور اس کارکن کا سامنا کرا دیا۔ انھوں نے فرمایا کہ میں اس شخص کو جانتا ہی نہیں۔ پھر کہا گیا کہ اچھا آپ باہر کھڑے ہو کر گھر میں آواز دیں کہ اتنے پونڈ کی جو رقم میں نے کل رکھوائی تھی، وہ دے دی جائے، حقیقت ظاہر ہو جائے گی۔ والد نے یہ بھی کیا لیکن والدہ نے کہلا بھیجا کہ آپ نے کبھی پونڈ مجھے نہیں دیے۔ آخر تلاشی کی گئی، لیکن جس ڈبے میں پونڈ رکھے ہوئے تھے، ہماری خوش نصیبی سے پولیس نے کھول کر ہی نہ دیکھا۔ اس طرح ہم محفوظ ہو گئے۔''

''خدا جانے انھیں زندگی میں ایسے خطرات کتنی مرتبہ قبول کرنے پڑے، لیکن مجاہدین کی اعانت کا کام بہ دستور جاری رکھا اور ان کے پاس جماعت کے آدمی برابر آتے رہتے تھے۔'' [1]

اے جی آفس کی ملازمت سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد خواجہ عبدالعزیز لاہور سے مستقل طور پر گوجراں والا آ گئے تھے۔ صحیح معنوں میں متقی اور متواضع و متوازن بزرگ تھے۔ جس زمانے میں اخبار الاعتصام گوجراں والا سے شائع ہوتا تھا، میں اس میں خدمات سرانجام دیتا تھا اور خواجہ صاحب مجھ پر شفقت فرماتے تھے۔ میں گوجراں والا اکیلا ہی رہتا تھا۔ مجھے یاد ہے ایک دو دفعہ مجھے شام کے وقت وہ اپنے گھر لے گئے اور کھانا کھلایا۔ ان کے دو فرزندوں خواجہ محمد یوسف اور خواجہ محمد قاسم سے میرے دوستانہ مراسم تھے۔

خواجہ صاحب مرحوم روزانہ حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ کے درسِ قرآن میں شرکت کرتے اور ان کے قریب ہو کر بیٹھتے۔ میں نے بارہا دیکھا کہ راستہ چلتے وقت ان کی نظر جھکی ہوتی تھی اور وہ اِدھر اُدھر نہیں دیکھتے تھے۔ ۱۶ اور ۱۷ جون ۱۹۵۲ء کی درمیان شب کو ان کا انتقال ہوا۔ انھوں نے وصیت کی تھی کہ میری وفات کی اطلاع فوراً دفتر کو دی جائے۔ وفات کے بعد ایک دن کی بھی پینشن وصول نہ کی جائے۔ ان کی وفات کے وقت میں گوجراں والا میں تھا اور ان کے جنازے میں شامل تھا۔

خواجہ مرحوم کی نرینہ اولاد پانچ بیٹے تھے۔ علی الترتیب ان کے نام یہ تھے: محمد اسحاق، عبدالرشید، عبداللہ، محمد یوسف اور محمد قاسم۔ خواجہ محمد اسحاق کو میں نے نہیں دیکھا۔ سنا ہے تقسیم ملک سے پہلے وہ کبھی کبھی مسجد مبارک میں خطبۂ جمعہ دیا کرتے تھے۔ گورنمنٹ کالج (لاہور) سے انھوں نے فلسفے میں ایم اے کیا اور فرسٹ

[1] سرگزشت مجاہدین: ص ۶۷۸، ۶۷۹.

ڈویژن لی۔ بہت ذہین اور سمجھ دار تھے۔ اس کالج میں ان دنوں انگریزوں، ہندوؤں اور پارسیوں کے لڑکے بھی تعلیم حاصل کرتے تھے اور پروفیسروں میں انگریز پروفیسر بھی تھے۔ خواجہ محمد اسحاق اپنے تمام ساتھی طالب علموں سے پڑھنے میں تیز تھے۔ کچھ عرصہ وہ بیمار بھی رہے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ گورنمنٹ کالج کیمبل پور میں فلسفے کے پروفیسر ہوئے۔ ان کی شادی جڑاں والا میں ہوئی تھی۔ وفات کے بعد ان کی میت کیمبل پور سے جڑاں والا لائی گئی اور انھیں وہیں دفن کیا گیا۔ ان کی زندگی میں بعض عجیب وغریب موڑ آئے۔ ان کے ایک ہی بیٹے تھے۔ ان کا نام خالد تھا۔ وہ پائیلٹ تھے۔ ان کی زندگی بھی عجیب طرح گزری۔ وہ بھی وفات پا گئے ہیں۔

خواجہ عبدالعزیز مرحوم کے دوسرے بیٹے عبدالرشید تھے۔ وہ میٹرک پاس تھے۔ درسِ نظامیہ کے فاضل اور فوج میں ملازم۔ خوب صورت جوان۔ اچانک ذہنی توازن بگڑ گیا۔ علاج کرایا گیا، لیکن افاقہ نہ ہوا۔ بالآخر لاہور کے ذہنی امراض کے اسپتال میں داخل کرا دیے گئے۔ ایک دن میں اور ان کے چھوٹے بھائی خواجہ محمد یوسف ملاقات کے لیے گئے تو وہ نہایت اچھی طرح ملے۔ اپنے تعلق داروں کے نام لے کر خیریت پوچھی۔ مجھ سے میرے تصنیفی کام کے سلسلے میں باتیں کیں۔ مولانا محمد اسماعیل سلفی مرحوم ومغفور کی بڑی تعریف کی۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ شخص بالکل تندرست ہے۔ ٹھیک ٹھیک باتیں کرتا ہے۔ اس کو یہاں کیوں بند کر رکھا ہے۔ اتنے میں ان کے ذہن کا پہیہ گھوما اور ایسی باتیں کرنے لگے، جن سے ان کا مرض واضح ہو گیا۔ ان میں ایک بات یہ تھی کہ اس اسپتال میں مولانا اسماعیل صاحب بھی آئے تھے۔ یہ معلوم نہیں کہ انھیں کتنا عرصہ اسپتال میں رکھا گیا اور ان کی وفات کب ہوئی۔

خواجہ صاحب کے تیسرے بیٹے خواجہ عبداللہ تھے۔ پورا قد، گورے چٹے، خوش مزاج، خوش گفتار اور خوش لباس۔ وہ ریلوے کے محکمے میں اسٹیشن ماسٹر تھے۔ ملازمت کے سلسلے میں ان کی سکونت لاہور کے محلہ گجر سنگھ میں تھی۔ وہیں ان کے ایک عزیز خواجہ عبیداللہ رہتے تھے جو خوش نویس تھے۔ میرے خواجہ عبداللہ اور خواجہ عبیداللہ دونوں سے مراسم تھے۔ افسوس ہے دونوں دنیا سے رخصت ہو گئے۔

چوتھے بیٹے خواجہ محمد یوسف ہیں جو اپنے آبائی شہر گوجراں والا میں اقامت گزیں ہیں۔ اللہ ان کی زندگی دراز کرے۔ تمام بھائیوں میں یہی اس وقت بقیدِ حیات ہیں۔ سب سے پہلے اس گھرانے کے اسی فرد سے میرا تعارف ہوا اور جلد ہی یہ تعارف دوستی کے قالب میں ڈھل گیا۔ میں اکتوبر ۱۹۴۸ء میں مرکزی جمعیت اہلِ حدیث کے آفس سکرٹری کی حیثیت سے لاہور آیا تو ایک روز خواجہ محمد یوسف کسی سلسلے میں دار العلوم تقویۃ الاسلام آئے جہاں میرا دفتر تھا۔ وہیں ان سے پہلی ملاقات ہوئی۔ اس وقت وہ نوجوان تھے۔ نکلتا ہوا قد، نکھرا

ہوا رنگ، تیکھے نقوش، کشادہ جبیں، چمک دار آنکھیں، چوڑا سینہ، بات چیت میں حلاوت اور سبک لہجہ، سفید شلوار قمیص پہنے ہوئے۔ یہ سطور ۳-نومبر ۲۰۱۲ء کو لکھی جا رہی ہیں۔ اس حساب سے یہ آج سے ٹھیک ۶۲ سال پہلے کی بات ہے۔ اس وقت سے لے کر لمحۂ رواں تک ہماری دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ تعلقات ہمیشہ مستحکم رہے۔ فروری ۱۹۵۰ء میں بہ سلسلہ اخبار ''الاعتصام'' مَیں گوجراں والا چلا گیا۔ تقریباً تین سال وہاں میرا قیام رہا۔ اس اثنا میں ان سے مراسم مزید بڑھ گئے۔ پھر میں دوبارہ لاہور آ گیا۔ اخبار کا دفتر بھی لاہور منتقل ہو گیا۔ خواجہ محمد یوسف جب بھی لاہور آئے مجھ سے ضرور ملے۔

بسا اوقات ان کے بعض دوست بھی ان کے ساتھ آتے۔ ان سے بھی میری دوستی ہو گئی جن میں ایک جناب محمد امین کھوکھر ہیں۔ طویل قامت، خوب صورت جوان، تیکھی ناک، موٹی آنکھیں، متناسب الاعضاء، مہذبانہ اندازِ گفتگو اور خوش پوش۔ کلین شیو۔ یہ ان کی جوانی تھی۔ ۱۱ ستمبر ۲۰۱۱ء کو میں ایک حادثے کی زد میں آ گیا اور میرا دایاں بازو ٹوٹ گیا۔ انھیں پتا چلا تو گوجراں والا سے عیادت کے لیے آئے۔ وہاں کی مٹھائی کا ڈبا ان کے ہاتھ میں تھا۔ ان کے صاحب زادے اور پوتے بھی ساتھ تھے۔ طویل عرصے کے بعد کھوکھر صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ رنگ روپ تو وہی تھا، لیکن چہرے پر داڑھی کی بہار تھی جو سفید چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ چند روز کے بعد پھر آئے، اب خواجہ محمد یوسف کو بھی ساتھ لے آئے تھے۔ میں کھوکھر صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے یاد رکھا۔ کئی دفعہ انھوں نے ٹیلی فون کیا۔ دعا ہے اللہ ان کا اور ان کے اہل و عیال کا حامی و محافظ ہو۔

اب آیئے خواجہ عبدالعزیز مرحوم و مغفور کے پانچویں اور سب سے چھوٹے صاحب زادے خواجہ محمد قاسم کی طرف۔

محمد قاسم کی ولادت ۱۹۳۳ء میں لاہور میں ہوئی۔ اس وقت خواجہ عبدالعزیز اے جی آفس میں ملازمت کرتے تھے اور ان کی سکونت لاہور میں تھی۔ لاہور کے قاریوں میں اس زمانے میں قاری فضل کریم کی بڑی شہرت تھی۔ وہ چینیاں والی مسجد میں طلبا کو قرآن مجید حفظ کراتے تھے۔ اس مسجد میں حفظ و قراءت قرآن کا سلسلہ مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے ۱۹۳۰ء کے تھوڑا عرصہ بعد اس وقت شروع کرایا تھا جب وہ اپنے عمِ مکرم حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی کی وفات کے بعد اس مسجد کے منصب خطابت پر متعین ہوئے تھے۔ اس شہر میں قرأت و تجوید کے ساتھ حفظِ قرآن کا یہ اولیں مدرسہ تھا، جس کا آغاز مولانا سید محمد داؤد غزنوی کی کوشش سے ہوا۔ خواجہ عبدالعزیز نے اپنے دو چھوٹے بیٹوں (محمد یوسف اور محمد قاسم) کو جو سکول میں تعلیم حاصل کرتے تھے، قاری صاحب کے مدرسے میں داخل کرا دیا اور وہاں انھوں نے قرآن مجید حفظ کیا۔ خواجہ صاحب گرمیوں

کے موسم میں بالعموم کشمیر جایا کرتے تھے، ایک مرتبہ وہ قاری صاحب کو بھی ساتھ لے گئے۔ خواجہ صاحب کے افرادِ خانہ کے ساتھ وہ بھی وہیں رہے اور تحفیظ قرآن کا سلسلہ بہ دستور جاری رہا۔

اللہ نے کرم فرمایا اور دونوں بھائیوں نے قرآن مجید حفظ کر لیا۔ آخری آیات سری نگر کے مسلم ہوٹل میں قاری صاحب کو سنائی گئیں اور خواجہ محمد قاسم متواتر دو سال شوپیاں (کشمیر) میں نماز تراویح پڑھاتے رہے۔ پھر گوجراں والا کی بعض مساجد میں یہ نیک ترین سلسلہ جاری رہا۔

حفظِ قرآن کے بعد خواجہ محمد قاسم نے درسِ نظامی کی تعلیم شروع کی جو دار العلوم تقویۃ الاسلام لاہور، جامعہ اسلامیہ چاہ شاہاں والا گوجراں والا اور جامعہ محمدیہ گوجراں والا میں حاصل کرتے رہے۔ ان مدارس میں ان کے اساتذہ تھے مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا محمد اسماعیل سلفی، حضرت حافظ محمد گوندلوی، مولانا عطاء اللہ بھوجیانی، مولانا محمد عبداللہ، مولانا ابوالبرکات احمد اور بعض دیگر حضرات۔ ان اساتذہ کرام سے انھوں نے بڑی محنت اور دلجمعی سے تعلیم حاصل کی۔ درسِ نظامی کی تکمیل کے بعد انھوں نے عربی فاضل کا امتحان پاس کیا اور پھر چلتے چلتے بی اے کا امتحان بھی دے دیا۔

مجھے یاد پڑتا ہے میرا ان سے پہلا تعارف دار العلوم تقویۃ الاسلام میں ان کی طالب علمی کے زمانے میں ہوا تھا۔ میں اس وقت ہفت روزہ ''الاعتصام'' کی خدمتِ ادارت پر مامور تھا اور اس کا دفتر اسی دار العلوم کی بلڈنگ کی دوسری منزل میں تھا۔ مجھے وہ اب بھی وہاں چلتے پھرتے دکھائی دے رہے ہیں اور ان کے معصومانہ چہرے پر مسکراہٹ لہرا رہی ہے۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھوں نے چند مہینے جہلم میں، ایک سال کوئٹہ میں، دو سال اسلام آباد میں خطابت کی۔ جامعہ اسلامیہ سلفیہ مسجد مکرم ماڈل ٹاؤن گوجراں والا میں فریضہ تدریس انجام دیتے رہے۔ کچھ عرصہ اپنے بڑے بھائی محمد یوسف کے ساتھ کاروبار بھی کیا۔

پھر ایک وقت آیا کہ استاذِ محترم حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کے فرمان کے مطابق تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گئے۔ ان کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:

۱- تین طلاقیں: یہ کتاب پہلی دفعہ ۱۹۶۴ء میں چھپی۔ پھر کئی دفعہ چھپی۔ اس پر مقدمہ حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی نے تحریر فرمایا۔

۲- قبر پرستی اور سماع موتی: یہ ان کا ایک طویل مضمون تھا جو بالاقساط ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں چھپا۔ بعد ازاں اسے کتابی شکل میں چھاپ دیا گیا۔ اس پر بھی مقدمہ حضرت الاستاذ مولانا محمد اسماعیل سلفی نے رقم فرمایا۔

۳- ''وسیلہ'' کتاب و سنت کی روشنی میں: یہ کتاب ۱۹۷۷ء میں لکھی گئی۔ اس پر مقدمہ ان کے بڑے بھائی

حافظ خواجہ محمد یوسف نے لکھا۔ اس کتاب کا سندھی زبان میں بھی ترجمہ ہو گیا ہے۔

۴- تبلیغی جماعت اپنے نصاب کے آئینے میں: یہ کتاب ۱۹۹۰ء میں معرضِ تصنیف میں آئی۔

۵- کراچی کا عثمانی مذہب اور اس کی حقیقت: یہ کتاب ۱۹۷۱ء میں لکھی گئی۔ فاضل مصنف لکھتے ہیں: اس مذہب کے بانی کراچی کے ایک حنفی المذہب ڈاکٹر مسعود عثمانی ہیں، جنھوں نے مسلمانوں میں فتنہ کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ یہ گروہ خوارج کا ظہورِ ثانی ہے۔

۶- حی علی الصلوٰۃ: یہ کتاب ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئی جو ۲۲۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں فرضی اور نفلی نمازوں سے متعلقہ مسائل ذکر کیے گئے ہیں، جن کی نمازیوں کو اکثر ضرورت پیش آتی ہے۔

۷- قد قامت الصلوٰۃ: ۵۴۴ صفحات کی اس کتاب کو ''حی علی الصلوٰۃ'' کا حصہ سمجھنا چاہیے۔ اس میں نماز سے متعلق تمام مسائل بالترتیب ضبطِ تحریر میں لائے گئے ہیں۔

۸- ہدایہ عوام کی عدالت میں: اس میں فقہِ حنفی کی مشہور کتاب ''ہدایہ'' میں مندرج روایات پر بحث کی گئی ہے۔ ہدایہ صدیوں سے درس نظامی کے نصاب میں شامل ہے اور اسے اہل حدیث اور احناف کے مدارس میں پڑھایا جاتا ہے۔ اس میں جو احادیث و روایات درج ہیں، لازماً محدثانہ نقطۂ نظر سے ان کے بارے میں تحقیق ہونی چاہیے۔ مسائل سے متعلق تحقیق میں ہرگز کوئی قباحت نہیں ہے۔ لیکن تحقیق کا اندازِ بیان خوب صورت ہونا چاہیے۔

۹- فتاویٰ عالم گیری پر ایک نظر: یہ کتاب چھے ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ اسے چھٹے مغل بادشاہ محی الدین اورنگ زیب عالم گیر نے ملا نظام الدین برہان پوری کے اہتمام میں عربی زبان میں مرتب کرایا۔ کہا جاتا ہے کہ ملا موصوف نے اس کے مختلف حصے پانچ سو علما سے مرتب کرائے، لیکن ان کے نام کسی کتاب میں مذکور نہیں ہیں۔ اس فقیر نے اپنی ایک کتاب ''برصغیر میں علم فقہ'' میں اس موضوع پر تفصیل سے لکھا جو پہلی مرتبہ ۱۹۷۳ء میں ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کی طرف سے شائع ہوئی۔ اس سے ۳۷ سال بعد اسے بہترین انداز میں کتاب سرائے الحمد مارکیٹ اردو بازار لاہور نے شائع کیا۔ مجھے بے حد تحقیق کے بعد اس کے اٹھائیس مرتبین کا علم ہو سکا ہے۔ فتاویٰ عالم گیری فقہ کی عام کتابوں کی طرح ایک کتاب ہے۔ دوسری فقہی کتابوں اور اس میں فرق یہ ہے کہ اس میں ہر مسئلے سے متعلق بہت سی کتابوں سے مواد لے کر یک جا کر دیا گیا ہے اور اس طرح یہ فتاویٰ جسے ''فتاویٰ ہندیہ'' بھی کہا جاتا ہے بڑی بڑی چھے جلدوں میں پھیل گیا۔

اس کا اردو ترجمہ سیّد امیر علی ملیح آبادی نے کیا جو بہت بڑے اہل حدیث عالم تھے اور دار العلوم ندوۃ

العلماء (لکھنؤ) کے شیخ الحدیث تھے۔ اس ترجمے پر انھوں نے تقریباً تین سو صفحات کا مقدمہ لکھا، جس میں فتاوے کے مآخذ و مصادر کا تذکرہ بھی کیا اور بتایا کہ اس کے کون کون سے مآخذ پایۂ صحت سے گرے ہوئے ہیں۔ یہ نہایت محققانہ مقدمہ ہے۔ سید امیر علی ملیح آبادی نے ۱۹۱۹ء میں وفات پائی۔ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ان سے بے شمار علما وطلبا نے استفادہ کیا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ.

ہمارے مرحوم دوست خواجہ محمد قاسم نے اس کے بعض حصوں کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔

۱۰۔ تعویذ اور دم کتاب وسنت کی روشنی میں: مجھے خواجہ صاحب کی صرف دو کتابیں پڑھنے کا موقع ملا ہے۔ ایک ''تین طلاقیں'' اور دوسری کوئی اور کتاب ہے، جس پر (غالباً) میں نے کچھ لکھا بھی ہے۔ ان کے علاوہ مجھے ان کی کوئی کتاب پڑھنے کی سعادت حاصل نہیں ہوئی۔ گزشتہ سطور میں ان کی کتابوں کے متعلق میں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ''مقالات خواجہ محمد قاسم'' کے ابتدائی صفحات میں تحریر شدہ مواد سے اخذ کیا گیا ہے۔ ''تعویذ اور دم کتاب وسنت کی روشنی میں'' کتاب کے مندرجات کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ''نبی ﷺ سے دم ثابت ہے، تعویذ ثابت نہیں۔'' اس سے آگے تعویذ نویسوں کے متعلق بڑے سخت الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، جنھیں لکھنا میں مناسب نہیں سمجھتا۔ معلوم نہیں یہ مرحوم ومغفور خواجہ صاحب کے الفاظ ہیں یا ان کے فرزند گرامی خواجہ ظہیر الاسلام ایم اے کے ہیں جنھوں نے ان کی کتابوں کا تعارف کرایا ہے۔ تعویذ حضرت حافظ محمد گوندلوی، حضرت حافظ عبداللہ روپڑی، حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، سیّد مولانا بخش کومولوی بھی لکھتے تھے، حضرت حافظ بارک اللہ لکھوی سے لے کر مولانا معین الدین لکھوی تک بے شمار علماے اہلِ حدیث لکھتے تھے۔ غزنوی علماے کرام بھی لوگوں کو تعویذ لکھ کر دیتے تھے۔ اب بھی لا تعداد علماے کرام تعویذ لکھتے ہیں۔ معلوم نہیں ان حضرات کے متعلق (جن میں خواجہ صاحب کے بعض اساتذہ بھی شامل تھے) ان کی کیا رائے تھی۔ اس کتاب کا تعارف ''مقالات خواجہ محمد قاسم'' کے صفحہ ۱۳ پر تین سطروں میں کرایا گیا ہے اور ''تعویذ'' کو ''تعویز'' لکھا گیا ہے اور ''تعویز'' لکھنا واقعی غلط ہے۔ خواجہ صاحب مرحوم نے ''تعویز'' (زا کے ساتھ) لکھنے کو غلط کہا ہوگا، نہ کہ ''تعویذ'' (ذال کے ساتھ) لکھنے کو۔ یعنی معاملہ شاید ذال اور زا کے املا کا ہوگا، اس عمل کا نہیں ہوگا جو بے شمار جلیل القدر علماے کرام کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں۔ قرآن وحدیث کے جو الفاظ پڑھ کر دَم کرنا جائز ہے، وہی الفاظ اگر کاغذ پر لکھ کر پانی میں بھگو کے کسی کو پلا دیے جائیں تو یہ ناجائز کیسے ہوگیا؟

۱۱۔ معرکہ حق و باطل بجواب جاء الحق: یہ کتاب ۹۰۷ صفحات پر مشتمل ہے جو خواجہ صاحب کی وفات کے بعد

چھپی اور جلد ہی ختم ہو گئی۔

۱۲- مقالات خواجہ محمد قاسم: یہ خواجہ صاحب مرحوم کی بعض تحریروں کا ۱۱۲ صفحات پر مشتمل مجموعہ ہے جو مرحوم کی وفات کے بعد معرض اشاعت میں آیا۔ ان بارہ کتابوں کے علاوہ بھی مقالات کے آخری صفحے پر مرحوم کی بعض کتابوں کے نام مرقوم ہیں۔

اب آیئے اپنے عالم و فاضل دوست خواجہ محمد قاسم کی حیاتِ مستعار کے آخری وقت کے بارے میں چند باتیں کرتے ہیں۔ ان کا آخری وقت دردناک بھی تھا اور قابل رشک بھی۔

خواجہ صاحب استاذِ مکرم حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کے حکم سے کم و بیش چالیس برس جامع مسجد اقصیٰ اہل حدیث سیٹلائٹ ٹاؤن (گوجرانوالا) میں خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے رہے۔ وہ دل کے مریض تھے لیکن کسی کو اس کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے۔ تصنیف و تالیف اور خطابت کی ذمہ داریاں بہتر طریقے سے نبھا رہے تھے۔ ۱۹- دسمبر ۱۹۹۷ء کا ان کا آخری خطبہ جمعہ تھا۔ حسب معمول خطبہ پڑھا اور تقریر کی۔ جماعت کرائی۔ التحیات کے بعد درود شریف پڑھا اور پھر دعائیں پڑھنے لگے تو مائیک سے لمبے سانس کی آواز نمازیوں کے کانوں میں پڑی اور ساتھ ہی سجدے میں گر گئے۔ ان کے پیچھے ایک نمازی حافظ عبدالوحید تھے۔ انھوں نے خیال کیا کہ خواجہ صاحب کو شاید کچھ شک پڑ گیا ہے، اسی لیے سجدۂ سہو کر رہے ہیں۔ پھر انھوں نے سجدے سے سر اٹھایا تو نیچے کو جھک گئے۔ حافظ عبدالوحید سمجھ گئے کہ معاملہ خطرناک ہے۔ انھوں نے فوراً سلام پھیر کر نمازیوں کو نماز سے نکالا اور خود اٹھ کر محراب کی طرف بڑھے۔ دیکھا تو خواجہ صاحب اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔

یہ صورت حال دیکھ کر لوگ آہیں بھرنے لگے اور خواتین گیلری سے نیچے اتر آئیں۔ آناً فاناً کہرام بپا ہو گیا اور ان کی ناگہانی موت کی خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔ مولانا خالد گرجاکھی نے نمازِ جنازہ پڑھائی جس میں علماء اور شیوخ الحدیث سمیت لوگوں نے بہت بڑی تعداد میں جنازے میں شرکت کی۔

خواجہ صاحب مرحوم کے بیٹے عاکف کا بیان ہے کہ ان کی وفات سے ایک ہفتہ پہلے میں نے خواب دیکھا کہ ابا جان مجھے کہہ رہے ہیں کہ اللہ نے مجھے جنت میں گھر دے دیا ہے۔ اب میرا یہاں رہنے کو جی نہیں چاہتا...... یہ خواب سچا ثابت ہوا اور وہ جنت میں پہنچ گئے۔

خواجہ محمد قاسم کے پانچ بیٹے ہیں۔ بڑے ظہیر الاسلام ایم اے ہیں جو ان کی جگہ جامع مسجد اقصیٰ اہل حدیث سیٹلائٹ ٹاؤن میں فریضہ خطابت انجام دیتے ہیں۔

دوسرے محمد عاکف بی اے سیاسی اور سماجی کارکن ہیں۔

تیسرے محمد عاصم ایم اے درس نظامی کے فاضل ہیں اور کاروبار کرتے ہیں۔

چوتھے حافظ محمد عدنان ایم اے جامع حرمین ماڈل ٹاؤن گوجراں والا کے مہتمم ہیں۔ تحریر و نگارش سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔

پانچویں حافظ حسن ایف اے پاس ہیں۔ درس نظامی کی تکمیل کر چکے ہیں۔ کاروبار میں مصروف ہیں۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ خواجہ محمد قاسم کی مغفرت فرمائے اور ان کی آل اولاد کو خدمت دین کی توفیق سے نوازے۔

یہاں چند الفاظ میں خواجہ محمد قاسم مرحوم کے ننہیال کا ذکر کرنا بھی میرے خیال میں ضروری ہے۔ ان کے نانا سیٹھ نظام الدین تھے جو اپنے عہد میں گوجراں والا کی مشہور شخصیت تھے۔ کسی زمانے میں آزادئ وطن کے لیے کانگریس سے بھی تعلق رہا اور مجلس خلافت سے بھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے انتہائی مداح اور عقیدت مند تھے۔ علما کا احترام سے تذکرہ کرتے۔ میں جب گوجراں والا میں اخبار ''الاعتصام'' میں کام کرتا تھا تو کبھی کبھی دفتر تشریف لاتے اور گزشتہ دور کے عالموں اور سیاسی راہنماؤں کی باتیں سناتے۔ مولانا محمد حنیف ندوی اس اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ ایک دن سیٹھ صاحب مرحوم صبح نو بجے کے قریب آئے۔ میں دفتر میں اکیلا بیٹھا کام کر رہا تھا۔ کورے لٹھے کا تھان مجھے دیا۔ فرمایا: کل میں یہاں آیا تو میں نے دیکھا کہ مولانا محمد حنیف ندوی کا پائجامہ پھٹا ہوا تھا۔ تم ابھی مولانا کے گھر جاؤ اور انھیں یہ کپڑا دے آؤ۔ کسی کو اس کا پتا نہیں چلنا چاہیے۔

سیٹھ صاحب مرحوم نہایت نیک اور کھلے دل کے آدمی تھے۔ اللہ نے انھیں مال و دولت سے نوازا تھا اور اس کی راہ میں خرچ بھی کرتے تھے۔

ان کے فرزندِ گرامی سیٹھ نذر محمد بھی فراخ حوصلہ تھے۔ یہ سب لوگ حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کے حلقہ عقیدت میں شامل تھے۔ سیٹھ نذر محمد مرحوم نے مولانا سلفی کی وساطت سے جامعہ سلفیہ کو ہزاروں روپے دیے۔ اللہ ان سب کی مغفرت فرمائے۔

ان کے بیٹے عبدالرحمٰن تھے، جن کی شادی خواجہ محمد قاسم کی ہمشیرہ سے ہوئی تھی۔ وہ میرے ملنے والے تھے۔

اللہ تعالیٰ ان دونوں خاندانوں کے فوت شدگان کو جنت نصیب کرے اور زندوں کو صحت و عافیت کے ساتھ نیکی کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

آخر میں ایک لطیفہ سنیے جو بہت سال ہوئے خواجہ محمد یوسف نے سنایا تھا۔ ایک مرتبہ رمضان المبارک میں خواجہ محمد قاسم نے مسجد اہل حدیث (دال بازار گوجراں والا) میں تراویح پڑھائیں۔ خواجہ محمد یوسف ان کے سامع تھے اور دونوں بھائی اکٹھے مسجد میں آتے تھے۔ خواجہ یوسف کی داڑھی خشخشی تھی اور خواجہ قاسم کی پوری۔

یوسف عمر میں بڑے تھے اور قاسم چھوٹے۔ ایک دن یوسف مسجد میں اکیلے آئے اور نماز سے کچھ دیر پہلے آ گئے۔ ایک بزرگ نمازی جو پہلی صف میں امام کے پیچھے نماز پڑھا کرتے تھے، وہ یوسف کو چھوٹی داڑھی کی وجہ سے خواجہ قاسم کا بیٹا سمجھتے تھے، حالاں کہ خواجہ قاسم کی ابھی شادی بھی نہیں ہوئی تھی اور یوسف صاحبِ اولاد تھے۔ ان بزرگ نے یوسف سے کہا آپ کے ساتھ آپ کے ابا جی نہیں آئے؟ جواب دیا: وہ ابھی آ جائیں گے۔ لیکن ان بزرگ کو یہ نہیں بتایا کہ وہ میرے چھوٹے بھائی ہیں۔

مولانا عبدالرؤف خاں رحمانی جھنڈانگری

(وفات ۳۰۔ نومبر ۱۹۹۹ء)

علاقہ نیپال اور ہندوستان کے ماضی قریب کے مشہور مدرسین، ممتاز خطبا اور نامور مصنفین میں مولانا عبدالرؤف خاں رحمانی جھنڈانگری کا اسمِ گرامی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے والد کا نامِ نامی حاجی نعمت اللہ خاں اور دادا کا سردار خاں تھا۔ ان کی ولادت ۱۹۱۰ء میں موضع کدربٹوا ضلع کپل وستو۔ (Kapil Vastu) نیپال میں ہوئی۔ پانچ سال کی عمر کو پہنچے تو گاؤں کے مکتب میں میاں مالک علی سے تعلیم حاصل کرنے لگے۔ ان کے والد اپنے اس بیٹے کو اعلیٰ دینی تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ وہ امیر آدمی تھے۔ انھوں نے ۹ دیہات اس نواح میں خریدے تھے اور ان کا شمار علاقے کے بڑے زمینداروں میں ہوتا تھا۔ ان کے خرید کردہ دیہات کے نام یہ تھے: (۱) کدربٹوا (۲) چنن پور (۳) سورن پور (۴) سُگا نگر (۵) ہرہوا (۶) ہرہٹی (۷) مدرہوا (۸) کھیری (۹) ہنکٹوا۔

حاجی نعمت اللہ خاں مرحوم نے موضع جھنڈانگر (نیپال) میں بھی اچھی خاصی زمین خریدی جس میں ایک مسجد بنائی اور ایک مدرسہ جاری کیا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ وہاں کے مسلمان مسجد میں با جماعت نماز پڑھیں، دین کے مسائل سیکھیں اور ان کے بچے مدرسے میں تعلیم حاصل کریں۔ یہ آج سے سو سال پیشتر ۱۹۱۴ء کی بات ہے۔ حاجی نعمت اللہ خاں نہایت ایثار پیشہ بزرگ تھے۔

انھوں نے اپنے گاؤں سورن پور کی تمام زمین جو چھے سو بیگھے خام (یعنی سو ایکڑ) تھی مدرسے کے نام وقف کر دی تھی۔ محکمہ مال کی اصطلاح میں یہ چار مربعے ہوئے۔ ہمارے علم کے مطابق انفرادی طور پر (بادشاہوں کے علاوہ) اتنی زمین برصغیر کے کسی مسلمان نے کسی مدرسے کو نہیں دی۔ یہی مدرسہ آگے چل کر ''جامعہ سراج العلوم السّلفیہ'' جھنڈانگر کے نام سے مشہور ہوا۔

قیامِ مدرسہ کے بعد حاجی نعمت اللہ خاں نے اپنے اہل و عیال کو جھنڈانگر بلا لیا تھا۔ وہیں مولانا عبدالرؤف نے دینی مدارس کے نصاب کے مطابق تیسری جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ [1]

---

[1] حاجی نعمت اللہ خاں کی خرید کردہ زمین اور جامعہ سراج العلوم کے نام اس کے وقف کے بارے میں ضروری معلومات اسی کتاب میں مولانا شمیم احمد ندوی سے متعلق مضمون میں بیان کی گئی ہیں۔

مولانا رحمانی کا سلسلۂ تعلیم:

تیسری جماعت تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد مولانا عبدالروف کا سلسلۂ تعلیم آگے چلا۔ وہ بنارس چلے گئے اور وہاں کی جامعہ رحمانیہ میں داخلہ لیا۔ جامعہ رحمانیہ میں انھوں نے مولانا محمد منیر خاں، مولانا حبیب اللہ بہاری اور مولانا فصیح الدین بنارسی سے استفادہ کیا۔ پھر اپنے گاؤں کے مدرسہ سراج العلوم میں واپس آگئے، لیکن یہاں چند روز ہی قیام رہا اور مزید تعلیم کے لیے جلد ہی دارالحدیث رحمانیہ (دہلی) کا عزم کیا۔ یہاں انھوں نے مولانا احمد اللہ پرتاپ گڑھی دہلوی، مولانا عبدالسلام درانی، مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوری، مولانا نذیر احمد رحمانی املوی اور مولانا سکندر علی ہزاروی کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیے۔ ۱۳۵۰ھ (۱۹۳۲ء) میں فارغ التحصیل ہوئے۔ دستارِ فضیلت شارح ترمذی حضرت مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری نے باندھی اور اس کے بعض پیچ حضرت مولانا احمد اللہ پرتاپ گڑھی نے پورے کیے۔ اس بابرکت مجلس میں دارالحدیث رحمانیہ کے مہتمم شیخ عطاء الرحمٰن سمیت بہت سے علما و زعما موجود تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پرنسپل ڈاکٹر ذاکر حسین خاں بھی اس علمی محفل میں شریک تھے جو آزادیٔ ہند کے بعد ملک کے منصب صدارت پر فائز ہوئے۔

دہلی اور بنارس میں تدریس:

مولانا عبدالروف بڑے ذہین، تحصیلِ علم کے بے حد شائق اور محنتی طالب علم تھے۔ درسی کتابوں کے علاوہ بھی مختلف موضوعات کی کتابوں کا مطالعہ جاری رکھتے تھے اور ان کی معلومات کا دائرہ وسیع تھا۔ مروّجہ تعلیم سے فراغت کے بعد انھیں اللہ کی مہربانی سے یہ اعزاز حاصل ہوا کہ دارالحدیث رحمانیہ ہی میں اپنے اساتذہ کرام کے ساتھ فریضۂ تدریس سرانجام دینے لگے اور بعض اہم فنون کی کتابوں کی تدریس ان کے ذمے لگائی گئی۔ انھیں درسی کتابوں پر عبور حاصل تھا اور وہ ابتدائے زمانۂ تدریس ہی میں کامیاب مدرس کے طور پر متعارف ہوگئے تھے۔ ایک سال انھوں نے دارالحدیث رحمانیہ میں تدریس کی۔ پھر استعفا دے کر اپنے آبائی مدرسہ میں جھنڈا نگر چلے گئے اور دو سال بہ طور مدرس وہاں خدمت انجام دیتے رہے۔

کسی زمانے میں وہ جامعہ رحمانیہ بنارس میں پڑھتے رہے تھے۔ اب اسی جامعہ کے اربابِ اہتمام کی طرف سے انھیں بہ حیثیت مدرس تشریف لانے کی دعوت دی گئی۔ چنانچہ وہ وہاں گئے اور تین سال تک وہاں ان کا سلسلۂ تدریس جاری رہا۔

جامعہ سراج العلوم کی تدریس:

اب مولانا کے والد حاجی نعمت اللہ خاں نے انھیں واپس جھنڈا نگر آنے کا حکم دیا اور وہ اپنے والد کے جاری کردہ مدرسے میں بہ طور مدرس کام کرنے لگے۔ اس کا نام جامعہ سراج العلوم السلفیہ رکھا گیا۔ اس کی زمام

نظامت حاجی صاحب کے ہاتھ میں تھی۔ کچھ عرصے کے بعد نظامت بھی مولانا کے سپرد کر دی گئی۔ اب درس و تدریس کے معاملات کے ذمے دار بھی یہی تھے اور مدرسے کے نظم ونسق کی باگ دوڑ بھی یہی سنبھالے ہوئے تھے۔ طلبا کا داخلہ، ان کے خرچ اخراجات کا معاملہ، اساتذہ کا تقرر، درسی اور دیگر کتابوں کی فراہمی وغیرہ تمام انتظامی امور کی انجام دہی انہی کے ذمے تھی اور یہ ارکانِ مدرسہ کی شراکت سے سارے کام حسن وخوبی کے ساتھ چلا رہے تھے۔ لائق مدرس اور بہترین منتظم تھے۔ (تقریباً چار سال کے استثنا کے علاوہ) تادمِ آخریں یہ بہت بڑی ذمہ داری ان کے سپرد رہی۔ [1]

جون ۱۹۹۴ء میں ماہنامہ "السراج" جاری کیا گیا تو یہ ایک اور بڑی ذمہ داری تھی جو مولانا عبدالرؤف رحمانی کے کندھوں پر آ پڑی۔ اللہ کے فضل سے یہ بھی پوری ہوتی رہی۔ علمی اور تحقیقی لحاظ سے ماہنامہ "السراج" ہندوستان اور نیپال کا مشہور مجلّہ ہے جو باقاعدگی سے جاری ہے اور کئی سال سے اس کی ادارت کا فریضہ مولانا عبدالرؤف رحمانی کے بھتیجے مولانا شمیم احمد ندوی انجام دے رہے ہیں۔

"جامعہ سراج العلوم السّلفیہ" ہندوستان اور نیپال کا عظیم الشان دار العلوم ہے، جس کا براہِ راست مدینہ یونیورسٹی سے تعلق ہے اور اس کے متعدد طلبا اس یونیورسٹی سے فارغ ہو چکے ہیں، ان میں سے بعض مختلف اداروں میں مشغول درس و تدریس ہیں اور بعض اسلامی اور یورپی و افریقی ملکوں میں تصنیفی، تدریسی، تبلیغی اور خطابتی فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہیں۔

تدریس و نظامت سے علیحدگی:

مولانا عبدالرؤف رحمانی جرأت مند اور شجاعت پیشہ اہل علم تھے۔ بعض لوگوں کی طرف سے انھیں تکلیفیں بھی پہنچیں لیکن انھوں نے بڑی بہادری سے ان کا مقابلہ کیا۔ انھوں نے اپنی کوشش اور خداداد صلاحیت سے جامعہ سراج العلوم کی دومنزلہ خوب صورت عمارت تعمیر کی تو جھنڈا نگر اور اس کے اطراف و جوانب کے بعض

---

[1] حاجی نعمت اللہ خاں بنارس میں رکشوں کا کاروبار کرتے تھے اور ان کا یہ بہت اچھا کاروبار تھا۔ ایک مرتبہ وہ بنارس سے واپس جھنڈا نگر آرہے تھے کہ راستے میں بیمار ہو گئے۔ گھر آئے تو علاج کے لیے انھیں گونڈہ لے جایا گیا۔ وہیں ۱۸۔ دسمبر ۱۹۴۶ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

میت جھنڈا نگر لائی گئی۔ مولانا عبدالعظیم صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی اور جھنڈا نگر کے قبرستان میں انھیں دفن کیا گیا۔ ان کی موت اس خاندان کے لیے تو بہت بڑا صدمہ تھا ہی، اس علاقے کے لوگ بھی اس سے بے حد مغموم ہوئے۔ انھوں نے اس علاقے میں جو اسلامی علوم کے اعتبار سے بنجر علاقہ تھا، عظیم الشان مدرسہ جاری کیا اور مسجد تعمیر کرائی۔ مدرسے کے لیے سوا ایکڑ زمین وقف کی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین یا رب العالمین

لوگوں کو بڑی تکلیف ہوئی اور ان کے دلوں میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی۔ وہ خفیہ طریقے سے مولانا کے خلاف سازشیں کرنے لگے اور انھیں نظامت اور تدریس سے علیحدہ کر کے جامعہ پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس میں وہ کامیاب بھی ہو گئے اور چار سال ان کا جامعہ پر قبضہ رہا۔ اس سلسلے میں خود مولانا کے الفاظ پڑھیے:

''درمیان میں ایک وقت آیا کہ جماعت اسلامی کے کچھ سر برآوردہ لوگوں کی سازش سے مجھے نظامت سے علیحدہ کر دیا گیا اور مدرسے کی خدمت سے محروم رکھا گیا، لیکن مدرسے کی یاد اور محبت سے میں ایک پل کے لیے بھی غافل نہ رہا۔ بہ زبانِ شاعر:

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روز گار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

''مدرسے سے الگ ہو کر میں موضع کدر بٹوا میں قیام پذیر ہو گیا تھا۔ کدر بٹوا میں بعد نماز مغرب اکثر اپنے مکان کی چھت پر جا کر یہ شعر پڑھا کرتا تھا۔

آدم بنا کے کیوں مری مٹی خراب کی
جوہر تو مجھ میں تھے ملکوتی خصال کے

جب بعض لوگوں کی کوشش سے چار برس کے بعد میں نے دوبارہ عہدۂ نظامت قبول کیا اور مدرسے میں گیا تو اس مدت میں نہ کوئی سفیدی ہوئی تھی، نہ کہیں پلستر ہوا تھا۔ عمارت خراب ہو گئی تھی اور خزانے میں صرف ایک سو روپے باقی تھے۔ مدرسہ دم توڑ رہا تھا۔ میں نے خدا کے بھروسے پر اسے دوبارہ سنبھالا۔'' [1]

نظامت سے علیحدگی کے بعد جب مولانا عبدالرؤف رحمانی اپنے گاؤں کدر بٹوا میں مقیم تھے، انھوں نے دو کتابیں لکھنے کا ارادہ کیا، ایک کتاب کا نام انھوں نے صیانۃ الحدیث سوچا تھا اور دوسری کا نصرۃ الباری فی بیان صحۃ البخاری۔ یہ دونوں موضوع بہت اہم ہیں۔ ان کے لیے انھیں کتب حوالہ کی ضرورت تھی جو مدرسہ سراج العلوم (جھنڈا نگر) کی لائبریری میں موجود تھیں۔ ان کتابوں کے لیے انھوں نے ملازم کو بھی بھیجا، خود بھی گئے۔ لیکن یہ کتابیں نہیں دی گئیں۔ اندازہ کیجیے مدرسہ ان کے والد حاجی نعمت اللہ خاں نے اپنی گرہ سے زمین خرید کر بنایا۔ لائبریری انھوں نے خود قائم کی جو عربی، فارسی اور اردو کی بے شمار علمی کتابوں پر محیط ہے، لیکن اب انھیں نہ وہاں جانے کی اجازت ہے اور نہ یہ اپنے خریدے ہوئے کتب خانے سے کوئی کتاب لے سکتے ہیں۔ حالاں کہ ہر کتب خانے سے ہر مصنف کتاب لے سکتا اور اس سے استفادہ کر سکتا ہے۔ فرماتے

[1] السراج سالانہ میگزین جلد ۲ صفحہ ۲۲۔

ہیں: اس واقعہ سے ’’اس وقت کے حاسدین کی شر پسند ذہنیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔‘‘ لیکن بعد میں کتابیں مل گئیں۔ وہ کیسے؟

’’بعد میں کھوریا کے بابو مہدی حسن صاحب کی توجہ خاص سے آپ کو کتابیں ملیں اور اس طرح یہ دو عظیم کتابیں (صیانۃ الحدیث اور نصرۃ الباری فی بیان صحۃ البخاری) منصۂ شہود پر آئیں۔‘‘ ❶

ایک پریشان کن واقعہ:

ایک اور واقعہ سنیے جو جامعہ سراج العلوم السلفیہ سے تعلق رکھتا ہے اور ان کے زمانۂ نظامت میں پیش آیا۔ اس واقعہ کی تفصیل تو آگے آئے گی جو دلچسپ بھی ہے اور دردناک بھی۔ یہاں چند الفاظ میں اس کا خلاصہ پڑھیے:

’’مولانا کے عہدِ نظامت میں راجا نیپال کے حکم سے مدرسہ سراج العلوم جھنڈا نگر کی پختہ عمارت منہدم کر دی گئی تھی اور پھر تین برس تک مقدمہ کھٹمنڈو میں چلتا رہا۔ اس وقت کھٹمنڈو کا سفر بہت ہی مشکل تھا۔ آمد و رفت کے وسائل موجودہ دور کے وسائل کی طرح نہیں تھے۔ کئی کئی دن سفر میں لگ جاتے تھے، لیکن پھر بھی مولانا نے ہمت نہیں ہاری اور اس مقدمے کی مسلسل پیروی کرتے رہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے ایک وقت آیا کہ راجا موہن شمیشر کے بھائی ببر شمشیر کے حکم سے مدرسے کی دوبارہ تعمیر کا فیصلہ ہوا، اور اس طرح اس مقدمے میں آپ کو کامیابی ملی اور ایک بہت بڑی پریشانی کا خاتمہ ہوا۔‘‘ ❷

تقریر و خطابت:

مولانا عبدالرؤف رحمانی تقریر و خطابت میں بھی خاص شہرت رکھتے تھے۔ طالب علمی کے دور ہی میں وہ خطابت میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ جس زمانے میں انھوں نے دارالحدیث رحمانیہ میں داخلہ لیا، وہ سیاسیات اور مذہبی بحثوں کا زمانہ تھا۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان بھی مناظرات و مباحث کا سلسلہ جاری رہتا تھا اور مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں بھی باہم علم کی کشتی کے اکھاڑے جمتے اور تحقیق کے دنگل ہوتے رہتے تھے۔ سیاسی جلسوں کا انعقاد بھی شب و روز کا معمول تھا، جن میں سیاسیات سے تعلق رکھنے والے مقرر تقریروں کا میدان گرم کیے رکھتے تھے۔ دہلی شہر علم کا بہت بڑا مرکز تھا، جس میں ہر موضوع سے وابستگی رکھنے والے کثیر تعداد میں موجود تھے۔ دینی مدارس کے طلبا کی ہفت روزہ محفلیں بھی

❶ تفصیل کے لیے دیکھیے ماہنامہ محدث (بنارس، اکتوبر ۱۹۹۹ء صفحہ ۴۳ تا ۴۵)

❷ ماہنامہ ’’التوعیۃ‘‘ (دہلی ستمبر ۱۹۸۷ء ص ۱۴).

پوری شان سے منعقد ہوتی تھیں جن میں ہر طالب علم مکمل تیاری سے اپنے افکار کا اظہار کرتا تھا۔

مولانا عبدالرؤف رحمانی کی خطابت کا آغاز اسی علمی اور سیاسی گہما گہمی کے دور میں ہوا اور اسی فضا میں ان کی زبان تقریر سے آشنا ہوئی۔ ان کے قلم نے بھی اسی ماحول میں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ وہ بارگاہِ الٰہی سے اخاذ ذہن لے کر آئے تھے اور مطالعہ کا شوق بھی انھیں اللہ کی طرف سے ودیعت فرمایا گیا تھا۔ جہاں اردو، عربی اور فارسی کے بے شمار اشعار ان کے حافظے میں محفوظ تھے، وہاں حدیث و رجال سے متعلق بھی ان کا علم وسیع تھا اور بزرگان دین کے لاتعداد واقعات انھیں زبانی یاد تھے، جو علامہ ابن جوزی کی صفۃ الصفوہ، علامہ ذہبی کی تذکرۃ الحفاظ، سیر اعلام النبلاء، تاریخ بغداد، ابن عساکر کی تاریخ دمشق اور دمیری کی حیاۃ الحیوان وغیرہ کتابوں میں منقول ہیں اور یہ کتابیں ان کے زیرِ مطالعہ رہتی تھیں۔ تقریر میں وہ ان کے حوالے دیتے تھے۔ شنید ہے کہ ان کی تقریر سے عوام و خواص یکساں مستفید ہوتے تھے۔

مجھے نہ ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہے اور نہ ان کی تقریر سننے کا کبھی موقع ملا۔ تقسیم ملک کی وجہ سے ہندوستان یا نیپال کے اصحاب علم سے میل جول کا سلسلہ تقریباً ختم ہے۔ لیکن کتابوں میں پڑھا اور لوگوں سے سنا ہے کہ وہ مسلسل کئی کئی گھنٹے بولتے اور ہر فقہی مسلک کے لوگ انہماک اور غور سے ان کے ارشادات سنتے اور محظوظ ہوتے تھے۔ وہ اپنی تقریر کو اشعار اور واقعات سے مزین کرنے کے فن سے خوب آگاہ تھے۔ جب سٹیج پر کھڑے ہو جاتے تو ان کی زبان بھی ان کا پورا ساتھ دیتی، ان کا حافظہ بھی ان کی مکمل رفاقت اختیار کیے رکھتا، ان کا ذہن بھی ہر موقعے پر ان کی مدد کرتا اور ان کا اسلوب بیان بھی کامل توانائی کے ساتھ ان کا معاون ثابت ہوتا۔

ایک دلچسپ لطیفہ:

اپنے ملک (نیپال) کے لوگوں کی بعض باتوں کا وہ دلچسپ انداز میں تذکرہ فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ علاقہ نیپال کے گاؤں "ہرنام پور" میں ایک بہت بڑے جلسے سے خطاب کر رہے تھے۔ یہ ان کی جوانی کا زمانہ تھا اور ان کی خطابت کا بھی وہ بھرپور جوانی کا دور تھا۔ انھوں نے نیپال کے پہاڑی مسلمانوں کی جہالت اور اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہاں کے اکثر پہاڑی مسلمانوں کو جانوروں کے ذبح کرنے کا طریقہ بھی معلوم نہیں۔ ذبح کے وقت وہ بسم اللہ کی جگہ یہ الفاظ کہتے ہیں:

آری کھایو باری کھایو کھایو کھیت میرو
اللہ پاک کا حکم بھیو گھانٹی کاٹوں تیرو

یعنی اب تک تو نے میرے کھیت کھلیان پھلواری میں کھایا پیا، آج اللہ کے حکم سے میں تیرا گلہ کاٹ

رہا ہوں۔ ❶

پُر تاثیر خطاب:

مولانا ممدوح کا خطاب اتنا پُر تاثیر ہوتا تھا کہ جہاں جاتے، مجمع پر غلبہ پا لیتے۔ ایک مرتبہ بنگلور کی والا جاہی مسجد میں ''توحید'' کے موضوع پر تقریر کی۔ سامعین میں سخت قسم کے متعصب علما بھی موجود تھے، مولانا نے اپنے خاص اسلوب میں اللہ کی وحدانیت اور اس کے مختار کل ہونے پر قرآن و حدیث سے دلائل دیے، بزرگانِ سلف سے منقول واقعات بیان کیے۔ کسی کو ان سے اختلاف کی جرأت نہیں ہوئی۔ سب نے نہایت سکون سے تقریر سنی اور انھیں داد دی۔ یاد رہے یہ وہی مسجد تھی، جس میں خالص توحید کے مسائل پر مشتمل مولانا اسماعیل شہید دہلوی کی کتاب ''تقویۃ الایمان'' کے ایک ایک ورق کو پھاڑ کر ضائع کیا گیا تھا اور کسی مدعیِ توحید کو اس مسجد میں جانے کی اجازت نہ تھی۔

۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹ نومبر ۱۹۶۱ء کو صوبہ یوپی کے ضلع بستی کے ایک مقام ''نوگڑھ'' میں مرکزی جمعیت اہلِ حدیث ہند کی کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کانفرنس کی کامیابی کے لیے یوں تو ہندوستان کی جماعت اہلِ حدیث کے تمام علما و زعما نے حصہ لیا، لیکن اس میں نمایاں طور پر حصہ لینے والوں میں مولانا عبدالرؤف رحمانی تھے۔ وہ ہاتھی پر سوار ہوئے اور ضلع بستی، ضلع گونڈہ اور نیپال کے قصبات و دیہات کے چکر لگائے اور وہاں تقریریں کیں۔ اہلِ حدیث مسلک کی وضاحت کی اور قرآن و حدیث کی روشنی میں اس انداز سے لوگوں کو خطاب کیا کہ وہ اس سے بے حد متاثر ہوئے۔ لوگوں نے دل کھول کر کانفرنس کی کامیابی کے لیے پیسے بھی دیے اور اس میں شرکت بھی کی۔ کانفرنس کے اخراجات کا تخمینہ اس سستے زمانے میں ۳۵ ہزار روپے لگایا گیا تھا۔ اس سے آدھی رقم اکیلے مولانا عبدالرؤف رحمانی نے فراہم کر دی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کانفرنس میں ایک لاکھ سے زیادہ لوگوں نے شرکت کی اور نہایت شوق سے علمائے کرام کی تقریریں سنیں۔

اس کانفرنس میں خطبہ استقبالیہ انہی مولانا عبدالرؤف رحمانی نے ارشاد فرمایا تھا۔ یہ تحریری خطبہ ۳۶ صفحات پر مشتمل تھا۔ نہایت جامع خطبہ جس میں جماعت اہلِ حدیث کی پوری تاریخ معرضِ بیان میں آ گئی تھی۔ یہ خطبہ سن کر شدتِ تاثر سے اس وقت کے علمائے ہند اور دیگر حاضرین کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے اور صدرِ کانفرنس مولانا عبدالوہاب آروی نے دو دفعہ فرمایا: ''بیٹا تم نے حق ادا کر دیا۔ بیٹا تم نے حق ادا کر دیا۔''

خطبے کے اختتام پر علمائے کرام نے گرم جوشی کے ساتھ مولانا رحمانی سے مصافحہ و معانقہ کیا اور مبارک باد

❶ ماہنامہ السراج، خطیب الاسلام نمبر بابت مئی...... اکتوبر ۲۰۰۰ء صفحہ ۲۱۳۔

دی۔ بعض اکابر علما نے اتنا بڑا مجمع دیکھ کر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے ان سے کہا:

''عبدالروٴف تمھاری بخشش ہوگئی، تم نے میدان عرفات اور حج کا نقشہ پیش کر دیا۔'' ❶

مولانا عبدالروٴف رحمانی کی خطابت وتقریر کی اثر آفرینی کا اندازہ اس سے لگایئے کہ خود ان کے استاذِ گرامی شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوری نے ایک موقع پر انھیں ''خطیب الہند'' کا خطاب دیا اور ایک اور موقع پر انھیں ''خطیب الاسلام'' کے لقب سے نوازا۔

نوگڑھ کانفرنس کے اسی خطبہ استقبالیہ میں مولانا عبدالروٴف رحمانی نے ہندوستان کی جماعت اہل حدیث کے مرکزی دار العلوم کے قیام پر زور دیا...... اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دوسرے دن وہیں علما کی میٹنگ ہوئی اور مرکزی دار العلوم کے قیام کی منظوری دے دی گئی اور پھر جلد ہی بنارس میں جامعہ سلفیہ کے نام سے یہ دار العلوم معرضِ قیام میں آ گیا، جس کے فارغ التحصیل حضرات بڑے فخر سے سلفی کہلاتے اور اپنے نام کے ساتھ ''سلفی'' کا لفظ لکھتے ہیں۔

تقسیم ملک کے بعد جماعت کی تنظیم:

یہاں یہ بھی عرض کر دیں کہ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے نتیجے میں جس طرح پاکستان کی جماعت اہل حدیث کا شیرازہ بکھر گیا تھا اور پھر ۲۴ جولائی ۱۹۴۸ء کو مولانا سید محمد داوٴد غزنوی کی صدارت میں کم وبیش دو سو علما وزعما کی مجلس میں ''مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان'' کے نام سے جماعت کی تنظیم قائم کی گئی تھی (جسے قیام بنگلہ دیش کے بعد سے مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان کہا جاتا ہے) اسی طرح کا معاملہ بلکہ اس سے بھی زیادہ دردناک معاملہ ہندوستان کی جماعت اہل حدیث کو پیش آیا۔ وہاں کی جماعت کو ازسر نو منظم کرنے کی پہلی آواز مولانا عبدالروٴف رحمانی کے استاذِ محترم مولانا نذیر احمد رحمانی املوی کی تھی۔ انھوں نے مولانا عبدالوہاب آروی سے ملاقات کی اور جماعت کی تنظیم کی طرف توجہ دلائی۔ مولانا آروی نے اس اہم کام پر غور کرنے کے لیے پانچ حضرات کو منتخب کیا۔ وہ تھے: (۱) مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوری (۲) مولانا نذیر احمد رحمانی املوی (۳) مولانا عبدالجلیل رحمانی (۴) مولانا محمد داوٴد راز اور (۵) مولانا عبدالروٴف رحمانی جھنڈا نگری۔

یہ پانچوں حضرات دہلی میں جمع ہوئے اور جماعت کی نشاۃ ثانیہ پر غور کیا۔ پھر رفتہ رفتہ سلسلہ آگے بڑھا اور ''مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند'' کے نام سے جماعت کی تنظیم کا قیام عمل میں آ گیا۔ اس کے بعد صوبائی جمعیتیں اور ضلعی جمعیتیں قائم کی گئیں اور ماشاء اللہ اب پورے ہندوستان میں جماعتی کام ہو رہا ہے۔

❶ ماہنامہ محدث بنارس، جون ۱۹۹۹ء صفحہ ۲۹.

متحدہ ہندوستان میں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس تمام برصغیر کی جماعت اہل حدیث کی نمائندہ تنظیم تھی۔ پھر برصغیر (ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش) تین ملکوں میں منقسم ہوا اور تینوں ملکوں میں الگ الگ تنظیمیں قائم ہوئیں۔ دوسرے دوملکوں کا تو مجھے پتا نہیں لیکن پاکستان میں جماعت اہل حدیث کے چھوٹے بڑے سات آٹھ گروپ ہوں گے اور سب اپنی اپنی جگہ تدریسی اور تصنیفی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان کی سب سے زیادہ مضبوط اور ملک گیر تنظیم ہے۔ پاکستان سے باہر بھی مختلف ملکوں میں اس کی تنظیمیں قائم ہیں۔

جمعیت اہل حدیث نیپال کا قیام:

بات مولانا عبدالرؤف رحمانی کی ہو رہی تھی۔ نیپال کے مشرقی اور وسط مغربی سرحدی علاقوں میں اہل حدیث خاصی تعداد میں آباد ہیں اور ان کے مدارس بھی جاری ہیں، لیکن ان کی کوئی تنظیم نہ تھی۔ وہ مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے قواعد وضوابط کے مطابق کام کرتے تھے۔ ۳۰ مارچ ۱۹۸۹ء کو مولانا عبدالرؤف رحمانی نے جامعہ سراج العلوم (جھنڈانگر) میں نیپال کے اہل حدیث علما وزعما کا ایک اجلاس منعقد کیا، جس میں ''مرکزی جمعیت اہل حدیث نیپال'' کے نام سے ان کی تنظیم کا قیام عمل میں لایا گیا۔

بے شبہ مولانا ممدوح بہت متحرک اہل علم تھے اور جماعتی معاملات میں ہر وقت سرگرم عمل رہتے تھے۔ خوش گفتار، بلند اخلاق، علما کے قدردان اور اسلام کے رفیع المرتبت مبلغ!

تصنیف وتالیف اور مقالہ نگاری:

جس طرح وہ ممتاز مدرس اور نامور خطیب تھے، اسی طرح جلیل القدر مصنف اور مقالہ نگار بھی تھے۔ ان کا قلم سیال اور تیز رفتار تھا جسے ہر علمی موضوع سے پیار تھا۔ انھوں نے بوقلموں عنوانات پر لکھا اور خوب صورت انداز میں بادلائل لکھا۔ انھوں نے کتابیں بھی تصنیف کیں اور بے شمار رسائل وجرائد میں مضامین بھی لکھے۔

ان رسائل وجرائد میں سے چند یہ ہیں: اہل حدیث (امرتسر) اخبار محمدی (دہلی) اہل حدیث (دہلی)، ترجمان (دہلی)، محدث (بنارس)، برہان (دہلی)، جریدہ ترجمان (دہلی)، ندائے ملت (دہلی)، الاسلام (دہلی)، التوعیہ (دہلی)، دعوت (دہلی)، رحیق (لاہور)، الاعتصام (لاہور) منہاج (لاہور)، مؤتمر (کراچی)، الصدیق (لاہور)، برہان (دہلی)، صدق جدید (لکھنؤ)، معارف (اعظم گڑھ)، تجلی (دیوبند)، دارالعلوم (دیوبند)، الہدیٰ (دربھنگہ)، الاسلام (سری نگر)، ماہنامہ صراط مستقیم (برمنگھم برطانیہ)، السراج (جھنڈانگر) اور دیگر بہت سے رسائل وجرائد۔

مجھے ذاتی طور پر نہایت مسرت ہوئی کہ رسائل وجرائد کی اس فہرست میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' اور سہ

روزہ ''منہاج'' بھی شامل ہیں جو میری ادارت میں شائع ہوتے تھے۔

ان رسائل و جرائد میں ان کے شائع شدہ مضامین کے صفحات کی تعداد تین ہزار سے زیادہ ہے۔

ان کی تصانیف کی تعداد ساٹھ تک پہنچتی ہے۔ ان میں سے ۳۸ مطبوعہ ہیں اور ۲۲ غیر مطبوعہ۔ ذیل کی سطور میں پہلے مطبوعہ تصانیف درج کی جاتی ہیں:

(۱) دلائل ہستی باری تعالیٰ (۲) دلائل صدقِ رسالت (۳) دلائل حشر و نشر (۴) احوال قیامت (۵) نماز کے احکام و مسائل (۶) اوقاف کا روشن اور تابناک سلسلہ (۷) رسالہ عشر و زکوٰۃ (۸) زکوٰۃ کے احکام و مسائل (۹) ماہِ رمضان کے فضائل و مسائل (۱۰) تحقیق مسنّہ (۱۱) حقوق و معاملات (۱۲) اسلام اور سائنس (۱۳) خیر و شر کا فلسفہ (۱۴) علماے سلف عطیات و وظائف (۱۵) ایمان و عمل (۱۶) احترام مسلم (۱۷) فہم قرآن اور تدبر قرآن کا شان دار ماضی (۱۸) نصرۃ الباری فی بیان صحۃ البخاری (۱۹) صیانۃ الحدیث (۲۰) تردید حاضر و ناظر (۲۱) خطبہ استقبالیہ نوگڑھ کانفرنس (۲۲) فضائل سید الانبیاء (۲۳) تذکرہ اسلاف (۲۴) عاملین حدیث کا پہلا مقدس گروہ (۲۵) ایام خلافت راشدہ (۲۶) سفر نامہ حجاز (۲۷) اقلیت اور اکثریت کے مسائل کتاب و سنت کی روشنی میں (۲۸) العلم و العلماء (۲۹) تواریخ مساجد (۳۰) نعم البدل (۳۱) علماے اسلام کی معاشی کفالت (۳۲) خطبہ استقبالیہ تلسی پور کانفرنس (۳۳) خطبہ استقبالیہ تولہوا، نیپال (۳۴) اسلام ایک عالم گیر مذہب ہے (۳۵) حرمت سود اور جوا (۳۶) علم عربی اور امراے زمانہ (۳۷) تذکرۂ نعمت (۳۸) دلائل توحید باری تعالیٰ

''تذکرہ نعمت'' ان کے والد گرامی حاجی نعمت اللہ خاں کے حالات پر مشتمل ہے۔

اب ذیل میں ان کی غیر مطبوعہ کتابوں کے نام ملاحظہ ہوں:

(۱) تاریخ مدرسہ (۲) قرآن پر پادریوں کے اعتراضات اور ان کے معقول جوابات (۳) صحابہ کرام کی ثروت و سخاوت (۴) اسلام کی حقانیت اور اس کی انقلابی طاقت (۵) اشعار و قصائد کی دینی حیثیت (۶) مومنین اور عابدین و ذاکرین کے صفات (۷) امر بالمعروف و نہی عن المنکر (۸) مقررین اور واعظین پر عتاب کا جواب (۹) خلافت فاروق اعظم (۱۰) مطالب خطاب و فوائد حمد و صلوۃ (۱۱) فہم القرآن (۱۲) لادینی تحریکات کے دور میں دینی اداروں کا قیام (۱۳) علم دین کا مقام اور مدارس اسلامیہ کی تاریخ (۱۴) تقویٰ کی خصوصیت (۱۵) ضلالت و ہدایت سے متعلق آیات کریمہ کی تشریح (۱۶) سفر حج کے آداب و شرائط اور چند مقدس آثار و شعائر (۱۷) مذہب اہل حدیث اپنے نظریات و خصوصیات کے آئینے میں (۱۸) کلمات دعا مع ثمرات (۱۹) اسلامی بیت المال (۲۰) انفاق فی سبیل اللہ (۲۱) نعماے جنت اور ان کے حق دار (۲۲) سفر

نامہ جنوبی ہند۔

مولانا عبدالرؤف رحمانی کی یہ ساٹھ کتابیں علم وتحقیق اور معلومات کے گنجینہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اپنی بعض کتابیں انھوں نے اس خاک نشین کو اس زمانے میں ارسال فرمائی تھیں جب میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' اور سہ روزہ ''منہاج'' کی ادارت کے فرائض ادا کرنے پر مامور تھا۔ میں نے وہ کتابیں بڑے شوق سے پڑھی تھیں اور مجھے ان پر تبصرہ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ وہ تبصرے ماہنامہ ''السراج'' کے خطیب الاسلام نمبر میں مندرج ہیں۔

ان کی تصانیف کی اس فہرست میں بائیس کتابیں غیر مطبوعہ ہیں یعنی مسودات کی صورت میں۔ ان کتابوں کے ناموں سے پتا چلتا ہے کہ مطبوعہ کتابوں کی طرح یہ بھی اہم کتابیں ہیں اور معلومات کا بہت بڑا ذخیرہ ان میں محفوظ ہے۔ جامعہ سراج العلوم کے ناظم مولانا شمیم احمد خاں ندوی اور ان کے رفقائے کار کو ان کی اشاعت کا اہتمام کرنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ خدانخواستہ مسودات ضائع ہو جائیں۔

مدرسے کے انہدام وتعمیر کی داستان:

گزشتہ صفحات میں مختصر الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ نیپال کے راجا کے حکم سے مولانا عبدالرؤف رحمانی کے مدرسہ جھنڈا نگر کی عمارت منہدم کر دی گئی تھی اور مولانا اس سے انتہائی پریشان ہوئے تھے۔ پھر یہ معاملہ راجا نیپال کے علم میں لایا گیا اور تین سال مقدمہ چلتا رہا۔ بالآخر فیصلہ مولانا کے حق میں ہو گیا اور منہدم شدہ عمارت دوبارہ تعمیر کی گئی۔ اس کی تفصیل مندرجہ ذیل صفحات میں خود مولانا کی زبانی ملاحظہ فرمایئے جو دردناک بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ یہ تفصیل ماہنامہ ''السراج'' (جھنڈا نگر) کے خطیب الاسلام نمبر (بابت مئی - اکتوبر ۲۰۰۰ء) سے منقول ہے۔ از صفحہ ۴۵۱ تا ۴۵۸۔ مولانا فرماتے ہیں:

۱۹۴۷ء کے بعد نیپال کے راجا کا مدرسے پر یہ عتاب نازل ہوا کہ مدرسہ جھنڈا نگر کو منہدم کر دو۔ راجا نیپال کا یہ آرڈر میرے والد صاحب (حاجی نعمت اللہ خاں مرحوم) کی زندگی میں آ چکا تھا۔ میرے والد نے لوگوں سے مشورہ کیا کہ کیا کیا جائے؟ سب لوگوں نے کہا کہ سوتے شیر کو مت جگاؤ۔ یعنی راجا نے قانون بنا دیا پھر لاگو نہیں کیا تو گویا سو گیا، لہٰذا اب اسے جگانا مناسب نہیں، حالانکہ قانون لاگو رہتا ہے۔ جب بادشاہ نے قانون لاگو کر دیا تو اسے جہاں لگنا ہے لگ کر رہے گا۔ میرے والد صاحب ان لوگوں کے مشورے کو مان گئے۔ ان کے انتقال کے بعد میرے پاس راجا کا حکم آیا کہ ۳۵ دن کے اندر اندر اس مدرسے اور مسجد کے متنازعہ حصے کو منہدم کر کے زمین بوس کر دو۔ اس حکم نامے کو دیکھ کر میں بہت پریشان ہوا۔ میں نے مدرسے کے پورب والے حصے کو بڑی شان سے بنوایا تھا۔ دو منزلہ عمارت تھی۔

گیٹ اتنا کشادہ اور شان دار تھا کہ اس گیٹ سے کسا کسایا ہاتھی بآسانی چلا آتا تھا۔ عمارت خوب لمبی چوڑی اور خوب صورت تھی۔ میں نے اپنے چچا مرحوم (جو اس وقت زندہ تھے) کو اس حکم نامے کی خبر دی اور پوچھا کہ اب ہم کیا کریں؟ انھوں نے کہا کہ اس سلسلے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تعلق دار چودھری بھوج پور کو بلاؤ۔ وہ حاجی نعمت اللہ صاحب کے ساتھی ہیں، وہ کچھ راہ بتائیں گے۔ تعلق دار صاحب بلائے گئے، ان کے علاوہ بہت سے لوگ آئے۔ رائے مشورہ سے یہ طے ہوا کہ ڈائرکٹ راجا سے ملا جائے، تب ہی یہ معاملہ رک سکتا ہے ورنہ نہیں۔ تعلق دار صاحب نے کہا کہ میرے سامنے کچھ مجبوری ہے، میں تو نہیں جا سکتا، مولانا عبدالرؤف خود جائیں۔ اس پر میں نے کہا کہ میں کچھ نہیں جانتا جاؤں تو کس کو ساتھ لے کر جاؤں۔ مختصر یہ کہ حاجی شکر اللہ صاحب کو لے کر میں کاٹھمنڈو کے لیے روانہ ہو گیا اور ادھر لوگوں نے میرے مدرسے اور مسجد کو منہدم کر دیا۔ مجھے خبر ملی تو میں رو پڑا۔ حاجی شکر اللہ صاحب بہت نیک اور سمجھ دار آدمی تھے۔ وہ مجھے تسلی دیتے رہے۔ خدا خدا کر کے ہم لوگ بیرگنج پہنچے جو ایک قصبہ ہے، وہاں سے آگے جانے کے لیے راہ دانی (یعنی اجازت نامہ) چاہیے، نیپال کی رعایا کے لیے بھی راہ دانی کا ہونا ضروری تھا۔

راہ دانی کے لیے کوئی چیز میرے پاس نہ تھی البتہ گھر سے چلتے وقت میرے چھوٹے بھائی عبداللہ خاں نے کہا تھا کہ جو اس گھر کا مالک ہے، بحر و بر کا مالک ہے۔ آپ راجا کے پاس جایے اور زمینداری کے تمام کاغذات ساتھ لیتے جایے تاکہ راجا کو معلوم ہو جائے کہ اتنا اتنا مال گزاری ہم لوگ ادا کرتے ہیں۔ چنانچہ اپنی زمینداری کے تمام کاغذات اپنے ہمراہ لے کر میں گھر سے روانہ ہوا تھا۔ بیرگنج میں افسران کو یہ کاغذات میں نے دکھائے۔ ان لوگوں نے کچھ رشوت لے کر راہ دانی ہم لوگوں کو دے دی۔ بیرگنج سے ہم لوگ بھیم پھیندی تک بذریعہ ٹرین گئے۔ بھیم پھیندی کا علاقہ پہاڑی ہے اور کاٹھمنڈو جانے کے لیے اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ پہاڑی راستہ انتہائی کٹھن اور دشوار گزار تھا۔ اس علاقے کے رہنے والے پہاڑی اس راستے پر چلنے کے عادی تھے، بغیر ان کے کسی دوسرے آدمی کا ان راستوں سے گزرنا ایک مشکل امر تھا۔

بھیم پھیندی کے پہاڑیے بدیشیوں کو تامدان میں بٹھا کر اپنے کندھے پر لادتے ہیں اور پھر ان کو لے کر پہاڑی راستوں سے گزرتے ہیں۔ وہ لوگ اتنے متعصب تھے کہ کسی مسلمان کو اپنے کندھے پر لاد کر لے نہیں جاتے تھے۔ اتفاق کی بات کہ ہم لوگ وہاں کچھ رات گئے پہنچے۔ تاریکی ہر جانب چھائی ہوئی تھی۔ اس تاریکی سے ہم لوگوں نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ دو پہاڑیوں کو کرایہ پر آمادہ کیا، ان لوگوں نے ہم دونوں کو تامدان میں بٹھایا اور کندھے پر لاد کر چل پڑے۔ رات کے آخری حصے میں روانہ ہوئے، جیسے ہی

صبح نمودار ہوئی اور روشنی پھیلی، ہم لوگوں کی داڑھیوں پر ان کی نظر پڑی، تامدان کندھے سے اتار کر ''ہو، ہو مسلمان ملچھ ڈسٹ ہو نچھا'' کہتے ہوئے اسی پہاڑ پر ہم لوگوں کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اب ہمیں پیدل چلنا پڑا، مجھے پیدل چلنے کی عادت نہیں تھی۔ بہت نازک مزاج تھا۔ اب مجبوراً چلنا پڑا، جہاں پہاڑ آتا تو ہم لوگ اس طرح اس پر چڑھتے جیسے بندر درخت پر چڑھتے ہیں یعنی ہاتھ اور پاؤں سے پتھر پکڑ کر، دو دن اور ایک رات مسلسل اس طرح پہاڑوں سے گزر کر ہم لوگ بمشکل تمام کاٹھمنڈو حکیم خواجہ سید حسن شاہ کا پتا پوچھتے ہوئے ان کے پاس پہنچے۔

خواجہ صاحب کا پتا ہمیں امام افضل شاہ نے دیا تھا جو کاٹھمنڈو میں کشمیری شاہی مسجد کے امام تھے۔ بیرگنج میں ہم لوگوں کی ملاقات امام صاحب سے ہوگئی تھی۔ وہ کسی ضرورت سے کلکتہ جارہے تھے۔ امام صاحب ہم لوگوں کا ماجرا سن کر بہت متاثر ہوئے اور خواجہ صاحب کا پتا بتا کر کہا کہ مدرسے اور مسجد کا سارا معاملہ ان کے سامنے رکھ دو گے تو وہ تمھاری راہنمائی اور مدد کریں گے۔

جب ہم نے خواجہ صاحب سے سارا ماجرا عرض کر دیا تو انھوں نے کہا کہ راجا صاحب فلاں باغ میں قیام پذیر ہیں۔ کل ان کے درشن کا دن ہے، آپ لوگ آج ہی اس باغ میں جا کر دفتر میں راجا کے درشن کا کارڈ جمع کرا دیں۔ ہوسکتا ہے کل ہی راجا سے ملاقات کا موقع مل جائے۔ ہم لوگ فوراً اس باغ کی طرف روانہ ہوگئے اور وہاں پہنچ کر دفتر میں کارڈ جمع کرا دیا۔ دفتر والوں نے ہم لوگوں کا کارڈ بھی راجا کے پاس پہنچا دیا۔

دوسرے دن صبح ہی ہم لوگ اس باغ میں پہنچ گئے۔ درشن کرنے والوں کا ہجوم تھا۔ ہم لوگوں کو وہاں گئے ہوئے بمشکل ایک گھنٹا ہوا ہوگا کہ ایک دربان پہاڑی دروازے پر کھڑا ہو کر پکار رہا تھا ''شکر، شکر، رفا، رفا، شکر، شکر، رفا، رفا''۔ حاجی شکر اللہ صاحب سمجھ گئے کہ ہم لوگ بلائے جا رہے ہیں، لیکن میں نہیں سمجھ سکا۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ جلدی چلو، ہم لوگ بلائے جا رہے ہیں۔ اس پر ان لوگوں نے کہا جو درشن کے لیے ہم سے پہلے آئے ہوئے تھے کہ تمھاری پکار کیسے ہو جائے گی، ابھی تو آئے ہو۔ ہم لوگ مہینوں سے پڑے ہیں اور درشن کا موقع نہیں مل رہا ہے۔ ان لوگوں کی باتوں کی پروا کیے بغیر ہم لوگ چل پڑے۔ جب ہم دونوں حدود کے اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ اندر بہت بڑا میدان ہے جس میں فوج اور پولیس منظم طور پر کھڑی ہے۔

میں تو خواجہ صاحب کے بتانے کے حساب سے خوب صاف ستھرا لباس اور شیروانی وغیرہ پہنے ہوئے تھا، لیکن حاجی شکر اللہ صاحب (شکرو میاں) کا کپڑا میلا کچیلا تھا۔ فوج اور پولیس کے سامنے سے گزرتے ہوئے جب ہم لوگ آگے بڑھنے لگے تو پولیس نے شکرو میاں کو روکا کہ ''میاں لائی جان نہ ہونے۔'' تب

اس دربان نے جو ہم لوگوں کو ساتھ لے کر جا رہا تھا کہا: ''یہ بھی جائے گا، اندر بلایا گیا ہے۔'' دو قلعے پار کر کے جب ہم لوگ اندر پہنچے تو دیکھا کہ بڑے بڑے امراء و رؤساء سونے کا ٹیکہ لگائے ہوئے دو رویہ کھڑے ہیں اور راجا موہن شمشیر ایک دوسرے محل میں اکیلے موجود ہیں اور محل کے برآمدے میں ایک دربان سونے کی چھڑی لیے ہوئے کھڑا ہے۔ برآمدے کے پاس ہم لوگ کھڑے کر دیے گئے۔ دربان اندر جاتا اور پھر باہر آتا، جیسے ہی دربان باہر نکلتا تمام افسران سیدھے کھڑے ہو جاتے اور جیسے ہی اندر جاتا امراء و رؤساء حضرات ایک دوسرے سے ہل مل کر باتیں کرنے لگتے۔ دربان کے دو تین چکر لگانے کے بعد ایک مرتبہ راجا اپنے محل سے برآمد ہو گیا۔ تمام افسران اور رؤساء باادب کھڑے تھے اور ہم لوگ بھی سلامی دینے کے لیے تیار تھے، جیسے ہی راجا اندر سے باہر نکلا روپیہ ان کے پاؤں کے پاس پھینک کر ہم لوگوں نے سلام کیا۔ راجا نے کہا روپیہ اٹھا لو۔ میں رونے لگا اور رو رو کر اپنے مدرسے اور مسجد کے منہدم کیے جانے کا پورا واقعہ سنا دیا اور راجا غور سے سنتا رہا۔ بہت متاثر ہوا، پوچھا ''کنا آئے چھو؟ (یعنی کس لیے آئے ہو اور کیا چاہتے ہو؟) میں نے کہا، مجھ پر بہت ظلم ڈھایا گیا ہے اور ہم لوگ فریاد لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں (یہ خیال رہے کہ راجا اردو زبان اچھی طرح سمجھتا تھا۔ ترجمان کی ضرورت نہیں تھی) یہ سن کر راجا نے فرمایا: ''سردار مان بہادر بوجھی وینو۔'' یہ کہہ کر راجا محل میں چلے گئے اور رؤساء و امراء بھی چلے گئے۔ میں نے شکرو میاں سے کہا کہ کچھ نہیں ہوا۔ راجا چلے گئے اور پبلک بھی چلی گئی۔ میں پریشان ہی تھا کہ ایک آدمی آیا اور کہنے لگا کہ ''کھوئی بنتی پتر وکھوئی بنتی پترو'' (یعنی کاغذات لاؤ، درخواست لاؤ) تو شکرو میاں نے کہا کہ ہم بنتی پتر و نہیں لائے ہیں۔ تب اس نے کہا، کہ کل تو بدا ہے (تعطیل ہے) پرسوں یعنی جمعرات کو بنتی پتر و لکھوا کر لاؤ۔

ہم لوگ وہاں سے چلے آئے اور تین دن تک ملکی اڈہ (یعنی سرکاری دفتر) میں دوڑتے رہے۔ خدا خدا کر کے درخواست لکھی گئی، اس وقت کے پہاڑیے اتنے متعصب تھے کہ ملکی اڈہ میں ہم نہیں جا سکتے تھے، اس لیے کہ ہم مسلمان تھے اور ملکی اڈہ یعنی دفتر کو مسلمان چھو لے تو وہ ناپاک ہو جاتا اور جب انھیں پانی پینا ہوتا تو مسلمان کو دور ہٹا کر پیتے۔ ملکی اڈہ (سرکاری دفتر) سے درخواست لکھوا کر ہم لوگوں نے داخل کرا دیا، وہ درخواست وہاں سے منتقل ہو کر علاقائی اڈہ میں پہنچی، علاقائی اڈہ میں ہم لوگ کئی دن تک دوڑتے رہے اور معلوم کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ راجا نے کیا حکم صادر فرمایا۔

علاقائی اڈہ کے ہیڈ سے خواجہ سید حسن شاہ کے والد معظم شاہ کے گہرے تعلقات تھے۔ خواجہ صاحب نے اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کیا تو معلوم ہوا کہ درخواست پر راجا صاحب کا یہ حکم درج ہے:

”ننج ہرو کو گھر مسجد کیلے ذیکھی ٔ بنے کو ماحال کے پر بندھ باٹا گھر بھونکاؤ ند پرنے رہے چھا،
تورنت بوجھی ٹھہرے موافق گرنا پرچھا آئین سوال بموجب گرنواو گرنا لاؤ نو“

یعنی اس شخص کا گھر اور مسجد کس تاریخ کو بنا ہے اور آج کیا بات ہوگئی؟ اور کس انتظام کے تحت گھر کو گرایا جارہا ہے، قاعدے کے مطابق جلد تحقیقات کر کے ہمارے پاس پیش کرو۔

یہ حکم نامہ معلوم کر کے ہم اور خواجہ صاحب بہت خوش ہوئے کہ راجا کے حضور میں یہ معاملہ پیش ہوگیا، خواجہ صاحب مارے خوشی کے کہنے لگے اب ان شاء اللہ کام ہوجائے گا، لاؤ کھیر کھلاؤ۔

اس زمانے میں دودھ بہت سستا تھا، بیس روپے میں نے خرچ کیے اور بہت عمدہ اور لذیذ کھیر بنی۔ سب نے کھائی اور خوش ہوئے۔

”گرنا لاؤ نو“ کا حکم ہونے کی وجہ سے اڈہ سے ہم لوگوں کو اس کی نقل ملی اور ہم لوگ (جھنڈا نگر) واپس چلے آئے، اب حکومتی پیمانے پر جانچ پڑتال شروع ہوئی اور کارروائیوں پر کارروائیاں ہوتی رہیں، حتی کہ وہ دن آیا کہ میجر میگھ راج شمشیر علاقے کے حالات جاننے کے لیے ہمارے علاقے شیو راج میں تشریف لائے۔ ان سے مل کر ہم لوگوں نے عرض کیا کہ میرے مدرسے اور مسجد کے معاملے کی جانچ بھی آپ کرلیں، انھوں نے کہا کہ میں یہ نہیں کرسکتا، جب تک سرکار سے بنتی پترو (یعنی آرڈر) نہ لے آؤ۔ اب معاملہ بہت اہم ہوگیا کہ کون یہاں (یعنی جھنڈا نگر نیپال) سے بھیر ہوا جائے اور وہاں سے راجا کو ٹیلی گرام کرے۔ حاجی شکر اللہ میاں صاحب فوراً تیار ہوگئے اور بھیر ہوا جا کر راجا کو ٹیلی گرام کیا۔ ٹیلی گرام پاتے ہی راجا نے میگھ راج شمشیر کو انکوائری کرنے کی اجازت دے دی، کیونکہ راجا کے پاس وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو کا خصوصی خط پہنچ چکا تھا کہ ”اس معاملے میں نیپال کے لوگوں کی شکایت قابل غور ہے۔“ اس خط کا بھی اثر راجا پر تھا، فوراً انکوائری کا حکم دے دیا۔

پنڈت جواہر لال نہرو کے راجا نیپال کو خط لکھنے کی وجہ یہ ہوئی کہ مدرسہ منہدم کرنے کا جب حکم راجا نیپال کی جانب سے آ گیا تو مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ناظم جمعیۃ علمائے ہند کو میں نے کئی خط لکھے۔ ان کا برابر جواب آتا رہا۔ اخیر میں انھوں نے لکھا کہ یہ معاملہ دہلی آئے بغیر حل نہیں ہوسکتا۔ اس پر مدرسے کی جانب سے ایک وفد مولانا عبدالصبور رحمانی کی معیت میں دہلی گیا اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی سے ملاقات کی۔ مولانا سیوہاروی نے مولانا ابو الکلام آزاد کو فون کیا اور وفد کے آنے کی اطلاع دی۔ مولانا آزاد نے پنڈت جواہر لال نہرو (وزیر اعظم ہند) کو فون کر کے وفد سے براہِ راست گفتگو کرنے کے لیے وقت لیا۔ وقت مقررہ پر مولانا عبدالصبور صاحب رحمانی وزیر اعظم ہند سے ملے۔ وزیر اعظم نے یقین دلایا کہ میں بہت جلد راجا نیپال

کو ایک سفارشی خط لکھ کر بھیج دوں گا۔ وفد چلا آیا اور وزیر اعظم ہند کا خط راجا کے پاس پہنچ گیا، جس کی بنا پر راجا کافی متاثر تھا اور انکوائری کی اجازت دے دی۔

جب ہم لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ میگھ راج شمشیر کو اصل واقعات معلوم کرنے کی اجازت مل گئی ہے تو ہم لوگ ان کے پاس آئے اور جھنڈا نگر آ کر واقعات سے مطلع ہونے کی سفارش کی۔ دوسرے دن ہاتھی پر سوار ہو کر وہ جھنڈا نگر آئے اور مدرسہ، مسجد اور اس کے آس پاس کی تمام زمینوں کا معائنہ کیا اور ایک نقشہ تیار کرایا۔ پھر رپورٹ میں یہ لکھا کہ ''ڈھائی تین سو مسلمانوں کی درخواست ہے کہ یہاں پر مدرسہ اور مسجد کی عمارت کے قائم رہنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اور اس جگہ آس پاس گڑھا اور کنواں ہے، اس کے پاٹ دینے میں بہت بڑا نقصان ہے۔ یہاں پر راجا کو سڑک بنوانے کی کوئی ضرورت نہیں اور مدرسے کے قائم رہنے میں کوئی حرج نہیں۔''

میجر میگھ راج شمشیر صاحب رپورٹ تیار کر کے کاغذات اپنے ساتھ لے گئے اور راجا کے سامنے پیش کر دیے۔ اس رپورٹ سے راجا نے کیا اثر لیا؟ یہ معلوم کرنے کے لیے تنہا میں کاٹھمنڈو گیا۔ تین چار روز تک راجا کے محل کا چکر لگاتا رہا، ایک دن میری نظر راجا موہن شمشیر اور میگھ راج شمشیر پر پڑی۔ محل کے برآمدے میں میگھ راج شمشیر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر راجا موہن شمشیر ٹہل رہے تھے، مجھے ڈھارس بندھی کہ اب میرا کام ضرور ہو جائے گا۔ (ان شاء اللہ)

پھر دوسرے دن میں گیا، میگھ راج شمشیر کی نظر مجھ پر پڑ گئی، راجا ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے اور میگھ راج شمشیر ان کے سامنے رکوع کی حالت میں جھکے ہوئے تھے۔ میں محل سے دور جا کر بیٹھ گیا، ایک پہاڑیا آیا اور پوچھا کہ ''تم ہی عبدالرؤف ہو؟'' میں نے کہا ہاں، اس نے مجھے اپنے ساتھ لیا اور قلعہ سے باہر دور ایک جگہ پر لا کھڑا کر دیا اور چلا گیا، پھر تھوڑی دیر بعد آیا اور مجھے راجا کے پاس لے گیا، راجا کو دیکھتے ہی زمین پر روپیہ پھینک کر میں نے سلام کیا۔

راجا نے جھنڈا نگر کی فائل منگوائی، راجا کے چھوٹے بھائی ببر شمشیر نے پوری کارروائی پڑھ کر سنائی۔ راجا نے پوچھا کہ ہندو اور مسلمان اس مدرسے اور مسجد کے مخالف تو نہیں؟ میگھ راج شمشیر نے جواب دیا کہ ہندو اور مسلمان سب اس کے موافق ہیں۔ اس پر راجا نے یہ فیصلہ صادر فرمایا:

> ''نانی میجر میگھ راج شمشیر جگا سرزمین ماگئی، ٹی پی لے آئے کو نقشہ باٹا دیکھی ہیر سدا سوگھر رہے ما کسے لائی ہانی نقصان پر دینا سوگھر بناؤ نا دینو، اگھی کھڑک نشانہ بموجب گرنا ہون دینا، تعلق اڈہ ما ظاہر گرنو مدرسہ لائی بناؤ نو۔''

یعنی پیارے میگھ راج شمشیر موقع پر پہنچے اور زمین کا معائنہ کیا اور نقشہ وغیرہ تیار کیا جسے میں نے دیکھا۔

اس مقام پر گھر بنانے میں کسی کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ اب ان کو گھر بنانے کی اجازت دی جاتی ہے اور جو پہلے ''کھڑک نشانہ'' یعنی شاہی فرمان جاری ہوا تھا اسے کالعدم کیا جارہا ہے اور مسجد و مدرسہ بنانے کی اجازت دی جارہی ہے۔ متعلق اڈہ کو خبر کر کے بنالیں۔

اس پروانے کو لے کر خوش خوش میں جھنڈا نگر پہنچا اور لوگوں کو مدرسے اور مسجد اسی مقام پر دوبارہ تعمیر کرنے کی خوش خبری سنائی۔ سب سے پہلے اس خوش خبری کا خط اپنے محترم استاذ جناب مولانا عبیداللہ صاحب رحمانی مبارک پوری کو لکھا اور اپنی پریشانی اور غریب الوطنی کا ذکر کیا۔ اس پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے استاذ محترم نے لکھا کہ ''یہ فتح دراصل تمھاری عید ہے، اللہ تعالیٰ نے تمھیں کامیاب کر دیا۔'' اس کے بعد مختلف علما کے مبارک بادی کے خطوط آنے لگے، ان میں سے چند کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

(۱) مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی (۲) مولانا مناظر احسن گیلانی (۳) مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی (۴) مولانا عبدالماجد دریا بادی۔

یہ واقعات میری زندگی کے میرے نزدیک سب سے زیادہ اہم ہیں۔ اللہ تعالیٰ میری محنت کو قبول فرمائے۔ آمین

اس مدرسے کے لیے دوبارہ جدوجہد کر کے مالی وسائل میں نے مہیا کیے اور مدرسے کی تعمیر جدید شروع کی۔ رفتہ رفتہ اس کی عالی شان عمارت دوبارہ تیار ہوگئی۔ اس مدرسے کی تعمیر مکمل کرنے کے بعد نسواں اسکول کی طرف توجہ کی۔ اس کے لیے نئے سرے سے زمین خریدی۔ پھر تعمیری سلسلہ شروع ہوا۔ اب بحمداللہ وہ بھی پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ دونوں اداروں (یعنی جامعہ سراج العلوم اور مدرسہ عائشہ صدیقہ) میں عالمیت تک کی تعلیم ہورہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں اداروں کو تابندہ و پائندہ رکھے، ہماری اس حقیر کوشش اور خدمت کو قبول فرمائے اور میرے اور میرے والدین کے لیے نجات کا ذریعہ بنائے۔ آمین

مولانا عبدالرؤف رحمانی کی یہ دلچسپ تحریر ختم ہوئی۔

''تذکرۂ نعمت'' میں درج ایک واقعہ:

مولانا عبدالرؤف رحمانی کی تصانیف میں سے ایک کتاب کا نام ''تذکرۂ نعمت'' ہے جس میں انھوں نے اپنے والد ماجد حاجی نعمت اللہ خاں کے احوالِ زندگی بیان کیے ہیں۔ ان کی بہت سی کتابوں کی طرح اس کتاب کے مطالعہ سے بھی میں محروم ہوں۔ یہ کتاب یقیناً پُر از معلومات ہوگی۔ اس میں سے بعض واقعات ماہنامہ ''السراج'' کے خطیب الاسلام نمبر میں درج کیے گئے ہیں۔ ایک واقعہ ان کے دورِ طالب علمی کا ہے جب وہ جامعہ رحمانیہ بنارس میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ یہ واقعہ ذیل میں درج کیا جارہا ہے۔

"یہ سب کو معلوم ہے کہ طالب علم یا مسافر کو دور طالب علمی یا دورانِ سفر گھر کی طرح آرام وسکون اور کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ اس کے پیش نظر ہمارے والد صاحب مرحوم نے میرے بنارس کے دورِ طالب علمی میں میرے واسطے الگ سے کھانے کا انتظام فرمایا اور اس کے لیے طریقہ یہ تھا کہ گھر سے اشیاے خور ونوش، چاول، دال، تیل، مصالحہ، گھی وغیرہ بھیجے جاتے تھے، جسے ہم اپنے رفقاء حکیم فضل الرحمٰن صاحب، حکیم محمد یونس صاحب بجوا، دودھنیاں کے مولوی مجیب اللہ نیز مہادیو کے مولوی عبدالحیٔ وغیرہ کے ساتھ مشترکہ طور سے ایک باورچی سے پکوایا کرتے تھے، لیکن یہ اکٹھا پکایا ہوا کھانا مزے دار نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اس کے متعلق والد صاحب کو خط لکھا تو انھوں نے ہمارے لیے حاجی شکرو میاں کے مشورے سے ایک باورچی رحمت اللہ کو جھنڈا نگر سے ہمارے پاس بنارس بھیج دیا۔ لیکن وہ ذمہ داری سے کام نہیں کرتا تھا۔ میں نے اس کی شکایت والد صاحب کے پاس لکھ بھیجی کہ رحمت اللہ ٹھیک سے کام نہیں کرتا ہے، چاول وغیرہ صاف کرنے پر قطعی دھیان نہیں دیتا، حتی کہ چاول میں کنکر پتھر کے علاوہ کبھی کبھی چوہیا کی رینڑی (مینگنی) بھی نکل آتی ہے۔ اس خط کے جواب میں والد صاحب نے مجھ کو جو خط لکھا وہ بہت نصیحت آموز ہے۔ انھوں نے لکھا کہ میں نے تمھارے آرام وراحت کے پیش نظر عام طلبا کے ساتھ کھانے کا بندوبست کرنے کے بجائے گھر سے راشن بھیج کر پکوانے کا انتظام کیا۔ پھر تمھاری شکایت پر یہاں کے خاص باورچی رحمت اللہ کو تمھارے پاس بھیجا۔ اس پر بھی تمھیں اطمینان نہیں ہے اور تمھاری شکایتوں کا سلسلہ جاری ہے تو ایسی صورت میں بس یہی رہ جاتا ہے کہ ہم دونوں میاں بیوی خود تمھارے پاس بنارس چلے آئیں اور تم کو پکا پکا کر کھلایا کریں۔ اس خط کو دیکھ کر میں بہت شرمندہ ہوا اور پھر کبھی اس طرح کی کوئی شکایت نہیں لکھی۔"

بیماری اور وفات:

مولانا ابرار احمد مدنی کے بقول عمر کے آخری دور میں مولانا عبدالرؤف رحمانی کئی بیماریوں کی زد میں آ گئے تھے۔ خون کی کمی ہوگئی تھی، گردوں نے کام کرنا بند کر دیا تھا، پھر گھٹیا کا عارضہ بھی لاحق ہوگیا تھا، جس کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ بہت علاج کرائے لیکن افاقہ نہ ہوا۔ وفات سے چند روز پیشتر جب بیماری نے شدت اختیار کر لی تو لکھنؤ کے سنجے اسپتال میں داخل کرائے گئے۔ چند روز علاج ہوا لیکن ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تو واپس جھنڈا نگر مدرسے میں لے آئے۔ وہاں کثیر تعداد میں ان کے معتقدین آتے اور ان سے ملتے۔ جو آتا بے چینی میں اس کا ہاتھ پکڑ کر رونے لگتے، یہ منظر دیکھ کر وہاں موجود سب کی

آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ بالآخر (۹۰ برس کی عمر پا کر) ۳۰۔نومبر ۱۹۹۹ء کو بعد از نماز مغرب چھ بج کر بیس منٹ پر جامعہ سراج العلوم السلفیہ (جھنڈا نگر) میں وفات پا گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

یہ الم ناک خبر پورے علاقے میں پھیل گئی۔ دوسرے دن یکم دسمبر ۱۹۹۹ء کو بعد نماز عصر جامعہ سراج العلوم میں ان کی وصیت کے مطابق جامعہ کے مفتی اور استاذِ محترم مولانا عبدالحنان فیضی نے نمازِ جنازہ پڑھائی، جس میں ہزاروں لوگوں نے شرکت کی۔

اللھم اغفرلہ و ارحمہ و اکرم نزلہ و وسع مدخلہ.

انٹرویو:

مولانا عبدالرؤف خاں رحمانی جھنڈا نگری سے متعلق اگرچہ ضروری معلومات ماہنامہ ''السراج'' کے خطیب الاسلام نمبر (بابت اکتوبر ۲۰۰۰ء) کی وساطت سے خوانندگانِ محترم کے مطالعہ میں آ چکی ہیں تاہم جی چاہتا ہے کہ یہاں مولانا مرحوم کا ایک انٹرویو بھی درج کر دیا جائے جو ان کی کویت تشریف روی کے موقع پر ہمارے عالم فاضل دوست ڈاکٹر حافظ محمد اسحاق زاہد (رکن لجنۃ القارہ الہندیہ جمعیت احیاء التراث الاسلامی کویت) نے ان سے لیا۔ یہ معلوم نہیں کہ انٹرویو ان کی وفات سے کتنا عرصہ قبل کا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان سے ۱۷ سوال کیے، جن کے انھوں نے صاف لہجے میں بے تکلفی سے جواب دیے۔ انٹرویو میں سوال درج نہیں ہیں، البتہ جواب سے ہر سوال کا پتا چل جاتا ہے۔ یہ انٹرویو ہمیں مولانا مرحوم کے بارے میں بہت سی معلومات سے آگاہ کرتا ہے۔ ملاحظہ فرمایے۔

جواب ۱: ...... میرا نام عبدالرؤف خاں رحمانی ہے۔ میرے والد کا نام نعمت اللہ خاں، میرے دادا کا نام سردار خان، میرے پردادا کا نام بختیار خان، میرے نکڑ دادا کا نام موتی خان ہے۔ اسی طرح آگے نام ہیں۔ ہم لوگ چودہ پشتوں سے مسلمان ہیں۔

جواب ۲: ...... میرے آباء واجداد میں کسی کے عالم و فاضل ہونے کا سراغ نہیں لگتا، لیکن میرے والد بہت ہی دین دار اور خدا پرست شخص تھے، وہ فارسی زبان سے واقف تھے۔ اپنی اتباع سنت اور دین پسندی کے سبب انھوں نے ایک مدرسہ سراج العلوم کے نام سے جھنڈا نگر میں قائم کیا اور اپنا ایک گاؤں سونپور وقف کیا کہ اس کی آمدنی اور غلہ وغیرہ سے طلباء کی تعلیم و تربیت ہو سکے۔ تہجد کی نماز پڑھنے والے تھے۔ سخت جاڑے کی راتوں میں ٹھنڈے پانی سے وضو کرتے اور مسجد میں جا کر نماز تہجد ادا کرتے تھے۔ نیپال کے سفر میں پہاڑوں کے اندر بھی نماز تہجد قضاء نہیں کی، اپنے ایک لڑکے عبداللہ خاں کو جو عشاء کی نماز میں جماعت سے حاضر نہ تھے والد صاحب نے محسوس کیا کہ گھر میں سو رہا ہے تو پاؤں پکڑ کر چارپائی سے گھسیٹتے ہوئے تین

دروازوں سے باہر لائے اور صحن میں پٹک دیا اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو نماز جماعت سے نہ پڑھیں تو میرا جی چاہتا ہے کہ لوگوں سے کہوں کہ وہ لکڑیاں جمع کریں اور اس میں آگ لگا دوں اور بے نمازی اس میں جل جائیں اور گھر بھسم ہو جائے۔ اتباع سنت کا یہ جذبہ تھا کہ کوئی مسلمان داڑھی کٹائے ان کے سامنے سے نہیں گزر سکتا تھا، اور سخاوت بھی ان کی طبیعت میں بہت زیادہ تھی۔ کئی مسجدیں اپنے وطن دتلو پور، جھنڈانگر، کدربٹوا میں بنوائیں اور بڑے بڑے دینی جلسے کرائے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے دو مرتبہ حج کیا۔ نیپال میں اپنے علاقے کے اچھے زمیندار تھے اور اپنی زندگی علماء کی صحبت میں گزارتے تھے۔

جواب ۳: ...... میری پیدائش تقریباً ۱۹۰۵ء کی ہے اور جس جگہ پیدا ہوا اس جگہ کا نام قدرت نگر (کدربٹوا) ہے جو نیپال کا ایک دور افتادہ گاؤں ہے۔ وہاں تعلیم و تہذیب اسلامی کی بہت کمی ہے۔ [1]

جواب ۴: ...... میری پیدائش کے بعد کسی حادثے یا کسی لطیفے کا مجھے علم نہیں ہے۔

جواب ۵: ...... میرے پڑھنے کی ابتدا سات برس کی عمر میں ہوئی۔ قدرت نگر میں مالک علی صاحب مجھے اور میرے دو چچا زاد بھائیوں (عبدالجبار اور عبدالغفار) کو پڑھاتے تھے۔ شیخ مالک علی صاحب ہم لوگوں کو بہت مارا پیٹا کرتے تھے، اس لیے میں گھر کے کسی گوشے میں چھپ جاتا تھا، شیخ مالک علی میرے والد سے کہتے کہ عبدالرؤف پڑھنے نہیں آیا ہے، والد صاحب گھر کے چھپے ہوئے گوشے میں مجھے تلاش کر لیتے اور پکڑ کر ساتھ لے جاتے۔ شیخ مالک علی مسجد میں پہنچ جانے پر بہت مارتے، ایک مرتبہ شیخ مالک علی صاحب کہیں باہر گئے ہوئے تھے تو ہم تینوں بھائیوں نے سوچا کہ مالک علی صاحب کی مار پیٹ سے ہم لوگ کیسے بچ سکتے ہیں۔ گاؤں کے دوسرے لڑکوں نے مشورہ دیا کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ میاں مالک علی مر جائیں تو نجات ملے گی۔ ہم سب میں بھائی عبدالغفار جو بہت ذہین تھے، انھوں نے کہا کہ شیخ مالک علی کے مر جانے سے کیا ہوگا، ایک میاں مر جائیں گے، ابا دوسرے میاں لے آئیں گے۔ ظلم کا سلسلہ جاری رہے گا۔ یہ دعا کرو کہ ابا مر جائیں۔ اس پر سب لوگ ہنس پڑے کہ ابا کے مرنے کی کون دعا کر سکتا ہے۔ اس کے بعد جب ہم لوگ نو برس کے ہوئے تو ہم تینوں قدرت نگر سے جھنڈانگر لائے گئے جو نیپال کا سرحدی علاقہ ہے۔ یہاں ہماری ابتدائی فارسی اور عربی تعلیم شروع ہوئی، بسکوہر کے مولانا خلیل صاحب مدرس کے طور پر مقرر تھے۔ میرے والد حاجی نعمت اللہ خاں صاحب مدرسے کے ناظم تھے۔ وہ اکثر قدرت نگر کی زمین کے مسئلے میں مقدمات وغیرہ کے سبب کا ٹھمنڈو رہا کرتے تھے۔ یہ مولانا خلیل مجھے بہت مارا کرتے تھے اور میرے غبی ہونے کے سبب کان پکڑ کر لٹا دیتے تھے اور میری پیٹھ پر دس بارہ اینٹ لاد دیتے تھے اور اس پر چھڑی سے مارتے تھے کہ ہلنے نہ پائے،

[1] یہ بہت پہلے کی بات ہے، اب یہ گاؤں نیپال کے تعلیم یافتہ اور مہذب مواضعات میں شمار کیا جاتا ہے۔

میرے کان کو اس قدر کھینچتے تھے کہ میرے کان پھٹ گئے تھے اور شیشم کی چھڑیوں سے پڑھتے وقت مارا کرتے تھے، بہر حال یہاں بارہ برس کی عمر تک پڑھا۔ اس کے بعد مدرسہ رحمانیہ مدن پورہ بنارس چلا گیا۔ وہاں مولانا حبیب اللہ، مولانا فصیح الدین، قاری احمد سعید اور بڑے مولانا محمد منیر خان صاحبان پڑھاتے تھے۔ یہاں مارنا پیٹنا بند تھا، ہم نے یہیں ہدایۃ النحو، کافیہ، قدوری اور منطق پڑھی۔ اسی اثنا میں میری والدہ کی سخت علالت کی خبر ملی، مولانا محمد منیر خاں صاحب نے کہا "لکل شی آفة وللعلم آفات" بہر حال انھوں نے مجھے اجازت دے دی۔ میں اپنی والدہ کی خدمت کے لیے جھنڈا نگر واپس آ گیا۔ والدہ کے لیے بہت دعائیں کی، مسجد کی چھت پر اللہ تعالیٰ سے گریہ وزاری کے ساتھ دعا کرتا رہا، لیکن مشیت خداوندی کے تحت ان کی زندگی بچ نہ سکی اور وہ وفات پا گئیں۔ اللہ تعالیٰ والدین کی قبروں کو منور رکھے اور ان کا ٹھکانا جنت میں رکھے۔ اس کے بعد جھنڈا نگر مولانا عبدالغفور بسکوہری رحمہ اللہ اور مولانا عبدالرحمٰن بجوادی سے فلسفہ، منطق، ترمذی، ابو داود، جلالین شریف، مقامات حریری، شرح الوقایہ، نور الانوار، متنبی وغیرہ پڑھنے لگا، یہاں سے فارغ ہو کر میں بیس برس کی عمر میں دارالحدیث رحمانیہ دہلی گیا۔ میرا داخلہ امتحان مولانا عبدالرحمٰن بہاری نحوی نے لیا۔ آپ میرے معقول جواب سن کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا کس جماعت میں داخلہ لو گے؟ میں نے کہا ساتویں میں تو انھوں نے کہا چاہے ساتویں میں پڑھو یا آٹھویں میں پڑھو تمھارے لیے سب برابر ہے۔

جواب ٦: ......طلب علم کا آغاز قاعدہ بغدادی سے ہوا اور انتہا صحیح بخاری اور تفسیر بیضاوی پر۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم ہمیں مولانا احمد اللہ صاحب پرتاب گڑھی پڑھاتے تھے، موصوف شیخ الکل فی الکل علامہ سیّد نذیر حسین محدث دہلوی کے شاگرد تھے، انھوں نے اپنے بہت سے شاگردوں کو علم حدیث کا درس دیا ہے۔

جواب ۷: ......علم منطق وفلسفہ کے اہم اساتذہ مولانا سکندر علی ہزاروی اور مولانا عبدالسلام درانی تھے۔ یہ علم فلسفہ و منطق کے بڑے ماہر اور امام تھے۔ مولانا سکندر علی ہزاروی نے ایک واقعہ سنایا کہ تمھارے امرتسر کے مولانا ثناء اللہ صاحب میرے استاذ معین الدین منطقی کے پاس اجمیر گئے، بات چیت کے دوران انھوں نے سوال کیا کہ آپ اجمیر کیسے تشریف لائے، تو مولانا ثناء اللہ صاحب نے فرمایا سنتا رہا ہوں کہ اجمیر میں شرکیہ مراسم ادا کیے جاتے ہیں اور کفر و شرک کا بازار گرم رہتا ہے تو مالانا معین الدین منطقی نے کہا یہاں شرک کہاں ہوتا ہے یہاں تو صرف یا خواجہ یا غریب نواز کی صدا سنائی دیتی ہے۔ اللہ کو شریک ہی نہیں کیا جاتا۔ کوئی نہیں کہتا یا اللہ یا خواجہ تو شرک یہاں کہا؟ یہ دراصل ایک منطقی لطیفہ تھا، لیکن حقیقت میں اجمیر شرکیہ مراسم سے بھرا ہوا تھا۔ مولانا عبدالسلام درانی جو علم فلسفہ و علم کلام کے امام تھے، وہ مجھے کتاب کو سمجھ کر پڑھنے کی تاکید کیا کرتے تھے، کبھی کبھی کسی مسئلے کے سمجھنے میں دشواری ہوتی تو پھر سمجھنا پڑتا تو کہتے کہ تیرے دماغ میں گوبر بھرا

ہوا ہے، لیکن میں بغیر سمجھے آگے نہیں بڑھتا تھا اور میرے رفقاء مولوی محمد اسلم پنجابی وغیرہ اکثر کہتے کیا یہ مسئلہ سمجھ میں نہیں آیا؟ میں کہتا میری سمجھ میں نہیں آیا، الحمدللہ میں سمجھ کر پڑھتا تھا۔ ایک دن اورینٹل کالج لاہور کے پروفیسر سیّد طلحہ دارالحدیث رحمانیہ دہلی میں آئے۔ ہمارے استاذ اور ہم سب نے ان کی تکریم کی اور ان کا استقبال کیا۔ پروفیسر سیّد طلحہ نے شیخ بوعلی سینا کی کتاب ''اشارات'' پر حاشیہ لکھا ہے۔ انھوں نے میرے استاذ سے فرمایا کہ اپنی کتاب پڑھاپے میں سننا چاہتا ہوں۔ مولانا عبدالسلام نے درس دیا اور درس جب ختم ہوا تو سیّد صاحب نے طریقہ درس کی تعریف کی اور کہا یہ کیسے معلوم ہوا کہ ان طلباء نے سمجھا؟ استاذ محترم نے ایک بنگالی طالب علم عبدالواحد سے کہا کہ تم سمجھا دو۔ اس نے کہا میرے سر میں درد ہو رہا تھا، میں نے غور نہیں کیا۔ پھر مولوی محمد اشفاق سے کہا کہ تم سمجھاؤ۔ انھوں نے کہا کہ مجھے نزلہ و زکام ہے۔ اسی طرح اور ساتھیوں سے کہا۔ سب لوگوں نے عذر کیا تو میں نے سوچا یہ تو استاذ کی بدنامی کی بات ہوگی کہ کوئی شاگرد نہ سمجھ سکا، تو میں نے اپنے استاذ سے کہا کہ مولانا میں عرض کروں؟ مولانا نے بڑی خوشی سے اجازت دی۔ میں نے بتلایا کہ ماتن کے متن کا یہ مطلب ہے، شارح کی شرح کے یہ معنی ہیں اور میر زاہد کے کہنے کا یہ مطلب ہے۔ جب تینوں کے معنی و مطلب سمجھا دیے تو پروفیسر صاحب بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ اول وہلہ میں اس طرح سبق محفوظ ہوگیا تو تکرار کے بعد اور کتنا بہتر ہو جائے گا۔

میں نے صحیح بخاری پڑھانے والے شیخ احمد اللہ صاحب سے ایک دفعہ یہ اعتراض کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سب کو اجازت کیوں نہیں دی کہ چار بیویوں سے زائد سے نکاح کر سکیں چاہے عمر و شباب کا کتنا ہی تقاضہ کیوں نہ ہو جب کہ قرآن کریم نے رسول پاک ﷺ کو گیارہ بیویاں رکھنے کی اجازت دی ہے، اس طرح کیا قرآن خود رسول اللہ ﷺ کا بنایا ہوا نہیں ہے جو چاہا اپنے لیے تجویز کر لیا اور مسلمانوں کو اس سے محروم کر دیا؟ یہ سنتے ہی مولانا کی دینی حمیت جوش میں آئی اور انھوں نے غضب ناک ہو کر ایک تھپڑ رسید کیا اور فرمایا کہ تو رسول اللہ ﷺ پر تنقید کرتا ہے؟ میں تیرے باپ کو لکھ دوں گا کہ تو مرتد ہو گیا ہے، تجھ کو وراثت سے محروم کر دیا جائے۔ اس کے بعد مجھے اپنی اس حرکت پر ندامت ہوئی، اسی سال دارالحدیث رحمانیہ دہلی سے فارغ ہوا اور (جھنڈا نگر) آ گیا۔ یہاں ''پیغام محمدی'' کا اشتہار پڑھا، اس کو فوراً بذریعہ ڈاک مونگیر سے پارسل منگوا کر پڑھا۔ اس میں ثابت کیا گیا تھا کہ تمام انبیائے کرام نے متعدد شادیاں کی ہیں اور رسول اکرم ﷺ نے مختلف دینی مصلحتوں کے تحت جو شادیاں کی تھیں وہ عقلاً و نقلاً درست ہیں۔ میں اس کتاب کو پڑھ کر بہت رویا اور میرا دل رسول کریم ﷺ کی محبت و الفت سے بھر گیا۔ پیغام محمدی بڑی قابل قدر کتاب ہے۔ اس کا علما کو مطالعہ میں رکھنا چاہیے۔

جواب ۸:......طلب علم میں میں نے سخت محنت ومشقت کی جیسا کہ علامہ اقبال نے لکھا ہے:

بے محنت پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شرر تیشہ سے ہے خانہ فرہاد
خون رگ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر
میخانۂ حافظ ہو کہ بت خانۂ بہزاد

یعنی بغیر محنت ومشقت کے کسی انسان کا جوہر اور قابلیت ظاہر نہیں ہوتی اور اس کے علم میں گہرائی وگیرائی پیدا نہیں ہوتی، اس لیے میں راتوں رات جاگا کرتا تھا۔ بارہ ایک بجے تک مطالعہ کتب کرتا رہتا تھا، اسی زمانے میں اخبار محمدی دہلی، اخبار اہلحدیث امرتسر، اخبار توحید امرتسر، اخبار اہلحدیث دہلی، اس دور سے بعد کا رسالہ الرحیق لاہور، اخبار الاعتصام لاہور اور اخبار منہاج لاہور اور متعدد اخباروں کے لیے مضامین لکھتا تھا جو ان رسالوں میں شائع ہوئے تھے۔

جواب ۹:......میرے بڑے بڑے مشائخ جس سے میں نے درس حدیث لیا اور علم کلام ومنطق پڑھا وہ حسب ذیل ہیں:

شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ مبارک پوری سے موطا امام مالک، مولانا نذیر احمد دہلوی رحمہ اللہ سے میر زاہد، مولانا سکندر علی ہزاروی سے تفسیر بیضاوی اور شیخ المشائخ مولانا احمد اللہ پرتاب گڑھی سے صحیحین کا درس لیا۔ اللہ تعالیٰ اساتذہ کی قبروں کو نور سے بھر دے اور سب کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

جواب ۱۰:......طالب علمی کے زمانے میں اور سن شباب میں کسی خاص حادثے کا مجھے علم نہیں ہے، البتہ علم کے حصول کے سلسلے میں جب دہلی اسٹیشن پر اترا اور ایک قلی کے ہمراہ چلا تو ایک جنٹل مین میرے پاس آیا اور کہا کہ تم کو صاحب بلاتا ہے۔ میں نے سوچا کہ میں نے کیا قصور کیا ہے کہ صاحب بلاتا ہے۔ یہ انگریزوں کا دور تھا۔ صاحب نے نام پر وحشت ہوتی تھی۔ قلی نے کہا صاحب کے پیٹ ہے، اس کو کچھ دے دو۔ تو یہ رخصت ہو جائے گا، میں نے اس کو ایک دو روپیہ دیا اور وہ رخصت ہو گیا۔ اسی طالب علمی کے دور میں جب دارالحدیث رحمانیہ دہلی ہی میں پڑھ رہا تا تو گھنٹا گھر کے قریب ایک بھاری مجمع لگا ہوا تھا۔ وہاں مفتی کفایت اللہ صاحب تقریر کر رہے تھے، ان کے شاگردوں اور عوام کی بھیڑ تھی، میں بھی اس مجمع کے پاس آیا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ انگریزی پولیس کی دو تین بسیں کھڑی ہیں، ان میں سپاہی اور افسران بھرے ہوئے ہیں۔ ان کے افسران مولانا کو تقریر سے منع کرنے لگے۔ وہ سیاسی تقریر انگریزوں کو پسند نہ آئی تو ایک بڑے افسر نے مولانا کو منع کرنے کی بجائے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، ہاتھ رکھتے ہی ان کے فدائی

شاگرد اس پر ٹوٹ پڑے اور اس کے ہاتھ کو منہ سے ہٹا دیا اور اس کو دھکیل دیا۔ اس پر پولیس نے مجمع پر آنسو گیس چھوڑ کر مجمع کو منتشر کیا اور ان کے شاگردوں کو پولیس کے لوگ مارنے لگے۔ یہ حادثہ بڑا شدید تھا۔ انگریزی پولیس نے کیا کارروائی کی۔ مزید اطلاع نہ ملی، اللہ تعالیٰ ان فدائی طالب علموں کو جزائے خیر عطا کرے۔

اسی طالب علمی کے دوران ڈاکٹر محمد اقبال صاحب مشہور اسلامی شاعر اندلس سے واپس آئے، اخبار میں اشتہار نکلا کہ جامعہ ملیہ میں ان کی آج تقریر ہے تو میں رات کے نو بجے دارالحدیث رحمانیہ سے نکلا اور یہ طے کر کے نکلا کہ اگر ناظم صاحب ہم کو نکال بھی دیں تو بھی ہم ڈاکٹر اقبال صاحب کی تقریر ضرور سننے جائیں گے، چنانچہ جامعہ ملیہ پہنچے۔ وہاں پر ایک لائٹ تھی۔ ڈاکٹر صاحب اسٹیج پر آ چکے تھے لوگ فرط عقیدت سے ان پر گل پوشی کر رہے تھے۔ انھوں نے پکار کر کہا کہ شیخ الجامعہ طلباء کو گل پوشی سے روکو دیجیے۔ میں پھولوں سے سینے تک ڈھک چکا ہوں۔ اس وقت طلباء نے گل پوشی بند کی، آپ نے اندلس کے مشاہدات پر تقریر کی اور مسدس حالی کے یہ اشعار پڑھے۔ ؎

کوئی قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے
مساجد کے دیوار و در جا کے دیکھے
حجازی امیروں کے گھر جا کے دیکھے
وہ اجڑا ہوا کرو فر جا کے دیکھے
نصیب ان کا اشبیلیہ میں ہے سوتا
شب و روز ہے قرطبہ ان کو روتا

ان اشعار کو پڑھتے ہوئے ڈاکٹر اقبال صاحب ایک مصرعہ بھول گئے۔ میں نے کرسی سے اٹھ کر دوسرے مصرعے کا لقمہ دیا، پتہ نہیں انھوں نے سنا کہ نہیں، تقریر ختم کرنے کے بعد میں ان کے قریب گیا، وہ تخت پر بیٹھے ہوئے تھے اور مولانا شفیع داؤدی ان کو جوتا پہنا رہے تھے جب کہ ڈاکٹر اقبال کہتے رہے کہ مولانا مجھے گنہگار مت کیجیے اور مولانا جوتے کا تسمہ باندھتے رہے، اتنا قریب ہونے کے باوجود میں ان سے ملاقات کی ہمت نہ کر سکا۔ یہ واقعہ سن شباب میں پیش آیا۔

جواب ۱۱: ...... میرے اقران و زملاء جو طالب علمی کے زمانے میں میرے ساتھ تھے، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں: (۱) مولانا عبدالجلیل رحمانی جنھوں نے مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کی نظامت کی تھی اپنے یہاں ششہنیاں میں ایک عالی شان مدرسہ دارالعلوم کے نام سے کھولا تھا اور ایک کتاب ''شہداء احد''

تصنیف کی اور بڑے بڑے جلسوں کے وہ صدر ہوتے تھے اور خطابت میں کافی شہرہ رکھتے تھے، وہ میرے شاگرد بھی تھے۔ شرح عقائد میں نے ان کو پڑھائی تھی۔ وہ جماعت خامسہ کے طالب علم تھے۔ (۲) عبدالمبین منظر، آپ میرے شاگرد تھے۔ بہت اچھے خطیب اور بہت بڑے مناظر تھے، آریوں، عیسائیوں اور بریلوی حضرات کے مناظرات میں شریک ہوتے اور فتح یاب ہوتے تھے۔ متعدد دینی کتابوں کے مصنف اور مدرسہ شمس العلوم سمرا کے ناظم اعلیٰ تھے۔ (۳) مولانا یونس محمد (۴) مولانا امر اللہ عارف سراجی۔ یہ بھی تقریر و تحریر میں شوق و ذوق رکھتے تھے۔ عارف سراجی نے چند کتابیں بھی تالیف کی ہیں، (۵) مولانا محمد اقبال صاحب رحمانی، مدرسہ سراج العلوم بونڈھیار کے ناظم اعلیٰ تھے۔ وہ بہت ذہین، سنجیدہ اور شریف الطبع تھے۔ انھوں نے مجھ سے کتاب شرح عقائد نفسی پڑھی تھی۔ وہ میرا بڑا احترام کرتے تھے اور شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ صاحب مبارک پوری کے بڑے عقیدت مند تھے۔

جواب ۱۲: ...... میری تعلیم و تدریس کا زمانہ دارالحدیث رحمانیہ دہلی سے شروع ہوا۔ میں وہاں سے ۲۲ برس کی عمر میں فارغ ہوا اور معاً بعد ۲۳ برس کی عمر میں اسی میں مدرس مقرر ہو گیا، اس وقت میری تنخواہ تیس روپیہ ماہوار تھی، اس زمانے میں بڑے بڑے علماء کی بھی تنخواہ سو روپے سے زائد نہ تھی، میں نے اس زمانے میں ۵ گھنٹیاں جماعت خامسہ تک لی تھیں۔ شرح عقائد نفسی پڑھا رہا تھا، دارالحدیث رحمانیہ کے مہتمم کو خیال پیدا ہوا کہ عبدالرؤف رحمانی نئے نئے مدرس ہوئے ہیں، جماعت خامسہ کے طلبا کو شرح عقائد اچھی طرح سمجھا پا رہے ہیں یا نہیں؟ تو شیخ عطاء الرحمٰن نے بنگالی طلباء سے پوچھا، پھر پنجابی طلباء سے حال معلوم کیا۔ پھر بستی گونڈہ اور الٰہ آباد کے طلباء سے معلوم کیا تو سب نے باتفاق کہا کہ شرح عقائد ہمیں بہت اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے، مولوی عبدالجلیل رحمانی صاحب سے پوچھا تو انھوں نے بتلایا کہ شرح عقائد اس طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ اگر چاہوں تو اسی وقت دوسرے کو درس دے دوں۔ میری تدریس کا یہ قاعدہ تھا کہ شرح عقائد کا مطالعہ کرتا اور سات دن تک آگے آنے والے اسباق پر نظر ڈال لیتا اور شرح عقائد کی شرح خیالی کو پڑھتا۔ پھر ملا افغانی کی شرح رمضان آفندی پڑھتا۔ اس طرح بسط و تفصیل سے میں سبق پڑھاتا تاکہ سارے طلباء مطمئن ہو کر اٹھیں، اس کے بعد مدن پورہ بنارس کی جامعہ رحمانیہ آ گیا۔ وہاں میں ملاحسن، شرح تہذیب اور متنبی وغیرہ پڑھاتا تھا۔ مدن پورہ کے رؤسائے کرام کے لڑکے مولانا محمد یحییٰ، مولانا محمد الیاس، مولانا محمد موسیٰ، مولانا عبیدالرحمٰن اور مولانا عبدالعظیم میرے لائق شاگرد ہیں۔ ان میں سے دو تین وفات پا چکے ہیں۔ بقیہ ابھی زندہ ہیں اور میری قدر شناس ہیں۔ میرے خاص شاگردوں میں مولانا عبدالحنان صاحب فیضی ہیں جنھیں میں نے جھنڈانگر میں تعلیم دی۔ ایک عرصہ سے وہ جامعہ میں بخاری اور تفسیر بیضاوی اور دیگر کتب احادیث کا درس

دیتے اور افتاء کا کام بھی کرتے ہیں۔

دعوت و تبلیغ کا کام میں عنفوان شباب سے لے کر اب تک برابر کرتا رہا۔ میرے تبلیغی مواعظ اور خطبات تذکیر و تبلیغ کی الحمداللہ ہندوستان کے بنگال و کشمیر، یوپی وغیرہ میں کافی شہرت ہے۔ میں نے نیپال کے اکثر جلسوں میں شرکت کی اور بعض جگہ صدارت بھی کی ہے، دہلی میں جب آل انڈیا اہل حدیث کانفرس کا آخری اجلاس تھا تو اس میں میں نے علم کی ترغیب و تحصیل پر ایک جامع و مانع تقریر کی تھی اور ایک مقالہ لکھ کر سنایا تھا۔ اس کو سننے کے بعد ہندوستان کے مشہور محدث مولانا شرف الدین دہلوی نے مجھے اپنے پاس بلایا اور پوچھا یہ مقالہ کس کا ہے؟ میں نے کہا میں نے ہی اسے مرتب کیا ہے۔ اس پر میری بڑی تحسین فرمائی اور مولانا اسلم جیراجپوری، استاذ تفسیر خواجہ مولانا عبدالحی فاروقی جامعہ ملیہ دہلی والوں نے بہت شاباشی دی۔

اسی طرح جب میں نے دارالعلوم ششہنیاں میں عشر کے بارے میں کتاب و سنت سے دلیلیں پیش کیں تو اس خطبے سے مولانا عبیداللہ صاحب مبارک پوری بہت محفوظ ہوئے، پھر میں نے دوسری تقریر میں کہا کہ مسلم اقلیت پر اکثریت آج کل ظلم و زیادتی کر رہی ہے۔ جب کبھی ہم ہندوستان پر حاکم تھے تو ہماری حکومت نے ہندو اکثر کے ساتھ احسان و سلوک کیا، ان کے مندروں کی مدد کی اور اشنان گھاٹوں اور پوجا پاٹ کے گھروں کو محفوظ رکھا اور ان میں چراغ و بتی جلانے کے لیے پنڈتوں اور مہنتوں کو بڑی بڑی جاگیریں دیں۔ یہ تمام حقائق صدر جمہوریہ ہند راجندر پرشاد کی کتاب انڈیا ٹوڈے کے حوالے سے میں نے پیش کیے، اورنگ زیب عالم گیر رحمہ اللہ پر لگائے گئے الزامات تعصب اور ظلم و زیادتی کی پوری طرح سے تردید کی اور بتلایا کہ ہم نے غیر مسلم اقلیتوں کو بغداد میں نوازا، ترکی میں نوازا اور ہندوستان کے گوشے گوشے میں ان کی عزت و عظمت اور ہر طرح کی مذہبی آزادی دی، لیکن جب ہندو اکثریت ہم پر غالب آئی تو اس نے مسلمانوں پر طرح طرح کے مظالم کیے، ان کو ٹرینوں میں قتل کیا گیا، ان کے گھروں کو جلایا گیا اور ان کے کاروبار کو ختم کیا گیا۔ اس تقریر میں میں نے یہ شعر پڑھا تھا۔ ؏

ہم نے جب ہوش سنبھالا تو سنبھالا تم کو
تم نے جب ہوش سنبھالا تو سنبھلنے نہ دیا

اس پر مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوری نے مجھے خطیب الہند کا لقب دیا جسے خطاب اور لقب کے طور پر لوگ میرے لیے لکھنے لگے۔ یہ تقریر ضلع گونڈہ (حال بلرام پور) کے موضع طیب پور میں کی تھی۔

ایک مرتبہ میں نے مبارک پور میں سود، جوا اور لاٹری کی حرمت اور مذمت پر تقریر کی اور مال حلال کی برکت اور رزق کی وسعت وغیرہ پر آیات و احادیث اور تاریخی واقعات کو بیان کا، ڈیڑھ گھنٹہ تک مسلسل یہ

بیان ہوتا رہا، مولانا مبارک پوری نے پورا خطاب پورے ذوق وشوق سے سنا اور بہت محفوظ ہوئے۔ یہ تقریر دن میں دس بجے کے وقت ہوئی تھی۔ پھر اسی رات میں میری تقریر مدرسہ دارالحدیث مئو میں ہوئی، اس جلسے کے مولانا عبیداللہ صاحب رحمانی رحمہ اللہ صدر تھے۔ انھوں نے جب مجھے تقریر کے لیے دعوت دی تو میں اپنے ہم مصر علماء کے درمیان سو رہا تھا، مجھ کو لوگوں نے جگایا اور کہا کہ تم سو رہے ہو، شیخ الحدیث خطاب دے رہے ہیں۔ دیکھو سنو، مولانا فرما رہے ہیں۔ مولانا عبدالرؤف کی تقریر میں نے املو اور مبارک پور وغیرہ میں بار بار سنی ہے، پہلے میں نے انھیں خطیب الہند کا لقب دیا تھا اور آج ان کو خطیب الاسلام کا لقب دے رہا ہوں۔ میں اس کے بعد اسٹیج پر گیا اور تقریر کی۔

مولانا عبداللہ شائق مدرسہ دارالحدیث اثریہ کے ناظم اعلیٰ تھے۔ ایک دفعہ میں نے مولانا کو لکھا کہ میرا پہلا پوتا منظور پیدا ہوا ہے، اس کے لیے کوئی تاریخی شعر لکھ دیجیے تو مولانا نے توصیفی کلمات لکھتے ہوئے اس طرح کے اشعار لکھ کر ارسال کیے۔

خوش بیاں ایسے کہ سامع کے لیے
ہر زباں پہ نعرہ ہل من مزید
حل قرآنی میں آپ اپنی مثال
ابن عباس زماں مرد رشید
ہو گئے ہیں جد منظور السعید

منظور السعید سے میرے پوتے منظور کا تاریخی نام نکلتا ہے۔

اسی طرح جب میں نے کان پور محلہ فیتھفل گنج میں تقریر کی تو ہر دس منٹ پر نعرۂ تکبیر کی صدا لگتی رہی۔

کان پور کے محلہ چمن گنج میں جب میں نے معراج پر تقریر کی تو اس وقت بہت بڑے بلند تخت پر شیعہ علماء اور ان کے مجتہدین اور بریلوی علماء وغیرہ سب موجود تھے۔ دو تقریروں کے بعد میری تقریر شروع ہوئی، ڈھائی گھنٹہ تک میں نے بیان کیا، نعرۂ تکبیر ہر دس منٹ کے بعد ساری رات میری تقریر کے دوران جاری رہا، ناظم جلسہ نواب علی نے ٹھیکے دار محمد میاں سے کہا کہ ان کو آپ لوگوں نے کہا چھپا رکھا تھا، پھولوں کے ہار مجھ پر بے انتہا برسائے گئے۔

اسی طرح تقریر وتبلیغ اور دعوت کا فریضہ میں نے اپنے ضلع بستی کے مشہور قصبہ بانسی میں ادا کیا۔ اس میں میری تقریر کے وقت عوام کا اتنا ہجوم تھا کہ بانسی کے راجہ کے شامیانہ دل بادل کے علاوہ بیس شامیانے اور کھڑے کیے گئے۔

جب میں راجھستان کے شہر جودھ پور میں پہنچا تو میری تقریر کے دوران نعرہ تکبیر کی آواز بلند ہوتی رہی۔ جب میں کشمیر میں پہنچا تو وہاں میرے خطاب پر علماء کشمیر مبارکی وغیرہ سر دھنتے اور بار بار تحسین و آفریں کرتے رہے۔

جب میں بنگال پہنچا تو بنگالی علمائے نے اپنی بنگالی زبان میں میری تقریر کو اشعار کے ذریعے پیش کیا کہ مولانا جھنڈانگری یہ کہتے ہیں۔

جب میں مدراس پہنچا تو مدراس میں حاجی عبدالعزیز صاحب مرحوم نے مختلف جگہوں پر میری دس تقریریں کرائیں اور بہت زیادہ مسرور ہوئے، میں نے مدرسے کے لیے جو مساعدہ طلب کیا انھوں نے میری امید سے زیادہ دیا۔ جب میں ترچی بنگلور اور پیارم پیٹ گیا تو میری تقریر سننے کے لیے ہر شخص انتظار میں تھا۔ جنوبی ہند میں میں نے ڈھائی تین مہینے سفر میں گزار دے۔

بستی گونڈہ کے اطراف و نواح کے ہر جلسے کی تاریخ مجھ سے لی جاتی۔ بہت سے جلسوں کے اثرات و برکات یہ ہیں کہ کہیں لوگوں نے اپنی چوٹیاں اور بڑھے ہوئے بال کٹوا دیے، ضلع دیوریا میں سود کی مذمت پر میں نے تقریر کی تو بڑے بڑے سود خوروں نے اپنی پرانی تمام رقموں کو جلا دیا اور سودی کاروبار بند کر دیا۔

سنقال پرگنہ میں جو پہاڑی علاقہ ہے، وہاں میرے تبلیغی مواعظ کا یہ اثر تھا کہ میں نے سگریٹ اور بیڑی کی مذمت پر تقریر وضاحت سے کی تو صبح ہی جلسہ کے ناظم مجھے وہ گڑھا دکھلانے لائے جہاں لوگوں نے اپنی جیب سے سگریٹ سلائی پھینک دیا تھا اور توبہ کر لی تھی کہ آئندہ سگریٹ نہ پئیں گے۔

بہر حال تبلیغ کے اثرات و برکات بحمد اللہ اچھے رہے اور کچھ ہندو حضرات نے بھی میرے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، گورکھ پور جا کر ان کو سند دی گئی کیونکہ نیپال میں ہندو کو مسلم بنانا ممنوع ہے۔

جواب ۱۲: ...... ہماری تصنیفات کا سلسلہ یہ ہے: پہلے میں نے عقلی و نقلی دلائل سے وجود باری تعالیٰ پر ایک کتاب لکھی۔ اس کا نام ہے "دلائل ہستی باری تعالیٰ"۔ اس کے بعد میں نے رسول اللہ ﷺ کے سچے رسول ہونے پر دلائل قائم کیے اس کا نام "دلائل صدق رسالت" رکھا۔

اس کے بعد میں نے ایک کتاب لکھی جس میں علم میں محنت اور فضل و کمال حاصل کرنے کا جذبہ اور ولولہ دیا۔ اس کتاب کا نام "العلم والعلماء" ہے۔

پھر میں نے عقیدہ قیامت کے عقلاً و نقلاً صحیح اور سچا ہونے کا ثبوت پیش کیا اور میں نے منطقی طور پر یہ لکھا کہ اگر قیامت کو برحق سمجھ کر ہم نے اچھے اچھے کام کیے اور برے کاموں سے بچے رہے اور قیامت نہ واقع ہوئی تو ہمارا کوئی خسارہ نہیں۔ کیونکہ ہم نے غریبوں سے ہمدردی کی اور پڑوسیوں سے اچھا سلوک کیا اور جبر و

ظلم وزیادتی سے باز رہے۔ دنیا میں نیک نامی ملی اور باعزت سمجھے گئے لیکن اگر کسی نے عقیدہ قیامت کا انکار کر کے سود خوری کی، شراب نوشی کی، زنا کاری کی اور اچھے عمل نہ کیے اور قیامت واقع ہوگئی تو سارا خسارہ اسی کے لیے ہے جس نے قیامت کا انکار کیا۔ تفسیر کبیر میں امام رازی رحمہ اللہ نے اس مفہوم کو اس طرح ادا کیا ہے۔

قال المنجم والطبيب كلاهما
لن يحشر الأجساد قلت اليكما
ان حق قولكما فلست بخاسر
وان حق قولي فالخسار عليكما

ایک کتاب ''حقوق و معاملات'' لکھی۔ اس میں واضح کیا کہ رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طریقہ حق دا کرنے کا اور معاملہ صاف رکھنے کا کتنا عمدہ اور صاف ستھرا تھا۔ اس کے ساتھ ہی تابعین، تبع تابعین، ائمہ دین، محدثین کرام اور مفسرین عظام کی زندگیاں حق شناسی وحق گزاری اور معاملات کی صفائی اور پاکیزگی میں کس قدر اچھی تھیں۔ اس کو میں نے تاریخی واقعات کے ذریعے واضح کیا ہے۔

اس کے بعد امام بخاری کی صحیح بخاری کے صحیح ترین اور اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہونے کو دلائل وشواہد سے ثابت کیا ہے۔ اس کتاب کا نام ''نصرة الباری فی بیان صحة البخاری'' ہے۔

اس کے بعد منکرین حدیث کے رد میں ایک کتاب لکھی جس میں ثابت کیا ہے کہ امام بخاری سے لے کر اللہ کے رسول ﷺ تک سلسلہ سند میں جتنے راوی ہیں وہ سب ثقہ اور معتمد علیہ ہیں، محدثین نے رسول ﷺ کی حدیث کی حفاظت وصیانت میں غیر معمولی احتیاط برتا ہے۔ اس کتاب کے دوسرے حصے میں مشہور تابعین و محدثین کے حفظ وضبط اور اخذ علم اور تالیف وتصنیف وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ اس کتاب پر اعظم گڑھ، اکوڑہ خٹک (پاکستان) لکھنؤ، دیو بند کے رسالوں نے تبصرے لکھے اور بہت تعریف وتحسین کی۔

ایک کتاب ''مسلمانوں کے اوقاف کے روشن اور تابناک کارنامے'' کے نام سے لکھی۔ اس میں میں نے لکھا ہے کہ صحابہ کرام سے وقف کا سلسلہ شروع ہوا۔ حضرت ابوبکر وعمر نے اپنی زمینیں اسلامی ضروریات کے لیے وقف کیں۔ اس کی بڑی فہرست ہے۔ اس کے ساتھ ہی تابعین ومحدثین کے اوقاف کا تذکرہ ملتا ہے، جس میں انھوں نے شفا خانے، یتیم خانے، مدرسے اور دار العلوم تعمیر کیے اور حجاج کی خدمت کے لیے بڑی بڑی جاگیریں وقف کیں۔ خلفائے بنو عباسیہ اور خلفائے بنو امیہ اور شاہانِ عالم حتیٰ کہ ہندوستان کے مسلم حکمرانوں نے جو اوقاف قائم کیے، ان کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب قابل مطالعہ ہے۔

اسی طرح میں نے ایک کتاب نماز کے فضائل ومسائل پر لکھی کہ کس طرح ائمہ کرام، محدثین عظام اپنی

نمازیں خشوع وخضوع سے ادا کرتے تھے اور کس طرح نماز کی حفاظت اور اس پر مداومت کیا کرتے تھے۔ اس کا نام ''نماز کے احکام ومسائل'' ہے۔

ایک رسالہ عشر وزکوٰۃ کے موضوع پر لکھا۔ زکوٰۃ برمحل ادا کرنے والے کے لیے کتنی بشارت ہے اور زکوٰۃ نہ دینے والوں کے لیے کتنی وعید ہے۔

ایک کتاب ''اسلام اور سائنس'' میں یہ لکھا ہے کہ سائنسی انکشافات وایجادات اسلام کے عقائد واحکام پر کچھ اثر انداز نہیں بلکہ سائنس کے نئے انکشافات سے اسلام کے پیچیدہ مسائل بھی آسانی سے سمجھے جانے لگے ہیں۔

مسلمانوں کی عزت وحرمت کا ذکر کرتے ہوئے کسی کو گالی دینے، کسی پر عیب لگانے، لعن طعن کرنے، غیبت وچغلی کرنے اور بہتان تراشی کی مذمت میں ''احترام مسلم'' کے نام سے ایک کتاب لکھی تاکہ مسلمان غیبت، گالی گلوچ اور لعن طعن سے اپنی زبان محفوظ رکھیں۔

ایک رسالے میں میں نے بقرعید کے موقع پر قربانی کے جانور کا دو دانتا ہونا ضروری ثابت کیا ہے اور اس کتاب کو شروح احادیث وکتب لغت وغیرہ سے مدلل کیا ہے۔ اس رسالے کا نام ''تحقیق مسنہ'' رکھا ہے۔

رمضان کے فضائل ومسائل پر ایک کتاب لکھی ہے جس میں روزہ رکھنے کا اجر وثواب، روزہ کشائی، تراویح، اعتکاف اور عیدین وغیرہ کے مسائل کو وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اس کتاب کا نام ''رمضان المبارک کے فضائل ومسائل'' ہے۔

میں نے رسول اکرم ﷺ کی سیرت پاک پر ایک کتاب لکھی ہے، جس میں آنحضرت ﷺ کی تعلیم وتربیت کے اثرات وبرکات اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اخلاق ومعاملات اور ان کی جاں نثاری وفدائیت کے واقعات کو قلم بند کیا ہے، یہ کتاب سیرت پر قابل قدر ہے اور لائق دید وشنید ہے، کتاب کا نام ہے ''فضائل سید الانبیاء ﷺ''

اس کے بعد خلفائے اربعہ کی سیرت پر ایک کتاب لکھی، جس کا نام ہے ''خلافت راشدہ-معاشی وسماجی عدل وانصاف اور امن وامان کا ایک بہترین دور-'' یہ کتاب ۸۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اور خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے عدل وانصاف اور امن وامان اور اقتصادی ومعاشی مسئلے میں اعتدال وتوازن کا بھی ذکر آیا ہے۔

میں نے ہندو دھرم، آریہ مذہب اور عیسائیوں کے اصول ودستور کے بالمقابل اسلام کے زکوٰۃ اور نماز وغیرہ کے مسائل کو آسان اور سہل دکھلایا ہے اور ثابت کیا ہے کہ عیسائیوں اور ہندوؤں کے اصول ودستور پر چلنا کسی انسان کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اس لیے یہ مذاہب دنیا کے لیے قابل قبول نہیں ہیں۔ اس پر چھ

عنوانات سے بحث کی گئی ہے اور اسلام کی اغلبیت و عالم گیریت کو ثابت کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا نام ہے ''اسلام ایک عالم گیر مذہب۔''

ایک کتاب میں میں نے لکھا ہے کہ غریب و کمزور اور نادار علماء نے کس طرح علم حاصل کیا، اپنے علم و فضل کو برقرار رکھا اور اچھی اچھی کتابیں لکھیں۔ ان کی پشت پر قوم وملت کی کتنی اعانت و دستگیری تھی۔ کس طرح بیت المال سے ان کا وظیفہ مقرر تھا اور کس طرح امرائے کرام نے ان کے ساتھ طلب علم کی راہ میں اعانت و مساعدت کی۔ یہ کتاب اچھے تاریخی واقعات سے پر ہے۔ اس کا نام ہے ''علمائے اسلام کی معاشی کفالت۔''

ایک کتاب میں نے اس موضوع پر لکھی ہے کہ امرائے زمانہ علم عربی پڑھنے والوں پر حقارت کی نظر نہ ڈالیں، شکم پرور سمجھ کر ان کو لعن طعن نہ کریں بلکہ اپنی زبانوں کو محفوظ رکھیں اور علمائے اسلام کی قدر کریں۔ اگر پہلے زمانے کے امراء بھی غریب طلباء کی ناقدری کرتے تو ابن الجوزی اور امام بخاری جیسے لوگ کیسے پیدا ہوتے۔ اگر دنیا امام شافعی کو غریب سمجھ کر ٹھکرا دیتی تو آج کتنے بڑے عالم اور امام الائمہ سے محروم ہو جاتی۔ امام شافعی وہ امام تھے جن کے لیے امام احمد بن حنبل بھی عشاء کی نماز کے بعد دیر تک دعا کرتے رہے۔

مناقب احمد میں ابن الجوزی نے لکھا ہے کہ ان کے لڑکے صالح نے پوچھا کہ والد صاحب آپ یہ دعا اتنی دیر تک کس کے لیے لیے کرتے ہیں؟ انھوں نے فرمایا: امام شافعی کے لیے۔ تو بیٹے نے کہا کہ آپ کا مذہب ان کے مذہب سے جدا ہے؟ امام احمد نے جواب دیا کہ ہمارا اور امام شافعی کا اختلاف فروع میں ہے، اصول میں ہم سب کا ایک ہی مذہب ہے۔ امام شافعی وہ امام ہیں کہ ان کے علم کا احسان ہم سب پر ہے۔ امام شافعی مثل آفتاب کے ہیں، جس طرح اس کی روشنی اور دھوپ سے سارا عالم مستفید ہوتا ہے، اسی طرح امام شافعی کے علم سے پوری دنیا مستفیض ہوتی اور فائدہ اٹھاتی ہے، حالانکہ امام شافعی ایسے مجبور تھے کہ کاغذ بھی ان کے پاس نہیں ہوتا تھا کہ کچھ لکھ لیں، لیکن حفظ کا مادہ بہت زیادہ تھا، جو سنتے تھے یاد کر لیتے تھے۔ اگر ان علمائے کرام کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تو دنیا ان کے علوم کے فیوض سے محروم ہو جاتی۔

ایک کتاب میں نے ''ایمان وعمل'' کے نام سے لکھی ہے جس میں ثابت کیا ہے کہ ہر مسلمان کی نجات کے لیے کامل ایمان اور صالح عمل کی ضرورت ہے۔ جن جن باتوں سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے اس سے ہم کو رک جانا چاہیے اور جن جن چیزوں کے کرنے کا حکم دیا ہے ان تمام کاموں مثلاً نماز روزہ زکوٰۃ و حج وغیرہ کو بجا لانا چاہیے اور جن اخلاق و عادات کو برتنے کا حکم دیا ہے ان کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اس کتاب میں مامورات ومنہیات کی پوری تفصیل دی گئی ہے اور آیات واحادیث و تاریخی واقعات کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ

کتاب تقریباً ۸۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

حسب ذیل کتابیں زیر تصنیف ہیں:

۱۔ صحابہ کرام کی دولت وسخاوت وفیاضی

۲۔ فہم قرآن وتدبر قرآن کا شان دار ماضی

۳۔ حضرت عمر فاروق کی امامت وسیاست

۴۔ منکرات اوران کے ازالے کی شرعی تدابیر

۵ قرن اوّل کا مسلمان کیا تھا اور دورِ حاضر کا مسلمان کیا ہے؟

۶۔ خدمت خلق اوراحسان وسلوک کے بصیرت افروز واقعات

یہ کتابیں مرتب ہو چکی ہیں۔ طباعت واشاعت کی محتاج ہیں۔

جواب ۱۴:......معروف تلامذہ کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

جواب ۱۵:......میرے والد صاحب رحمہ اللہ پہلے دیوبندی مذہب پر عامل تھے۔ انھوں نے اہل حدیث کی صحبت اختیار کی اور جھنڈا نگر میں مسجد ومدرسہ بنایا۔ شیخ الکل فی الکل سیّد نذیر حسین محدث دہلوی کے شاگرد مولانا لیاقت علی صاحب، مولانا جعفر علی صاحب، مولانا محمد صالح صاحب، مولانا دیانت اللہ صاحب وغیرہ میرے والد صاحب کے پاس رہا کرتے تھے، حتیٰ کہ دسترخوان پر ساتھ رہتے، ان کی مجالست ومصاحبت سے والد صاحب اہل حدیث کے جلسوں میں جانے لگے۔ وہاں شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا محمد ابوالقاسم سیف بنارسی، مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری، مولانا عبدالتواب ملتانی اور مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی وغیرہ اجلہ علماء سے ملاقات ہوتی رہی۔ ان صحبتوں اور مجلسوں میں اہل حدیث عقائد کا میرے والد کو علم ہوتا رہا۔ آپ اخبار ''العدل'' امرتسر کا منگایا کرتے تھے جو دیوبندی مسلک کا آرگن تھا۔ میرے والد صاحب اپنے دوست حاجی شکرو میاں کے ساتھ چھپرہ (بہار) کے جلسے میں گئے تو وہاں بڑے بڑے علماء کی تقریروں کو سنا اور وہیں اہل حدیث مسلک اختیار کیا اور جب جلسے سے اپنے گھر قدرت نگر واپس آئے تو اپنے دونوں بھائیوں حاجی محمد اسحٰق اور حاجی محمد امین صاحبان سے مسلک حق اہل حدیث مذہب کو اختیار کرنے کا واقعہ بیان کیا۔ دونوں بھائیوں نے بھی اپنے بڑے بھائی کے مسلک حق کو اختیار کیا اور سارا خاندان اہل حدیث ہو گیا، ان کی اولاد واحفاد سب اسی مسلک کے حامل ہیں۔ اسی وقت سے دعوتِ سلفیت کا آغاز ہوا۔ مسجد بنائی گئی اور مدرسہ سراج العلوم قائم کیا گیا۔ مدرسے کے وہ خود ناظم رہے۔ ان کے بعد ان کے بھائی حاجی محمد اسحٰق صاحب ناظم رہے۔ ان کی وفات کے بعد میں مدرسے کا ناظم ومہتمم بنا اور اب تک چالیس پچاس برس سے میں ہی اس

کی خدمت کر رہا ہوں۔

جواب ۱۶: ...... میں نے کوئی اہم مناظرہ نہیں کیا، عتیق الرحمٰن بریلوی مولوی صاحب تھے۔ ان سے قلمی مناظرہ حاضر و ناظر کے موضوع پر ہوا۔ میں نے دو کتابیں ان کی تردید میں لکھی ہیں۔ پہلی کتاب کا نام ''جوابات حاضر و ناظر'' ہے اور دوسری کتاب کا نام جو بہت ہی مفصل و مدلل ہے ''تردید حاضر و ناظر'' ہے۔

جواب ۱۷: ......اس سلسلے میں ایک عام نصیحت وہ ہے جو جریر بن عبداللہ البجلی کو رسول اکرم ﷺ نے فرمایا تھا۔

بخاری شریف جلد اول کتاب العلم میں یہ حدیث وارد ہے کہ حضرت جریر بن عبداللہ رسول اکرم ﷺ کے پاس آئے اور عرض کیا ''عظني و أوجز'' یعنی مجھے کچھ نصیحت کیجیے اور مختصر کیجیے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میں تم کو مختصر نصیحت کروں گا لیکن تم میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیعت کرو کہ جو کچھ میں کہوں گا، تم اس پر عمل کرو گے، انھوں نے کہا یا رسول اللہ! میں بیعت کرنے کے لیے حاضر ہوں، چنانچہ انھوں نے بیعت کی تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''النصح لكل مسلم'' کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان بھائی کے ساتھ خیر خواہی کرے۔ اس پر انھوں نے عمل کرنے کا اقرار کیا۔ حافظ ابن حجر فتح الباری میں النصح لکل مسلم کے تحت ایک واقعہ لکھتے ہیں کہ: جریر بن عبداللہ البجلی ایک مال دار صحابی تھے۔ میلوں میں پھیلے ہوئے ان کے کھجور کے باغات تھے۔ روزانہ باغات تک پہنچنا ان کے لیے بغیر سواری کے ممکن نہیں تھا، اس لیے منیجر کو حکم دیا کہ ایک گھوڑا میرے لیے خرید کر لاؤ۔ منیجر بازار میں گیا، ایک گھوڑا تین سو میں خرید کیا، گھوڑے کے مالک کو پورا روپیہ نہ دے سکا تو اس سے کہا کہ میرے مالک کے پاس چلو باقی روپیہ دلا دیتا ہوں، چنانچہ گھوڑے کا مالک اپنے گھوڑے کے ساتھ آیا، جریر بن عبداللہ البجلی نے پوچھا کہ گھوڑا کتنے میں خریدا ہے؟ کہا تین سو میں، جریر بن عبداللہ نے گھوڑے کے مالک سے پوچھا: میں اس پر سوار ہو کر اس کی رفتار دیکھ لوں؟ اس نے اجازت دے دی۔ آپ گھوڑے پر سوار ہو گئے اور اچھی طرح دوڑا کر لائے۔ فرمایا یہ گھوڑا تین سو کے لائق نہیں ہے، اس کی رفتار اور چال بتلاتی ہے کہ اس کی قیمت کم از کم ۴۰۰ ہونی چاہیے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد پوچھا کہ کیا دوبارہ سوار ہو کر اس گھوڑے کی رفتار کے مختلف انداز کو دیکھ سکتا ہوں؟ اس کو میں سرپٹ دوڑاؤں گا، اس کو قدم چلاؤں گا اور اس کی دلکی چال دیکھوں گا۔ اس نے اجازت دے دی، سوار ہو کر سرپٹ دوڑایا، پھر قدم چلایا، دلکی چلایا، پھر پوئیا دوڑایا۔ واپس آ کر بتایا کہ اس گھوڑے کی قیمت نہ تین سو ہے نہ چار سو بلکہ چھ سو ہے، پھر تھوڑی دیر تک گھوڑے نے چارہ کھایا، پانی پیا تو جریر بجلی نے گھوڑے کے مالک سے پھر تیسری بار اجازت لی کہ میں سوار ہو کر صرف سرپٹ دوڑاؤں گا کہ اس میں کتنا دم ہے۔ مالک نے اجازت دے دی۔ آپ نے

اس کو سرپٹ دوڑایا، اس کا دم قدم بہت اچھا نکلا۔ جریر بجلی نے کہا: اس گھوڑے کی قیمت نہ پانچ سو نہ چھ سو بلکہ آٹھ سو ہے، منیجر کو حکم دیا کہ گھوڑے کی قیمت آٹھ سو ادا کر دو، منیجر نے ادا کر دیا۔ گھوڑے کا مالک خوش ہو کر واپس چلا گیا، منیجر نے جریر بن عبداللہ البجلی سے سوال کیا کہ میں نہیں سمجھا کہ جس گھوڑے کی قیمت ہم نے ۳۰۰ طے کر دی تھی، اس پر آپ نے ۵۰۰ سو کا اضافہ کیوں کیا؟ جب گھوڑے کا مالک ۳۰۰ پر راضی تھا تو مزید ۵۰۰ دے کر ۸۰۰ کیوں کیا۔ اس میں کیا مصلحت تھی؟ انھوں نے فرمایا کہ میں نے آنحضور ﷺ سے ایک حدیث سنی تھی جو آپ نے مجھے بیعت کے وقت سنائی تھی کہ مسلمان مسلمان بھائی کے ساتھ خیر خواہی کرے، اس گھوڑے کا مالک مسلمان ہے۔ مجھے بحیثیت مسلمان ہونے کے اس کے معاملے میں خیر خواہی کرنی چاہیے تھی۔ اس گھوڑے کی اصلی قیمت ۸۰۰ ہے، گھوڑے کا مالک یا تو جاہل ہے یا اپنے گھوڑے کی حیثیت سے واقف نہیں ہے کہ ایسے چال دار گھوڑے کی قیمت کیا ہوتی ہے؟

یا اگر واقف ہے اور اپنی کسی غرض اور ضرورت سے مجبور ہو کر اونے پونے پھینک رہا ہے تو مجھے اس طرح نہیں لینا چاہیے۔ بلکہ اس کی واجبی قیمت ادا کرنی چاہیے۔ تاکہ ''النصح لکل مسلم'' پر عمل ہو جائے۔ میں اس کی جہالت کے سبب دام کم نہیں دے سکتا اور اس کی کسی غرض و ضرورت سے مجبور ہو کر اونے پونے پھینکنے کی مصلحت کو قبول نہیں کر سکتا۔ اس کا واجبی حق دوں گا تاکہ آنحضور ﷺ کی حدیث کے مطابق میرا عمل ہو جائے۔

آنحضور ﷺ نے جریر بن عبداللہ بجلی کو دو نصیحتیں کی تھیں۔ ایک یہ کہ جب نماز کا وقت ہو جائے تو نماز وقت پر ادا کرو۔ دوسری یہ کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان بھائی کے ساتھ خیر خواہی کا عمل کرے۔

جس طرح صحابہ کرام نے حدیث رسول پر عمل کیا اسی طرح میری نصیحت ہے کہ ہم لوگ بھی خیر خواہی کا جذبہ رکھیں۔ ہر مسلمان بھائی خواہ عرب کے ہوں یا عجم کے، دوسرے مسلمان بھائی کے ساتھ خیر خواہانہ سلوک کریں۔ عربی کو عجمی پر عجمی کو عربی پر کوئی تفوق نہیں ہے، تقوی و تدین شرط ہے، جس میں تقویٰ و تدین زیادہ پایا جائے گا وہ قابل قدر ہے، چاہے عرب کا ہو یا عجم کا۔ جو مسلمان بھائی دوسرے مسلمان بھائی کے ساتھ خیر خواہی کا جذبہ رکھے گا اس کو حدیث رسول پر عمل کرنے کا صلہ اور بے انتہا اجر و ثواب ملے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم مسلمان کو اس کی توفیق بخشے۔ (آمین)

اب آخر میں مولانا عبدالرؤف خاں رحمانی، ماہ و سال کے آئینے میں بحوالہ ''نوائے اسلام'' دہلی:

نام و نسب: عبدالرؤف خاں بن الحاج نعمت اللہ خاں بن سردار خاں بن بختیار خاں بن موتی خاں

ولادت: تقریباً ۱۹۱۰ء

مقام پیدائش: موضع کدربٹوا، ضلع کپل وستو (نیپال)

ابتدائی تعلیم: مکتب کدربٹوا و مدرسہ سراج العلوم جھنڈا نگر

مکتب کے اساتذہ: میاں مالک علی و مولوی محمد خلیل بسکوہری

اعلیٰ تعلیم: جامعہ رحمانیہ بنارس، مدرسہ سراج العلوم جھنڈا نگر، دار الحدیث رحمانیہ دہلی

ممتاز اساتذہ: مولانا محمد منیر خاں بنارسی، مولانا عبدالغفور بسکوہری، مولانا عبدالرحمٰن بجواوی، شیخ الحدیث مولانا احمد اللہ پرتاب گڑھی تلمیذ شیخ الکل فی الکل میاں سید نذیر حسین محدث دہلوی، شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوری، مولانا نذیر احمد رحمانی املوی، مولانا سکندر علی ہزاروی اور مولانا عبدالسلام درانی رحمہم اللہ

فراغت و سالِ فراغت:...... دار الحدیث رحمانیہ دہلی ۱۹۳۲

تدریسی خدمات: دار الحدیث رحمانیہ دہلی (تقریباً ایک سال)، جامعہ رحمانیہ بنارس (تین سال)، مدرسہ سراج العلوم جھنڈا نگر (تقریباً ۱۹۳۷ سے آخر حیات تک)۔

ممتاز تلامذہ: (۱) مولانا محمد اقبال رحمانی رحمہ اللہ (۲) مولانا محمد حسن رحمانی رحمہ اللہ (۳) مولانا عبدالجلیل رحمانی رحمہ اللہ (۴) مولانا عبدالمبین منظر (۵) مولانا ذکر اللہ ذاکر ندوی (۶) مولانا عبدالحنان فیضی (۷) مولانا حامد الانصاری انجم جمال اثری (۸) مولانا عبدالمنان سلفی (۹) مولانا محمد اسلم مدنی وغیرہم

اہم عہدے و مناصب:...... جامعہ سراج العلوم السلفیہ کے تاحیات ناظم و مہتمم (۲) رکن مجلس تاسیسی رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ (۳) نائب صدر و رکن مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند (۴) بانی امیر مرکزی جمعیۃ اہل حدیث نیپال (۵) رکن مجلس عاملہ جامعہ سلفیہ بنارس (۶) مختلف دینی مجلات و جرائد کی مجلس مشاورت کے رکن (۷) متعدد مدارس کے سرپرست

خدمات کی ایک جھلک:

۱۔ خطابت: تقریباً پچاس برس افق خطابت پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکتے اور ہند و نیپال کے ہر گوشے کو اپنی مؤثر اور دل پذیر تقریروں سے منور کرتے رہے۔

۲۔ صحافت: درجنوں دینی و علمی مجلات و جرائد میں سیکڑوں علمی مقالات اور اصلاحی مضامین تحریر کیے۔

۳۔ تصنیف و تالیف: مختلف دینی، علمی اور تاریخی موضوعات پر تقریباً ساٹھ کتابیں اور رسالے تصنیف فرمائے جن میں نصرۃ الباری، صیانۃ الحدیث، ایمان و عمل، ایام خلافت راشدہ، حقوق و معاملات

اور العلم والعلماء عوام وخواص میں بے حد مقبول ہیں۔

۴۔ قیام مساجد و مدارس:...... نیپال میں درجنوں مساجد و مکاتب قائم فرمائے جن میں تولہوا کی مسجد و مدرسہ، چزوٹہ کی مسجد ومدرسہ اور بھیرہوا کی مسجد و مدرسہ قابل ذکر ہیں۔

۵۔ مدرسہ سراج العلوم کو ہمہ جہت ترقی سے ہم کنار کرنے کے لیے کوشاں رہے، اور یہ برصغیر کے اہم مدارس کی صف میں شامل ہوا، جامعہ میں فراغت تک تعلیم جاری کی، سند کا معادلہ سعودی یونیورسٹیوں سے کرایا اور مختلف شعبہ جات قائم فرمائے۔

۶۔ مدرسہ عائشہ صدیقہ کا قیام:...... بچیوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے مدرسہ عائشہ صدیقہ قائم فرمایا اور اس کے لیے الگ الگ دار الاقامہ اور درس گاہ کی شان دار عمارتیں تعمیر کرائیں، یہ مدرسہ نیپال کا سب سے بڑا نسواں تعلیمی ادارہ ہے۔

۷۔ ماہنامہ السراج کا اجراء:...... مسلمانوں کو دین کی بنیادی تعلیمات سے روشناس کرانے کے لیے اردو زبان میں ''السراج'' کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا جو پابندی کے ساتھ نکل رہا ہے۔

اولاد و احفاد:

مولانا کے دو بچوں کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ الحاج عبدالرشید خاں صاحب مولانا کے اکلوتے فرزند ہیں۔ ان کے پانچ بچے ہیں۔ (۱) ڈاکٹر منظور احمد خاں (۲) مسرور احمد خاں (۳) منصور احمد خاں (۴) محمد ارشد خاں (۵) محمد افضل خاں۔

انتقال:

۳۰ رنومبر ۱۹۹۹ء موافق ۲۱ رشعبان ۱۴۲۰ھ کو بعد نماز مغرب ۶ بج کر ۲۰ منٹ پر جامعہ سراج العلوم جھنڈا نگر میں انتقال فرمایا۔

تدفین:

یکم دسمبر ۱۹۹۹ء بروز بدھ بعد نماز عصر آپ کی وصیت کے مطابق آپ کے شاگردِ رشید مولانا عبدالحنان صاحب فیضی مفتی جامعہ سراج العلوم نے جنازے کی نماز پڑھائی اور جھنڈا نگر کے عوامی قبرستان میں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔

اللّٰھم اغفرلہ و ارحمہ وعافہ و اعف عنہ و اکرم نزلہ و وسع مدخلہ وادخلہ جنت الفردوس

مولانا عبدالخالق جامعی

(وفات ۱۹ فروری ۲۰۰۰ء)

۱۹۴۸ء میں مرکزی جمعیت اہل حدیث (مغربی پاکستان) کے قیام کے بعد جمعیت کے صدر محترم مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے جو مجلس عاملہ بنائی، اس کے ایک رکن مولانا عبدالخالق جامعی تھے، جنھیں ضلع گجرات کی طرف سے رکن مجلس عاملہ نامزد کیا گیا تھا۔ میانہ قد، کتابی چہرہ، سرخی مائل گندمی رنگ، نرم کلام، سنجیدہ طبع، کھلی موری کا سفید لٹھے کا پاجامہ، سردیوں میں گرم اور گرمیوں میں ٹھنڈے کپڑے کی شیروانی، پاؤں میں مکیشن، سر پر قراقلی ٹوپی، صاف ذہن کے دھیمے مزاج کے اہل علم، انداز کلام نستعلیق، مجلس عاملہ میں اردو میں بات کرتے اور سنبھل سنبھل کر بولتے۔ اس وقت سیاہ داڑھی تھی۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے سفید ہوگئی۔

والد کا اسم گرامی مولانا حکیم عبدالغنی تھا جو نہایت صالح بزرگ تھے اور میں نے انھیں دیکھا تھا۔ دو تین مرتبہ لاہور مرکزی جمعیت کے دفتر تشریف لائے۔ مولانا داؤد غزنوی ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ ان کی مہربانی تھی کہ مجھ پر بے حد شفقت فرماتے تھے۔ میرے خیال میں اخلاق اور احترام کا تقاضا یہ ہے کہ مولانا عبدالخالق جامعی کا تذکرہ کرنے سے پہلے ان کے والد عالی قدر مولانا حکیم عبدالغنی کے ضروری حالات سے مطلع ہوا جائے، تو آیے پہلے اس فرض سے سبک دوش ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

مولانا حکیم عبدالغنی کا مسکن موضع چک رجادی تھا جو ضلع گجرات کی تحصیل لالہ موسیٰ میں واقع ہے اور لالہ موسیٰ کے بالکل قریب۔ وہی چک ان کا مولد ہے اور سال ولادت ۱۳۰۱ھ (۱۸۸۴ء) ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی۔ اس زمانے میں وزیر آباد (ضلع گوجراں والا) میں حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے شاگرد رشید حضرت حافظ عبدالمنان محدث پنجاب کا سلسلہ تدریس جاری تھا، مزید تعلیم کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دو سال ان کی خدمت میں رہے۔ پھر ان سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ انھیں مزید تعلیم کے لیے دہلی میں حضرت میاں صاحب کے آستانۂ فضیلت پر حاضر ہونے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔ انھوں نے اجازت دے دی تو وہ حضرت میاں صاحب کی خدمت میں گئے اور ان سے اپنی تمنا بیان کی۔ حضرت میاں صاحب نے نہایت شفقت سے فرمایا کہ آپ کو حضرت حافظ صاحب ہی سے اپنی تعلیم مکمل کرنی چاہیے۔ چنانچہ وہ دہلی سے وزیر آباد آگئے اور حضرت حافظ صاحب سے سند فراغت حاصل کی۔

تکمیل تعلیم کے بعد اپنے گاؤں (چک رجادی) تشریف لائے۔ اپنی گرہ سے مسجد تعمیر کرائی اور امامت و خطابت کے ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ اس وقت اس علاقے میں کوئی طبیب یا ڈاکٹر نہ تھا اور بیمار اور ان کے لواحق نہایت پریشان ہوتے تھے، مولانا عبدالغنی نے دہلی جا کر برصغیر کے مشہور طبیب حکیم محمد اجمل خان سے علم طب پڑھا اور ان سے سند لی۔ اب وہ اپنے علاقے میں لوگوں کا روحانی علاج بھی کرتے تھے اور جسمانی بھی۔

ذہانت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ رمضان المبارک کی آمد پر تین مہینے باقی تھے کہ ان کی والدہ مکرمہ نے کہا بیٹا تم عالم اور واعظ تو ہو گئے، یہ ہمارے لیے بہت خوشی کی بات ہے، لیکن میری خواہش ہے کہ تم قرآن مجید بھی حفظ کر لو اور رمضان شریف میں نماز تراویح پڑھاؤ۔ چنانچہ فرماں بردار بیٹے نے ماں کی تمنا پوری کرنے کے لیے اسی وقت قرآن مجید یاد کرنا شروع کر دیا اور تین مہینے میں یاد کر کے رمضان شریف میں سنا بھی دیا۔ بعد ازاں جب تک صحت ٹھیک رہی ہر روز پانچ پارے سناتے رہے۔ اس طرح تین قرآن ہر رمضان میں ختم کیا کرتے تھے۔ قرآن مجید سے انھیں بے حد محبت تھی اور خوش الحان تھے۔ اسی بنا پر حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری انھیں بلبل پنجاب کہا کرتے تھے۔

طویل مدت تک چک رجادی اور اس علاقے کے حنفی حضرات مختلف مسائل کے سلسلے میں مولانا حکیم عبدالغنی مرحوم کو پریشان کرتے رہے۔ ایک مرتبہ تقلید شخصی کے موضوع پر سخت کش مکش شروع ہوگئی۔ آخر ۴-اپریل ۱۹۲۳ء مناظرے کی تاریخ مقرر کر لی گئی۔ احناف کی طرف سے گوجراں والا کے معروف عالم دین مولانا عبدالعزیز کو مناظر کی حیثیت سے لایا گیا۔ ان کی معاونت مولوی نظام الدین ملتانی اور مولوی کرم الدین وغیرہ بعض حنفی علمانے کی۔ اہل حدیث کی طرف سے مولانا عبدالغنی مرحوم کی دعوت پر مولانا ثناء اللہ امرتسری تشریف لائے تھے اور وہ تنہا مناظر تھے۔ مناظرہ کافی دیر جاری رہا، لیکن کوئی مناظر مولانا ثناء اللہ کے سامنے جم کر کھڑا نہ رہ سکا۔ اس مناظرے کے نتیجے میں بہت سے احناف نے مسلک اہل حدیث اختیار کر لیا۔

مولانا حکیم عبدالغنی مستجاب الدعوات بزرگ تھے۔ ایک دفعہ اس علاقے میں سخت قحط پڑا اور لوگ انتہائی پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔ مولانا کے حامیوں کے علاوہ ان کے مخالف بھی بہت بڑی تعداد میں ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا نے لوگوں کو ساتھ لے کر نماز استسقا پڑھی اور نہایت عجز و عاجزی سے بارگاہِ الٰہی میں دعا مانگی جو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی اور کھل کر بارش ہوئی۔ علاقے کے لوگوں پر اس کا بہت اثر ہوا اور توحید کے دائرے نے وسعت اختیار کی۔ یہ عالم دین بغیر کسی لالچ کے تمام عمر اللہ کے دین کی خدمت میں مصروف رہے۔ ۱۹۶۷ء میں ۹۰ سال کی عمر پا کر نماز فجر کے بعد داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اگر میری ان گزارشات کو آج کے دور کے کسی اہل حدیث نوجوان کو پڑھنے کا موقع ملے تو میں عرض کروں کہ وہ آج سے ۸۰-۹۰ سال پہلے کے دور کو موجودہ دور پر قیاس نہ کریں۔ اس دور میں کسی اہل حدیث کے لیے اہل حدیث کہلا کر زندگی گزارنا نہایت مشکل تھا۔ ان کی اپنے خرچ سے تعمیر کردہ مسجدوں پر احناف قبضہ کر لیتے تھے۔

اسی چک رجادی کی مسجد اہل حدیث جو مولانا عبدالغنی نے خود اپنے ذاتی خرچ سے تعمیر کرائی تھی، احناف کے لیے اذیت کا باعث بن گئی اور انھوں نے دھاوا بول کر اس پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت پیسا ملنا بھی بہت مشکل تھا۔ اس سلسلے میں مولانا عبدالغنی نے ۱۳ فروری ۱۹۳۹ء کو اپنے بیٹے مولانا عبدالخالق کو ایک خط لکھا۔ مولانا عبدالخالق اس وقت استاد کی حیثیت سے جامعہ ملیہ (دہلی) سے منسلک تھے۔ خط ملاحظہ ہو:

”برخوردار عزیزی عبدالخالق سلمہ اللہ تعالیٰ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ اس سے قبل لکھ چکا ہوں کہ اڑھائی سو روپیہ کسی سے لے کر جلد بھیجو...... یہ بھی لکھا تھا کہ تاریخ کا پتھر لاہور سے لایا ہوں۔ شاید وہ نصب کرنے میں مزاحم ہوں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ۷ فروری کی شام کو میں گھر پہنچا۔ حافظ احمد دین اور چشتیوں نے ادھر کے لوگوں کو ابھارا کہ مسجد ان کی ملکیت ہو جائے گی۔ آخر صبح کو پچاس ساٹھ آدمی مسجد میں آ گئے اور کہا کہ پتھر نصب نہیں ہونے دیں گے۔ ہم نے کہا ہم نصب کریں گے۔ کیوں کہ بحیثیت متولی مسجد میرا فرض ہے کہ میں نصب کروں۔ آخر انھوں نے کاری گروں کو کام کرنے سے بند کر دیا۔ ہم نے رات کو پتھر نصب کر دیا۔ صبح کو جب ان کو خبر ہوئی تو آپس میں منصوبے کرنے لگے، کوئی آگے نہیں آتا تھا۔ رات کے تین بجے غلام رسول نے مجھے پیغام دیا کہ آج صبح کو تمام گاؤں کے لوگ مسلح ہو کر مسجد پر پتھر کے لیے دھاوا بولنے والے ہیں، آپ اپنا انتظام کر لیں۔ میں نفل پڑھ کر دو آدمیوں کو اپنے ساتھ لے کر پولیس کو مطلع کرنے کے لیے لالہ موسیٰ چلا آیا۔ ایک درخواست ڈپٹی کمشنر کو اور دوسری سپرنٹنڈنٹ پولیس کو دی اور اس کی ایک ایک کاپی مقامی تھانے پہنچا دی۔ ابھی تھانے دار پوری درخواست پڑھنے بھی نہ پایا تھا کہ بھائی محمد دین اور کرم دین پہنچ گئے کہ وقوعہ ہو گیا ہے۔ سوڈیڑھ سو آدمی لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے مسلح ہو کر ”یا علی“ کے نعرے لگاتے ہوئے قفل توڑ کر مسجد میں گھسے اور پتھر اکھاڑ کر چلے گئے...... پولیس نے ان کو بلایا لیکن نہ کوئی سرزنش کی اور نہ پتھر ان سے لے کر دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انھوں نے پولیس کو پہلے سے ہاتھ میں کر لیا تھا۔ اب مسجد کا کام بند ہے اور ہم لوگ خطرے میں ہیں۔ کل امرتسر اور لاہور مشورے کے لیے گیا تھا، رات کو گھر آیا۔ پھر صبح کو گجرات پہنچا۔ اللہ مدد

کرنے والا ہے۔ سکھا شاہی سنتے تھے لیکن آنکھوں نے بھی اس کا مشاہدہ کر لیا۔ روپیہ جلد بھیجو۔"

فقط والسلام

عبدالغنی کان اللہ لہ

اس طرح نہایت تکلیف دہ اور خطرناک حالات میں ہمارے بزرگوں نے مسجدیں تعمیر کرائیں۔ مولانا حکیم عبدالغنی نے اپنی گرہ سے اپنے گاؤں میں مسجد بنائی۔ پھر اس کے نتیجے میں جو صورت حال پیدا ہوئی، وہ اس خط سے ظاہر ہے۔ اس کے لیے وہ کسی سے چندہ نہیں مانگتے۔ اپنے بیٹے کو دہلی خط لکھتے ہیں کہ اڑھائی سو روپے مسجد کے سلسلے میں بھیجو۔ اڑھائی سو روپے اس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی۔ انہی بزرگوں کی قربانیوں کا نتیجہ ہے کہ اب اہل حدیث کی جگہ جگہ مسجدیں بن گئی ہیں۔ پیسا بھی عام ہے اور اہل حدیث بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ان بزرگان کرام جیسے اخلاص، ہمت اور عملی استعداد سے ہم محروم ہیں۔ اس وقت نہ ریل گاڑیاں عام تھیں اور نہ آج کل کی طرح بسوں کی کثرت تھی۔ لوگ بالعموم پیدل سفر کرتے تھے اور کتاب و سنت کی تبلیغ و خدمت ان کا شعار تھا۔ نہ وہ سیاسی ہنگاموں سے دلچسپی رکھتے تھے اور نہ انھیں اخباروں میں چھپنے اور اپنی تصویریں کھنچوا کر شہرت کی منڈیوں میں اپنے جلوے دکھانے کا شوق تھا۔ نہ وہ جلوسوں اور مظاہروں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی تگ و دو کا نقطہ ماسکہ فقط رضائے الٰہی تھا۔

اس ضمن میں ایک خط اور پڑھیے جو اس وقت کی جامعہ ملیہ دہلی کے استاذ تفسیر خواجہ عبدالحی فاروقی نے ۱۳ مئی ۱۹۳۹ء کو علامہ حسین میر کے نام لکھا۔

"علامۃ المفضال حسین میر صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ.......... ایک ضرورت سے میں جامعہ کے استاذ مولوی عبدالخالق صاحب کو آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔ ان کے والد نے اپنے گاؤں میں اہل حدیث کے لیے مسجد بنوائی ہے، جسے وہاں کے حنفی نقصان پہنچانے کی فکر میں ہیں۔ واقعہ کی پوری تفصیل تو یہ خود بیان کریں گے، میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ خواجہ عبدالرحیم صاحب سے کہیں کہ وہ ان کے معاملے میں دلچسپی لیں اور جہاں تک ممکن ہو ان کی مدد کر کے ان کو مصائب سے نجات دلائیں۔ میں آپ کا بہت شکر گزار رہوں گا۔ امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ والسلام عبدالحی"

خواجہ عبدالحی فاروقی مرحوم و مغفور کے حالات زندگی میں اپنی کتاب "نقوش عظمت رفتہ" میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں اور تفسیر قرآن کے سلسلے میں انھوں نے جو تصنیفی خدمات سرانجام دیں، ان کا تذکرہ اپنی ایک اور کتاب "برصغیر کے اہل حدیث خدام قرآن" میں کیا گیا ہے۔

خواجہ عبدالرحیم کو قیام پاکستان کے بعد غالباً راولپنڈی ڈویژن کا کمشنر مقرر کیا گیا تھا اور جس زمانے میں مولانا عبدالغنی مرحوم نے چک رجادی میں مسجد بنوائی، اس زمانے میں ممکن ہے وہ ضلع گجرات کے ڈپٹی کمشنر ہوں۔

ان دونوں خطوط کے یہاں نقل کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس مسجد کی تعمیر کے لیے مولانا عبدالغنی نے کس قدر کوشش کی اور اس سلسلے میں ان کو کتنی مشکلات پیش آئیں اور ان مشکلات کو انھوں نے کتنے صبر اور تحمل سے برداشت کیا۔ اس کے لیے انھوں نے حالات کے مطابق روپیہ پیسا بھی خرچ کیا اور بے پناہ بھاگ دوڑ بھی کی۔ یہ لوگ تھے مسلک اہل حدیث کے اصل خادم اور کتاب وسنت کے مخلص ترین مبلغ۔ ہم لوگوں کی دوں ہمتی کا یہ عالم ہے کہ ہم اپنے بزرگوں کے صحیح حالات سے بھی آگاہ نہیں، اگر تھوڑے بہت آگاہ ہیں تو انھیں بیان کرنے کی سکت نہیں رکھتے۔

مولانا عبدالغنی سے متعلق ان چند سطری گزارشات کے بعد آیئے ان کی آل اولاد کے بارے میں کچھ معلومات سے باخبر ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

مولانا ممدوح کی اولاد چار بیٹوں اور دو بیٹیوں پر مشتمل تھی۔ بڑے بیٹے عبدالخالق جامعی تھے۔ دوسرے عبدالواحد، تیسرے عبدالباسط اور چوتھے بیٹے کا نام عبدالماجد تھا۔ ترتیب کی رو سے آئندہ سطور میں سب سے پہلے عبدالخالق جامعی کا تذکرہ کرنا چاہیے۔

مولانا عبدالخالق جامعی ۵ ستمبر ۱۹۱۱ء کو اپنے آبائی گاؤں چک رجادی (تحصیل لالہ موسیٰ ضلع گجرات) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم تحصیل کھاریاں کے ایک گاؤں موضع ''گنجہ'' کی مسجد میں مولانا سلطان محمود سے حاصل کی جو اپنے عہد کے جید عالم اور صالح بزرگ تھے۔ عبدالخالق نے ان سے چند کتابیں پڑھنے کے بعد وزیر آباد (ضلع گوجراں والا) کا رخ کیا۔ وہاں محدث پنجاب حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کے تلمیذ رشید مولانا عمر دین کا سلسلۂ درس جاری تھا، عبدالخالق اس میں شامل ہو گئے۔ مولانا عمر دین سے مختلف موضوعات کی درسی کتابیں پڑھیں۔ پھر دہلی کا قصد کیا اور وہاں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخلہ لیا۔ اس وقت جامعہ ملیہ کے پرنسپل جنھیں شیخ الجامعہ کہا جاتا تھا، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں تھے (جو آزادیٔ برصغیر سے کئی سال بعد ہندوستان کے صدر منتخب کیے گئے) اور اساتذہ کی فہرست میں مولانا محمد سورتی اور خواجہ عبدالحی فاروقی جیسے جلیل القدر بزرگ شامل تھے۔

مولانا عبدالخالق نے وہاں منشی فاضل کا امتحان دیا یعنی فارسی زبان کی سند فضیلت حاصل کی۔ پھر ۱۹۳۷ء میں میٹرک پاس کیا۔ پھر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے ان کی علمی صلاحیتوں کے پیش نظر انھیں جامعہ میں استاد مقرر کر دیا اور وہ تدریسی خدمات سرانجام دینے لگے۔ کچھ عرصے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ان کی تعیناتی

جامعہ ملیہ کے ایک تربیتی مدرسے میں کر دی۔ وہاں ایک انگریز خاتون مسز گابا صدر مدرس تھیں۔ اس خاتون نے مولانا عبدالخالق کی صلاحیتوں سے بہت فائدہ اٹھایا۔ اس مدرسے میں ان سے بیگم شائستہ اکرام اللہ کے بچے اور بچیاں نیز چودھری محمد علی (سابق وزیر اعظم پاکستان) کے ایک یا دو بچے تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اکرام اللہ صاحب آزادی کے بعد امریکہ میں پاکستان کے سفیر مقرر کیے گئے تھے۔

تقسیم برصغیر یعنی ۱۹۴۷ء تک مولانا عبدالخالق جامعہ ملیہ (دہلی) میں رہے۔ اس کے بعد پاکستان آ گئے اور لالہ موسیٰ میں کاروبار شروع کر دیا۔ اس وقت لالہ موسیٰ میں اہل حدیث کی کوئی مسجد نہ تھی۔ یہ بھی ایک لطیفہ ہے کہ اپریل ۱۹۴۸ء میں وہ لالہ موسیٰ میں بریلوی مکتب فکر کی ایک مسجد ''مستعار'' لے کر اس میں نماز جمعہ پڑھانے لگے۔ شروع شروع میں چار پانچ آدمی شریک نماز ہوتے تھے۔ اس کے بعد ان کی خطابتی صلاحیتیں اجاگر ہونے لگیں تو ہر مذہب و مسلک کے لوگ ان کی اقتدا میں جمعہ پڑھنے اور ان کا خطبہ سننے کے لیے آنے لگے۔ نمازیوں کی صفیں مسجد سے باہر دور تک چلی جاتی تھیں۔ اس اثنا میں بعض بڑی بڑی شخصیتیں ان سے ملاقات کے لیے آئیں۔ ایک مرتبہ سابق وزیر اعظم پاکستان حسین شہید سہروردی بھی تشریف لائے اور ان سے کچھ دیر مصروف گفتگو رہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے چیئرمین سید وقار عظیم نے ان کو اپنے شعبے میں خدمات انجام دینے کی پیش کش کی۔ لیکن انھوں نے جواب میں فرمایا کہ میں اپنے چھوٹے سے کاروبار اور مسجد کی خطابت پر بہت مطمئن ہوں۔

ایک مرتبہ مرکزی جمعیت اہل حدیث کی میٹنگ میں مولانا سید داؤد غزنوی نے لالہ موسیٰ میں ان کے مشاغل کے بارے میں پوچھا تو جواب دیا کہ میں نے بریلوی حضرات سے ایک مسجد مستعار لی ہے، اس میں جمعہ پڑھاتا ہوں۔ مولانا غزنوی نے فرمایا بہت سی چیزیں مستعار لی جاتی ہیں، لیکن مسجد مستعار لینے کی بات آپ ہی سے سنی ہے۔

ان کی تقریر، انداز خطابت اور طریق تفہیم سے لوگ بہت خوش تھے اور نہایت شوق اور توجہ سے ان کی تقریر سنتے تھے۔ اپریل ۱۹۴۸ء سے مئی ۱۹۷۸ء تک تیس اکتیس سال وہ اس ''مستعار'' لی ہوئی مسجد میں خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے رہے۔ اس اثنا میں ان کا درس قرآن کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

پھر موضع ہیل کے ایک پاک باز اور مخیّر بزرگ حاجی رحمت اللہ مرحوم کی تحریک سے میونسپل کمیٹی لالہ موسیٰ کے دفتر کے قریب مسجد اہل حدیث کے لیے جگہ خریدی گئی۔ اس جگہ کی قیمت بہتر ہزار روپے تھی جو حاجی رحمت اللہ مرحوم نے اپنی گرہ سے ادا کی۔ ۳۱ مئی ۱۹۷۸ء کو اس مسجد کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور یہ ''جامع مسجد رحمانیہ اہل حدیث'' کے نام سے موسوم ہوئی۔

موضع ''ہیل'' لالہ موسیٰ سے آٹھ میل کے فاصلے پر ہمارے دوست قاضی عبدالقدیر خاموش کا گاؤں ہے۔ مسجد کے سنگ بنیاد کی تقریب میں میاں فضل حق مرحوم، شیخ محمد اشرف مرحوم اور دور ونزدیک کے بے شمار علما وزعما نے شرکت کی۔ سنگ بنیاد مولانا حافظ محمد یحییٰ میر محمدی نے رکھا۔ اللہ کے فضل سے یہ مسجد تھوڑے ہی عرصے میں پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی۔ اس میں پہلا خطبہ جمعہ مولانا معین الدین لکھوی نے ارشاد فرمایا۔

مولانا عبدالخالق جامعی نے بائیس برس اس مسجد میں خطابت و امامت اور تدریس کے فرائض سرانجام دیے۔ انھوں نے بچیوں کو قرآن مجید کا ترجمہ پڑھانا شروع کیا اور ان کی دینی تعلیم کے لیے جامعہ رحمانیہ للبنات کے نام سے درس گاہ قائم کی، جس سے بہت سی بچیوں نے دینیات کی تعلیم حاصل کی اور کر رہی ہیں۔ ان میں اکثریت بریلوی اور شیعہ گھرانوں کی بچیوں کی تھی۔ اس تعلیم سے متاثر ہو کر انھوں نے مسلک اہل حدیث قبول کیا اور اس کے اثرات ان کے خاندانوں میں پھیلے۔

بے شک مولانا عبدالخالق جامعی نہایت باہمت اور مخلص ترین عالم دین تھے۔ ان کا اخلاص ملاحظہ ہو کہ جو لوگ مسجد اہل حدیث کی تعمیر میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے، وہ خود ان کی مسجد میں خطبہ جمعہ بھی ارشاد فرماتے ہیں اور درس قرآن بھی دیتے ہیں اور ان کے بچوں کو بھی پڑھاتے ہیں۔ یہ تو مجھے یاد نہیں کہ مرکزی جمعیت اہل حدیث کے قیام ۲۴ جولائی ۱۹۴۸ء کے اجلاس میں وہ شامل تھے یا نہیں البتہ یہ حقیقت ہے کہ ابتدائی دور ہی میں ان کو مرکزی جمعیت کی مجلس عاملہ کے رکن نامزد کر لیا گیا تھا۔ میں جمعیت کے قیام کے تھوڑے عرصے بعد اس کے ناظم دفتر کی حیثیت سے خدمات انجام دینے لگا تھا اور مجھے جمعیت کی مجلس عاملہ کے تمام حضرات کے بارے میں معلومات حاصل تھیں، کیوں کہ دفتری خط کتابت وغیرہ کا سلسلہ میرے سپرد تھا اور میرا ارکان عاملہ وشوریٰ سے براہ راست رابطہ رہتا تھا۔

مولانا عبدالخالق جامعی مجلس عاملہ اور شوریٰ کی ہر میٹنگ میں تشریف لاتے تھے اور صدر جمعیت (مولانا غزنوی) سمیت تمام ارکان ان کا احترام کرتے تھے، وہ بھی سب سے بے حد عزت کا برتاؤ کرتے تھے۔ دہلی کے لہجے میں اردو بولتے اور صاف ستھرے اسلوب میں بات کرتے تھے۔ مجلس عاملہ میں کوئی اہم مسئلہ پیش آتا تو بسا اوقات مولانا غزنوی اس کے بارے میں خاص طور سے ان کی رائے لیتے اور وہ خوش اسلوبی سے اپنا نقطۂ نظر بیان فرماتے۔ مولانا محمد حنیف ندوی سے بعض جماعتی معاملات میں وہ علاحدگی میں بات کرتے اور مولانا ندوی کی رائے اس معاملے میں بالعموم ان سے ہم آہنگ ہوتی۔

اس فقیر پر وہ بے حد شفقت فرماتے تھے۔ ''الاعتصام'' کی ادارت اس زمانے میں میرے سپرد تھی، اس کی ترتیب اور مندرجات کا نہایت اچھے پیرائے میں ذکر کرتے، جس سے میری حوصلہ افزائی کا پہلو نمایاں

ہوتا۔ یہ تو بالکل ظاہر بات ہے اور نفسیاتی اور واقعاتی حقیقت ہے کہ کسی سلسلے میں کسی کی حوصلہ افزائی کی جائے گی تو وہ خوش ہوگا، بالخصوص کوئی بڑی عمر کا تجربہ کار اہل علم کسی چھوٹی عمر کے شخص کے بارے میں کوئی تعریفی کلمات کہے گا تو لازماً وہ کلمات اس کے لیے مسرت کا باعث ہوں گے۔ میرے لیے بھی ان کے اس مفہوم کے الفاظ مسرت کا باعث ہوتے تھے۔

موجودہ دور کے لوگوں کو اس دور کے جماعتی حالات کا شاید علم نہیں ہوگا جو مولانا داؤد غزنوی کی وفات کے بعد پیدا ہوئے، میں بھی ان حالات کی نقاب کشائی نہیں کرنا چاہتا۔ جن لوگوں کے ساتھ زندگی کا کچھ حصہ گزرا ہو، ان کا اچھے الفاظ ہی میں ذکر کرنا چاہیے، اگر یہ ممکن نہ ہو تو خاموشی اختیار کر لینی چاہیے۔ مولانا غزنوی کے اس دنیاے فانی سے رخصت ہو جانے سے کچھ عرصے بعد میں نے الاعتصام کی ادارت سے استعفا دے دیا تھا اور مجھے ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ کر لیا گیا تھا اور میں نے تصنیف و تالیف کو اپنا مقصد حیات قرار دے لیا تھا۔ میرے مشفق مولانا محمد حنیف ندوی وہاں بہت پہلے (۱۵ مئی ۱۹۵۱ء) سے یہی خدمت سر انجام دے رہے تھے۔ مولانا عبدالخالق جامعی دو تین مرتبہ ہمیں ملنے کے لیے وہاں بھی پہنچے۔ یہ ان کی مہربانی تھی۔ انھوں نے ہمیشہ اس فقیر کو یاد رکھا اور اپنے ہاں (لالہ موسیٰ) آنے کے لیے کئی پیغام بھجوائے۔ میرے مرحوم دوست مولانا حافظ محمد اسماعیل اسد (خطیب مسجد اہل حدیث حافظ آباد) نے بھی مجھے متعدد بار کہا کہ مولانا عبدالخالق جامعی بعض عوارض کی وجہ سے خود لاہور نہیں آ سکتے، تمھیں بہت یاد کرتے ہیں اور تمھیں جماعتی سلسلے میں کچھ بتانا اور کچھ تم سے پوچھنا چاہتے ہیں، لیکن افسوس ہے، میں ان کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا۔

اب ایک خط ملاحظہ فرمایے جو انھوں نے جامعہ ملیہ کے زمانۂ تدریس میں شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کو لکھا۔ یہ محکمانہ نوعیت کا نہایت مختصر خط ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کا جواب ہے۔ اسے آج سے ۷۷-۷۸ سال قبل کی ایک تاریخ یا تاریخی دستاویز سمجھنا چاہیے۔

”تعلیمی مرکز نمبر ۱-۸ فروری ۱۹۳۶ء

مکرمی جناب شیخ الجامعہ صاحب بہ توسط جناب نگران صاحب تعلیمی مرکز۔

السلام علیکم

میں اس سال جامعہ سینئر کے امتحان میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔ براہ کرم مجھے امتحان میں شرکت کی اجازت مرحمت فرمائیں۔

والسلام

خاکسار عبدالخالق“

اب شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کا جواب پڑھیے:

''مجھے اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اس کے لیے مسجل کو درخواست دینی ہوگی، جس کے ساتھ میں ایک صداقت نامہ منسلک کر دوں گا۔ آپ ایک قومی تعلیم گاہ میں مدرس کا کام انجام دے رہے ہیں۔ قواعد یہی چاہتے ہیں۔''

ذاکر حسین ۹-فروری ۱۹۳۶

....

مندرجہ ذیل سطور ملاحظہ ہوں، جو عبدالخالق صاحب کی درخواست کی منظوری سے متعلق ہیں:

''نقل تجویز نمبر ۷-منظور کردہ مجلس تعلیمی منعقدہ ۵-دسمبر ۱۹۳۶ء

عبدالخالق صاحب مدرس تعلیمی مرکز کی درخواست پیش ہوئی کہ مجھے جامعہ سینئر کے امتحان کی اجازت دی جائے۔ طے پایا کہ درخواست منظور کی جاتی ہے۔ مسجل صاحب مناسب کارروائی فرمائیں...... نقل بخدمت جناب عبدالخالق صاحب ارسال ہے۔

مسجل (رجسٹرار) کے دستخط نہیں پڑھے گئے

....

عبدالخالق جامعی صاحب کا ایک اور خط ڈاکٹر ذاکر حسین کے نام:

تعلیمی مرکز ۱۳-اکتوبر ۱۹۳۷ء

مکرمی جناب شیخ الجامعہ صاحب۔ السلام علیکم

بعض خانگی امور کی وجہ سے مجھے غالباً جنوری ۱۹۳۸ء یا اگست ۱۹۳۸ء سے فروری ۱۹۳۹ء تک چھٹی لینی پڑے گی۔ اس سلسلے میں آپ سے ۱۷-اکتوبر ۱۹۳۷ء کے بعد کسی دن ملنا چاہتا ہوں۔ براہ کرم مطلع فرمائیں کہ کس وقت اور کہاں ملو؟

خاکسار

عبدالخالق

....

ذیل میں ڈاکٹر صاحب کا چند لفظی جواب پڑھیے:

''آپ ۱۸ یا ۱۹-اکتوبر کو دفتر میں مجھ سے مل لیں۔ ۲۰ سے ۲۵ تک میں دہلی میں نہ ہوں گا۔ وقت

ایک اور دو بجے کے درمیان مناسب ہوگا۔

ذاکر حسین

۱۵-۱۰-۳۷

....

اسی سلسلے میں ڈاکٹر ذاکر حسین کا خط:

''مکرمی عبدالخالق صاحب السلام علیکم...... میں نے کل اور آج کا وقت آپ کو دیا تھا۔ کل شاید آپ کسی کام کی وجہ سے تشریف نہ لا سکے۔ آج مجھے باہر جانا پڑ رہا ہے۔ غالباً ڈھائی بجے سے پہلے واپس نہ آ سکوں گا، اس لیے آج تکلیف نہ فرمائیں۔ کل مدرسے کے وقت میں یا اس کے بعد دو بجے تک کسی وقت تشریف لے آئیں۔

آپ کا مخلص

ذاکر حسین

۱۹-۱۰-۳۷

....

ذیل کی سطور میں مولانا عبدالخالق جامعی کے نام خواجہ عبدالحی فاروقی کا مکتوب گرامی پڑھیے۔ اس مکتوب پر ۲۷-اپریل ۱۹۴۲ء کی تاریخ لکھی ہے۔ جس لیٹر پیڈ پر یہ لکھا گیا ہے، اس کی پیشانی پر حلقۂ ہمدردان جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر دہلی کے الفاظ مطبوع ہیں۔ تار کا پتا جامعہ دہلی اور ٹیلی فون نمبر ۳۵۷ ہے۔ اس مکتوب سے پتا چلتا ہے کہ اس زمانے میں پیسا کتنا مہنگا تھا اور جامعہ ملیہ میں کام کرنے والے لوگ کس طرح زندگی بسر کرتے تھے اور حساب کتاب میں کس قدر دیانت دار تھے۔

''مکرمی! السلام علیکم۔ بیس روپے شفیق الرحمٰن چیڑا سی سے وصول کر کے بے باقی کی رسید دے دیجیے۔ مولوی محمد [1] صاحب خود آٹھ روز دہلی سے باہر رہے۔ آٹھ روز بچے علی گڑھ چلے گئے۔ [2] اس لیے یکم مارچ سے ۱۵-اپریل تک ان کے چار روپے بنتے ہیں۔ والدہ قیوم نے کہا تھا کہ آپ کا کوئی حساب ان کی طرف باقی ہے، اسی لیے یہ چار روپے بھی مولوی صاحب کے

---

[1] معلوم نہیں اس سے کون مولوی محمد مراد ہیں۔ ممکن ہے مولانا سورتی مراد ہوں، وہ جامعہ ملیہ میں پڑھاتے رہے تھے۔ لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کس زمانے میں جامعہ ملیہ میں فریضۂ تدریس انجام دیتے تھے۔

[2] اسی طرح لکھا ہے، لیکن یہ بے ربط عبارت ہے۔ ممکن ہے ''آٹھ روز بعد'' ہو۔

حساب میں وصول کر کے اس کی رسید الگ دے دیجیے۔ اب میری طرف آپ کی کوئی رقم باقی نہیں۔ باقی رہا بچوں کا معاملہ، اس کے متعلق میں خاموش رہتا ہوں۔"

عبدالحیٔ

اب مولانا عبدالخالق جامعی کے نام خواجہ عبدالحیٔ فاروقی کا ایک اور خط پڑھیے۔ یہ بھی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے لیٹر پیڈ پر لکھا گیا ہے۔ یہ خط اپنے مندرجات کے اعتبار سے بالکل واضح ہے:

"مکرمی! السلام علیکم، چوبیس روپے کی رسید آج ملی۔ اس میں سے چار روپے مولوی محمد صاحب کو دے دیجیے۔ وہ کل دریافت کر رہے تھے۔ جمعرات کا دن قرول باغ میں گزاروں گا اور شب کو امرتسر روانہ ہو جاؤں گا۔ ان شاء اللہ

"آج صبح میں سبزی منڈی گیا تھا۔ حاجی عباد اللہ میوہ فروش کے دو بچے جامعہ نگر میں پڑھتے تھے۔ اب وہ گھر پر ہیں۔ اگر آپ تعطیلات میں یہاں رہیں تو سبزی منڈی میں ان کے پاس چلے جایے، آپ کے قیام و طعام کا بندوبست وہی کریں گے اور کچھ نقد بھی دیں گے۔ بچوں کی نگرانی اور معمولی تعلیم آپ کا کام ہوگا۔ ایک ابتدائی اول اور دوسرا ابتدائی دوم کا طالب علم ہے۔ آپ فوراً خط پڑھتے ہی مجھے فون پر نفی و اثبات میں جواب دیجیے، کیوں کہ میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ دو روز کے اندر انتظام کر دوں گا۔ قیام و طعام کا انھوں نے خود ذکر کیا تھا اور نقد کی کوئی تعیین نہ تھی اس لیے اس کا فیصلہ آپ خود کر لیں۔ آپ آغا صاحب سے وہاں جا کر خود دریافت کر لیجیے اور ان سے کہیے کہ میں نے آپ کو بھیجا ہے۔

اپنے دونوں بچوں کے بارے میں آپ سے جمعرات کے روز گفتگو کروں گا۔ غالباً ساڑھے دس تک قرول باغ پہنچ جاؤں گا۔ حکیم صاحب کے پاس ٹھہروں گا۔

والسلام
عبدالحیٔ

....

مولانا عبدالخالق جامعی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا گزشتہ سطور میں ذکر کیا گیا ہے۔ وہ بے حد نرم مزاج اور خالص علمی آدمی تھے۔ انھوں نے ۱۹۔ فروری ۲۰۰۰ء کو وفات پائی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

وفات کے وقت مولانا عبدالخالق جامعی کی نرینہ اولاد تین بیٹے تھے۔ عبدالحمید، عبدالجلیل اور عبدالوکیل۔ عبدالوکیل وفات پا گئے ہیں۔ عبدالحمید اور عبدالجلیل کاروبار میں مصروف ہیں۔

مولانا عبدالخالق جامعی کے علاوہ مولانا حکیم عبدالغنی کے تین بیٹے اور ہیں۔ تفصیل اس طرح ہے۔

(۱) مولوی عبدالواحد: نہایت نیک طبع اور صالح مزاج۔ ان کی اولاد نرینہ چار بیٹے ہیں۔ عبدالحفیظ، عبدالرحیم، عبدالحلیم اور عبدالسلام۔ چاروں بیٹے کاربار کرتے ہیں۔

(۲) مولوی عبدالباسط: باعمل عالم اور تقوی شعار بزرگ ہیں۔ ان کی اولاد نرینہ ایک بیٹا ہے، عمران باسط۔ ملازمت کے سلسلے میں پاکستان سے باہر کسی ملک میں مقیم ہے۔

(۳) مولوی عبدالماجد: ان کے تین بیٹے ہیں۔ حافظ طارق محمود یزدانی۔ عامر محمود اور ناصر محمود۔ مؤخر الذکر دونوں بیٹے (عامر محمود اور ناصر محمود) تو اندرون ملک اور بیرون ملک کاربار میں مصروف ہیں لیکن حافظ طارق محمود یزدانی اپنے آبا واجداد کی راہ پر گامزن ہیں اور اپنے آپ کو انھوں نے خدمت دین کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ ماشاء اللہ عالم دین ہیں، حافظ قرآن ہیں، مقرر اور خطیب ہیں۔ جامع مسجد رحمانیہ اہل حدیث لالہ موسیٰ کی خطابت کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں۔ لالہ موسیٰ میں لڑکیوں کی دینی تعلیم کے ادارے کا اہتمام اور انتظام بھی انھی کے سپرد ہے۔ اس ادارے کا نام ''جامعہ رحمانیہ للبنات'' ہے۔ اپنے گاؤں چک رجادی میں بھی جامعہ احسان اہل حدیث کے نام سے انھوں نے ایک تدریسی ادارہ قائم کیا ہے۔ اس کے مہتمم یہی ہیں۔ ضلع گجرات کی جمعیت اہل حدیث کے منصب امارت پر فائز ہیں۔ یہ تمام فرائض وہ حسن وخوبی اور محنت کے ساتھ سرانجام دے رہے ہیں۔

۱۴ر اگست ۲۰۰۵ء کو میں حافظ طارق محمود، حافظ عبدالستار عاصم اور قاضی عبدالقدیر خاموش کی دعوت پر گجرات گیا تھا۔ شہر کے ایک بڑے ہوٹل میں ان حضرات نے اس فقیر کے اعزاز میں تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ متعدد حضرات نے تقریریں کیں اور ازراہ کرم اس فقیر کی تصنیفی اور جماعتی خدمات کا تذکرہ کیا اور شیلڈ عطا کی۔ اسی موقعے پر حافظ عبدالستار عاصم کے مکتبے کا افتتاح بھی کیا گیا تھا۔ مولانا عبدالخالق جامعی کے صاحب زادوں سے ملاقات ہوئی۔ وہاں سے فارغ ہو کر میں حافظ طارق محمود یزدانی اور دوسرے دوستوں کے ساتھ لالہ موسیٰ گیا اور وہاں مسجد رحمانیہ اہل حدیث میں عصر کی نماز پڑھی، جہاں مولانا عبدالخالق بائیس سال خطابت وامامت اور درس وتدریس کا فریضہ ادا کرتے رہے تھے۔ بڑی شان دار مسجد ہے۔ حافظ طارق محمود یزدانی اور بعض دیگر حضرات نے بتایا کہ مولانا عبدالخالق جامعی اس فقیر کا اکثر تذکرہ کیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ میں بہت سی باتیں اس کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن افسوس ہے یہ فقیر ان کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا اور وہ بے شمار باتیں اپنے ساتھ ہی لے گئے۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت کے رنگ دیکھیے کہ جس علاقے اور گاؤں میں اہل حدیث کا نام لینا جرم تھا، اب

وہاں اہل حدیث کے تدریسی ادارے قائم ہیں اور پورے زور سے توحید کے نعرے بلند ہو رہے ہیں۔ مولانا حکیم عبدالغنی کو اہل حدیث ہونے کی بنا پر جو لوگ پریشان کر رہے تھے، اب انہی کے اخلاف ان کے بیٹوں اور پوتوں کے ساتھ توحید کی تبلیغ اور کتاب وسنت کی اشاعت میں مشغول ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ مولانا حکیم عبدالغنی مرحوم ومغفور کی اولاد میں سے جن حضرات کا گزشتہ سطور میں ذکر کیا گیا ہے اب وہ کس حال میں ہیں۔ (۱۴۔ مئی ۲۰۰۳ء)

دعا ہے اللہ تعالیٰ وفات پانے والوں کی مغفرت فرمائے اور زندوں کو اپنے دین کی خدمت کی زیادہ سے زیادہ توفیق سے نوازے۔

مولانا عبدالکریم ندیم ڈیروی

(وفات ۲۷ ستمبر ۲۰۰۴ء)

جنوبی پنجاب کے ایک عالم دین مولانا ابونعیم عبدالکریم ندیم یاروی ڈیروی تھے جو ۱۹۲۵ء میں ڈیرہ غازی خاں کے ایک گاؤں یاروکھوسہ میں پیدا ہوئے۔ یہ گاؤں ڈیرہ غازی خاں سے سولہ کلومیٹر کے فاصلے پر شمال کی طرف واقع ہے۔ مولانا موصوف کا تعلق اس نواح کے ایک علمی خاندان سے تھا۔ ان کا سلسلہ نسب یہ ہے:
عبدالکریم بن میاں عبدالواحد بن میاں عبدالرحیم بن حافظ گل محمد بن احمد۔

مولانا عبدالکریم کے والد میاں عبدالواحد کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اردو کے شاعر تھے اور اردو اشعار میں قرآن مجید کی تفسیر بیان کیا کرتے تھے۔ فارسی زبان سے انھیں خاص لگاؤ تھا اور شیخ سعدی کی گلستاں، بوستاں اور کریما انھیں زبانی یاد تھیں۔ وہ اپنے علاقے کے خوش بیان واعظ بھی تھے۔ متعدد لوگ ان کے وعظ سے متاثر ہو کر دائرۂ اہل حدیثیت میں شامل ہوئے۔

مولانا عبدالکریم ندیم ڈیروی کی والدہ بھی اس دور اور معاشرے کے مطابق علم سے آشنا تھیں اور مولانا عبدالعزیز ڈیروی مبلغ آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کی بڑی بیٹی تھیں۔ عبدالکریم نے تعلیم کا آغاز مقامی علما (مولانا غلام رسول قریشی، حافظ فیض محمد بھٹی اور مولانا مشتاق احمد ڈیروی) سے کیا۔ مڈل سکول یاروکھوسہ سے مڈل تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد دارالحدیث محمدیہ جلال پور پیروالا چلے گئے اور سات سال میں وہاں کا نصاب مکمل کیا اور سند لی۔ وہاں مولانا سلطان محمود سے بالخصوص اخذ فیض کیا اور ان کے طرزِ تدریس سے بہت متاثر ہوئے۔

بعدازاں آستانہ فریدیہ کوٹ مٹھن میں مولانا واحد بخش کی خدمت میں حاضر ہوئے جو ان کے نانا مولانا عبدالعزیز ڈیروی کے ہم درس رہے تھے۔ وہاں حدیث وفقہ کی چند کتابیں پڑھیں۔ پھر وہاں سے نکلے اور یکے بعد دیگرے مولانا عبدالحق ہاشمی، مولانا عبدالتواب ملتانی، مولانا غلام اللہ خاں (راولپنڈی) مولانا عبدالغنی جاچڑوی (رحیم یار خاں) مولانا عبداللہ درخواستی اور مولانا محمد موسیٰ کے حلقہ ہائے درس میں پہنچے اور ان سے اکتسابِ علم کیا۔ بعض شیعہ علما کے حلقۂ شاگردی میں بھی شمولیت کی۔

احمد پور شرقیہ کے مولانا عبدالحق ہاشمی سے موطا امام مالک کا درس لیا۔ وہ جس انداز سے موطا پڑھاتے

تھے، اس کی وہ بہت تعریف کرتے تھے۔ موطا کے علاوہ مولانا عبدالحق ہاشمی سے صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داؤد اور امام شافعی کی کتاب الام پڑھیں۔ عربی ادب کی کتاب متنبی بھی ان سے پڑھی اور سندِ فراغ لی۔

مولانا عبدالکریم ڈیروی نے عربی ادب اور معقولات کی بعض کتابیں دوبار پڑھیں۔ موطا امام مالک، کتاب الامّ اور متنبیّ میں مولانا عبدالحق ہاشمی کے صاحب زادے مولانا عبدالرزاق فاروقی ان کے ہم جماعت تھے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد حالات کچھ ایسے پیدا ہوئے کہ مولانا عبدالکریم کو مالی اعتبار سے سخت پریشانی لاحق ہوئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ گھر کا سامان بیچنا پڑا۔ اتفاق سے اس وقت ملتان کے دارالحدیث محمدیہ قدیر آباد میں ایک مدرس کی ضرورت تھی۔ مولانا ملک عبدالعزیز ملتانی کو جب پتا چلا کہ ان کے پرانے دوست مولانا عبدالعزیز ڈیروی مبلغ آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کے نواسے عبدالکریم ڈیروی دارالحدیث جلال پور پیر والا اور مولانا عبدالحق ہاشمی کے مدرسے سے فارغ التحصیل ہو کر آئے ہیں تو انھوں نے ان کو ملتان بلایا اور قدیر آباد کے مدرسے میں مدرس مقرر کر دیا۔ اس وقت اس مدرسے میں حضرت مولانا شرف الدین دہلوی بھی تدریسی خدمت سرانجام دے رہے تھے۔ یہ ۱۹۵۰ء کے آخر کی بات ہے۔

مولانا عبدالکریم بہت اچھے مدرس تھے۔ انتظامیہ والے بھی ان کے طریق درس سے خوش تھے اور طلبا بھی مطمئن تھے۔ لیکن معلوم نہیں انھیں کیا سوجھی کہ ۱۹۵۲ء میں میونسپل کمیٹی کے سکول میں دینیات کے معلم کی حیثیت سے ملازمت کرنے لگے۔ چھے سال سکول میں ان کا سلسلۂ تدریس جاری رہا۔ پھر حکومت پنجاب نے مختلف محکموں کے ملازموں کو تخفیف کے نام سے ملازمت سے الگ کر دیا تو انھیں بھی الگ کر دیا گیا۔ بعض ملازم کوشش کر کے دوبارہ بحال ہو گئے، لیکن مولانا عبدالکریم نے بحالی کے لیے کوشش نہیں کی۔

کچھ عرصے بعد دینی مدارس میں واپس آ گئے اور بعض مسجدوں میں خطابت و امامت کا فریضہ بھی انجام دیا۔ جن مدرسوں میں تدریس کی وہ ہیں دار الحدیث محمدیہ جو میاں فضل حق نے حافظ آباد میں جاری کیا تھا۔ جامعہ سلفیہ فیصل آباد، دار الحدیث رحمانیہ ملتان، جامعہ سعیدیہ خانیوال، مدرسہ محمدیہ پکا قلعہ حیدر آباد سندھ، مدرسہ محمدیہ مورو ضلع نواب شاہ سندھ، مدرسہ محمدیہ مسجد اہل حدیث کوٹ لقمان کریچو تحصیل ہالہ سندھ۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ انھوں نے کس مدرسے میں کتنا عرصہ تدریسی خدمت انجام دی۔ یہ بھی پتا نہ چلا کہ وہ ایک مدرسہ چھوڑ کر دوسرے مدرسے میں کیوں گئے۔ بہر حال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انھوں نے متعدد مدارس میں طالبانِ علم کو تعلیم دی۔

مولانا عبدالکریم ڈیروی مناظر نہیں تھے، لیکن ایک مرتبہ ۱۹۶۲ء میں انھوں نے کوٹ لقمان کوریچو میں بریلوی حضرات سے مناظرہ بھی کیا۔ مناظرے کے نتیجے میں چند ارکانِ جماعت کے ساتھ انھیں گرفتار کر لیا

گیا۔ تقریباً دو ہفتے جیل میں بند رہے۔ جیل میں خطبہ جمعہ ارشاد فرمایا۔

مولانا عبدالکریم ڈیروی کے تلامذہ کافی تعداد میں ہیں، جن میں مندرجہ ذیل حضرات شامل ہیں:

۱- قاری محمد ادریس غفاری خطیب و مدرس شام کوٹ نو، ضلع قصور
۲- مولانا محمد عبداللہ شیخوپوری
۳- مولانا عبدالستار حسن سابق شیخ الحدیث معہد الشریعہ کوٹ ادو
۴- مولانا سیف اللہ ملتان
۵- مولانا ارشاد الحق اثری، ادارہ علوم اثریہ فیصل آباد
۶- مولانا اسد اللہ ثاقب خطیب جامع قمر المساجد ملتان
۷- مولانا محمد حسین محمدی احمد پور
۸- مولانا عامر کلیم معہد الشریعہ کوٹ ادو
۹- پروفیسر اللہ بخش حال امریکہ
۱۰- مولانا عبدالرحمٰن عظیمی سابق شیخ الحدیث جامعہ محمدیہ کہروڑ پکا

مولانا عبدالکریم ڈیروی نرم خو، حلیم الطبع، کتاب و سنت کے مخلص ترین خادم اور اہل علم کے قدر دان تھے۔ اس کے ساتھ ہی بے حد خود دار بھی۔

۱۹۹۴ء میں انھیں دار الحدیث محمدیہ ملتان کے مدرس مقرر کیا گیا۔ اس وقت اس مدرسے کے شیخ الحدیث مولانا عبدالکبیر صاحب تھے۔ وہ وہاں سے چلے گئے تو مولانا عبدالکریم کو شیخ الحدیث بنا دیا گیا۔ لیکن جسمانی ضعف و کمزوری کی وجہ سے ۲۰۰۴ء کے اوائل میں سلسلۂ تدریس ترک کر کے گھر آ گئے۔ اس سے کچھ عرصہ بعد ۲۷ ستمبر ۲۰۰۴ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

اللھم اغفرلہ و ارحمہ و عافہ و اعف عنہ [1]

حضرت مرحوم کے صاحب زادے مولانا عبدالرحیم اظہر ڈیرہ غازی خاں میں اقامت گزیں ہیں اور اپنے انداز میں دین کی خدمت کر رہے ہیں۔

ان کے مضامین اخبار الاعتصام اور بعض دیگر اخبارات میں چھپتے رہتے ہیں۔ اپنے والد گرامی کے نام سے انھوں نے الکریم اسلامک لائبریری قائم کی ہے۔ دوسرا اہم کام انھوں نے یہ شروع کیا ہے کہ ”تذکرہ علمائے اہل حدیث جنوبی پنجاب“ ترتیب دے رہے ہیں۔ اس قسم کی خدمت مرکز ابن القاسم الاسلامی ملتان

[1] ہفت روزہ الاعتصام مورخہ ۲۰ تا ۲۶- اگست ۲۰۱۲ء۔

کے فاضل مدرس حافظ ریاض احمد عاقب نے بھی اپنے ذمے لے رکھی ہے۔ ملتان کی عبدالرحمٰن اسلامک لائبریری کے بانی مولانا محمد یاسین شاد بھی اس نوعیت کے کام کے لیے کوشاں ہیں۔ ماہنامہ ''تفہیم الاسلام'' احمد پور شرقیہ کے ایڈیٹر جناب حمید اللہ خاں عزیز بھی سابق ریاست بہاول پور کے علمائے اہل حدیث کے حالات جمع کرنے میں مصروف ہیں۔ یہ نہایت اہم کام ہے جو یہ حضرات اپنے اپنے انداز میں کر رہے ہیں۔ مولانا عبدالکریم کے صاحب زادے مولانا عبدالرحیم اظہر نے حفظ قرآن کا ادارہ بھی قائم کیا ہے۔ اللہ ان دوستوں کو ان ضروری امور کی انجام دہی کی توفیق بخشے۔ آمین

میرا بھائی محمد حسین بھٹی

(وفات ۲۷۔ اگست ۲۰۰۷ء)

پورا قد، متوازن جسم، گول چہرہ، گندمی رنگ، ابھری ہوئی ناک، لمبی داڑھی جو تقریباً سفید ہو گئی تھی۔ ٹخنوں سے اوپر شلوار، یہ تھا میرا چھوٹا بھائی محمد حسین بھٹی۔

ہر شخص پر زندگی میں کئی دور آتے ہیں اور وہ سفر حیات کی مختلف منزلیں مختلف طریقوں سے طے کرتا ہے اور ہر منزل اسے نئے تجربے سے آشنا کراتی اور مختلف افکار و خیالات کے لوگوں سے متعارف ہونے کا ذریعہ بنتی ہے۔ میرے بھائی محمد حسین بھٹی پر بھی کئی دور آئے اور ایک محدود سے دائرے میں رہتے ہوئے اس کی حیاتِ مستعار کی گاڑی نے متعدد موڑ کاٹے۔ اس کے قد و قامت اور جسم کی ساخت تو وہی رہی، مگر زندگی کے آخری برسوں میں اس کے چہرے بشرے کے ظاہری آثار بالکل بدل گئے تھے اور فکر و عمل کی کیفیت منقلب ہو گئی تھی۔

وہ نہ عالم تھا نہ فاضل، نہ کسی مسجد کا امام تھا نہ خطیب، شاید اس نے کبھی اذان بھی نہیں دی ہو گی۔ نہ مدرس تھا نہ معلم، نہ مقرر تھا نہ واعظ، وہ وعظ و تقریر سننے کا زیادہ عادی بھی نہ تھا۔ ایک عام سا مسلمان تھا۔ البتہ وہ کسی نہ کسی کتاب کا مطالعہ کرتا رہتا تھا اور روزانہ زندگی میں پیش آنے والے مسائل سے آگاہ اور ملکی حالات سے باخبر تھا۔

وہ کوئی سرمایہ دار اور کارخانہ دار بھی نہ تھا۔ وہ بڑا زمیندار بھی نہ تھا۔ اس کا بہت بڑا مکان بھی نہ تھا۔ گاؤں میں اس کا کوئی ڈیرا بھی نہ تھا۔ یعنی میرے بھائی میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جو لوگوں کے لیے باعث کشش اور وجہ جاذبیت ہو سکتی ہو۔ لیکن اس کے باوجود میرا اس کے متعلق چند باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ کسی کو ان باتوں میں دلچسپی ہو یا نہ ہو، مجھے بہر حال دلچسپی ہے، اس لیے کہ وہ میرا چھوٹا بھائی تھا، نیک خصال اور صاحبِ مطالعہ بھائی۔

میں نے اپنی تصانیف میں اب تک ہزاروں لوگوں کے حالات بیان کر دیے ہیں۔ کم و بیش تین ہزار افراد کے واقعاتِ زندگی تو فقہائے ہند کی دس جلدوں میں ضبط تحریر میں آ گئے ہیں۔ باقی کتابوں میں جن حضرات کے متعلق لکھا گیا ہے، وہ اس کے علاوہ ہیں۔ اخبار ''الاعتصام'' میں پندرہ سولہ سال پر محیط دورِ

ادارت میں بھی اور اس کے بعد بھی بے شمار بزرگوں کے متعلق لکھا، جن میں علما بھی شامل ہیں اور غیر علما بھی۔ اسی طرح ادارہ ثقافت اسلامیہ میں ماہنامہ "المعارف" کی ادارت کے طویل زمانے میں بہت سے لوگوں پر لکھا۔ دیگر رسائل و جرائد میں بھی لکھا۔ لیکن کسی کتاب یا اخبار میں اپنے کسی رشتے دار کے بارے میں کوئی بات نہیں لکھی۔ اگر کہیں لکھی بھی تو نہایت اختصار کے ساتھ، اشاروں کے الفاظ اور کنایوں کے پیرائے میں......!

اپنی تقریباً ۶۴ سالہ تحریری زندگی میں بے حد افسردہ دلی اور انتہائی غم زدہ قلم سے پہلی مرتبہ اپنے بھائی محمد حسین پر چند سطور لکھ رہا ہوں۔ یہ سطور بھی الفاظ کے ہیر پھیر سے اسی طرح الجھی ہوئی ہیں، جس طرح اس کی موت کی وجہ سے میرا ذہن الجھا ہوا ہے۔ قارئین کرام اصحابِ علم کی الجھاؤ سے پاک تحریریں تو ہمیشہ پڑھتے ہیں، آج اس فقیر کی الجھی ہوئی تحریر بھی پڑھ لیجیے۔

محمد حسین ۱۵۔ نومبر ۱۹۳۶ء کو ہمارے قدیم وطن کوٹ کپورہ ریاست فرید کوٹ میں پیدا ہوا۔ میری تاریخ پیدائش ۱۵۔ مارچ ۱۹۲۵ء ہے۔ اس حساب سے وہ مجھ سے گیارہ سال آٹھ مہینے چھوٹا تھا۔ اس کی پیدائش سے کچھ عرصہ قبل ہمارے ہاں انجمن اصلاح المسلمین کے سالانہ جلسے میں حضرت عبداللہ روپڑی کے برادر خرد حافظ محمد حسین روپڑی تشریف لے گئے تھے اور انھوں نے جلسۂ عام میں تقریر فرمائی تھی جو لوگوں نے بہت پسند کی تھی۔ انہی حافظ محمد حسین روپڑی کے نام پر میرے بھائی کا نام محمد حسین رکھا گیا تھا۔ یہ نام میرے کہنے سے رکھا گیا تھا، ورنہ میرے دادا میاں محمد مرحوم اس کا نام محمد الیاس رکھنا چاہتے تھے۔ یہ بھی بہت اچھا نام تھا۔ اللہ کے دو برگزیدہ پیغمبروں کے اسمائے گرامی کا خوب صورت مجموعہ......!

ہمارے شہر کوٹ کپورہ کی انجمن اصلاح المسلمین نے کافی وسیع جگہ میں اسلامیہ پرائمری سکول جاری کیا تھا۔ اس سکول میں اس دور کے سرکاری سکولوں کے مطابق تعلیم دی جاتی تھی۔ لیکن اس کے علاوہ دینیات کی تعلیم کا بھی انتظام تھا۔ سکول میں چار معلم مقرر کیے گئے تھے جن کی تنخواہ انجمن اصلاح المسلمین کے ذمے تھی۔ ان میں سے تین معلموں کے نام مجھے یاد ہیں اور تینوں سے میرے دوستانہ مراسم تھے۔ ایک حافظ علی محمد تھے جو بچوں کو ناظرہ قرآن مجید اور اسلامیات کی ابتدائی کتابیں پڑھاتے تھے اور وہاں کی ایک مسجد کے امام بھی تھے۔ تقسیم ملک کے بعد وہ اپنے خاندان کے ساتھ اسی گاؤں (چک نمبر ۵۳ گ ب ڈھیسیاں منصور پور) میں مقیم ہوئے، جہاں ہم لوگوں نے سکونت اختیار کی۔ دوسرے معلم مولوی محمد یحییٰ تھے جو منڈی عثمان والا (تحصیل چونیاں ضلع قصور) کے رہنے والے تھے اور تیسرے تھے محمد اسماعیل۔ ان کا تعلق ضلع فیروز پور کی تحصیل زیرہ کے ایک گاؤں سے تھا۔ یہ تینوں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے شاگرد تھے۔ تینوں کا تقرر

مولانا ممدوح کے کہنے سے ہوا تھا اور تینوں وفات پا گئے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

محمد اسماعیل قیامِ پاکستان سے کئی سال پہلے عین عالم جوانی میں فوت ہو گئے تھے۔ صالح اور ذہین نوجوان تھے۔ چوتھے معلم کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔

میرے بھائی محمد حسین نے اسی اسلامیہ پرائمری سکول سے پرائمری پاس کی تھی اور اس زمانے میں چار جماعتوں کو پرائمری کہا جاتا تھا۔ اس وقت اس کی عمر گیارہ سال تھی۔

تقسیم ملک کے بعد ہم لوگ پاکستان کے ضلع لائل پور میں آئے تو اسے جڑاں والا کے ایک سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ لیکن اس سے تھوڑا عرصہ بعد میں لاہور آیا تو اسے بھی اپنے ساتھ لاہور لے آیا۔ اس کا ہم جماعت ہمارا ایک عزیز عبدالقدوس بھی لاہور آ گیا تھا۔ دونوں میرے پاس رہتے تھے۔ یہاں انھیں ایک پرائیویٹ سکول میں داخل کرا دیا گیا تھا۔ میٹرک کے امتحان میں کامیابی کے بعد محمد حسین میرے پاس ہی رہا۔

اس سے کچھ عرصے بعد محمد حسین نے ادیب عالم کا اور پھر ادیب فاضل کا امتحان دیا۔ اس زمانے میں وائی ایم سی اے ہال میں اکاؤنٹینسی سکھائی جاتی تھی۔ یہ نو یا دس مہینے کا کورس تھا۔ محمد حسین نے یہ کورس بھی پاس کیا۔ بعد ازاں کچھ عرصہ پرائیویٹ ملازمت بھی کی۔ اس وقت تھوڑی بہت کوشش سے سرکاری ملازمت مل جاتی تھی۔ چناں چہ محکمہ تعلیم میں اس کی کچھ صورت پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن وہ اس پر آمادہ نہ ہوا، اس لیے کہ ہمارے ایک عزیز کے کہنے پر ہم چار حصے داروں نے مساوی رقم سے دو نئے ٹرک خرید لیے تھے۔ محمد حسین اب اس کاروبار سے وابستہ ہوگیا اور ٹرک چلانے لگا۔ کئی سال پشاور سے کراچی اور واہگہ سے کوئٹہ تک اس کے ٹرک کے پہیے گھومتے رہے۔ کچھ عرصہ اس نے اپنے ایک دوست عزیز حیدری کے ساتھ مل کر حضرو (موجودہ خیبر پختون خوا) کے علاقے میں تجارت بھی کی۔ دو سال کے قریب اس نے ٹریکٹر بھی چلایا۔ اس وقت اس کے ایک دوست جن کا نام غالباً ملک منظور احمد تھا، فیصل آباد کے ایس پی تھے اور ضلع مظفر گڑھ کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے اس کو مظفر گڑھ بھیج دیا۔ وہ کئی مہینے وہاں ایس پی کی زمینوں میں ٹریکٹر چلاتا رہا۔ ایس پی صاحب سے اس کے مراسم ایک پیر صاحب کی وساطت سے ہوئے تھے جو ہمارے گاؤں کے قریب چک نمبر ۴۲ گ ب کے رہنے والے تھے۔ ان کا نام شاہ محمد تھا اور ارائیں برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ پیر صاحب پکے بریلوی تھے اور محمد حسین کٹر اہل حدیث، لیکن دونوں کے باہم بہت اچھے تعلقات تھے۔ مظفر گڑھ کے زمانہ قیام میں ایک مرتبہ ڈھائی تین مہینے تک محمد حسین کے متعلق ہمیں کوئی اطلاع نہ ملی۔ ایس پی ملک منظور احمد کا بھی فیصل آباد سے کہیں تبادلہ ہوگیا۔ میں گاؤں گیا تو گھر کے سب لوگ پریشان۔ میرے گاؤں کے ایک دوست حاجی محمد رفیق زبیدی پیر صاحب سے تعلق رکھتے تھے۔ ہم دونوں محمد حسین کا پتا معلوم کرنے کے لیے

پیر صاحب کے گھر پہنچے۔ پیر صاحب کا بہت بڑا ڈیرا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ مریدوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ پیر صاحب سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن وہ مجھے غائبانہ طور پر جانتے تھے۔ حاجی محمد رفیق زبیدی نے میرا نام لے کر انھیں پیغام بھجوایا تو وہ فوراً مریدوں کے جھرمٹ سے اٹھ کر ننگے پاؤں باہر آئے اور جھک کر میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا، حالاں کہ وہ مجھ سے عمر میں کافی بڑے تھے اور ان کے مرید بھی وہاں موجود تھے۔

پیر صاحب کا ڈیرا یا پیر خانہ جڑاں والا فیصل آباد روڈ پر دائیں جانب سیم نہر کے کنارے تھا۔ ہم گیارہ بجے کے قریب وہاں پہنچے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹا وہاں رہے۔ وہ بے حد احترام سے پیش آئے۔ کھانا کھلایا، چائے پلائی اور محمد حسین کا مظفر گڑھ کا ڈاک کا پتا دیا۔ یہ ان پیر صاحب سے میری پہلی اور آخری ملاقات تھی۔

میرا بھائی محمد حسین کچھ سخت مزاج تھا اور بعض اوقات اپنے متعلق کوئی بات برداشت کرنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا تھا۔ ایک دفعہ سیم نہر کے ایک افسر نے (جس کا دفتر جڑاں والا میں تھا اور وہ علم و ادب سے دلچسپی رکھتا تھا اور محمد حسین سے اس کے بے تکلفانہ مراسم تھے) مجھے بتایا کہ محمد حسین ایک روز نہر کی پٹری پر ٹریکٹر لے کر آ رہا تھا کہ نہر کے ایک ملازم نے اسے روکا اور کہا کل ہمارا افسر دورے پر آ رہا ہے۔ اس لیے ہم پٹری صاف کر رہے ہیں۔ تم کل یہاں آئے تو تمھیں پکڑ لیا جائے گا۔ یہ الفاظ اس نے سخت لہجے میں کہے۔ شام کا وقت تھا۔ محمد حسین تھوڑا سا آگے جا کر رک گیا۔ ملازم چلا گیا تو اس نے صاف شدہ پٹری پر ٹریکٹر سے ہل چلا دیا اور پٹری میں جگہ جگہ گڑھے پڑ گئے۔ پھر یہ کارروائی کر کے جڑاں والا آ کر اسے بتایا کہ میں یہ نیک کام کر آیا ہوں۔ اس نے صبح صبح جا کر مزدوروں سے (جنھیں وہ اپنی بولی میں بیل دار کہتے ہیں) پٹری صاف کرائی۔ اس اہل کار نے مجھے کہا محمد حسین نے یہ مہربانی کی مجھے بتا دیا کہ میں غصے میں یہ کارنامہ سرانجام دے آیا ہوں، تم اپنے افسر اعلیٰ کے آنے سے پہلے اسے صاف کرا لو۔ اگر یہ بتاتا اور ہمارا افسر اکھڑی ہوئی پٹری دیکھتا تو ہماری شامت آ جاتی۔

ٹریکٹر کے سلسلے کا ایک واقعہ اور سنیے جو دسمبر ۱۹۶۴ء میں پیش آیا۔

ایک دفعہ معمول کے مطابق میں گاؤں گیا۔ جڑاں والا جا کر بس سے اترا تو ہمارے بہنوئی عبدالشکور نمبر دار سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ملتے ہی کہا محمد حسین بالکل ٹھیک ہے، اسے کوئی چوٹ نہیں آئی۔ ''چوٹ'' کا لفظ سن کر میں پریشان ہو گیا اور پوچھا چوٹ کا کیا مطلب؟ عبدالشکور نمبر دار نے بتایا کہ کل اس کا ٹریکٹر الٹ گیا تھا، لیکن وہ محفوظ رہا۔ میں نے خیال کیا کہ تمھیں اس واقعہ کی اطلاع پہنچ گئی ہے اور تم اس کا پتا کرنے آئے ہو، اسی لیے میں نے کہا ہے کہ وہ خیریت سے ہے۔

میں گاؤں پہنچا تو محمد حسین دھوپ میں لیٹا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر بیٹھ گیا اور بتایا کہ ذرا سا دباؤ ہے، ویسے

میں خیریت سے ہوں۔ اللہ نے مہربانی فرمائی کہ بچ گیا۔

میں نے پوچھا کسی ڈاکٹر سے چیک کرایا؟ اس نے نفی میں جواب دیا تو میں اسی وقت اسے جڑاں والا کے سرکاری اسپتال لے گیا تاکہ ڈاکٹر سے چیک اپ کرایا جائے۔ مقصد محض تسلی کرنا تھا۔ اسپتال جاتے ہی ہماری ملاقات حاجی محمد امین صاحب سے ہوئی جو اس وقت وہاں ڈسپنسر تھے اور ان کا تعلق ضلع فیصل آباد کی تحصیل تاندلیاں والا کے ایک گاؤں جھوک خیالی سے تھا اور وہ ہمارے پرانے ملنے والے تھے۔ وہ بہت اچھی طرح ملے اور آمد کی وجہ پوچھی۔ میں نے وجہ بتائی تو کہا ڈاکٹر کو ضرور دکھانا چاہیے۔ ممکن ہے کوئی اندرونی چوٹ ہو۔ اس قسم کی چوٹ فوری طور پر محسوس نہیں ہوتی، بعد میں تکلیف دیتی ہے۔

طویل قامت، خوب صورت اور خوش لباس ڈاکٹر صاحب کرسی پر تشریف فرما تھے اور مریض ان کے سامنے بنچوں پر بیٹھے تھے۔ ہم بھی دونوں بھائی مریضوں کے ساتھ بنچ پر بیٹھ گئے۔ ازراہِ کرم ہمارے دوست حاجی محمد امین صاحب ہمارے قریب کھڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب مریضوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے رویے سے مجھے ایسا معلوم ہوا کہ بہت خوش مزاج ڈاکٹر ہیں۔ ہماری باری آئی تو میں نے کھڑے ہو کر بڑے ادب سے ڈاکٹر صاحب سے عرض کیا کہ ہم فلاں گاؤں سے آئے ہیں۔ میرا یہ بھائی ٹریکٹر چلا رہا تھا کہ ٹریکٹر الٹ گیا۔ یہ کچھ دباؤ سا محسوس کر رہا ہے۔ مہربانی فرما کر آپ اسے چیک فرمالیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کی طرف دیکھا اور روکھی زبان سے فرمایا اسے چیک ویک کرنے کی ضرورت نہیں، یہ بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے دوبارہ عرض کیا کہ ہماری تسلی ہو جائے گی، آپ ذرا ملاحظہ فرمالیجیے۔ امین صاحب نے بھی ان سے کہا کہ دیکھ لیتے تو انھیں اطمینان ہو جاتا۔ چار پانچ دفعہ میں نے خوشامدانہ لہجے میں ڈاکٹر صاحب سے عرض کیا، امین صاحب نے بھی، جس انداز سے وہ اپنے باس سے کہہ سکتے تھے، دو تین دفعہ کہا، لیکن ڈاکٹر صاحب یہی فرماتے رہے کہ یہ بالکل ٹھیک ہے، اسے دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہم دونوں نے اس زمانے کے دیہاتی کلچر کے مطابق سفید تہبند باندھے اور سوت کے بنے ہوئے کھیس اوڑھے ہوئے تھے۔

امین صاحب نے آہستہ سے کہا مجھے افسوس ہے، ڈاکٹر صاحب نے نہ میری بات مانی نہ آپ کی۔ اب وہاں بیٹھنا اور ڈاکٹر صاحب سے اس سلسلے میں کچھ کہنا بے کار تھا۔ ہم دونوں بھائی بنچ سے اٹھے اور چلتے ہوئے میں نے ڈاکٹر سے بے حد نرم لہجے میں پنجابی میں عرض کیا: ''ڈاکٹر صاب اب پرسوں ان شاء اللہ آپ سے لاہور ملاقات ہو گی۔''

ڈاکٹر نے میری اس بات کا کیا مطلب لیا اور یہ الفاظ سن کر ان کے چہرے پر کیا تاثرات ابھرے؟ اس کا مجھے علم نہیں۔ میں نے پیچھے کو گردن گھما کر ان کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ سیدھا جڑاں والا کی غلہ منڈی میں

ایک گڈس ٹرانسپورٹ کمپنی کے اڈے پر آیا، جس سے میرا تعلق تھا۔ میں اس زمانے میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' کا ایڈیٹر تھا اور روزنامہ ''امروز'' میں (جو اس دور کا بہت بڑا اخبار تھا) ہفتے میں دو دن (اتوار اور جمعے کو) مضمون لکھا کرتا تھا۔ ٹرکوں کے اڈے سے میں نے ''امروز'' کے ایڈیٹر کو ٹیلی فون کیا اور اسپتال میں میرے ساتھ جو کچھ بیتی تھی، اس کا تذکرہ کیا۔ یہ ایک خبر تھی جو دوسرے دن اخبار میں چھپ گئی۔ اس وقت پنجاب کے محکمہ صحت کے سیکرٹری ڈاکٹر طوسی تھے جو بہت ذمہ دار افسر تھے اور میرے ساتھ ان کے کچھ مراسم بھی تھے۔ انھوں نے اخبار پڑھتے ہی ڈاکٹر صاحب کو طلب کر لیا۔

تیسرے دن گیارہ بجے میں اپنے اخبار ''الاعتصام'' کے دفتر میں بیٹھا اداریہ لکھ رہا تھا کہ مولانا محمد اسحاق چیمہ کے ساتھ ڈاکٹر صاحب میرے دفتر پہنچ گئے، اتفاقاً یہ وہی وقت تھا، جس وقت دو دن پہلے میں ڈاکٹر کے کمرے سے نکلا تھا۔ مولانا محمد اسحاق چیمہ لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کے رہنے والے تھے اور میرے بے تکلف دوست تھے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے پنجابی میں کہا: ''اوئے توں سانوں کس مصیبت وچ پا دتا اے'' (او تم نے ہمیں کس مصیبت میں ڈال دیا ہے۔)

میں نے عرض کیا: جناب! میں تو آپ کو کسی قسم کی مصیبت میں ڈالنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

فرمایا: اخبار میں کیا چھپوا دیا ہے؟

عرض کیا: اخبار میں کوئی ایسی بات نہیں چھپی جو خلافِ واقعہ ہو۔ جو کچھ میرے ساتھ بیتی وہی چند الفاظ میں اخبار میں آ گئی۔ ڈاکٹر صاحب تشریف فرما ہیں۔ اگر کوئی غلط بات چھپ گئی ہے تو میں ابھی آپ کے سامنے ان سے معافی مانگ لیتا ہوں۔

چیمہ صاحب نے فرمایا: ڈاکٹر صاحب تحصیل سمندری کے فلاں گاؤں سے تعلق رکھتے ہیں اور اہلِ حدیث ہیں۔ یہ میرے پاس پہنچے اور واقعہ بیان کیا۔

میں نے عرض کیا: اگر یہ اہلِ حدیث ہیں تو معاملے کی سنگینی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ہمارے ساتھ انھوں نے جو برتاؤ کیا، وہ کس حدیث کے مطابق کیا؟

انھوں نے کہا: تم ڈاکٹر سے اپنا تعارف کراتے اور بتاتے کہ میں فلاں آدمی ہوں۔

میں نے کہا: مجھے اپنا تعارف کرانے کی کیا ضرورت تھی۔ بیمار کی بیماری ہی معالج سے تعارف کا اصل ذریعہ ہے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کو سوچنا چاہیے تھا۔

یہ مجھے معلوم نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کو میرے اور چیمہ صاحب کے دوستانہ تعلقات کا کیسے پتا چلا؟ ممکن ہے میرے اسپتال سے آنے کے بعد ان کو حاجی محمد امین صاحب نے میرے بارے میں کچھ بتایا ہو۔ اندازہ

فرمایے، اس زمانے میں اخبار میں کسی بات کے چھپنے کی کتنی اہمیت تھی اور اس وقت کے افسر کتنے ذمے دار تھے کہ کوئی شکایت ہوتی تو اس کا فوراً ایکشن لیتے۔ ڈاکٹر صاحب کا اسی دن جڑاں والا سے کسی اور جگہ تبادلہ ہو گیا تھا۔

یہ واقعہ اپنے بھائی محمد حسین بھٹی سے متعلق لکھتے ہوئے ذہن میں آیا اور بیان کر دیا گیا۔ زمانے کے رنگ دیکھیے کہ محمد حسین فوت ہوا تو اسی اسپتال کے متعدد افراد اس کے جنازے میں شامل تھے اور جو شامل نہیں ہو سکے، وہ بعد میں تعزیت کے لیے ہمارے گھر پہنچے۔ اسی اسپتال میں میرا چھوٹا بھائی حکیم حامد محمود بہ حیثیت سرکاری طبیب خدمات سرانجام دے رہا ہے۔

اب محمد حسین کے بارے میں چند باتیں اور سنیے......!

۱۹۵۸ء کے آغاز میں میں نے سہ روزہ اخبار ''منہاج'' جاری کیا۔ اس اخبار سے مرحوم قاضی محمد اسلم سیف فیروز پوری کا بھی تعلق تھا۔ تیرہ چودہ مہینے یہ اخبار جاری رہا۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں ایوب خاں نے ملک میں مارشل لا جاری کر کے صحافت پر ایسی پابندیاں عائد کر دی تھیں کہ نئے اخبارات بہت سی مشکلات میں پھنس گئے تھے۔ ''منہاج'' کا شمار بھی انہی اخبارات میں ہوتا تھا۔ اخیر اپریل ۱۹۵۹ء میں ہمیں ''منہاج'' بند کرنا پڑا۔ قاضی محمد اسلم سیف اور محمد حسین نے اس اخبار کے لیے بڑی محنت کی۔ دفتر میں یہ دونوں اکٹھے رہتے تھے اور اس زندگی پر بڑے خوش تھے جو اس وقت گزار رہے تھے۔ قاضی صاحب تو ''منہاج'' میں لکھتے ہی تھے، لیکن محمد حسین کا قلم بھی کسی حد تک رواں ہو گیا تھا اور اس کے کئی مضامین ''منہاج'' میں شائع ہوئے تھے۔ اس دور کی بعض باتیں کبھی کبھی قاضی محمد اسلم سیف (مرحوم) خوش گوار لہجے میں سنایا کرتے تھے۔

نویں اور دسویں جماعت میں محمد حسین کے ہم جماعت لڑکوں میں احناف کے بریلوی مسلک کے متعدد لڑکے شامل تھے۔ اس زمانے میں حضرت مولانا اسماعیل شہید دہلوی کی مشہور تصنیف ''تقویۃ الایمان'' مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ادارہ اشاعۃ السنۃ کی طرف سے نئی نئی شائع ہوئی تھی، محمد حسین اس کا مطالعہ شوق اور اہتمام سے کرتا تھا۔ اس کے کہنے سے اس کے ہم جماعت لڑکے بھی اس کتاب کا مطالعہ کرنے لگے اور اس کے مندرجات سے متاثر ہوئے۔ بعض لڑکوں کے ورثا نے مسکراتے ہوئے، مجھے یہ بھی کہا کہ تمھارے بھائی نے ہمارے لڑکوں کو وہابی بنا دیا ہے اور وہ لڑکے اب ہمیں وہابی بنانے کی کوشش میں ہیں۔ اس زمانے میں ہم بھائی دروازے کے اندر نور محلے میں رہتے تھے اور محلے کے لوگوں سے ہمارے اچھے مراسم تھے۔

کہنا چاہیے کہ محمد حسین مسلک اہل حدیث کا خاموش مبلغ اور کتاب و سنت کے احکام کا سکوت پسند مقرر تھا۔

دار العلوم تقویۃ الاسلام کے طلبا میں سے ضلع فیصل آباد کی تحصیل سمندری کے چک نمبر ۴۷۹ گ ب کے خلیل اثری مرحوم اور چونیاں کے عبدالعلیم خاں منصور پوری سے محمد حسین کے خاص طور سے دوستانہ مراسم تھے۔ چک ۴۷۹ گ ب کے حکیم ثناء اللہ مرحوم اس وقت طبیہ کالج (لاہور) میں طب پڑھتے تھے اور دارالعلوم میں ان کی رہائش تھی۔ وہ بھی محمد حسین کے دوستوں کی فہرست میں شامل تھے۔ حافظ احمد شاکر سے بھی اس کا ہنسی مذاق کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی مرحوم و مغفور کے ملازم محمد عمر تبتی سے بھی اس کا میل جول تھا۔

فیصل آباد شہر کے علمائے دین میں سے مولانا محمد صدیق اور مولانا محمد اسحاق چیمہ میرے بھائی محمد حسین پر نگاہِ شفقت رکھتے تھے۔ ۱۹۶۳ء میں ضلع فیصل آباد کی جمعیت اہل حدیث کے صدارتی انتخاب میں مولانا محمد اسحاق چیمہ اور مولانا محمد صدیق ایک دوسرے کے مدِ مقابل تھے۔ میرا تعلق چوں کہ اسی ضلع سے ہے، اس لیے میں بھی ووٹر تھا اور میں نے مولانا محمد صدیق کے مقابلے میں مولانا محمد اسحاق چیمہ کی حمایت کی تھی اور چیمہ صاحب صدارتی انتخاب جیت گئے تھے۔ ان کی حمایت اور اپنی مخالفت کے سلسلے میں مولانا محمد صدیق کو مجھ سے دوستانہ شکوہ تھا۔ وہ بہت اچھے مقرر تھے، جب کہ چیمہ صاحب کو یہ مقام حاصل نہ تھا۔

مولانا محمد اسحاق چیمہ کی دور کی نظر کمزور تھی اور وہ عینک لگاتے تھے۔ مولانا محمد صدیق ازراہِ مزاح انھیں ”انھاں“ (اندھا) کہا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ ضلع فیصل آباد کے جماعتی جلسوں میں ضلع کی جماعت کا انھاں صدر چیمہ تقریر کیا کرے گا، محمد صدیق تقریر کے لیے کہیں نہیں جائے گا۔ اسی اثنا میں ایک مرتبہ ہمارے گاؤں کے لوگوں نے نمازِ عشا کے بعد تبلیغی جلسے کا اہتمام کیا، جس کے واحد مقرر مولانا محمد صدیق تھے۔ اشتہار چھپ گئے اور علاقے میں اعلان ہو گیا۔ لیکن مولانا محمد صدیق نے جلسے میں تشریف لانے اور تقریر کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا اپنے ضلع کے صدر چیمے کو بلاؤ، وہی تقریر کرے۔ بالآخر انھوں نے فرمایا کہ اسحاق بھٹی کے بھائی محمد حسین کو میرے پاس بھیجو۔ محمد حسین گیا تو اس سے میرے متعلق گلے شکوے کیے اور اس شرط پر آنے کا وعدہ کیا کہ لاہور سے مجھے بھی جلسے میں بلایا جائے۔ مجھے اطلاع ملی تو میں اس وقت گاؤں پہنچا جب مولانا محمد صدیق تقریر کر رہے تھے۔ ان کی سیاہ رنگ کی کار پنڈال کے باہر کھڑی تھی اور وہ اپنی عادت کے مطابق گلے میں پستول لٹکائے تقریر فرما رہے تھے۔ میں ایک کونے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ انھیں میری آمد کا پتا چلا تو بلند آواز سے ہنستے ہوئے کہا، دور کیوں کھڑے ہو، یہاں آؤ۔ پھر آگے بڑھ کر مجھ سے سٹیج پر معانقہ کیا اور لوگوں سے کہا میرے اس دوست نے مجھے شکست دلانے میں کوشش کی۔ میں اس گاؤں میں اس کے لیے نہیں آیا، اس کے چھوٹے بھائی کے کہنے سے آیا ہوں اور اس شرط پر آیا ہوں کہ یہ میرا مخالف

دوست بھی لاہور سے جلسے میں آئے اور میری تقریر سنے۔

آہ! وہ سب لوگ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مولانا محمد صدیق نے ۱۲۔ ستمبر ۱۹۸۹ء کو وفات پائی اور اس سے تین سال چھ مہینے گیارہ دن بعد ۲۳۔ مارچ ۱۹۹۳ء کو مولانا محمد اسحاق چیمہ کا انتقال ہوا۔ ۲۷۔ اگست ۲۰۰۷ء کو میرا بھائی محمد حسین بھی چل بسا۔ رہے نام اللہ کا۔

مولانا محمد صدیق جرأت مند خطیب تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے، قیامِ پاکستان کے بعد پنجاب کے وہ اولیں عالم دین اور پہلے خطیب تھے، جنھوں نے کار خریدی اور وہ اپنی کار پر گلے میں پستول ڈال کر تقریر کے لیے جایا کرتے تھے۔ اور قیام پاکستان سے قبل متحدہ پنجاب میں بنگلہ فاضلکا کے مولانا عبداللہ اوڈ (امیر جماعت غرباے اہل حدیث پنجاب) واحد عالم دین تھے جن کے پاس کار بھی تھی اور پستول بھی تھا اور وہ پنجاب کا سفر اپنی کار پر کیا کرتے تھے۔ وہ اسی کار پر فاضلکا بنگلہ سے چل کر ہیڈ سلیمان کی کے راستے سے پاکستان میں داخل ہوئے تھے۔ اب تو پیسا عام ہے اور چھوٹا موٹا ہر عالم کار لیے پھرتا ہے، جس سے کار کی وقعت ختم ہو گئی ہے۔

میں اپنے بھائی محمد حسین بھٹی کی بات کر رہا تھا۔ درمیان میں اس سے تعلق رکھنے والے حضرات کا تذکرہ آ گیا۔ اسے میری مجبوری سمجھیے کہ بھائی کے متعلق جو اچھی بات ذہن میں آتی ہے بیان کر رہا ہوں......!

زندگی کے مختلف موڑ کاٹنے کے بعد محمد حسین نے جڑاں والا کی حسین شوگر مل میں ملازمت کر لی تھی۔ اس کا دوستانہ تعلق میاں غلام دست گیر باری سے تھا جو پنجاب مسلم لیگ کے سابق صدر اور پنجاب اسمبلی کے سابق رکن میاں عبدالباری کے فرزند گرامی ہیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے یہ ملازمت اس نے میاں غلام دست گیر کے کہنے پر کی تھی۔ وہ حسین شوگر مل میں بائلر انجینئر تھا اور اسی حیثیت سے اس کی ریٹائرمنٹ ہوئی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد قاعدے کے مطابق اسے پینشن ملتی تھی۔ مل کی طرف سے جڑاں والا میں اسے ایک پلاٹ بھی ملا تھا۔ سنا ہے ایشیا کی یہ بہت بڑی شوگر مل ہے۔

یہاں ایک لطیفہ بھی سنتے جائیے۔ گزشتہ سطور میں حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے ملازم محمد عمر تبتی کا ذکر ہوا ہے کہ لاہور کے زمانۂ قیام میں محمد حسین سے اس کے دوستانہ تعلقات تھے۔ ایک دن محمد عمر نے مجھ سے پوچھا: ''محمد حسین کیا کام کرتا ہے؟'' میں نے اسے بتایا کہ وہ جڑاں والا کی حسین شوگر مل میں کام کرتا ہے۔ محمد عمر نے کہا اچھا تو اس نے ٹریکٹر بیچ کر شوگر مل بنا لی ہے۔ یعنی ''حسین'' کے لفظ سے وہ سمجھا کہ یہ شوگر مل محمد حسین کی ہے۔ اور ٹریکٹر بیچ کر بنائی گئی ہے۔ محمد عمر تبتی کا یہ لطیفہ میں نے کئی دوستوں کو سنایا۔ وہ بڑا دلچسپ آدمی تھا۔ محمد عمر کی وفات پر چھبیس ستائیس سال کا عرصہ بیت چکا ہے۔ میں نے اس کا تذکرہ اپنی کتاب ''نقوش عظمت رفتہ'' میں اس مضمون کے مختلف مقامات میں کیا ہے جو مولانا سید محمد داؤد غزنوی پر لکھا گیا ہے۔

میاں غلام دست گیر باری کے ساتھ تو محمد حسین کے تعلقات تھے ہی، ان کے والد گرامی میاں عبدالباری مرحوم بھی اس پر شفقت فرماتے تھے۔ وہ کسی سلسلے میں لاہور آتے تو بعض اوقات محمد حسین کو بھی اپنے ساتھ لے آتے تھے۔ میاں غلام دست گیر بھی جڑاں والا سے لاہور آتے تو کبھی کبھی محمد حسین ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ مسلکی اعتبار سے میاں عبدالباری کے خاندان کا تعلق ''بریلویت'' سے ہے۔ محمد حسین نے کئی دفعہ مجھے بتایا کہ میاں غلام دست گیر بالعموم جمعرات کو لاہور حضرت علی ہجویری رحمہ اللہ کے مزار پر آتے اور صبح تک وہاں رہتے ہیں۔ لیکن محمد حسین اپنے عقیدۂ اہل حدیثیت میں کہنا چاہتے کہ بے حد متشدد تھا۔ ان میں سے کبھی کسی نے کسی کے مسلک کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ ایک یا دو دفعہ میاں غلام دست گیر باری میرے بھائی محمد حسین کے ساتھ میرے غریب خانے پر سانده بھی تشریف لائے۔

ایک مرتبہ میرے ایک عزیز نے اپنے ایک اہم کام کے سلسلے میں مجھے کہا کہ یہ کام فلاں سرکاری افسر کی سفارش پر ہوسکتا ہے، لیکن اس کی صورت یہ ہے کہ اس افسر کو معاملے کی اہمیت اور نوعیت سے میاں غلام دست گیر آگاہ کریں، اور یہ کام کل ہی ہونا چاہیے۔ اس وقت دن کے تین بجے تھے اور سردیوں کا موسم تھا۔ میں نے اسی وقت جڑاں والا میں میاں غلام دست گیر کو بھی ٹیلی فون کیا اور گاؤں میں محمد حسین کو بھی اطلاع دی۔ دونوں صبح آٹھ بجے میرے اس وقت کے دفتر ادارہ ثقافت اسلامیہ (کلب روڈ) پہنچ گئے۔ وہ دوست بھی آ گئے، جن کا کام تھا۔ انھوں نے معاملے کی نوعیت میاں غلام دست گیر کو بتائی۔ میاں صاحب نے چائے کی پیالی پی اور اسی وقت گاڑی میں بٹھا کر انھیں ان صاحب کے پاس لے گئے، جن سے ملنا مقصود تھا۔

میاں غلام دست گیر محمد حسین کے جنازے میں شریک تھے۔ قبر پر دعا کے بعد لوگ واپس آ گئے۔ میاں غلام دست گیر وہیں بیٹھ گئے۔ محمد حسین کے بیٹے ناصر محمود نے ان سے کہا تایا جی اب آپ گھر چلیں اور کھانا کھائیں۔ میاں صاحب نے جواب دیا تم جاؤ۔ یہ میرا دوست تھا۔ میں کچھ دیر یہاں بیٹھ کر آؤں گا۔

واقعہ یہ ہے کہ محمد حسین نے ان کے ساتھ خوب یارانہ نبھاہا۔ ہر انتخاب میں اس نے ان کی مدد کی۔ ۲۰۰۲ء میں میاں غلام دست گیر باری کے بیٹے حیدر باری نے ق لیگ کے ٹکٹ پر ہمارے حلقے سے الیکشن لڑا تو محمد حسین اس کا سرگرم معاون تھا۔ میاں صاحب کے غالباً دو بیٹے ہیں۔ ایک قادر باری ایڈووکیٹ اور دوسرا حیدر باری سابق ایم پی اے۔ حیدر باری سے میری جان پہچان نہیں ہے، البتہ قادر باری کی ادارہ ثقافت اسلامیہ میں میرے پاس آمد و رفت رہی۔ قادر باری جب لاہور میں تعلیم حاصل کرتے تھے، اس زمانے میں ایک مرتبہ میاں غلام دست گیر نے مجھے خط لکھا تھا کہ قادر باری تمھارا بھتیجا ہے۔ تمھارے پاس آیا کرے گا اس کی عملی تربیت کرو۔

میاں غلام دست گیر کی ایک بیٹی کی شادی مرکزی جمعیت اہل حدیث کے اولیں ناظم مالیات میاں عبدالمجید کے بڑے بیٹے میاں عبدالوحید کے فرزند اور دار الدعوۃ السّلفیہ (لاہور) کے بنیادی رکن میاں عبدالمعید کے بھتیجے سے ہوئی۔ افسوس ہے میاں عبدالمجید اور ان کے بیٹے میاں عبدالوحید اور میاں عبدالمعید سب وفات پا گئے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

محمد حسین بھٹی صاف گو آدمی تھا۔ بعد میں اس کی تنخواہ بڑھ گئی تھی، لیکن کسی زمانے میں شوگر مل سے جو ماہانہ تنخواہ اسے ملتی تھی، اسے مہینے کے تیس دنوں پر تقسیم کیا جائے تو روزانہ کے حساب سے ایک سو ستر روپے کچھ آنے بنتے تھے۔ کوئی شخص اس سے کسی بڑے آدمی سے کام کے سلسلے میں کہتا تو وہ جواب دیتا کہ میں ایک سو ستر روپے اتنے آنے کا مزدور ہوں، وہ بڑا آدمی ہے، اول تو وہ مجھ سے ملے گا نہیں، اگر ملے گا تو میری بات نہیں سنے گا۔ اگر سنے گا تو اس پر عمل نہیں کرے گا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ تقریباً چالیس سال قبل ایک سو ستر روپے روزانہ آمدنی بہت مناسب تھی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ کسی سے کہہ کر کام بھی کرا دیتا تھا۔

وہ کسی ذہنی، جسمانی یا مالی پریشانی میں مبتلا ہوتا تو اس کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ پوچھنے پر ہمیشہ یہی کہتا کہ اللہ کا شکر ہے بالکل ٹھیک ہوں۔ خود میرا تجربہ بھی اس کے متعلق یہی ہے اور اس سے ملنے والوں نے بھی مجھے یہی بتایا۔ وہ کسی کی غیبت نہیں کرتا تھا۔ کسی کے متعلق کوئی بات ہوتی تو صاف لفظوں میں اس کے سامنے کہہ دیتا۔ پھر خاموشی اختیار کر لیتا۔ وہ نماز با جماعت کا پابند تھا۔ اگر چہ کیسے ہی کام میں مصروف ہوتا، جوں ہی کان میں اذان کی آواز پڑتی سب کام چھوڑ چھاڑ کر مسجد کو روانہ ہو جاتا۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ مسجد میں آ کر باتیں کرتے اور کسی نہ کسی طرح لوگوں پر ظاہر کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ مسجد میں تشریف لائے ہیں، لیکن محمد حسین چپکے سے مسجد میں آتا اور نماز پڑھ کر واپس چلا جاتا۔ جنازوں میں بھی وہ اسی طرح شامل ہوتا تھا۔

محمد حسین کی وفات کے بعد اس کے بعض دوستوں نے اس کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے بیان کیا کہ کہیں کسی چھوٹے بڑے سفر پر اس کے ساتھ جانے کا اتفاق ہوتا تو اپنے رفقائے سفر کا کرایہ وغیرہ وہ خود ہی ادا کرتا تھا۔ مل میں عام طور پر اپنے دوستوں کو اپنی گرہ سے چائے پلاتا۔

وہ کسی سے ادھار نہیں لیتا تھا۔ اپنے آپ کو اپنی مالی حد کے اندر محدود رکھتا تھا۔ دکان سے سودا سلف نقد لیتا تھا، ادھار سے اس کو نفرت تھی۔ اس نے کبھی کسی کھانے میں نقص نہیں نکالا اور کبھی کسی خاص قسم کے کھانے کا مطالبہ نہیں کیا، جو مل گیا کھا لیا۔ وہ وعدے کا پکا تھا، جو کسی سے وعدہ کیا اس پر پورا اترا۔

اس کی مالی حالت اس کی حیثیت کے مطابق بہت اچھی تھی۔ دو ٹرکوں میں اس کا اچھا خاصا حصہ تھا۔ مل کی طرف سے بھی پینشن ملتی تھی۔ ۲۰۰۷ء کے ماہِ رمضان سے قبل بیوی، بیٹے، لڑکی اور داماد کے ساتھ اس کا

عمرے پر جانے کا پروگرام تھا۔ پاسپورٹ بن گئے تھے اور ویزے لگ گئے تھے۔ ان سب افراد کے اخراجات اس نے خود ہی ادا کرنا تھے۔ لیکن عمرے پر جانے کے بجائے وہ اللہ کے دربار میں پہنچ گیا۔

جا اوئے یار حوالے رب دے میلے چار دناں دے
اس دن عید مبارک ہوسی جس دن پھر ملاں گے

اس کی پنشن اب اس کی بیوہ کو ملتی ہے اور دو لڑکوں کے حصے کی بھی وہی مالک ہے۔

اس کی پہلی شادی اپریل ۱۹۵۹ء کو جڑاں والا میں ہمارے ایک عزیز میاں محمد زکریا (مرحوم) کی ہمشیرہ سے ہوئی تھی۔ شادی کے وقت وہ میرے پاس لاہور میں تھا اور اس کی شادی میں نے ہی کی تھی۔ شادی پر جو کچھ خرچ ہوا، میں نے کیا۔ دلہن کے لیے دس تولے سونے کے زیور بنائے۔ ۲۳۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کو اس بی بی سے ایک بیٹا پیدا ہوا، جس کا نام میں نے ناصر محمود رکھا۔ اس کی ولادت پر ہمیں نہایت خوشی ہوئی تھی۔ تمام گاؤں میں بتاشے بانٹے گئے اور سات دن کے بعد گائے ذبح کر کے عقیقہ کیا گیا۔ تھوڑے عرصے کے بعد ناصر محمود کی نیک بخت والدہ وفات پا گئی۔ اس کی پرورش اور دیکھ بھال کی ذمہ داری ہماری والدہ کے سپرد ہوئی۔ کچھ بڑا ہوا تو سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ اس نے پرائمری پاس کی تو میں اسے لاہور لے آیا۔ یہاں اس نے ایک سکول سے میٹرک پاس کیا اور پھر راوی روڈ کے گورنمنٹ کالج سے ایف اے تک پڑھا۔ پھر پرائیویٹ طور پر بی اے کا امتحان دیا۔ اس کالج کے پرنسپل کا نام ناصر محمود تھا اور وہ میرے ملنے والے تھے۔ ناصر کے کالج چھوڑنے کے بعد انھوں نے کئی دفعہ مجھ سے اس کے بارے میں پوچھا۔ عصری تعلیم کے بعد وہ پہلے کراچی گیا اور جامعہ ابوبکر الاسلامیہ میں داخل ہوا۔ پھر دار الحدیث جلال پور پیر والا (ضلع ملتان) چلا گیا اور وہاں کے اساتذہ کرام سے دینیات کی تعلیم میں مشغول ہو گیا۔

تعلیم کے دوران ہی میں (یا اس کے بعد) ناصر محمود کا تعلق جماعۃ الدعوۃ سے ہو گیا اور اس جماعت کی طرف سے اس نے جہادِ افغانستان میں حصہ لیا۔ اس پر کچھ عرصہ گزرا تھا کہ اس کی شادی فیصل آباد کے رہنے والے جماعۃ الدعوۃ کے مشہور رکن اور اس کے ناظم مالیات حاجی محمد اشرف صاحب کی دختر نیک اختر سے ہو گئی۔ اب ناصر محمود (جو اپنے حلقۂ احباب میں سلطان ناصر کے نام سے متعارف ہے) ماشاء اللہ صاحب اولاد ہو گیا تھا اور میرا بے حد احترام کرتا تھا۔ میں نے پہلے محمد حسین اور پھر اس کے بیٹے ناصر محمود کی تعلیم و تربیت میں انتہائی دلچسپی لی۔ سلطان ناصر کی بیوی نیک خاندان کی شریف اور نیک بچی ہے۔ اس نے اپنے سسر اور اس کی عیادت کے لیے آنے جانے والوں کی بے حد خدمت کی۔ اس کا نام راشدہ ہے اور وہ واقعی راشدہ ہے یعنی اسم بامسمیٰ۔

ناصر کی والدہ کی وفات کے بعد محمد حسین کی دوسری شادی چک ۳۶ میں ہمارے عزیزوں میں ایک شخص نور محمد کی بیٹی سے ہوئی۔ اس سے ایک لڑکا پیدا ہوا اور ایک لڑکی۔ لڑکے کا نام یاسر تھا۔ اس نے سرکاری سکول میں مڈل پاس کیا۔ پھر محمد حسین نے اسے حفظ قرآن پر لگا دیا اور جڑاں والا کے حفظ قرآن کے ایک مدرسے میں اس نے قرآن مجید یاد کرنا شروع کیا۔ مدرسے میں اس بچے کے لیے محمد حسین صبح و شام خود کھانا لے کر جاتا تھا۔ محمد حسین نے اس سلسلے میں بڑی محنت کی۔ اس بچے نے ایک قاری صاحب سے قرآن مجید یاد کیا، حفظ قرآن کے دوران میں رمضان شریف میں پہلی مرتبہ اس نے میرے کہنے سے ہمارے گھر (لاہور) تراویح میں قرآن مجید سنایا۔ اس وقت اس نے پندرہ سولہ پارے یاد کیے تھے۔ ہم لوگ اس کے حسن قرأت سے نہایت خوش ہوئے۔

حفظ قرآن کے بعد دینیات کی تعلیم کے لیے محمد حسین نے یاسر کو اوڈاں والا (ضلع فیصل آباد) کے دار العلوم تقویۃ الاسلام میں داخل کرا دیا تھا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد میرا ارادہ اسے تحریر و تحقیق کی راہ پر لگانے کا تھا۔ لیکن اس کی وابستگی جہادی تنظیم (جماعۃ الدعوۃ) سے ہو گئی تھی اور وہ بغیر کسی کو بتائے اوڈاں والا سے اس تنظیم کی جہادی تربیت گاہ میں مظفر آباد (آزاد کشمیر) پہنچ گیا اور اٹھارہ سال کی عمر میں جام شہادت نوش کر گیا۔ وہ لمبے قد کا صحت مند نوجوان تھا۔ اللہ کا مال تھا، اللہ لے گیا۔ یہ دنیا عارضی ہے۔ ہم نے بھی آخر موت ہی کی وادی میں جانا ہے۔ قرآن نے بالکل صحیح فرمایا۔ کل من علیھا فان...... انا اللہ و انا الیہ راجعون۔

محمد حسین کی بیٹی کی شادی چونیاں کے قریب موضع ''ٹبیاں'' میں ہمارے عزیزوں میں ہوئی۔ وہ بیٹی ما شاء اللہ بچوں والی ہے۔

محمد حسین، حسین شوگر مل کی ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد اپنے گاؤں (چک نمبر ۵۳ گ ب منصور پور ڈھیسیاں) میں سکونت پذیر تھا۔ اس کی عام صحت ہمیشہ اچھی رہی۔ لیکن کچھ عرصہ قبل بیمار ہو گیا تھا۔ ناصر اپنے باپ کا فرماں بردار اور خدمت گزار بیٹا تھا۔ وہ فیصل آباد رہتا تھا۔ اسے پتا چلا تو باپ کو فیصل آباد لے گیا اور الائیڈ اسپتال میں داخل کرا دیا۔ اللہ نے صحت عطا فرمائی۔ اب وہ ناصر کے پاس فیصل آباد میں تھا کہ وفات پا گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

وفات بھی عجیب طرح ہوئی جو میرے خیال میں قابل رشک ہے۔ ۲۷۔ اگست ۲۰۰۷ء کو نماز عشا کے بعد اس کے پوتے پوتیاں یعنی ناصر محمود کے بچے اس کی چارپائی پر بیٹھے (اپنے دادا سے) باتیں کر رہے تھے۔ دادا بھی خوش اور پوتے پوتیاں بھی خوش۔ دس بج کر چند منٹ ہوئے تھے کہ ناصر نے ان سے کہا: ''ابا جی! اب

آپ سو جائیں۔'' کہا میں سو جاتا ہوں۔ تم بچوں کو سلا دو۔ ناصر بچوں کو اوپر مکان کی چھت پر لے گیا۔ انھیں چھوڑ کر دو تین منٹ کے بعد واپس آیا تو کہا: اب آپ سو جائیں...... جواب دیا: اچھا سو جاتا ہوں۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ۔ یہ آخری الفاظ تھے جو محمد حسین کی زبان سے نکلے۔ خود بخود ہاتھ پاؤں سیدھے ہو گئے۔ آنکھیں بند ہو گئیں اور میرا بھائی محمد حسین ہمیشہ کے لیے سو گیا۔ یہ شب کے ٹھیک سوا دس بجے کا وقت تھا۔ اللھم اغفر لہ و ارحمہ و عافہ و اعف عنہ۔

ناصر محمود نے اسی وقت بذریعہ ٹیلی فون لوگوں کو اطلاع دینا شروع کر دی۔ سب سے پہلے دس بج کر پچیس منٹ پر ہمیں اطلاع ہوئی۔ چھوٹے بھائی کی موت کی اطلاع سے جو اثرات ذہن پر طاری ہوئے، انھیں لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ان اثرات کے آثار اب تک سطح قلب پر مرتسم ہیں، بلکہ مستقبل کے متعلق بعض معاملات ذہن میں آئے تو وہ آثار مزید نمایاں ہونے لگے۔

ہمارے گھر کے غم زدہ افراد کا قافلہ رات کے دو بجے لاہور سے روانہ ہوا۔ میرا کسی سے بات کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا اور نہ کسی سے میں نے کوئی بات کی۔ بلکہ ہم میں سے کوئی بھی کسی سے ہم کلام نہیں ہوا۔ گاڑی میں خاموشی چھائی رہی۔ ''کھرڑیاں والا'' پہنچے تو فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ وہیں جڑاں والا جانے والی سڑک کے بائیں جانب مسجد میں نماز پڑھی اور پانچ بجے ہماری گاڑی گھر پہنچی۔ میرے بھائی کی میت فیصل آباد سے ایمبولینس کے ذریعے ہمارے جانے سے پہلے آ چکی تھی۔ میرا بھائی ہمارے وہاں جانے سے سات گھنٹے پہلے سوا دس بجے کلمہ طیبہ پڑھ کر سویا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ مجھے دیکھ کر احترام سے کھڑا ہو جاتا اور آگے بڑھ کر مجھے سلام کرتا، لیکن آج چارپائی پر آنکھیں بند کیے اور زبان پر خاموشی طاری کیے لیٹا ہوا تھا۔ میں نے اسے دیکھ کر کہا تم تو اپنے اہل و عیال سمیت عمرے کے لیے جا رہے تھے، تمھارے ویزے لگ چکے تھے، لیکن تم مکے اور مدینے کے بجائے کسی اور ہی طرف جا رہے ہو۔ اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ عمرے کا ویزا عارضی تھا، یہ پکا ویزا ہے۔ عمرے کے بعد وہاں سے نکل جانا ضروری تھا، لیکن اب تم جہاں جا رہے ہو، وہاں سے تمھیں کوئی نکال نہیں سکے گا۔ تم نے اپنے اس سفر پر روانہ ہوتے وقت کلمہ توحید پڑھا ہے اور یہ کلمہ ان شاء اللہ تمھارے لیے جنت میں داخلے کا ذریعہ ثابت ہو گا۔

محمد حسین کا جنازہ اس کی وفات سے پونے بارہ گھنٹے بعد ۲۸۔ اگست ۲۰۰۷ء کو دن کے دس بجے اٹھایا گیا۔ میں نے اس کے سرھانے کا دائیں جانب کا پایہ پکڑا۔ تین شخص اور تھے، جنھوں نے تین پائے پکڑے اور ہم چار آدمیوں نے چارپائے ابھی کندھوں پر اٹھائے ہی ہوں گے کہ بے شمار لوگ پائے پکڑنے کے لیے ہماری طرف بڑھے۔ جنازہ اپنے آخری مقام کی طرف روانہ ہوا اور لوگوں کا ایک ہجوم تیزی کے ساتھ اس

کے دائیں بائیں اور پیچھے چلنے لگا۔ اس ہجوم میں علما بھی تھے، صلحا بھی تھے۔ امرا بھی تھے، غربا بھی تھے۔ خواص بھی تھے اور عوام بھی تھے۔ مختلف سیاسی افکار کے حاملین بھی تھے۔ چھوٹے بھی تھے اور بڑے بھی تھے۔ جنازے کے بعد تدفین کا مرحلہ آیا تو قبر پر دعا کی گئی۔ اس وقت اگرچہ بہت سے لوگ واپس چلے گئے تھے تاہم بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے۔ گاؤں کے لوگوں کے علاوہ لاہور، فیصل آباد، جڑاں والا، ستیانہ اور اردگرد کے دیہات کے بے شمار لوگ تھے، جو معاشرے کے ہر طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔

رات تک دیہات سے لوگ تعزیت کے لیے آتے رہے اور پھر کئی دن یہ سلسلہ جاری رہا۔ جیسے جیسے اس سے تعلق رکھنے والوں کو اس کی وفات کا پتا چلتا گیا، ان کی آمد و رفت جاری رہی۔

دوسرے دن لاہور کے ایک صحافی دوست نے لاہور کے تمام اخباروں میں خبر لگوا دی تھی۔ خبر چھپنے کی وجہ سے تعزیت کرنے والوں کا سلسلہ مزید وسیع ہو گیا۔ میں گاؤں سے واپس لاہور آیا تو مختلف حلقوں کے دوستوں میں سے بعض نے ٹیلی فون کیے، بعض نے تعزیتی خطوط لکھے اور بعض گھر پر تشریف لائے۔ گھر تشریف لانے والوں میں متعدد علمائے کرام اور بعض صوبائی وزیر بھی تھے۔ ٹیلی فون کرنے والوں میں بھی بعض وزیروں کے نام شامل ہیں۔ مکہ مکرمہ سے بھی بعض حضرات کے تعزیتی ٹیلی فون آئے۔ کویت اور ہندوستان کے دوستوں نے بھی تعزیت کی۔

روزناموں کے علاوہ ہفت روزہ اور ماہانہ رسائل و جرائد میں بھی نمایاں طور سے میرے بھائی محمد حسین بھٹی کی خبر وفات شائع ہوئی۔

لاہور اور بیرونِ لاہور کی بعض مساجد میں دعائے مغفرت کی گئی اور بعض مقامات میں نمازِ جمعہ کے بعد غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی گئی۔ میرا بھائی محمد حسین بھٹی میرا بے حد احترام کرتا تھا۔ میری کسی چھوٹی بڑی تکلیف کا اسے پتا چلتا تو فوراً لاہور پہنچتا اور میرے دکھ درد میں شریک ہوتا۔

اللهم اكرم نزله و وسع مدخله و ادخله جنت الفردوس.

محمد حسین بھٹی کے دونوں بیٹوں (ناصر محمود اور یاسر) کے متعلق چند باتیں گزشتہ سطور میں بیان کی گئی ہیں۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یاسر لمبے قد کا خوب رو اٹھارہ سالہ نوجوان تھا جو کشمیر میں شہید ہو گیا تھا۔

ناصر محمود کے بارے میں بھی ضروری باتیں عرض کر دی گئی ہیں۔ وہ گٹھے ہوئے جسم اور میانے قد کا صحت مند جوان تھا۔ عصری تعلیم بی اے تک حاصل کی اور پھر دینیات کی مروجہ کتابیں دار الحدیث محمدیہ جلال پور پیر والا میں پڑھیں۔ خوش اطوار اور خوش اخلاق تھا۔ طالب علمی کے دور ہی میں اس کا تعلق جماعۃ الدعوۃ سے ہو گیا تھا اور اس سلسلے میں اس کا زیادہ وقت پشاور اور آزاد کشمیر میں گزرتا تھا۔ پہلے اسے جماعۃ الدعوۃ کی طرف سے

گاڑی ملی تھی اور وہ پہاڑی راستوں کا ماہر ڈرائیور تھا۔ پھر اس نے اپنی ذاتی گاڑی خرید لی تھی۔ میرے پشاور کے بعض دوست مجھے ٹیلی فون کر کے بتایا کرتے تھے کہ آپ کے بھتیجے ناصر کی وساطت سے آپ کی خیر و عافیت کا پتا چلتا رہتا ہے۔

وہ اچھا مقرر بھی تھا اور روزانہ درسِ قرآن بھی دیتا تھا۔ مطالعہ کتب بھی جاری رکھتا تھا۔ وہ لوگوں سے خندہ پیشانی سے ملتا تھا اور صلح کل قسم کا آدمی تھا۔

وہ محنتی اور جفاکش تھا۔ پھر یکا یک بیمار ہو گیا۔ پتا چلا کہ شوگر کا مرض لاحق ہو گیا ہے۔ اسی اثنا میں اس پر دل کا حملہ ہوا۔ کچھ عرصہ اس کا علاج ہوتا رہا۔ پھر ڈاکٹروں نے بائی پاس آپریشن کا مشورہ دیا۔ ۱۹۔ اپریل ۲۰۱۲ء کو لاہور کے ایک اسپتال میں بائی پاس آپریشن کی تیاری ہو رہی تھی کہ عزرائیل نے آ پکڑا ڈاکٹروں کو آپریشن سے روکا اور ناصر محمود اللہ کو پیارا ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ناصر محمود نے اپنے پیچھے بہت سے رشتے داروں سمیت ایک جوان بیوہ، پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں چھوڑیں۔ وفات کے وقت سب سے بڑا بیٹا عبداللہ پندرہ سال کا تھا اور چھوٹی بیٹی صرف ایک مہینے کی۔ اس کی بیوی اور بیٹے بیٹیاں مرکز الدعوۃ (مریدکے) میں مقیم تھے، اب بھی وہیں ہیں۔

ناصر کی پہلی نماز جنازہ مرکز الدعوہ میں حافظ محمد سعید نے پڑھائی، جس میں بے شمار لوگ شامل تھے۔ پھر میت بذریعہ ایمبولینس چک ۵۳ گ ب ڈھیپیاں لے جائی گئی۔ وہاں دوسری نماز جنازہ مولانا عتیق اللہ سلفی نے پڑھائی۔ اس میں گاؤں اور اردگرد کے دیہات کے لاتعداد لوگ شریک تھے۔

ناصر محمود اور اس کے والد محمد حسین دونوں کی وفات حرکتِ قلب بند ہو جانے سے ہوئی۔

ناصر محمود ۲۳۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کو پیدا ہوا تھا اور ۱۹۔ اپریل ۲۰۱۲ء کو اس کا انتقال ہوا۔ وہ ساڑھے چھیالیس برس کی جوان عمر میں اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس کے بیٹے عبداللہ کو جو باپ کی وفات کے وقت آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا، مزید تعلیم کے لیے میں اپنے پاس لاہور لے آیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں کہنا چاہیے کہ میرے بھائی محمد حسین بھٹی نے بھی میرے پاس لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بیٹے ناصر محمود نے بھی یہیں بی اے کیا اور اس کے پوتے عبداللہ کو بھی میں یہیں لے آیا۔

میرے ایک بھائی کا نام طارق محمود ہے۔ اس نے جڑاں والا کے ہائی سکول میں میٹرک پاس کیا۔ پھر میں اسے لاہور لے آیا۔ یہاں اس نے بی اے تک تعلیم حاصل کی۔ اس وقت میرے ایک دوست واپڈا کے ایک شعبے کے ڈائریکٹر تھے۔ میں نے ان سے بات کی تو انھوں نے اسے اپنے شعبے میں ملازم رکھ لیا۔ اب

طارق اپنی مدتِ ملازمت پوری کر کے ریٹائر ہو گیا ہے اور پینشن پا رہا ہے۔

عام طور پر گھروں میں ہم دیکھتے ہیں کہ عورتیں اپنے بھانجے بھانجیوں کی تو بڑی تعریف کرتی ہیں کہ وہ بہت لائق ہیں اور پڑھنے لکھنے میں بڑے تیز ہیں، انھیں اپنے گھروں میں بھی رکھتی ہیں، لیکن بے چارے خاوند کے بھتیجے بھانجوں کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی، انھیں اپنے گھر سے دور رکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ خاوند بھی اس سلسلے میں بیوی کو کچھ نہیں کہہ سکتے، ان میں یہ جرأت ہی نہیں ہوتی کہ اپنے بھانجے بھتیجوں کو تعلیم دلانے کی غرض سے گھر میں رکھ سکیں یا انھیں کوئی مالی فائدہ پہنچا سکیں۔ لیکن اس فقیر کے گھر میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ہمارے ہاں ہمارے بھائیوں اور بھتیجوں نے تعلیم حاصل کی اور ان کے تمام اخراجات ہم نے خود برداشت کیے۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ وفات شدگان کی مغفرت فرمائے اور زندوں کو صالحیت کی نعمت سے نوازے رکھے۔ آمین یا رب العالمین۔

مولانا عبدالقیوم رحمانی

(وفات ۲۸ مئی ۲۰۰۸ء)

مولانا موصوف کا سلسلۂ نسب یہ ہے: عبدالقیوم بن زین اللہ بن سلیمان بن امانت بن خدا بخش۔! ۱۹۲۰ء کے آس پاس موضع دودھنیاں نبرگ ضلع بستی (حال سدھارتھ نگر) یوپی میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق دراصل صوبہ یوپی کے ایک غیر مسلم راجپوت خانوادے سے تھا، جسے ٹھاکر کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ کئی پشت پہلے ان کے ایک بڑے شخص کا نام مل سنگھ ٹھاکر تھا، لیکن یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ اس خاندان کا پہلا شخص کون تھا، جس نے اسلام قبول کیا۔

ان کے علاقے میں مسلمان کثیر تعداد میں آباد تھے، لیکن علم کی بہت کمی تھی۔ پورے علاقے میں نہ کوئی دینی مدرسہ تھا، نہ حصولِ تعلیم کا کوئی اور ذریعہ تھا۔ اسلامی جذبہ بھی ان میں نہیں پایا جاتا تھا۔ ایک گاؤں میں سرکاری پرائمری سکول تھا جس میں مختلف دیہات کے کچھ بچے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر موضع ہانسی میں ایک ہائی سکول تھا۔ عام لوگ تعلیم سے محروم تھے۔ گردو پیش میں چند علمائے دین تھے جنھوں نے اس نواح میں اسلام کی تبلیغ کی اور لوگوں کو کتاب وسنت سے آگاہی حاصل ہوئی، وہ علما تھے مولانا عبدالرحمٰن، قاری عبدالحق، مولانا اللہ بخش، مولانا عباداللہ اور مولانا اظہر مسلم بہاری۔ یہ حضرات مختلف مقامات میں فروکش تھے اور اپنے اردگرد کے دیہات میں اسلام کی تبلیغ واشاعت کا فریضہ ادا کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ ان بزرگوں کی کوششیں رنگ لائیں اور لوگوں کو تعلیم سے دلچسپی پیدا ہوئی۔

مولانا عبدالقیوم نے ابتدائی تعلیم موضع سیورا کے پرائمری سکول میں حاصل کی اور اپنے دادا کے سگے بھائی ظہور محمد سے ابتدائی دینی کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں جھنڈا نگر گئے۔ وہاں مولانا عبدالرحمٰن ڈوکی اور مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈانگری کا سلسلۂ تدریس جاری تھا، ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیے اور ان سے فارسی اور اسلامیات کی چند ابتدائی کتابیں پڑھیں۔

۱۹۳۳ء میں جھنڈانگر سے مئو ناتھ بھنجن کا عزم کیا اور وہاں کے مدرسہ فیض عام میں داخلہ لیا۔ اس مدرسے میں مولانا عبدالرحمٰن مئوی نحوی سے نحو میر، میزان منشعب اور عربی و فارسی کی بعض کتابیں پڑھنے کی سعادت حاصل کی۔

اب ان کے دل میں حصولِ علم کا شوق بڑھ گیا تھا، چنانچہ ۱۹۳۴ء میں دہلی گئے اور وہاں دارالحدیث رحمانیہ میں داخل ہوئے جو ہندوستان میں اس وقت دینی علوم کی تحصیل کا مشہور مرکز تھا۔ وہاں انھوں نے مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوری سے بلوغ المرام، مولانا نذیر احمد رحمانی املوی سے اصول فقہ کی کتاب نور الانوار، مولانا عبدالغفور بسکوہری سے مشکوٰۃ شریف اور ادب عربی کی چند کتابوں کی تکمیل کی۔ ایک پنجابی عالم سے متنبی، مقامات حریری، حماسہ اور کتاب المراثی وغیرہ کتابیں پڑھیں۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ پنجابی عالم کون تھے۔

دہلی ہی میں انھوں نے مدرسہ زبیدیہ میں مولانا احمد اللہ پرتاپ گڑھی دہلوی اور مدرسہ سعیدیہ میں مولانا شرف الدین دہلوی سے کتبِ حدیث کی تکمیل کی اور سندِ فراغ لی۔ قیام دہلی کے زمانے میں پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا جسے اب عربی فاضل کہا جاتا ہے۔

مجموعی طور سے انھوں نے جن اساتذہ کرام سے تحصیل علم کی ان کے نام یہ ہیں: مولانا محمد زمان رحمانی، مولانا عبدالرحمٰن نحوی، مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوری، مولانا نذیر احمد رحمانی املوی، مولانا عبدالغفور بسکوہری، مولانا سکندر علی ہزاروی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی، مولانا ابوسعید شرف الدین دہلوی، مولانا محمد عبدالرحمٰن یعقوب اور مولانا احمد اللہ پرتاپ گڑھی دہلوی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد وہ بعض مقامات میں تدریسی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ ان کی کوشش سے کئی تدریسی ادارے قائم ہوئے جن میں دینی اور عصری تعلیم دینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ۱۹۴۸ء میں انھوں نے بڑھنی بازار سدھارتھ نگر میں ایک ہائی سکول کی بنیاد رکھی جس نے کچھ عرصہ بعد انٹر کالج کی شکل اختیار کی۔ ضلع سدھارتھ نگر ہی کے ایک قصبے "مہدیا" میں مسلم ہائر سیکنڈری سکول قائم کیا جو کامیابی سے جاری ہے اور بے شمار طلبا اس میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

مولانا عبدالقیوم رحمانی سے جن حضرات نے استفادہ کیا ان میں سے چند حضرات یہ ہیں: ڈاکٹر عبدالعلیم عبدالعظیم بستوی (سعودی عرب)، شیخ صلاح الدین مقبول احمد (کویت)، شیخ محمد بن زیاد بن عمر العکلہ (شام)، شیخ عبدالرحمٰن حذیفی (امام وخطیب مسجد نبوی مدینہ منورہ)، شیخ ابو خالد فلاح خالد مطیری (کویت)، شیخ عارف جاوید محمدی (پاکستان - حال کویت)، ڈاکٹر حافظ محمد اسحاق زاہد (پاکستان- حال کویت)، ڈاکٹر عاصم قریوتی (سعودی عرب)، شیخ بدر بن علی طامی العتیمی (سعودی عرب)، ڈاکٹر ولید بن محمد بن عبداللہ العلی (کویت)، شیخ صفوان عدنان داؤدی (شام) شیخ نظام یعقوبی۔

مولانا عبدالقیوم رحمانی کو قرآن مجید سے خاص شغف تھا اور اس کی تفسیر پر ان کی گہری نظر تھی۔ وہ بہت اچھے مقرر تھے۔ تقریر میں قرآن مجید کی آیات کثرت سے پڑھتے اور موثر انداز میں ان آیات کی تفسیر بیان

کرتے۔ وہ باعمل عالم اور اونچے درجے کے خطیب اور واعظ تھے۔

وہ اپنے عہد کے سیاست دان بھی تھے۔ سیاست سے دلچسپی انھیں اس وقت ہوئی جب وہ طلب علم کے لیے دہلی آئے۔ ان دنوں برصغیر میں آزادی کی تحریکیں چل رہی تھیں اور لوگ انگریزی حکومت کے خلاف شدید جدوجہد کر رہے تھے۔ کانگرس بالخصوص اس کے لیے میدانِ عمل میں تھی اور علمائے کرام خاصی تعداد میں اس کے ہم نوا تھے۔ مولانا عبدالقیوم کے مراسم مولانا ابوالکلام آزاد سے استوار ہوئے تو یہ بھی وادیٔ سیاست میں اتر آئے۔ طالب علمی کے زمانے میں تو انھوں نے سیاست میں عملی طور سے حصہ نہیں لیا، البتہ سیاسی جلسوں میں شرکت کرتے اور قائدین سے میل جول رکھتے تھے۔ مروجہ تعلیم سے فراغت کے بعد پوری طاقت کے ساتھ میدان میں اترے اور گرفتار ہوئے۔ ۲۲-اگست ۱۹۴۲ء کو اپنے گاؤں سے گرفتار کیے گئے اور سٹی جیل میں بند کر دیے گئے۔ بعد ازاں گورکھ پور جیل بھیج دیے گئے۔ کچھ عرصے کے بعد گورکھ پور جیل سے انھیں نینی تال جیل الٰہ آباد منتقل کر دیا گیا۔ ان دنوں سندر لال، فیروز گاندھی، لال بہادر شاستری، مولانا حسین احمد مدنی، بلبھ بھائی پٹیل وغیرہ بھی اسی جیل میں تھے۔ مولانا حسین احمد مدنی نے اپنی سوانح عمری ”نقشِ حیات“ میں ان کا ذکر کیا ہے۔ ۲۲ مئی ۱۹۴۳ء کو نینی جیل سے رہا ہوئے۔ اس کے علاوہ بھی متعدد مرتبہ گرفتاری اور قید تک نوبت پہنچی۔

مولانا ابوالکلام آزاد سے انھیں انتہائی عقیدت تھی اور اس وقت کے برصغیر کے جن سیاست دانوں سے ان کے قریبی تعلقات تھے، وہ تھے مولانا حسین احمد مدنی، پنڈت جواہر لال نہرو، خان عبدالغفار خاں، پنڈت پنت، قاضی عدیل عباسی، قاضی جلیل عباسی، لال بہادر شاستری، چرن سنگھ، سندر لال، رفیع احمد قدوائی، اندرا گاندھی اور دیگر بہت سے راہنما۔

۱۹۴۷ء میں جواہر لال کی کوشش سے ایشیائی کانفرنس منعقد ہوئی تو مولانا عبدالقیوم رحمانی نے اس میں شرکت کی اور جواہر لال کے کہنے پر ترجمانی کے فرائض انجام دیے۔

آزادیٔ وطن کے بعد اس وقت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے مولانا ممدوح کو حکومت کی طرف سے دو سو بیگھے زرعی زمین دی جو آج بھی ان کے ورثا کے قبضے میں ہے۔

آزادی کے جشنِ سیمیں کے موقعے پر اندرا گاندھی نے مجاہدین آزادی کو ایوارڈ دیا تھا، جس پر ہر مجاہد آزادی کا نام لکھا تھا، مولانا کو بھی ایوارڈ دیا گیا تھا۔ اس موقعے پر انھیں شیلڈ بھی دی گئی تھی۔

فریڈم فائٹر (مجاہد آزادی) کی حیثیت سے انھیں حکومت ہند کی طرف سے ریلوے کا فرسٹ کلاس کا پاس بھی ملا تھا۔ وہ اپنے ملک میں جہاں چاہے جا سکتے تھے۔ چنانچہ اس پاس کے ذریعے انھوں نے ملک کے

بے شمار مقامات کا سفر کیا۔ اس پاس کی ہر سال تجدید ہوتی تھی۔ قاعدے کے مطابق اس پر ان کا فوٹو چسپاں ہے۔ اس پاس کی ایک کاپی میرے سامنے ہے۔ اس کا نمبر ۵۲۷۴۶۰ ہے۔

سنا ہے کہ ملک کی آزادی میں حصہ لینے اور قید و بند کی منزل سے گزرنے والوں کی حکومتِ ہند ہر مہینے مالی مدد بھی کرتی تھی۔ مولانا عبدالقیوم رحمانی کو بھی باقاعدہ مشاہرہ دیا جاتا تھا۔

مولانا ممدوح نے ملکی سیاسیات میں بھی حصہ لیا، تدریسی خدمات بھی سرانجام دیں، وعظ وتقریر کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ تحریر و نگارش سے بھی ان کا تعلق رہا۔ دہلی کے دارالحدیث رحمانیہ کا ماہانہ رسالہ اس عہد کا ایک تحقیقی و علمی مجلّہ تھا۔ مولانا ممدوح کے مضامین اس میں شائع ہوتے رہے۔ ان کا ایک اردو مضمون ''خیر الامم'' اور ایک ''حاضر و ناظر'' تھا۔ دو کتابچے لکھے۔ ایک عربی زبان میں ''تاریخ الیہود و النصاریٰ فی القرآن الکریم'' یہ کتابچہ دست یاب ہے، جس میں قرآن کی روشنی میں یہود و نصاریٰ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قرآن کی تفسیر بھی لکھی، لیکن اس کا مسودہ محفوظ نہیں رہا۔ کہیں گم ہو گیا۔

مولانا ممدوح خاندانی اعتبار سے اچھے خاصے زمیندار تھے، لیکن ان کی معاشرتی زندگی نہایت سادہ تھی۔ کھدر کا لباس پہنتے، جو ملتا کھا لیتے۔ کسی قسم کا تکلف نہ کرتے۔ ہر شخص کے ہم درد تھے۔ کسی کا کسی سرکاری محکمے میں کوئی کام ہوتا تو اس کے ساتھ چل پڑتے اور کام کرواتے۔ ریا ونمود سے نفور تھے۔ سفر میں بسا اوقات پیدل بھی چلتے اور جماعتی جلسوں میں شرکت فرماتے۔ کسی کا احسان مند ہونے سے گریز کرتے۔ اپنا کام خود کرتے۔ اللہ نے ان کو بڑی ہمت سے نوازا تھا۔ صاف دل، صاف ذہن اور صاف کلام تھے۔ خدمتِ خلق ان کا شیوہ تھا۔ سرکار دربار میں کسی غریب کو کام پڑتا تو اس کے ساتھ ضرور جاتے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ امیر کا کام تو کسی نہ کسی ذریعے سے ہو ہی جاتا ہے، غریب کا بالعموم کوئی ذریعہ نہیں ہوتا، اس کی مدد کرنا اخلاقی فرض بھی ہے اور معاشرتی اور اسلامی فرض بھی۔ مولانا سید محمد داؤد غزنوی کا بھی یہی نقطہ نظر تھا۔ وہ کمزور لوگوں کا کام کرانے کی پوری کوشش کرتے اور اللہ کی مہربانی سے کام ہو بھی جاتا۔

مولانا عبدالقیوم رحمانی بے خوف سیاست دان اور صاف گو عالم تھے۔ راجیو گاندھی نے اپنے زمانہ وزارتِ عظمیٰ میں ہندوستان کی آبادی پر کنٹرول کرنے کے لیے نس بندی کا حکم دیا تو مولانا ممدوح نے اس کی سخت مخالفت کی۔ ایک مرتبہ اس کے خلاف پٹنہ میں جماعت اہل حدیث کا جلسہ کرنے کا اعلان کیا اور جلسے کا اشتہار خود ان کی طرف سے شائع کیا گیا۔ حکومت نے جلسہ روکنے کی کوشش کی۔ جلسہ گاہ میں مولانا موجود تھے۔ پولیس کی بڑی تعداد کے ساتھ پٹنے کا پولیس کپتان آیا اور مولانا سے کہا کہ جلسہ نہیں ہو سکتا۔ مولانا نے نہایت خفگی سے پولیس کپتان کو جواب دیا چلے جاؤ یہاں سے، جلسہ ضرور ہوگا اور میں وزیر اعظم کی نس بندی

کے حکم کے خلاف تقریر کروں گا۔ ہم انگریز سے نہیں ڈرے، تم سے کیا ڈریں گے۔ فرمایا وزیر اعظم کو میرے یہ الفاظ پہنچا دو۔ کپتان صاحب اپنی پولیس کے ساتھ پنڈال سے باہر نکل گئے اور جماعت اہل حدیث کا جلسہ ہوا جو حاضری کے اعتبار سے کامیاب رہا۔

ریلوے کے پاس پر مولانا کی تصویری فوٹو کاپی میرے سامنے ہے۔ سر پر قراقلی ٹوپی ہے اور سفید کھدر کا لباس پہنے ہوئے ہیں۔ سفید داڑھی ہے اور مونچھیں ترشوائی ہوئیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ میانہ قد ہے اور میانہ ہی جسم، نہ موٹے نہ دبلے پتے، چہرے پر سنجیدگی کا غلبہ۔

مولانا عارف جاوید محمدی کا بیان ہے کہ ۲۰۰۶ء میں وہ کویت تشریف لائے تھے۔ وہاں کے اصحابِ علم نے شیخ محمد ناصر العجمی کے مکان پر منعقدہ ایک مجلس میں ان سے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کا سماع کیا۔ خود وہ (عارف جاوید) بھی اس مجلس میں موجود تھے۔ سب نے ان کے شاگردوں میں شامل ہونے کا شرف حاصل کیا۔ مولانا نے تمام حاضرین کو اجازہ الروایہ عطا فرمایا۔ ۱۷۔ فروری ۲۰۰۶ء کو وہ مولانا عارف جاوید محمدی کی دعوت پر مرکز دعوۃ الجالیات تشریف لائے۔ یہاں بھی بہت سے احباب نے ان پر قراءتِ حدیث کی اور شرف اجازہ سے مفتخر ہوئے۔

مولانا عبدالقیوم نے اس مجلس میں حاضرین کو بتایا کہ انھوں نے حضرت مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ اسی مجلس میں مولانا عارف جاوید کے دو بیٹوں (محمد شفیع اور قاسم) نے مولانا عبدالقیوم کی بیعت کی۔ مولانا نے بچوں سے قرآن مجید کی چند آیات سنیں اور انھیں دعا دی۔ عارف صاحب کے بڑے بیٹوں عبداللہ اور عبدالرحمٰن نے حافظ محمد یحییٰ میر محمدی مرحوم و مغفور کے دستِ مبارک پر بیعت کی تھی۔

مولانا عبدالقیوم رحمانی احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کا صحیح ترین نمونہ تھے۔ آزادیٔ وطن کے لیے انھوں نے بڑی خدمات سرانجام دیں۔ ہندوستان کی جماعت اہل حدیث کے وہ سرگرم رکن تھے۔ حکومت ہند کی طرف سے آزادی کے بعد جن اہل حدیث حضرات کو مجاہد آزادی کا خطاب ملا، ان میں ایک مشہور عالم مولانا حکیم عبدالصمد مراد آبادی مرحوم تھے۔

مولانا عبدالقیوم رحمانی کا اسلوبِ تقریر پُر تاثیر تھا۔ قرآن مجید پر انھیں استحضار تھا۔ تقریر میں مناسب مواقع پر اتنی کثرت سے قرآن کی آیات پڑھتے کہ بسا اوقات سننے والے حفاظِ قرآن بھی حیران رہ جاتے۔ یہ اللہ کا ان پر عظیم احسان تھا۔

ہر انسان کی طرح یہ مردِ باہمت بھی موت کی آغوش میں چلا گیا۔ ۱۶ مئی ۲۰۰۸ء کو جماعت اہل حدیث کے ایک جلسے کی صدارت اور تقریر کے لیے موضع تیواری (ضلع سدھارتھ نگر) گئے۔ وہیں سے اگلے روز ۱۷

مئی کو ایک اور جگہ تشریف لے گئے۔ وہاں بھی تقریر کی اور جلسے کی صدارت کا فریضہ انجام دیا۔ ۲۲- مئی کو واپس گھر آئے تو اسہال کا عارضہ لاحق تھا۔ علاج کرایا گیا لیکن ۲۷ مئی کو مرض زیادہ شدت اختیار کر گیا۔ ۲۸ مئی کو علاج کے لیے بذریعہ جیپ انھیں لکھنؤ لے جایا گیا۔ وہاں اسپتال میں داخل ہوئے بہ مشکل دو گھنٹے گزرے ہوں گے کہ وفات پا گئے۔ ورثاء شب کے گیارہ بجے میت کو لے کر گھر پہنچے۔ دوسرے دن ۲۹ مئی ۲۰۰۸ء کو سوا دس بجے مولانا عبدالحمید رحمانی نے نماز جنازہ پڑھائی جس میں دور و نزدیک کے ہزاروں افراد نے شرکت کی جس میں علما، طلبا، سیاست دان اور کاروباری لوگ شامل تھے۔ اس عالم دین اور مردِ مجاہد کو ان کے آبائی قبرستان میں دفن کیا گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

سوگ واروں میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو بھی کثیر تعداد میں شامل تھے۔

مولانا عبداللہ سلفی

(وفات ۳۰-نومبر ۲۰۰۹ء)

مولانا عبداللہ سلفی ضلع مظفر گڑھ کی تحصیل کوٹ ادو کے ایک گاؤں بیٹ قائم والا میں ۴ جون ۱۹۴۶ء کو پیدا ہوئے۔ گھر میں غربت کا دور دورہ تھا۔ چار سال کے ہوئے تو والد وفات پا گئے جن کا نام قادر بخش تھا۔ اس کے بعد ان کی زندگی کے شب و روز عجیب و غریب حالات میں گزرے۔

ان کے ماموں حکیم محمد رمضان نے ابتدائی دور میں ان کی تربیت کا اہتمام کیا۔ ایک گاؤں یارے والا کے سکول میں داخل کرائے گئے اور پرائمری پاس کی۔ اب دس گیارہ سال کو پہنچ گئے تھے۔ ایک بزرگ حافظ غلام حسین قریشی سے قرآن مجید حفظ کرنا شروع کیا۔ دس بارہ سپارے حفظ کیے تھے کہ یہ سلسلہ ترک کر دیا۔ پھر خدا جانے کیا سوجھی پیری مریدی کا دھندا اختیار کر لیا۔ صرف دو سال یہ کام کیا ہوگا کہ اس سے نفرت ہوگئی اور احناف کے دیوبندی مکتبِ فکر سے وابستہ ہوگئے اور ڈیرہ غازی خاں کے مدرسہ قاسم العلوم میں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ وہاں درس نظامیہ کی چند کتابیں پڑھیں، پھر ملتان کو روانہ ہوئے اور وہاں کے مدرسہ خیر المدارس میں داخلہ لیا۔ کچھ عرصہ اس مدرسے کے نصاب کے مطابق تحصیل علم کرتے رہے۔

اب ان کا کاروانِ حیات ایک اور رخ اختیار کرتا ہے۔ وہ چند دوستوں کے ساتھ کسب معاش کے لیے عرب امارات جا پہنچے۔ وہاں انھوں نے کئی قسم کے کام کیے۔ مزدوری کی، نوکری کی۔ اس اثنا میں ان کی ایک ممتاز عالم شیخ محمد قندی مصری سے ملاقات ہوئی۔ اس عالم نے ان سے نہایت شفقت کا برتاؤ کیا۔ چلتے پھرتے انھوں نے اچھی خاصی عربی زبان سیکھ لی تھی اور اس سے قبل پاکستان کے بعض مدارس میں کچھ تعلیم بھی حاصل کر لی تھی۔ اس مصری عالم سے انھوں نے مختلف موضوعات کی عربی کتابیں پڑھیں۔ وہاں انھیں اردو کی کتابیں بھی میسر آ گئی تھیں، ان کا مطالعہ بھی جاری رکھا اور یہ اچھے خاصے عربی کے عالم ہو گئے تھے اور ان کا ٹھکانا ابوظہبی تھا۔

اب وقت نے ایک نہایت خوش گوار پلٹا کھایا۔ ۱۹۶۸ء میں یہ ابوظہبی سے نکلے اور سعودی عرب کو پیدل روانہ ہوئے۔ دورانِ سفر صوبہ الاحساء کے ایک شہر الہلوف پہنچے تو وہاں کے ایک نامور عالم شیخ ابوبکر یحییٰ سے ملاقات کا اتفاق ہوا۔ ان سے کچھ گفتگو ہوئی تو انھوں نے ان کو اپنے حلقۂ تلامذہ میں شامل کر لیا۔ کچھ مدت

ان سے فیض حاصل کیا۔ پھر جدہ کو روانہ ہوئے، وہاں سے مکہ مکرمہ پہنچے اور عمرہ و حج کی سعادت حاصل کی۔ انھوں نے جدہ کے بعض علما سے بھی استفادہ کیا اور مکہ مکرمہ میں جن شیوخ سے تعلق تلمذ پیدا ہوا، ان میں احمد پور شرقیہ کے مولانا عبدالحق ہاشمی کا اسمِ گرامی بھی شامل ہے۔ ان سے انھوں نے سند و اجازہ کا شرف بھی حاصل کیا۔

اب وہ دینیات کے عالم بھی ہو گئے تھے، عربی بھی خوب بولنے لگے تھے، عربی میں وعظ و تقریر بھی کرتے تھے اور مسلکِ اہل حدیث بھی اختیار کر لیا تھا۔

سعودی عرب سے وہ پھر عرب امارات پہنچے۔ لیکن کس طرح پہنچے اور کس شان سے پہنچے۔ اس کا تذکرہ ہمارے عزیز دوست حمید اللہ خاں عزیز اپنے ماہنامے ''تفہیم الاسلام'' (احمد پور شرقیہ) میں ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''ایک مرتبہ شیخ زید بن النہیان عمرے کے لیے گئے تو مکہ مکرمہ میں ان کی ملاقات مولانا عبدالحق ہاشمی سے ہوئی۔ انھوں نے مولانا سے کہا کہ اپنے محل کی جامعہ مسجد کی خطابت و امامت اور مدرسے کے لیے انھیں ایک عالم کی ضرورت ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ وہ عالم آپ کا شاگرد ہو۔ مولانا ہاشمی نے شیخ ممدوح سے مولانا عبداللہ سلفی کا تعارف کرایا اور وہ عرب امارات جا کر شیخ زید بن النہیان کے محل کی مسجد کے امام و خطیب ہو گئے۔ پھر دس سال وہاں یہ خدمت سرانجام دی۔ انھوں نے وہاں کی وزارتِ امور اسلامیہ و اوقاف کے واعظ و مبلغ کے طور پر بھی کام کیا اور کامیابی کے ساتھ کیا۔''

اب آگے چلیے اور اللہ کی قدرت کے رنگ دیکھیے۔

دس بارہ سال کے بعد مولانا عبداللہ سلفی واپس وطن آ گئے۔ یہاں انھوں نے کوٹ ادو سے کچھ فاصلے پر وسیع و عریض رقبے میں معهد الشريعة و الصناعة کے نام سے نومبر ۱۹۸۲ء میں ایک بہت بڑا ادارہ قائم کیا جو مندرجہ ذیل شعبوں پر مشتمل ہے:

☆......قسم الدراسات الاسلامیہ (اس میں دینیات کی مروجہ تعلیم دی جاتی ہے)
☆......قسم تحفیظ القرآن (اس میں بچوں کو قرآن حفظ کرایا جاتا ہے)
☆......شعبہ عصری علوم (نرسری تا میٹرک مع سائنس)
☆......درس نظامی کے طلبا کے لیے عصری تعلیم (میٹرک تا ایم اے)
☆......شعبہ کمپیوٹر
☆......شعبہ تعمیر مساجد

☆......کیڈٹ کالج

☆......اسلامیہ پبلک ڈگری کالج

☆......اسلامیہ پبلک کالج آف کامرس

☆......اسلامیہ پبلک گرلز کالج

جنوبی پنجاب کا یہ بہت بڑا ادارہ ہے جس میں جنوبی پنجاب سمیت پورے پنجاب کے طلبا تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

مولانا ممدوح اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ انھوں نے نہایت غربت کی حالت میں آنکھ کھولی اور زندگی کی دوڑ میں کئی قسم کے حالات سے دوچار ہوئے۔ پھر اللہ کی مہربانی سے نہایت خوش کن دور میں داخل ہو گئے۔

جب اللہ کے فضل سے مالی حالات بہتر ہو گئے تو انھوں نے بعض دیگر مقامات کے اداروں کی بھی مدد کی۔ احمد پور شرقیہ کی مسجد تقویٰ کی تعمیر کے سلسلے میں کچھ رقم کی ضرورت پڑی تو ان سے رابطہ کیا گیا اور انھوں نے اس کارِ خیر میں پورا تعاون کیا۔

مولانا عبداللہ سلفی نے اتوار کے روز ۳۰ نومبر ۲۰۰۹ء کو تقریباً آٹھ بجے صبح حرکت قلب بند ہو جانے سے وفات پائی۔ ان کی نماز جنازہ معہد الشریعۃ والصناعۃ کے وسیع میدان میں شیخ الحدیث مولانا محمد رفیق اثری نے پڑھائی، جس میں تمام مکاتبِ فکر اور ہر طبقہ وخیال کے ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ [1]

اللهم اكرم نزله و وسع مذخله و ادخله جنة الفردوس.

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۵ مئی، ۳۱ مئی ۲۰۱۲ء) ماخوذ از مضمون مولانا عبدالرحیم اظہر ڈیروی۔

حکیم محمد ادریس فاروقی

(وفات ۵- جون ۲۰۱۰ء)

سوہدرہ ضلع گوجراں والا کا مشہور تاریخی قصبہ ہے، جس کے علوی خاندان کو (جسے اب فاروقی خاندان کہا جاتا ہے) علم وعمل اور تصنیف وخطابت میں امتیازی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس خانوادۂ ذی شان کے ایک پیکر صالحیت بزرگ مولانا غلام نبی الربانی تھے جو ۴- ستمبر ۱۸۴۸ء کو سوہدرہ میں پیدا ہوئے۔ تحصیل علم کا آغاز اپنے والد مکرم مولوی محبوب عالم سے کیا۔ پھر اس راہ کی مختلف منزلیں طے کرتے ہوئے موضع لکھوکے (ضلع فیروز پور) میں حضرت حافظ محمد لکھوی کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے کتب حدیث پڑھیں۔ وہاں سے چلے تو دہلی جا کر حضرت میاں سید نذیر حسین کے آستانۂ فضیلت پر دستک دی۔ ان دنوں امرتسر میں حضرت عبداللہ غزنوی کا سلسلۂ فیض جاری تھا، ان کے حلقۂ بیعت میں شامل ہونے کی سعادت بھی حاصل کی۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد واپس اپنے وطن سوہدرہ تشریف لائے اور وہاں مسندِ رشد و ہدایت بچھائی اور وعظ وتقریر، درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کی صورت میں توحید وسنت کی بے حد اشاعت کی اور کثیر تعداد میں لوگ ان سے مستفید ہوئے۔ اس جلیل المرتبت عالم دین نے ۸۳ سال کے لگ بھگ عمر پائی اور ۳- مئی ۱۹۳۰ء (۴ ذی الحجہ ۱۳۴۸ھ) کو سوہدرہ میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔

مولانا غلام نبی الربانی کے دو صاحب زادے تھے اور دونوں رفیع المنزلت علماء تھے۔ بڑے مولانا عبدالحکیم اور چھوٹے مولانا عبدالحمید۔

عبدالحکیم کی ولادت ۱۸۷۳ء کو ہوئی اور پوری مروجہ تعلیم حاصل کی۔ سند حدیث حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی سے لی۔ بہت اچھے مبلغ اور واعظ وخطیب تھے۔ عین عالم جوانی میں ۱۹۰۲ء کو وفات پائی۔ باپ نے جوان بیٹے کی میت اپنے ہاتھوں قبر میں اتاری۔

ان سے چھوٹے مولانا عبدالحمید ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے۔ درسیات کی ابتدائی کتابیں گھر میں پڑھیں۔ پھر صحاح ستہ کی تکمیل حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی محدث سے کی اور سند لی۔ بعد ازاں حضرت میاں سید نذیر حسین کی خدمت میں دہلی گئے اور ان سے فیض یاب ہوئے۔ حضرت میاں صاحب کے عالی قدر شاگرد شارح ابوداؤد مولانا شمس الحق ڈھیانوی کے سامنے بھی زانوئے ادب تہ کیے۔ بعد ازاں عازمِ بھوپال

ہوئے اور شیخ حسین بن محسن انصاری یمانی کے حلقۂ درس میں شمولیت کی اور سندِ حدیث کے حق دار ٹھہرے۔ اس طرح اس عہد کے برصغیر کے متعدد مشہور اصحابِ علم سے حصول فیض کیا۔ واپس سوہدرہ آ کر وعظ و تبلیغ میں مشغول ہوئے اور مدرسہ حمیدیہ کے نام سے مدرسہ جاری کیا۔ ان کی شادی حضرت محدث حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کی صاحب زادی سے ہوئی تھی۔ اس عالم اجل نے صرف تیس برس عمر پائی اور ۲۴- مئی ۱۹۱۲ء (۷- جمادی الاخریٰ ۱۳۳۰ھ) کو وفات پا گئے۔ مولانا غلام نبی ربانی نے خود ہی جوان بیٹے کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور خود ہی تجہیز و تکفین کا اہتمام کیا۔

لائق بیٹے کی وفات کے بعد ان کے جاری کردہ مدرسہ حمیدیہ کی زمام انتظام ہاتھ میں لی اور اس میں خدمت تدریس سرانجام دینے لگے۔ اس حادثے سے اٹھارہ سال بعد ۳- مئی ۱۹۳۰ء کو سفر آخرت پر روانہ ہوئے۔

مولانا عبدالحمید کے بیٹے مولانا عبدالمجید سوہدروی تھے جو جنوری ۱۹۰۱ء کو سوہدرہ میں پیدا ہوئے۔ باپ کی وفات کے وقت وہ گیارہ سال کے بچے تھے اور حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کے نواسے تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے جدِ امجد مولانا غلام نبی سے پائی اور پھر مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی اور مختلف اساتذہ کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیے۔ اللہ نے ان کو بہت سی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ تحریر و تقریر کی صورت میں انھوں نے بڑی خدمات سرانجام دیں۔ اسلامی تاریخ سے انھیں خاص طور پر لگاؤ تھا اور بزرگانِ دین کے واقعات دلچسپ انداز میں سنایا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ وہ نامور طبیب بھی تھے۔ طب کے موضوع پر بھی انھوں نے بہت کچھ لکھا۔ وہ میٹھی زبان اور خوب صورت اسلوب میں مدلل تقریر کرتے تھے۔ ان کا زمانہ متحدہ ہندوستان کا زمانہ تھا۔ پورے ہندوستان کی جماعت اہل حدیث کے جلسوں میں انھیں دعوت دی جاتی تھی اور وہ جلسوں میں تشریف لے جاتے تھے۔ سامعین ان کی تقریر نہایت شوق سے سنتے اور متاثر ہوتے تھے۔ قصبہ سوہدرہ ان کی وجہ سے پورے برصغیر میں مشہور ہوا۔ انھوں نے ۶- نومبر ۱۹۵۹ء کی شب کو لاہور میں وفات پائی اور دوسرے دن ان کی میت ان کے وطن سوہدرہ پہنچائی گئی اور وہیں انھیں دفن کیا گیا۔ ❶

مولانا عبدالمجید سوہدروی کی نرینہ اولاد میں سب سے بڑے حافظ محمد یوسف تھے جو کم و بیش ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے جد امجد مولانا غلام نبی الربانی سے حاصل کی۔ اس کے بعد حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کے مدرسے کے فاضل مدرس مولانا عمرالدین وزیر آبادی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے درس نظامیہ کی تکمیل کی۔ ۱۹۴۲ء میں امرتسر کے طبیہ کالج سے طب کی تعلیم حاصل کی۔ اسی طرح

❶ ان کے تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب بزم ارجمنداں۔ (شائع کردہ مکتبہ قدوسیہ، اردو بازار لاہور)

پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات پاس کیے، جنھیں اب فاضل عربی اور فاضل فارسی کہا جاتا ہے۔

اللہ نے توفیق بخشی قرآن مجید بھی حفظ کیا۔

حافظ محمد یوسف عالی کردار، بلند اخلاق، نہایت منکسر اور درویش منش عالم تھے۔ بہت اچھے خطیب اور صاحب مطالعہ بزرگ تھے۔ توحید وسنت کا جذبۂ صادقہ اپنے آباؤ اجداد سے وراثت میں ملا تھا۔ شیریں کلام اور نرم مزاج۔ تحریر و نگارش سے بھی تعلق تھا۔ اپنے والد مکرم مولانا عبدالمجید سوہدروی کی وفات کے بعد کچھ عرصہ ہفت روزہ ''اہل حدیث'' کی ادارت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ نہایت صالح فطرت اور نیک اطوار تھے۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۹۶ء کو سوہدرہ میں فوت ہوئے۔

مولانا حکیم محمد ادریس فاروقی انھی حافظ محمد یوسف کے بڑے صاحب زادے ہیں۔ ان کا مختصر سلسلۂ نسب یہ ہے: محمد ادریس بن حافظ محمد یوسف بن مولانا عبدالمجید بن مولانا عبدالحمید بن مولانا غلام نبی الربانی بن مولوی محبوب عالم۔ اس سلسلۂ نسب کے تمام افراد علم وعمل کی دولت سے مالا مال ہیں اور کتاب وسنت کی تبلیغ واشاعت ان کا اصل مقصد حیات رہا ہے۔

مولانا محمد ادریس ۱۹۴۴ء میں بمقام سوہدرہ پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم والد مکرم حافظ محمد یوسف سے حاصل کی۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد جامعہ اثریہ جہلم، جامعہ اسلامیہ گوجراں والا، جامعہ سلفیہ فیصل آباد اور بعض دیگر تدریسی اداروں میں درس نظامیہ کی تکمیل کی۔ اساتذہ کی وسیع فہرست میں حضرت حافظ محمد گوندلوی، مولانا ابوالبرکات احمد، مولانا شریف اللہ خاں سواتی، حافظ عبداللہ، بڈھیمالوی، پیر محمد یعقوب قریشی، مولانا محمد صادق خلیل، مولانا محمد علی جانباز، مولانا فاروق احمد راشدی، مولانا محمد یوسف کلکتوی، حافظ بنیامین طور شامل ہیں۔

اپنے والد اور دادا کی طرح انھوں نے علم طب بھی پڑھا۔ نیز پنجاب یونیورسٹی سے عربی فاضل کا امتحان پاس کیا اور بعد ازاں بی اے کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے۔

مولانا محمد ادریس فاروقی اشاعت اسلام کے لیے ہر وقت کمربستہ رہتے تھے۔ بائیس سال ان کا قیام کوئٹہ میں رہا۔ وہاں وہ اسلامیہ ہائی سکول میں طلباء کو اردو، عربی اور اسلامیات پڑھاتے تھے۔ کوئٹہ ریڈیو میں ان کی تقریروں کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ وہ جامع مسجد اہل حدیث غزنویہ (واقع پٹیل روڈ) میں خطابت کا فریضہ بھی انجام دیتے تھے۔ بلوچستان کی رؤیت ہلال کمیٹی اور عربی نصاب کمیٹی بلوچستان کے رکن بھی تھے۔ بائیس سال کے بعد وہ اپنے آبائی وطن سوہدرہ آئے اور کتاب وسنت کی اشاعت کا وہی سلسلہ شروع کیا جو ان کے آباؤ اجداد کا طرۂ امتیاز تھا۔

اب ان کے حلیے اور لباس وغیرہ کی طرف آیئے: پورا قد، گداز جسم، گول چہرہ، کھلتا ہوا گندمی رنگ، موٹی آنکھیں، کھلی پیشانی، شلوار قمیص ان کا پہناوا، اخلاق حسنہ کے مالک، خوش طبع، ملنسار، اچھے خطیب، صداقت پیشہ، اہل علم کے قدر دان، حلیم الطبع علم و ادب کے دلدادہ، فراخ حوصلہ، وسیع المطالعہ، قلم و قرطاس سے رابطہ رکھنے والے۔ مبلغ کتاب وسنت۔

بہت سال ہوئے میں نے پہلی دفعہ انھیں مولانا عبدالمالک مجاہد کے جاری کردہ تصنیفی اور اشاعتی ادارے دارالسلام میں دیکھا تھا۔ اس وقت یہ ادارہ ایم اے او کالج کے قریب علامہ احسان الٰہی ظہیر کی بلڈنگ میں قائم تھا۔ حافظ عبدالعظیم اسد نے تعارف کرایا کہ یہ مولانا عبدالمجید سوہدروی کے پوتے ہیں اور یہاں ترجمہ و تصنیف کے شعبے سے منسلک ہیں۔ انھیں دیکھ کر اور ان سے مل کر بے حد خوشی ہوئی تھی۔ اس کے بعد بے شمار مرتبہ ملاقات ہوئی۔ غریب خانے پر بھی دو تین مرتبہ تشریف لائے۔ متواضع طبیعت اور میل جول رکھنے والے اہل علم۔

اب ان کی تصنیفی سرگرمیوں اور قلمی کاوشوں کا تذکرہ۔

۱۔ انوارالحدیث: قیام کوئٹہ کے زمانے میں انھوں نے ایک جگہ درس حدیث کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ بعد میں ان دروس کو جمع کر کے کتابی صورت میں شائع کیا گیا اور اس کتاب کا نام ''انوارالحدیث'' رکھا۔ اس میں حجیت حدیث، عظمت حدیث، ضرورت حدیث اور اہمیت حدیث جیسے اہم امور کو اجاگر کیا گیا ہے۔ نیز منکرین حدیث، احادیث مبارکہ پر جو اعتراضات کرتے ہیں، ان کا تحقیقی انداز میں جواب دیا گیا ہے۔ اس موضوع کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے تقلید پر بھی بحث کی ہے اور تقلید کو عمل بالحدیث میں رکاوٹ قرار دیا ہے۔

۲۔ سیرت حسین رضی اللہ عنہ:...... اس کتاب میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے حالات اور ان کے فضائل و مناقب بیان کیے گئے ہیں۔ کتاب میں اعتدال سے صحیح واقعات معرض تحریر میں لائے گئے ہیں۔ اپنے موضوع کی یہ ایک اہم کتاب ہے جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی حیات طیبہ کے ہر گوشے کی وضاحت کرتی ہے۔

۳۔ سیرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا:...... یہ کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ اول حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے حالات پر محیط ہے۔ نکاح کے وقت حضرت خدیجہ کی عمر چالیس برس اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پچیس برس تھی۔ اس کتاب کا مطالعہ قاری کے

لیے بے شمار معلومات فراہم کرتا ہے۔

۴۔ نبی رحمت: اس مختصری کتاب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ان شفقتوں اور مہربانیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو آپ بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور جانوروں پر فرماتے تھے۔ اس موضوع کی یہ منفرد نوعیت کی کتاب ہے۔

۵۔ مسئلہ تقلید: اس میں بتایا گیا ہے کہ تقلید کیا ہے اور جن ائمہ کرام کی تقلید کی جاتی ہے، ان کے اس کے متعلق کیا ارشادات ہیں۔

۶۔ مقام رسالت: مولانا محمد ادریس فاروقی کی یوں تو تمام تصانیف بڑی اہمیت کی حامل ہیں اور ہر کتاب اپنے موضوع کی بے شمار معلومات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔لیکن ان میں ''مقام رسالت'' ایک خاص امتیاز رکھتی ہے۔اس کتاب میں جن امور کی وضاحت کی گئی ہے، وہ ہیں حدیث اور مقام حدیث، تدوین حدیث، حدیث اور سلف صالحین، تعارف کتب حدیث، کتب حدیث کی اقسام مثلاً الجامع، السنن، المسند، المعجم، المستدرک وغیرہ۔ طبقات حدیث، اختلاف اور اس کی وجوہات۔ فتنۂ انکار حدیث، قرآن اور حدیث کا باہمی تعلق، منکرین حدیث کے اعتراضات کا جائزہ، انکار حدیث کے عوامل۔کم وبیش تین سو صفحات کی یہ کتاب مقام رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کو خوب صورتی سے واضح کرتی ہے۔ فاضل مصنف کا طریق نگارش عام فہم اور باعث کشش ہے۔ ہر بات صراحت اور دلیل سے حوالہ قرطاس کی گئی ہے۔خوانندگان محترم کتاب کا مطالعہ کرتے وقت صاف ستھری زبان سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں اور بہترین معلومات بھی ان کے ذہن میں راسخ ہوتی ہیں۔

مولانا محمد ادریس فاروقی نے خود بھی متعدد علمی کتابیں لکھیں اور اپنے جد امجد مولانا عبدالمجید سوہدروی کی بھی کئی اہم کتابیں خوب صورت انداز میں ضروری اضافوں کے ساتھ شائع کیں۔ان کتابوں میں رہبر کامل، انتخاب صحیحین، خطبات قاضی سلیمان منصور پوری، سیرت ثنائی، خطبات ثنائی، حدیث کی چار کتابیں، ظل رسول صلی اللہ علیہ وسلم، اسوۂ حسنہ، ہندو شعراء کا نعتیہ کلام، رسالت و بشریت، کرامات اہل حدیث، فرقہ ناجیہ، دولت مند صحابہ، سیرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، سیرت فاطمۃ الزہرا، سیرۃ الائمہ، تحریک وہابیت، انگریز اور وہابی، نقوش ابوالکلام آزاد شامل ہیں۔

مولانا محمد ادریس ان تھک اور محنتی اہل علم تھے اور تصنیف وتالیف سے انھیں بے حد شغف تھا۔ وہ جو علمی

کام کرتے کامل انہماک سے کرتے تھے۔ ان کی تصانیف اور مرتبات اس کی شہادت دیتی ہیں۔

انھوں نے ''ضیائے حدیث'' کے نام سے ماہانہ مجلہ جاری کیا، جسے علمی اور تحقیقی مضامین کا مجموعہ کہنا چاہیے۔ یہ مجلہ باقاعدگی سے ہر مہینے معرض اشاعت میں آتا ہے اور قارئین اس کے مندرجات سے استفادہ کرتے ہیں۔

وہ سراپا عمل عالم ۵ جون ۲۰۱۰ء کو ''ضیائے حدیث'' کے دفتر (دارالسلام) میں مولانا ارشد کمال کے ساتھ اپنی تصنیف ''مقام رسالت'' پر نظر ثانی کر رہے تھے کہ اچانک دل کا دورہ پڑا اور گیارہ بج کر بائیس منٹ پر وفات پا گئے۔ اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ۔

تصنیف و تالیف کے لیے ان کی تگ و تاز ملاحظہ ہو کہ مرتے وقت بھی اس صاحب قلم کے ہاتھ میں قلم ہے اور لکھ رہے ہیں۔ ﴿وَ الْقَلَمِ وَ مَا یَسْطُرُوْنَ﴾۔

مولانا محمد ادریس کی نرینہ اولاد تین بیٹے ہیں۔ بڑے نجم الحمید جو ادارہ دارالسلام کے مرکزی دفتر ریاض (سعودی عرب) میں کام کرتے ہیں۔ دوسرے قمر الحمید اور تیسرے حافظ محمد نعمان فاروقی۔ تینوں ماشاء اللہ تعلیم یافتہ اور لائق بیٹے ہیں۔ اپنے اسلاف کی طرح خدمت کتاب و سنت میں مشغول اور تدین و صالحیت کی نعمت سے بہرہ ور!

مولانا محمد بشیر طیب

(وفات ۱۶- مارچ ۲۰۱۱ء)

لمبا قد، گندمی رنگ، تیکھے نقوش، ابھری ہوئی ناک، مناسب جسم، نہ موٹے، نہ زیادہ دبلے پتلے، سرخ مہندی سے رنگین لمبی داڑھی، خوش طبع اور خوش کلام۔ یہ تھے مولانا محمد بشیر طیب جنھیں میں نے پہلی دفعہ یکم جولائی ۲۰۰۸ء کو کویت میں دیکھا۔ اس وقت وہ عربوں جیسا لمبا چغہ پہنے اور سر پر رومال باندھے ہوئے تھے۔ اس طرح گرم جوشی سے ملے جیسے مدتوں سے آشنائی ہو۔ پھر جلد ہی پتا چل گیا کہ وہ خوش گفتار بھی ہیں، مہمان نواز بھی ہیں اور میل جول میں ممتاز بھی۔

مولانا محمد بشیر طیب ۱۹۴۹ء کو موضع بدوکی سکھواں ضلع گوجراں والا میں پیدا ہوئے۔ یہ گاؤں حافظ آباد گوجراں والا روڈ پر واقع ہے۔ سلسلۂ نسب یہ ہے: محمد بشیر طیب بن میاں عطاء اللہ بن حکیم محمد دین بن حکیم مہر علی۔

مولانا محمد بشیر طیب کے والد میاں عطاء اللہ صحیح العقیدہ، تہجد گزار اور نیک اطوار بزرگ تھے۔ قرآن مجید کی بہ کثرت تلاوت کرتے اور اپنے حلقے کے مبلغ دین...... گاؤں میں احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور لوگوں کی خدمت ان کا معمول تھا۔ گاؤں میں چھوٹا موٹا جھگڑا ہو جاتا تو فریقین ان سے فیصلہ کراتے اور اس پر کاربند رہتے۔ مولانا محمد بشیر کے دادا اور پردادا بھی اس ماحول کے مطابق پڑھے لکھے اور طبیب تھے۔

محمد بشیر کچھ بڑے ہوئے تو قریبی گاؤں موضع ادھووالی کے گورنمنٹ مڈل سکول میں داخل کرا دیے گئے (اب یہ ہائی سکول ہے) سکول میں انھوں نے پرائمری تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد دینی تعلیم کے حصول کی طرف متوجہ ہوئے، چنانچہ ۱۹۶۱ء میں جب بارہ سال کے ہوئے تو والد مکرم نے ان کو اپنے چھوٹے بھائی مولانا عبیداللہ کے پاس موضع سنبھلا کلاں بھیج دیا جو ایمن آباد سے آٹھ دس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ وہاں انھوں نے مختلف علوم کی چند ابتدائی کتابیں پڑھیں۔

بعد ازاں ۱۹۶۴ء میں گوجراں والا کے ایک دیوبندی دار العلوم (جامعہ رحمانیہ) میں داخل کرا دیے گئے۔ کچھ عرصہ وہاں رہے اور بعض درسی کتابیں پڑھیں۔ پھر ۱۹۶۵ء میں والد گرامی کے حکم سے جامعہ محمدیہ (واقع جی ٹی روڈ گوجراں والا) میں داخلہ لیا۔ اس وقت جامعہ محمدیہ کے اساتذہ کرام تھے شیخ الحدیث مولانا عبداللہ (جن کی کوشش سے جامعہ محمدیہ کا قیام عمل میں آیا) موجودہ شیخ الحدیث مولانا عبدالحمید ہزاروی، مولانا جمعہ

خاں ہزاروی، حافظ عبدالمنان نور پوری، حافظ عبدالسلام بھٹوی، مولانا بشیر الرحمٰن نور پوری، مولانا عبدالرحمٰن لکھوی، مولانا مصباح الدین اور مولانا محمد رفیق سلفی۔

طالب علمی کے دوران ہی میں مولانا محمد بشیر طیب کے والد کی وفات کا حادثہ پیش آ گیا اور گھریلو حالات بالکل بدل گئے۔ آمدنی کی کوئی صورت نہ تھی۔ خیال ہوا کہ تعلیم کا سلسلہ ترک کر کے کوئی ایسا کام کیا جائے جس سے گھر کے اخراجات کا مسئلہ حل ہو۔ لیکن بعض قریبی رشتے داروں نے تعلیم جاری رکھنے کا مشورہ دیا اور کہا گھریلو معاملات سے متعلق کوئی تشویش نہ کرو اور علم حاصل کرو۔ چنانچہ عزیز و اقارب کی اس حوصلہ افزائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم بھی جاری رکھی اور اللہ نے گھر کے معاشی تفکرات سے بھی محفوظ رکھا۔

جامعہ محمدیہ کے زمانۂ طالب علمی میں وعظ و تقریر کا شوق پیدا ہوا۔ اس زمانے میں پنجاب کے اہل حدیث حلقوں میں کاموں کی کے شاہ عبدالغنی مرحوم کے وعظوں کی بڑی شہرت تھی۔ بالخصوص مسئلۂ توحید پر وہ بہت عمدہ تقریر کرتے تھے اور جو اسلوب تقریر انھوں نے اختیار کیا تھا اس سے لوگ بہت متاثر تھے۔ مولانا محمد بشیر نے بھی وہی اسلوب اختیار کرنے کی کوشش کی، جسے عام لوگوں کے علاوہ ان کے بعض اساتذہ نے بھی پسند کیا اور اس سے ان کی حوصلہ افزائی ہوئی۔

اس وقت گوجراں والا کے مولانا محمد صادق عتیق قصبہ ایمن آباد کی جامع مسجد اہل حدیث کے منصب خطابت پر فائز تھے۔ انھوں نے ایک دفعہ مولانا محمد بشیر طیب سے کہا کہ میں نے بدوملہی (ضلع سیالکوٹ) کے لوگوں سے وہاں جمعہ پڑھانے کا وعدہ کیا تھا لیکن میں اچانک بیمار ہو گیا ہوں، آپ وہاں جائیں اور جمعہ پڑھائیں۔ چنانچہ یہ وہاں پہنچے اور خطبہ جمعہ دیا۔ ان کا یہ پہلا خطبہ جمعہ تھا۔ ان کی تقریر سے لوگ بہت خوش ہوئے اور ان کے اصرار پر یہ وہاں دو مہینے خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے رہے۔ اس کے بعد ۱۹۷۱ء میں بدوملہی کی جامع مسجد اہل حدیث کے اربابِ انتظام نے ان کو مستقل طور سے خطیب مقرر کر لیا۔ پھر چھے سال (۱۹۷۶ء تک) وہاں ان کا سلسلۂ خطابت جاری رہا۔ بدوملہی کی خطابت کے زمانے میں انھوں نے وہاں درزی کا کام سیکھا۔ اس طرح یہ کپڑے کی سلائی کے ہنر سے شناسا ہو گئے۔ یہ ہنر آگے چل کر کویت میں ان کی آمدنی کا ذریعہ ثابت ہوا۔

پھر حالات ایسے پیدا ہوئے کہ ۱۹۷۶ء میں مولانا محمد صادق عتیق جو ایمن آباد کی جامع مسجد اہل حدیث کے خطیب تھے، گوجراں والا چلے گئے۔ اب ایمن آباد کی جماعت کے لوگ بدوملہی پہنچے اور مولانا محمد بشیر طیب کو خطیب کی حیثیت سے ایمن آباد لے آئے۔ پھر دو سال (۱۹۷۸ء تک) ایمن آباد کی جامع مسجد اہل حدیث کا منصب خطابت ان کے سپرد رہا۔

اب ان کی زندگی کا ایک اور مرحلہ سامنے آتا ہے۔ انھوں نے کویت جانے کا فیصلہ کیا۔ ان کا ارادہ وہاں جا کر لوگوں کے کپڑے سینے اور پیسے کمانے کا تھا۔ چنانچہ ۱۹۷۸ء میں یہ کویت گئے اور ۱۹۷۹ء تک تقریباً ایک سال درزی کی دکان پر کام کرتے رہے۔ پھر وزارتِ اوقاف میں کسی مسجد کے مؤذن کی تقرری کے لیے بھاگ دوڑ شروع کر دی اور اللہ نے اس میں کامیابی عطا فرمائی۔

ہوا یہ کہ ایک مرتبہ رات کو دیر تک کپڑے سیتے رہے۔ رات کے آخری حصے میں سوئے تو نیند نے ایسا غلبہ پایا کہ فجر کی نماز قضا ہو گئی۔ اس پر بے حد افسوس ہوا اور اپنے ضمیر کو ملامت کی کہ یہاں دنیا کمانے آئے ہو اور دین کو ترک کر رہے ہو۔ دین بھی ہاتھ سے نکل رہا ہے اور دنیا بھی نہیں مل رہی۔ اللہ سے رو رو کر دعا کی کہ یا اللہ ایسا کام مل جائے جس سے دین اور دنیا دونوں میں کامیابی حاصل ہو۔ چنانچہ ۱۹۷۹ء میں وزارتِ اوقاف کی طرف سے مؤذن کے طور پر تقرری ہو گئی۔

تقرری کیسے ہوئی؟ یہ بھی عجیب واقعہ ہے۔ انھوں نے عربی کی کتابیں تو جامعہ محمدیہ (گوجراں والا) اور بعض دیگر مدارس میں پڑھی تھیں لیکن عربی میں گفتگو کرنے کی مشق نہ تھی۔ عربی کے چند الفاظ بول لیتے تھے اور کام چل رہا تھا۔ کویت کے حالات اور وہاں کے اہم مقامات سے بھی زیادہ آگاہ نہ تھے۔ یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کویت کی وزارۃ الاوقاف والشؤن الاسلامیہ کا دفتر کہاں ہے اور اس میں ملازمت کے لیے درخواست کیسے دی جاتی ہے اور اس کے کس شعبے میں دی جاتی ہے۔ حسنِ اتفاق سے انھیں وہاں ایک پاکستانی حافظ نصیر الدین مل گئے جو محکمہ اوقاف کی ایک مسجد میں امام تھے۔ وہاں مؤذن، امام اور خطیب کا تقرر سرکاری طور پر ہوتا ہے اور اس عہدے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ حافظ نصیر الدین انھیں وزارتِ اوقاف میں لے گئے اور درخواست دے دی۔ حافظ صاحب موصوف سے ان کی یہ پہلی ملاقات تھی اور وزارتِ اوقاف کا دفتر بھی پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ اس دفتر میں جس شخص کو درخواست دی ان کے نام کا ایک جز بدر تھا وہ کویت کے رہنے والے تھے اور مدیر مساجد تھے۔ حافظ نصیر الدین سے ان کے اچھے تعلقات تھے۔

مدیر صاحب نے مولانا محمد بشیر طیب سے کہا: آپ پندرہ دن کے بعد یہاں آئیں۔ اس دن آپ کا انٹرویو ہوگا۔

دفتر سے باہر نکلے تو حافظ نصیر الدین نے ان سے کہا کہ میں آپ سے جتنا تعاون کر سکتا تھا، کر دیا۔ اب آپ آج سے پندرھویں دن یہاں آئیں اور انٹرویو دیں۔

یہ مقررہ دن انٹرویو کے لیے گئے تو وہاں ایک اور مدیر مساجد بیٹھے تھے جو چند روز قبل اس منصب پر فائز ہوئے تھے۔ پہلے مدیر مساجد کا کچھ پتا نہیں تھا کہ کہاں گئے۔ اس صورتِ حال سے انھیں پریشانی ہوئی کہ

معلوم نہیں اب کیا ہوگا۔ بدر صاحب سے تو کچھ تعارف ہو گیا تھا، نیا آدمی خدا جانے کیسے پیش آئے۔

بہر حال یہ ان کے پاس گئے اور السلام علیکم کہا۔

انھوں نے پوچھا: انٹرویو کے لیے آئے ہو؟

جواب دیا: جی ہاں انٹرویو کے لیے حاضر ہوا ہوں۔

کچھ اور لوگ بھی آئے تھے جو وہاں بیٹھے تھے۔ مدیر مساجد ان سب کو دفتر کی اوپر کی منزل میں لے گئے اور ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ انٹرویو دینے والوں کے ناموں کی فہرست ان کے ہاتھ میں تھی۔ ہر شخص کو نام لے کر اندر بلایا اور بٹھایا جاتا تھا۔ وہ انٹرویو دے کر باہر آتا تو دوسرے کا نام پکارا جاتا۔ مولانا محمد بشیر طیب کے نام کی آواز پڑی تو یہ اندر گئے۔ دیکھا کہ داڑھی منڈھے ایک بارعب مصری عالم کرسی پر تشریف فرما ہیں۔ ان کے سامنے کی کرسی پر یہ بھی بیٹھ گئے۔ مدیر مساجد بھی ساتھ ہی بیٹھے تھے۔

مصری عالم نے مولانا محمد بشیر طیب سے پوچھا: شیخ آپ کس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں؟

اب یہ سوچنے لگے کہ اس سوال کا کیا جواب دیا جائے۔ آخر جواب دیا کہ میں سلفی ہوں۔

مصری عالم سلفی کا لفظ سنتے ہی گرج کر بولے: سلفی کیا ہوتا ہے؟

اس کی بارعب آواز اور طرزِ تخاطب سے یہ گھبرا گئے۔ زندگی میں ان کا یہ پہلا انٹرویو تھا، وہ بھی دیارِ غیر میں اور عربی زبان میں۔

مصری عالم نے پھر سوال دوہرایا: آپ کا مذہب کیا ہے؟

مدیر مساجد بھی ان کے ساتھ ہی بیٹھے ہیں۔ مولانا ممدوح دونوں طرف سے پریشان ہیں۔ انٹرویو لینے والے مصری عالم کی طرف سے بھی اور مدیر مساجد کی طرف سے بھی۔

انھوں نے اپنے آپ کو گھبراہٹ سے نکالنے کی کوشش کی اور کچھ سنبھل کر جواب دیا: میں محمدی ہوں۔

یہ جواب بھی مصری عالم کے منشا کے خلاف تھا۔ وہ طیش میں آ گئے اور قدرے اونچی آواز میں بولے: میرا سوال آپ کی سمجھ میں نہیں آیا؟ میں پوچھ رہا ہوں کہ آپ کا مذہب کیا ہے؟ حنفی ہیں، مالکی ہیں، شافعی ہیں یا حنبلی ہیں؟ یہ چار مذاہب ہیں۔ بتایے آپ ان مذاہب میں سے کس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں؟

مولانا فرماتے ہیں کہ میں نے ٹوٹی پھوٹی عربی میں جواب دیا: جناب میں آپ کا سوال سمجھ گیا ہوں، لیکن میں آپ کے سوال کے متعلق ایک گزارش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

انھوں نے اجازت دے دی تو میں نے عرض کیا: یہ چار مذاہب تو بہت بعد میں آئے، ان مذاہب سے پہلے کون سا مذہب تھا؟

یہ سن کر انٹرویو لینے والے مصری عالم سوچ میں پڑ گئے۔ پھر چند لمحوں کے بعد فرمایا: احسنت یا شیخ! انت باکستانی؟ (شیخ آپ نے ٹھیک کہا۔ کیا آپ پاکستانی ہیں؟)

مصری عالم کا یہ جواب سن کر مولانا محمد بشیر طیب کا حوصلہ بڑھا اور مدیرِ مساجد کے چہرے پر بھی بشاشت کے آثار ابھرے۔ اس کے بعد چند اور سوالات پوچھے اور انٹرویو ختم ہو گیا۔

یہ کمرے سے باہر نکلے تو مدیر مساجد نے کہا: ابھی جانا نہیں، باہر بیٹھیے۔ یہ گھبرا گئے کہ معلوم نہیں اب کیا معاملہ پیش آئے گا اور مدیر صاحب کیا پوچھیں گے۔ ان کے سوالات کا جواب دیا جائے گا یا نہیں۔

کچھ دیر کے بعد مدیر صاحب فارغ ہوئے تو انھوں نے ان کا ہاتھ پکڑا اور دوسرے مدیر صاحب کے پاس لے گئے۔ وہ مدیر حج تھے۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ وہ مدیر صاحب بھی جن کے سامنے انٹرویو ہوا تھا، سلفی ہیں اور مدیر حج کا تعلق بھی سلفیت سے ہے۔ ان دونوں حضرات نے مولانا کا بہت احترام کیا اور چائے پلائی۔ پاکستانی علما و مشائخ کے بارے میں پوچھا۔ انھوں نے بتایا کہ میرا تعلق سید بدیع الدین شاہ راشدی، علامہ احسان الٰہی ظہیر، حضرت حافظ محمد گوندلوی (سابق استاذ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ) اور مولانا محمد اسماعیل سلفی سے ہے۔ اس سے وہ دونوں مدیرانِ کرام بہت خوش ہوئے اور پاکستان کے مدارس و جامعات سے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔

مولانا محمد بشیر طیب فرماتے ہیں کہ یہ مدیر مساجد عزت مآب بالغ الراشد العجمی تھے جن سے بعد میں ان کے دوستانہ مراسم قائم ہوئے، اور مدیر حج تھے جاسم العون جو کچھ عرصہ بعد کویت کی قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور منصب وزارت تک پہنچے۔

مدیر مساجد بالغ الراشد نے مولانا کو مبارک باد دی اور بتایا کہ آپ انٹرویو میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ چند ضروری امور مکمل ہونے کے بعد آپ کو کسی مسجد میں بھیج دیا جائے گا۔

بالغ الراشد کا اچانک اس منصب پر فائز ہونا مولانا محمد بشیر کے لیے اللہ کی رحمت ثابت ہوا، جن کی مسلکی ہم آہنگی کی بنا پر انھیں ملازمت ملی۔

اب ان کی باقاعدہ تقرری کے متعلق سنیے!

انٹرویو کے بعد وہاں کسی مسجد میں باقاعدہ تقرری اس وقت ہوتی ہے جب وزارتِ اوقاف میں درخواست گزار اور محکمۂ مساجد کے افسر اعلیٰ کے دستخط ہو جاتے ہیں اور دونوں فریقوں میں تحریری معاہدہ طے پا جاتا ہے۔ جب یہ دستخط کرنے گئے اور مدیر مالیہ کے کمرے میں داخل ہوئے تو اس نے پوچھا: کیسے آنا ہوا؟

جواب دیا: تقرری کے لیے۔

مدیر مالیہ نے فرمایا: ہمارے پاس تو کوئی خالی جگہ نہیں ہے۔ تقرری کہاں کریں۔

اس جواب سے انھیں پریشانی ہوئی کہ جب انٹرویو میں کامیاب ہو گئے ہیں اور حصولِ ملازمت کا آخری مرحلہ طے ہو چکا ہے تو جگہ نہ ہونے کا کیا مطلب؟ اگر جگہ نہیں تھی تو انٹرویو کیوں لیا گیا؟ اس دن بالغ الراشد بھی دفتر نہیں آئے تھے، وہ چھٹی پر تھے۔ مولانا نے جرأت کی اور مساجد کے مدیرِ اعلیٰ کے پاس چلے گئے۔ ان سے حاضری کی وجہ بیان کی تو انھوں نے مدیر مالیہ کو ٹیلی فون کیا کہ شیخ کی تقرری ضرور کی جائے۔ اب یہ دوبارہ ان کے پاس آئے تو انھوں نے دستخط کراتے وقت کہا کہ ماہانہ تنخواہ صرف ۵۵ دینار ہوگی۔ یہ منظور ہے تو دستخط کریں۔ اب پریشانی لاحق ہوئی کہ اس تنخواہ سے خود کیا کھائیں گے اور گھر کیا بھیجیں گے۔ اس وقت تیس دینار کے ایک ہزار پاکستانی روپے بنتے تھے۔

پھر خیال آیا کہ عزت کی ملازمت ہے، صاف ستھرا ماحول ہے، مسجد کے کمرے میں رہائش ہوگی۔ نماز باجماعت کا التزام ہوگا۔ اللہ بھلی کرے گا۔ فارغ وقت میں کپڑے کی سلائی کا کام کیا جا سکے گا۔ یہ باتیں سوچ کر دستخط کر دیے اور ملازمت اختیار کر لی۔ پھر اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ جب پہلی تنخواہ ملی تو وہ ۵۵ دینار کے بجائے ۷۰ دینار تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسی مہینے امیر کویت شیخ جابر احمد نے ملازموں کی تنخواہوں میں اضافہ کیا تھا۔ اس طرح حالات روز بروز بدلتے گئے۔ حکومتی قواعد کے مطابق تنخواہ میں اضافہ ہوتا گیا۔ دیگر سرکاری مراعات بھی ملنے لگیں، گریڈ بڑھا اور تمام معاملات اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے ٹھیک ہو گئے۔

کویت ہی میں ان کی مولانا عارف جاوید محمدی سے ملاقات ہوئی، مولانا عبدالخالق محمد صادق مدنی، حاجی عبداللہ شاد، ڈاکٹر حافظ محمد اسحاق زاہد، مولانا صلاح الدین مقبول احمد، احمد اللہ مبارک پوری، قاری عتیق الرحمٰن، انجینئر عبدالغفور، ملک جاوید اختر، حاجی حبیب الرحمٰن (فیصل آباد)، مولانا محمد انور سلفی، حاجی محمد امین گجراتی اور دیگر متعدد ہندوستانی اور پاکستانی اصحاب علم حضرات سے وہاں ملاقات و تعارف کے مواقع ملے۔ جمعیت احیاء التراث الاسلامی کی تشکیل عمل میں آئی تو دائرۂ کار مزید وسیع ہوا اور اہلِ علم سے تعارف کے حلقے دور تک پھیلتے چلے گئے۔

وہیں ہندوستان سے تشریف لے جانے والے فضلائے کرام میں سے حضرت مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈانگری، مولانا مختار احمد ندوی، مولانا عبدالحمید رحمانی، مولانا عبدالسلام رحمانی اور دوسرے بے شمار بزرگانِ عالی قدر سے میل جول کی سعادت حاصل ہوئی۔

مولانا محمد بشیر طیب کا محکمہ اوقاف کی بعض مساجد میں درسِ قرآن کا سلسلہ بھی جاری تھا، وہ درسِ حدیث بھی دیتے تھے، جمعہ بھی پڑھاتے تھے اور امامت کا فریضہ بھی سرانجام دیتے تھے۔ اپنی جگہ بے حد مطمئن تھے

اور اللہ تعالیٰ کے نہایت شکر گزار تھے کہ اس نے اپنے آبائی وطن سے ہزاروں میل دور اطمینان کی زندگی گزارنے کے اسباب پیدا فرمائے۔ یہ وہ اسباب تھے، جن کا انھیں ابتدائی دور میں کبھی تصور بھی نہیں ہوا تھا۔ اللہ نے ان کو مشکلات سے نکالا اور بہترین دینی فضا عطا فرمائی۔

جامعہ محمدیہ گوجراں والا میں وہ جن طلبا کی رفاقت میں کئی سال تحصیل علم کرتے رہے، ان کی تعداد تو یقیناً بہت زیادہ ہوگی، لیکن ان میں چند حضرات کے اسمائے گرامی یہ ہیں: پروفیسر ڈاکٹر فضل الٰہی، پروفیسر محمد سعید کلیروی، حافظ عبدالحمید ازہر اسلام آباد، مولانا عبدالعلیم علوی مدرس کلیۃ القرآن والحدیث فیصل آباد، پروفیسر عتیق الرحمٰن سیالکوٹ، مولانا محمد احمد مہموں والی، حکیم عبدالرحمٰن نظامی، مولانا عبیداللہ عبید، مولانا عبدالرشید ارشد، قاری عصمت اللہ اظہر، حکیم عبدالرشید، مولانا محمد صدیق سلفی۔

مولانا محمد بشیر طیب مقالہ نگاری اور مضمون نویسی کا ذوق بھی رکھتے تھے، ان کے زیادہ مضامین ہفت روزہ ''اہل حدیث'' (لاہور) میں شائع ہوئے۔ ایک کتاب ''بخشش کی راہیں'' چھپی۔

مولانا محمد بشیر طیب نے ۱۶- مارچ ۲۰۱۱ء کو کویت میں وفات پائی۔ ۱۸- مارچ کو جمعۃ المبارک کے روز ان کی میت ان کے گاؤں سنبھلا پہنچی۔ اسی روز عصر کے بعد ان کی نماز جنازہ حافظ عبدالمنان نور پوری نے پڑھائی۔ میں اور میرا چھوٹا بھائی سعید احمد بھٹی ان کے جنازے میں شامل تھے۔

اب مولانا محمد بشیر طیب کی اولاد کا تذکرہ ملاحظہ ہو۔

ان کی اولاد ماشاءاللہ پانچ بیٹے ہیں اور چار بیٹیاں۔

ایک بیٹے حافظ ابوبکر عتیق ہیں، فاضل جامعہ محمدیہ گوجراں والا۔ جامعہ اسلامیہ عالیہ اسلام آباد سے بی اے پاس کرنے کے بعد انھوں نے کراچی یونیورسٹی سے ایم اے اسلامیات کی ڈگری حاصل کی۔ گزشتہ کئی سال سے کویت کی وزارت اوقاف کی طرف سے موذن وخطیب ہیں، نیز وہیں کے دارالقرآن میں مدرس کی حیثیت سے فرائض سر انجام دے رہے ہیں۔

دوسرے بیٹے حافظ محمد ابوسفیان سلفی ہیں، انھوں نے جامعہ محمدیہ (گوجراں والا) سے سندِ فراغت لی اور اب وہیں خدمت تدریس میں مشغول ہیں۔ ہومیو پیتھک ڈاکٹر بھی ہیں۔ ایمن آباد میں سکونت پذیر ہیں اور وہاں کی جامع مسجد اہل حدیث کی خطابت وامامت انھی کے ذمے ہے۔

تیسرے بیٹے حافظ ابوقتادہ نے کمپیوٹر سائنس میں ایم اے کیا ہے۔

چوتھے بیٹے حافظ ابوعبیدہ کاظمی اور پانچویں بیٹے حافظ ابوہریرہ مدنی ہیں۔ یہ دونوں بیٹے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

چار بیٹیوں میں سے بڑی بیٹی ام علی صدیقہ طیبہ مدرسہ تعلیم القرآن والحدیث کی فاضلہ اور وفاق المدارس السّلفیہ کی سند یافتہ ہیں۔ انھوں نے کوٹلی نواب علاقہ واہنڈو میں مدرسہ کلیۃ الاسلامہ للبنات جاری کیا ہے۔ اللہ نے اولاد بھی عطا فرمائی ہے۔

دوسری بیٹی ام زید ثوبیہ طیبہ بھی گوجراں والا کے مدرسہ تعلیم القرآن والحدیث کی فاضلہ اور وفاق المدارس السّلفیہ کی سند یافتہ ہیں۔ بی اے پاس ہیں اور شاء اللہ بچوں والی ہیں۔

تیسری بیٹی جویریہ طیبہ گھر میں بچوں کو قرآن کا ترجمہ پڑھاتی ہیں اور ایم اے اسلامیات ہیں۔

چوتھی بیٹی اسماء طیبہ بھی تعلیم یافتہ ہیں۔

گزشتہ سطور میں مولانا محمد بشیر طیب کے حالات بھی معرضِ بیان میں آ گئے ہیں اور ان کے بیٹے بیٹیوں کا تذکرہ بھی کر دیا گیا ہے۔ یہ سطور ۱۵۔ اپریل ۲۰۱۱ء کو لکھی گئی تھیں۔ اب ان کے بیٹے بیٹیاں علم میں مزید ترقی کر گئے ہوں گے۔

یہاں یہ عرض کر دوں کہ میں جب جولائی ۲۰۰۸ء میں کویت گیا تو مولانا محمد بشیر طیب نے مجھے تحفۃً کمبل عنایت فرمایا تھا جو سردیوں میں میرے استعمال میں آتا ہے۔ ہم عاجز بندوں کی بارگاہِ الٰہی میں دعا ہے کہ انھیں جنت الفردوس نصیب ہو اور ان کی آل اولاد کا دینی اور دنیوی اعتبار سے مستقبل بہتر ہو۔

مولانا عبدالحکیم مجاز اعظمی

(وفات ۲۴۔ دسمبر ۲۰۱۱ء)

آج ۲۸۔ جون ۲۰۱۳ء ہے۔ ایک سال قبل جولائی ۲۰۱۲ء میں اچانک میرے ذہن کے دریچے پر مجاز اعظمی کی یاد نے دستک دی۔ میں نے ان کو نہیں دیکھا، لیکن بہت سال ہوئے، جب وہ ''ترجمان'' (دہلی) کے منصب ادارت پر فائز تھے اور میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' (لاہور) میں یہی خدمت سرانجام دیتا تھا تو ان سے غائبانہ جان پہچان ہوئی اور خط کتابت کا سلسلہ بھی چلا۔ وہ بہت اچھا لکھتے تھے اور شاعر بھی تھے۔ بہرحال ان کی یاد میرے ذہن پر اتنی غالب آئی کہ میں نے دہلی ایک دوست کو ٹیلی فون کیا اور ان کے متعلق پوچھا تو پتا چلا کہ وہ ۲۴۔ دسمبر ۲۰۱۱ء کو وفات پا گئے ہیں۔ یہ الفاظ سن کر بہت افسوس ہوا، لیکن سوائے انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھنے کے کوئی چارہ نہ تھا۔

اب ذہن گزشتہ ۶۵ سال قبل کے سیاسی واقعات کی طرف منتقل ہوا، اس وقت صرف ملک کے بٹوارے کا فیصلہ ہوا تھا، علم کی تقسیم کا فیصلہ ہرگز نہیں ہوا تھا اور نہ کسی طرف سے یہ سوال اٹھایا گیا تھا کہ دونوں ملکوں میں سے کسی ملک کا کوئی اہل علم آسانی سے کسی سے میل ملاقات نہیں کر سکے گا اور نہ آنے جانے میں کوئی سہولت دی جائے گی۔ گزشتہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مطلق العنان بادشاہوں کے دور میں بھی علما وصوفیا کی ہر ملک میں بلاخوف وخطر اور بغیر کسی قسم کی اجازت کے آمد و رفت رہتی تھی اور ان کے وعظ و تبلیغ کے سلسلے جاری رہتے تھے۔ غیر مسلم پروہت اور سادھو بھی ہر مسلمان ملک کے ہر مقام پر آتے جاتے اور کامل آزادی سے اپنے مذہب کے اوصاف بیان کرتے تھے لیکن افسوس ہے نہ اب ہندوستان کے اہل علم آسانی سے پاکستان آ سکتے ہیں، نہ پاکستان کے ہندوستان جا سکتے ہیں۔ دونوں ملکوں کے مصنفین کی کتابوں کی دست یابی میں بھی مشکلات پیدا کر دی گئی ہیں۔ بہر کیف میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ گزشتہ سال مجاز اعظمی صاحب بہت یاد آئے۔

اب آگے چلیے۔ ۱۵ مئی ۲۰۱۲ء کو شب کے دس بجے مئو ناتھ بھنجن سے مکتبۃ الفہیم کے مولانا عزیز الرحمٰن صاحب کا ٹیلی فون آیا کہ اپنا ای میل باکس دیکھیے۔ میں نے دیکھا تو اس سے مولانا مجاز اعظمی سے متعلق دو مضمون برآمد ہوئے۔ ایک مولانا محمد اعظمی کا تحریر فرمودہ تھا اور ایک جناب اطہر افضال (نئی دہلی) کا رقم کردہ۔ یہ دونوں مضمون میں نے ہفت روزہ ''الاعتصام'' کو بھجوا دیے۔ مولانا اعظمی کا مضمون ۳ تا ۹۔ اگست

۲۰۱۲ء کے ''الاعتصام'' میں چھپا اور جناب اطہر افضال کا ۱۰ تا ۱۶۔ اگست ۲۰۱۲ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ یہ دونوں ہندوستانی اصحابِ قلم کے مضامین تھے، پاکستانی قارئین نے کہاں پڑھے ہوں گے۔ اگر کسی نے پڑھ بھی لیے تو اب اسے کہاں یاد ہوں گے۔ ویسے بھی ہمارے ہاں خالص علمی شخصیتوں سے لوگوں کا جو تعلق رہ گیا ہے، اس کی تفصیل میں نہ جانا ہی بہتر ہے۔ میرا خیال ہے ان دونوں ہندوستان فاضل مضمون نگاروں کو بھی پتا نہیں چلا ہوگا کہ ان کے مضمون پاکستانی اخبار میں چھپ گئے ہیں۔

ان چند ابتدائی گزارشات کے بعد مولانا مجاز اعظمی کے کچھ تفصیلی حالات کا مطالعہ کیجیے۔!

ان کے والد کا نام عبدالاحد، دادا کا محمد صابر اور پردادا کا حاجی محمود عالم تھا۔ اس خاندان کا تعلق صوبہ یوپی کے شہر مئوناتھ بھنجن سے تھا اور یہ لوگ پارچہ بافی کا کام کرتے تھے۔ دین داری اور تقویٰ شعاری میں مشہور تھے۔ ان کا بنایا ہوا کپڑا رانچی اور پٹنہ تک جاتا تھا۔ ان میں کچھ لوگ غلے کا کاروبار بھی کرتے تھے۔ اس خاندان کے ایک عالم دین مولانا محمد سعید تھے جن کا شمار مئوناتھ کے مدرسہ عالیہ کے طبقہ اولیٰ کے فضلا میں ہوتا تھا۔ انھوں نے دہلی جا کر حضرت میاں سید نذیر حسین سے بھی شرف تلمذ حاصل کیا تھا۔ خاندان کے ایک اور بزرگ صوفی عبدالحفیظ تھے، جو مولانا اسماعیل شہید دہلوی اور سید احمد شہید رائے بریلوی کی تحریک مجاہدین سے منسلک تھے۔

مجاز اعظمی اس علم دوست اور پیکر صالحیت خاندان میں ۱۹۲۶ء (۱۳۴۴ھ) کو پیدا ہوئے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ ان کی تعلیمی اسناد کے مطابق تاریخ ولادت اپریل ۱۹۲۹ء ہے۔ لیکن ان کے بھتیجے مولانا ابوالقاسم عبدالعظیم (مئوناتھ بھنجن) اس کی تردید کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ''خاندانی روایت کے مطابق ان کی حقیقی تاریخ ولادت ۱۳۴۴ھ (مطابق ۱۹۲۶ء) ہے۔'' [1]

مجاز اعظمی کا نام عبدالحکیم تھا اور مجاز ان کا تخلص۔ ''اعظمی'' کی نسبت کا پس منظر یہ ہے کہ اس وقت ان کا آبائی مسکن مئوناتھ بھنجن ضلع اعظم گڑھ کا ایک قصبہ تھا یعنی مجاز صاحب ضلع اعظم گڑھ میں رہتے تھے، اس لیے اعظمی کہلاتے تھے۔ اس کے بعد حکومتِ ہند نے مئوناتھ بھنجن کو ضلع بنا دیا۔ اس شہر اور ضلع کے علما کو ''مئوی'' کی نسبت سے پکارا جاتا ہے۔ اس علاقے میں مسلمان بہت بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ اہل حدیث بھی کثرت سے ہیں اور ان کے مدارس و جامعات بھی کافی ہیں، جن میں ماشاءاللہ ہزاروں طلبا تعلیم حاصل کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں۔

عبدالحکیم مجاز اعظمی کی تعلیم کا آغاز اپنے شہر مئو کے مدرسہ عالیہ سے ہوا جو اس نواح کا قدیم ترین تدریسی ادارہ ہے۔ دینی مدارس کے نصاب کے مطابق وہاں انھوں نے جماعت ثانیہ تک تعلیم حاصل کی۔

اس کے بعد ۱۹۴۲ء میں دہلی گئے اور دار الحدیث رحمانیہ میں داخلہ لیا جو دہلی کے دو اصحابِ ثروت

[1] ملاحظہ ہو: سہ ماہی ''افکارِ عالیہ'' جنوری تا مارچ ۲۰۱۲ء مئوناتھ بھنجن۔ حاشیہ صفحہ: ۹

بھائیوں (شیخ عبدالرحمٰن اور شیخ عطاء الرحمٰن) نے حضرت مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی کے مشورے اور تحریک سے ۱۹۲۱ء میں جاری کیا تھا۔ وہاں انھوں نے حضرت مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوری کی خدمت میں حاضری دی اور اپنا مقصد بیان کیا۔ اس وقت ان کی عمر سولہ سال کی تھی۔ مولانا نے ان کا امتحان لیا اور داخلے کی نوید سنائی۔ وہ ۱۹۴۲ء میں اس دارالحدیث میں داخل ہوئے تھے اور پانچ سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۴۷ء میں وہاں سے فارغ ہوئے اور رحمانی کی نسبت پائی۔

دارالحدیث رحمانیہ میں انھوں نے جن جلیل القدر اساتذہ سے تحصیل علم کی ان میں مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوری، مولانا نذیر احمد رحمانی املوی، مولانا عبدالجلیل رحمانی، مولانا اصحاب الدین پشاوری، مولانا محمد بشیر مبارک پوری، مولانا عبدالصمد حسین آبادی اور مولانا عبدالحلیم پشاوری کے اسمائے گرامی بہ طورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔

اس سے قبل مدرسہ عالیہ مئوناتھ بھنجن میں جن حضرات سے انھوں نے حصولِ فیض کیا، ان میں مولانا حکیم محمد سلیمان رحمانی مئوی اور مولانا عبدالصمد رحمانی مبارک پوری شامل ہیں۔

مجازؔ اعظمی دراصل دارالحدیث رحمانیہ آکر مجازؔ اعظمی ہوئے، وہ گھر سے عبدالحکیم کے نام کے ساتھ نکلے تھے، دہلی کی ادبی فضا اور رحمانیہ کے علمی ماحول نے ان کو تحریر و نگارش کی راہ پر لگایا اور وہ شعر و شاعری کی وادیٔ دل نواز میں داخل ہوئے۔ اسی ادارۂ خوش رنگ کے ماہنامہ ''محدث'' سے انھیں مضمون نگاری کی منزلِ حسین کی طرف قدم زن ہونے کی تلقین ہوئی اور وہ قلم کے ذریعے اپنے دلی جذبات کو کاغذ پر مرتسم کرنے لگے۔ ان کا پہلا مضمون ''محدث'' میں شائع ہوا تو ان کے استاذِ مکرم مولانا نذیر احمد رحمانی املوی نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور اس سلسلے کو جاری رکھنے کی ترغیب دی۔ عالی قدر استاذ کے کلماتِ تحسین ان کے اشہب قلم کے لیے غذا اور سمندِ فکر کے لیے مہمیز ثابت ہوئے۔

دارالحدیث رحمانیہ کے زمانۂ تعلیم میں انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ ۱۹۴۶ء میں وہ بھوپال گئے اور وہاں علامہ خلیل عرب سے عربی ادب و لغت میں اخذِ فیض کیا۔ اس وقت دہلی سے اہل حدیث کے دو اور جریدے بھی شائع ہوتے تھے۔ ایک مولانا عبدالحنان علوی کا ہفت روزہ ''اہل حدیث گزٹ'' اور دوسرا مولانا حافظ عبدالستار دہلوی کا ''صحیفۂ اہل حدیث''۔ مجازؔ اعظمی کے رشحاتِ قلم کی اشاعت ان جرائد میں بھی ہوتی تھی۔

ان کے زمانۂ طالب علمی میں دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی اور کانگرس، احرار، جمعیت علماے ہند اور دیگر سیاسی جماعتوں کے زعما و ارکان کو انگریزی حکومت نے جیلوں سے رہا کیا تو دہلی سیاست دانوں کا مرکز بن گئی اور ملک کی آزادی کے لیے برطانوی حکومت سے گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔ عوامی جلسے بھی ہونے لگے۔ مجاز

اعظمی نے ان سیاسی معاملات میں لازماً دلچسپی لی ہوگی اور واقعات کے اس اہم موڑ پر یقیناً ان کا کوئی نقطۂ نظر رہا ہوگا۔ وہ شاعر تھے، مضمون نگار تھے، ملک کے دارالحکومت دہلی میں مقیم تھے۔ سیاست کی چہل پہل ان کے سامنے پورے جوبن پر جلوہ گر تھی، عملی یا فکری طور پر انھوں نے اس میں تھوڑا بہت ضرور حصہ لیا ہوگا۔ حساس ذہن ہرگز اس قسم کے حالات سے دامن کشاں نہیں رہ سکتا۔ ع

دل آیا ہے تری اٹھتی جوانی ابھرے جوبن پر

مولانا مجاز اعظمی نے ۱۹۴۷ء میں جب دارالحدیث رحمانیہ سے سندِ فراغ لی، اس وقت ملک دو حصوں میں تقسیم ہو رہا تھا اور اس تقسیم کے خوں ریز چھینٹے اس طرح زور سے اس دارالحدیث پر گرے کہ اسے ختم کر دیا اور وہ دوبارہ سر نہ اٹھا سکا۔ مجاز اعظمی اس دارالحدیث کے سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی بنے اور وہ دہلی سے وطن مالوف کو لوٹے تو سند کی صورت میں رحمانیہ کی طرف سے عطا کردہ علمی تحفہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے بعد اس دارالحدیث کی طرف سے سندوں کے اس عطیے کا باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

وطن آتے ہی انھیں وہاں کی جامعہ عالیہ عربیہ کی مسند درس پر متمکن کر دیا گیا۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۸ء تک ایک سال انھوں نے اس جامعہ میں تدریسی خدمات سر انجام دیں۔ ۱۹۴۹ء میں وہ دہلی آ گئے۔ وہ نہایت افراتفری اور پریشانی کا زمانہ تھا۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری کا ہفت روزہ اخبار ''اہل حدیث'' جو امرتسر سے شائع ہوتا تھا، بند ہو چکا تھا۔ اس کی یاد میں مولانا سید تقریظ احمد سہسوانی نے دہلی سے اخبار ''اہل حدیث'' جاری کیا تو مولانا مجاز اعظمی کو اس کے عملۂ ادارت میں شامل کر لیا گیا۔

اس ہنگامہ خیز دور میں مولانا مجاز اعظمی کو بہت سے نشیب و فراز سے گزرنا پڑا۔ ملکی حالات کے ساتھ ساتھ مالی حالات بھی بے حد تکلیف دہ تھے، لیکن مجاز اعظمی نہایت خود دار اور باحمیت اہل علم تھے۔ وہ کسی کے سامنے اپنی تکلیف بیان کرنے کے عادی نہ تھے۔ اس کا اندازہ ان کے ان دو اشعار سے ہوتا ہے، جن سے ان کے کردار کی پوری تصویر لکھ کر نظر و بھر کے زاویوں میں آ جاتی ہے:

غیرتِ نفس پہ ہر وقت نظر رکھتا ہوں
دامنِ تنگ میں کچھ لعل و گہر رکھتا ہوں
اہل دنیا پہ نہ ظاہر ہو میری تشنہ لبی
اس لیے ہونٹوں کو ہر حال میں تر رکھتا ہوں

تقسیم ملک کے نتیجے میں پیش آنے والے روح فرسا واقعات کے بعد جب سلفیانِ ہند کو کسی قدر سکون کی فضا میسر آئی تو انھوں نے جماعت کو دوبارہ منظم کرنے کا عزم کیا اور ۱۹۵۳ء میں دہلی سے آل انڈیا اہل

حدیث کانفرنس کا داعی ماہنامہ ''ترجمان'' جاری کیا گیا۔ مولانا عبدالوہاب آروی نے جو اس وقت آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کے صدر تھے مولانا مجاز اعظمی کو ''ترجمان'' کے ایڈیٹر مقرر کیا۔ یہ ان کی جوانی کا زمانہ تھا اوران کے قلم کی رفتار اتنی تیز تھی کہ ہر صنف تحریر اس کی لپیٹ میں تھی۔ نثر بھی، نظم بھی، ترجمہ بھی۔ انھوں نے نہایت محنت سے کام کیا اور ۱۹۵۸ء تک پورے چھے سال وہ ترجمان کی ادارت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔

اخبار اور جماعت کے دفتر کے چھوٹے موٹے تمام کام وہ خود کرتے تھے۔ ترجمان اس وقت الاعتصام کے تبادلے میں آتا تھا اور اس کے مندرجات کا بڑے شوق سے مطالعہ کیا جاتا تھا۔ جس طرح وہ چپڑاسی سے لے کر ایڈیٹر تک کے تمام فرائض ادا کرتے تھے، اسی طرح یہ فقیر بھی ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں طویل عرصے تک ہر قسم کے کام خود ہی کرتا رہا۔

اردو کے علاوہ عربی زبان میں بھی مولانا مجاز اعظمی مہارت رکھتے تھے۔ اس کا مختصر سا تذکرہ مولانا ضیاء الحسن محمد سلفی کی زبانی سنیے جن کا ان سے قریبی تعلق رہا۔ ان کا بیان ہے:

> ''۱۹۵۵ء میں جب شاہ سعود والیِ حجاز ہندوستان تشریف لائے اور ان کے اعزاز میں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کی طرف سے لال قلعہ دہلی کے دیوانِ خاص میں استقبالیہ تقریب منعقد ہوئی تو آپ (مولانا مجاز اعظمی) نے اپنی عربی ادب کی بلاغت و فصاحت کو بروئے کار لا کر عربی زبان میں کلمۃ الترحیب (سپاس نامہ) تحریر کیا تھا جو قائد ملت مولانا عبدالوہاب آروی نے پیش کیا تھا۔ یہ سپاس نامہ مولانا مجاز اعظمی کی عربی ادب کی صلاحیت کا حسین شاہ کار تھا۔ اس موقعے پر آپ نے ''ترجمان'' کا جو شاہ سعود نمبر شائع کیا، اسے کافی شہرت حاصل ہوئی تھی۔'' [1]

جماعتوں کے معاملات عجیب قسم کے ہوتے ہیں اور ان میں مختلف افکار اور مختلف ذہنی ساخت کے لوگوں کا عمل دخل جاری رہتا ہے۔ بسا اوقات سرمایہ دار لوگ اپنے مالی تعاون کی وجہ سے اہل علم پر غالب آجاتے ہیں۔ بہرکیف کسی وجہ سے چھے سال کی خدمت کے بعد ۱۹۵۸ء میں مولانا مجاز اعظمی ''ترجمان'' کی ادارت سے الگ ہو گئے (یا الگ کر دیے گئے)۔ پھر ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۸ء تک وہ دہلی سے شائع ہونے والے جماعت اسلامی کے آرگن ''دعوت'' سے منسلک رہے۔ اس اخبار میں وہ ''ذکر و فکر'' کے عنوان سے کالم لکھتے تھے اور ''کوہ پیا'' کے نام سے روزانہ ان کا قطعہ بھی اس اخبار میں چھپتا تھا، جس میں ملک کے سیاسی حالات کی عکاسی کی جاتی تھی۔

اس اثنا میں انھوں نے معاشرتی اور تاریخی موضوع پر چند کتابیں بھی لکھیں۔ ان کتابوں میں روحِ نماز، اسلامی زندگی، آثارِ نبوت، روحانی عورت، ہدایت نامہ مسلمان بیوی، ہدایت نامہ مسلمان شوہر، خلیفہ اسلام

[1] سہ ماہی افکار عالیہ، صفحہ: ۵۶، ۵۷۔

اول اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مجاؔز صاحب کم وبیش بیس سال دہلی رہے اور اس دوران میں انھوں نے بے شمار تحریری کام کیے۔ اس شہر کے علما وادبا اور سیاست دانوں سے بھی ان کے تعلقات رہے۔ وہ علمی اور ادبی مجلسوں میں شریک ہوتے اور اپنے ملک میں پیش آنے والے مسائل پر بحث کرتے تھے۔

وہ سخت قسم کے حوادث سے بھی دوچار ہوئے۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۹ء تک یکے بعد دیگرے تھوڑے عرصے میں ان کی ایک بیٹی اور تین بیٹوں نے وفات پائی۔ اولاد کی موت نے ان کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔

اب دہلی کی بیس سالہ علمی سکونت ترک کر کے ۱۹۶۹ء میں وہ اپنے آبائی وطن مئوناتھ بھنجن چلے گئے۔ وہاں انھوں نے ''کتابستان'' کے نام سے ایک مکتبہ قائم کیا، لیکن وہ چل نہ سکا۔ بالآخر جامعہ عالیہ عربیہ کے ناظم اعلیٰ مولانا عبدالاحد انھیں جامعہ عالیہ میں لے گئے۔ پہلے دفتری امور سے منسلک ہوئے۔ پھر تدریسی خدمات سرانجام دینے لگے۔ تفسیر، ادب، بلاغت اور عقیدے سے متعلق کتابوں کی تدریس ان کے ذمے لگائی گئی۔ اسی اثنا میں کلیہ فاطمۃ الزہرا میں ۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۵ء تک فریضہ تدریس ادا کیا۔

مجاؔز صاحب جہاں ممتاز صحافی، نامور مقالہ نگار، کامیاب مدرس تھے، وہاں بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ ان سے متعلق مضمون لکھنے والے تمام حضرات نے ان کی شاعری کا ذکر کیا ہے اور ان کے اشعار درج بھی کیے ہیں۔ آخری عمر کے شعر ملاحظہ ہوں، جن میں عمر رفتہ کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے:

یوں چلوں سر خم کہ جیسے عمرِ رفتہ کی تلاش
آگے بڑھتا جاؤں اس سے دور ہوتا جاؤں میں
میرے چہرے کی لکیروں پر حروفِ آخریں
سب پڑھیں، پڑھنے سے خود معذور ہوتا جاؤں میں

تدریس کے زمانے میں مولانا مجاز اعظمی سے بے شمار طلبا وعلما نے استفادہ کیا۔

اس عالم کبیر اور معلمِ جلیل نے ۸۵ سال عمر پا کر ۲۴۔ دسمبر ۲۰۱۱ء کی صبح کو اپنے آبائی وطن مئوناتھ بھنجن میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔ اسی دن نمازِ ظہر کے بعد ان کی نمازِ جنازہ اُن کے بھتیجے مولانا ابوالقاسم عبدالعظیم نے پڑھائی، جس میں ہزاروں لوگوں نے شرکت کی۔

اللهم اغفرله وارحمه وعافه واعف عنه .

سید عبدالشکور شاہ اثری

(وفات ۲۹- اگست ۲۰۱۲ء)

میانہ قد، متوازن جسم، گورا رنگ، تیکھی ناک، موٹی چمک دار آنکھیں، باریک ہونٹ، کشادہ پیشانی، نرم کلام، حلیم الطبع، چہرے کے طول و عرض پر قابض قد آور داڑھی، سر پر بڑا سا رومال، شلوار قمیص لباس۔ سادگی پسند، تقویٰ و طہارت کی دولت سے مالا مال، بلند کردار اور اخلاق حسنہ کی نعمت سے بہرہ مند، خوب رو اور صاف دل۔ وظائف و اوراد کے خوگر، باعمل عالم، منجھے ہوئے مدرس اور خوش گفتار خطیب۔ یہ تھے مولانا سید عبدالشکور شاہ اثری، جنھیں عام طور پر شاہ صاحب کہا جاتا تھا۔

یہ سطور ۱۴- نومبر ۲۰۱۲ء کو لکھی جارہی ہیں۔ میری ان سے پہلی ملاقات آج سے کم و بیش تیس برس پہلے شیش محل روڈ پر مکتبہ سلفیہ میں ہوئی تھی۔ میں اس وقت ادارہ ثقافت اسلامیہ سے منسلک تھا۔ دفتر جاتے ہوئے مکتبہ سلفیہ میں اپنے موضوع کی کچھ کتابیں لینے گیا تو وہاں ایک صاحب حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے باتیں کر رہے تھے۔ مولانا مرحوم نے ان سے تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ ان کا اسم گرامی سید عبدالشکور شاہ ہے۔ یہ سانگلہ ہل میں سکونت پذیر ہیں اور حافظ عبداللہ بڈھیمالوی کے داماد ہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے نام اور کام سے تو متعارف تھے لیکن بالمشافہ ملاقات اس دن ہوئی۔ حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی مرحوم میری والدہ مرحومہ کے خالہ زاد تھے۔

مکتبہ سلفیہ میں شاہ صاحب کے ہاتھ میں حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ کی سوانح عمری ''الحیات بعد الممات'' تھی جو تقسیم ملک سے بہت سال قبل دہلی سے شائع ہوئی تھی اور اب شاہ صاحب نے اپنے مکتبہ اثریہ سانگلہ ہل کی طرف سے اس کا عکس شائع کیا تھا۔ اس پہلی ملاقات کے بعد ان سے جو مراسم پیدا ہوئے وہ اللہ کی مہربانی سے ہمیشہ قائم رہے۔ میں تھوڑا بہت جو قلمی کام کر رہا ہوں، بحمد اللہ وہ اس پر خوش تھے اور میرے لیے ان کی خوشی بہت بڑے اعزاز کا درجہ رکھتی تھی۔

سید عبدالشکور اثری ۱۹۳۴ء کو موضع چک ملیرہ تحصیل سرسہ ضلع حصار میں پیدا ہوئے۔ مختصر سلسلۂ نسب یہ ہے: عبدالشکور شاہ بن زبیر شاہ بن بشیر الدین شاہ بن فضل شاہ فاروقی۔

تقسیم ملک کے وقت صوبہ پنجاب انتیس ضلعوں پر مشتمل تھا۔ ان میں سے سترہ ضلعے پاکستان کو ملے اور

بارہ ہندوستان کے حصے میں آئے۔ ان بارہ اضلاع کے علاوہ مشرقی پنجاب کی آٹھ ریاستوں پر بھی ان کا قبضہ ہوا۔ ان بارہ اضلاع اور آٹھ ریاستوں کو اس زمانے میں مشرقی پنجاب کہا جاتا تھا۔ پھر حکومتِ ہند نے مشرقی پنجاب کے تین صوبے بنا دیے، ایک پنجاب، دوسرا ہماچل پردیش اور تیسرا ہریانہ۔ ضلع حصار کو صوبہ ہریانہ میں شامل کر دیا گیا۔

تقسیم ملک کے وقت عبدالشکور شاہ کی عمر تیرہ سال کی تھی اور وہ پرائمری پاس تھے۔ قرآن مجید بھی پڑھ لیا تھا۔ ترکِ وطن کے بعد اپنے خاندان کے ساتھ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے قریب ایک گاؤں بیریاں والا میں سکونت اختیار کی۔ اس وقت ٹوبہ ٹیک سنگھ ضلع فیصل آباد کی ایک تحصیل تھا، اب ضلع ہے۔

مرحوم و مغفور سید مولا بخش کومی بھی قیامِ پاکستان کے بعد اپنے آبائی وطن کوم ضلع لدھیانہ سے نکل کر اسی علاقے (ٹوبہ ٹیک سنگھ) میں آ بسے تھے۔ اللہ نے ان کو علم و عمل اور اتقا و صالحیت سے خوب نوازا تھا اور کچھ طلبا ان سے تحصیل علم کرتے تھے۔ سید عبدالشکور شاہ بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے اخذِ فیض کرنے لگے۔ مشکوٰۃ شریف اور بعض دیگر درسی کتابیں ان سے پڑھیں۔

پھر چک ۴۹۳ گ ب اوڈاں والا چلے گئے، جہاں قیامِ پاکستان سے پچیس چھبیس برس پہلے صوفی عبداللہ مرحوم نے دارالعلوم تعلیم الاسلام کے نام سے مدرسہ جاری کیا تھا۔ اس مدرسے میں متعدد اساتذہ طلبا کو تعلیم دینے پر مامور تھے۔ عبدالشکور شاہ نے وہاں کے قابل احترام اساتذہ سے بعض فنون کی کتابیں پڑھیں۔

اوڈاں والا میں جلال پور پیر والا (ضلع ملتان) کے دارالحدیث محمدیہ کا پتا چلا تو شاہ صاحب نے وہاں کا عزم کیا۔ اس دارالحدیث میں شیخ الحدیث مولانا سلطان محمود صاحب کا سلسلۂ تدریس جاری تھا، وہ اس میں شامل ہو گئے۔ وہاں اس وقت جو حضرات حصولِ علم میں مشغول تھے، ان میں وہاں کے موجودہ دور کے شیخ الحدیث مولانا محمد رفیق اثری بھی شامل تھے۔ مولانا سلطان محمود رحمہ اللہ سے شاہ صاحب نے خوب استفادہ کیا۔

شاہ صاحب نہایت محنت اور انہماک سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ طلبِ علم کے علاوہ انھیں کسی معاملے سے کوئی سروکار نہ تھا۔ نہ کسی سے بے مقصد بات کرتے اور نہ کسی سے بحث و مباحثہ کرتے۔ صرف پڑھنا اور مطالعہ کرنا ان کا شب و روز کا مشغلہ تھا۔ صالحیت اور تقوے کی دولت بھی اللہ نے ان کو عطا فرمائی تھی۔

دارالحدیث محمدیہ سے فراغت کے بعد انھوں نے گوجراں والا میں محدث دوراں حضرت حافظ محمد گوندلوی کے آستانۂ فضیلت پر حاضری دی اور ان سے سندِ حدیث لی۔ حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی کے حضور بھی زانوئے ادب تہہ کیے اور ان سے مستفید ہوئے۔

فارغ التحصیل ہوئے تو درس و تدریس اور خطابت کو اپنا اصل مشغلہ قرار دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ بہت سی

اہم کتابوں کی اشاعت و طباعت کو بھی اپنی سرگرمیوں کا محور ٹھہرایا۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ کی جامع مسجد اہل حدیث میں وہ طویل عرصے تک خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے رہے۔ اب بہت مدت سے اس مسجد کے منصبِ خطابت پر ہمارے عزیز دوست مولانا برق توحیدی متمکن ہیں۔

شاہ صاحب مناظر بھی تھے۔ بعض مسائل میں ٹوبہ ٹیک سنگھ اور اس کے گردو پیش کے علمائے احناف سے ان کے مناظروں اور مباحثوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر مناظرے میں ان کو کامیابی سے نوازا۔

مولانا برق توحیدی نے اپنے ماہنامے ''التوحید'' (اکتوبر ۲۰۱۲ھ کے شمارے) میں لکھا ہے کہ شاہ صاحب کا ایک مرتبہ حافظ عبدالقادر روپڑی سے بھی مناظرہ ہوا تھا۔ اس مناظرے کا ذکر برق توحیدی صاحب کے الفاظ ہی میں کیا جائے تو مناسب رہے گا۔ وہ تحریر کرتے ہیں:

''ایک مرتبہ جناب مفتی عصر حضرت العلام حافظ محمد عبداللہ روپڑی اور رئیس المناظرین حضرت حافظ عبدالقادر روپڑی رحمہ اللہ ناگرہ گاؤں تشریف لائے۔ حافظ عبدالقادر روپڑی رحمہ اللہ نے نکاحِ شغار کی ممانعت اور حرمت میں بلا شرط آپس میں رشتے کے لین دین کو بھی شمار کیا۔ مولانا سید عبدالشکور اثری رحمہ اللہ کا موقف اس کے خلاف تھا۔ وہ فرماتے تھے کہ نکاح میں اگر مساواتِ مہر یا خود دوسری لڑکی کو مہر بنانے جیسی شروط نہ ہوں تو ایک دوسرے سے رشتہ کرنا حرام نہیں۔ ان کے اس موقف کے وہاں کے کچھ لوگ بھی قائل تھے۔ ان لوگوں نے حافظ عبدالقادر روپڑی رحمہ اللہ سے کہا کہ سید عبدالشکور شاہ تو اس کو جائز سمجھتے ہیں۔ حافظ صاحب نے سخت الفاظ میں مثال دے کر اس کی حرمت کی بات کی تو لوگوں نے کہا ہم شاہ صاحب کو بلا لیتے ہیں، آپ ان سے اس مسئلے میں مناظرہ کر لیں۔ حافظ صاحب مناظرے کے لیے ہر وقت اسی طرح تیار رہتے تھے، جس طرح شکاری شکار کے لیے تیار رہتا ہے۔ انھوں نے اپنی مناظرانہ افتادِ طبع میں فرمایا ٹھیک ہے، لاؤ عبدالشکور کو۔ شاہ صاحب وہاں سے تھوڑے فاصلے پر اپنے گاؤں بیریاں والا میں مقیم تھے۔ انھیں اطلاع دی گئی تو فوراً کتابیں لے کر وہاں پہنچ گئے۔ وہ ایسا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ اب آمنے سامنے سٹیج سج گئی اور مناظرہ شروع ہو گیا۔ گفتگو طول پکڑ گئی تو حافظ عبدالقادر روپڑی رحمہ اللہ نے یہ کہہ کر مجلس ختم کر دی کہ یہ تو ہمارا گھر کا معاملہ ہے، مجھے فلاں جگہ فلاں لوگوں سے مناظرے پر پہنچنا ہے۔ حافظ عبدالقادر روپڑی مرحوم تو چلے گئے، لیکن لوگوں نے شاہ صاحب مرحوم سے اصرار کیا کہ بڑے حافظ صاحب (حافظ عبداللہ روپڑی رحمہ اللہ) موجود ہیں، ان سے گفتگو کر لیں (ان کا موقف بھی وہی ہے جو حافظ عبدالقادر صاحب کا ہے) شاہ صاحب مرحوم

نے فرمایا میں بڑے حافظ صاحب سے گفتگو کو خلافِ ادب سمجھتا ہوں۔ ان کے سوا جس سے چاہیں بات کروالیں، مگر حافظ صاحب کے احترام کے پیش نظر ان سے گفتگو کرنا مناسب نہیں۔''

اندازہ فرمایئے شاہ صاحب مرحوم بزرگ علمائے کرام کی کس قدر تکریم کرتے تھے اور ان کا احترام ان کے دل میں کتنا جاگزیں تھا۔ جس مسئلے میں ان کا موقف مبنی بر صحت ہے، اس کی وضاحت کے لیے بھی وہ کسی بزرگ عالم دین کے سامنے آنا سوے ادب قرار دیتے ہیں۔ یہ شاہ صاحب کی ذہنی بڑائی کی بہت بڑی دلیل ہے۔

شاہ صاحب نے اپنے گاؤں بیریاں والا میں مدرسہ جاری کر لیا تھا، جس میں وہ خود بھی تعلیم دیتے تھے اور دو اور فاضل مدرسین کی خدمات بھی حاصل کر لی گئی تھیں۔ اس نواح میں یہ بہت اچھا مدرسہ تھا اور جلد ہی اس کی شہرت پھیل گئی تھی، لیکن افسوس ہے حالات ایسے پیدا ہوئے کہ مدرسہ ختم ہو گیا۔

اس کے بعد شاہ صاحب نے اپنے گاؤں کو خیر باد کہا اور سانگلہ ہل تشریف لے گئے۔ وہاں انھوں نے خطابتی صورت میں بے حد خدمات سرانجام دیں اور ان کی کوشش سے اس شہر اور علاقے میں توحید و سنت کی بڑی ترویج ہوئی۔ ان کا اسلوب تبلیغ نہایت موثر تھا۔ وہ جو بات کرتے قرآن و حدیث کی روشنی میں کرتے۔ وہ وسیع المطالعہ عالم تھے اور سنجیدگی کا پیکر۔ غلط اور ناروا بات سے نہ ان کی زبان آشنا تھی اور نہ ان کا ذہن کبھی اس طرف منتقل ہوا۔ امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم ﷫ سے وہ بہت متاثر تھے اور ان کی تصانیف کا انتہائی شوق اور دلچسپی سے مطالعہ کرتے تھے۔

طویل عرصے تک وہ مرکز الدعوۃ السّلفیہ (ستیانہ بنگلہ ضلع فیصل آباد) میں خدمتِ تدریس انجام دیتے رہے۔ انھیں تدریس سے خاص شغف تھا اور ہر فن کی درسی کتابوں پر عبور رکھتے تھے۔

مرکز الدعوۃ السّلفیہ ستیانہ بنگلہ سے وہ جامعہ اسلامیہ البخاری کے اربابِ اہتمام کی درخواست پر سرگودھا تشریف لے گئے۔ وہ اس عمر میں بھی بڑے متحرک اور مستعد تھے۔ دلجمعی سے شائقینِ علم کو پڑھاتے تھے۔

ایک زمانے میں شاہ صاحب ممدوح نے اپنے علاقے کی سیاست میں بھی حصہ لیا۔ جنرل ایوب خاں نے ۱۹۶۲ء میں جو آئین ترتیب دیا تھا، اس میں بنیادی جمہوریتوں کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا۔ شاہ صاحب نے اس سلسلے کے تحت انتخاب لڑا اور کامیاب ہوئے۔ پھر اس علاقے کے چیئرمین بھی منتخب کیے گئے۔ ایک عالم دین کے لیے بہ ظاہر اس منصب پر پہنچنا مشکل معلوم ہوتا ہے، لیکن سید عبدالشکور شاہ صاحب کو یہ دنیوی اور سیاسی اعزاز بھی حاصل ہوا۔

اب شاہ صاحب کی خدمتِ تصنیف اور خدمتِ طباعت و اشاعت کی طرف آیے۔ ان کی اپنی تصنیف تو غالباً ایک ہی کتاب ہے جس کا نام ''مسنون نماز'' ہے لیکن انھوں نے ہمارے اسلاف کرام کی عربی اور اردو کی

نہایت اہم کتابیں شائع کیں۔ان کتابوں کی فہرست ذیل میں درج کی جارہی ہے۔ملاحظہ فرمایئے:

۱- تحقیق الکلام: تصنیف حضرت مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری (اردو)

۲- احکام الجنائز: تصنیف حضرت مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری (اردو)

۳- الحیات بعدالممات (سوانح عمری حضرت میاں سیدنذیرحسین دہلوی) تصنیف مولانا فضل حسین بہاری (اردو)

۴- خطبات مدراس: علامہ سید سلیمان ندوی (اردو)

۵- اللمحات: مولانا محمد رئیس ندوی

۶- الاسماء و الصفات للبیهقی (۲ جلد)

۷- التمهید لابن عبدالبر جلد ۱۱ سے جلد ۲۶ تک۔پہلی دس جلدیں مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور نے شائع کی تھیں۔

۸- الطرق الحکمیه فی السیاسة الشرعیه

۹- علل الحدیث لابن ابی حاتم (دوجلد)

۱۰- دلائل النبوة للبیهقی (۱-۷ جلد)

۱۱- سلسله الاحادیث الضعیفه (جلد ۱-۲)

۱۲- کتاب المراسیل لابن ابی حاتم (جلد ۱)

۱۳- الکنیٰ و المراسیل للدولابی (جلد ۱-۲)

۱۴- ذیل اللآلیء للسیوطی

۱۵- التعقبات علی الموضوعات للسیوطی

۱۶- الموضوعات الکبری لعلی القاری

۱۷- فهرس احادیث مسند احمد

۱۸- مصابیح السنة للبغوی (۱-۴ جلد)

۱۹- الادب المفرد

۲۰- مشکوٰۃ مترجم غزنویہ

۲۱- السراج الوهاج شرح مسلم از نواب صدیق حسن خاں

۲۲- قیام اللیل للمروزی

۲۳- طبقات الصوفیه لابی عبدالرحمن السلمی

یہ اس علم پیشہ فاضل اور محبِّ احادیث پیغمبر ﷺ کا بہت بڑا اشاعتی کارنامہ ہے۔

شیخ الحدیث مولانا محمد رفیق اثری نے اپنی پُر از معلومات تصنیف ''مولانا سلطان محمود محدث جلال پوری'' میں شاہ صاحب کا تذکرہ خوب صورت انداز میں کیا ہے (ملاحصہ ہو صفحہ ۲۴۶، ۲۴۷) وہ مولانا اثری کے ہم درس اور حضرت مولانا سلطان محمود کے شاگرد تھے۔ مولانا اثری تحریر فرماتے ہیں کہ شاہ صاحب نہایت محنتی اور تقویٰ شعار طالب علم تھے۔ اپنے استاذِ عالی قدر کا انتہائی احترام کرتے تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد کسی نہ کسی سلسلے میں جلال پور تشریف لاتے رہتے تھے۔ زمانۂ طالب علمی میں یومیہ ذکر و اذکار اور وظائف و اوراد کے پابند تھے۔ کم گو اور عبادت گزار تھے۔

اب شاہ صاحب کی وفات کے متعلق سنیے!

۲۶؍ اگست ۲۰۱۲ء کو مجھے کسی نے اطلاع دی کہ شاہ صاحب بیمار ہیں اور میو اسپتال میں داخل ہیں۔ میں عزیزی حسان سعید کو اپنے ساتھ لے کر اسپتال پہنچا تو شاہ صاحب کے صاحب زادے عزیزی انس شاہ ان کے پاس بیٹھے تھے اور شاہ صاحب بے ہوش تھے۔ اتنے میں ایک طویل قامت نوجوان آئے۔ انھوں نے نہایت احترام سے شاہ صاحب کے پاؤں چھوئے، ان کا ماتھا چوما اور چلے گئے۔ میرا خیال ہے وہ ان کے شاگرد ہوں گے۔

انس شاہ صاحب نے بتایا کہ شاہ صاحب اپنے ایک رشتے دار سے ملاقات کے لیے اوکاڑے گئے تھے۔ وہیں دماغ کی شریان پھٹی اور بے ہوش ہو گئے۔ ایک شخص انھیں میو اسپتال لے آیا۔ انس شاہ نے کہا کہ شاہ صاحب نے وصیت کی ہے کہ ان کی کتابیں مرکز الدعوۃ السّلفیہ (ستیانہ بنگلہ) کی لائبریری کو دے دی جائیں اور انھیں چک نمبر ۳۶ گ ب میں دفن کیا جائے۔

شاہ صاحب نے ۲۹؍ اگست کی صبح کو میو اسپتال میں وفات پائی۔ ان کی میت سانگلہ ہل لے جائی گئی اور وہاں ان کا جنازہ پڑھا گیا، جس میں بے شمار لوگوں نے شرکت کی۔ سانگلہ ہل سے میت کو ستیانہ بنگلہ لایا گیا۔ لاہور سے ان سطور کا راقم، عزیزی پروفیسر رانا تنویر قاسم اور محمد حسین صاحب مرکز الدعوۃ السّلفیہ ستیانہ پہنچے۔ وہاں ان کا دوسرا جنازہ پڑھا گیا، اس میں بھی لاتعداد لوگ شامل تھے۔ ستیانہ سے ان کی میت چک ۳۶ لائی گئی۔ وہاں دو جنازے پڑھے گئے۔ ایک شام کے بعد مسجد میں۔ پھر تدفین کے لیے قبرستان لے کر گئے تو وہاں مختلف مقامات سے لوگ آ گئے، انھوں نے بھی جنازہ پڑھا۔ اس طرح اس مردِ صالح کا چار مرتبہ جنازہ پڑھا گیا۔ انھیں سپردِ خاک کر کے تقریباً شب کے دس بجے ہم وہاں سے چلے اور دو بجے کے قریب لاہور پہنچے۔

اللھم اکرم نزله و وسع مدخله و ادخله جنة الفردوس.

شاہ صاحب مرحوم کی نرینہ اولاد پانچ بیٹے ہیں۔

بڑے انس شاہ جو لاہور میں کاروبار کرتے ہیں۔

دوسرے اسامہ: یہ سعودی عرب میں ملازمت کرتے ہیں۔

تیسرے اویس: یہ لاہور میں کام کرتے ہیں۔

چوتھے انیس: یہ سعودی عرب میں مقیم ہیں۔

پانچویں کا نام طیب ہے۔ یہ سانگلہ ہل رہتے ہیں۔

شاہ صاحب مرحوم کی ایک ہی بیٹی ہیں۔ وہ بھی سعودی عرب میں مقیم ہیں۔

قاری عبدالوکیل صدیقی

(وفات یکم مارچ ۲۰۱۳ء)

۱۹۸۸ء کے مارچ کا پہلا ہفتہ تھا کہ میں اپنے مرحوم دوست محمد سعید قادری کی رفاقت میں بہاول پور گیا۔ الحمراء ہوٹل میں ہم نے کمرہ لیا اور تین دن ہمارا وہاں قیام رہا۔ پھر رحیم یار خاں، اوچ شریف، احمد پور شرقیہ اور صادق آباد کا چکر لگایا۔ اسی اثنا میں خان پور گئے اور وہاں سے دین پور جا کر مولانا عبیداللہ سندھی اور دیگر فوت شدگان کی قبروں پر دعائے مغفرت کی۔ مغرب کی نماز دین پور کی مسجد میں پڑھی۔ اس طرح ایک ہفتہ سابق ریاست بہاول پور کے مختلف مقامات کی سیاحت کے بعد دس بجے شب کو خان پور سے بس پر سوار ہوئے اور صبح چھے بجے کے قریب لاہور پہنچ گئے۔

میرے اس سفر کے ساتھی محمد سعید قادری ایم اے ہسٹری تھے۔ مختلف موضوعات سے متعلق ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ وہ نیشنل بینک میں کسی بڑے عہدے پر فائز تھے، اس مخلص ترین دوست نے مختصر ترین علالت کے بعد نومبر ۱۹۹۰ء میں وفات پائی۔ ان کی وفات میرے لیے بہت بڑے صدمے کا باعث تھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ سطور ۳۱/ مارچ ۲۰۱۳ء کو لکھی جا رہی ہیں۔ اس حساب سے خان پور وغیرہ مقامات کے سفر پر پچیس برس کی طویل مدت بیت چکی ہے۔ اس کا ذکر میں نے ایک مضمون میں کیا ہے جو مولانا عبیداللہ سندھی کے متعلق اپنی کتاب ''نقوشِ عظمتِ رفتہ'' میں لکھا ہے۔ یہ کتاب بھی آج سے سترہ (۱۷) برس قبل اکتوبر ۱۹۹۶ء میں مکتبہ قدوسیہ لاہور کی طرف سے شائع ہوئی تھی۔ اس میں پاکستان و ہندوستان کی متعدد بڑی شخصیات کا تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے اس لیے جلد ہی ختم ہو گئی تھی۔ اس کے بعد شائع نہیں کی گئی۔

''نقوشِ عظمتِ رفتہ'' کی اشاعت کے چند روز بعد میں مکتبہ قدوسیہ گیا۔ وہاں ایک صاحب الماریوں میں اپنی پسند کی کتابیں دیکھ رہے تھے، کشیدہ قامت، گورا سرخی مائل رنگ، خوب صورت نقش و نگار، چہرے پر متانت کے آثار۔ آنکھوں پر نظر کی عینک، صاف ستھرا لباس زیب تن، سر پر عربوں کا سا رومال، سیاہ داڑھی، پینتیس چھتیس برس کی جوان عمر۔ مجھے کسی نے بھٹی صاحب کہہ کر مخاطب کیا تو وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ السلام علیکم کہتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھائے اور پنجابی میں فرمایا: ''بھٹی صاحب! آپ خان پور

گئے۔ دین پور کا چکر لگایا لیکن ہمارے پاس نہیں آئے۔ ہمارے پاس آتے تو جہاں آپ چاہتے، ہم آپ کو لے جاتے“۔ عزیزی عمر فاروق قدوسی نے ان کا تعارف کرایا کہ یہ قاری عبدالوکیل صدیقی ہیں۔ خان پور رہتے ہیں اور ان کا وہاں بہت بڑا دارالعلوم ہے، جس میں خاصی تعداد میں طلباء تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اب تک میں قاری صاحب ممدوح سے متعارف نہ تھا اور مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ خان پور میں جماعت اہل حدیث کی کوئی مسجد یا مدرسہ ہے۔

قاری صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ جو خوش گوار ماحول اور علمی فضا میں ہوئی۔ اس کے بعد لاہور میں ڈاکٹر عبدالغفور راشد کے ساتھ مرکزی جمعیت اہل حدیث کی ایک میٹنگ میں ان سے دوسری دفعہ ملنے کا موقع ملا۔ اس ملاقات میں انھوں نے مجھے خان پور آنے کی باقاعدہ دعوت دی۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے عرض کیا کہ میرا بھی وہاں حاضری کو جی چاہتا ہے۔

اس سے ایک سال بعد خان پور میں تبلیغی جلسہ منعقد ہوا تو اس میں شرکت کا دعوت نامہ آیا اور میں نے اس میں شرکت کی۔ بڑا بارونق جلسہ تھا۔ اس موقعے پر متعدد حضرات سے ملاقات ہوئی اور پتا چلا کہ اس شہر اور علاقے میں قاری صاحب کا بہت اثر ہے اور ان کی تبلیغی تگ و دو کا دائرہ دور تک پھیلا ہوا ہے۔ جلسے میں مولانا محمد حسین شیخو پوری، حافظ ابتسام الٰہی ظہیر، مولانا ارشاد الحق اثری، مولانا شمشاد سلفی اور دیگر متعدد حضرات شامل تھے۔

اس سے کچھ عرصے کے بعد ہمارے مرحوم دوست حافظ محمد اسماعیل اسد حافظ آبادی نے جمعۃ المبارک کے روز حافظ آباد میں ایک اجتماع کا اہتمام کیا، جس میں قاری صاحب کو دعوت دی گئی تھی۔ مجھے اور حافظ احمد شاکر کو بھی بلایا گیا تھا۔ قاری صاحب نے خطبۂ جمعہ ارشاد فرمایا، جس میں مسئلہ توحید نہایت مؤثر اور زوردار انداز میں وضاحت سے بیان کیا۔ وہ جس موضوع پر بات کرتے قرآن و حدیث کی روشنی میں کرتے۔ ان کا الفاظ کا انتخاب اور بولنے کا اسلوب سامعین کو اپنی گرفت میں لے لیتا۔ انھیں عام واعظین کی طرح تبلیغ کے نام سے حاضرین کو ادھر ادھر کے قصے کہانیاں سنانے اور لطیفے بیان کرنے کی عادت نہ تھی۔ انھوں نے جلیل القدر اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کیے تھے اور وہ ثقہ عالم دین تھے، سٹیج پر لوگوں کو ثقاہت سے خطاب کرتے تھے۔

مئی ۲۰۱۱ء کے ابتدائی دنوں میں قاری صاحب ممدوح نے مجھے اور رانا شفیق خاں پسروری کو خاص طور پر خان پور حاضر ہونے کی دعوت دی اور ہم دونوں وہاں حاضر ہوئے۔ دو دن ہمارا وہاں قیام رہا۔ ہم نے دیکھا کہ خان پور شہر اور اس سے باہر پورے علاقے میں ان کے اثرات کا دائرہ پھیلا ہوا ہے اور لوگ ان کے علم

اور طریق تبلیغ کی بنا پر ان کا انتہائی احترام کرتے ہیں۔ ان کی پرخلوص مساعی سے شہر خان پور میں اہل حدیث کی کئی مسجدیں تعمیر ہوگئی ہیں جو نمازیوں سے بھری رہتی ہیں اور ان میں دارالعلوم کے اساتذہ جمعہ و جماعت کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ فجر کی نماز کے بعد ان میں درسِ قرآن کا سلسلہ بھی جاری ہے اور ہر مسجد میں محلے کے بچے قرآن پڑھتے اور کتاب وسنت کے احکام سیکھتے ہیں۔

اب آیئے قاری صاحب کے اصل وطن، ان کی ابتدائی زندگی کے دست یاب احوال، تحصیل علم اور اساتذہ کرام کے بارے میں چند باتیں کرتے ہیں۔

قاری صاحب دراصل موجودہ صوبہ خیبر پختونخوا کے علاقہ ہزارہ کے مشہور شہر ہری پور کے رہنے والے تھے۔ یکم جنوری ۱۹۵۵ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی۔ ذہن صاف تھا۔ جو کچھ پڑھتے، حافظے کے خزانے میں محفوظ ہو جاتا۔ پھر ایک وقت آیا کہ مزید حصول علم کا شوق انھیں گوجراں والا لے گیا۔ وہاں انھوں نے حضرت حافظ محمد گوندلوی، مولانا ابوالبرکات احمد مدراسی، مولانا محمد اعظم، مولانا عبدالحمید ہزاروی، مولانا محمد الیاس اثری اور بعض دیگر عالی مرتبت اساتذہ سے اکتساب فیض کیا۔

مختلف اوقات میں وہ راولپنڈی بھی گئے اور وہاں کی جامعہ تعلیم القرآن میں مولانا غلام اللہ خاں مرحوم سے قرآن مجید کے بعض مشکل مقامات سمجھنے کی کوشش کی، بالخصوص قرآن کی روشنی میں مسئلہ توحید پر ان سے فیض یاب ہوئے۔ کئی مرتبہ ان کے دورۂ تفسیر میں شرکت کی۔

شنید ہے کہ قاری صاحب بعض فقہی نوعیت کے مسائل احاطۂ فہم میں لانے کے لیے مفتی محمد شفیع مرحوم کی خدمت میں کراچی بھی گئے۔ وہاں کچھ عرصہ ان سے مستفید ہوتے رہے۔ غرض ان کے دل میں حصول علم کا ایسا جذبۂ صادقہ کارفرما تھا جو انھیں مختلف اساتذۂ فن کے دروازے پر لے جاتا تھا اور وہ ان سے استفادہ کرتے تھے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ ۲ جولائی ۱۹۷۴ء کو ضلع رحیم یار خاں کے شہر خان پور تشریف لے گئے اور وہاں کی بہت پرانی جامع مسجد خواجگان اہل حدیث میں تدریس وخطابت کا سلسلہ شروع کیا اور پھر جلد ہی اس پورے علاقے میں ان کی آواز گونجنے لگی۔ اس وقت وہ بیس برس کے جوان رعنا تھے جنھوں نے اس نواح میں توحید کے ایک بڑے مبلغ کی حیثیت سے شہرت پائی۔ یہ آج سے تقریباً چالیس برس قبل کی بات ہے۔ کتاب وسنت کی دعوت کا یہ آوازۂ حق جو محدود پیمانے پر خان پور کی ایک چھوٹی سی مسجد میں ہری پور ہزارہ کے ایک غیر معروف نوجوان کی زبان سے بلند ہوا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے تھوڑے عرصے میں نہ صرف خان پور بلکہ پوری ریاست بہاول پور میں پھیل گیا۔ پھر اس سے بھی آگے سندھ کے دیہات و بلاد میں پہنچا۔ دوسری طرف

پنجاب کے مختلف مقامات کے لوگ بھی ان کے طریق وعظ سے متاثر ہوئے۔

ان کے علاقے خان پور اور اس کے قرب و جوار میں قبر پرستی اور پیر پرستی کا زور تھا، قاری صاحب نے پیدل یا سائیکل پر غرض ہر طرح دیہات کے چکر لگائے، لوگوں کو قرآن و حدیث کے احکام سے آگاہ کیا اور جگہ جگہ توحید کی تبلیغ کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بے شمار لوگ ان کے مواعظ حسنہ سے متاثر ہوئے اور انھوں نے قرآن و حدیث کو اپنے عمل کا محور قرار دیا۔

قاری صاحب کا نوجوانوں کے اس گروہ سے تعلق تھا جو علامہ احسان الٰہی ظہیر سے متاثر تھے اور تقریر و خطابت کی وادیوں میں تیز رو تھے۔

۱۹۸۶ء میں قاری صاحب نے خان پور میں چوبیس کنال جگہ خریدی اور اس میں عظیم الشان مسجد تعمیر کی۔ جامعہ محمدیہ اہل حدیث کے نام سے دارالعلوم قائم کیا۔ لڑکیوں کی تعلیم کے لیے مدرسۃ البنات بنایا۔ دارالاقامہ اور دارالایتام تعمیر کرائے۔ مختلف موضوعات کی کتابوں پر مشتمل لائبریری قائم کی۔ اس طرح یہ ایک بڑا دینی مرکز ہے جو متعدد اداروں پر محیط ہے۔

کئی دیہات میں بھی انھوں نے مسجدیں تعمیر کرائیں۔ بعض لوگوں نے بتایا کہ وہ تدریس یا خطابت کی کسی سے تنخواہ نہیں لیتے تھے۔ ان کے گزر اوقات کا ذریعہ ان کا ایک کاربار ہے، وہ جس ادارے کے لیے لوگوں سے مالی امداد کی اپیل کرتے، اس میں خود بھی اپنی گرہ سے رقم دیتے۔

میں اور رانا شفیق خاں پسروری ان کی دعوت پر خان پور گئے تو ہمیں ان کے ساتھ متعدد مقامات میں جانے کا موقع ملا۔ ہم لیاقت پور بھی گئے۔ وہاں ایک بڑی مسجد ہے اور اچھا خاصا مدرسہ ہے، تدریس و خطابت کا فریضہ ہمارے دوست حافظ محمد اسلم حنیف انجام دیتے ہیں جو لیاقت پور اور اس کے نواح کی مؤثر شخصیت ہیں۔ ہم نے عشاء کی نماز وہاں پڑھی اور قاری صاحب اور رانا صاحب نے تقریریں کیں۔ میں نے بھی چند باتیں عرض کیں۔ کھانا حافظ محمد اسلم حنیف صاحب کے مکان پر کھایا۔

کوٹ پنجابیاں اور بعض دیگر مقامات میں بھی گئے۔ ہر جگہ قاری صاحب کو احترام کا مقام حاصل تھا اور لوگ توجہ سے ان کے ارشادات سنتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی زندگی عمل و اخلاق کا خوب صورت مرقع تھی۔

اب آئیے ان کے آخری ایام زیست کی طرف!

گزشتہ دو سال سے ان کی صحت خراب چلی آ رہی تھی۔ لیکن وہ اپنے تدریسی و تبلیغی فرائض بہ دستور ادا کر رہے تھے۔ انھیں جگر کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ کچھ عرصہ رحیم یار خاں کے شیخ زید اسپتال میں علاج ہوتا رہا، لیکن بیماری روز بہ روز بڑھتی گئی۔ ڈاکٹروں نے ان کو جگر کی پیوندکاری کا مشورہ دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے لیے یا لندن

جانا پڑتا ہے یا ہندوستان۔ وہ ہندوستان جانے کے لیے تیار ہو گئے تھے، لیکن ۲۰ جنوری کو طبیعت زیادہ بگڑ گئی اور انھیں ڈاکٹرز اسپتال لاہور لے جایا گیا۔ انجام کار وہی ہوا جو اللہ کو منظور تھا۔ جمعۃ المبارک کے روز یکم مارچ ۲۰۱۳ء کو وہ اسی اسپتال میں صبح ساڑھے چھے بجے راہ گرائے عالم بقاء ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون .

اسپتال سے بذریعہ ایمبولینس ان کی میت ان کے آبائی وطن ہری پور (ہزارہ) پہنچائی گئی۔ ان کی پہلی نماز جنازہ ہری پور کے گورنمنٹ ہائی سکول کی گراؤنڈ میں سوا دس بجے شب مولانا ارشاد الحق اثری نے پڑھائی۔ اس کے بعد دوسری اور تیسری مرتبہ بھی جنازہ پڑھا گیا۔ جہاں پیدا ہوئے تھے، وہیں دفن کیے گئے۔ ان کی زندگی کا خمیر ہری پور (ہزارہ) سے اٹھا۔ گوجراں والا، راولپنڈی اور کراچی میں تحصیل علم کی۔ پورا عملی دور خان پور اور اس کے قرب و جوار میں گزرا اور تدفین اپنے آبائی علاقے کی سرزمین میں ہوئی۔ اس طرح یہ خاک وہیں پہنچی جہاں کا خمیر تھا۔ اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ.

قاری صاحب کی اولاد نرینہ دو بیٹے ہیں۔ بڑے بیٹے حافظ عامر صدیقی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اعلیٰ و اقدس میں عاجزانہ دعا ہے کہ اس کے بندے عبدالوکیل صدیقی نے درس و تدریس اور وعظ و تبلیغ کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، وہ ہمیشہ جاری رہے اور زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے فیض یاب ہوں۔ آمین یا رب العالمین۔

قاری عبدالوکیل صدیقی مرحوم و مغفور کے بارے میں ضروری باتیں جو میں جانتا تھا، بیان کر دی گئیں۔

گزارش یہ ہے کہ ریاست بہاول پور کے مختلف مقامات میں توحید و سنت کی تبلیغ و اشاعت کا سلسلہ بہت مدت سے جاری تھا، درس و تدریس کی صورت میں بھی، وعظ و خطابت کے انداز میں بھی اور تصنیف و تالیف کے رنگ میں۔ مولانا عبدالحق ہاشمی اس علاقے کے ممتاز عالم تھے جو ۱۳۰۲ھ (۱۸۸۵ء) میں کوٹلہ شیخاں میں پیدا ہوئے۔ پھر احمد پور شرقیہ آ گئے اور پچیس سال ان کا سلسلہ تدریس وہاں جاری رہا۔ انھوں نے حضرت مولانا محمد حسین بٹالوی اور اپنے عہد کے دیگر بہت سے اہل علم سے تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ بہت بڑے واعظ اور بہت بڑے خطیب تھے۔ ان کی تصانیف کا دائرہ بھی بہت وسیع تھا۔ وہ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تھے۔ انھوں نے ۵۴ کتابیں عربی میں تصنیف کیں، جن میں بعض کئی کئی ضخیم جلدوں پر مشتمل ہیں۔ میں نے وہ کتابیں قلمی صورت میں ان کے صاحب زادۂ گرامی مولانا عبدالوکیل ہاشمی کے پاس فروری ۲۰۰۰ء میں مکہ مکرمہ میں دیکھی ہیں۔

انھوں نے احمد پور شرقیہ میں تبلیغی جلسے بھی کرائے، جن میں مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی، مولانا محمد جونا گڑھی دہلوی اور دیگر علمائے کرام نے شرکت فرمائی۔ اس زمانے میں اس علاقے میں سفر کرنا بہت مشکل تھا۔ لوگ اونٹوں پر یا گھوڑوں پر یا پیدل سفر کرتے تھے۔ مولانا مرحوم نے ۱۷۔ شوال ۱۳۹۲ھ (۲۲۔ نومبر ۱۹۷۲ء) کو مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔ ان کا پہلا جنازہ بیت اللہ شریف میں پڑھا گیا۔ پھر ان کی وصیت کے

مطابق میت مدینہ منورہ پہنچائی گئی اور مسجد نبوی میں جنازہ پڑھا گیا اور جنت البقیع میں ان کی تدفین ہوئی۔ میں نے ان کے حالات میں طویل مضمون اپنی کتاب ''دبستان حدیث'' میں لکھا ہے جو پہلی دفعہ ۲۰۰۸ء میں شائع ہوئی۔ ان کے فرزندِ گرامی مولانا عبدالرزاق بھی مشہور خطیب اور مقرر تھے جو احمد پور شرقیہ کی جامع مسجد کے خطیب وامام تھے۔

بعض غزنوی علماے کرام نے بھی ریاست میں وعظ و خطابت اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ انھوں نے صادق گنج کو اپنا مسکن بنایا۔ ان میں حافظ محمد زکریا غزنوی نامور خطیب اور مدرس تھے۔ میں نے ان کے دست باب حالات اپنی ایک کتاب ''گلستان حدیث'' میں لکھے ہیں۔ یہ کتاب پہلی بار ۲۰۱۱ء میں چھپی۔ حافظ صاحب ممدوح ۳۰ دسمبر ۱۹۸۰ء کو فوت ہوئے۔ مولانا عبدالرحیم غزنوی کے بیٹے اور حضرت عبداللہ غزنوی کے پوتے تھے۔ مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی کے چچازاد بھائی۔

ان کے علاوہ بھی بہت سے اہل علم تھے جنھوں نے ان دیار میں توحید و سنت کی تبلیغ کی۔

تقسیم ملک کے بعد پروفیسر حافظ عبداللہ نے بہاول پور میں سکونت اختیار کی تو انھوں نے بھی اس علاقے کو اپنا مرکزِ تبلیغ دین بنایا۔

۱۸، ۱۹، ۲۰ رجب ۱۳۳۸ھ (۹، ۱۰، ۱۱۔ اپریل ۱۹۲۰ء) کو ریاست بہاول پور کی کونسل کے ممبر مولانا عبدالرحمٰن کی زیر صدارت ملتان میں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کا ۹ واں سالانہ جلسہ ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دور میں ریاست بہاول پور میں اہل حدیث اچھی خاصی تعداد میں موجود تھے اور اونچے سرکاری حلقوں میں بھی اثر ورسوخ رکھتے تھے۔

یہ چند سطور قاری عبدالوکیل صدیقی رحمہ اللہ کے متعلق لکھتے ہوئے ذہن میں آئیں اور لکھ دی گئیں۔

ریاست بہاول پور کے علماے کرام کے حالات جناب حمید اللہ عزیز خاں ایڈیٹر ماہنامہ ''تفہیم الاسلام'' احمد پور شرقیہ لکھ رہے ہیں۔ یہ بہت اہم کام ہے جو انھوں نے شروع کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اس نیک مقصد میں کامیابی عطا فرمائے۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ یہ لوگ کتاب و سنت کے مخلص ترین مبلغ تھے۔ رحمھم اللہ تعالی۔

کی شادی ۱۹۴۲ء میں محمد محمود میمن کی ہمشیرہ (یعنی مولانا محمد جونا گڑھی کی صاحب زادی ہاجرہ سے ہوئی تھی) اس نیک بخت مرحومہ خاتون سے مولانا معین الدین لکھوی کی نرینہ اولاد تین بیٹے ہیں۔ بڑے مولانا بارک اللہ لکھوی ایم اے، ان سے چھوٹے ڈاکٹر زعیم الدین عابد لکھوی اور ان سے چھوٹے ڈاکٹر عظیم الدین زاہد لکھوی۔ تینوں بھائی ملنسار، خوش کردار اور سراپا خلوص ہیں۔ ننہیال اور ددھیال کے اوصاف حسنہ سے متصف۔ دونوں ڈاکٹر صاحبان امراض قلب کے ماہر معالج ہیں اور میرے جیسے نادر لوگوں کا مفت علاج کرتے ہیں۔

محمد محمود میمن دہلی میں کئی سال ایک اخبار میں کام کرتے رہے تھے۔ اس لیے وہ اخباری سلسلے کے ضروری امور سے آگاہ تھے۔ مجھے انھوں نے اوکاڑہ سے اپنی آمد کی اطلاع دی تو میں نے ان کو ''الاعتصام'' میں منیجر کے طور پر کام کرنے کو کہا۔ چنانچہ وہ لاہور آئے اور اخبار میں کام کرنے لگے۔ وہ انتظامی معاملات سے باخبر تھے اور قارئین کے خطوط وغیرہ کا جواب بہت اچھے انداز میں دیتے تھے۔ میں ان کی کارکردگی سے مطمئن تھا۔ مولانا سید محمد داؤد غزنوی ان کے کام کی وجہ سے بھی اور مولانا محمد جونا گڑھی کے بیٹے کی بنا پر بھی ان پر شفقت فرماتے تھے۔

ایک دن میں نے دیکھا کہ میانے قد، گندمی رنگ، تیکھے نقوش، صاف ستھرے لباس میں ملبوس سترہ اٹھارہ سال کے ایک صحت مند نوجوان محمود میمن کے پاس بیٹھے ہیں اور دونوں بے تکلفی سے دہلوی لہجے میں محو گفتگو ہیں۔ میں ان کی طرف بڑھا تو مجھے دیکھ کر دونوں احتراماً کھڑے ہو گئے اور دعا سلام کا تبادلہ ہوا۔ اس نوجوان کا تعارف کراتے ہوئے محمود نے بتایا کہ یہ کراچی سے تشریف لائے ہیں اور جماعت غربائے اہل حدیث کے امام محترم مولانا حافظ عبدالستار دہلوی کے صاحب زادۂ گرامی ہیں۔ عبدالجبار ان کا نام ہے اور میرے دوست ہیں۔ مجھے ان سے مل کر مسرت ہوئی۔ اس وقت نہ وہ سلفی کہلاتے تھے، نہ مولانا۔ ان کے چہرے اور گفتگو سے سلفیت اور مولانیت کی کوئی جھلک دکھائی بھی نہیں دیتی تھی۔

یہاں یہ بتانا بھی میرے خیال میں مناسب ہوگا کہ محمود میمن کے والد مکرم مولانا محمد جونا گڑھی دہلوی، مولانا عبدالجبار سلفی کے جد امجد مولانا عبدالوہاب دہلوی کے شاگرد تھے اور ان کے برادر کبیر مولانا محمد سلیمان جونا گڑھی نے کراچی میں مولانا عبدالجبار سلفی کے والد محترم مولانا حافظ عبالستار دہلوی کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیے تھے۔ اس طرح محمود میمن اور عبدالجبار سلفی کے بزرگوں کے درمیان استادی شاگردی کا رشتہ قائم تھا۔ یہ ایسا رشتہ ہے جو زندگی اور موت دونوں حالتوں میں قائم رہتا ہے۔ اس میں کبھی دراڑ نہیں آ سکتی۔

یہ سطور ۲۰۔ اپریل ۲۰۱۳ء کو لکھی جا رہی ہیں۔ اس حساب کے مطابق عبدالجبار سلفی سے میری ملاقات کا واقعہ آج سے ساٹھ برس قبل کا ہے۔ میں ان دنوں مونچھوں کو تاؤ دے کر رکھتا تھا اور داڑھی پر عمل مقراض جاری رہتا تھا۔ وہ میرے اس معمول پر خوب صورت انداز میں تبصرہ کرتے تھے۔ بڑے خوش طبع نوجوان

تھے۔ اب یاد نہیں آ رہا کہ عبدالجبار صاحب کتنے دن یہاں رہے۔ یہ البتہ یاد ہے کہ ان کے دوران قیام میں ہم تینوں نے کئی مرتبہ اکٹھے کھانا کھایا اور با جماعت چائے پی۔ بات چیت اور کھانے پینے میں ان سے کوئی تکلف نہ تھا۔ غالباً اس کے بعد ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔

ساٹھ سال کے اس طویل عرصے میں بے شمار انقلاب آئے۔ وہ عبدالجبار سے مولانا عبدالجبار ہو گئے اور سلفیت کا تاج بھی ان کے حصے میں آیا۔ میری زندگی میں بھی بہت سے نشیب و فراز آئے اور حالات کی رفتار مجھے مختلف مقامات میں گھماتی پھری، لیکن وہ عبدالجبار جنھیں بعد میں مولانا عبدالجبار سلفی کہا جانے لگا، مجھے زندگی کے ہر موڑ پر یاد رہے۔ میں ان کے ذہن کے کسی گوشے میں موجود تھا یا نہیں، اس کا مجھے علم نہیں لیکن میں نے ہمیشہ انھیں یاد رکھا۔

اب تو وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور جنت الفردوس میں پہنچ گئے لیکن ان کی زندگی کے آخری دور کے چند سال پیشتر ہمارا کہیں آمنا سامنا ہو جاتا تو نہ وہ مجھے پہچان سکتے، نہ مجھے ان کے متعلق کچھ پتا چل سکتا۔ وہ امام ہو گئے، خطیب ہو گئے، مدرس ہو گئے، مفتی ہو گئے، تاجر کتب اور ناشر کتب ہو گئے۔ بڑے بڑے تدریسی اداروں کا اہتمام ان کے سپرد ہوا۔ عقیدت مندوں کا ہجوم ان کے آگے پیچھے چلنے لگا۔ ارادت کیش ان کے ہاتھ پاؤں داہنا اپنے لیے سعادت قرار دینے لگے۔ تلامذہ کی جماعت ان کے حضور زانوئے ادب تہ کرنے لگی۔ اس حالت میں ان کے سراپا کے طول و عرض سے میں ساٹھ سال قبل کے مجسمے کو تلاش کرنے میں ہرگز کامیاب نہ ہو سکتا۔

ماہ و سال کی اتنی تبدیلی کے ساتھ ان کی جسمانی حالت بہت بدل گئی۔ جوانی بڑھاپے کے قالب میں ڈھل گئی، توانائی نے کمزوری کا لبادہ اوڑھ لیا اور سیاہ بالوں پر سفید چادر تن گئی۔ یعنی جان پہچان کے تمام ظاہری اسباب ختم ہو گئے۔ میں بھی اس حالت کو پہنچ گیا ہوں کہ وہ میری ہیئت کذائی سے قطعاً ساٹھ سال قبل کے اسحاق بھٹی کو تلاش نہ کر پاتے۔

عبدالجبار سلفی اس زمانے میں بے تکلفی سے پنجاب کے لوگوں کے اردو لہجے کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ حالانکہ خود ان کے دادا مولانا عبدالوہاب پنجابی تھے اور وہ پنجاب کے ضلع جھنگ کے ایک گاؤں واسو آستانہ سے ضلع ملتان کے ایک گاؤں میں جا کر آباد ہوئے۔ بعد ازاں وہاں سے دہلی چلے گئے اور پھر وہیں مستقل طور سے سکونت اختیار کر لی تھی۔ [1]

---

[1] اس فقیر کو یہ سعادت حاصل ہے کہ سب سے پہلے میں نے مولانا عبدالوہاب دہلوی اور ان کے فرزند گرامی حافظ عبدالستار دہلوی کے حالات لکھے۔ ملاحظہ ہو راقم کی کتاب ''کاروانِ سلف'' شائع کردہ مکتبہ اسلامیہ فیصل آباد اور اردو بازار، لاہور، بعد ازاں رجال سے متعلق اپنی مختلف کتابوں میں اس خاندان اور ان کے متعلقین و تلامذہ کا تذکرہ کیا، جن میں موجودین بھی شامل ہیں اور مرحومین بھی۔

تھے۔ اب یاد نہیں آ رہا کہ عبدالجبار صاحب کتنے دن یہاں رہے۔ یہ البتہ یاد ہے کہ ان کے دوران قیام میں ہم تینوں نے کئی مرتبہ اکٹھے کھانا کھایا اور با جماعت چائے پی۔ بات چیت اور کھانے پینے میں ان سے کوئی تکلف نہ تھا۔ غالباً اس کے بعد ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔

ساٹھ سال کے اس طویل عرصے میں بے شمار انقلاب آئے۔ وہ عبدالجبار سے مولانا عبدالجبار ہو گئے اور سلفیت کا تاج بھی ان کے حصے میں آیا۔ میری زندگی میں بھی بہت سے نشیب و فراز آئے اور حالات کی رفتار مجھے مختلف مقامات میں گھماتی پھری، لیکن وہ عبدالجبار جنھیں بعد میں مولانا عبدالجبار سلفی کہا جانے لگا، مجھے زندگی کے ہر موڑ پر یاد رہے۔ میں ان کے ذہن کے کسی گوشے میں موجود تھا یا نہیں، اس کا مجھے علم نہیں لیکن میں نے ہمیشہ انھیں یاد رکھا۔

اب تو وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور جنت الفردوس میں پہنچ گئے لیکن ان کی زندگی کے آخری دور کے چند سال پیشتر ہمارا کہیں آمنا سامنا ہو جاتا تو نہ وہ مجھے پہچان سکتے، نہ مجھے ان کے متعلق کچھ پتا چل سکتا۔ وہ امام ہو گئے، خطیب ہو گئے، مدرس ہو گئے، مفتی ہو گئے، تاجر کتب اور ناشر کتب ہو گئے۔ بڑے بڑے تدریسی اداروں کا اہتمام ان کے سپرد ہوا۔ عقیدت مندوں کا ہجوم ان کے آگے پیچھے چلنے لگا۔ ارادت کیش ان کے ہاتھ پاؤں دابنا اپنے لیے سعادت قرار دینے لگے۔ تلامذہ کی جماعت ان کے حضور زانوئے ادب تہ کرنے لگی۔ اس حالت میں ان کے سراپا کے طول و عرض سے میں ساٹھ سال قبل کے مجسمے کو تلاش کرنے میں ہرگز کامیاب نہ ہو سکتا۔

ماہ و سال کی اتنی تبدیلی کے ساتھ ان کی جسمانی حالت بہت بدل گئی۔ جوانی بڑھاپے کے قالب میں ڈھل گئی، توانائی نے کمزوری کا لبادہ اوڑھ لیا اور سیاہ بالوں پر سفید چادر تن گئی۔ یعنی جان پہچان کے تمام ظاہری اسباب ختم ہو گئے۔ میں بھی اس حالت کو پہنچ گیا ہوں کہ وہ میری ہیئت کذائی سے قطعاً ساٹھ سال قبل کے اسحاق بھٹی کو تلاش نہ کر پاتے۔

عبدالجبار سلفی اس زمانے میں بے تکلفی سے پنجاب کے لوگوں کے اردو لہجے کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ حالانکہ خود ان کے دادا مولانا عبدالوہاب پنجابی تھے اور وہ پنجاب کے ضلع جھنگ کے ایک گاؤں واسو آستانہ سے ضلع ملتان کے ایک گاؤں میں جا کر آباد ہوئے۔ بعد ازاں وہاں سے دہلی چلے گئے اور پھر وہیں مستقل طور سے سکونت اختیار کر لی تھی۔ [1]

---

[1] اس فقیر کو یہ سعادت حاصل ہے کہ سب سے پہلے میں نے مولانا عبدالوہاب دہلوی اور ان کے فرزند گرامی حافظ عبدالستار دہلوی کے حالات لکھے۔ ملاحظہ ہو راقم کی کتاب "کاروانِ سلف" شائع کردہ مکتبہ اسلامیہ فیصل آباد اور اردو بازار، لاہور، بعد ازاں رجال سے متعلق اپنی مختلف کتابوں میں اس خاندان اور ان کے متعلقین و تلامذہ کا تذکرہ کیا، جن میں موجودین بھی شامل ہیں اور مرحومین بھی۔

اب آگے چلیے!

مولانا عبدالجبار سلفی ۱۹۳۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ تقسیم ملک کے زمانے میں ان کی عمر گیارہ سال کی تھی۔ یہ اصحاب علم کا خاندان ہے۔ دہلی میں ان کا مدرسہ بھی تھا جو ان کے جد امجد مولانا عبدالوہاب دہلوی نے ۱۳۰۰ھ (۱۸۸۲ء) کے آغاز میں جاری کیا تھا۔ اس کا نام ''مدرسہ دارالکتاب والسنہ'' تھا۔ مدرسے میں متحدہ ہندوستان کے مختلف مقامات کے طلباء تعلیم حاصل کرتے تھے۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ عبدالجبار سلفی نے تحصیل علم کا آغاز دہلی ہی میں کر لیا تھا۔ اگست ۱۹۴۷ء میں یہ لوگ دہلی کی سکونت ترک کر کے کراچی آئے تو عبدالجبار نے متعدد حضرات کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیے اور تعلیم حاصل کی۔ اساتذہ کی تفصیل بہ ترتیب تواریخ وفات یہ ہے۔

۱۔ ان کے والد مکرم مولانا حافظ عبدالستار دہلوی: وفات ۲۹۔ اگست ۱۹۶۶ء (کراچی)

۲۔ مولانا محمد یونس دہلوی: وفات نومبر ۱۹۶۷ء (کراچی)

۳۔ میاں نذیر احمد: دہلی میں عبدالجبار کے یہ حفظ قرآن کے استاد تھے۔ وفات ۱۹۷۲ء (ڈیرہ غازی خاں)

۴۔ مولانا عبدالجلیل خاں جھنگوی: وفات ۶۔ جون ۱۹۷۶ء (کراچی)

۵۔ ان کے بڑے بھائی مولانا حافظ عبدالغفار سلفی: وفات ۱۲۱ کتوبر ۱۹۷۷ء (کراچی)

۶۔ مولانا عبداللہ لائل پوری، جھال خانوآنہ۔ لائل پور: وفات ۱۶۔ جولائی ۱۹۸۳ء (وفات جدہ۔ تدفین مکہ مکرمہ)

۷۔ مولانا عبدالقہار سلفی دہلوی: وفات ۳۱۔ مئی ۲۰۰۶۔ (کراچی)

۸۔ مولانا عبدالرحمٰن سلفی: موجودہ امیر جماعت غرباے اہل حدیث (کراچی)

۹۔ مولانا تاج الدین صاحب

۱۰۔ مولانا عبدالقدوس صاحب

درس نظامی کی تعلیم کے دوران ہی میں مولانا عبدالجبار سلفی نے میٹرک کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے۔

مولانا عبدالجبار سلفی خدمت دین کے سلسلے میں بڑے باہمت اور صاحب عزم تھے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے اپنے مرحوم برادر کبیر مولانا حافظ عبدالغفار سلفی کی رفاقت میں کتابوں کی نشر و اشاعت اور خرید و فروخت کے لیے مکتبہ دینیات کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، جس کا بعد میں مکتبہ شعیب نام رکھا گیا۔ اس مکتبے کی طرف سے بہت سی کتابیں شائع کی گئیں، جن میں حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کی سوانح عمری الحیات بعد الممات اور مولانا محمد جوناگڑھی دہلوی کی تصانیف زکوٰۃ محمدی، صلاۃ محمدی، صوم محمدی وغیرہ تمام محمدیات شامل ہیں۔ پھر انھوں نے مکتبہ ایوبیہ جاری کیا۔ اس مکتبے کی طرف سے اپنے والد گرامی مولانا

حافظ عبدالستار دہلوی مرحوم ومغفور کی تحریر فرمودہ قرآن مجید کی تفسیر وحواشی فوائد ستاریہ، فتاویٰ ستاریہ وغیرہ ان کی تمام تصانیف شائع کیں۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری کے بھی بہت سے رسائل کی اشاعت کی گئی۔ یہ بہت بڑی دینی خدمت ہے جو انھوں نے محدود وسائل کے باوجود اس زمانے میں سرانجام دی۔

اشاعت کتب کے علاوہ پندرہ روزہ "صحیفہ اہل حدیث" ہے جو ۱۹۲۲ء میں مولانا عبدالوہاب مرحوم و مغفور نے دہلی سے جاری کیا تھا، جس کی اشاعت پر ۹۳ سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ یہ رسالہ اگست ۱۹۴۷ء میں دہلی سے کراچی منتقل ہو گیا تھا اور باقاعدہ جاری ہے۔ مولانا عبدالجبار سلفی کو پہلے اس کے منیجر بنایا گیا، پھر نائب مدیر اور بعدازاں مدیر بنا دیے گئے۔ اب ایک مدت سے وہ اس رسالے کی مسند ادارت پر فائز تھے۔ مضامین ومشمولات کے اعتبار سے یہ بہت عمدہ رسالہ ہے۔

اس کا اداریہ، باب الفتاویٰ اور دیگر مندرجات زبان وانداز کے اعتبار سے لائق مطالعہ ہیں اور کاغذ، طباعت، کمپوزنگ، وغیرہ جاذب نظر۔

مولانا عبدالجبار سلفی کی اولاد نرینہ تین بیٹے ہیں۔ بڑے محمد ایوب، ان سے چھوٹے عبداللہ اور سب سے چھوٹے عبیداللہ۔ تینوں کا شمار اپنے اسلاف کی طرح علماء اور خدام دین میں ہوتا ہے۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ میرے ساٹھ سال قبل کے دوست مولانا عبدالجبار سلفی کی مغفرت فرمائے اور ان کے برادر کبیر مولانا عبدالرحمٰن سلفی اور مرحوم کی آل اولاد اور دیگر متعلقین کو اپنے حفظ وامان میں رکھے اور انھیں بھی اور ہمیں بھی اپنے دین کی خدمت کے زیادہ سے زیادہ مواقع عطا فرمائے۔ آمین

مولانا محمد رفیق سلفی

(وفات ۲۱۔ اگست ۲۰۱۳ء)

پنجاب میں جن علاقوں نے علماے دین کی کثرت کی بنا پر شہرت پائی ان میں گوجراں والا شہر کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ اہل حدیث علما میں سے مولانا غلام رسول قلعوی، حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی، مولانا عبدالمجید سوہدروی اور ان کے اسلاف و اخلاف، مولانا حافظ محمد گوندلوی، مولانا محمد اسماعیل سلفی، مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی، مولانا محمد حنیف ندوی، قاضی عبدالرحیم، مولانا عبداللہ، حافظ عبدالمنان نور پوری، مولانا احمد الدین گکھڑوی، مولانا ابوالبرکات احمد مدراسی اور دیگر بے شمار مرحومین و موجودین۔

احناف کے دیو بندی حضرات میں سے مولانا عبدالعزیز، مولانا عبدالواحد، مولانا محمد چراغ، مولانا محمد سرفراز خاں صفدر، قاضی شمس الدین اور ان کے علاوہ بہت سے حضرات، جن میں وہ بھی ہیں جو وفات پا چکے اور وہ بھی ہیں جو اللہ کے فضل سے زندہ ہیں اور اپنے انداز سے دین کی خدمت سر انجام دے رہے ہیں۔ بریلوی حضرات میں سے مولانا محمد حسین گوندلوی اور شیعہ میں سے مفتی جعفر حسین۔

ان لائق تکریم بزرگانِ دین میں سے کتنے ہی ایسے بزرگ ہیں جو جدی پشتی اسی شہر اور علاقے سے تعلق رکھتے ہیں اور اچھی خاصی تعداد ان کی ہے جو دوسرے علاقوں سے یہاں آئے اور پھر مستقل طور پر یہیں سکونت پذیر ہو گئے۔

ان سطور میں ضلع گوجراں والا کے ایک اہل حدیث عالم دین مولانا محمد رفیق سلفی سے متعلق چند باتیں عرض کرنا مقصود ہے جو ۱۹۳۶ء میں ضلع امرتسر کی تحصیل اجنالہ کے ایک گاؤں شہورا میں پیدا ہوئے۔ جاٹوں کی ڈھلوں برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ سلسلہ نسب یہ ہے: محمد رفیق بن اللہ دتا بن اللہ بخش بن خدا بخش بن حسن بن وسن۔

مولانا محمد رفیق کے دادا اللہ بخش اور پڑدادا خدا بخش کا شمار اپنے عہد کے علماے دین میں ہوتا تھا۔ تقسیم ملک کے زمانے (اگست ۱۹۴۷ء) میں یہ لوگ اپنے وطن سے نکلے اور لاہور کے ایک مقام رام گڑھ میں مقیم ہوئے، جسے اب مجاہد آباد کہا جاتا ہے۔ اس وقت یہ چند گھروں پر مشتمل چھوٹی سی بستی تھی۔ اہل حدیث کی وہاں کوئی مسجد نہ تھی۔ البتہ اس کے قریب مغل پورہ میں مسجد توحید گنج کے نام سے اہل حدیث کی مسجد تھی جو

حافظ محمد یوسف گکھڑوی مرحوم کی کوشش سے بنائی گئی تھی اور اس کے منصب خطابت پر مولانا حافظ اسماعیل ذبیح (متوفی ۲ مئی ۱۹۷۵ء) فائز تھے۔

ترکِ وطن کے وقت محمد رفیق کی عمر گیارہ سال کی تھی اور یہ چوتھی جماعت میں پڑھتے تھے۔قرآنِ مجید اپنے والد ماجد سے گاؤں میں پڑھ لیا تھا، چند ابتدائی دینی کتابیں بھی ان سے پڑھ لی تھیں۔اب یہ لاہور آئے تو مغل پورہ کی مسجد توحید گنج میں حافظ اسماعیل ذبیح کے حلقہ شاگردی میں شامل ہوئے۔ بہ الفاظ دیگر پاکستان میں حافظ صاحب ممدوح ان کے اوّلیں استاذ تھے۔اسی مسجد میں قاری محمد ابراہیم صاحب سے بعض درسی کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں مختلف اوقات و مقامات میں حافظ محمد یوسف گکھڑوی ، مولانا احمد الدین گکھڑوی ، مولانا عبداللہ میر پوری، مولانا نذیر احمد اور مولانا خالد گھر جاکھی سے اکتساب علم کرتے رہے۔ آخر میں کتب تفاسیر واحادیث کی تکمیل کے لیے حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی مرحوم ومغفور کی بارگاہِ فضیلت میں حاضری دی اور ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد انھیں مولانا محمد رفیق سلفی کہا جانے لگا۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ پاکستان آنے کے بعد انھوں نے جس اہل علم سے دینیات کی تعلیم کا آغاز، ان کا نام بھی اسماعیل اور جن عظیم المرتبت شخصیت سے دینیات کی انتہائی کتابیں پڑھیں اور سند فراغ لی ان کا اسم گرامی بھی اسماعیل...... دونوں اساتذہ کرام نے تقریر وخطابت میں بڑی شہرت پائی اور شاگرد بھی اس میدان میں نامور ہوئے۔تینوں استاذ وشاگرد اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی ان حروف کے راقم عاجز کے عالی قدر استاذ تھے اور مولانا محمد اسماعیل ذبیح مخلص ترین بزرگ دوست۔ افسوس مولانا محمد رفیق سلفی سے ملاقات کا موقع نہیں ملا۔

مولانا محمد رفیق سلفی کا دورِ طالب علمی ہی سے مناظرانہ ذہن تھا۔مختلف مذاہب کے لوگوں کے ساتھ ان کے مناظرے ہوتے رہے۔ یہاں ان کے زمانہ طالب علمی کا ایک واقعہ بیان کرنے کو جی چاہتا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ ابتدا ہی سے وہ حاضر دماغ اور حریف پر گرفت کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔

شرح اس متن کی یہ ہے کہ یہ جامع مسجد توحید گنج گکھڑ میں حافظ محمد یوسف گکھڑوی کے حلقۂ شاگردی میں شامل تھے اور حافظ صاحب کا حکم تھا کہ کوئی طالب علم کسی جماعت کے جلسے میں نہیں جا سکتا۔کوئی گیا تو اسے سزا دی جائے گی۔ اس زمانے میں گکھڑ کی بریلوی حضرات کی مسجد میں مولانا عبدالغفور ہزاروی کے شاگرد مولانا عبدالصبور ہزاروی امامت وخطابت کے منصب پر فائز تھے۔ وہ ستائیسویں رمضان کو تقریر کے لیے اپنے استاذ مولانا عبدالغفور ہزاروی کو دعوت دیا کرتے تھے۔ایک مرتبہ ان کی تقریر سننے کے لیے محمد رفیق بھی چند طالب علم ساتھیوں کے ساتھ ان کی تقریر سننے کے لیے جلسے گئے۔مولانا عبدالغفور ہزاروی نے تقریر کرتے

ہوئے فرمایا کہ وہابی آٹھ رکعت تراویح پڑھتے ہیں اور ہم حنفی بیس رکعت پڑھتے ہیں۔ اگر قیامت کے روز اللہ کے دربار میں بیس رکعت تراویح پڑھنا صحیح ثابت ہوگیا تو وہابی بارہ رکعت کہاں سے لائیں گے؟ اور اگر آٹھ ثابت ہوگئیں تو بارہ رکعت ہمارے کسی اور کام آ جائیں گی۔ مولانا عبدالغفور ہزروی کے اس فقہی نکتے پر لوگ بہت خوش ہوئے اور بڑی نعرے بازی ہوئی...... محمد رفیق نے ان کے نام ایک رقعہ لکھ کر بھیجا کہ وہابی اس یقین کے ساتھ آٹھ رکعت تراویح پڑھتے ہیں کہ یہی صحیح ہے لیکن آپ اس شک میں مبتلا ہیں کہ تراویح بیس ہیں یا آٹھ اور اللہ کے دربار میں بیس صحیح قرار پائیں گی یا آٹھ، جب کہ نبی کریم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ ۲۹ شعبان کو اگر بادل وغیرہ کی وجہ سے چاند نظر نہ آئے تو شک کی بنا پر روزہ نہیں رکھنا چاہیے۔ یعنی یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ اگر دوسرے دن روزہ نہ ہوا تو ہمارا یہ نفلی روزہ ہوگا اور اگر چاند ہوا تو اس روزے کو رمضان کے روزوں میں شامل کرلیا جائے گا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص شک کی حالت میں روزہ رکھے، اس نے ابوالقاسم (محمد ﷺ) کی یعنی میری نافرمانی کی۔ جب روزے کے بارے میں شک سے متعلق نبی ﷺ کا یہ فرمان ہے تو آپ کا آٹھ یا بیس تراویح میں شک کا سلسلہ کیوں جاری ہے؟ یہ بھی نبی ﷺ کی نافرمانی کے ذیل میں آتا ہے۔ رقعے میں محمد رفیق نے لکھا تھا کہ اس کا جواب دیا جائے، لیکن مولانا عبدالغفور ہزاروی نے رقعہ پڑھا اور یہ کہہ کر جیب میں ڈال لیا کہ میں نے مناظرہ کرنا چھوڑ دیا ہے۔

رقعہ نویس رفیق صاحب نے رقعے پر اپنا پتا بھی لکھا تھا، اس لیے شہر میں مشہور ہوگیا کہ اہل حدیث کے مدرسے کے ایک طالب علم نے مولانا عبدالغفور سے سوال پوچھا اور وہ اس کا جواب نہ دے سکے۔ بات حافظ محمد یوسف صاحب تک بھی پہنچ گئی۔ انھوں نے طلبا سے دریافت کیا کہ رات تم میں سے جلسے میں کون گیا تھا؟ رفیق صاحب نے کہا میں گیا تھا۔ ان کے ساتھ جو طلبا گئے تھے، انھوں نے بھی اقرار کرلیا۔ رفیق صاحب نے کہا ان سب کو میں لے کر گیا تھا، اس لیے صرف مجھے سزا دی جائے۔ حافظ صاحب نے فرمایا: مدرسے کے قانون کی سب نے خلاف ورزی کی ہے، اس لیے سزا میں سب برابر ہوں گے۔

اس کے بعد جب ان کی خدمت میں سارا واقعہ بیان کیا گیا تو جلسے نہ سننے کی پابندی ختم کردی گئی۔

طالب علمی کے زمانے ہی میں یہ خطابت کے میدان میں آگئے تھے۔ ضلع گوجراں والا کے ایک گاؤں پناکھہ میں ایک صاحب پیر مراد علی شاہ کی مسجد میں وہ کافی عرصہ جمعہ پڑھاتے رہے۔ پھر ٹھٹھہ چھینا کی مسجد میں خطیب مقرر کرلیے گئے۔ بعد ازاں موضع راہ والی میں جی ٹی روڈ پر مسجد تعمیر کی گئی۔ اس سے پہلے یہاں اہل حدیث کی کوئی مسجد نہ تھی۔ یہاں جی ٹی روڈ پر ان کی کوشش سے مسجد کے لیے جگہ خریدی گئی۔ اس کا سنگ بنیاد پیر کے روز ۲۔ دسمبر ۱۹۶۳ء کو رکھا گیا۔ سنگ بنیاد کے لیے وہ حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کی خدمت میں

گئے، لیکن انھیں کوئی ایسی رکاوٹ پیش آ ئی کہ وہ تشریف نہ لے جا سکے اور حافظ محمد یوسف گکھڑوی کو سنگ بنیاد رکھنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد جلد ہی وہاں مسجد تعمیر ہو گئی اور جمعہ و جماعت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس مسجد میں بعد میں مولانا محمد رفیق سلفی تادم وفات پورے پچاس برس خدمت خطابت و امامت سرانجام دیتے رہے۔ یہاں انھوں نے دینیات کی تعلیم کے لیے مدرسہ بھی جاری کیا، جس میں بیرونی طالب علم بھی تعلیم حاصل کرتے تھے اور مقامی بھی۔ اس مدرسے میں ہمارے عزیز دوست جامعہ سلفیہ فیصل آباد کے لائق مدرس، ماہنامہ ''ترجمان الحدیث'' کے مدیر اور متعدد کتابوں کے مصنف مولانا حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی کئی سال خدمت تدریس پر مامور رہے۔ مولانا محمد رفیق سلفی روزانہ فجر کے بعد درس قرآن بھی دیتے تھے۔ درس قرآن کا پہلا دور تیرہ سال میں اور دوسرا سترہ (۱۷) سال میں ختم ہوا۔ تیسرا دور جاری تھا کہ وہ وفات پا گئے۔

اب راہ والی میں چھ یا سات مسجدیں ہیں اور اللہ کے فضل سے یہ مسجدیں نمازیوں سے بھری رہتی ہیں۔ بچوں کی تعلیم کا سلسلہ بھی ان مسجدوں میں جاری ہے۔ راہ والی کے قرب و جوار کے دیہات ترگڑی، تلونڈی کھجور والی، بلے والا، منڈیالا وڑائچ، لوہیاں والا وغیرہ میں مولانا محمد رفیق سلفی نے کتاب و سنت کی خوب اشاعت کی۔ ان مقامات میں وہ پیدل بھی جاتے اور سائیکل پر بھی ان کی آمدورفت رہتی۔ وہ اس نواح کے مشہور خطیب اور مناظر تھے۔ انھوں نے خطابت و امامت کا کبھی کوئی پیسا نہیں لیا، نہ تبلیغ کے سلسلے میں کہیں آمدورفت کا کسی سے کچھ وصول کیا۔ ان کا فرنیچر وغیرہ کا کاروبار تھا اور یہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔

انھوں نے مولانا خالد گرجاکھی، مولانا عبدالرحمٰن عتیق، شیخ محمد اکرام اور دیگر حضرات کی رفاقت میں ضلع گوجراں والا کے مختلف مقامات میں توحید و سنت کی تقریری صورت میں تبلیغ کی۔ شیخوپورہ، سرگودھا، چکوال اور ایبٹ آباد کے دیہات و قصبات میں بھی گئے اور وعظ کیے۔ اللہ نے ان کی زبان میں اثر رکھا تھا اور لوگ ان کے وعظ سے متاثر ہوتے تھے۔

وہ اپنے مبلغ دوستوں کے ساتھ تبلیغ کے لیے گلیات وغیرہ میں بھی گئے۔ اس علاقے کے مختلف مقامات میں میاں فضل حق مرحوم اور ان کے مرحوم و مغفور فرزند میاں نعیم الرحمٰن کی کوشش سے متعدد مساجد کی تعمیر ہوئیں اور لوگوں نے کتاب و سنت کی راہ اختیار کی۔ حافظ محمد یحییٰ عزیز میر محمدی اور ان کے رفقائے کرام کی تبلیغی جدوجہد سے بھی اس نواح کے لوگ بہت متاثر ہوئے۔

مولانا محمد رفیق سلفی نے ۱۹۶۷ء میں اپنے استاذ گرامی حافظ محمد یوسف گکھڑوی کے ساتھ بہ سلسلہ وعظ و تبلیغ حیدر آباد اور کراچی کا سفر بھی کیا اور وہاں مختلف اجتماعات میں تقریریں کیں۔

اس کے بعد ۱۹۸۱ء میں وہ حکیم عبدالرحمٰن آزاد مرحوم کے ساتھ صوبہ سندھ کے شہروں نواب شاہ، سکھر،

میر پور، حیدر آباد اور کراچی گئے اور ہر جگہ بڑے بڑے مجمعوں کو خطاب کیا۔ ایک مرتبہ وہ مولانا حافظ عبداللہ شیخو پوری کے ساتھ کراچی گئے۔ وہاں سب مسالک کے لوگوں کی دو روزہ مشترکہ کانفرنس تھی، جس میں اہل حدیث، دیو بندی، بریلوی اور شیعہ مقررین نے تقریریں کیں۔ حافظ عبداللہ شیخو پوری اور مولانا محمد رفیق سلفی دونوں جماعت اہل حدیث کے ممتاز مقرر تھے اور ان کا حلقۂ سامعین بڑا وسیع تھا۔

مولانا محمد رفیق سلفی نے مناظرے کا فن مولانا احمد الدین گکھڑوی سے سیکھا تھا۔ اس فن میں وہ مولانا حافظ عبدالقادر روپڑی سے بھی متاثر تھے۔ ان دونوں بزرگوں کو یہ اپنے دور کے بہت بڑے مناظر قرار دیتے ہیں اور واقعی یہ بہت بڑے مناظر تھے۔ مناظرے کے بارے میں موضوع مناظرہ سے کامل معلومات کے علاوہ بنیادی بات مناظر کی حاضر جوابی ہے۔ میں نے مولانا احمد الدین گکھڑوی کا مناظرہ بھی سنا ہے اور حافظ عبدالقادر روپڑی کا بھی۔ بے شبہ اس فن میں یہ بزرگ بڑی مہارت رکھتے تھے۔ حافظ عبدالقادر روپڑی نے سلطان المناظرین کے لقب سے شہرت پائی، لیکن وہ خود مولانا احمد الدین گکھڑوی کو استاذ المناظرین کہا کرتے تھے۔

بہرکیف مولانا محمد رفیق سلفی معروف مناظر تھے۔ انھوں نے مرزائیوں، شیعوں، عیسائیوں کے ساتھ بھی مناظرے کیے اور بعض موضوعات پر علمائے احناف سے بھی ان کے مناظروں کا سلسلہ جاری رہا اور اللہ نے ان کو کامیابی سے نوازا۔

صبر و ضبط کے باب میں بھی مولانا محمد رفیق سلفی کا مقام بڑا بلند تھا۔ ان کے ایک لائق بیٹے حافظ عتیق الرحمٰن تھے۔ وہ ۸۔ اگست ۱۹۹۱ء کو فجر کی نماز پڑھا رہے تھے کہ کسی سفاک نے ان کو گولی ماری اور وہ نماز ہی میں شہید ہو گئے۔ یہ بہت بڑا حادثہ تھا جو مولانا ممدوح کو پیش آیا۔ جوان بیٹے کی اچانک موت پر صبر سے کام لینا نہایت مشکل ہے، لیکن مولانا نے اس الم ناک موقع پر انتہائی صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا۔ شہید کی ماں نے بھی اس حادثے کو بڑے صبر اور حوصلے سے برداشت کیا۔ باقی رشتے داروں اور افرادِ خانہ نے بھی ضبط و تحمل سے کام لیا۔

مولانا نے فرمایا: "حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو بھی مسجد میں شہید کیا گیا تھا اور جب انھیں شہید کیا گیا وہ صبح کی نماز پڑھا رہے تھے۔ میرے بیٹے کو بھی مسجد میں شہید کیا گیا اور اس وقت شہید کیا گیا، جب وہ صبح کی نماز پڑھا رہا تھا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی بھی دوسری رکعت تھی اور حافظ عتیق الرحمٰن کی بھی دوسری رکعت تھی۔"

مولانا محمد رفیق سلفی اس دن ایک عزیز کی وفات پر لاہور گئے تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں ان کے یہ

صاحب زادے نماز پڑھا رہے تھے۔ دوسری رکعت کا آخری سجدہ کر کے اُٹھے ہی تھے اور ان کی زبان سے ابھی اللہ کا مبارک نام نکلا ہی تھا کہ کسی دشمن نے گولی کا فائر کیا اور گولی حافظ صاحب کے کندھے میں لگ کر جسم کے اندر چلی گئی۔ دشمن نے دوسری گولی چلائی تو وہ حافظِ قرآن کو لگنے کی بجائے لکڑی کی اس رحل کو لگی، جس میں قرآن رکھا ہوا تھا۔ وہ رحل کی لکڑی کو چیر کر قرآن کے بھی دوسری طرف نکل گئی اور کلام اللہ کے اوراق پھٹ گئے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ اس قرآن کو سامنے رکھ کر درس دینا چاہتے تھے۔

وہ ۱۹۶۵ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۹۹۱ء میں اللہ کے دربار میں پہنچ گئے۔ کل چھبیس برس کی عمر ہوئی۔

انا للہ و انا الیہ راجعون.

ان کی شہادت کے بعد لوگوں نے مولانا سے احتجاجی مظاہرہ کرنے اور جلوس نکالنے کے لیے کہا تو فرمایا: اس کی نہ ضرورت ہے اور نہ اس کا کوئی فائدہ ہوگا۔ اس قسم کے مظاہروں اور جلوسوں سے کبھی کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا۔ اس سے سڑکوں پر لوگوں کی آمدورفت رُک جاتی ہے اور وہ پریشان ہوتے ہیں۔ ہم اس قسم کا کوئی کام نہیں کریں گے جس سے لوگوں کو تکلیف پہنچے۔

مولانا محمد رفیق سلفی کی اولاد تین بیٹیاں ہیں اور سات بیٹے تھے۔ ایک بیٹا محمد صدیق تھا جو چھوٹی عمر میں وفات پا گیا تھا۔

ایک بیٹے محمد شفیق ڈھلوں ہیں جو کاربار بھی کرتے ہیں اور ایک مسجد میں خطیب بھی ہیں۔

دوسرے یہی حافظ عتیق الرحمٰن سلفی تھے جو مستند عالم اور مناظر تھے۔ وہ ۸۔ اگست ۱۹۹۱ء کو حالتِ نماز میں جامِ شہادت نوش کر گئے۔

تیسرے عبدالوحید سلفی ہیں جو کاربار کرتے ہیں اور راہ والی کی مرکزی جامع مسجد کے مہتمم بھی ہیں۔

چوتھے میاں عبدالرشید ڈھلوں ہیں۔ یہ ڈھنگراں والی میں مصروف کار ہیں۔

پانچویں مولانا عبدالقدیر سلفی ہیں۔ یہ باپ کی جگہ راہ والی کی مرکزی مسجد اہل حدیث کے خطیب ہیں۔ جامعہ محمدیہ گوجراں والا کے فارغ التحصیل ہیں اور تجارت ان کا پیشہ ہے۔

چھٹے حافظ شاہد ظہیر تجارت پیشہ ہیں۔

مولانا سلفی کے ایک پوتے محمد طیب شفیق ہیں۔ انھوں نے ۲۰۱۱ء میں درس نظامی کی تکمیل کی۔ کئی سال سے ایک مسجد میں خطیب ہیں اور روزانہ عشاء کے بعد راہ والی کی مرکزی مسجد اہل حدیث میں درس حدیث دیتے ہیں اور نمازِ مغرب کے بعد ترجمہ قرآن پڑھاتے ہیں۔

مولانا مرحوم کے تین داماد ہیں۔

ایک مولانا زین العابدین ہیں، جو مسلم مسجد راہ والی کے خطیب ہیں۔

دوسرے حاجی مصطفیٰ ہیں، یہ راہ والی کی مسجد مزمل اہل حدیث کے مہتمم ہیں۔

تیسرے میاں فاروق فیصل آباد رہتے ہیں اور ثناء ٹیکسٹائل ملز کے مالک ہیں۔

مولانا محمد رفیق سلفی مرحوم نے تحریک تحفظ ختم نبوت میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا تھا۔

اب مولانا محمد رفیق سلفی کی وفات کے متعلق سنیے!

بدھ کے روز ۲۱۔ اگست ۲۰۱۳ء کو وہ اپنے گھر میں نمازِ فجر کے بعد سوئے اور پھر اسی حالت میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ یعنی دنیا کی نیند اس عالم تبلیغ پیشہ کو آخرت کی نیند میں لے گئی۔ اس وقت وہ عمر کی ۷۷ منزلیں طے کر چکے تھے۔

انا للہ و انا الیه راجعون .

ان کی نمازِ جنازہ بعد نمازِ مغرب گورنمنٹ گرلز کالج راہ والی میں پروفیسر حافظ عبدالستار حامد نے پڑھائی، جس میں ہزاروں لوگوں نے شرکت کی۔

اللّٰھم اغفرله وارحمه و عافه واعف عنه .

(مولانا محمد رفیق سلفی سے متعلق معلومات میری درخواست پر وزیر آباد سے جناب حکیم عتیق الرحمٰن صاحب نے ارسال فرمائیں اور بعض باتوں کا علم حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی سے ہوا۔ اس پر میں ان دوستوں کا شکرگزار ہوں۔)

موجودین باون (۵۲)

خدام حدیث

مولانا ظہیر الدین رحمانی

(ولادت ۱۹۲۰ء)

ضلع اعظم گڑھ ہندوستان کے صوبہ یوپی کا ایک مشہور مردم خیز علاقہ ہے۔ اس ضلعے کا ایک قصبہ مبارک پور ہے جو اس نواح کا صنعتی مرکز بھی ہے اور اہل علم کا مرکز بھی ہے۔ وہیں ایک چھوٹی سی بستی حسین آباد کے نام سے موسوم ہے۔ یہی بستی حضرت مولانا ظہیر الدین صاحب رحمانی کا زاد بوم ہے۔ انھوں نے اسی بستی میں پرورش پائی اور یہیں پلے بڑھے۔

خاندانی روایت کے مطابق ان کی ولادت ۱۹۲۰ء میں ہوئی، لیکن تعلیمی کاغذات میں ۱۹۲۳ء درج ہے۔

اب آیے آئندہ سطور میں حضرت مولانا ممدوح کے حالات خود انہی کی زبانی پڑھیے جو ۱۵-اکتوبر ۲۰۰۴ء کے پندرہ روزہ ''جریدہ ترجمان'' دہلی کی جلد ۲۴ کے شمارہ نمبر ۲۰ میں درج ہیں۔ اس مختصر مضمون میں انھوں نے اپنی زندگی کے اہم واقعات بیان کر دیے ہیں۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں:

اپنی والدہ محترمہ خدیجہ بیگم بنت پیر حافظ نظام الدین سے قرآن کے چند پارے پڑھے اور اس کے بعد اپنے نانا کے ایک شاگرد حافظ عبدالعزیز سے پڑھے۔ پرائمری اور درجہ مولوی تک کی تعلیم مدرسہ دارالتعلیم مبارک پور میں ہوئی۔ اس کے بعد مدرسہ فیض عام مئو ناتھ بھنجن میں چھٹی جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ بعض لوگوں کی ترغیب پر دارالعلوم دیوبند میں داخل ہو گیا، لیکن دارالعلوم دیوبند کی تعلیم میرے والد کو پسند نہیں تھی۔ انھوں نے مولانا عبیداللہ صاحب رحمانی سے بات چیت کر کے میرے بارے میں دلّی جانے کا فیصلہ کر لیا، چنانچہ میں حضرت مولانا عبیداللہ صاحب رحمانی شارح مشکوٰۃ اور مولانا نذیر احمد صاحب املوی اور دوسرے مبارک پوری اساتذہ کے ساتھ دہلی روانہ ہو گیا۔ دہلی میں ''مدرسہ رحمانیہ'' میں چھٹی جماعت میں میرا داخلہ ہو گیا اور تین سال وہاں رہ کر وہاں کے نصاب کے مطابق تعلیم حاصل کر کے ۱۹۴۰ء میں سند فراغت حاصل کر لی۔

میری زندگی کا یہ عجیب واقعہ ہے کہ میں نے خود سے کبھی ملازمت کی درخواست نہ کی بلکہ ملازمت مجھے تلاش کرتے ہوئے میرے گھر آئی۔ ابتدا میں میری فراغت کے وقت میری مادر علمی ''دارالتعلیم'' کا حال بہت تنگی اور عسرت کے دور سے گزر رہا تھا تو میں نے اس مدرسے کو سنبھالنے کے لیے اس وقت کے ناظم جناب الحاج عبدالسلام صاحب مرحوم کی خواہش اور مشورے کے مطابق بلا تنخواہ کام کرنا شروع کر دیا۔ اس وقت

لدھیانہ میں ایک مدرسہ یعقوبیہ تھا، اس کی طرف سے ملازمت کی پیش کش ہوئی، میں وہاں جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ یہ ۱۹۴۴ء کی بات ہے۔ اتفاق سے ان دنوں دلّی میں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کا جلسہ ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ دلی کے جلسے میں شرکت کے بعد لدھیانہ چلا جاؤں گا۔ اتفاق سے جلسے میں آگرہ کی جماعت کے لوگ شریک تھے۔ انھی میں مدرسہ قاسم العلوم گکوگلی (آگرہ) کے ناظم جناب الحاج محمد یوسف صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی، انھوں نے حضرت مولانا عبیداللہ رحمانی سے میرے حالات سن کر اپنے مدرسہ قاسم العلوم کی ملازمت کی پیش کش کی چنانچہ میں نے لدھیانہ کے مدرسہ یعقوبیہ والوں کو معذرت کا خط لکھ دیا اور مولانا عبیداللہ صاحب کی سفارش پر آگرہ چلا گیا، لیکن وہاں ایک ہفتے سے زیادہ ٹھہر نہ سکا اور استعفا دے کر گھر آ گیا۔ کچھ دنوں کے بعد جناب ڈاکٹر محمد فرید صاحب بانی و ناظم مدرسہ احمدیہ سلفیہ دربھنگا کا خط آیا، انھوں نے اپنے مدرسے کے لیے ملازمت کی پیش کش کی، محترم ڈاکٹر صاحب سے دلّی کی اہل حدیث کانفرنس کے جلسے میں ملاقات ہوچکی تھی چنانچہ میں ان کی دعوت پر دربھنگا مدرسہ احمدیہ سلفیہ پہنچ گیا لیکن وہاں قیام وطعام کی فضا مجھے پسند نہ آئی اور دو ہفتوں کے بعد استعفا دے کر پھر گھر چلا آیا۔

۱۹۴۶ء میں میرے والدین کا اچانک ایک ہی دن انتقال ہوگیا۔ اب میں نے تہیہ کرلیا کہ مجھے اپنے قوت بازو سے اپنی روزی پیدا کرنا ہے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ مولانا فضل الرحمٰن صاحب اعظمی اور مولانا مفتی عبدالعزیز صاحب اعظمی اس وقت جامعہ محمدیہ رائیدرگ میں مدرس تھے۔ وہ دونوں سالانہ چھٹیوں میں اپنے گھر مئو ناتھ بھنجن آئے ہوئے تھے اور وہاں سے حضرت مولانا عبیداللہ صاحب مبارک پوری کی ملاقات کے لیے مبارک پور آئے۔ اس وقت میں بھی مبارک پور مولانا کی ملاقات کے لیے گیا ہوا تھا، ملاقات کے بعد مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے جامعہ محمدیہ رائیدرگ کی ملازمت کی لیے پیش کش کی۔ اس سے پہلے حضرت مولانا اسماعیل صاحب ناظم جامعہ محمدیہ رائیدرگ کا خط میرے پاس آ چکا تھا، مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے رائیدرگ اور مدرسے کا کچھ ایسا نقشہ کھینچا کہ میرے دل میں رائیدرگ جانے کی خواہش پیدا ہوگئی۔

سالانہ تعطیلات کے بعد جب مدرسہ کھلا تو میں رائیدرگ پہنچ گیا۔ وہاں بمشکل چھ مہینے رہا اور سالانہ تعطیل میں گھر چلا گیا اور پھر استعفا نامہ بھیج دیا۔ مولانا اسماعیل صاحب ناظم جامعہ اور میرے ساتھی اساتذہ مولانا فضل الرحمٰن صاحب اور مولانا عبدالعزیز صاحب کو تعجب ہوا اور انھوں نے مجھ پر زور ڈالا کہ میں اپنا استعفا واپس لے لوں اور پھر جامعہ محمدیہ رائیدرگ کی ملازمت قبول کرلوں۔

چنانچہ ان محترم بزرگوں کے مسلسل اصرار پر ۱۹۴۸ء میں دوبارہ رائیدرگ آ گیا۔ ۱۹۴۹ء میں جب کہ میں رائیدرگ میں تھا میری اہلیہ کا میرے وطن حسین آباد میں اچانک انتقال ہوگیا۔ بذریعہ تار مجھے اطلاع ملی

اور میں وطن روانہ ہوگیا، مگر مسافت بعید کی وجہ سے تجہیز و تکفین کے بعد پہنچا۔ ۱۹۵۰ء میں میری دوسری شادی مولانا اسماعیل صاحب ناظم جامعہ محمدیہ کے اصرار پر رائیدرگ میں ہوئی۔ اس طرح میں مستقل طور پر رائیدرگ میں مقیم ہوگیا۔

شادی کے بعد بعض گھریلو باتوں کی وجہ سے مولانا اسماعیل صاحب ناظم جامعہ سے میرا اختلاف ہوگیا اور میں نے جامعہ محمدیہ رائیدرگ کی ملازمت سے استعفا دے دیا۔ میرے استعفا کی خبر بنگلور کے اردو روزناموں میں شائع ہوگئی اور پھر اس خبر کے شائع ہوتے ہی مختلف جگہوں سے ملازمت کی پیش کش ہوئی۔ میں نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا کہ اتنے میں جامعہ دار السلام عمر آباد سے خط آیا۔ یہ خط کارڈ کی شکل میں تھا اور لکھنے والے میرے قریبی ہم درد اور دوست جامعہ کے استاذ اور اس وقت کے نائب ناظم مولانا عبدالسبحان صاحب اعظمی تھے۔ خط ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا جس پر اس وقت کے ناظم جناب مولانا عبدالواحد صاحب رحمانی کے دستخط تھے۔

عمر آباد آنے سے قبل یہاں سے قریب (عمر آباد سے) وانمباڑی کے چرم تاجر جناب الحاج پٹیل عبدالحمید صاحب تجارت کے سلسلے میں بلھاری میں رہا کرتے تھے۔ میرے قیام رائیدرگ کے دوران میرا بلھاری آنا جانا رہا کرتا تھا۔ اس سلسلے میں جناب حاجی عبدالحمید پٹیل صاحب سے میری شناسائی اور ملاقات تھی۔ وہ دعوت دے کر مجھے اپنے ساتھ وانمباڑی لائے۔ وانمباڑی کے قیام کے دوران حاجی صاحب مذکور کے ساتھ عمر آباد آیا۔ عمر آباد میں اس وقت کے مدرسے کے ناظم ساہوکار جناب اسماعیل صاحب رحمہ اللہ سے ملاقات ہوئی۔ وہ ان دنوں مریض تھے۔ چلنے پھرنے سے معذور تھے، انھوں نے مجھ سے کہا کہ آپ عمر آباد آجایئے۔ آپ کی جگہ عمر آباد ہے۔ میں نے کہا ان شاء اللہ۔ اسی وقت آں مرحوم کے تینوں صاحب زادے جناب کاکا رشید صاحب مرحوم، اور جناب کاکا عمر صاحب مرحوم اور کاکا سعید احمد صاحب حفظہ اللہ سے ملاقات ہوئی۔ میں ان لوگوں کے اخلاق سے متاثر تھا اس لیے جب عمر آباد کا خط آیا جس میں ملازمت کی پیش کش تھی اور مولانا عبدالواحد صاحب نے لکھا تھا کہ ”اخبارات سے آپ کے استعفے کی خبر معلوم ہوئی، آپ فوراً عمر آباد آجایئے۔ دار السلام کا دروازہ آپ کے لیے کھلا ہوا ہے، تمام باتیں بالمشافہ طے ہوجائیں گی۔“

یہ خط ملنے کے ساتھ میں مطمئن ہوگیا اور عمر آباد آنے کا ارادہ کرلیا، چنانچہ ۱۵ر نومبر ۱۹۵۸ء کو میں عمر آباد پہنچ گیا اور اس وقت سے اب تک بغیر کسی پریشانی کے عمر آباد میں ہوں اور اللہ تعالیٰ کا بے پایاں شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے اتنی طویل مدت تک علم کی خدمت کی توفیق عطا فرمائی۔

مدرسہ دار التعلیم حسین آباد میں جن اساتذہ سے میں نے فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی وہ درج

ذیل ہیں:

۱- حضرت مولانا محمد اصغر صاحب رحمہ اللہ

۲- حضرت مولانا محمد احمد صاحب املوی رحمہ اللہ

۳- اور عارضی طور پر حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب مبارک پوری شارح ترمذی رحمہ اللہ

مدرسہ فیض عام مئو میں میرے اساتذہ درج ذیل تین ہیں:

۱- حضرت مولانا احمد صاحب صدر المدرسین مدرسہ فیض عام مئو

۲- حضرت مولانا عبداللہ صاحب شائق استاذ حدیث وادب

۳- حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب نحوی: استاذ نحو وفلسفہ (فلسفۂ قدیم)

مدرسہ دار الحدیث رحمانیہ میں میرے اساتذہ درج ذیل ہیں:

۱- حضرت مولانا احمد اللہ صاحب، پرتاپ گڑھی

۲- حضرت مولانا عبیداللہ صاحب رحمانی، مبارک پوری شارح مشکوٰۃ

۳- حضرت مولانا نذیر احمد صاحب املوی رحمانی مصنف تصنیفات کثیرہ

۴- حضرت مولانا اصحاب الدین صاحب استاذ تفسیر

۵- حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب، استاذ فلسفہ

۶- حضرت مولانا عبدالجلیل صاحب بستوی استاذ ادب

ان کے علاوہ اور بہت سے اساتذہ ایسے ہیں جن سے مختلف اوقات میں علمی استفادہ کیا۔

اللہ کے فضل وکرم سے میری تدریس کی طویل مدت میں مجھ سے ہزاروں اشخاص نے استفادہ کیا جن کی فہرست میرے پاس محفوظ نہیں ہے۔ اور اللہ سے دعا ہے کہ وہ میری ان حقیر خدمات کو قبول فرمائے۔

یہ آج سے آٹھ سال قبل کی مولانا ظہیر الدین رحمانی کی اپنے ہاتھ کی تحریر ہے۔

معلوم نہیں اب مولانا ممدوح کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ (۲۸۔ ستمبر ۲۰۱۳ء) کو چمن ستان حدیث کے خوانندگانِ محترم کی خدمت میں پیش کی گئی ہے۔

چودھری غلام حسین تھاڑیا

(ولادت ۱۶۔ جولائی ۱۹۲۳ء)

۱۹۴۳ء کے مارچ میں معلم کی حیثیت سے میں مرکز الاسلام گیا جو لکھو کے گاؤں سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر تھا۔ اس سے ڈیڑھ سال بعد ۱۹۴۴ء کے آخر میں وہاں ایک اور صاحب آئے جن کا حلیہ اور اس وقت کا لباس اور چال ڈھال اب تک میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ میانہ قد، اکہرا بدن، گندمی رنگ میں سرخی کی آمیزش، تیکھی ناک، چمک دار آنکھیں، لبوں پر مسکراہٹ، چھوٹے سائز کی کالی ڈاڑھی۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق نسواری سے رنگ کی کلے پر طرّے دار پگڑی باندھے اور سفید لٹھے کا تہبند اور سفید قمیص پہنے ہوئے۔ تیئس چوبیس سال کے خوب رو جوان۔! مولانا معین الدین لکھوی نے تعارف کرایا: یہ ہیں چودھری غلام حسین تھاڑیا بی اے، یہ ہمارے مدرسے میں مدرس کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں گے اور دیگر مضامین کے ساتھ ساتھ طلباء کو ریاضی اور انگریزی وغیرہ جدید علوم کے مضامین پڑھایا کریں گے۔

''تھاڑیا'' کی نسبت سے میرا ذہن جو بسا اوقات اصل بات سمجھنے میں ٹھوکر کھا جاتا ہے ''دیہاڑیا'' کی طرف منتقل ہوا، لیکن یہ انتقالِ ذہنی خلافِ واقعہ یا خلافِ حقیقت نہیں تھا۔ ہم میں سے ہر شخص کسی نہ کسی صورت میں دیہاڑیا ہے یعنی مزدور۔ فرق صرف یہ ہے کہ مزدوری کی شکلیں کچھ مختلف ہوتی ہیں۔ کسی کی مزدوری کسی قسم کی ہے، کسی کی کسی قسم کی۔ میں خود ہمیشہ دیہاڑیا یا مزدور رہا۔ لوگ مجھے مصنف یا رائٹر کہتے ہیں، یہ ان کی مہربانی ہے، ورنہ اصل بات یہ ہے کہ میں قلم کا مزدور ہوں یعنی دیہاڑی دار۔

چودھری غلام حسین تھاڑیا سے کھڑے کھڑے چند باتیں ہوئیں تو اندازہ ہوا کہ یہ بظاہر سنجیدہ طبع ہونے کے باوجود بباطن خوش مزاج اور بزبان خوش کلام ہیں۔ اب ہم دونوں ایک ہی کمرے (یا ایک ہی کچے کوٹھے) کے وسنیک اور ایک ہی مکان کے رہائشی اور دن رات ایک ہی ادارے کے ساتھی تھے۔ ہم نے ایک دوسرے کو کیسا پایا اور کس طرح آپس میں گزر گزران ہوئی، اس کا تو آگے چل کر پتا چلے گا، پہلے یہ معلوم کر لیا جائے کہ انھیں تھاڑیا بروزن دیہاڑیا کیوں کہا جاتا ہے اور ان کے آبا و اجداد کون تھے؟

بات یہ ہے کہ کسی زمانے میں ان کے دادے پڑدادے جس گاؤں میں سکونت پذیر تھے، اس گاؤں کا نام ''تھاڑا'' تھا۔ وہ گاؤں دریائے ستلج کے کنارے واقع تھا۔ ہر سال بارش کے موسم میں وہاں سیلاب کا حملہ

ہوتا تھا، ان کی زمینیں اس کی زد میں آ جاتی تھیں اور فصلیں برباد ہو جاتی تھیں۔ ان کے خاندان کے ایک بزرگ کا نام میاں عبدالرحمٰن تھا۔ وہ موضع تہاڑا کی سکونت ترک کر کے فیروز پور آ بسے تھے اور اس زمانے کی سرکار نے ان کو تہاڑا کی زمینوں کے بدلے میں وہاں خاصا رقبہ دے دیا تھا اور اس خاندان کے لوگوں کی وہاں ایک خاص بستی آباد ہو گئی تھی، میاں عبدالرحمٰن کے نام کی نسبت سے اس بستی کا نام ''بستی رحمان تہاڑیا'' رکھا گیا اور محکمہ مال کے کاغذات میں اس کا یہی نام درج تھا۔ پھر آگے چل کر اس بستی کے مکینوں کے ہر اس فرد کو، جس کا تہاڑا گاؤں سے تعلق تھا ''تہاڑیا'' کہا جانے لگا۔ یہ نسبت شہروں میں بھی چلتی ہے، جیسے لاہوریا، سیالکوٹیا، ملتانی، مظفر گڑھیا، گوجراں والیاں، پشاوریا وغیرہ۔

یہ بستی تقسیم ملک سے قبل کے فیروز پور کے جغرافیے کی رو سے چھاؤنی اور شہر کے درمیان بجانب شہر بائیں طرف اس بڑے پل کی ڈھلوان سے تھوڑا سا آگے تھی جو ریلوے لائن کے اوپر سے شہر اور چھاؤنی کو ملاتا تھا۔ میں ایک مرتبہ چودھری غلام حسین کے ساتھ وہاں گیا تھا۔ وہ ان کے ماموں چودھری عبدالسلام کا مکان تھا اور ہم نے دوپہر کا کھانا وہیں کھایا تھا۔

آہستہ آہستہ ''بستی رحمان تہاڑیا'' کا نام ''تہاڑیاں والی بستی'' میں بدل گیا، یعنی لفظ رحمان لوگوں کی زبان سے اتر گیا۔ اس بستی کے علاوہ فیروز پور میں تین بستیاں اور تھیں، وہ تھیں بھٹیاں والی بستی، ممدیاں والی بستی اور ٹینکاں والی بستی۔ جس طرح تہاڑیاں والی بستی کی ایک خاص وجہ تسمیہ تھی، اسی طرح باقی تین بستیوں کی وجوہِ تسمیہ بھی ہوں گی۔ یہ چار بستیاں تھیں جو فیروز پور شہر کے مشرق و مغرب اور جنوب و شمال کے چار دروازوں (دہلی دروازہ، ملتانی دروازہ، قصوری دروازہ اور مکھو دروازہ) سے تھوڑا سا باہر تھیں۔

پھر ایک وقت آیا کہ فیروز پور میں سرکاری عمارتیں بننے لگیں مثلاً فیروز پور شہر اور چھاؤنی کے الگ الگ ریلوے اسٹیشن، ضلع کچہری، ضلعی افسروں کی کوٹھیاں، تحصیل ہیڈ کوارٹر، گورنمنٹ ہائی سکول اور جیل خانہ وغیرہ۔ اب تہاڑیاں والی بستی کے مکینوں کی زمینیں (جو انھیں تہاڑا گاؤں کی زمینوں کے بدلے میں ملی تھیں) ان سرکاری عمارتوں نے گھیر لیں اور ان کے تبادلے میں انھیں فیروز پور سے بجانب جنوب گیارہ بارہ میل کے فاصلے پر دو چک (یعنی گاؤں) دے دیے گئے۔ ایک گاؤں کا نام تھا چک روڑاں والا اور دوسرے کا نام تھا چک سادھو والا۔ چودھری غلام حسین کے آبا و اجداد جو کھیتی باڑی کرتے تھے، چک سادھو والا میں آباد ہو گئے اور اسے ان کے پرانے مسکن کی وجہ سے ''چک تہاڑیاں'' کہا جانے لگا۔

چودھری غلام حسین ارائیں برادری کے فرد ہیں اور کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ فیروز پور شہر میں ان کے ننھیال تھے۔ ان کی ولادت وہیں ۱۶۔ جولائی ۱۹۲۳ء کو ہوئی۔ والد کا اسم گرامی میاں محمد ابراہیم

اور دادا کا نام میاں الٰہی بخش تھا۔ میں نے ان کے والد کو دیکھا ہے۔ خاموش طبع اور نیک آدمی۔

چودھری صاحب کے ننھیال کے بعض افراد اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور فیروز پور شہر اور اس کے گرد و نواح میں انھیں احترام کا مقام حاصل تھا۔ ان کے ایک ماموں کا نام عبدالحق تھا جو اس زمانے میں انگلستان سے بیرسٹری کر کے آئے تھے، جب پورے ہندوستان میں بہت کم تعداد میں بیرسٹر ہوں گے۔ ان کے ایک ماموں چودھری عبدالستار تھے جو ضلع فیروز پور کے ایک شہر ''فاضلکا'' میں گورنمنٹ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ وہ بڑے جرأت مند شخص تھے۔ کشمیر میں ڈوگرہ حکومت کے مظالم کے خلاف ۱۹۳۰ء میں مجلس احرار نے تحریک شروع کی تو چودھری عبدالستار کی حمیّت جوش میں آئی اور وہ سرکاری ملازمت ترک کر کے مجلس احرار میں شامل ہو گئے اور اس کے چوٹی کے راہنماؤں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ بالخصوص فیروز پور شہر اور ضلعے کے سیاسی اور دینی حلقوں میں ان کو بہت تکریم کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ میں نے ان کو نہیں دیکھا لیکن فیروز پور کے لوگوں سے ان کی تعریف سنی ہے۔ افسوس ہے انھوں نے زیادہ عمر نہیں پائی۔ ان کی وفات کے بعد ان کی ایک بیوہ تھیں اور اولاد تھی تین بیٹیاں۔ چودھری غلام حسین نے پہلی جماعت اپنے اسی ماموں چودھری عبدالستار کے ہائی سکول فاضلکا میں پڑھی۔ مرحوم کی تربیت کا ان پر بہت اثر ہے۔

چودھری عبدالستار نے جب سکول کی ملازمت چھوڑ دی تو غلام حسین فیروز پور آ گئے اور پھر دوسری جماعت سے لے کر میٹرک تک فیروز پور کے گورنمنٹ ہائی سکول میں تعلیم حاصل کی۔ اسی سکول میں ان کا تعلق مولانا معین الدین لکھوی سے ہوا۔ وہ ان کے میٹرک میں کلاس فیلو تھے۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد انھوں نے فیروز پور کے آر، ایس، ڈی (رام سکھ داس) کالج میں داخلہ لیا اور وہیں بی اے پاس کیا۔

اب چودھری غلام حسین کا دن رات کا نظام اوقات (ٹائم ٹیبل) ملاحظہ ہو جو انھوں نے سکول اور کالج کی طالب علمی کے زمانے میں اپنے لیے بنا رکھا تھا۔ اس کا ذکر یہاں اس لیے کیا جاتا ہے کہ ممکن ہے کسی طالب علم کی اس پر نظر پڑ جائے اور وہ اس پر عمل کرنے لگے یا کسی طالب علم کے والدین کو ان سطور کے مطالعہ کا موقع ملے تو وہ اپنے بچوں کو اس طرف توجہ دلانے کی کوشش کریں۔ صبح کی نماز باجماعت پڑھنے کے بعد تلاوتِ قرآن، پھر تھوڑی بہت سیر، واپس آ کر غسل اور ناشتہ، پھر سکول (یا کالج) کو روانگی، چھٹی کے بعد گھر آ کر کھانا، پھر ظہر کی نماز، بعد ازاں وقت کی گنجائش کے مطابق آرام، پھر عصر تک کسی کتاب کا مطالعہ، عصر کی نماز کے بعد تقریباً ایک گھنٹا مطالعہ، اس کے بعد غروبِ آفتاب تک کھیل، فٹ بال یا ہاکی، پھر مغرب کی نماز، کھانا اور کھانے کے بعد کسی دوست کے ساتھ یا اکیلے سیر، واپس آ کر عشا کی نماز باجماعت اور پھر سو جانا۔

موسم اور حالات کے مطابق گرمی اور سردی میں طالب علمی کے دور میں یہی نظام اوقات رہا۔
تعلیم کے زمانے میں طلبا کے لیے مختلف شہروں اور علاقوں کی سیر و سیاحت کا سلسلہ بھی چلتا ہے۔ چودھری غلام حسین نے اس زمانے میں اپنے کالج کے طلبا کے ساتھ لدھیانہ، امرتسر، دہلی، فتح پور سیکری، متھرا، آگرہ، علی گڑھ وغیرہ کی سیر کی۔ ان شہروں میں مجھے بھی گھومنے پھرنے کا بہت موقع ملا۔ اس کی روداد میں نے اپنی کتاب ''گزر گئی گزران'' میں بیان کی ہے۔

بی اے میں کامیاب ہونے کے بعد چودھری غلام حسین کا ارادہ پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے عربی میں داخلہ لینے کا تھا لیکن ایک بزرگ سید حسن شاہ نقوی نے ان کو ریلوے میں بطور گارڈ بھرتی کرا دیا۔ شاہ صاحب بڑے مخلص آدمی تھے، میں انھیں جانتا تھا، وہ محکمہ ریلوے میں ملازم تھے۔ انھوں نے فیروز پور میں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھا تھا اور ان سے عقیدت مندانہ مراسم رکھتے تھے۔ پریکٹیکل اور تھوریٹکل ٹریننگ کے لیے چودھری صاحب والٹن ٹریننگ سکول میں داخل ہو گئے۔ یہ دو مہینے کا کورس تھا۔ کورس مکمل ہوا تو گڈس ٹرین کے گارڈ کے طور پر کراچی ڈویژن میں روہڑی سکھر میں ان کی تعیناتی ہوئی۔ اس زمانۂ ملازمت کے چند واقعات سنیے!

☆...... گارڈ کے پاس لکڑی کا ایک بکس ہوتا ہے، جس میں ایک لیمپ، رجسٹر، ارائیول ڈیپارچر کے فارم، کمبل، جھنڈیاں اور پٹاخے وغیرہ ہوتے ہیں۔ لیکن چودھری صاحب نے ان سرکاری چیزوں کے علاوہ پاجامہ، مصلّی، لوٹا، تولیہ وغیرہ غیر سرکاری مال بھی اس میں ڈال رکھا تھا۔ لوٹے کی ٹونٹی کے ساتھ رسی سے بن کی مسواک بھی شاید باندھ رکھی ہو۔ ایک دن انھوں نے سٹی جانا تھا۔ ایس ایم (سٹیشن ماسٹر) سے کہا کہ میرا بکس بریک میں رکھوا دیں، اور خود آگے جا کر ڈرائیور کا نام اور انجن کا نمبر نوٹ کر کے ڈرائیور کو چلنے کا اشارہ دے دیا۔ گاڑی چل پڑی۔ یہ پیچھے آ کر بریک میں سوار ہونے لگے تو دیکھا کہ قلی ان کا بکس اٹھائے آ رہا ہے۔ گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی تھی اور قلی کا بکس لے کر بریک تک پہنچنا مشکل تھا۔ بڑے پریشان ہوئے کہ سب ضروری چیزیں اس بکس میں تھیں۔ اتنے میں ریلوے کے ایک ملازم نے کہا آپ جایے، پیچھے میل ٹرین (کوئٹہ میل) آ رہی ہے، آپ کا بکس اس میں بھیج دیا جائے گا۔ گاڑی رن تھرو تھی، پیچھے لیمپ نہیں تھا۔ ہر اسٹیشن پر گاڑی روک لی جاتی اور ان سے دستخط لیے جاتے کہ گاڑی ٹھیک جا رہی ہے۔ رات کا سفر، سردی کا موسم اور گاڑی کوئٹے کی طرف جا رہی ہے۔ سردی لمحہ بلمحہ بڑھ رہی ہے اور ہوا کے تیز جھونکے پورے زور سے گارڈ صاحب کی طرف آ رہے ہیں۔ وہ کبھی بیٹھتے ہیں، کبھی اٹھتے ہیں، کبھی اپنے ڈبے میں گھومنے لگتے ہیں، کبھی بصورتِ ورزش ڈنڈ پیلتے اور بیٹھکیں

لگاتے ہیں، کسی اسٹیشن پر گاڑی رکتی ہے تو کنٹرول سے پتا کرتے ہیں کہ کوئٹہ میل کہاں ہے؟ لیکن اس کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ سردی کی شدت سے اس طرح ٹھٹھر گئے کہ تقریباً یقین ہو گیا کہ یہ زندگی کی آخری رات ہے۔ اور اللہ سے گزشتہ گناہوں کی توبہ کرنے کا وقت آ پہنچا ہے، اس واقعہ پر کم وبیش ستر برس کا عرصہ بیت چکا ہے لیکن وہ ماشاء اللہ زندہ ہیں اور اللہ کے فضل سے ٹھیک ٹھاک زندہ ہیں اور ہر وقت توبہ کرتے ہیں۔

اسی حالت میں صبح کے قریب جب سبّی دو تین اسٹیشن رہ گیا تو کوئٹہ میل نے انھیں آ پکڑا۔ یہ دوڑ کر اس کے گارڈ کے پاس پہنچے اور اپنے بکس کے بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ آپ کا بکس میں بہت پیچھے فلاں اسٹیشن پر چھوڑ آیا ہوں۔ یہ الفاظ سن کر تکلیف مزید بڑھ گئی۔ دوسرے دن واپسی پر اس اسٹیشن سے بکس لیا اور یادداشت سے کاغذات پُر کیے۔

☆......ایک دن چودھری صاحب اپنی گڈس ٹرین لے کر سبّی سے واپس آ رہے تھے کہ لاڑکانہ کے قریب ان کی ٹرین کسی اسٹیشن پر رکی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ یہ بریک کی پچھلی طرف کھڑے دھوپ سینک رہے تھے کہ ایک لمبا تڑنگا نوجوان ان کے پاس آیا اور کہا مجھے فلاں اسٹیشن تک جانا ہے، وہاں اتار دینا اور جتنے پیسے چاہے لے لینا۔ انھوں نے اسے بٹھا لیا اور اسے دیکھ کر مسکرائے۔ اس نے مسکرانے کی وجہ پوچھی تو کہا تمھارا نام زین العابدین ہے؟ اس نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا اور کہا: جی ہاں میرا نام زین العابدین ہے۔ انھوں نے دوسرا سوال کیا: آج سے دس بارہ سال پہلے تم گورنمنٹ ہائی سکول فیروز پور (پنجاب) میں پڑھتے رہے ہو؟ وہ سوچ کر کہنے لگا: جی ہاں۔ ساتھ ہی کہا لیکن میں نے آپ کو بالکل نہیں پہچانا۔ سندھ کے اس جنگل اور ریگستان میں آپ میرے واقف کیسے نکل آئے؟ اتنے میں اس کا اسٹیشن آ گیا اور وہ سلام کر کے گاڑی سے اتر گیا۔

☆......ایک دن یہ کوٹری کی طرف سے روہڑی ہیڈ کوارٹر کی طرف جا رہے تھے کہ ایک اسٹیشن پر ان کی گاڑی رکی۔ بریک کے دو دروازے ہوتے ہیں، یہ پچھلا دروازہ اندر سے بند کر کے اگلے دروازے سے نکل کر پلیٹ فارم پر آ گئے اور اسٹیشن کے عملے سے باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں ڈیپارچر (روانگی) کا وقت ہو گیا۔ اسٹیشن ماسٹر نے سگنل دے دیا، انھوں نے بھی جھنڈی ہلا دی اور گاڑی چل پڑی۔ بریک ان کے برابر آئی تو بھاگ کر پچھلی طرف چڑھ گئے۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ سوچا کہ یہاں کھڑے رہے تو سردی سے برا حال ہو جائے گا۔ اگلی طرف جانے کی کوئی صورت نہ تھی، اس لیے کہ دونوں طرف کے فٹ بورڈ الگ الگ تھے۔ انھوں نے آگے کو منہ کر کے چھلانگ لگا دی۔ گاڑی کی رفتار تیز ہو چکی

تھی، اس کا پچھلا حصہ بھی اسٹیشن سے نکل چکا تھا۔ ہوا کے تیز جھونکے نے ان کو آگے دھکیل دیا۔ یہ نہایت خطرناک صورتِ حال تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے مہربانی فرمائی کہ ہاتھ اگلی طرف بار پر پڑ گیا اور یہ کود کر اوپر چڑھ گئے۔ یعنی موت کے جبڑوں سے نکل گئے۔

☆......ان لوگوں کو مہینے کی تاریخوں کا علم تو ہوتا ہے، لیکن دنوں کا بالعموم پتا نہیں چلتا۔ ایک دن ایک بجے کے قریب اپنے ہیڈ کوارٹر روہڑی آئے۔ اسٹیشن پر گاڑی سے اترے تو اچانک خیال آیا کہ آج جمعے کا دن ہو گا۔ ٹکٹ کلکٹر سے پوچھا تو اس نے کہا آج شاید جمعرات ہے۔ اے ایس ایم سے پوچھا تو اس نے جواب دیا شاید جمعۃ المبارک ہے۔ انھیں تسلی نہ ہوئی تو ایس ایم سے پوچھا۔ اس نے کہا معلوم نہیں کیا دن ہے۔ ایک قلی نے کہا اس اس پہاڑی کے پرے جامع مسجد ہے۔ وہاں جا کر دیکھ لیں، اگر جمعہ ہو رہا ہو تو پڑھ لیں، ورنہ واپس آ جائیں۔ پریشان ہو کر اپنے کوارٹر کی طرف چل پڑے۔ راستے میں ایک مسجد آئی۔ اس میں خطبہ ہو رہا تھا۔ اب کپڑے بدلنے کے لیے تیزی سے کوارٹر میں آئے۔ واپس گئے تو نمازِ جمعہ پڑھی جا چکی تھی، جس کا انھیں نہایت افسوس ہوا۔

☆......اب ایک اور واقعہ سنیے جو اس سلسلے کا آخری واقعہ ہے اور ان کی ریلوے کی ملازمت کا بھی آخری واقعہ ہے۔ ایک مرتبہ رات کے آخری حصے میں ہیڈ کوارٹر روہڑی اسٹیشن پر گاڑی چھوڑ کر اپنے کوارٹر میں آئے تو دیکھا کہ فجر کی نماز میں تقریباً آدھ گھنٹا باقی ہے۔ اس وقت سو جاتے تو نماز فجر کے قضا ہونے کا خطرہ تھا اور قبل از وقت نماز بھی نہیں پڑھ سکتے تھے۔ اب پتلون اور جوتوں سمیت ٹیڑھے سے ہو کر چارپائی پر لیٹ گئے تاکہ نیند نہ آئے اور نماز پڑھ کر سوئیں۔ چوں کہ ساری رات جاگتے رہے تھے اور تھکاوٹ بھی تھی، اس لیے لیٹتے ہی نیند نے غلبہ پا لیا۔ معلوم نہیں کس وقت نیند ہی کی حالت میں بوٹ اتار کر بستر میں سیدھے ہو گئے اور کمبل اوڑھ لیا۔ کچھ پتا نہیں (اصحابِ کہف کی طرح) کب تک سوئے رہے۔ نیند سے بیدار ہو کر باہر نکلے تو ہلکی ہلکی سی دھوپ تھی۔ سردی محسوس ہوئی تو کرسی پر دھوپ میں بیٹھ گئے۔ خیال یہ تھا کہ دھوپ زیادہ اور سردی کم ہو تو غسل کر کے فجر کی نماز پڑھیں گے اور پھر ناشتہ کریں گے۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد سردی زیادہ ہونے لگی اور دھوپ نے زرد چادر اوڑھنا شروع کر دی۔ گھڑی دیکھی تو چھے بجے تھے۔ انھوں نے سمجھا گھڑی رک گئی ہے۔ اب صبح کے آٹھ نو بجے کا وقت ہونا چاہیے۔ ساتھ والے کوارٹر کی کھڑکی کے اندر سے دیکھا تو وہ کلاک بھی چھے بجا رہا تھا۔ ایک اور گھڑی دیکھی تو اس پر بھی یہی وقت تھا۔ تمام گھڑیاں تو خراب نہیں ہو سکتی تھیں۔ خیال ہوا کہ سورج کو دیکھا جائے۔ سورج کو دیکھا تو وہ دن کا سفر طے کر کے مغرب میں نیچے کو جا رہا تھا۔ بہت افسوس ہوا کہ

ایک فجر کی نماز کی فکر تھی، لیکن اب ظہر اور عصر کی نمازیں بھی قضا ہو چکی ہیں۔
فجر سے لے کر عصر تک کی قضا شدہ نمازیں اکٹھی پڑھیں۔ مغرب کی نماز کے بعد استعفا لکھ کر اسٹیشن ماسٹر کی میز پر رکھا اور رات کی ٹرین سے لاہور کو روانہ ہو گئے۔ گارڈ کی حیثیت سے صرف دو مہینے ملازمت کی اور پھر یہ ملازمت نماز کی نذر ہو گئی۔ اس لیے کہ اس ملازمت میں وقت پر نماز نہیں پڑھی جا سکتی تھی۔ یہ ۱۹۴۳ء کے آخر یا ۱۹۴۴ء کے شروع کی بات ہے۔
اس کے بعد ایک اور ملازمت کے بارے میں سنیے۔ یہ فیروز پور چھاؤنی میں کنٹرولر آف ملٹری اکاؤنٹس کے دفتر کی ملازمت ہے۔ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ یہاں ان کے افسر ہندو اور سکھ تھے۔ انھوں نے ظہر کی نماز پر اعتراض کیا تو انھوں نے ملازمت چھوڑ دی۔ اس دفتر میں چار مہینے کام کیا۔ یعنی دونوں سرکاری ملازمتیں نماز بروقت نہ پڑھ سکنے یا پڑھنے پر اعتراض کی وجہ سے ترک کر دیں اور استعفا دے کر گھر آ گئے۔
اب اسی قسم کا واقعہ مشہور اہل حدیث عالم و مصنف سید امیر علی ملیح آبادی (متوفی ۱۹۱۹ء) کے بارے میں سنیے جو اس فقیر نے اپنی کتاب ''قافلہ حدیث'' میں ان سے متعلق مضمون میں لکھا ہے۔ وہ ڈاک خانے میں پوسٹ ماسٹر تھے۔ اٹھارہ انیس برس کی عمر تھی۔ ظہر کی نماز پڑھنے مسجد میں گئے۔ بعد میں انگریز افسر ڈاک خانے کا معائنہ کرنے آیا۔ پوسٹ ماسٹر کو غیر حاضر پا کر اس نے خفگی کا اظہار کیا۔ ایک ملازم نے دوڑ کر انھیں مسجد میں اطلاع دی۔ وہ اس وقت وضو کر رہے تھے۔ اطمینان سے وضو کیا اور نماز پڑھی۔ واپس آئے تو افسر نے اعتراض کیا۔ انھوں نے کوئی بات نہیں کی۔ اسی وقت ملازمت سے استعفا دے دیا۔ سید امیر علی ملیح آبادی اور چودھری غلام حسین تہاڑیا کے یہ واقعات نماز سے تعلق رکھتے ہیں جو دونوں کے عہدِ شباب میں پیش آئے۔
ان واقعات سے ان کے اسلامی کردار اور غیرتِ دینی کا پتا چلتا ہے، جس کا وہ برسرِ عام عملی مظاہرہ کرتے ہیں۔
اس قسم کا کردار بہت کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔ اس موقعے پر ناصر زیدی کے دو خوب صورت شعر ذہن میں آ رہے ہیں۔ معلوم نہیں ان کا اس واقعہ سے کوئی تعلق بنتا ہے یا نہیں، لیکن میں یہاں درج کر رہا ہوں۔

حق بات کہوں برسرِ احباب و رقیباں
یہ حوصلہ مجھ میں مرے کردار سے آیا،
مفقود ہے وہ عہدِ رواں کے شعراء میں
جو لطف مجھے میر کے اشعار سے آیا

یہاں ایک اور واقعہ بھی سنتے جایے، جس کا تعلق نواب وقار الملک (مولوی مشتاق حسین) سے ہے۔ یہ واقعہ ''مکتوبات سرسید'' (مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۵۹ء) میں درج ہے۔ وقار الملک کا شمار سرسید احمد خاں

کے بے تکلف دوستوں میں ہوتا تھا۔نواب محسن الملک (مولوی مہدی علی خاں) کی وفات (۱۹۰۷ء) کے بعد علی گڑھ کالج کے سیکرٹری منتخب کیے گئے۔ ۱۹۱۷ء میں فوت ہوئے۔ ان کو بھی کسی انگریز کی طرف سے نماز کے متعلق کوئی ناگوار واقعہ پیش آیا تو اس کا علم سرسید کو ہوا۔ انھوں نے ایک خط میں نواب وقار الملک کو لکھا:

''کوئی شخص اگر کہے کہ تم نماز نہ پڑھو، اس کا صبر ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ہوسکتا۔ یہ بات سنی بھی نہیں جاسکتی...... کسی شخص کے منع کرنے سے نماز نہ پڑھنا یا سستی میں ڈالنا میری سمجھ میں کفر ہے جو کبھی بخشا نہ جائے گا۔ تم کو پہلے ہی اپنی طرف سے ایسا طریقہ اختیار کرنا تھا جو کبھی اس قسم کی بحث نہ آتی اور جب ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا تھا تو پھر لجلجانا اور گڑگڑانا کیسا۔ ''حضور رخصت ہی دیں۔ تنخواہ کاٹ لیں'' کہنا واہیات ہے۔ تڑاق سے استعفا دے دینا تھا اور صاف کہہ دینا تھا کہ میں اپنے خدائے عظیم الشان، قادرِ مطلق کے حکم کی اطاعت کروں گا، نہ کہ آپ کی۔ کیا ہوتا۔ نوکری نہ میسر ہوتی، فاقے مر جاتے۔ نہایت اچھا ہوتا۔''

یہ خط ۹۔ جنوری ۱۸۷۵ء کا تحریر کردہ ہے جو انھوں نے نواب وقار الملک کو بنارس سے ارسال کیا۔

نماز کے بارے میں سرسید کا ایک اور چند لفظی خط ملاحظہ فرمایئے جو نہایت دلچسپ ہے۔ یہ خط بھی مکتوبات سرسید میں درج ہے۔ ایک شخص نے سرسید سے استفسار کیا کہ اگر نماز میں قرآن مجید کے اصل الفاظ کے بجائے ان کا صرف ترجمہ پڑھ لیا جائے تو آپ کے نزدیک کچھ قباحت تو نہیں؟

سرسید اس کا جواب دیتے ہیں:

''مخدومی! نماز میں قرآن مجید بلفظہ نہ پڑھنے اور اس کا ترجمہ پڑھ لینے میں بجز اس کے اور کچھ قباحت نہیں کہ نماز نہیں ہوتی۔''

ملازمت کے دوران میں چودھری غلام حسین تہاڑیا کے نماز سے متعلق نزاکتِ احساس کا ذکر کرتے ہوئے ذہن اچانک سرسید کے خطوط کی طرف منتقل ہو گیا اور خوانندگانِ محترم کو یکا یک ۱۹۴۴ء سے بہت پیچھے ۱۸۷۵ء میں سرسید کی مجلس میں جانا پڑا۔ ممکن ہے وہ سرسید کے بعض افکار کی وجہ سے اتنا لمبا سفر کر کے اس مجلس میں نہ جانا چاہتے ہوں، لیکن کوئی بات نہیں، بعض کام چاہت کے خلاف بھی کر لیے جاتے ہیں۔

اب آیئے چودھری غلام حسین سے دوبارہ رابطہ کرتے ہیں۔ کنٹرولر آف ملٹری اکاؤنٹس کی ملازمت سے علیحدگی کے بعد انھوں نے اس مسئلے پر غور کیا کہ ایسا تعلیمی ادارہ قائم کیا جائے جس میں طلبا کو بہ یک وقت دینی تعلیم بھی دلائی جائے اور عصری تعلیم سے بھی انھیں روشناس کرایا جائے۔ حسنِ اتفاق سے اس وقت آبادی سے دور مرکز الاسلام میں اس قسم کا ادارہ قائم تھا۔ اس کا ذکر انھوں نے مولانا معین الدین لکھوی سے کیا تو

انھوں نے ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۴۴ء کو انھیں خط لکھا اور وہ وہاں آ گئے۔ مرکز الاسلام کا قیام ۱۹۲۸ء کے لگ بھگ مولانا محمد علی لکھوی کی کوشش سے عمل میں آیا تھا۔ اس کی دو مربعے کے قریب زمین بھی تھی۔ جب چودھری صاحب وہاں آئے اس وقت مولانا محمد علی لکھوی تو مدینہ منورہ میں تھے، لیکن ان کے دونوں بیٹے مولانا محی الدین اور مولانا معین الدین وہیں تھے جن کی نظامت میں یہ ادارہ چل رہا تھا اور میں اس میں مدرس تھا۔ اس میں تقریباً چالیس طالب علم تعلیم حاصل کرتے تھے، جن میں زیادہ بیرونی تھے اور کچھ وہ تھے جو صبح کو اردگرد کے دیہات سے آتے اور عصر کے بعد چلے جاتے تھے۔

اب قرآن و حدیث اور دیگر علوم دینی کے ساتھ انگریزی، ریاضی، تاریخ وغیرہ مضامین باقاعدہ پڑھائے جانے لگے تھے اور اس جنگل میں منگل کی خوش گوار فضا پیدا ہوگئی تھی۔ طلبا کی تقریری تربیت کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا تھا۔

اس وقت پنجاب کے دیہاتی دینی مدارس میں عربی اور فارسی عبارتوں کا ترجمہ بالعموم پنجابی میں کرایا جاتا تھا۔ مدارس کے اساتذہ و طلبا کی باہمی بول چال کی زبان بھی پنجابی تھی۔ لیکن ہم نے مرکز الاسلام میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا، آپس میں بھی اردو میں گفتگو کی جاتی تھی۔

خاص طور پر طلبا کے ساتھ بات چیت کا سلسلہ اردو میں جاری رہتا تھا۔ اب تو صورت حال بالکل بدل گئی ہے۔ دیہات میں بھی ماں باپ بچوں کے ساتھ اردو میں گفتگو کرتے ہیں۔ اس وقت یہ معاملہ نہ تھا۔ گھروں میں، سکولوں میں اور مدرسوں میں خالص پنجابی زبان کا سکہ چلتا تھا، لیکن ہم نے مرکز الاسلام کی ''سرکاری'' زبان اردو قرار دے دی تھی۔

مرکز الاسلام کے قرب و جوار کے دیہات میں ہم نے ''تبلیغ'' کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ ہفتے میں ایک یا دو مرتبہ میں اور چودھری صاحب چند طلبا کو ساتھ لیتے اور کسی گاؤں میں مغرب کی نماز پڑھتے۔ مغرب کے بعد حالات کے مطابق تقریریں کی جاتیں اور رات کو واپس آ جاتے۔ بعض اوقات لوگوں کے مجبور کرنے پر کسی گاؤں میں رات کو رہنا بھی پڑ جاتا تو فجر کی نماز پڑھ کر وہاں سے چل پڑتے اور گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں مرکز الاسلام آ جاتے۔

ایک شخص صوفی ولی محمد تھے۔ اونچے لمبے جوان۔ نیک آدمی۔ وہ ہمارے دوست بن گئے تھے۔ ان کے گاؤں کا نام تو مجھے یاد نہیں رہا۔ ایک مرتبہ وہ ہمیں وہاں لے گئے۔ رات کو ہم نے تقریریں کیں اور وہیں رہے۔ صوفی ولی محمد نے بڑے اخلاص کے ساتھ ہمیں گڑ کا حلوہ کھلایا۔ گڑ کی مٹھاس میں ان کے اخلاص کی مٹھاس بھی ملی ہوئی تھی۔ صبح کو شکر والی لسی پلائی۔ ایک مرتبہ وہ لاہور آ کر مجھے ملے بھی تھے۔

مرکز الاسلام میں عصر کے بعد کھیل اور ورزش کا سلسلہ روزانہ بالالتزام چلتا تھا۔ کھیل میں فٹ بال کو ترجیح دی جاتی تھی۔ بسا اوقات اس کھلے جنگل میں دوڑ کا مقابلہ بھی ہوتا تھا۔ ایک من یا ڈیڑھ من کا ''گدر'' بھی تھا، وہ بھی اٹھایا جاتا تھا۔ کھیل اور ورزش میں مولانا محی الدین اور معین الدین ضرور حصہ لیتے تھے۔ ان کی پولو کھیلنے والی قد آور گھوڑی تھی۔ مولانا محی الدین رکاب میں پاؤں ڈال کر اس پر سوار نہیں ہوتے تھے، اُچھل کر سواری کرتے تھے۔

چار سال سے زیادہ عرصہ مرکز الاسلام میں میرا اور چودھری غلام حسین کا ساتھ رہا۔ میں نے ان کو مخلص دوست، ہم درد ساتھی، صالح فطرت انسان، مستعد اور ذمہ دار اہلِ علم پایا، لیکن انھوں نے مجھے کیسا پایا؟ اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ جانیں اور ان کا دل۔

جولائی ۱۹۴۷ء میں سالانہ چھٹیاں ہوئیں تو سب لوگ اپنے گھروں کو چلے گئے۔ ۱۴۔ اگست کو ملک تقسیم ہو گیا اور پھر کچھ پتا نہیں تھا کہ کون کدھر گیا اور کس کے ساتھ کیا بیتی۔ اکتوبر کے آغاز میں ہم لوگ اپنے موجودہ گاؤں (ضلع فیصل آباد کی تحصیل جڑاں والا) کے موضع چک نمبر ۵۳ گ ب منصور پور پہنچے۔ ہم تین برادریوں کے لوگ ایک ہی جگہ (کوٹ کپورہ ریاست فرید کوٹ) سے اس گاؤں میں آئے تھے۔ وہ برادریاں تھیں بھٹی، ملک اور ارائیں۔ ہم سب ایک دوسرے کو جانتے تھے اور دادوں پڑدادوں کے زمانے سے ایک دوسرے کی غمی شادی میں شریک ہوتے چلے آرہے تھے، لیکن میرا وہاں جی نہیں لگ رہا تھا۔ ایک دن پتا چلا کہ مولانا معین الدین لکھوی اور ان کے خاندان کے لوگ اوکاڑہ شہر اور اس کے گرد و نواح میں آبسے ہیں۔ میں کسی نہ کسی طرح اوکاڑے پہنچا اور مولانا معین الدین اور دوسرے دوستوں سے اس طرح ملاقات ہوئی، جیسے صدیوں سے بچھڑے ملے ہوں۔ چودھری غلام حسین اور ان کے خاندان کے بارے میں پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ خیریت سے پاکستان آگئے ہیں۔ حسنِ اتفاق ملاحظہ ہو کہ دوسرے دن چودھری صاحب اوکاڑہ آگئے۔ بس پھر کچھ نہ پوچھیے کہ میں انھیں دیکھ کر اور ان سے مل کر کتنا خوش ہوا، اور وہ مجھے دیکھ کر اور مجھ سے مل کر کتنے خوش ہوئے، اپنی خوشی کی لہر مجھ پر اس قدر غالب آگئی تھی کہ مجھے اس کے متعلق ان سے پوچھنے کا بالکل خیال نہ رہا۔ لیکن میرا حسنِ ظن ان کے متعلق یہ ہے کہ وہ بھی مجھے دیکھ کر اور مجھ سے مل کر تھوڑا بہت ضرور خوش ہوئے ہوں گے۔ کئی دن ہم وہاں اکٹھے رہے۔ وہیں ان کے چھوٹے بھائی غلام نبی سے ملاقات ہوئی۔ یہ ان سے آخری ملاقات تھی۔ اس سے کچھ عرصہ بعد عین عالم جوانی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون

قیامِ پاکستان کے بعد چودھری غلام حسین اپنے خاندان سمیت موضع تلونڈی (Talwandi) (ضلع قصور) میں مقیم ہوئے۔ میں تو کچھ عرصے کے بعد گاؤں سے لاہور آگیا، لیکن چودھری صاحب غلہ منڈی

اوکاڑہ میں بطور کمیشن ایجنٹ کام کرنے لگے۔ یہ کام راس نہ آیا تو ستلج کاٹن ملز ہائی سکول (اوکاڑہ) میں سیکنڈ ماسٹر کی حیثیت سے پڑھانا شروع کر دیا۔ یہ خدمت ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۲ء تک انجام دی۔ تقریباً چار مہینے میونسپل کمیٹی چونیاں (ضلع قصور) کے سیکرٹری رہے۔ اس زمانے میں چونیاں کی میونسپل کمیٹی کے چیئر مین ان کے ایک عزیز چودھری عبدالرحیم ایڈووکیٹ تھے۔

پھر لاہور آ کر پنجاب یونیورسٹی سے لائبریری سائنس کا کورس پاس کیا۔ میں اس زمانے میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' کی ادارت پر مامور تھا۔ وہ میرے پاس شیش محل روڈ آیا کرتے تھے اور ان سے میل ملاقات کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ لائبریری سائنس کا امتحان دینے کے بعد انھوں نے لائبریرین کے طور پر تیس سال سرکاری ملازمت کی۔ پہلی تعیناتی گورنمنٹ کالج راولپنڈی میں ہوئی۔ وہاں سات سال رہے۔ بائیس سال گوجراں والا کے ایک کالج میں بسر ہوئے اور ملازمت کا آخری سال لاہور میں گزرا۔ پھر ساٹھ سال کی عمر کو پہنچے تو ریٹائر ہو گئے۔ غالباً ۱۹۸۳ء میں ریٹائرمنٹ ہوئی۔

راولپنڈی کے جس کالج میں یہ لائبریرین مقرر ہوئے، اس کے پرنسپل کا نام ''جی احمد'' تھا۔ اس نے ان کے ساتھ اول روز ہی سے جو برتاؤ شروع کیا، اس کی وجہ سے انھوں نے اس کا نام ''جی احمق'' رکھا اور یہ نام پرنسپل صاحب کی حرکات وسکنات اور عمل وسعی کے پیش نظر بالکل صحیح تھا اور جلد ہی کالج میں مشہور ہو گیا۔

چودھری غلام حسین جس زمانے میں گوجراں والا میں لائبریرین کے طور پر خدمات سرانجام دیتے تھے، اس زمانے میں ہفت روزہ الاعتصام کا دفتر کچھ عرصہ گوجراں والا میں رہا تھا اور میں اس اخبار میں کام کرتا تھا۔ چودھری صاحب کی سکونت گھر جاکھ میں تھی۔ وہ کبھی کبھی میرے پاس دفتر ''الاعتصام'' آ جاتے تھے، میں بھی ان کے ساتھ بعض اوقات گھر جاکھ چلا جاتا تھا۔ اس وقت ان کے گھر میں ایک خوب صورت نوجوان رہتا تھا جو ان کا رشتے دار تھا اور گونگا تھا۔ وہ میرا دوست بن گیا تھا، میں اس کی اشاراتی انداز کی ہر بات سمجھ لیتا تھا اور وہ میری بات سمجھ لیتا تھا۔ یعنی ہمارا معاملہ اس طرح کا ہو گیا تھا کہ گونگے کی رمزیں گونگے کی ماں ہی سمجھے۔ جس مکان میں چودھری صاحب رہتے تھے، مجھے یاد پڑتا ہے، وہ ان کے خالو کا مکان تھا جو ریٹائرڈ نائب تحصیل دار تھے اور ادھیڑ عمر کے چھوٹی سفید داڑھی والے گورے چٹے وجیہ شخص۔!

جماعت اہل حدیث کے علمائے کرام اور جماعت کی تنظیم سے چودھری غلام حسین کو ہمیشہ دلچسپی رہی۔ ایک مرتبہ جمعۃ المبارک کے روز جماعت کی تنظیم کے سلسلے میں مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا محمد اسماعیل سلفی، مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی اور ان سطور کا راقم کھڈیاں خاص (ضلع قصور) گئے۔ چودھری غلام حسین بھی ہمارے ساتھ تھے۔ اردگرد کے دیہات کے بہت لوگ آئے تھے۔ جمعہ مولانا غزنوی سے پڑھایا اور تنظیمی

سلسلے میں اس نواح کے لوگوں سے گفتگو ہوئی۔ نمازِ جمعہ سے کچھ دیر بعد ہم لوگ لاہور آنے کے لیے قصور چلے گئے اور چودھری صاحب اپنے مسکن تلونڈی کو روانہ ہو گئے۔

راولپنڈی کی ملازمت کے زمانے میں وہاں کی جامع مسجد اہل حدیث کے مرحوم خطیب مولانا حافظ محمد اسماعیل ذبیح سے ان کے گہرے مراسم قائم ہو گئے تھے، چنانچہ آزاد کشمیر وغیرہ کے علاقوں میں جو تبلیغی جلسے منعقد ہوتے اور حافظ صاحب ان میں شرکت فرماتے تو عام طور پر انھیں اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ مظفر آباد کے ایک جلسے میں یہ حافظ صاحب ممدوح کے ساتھ تھے۔ کھانا کھاتے وقت دیکھا کہ وہاں زین العابدین بھی موجود تھا، جس نے تقسیم ملک سے قبل لاڑکانہ (سندھ) کے علاقے میں ان سے گاڑی پر سوار کرانے کی درخواست کی تھی، جب یہ مال گاڑی کے گارڈ کی حیثیت سے ریلوے میں ملازمت کرتے تھے۔ اس وقت انھوں نے زین العابدین سے وہی سوال کیے جو لاڑکانہ کے علاقے میں کیے تھے، (جیسا کہ گزشتہ صفحات میں گزر چکا) زین العابدین حیران تھا کہ انھیں میرے متعلق اتنی معلومات کیسے حاصل ہوئیں۔

ایک مرتبہ چودھری غلام حسین میرے پاس لاہور آئے اور بیمار ہو گئے۔ میں اس وقت اکیلا لاہور رہتا تھا اور دار العلوم تقویۃ الاسلام کی بلڈنگ میں جہاں اخبار ''الاعتصام'' کا دفتر تھا، مجھے رہائش کے لیے ایک کمرہ ملا تھا۔ چودھری صاحب کا علاج کرایا گیا مگر افاقہ نہ ہوا۔ ایک دن مولانا داود غزنوی نے میو اسپتال کے ڈاکٹر ضیاء اللہ کے نام رقعہ لکھ کر مجھے دیا۔ میں چودھری صاحب کو ان کے پاس لے گیا۔ انھوں نے فوراً انھیں اسپتال میں داخل کر لیا۔ چند روز وہ اسپتال رہے اور اللہ نے شفا بخشی۔ اللہ کا فرمان کتنا صحیح ہے: ﴿وَ اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ۝﴾

چودھری غلام حسین کی شادی ۱۹۴۳ء میں ہوئی تھی۔ ان کے تین بچے چھوٹی عمر میں وفات پا گئے تھے۔ بیوی بھی ۲۴۔ ستمبر ۱۹۹۵ء کو دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ یہ بہت بڑا صدمہ تھا جو انھیں پہنچا۔ صرف ایک بیٹی ہے، جس کی شادی پاکستان کے مشہور صحافی اور ادیب اسد اللہ غالب سے ہوئی۔ غالب صاحب دراصل ضلع قصور کے ایک گاؤں فتوحی والا سے تعلق رکھتے ہیں۔ فتوحی والا کو اس اعتبار سے تاریخی حیثیت حاصل ہے کہ یہاں ایک بزرگ صوفی ولی محمد سکونت پذیر تھے۔ ان کی صالحیت اور تقویٰ شعاری کے بعض عجیب و غریب واقعات مشہور ہیں، جنھیں ان کی کرامات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

صوفی ولی محمد مرحوم کی وابستگی سرحد پار کی جماعت مجاہدین سے تھی۔ وہ کافی عرصہ سرحد پار کے علاقوں میں رہے تھے اور انھوں نے برصغیر کی آزادی کے لیے مجاہدین کے ساتھ مل کر انگریزی حکومت کے خلاف باقاعدہ جہاد کیا۔ اس جماعت کے لوگ فروری ۱۸۲۶ء میں مولانا اسماعیل شہید دہلوی اور سید احمد شہید رائے

بریلوی کی قیادت میں قبائلی علاقوں میں گئے تھے۔ آزادیٔ برصغیر یعنی ۱۹۴۷ء تک ایک سو اکیس سال یہ جماعت انگریزوں سے برسرِ پیکار رہی۔ فتوحی والا کے صوفی ولی محمد جماعت مجاہدین کے مشہور رکن تھے اور لوگوں سے بیعت جہاد لیتے تھے۔ اسی تحریک آزادی کو جس کی سرگرمیاں ایک سو اکیس برس کی طویل مدت میں پھیلی ہوئی ہیں، ''ہندوستان کی وہابی تحریک'' کہا جاتا ہے۔

یہ ایک الگ موضوع ہے۔ یہاں ''فتوحی والا'' کی وجہ سے یہ چند باتیں معرضِ تحریر میں آ گئیں۔ دراصل میں عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ چودھری غلام حسین تہاڑیا کے تین نواسے ہیں سیف الاسلام، نعیم الاسلام اور عمار چودھری۔ ماشاء اللہ تینوں سعادت مند اور تعلیم یافتہ ہیں اور اخبارات میں کام کرتے ہیں۔

چودھری صاحب تلونڈی (ضلع قصور) میں سکونت پذیر ہیں اور وہاں کی جمعیت اہل حدیث کے صدر ہیں۔ ان کی بیٹی، داماد اور نواسے ان سے لاہور رہنے پر اصرار کرتے ہیں۔ یہ لاہور آتے ہیں، لیکن جلد ہی واپس چلے جاتے ہیں۔ شہر کی فضا اور اس ماحول سے ان کی طبیعت صلح کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ یہ تلونڈی کی کھلی فضا سے مانوس ہیں، اسی لیے اسے لاہور پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان کی مہربانی ہے کہ لاہور آئیں تو اپنے کسی نواسے (عام طور سے عمار چودھری) کے ساتھ غریب خانے پر ضرور تشریف لاتے ہیں۔

آخر میں یہ عرض کر دیں کہ آزادیٔ وطن سے پہلے ۱۹۴۴ء میں مرکز الاسلام کے چھوٹے سے مدرسے میں جدید و قدیم تعلیم کی آمیزش کا محدود پیمانے پر جو منصوبہ شروع کیا گیا تھا، آج تقریباً ۷۰ سال بعد ملک گیر سطح پر حکومت بھی اس پر عمل کے لیے اصرار کر رہی ہے اور دینی مدارس کے ارباب اہتمام بھی سنجیدگی سے اس منصوبے کو بروئے عمل لا رہے ہیں۔ پاکستان میں سب سے پہلے تقریباً ۵۵ برس قبل جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) میں اس پر عمل کا آغاز ہوا تھا اور مختلف اوقات میں انگریزی کے بعض معلمین کی خدمات حاصل کی گئی تھیں، اب معلوم نہیں کیا صورت حال ہے۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ ہمارے مخلص ترین دیرینہ دوست چودھری غلام حسین تہاڑیا کو خیر و عافیت سے نوازے رکھے۔ مجھے صحت و تندرستی عطا فرمائے اور کتاب و سنت کی خدمت کی توفیق بخشے۔ آمین یا رب العالمین۔

(۱۰۔ ستمبر ۲۰۱۱ء)

مولانا ابوبکر صدیق سلفی

(ولادت یکم فروری ۱۹۲۶ء)

گندمی رنگ، میانہ قد، قدرے لمبا چہرہ، آنکھوں پر نظر کی عینک، صحت مند، خوش اخلاق، نرم خو، نیک اطوار، کتاب وسنت پر عمل میں حریص اور اس کی تبلیغ میں ہر وقت آمادہ و تیار، لباس مشتمل بر شلوار قمیص، گرمیوں میں سر پر سفید ٹوپی اور سردیوں میں گرم ٹوپی اور جرسی وغیرہ۔ مختصر مگر پوری داڑھی جس پر عمر کی رفتار سے فائدہ اٹھا کر سفیدی نے قبضہ جما لیا ہے۔ یہ ہیں مولانا ابوبکر صدیق سلفی جن سے قیام پاکستان سے قبل میرے دوستانہ مراسم قائم ہوئے جو اب تک قائم ہیں۔ جب میں ان مراسم کی رسی کو توڑنے یا ڈھیلا کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو یہ رسی اور مضبوط ہو جاتی ہے اور میرے مقابلے پر آ کھڑی ہوتی ہے اور زبان حال سے پکار اٹھتی ہے کر لو جو کرنا ہے، نہ میں ٹوٹوں گی، نہ ڈھیلی ہوں گی۔ پھر میں صبر شکر کر کے اسی مقام پر آ جاتا ہوں، جہاں پہلے تھا۔ برصغیر میں بے شمار انقلاب آئے، یہ دو حصوں میں بٹا۔ پھر خود پاکستان بھی ٹوٹا اور اس کے ایک حصے نے بنگلہ دیش کی شکل اختیار کی۔ بچے کھچے پاکستان نے بھی کئی رنگ بدلے۔ کبھی جمہوری ہوا، کبھی صدارتی ہوا، کبھی مارشلائی ہوا، کبھی غیر آئینی ہوا۔ کبھی یہاں کسی وزیر اعظم کا عدالتی قتل ہوا۔ کبھی وزرائے اعظم کہلانے والوں کو دیس نکالا دیا گیا۔ لیکن میری اور ابوبکر صدیق کی دوستی میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ یہ جہاں آج سے ستر سال پہلے تھی، اب بھی وہیں پیر جمائے کھڑی ہے۔ ہم ہر تبدیلی کے موقع پر عملاً یہی سمجھتے رہے کہ خر آمد و گائے رفت۔ ہماری بلا سے، کوئی آئے کوئی جائے ہمیں کسی سے کوئی علاقہ نہیں۔

میں اکتوبر ۱۹۴۸ء میں لاہور آیا تو یہ دار العلوم تقویۃ الاسلام میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ میرا دفتر بھی وہیں تھا۔ اس وقت حافظ محمد یحییٰ عزیز میر محمدی، خلیل اثری، ابوبکر سلفی اور میں نے پنجاب کے دینی مدارس کے اہل حدیث طلبا کی تنظیم قائم کرنے کا عزم کیا، چناں چہ ہم نے جامعہ محمدیہ اوکاڑہ، تعلیم الاسلام اوڈاں والا اور چند دیگر مقامات کے مدارس کا چکر لگایا اور جمعیت طلبائے اہل حدیث کے نام سے طلبا کی تنظیم قائم کی۔ اس کے پہلے امیر حافظ محمد یحییٰ میر محمدی کو اور ناظم اعلیٰ انہی ابوبکر صدیق کو بنایا گیا۔

آئندہ سطور میں ان کے واقعات زندگی ملاحظہ کیجیے جو خود انہی کے تحریر کردہ ہیں۔ پہلے ارادہ ہوا کہ ان واقعات کو اپنے الفاظ میں ڈھالا جائے، لیکن پھر خیال کیا کہ ان میں ضروری تبدیلی کر کے درج کیا جائے تو

دلچسپی قائم رہے گی۔ آیے ان واقعات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ جس طرح میں ان واقعات کو دلچسپ سمجھتا ہوں، مجھے یقین ہے خوانندگانِ کرام بھی انھیں دلچسپ ہی قرار دیں گے ...... میں نے اس مضمون کے متعدد مقامات میں حک و اضافہ کیا ہے اور اس کے الفاظ میں بھی تغیر و تبدل کیا گیا ہے۔ نیز مختلف مقامات پر ذیلی عنوان قائم کیے ہیں۔

ولادت:

سکول سرٹیفکیٹ کے مطابق میری ولادت یکم فروری ۱۹۲۶ء کو موضع ''کرما'' میں ہوئی جو چار پانچ ہزار کی آبادی پر مشتمل تھا اور تحصیل و ضلع فیروز پور کا اہم گاؤں تھا۔ علومِ دینیہ کے مشہور مرکز لکھوکے سے چار کلومیٹر پر واقع تھا۔ ارائیں برادری کی وہاں اکثریت تھی اور میرا تعلق اسی برادری سے ہے۔

والدہ ماجدہ مرحومہ نے مجھے بتایا کہ تم بچپن میں اتنے شدید بیمار ہو گئے تھے۔ کہ ہڈیوں کا ڈھانچا بن کر رہ گئے تھے۔ کوئی تمھیں اٹھانے کے لیے تیار نہ تھا۔ ہم لوگ تمھاری زندگی سے ناامید ہو گئے تھے۔ ایسے لگتا تھا کہ آج گیا یا کل گیا۔

تمھارے والد (مرحوم) تمھیں لکھوکے لے گئے اور مولانا محمد علی لکھوی رحمہ اللہ سے ملے۔ ان سے تعویذ لیا اور دم کرایا۔ پھر اللہ کی مہربانی سے تم تندرست ہو گئے۔

گھر میں والد مرحوم اور بڑے بھائی اگرچہ ناخواندہ تھے مگر نمازی تھے۔ مسجد سے ان کا خاص تعلق تھا۔ مجھے بھی وہ بچپن میں مسجد میں لے جایا کرتے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کی توفیق سے بچپن میں ہی مسجد سے رابطہ قائم ہو گیا تھا جو الحمد للہ اب بڑھاپے میں بھی قائم ہے۔

سکول میں داخلہ:

گاؤں میں لوئر مڈل سکول تھا اور مجھے اس میں داخل کرا دیا گیا۔ پرائمری میں جو اس وقت چار جماعتوں پر مشتمل ہوتی تھی، میں ممتاز طلباء میں پوزیشن ہولڈر تھا۔ لوئر مڈل سکول یعنی چھٹی کلاس کی تکمیل کے بعد آگے تعلیم کی خواہش تھی۔ لکھوکے میں مڈل سکول تھا۔ چنانچہ میں نے اس سکول میں داخلے کے لیے اصرار کیا، مگر والد مرحوم نے یہ مسئلہ سن رکھا تھا کہ بچے کو دینی تعلیم دلانے پر والدین کو جنت میں نورانی تاج پہنایا جائے گا اس لیے والد مرحوم چاہتے تھے کہ میں عالم بنوں مگر میرا اصرار دنیوی تعلیم کے لیے تھا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ ہمارے ہندو پڑوسی شام لال جو عمر میں مجھ سے بڑے تھے، کہنے لگے بھئی میں نے سنا ہے تم اپنے والد کی بات نہیں مانتے۔ دینی تعلیم کی بجائے دنیاوی تعلیم پر مصر ہو؟

مجھے شرمندگی ہوئی کہ ایک غیر مسلم مجھے والد کی نافرمانی کا طعنہ دے رہا ہے۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر

لیا کہ والد کی بات مان لینی چاہیے۔ گھر آ کر میں نے والد مرحوم سے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ والد صاحب نے فرمایا مسجد میں جا کر مولانا شمس الدین (مرحوم) سے ترجمہ قرآن پڑھو اور میں نے پڑھنا شروع کر دیا۔ اس طرح میری دینی تعلیم کا آغاز ہو گیا۔

دینی تعلیم مختلف مقامات میں:

میں نے ابواب الصرف، کچھ ترجمہ قرآن، صرف بہائی کا درس گاؤں میں اپنے استاد مولانا شمس الدین صاحب سے لیا۔ مولانا شمس الدین نہایت قابل عالم تھے۔ لوگوں کی دینی تعلیم و تربیت کے ساتھ ان کے خانگی اور معاشرتی مسائل بھی حل کرا دیتے تھے۔ وہ مولانا عبدالرحمٰن بڈھی مالوی رحمہ اللہ کے ایک واسطے سے میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ سے تعلق شاگردی رکھتے تھے۔

اگلے سال مولانا حافظ محمد اسماعیل رحمہ اللہ کے مدرسے میں پہنچ گیا جو ضلع امرت سر کے ایک گاؤں بھاؤوال میں دریائے ستلج کے کنارے تھا۔ وہاں صرف میر، نحو میر، بلوغ المرام، ترجمہ قرآن، دستور المبتدی اور زرادی وغیرہ کتابیں پڑھیں۔

پھر ضلع لدھیانہ کے ایک شہر جگراواں جا کر دیوبندی حضرات کے ایک مدرسے میں داخل ہو گیا۔ وہاں نور الایضاح، رسالہ منطق، مفید الطالبین کے علاوہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی سیرت پر عربی زبان میں کتاب پڑھی۔ لیکن وہاں کا انتظام نہایت ناقص تھا۔ پچاس ساٹھ طلبا کے لیے ایک کمرہ تھا۔ مسجد زیر تعمیر تھی۔ وہیں زندگی میں پہلی بار جوؤں سے پالا پڑا۔ وہاں کے بڑے استاد مولانا عبداللہ شام نگری تھے اور مولانا محمد ابراہیم مہتمم تھے جو پاکستان بننے کے بعد میاں چنوں میں آباد ہو گئے تھے۔ دو ماہ کے بعد میں جگراواں سے بھاگ آیا۔

اگلا مقام مدرسہ صادقیہ عباسیہ منچن آباد (ضلع بہاول نگر) ہوا۔ تقریباً چھ ماہ وہاں گزارے۔ مولانا خان محمد سے ہدایت النحو اور صدر مدرس مولانا غلام مرتضیٰ صاحب سے منطق کی کوئی کتاب پڑھی۔ وہاں سے نکلا اور منڈی صادق گنج میں ریلوے اسٹیشن کے پاس مولانا محمد رمضان صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے قدوری اور منیۃ المصلی وغیرہ پڑھیں۔ مولانا صاحب کے صاحب زادے میرے ہم سبق تھے۔

۱۹۴۲ء میں مدرسہ نذیریہ فیروز پور میں داخلہ لیا جہاں میرے مربی اور طلبا سے محبت کرنے والے مولانا ابو الطیب محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے۔ یہاں کافیہ، دستور المبتدی، زرادی، منتقی الاخبار، مشکوۃ وغیرہ کتب پڑھیں۔

کھنڈیلہ میں:

۱۹۴۳ء میں دلّی کا رُخ کیا اور مسجد کلاں میں مقیم ہوا۔ دلّی کا لال قلعہ دیکھا اور شاہی مسجد اور دیگر

مقامات کی سیر کی۔ مشہور اہل حدیث تعلیمی ادارہ دار الحدیث رحمانیہ دیکھا، میاں سید نذیر حسین رحمہ اللہ کا مدرسہ دیکھا جو پل بنگش میں تھا۔ جماعت غربائے اہل حدیث کے مدرسہ دار الکتاب والسنۃ کی زیارت کی۔

دلّی اس وقت علما و طلبا کی مارکیٹ تھی۔ مختلف مقامات کے مدارس کے اساتذہ دلّی آتے اور طلبا کو ترغیب دے کر اپنے مدارس میں لے جاتے۔ ہمیں بھی آگرہ کے ایک مولانا صاحب نے تیار کیا۔ لیکن اسی دوران حضرت شیخ الحدیث مولانا ابو محمد عبدالجبار کھنڈیلوی رحمہ اللہ سے ملاقات ہوگئی۔ انھوں نے مشکوۃ شریف کا مقدمہ سنا جس سے میں بہت متاثر ہوا اور ان کے مدرسہ مصباح العلوم کھنڈیلہ جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ مولانا اور ان کے صاحب زادے فوراً لے جانے پر آمادہ ہو گئے اور چھوٹی ریل کے ذریعے کاؤنٹ سٹیشن پر رات کے قریب پہنچے اور اونٹوں پر سوار ہو کر رات کو دس بجے کے قریب کھنڈیلہ شہر میں داخل ہوئے۔ اس زمانے میں اونٹ پر ایک سواری کا کرایہ تین روپے تھا جو شاید آج کل کے اڑھائی تین سو روپے کے برابر ہوگا۔ کھنڈیلے جانے کے لیے اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ نہ موٹر نہ تانگہ نہ ریل۔ سارا خشک پہاڑی علاقہ تھا۔

مدرسے میں تین اساتذہ کرام تھے۔ شیخ الحدیث مولانا ابو محمد عبدالجبار کھنڈیلوی، ان کے صاحب زادے مولانا عبدالمالک اور ایک بنگالی عالم جن کا نام حافظے میں نہیں رہا۔ اس وقت میرے سارے اسباق مشکوۃ حصہ ثانی، نسائی شریف، شرح جامی، جامع ترمذی وغیرہ حضرت مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی کے پاس تھے اور یہ تمام کتابیں میں نے انھی سے پڑھیں۔ طلبا کا دوپہر کا کھانا مختلف گھروں سے آتا تھا۔ شام کا کھانا خود تیار کرنا ہوتا تھا جس کا مدرسے کی طرف سے سات روپے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ حضرت مولانا کے صاحب زادے مولانا قاری عبدالخالق رحمانی جو بڑے عالم اور خطیب تھے، آگرے میں تدریسی اور خطابتی خدمات انجام دیتے تھے، وہ جب آتے تو خوب گہما گہمی رہتی۔ ایک سال کھنڈیلے میں گزارا۔ حضرت الاستاد مولانا محمد عطاء اللہ حنیف رحمہ اللہ کے ہاتھ والدہ ماجدہ نے کھانے کے لیے پنجیری اور دوسرا سامان بھیجا تھا۔

کھنڈیلہ کے متعلق چند باتیں:

فصل وہاں بارش سے ہوتی تھی۔ عام کاشت کار ہندو تھے۔ مسلمان تجارت پیشہ تھے جو اقلیت میں تھے۔ اس علاقے پر دو حکمرانوں کا راج تھا جو آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ مدرسے کی بلڈنگ شان دار تھی۔ اس قسم کی بلڈنگ پہلی دفعہ دیکھی۔ مدرسے سے مسجد ذرا دور تھی جسے بن بنگال والی مسجد کہا جاتا تھا۔

وہاں پہلی بار خنزیر دیکھے جو کتوں کی طرح گلیوں، میدانوں میں پھرتے تھے۔ بندر اور لنگور ٹولیوں کی صورت میں گھروں کی چھتوں پر دوڑتے پھرتے تھے۔ وہاں کسی پرندے کا شکار جرم تھا۔ غالباً ۱۹۴۴ء میں وہاں ایک عظیم الشان اہل حدیث کانفرنس ہوئی تھی جس میں پنجاب اور دلّی وغیرہ کے علما شریک ہوئے تھے۔

پنجاب کے علما میں حافظ عبداللہ روپڑی، حافظ عبدالقادر روپڑی، حافظ محمد اسماعیل روپڑی، مولانا محمد اسماعیل سلفی، مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی اور مولانا احمد الدین گکھڑوی مدعو تھے۔ کانفرنس تین روزہ تھی جو خوب کامیاب رہی۔ حافظ محمد اسماعیل روپڑی کی تقریر سب سے زیادہ پسند کی گئی۔ بریلوی مسجد کے سامنے جلسہ ہوا۔ مولانا احمد الدین گکھڑوی کی عیسائیت پر بڑی مدلل تقریر تھی جو لوگوں نے بڑی دلچسپی سے سنی۔

کھنڈیلہ شہر کے قریب ہی ایک خالص مسلمان آبادی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ یہاں امام مہدی کی قبر ہے۔ وہاں لوگ گائے کی قربانی کرتے تھے۔ خواتین پردے کی سخت پابند تھیں۔ ہم طلبا نے بھی ایک بار اس آبادی کا چکر لگایا تھا۔

مدرسہ غزنویہ امرتسر میں:

۱۹۴۵ء میں حضرت الاستاذ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف کے مشورے سے مدرسہ محمدیہ گوجراں والا (چوک نیائیں) پہنچ گیا۔ وہاں پہلے مولانا عبدالرحیم رحمانی پڑھاتے تھے جو مدرسہ رحمانیہ دہلی کے فاضل تھے۔ اس سال وہ امرت سر مدرسہ غزنویہ میں تشریف لے گئے۔ میرے وہاں کے ایک ساتھی جو مولوی فاضل تھے اور دیوبندی مسلک کے حامل تھے، ان کا نام محمد حسین تھا۔ وہ حضرت حافظ محمد گوندلوی کے پاس پڑھنے آئے تھے۔ میں گوجراں والا سے امرتسر جانے کے لیے تیار ہوا تو میرے مشورے سے وہ بھی میرے ساتھ امرت سر مدرسہ غزنویہ میں مولانا نیک محمد محدث کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ دورانِ تعلیم کتابوں کے مطالعے کے بعد وہ عامل بالحدیث ہو گئے تھے۔ مدرسہ غزنویہ میں میرے ہم سبق مولانا حافظ محمد یحییٰ عزیز میر محمدی، حافظ فضل کریم، حافظ بشیر احمد بھوجیانی، عبدالرحمٰن وغیرہ تھے۔ مدرسہ غزنویہ میں چار استاد تھے: مولانا نیک محمد محدث جو اسم بامسمیٰ تھے۔ مولانا عبداللہ بھوجیانی، مولانا عبدالرحیم بھوجیانی۔ یہ دونوں حقیقی بھائی تھے۔ جید عالم اور بہترین استاد۔ قیام پاکستان کے دوران اپنے گاؤں بھوجیاں میں ان کو سکھوں نے شہید کر دیا تھا۔ مولانا محمد حسین ہزاروی سے یہاں سنن ابو داؤد، متنبی، مرقاۃ، مختصر معانی، شرح تہذیب، صحیح مسلم کا ایک ربع اور دوسری چند کتابیں پڑھیں۔

مدرسہ غزنویہ کے مہتمم مولانا سید محمد داؤد غزنوی تھے، وہ لاہور میں مسجد چینیاں والی کے خطیب تھے اور لاہور ہی میں رہتے تھے۔ نہایت حسین و جمیل جوان۔ پنجاب کانگریس کمیٹی کے صدر تھے، جن کی حیثیت صوبائی گورنر سے کسی طرح کم نہ تھی، لیکن جب امرتسر تشریف لاتے تو مسجد میں رات بسر کرتے۔ وہ چاہتے تو شان دار کوٹھی بنا سکتے تھے اور بڑا کاروبار بھی کرتے۔ لیکن امانت و دیانت کے پیکر تھے۔ عمر بھر فقیر ہی رہے، چینیاں والی مسجد کے چھوٹے سے مکان میں زندگی گزار دی۔ امرت سر ہی میں مولانا مودودی سے اسپتال میں جو

گردے کی تکلیف میں مبتلا تھے، ملاقات کی۔ اس وقت وہ جوان تھے، سیاہ خشخشی ڈاڑھی۔

مسلم لیگ کا جلوس مسجد میں:

وہ زمانہ سیاسی ہنگاموں کا تھا۔ ۱۹۴۶ء کے الیکشن کا دور تھا۔ سب سیاسی جماعتیں زور شور سے جلسے جلوسوں کے ذریعے اپنی قوت کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ ایک رات جب کہ مسجد غزنویہ میں نماز عشا کی جماعت ہو رہی تھی، مسلم لیگ کا جلوس آیا اور نہایت شرانگیز فرقہ وارانہ نعرے بازی شروع کر دی۔ اسی دوران جلوس کے کچھ لوگ جوتوں سمیت مسجد میں گھس آئے اور طلبا سے لڑائی کرنے لگے۔ اس ہنگامے میں ایک پٹھان طالب علم نے آگے بڑھ کر ایک نوجوان کے پیٹ میں چاقو سے حملہ کر کے سخت زخمی کر دیا۔ اس پر جلوس بھاگ گیا اور طلبا کے خلاف قتل کا مقدمہ درج کرا دیا گیا جو سال بھر چلتا رہا۔ آخر کار جب مولانا سید محمد داؤد غزنوی مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تو سکھ مجسٹریٹ نے کہا اب تو تمھیں صلح کر لینی چاہیے۔ چنانچہ صلح ہو گئی۔ میرا نام بھی نامزد ملزموں میں تھا جس کا خمیازہ میں بھگتتا رہا۔

فسادات:

مسلم لیگ کی الیکشن میں کامیابی کے بعد ۱۹۴۶ء میں امرت سر میں خاص طور پر زبردست فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے۔ بعض مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا کر مکینوں سمیت بھسم کر دیا گیا۔ سکھ ایک جنگ جو قوم ہے۔ ہتھیار اپنے پاس رکھنا ان کا مذہبی شعار ہے۔ اس سے انھوں نے مسلمانوں کے خلاف بہت کام لیا۔ مسلمان نہتے تھے، اس لیے مار کھاتے رہے۔ آخر کار پورے امرت سر کے مسلمان محلہ شریف پورہ میں جو مسلمانوں کا گڑھ تھا، جمع ہو گئے۔ فسادات کئی مہینے جاری رہے۔ مدرسہ غزنویہ کے طلبا کا کھانا شہر کے مختلف دور و نزدیک کے گھروں سے آتا تھا وہ بھی بند ہو گیا۔ تعلیم کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ آمد و رفت کے ذرائع بند ہو گئے۔ کرفیو لگ گیا۔ کرفیو کے وقفے میں ہم وہاں سے بھاگ کر اپنے گھر پہنچ گئے۔

ان ہنگامہ خیزیوں کے دوران پتا چلا کہ مولانا حسین احمد مدنی ریل کے ذریعے لاہور جانے کے لیے امرتسر سے گزریں گے۔ ان کے خلاف مظاہرہ کرنے کے لیے مسلم لیگ کے رضا کار ریلوے سٹیشن پر نعرہ بازی کر رہے تھے۔ جس ڈبے میں مولانا سوار تھے وہ پوری طرح بند تھا۔ کوشش کے باوجود مسلم لیگی رضا کار ان تک نہ پہنچ سکے۔ ہنگامہ فرو ہوا تو ہم طلبائے مدرسہ غزنویہ ان سے بڑی مشکل سے ملے۔ مولانا مدنی ڈرے اور سہمے ہوئے تھے۔ مشکل سے معمولی سا مصافحہ کیا۔

امرت سر سکھوں کا مذہبی شہر اور گڑھ تھا۔ اس میں ان کے بہت سے ادارے قائم تھے۔ ایک دن جب کہ مدرسہ غزنویہ کے طلبا بعد نماز عصر باہر گراؤنڈ میں فٹ بال کھیلنے کا شغل کر رہے تھے، سکھ طالب علموں کی

ایک فٹ بال ٹیم آئی اور ہمیں فٹ بال کھیلنے کا چیلنج دیا۔ ہم نے چیلنج قبول کر لیا۔ مقابلہ ہوا، اللہ تعالیٰ کی مدد سے طلبا جیت گئے اور سکھوں کی ٹیم ہار گئی اور شرمندہ ہوئی۔

امرتسر سے روانگی:

جب میں امرت سر سے آخری بار نکلا، کرفیو کا وقفہ تھا۔ حالات نہایت خطرناک تھے۔ ٹرینوں کو روک کر مسلمانوں کو قتل کیا جا رہا تھا۔ مسلمان رضا کار ریل پر سوار ہونے سے مسلمانوں کو روک رہے تھے۔ بالخصوص اس ٹرین سے جو سکھوں کی آبادیوں کے درمیان سے گزرتی تھی۔ مجھے بھی روکا گیا۔ لیکن میں کیا کرتا، امرت سر میں ٹھہرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ جو ریل امرت سر سے قصور اور فیروز پور کی طرف آتی تھی، اسی پر میں نے سوار ہونا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا نام لے کر سوار ہو گیا۔ ڈبے میں میرے سوا سب سکھ تھے جو بپھرے ہوئے تھے۔

میرے پاس سفید رومال تھا۔ میں سکڑ کر سیٹ پر لیٹ گیا اور رومال سے اپنے آپ کو لپیٹ لیا۔ ترن تارن سٹیشن پر ریل رکی۔ خطرہ تھا کہ یہاں قتل و غارت ہوگی، کیوں کہ وہ سکھوں کا مذہبی شہر ہے۔ سکھ نہایت اشتعال انگیز نعرے لگا رہے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے بچا لیا۔ سکھوں نے مجھے تنگ کرنا شروع کیا۔ اٹھو تم کون ہو؟ میں بیمار کی سی آواز میں کہتا: میں بیمار ہوں، مجھے بخار ہے۔ آخر ایک بوڑھا سکھ بولا بھئی کیوں بے چارے بیمار کو تنگ کر رہے ہو۔ اس پر میری جان چھوٹی۔ میں اسی طرح لیٹا رہا۔ کھیم کرن میں گجر دودھ لے کر ریل پر سوار ہوئے تو میں اٹھ بیٹھا۔ بہت مشکل حالت میں قصور پہنچا اور پھر فیروز پور سے ہوتا ہوا اپنے گاؤں کرما چلا گیا۔ ہمارے علاقے بالخصوص تحصیل فیروز پور میں غیر مسلموں کی آبادی برائے نام تھی۔

تعلیم تو چھوٹ ہی گئی تھی۔ اب میں نے کوئی کاروبار کرنے کا ارادہ کیا۔ والد ماجد سے ذکر کیا تو وہ بھی کچھ رضامند ہو گئے۔ مجھے یہ اندازہ نہ تھا کہ پاکستان بننے کے بعد ہمیں یہاں سے نکلنا پڑے گا۔ میں نے گندم خریدنی شروع کی۔ سات روپے من کے حساب سے نقد روپیہ اس پر لگا دیا۔ چند روز بعد وہیں سب سامان، غلہ، گندم وغیرہ چھوڑنا پڑا۔ علاقے کے سب مسلمان ہمارے گاؤں میں اکٹھے ہو گئے۔ وہاں سے قافلے کی صورت میں نکل پڑے۔ راستے میں فوجی ملے جو ہمیں یہاں سے نکالنے کے لیے آ رہے تھے۔ ہم چونکہ نکل پڑے تھے اس لیے انھوں نے ہمیں کچھ نہیں کہا۔ رات فیروز پور شہر کے باہر قصور روڈ پر گزاری۔ اگلے دن گنڈا سنگھ کے راستے پاکستان میں داخل ہو گئے۔ پھرتے پھراتے ڈھولن ہٹھاڑ قصبے کے باہر ڈیرہ ڈال دیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد:

گھر کے سب لوگ تو ڈھولن ہٹھاڑ ضلع قصور کے باہر کھلے میدان میں ٹھہرے ہوئے تھے اور ہم چار آدمی گھوم پھر کر مکان الاٹ کرانے کے لیے نکل گئے۔ ان دنوں مہاجرین کے لیے ریل کا کرایہ معاف تھا۔ ہم

اوکاڑہ، دیپال پور، خانیوال، ٹوبہ ٹیک سنگھ، گوجرہ، لائل پور میں بھوکے پیاسے گھومتے رہے۔ کہیں کہیں نیک بندوں کے ذریعے کھانا مل جاتا تھا۔ لائل پور کے دفتر الاٹ منٹ میں بڑا رش اور بدنظمی تھی۔ ہم نے اس کا نوٹس لینے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ کھڑے ہوکر مجمعے میں معمولی قسم کی تقریر کی جس میں محکمہ بحالیات کی بدنظمی پر تنقید کی گئی تھی۔ ہمارے اس معمولی نوٹس کا خاطر خواہ فائدہ ہوا اور انتظام بہتر ہوگیا۔ خالی ہاتھ تو تھے، کہیں سے ٹوٹی شیشی اور معمولی سا قلم لیا اور مہاجرین کے فارم پُر کرنے بیٹھ گئے۔ چھ پیسے فارم کے حساب سے کچھ رقم جمع ہوگئی تو گوجرہ گئے۔ وہاں اپنے منظور شدہ فارموں پر گائیں اور بھینسیں مل گئیں۔ شہر سے دومیل پر چک نمبر ۹۶ میں زمین الاٹ ہوگئی۔ لیکن ساتھی مطمئن نہ تھے اس لیے کہ وہاں نہری پانی کی کمی تھی، وہاں سے نکلے اور چک نمبر ۸۰ گ ب (نزد ستیانہ بنگلہ ضلع لائل پور) میں جا آباد ہوئے۔ وہاں برادر مکرم مولوی احمد الدین فیروز پوری نے آبادکاری میں اعزہ واقربا کی بڑی خدمت کی۔ اللہ تعالیٰ ان کو اجر جزیل سے نوازے، آمین۔

وہیں درس نظامی کے سلسلے کا مدرسہ جاری کیا جس کا نام حضرت الاستاد مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ کے مشورے سے دار القرآن والسنہ رکھا گیا۔ مدرسہ بڑے اچھے طریقے سے جاری رہا۔ مختلف علما تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ ان میں مولانا قدرت اللہ فوق رحمہ اللہ صدر مدرس، مولانا عبیداللہ عفیف حفظہ اللہ (شیخ الحدیث دار الحدیث مسجد قدس چوک دال گراں لاہور)، حکیم شمس العارفین اور چند دیگر علما شامل تھے۔ بہت سے علما وہاں سے پڑھ کر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ مہتمم مدرسہ مولوی احمد الدین فیروز پوری قضائے الٰہی سے فوت ہو گئے تو بعد میں مدرسے کو سنبھالنے والا کوئی نہ تھا۔ مدرسہ ختم ہوگیا۔ اس کا کتب خانہ مرکز الدعوۃ السلفیہ ستیانہ بنگلہ میں منتقل کر دیا گیا۔ اب صرف لڑکیوں کا مدرسہ جاری ہے۔ مقامی طلبا قرآن کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ رہے نام اللہ کا۔

دار العلوم تقویۃ الاسلام لاہور میں داخلہ:

ابتدا میں میں ایک چھوٹی سی مسجد میں امامت و خطابت اور بچوں کو قرآنِ مجید کی تعلیم دیتا رہا اور ساتھ ساتھ کریانہ کی دکان کر لی۔ بہ ظاہر تعلیم سے تعلق منقطع ہوگیا تھا کہ اچانک حضرت الاستاد مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ کا مکتوب ملا کہ تم کدھر پھر رہے ہو، جو کام تم کر رہے ہو وہ تو ساری دنیا کر رہی ہے۔ کام تو وہ کرنا چاہیے جس کی طرف لوگوں کا دھیان کم ہے، وہ ہے دین کی تعلیم۔ اس خط سے میں بڑا متاثر ہوا۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لاہور آیا اور دار العلوم تقویۃ الاسلام شیش محل روڈ میں داخل ہوگیا۔ یہاں حضرت الاستاد مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی شیخ الحدیث کے منصب عالی پر فائز تھے۔ مولانا موسیٰ خاں، مولانا شریف اللہ خاں، مولانا محمد عبدہ الفلاح اور مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے شرح وقایہ، ہدایہ، نور الانوار، اصولِ شاشی،

صحیح مسلم، صحیح بخاری، مطول، ہدیہ سعیدیہ، سُلّم العلوم، شمس بازغہ وغیرہ کتب پڑھ کر تحصیل علوم کی سند حاصل کی جس پر حضرت الاستاد مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، مولانا سید محمد داوٗد غزنوی اور ممتحن مولانا عبدالرحیم رحمانی کے دستخط ثبت ہیں۔

تقسیم اسناد کی تقریب جامع مسجد چینیاں والی میں مولانا سید محمد داوٗد غزنوی رحمہ اللہ کی صدارت میں ہوئی۔ سند حاصل کرنے والوں میں میرے سمیت مولانا حافظ بشیر احمد بھوجیانی، مولانا محمد رفیق، مولانا سیف الرحمٰن الفلاح اور دیگر طلبا شریک تھے۔

حصولِ سند کے بعد:

فارغ التحصیل ہونے کے بعد میرے والد ماجد کی خواہش تھی کہ میں طب کی تعلیم بھی حاصل کروں۔ چنانچہ آئندہ میری پوری زندگی حضرت الاستاد مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے مشوروں پر استوار ہوئی۔ طب کی تعلیم صالح عالم دین مولانا حکیم ہدایت اللہ بٹالوی رحمہ اللہ کے پاس رہ کر حاصل کی اور حکیم ابوتراب عبدالحق امرتسری کے طبی ادارے میں امتحان دے کر سند لی۔ سرکاری طبی کونسل پاکستان میں درجہ اول پر رجسٹریشن ہوئی۔ اسی دوران مولانا احمد علی لاہوری سے تفسیری دورہ مکمل کیا اور پچانوے فی صد نمبر حاصل کیے۔ ۲۴ جولائی ۱۹۴۸ء کو مولانا داوٗد غزنوی کے زیر صدارت دار العلوم تقویۃ الاسلام ہال میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کا تاسیسی اجلاس منعقد ہوا، جس میں یہ عاجز راقم الحروف بھی شامل ہونے کا اعزاز رکھتا ہے۔ اسی زمانے سے مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ساتھ تعلق قائم ہے۔

جس زمانے میں حضرت الاستاد مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سنن ابوداوٗد کا حاشیہ فیض الودود کے نام سے تحریر فرما رہے تھے، میں ان کا معاون تھا، جو کتاب الطہارۃ سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اس طرح پوری زندگی حضرت الاستاد مولانا محمد عطاء اللہ حنیف کا دست شفقت میرے سر پر رہا۔

مولانا عبدالمجید سوہدروی کی خدمت میں:

حضرت مولانا عطاء اللہ صاحب کی وساطت سے مختلف مقامات پر خطابت وامامت کے لیے رابطہ ہوا مگر کہیں جگہ نہ ملی۔ اس سلسلے میں وزیر آباد میں حضرت حافظ عبدالمنان محدث پنجاب رحمہ اللہ کی مسجد میں گیا۔ مجھ سے پہلے وہاں ایک ہم جماعت مدراسی کام کر رہا تھا۔ لوگ اس سے مطمئن نہ تھے۔ میں کوئی دو ہفتے وہاں ٹھہرا رہا مگر خدمت کا موقع نہ مل سکا۔ ان دنوں حضرت مولانا حکیم عبدالمجید صاحب سوہدروی سے رابطہ ہوا جو بہت سی کتابوں کے مصنف، صحافی، حکیم، مقرر اور خطیب تھے، وہ میرے نہایت مہربان تھے، مجھے اپنے ساتھ سوہدرے لے گئے۔ کھلایا پلایا اور فرمایا مضمون لکھو۔ چنانچہ ان کی راہنمائی میں مضمون لکھا جو انھوں نے اپنے

اخبار میں چھاپ دیا۔ مولانا عبدالمجید سوہدروی کا مجھ پر احسان یہ ہے کہ وہ انڈیا میں دور ونزدیک کے مقامات میں اپنے وعظ وتقریر سے لوگوں کو مستفید فرماتے تھے۔ ہمارے گاؤں کرما سے تین کلومیٹر پر موضع ہٹی کلاں میں جلسہ تھا۔ جلسہ مسجد کے وسیع صحن میں ہوا جہاں پرالی بچھا' گئی تھی۔ میں اس وقت تیسری جماعت میں تھا۔ جلسے میں اور لڑکوں کے ساتھ میں بھی شریک ہوا۔ مولانا عبدالمجید سوہدروی کی تقریر زبردست تھی، جس میں انھوں نے مسلمانوں کی حالت زار کا نقشہ کھینچا تھا۔ خاص طور پر تمباکو نوشی کے نقصان کے متعلق تفصیلات بیان کی تھیں۔

آخر میں انھوں نے پوچھا کون کون قرآنِ مجید کا ترجمہ پڑھے گا۔ بہت سے لوگوں نے ہاتھ کھڑے کیے، میں نے بھی ہاتھ کھڑا کیا۔ اللہ تعالیٰ کو منظور تھا کہ میں درس نظامی سے فارغ ہوا اور ساٹھ سال سے قرآنِ مجید کے ترجمے کی کلاس لے رہا ہوں۔ ان شاء اللہ اس کا اجر مولانا عبدالمجید سوہدروی کو بھی ضرور مل رہا ہوگا۔

مولانا احمد علی لاہوری کی خدمت میں:

۱۹۵۰ء میں جب تقویۃ الاسلام سے فارغ ہوا تو مولانا احمد علی صاحب کی تفسیری خدمات کی شہرت سنی۔ ان کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہ کیا۔ میں اکیلا اہل حدیث تھا، میرے ساتھ بڑی شفقت فرماتے تھے۔ باقی طلبا خیر المدارس ملتان وغیرہ کے سب دیوبندی مسلک کے تھے۔

دیوبندی طلبا اپنے اساتذہ کی تربیت کی وجہ سے سخت متعصب تھے اور غالی مقلد۔ میرے ساتھ معاندانہ رویہ رکھتے تھے۔ ایک دن سبق کے دوران طلبا نے میرے بارے میں سخت سوالات اٹھائے۔ یہ وہابی ہے، رفع الدین کرتا اور آمین بالجہر پکارتا ہے، مقلد نہیں۔ حضرت الاستاذ مولانا احمد علی نے ان سے فرمایا کیا کلمے میں تقلید کا ذکر ہے؟ اگر تم رفع الیدین منسوخ سمجھتے ہو تو نہ کرو۔ وہ منسوخ نہیں سمجھتا تو اس کو کرنے دو۔ میں خاموش رہا۔ میری طرف سے مولانا موصوف نے خوب مدافعت فرمائی۔ نماز مغرب کے بعد مجھ اکیلے کو بعض اوقات لے کر بیٹھ جاتے اور مولانا عبدالواحد غزنوی کی خوبیاں اور ان کے خاندان سے اپنے تعلقات بیان فرماتے۔ مولانا موصوف جب تک زندہ رہے ہمیشہ مولانا سید محمد داؤد غزنوی رحمہ اللہ کی اقتدا میں اقبال پارک کے کھلے میدان میں سنت کے مطابق نماز عیدین ادا فرماتے رہے۔

حضرت مولانا کے دورہ تفسیر میں الحمد للہ میں نے پچانوے فی صد نمبر حاصل کیے۔ سند میرے پاس موجود ہے جس پر مولانا کے اور مولانا حسین احمد کے دستخط ثبت ہیں۔ آپ کے لائق و فائق نواسے مولانا عبدالوحید سے جو بڑی نفیس ہستی ہیں حرم مکی میں تعارف ہوا، راقم الحروف سے بڑی محبت سے پیش آئے۔ اللہ تعالیٰ انھیں دنیا و آخرت کی حسنات سے نوازے، آمین۔

ہفت روزہ ''الاعتصام'' کی بائنڈنگ:

میرے تقویۃ الاسلام شیش محل روڈ لاہور کے زمانۂ طالب علمی میں مولانا محمد اسحاق بھٹی حفظہ اللہ جو میرے مہربان، بڑے فاضل و عالم، مؤرخ، مصنف، صحافی باا خلاق ہیں، جنھیں میں لڑکپن سے انڈیا ہی سے جانتا ہوں، مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ناظم دفتر کے طور پر تشریف لائے۔ وہ نیکی اور علم کے ساتھ انکسار و عاجزی کے پیکر ہیں۔ بڑائی، تکبر سے کوسوں دور۔ دفتر کی نظامت کے ساتھ ساتھ وہ ہفت روزہ الاعتصام میں (جس کے مدیر مسئول حضرت مولانا محمد حنیف ندوی اور حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف اخبار کے پرنٹر پبلشر تھے) بھی کام کرتے تھے۔ انھوں نے پہلا مضمون کربلا اور شہادت حسین پر لکھا اور خوب لکھا۔ مجھے شائع ہونے سے پہلے دکھایا۔ میں نے مضمون پڑھ کر اندازہ کر لیا کہ اس ہستی میں لکھائی پڑھائی اور اردو ادب کی بہترین صلاحیتیں موجود ہیں۔ میں ان دنوں الاعتصام کی بائنڈنگ کرتا تھا۔ مجھے معاوضے میں ڈیڑھ روپیہ ملتا تھا۔ دیکھتے دیکھتے مولانا محمد اسحاق بھٹی پہلے ہفت روزہ الاعتصام لاہور کے جو مرکزی جمعیت اہل حدیث کا ترجمان تھا، نائب مدیر، پھر مدیر بنے۔ انھوں نے محنت اور اپنی خداداد صلاحیتوں سے اخبار کو اعلیٰ مقام تک پہنچا دیا۔ الاعتصام سے الگ ہو کر انھوں نے منہاج کے نام سے سہ روزہ اخبار بھی جاری کیا جو کچھ عرصے کے بعد دم توڑ گیا۔ اس کے بعد پھر الاعتصام کی ادارت سنبھال لی۔

سکول کی ملازمت:

میں نے پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان چونکہ پاس کیا ہوا تھا اسی بنا پر مختلف سکولوں میں ٹیچر کی درخواستیں دیں۔ مگر کہیں جگہ نہ ملی۔ اس زمانے میں لاہور آج کل کے مقابلے میں پندرہ بیس گنا چھوٹا تھا۔ آخر کار ارادہ کیا کہ گاؤں میں مطب یونانی شروع کروں۔ چنانچہ طبابت کا کام شروع کیا۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے سو فی صد بیمار تندرست ہوئے۔ ان میں کئی ایسے مریض تھے جو علاج سے عاجز آ چکے تھے۔ میں علاج بھی کرتا اور دعا بھی کرتا لیکن پیسے مانگنے میں شرم محسوس کرتا۔ اسی دوران اسلامیہ ہائی سکول مصری شاہ لاہور میں عربی ٹیچر کی ضرورت نکلی۔ اس سکول میں مولانا حافظ محمد اشرف رحمہ اللہ ٹیچر تھے، جو مشہور عالم تھے، اور لسوڑے والی مسجد اہل حدیث اندروں شیراں والا گیٹ میں خطیب تھے، میری درخواست سکول ہذا میں موجود تھی۔ انھوں نے حضرت الاستاد مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ سے رابطہ کیا۔ اس وقت اتفاقاً میرے مہربان دوست اور بہنوئی مولوی احمد الدین مولانا عطاء اللہ رحمہ اللہ کے پاس موجود تھے۔ حضرت الاستاد نے انھیں فرمایا فوراً جاؤ اور ابوبکر کو لے کر آؤ۔ چنانچہ اگلے دن میں سکول میں بہ طور ٹیچر ملازم ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو اجر جزیل سے نوازے۔

مسجد نجم میں خطابت و امامت:

سکول میں تدریسی خدمات انجام دینے کے ساتھ ساتھ میں مسجد عزیز اہل حدیث میں عارضی طور پر امام وخطیب اور مدرس بھی تھا۔ یہ مسجد لاہور کے علاقہ مصری شاہ میں بہت عرصہ پیشتر میاں عبدالعزیز مالواڈا بار ایٹ لا (سابق میئر لاہور کارپوریشن) نے اپنی زمین میں اپنے خرچ سے تعمیر کرائی تھی اور اس کے امام حافظ عبدالعزیز شجاع آبادی تھے۔ تقریباً اڑھائی سال میں نے اس وقت یہاں کام کیا اور بلوغ المرام اور صرف و نحو کی ابتدائی کتب بھی پڑھاتا رہا۔ میں نے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کی اے، اللہ میں نے دینی علم تیرے دین کی خدمت کے لیے حاصل کیا ہے۔ اب میں سکول میں پڑھارہا ہوں، مجھے موقع دے کہ تیرے دین کی بے لوث خدمت کرسکوں۔ اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی اور مجھے مسجد نجم میں خدمت کا موقع ملا جو جون ۱۹۵۴ء سے اب تک جاری ہے۔ میں نے اس خدمت کے سلسلے میں کوئی معاوضہ نہیں لیا۔ یہ مسجد پاکستان بننے سے پہلے کی ہے۔ میں نے آ کر جماعت بندی کی۔ مسجد کا نام مسجد نجم اہل حدیث رکھا اور یہاں امامت کے ساتھ تدریسی خدمات بھی انجام دیتا رہا۔ ناظرہ قرآن بھی پڑھایا، بچوں کو مسنون دعائیں بھی یاد کرائیں۔ بہرحال میں حدیث اور قرآن کے سلسلے میں کام کررہا ہوں۔ بے شمار لوگوں نے یہاں سے تعلیم حاصل کی۔ قرآن پڑھانا پہلے دن سے شروع کیا جو آج تک جاری ہے۔ مسجد میں توسیع کی گئی اور جمعۃ المبارک کی ادائیگی شروع ہوئی۔ پہلا خطبہ حضرت الاستاد مولانا محمد عطاء اللہ حنیف رحمہ اللہ نے دے کر افتتاح فرمایا۔ اللہ کا شکر ہے میں نے پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا اور وفاق المدارس اور طب کی سند حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ طبی کونسل پاکستان سے اے لیول کی رجسٹریشن حاصل کی۔ طالبات کو دو بار بخاری شریف کا درس دیا۔ طلبا کو مشکوۃ شریف کی بہت سی احادیث زبانی یاد کرائیں۔ تفسیر جامع البیان اور دیگر احادیث وفقہ اور صرف ونحو کی کتب پڑھائیں۔

ایک وقت تھا کہ میں اکیلا ہی شمالی لاہور میں اہل حدیث کی ایک مسجد کا امام تھا۔ اب ماشاء اللہ اس طرح بیس سے زیادہ مساجد بن چکی ہیں۔ میں نے پہلا حج ۱۹۸۲ء میں کیا۔ اس کے بعد چار حج کیے اور ایک عمرے کی سعادت حاصل کی۔ الحمد لله على ذلك۔

ترجمہ وتصنیف:

حضرت الاستاد مولانا محمد عطاء اللہ حنیف رحمہ اللہ کی تربیت اور نگرانی میں حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمہ اللہ کی تفسیر موضح القرآن کی تسہیل کا کام کیا۔ اس کا نام حضرت الاستاد نے موضح الفرقان تسہیل موضح القرآن تجویز فرمایا جسے محمد حسین اینڈ سنز مالکان چاند کمپنی اردو بازار نے شائع کیا۔ اس کے بے شمار ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

غایۃ الامانی کا اردو ترجمہ کیا جو ہزار صفحات سے زائد ہے۔ ایک شخص نے شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کے ردّ میں کتاب لکھی تھی، اس کے جواب میں یہ غایۃ الامانی کتاب لکھی گئی تھی۔ اس کی اشاعت کی سعادت دار العلوم اثریہ جہلم کے حصے میں آئی۔

منتقی الاخبار کا اردو ترجمہ جو ناقص تھا مکمل کیا۔ کہیں کہیں توضیحی فوائد بھی لکھے۔ اعراب لگائے۔ اسے دار الدعوۃ السّلفیہ شیش محل روڈ نے شائع کیا۔

فقہ محمدیہ کی تسہیل کی۔ یہ کتاب احکام پر مشتمل ہے۔ اس کے آغاز میں عقائد کا اضافہ ہے جو قرآن و حدیث پر مشتمل ہیں۔ یہ میاں عبدالمعید مرحوم مالواڈہ کے پاس تھی، غیر مطبوع۔

فتاویٰ حمویہ کا اردو ترجمہ غیر مطبوع۔

نصیحت المسلمین،

عمل بالحدیث،

رد الشبہات کا اردو ترجمہ۔

مختلف مدارس کے امتحانات:

حضرت الاستاد مولانا عطاء اللہ حنیف کے ساتھ کئی سال جامعہ اسلامیہ آبادی حاکم رائے گوجراں والا کے طلبا کے امتحان میں معاون رہا۔ اب کئی سال سے جامعہ سلفیہ نصرۃ العلوم گوجراں والا کا ممتحن ہوں۔ ایک سال تعلیم الاسلام ماموں کانجن ضلع فیصل آباد کا سالانہ تحریری امتحان لیا۔ ایک سال جلال پور پیر والا کے سالانہ امتحان میں حضرت الاستاد کا معاون تھا۔

اب دار الدعوۃ السّلفیہ شیش محل روڈ کا خادم (صدر) ہوں۔ سکول میں تدریس کے دوران بہت سے طلبا کے عقائد درست ہوئے۔ بے شمار طلبا نے علم دین سیکھا۔

اساتذہ کرام:

ناظرہ قرآن بابا نظام الدین نمبردار (موضع کرما) سے پڑھا۔ سکول میں مولوی عبدالرحمٰن لکھوی، ماسٹر عبداللطیف لکھوی اور ماسٹر نور محمد سے تعلیم حاصل کی۔ درس نظامی میں میرے اساتذہ کرام یہ ہیں: (۱) مولانا شمس الدین جو ایک واسطے سے حضرت میاں سید نذیر حسین محدث دہلوی کے شاگرد تھے۔ (۲) مولانا حافظ محمد اسماعیل بھاؤ وال (۳) مولانا خان محمد منچن آباد (۴) مولانا غلام مرتضیٰ صدر مدرس مدرسہ صادقیہ (۵) مولانا محمد عبداللہ شام کوٹ جگراؤں (۶) مولانا محمد رمضان منڈی صادق گنج (۷) شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی (۸) مولانا عبدالرحمٰن (۹) مولانا عبداللہ بھوجیانی (۱۰) مولانا عبدالرحیم بھوجیانی

(۱۱) شیخ الحدیث مولانا نیک محمد (۱۲) مولانا محمد عبدہ الفلاح (۱۳) مولانا شریف اللہ خاں (۱۴) مولانا محمد موسیٰ خاں علم طب میں (۱۵) حکیم ظفر اللہ قریشی فاضل طب والجراحت طبیہ کالج دہلی (۱۶) مولانا حکیم ہدایت اللہ بٹالوی (۱۷) ان حضرات کے علاوہ آقا بیدار بخت ایڈووکیٹ سے فارسی کی تعلیم۔

میرا بچپن میں نام محمد صدیق تھا۔ بعد میں ابوبکر صدیق ہوا۔ والد ماجد کا نام ولی محمد اور دادا کا بدر الدین۔

شادی:

میری شادی چک نمبر 1-L / 18 کے ایک معزز گھرانے میں ہوئی۔ نکاح استاد پنجاب حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی نے پڑھایا۔ میرے استاد و مربی مولانا محمد عطاء اللہ حنیف رحمہ اللہ نے لاہور سے خاص طور پر چک نمبر 1-L / 18 ضلع اوکاڑہ میں نکاح میں شرکت فرمائی اور رومال کا تحفہ دیا۔

اولاد و احفاد:

میری اولاد میں میرے دو بیٹے، دو بیٹیاں موجود ہیں۔ ایک بیٹی فوت ہوگئی تھی۔ میرا ایک بیٹا ڈاکٹر محمد چودھری کینسر سپیشلسٹ ہے۔ کے ای کالج لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ میو ہسپتال میں خدمات انجام دیں۔ آج کل ایسوسی ایٹ پروفیسر وارڈ انچارج گنگا رام ہسپتال ہے۔ اس کی ایک بیٹی شادی شدہ، دو بیٹے ارسلان اور عبداللہ زیر تعلیم ہیں۔

دوسرا بیٹا حافظ قرآن احمد ساجد ہے، جس نے دینی تعلیم بھی حاصل کی ہے۔ بیس سے زائد مصلے سنا چکا ہے۔ اس کے دو بیٹے نیہان اور سہل ہیں اور ایک بیٹی ام ایمن زیر تعلیم ہے۔ دو بیٹیاں ربیعہ اور سمیہ اپنے اپنے گھروں میں آباد ہیں۔

اللہ تعالیٰ مجھ گناہ گار کے گناہ معاف فرمائے اور حسنات قبول فرمائے، آمین۔

اب چراغ سحری ہوں بجھا چاہتا ہوں

عارضہ جن کے لیے تعویذ:

میرے بڑے بھائی حاجی عبدالعزیز مرحوم کی شادی انڈیا میں ہوئی تھی۔ ان کی بیوی کو جن پریشان کرتے تھے، اس کا مختلف طریقوں سے علاج کیا گیا۔ ان دنوں میں طالب علمی کے سلسلے میں مسافری کی زندگی میں گاؤں سے باہر تھا۔ پاکستان بننے کے بعد چک نمبر ۸۰ گ ب (فیصل آباد) میں آباد ہونے کے دوران جب تکلیف شروع ہوئی تو میں نے تعویذ دیا۔ اس سے افاقہ ہوا لیکن چند ماہ بعد تعویذ گم ہوگیا۔ پھر تکلیف شروع ہوگئی۔ پھر تعویذ دیا۔ اس کا حشر بھی پہلے تعویذ والا ہوا۔ میں نے گھر میں کہا جب اسے تکلیف شروع ہو تو مجھے فوراً اطلاع دیں۔ چنانچہ ایک دن جب کہ میں اپنی دکان پر بیٹھا تھا، اطلاع ملی۔ میں فوراً گھر

گیا۔ جاتے ہی لاحول و لا قوۃ الا باللہ۔ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھ کر تھتکارا اور اپنی زبان میں کہا: ظالمو! تمھیں اللہ نے آبادیوں سے جنگلوں، بیابانوں میں نکال دیا ہے، تم لوگوں کو کیوں تکلیف دیتے ہو؟ یہاں سے نکل جاؤ۔ یہ کہنے پر وہ چلے گئے۔ بھائی کی بیوی تندرست ہو گئی۔ پہلے معالج کھانے پر مختلف پابندیاں لگاتے تھے مثلاً بڑا گوشت نہیں کھانا وغیرہ۔ میں نے کہا اب تم ہر حلال چیز کھا سکتی ہو۔ الحمدللہ اس کے بعد ساٹھ سال میں پھر تکلیف نہیں ہوئی۔

ایک مریض کے بارے میں تعویذ کے لیے میرے ایک جاننے والے کو سفارشی بنایا گیا۔ اس کو یاد نہ رہا۔ ایک سادہ کاغذ پر تعویذ لکھ کر اس مریض کو دیا اور وہ تندرست ہو گیا۔ اس طرح کے کئی اور واقعات ہوئے۔

مکان کی تعمیر اور چند مزید باتیں:

مسجد نجم احاطہ تھانیدار لاہور میں جب میں آیا تو ایک چھوٹا سا مکان کرایے پر لیا جس میں سہولتیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ میں نے دعا کی یا اللہ ایک مکان دے دے۔ اسی دوران ایک صاحب میرے پاس آئے اور کہاں فلاں پلاٹ خالی ہے جو ایک مرزائی کا ہے۔ آپ لینا چاہیں تو قبضے کے ایک سو بیس روپے دے دیں۔ میں نے کہا میرے پاس صرف ساٹھ روپے ہیں۔ چنانچہ ساٹھ روپے میں چھے مرلے کی ہندو پراپرٹی کا قبضہ مل گیا اور پھر آہستہ آہستہ رہائش کے لیے مکان بھی تعمیر ہو گیا۔

مسجد نجم کے ایک نمازی نے سر درد کی شکایت کی کہ علاج کے باوجود آرام نہیں آ رہا۔ میں نے کھڑے کھڑے سورۂ فاتحہ اور دوسری دعائیں پڑھ کر دم کیا۔ اسی وقت درد ختم ہو گیا، پھر کبھی نہ ہوا۔ الحمدللہ۔

دعا اور دوا دونوں کارگر ہیں لیکن جب اللہ تعالیٰ چاہے۔ ہر دعا دنیا میں قبول نہیں ہوتی۔ بعض قبول ہو جاتی ہیں۔ بعض اللہ تعالیٰ کے ہاں محفوظ ہو جاتی ہیں۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی مرضی پر منحصر ہے۔ بندے کا کوئی کمال نہیں۔

وہ کتابیں جو مختلف اوقات میں پڑھائیں:

(۱) قرآنِ مجید ناظرہ و ترجمہ (۲) تفسیر جلالین و تفسیر جامع البیان (۳) الفوز الکبیر (شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ) (۴) بخاری شریف (تدریساً) (۵) مشکوٰۃ (درساً و تدریساً) (۶) بلوغ المرام (نامکمل) (۷) ریاض الصالحین (نامکمل) (۸) منتقی الاخبار (نامکمل) (۹) الترغیب والترہیب (نامکمل) (۱۰) مصطلحات المحدثین (۱۱) شرح نخبۃ الفکر (نامکمل) (۱۲) جامع ترمذی۔

علم و روحانیت کا مرکز:

موضع لکھو کے کا گزشتہ صفحات میں ذکر ہوا ہے۔ یہ گاؤں علم و روحانیت کا مرکز تھا، وہاں سے مولانا محمد

علی لکھوی رحمہ اللہ، ان کے صاحب زادگان مولانا محی الدین لکھوی، مولانا معین الدین لکھوی ہمارے گاؤں ''کرما'' وعظ و تبلیغ کے لیے تشریف لایا کرتے تھے۔ سکول میں اساتذہ کرام میں مولانا قدرت اللہ لکھوی، مولانا عبدالرحمٰن لکھوی، ہیڈ ماسٹر مولوی عبداللطیف لکھوی تعلیم کے ساتھ نیکی کی تربیت فرماتے۔ پھر قرآن مجید ناظرہ کے بعد میں نے اپنے استاد بابا نظام الدین نمبردار سے احوال الآخرت سبقاً سبقاً پڑھی۔ جمعہ پڑھنے ہم کبھی لکھوکے یا مرکز الاسلام جایا کرتے تھے۔ لکھوکے میں خطبہ جو مولانا محمد حسین بن حافظ محمد لکھوی ارشاد فرماتے تھے۔

کتے کا حملہ اور زخم:

مولانا قدرت اللہ لکھوی اور مولوی عبداللطیف لکھوی (ہیڈ ماسٹر) کا دوپہر کا کھانا عموماً ہمارے گھر میں تیار ہوتا تھا۔ وقفے کے دوران کھانا کھانے کے لیے سکول کے طلبا اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے تھے۔ وقفہ تقریباً پون گھنٹے کا ہوتا تھا۔ ایک دن جب کہ میں سکول کی دوسری جماعت کا طالب علم تھا، وقفے کے دوران گھر سے کھانا کھا کر بازار کے راستے سے سکول جا رہا تھا۔ بازار میں کوئی بیس دکانیں ہوں گی۔ جب میں اس جگہ پہنچا جہاں بازار ختم ہونے والا تھا، بازار میں ایک خطرناک قسم کا کتا لیٹا ہوا تھا۔ میں ڈرا اور دیوار کے ساتھ لگ کر اس کتے کے پاس سے گزرا۔ میرا خیال تھا وہ سو رہا ہے۔ جوں ہی میں اس کے برابر پہنچا، وہ اٹھا، اچھلا اور میری بائیں ٹانگ پر حملہ آور ہوا اور پنڈلی سے بوٹی نوچ لی۔ لوگوں نے میری مدد کی۔ وہاں ڈاکٹر نہ حکیم، بس گھریلو قسم کا علاج ہوتا تھا۔ کچھ عرصہ میں کہیں نہیں جا سکا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے شفا بخشی۔ آج بھی اس بڑے زخم کا نشان میری شناخت کے طور پر موجود ہے۔

آنکھ پر زخم:

میں تیسری جماعت میں تھا کہ ایک دن تفریح کے دوران سکول سے نکلا۔ سکول کے سامنے ایک کھلا میدان تھا جہاں طلبا کھیلا کرتے تھے، وہاں گلی ڈنڈا کھیلا جا رہا تھا کہ ایک لڑکے نے گلی پھینکی جو میری آنکھ پر آ لگی۔ علاج کہاں سے ہوتا، کوئی انتظام ہی نہیں تھا گویا ارشاد نبوی ﷺ کے مطابق ''لا یداوون، لا یتطیرون و علی ربھم یتوکلون'' والا نقشہ اور ماحول تھا۔ اس گلی پھینکنے والے احمد الدین ترکھان کو معاف کر دیا۔ غالباً اسی کا نتیجہ ہے کہ اگرچہ میری بائیں آنکھ خراب ہو گئی لیکن دائیں آنکھ اس بڑھاپے میں بھی کام کر رہی ہے۔ وللہ الحمد...... سکول اور مسجد سے بچپن کے تعلق کا مجھے یہ فائدہ ہوا کہ کئی سورتیں زبانی یاد ہو گئیں مثلاً سورۂ یٰس، سورۂ ملک، سورۂ مزمل اور سورۂ سجدہ۔

مزدوری کا ایک واقعہ:

امرتسر کے مدرسہ غزنویہ سلفیہ میں تعلیم کے دوران جی میں آیا کہ خود کمائی کر کے تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ جمعۃ المبارک کے دن چھٹی ہوتی تھی اور مسجد کے ساتھ مدرسے کی عمارت مولانا اسماعیل غزنوی مرحوم کی نگرانی میں بن رہی تھی۔ مسجد کے ساتھ ہی ایک متمول شخص ڈپٹی محمد شریف کا (جو غالباً گورنمنٹ کے کسی محکمے کے ریٹائرڈ افسر تھے) مکان تھا۔ انھوں نے شاید اپنی کھڑکیوں اور روشن دانوں کو جو ناجائز طور پر مسجد میں کھلتے تھے، بچانے کے لیے سٹے آرڈر (Stay order) لے لیا تھا۔ مولانا اسماعیل غزنوی مرحوم چاہتے تھے کہ عمارت جلد از جلد مکمل ہو جائے، پہلے کمرے کی چھت ڈاٹ کے ذریعے ڈالی گئی تھی۔ ابھی وہ چھت کچی تھی کہ اس کے اوپر دوسرا کمرہ شروع کر دیا گیا۔ اس وقت میں بھی مزدور کی حیثیت سے لوہے کے تسلے میں مسالہ لے کر سیڑھی پر چڑھ رہا تھا۔ ایک آدھ پائے دان باقی تھا کہ عمارت یک دم گر گئی۔ پھر مجھے نہیں معلوم کیا ہوا۔ مشہور ہو گیا کہ ایک طالب علم اس عمارت میں دب کر مر گیا ہے۔ مغرب کے وقت اسپتال میں مجھے کچھ ہوش آیا تو وہاں عظیم ترین ہستی حضرت مولانا نیک محمد رحمہ اللہ اور طلبا میری خبر گیری کے لیے موجود تھے۔ آٹھ دس دن کے بعد مجھے اسپتال سے رخصت ملی تو میں ننگے بدن ایک تہبند کے ساتھ ہاتھ میں گڑوی لے کر مدرسے پہنچا۔ اتفاقاً وہاں مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی رحمہ اللہ مہتمم مدرسہ موجود تھے۔ مجھے دیکھ کر کہا ''الرزق مقسوم والحریص محروم'' یہ ان کا اپنا قیاس تھا، ورنہ میں نے تو ایک نیک جذبے کے تحت ہی مزدوری کی تھی۔ اس حادثے میں مجھے جو چوٹیں اور زخم لگے وہ زندگی بھر اپنا اثر دکھاتے رہے۔

ایک دعا کی قبولیت:

امرتسر میں ہم تین طلبا کا کھانا لوہ گڑھ سے آتا تھا جو مسجد سے کم از کم ڈیڑھ کلومیٹر ہوگا۔ ہمیں باری باری کھانا لانے کے لیے جانا ہوتا تھا۔ میں اکتا گیا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے اس سے نجات دے۔ چناں چہ دعا قبول ہوئی اور مسجد کے بالکل ساتھ والے گھر سے تازہ کھانا آنے لگا۔

مولوی فاضل کا امتحان:

دار العلوم تقویۃ الاسلام (لاہور) میں تحصیل علم سے فارغ ہو کر اپنے ہم سبق احباب سیف الرحمن الفلاح اور مولانا محمد رفیق وغیرہ کے ساتھ جو اب مرحوم ہو چکے ہیں، پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان دیا۔ الحمد للہ اپنے ساتھیوں میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے۔ اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا، پھر میٹرک کا امتحان دیا جس میں کامیاب ہوا۔ دار العلوم تقویۃ الاسلام (لاہور) میں مولوی فاضل کے امتحان کی تیاری کے دوران سخت بیمار ہو گیا۔ معالج حضرات نے پڑھنے لکھنے کی ممانعت کر

دی، صرف یہ اجازت تھی کہ بیٹھ کر سن سکتے ہو۔ اس بیماری کے دوران محبی عبدالعلیم خان منصور پوری نے میری بڑی خدمت کی۔ اللہ تعالیٰ ان کو اجر جزیل سے نوازے۔ وہ چونیاں رہتے ہیں اور کئی سال سے بیمار ہیں، دعا ہے اللہ تعالیٰ انھیں شفا بخشے، آمین۔

السّلفی کی نسبت:

لاہور میں تعلیم کے دوران غزنوی خاندان کے گل سرسبد مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی رحمہ اللہ سے کبھی کبھی مجالس ہوتی تھیں جس سے ہم نے بڑا فیض پایا۔ ایک دن میں نے عرض کیا آپ کے مدرسے کا نام تقویۃ الاسلام ہے۔ ہم فارغ ہونے والے مدرسے کی طرف کس طرح اپنی نسبت کر سکتے ہیں؟ مولانا نے فرمایا: اصل میں امرتسر میں اس مدرسے کا نام المدرسۃ الغزنویۃ السلفیۃ تھا، لہٰذا تم السّلفیہ کے ساتھ اپنی نسبت رکھو یعنی ''السّلفی'' کہلاؤ۔ اسی وجہ سے میرے نام کا لاحقہ ''السّلفی'' ہے نہ کہ سلفی۔

پولیس والے کو تین آنے دیے:

۱۹۴۰ء میں جب میں موضع بھاؤ وال (ضلع امرتسر میں) پڑھتا تھا، مولانا عبدالکریم گرنتھی فیروز پوری (امین خاندان غزنویہ) کا بیٹا محمد یحییٰ میرے ساتھ پڑھتا تھا۔ ایک مرتبہ ان کے گاؤں جانے کا اتفاق ہوا۔ واپسی پر انھوں نے مجھے ایک کمان اور ایک کڑکی دی (جس سے شکار کیا جاتا ہے)۔ جب میں واپس بھاؤ وال کے قریب دریائے ستلج کے کنارے پہنچا تو پولیس نے مجھے پکڑ لیا اور کہا کمان اور کڑکی کا لائسنس دکھاؤ۔ میں نے کہا اس کا تو لائسنس نہیں ہوتا۔ وہ نہ مانے اور سپاہی نے کہا اسے پٹی تھانے لے جاؤ۔ میں نے بہت کہا کہ میرے سبق کا وقت ہے۔ مجھے جانے دو لیکن پولیس نے میری بات نہیں مانی۔ ایک سپاہی مجھے لے کر چل پڑا۔ تھوڑی دور گیا تو سپاہی پیشاب کرنے بیٹھ گیا اور بغیر استنجا کیے کھڑا ہوگیا۔ میں نے اس سے کہا کیا تو مسلمان ہے؟ پیشاب سے تیرا جسم اور کپڑے ناپاک ہو گئے ہیں۔ اس نے کہا باتیں مت کرو۔ چائے پانی دو تو تمھیں چھوڑ دوں گا۔ میرے پاس غالباً تین آنے تھے، وہ اس نے لے لیے اور مجھے آزاد کر دیا۔ میں بھاؤ وال پہنچ گیا۔

مولانا آزاد کی تقریر اور اس کا اثر:

۱۹۴۲ء میں لاہور میں جمعیت علماے ہند کا جلسہ تھا، جس میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تشریف آوری کی اطلاع تھی۔ ہم اپنے استاد کے ہمراہ امرتسر سے لاہور پہنچے۔ اس جلسے کی مجلس استقبالیہ کے ناظم مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی رحمہ اللہ تھے۔ مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور دیگر حضرات کی تقاریر ہوئیں۔ آخر میں امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کا زبردست خطاب ہوا۔ یہ خطاب سن کر جب کہ میری عمر پندرہ

سولہ سال تھی ایسا جذبہ پیدا ہوا کہ ان سب انگریزوں کو قتل کر دوں جو ہمارے ملک پر حکومت کر رہے ہیں۔
اس جلسے کے پنڈال میں داخلے کے لیے چار آنے کا ٹکٹ تھا۔
مولانا آزاد نے سب قناتیں گروا دیں اور بے شمار لوگوں نے ان کا خطاب سنا۔ یہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ مولانا آزاد کی زیارت نصیب ہوئی اور ان کے ارشادات سننے کی سعادت سے بہرہ مند ہوا۔ اللہ انھیں غریق رحمت فرمائے۔ آمین

(یہ مضمون ۱۷۔ دسمبر ۲۰۱۲ء کو لکھا گیا)

بشیر انصاری

(ولادت ۱۸۔ستمبر ۱۹۳۲ء)

زمانہ قبل از تاریخ کا اگر یہ مطلب لیا جائے کہ کوئی واقعہ ایسے وقت میں وقوع پذیر ہوا جس کی تاریخ کا علم نہ ہو، تو میں عرض کروں گا کہ بشیر انصاری سے میرا تعلق زمانہ تاریخ سے قبل کا ہے۔ کچھ پتا نہیں ان سے مراسم کا آغاز کب ہوا، کہاں ہوا اور کس انداز میں ہوا؟ یا یہ کہ آغاز ہوا ہی نہیں، بس مراسم کہیں فضا سے ظہور میں آئے اور براہ راست دوستی کے آنگن میں داخل ہو گئے۔

جب میں نے ان کو کہیں اور کسی موقعے پر دیکھا تو یہ دبلے پتلے کشیدہ قامت نوجوان تھے۔ بہت چھوٹی سیاہ داڑھی (اب بھی تقریباً اسی قسم کی ہے لیکن سفید ہو گئی ہے) سر پر انگریزی طرز کے بال، لبوں پر مسکراہٹ، دیکھنے میں سنجیدہ طبع، گندم گوں، نرم کلام اور شلوار قمیص پہنے ہوئے۔ پھر خدا جانے کس طرح ان سے تعلقات بڑھے اور بڑھتے ہی چلے گئے۔ جہاں ملے اور جب ملے (باطن کا معاملہ اللہ جانے یا وہ جانیں) بظاہر محبت سے ملے۔ میں نے بھی اپنے طور پر ان کو کچھ ایسا ہی محسوس کرانے کی کوشش کی۔ اب تک کے واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ میں اپنی اس کوشش میں کامیاب رہا۔ اگر کامیاب نہیں رہا تو ناکام بھی نہیں رہا اور اس کی اصل وجہ ان کا اخلاص ہے، جس نے مجھے ہمیشہ کامیابی کا احساس دلائے رکھا۔

بشیر انصاری ۱۸ ستمبر ۱۹۳۲ء کو موضع ''بھنگواں'' میں پیدا ہوئے۔ یہ گاؤں ضلع امرتسر (مشرقی پنجاب) کے ریلوے اسٹیشن جنڈیالا گورو سے متصل تھا۔ آزادی کے وقت اگست ۱۹۴۷ء میں بشیر انصاری کی عمر پندرہ سولہ سال کی تھی، مجھ سے چھے سات سال کم۔ ظاہر ہے انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی وطن میں حاصل کی ہو گی۔ ممکن ہے میٹرک تک وہاں کے کسی سکول میں پڑھا ہو۔ میٹرک نہیں تو مڈل تو وہاں پاس کیا ہی ہو گا۔ یعنی تعلیمی اعتبار سے بھی مڈل کلاسیے ہوں گے اور معاشرتی اعتبار سے بھی۔ میرا خیال ہے اسی کلاس میں ہوں گے۔ یہ کلاس مجھے بہت پسند ہے۔ اس سے اگلی کلاسوں والوں سے میں نے کبھی تعلق نہیں رکھا۔

آزادی کے بعد وہ اپنے بزرگوں کے ساتھ گوجراں والا آئے۔ یہاں آ کر گوجراں والا کے کالج سے بی اے پاس کیا۔ پھر پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اسلامیات اور ایم اے اردو کیا۔ کالج میں ان کے اساتذہ تھے پروفیسر اسرار احمد سہاروی، مظفر علی سید، پروفیسر ارتضا احمد قادری اور یونیورسٹی میں ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وحید

قریشی، پروفیسر حمید احمد خاں، اعجاز حسین بٹالوی اور عابد حسن منٹو۔

دینیات کی تعلیم مولانا محمد علی جانباز، حافظ فتح محمد فتحی اور قاری محمد یحییٰ بھوجیانی سے حاصل کی۔

طالب علمی کے دور ہی سے ذہن ادبیت کی طرف مائل تھا۔ ۱۹۶۱ء میں گوجراں والا کے کالج کی بزم علوم اسلامی کے صدر اور بزم اردو کے سیکرٹری منتخب ہوئے۔ لاہور کے لا کالج میں بھی کچھ عرصہ پڑھتے رہے۔

وہاں ایک تحریری مقابلے کے بعد ۱۹۶۲ء میں کالج میگزین ''المیزان'' کی ادارت ان کے سپرد ہوئی۔

۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۳ء تک ہفت روزہ ''اہل حدیث'' (لاہور) کے مدیر رہے۔ ۱۹۷۴ء میں ہفت روزہ ''الیوم'' (لاہور) کے مدیر مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۵ء سے ہفت روزہ ''الاسلام'' (لاہور) کا منصب ادارت ان کے سپرد ہوا۔

علامہ احسان الٰہی ظہیر کے ماہنامہ ''ترجمان الحدیث'' (لاہور) کی ادارت بھی کی۔ علاوہ ازیں اگر آپ صبر سے کام لیں اور صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھ سکیں تو سنیے۔ ماہنامہ ''والضحیٰ'' (گوجراں والا) ماہنامہ ''جنت الماویٰ'' (گوجراں والا) ماہنامہ ''النصیحہ'' (گوجراں والا) کی زمام ادارت بھی ان کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن میں نے ان مؤقر ماہناموں میں سے کوئی رسالہ نہیں دیکھا۔ البتہ ''والضحیٰ'' کی ایک مرتبہ زیارت ہوئی تھی اور قرآن مجید میں بھی یہ لفظ پڑھا ہے۔ یہ انہی کو معلوم ہوگا کہ یہ (نماز) الضحیٰ پڑھتے ہیں یا نہیں، میں نے البتہ دو تین دفعہ پڑھی ہے۔ یا ''النصیحہ'' سے انھیں تھوڑی بہت نصیحت حاصل ہوئی یا نہیں یا ''جنت الماویٰ'' میں کبھی جانے کا اتفاق ہوا یا نہیں۔ اتنے مصروف آدمی کو کہاں ایسے کاموں پر عمل کا وقت ملتا ہوگا۔ رسالوں کی ادارت فرمائیں یا ان پر عمل کریں۔ ایک وقت میں ایک ہی کام ہوسکتا ہے۔ عمل قارئین کر سکتے ہیں تو کریں۔

ان کے اخبار نویسی کے محکمے میں آنے کی وجہ ایک دوست نے یہ بتائی کہ مروجہ تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے بنک میں ملازمت کر لی تھی۔ ایک روز نماز جمعہ کے بعد حضرت حافظ محمد گوندلوی کی خدمت میں حاضر تھے کہ انھوں نے پوچھا آج کل آپ کیا کر رہے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا بینک میں ملازمت کر رہا ہوں۔ حافظ صاحب نے فرمایا بینک کی ملازمت حرام ہے، اسے آج ہی چھوڑ دو۔ چنانچہ انھوں نے ملازمت چھوڑ دی اور اخبار نویسی کی راہ اختیار کر لی۔ یہ شاید ان کے نزدیک صحیح راہ ہے اور جو کچھ اس میں لکھا جاتا ہے، بالکل صحیح ہوتا ہے۔ کوئی بات غلط یا خلاف واقعہ نہیں ہوتی۔

بشیر انصاری صاحب نے بڑی دنیا کے سفر کیے۔ دو مرتبہ (غالباً) حج بیت اللہ کیا۔ دو دفعہ انگلستان گئے۔ جاپان گئے، افغانستان، کویت اور عراق وغیرہ ملکوں کی سیاحت کی اور کئی کئی دن وہاں رہنے کا اتفاق ہوا۔ مکہ مکرمہ اور جدہ کے ریڈیو پر تقریریں بھی کیں۔

ان کے انہی اسفارِ کثیرہ میں میرے علاقے سانده کا سفر بھی شامل کیجیے۔ میرے غریب خانے پر کئی دفعہ

تشریف لائے۔ لیکن ہر دفعہ بھول گئے۔ نہ انگلستان میں کہیں بھولے، نہ جاپان، کویت اور عراق وغیرہ میں کبھی بھولے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے سانده رقبے اور آبادی کے لحاظ سے ان تمام ملکوں اور شہروں سے بڑا ہے۔ پھر جہاں انھیں بھول جانے کا شبہ پڑتا ہے، وہاں سے ٹیلی فون پر پوچھتے ہیں: میں یہاں کھڑا ہوں۔ یہاں سے کدھر جاؤں۔؟ گرمیوں میں آئیں تو اللہ انھیں جزائے خیر دے آم ضرور لاتے ہیں اور میرے لیے اصل خوشی کا باعث آم ہی ہوتے ہیں۔ خود آئیں یا نہ آئیں آم ضرور آنے چاہییں۔

مذکورہ بالا جرائد و رسائل کی ادارت کے ساتھ ساتھ بشیر انصاری صاحب نے دو کتابیں بھی مرتب کی ہیں یا ''مرمت......'' کی ہیں۔ ایک کتاب کا نام ہے ''تحریک اہل حدیث، افکار و خدمات''۔ دوسری کا نام ہے ''نجات کا راستہ''۔ میری نظر سے یہ دونوں کتابیں نہیں گزریں۔ بے شک یہ کتابیں بہت اچھی ہوں گی۔ نجات کا راستہ میرے اس دوست نے یقیناً بتایا ہوگا کہ کون سا ہے اور خود بھی اس سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی ہوگی۔

بشیر انصاری کے نام مختلف حضرات کے جو خطوط آئے وہ بھی انھوں نے کتابی صورت میں دو جلدوں میں چھاپ دیے ہیں۔ یہ علمی اور ادبی لحاظ سے بہترین خطوط ہیں اور بہت سی بڑی شخصیات کے تحریر فرمودہ ہیں۔ ان خطوط کا مطالعہ میں نے بڑی دلچسپی سے کیا۔ خطوط میرے نام بھی بے شمار حضرات کے آئے ہیں اور آتے رہتے ہیں، جن میں سے بعض اہم خطوط گم بھی ہوگئے ہیں۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ میں بھی یہ خطوط جمع کر کے اور ہر لکھنے والے کا چند سطور میں تعارف کرا کے چھپوانے کی کوشش کروں۔

بہر حال ہمارے جگری دوست بشیر انصاری ملنسار، خوش اخلاق، متواضع اور مخلص اہل علم ہیں۔ جہاں ملیں اور جب ملیں خندہ پیشانی سے ملتے ہیں۔ یہ پڑھے لکھے شخص ہیں، لیکن میں حیران ہوں کہ یہ اتنا کچھ لکھتے ہیں، پڑھتے کس وقت ہیں۔ ویسے اخبار نویسی میں پڑھنے کی ضرورت کم ہی ہوتی ہے بلکہ بہت کم اور لکھنے کی زیادہ۔ خود میں بھی لکھنے میں مصروف رہتا ہوں، لکھنے سے فرصت ملے تو کچھ پڑھوں۔ لوگ مجھ سے پوچھتے بھی یہی ہیں کہ آج کل کیا لکھ رہے ہو؟ یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ کیا پڑھ رہے ہو؟ انھیں معلوم ہے کہ یہ شخص لکھنے والا ہے، پڑھنے والا نہیں۔

اللہ بشیر انصاری کو خوش رکھے اور یہ ہمیشہ اس کے دین کی خدمت کرتے رہیں۔ طویل مدت سے ہفت روزہ ''اہل حدیث'' (لاہور) کے منصب ادارت پر فائز ہیں۔

(یہ سطور ۵۔ اپریل ۲۰۱۱ء کو لکھی گئیں)

مولانا محمد اعظمی

(ولادت ۱۹۳۴ء)

مولانا ممدوح کا سلسلۂ نسب یہ ہے: محمد اعظمی بن مولانا عبدالعلی بن عبداللہ بن علیم اللہ بن جمال الدین۔

مولانا محمد اعظمی ہندوستان کے صوبہ یوپی کے مشہور شہر مئو ناتھ بھنجن میں ۱۹۳۴ء میں پیدا ہوئے۔ یہ شہر پہلے ضلع اعظم گڑھ میں شامل تھا، اس لیے وہاں کے لوگ اپنے لیے ''اعظمی'' کی نسبت استعمال کرتے تھے۔ ۱۹۸۸ء میں اسے مستقل ضلع بنا دیا گیا۔ مئو ناتھ بھنجن مسلم اکثریت والا شہر ہے، جہاں متعدد چھوٹے بڑے جامعات اور مدارس و مکاتب قائم ہیں اور پورے ہندوستان سے طلبا ان اداروں سے فیض یاب ہونے کے لیے آتے ہیں۔ بڑے بڑے علما و فضلا اور ادبا و شعرا نے یہاں جنم لیا اور بے حد علمی و ادبی خدمات سرانجام دیں۔ آج بھی یہ شہر علم و ادب کے سلسلے میں اپنی ایک نمایاں شناخت رکھتا ہے۔

مولانا محمد اعظمی کے آبا و اجداد میں علم و عمل کی روایت ہمیشہ قائم رہی۔ اب بھی ان کا گھرانا علمی خدمات کے لیے مشہور ہے۔ ان کے اجداد میں سے متعدد بزرگوں کو حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ خود مولانا محمد اعظمی ایک واسطے سے میاں صاحب کے شاگرد ہیں۔

خاندانی روایت کے مطابق انھوں نے ناظرہ قرآن مجید گھر میں پڑھا۔ اس کے بعد شہر کے قدیم و مشہور تعلیمی ادارے جامعہ عالیہ عربیہ میں ابتدائی تعلیم کے لیے داخل ہوئے۔ وہاں کچھ تعلیم پائی تو مسلم اسکول میں داخل کرا دیے گئے۔ اس اسکول میں صرف ایک سال رہے۔ ذہنی رجحان دینی تعلیم کی طرف تھا، اس لیے اسکول سے نکلے اور دوبارہ جامعہ عالیہ عربیہ میں چلے گئے اور اس کے نصاب کے مطابق پڑھنا شروع کیا۔ اس وقت وہاں کے بزرگ اساتذہ میں مولانا محمد سلیمان مئوی تلمیذِ رشید حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی بہ قید حیات تھے، مولانا محمد اعظمی نے ان سے شرح جامی پڑھی۔ مولانا عبدالصمد مبارک پوری بھی وہیں تھے، ان سے عربی اور فارسی کی ابتدائی کتابوں کے علاوہ بلوغ المرام کا کچھ حصہ پڑھا۔ وہیں کے قابل اکرام اساتذہ میں سے مولانا محمد اسحاق کھیدوپوری، مولانا عبدالباقی کھیدوپوری اور دیگر حضرات سے استفادہ کیا۔

جامعہ عالیہ عربیہ کے علاوہ مولانا محمد اعظمی مئو کے ایک اور تدریسی ادارے جامعہ فیض عام میں کچھ عرصہ اخذِ فیض کرتے رہے۔ یہ وہاں اہل حدیث کا ایک بہت بڑا تدریسی مرکز ہے۔ اس میں حضرت میاں سید نذیر

حسین دہلوی کے لائق شاگرد مولانا محمد احمد مئوی (متوفی ۱۹۴۸ء) سے انھوں نے حدیث کی ابتدائی کتاب بلوغ المرام کا درس لیا۔ وہیں مولانا عبداللہ شائق (متوفی ۱۹۷۴ء) اور مولانا عبدالرحمٰن نحوی اور بعض دوسرے اساتذہ سے چند درسی کتابیں پڑھیں۔

اس کے بعد جنوبی ہند کی مشہور اسلامی درس گاہ جامعہ دارالسلام عمرآباد پہنچے۔ وہاں بھی خوش قسمتی سے حضرت میاں صاحب دہلوی کے شاگرد رشید مولانا محمد لقمان اعظمی فریضۂ تدریس انجام دے رہے تھے، ان سے مولانا محمد اعظمی کو مشکوٰۃ کا درس لینے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ان کے علاوہ دارالسلام عمرآباد میں جن اساتذہ سے اخذِ علم کے مواقع میسر آئے، ان میں مولانا ابو البیان حماد، مولانا عبدالسبحان اعظمی، حافظ عبدالواجد رحمانی، مولانا غضنفر علی شاکر نائطی، مولانا محمد امین اور مولانا عبدالکبیر شامل ہیں۔ وہاں کی آب و ہوا مولانا کو موافق نہیں آئی، اس لیے صرف ایک سال وہاں رہے۔ یہ ۴۶-۱۹۴۵ء کی بات ہے۔

بعد ازاں دہلی کے دارالحدیث رحمانیہ میں داخلہ لیا جو اس دور کے ہندوستان میں اسلامی تعلیم کا عدیم المثال ادارہ تھا۔ وہاں انھوں نے مولانا نذیر احمد رحمانی املوی سے شرح وقایہ جلد دوم، مولانا محمد عبدہ الفلاح سے مشکوٰۃ شریف جلد دوم، مولانا عبدالمعز سے تلخیص المفتاح اور علم منطق کی کتاب قطبی اور مولانا عبدالصمد مبارک پوری سے مشکوٰۃ کے ایک حصے کا درس لیا۔ افسوس کہ یہ عظیم الشان مدرسہ ۱۹۴۷ء میں برصغیر کی آزادی اور تقسیم ملک کے نتیجے میں ہونے والے فسادات کی نذر ہو گیا۔ اس ادارے میں مولانا محمد اعظمی کو صرف ایک سال پڑھنے کا موقع ملا۔

دہلی سے واپسی کے بعد انھوں نے اپنے شہر مئو کی جامعہ عالیہ عربیہ میں داخلہ لیا اور وہاں مفتی عبدالعزیز اعظمی عمری سے جامع ترمذی اور نخبۃ الفکر دو کتابیں پڑھیں۔ دیگر اساتذہ سے بھی فیض یاب ہوئے۔ پھر ایک سال کے بعد جامعہ فیض عام چلے گئے۔ وہاں مولانا عبدالرحمٰن نحوی، مولانا عبداللہ شائق اور دیگر اساتذہ سے تعلیم حاصل کی اور الہ آباد بورڈ سے عالم کا امتحان پاس کیا۔ مولانا عبداللہ شائق جامعہ عالیہ عربیہ میں صحیح بخاری کا درس دیتے تھے مگر ان کے سفر حج پر جانے کی وجہ سے یہ درس موقوف ہو گیا، اس لیے مولانا محمد اعظمی نے مدرسہ سعیدیہ بنارس کا رخ کیا اور وہاں حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے فاضل شاگرد مولانا ابو القاسم بنارسی (متوفی ۱۹۴۹ء) سے صحیح بخاری، صحیح مسلم اور تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن پڑھنا شروع کیں۔ چند ماہ کے بعد مولانا بنارسی پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ وفات پا گئے تو مولانا محمد اعظمی پھر جامعہ فیض عام (مئو) واپس آ گئے۔ اب مولانا عبداللہ شائق سفرِ حج سے واپس تشریف لے آئے تھے، چنانچہ مولانا محمد اعظمی ان سے دوبارہ صحیح بخاری اور تفسیر بیضاوی پڑھنے لگے۔ صحیح مسلم مولانا عبدالرحمٰن نحوی سے اور سنن ابو داؤد مولانا محمد احمد سے

پڑھیں۔ یہیں سے ۱۹۴۹ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔

تکمیل تعلیم کے بعد ان کے درس و تدریس کے سلسلے کا آغاز ہوا۔ جن اداروں میں تدریس کی مسندیں بچھائیں، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

☆...... مدرسہ محمدیہ دیوریا، یوپی (یہاں صرف ایک مہینا رہے)

☆...... مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، اعظم گڑھ یوپی (ایک سال)

☆...... جامعہ عالیہ عربیہ مئوناتھ بھنجن یوپی (پانچ سال)

☆...... مدرسہ فیض العلوم، سیونی، مدھیہ پردیش (پانچ سال)

☆...... دوبارہ جامعہ عالیہ عربیہ مئوناتھ بھنجن یوپی (تیس سال)

☆...... کلیہ فاطمۃ الزہراللبنات، مئوناتھ بھنجن، یوپی (چھے سال)

انھوں نے تقریباً نصف صدی تک طلبا کو تعلیم دی اور پچیس سال صحیح بخاری پڑھاتے رہے۔ مذکورہ اداروں میں بعض کے وہ ناظم اور مہتمم بھی رہے۔ فتویٰ نویسی کا سلسلہ بھی ان کے سپرد رہا۔ پھر جب کمزوری اور نقاہت نے غلبہ پالیا تو تدریس کی ذمہ داریوں سے دست بردار ہو گئے۔ تاہم حدیث سے متعلق استفادہ کرنے والوں کے لیے ان کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔

ان تدریسی اداروں میں بے حساب طلبا و طالبات ان کے حضور دوزانو ہو کر بیٹھے اور تحصیل علم کی۔ ان سب کے نام تو خود انھیں بھی یاد نہیں ہوں گے۔ البتہ چند حضرات کے اسمائے گرامی ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری مرحوم (سابق صدر جامعہ سلفیہ، بنارس)

۲۔ مولانا مظہر احسن ازہری (نائب صدر جامعہ سلفیہ، بنارس)

۳۔ ڈاکٹر عبدالعلی ازہری (پرنسپل مسلم کالج، لندن)

۴۔ ڈاکٹر شفیع الرحمن بہاری (سابق صدر شعبہ عربی، دہلی یونیورسٹی)

۵۔ مولانا محفوظ الرحمٰن فیضی (سابق شیخ الجامعہ فیض عام، مئو)

۶۔ مولانا محمد حنیف مدنی (سابق استاذ جامعہ سلفیہ، بنارس)

۷۔ مولانا عبدالکبیر مدنی مبارک پوری (استاذ جامعہ سلفیہ، بنارس)

۸۔ مولانا عزیز الحق عمری (استاذ جامعہ فیض عام، مئو)

۹۔ مولانا ابوالقاسم عبدالعظیم مدنی (استاذ جامعہ فیض عام، مئو)

۱۰۔ مولانا محمد مظہر اعظمی (استاذ جامعہ عالیہ عربیہ، مئو)

۱۱- مولانا راحت اللہ فاروقی (استاذ جامعہ محمدیہ، مالیگاؤں)

۱۲- مولانا اسعد اعظمی بن مولانا محمد اعظمی (مدیر "صوت الامۃ" جامعہ سلفیہ، بنارس)

۱۳- شیخ عبداللہ البدر

۱۴- شیخ حسام بوقریص

۱۵- ڈاکٹر ولید المنیس

۱۶- مولانا حفظ اللہ، کویت

۱۷- شیخ صلاح الدین مقبول احمد، کویت

۱۸- مولانا عارف جاوید محمدی، کویت

۱۹- شیخ عبداللہ بن عارف جاوید محمدی، کویت

۲۰- عبدالرحمٰن بن مولانا عارف جاوید محمدی، کویت

۲۱- شیخ محمد ناصر العجمی، کویت

۲۲- شیخ فیصل العلی، کویت

۲۳- ڈاکٹر محمد محمدی، نورستانی، کویت

مولانا محمد اعظمی کی خدمات صرف تدریس تک محدود نہیں رہیں، ان کی قلمی تگ و تاز کا دائرہ بھی کافی وسیع ہے، جس میں ان کی تصانیف بھی شامل ہیں اور تراجم بھی۔

تصانیف یہ ہیں: (۱) آداب زواج (۲) کائنات کا آغاز و انجام (۳) تذکرۃ البخاری (۴) نواب صدیق حسن خاں اور ان کی وہابیت (۵) نمازِ نبوی (۶) مستند دعائیں (۷) نقوش رحمانی یعنی مجموعہ مکاتیب مولانا عبیداللہ رحمانی (۸) فضائل اعمال کے دفاع کا علمی و تحقیقی جائزہ (۹) تین طلاقیں علماے احناف کی نظر میں (۱۰) شرعی منتروں سے علاج (۱۱) التحلی بالذھب للنساء یہ مولانا کی عربی تصنیف ہے۔ (۱۲) تلخیص فقہ السنۃ (۱۳) متفقہ فتوئی (۱۴) مولانا ابو الکلام آزاد مذہبی فکر و عمل کے آئینے میں (۱۵) لمحاتِ موت (۱۶) شریعت و عادت

اب ذیل میں ملاحظہ فرمایے ان کے تراجم جو انھوں نے عربی اور فارسی سے اردو زبان میں کیے:

۱- قرآن مجید پڑھنے پڑھانے کے آداب: ترجمہ التبیان فی آداب حملۃ القرآن، از امام نووی

۲- دین کیا ہے؟ ترجمہ رسالہ: الدین وشروط الصلوٰۃ از شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب نجدی

۳- تبلیغی جماعت اور اخوان المسلمون: ترجمہ القطبیۃ ھی الفتنۃ فاعرفوھا از شیخ ابو ابراہیم بن سلطان

۴- ائمہ اربعہ کا دفاع اور سنت کی اتباع: ترجمہ جلب المنفعة فی الذب عن الائمة المجتھدین الاربعة از نواب صدیق حسن خاں (فارسی)

ان تصانیف و تراجم کے علاوہ وقتاً فوقتاً ہند اور بیرونِ ہند کے رسائل و مجلّات میں مولانا ممدوح کے مضامین و مقالات چھپتے رہے۔ عربی میں بھی، اردو میں بھی۔ عربی زبان میں ان کے چند مقالے ''مجلۃ الجامعۃ السّلفیۃ'' (بنارس) میں چھپے۔ یہ مجلّہ اب ''صوت الامہ'' کے نام سے شائع ہوتا ہے۔

جن اردو جرائد و مجلّات میں ان کے مضامین معرضِ اشاعت میں آئے ان میں بعض مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) ماہنامہ ''محدث'' بنارس (۲) پندرہ روزہ ''جریدہ ترجمان'' دہلی (۳) مجلّہ ''اہل حدیث'' دہلی (۴) ماہنامہ ''آثار جدید'' مئو ناتھ بھنجن (۵) ماہنامہ ''البلاغ'' بمبئی (۶) ماہنامہ ''السراج'' نیپال (۷) ماہنامہ ''صراط مستقیم'' برمنگھم (۸) ماہنامہ ''افکار عالیہ'' مئو (۹) ماہنامہ ''التبیان'' دہلی (۱۰) ماہنامہ ''احتساب'' دریاباد (۱۱) ہفت روزہ ''اہل حدیث گزٹ'' دہلی (۱۲) ''الہدیٰ'' دربھنگہ۔

تصنیفی اور تحریری کاوشوں کے ساتھ ساتھ مولانا محمد اعظمی کی تقریر و خطابت کا سلسلہ بھی جاری رہا اور ماشاء اللہ جاری ہے۔ انھوں نے مختلف مسجدوں میں خطبات بھی ارشاد فرمائے اور عوامی جلسوں میں بھی ان کے مواعظ حسنہ لوگوں نے بڑے غور سے سنیں اور وہ ان کے ارشادات سے بے حد متاثر ہوئے۔ جس طرح کامیابی سے انھوں نے تدریسی اور تحریری خدمات سرانجام دیں، اسی طرح خطابتی اور تقریری صورت میں بھی ان کی تگ و دو ہمیشہ جاری رہی۔

مولانا موصوف کو ایک اعزاز یہ حاصل ہے کہ ان کی سند عالی ہے۔ یعنی صرف ایک واسطے سے حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی تک پہنچتی ہے۔ ان کے چار جلیل المرتبت استاذ حضرت میاں صاحب کے شاگرد تھے اور وہ مندرجہ ذیل تھے۔

۱- مولانا محمد نعمان اعظمی: جامعہ دارالسلام عمرآباد (متوفی ۱۳۷۱ھ، ۱۹۵۱ء)

۲- مولانا محمد احمد: جامعہ فیض عام مئو (متوفی ۱۳۶۷ھ-۱۹۴۷ء)

۳- مولانا سلیمان بن داؤد مئو (متوفی ۱۳۷۸ھ-۱۹۵۹ء)

۴- مولانا ابوالقاسم بنارسی مدرسہ سعیدیہ بنارس (متوفی ۱۳۶۹ھ-۱۹۴۹ء)

یہ چاروں حضرات برصغیر کے عظیم المنزلت عالم، مشہور استاذ اور ممتاز خطیب تھے، جن سے مولانا محمد اعظمی کو اخذِ فیض کی سعادت حاصل ہوئی۔ سند عالی کی وجہ سے مختلف مقامات سے علمائے کرام ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان سے سند و اجازہ حاصل کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ کویت کی وزارت اوقاف کی

دعوت پر کئی دفعہ وہاں تشریف لے گئے اور علما کی مجلس میں ان سے سندیں لی گئیں اور مختلف مجالس علمیہ میں ان کے سامنے حدیث کی جن کتابوں کی مکمل قراءت ہوئی وہ ہیں صحیح مسلم، مشکوٰۃ اور صحیح ابن خزیمہ۔ ان مجلسوں میں سے ہر مجلس میں پانچ سو سے چھے سو اہل علم نے شرکت کی، جن میں خواتین بھی شامل تھیں۔

مولانا نے مختلف اوقات میں نیپال، پاکستان، قطر، امارات، کویت اور سعودی عرب کے سفر کیے۔

۱۹۹۳ء میں اپنی زوجہ محترمہ کے ساتھ حج بیت اللہ کیا۔

ان کی ماشاء اللہ بارہ اولادیں ہیں، چھے بیٹے اور چھے بیٹیاں۔ سب تعلیم یافتہ ہیں۔ عالم، خطیب، مصنف، ڈاکٹر، انجینئر۔ اپنی اپنی جگہ سب خوش وخرم۔ سب شادی شدہ اور اصحابِ اولاد۔

مولانا اگرچہ جسمانی اعتبار سے نقاہت کا شکار ہیں اور ۸۰ سال کو پہنچ گئے ہیں لیکن خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے، امامت کراتے، درس قرآن دیتے اور سائلین کو مسائل بتاتے ہیں۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ صحت وتوانائی کے ساتھ ان کی زندگی دراز فرمائے اور وہ ہمیشہ خدمتِ دین میں مشغول رہیں۔ آمین یارب العالمین

(یہ سطور ۲۹۔ ستمبر ۲۰۱۲ء کو لکھی گئیں)

مولانا حافظ عبدالرحمٰن سلفی

(ولادت ۱۶ جنوری ۱۹۳۴ء)

مولانا حافظ عبدالستار دہلوی کے بیٹے اور مولانا عبدالوہاب دہلوی کے پوتے حافظ عبدالرحمٰن سلفی۔ ۱۶ جنوری ۱۹۳۴ء کو دہلی میں پیدا ہوئے اور متعدد جید اساتذہ کرام سے تحصیل علم کی، جن میں خود ان کے والد گرامی بھی شامل ہیں۔ اس خاندان کی علمی مساعی کا آغاز مولانا عبدالوہاب سے ہوا۔ وہ خاندانی طور پر ضلع جھنگ کے ایک گاؤں واسو آستانہ سے تعلق رکھتے تھے۔ کچھ عرصہ ضلع ملتان کے ایک قصبے میں بھی ان کی سکونت رہی۔ اس لیے انھیں مولانا عبدالوہاب ملتانی بھی کہا جاتا ہے۔

مولانا عبدالوہاب نے دہلی جا کر حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی سے تحصیل علم کی اور پھر وہیں اقامت گزین ہو گئے، اور انھیں مولانا عبدالوہاب دہلوی کہا جانے لگا۔ وہ جلیل القدر عالم اور معروف مقرر تھے۔ توحید کے موضوع پر نہایت مؤثر وعظ فرماتے تھے۔ دہلی میں انھوں نے ''مدرسہ دارالکتاب والسنہ'' کے نام سے تدریسی ادارہ قائم کیا، جس میں برصغیر کے مختلف مقامات کے بے شمار شائقین علم نے تعلیم حاصل کی۔ وہیں سے انھوں نے پندرہ روزہ ''صحیفہ اہل حدیث'' جاری کیا۔ جمعہ و جماعت اور وعظ و خطابت کی صورت میں بھی انھوں نے کتاب و سنت کی تبلیغ فرمائی۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ غرض انھوں نے اپنے انداز میں بہت سی دینی خدمات سرانجام دیں اور وہ جولائی ۱۹۳۲ء (رجب ۱۳۵۱ھ) میں سفر آخرت پر روانہ ہوئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ.

تقسیم ملک کے بعد ان کے صاحب زادہ گرامی مولانا حافظ عبدالستار صاحب جو درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں ان کے صحیح جانشین تھے، کراچی آ گئے تھے۔ کراچی میں ان کی دینی خدمات کے دائرے نے بڑی وسعت اختیار کی اور اس کے اثرات دور دور تک پہنچے۔ انھوں نے ۲۹ اگست ۱۹۶۶ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔

مولانا حافظ عبدالرحمٰن سلفی کا تعلق مولانا عبدالوہاب دہلوی کی تیسری نسل سے ہے اور یہ ان کی قائم کردہ ''جماعت غربا اہل حدیث'' کے تیسرے امام (یا امیر) ہیں اور حالات کے مطابق کتاب و سنت کی ترویج و اشاعت میں مشغول۔ ان کی سرپرستی میں کراچی سے پندرہ روزہ ''صحیفہ اہل حدیث'' بھی جاری ہے جو اس

دور میں قرآن وحدیث کی تبلیغ کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ کراچی میں جامعہ ستاریہ کے نام سے ایک تدریسی ادارہ بھی جاری ہے، جس میں بے شمار علماء وطلباء نے تعلیم حاصل کی اور متعدد اساتذہ وہاں تدریسی خدمت کی انجام دہی میں مصروف ہیں۔ پھر تصنیف وتالیف کی شکل میں بھی خوب کام ہو رہا ہے۔ اپنے بزرگوں کی طرح ان کا وعظ وخطابت کا سلسلہ بھی بہتر انداز سے جاری ہے۔

ایک بہت عمدہ کام ان حضرات کی کوشش سے یہ ہو رہا ہے کہ کئی اہم اردو کتابوں کا سندھی زبان میں ترجمہ کر دیا گیا ہے، جن میں مولانا حافظ عبدالستار دہلوی کا اردو ترجمہ قرآن اور فوائد ستاریہ، مولانا اسماعیل شہید دہلوی کی مشہور تصنیف تقویۃ الایمان، شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب کی معرکہ آرا تالیف کتاب التوحید خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ بھی متعدد کتب ورسائل کو سندھی زبان میں منتقل کیا گیا ہے اور سندھ کے لوگ اس سے استفادہ کر رہے ہیں۔ سندھی ترجمے کی خدمت مولانا امام الدین جونیجو نے انجام دی ہے۔ ان کے علاوہ اور اہل علم بھی ہوں گے جو اس کام میں دلچسپی لیتے ہوں گے۔

مولانا عبدالرحمٰن سلفی کو جماعتی حلقوں میں تو احترام کا مقام حاصل ہے ہی، دوسرے علمی حلقوں میں بھی انھیں تکریم کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور مقامی نوعیت کی اہل علم کی مجلسوں میں ان کی رائے کو اہمیت دی جاتی ہے۔ سرکاری سطح پر بھی کسی معاملے میں علماء کی مشاورت ضروری ہو تو اس میں انھیں دعوت شرکت دی جاتی اور ان کی آواز احترام کے ساتھ سنی جاتی ہے۔ غرض ہر حلقے میں اللہ کی مہربانی سے ان کو توقیر کا مقام حاصل ہے اور اپنی رائے ہر مجلس میں بلند آہنگی سے پیش کرتے ہیں۔ اس کی وجہ ان کا علم، ان کی صالحیت، ان کی دینی خدمات، ان کی رواداری، معتدل مزاجی، سب کے ساتھ حسن سلوک اور بلندیٔ اخلاق ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن سلفی کے اساتذہ کی فہرست میں جو رفیع المرتبت حضرات شامل ہیں، ان میں چند عالی قدر بزرگ یہ ہیں: ان کے والد گرامی مولانا حافظ عبدالستار دہلوی، مولانا عبدالجلیل خاں بلوچ، مولانا عبداللہ لائل پوری جھال خانوآنہ۔ مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی، علامہ خلیل عرب، ڈاکٹر عبدالواحد فیصل آبادی اور بعض دیگر علمائے کرام۔ درس نظامیہ کے علاوہ انھوں نے میٹرک تک سکول کی تعلیم حاصل کی۔

تکمیل تعلیم کے بعد ان کا سلسلہ تدریس بھی جاری رہا اور مدرسے کی نظامت بھی ان کے سپرد رہی۔

کراچی میں لڑکیوں کا دینی مدرسہ بھی انھوں نے جاری کیا ہے جس کا انتظام وانصرام انہی کے ذمے ہے۔

ماشاء اللہ بڑے باہمت عالم دین ہیں جو بہت سی ذمہ داریاں بہترین صورت میں ادا کر رہے ہیں۔

ان کی اولاد ایک بیٹی ہے اور تین بیٹے۔ بیٹوں کے نام ہیں: سعد سلفی، سعود سلفی اور فیصل سلفی۔ سب علمائے دین اور خدامِ کتاب وسنت ہیں۔ کہنا چاہیے کہ مولانا عبدالوہاب کی تیسری اور چوتھی نسل باقاعدگی سے

ہندوستان اور پاکستان میں قرآن وحدیث اور علوم دینیہ کے درس وتدریس کا فریضہ سرانجام دے رہی ہے۔

یہاں یہ بھی عرض کر دیں کہ پاکستان میں اہل حدیث کی کئی تنظیمیں قائم ہیں، یوں تو سب تنظیمیں اپنے اپنے انداز میں دینی خدمات میں مشغول ہیں۔ لیکن تنظیمی حیثیت سے درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور مختلف اہم کتابوں کے تراجم کی صورت میں جماعت غربائے اہل حدیث کی خدمات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس اعتبار سے اس کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے کہ یہ خدمت نسلاً بعد نسل ایک ہی خاندان کے اصحاب علم کی نگرانی میں انجام دی جا رہی ہے۔ اللہ ان سب کو خیر و عافیت سے رکھے۔ آمین۔

(یہ سطور ۲۷۔ مارچ ۲۰۱۳ء کو لکھی گئیں)

مولانا عبدالحمید ہزاروی

(ولادت ۱۹۳۴ء)

طویل قامت، نکھرا ہوا گندمی رنگ، شیریں کلام، نرم اطوار، اخلاقِ حسنہ کے مالک، پیکر متانت، سادہ مگر صاف ستھرا پیرہن یعنی شلوار قمیص، منجھے ہوئے مدرس، خوش بیان خطیب، آنکھوں میں حیا، دل میں خوفِ خدا، عمل میں تیز، حلم میں اپنی مثال آپ۔ یہ ہیں مولانا عبدالحمید ہزاروی۔ ان کے آبا و اجداد کی زندگی عجیب و غریب حالات کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ خود ان کے ابتدائی کوائفِ حیات بھی عجیب قسم کی منزلوں سے گزرے۔ آیے ان سب واقعات سے آگاہ ہونے کی سعی کرتے ہیں۔

مولانا عبدالحمید ہزاروی کے جس نسب نامے کا پتا چلا ہے، وہ یہ ہے: عبدالحمید بن عبدالحق بن امام الدین بن میاں حیات۔ اس نسب نامے کی رو سے ان کے پڑدادا کا نام میاں حیات تھا۔ میاں حیات دراصل دہلی کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے زمانے میں جب مغل حکومت ختم ہوگئی اور دہلی شہر انگریزوں کے قبضے میں آ گیا تو دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح انگریزی حکومت نے میاں حیات کو گرفتار کر لیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میاں حیات مغل دور میں کسی اہم سرکاری عہدے پر فائز رہے تھے اور ان کا شمار آخری مغل حکمران بہادر شاہ ظفر کے قریبی مصاحبوں میں ہوتا تھا۔ انگریزوں کا خیال یہ تھا کہ ان کے خلاف جو بغاوت ہوئی اور جنگ و جدال کا سلسلہ شروع ہوا، اس کی تفصیلات کا میاں حیات کو علم ہے۔ اس کی تہہ تک پہنچنے کے لیے انھیں دس مربعے زمین دینے کا وعدہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ بھی کچھ مراعات کی پیش کش کی گئی۔

یہ نہایت نازک وقت تھا۔ ایک طرف بہت بڑی پیش کش اور دوسری طرف سخت سزا کا اندیشہ۔ اب میاں حیات نے دہلی سے نکلنے کا منصوبہ بنایا، جس میں وہ کامیاب ہوئے اور اِدھر اُدھر کے چکر لگاتے ہوئے کسی طرح راولپنڈی پہنچ گئے۔ کچھ عرصہ وہاں رہے، پھر اس سے چند میل آگے ٹیکسلا کا قصد کیا۔ پورے ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تھا اور مشکوک لوگوں کو گرفتار کیا جا رہا تھا۔

میاں حیات کے نزدیک راولپنڈی کی بہ نسبت ٹیکسلا محفوظ جگہ تھی۔ ٹیکسلا میں کچھ اور لوگ بھی آ گئے تھے جو اس زمانے کی ترک حکومت کے باغی تھے۔ اب ان سب نے مشورہ کر کے کسی زیادہ محفوظ مقام پر جانے کا فیصلہ کیا۔ چناں چہ یہ لوگ ٹیکسلا سے نکلے اور ایبٹ آباد اور نتھیا گلی کے درمیان ایک مقام ”نملی میر“ میں

سکونت پذیر ہو گئے۔

ترکوں نے تو وہیں مستقل طور سے رہائش اختیار کر لی اور ان کی آل اولاد اب بھی وہیں ہے اور وہ جگہ ان کا اصل ٹھکانا قرار پا گئی ہے، لیکن میاں حیات نے وہاں رہنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ کسی اور محفوظ مقام کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ مختلف علاقوں میں گھومتے گھماتے، بالآخر کالا باغ کے نشیب میں دو پہاڑوں کے درمیان ایک مقام پر جا بسیرا کیا۔ وہاں آمد و رفت کے ذرائع اب بھی بہت مشکل ہیں، آج سے پونے دوسو سال قبل تو معلوم نہیں کس قدر دشوار ہوں گے۔ میاں حیات نے پوری زندگی یہیں دو پہاڑوں کے دامن میں گزار دی۔

میاں حیات کی اولاد چار بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کا نام امام الدین تھا۔ یہ بزرگ مولانا عبدالحمید ہزاروی کے دادا تھے۔ چھوٹے بیٹے کا نام عبدالرحیم تھا۔ دو بیٹے سرحد پار کی جماعت مجاہدین میں شامل ہو گئے تھے۔ یہ وہی جماعت ہے جسے مولانا اسماعیل شہید دہلوی اور سید احمد شہید کی جماعت کہا جاتا ہے۔ یہ جماعت آزادیٔ برصغیر اور قیامِ پاکستان تک انگریزی حکومت کے ساتھ برسر پیکار رہی۔

میاں حیات کی وفات کے بعد ان کے بیٹے امام الدین اپنے اہل و عیال سمیت ایک گاؤں ''مکول بالا'' چلے گئے تھے۔ امام الدین کی اولاد ایک بیٹا تھا اور ایک بیٹی۔ بیٹے کا نام عبدالحق تھا۔ یہ مولانا عبدالحمید ہزاروی کے والد گرامی تھے۔

امام الدین علوم دینیہ سے بہرہ ور تھے اور ان کے بیٹے عبدالحق بھی عالم دین تھے۔ ان باپ بیٹے کا اس ماحول کے مطابق اچھا خاصا کتب خانہ بھی تھا۔

مولانا عبدالحمید موضع مکول بالا نزد کالا باغ نتھیا گلی علاقہ گلیات میں ۱۹۳۴ء میں پیدا ہوئے۔ پیدائش سے چھٹے سال بعد ۱۹۴۰ء میں ان کے دادا امام الدین فوت ہو گئے اور نو سال کی عمر کو پہنچے تو ۱۹۴۳ء میں والد مکرم (عبدالحق) کا بھی انتقال ہو گیا۔

عبدالحق کی اولاد چار بیٹے تھے اور تین بیٹیاں۔ باپ کی وفات کے وقت یہ ساتوں بیٹے بیٹیاں کم عمر تھے۔ بیٹوں کے نام بالترتیب یہ ہیں: عبدالعزیز، عبدالحمید، عبدالمجید اور عبدالقیوم۔ گاؤں میں کوئی سرکاری سکول نہ تھا۔ تمام بہن بھائیوں نے بالکل ابتدائی عمر میں اپنے والد ہی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ عبدالحمید نے صرف دس پارے ناظرہ قرآنِ مجید پڑھا اور نماز پڑھنے کا طریقہ سیکھا اور نماز میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے، وہ یاد کیا۔ بعد ازاں بڑے بھائی عبدالعزیز اور چھوٹے بھائی عبدالمجید نے دینی تعلیم حاصل کی۔

اب دیکھتے ہیں کہ عبدالحمید کے دل میں تحصیل علم کا جذبہ کیوں کر ابھرا اور کب ابھرا......؟

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، ان کے باپ اور دادا عالم تھے اور ان کی جو تھوڑی بہت کتابیں الماریوں میں پڑی تھیں، وہ ہر وقت ان کی آنکھوں کے سامنے رہتی تھیں اور انھیں دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ ان کو پڑھنے والے باپ بیٹا تو اس دنیا سے رخصت ہو گئے، اب ان کا کیا مصرف ہے اور انھیں کون پڑھے گا......؟

اس جذبے نے دل میں شدت سے کروٹ لی تو حصولِ علم کا عزم کیا۔ حسن اتفاق سے اس وقت ان کے گاؤں میں مولوی محمد دین مجاہد خطابت و امامت کا فریضہ انجام دیتے تھے اور صوفی عبداللہ مرحوم و مغفور (بانی دارالعلوم اوڈاں والا اور جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن) کے ارادت مند تھے۔ عبدالحمید نے ان سے بات کی تو وہ انھیں صوفی صاحب کی خدمت میں اوڈاں والا (ضلع فیصل آباد) لے گئے اور اس مدرسے میں داخل کرادیے گئے۔ یہ ۱۹۴۴ء کی بات ہے۔ اس وقت عبدالحمید کی عمر گیارہ بارہ سال کی ہوگی۔ تعلیم ان کی بس یہی تھی، ناظرہ قرآنِ مجید کے دس پارے اور نماز پڑھنے کا طریقہ اور اس میں پڑھی جانے والی دعائیں۔

مدرسے کے نصاب اور طریق تعلیم کے مطابق انھیں پہلی جماعت میں داخل کیا گیا۔ پہلی جماعت کی کتابیں تھیں، علم صرف کی صرف بہائی، صرف میر اور ابواب الصرف، اور علم نحو کی نحو میر۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ تو معمولی اردو پڑھنا بھی نہیں جانتے تھے، لیکن یہاں فارسی اور عربی کتابیں پڑھنے کا معاملہ درپیش تھا۔ اپنے تمام ہم جماعت لڑکوں سے یہ کم علم تھے۔ لیکن خوب محنت کی، لکھنے کا طریقہ بھی سیکھا، اردو بھی پڑھنے لگے اور سالانہ امتحان میں ان لڑکوں کے برابر بلکہ بعض سے آگے رہے جو ان سے کچھ عرصہ پہلے سے یہ کتابیں پڑھ رہے تھے۔

پہلی جماعت کی کتابیں مولانا محمد صادق خلیل سے پڑھیں۔ اس زمانے میں مولانا محمد اسحاق چیمہ بھی وہاں پڑھاتے تھے، ان سے فصول اکبری اور بعض دیگر علوم و فنون کی کتابیں پڑھنے کا موقع ملا۔ پیر محمد یعقوب جہلمی سے جامع ترمذی کا درس لیا اور مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کچھ مہینے ۱۹۴۶ء کے اور کچھ مہینے ۱۹۴۷ء کے وہاں مدرس رہے تھے، ان سے سنن نسائی پڑھی۔ مولانا محمد یعقوب ملہوی سے صحیح مسلم اور مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی سے سنن ابی داؤد اور صحیح بخاری کی تکمیل کی۔ ان کے یہ تمام اساتذہ کرام سفرِ آخرت اختیار کر چکے ہیں۔ صوفی عبداللہ اور مولوی محمد دین مجاہد بھی یہ دنیا چھوڑ گئے ہیں۔ رحمہم اللہ تعالیٰ

مولانا عبدالحمید ہزاروی ۱۹۴۴ء میں اوڈاں والا گئے تھے اور چھے سال وہاں طالب علم کی حیثیت سے رہے۔ ۱۹۵۰ء میں اس دارالعلوم سے سندِ فراغت لی۔ ان کا شمار اس دارالعلوم کے ذہین اور محنتی طلبا میں ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دارالعلوم کے مہتمم صوفی عبداللہ صاحب ان پر بڑی شفقت فرماتے تھے اور انھوں نے دارالعلوم کے طلبا کی انتظامی ذمہ داریاں ان کے سپرد کر دی تھیں۔ طلبا بھی ان کا احترام کرتے تھے اور اساتذہ

بھی ان کی قابلیت کے معترف تھے۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد صوفی صاحب نے اسی دار العلوم کے لیے ان کی تدریسی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ صوفی صاحب بڑے مردم شناس تھے۔ وہ اپنے دار العلوم کے طلبا اور اساتذہ کی صلاحیتوں سے خوب آگاہ تھے۔ اگر کوئی طالب علم تدریس کے قابل ہوتا تو فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ انھیں وہیں مدرس مقرر کر لیتے۔ چناں چہ مولانا عبدالحمید ہزاروی کا بھی بہ طور مدرس یہیں تقرر کر لیا گیا، لیکن انھوں نے وہاں صرف ایک سال تدریسی خدمت سر انجام دی، جس میں کچھ عرصہ ۱۹۵۰ء کا شامل تھا اور کچھ عرصہ ۱۹۵۱ء کا۔ اس کے بعد ان کے وطن علاقہ ہزارہ کے بعض سرکردہ لوگ صوفی صاحب کی خدمت میں پہنچے اور اصرار کرنے لگے کہ انھیں اپنے وطن جانے کی اجازت دی جائے۔ وہاں ان کی زیادہ ضرورت ہے۔ اس علاقے کے ایک مشہور عالم مولانا عبداللہ صاحب جھنگڑوی مرحوم تھے، وہ بھی دیگر حضرات کے ساتھ صوفی صاحب سے ملے۔ ان کے اصرار پر صوفی صاحب نے اجازت دے دی اور مولانا عبدالحمید ہزاروی نے حویلیاں کے قریب جھنگڑا گاؤں کے مدرسے میں تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا لیکن یہ مدرسہ کامیاب نہ ہو سکا۔ مولانا ممدوح وہاں صرف ایک سال رہے۔ پھر جھنگڑا سے قریب کے ایک گاؤں ریالا تشریف لے گئے۔ وہاں کے مدرسے میں وہ تقریباً پانچ سال (۱۹۵۵ء تک) مصروفِ تدریس رہے۔

ریالا سے گوجراں والا کے مدرسہ محمدیہ میں چلے گئے۔ وہاں جانے کا پس منظر یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ نے مولانا عبداللہ مظفر گڑھی سے فرمایا کہ انھیں اپنے مدرسے کے لیے ایک مدرس کی ضرورت ہے۔ انھوں نے بتایا کہ مولانا عبدالحمید ہزاروی لائق مدرس ہیں۔ انھیں گوجراں والا لے جانے کی کوشش کریں۔ اسی اثنا میں حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کالا باغ کے ایک جلسے میں تشریف لے گئے تو وہاں مولانا عبدالحمید ہزاروی نے ان سے ملاقات کی۔ مولانا سلفی نے ان کو گوجراں والا آنے کی دعوت دی۔ یہ ۱۹۵۵ء کے آخر کی بات ہے۔ ان کے حکم کے مطابق مولانا عبدالحمید ہزاروی گوجراں والا چلے گئے۔ اس وقت مولانا سلفی طلبا کو تفسیر جامع البیان پڑھا رہے تھے۔ سلام دعا کے بعد مولانا سلفی نے ان سے فرمایا کہ آج ان طلبا نے یہاں تک مجھ سے پڑھا ہے، اس سے آگے آپ پڑھائیں۔ یہ کہہ کر وہ اسی وقت اپنی مسند سے اٹھے اور اس پر مولانا عبدالحمید ہزاروی کو بٹھایا۔ اس طرح مولانا عبدالحمید ہزاروی نے اس مدرسے میں طلبا کو تفسیر جامع البیان پڑھانے سے اپنی تدریس کا آغاز فرمایا۔

اس وقت وہاں طلبا کی تعداد کم تھی اور استاذ دو تھے، ایک مولانا عبداللہ صاحب مرحوم اور دوسرے یہی مولانا عبدالحمید ہزاروی۔ اس کے بعد مولانا عبداللہ صاحب نے اپنا الگ مدرسہ جاری کر لیا اور مدرسہ محمدیہ

میں مولانا عبدالحمید ہزاروی اکیلے رہ گئے۔ فروری ۱۹۶۸ء میں حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی وفات پا گئے تو مدرسہ محمدیہ بھی مولانا عبداللہ صاحب مرحوم کی نگرانی میں چلا گیا۔ اب ان دونوں مدرسوں کو ضم کر کے اس کا نام جامعہ محمدیہ رکھ دیا گیا۔

یہ ایک الگ معاملہ ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ جامعہ محمدیہ ایک بہت بڑے دار العلوم کی حیثیت سے طویل مدت سے جی ٹی روڈ پر جاری ہے اور یہ مولانا عبداللہ مرحوم و مغفور کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس میں اچھی خاصی تعداد میں طلبا تعلیم حاصل کرتے ہیں اور متعدد اساتذہ ان کو تعلیم دینے کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ مولانا عبدالحمید ہزاروی ۱۹۵۵ء میں اس درس گاہ سے وابستہ ہوئے اور اب تک باقاعدگی سے وہاں پڑھا رہے ہیں اور جامعہ محمدیہ کے منصب شیخ الحدیث پر فائز ہیں۔

مولانا عبدالحمید ہزاروی کے اساتذہ کا ذکر گزشتہ سطور میں آ چکا ہے۔ اب ان کے تلامذہ کے متعلق سنیے......!

مولانا ممدوح ۱۹۵۰ء میں اوڈاں والا سے فارغ التحصیل ہوئے۔ ایک سال انھوں نے دار العلوم اوڈاں والا میں تدریس کی۔ تقریباً پانچ سال موضع ریالا کے مدرسے میں مدرس رہے۔ اس کے بعد گوجراں والا تشریف لے آئے۔ یہ سطور ۱۶- جون ۲۰۱۳ء کو لکھی جا رہی ہیں۔ اس حساب سے اب تک ان کی تدریسی زندگی کم و بیش ساٹھ سال کا سفر طے کر چکی ہے۔ اس اثنا میں ان سے ہزاروں طلبا نے تعلیم حاصل کی جو اللہ کی مہربانی سے مختلف مقامات میں خطابتی اور تدریسی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ حضرات پاکستان سے باہر بھی بعض ممالک میں تبلیغی فرائض ادا کر رہے ہیں۔ ان کثیر التعداد تلامذہ میں سے چند حضرات کے اسمائے گرامی ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں:

اوڈاں والا میں مولانا محمد علی جانباز (سیالکوٹ) اور مولانا عبدالغفور ناظم آبادی (فیصل آباد) ان کے دائرۂ شاگردی میں داخل ہوئے۔ گوجراں والا میں جن حضرات نے ان سے استفادہ کیا، ان میں سے چند حضرات یہ ہیں:

حافظ عبدالمنان نور پوری، پروفیسر ڈاکٹر فضل الٰہی اسلام آباد، مولانا عبدالعزیز حنیف اسلام آباد، ڈاکٹر حافظ عبدالکریم ناظم اعلیٰ مرکزی جمعیت اہل حدیث، مولانا محمد شریف چنگوانی ناظم مرکز ابن القاسم الاسلامی ملتان، حافظ محمد شریف فیصل آباد، حافظ عبداللہ لوکو ورکشاپ مغل پورہ لاہور، حافظ محمد امین مہتمم دار العلوم تقویۃ الاسلام اوڈاں والا ضلع فیصل آباد، مولانا ذوالفقار علی الشریعہ کالج اقبال ٹاؤن لاہور، حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی مدرس جامعہ سلفیہ و ایڈیٹر ترجمان الحدیث فیصل آباد، مولانا محمد جاوید سیالکوٹی، مولانا حافظ عبدالغفار روپڑی ناظم

جامعہ قدس لاہور، مولانا حافظ عبدالوہاب روپڑی مدرس جامعہ قدس لاہور، مولانا عبدالحی عابد شیخ الحدیث جامعہ محمدیہ عام خاص باغ ملتان، حافظ عبدالکریم سابق شیخ الحدیث جامعہ محمدیہ خان پور، حافظ محمد رفیق مدرس عام خاص باغ ملتان۔ ان کے علاوہ بھی بے شمار حضرات نے مولانا ممدوح کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیے۔

تدریس کے علاوہ مولانا عبدالحمید ہزاروی فتویٰ نویسی اور خطابت کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں۔ انھوں نے حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کی نگرانی میں فتویٰ نویسی کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ بعد ازاں حضرت حافظ محمد گوندلوی کی زیرنگرانی فتوے تحریر فرماتے رہے۔ یعنی فتویٰ مولانا عبدالحمید ہزاروی لکھتے تھے اور اسے اپنے دستخط سے جاری حضرت حافظ صاحب فرماتے تھے۔ حضرت حافظ صاحب کی وفات کے بعد خود مولانا عبدالحمید ہزاروی نے بے شمار فتوے تحریر فرمائے۔

۱۹۶۹ء میں مولانا ہزاروی نے گوجراں والا کی ایک مسجد اہل حدیث میں خطبہ جمعہ دینا شروع کیا جو اب تک باقاعدگی سے جاری ہے۔

جامعہ محمدیہ کی تدریس کے بعد مولانا ممدوح جامعہ محمدیہ للبنات کنگنی والا میں بچیوں کو دینی تعلیم دیتے ہیں۔ مدرسہ للبنات کھیالی میں بھی وہ بچیوں کو پڑھاتے رہے ہیں۔

مولانا ممدوح کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ انھوں نے ابتدائی جماعت سے آخری جماعت تک ایک ہی مدرسے (دار العلوم تعلیم الاسلام اوڈاں والا) میں تعلیم حاصل کی اور گزشتہ پچپن چھپن سال سے ایک ہی دار العلوم (جامعہ محمدیہ گوجراں والا) میں طلبا کو تعلیم دے رہے ہیں۔

مولانا عبدالحمید ہزاروی سے متعلق یہ معلومات مجھے حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی کی وساطت سے حاصل ہوئی ہیں۔ وہ جون ۱۹۸۶ء سے مارچ ۱۹۹۳ء تک سات سال ان کے حلقہ درس میں رہے اور پہلی جماعت سے صحیح بخاری تک مروجہ نصاب کی تمام کتابیں ان سے پڑھیں۔ ان کے بقول مولانا ممدوح طلبا کے لیے نہایت شفیق اور بے حد مہربان ہیں۔

وہ نہ کسی طالب علم کو جھڑکتے ہیں، نہ ڈا ٹ ہیں۔ اگر کسی کو کوئی شرارت کرتا یا اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا دیکھتے ہیں تو اس وقت اسے کچھ نہیں کہتے۔ دوسرے دن جب وہ ان کے سامنے پڑھنے کے لیے آتا ہے تو موقع کی مناسبت سے یا تو اسے یہ فرماتے ہیں کہ تم ذہین اور محنتی طالب علم ہو، تمھاری توجہ پڑھنے لکھنے کی طرف رہنی چاہیے۔ یا اس کے لیے اس قسم کے الفاظ استعمال فرماتے ہیں کہ اگر اِدھر اُدھر گھومتے رہو گے اور شرارتوں میں وقت ضائع کرو گے تو تعلیم کیسے حاصل کرو گے۔ بے حد نرمی اور شفقت کے باوجود طلبا پر ان کا بڑا رعب ہے۔

صوفی عبداللہ مرحوم ومغفور کا یہ نقطہ نظر تھا کہ جب بھی کوئی طالب علم مدرسے میں داخلے کے لیے آئے،

اسے داخل کر لینا چاہیے۔ اگر تعلیمی سال کے آخر میں آئے تو بھی داخلے سے انکار نہ کرو اور یہ نہ کہو کہ آئندہ سال آنا۔ وہ کچھ نہ کچھ تو پڑھے گا اور اسے تھوڑی بہت دین کی سمجھ آئے گی۔ ایسا نہ ہو کہ ہم اسے داخل کرنے سے انکار کر دیں اور وہ غلط کاموں میں مشغول ہو جائے۔ مولانا عبدالحمید ہزاروی بھی حتی الامکان طلبا کو اسی قسم کی رعایتیں دینے کے عادی ہیں۔

شروع سے آخر تک ہر جماعت کی کوئی نہ کوئی کتاب مولانا عبدالحمید ہزاروی پڑھاتے ہیں۔ اس طرح چھوٹے بڑے تمام درجوں کے طلبا پر ان کی نظر رہتی ہے۔ انھیں معلوم ہے کہ کون طالب علم کس قابلیت کا مالک ہے۔ یہ بہت اچھا طریقہ ہے جو مولانا ممدوح نے اختیار فرمایا ہے۔ بالعموم بڑے اساتذہ چھوٹے درجوں کی کتابیں نہیں پڑھاتے، وہ انتہائی جماعتوں کے طلبا کو پڑھاتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ابتدائی درجوں کے طلبا بڑے اساتذہ کی نگرانی سے محروم رہتے ہیں، لیکن مولانا ممدوح نے جو سلسلہ جاری فرمایا ہے، اس کی وجہ سے تمام طلبا کی قابلیت سے متعلق وہ پورا علم رکھتے ہیں۔

یہاں یہ عرض کریں کہ کچھ لوگ تو (اگرچہ وہ کسی علاقے سے تعلق رکھتے ہوں) فطری اور طبعی طور پر نرم دل اور ہم دردِ خلائق ہوتے ہیں، اور کچھ علاقے بھی ایسے ہیں جہاں کے لوگوں کے دلوں میں نرمی پائی جاتی ہے۔ جہاں تک میرا تجربہ ہے ہزارہ کی طرف کے زیادہ تر لوگ نرم خو ہیں۔ اس نواح کے جن حضرات سے میرا تھوڑا یا زیادہ تعلق رہا ہے، میں نے انھیں نرم خو پایا ہے۔ سختی اور تشدد کا مادہ میرے خیال میں ان میں نہیں ہے۔ مولانا عبدالحمید ہزاروی کو بھی اللہ تعالیٰ نے ہم دردی اور نرمی کی خصوصیت سے نوازا ہے۔ پھر علم و عمل کی نعمت عظمیٰ نے بھی انھیں نرمی اور ہم دردی کا خوگر بنا دیا ہے۔

ان کا قافلہ عمر ثمانین کی منزل کو پہنچ گیا ہے، لیکن وہ ماشاء اللہ جوانوں کی طرح طلبا کو درس دیتے اور ہر عمل خیر میں سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہم عاجز بندوں کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی زندگی میں برکت عطا فرمائے اور وہ اخلاص کے ساتھ کتاب و سنت کی خدمت میں مصروف رہیں۔

(یہ سطور ۱۶۔ جون ۲۰۱۳ء کو لکھی گئیں)

مولانا عبدالحنان فیضی

(ولادت دسمبر ۱۹۳۴ء)

ہندوستان کے صوبہ یوپی کے ضلع سدھارتھ نگر کی تحصیل شہرت گڑھ کا ایک قصبہ نما گاؤں ''انتری بازار'' ہے، جسے محمود واگرانٹ بھی کہا جاتا ہے۔ اس گاؤں کو متعدد علمائے دین کے مولد و مسکن ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ یہ علما مسلک اہل حدیث سے تعلق رکھتے ہیں اور توحید و سنت کی تبلیغ و اشاعت ہمیشہ ان کا اصل مقصد رہا ہے۔ اس علاقے کے موضع یوسف پور میں پہلا دینی ادارہ ''مدرسہ دارالہدیٰ'' کے نام سے حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے ایک شاگرد مولانا عباداللہ نے جاری کیا تھا، اس کے بعد دوسرا تدریسی ادارہ ''مدرسہ بحرالعلوم'' موضع ''انتری بازار'' میں قائم کیا گیا۔ اس مدرسے میں مختلف اوقات میں بہت سے علمائے کرام نے خدماتِ تدریس انجام دیں اور بے شمار شائقینِ علم نے ان سے استفادہ کیا۔ یہ سلسلہ اللہ کی مہربانی سے اب بھی جاری ہے۔

موضع انتری بازار میں ۱۹۰۲ء کے آس پاس ایک عالم دین مولانا محمد زمان رحمانی پیدا ہوئے، جن کی تدریسی اور تبلیغی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انھوں نے ۱۶۔ اپریل ۱۹۷۸ء کو وفات پائی۔ زیرِ تذکرہ بزرگ مولانا عبدالحنان سلفی انہی مولانا محمد زمان سلفی کے صاحب زادۂ گرامی قدر ہیں جن کی ولادت رمضان المبارک ۱۳۵۳ھ (دسمبر ۱۹۳۴ء) میں ہوئی۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں انتری بازار کے مدرسہ بحر العلوم میں منشی علمدار مرحوم سے حاصل کی۔ پھر ۱۹۴۷ء میں ششہنیاں چلے گئے، جہاں اس وقت ان کے والد مولانا محمد زمان کا سلسلہ تدریس جاری تھا۔ انھوں نے وہاں اپنے والد کے سامنے بھی زانوے شاگردی تہہ کیے۔ ان کے علاوہ دیگر مدرسین مولانا عبدالجلیل رحمانی اور مولانا عبدالقدوس ٹکریاوی سے بھی عربی اور فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔

۱۹۴۹ء میں مولانا عبدالرؤف رحمانی کی دعوت پر مولانا محمد زمان رحمانی جامعہ سراج العلوم جھنڈا نگر (نیپال) تشریف لے گئے تو عبدالحنان بھی والد محترم کے ساتھ وہاں چلے گئے۔ جامعہ سراج العلوم میں انھوں نے اپنے والد سے بھی استفادہ کیا اور ان کے علاوہ انھیں وہاں مولانا عبدالرؤف رحمانی اور مولانا عبدالرحمٰن بجواوی سے بھی اخذِ فیض کی سعادت حاصل ہوئی۔ انہی دنوں مولانا عبدالغفور بسکوہری بہ طور مدرس ان کے

گاؤں کے "مدرسہ بحر العلوم" میں تشریف لے گئے تو ان کے والد نے ان کو گاؤں بھیج دیا۔ مولانا عبدالغفور بسکوہری ان کے والد مکرم کے بھی استاذ تھے اور اس دور کے مشاہیر اساتذہ میں شمار کیے جاتے تھے۔ لیکن یہ زیادہ عرصہ مولانا بسکوہری کے حلقۂ درس میں نہیں رہے، جلد ہی واپس جامعہ سراج العلوم چلے گئے، جہاں یہ دو سال رہے اور مختلف فنون کی چند کتابیں وہاں پڑھیں۔ پھر مدرسہ فیض عام مئوناتھ بھنجن تشریف لے گئے۔ یہاں انھوں نے مولانا محمد احمد، مولانا عبداللہ شائق مئوی، مولانا شمس الحق سلفی، مولانا مصلح الدین اعظمی، مولانا عبدالمعید بنارسی، مولانا عبدالرحمٰن نحوی، مفتی حبیب الرحمٰن مئوی۔ مولانا عظیم اللہ مئوی اور بعض دیگر اساتذہ سے اخذِ فیض کیا۔ مدرسہ فیض عام میں یہ چھے برس رہے اور ۱۹۵۸ء میں اسی مدرسہ سے فارغ التحصیل ہوئے اور فیضی کی نسبت سے شہرت پائی۔ ان کے رفقاے درس کی فہرست میں مولانا امان اللہ بہاری، مولانا مظہر احسن ازہری اور مولانا حقیق اللہ نیپالی کے نام شامل ہیں۔ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری، مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری اور ڈاکٹر عبدالعلی بھی اس زمانے میں مدرسہ فیض عام میں تحصیلِ علم کر رہے تھے۔ لیکن ان سے ایک دو سال پیچھے تھے۔

جس زمانے میں مولانا عبدالحنان نے مدرسہ فیض عام سے فراغت پائی اور سند لی اس زمانے میں ہندوستان کی تعلیم گاہوں کے فارغ التحصیل ذہین طلبا اعلیٰ تعلیم کے لیے مصر کی جامعہ ازہر میں داخلہ لیا کرتے تھے۔ ان کے بعض رفقاے درس بھی وہاں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنے والد مولانا محمد زمان رحمانی سے وہاں جانے کی خواہش کا اظہار کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں تمھیں جامعہ ازہر بھیج سکوں۔ نہ میں اس کے لیے کسی سے قرض لے سکتا ہوں اور نہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلا سکتا ہوں۔ اس طرح وسائل کی عدم دست یابی کی وجہ سے ان کی جامعہ ازہر جانے کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔

مدرسہ فیض عام سے فراغت اور حصولِ سند کے بعد انھوں نے تدریس کا آغاز "مدرسہ اسلامیہ" (کوٹلہ باسہ ضلع بلرام پور) سے کیا۔ قصبہ کوٹلہ باسہ نیپال اور ہندوستان کی سرحد پر واقع ہے۔ ۱۹۵۸ء میں یہ ایک مشہور تجارتی قصبہ تھا، جس میں مسلمان تاجر بہت بڑی تعداد میں آباد تھے اور یہاں تجارتی اور کاروباری رونق رہتی تھی، لیکن اب اس کی یہ رونقیں ماند پڑ گئی ہیں۔

مولانا عبدالحنان کوٹلہ باسہ کے مدرسہ اسلامیہ میں صرف ایک سال رہے۔ یہاں سے وہ بنارس تشریف لے گئے اور وہاں کے مدرسہ سعیدیہ میں خدمتِ تدریس انجام دی۔

۱۹۶۴ء کے آس پاس وہ مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈانگری کی دعوت پر جامعہ سراج العلوم (جھنڈا نگر) چلے گئے۔ ۱۹۷۴ء تک گیارہ سال اس جامعہ میں ان کا قیام رہا۔ اس اثنا میں وہاں متعدد جلیل القدر

اساتذہ نے تدریسی خدمات سرانجام دیں، جن میں ان کے والد محترم مولانا محمد زمان رحمانی بھی شامل تھے۔ ان کے علاوہ مولانا محمد رئیس ندوی، مولانا قطب اللہ رحمانی ندوی، ڈاکٹر محفوظ الرحمٰن مدنی، مولانا عبدالحلیم ماہر، مولانا مختار احمد مدنی اور مولانا محمد مستقیم سلفی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

گیارہ سال کے اس عرصے میں مولانا عبدالحنان فیضی کچھ عرصہ جامعہ سراج العلوم کے صدر مدرس بھی رہے، شعبہ افتا بھی ان کے سپرد رہا اور مکتبے کی نگرانی بھی کرتے رہے۔ انھوں نے ہر ذمہ داری نہایت محنت اور توجہ سے نبھائی۔

۱۹۷۴ء میں وہ جامعہ سلفیہ (بنارس) کے اربابِ اہتمام کی دعوت پر بنارس چلے گئے۔ وہاں تفسیر بیضاوی، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد کی تدریس ان کے ذمے لگائی گئی۔ اس کے ساتھ ہی منطق اور عربی ادب کی بعض کتابیں بھی وہ پڑھاتے تھے۔ جامعہ سلفیہ میں تدریس کا فریضہ ادا کرتے ہوئے چار سال ہوئے تھے کہ انھیں والد مکرم مولانا محمد زمان رحمانی کی شدید بیماری کی اطلاع پہنچی اور وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کے بغیر والد کی خدمت کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اس طرح مجبوراً انھیں جامعہ سلفیہ کی تدریس چھوڑنا پڑی۔ ایک اور معاملہ یہ پیش آیا کہ خود مولانا عبدالحنان فیضی کو اختلاج اور بلڈ پریشر کا عارضہ لاحق ہوگیا...... اسی اثنا میں ۱۶۔ اپریل ۱۹۷۸ء کو مولانا محمد زمان رحمانی انتقال کر گئے۔

والد کی وفات کے بعد مولانا عبدالرؤف رحمانی کی دعوت پر ۱۹۷۸ء میں مولانا عبدالحنان فیضی دوبارہ جامعہ سراج العلوم تشریف لے گئے۔ اس وقت سے اب تک (تقریباً ۳۵ برس سے) وہ اسی جامعہ میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ کئی سال وہ شیخ الجامعہ کے منصب عالی پر فائز رہے۔ انھوں نے جن کتابوں کی تدریس کی، وہ ہیں صحیح بخاری، تفسیر بیضاوی اور اس قسم کی بہت سی اہم کتابیں۔ وہ کم وبیش ۵۵ سال سے درس وتدریس میں مشغول ہیں۔ اس طویل مدت میں انھوں نے حدیث کی بلوغ المرام سے لے کر صحیح بخاری تک، علم صرف کی صرف بہائی سے شافیہ تک، علم نحو کی نحو میر سے شرح جامی تک تمام کتابیں کئی کئی مرتبہ پڑھائیں۔ اسی طرح قرآن مجید کی تفسیروں کی جو درس نظامی میں شامل ہیں اور عربی ادب اور عقیدہ وغیرہ کے موضوع کی تمام کتابوں کی تدریس کی۔ فقہ، اصول اور اصول حدیث کی کتابیں بھی متعدد مرتبہ پڑھانے کے مواقع ملے۔ جامعہ سراج العلوم کے شعبہ بنات کلیہ عائشہ صدیقہ میں بھی وہ صحیح بخاری اور تفسیر وحدیث کی بڑی بڑی کتابوں کی تدریس فرماتے رہے۔

وہ کامیاب مدرس ہیں۔ ان کے طریق تدریس سے طلبا نہایت مطمئن ہیں۔ وہ آسان انداز سے طلبا کی ذہنی سطح کے مطابق درس دیتے ہیں۔

تدریس کے علاوہ ان کی خطابت کا بھی خاص اسلوب ہے۔ وہ سامعین کے فہم اور ان کی قابلیت کی روشنی میں ان سے مخاطب ہوتے ہیں۔ مشکل اور دقیق الفاظ کے بجائے آسان زبان میں انھیں سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ابلاغ اسی طریق تفہیم کا نام ہے کہ ہر بات آسانی سے سامعین کے ذہن میں اتر جائے اور وہ اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کریں۔

مولانا عبدالحنان فیضی جامعہ سراج العلوم (جھنڈانگر) میں فتویٰ نویسی کی خدمت بھی انجام دیتے ہیں۔ ان کے جاری کردہ فتاویٰ کا مجموعہ کئی ضخیم رجسٹروں پر مشتمل ہے جو ان کے صاحب زادے مولانا عبدالمنان سلفی نے فقہی انداز میں مرتب کر دیا ہے۔ وہ اسے شائع کرنا چاہتے ہیں۔

مولانا عبدالحنان فیضی نے مختلف مدارس میں جن اساتذہ کرام سے تعلیم حاصل کی ان کے اسمائے گرامی گزشتہ سطور میں خوانندگانِ محترم کے مطالعہ میں آئے۔ اب ذیل میں ان کے چند تلامذہ کے نام ملاحظہ ہوں:

ڈاکٹر رضاء اللہ مبارک پوری، مولانا محمد مستقیم سلفی جامعہ سلفیہ بنارس، مولانا عبدالباری مدنی استاذ جامعہ امام محمد بن سعود الاسلامیہ ریاض سعودی عرب، مولانا صلاح الدین مقبول احمد کویت، جناب محمد عزیر شمس مکہ مکرمہ، ڈاکٹر اقبال احمد نملی مالیگاؤں، مولانا عبدالمعید مدنی علی گڑھ، مولانا عبدالقیوم سلفی قطر، مولانا عبداللہ مدنی جھنڈا نگری، ڈاکٹر وصی اللہ مدنی، ڈاکٹر الطاف الرحمٰن مدنی، مولانا عبدالواحد مدنی، حافظ محمد الیاس ریاض۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مولانا عبدالحنان فیضی کو صحت و عافیت سے نوازے رکھے اور وہ کتاب و سنت کی خدمت میں مشغول رہیں۔ آمین

(یہ سطور ۲۸ مئی ۲۰۱۳ء کو لکھی گئیں)

ملک عبدالرشید عراقی

(ولادت ۱۰۔ نومبر ۱۹۳۵ء)

صحیح طور سے یاد نہیں کہ عبدالرشید عراقی سے پہلی ملاقات کب ہوئی۔ بس اتنا یاد ہے کہ جب ان سے ملاقات ہوئی ان کا چہرہ بالوں سے آزاد تھا اور وہ ان کی جوانی کا زمانہ تھا۔ کشیدہ قامت، مناسب خدوخال، کھلی پیشانی اور خوب رو جوان۔ اب کئی سال سے ان کی سفید داڑھی پورے آب و تاب سے چہرے پر لہرا رہی ہے۔

عراقی صاحب ۱۰۔ نومبر ۱۹۳۵ء کو سوہدرہ (ضلع گوجراں والا) میں پیدا ہوئے۔ ککے زئی برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۱۹۵۲ء میں میٹرک پاس کیا اور ۱۹۵۵ء میں ادیب عالم۔ مولانا علم الدین مرحوم سے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھا اور حدیث کی ابتدائی کتاب بلوغ المرام بھی انہی سے پڑھی۔ مشکوۃ شریف کا کچھ حصہ مولانا عبدالمجید سوہدروی سے پڑھا اور باقی کتاب ان کے مرحوم فرزند حافظ محمد یوسف سے پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ریاض الصالحین کا درس مولانا عبدالسلام ہزاروی سے لیا اور دینی تعلیم کا سلسلہ اختتام کو پہنچا۔

مغربی پاکستان طبی کانفرنس کا دفتر لاہور میں تھا۔ ۱۹۵۵ء میں اس کے آفس سیکرٹری کے طور پر ملازمت کرنے لگے۔ اس سے تین سال قبل ۱۹۵۲ء میں مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے رابطہ ہوا تو ان کے کہنے سے ماہنامہ ''معارف'' (اعظم گڑھ) اور ماہنامہ ''برہان'' (دہلی) دو رسالے اپنے نام جاری کرائے اور ان کا باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا۔ پھر مضمون نویسی کا شوق پیدا ہو گیا۔ پہلا مضمون پندرہ روزہ ''اہل حدیث'' (دہلی) میں ''روزہ ڈھال ہے'' کے عنوان سے چھپا۔ دوسرا مضمون بہ عنوان ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں شائع ہوا۔ اس کے بعد پاکستان کے بہت سے رسائل و جرائد میں ان کے مضامین کی اشاعت ہوئی۔ اگرچہ وہ ہر موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہیں لیکن اکثر مضامین کا تعلق شخصیات سے ہوتا ہے۔ تصانیف کا بھی زیادہ تر تعلق اسی موضوع سے ہے۔

ملک عبدالرشید عراقی کی زندگی کا طویل عرصہ بینک کی ملازمت میں گزرا۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ تحریر و نگارش کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔

ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد اپنے آپ کو تصنیف و تالیف کے لیے وقف کر دیا۔ ذیل میں ان کی

تصانیف کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ تذکرہ ابوالوفا: اس کتاب میں حضرت مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری کے حالات، مناظرات اور ان کی تصانیف کا تذکرہ کیا گیا ہے۔۱۹۸۴ء میں چھپی۔ ۷۶ اصفحات پر مشتمل ہے۔

۲۔ تذکرہ بزرگانِ علوی سوہدرہ: یہ کتاب مولانا غلام نبی سوہدروی، مولانا عبدالحمید، مولانا عبدالمجید خادم سوہدروی، حافظ محمد یوسف، حافظ عبدالوحید اور حکیم محمد ادریس کے حالاتِ زندگی اور ان کی تصنیفی خدمات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ طباعت ۱۹۸۷ء صفحات ۱۲۸۔

۳۔ برصغیر پاک و ہند میں علمائے اہل حدیث کی تفسیری و حدیثی خدمات: اس کتاب کے مندرجات کا اس کے نام سے پتا چل جاتا ہے۔ صفحات ۸۸۔

۴۔ برصغیر میں اہل حدیث کی تفسیری خدمات: صفحات ۴۰

۵۔ سیرت ائمہ اربعہ: اس میں امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل ﷭ کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ صفحات ۴۸۔

۶۔ مؤلفین صحاح ستہ اور ان کے علمی کارنامے: کتاب کے موضوع کا علم اس کے نام سے ہو جاتا ہے۔ صفحات ۹۲۔

۷۔ ادیانِ باطلہ کی تردید میں علمائے اہل حدیث کی خدمات: یعنی عیسائیوں، آریہ سماجیوں اور قادیانیوں کی تردید میں علمائے اہل حدیث کی تصانیف۔ صفحات ۸۰۔

۸۔ امام ابن تیمیہ: شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ اور ان کے چار مشہور تلامذہ حافظ ابن قیم، حافظ ابن عبدالہادی، حافظ ابن کثیر اور حافظ ذہبی کے مختصر حالات اور علمی کارنامے۔ صفحات ۴۸

۹۔ شاہ ولی اللہ دہلوی: اس کتاب میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے چار بیٹوں شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی کے علاوہ شاہ اسماعیل شہید، شاہ محمد اسحاق اور سید میاں نذیر حسین دہلوی کے حالات اور ان کی تصنیفی و تدریسی خدمات کا ذکر کیا گیا ہے۔ صفحات ۱۲۸

۱۰۔ تذکرہ محدث روپڑی: یعنی مولانا حافظ عبداللہ محدث روپڑی کے حالات اور ان کے مشہور اساتذہ و تلامذہ کا تذکرہ اور حضرت حافظ صاحب کی تصانیف کا تعارف۔ صفحات ۵۴۔

۱۱۔ دو روشن ستارے: حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ عبدالحق محدث دہلوی کے کوائفِ حیات اور ان کے علمی کارنامے۔ صفحات ۱۲۴۔

۱۲۔ کاروانِ حدیث: بیالیس نامور اہلِ علم کے حالات اور کارنامے۔ صفحات ۳۶۰

۱۳۔ تذکرہ محدث وزیر آبادی: استاذِ پنجاب حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کے حالات اور ان کے تین مشہور اساتذہ، بارہ معاصرین اور دس ممتاز تلامذہ کا تذکرہ۔ صفحات ۱۱۸۔

۱۴۔ عظمت حدیث: حجیتِ حدیث، کتابتِ حدیث، تدوینِ حدیث، تاریخ حدیث اور مؤلفین صحاح ستہ کا تذکرہ۔ صفحات ۷۰۔

۱۵۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری کی تصنیفی خدمات۔ صفحات ۱۴۸۔

۱۶۔ عظمت و رفعت کے مینار: یہ کتاب انبیائے کرام، صحابہ کرام، تابعینِ عظام، تبع تابعین، ائمہ اربعہ، محدثین اور خادمین حدیث کے تذکار پر مشتمل ہے۔ صفحات ۲۴۲۔

۱۷۔ برصغیر پاک و ہند میں علمائے اہل حدیث کے علمی کارنامے: کتاب کے مشمولات کا اندازہ اس کے نام سے ہو جاتا ہے۔ اس میں ۴۳ علمائے اہل حدیث کی مختلف علمی خدمات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

۱۸۔ خلفائے راشدین: یہ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کے واقعاتِ حیات پر مشتمل ہے۔ کتاب کے آخر میں حضرت معاویہ اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ صفحات ۷۵۶

۱۹۔ مولانا ابوالکلام آزاد: یعنی مولانا آزاد کی شخصیت و خدمات کا بیان۔ صفحات ۱۲۵

۲۰۔ اہل حدیث کے چار مراکز: اس میں اہل حدیث کے چار مراکز کا ذکر ہے۔ سیاسی مرکز پٹنہ، تدریسی مرکز دہلی، روحانی مرکز امرتسر اور علمی مرکز بھوپال۔ صفحات ۹۸۔

۲۱۔ اہل حدیث کی دعوت: صفحات ۱۶۔

۲۲۔ حدیث کی نشر و اشاعت میں اہل حدیث کی خدمات: صفحات ۱۵۹۔

۲۳۔ خاندان شاہ ولی اللہ کی تصنیفی خدمات: صفحات ۱۴۴

۲۴۔ غزنوی خاندان: جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس میں خاندانِ غزنویہ کے علمائے کرام کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ صفحات ۱۶۰

۲۵۔ امام ابن تیمیہ اور ان کے تلامذہ: صفحات ۱۳۲

۲۶۔ چالیس علمائے اہل حدیث: ۴۲۲

۲۷۔ سید سلیمان ندوی: کتاب کے مشتملات کا اس کے نام پتا چل جاتا ہے۔ صفحات ۱۰۲

۲۸۔ تذکرۃ النبلاء فی تراجم العلماء: یہ کتاب متعدد علمائے کرام کے حالات کا مجموعہ ہے۔ صفحات ۴۱۶

۲۹۔ مقام حدیث: صفحات ۱۱۶

۳۰۔ اسلام میں سنت کا مقام: صفحات ۴۸

۳۱۔ تذکرۂ اسلاف: صفحات ۴۰

۳۲۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز: یہ کتاب اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حالات پر محیط ہے۔ صفحات ۲۰۰

۳۳۔ جامعینِ حدیث: صفحات ۱۴۳

۳۴۔ سیرت امام احمد بن حنبل: صفحات ۱۱۲

ان کتابوں کے علاوہ بھی عراقی صاحب نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں سے بعض مطبوعہ ہیں اور بعض غیر مطبوعہ۔ ان کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد پچاس سے زیادہ ہوگی۔ بعض کتابوں کے مسودات ناشروں نے گم کر دیے۔ متعدد مصنفوں کی کتابوں پر انھوں نے تقریظات لکھیں۔ بہت سی کتابوں پر تبصرے کیے۔ ماشاءاللہ وہ لکھنے میں تیز ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کا حامی و ناصر ہو۔

عراقی صاحب کہیں سوہدرہ سے باہر جائیں تو ان کے دوست جناب ابوعمر عبدالعزیز ایم اے سوہدروی بالعموم ان کے رفیقِ سفر ہوتے ہیں۔ ملنسار اور خوش کلام۔ قلم و قرطاس سے بھی رابطہ رکھتے ہیں۔ اس خاک نشین کے غریب خانے پر بھی وہ عراقی صاحب کی رفاقت میں کئی دفعہ تشریف لائے۔

بارگاہِ الٰہی میں دعا ہے کہ وہ ان دونوں کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔ آمین

(۱۴۔ مئی ۲۰۱۱ء)

مولانا محمد عبداللہ شجاع آبادی

(ولادت ۱۹۳۸ء)

شہر ملتان اور ضلع ملتان میں جو علماے کرام پیدا ہوے اور انھوں نے تدریسی خدمات سر انجام دیں (اور دے رہے ہیں) ان میں ایک عالمِ دین مولانا محمد عبداللہ شجاع آبادی ہیں۔ جو ملتان کے ایک تدریسی ادارے جامعہ دار الحدیث الخیر میں شیخ الحدیث کے عظیم منصب پر رونق افروز ہیں۔ ان کے حالات مجھے ان کے فاضل شاگرد اور مرکز کے لائق مدرس حافظ ریاض احمد عاقب نے ارسال فرمائے۔ میں انھیں اپنے الفاظ میں منتقل کر کے معزز قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

مولانا محمد عبداللہ کی ولادت ۱۹۳۸ء (۱۳۵۷ھ) کو ضلع ملتان کی تحصیل شجاع آباد کے قریب بستی محمد پور میں ہوئی۔ دو سال کے بچے تھے کہ والدہ وفات پا گئیں اور ان کی تربیت والدِ محترم اور بڑی بہن نے کی۔

شجاع آباد کے قریب ملتان روڈ پر ایک گاؤں چاہ خلیل والا کے نام سے موسوم ہے۔ وہاں ایک عالم دین مولانا خلیل الرحمٰن فیروز پوری اقامت فرما تھے جو حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ کے شاگرد تھے۔ مولانا عبداللہ شجاع آبادی کے آبا و اجداد نے ان کے مواعظ حسنہ سے متاثر ہو کر مسلک اہل حدیث اختیار کیا۔

مولانا عبداللہ نے ابتدائی تعلیم اپنے علاقے کے اساتذہ سے حاصل کی، جن میں مولانا احمد اور حافظ عبدالرحمٰن شامل ہیں۔ اسی نواح کے ایک عالم مولانا الٰہی بخش تھے، ان سے بھی استفادہ کیا۔ وہ مولانا خلیل الرحمٰن فیروز پوری اور مولانا عبدالحق ہاشمی بہاول پوری کے شاگرد تھے۔ ۱۹۵۳ء میں جب مولانا عبداللہ پندرہ سال کی عمر کو پہنچے تو شیخ الحدیث مولانا سلطان محمود کی خدمت میں جلال پور پیر والا آئے اور ان کے دار الحدیث محمدیہ میں داخلہ لیا۔ وہاں انھوں نے بلوغ المرام مولانا عبدالمجید کدنوی سے پڑھی اور مشکوٰۃ، شرح نخبۃ الفکر اور بعض دیگر فنون کی کتابیں مولانا سلطان محمود سے پڑھنے کی سعادت حاصل کی۔

۱۹۵۵ء میں ملتان کے دار الحدیث محمدیہ باغ عام خاص میں داخل ہوئے۔ وہاں مولانا عبدالعزیز ملک ملتانی، مولانا محمد عبدہ الفلاح، مولانا عبدالرحمٰن لکھوی، مولانا شمس الحق ملتانی اور مولانا عبدالعزیز عالم گیری کی تدریس کا سلسلہ جاری تھا۔ مولانا عبداللہ شجاع آبادی نے ان سب حضرات سے حدیث و فقہ اور دیگر علوم کی کتابوں کا درس لیا۔

۱۹۵۶ء میں وہ کراچی چلے گئے۔ وہاں جامع العلوم السعودیہ میں مولانا حاکم علی دہلوی کے درس و تدریس کی بڑی شہرت تھی۔ وہ مولانا احمد اللہ دہلوی اور مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوری کے شاگرد تھے۔ کراچی میں مولانا عبداللہ شجاع آبادی نے مولانا حاکم علی سے استفادہ کیا۔

۱۹۵۷ء میں جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) میں داخلہ لیا۔ وہاں اس وقت حضرت حافظ محمد گوندلوی، مولانا شریف اللہ خاں سواتی، مولانا محمد عبدہ، مولانا محمد صدیق لائل پوری اور مولانا محمد اسحاق چیمہ طالبانِ علم کو مستفید فرمارہے تھے۔ مولانا عبداللہ شجاع آبادی نے ان حضرات سے تفسیر وحدیث، فقہ واصول، عربی ادبیات اور دیگر علوم مروّجہ کی کتابیں پڑھیں۔ اسی سال راولپنڈی جاکر مولانا غلام اللہ خاں کے دورۂ تفسیر میں شریک ہوئے۔

بعد ازاں کراچی جاکر مولانا شرف الدین دہلوی سے صحیح بخاری، صحیح مسلم اور موطا امام مالک کا درس لیا۔ مولانا محمد جونا گڑھی دہلوی کے فرزند گرامی مولانا محمد سلیمان جونا گڑھی اور اس دور کے ایک اور عالم مولانا محمد داؤد راغب سے بھی استفادہ کیا۔

۱۹۵۹ء میں ملتان کے مدرسہ نعمانیہ حنفیہ میں داخل ہوگئے۔ اس مدرسے کے اساتذہ سے کنز الدقائق، ہدایہ اخیرین، سلّم العلوم، میبذی، اقلیدس، موطا امام مالک، مطول، حسامی، ہدیہ سعیدیہ، قطبی، میر قطبی وغیرہ کتابیں پڑھیں۔ اس مدرسے میں ان کے استاذ مولانا عبدالرؤف ہزاروی اور مولانا قاضی امیر عالم ہزاروی تھے۔

بعد ازاں لاہور آکر جامعہ اہل حدیث مسجد قدس میں حضرت حافظ عبداللہ روپڑی کی خدمت میں حاضری دی۔ ان سے تفسیر جامع البیان اور تفسیر وحدیث کی بعض دیگر کتابیں پڑھیں۔ حافظ صاحب کا اندازِ تدریس نہایت محققانہ اور عالمانہ تھا۔ ان سے سند بھی حاصل کی۔

۱۹۶۰ء میں راولپنڈی کے مدرسہ تدریس القرآن والحدیث کا رخ کیا۔ یہ مدرسہ حافظ محمد اسماعیل ذبیح مرحوم نے جاری کیا تھا جو اہل حدیث کے مشہور خطیب اور مقرر تھے۔ وہاں جامع ترمذی اور عربی ادب کی کتاب مقامات حریری حافظ صاحب موصوف سے پڑھیں۔ تفسیر بیضاوی مولانا عبداللہ مظفر گڑھی سے اور سراجی اور بعض دیگر کتابیں مولانا محمد خاں سے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔

۱۹۶۱ء (۱۳۸۰ھ) ہی میں دار العلوم تقویۃ الاسلام (واقع شیش محل روڈ لاہور) میں بہ حیثیت طالب علم ان کا ورود ہوا۔ اس وقت اس دار العلوم کی تدریسی حلقوں میں بڑی شہرت تھی۔ حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی اس کے مہتمم تھے جو اپنی جلالتِ علمی کی بنا پر بلند مرتبے پر فائز تھے۔ اس دار العلوم کے اساتذہ کرام بھی اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ اساتذہ کی جماعت میں شیخ الحدیث مولانا حافظ محمد اسحاق حسینوی اور مولانا شریف اللہ خاں کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اس دار العلوم میں مولانا محمد عبداللہ شجاع آبادی نے

صحیح بخاری، صحیح مسلم، موطا امام مالک، تاریخ التشریع الاسلامی، حجۃ اللہ البالغہ، الفوز الکبیر، شرح عقائد نسفی کے لیے مولانا حافظ محمد اسحاق حسینوی کے حضور زانوے شاگردی تہ کیے اور شمس البازغہ اور ملا حسن کی تکمیل مولانا شریف اللہ خاں سے کی۔

اس سال صحیح بخاری کی تقریب میں حضرت مولانا محمد علی لکھوی مدنی نے شرکت فرمائی تھی اور وہ اس سے چند روز پیشتر کچھ عرصے کے لیے مدینہ منورہ سے تشریف لائے تھے اور مولانا سید محمد داؤد غزنوی کی درخواست پر انھوں نے دار العلوم تقویۃ الاسلام میں صحیح بخاری کی آخری حدیث کا درس دیا تھا۔ اس سے قبل انھوں نے موطا امام مالک اور صحیحین کا زبانی امتحان بھی لیا تھا۔ دار العلوم کے فارغین کو حضرت مولانا غزنوی نے اپنے دستِ مبارک سے اسناد عطا فرمائی تھیں اور حضرت مولانا محمد علی لکھوی مدنی نے اجازۃ الروایت سے نوازا تھا۔

میں اس زمانے میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' کی ادارت کے فرائض انجام دیتا تھا۔ اس اخبار کا دفتر دار العلوم تقویۃ الاسلام کی بلڈنگ میں تھا اور مولانا عبداللہ صاحب سے میری پہلی ملاقات وہیں ہوئی تھی، جس نے آگے چل کر باہمی تعلقات کی شکل اختیار کر لی۔ اس کا ذکر انھوں نے ایک مکتوب میں کیا ہے جو میرے نام ارسال فرمایا۔

مولانا عبداللہ شجاع آبادی متعدد مدارس میں اساتذہ سے تقریباً نو سال تعلیم حاصل کرتے رہے اور حدیث اور دیگر علوم کی بعض کتابیں انھوں نے اپنے عہد کے مشہور اساتذہ سے دو دو تین تین بار پڑھیں۔ ہر استاذ کا ہر فن کی کتاب میں تدریس کا ایک خاص انداز ہوتا ہے، جس سے انھوں نے فائدہ اٹھایا۔ موجودہ دور کے طلبا درسی کتابیں جلد سے جلد ختم کرنا چاہتے ہیں۔ بعض اساتذہ کا بھی یہی مقصد ہوتا ہے کہ اس کام سے جلد فراغت حاصل کر لی جائے۔ کچھ عرصہ پیشتر تو کتبِ حدیث کے خلاصے تیار کرنا شروع کر دیے گئے تھے جنھیں ''زبدہ'' کا نام دیا گیا تھا۔ صحیح بخاری کے خلاصے کو ''زبدۃ البخاری'' سے تعبیر فرمایا گیا اور اخبارات میں اس زبدیاتی کارنامے کے اشتہارات شائع کرائے گئے۔ اس فقیر نے اس نہایت غیر علمی سلسلے پر اخبارات میں مضامین لکھے اور اہلِ علم کو زبدیوں کی اس خلافِ اسلاف حرکت سے آگاہ کیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہ سلسلہ آگے نہیں بڑھا۔

مولانا عبداللہ شجاع آبادی نے نو سال مروّجہ تعلیم حاصل کی اور ۱۹۶۱ء میں اس سے فارغ ہوئے تو ان کی تدریس کے دور کا آغاز ہوا۔ انھوں نے حصولِ علم کے لیے بھی متعدد مدارس کے چکر لگائے اور تدریس بھی کئی مدارس میں کی، جس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

☆...... وہ گھر پہنچے تو سب سے پہلے انھیں ملتان کے شیخ عبدالرشید صدیقی ناظم اعلیٰ مرکزی جمعیت اہل حدیث

ملتان اور مولانا عبدالعزیز ملک مہتمم دار الحدیث نے دعوت دی کہ وہ وہاں کے دار الحدیث محمدیہ میں خدمت تدریس انجام دیں۔ چنانچہ انھوں نے یہ دعوت قبول کی اور اس مدرسے میں جو اسباق ان کے سپرد کیے گئے وہ تھے ترجمۂ قرآن، صحیح مسلم، سنن ابن ماجہ، مشکوۃ شریف، تلخیص الحبیر، دیوانِ حماسہ، دیوان متنبّی، کافیہ، شمس البازغہ اور تاریخ ادب عربی۔ تقریباً دو سال وہ اس مدرسے میں پڑھاتے رہے۔

☆......۱۹۶۳ء میں وہ حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی کو سلام کرنے کی غرض سے لاہور گئے تو مولانا نے ان کو جامعہ سلفیہ میں تدریس کے لیے مولانا اسماعیل سلفی کے نام درخواست لکھنے کا حکم دیا۔ انھوں نے مولانا کے حکم کی تعمیل کی۔ مولانا نے اس پر سفارشی الفاظ تحریر فرمائے اور جامعہ سلفیہ میں ان کی تقرری عمل میں آ گئی۔ وہاں یہ ترجمۂ قرآن، صرف ونحو کی کتابیں، دیوان حماسہ، منطق کی قطبی اور بعض دیگر کتابیں پڑھانے لگے۔ جامعہ سلفیہ میں تدریس کے دوران ہی انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے فاضل عربی کا امتحان پاس کیا۔ وہاں بھی ان کی مدتِ تدریس دو سال رہی۔ ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۵ء تک۔

☆......اسی سال مولانا عبداللہ صاحب (گوجراں والا) کی دعوت پر ان کی جاری کردہ جامعہ شرعیہ جی ٹی روڈ میں چلے گئے۔ اسی جامعہ شرعیہ کو بعد میں جامعہ محمدیہ کہا جانے لگا۔ اہل حدیث کی یہ مشہور جامعہ ہے۔

☆......۱۹۷۱ء میں حکیم عبدالرحیم اشرف کی دعوت پر جامعہ تعلیمات اسلامیہ فیصل آباد تشریف لے گئے۔ وہاں تین سال ان کا سلسلہ تدریس جاری رہا۔ اس وقت وہاں مولانا عبدالغفار حسن، شیخ عریان اور شیخ عبدالوہاب مصری بھی وہاں پڑھاتے تھے۔

☆......۱۹۷۴ء میں شیخ الحدیث مولانا سلطان محمود صاحب کے مشورے سے شجاع آباد میں مدرسہ محمدیہ کی بنیاد رکھی گئی۔ اب صاحب ترجمہ مولانا محمد عبداللہ نے وہاں پڑھانا شروع کیا۔ وہاں ۱۹۸۴ء تک دس سال تدریس کی۔

☆......ان دنوں مولانا عبداللہ امجد چھتوی عارف والا کے مدرسہ اشاعت العلوم میں بہ حیثیت شیخ الحدیث خدمت سرانجام دیتے تھے۔ ان کے کہنے پر مولانا محمد عبداللہ شجاع آبادی ۱۹۸۴ء میں وہاں تشریف لے گئے۔ اس مدرسے میں وہ صحیح مسلم، حجۃ اللہ البالغۃ، اسرار البلاغۃ، بدایۃ المجتہد، شرح عقیدہ طحاویہ، شرح ابن عقیل، کافیہ، شافیہ وغیرہ کتابیں پڑھاتے تھے۔ وہاں ۱۹۸۷ء تک تین سال ان کا قیام رہا۔

☆......اسی سال وہ مولانا محمد یاسین ظفر، مولانا محمد یونس بٹ، میاں فضل حق مرحوم اور مولانا محمد عبدہ مرحوم کے حکم سے جامعہ سلفیہ (اسلام آباد) چلے گئے۔ وہاں وہ صحیح بخاری، تفسیر بیضاوی، حجۃ اللہ البالغۃ،

بدایۃ المجتہد، شرح عقیدہ طحاویہ اور بعض دیگر کتابیں پڑھاتے رہے۔ جامعہ سلفیہ اسلام آباد میں ان کا سلسلۂ تدریس تقریباً بارہ سال جاری رہا۔ بعض گھریلو مسائل کی وجہ سے ۱۹۹۸ء میں گھر چلے گئے۔

☆......اسی سال مولانا شمس الحق ملتانی کے حکم سے جامعہ رحمانیہ (ملتان) میں پڑھانا شروع کیا۔ اس مدرسے میں وہ صحیح بخاری، ابو داؤد، ترمذی اور اصول فقہ کی بعض کتابیں پڑھاتے تھے۔ یہاں صرف ایک سال ان کا قیام رہا۔

☆......۱۹۹۹ء میں مرکز ابن القاسم الاسلامی ملتان کے ناظم حاجی محمد شریف چنگوانی انھیں اس مرکز میں لے آئے۔ یہ مرکز ابن القاسم میں تفسیر بیضاوی، صحیح بخاری، جامع ترمذی، حجۃ اللہ البالغۃ، بدایۃ المجتہد، الفوز الکبیر، شرح عقیدہ طحاویہ، سراجی، شرح ابن عقیل، ہدایہ اور بعض دیگر کتابوں کا درس دیتے تھے۔

مولانا عبداللہ شجاع آبادی کم و بیش پچاس سال سے پڑھا رہے ہیں۔ اس طویل عرصے میں ان سے بے شمار علما و طلبا نے تعلیم حاصل کی۔ اس وسیع فہرست میں حافظ ریاض احمد عاقب شیخ الحدیث مرکز ابن القاسم الاسلامی، حافظ عبدالمنعم فاروقی حفید مولانا عبدالتواب ملتانی، مولانا محمد یعقوب طاہر کراچی، حافظ عبدالستار حسن کوٹ ادو، شیخ الحدیث مولانا محمد رمضان سلفی، مولانا عتیق الرحمٰن بخاری ریاض (سعودی عرب)، سید ضیاء اللہ شاہ بخاری، مولانا محمد خالد سیف اسلام آباد اور دیگر بے شمار حضرات شامل ہیں۔

مختلف مدارس میں جو حضرات ان کے رفقائے درس رہے ان میں شیخ الحدیث مفتی عبیداللہ عفیف، مولانا عبدالوکیل علوی منصورہ لاہور، مولانا عبدالخالق قدوسی شہید، شیخ الحدیث مولانا عبدالحلیم مرحوم (اوکاڑہ)، شیخ الحدیث مولانا محمد علی جانباز مرحوم، مولانا فضل الرحمٰن ہزاروی سیالکوٹ، پروفیسر یوسف کاظم اسلام آباد، مولانا محمد فاروق راشدی جامعہ اسلامیہ گوجراں والا اور دیگر متعدد حضرات کے نام آتے ہیں۔ ان کے تقریباً تمام ساتھی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہے اور مصروف ہیں۔

گزشتہ سطور میں ہم مولانا محمد عبداللہ شجاع آبادی کے زمانہ طالب علمی سے مطلع ہوئے، ہمیں ان کے اساتذۂ گرامی کا پتا چلا، ان کے رفقائے درس سے واقفیت ہوئی، ان کے مقاماتِ تدریس ہمارے علم میں آئے۔ اب آیئے ان کی خدمتِ تصنیف و تالیف سے مطلع ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھوں نے مختلف اوقات میں چھوٹی بڑی جو کتابیں لکھیں، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱- لا الہ الا اللہ یعنی التوحید الخالص

۲- محمد رسول اللہ یعنی اطاعت رسول (ﷺ)

۳- اصحاب الرضوان فی مرآۃ القرآن

۴- تاریخ اہل حدیث

۵- الحیاۃ البرزخیہ وعدم سماع الموتی

۶- حدیث رسول اور پرویزیت

۷- عورت عالمی تناظر میں

افسوس ہے میں ان میں سے کوئی کتاب بھی نہیں دیکھ سکا۔ خیال یہ ہے کہ یہ کتابیں اردو زبان میں ہوں گی لیکن ان میں سے نمبر تین اور پانچ کے نام عام آدمی کی سمجھ سے بالا ہیں۔ میرے خیال میں اردو کتاب کا نام اردو میں ہونا چاہیے تاکہ فوراً قاری کی سمجھ میں آ جائے۔

مولانا ممدوح نے ماشاء اللہ حج بیت اللہ بھی کیا اور کویت کا سفر بھی فرمایا۔ وہاں کے اہل علم نے ان سے سند و اجازہ بھی حاصل کیا۔ اللہ تعالیٰ اس عالی قدر استاذ کی زندگی دراز فرمائے اور ان کا دائرۂ افادیت مزید وسیع ہو۔

۱۹۶۱ء میں جب ان سے میرا تعارف ہوا اس وقت وہ نوجوان تھے اور طالب علمی کے دور سے گزر رہے تھے۔ پھر اس سے پچاس سال بعد ۲۰۱۱ء میں مرکز ابن القاسم الاسلامی ملتان میں ان سے ملاقات ہوئی تو وہ وہاں کے منصبِ شیخ الحدیث پر فائز تھے۔ ان کے سیاہ بال سفید لبادہ اوڑھ چکے تھے اور ان کا حلیہ بالکل تبدیل ہو چکا تھا، لیکن رنگ وہی گندمی، آنکھیں موٹی، پیشانی کشادہ، مزاج میں سادگی اور گفتگو میں نرمی کا عنصر نمایاں، چہرے پر وہی پرانی معصومیت اور انکسار کی جھلک۔

جیسا کہ ابتدا میں بتایا گیا آج کل وہ ملتان کے جامعہ دار الحدیث الخیریہ میں شیخ الحدیث کے طور پر خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔

بارگاہِ الٰہی میں دعا ہے کہ وہ انھیں ہر مقام اور عمر کے ہر حصے میں کتاب وسنت کی خدمت میں مشغول رکھے۔

مولانا عبدالسلام سلفی ہزاروی

(ولادت ۱۹۳۸ء)

صوبہ سرحد (جسے اب خیبر پختونخوا کہا جاتا ہے) کے موجودہ علما میں سے ایک عالم دین کا اسم گرامی مولانا عبدالسلام سلفی ہزاروی ہے۔ مولانا عبدالسلام کی ولادت ۱۹۳۸ء میں موضع مگری (ضلع ہری پور ہزارہ) میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام ملک عبدالعزیز ہے۔ مولانا ممدوح ۱۹۵۳ء میں موضع جھنگڑہ (ضلع ایبٹ آباد) چلے گئے تھے۔ وہاں ان کی خالہ رہتی تھیں، جن کی شادی اس نواح کے ایک عالم مولانا عبدالغنی سے ہوئی تھی۔ وہ اولاد سے محروم تھے اور ۱۹۵۱ء میں فوت ہو گئے تھے۔ شوہر کی وفات کے بعد عبدالسلام کی خالہ عبدالسلام کو اپنے پاس لے گئی تھیں، پھر انھی کے گھر ان کی پرورش ہوئی۔ یہ سطور ۱۴-دسمبر ۲۰۱۲ء کو لکھی جا رہی ہیں۔ ان کی خالہ ماشاء اللہ زندہ ہیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ صحت وعافیت کے ساتھ ان کی زندگی دراز فرمائے۔

عبدالسلام نے ابتدائی تعلیم دو مقامات میں حاصل کی، اپنے آبائی گاؤں موضع مگری میں بھی اور اپنی خالہ کے پاس جھنگڑہ میں بھی۔

مزید حصول علم کے لیے ۱۹۵۴ء میں مولانا عبدالسلام ہزاروی نے (اپنی خالہ کے) گھر سے قدم باہر نکالا اور راولپنڈی کے مدرسہ تدریس القرآن والحدیث میں پہنچے جو مولانا حافظ اسماعیل ذبیح نے جاری کیا تھا۔ اس مدرسے میں انھوں نے ۱۹۵۹ء تک تعلیم حاصل کی۔ وہاں ان کے اساتذہ تھے حافظ محمد اسماعیل ذبیح، حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی، حافظ عبدالغفور جہلمی اور مولانا عبداللہ مظفر گڑھی۔ یہ حضرات خطابت میں بھی شہرت رکھتے تھے اور معروف مدرس بھی تھے۔ اپنی اپنی باری سے سب وفات پا چکے ہیں، اللھم اغفرلھم وارحمھم

پھر ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۱ء تک (ایک سال) عبدالسلام ہزاروی نے مولانا عبداللہ جھنگڑوی کی خدمت میں ہری پور میں گزارا اور ان سے بعض درسی کتابیں پڑھیں۔ مولانا عبداللہ جھنگڑوی مشہور خطیب بھی تھے اور مدرس بھی۔ وہ بھی وفات پا چکے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۴ء تک (دو سال) عبدالسلام نے جامعہ سلفیہ کے لائق احترام اساتذہ سے فیض یاب ہونے کی سعادت حاصل کی، وہ اساتذہ گرامی تھے حضرت العلام حافظ محمد گوندلوی، مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی، پیر محمد یعقوب قریشی، مولانا شریف اللہ خاں سواتی، مولانا محمد صادق خلیل اور حافظ بنیامین۔ ان

کے یہ جلیل القدر اساتذہ بھی اس دنیا کو چھوڑ کر جنت میں پہنچ گئے ہیں۔ رحمہم اللہ تعالیٰ

جامعہ سلفیہ ان کی درس نظامیہ کی تعلیم کی آخری درس گاہ تھی۔ اس کے بعد ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۳ء تک وہ آٹھ سال ہری پور ہزارہ کی ایک مسجد میں امامت و خطابت کا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔ بعد ازاں ۱۹۷۳ء سے ۲۰۰۳ء تک پورے تیس سال وہ پشاور صدر کی مرکزی جامع مسجد اہل حدیث فوارہ چوک میں خطابت و امامت اور تدریس میں مشغول رہے۔ پھر ۲۰۰۴ء سے ۲۰۰۹ء تک پشاور ہی کی ایک مسجد اہل حدیث میں اسی خدمت کو اپنا معمول بنائے رکھا۔

۲۰۱۰ء سے جامع مسجد اقصیٰ اہل حدیث چک شہزاد اسلام آباد میں خطیب کی حیثیت سے قرآن و حدیث کی تبلیغ کر رہے ہیں۔

حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی اور شیخ الحدیث مولانا اسماعیل سلفی کے زمانے سے مرکزی جمعیت اہل حدیث سے وابستہ ہیں۔ مرکزی جمعیت پاکستان کے متعدد نائب امیروں میں شاید یہ بھی ایک نائب امیر ہیں۔ ان کا مستقل قیام چوں کہ پشاور میں ہے، اس لیے یہ صوبہ خیبر پختونخوا کی جماعت کے سرپرستِ اعلیٰ بھی ہیں۔

بقول ان کے ان کی سیاسی خدمات بھی ہیں۔ وہ خدمات کیا ہیں؟ سنیے!

☆......ایم ایم اے کے قیام کے روزِ اول سے صوبہ سرحد میں اس کے نائب امیر رہے۔

☆......۲۰۰۲ء سے ۲۰۰۸ء تک نفاذ شریعت کونسل کے رکن رہے۔

☆......تقریباً پچیس سال سے خیبر پختونخوا کی رؤیت ہلال کمیٹی کے رکن ہیں۔

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ ایم ایم اے کا مطلب متحدہ مجلس عمل تھا۔ اس مجلس کی صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختونخوا) میں چھے سال حکومت رہی۔ سوال یہ ہے کہ اس صوبے میں اس حکومت نے کیا کارنامہ انجام دیا اور کون سا نظامِ شریعت قائم کیا، جس کی کونسل کے مولانا عبدالسلام ہزاروی رکن تھے۔ یہ چند مولویوں کا ایک گروہ تھا، جس نے اس صوبے میں اسی طرح حکومت کی، جس طرح پاکستان کے دوسرے صوبوں میں دوسری سیاسی جماعتوں نے کی اور چھے سال خوب موجیں ماریں۔

اس جماعت نے یہ ثابت کیا کہ اس ملک میں اسلام کا نفاذ نہایت مشکل ہے۔ چھے سال یہ مجلس بعض شخصیتوں کے درمیان گھومتی رہی۔ اہل حدیث کا اس جماعت میں عملاً کوئی حصہ نہیں تھا۔ ان کو صرف اس لیے اس میں شامل کیا گیا کہ ان سے انتخاب کے موقعے پر ووٹ لیے جائیں اور ہم لوگ علما کو ووٹ دینا کارِ ثواب سمجھتے ہیں۔ یہ مجلس کبھی متحدہ نہیں رہی، ہمیشہ منتشرہ رہی۔ بعض لوگ اس ایم ایم اے کو ملٹری مولوی الائنس کہا

کرتے تھے۔

مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ناظم اعلیٰ ڈاکٹر حافظ عبدالکریم صالح عالم دین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ ڈیرہ غازی خاں کے ضمنی انتخاب میں ان کی سب سے زیادہ مخالفت جماعت اسلامی نے کی۔ اس کے ارکان نے ان کے خلاف اخبارات میں مضمون لکھے۔ دیوبندی حضرات نے بھی جو کچھ ہو سکتا تھا کیا لیکن وہاں کے لوگ بتاتے ہیں کہ بریلوی حضرات نے حافظ عبدالکریم کی حمایت کی۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ مولانا عبدالسلام سلفی ہزاروی کو اپنے دین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کی توفیق بخشے، وہ کسی مجلس عمل وغیرہ سے وابستگی کی صورت میں ہو یا کسی اور صورت میں۔

مولانا محمد یوسف انور

(ولادت ۱۹۳۹ء)

آزادیٔ برصغیر سے قبل کے ضلع لاہور کے ایک قصبے کا نام ''پٹی'' تھا۔ اس قصبے میں جماعت اہل حدیث کے لوگ بہت بڑی تعداد میں آباد تھے اور بڑے اثر و رسوخ کے مالک تھے۔ ان میں علمائے دین بھی تھے اور تجارت پیشہ لوگ بھی۔! تقسیم ملک کے نتیجے میں یہ قصبہ ہندوستان کے حصے میں آیا اور ضلع امرتسر میں شامل ہوا۔ وہاں ایک شخص حاجی عبدالرحمٰن رہتے تھے جو نہ کوئی بڑا کاروبار کرتے تھے اور نہ ان کا شمار علمائے دین میں ہوتا تھا۔ لیکن صالح اور پرہیزگار شخص تھے۔ منکسر اور متواضع، اصحاب علم کے قدردان، تبلیغ دین کے شائق اور کتاب و سنت پر مبنی مسائل کی اشاعت کے لیے ہر آن کوشاں۔

پٹی کی نئی منڈی میں ان کی رنگریزی کی دکان تھی۔ اپنے گاہکوں اور اردگرد کے دکان داروں کو دینی احکام سے مطلع کرنا اور شیریں الفاظ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی حقیقت سے آگاہ کرنا ان کا من پسند مشغلہ تھا۔ اپنے خاص انداز تبلیغ سے کتنے ہی لوگوں کو انھوں نے بدعات کی دلدل سے نکالا، غلط رسوم و رواج سے جو ہمارے معاشرے میں رائج ہوگئی ہیں، متنفر کیا اور دین کی سیدھی راہ پر لگایا۔

پٹی میں جو اہل حدیث علما کہیں سے آتے، حاجی عبدالرحمٰن انھیں اپنے گھر لے جاتے اور ان کی خدمت اور مہمان نوازی کو اپنے لیے سعادت قرار دیتے۔ حضرت شاہ محمد شریف گھڑیالوی پنجاب کی جماعت اہل حدیث کے امیر تھے اور بہ درجہ غایت متقی بزرگ۔ بہت لوگ ان کے حلقۂ بیعت میں شامل تھے۔ اس مرد عالی مرتبت نے ۲۵۔ مئی ۱۹۴۴ء کو وفات پائی۔ حضرت شاہ صاحب کا پٹی میں ورود ہوتا تو حاجی عبدالرحمٰن انھیں اپنے دکان پر لے جاتے اور شاہ صاحب سے ملنے والے لوگ وہیں آتے اور جب تک شاہ صاحب کا وہاں قیام رہتا، حاجی صاحب کا چھوٹا سا گھر اہل علم کی محفل کی شکل اختیار کیے رکھتا۔

علما و صلحا کے اس خوب صورت مرکز موضع پٹی میں جماعت اہل حدیث کا ایک دینی مدرسہ بھی تھا۔ مرحوم اہل حدیث عالم حافظ احمد پٹوی اسی قصبے کے رہنے والے تھے۔ جامعہ سلفیہ فیصل آباد کے اولین ناظم تعمیرات میاں محمد عالم مرحوم کا تعلق بھی اسی قصبے سے تھا۔ میاں محمد عالم نیک اور مخیّر بزرگ تھے۔ انھوں نے چوبرجی سے آگے پونچھ روڈ پر ایک مسجد بنوائی۔ پھر سمن آباد کے علاقہ رستم پارک میں ایک مسجد تعمیر کرائی۔ ان کے

چھوٹے بھائی میاں دین محمد اور ان کے بیٹوں نے بھی دین کی بڑی خدمت کی۔ پٹی کی ایک مسجد میں کچھ عرصہ مولانا حافظ اسماعیل ذبیح خطابت وامامت کا فریضہ سرانجام دیتے رہے تھے۔

تقسیم ملک کے بعد حاجی عبدالرحمٰن اپنے اس آبائی مسکن کی سکونت ترک کر کے لائل پور (فیصل آباد) آ گئے تھے اور گول بازار کریانہ میں مربہ جات اور خشک چائے وغیرہ کی دکان کھول لی تھی۔ اس کے قریب ہی گول بازار کپڑا میں ان کا سکونتی مکان تھا۔ یہاں بھی پٹی کی طرح مختلف اوقات میں ان کے گھر علمائے کرام کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا۔ ان علمائے کرام کی وسیع فہرست میں حضرت حافظ عبداللہ روپڑی، مولانا عبدالمجید سوہدروی اور مولانا محمد حسین شیخوپوری وغیرہ حضرات شامل ہیں۔ حضرت امام سید عبدالجبار غزنوی کے تلامذہ کرام میں ایک بزرگ مولانا عبدالمجید ہزاروی تھے، متقی اور بلند کردار۔ وہ ایک دفعہ فیصل آباد آئے اور دو مہینے حاجی عبدالرحمٰن کے ہاں مقیم رہے۔ اس اثنا میں ان کا یہ معمول رہا کہ فجر کی نماز جامع مسجد اہل حدیث (امین پور بازار) میں پڑھتے اور وہاں درس قرآن دیتے۔ کبھی کسی اور مسجد میں چلے جاتے اور وہاں قرآن و حدیث کے مسائل بیان فرماتے۔ لیکن ان کا قیام حاجی عبدالرحمٰن کے گھر ہی رہا۔

قیام پاکستان کے بعد مولانا احمد الدین گکھڑوی سات آٹھ سال لائل پور اقامت گزیں رہے۔ اس اثنا میں جامع مسجد اہل حدیث (امین پور بازار) مسجد الفردوس گلبرگ اور مسجد اہل حدیث مومن آباد میں ان کا سلسلہ خطابت جاری رہا۔ لیکن اس طویل مدت میں قیام و طعام کی ذمہ داری حاجی عبدالرحمٰن صاحب نے قبول کیے رکھی۔ اس سلسلے میں وہ بڑے فراخ حوصلہ تھے۔ اس باب میں ان کی اہلیہ اور گھر کے دیگر افراد بھی ان سے پورا تعاون کرتے تھے۔

صوفی عبداللہ مرحوم کے بھی وہ عقیدت مند تھے اور انھیں اولیاء اللہ میں گردانتے تھے، اور فی الواقع صوفی صاحب کا شمار اولیاء اللہ میں ہوتا تھا۔ ان کے حالات میں ''تذکرہ صوفی عبداللہ'' کے نام سے اس فقیر نے ایک مستقل کتاب لکھی ہے جو ساڑھے چار سو صفحات پر محیط ہے اور مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ لاہور کی طرف شائع کی گئی ہے۔ اس میں صوفی صاحب مرحوم کی زندگی کے واقعات تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ ان کی قبولیت دعا کے واقعات تو نہایت حیرت انگیز ہیں جو کتاب میں درج ہیں۔ کتاب میں ان کی مجاہدانہ زندگی کے کوائف بھی مندرج ہیں جن کے مطالعہ سے اس دور کی پوری سیاسی تاریخ سامنے آ جاتی ہے۔

فیصل آباد کے تجارت پیشہ حضرات میں سے صوفی احمد الدین، حاجی بشیر احمد، حاجی گلزار احمد اور بعض دیگر حضرات سے حاجی عبدالرحمٰن دوستانہ تعلقات رکھتے تھے اور یہ حضرات ان کے طریق تبلیغ سے متاثر تھے اور انھوں نے اس باب میں حاجی صاحب سے بہت استفادہ کیا تھا۔ حاجی صاحب ممدوح نے جولائی ۱۹۸۵ء

میں وفات پائی اوران کی نمازِ جنازہ مولانا معین الدین لکھوی نے پڑھائی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ

ہمارے دیرینہ دوست مولانا محمد یوسف انور انہی حاجی عبدالرحمٰن کے فرزند ہیں جو ۱۹۳۹ء میں اپنے آبائی مسکن پٹی میں پیدا ہوئے۔ تقسیم ملک کے وقت ان کی عمر آٹھ سال کے قریب تھی۔ فیصل آباد کے سرکاری سکول میں میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ پھر جامعہ سلفیہ میں داخلہ لیا۔ اس زمانے میں شہر سے روزانہ جامعہ سلفیہ آنا جانا بہت مشکل تھا، لیکن محمد یوسف کسی نہ کسی طرح روزانہ آتے جاتے تھے۔ اس اثنا میں وہ شدید بیمار پڑ گئے۔ صحت یاب ہوئے تو حضرت مولانا عبداللہ ویرووالوی کے قائم کردہ دار القرآن والحدیث میں داخلہ لے لیا۔ اسی دار العلوم سے مروجہ نصاب کی تکمیل کی۔ اساتذہ میں حضرت حافظ محمد گوندلوی، مولانا عبداللہ ویرووالوی، مولانا عبدالغفار حسن، پروفیسر غلام احمد حریری اور مولانا حافظ احمد اللہ بڈھی مالوی شامل ہیں۔ یہ سب بزرگان گرامی اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ رحمہم اللہ تعالیٰ

محمد یوسف انور کے ہم جماعت اور ہم سبق حضرات میں مولانا عبدالخالق قدوسی شہید، مولانا عبیداللہ عفیف، ڈاکٹر صہیب حسن (لندن) مولانا عبدالغفار ناظم آباد، مولانا عبداللہ ویرووالوی کے صاحب زادگان گرامی حافظ عبدالرحمٰن اور حافظ داؤد شامل ہیں۔

جہاں تک میں جانتا ہوں، ہمارے یہ دوست محمد یوسف زندگی کے ابتدائی دور ہی سے جماعت اہل حدیث کی خدمت میں مصروف ہو گئے تھے۔ میرے خیال میں اسے ان کے والد مرحوم والد حاجی عبدالرحمٰن کی تربیت کا نتیجہ قرار دینا چاہیے۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

☆......اپریل ۱۹۵۵ء میں مرکزی جمعیت کی تیسری سالانہ کانفرنس بصدارت مولانا اسماعیل غزنوی لائل پور میں منعقد ہوئی تو مولانا عبیداللہ احرار کی قیادت میں شہر کے جن نوجوانوں نے رضا کارانہ طور پر خدمات سرانجام دیں ان میں محمد یوسف انور پیش پیش تھے اور اہل علم کے اطاعت گزار۔ حضرت مولانا سید محمد داؤد غزانوی ان کی مساعی پر بہت خوش تھے۔

☆......۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو مولانا ابوالکلام آزاد نے وفات پائی۔ ان کی وفات پر مولانا عبیداللہ احرام، مولانا تاج محمود اور بعض دیگر حضرات کی تجویز سے لائل پور میں میر عبدالقیوم ایڈووکیٹ کے زیر صدارت تعزیتی جلسہ منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس جلسے میں مولانا محمد داؤد غزنوی، شورش کاشمیری اور بعض دوسرے مقررین نے تقریریں کیں۔ یہ نہایت کامیاب جلسہ تھا۔ اس جلسے کے سلسلے میں انجمن شبان اہل حدیث کے ارکان کے ساتھ، جن میں میاں حبیب اللہ بھی شامل تھے، یوسف انور نے بڑی بھاگ دوڑ کی۔

☆......اپریل ۱۹۷۶ء میں سید ابوبکر غزنوی کا انتقال ہوا تو فیصل آباد کے دھوبی گھاٹ میں مولانا محمد صدیق

کے زیر صدارت تعزیتی جلسہ کیا گیا، جس میں صدر جلسہ کے علاوہ علامہ احسان الٰہی ظہیر، مولانا محمد حسین شیخوپوری اور چند دوسرے حضرات نے تقریریں کیں۔ اس موقعے پر بھی مولانا محمد یوسف انور نے میاں حبیب اللہ اور اپنے دوسرے دوستوں کی معیت میں بڑی تگ و دو کی۔

مولانا محمد یوسف انور اچھے مقرر اور خطیب ہیں۔ وہ تیس برس مسجد رحمانیہ کے منصب خطابت پر فائز رہے۔

۱۲۔ ستمبر ۱۹۸۹ء کو مولانا محمد صدیق لائل پوری نے وفات پائی۔ مولانا مرحوم جامع مسجد اہل حدیث امین پور بازار کے خطیب تھے۔ ان کی وفات کے بعد وہاں کی انجمن نے خطابت کی ذمہ داری مولانا محمد یوسف انور کے سپرد کر دی۔ چناں چہ طویل مدت سے وہ اس جامع مسجد کے خطیب ہیں۔ یہ اس شہر کی اولین جامع مسجد اہل حدیث ہے جو مولانا عبدالواحد، میر حکیم نور الدین اور ان کے رفقاے کرام کی کوششوں سے آزادی ملک سے پہلے تعمیر ہوئی۔ اس کی خطابت ایک بڑا اعزاز ہے۔

فیصل آباد کی مختلف مساجد میں مولانا محمد یوسف انور کا قرآن و حدیث کے دروس کا سلسلہ طویل عرصے سے جاری ہے۔ مسجد رحمانیہ میں نماز فجر کے بعد درس قرآن کے چار دور اور امین پور بازار والی مسجد میں پانچ دور مکمل ہو چکے ہیں۔ مسجد رحمانیہ میں نماز عصر کے بعد روزانہ درس حدیث دیتے ہیں۔ یہ سلسلہ تقریباً چالیس برس سے جاری ہے۔

تقریر و خطابت اور درس کے علاوہ تحریری طور سے بھی خدمت دین میں ان کی مصروفیات قابل ذکر ہیں۔ کئی سال تک ہفت روزہ ”اہل حدیث“ کے مدیر رہے۔ نیز مختلف اخباروں میں بہت سے مضامین سپرد قلم کیے۔

بعض مسائل سے متعلق انھوں نے متعدد کتابچے شائع کیے جو یہ ہیں: (۱) احادیث کی روشنی میں جرابوں پر مسح (۲) جوامع الکلم (۳) علماے اہل حدث کی خدمات حدیث (۴) تحریک تحفظ ختم نبوت میں اہل حدیث کی خدمات (۵) فلسفہ عید قربان (۶) مقصد عید الفطر (۷) میاں فضل حق کی جماعتی و دینی خدمات، وغیرہ۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ مولانا محمد یوسف انور کے والد گرامی حاجی عبدالرحمٰن جماعت کے علما و صلحا سے عقیدت مندانہ تعلقات رکھتے تھے، صوفی عبداللہ مرحوم سے بھی ان کے مخلصانہ مراسم تھے۔ ایک دفعہ محمد یوسف انور کو عرق النسا کی تکلیف ہوگئی۔ چلنا پھرنا مشکل ہو گیا۔ بہت علاج کرائے مگر افاقہ نہ ہوا۔ ٹانگ میں ہر وقت شدید درد رہتا تھا۔ اسی اثنا میں پتا چلا کہ صوفی عبداللہ مرحوم لائل پور تشریف لائے ہیں اور مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف کے مکان پر اقامت فرما ہیں۔ حاجی عبدالرحمٰن وہاں پہنچے اور صوفی صاحب کو اپنے گھر لے آئے۔ صوفی صاحب تین دن ان کے مکان پر رہے۔ وہ دو وقت (صبح اور شام) ٹانگ پر چھڑی لگا کر دم

کرتے تھے۔ تین دن دم کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے کامل شفا عطا فرما دی۔ کہنا چاہیے کہ یہ شفا عاجل بھی تھی اور کامل بھی۔

صوفی صاحب کی قبولیتِ دعا کے سلسلے کا ایک واقعہ مولانا محمد یوسف انور کی زبانی سنیے!

وہ بیان کرتے ہیں کہ فیصل آباد کے گول بازار کریانہ میں بریلوی مسلک کے ایک شخص شیخ معراج دین فروکش تھے۔ ان کی شادی ہوئی لیکن کئی برس تک وہ اولاد سے محروم رہے۔ علاج بھی کرائے اور پیروں فقیروں کے ہاں بھی چکر لگاتے رہے، لیکن کوئی اثر نہ ہوا۔ ایک دفعہ محمد یوسف انور کے والد گرامی حاجی عبدالرحمٰن انھیں صوفی صاحب کی خدمت میں ماموں کانجن لے گئے۔ صوفی صاحب نے دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے شیخ معراج الدین کو بیٹے بھی دیے اور بیٹیاں بھی۔ شیخ صاحب نے مسلک اہل حدیث قبول کر لیا۔ وہ ہر رمضان المبارک میں کافی رقم اکٹھی کر کے صوفی صاحب کے قائم کردہ جامعہ تعلیم الاسلام میں ماموں کانجن پہنچاتے ہیں۔

مولانا محمد یوسف انور سے ہماری دوستی ۱۹۵۵ء کے لگ بھگ ہوئی، جب وہ سترہ اٹھارہ سال کے نوجوان تھے۔ اب ۷۵ سال کی حد عبور کر چکے ہیں۔ میانہ قد، گول چہرہ، سفید داڑھی، خوش اخلاق، ملنسار، اچھے دوست اور اچھے انسان۔ مہمان نواز اور اصحاب علم کے قدردان۔ دعا ہے ان کی عمر دراز ہو اور وہ ہمیشہ کتاب و سنت کی اشاعت میں مشغول رہیں۔

ماشاءاللہ مالی لحاظ سے آسودہ حال ہیں۔ بچے کاروبار کرتے ہیں اور زندگی اللہ کے فضل سے آرام سے گزر رہی ہے۔ مجھے جب فیصل آباد جانے کا اتفاق ہوتا ہے، اپنے اس دیرینہ دوست سے ملنے کی کوشش کرتا ہوں۔

(۱۵۔ جون ۲۰۱۲ء)

حافظ مفتی ثناء اللہ مدنی

(ولادت فروری ۱۹۴۰ء)

پورا قد، چوڑا چہرہ، کشادہ پیشانی، نکھری ہوئی گندمی رنگت، سفید لباس اور سر پر بڑا سا سفید رومال، کم گو، نرم خو اور علم و عمل کا خوش نما پیکر۔ یہ ہیں مولانا مفتی حافظ ثناء اللہ مدنی جن کا شمار پاکستان کے لائق احترام شیوخ الحدیث اور مفتیانِ عالی مرتبت میں ہوتا ہے۔

حافظ صاحب کا مختصر سلسلہ نسب یہ ہے: ثناء اللہ بن عیسٰی خاں بن اسماعیل خاں۔ فروری ۱۹۴۰ء میں بمقام کلس (ضلع قصور) پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اسی ضلعے کے موضع سرہالی کلاں میں پائی جو ان کا آبائی مسکن ہے۔ قرآن مجید بھی سرہالی کلاں میں حفظ کیا۔ ان کے گاؤں میں روپڑی علمائے کرام کی آمد و رفت رہتی تھی۔ ۱۹۵۳ء میں وہاں ایک سہ روزہ تبلیغی جلسہ ہوا، جس میں حضرت حافظ عبداللہ روپڑی اور ان کے بھتیجے حافظ محمد اسماعیل روپڑی اور حافظ عبدالقادر روپڑی تشریف لائے تھے۔ ان کے علاوہ بھی متعدد علمائے کرام نے شرکت فرمائی اور تقریریں کیں۔ روپڑی حضرات کی تقریروں اور ان کے مواعظ سے بالخصوص لوگ بہت متاثر ہوئے۔

حافظ ثناء اللہ نے قرآن مجید حفظ کیا تو ان کے گاؤں (سرہالی کلاں) کے ایک نیک خصال بزرگ حاجی عبدالعزیز مرحوم نے جو علما سے دلی تعلق رکھتے تھے، انھیں دینی تعلیم کے حصول کی ترغیب دی اور پھر خود ہی اپنے ساتھ لائے اور جامعہ اہل حدیث (مسجد قدس لاہور) میں حضرت حافظ عبداللہ محدث روپڑی کی خدمت میں پیش کیا اور انھیں جامعہ میں داخل کرا دیا گیا۔ یہ ۱۹۵۴ء کی بات ہے۔ حاجی صاحب مرحوم نے ۱۹۶۹ء کو سرہالی کلاں میں وفات پائی۔

حافظ ثناء اللہ کو مختلف علوم کی ابتدائی کتابیں میزان الصرف، میزان منشعب، صرف میر، زرادی، نحو میر، ہدایۃ النحو، ابواب الصرف، مرقات وغیرہ خود حافظ محدث روپڑی نے پڑھائیں۔ ابواب الصرف کے ابواب بھی وہ خود ہی سنتے تھے۔ یہ حافظ ثناء اللہ مدنی کی خوش نصیبی ہے کہ بالکل ابتدائی درجات کی درسی کتابیں اتنے بڑے محدث سے پڑھنے کی سعادت ان کے حصے میں آئی۔

قرآن مجید کا ترجمہ بھی حضرت حافظ عبداللہ محدث روپڑی سے پڑھنا شروع کیا۔ ترجمہ قرآن حضرت حافظ صاحب نے سورہ ق سے پڑھانے کا آغاز کیا اور فرمایا میں نے اپنے استاذ مکرم حضرت امام عبدالجبار

غزنوی رحمہ اللہ سے اسی مقام سے پڑھنا شروع کیا تھا۔ ترجمہ پڑھاتے وقت حافظ صاحب روپڑی کی آنکھوں سے عام طور پر آنسو جاری رہتے تھے۔

حافظ ثناء اللہ مدنی ابتدا ہی سے علمی ذوق رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ اللہ نے عمل کی توفیق بھی مرحمت فرمائی اور ذہانت کی نعمت بھی بارگاہِ الٰہی سے میسر آئی۔ اس طرح وہ رفتہ رفتہ جلد ہی استاذِ عالی قدر کے رنگ میں رنگے گئے اور علمی تحقیق وکاوش ان پر غالب آ گئی۔ انھوں نے حضرت حافظ صاحب سے بہت استفادہ کیا اور ان سے خوب فیض یاب ہوئے۔

جامعہ قدس اہل حدیث ہی میں ۱۹۶۳ء میں انھیں اور ان کے بعض ہم جماعت طلباء کو حضرت حافظ عبداللہ روپڑی اور حافظ عبدالقادر روپڑی کی مساعیٔ جمیلہ سے مدینہ یونیورسٹی میں داخلے کی اطلاع موصول ہوئی تو یہ لوگ انتہائی خوش ہوئے۔ جامعہ قدس سے ان کی روانگی کے موقع پر خاص تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا، جس میں کئی معروف علمائے کرام نے شرکت فرمائی۔ حافظ عبدالقادر صاحب کراچی تک بذریعہ ریل ان حضرات کے ساتھ گئے۔

حافظ ثناء اللہ صاحب نے کلیۃ الشریعہ میں داخلہ لیا اور وہاں کا نصاب مکمل کر کے سندِ فراغ لی۔ واپس وطن آ کر پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے عربی اور ایم اے اسلامیات کے امتحانات دیے اور دونوں امتحانوں میں اول پوزیشن حاصل کی۔

پاکستان اور مدینہ منورہ میں انھیں جن جید اساتذہ کرام کے حضور زانوے ادب تہہ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، وہ ہیں حضرت حافظ عبداللہ روپڑی، حضرت العلام حافظ محمد گوندلوی، مولانا محمد عبدہ الفلاح، مولانا عبدالغفار حسن۔ سعودی عرب کے مرحوم مفتیِ اعظم شیخ عبدالعزیز بن باز، علامہ ناصر الدین البانی، شیخ محمد امین شنقیطی، شیخ شیبۃ الحمد، شیخ عبدالمحسن العباد، شیخ حماد انصاری اور شیخ محمد بن ارمان علی۔

مدینہ یونیورسٹی سے سندِ فراغت کے بعد انھوں نے اپنے آبائی گاؤں سرہالی کلاں (ضلع قصور) میں مسند درس بچھائی اور باقاعدہ تدریس کا آغاز کیا لیکن کچھ عرصے کے بعد اپنے عالی قدر استاذ حضرت حافظ عبداللہ روپڑی کی جگہ جامعہ قدس اہل حدیث لاہور، میں (جہاں انھوں نے اپنے حصول تعلیم کا آغاز کیا تھا) تشریف لے آئے اور طلباء کو پڑھانا شروع کیا۔ اپنے استاذ کی مسند پر بیٹھ کر خدمت تدریس انجام دینا ایک بڑا اعزاز تھا جو انھیں عطا ہوا۔

۱۹۷۲ء میں یہ سعودی حکومت کے مبعوث کی حیثیت سے جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) میں مدیرِ تعلیم اور شیخ الحدیث کے منصبِ عالی پر فائز ہوئے اور خدمات سرانجام دینے لگے۔

اللہ نے اس عالم جلیل کو بہت سی خوبیوں سے نوازا ہے۔ بہت سالوں سے حافظ عبدالرحمٰن مدنی کی جاری کردہ جامعہ لاہور الاسلامیہ (ماڈل ٹاؤن) میں شیخ الحدیث کی مسند پر متمکن ہیں۔ تقریباً پچاس مرتبہ طلبا کو صحیح بخاری پڑھا چکے ہیں۔ لاہور میں انصار السنہ کے نام سے اپنا بھی ایک تدریسی ادارہ قائم کیا ہے، جس میں منتہی طلباء کو ان کے ذہنی اور فکری رجحان کے مطابق تحریر و تدریس کی تربیت دی جاتی ہے۔ یہ نہایت اہم کام ہے جو وہ ایک عرصے سے کر رہے ہیں۔

اب آیئے ان کی قلمی تگ و تاز کی طرف۔!

جس طرح تدریس حدیث میں ان کا ایک مقام ہے اور وہ باقاعدگی کے ساتھ بدرجہ غایت محنت سے اس خدمت میں مصروف ہیں، اسی طرح قلمی صورت میں بھی وہ خدمت حدیث کا بنیادی کام پورے عزم کے ساتھ کر رہے ہیں۔

''جائزۃ الاحوذی'' کے نام سے انھوں نے جامع ترمذی کی عربی زبان میں شرح لکھی جو تین ضخیم جلدوں میں چھپی۔ نبی ﷺ کی احادیثِ مبارکہ کے سلسلے کی یہ ایک اہم ترین خدمت ہے، جسے سرانجام دینے کی اللہ تعالیٰ نے انھیں توفیق بخشی۔

دوسرا عظیم کام صحیح بخاری کی عربی شرح کا ہے جو تین چار سال سے ان کے زیر قلم ہے۔ اس کتاب (چمنستان حدیث) کی اشاعت تک ممکن ہے یہ رفیع الشان کام تکمیل کی منزل کو پہنچ جائے۔ جامع ترمذی اور صحیح بخاری کی شروح کا تعلق عربی زبان سے ہے۔

اب تیسرے قلمی کام کے متعلق سنیے جو انھوں نے اردو میں کیا۔

یہ ہے ''فتاویٰ ثنائیہ مدنیہ''۔ یہ ان کے فتاوے کی پہلی جلد ہے جو عقائد سے متعلق ہے اور جسے قاری عبدالشکور مدنی نے نہایت محنت سے ترتیب دے کر اور الگ الگ ہر مسئلے کے عنوان بنا کر اپنے ادارے (دار الارشاد ۲۱۴۔ بی سبزہ زار سکیم لاہور) کی طرف سے شائع کیا ہے۔ بڑے سائز کے ۸۸۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

حافظ صاحب ممدوح سے بے شمار لوگوں نے مختلف نوعیت کے مسائل پوچھے اور پوچھ رہے ہیں۔ ان کی اشاعت کا سلسلہ انھوں نے ۱۹۷۰ء میں ہفت روزہ ''تنظیم اہل حدیث'' اور ماہنامہ ''محدث'' (لاہور) سے شروع کیا تھا۔ ان کے علاوہ بھی جماعت اہل حدیث کے جرائد و رسائل میں ان کی اشاعت ہوتی رہی۔

بعد ازاں ۱۹۹۰ء سے ہفت روزہ ''الاعتصام'' (لاہور) میں باقاعدہ تسلسل کے ساتھ ان کے فتاویٰ جات کی اشاعت ہونے لگی۔ تمام فتوے قرآن و حدیث اور آثارِ سلف کے حوالوں سے مزین ہیں۔ فتاوے کی اچھی خاصی تعداد جدید مسائل پر محیط ہے۔ وہ ہر سوال کے جواب میں قرآن و حدیث کی اصل عبارت درج کرتے

اور نیچے اس کا ترجمہ دیتے ہیں تاکہ سائل اور عام قاری کو کسی قسم کا شبہ نہ رہے۔

مرتب فتاویٰ ہیں قاری عبدالشکور مدنی جو مدینہ یونیورسٹی کے فاضل، جامعہ اہل حدیث قدس کے مدرس اور حافظ مفتی ثناء اللہ مدنی کے شاگرد ہیں، انھوں نے فتاوے کی پہلی جلد جو کتاب العقائد پر مشتمل ہے، نہایت محنت اور ذمہ داری سے مرتب کی ہے۔ اس کے ناشر بھی وہی ہیں۔ چوں کہ وہ علم دینیہ کے فاضل، وسیع المطالعہ عالم اور منجھے ہوئے مدرس ہیں، اس لیے انھوں نے فتاوے کی ترتیب و اشاعت کا کام دل جمعی کے ساتھ کیا ہے۔ احادیث و آثار کی تخریج کی گئی ہے۔ پروف ریڈنگ کا معاملہ یوں تو ہر موضوع اور ہر زبان کی کتاب میں نہایت اہمیت رکھتا ہے، لیکن عربی کتابوں اور اردو ترجمے میں خاص طور پر دقتِ نظر کا متقاضی ہوتا ہے۔ فتاوے کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ فاضل مرتب اور نامور ناشر نے یہ کام بہت احتیاط اور عمدگی سے کیا ہے۔ حضرت حافظ مفتی ثناء اللہ مدنی خوش نصیب ہیں کہ انھیں قاری عبدالشکور مدنی جیسا شاگرد اور مرتب و ناشر ملا۔

فتاویٰ ثنائیہ مدنیہ کی دوسری جلد ترتیب کے مرحلے سے گزر چکی ہے، ممکن ہے ''چمنستان حدیث'' کی اشاعت سے پہلے ہی چھپ جاے۔

فتاویٰ ثنائیہ مدینہ پر طویل مقدمہ حافظ ڈاکٹر عبدالرشید اظہر مرحوم و مغفور نے لکھا جو خالص علمی معلومات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ فتاوی ثنائیہ مدنیہ کے لائق تکریم مصنف اور اس کے مرتب و ناشر کو اپنے دین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کے مواقع مرحمت فرمائے۔

(یہ سطور ۸۔ جولائی ۲۰۱۳ء کو ضبطِ تحریر میں آئیں)

مولانا محمد رفیق سلفی

(ولادت ۱۹۴۰ء)

ضلع اوکاڑہ کی تحصیل دیپال پور میں ایک گاؤں جھجھ خورد کے نام سے موسوم ہے۔ یہاں کے ایک معزز گھرانے میں ۱۹۴۰ء میں مولانا محمد رفیق سلفی کی ولادت ہوئی اور انھوں نے مختلف اوقات میں مندرجہ ذیل پانچ مدارس میں تعلیم حاصل کی۔

۱۔ مدرسہ فیض الاسلام شیر نگر ضلع اوکاڑہ

۲۔ مدرسہ خادم القرآن والحدیث منڈی تاندلیاں والا ضلع فیصل آباد

۳۔ دارالعلوم تقویۃ الاسلام، شیش محل روڈ لاہور

۴۔ دارالحدیث اوکاڑہ

۵۔ جامعہ سلفیہ فیصل آباد

اپنے دور کے یہ ذہین طالب علم تھے۔ جس مدرسے میں حصول تعلیم کے لیے گئے اس کے ہر امتحان میں ہمیشہ پہلی پوزیشن حاصل کی۔ ایک مرتبہ مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے زمانۂ حیات میں دارالعلوم کے سہ ماہی امتحان کا نتیجہ نکلا تو حسب روایت ان کی اول پوزیشن تھی۔ ایک اور طالب علم نے کہا اول پوزیشن میری ہے۔ معاملہ مولانا غزنوی کی خدمت میں پیش ہوا تو انھوں نے دونوں کے پرچے دیکھے۔ فرمایا رفیق کو اس کے حق سے کم نمبر دیے گئے ہیں۔ سالانہ امتحان مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی اور مولانا محمد عبدہ الفلاح نے لیا تھا۔ اس میں بھی محمد رفیق سلفی اول آئے۔ دارالعلوم کے مہتمم مولانا غزنوی نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور انعام سے نوازا۔

مولانا محمد رفیق سلفی نے جن اساتذہ کرام سے تحصیل علم کی، ان کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) حضرت حافظ محمد محدث گوندلوی، (۲) مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی (۳) مولانا شریف اللہ خاں سواتی (۴) مولانا عبدالغفار حسن (۵) مولانا حافظ محمد اسحاق حسینوی (۶) حافظ عبدالرشید گوہڑوی (۷) مولانا عبدالرشید مجاہد آبادی (۸) مولانا محمد حسین طور (۹) مولانا محمد یعقوب گوجر (۱۰) مولانا حسین امام خاں (۱۱) حافظ مختار احمد

فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولانا محمد رفیق سلفی نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ ایک سال منڈی چشتیاں ضلع بہاول نگر کے ایک مدرسے میں تدریس کی۔ ایک سال مدرسہ فیض الاسلام شیر نگر ضلع اوکاڑہ میں پڑھاتے رہے۔ یہ وہی مدرسہ ہے جہاں انھوں نے خود اپنی تعلیم کا آغاز کیا تھا۔ تین سال موضع ڈھلیانہ ضلع اوکاڑہ کے دار العلوم میں فریضۂ تدریس سر انجام دیا۔ اس کے بعد گوجراں والا کے مدرسہ محمدیہ میں (جسے بعد میں جامعہ محمدیہ کہا جانے لگا) تشریف لے آئے۔ یہاں آنے کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کو اس مدرسے کے لیے ایک مدرس کی ضرورت تھی۔ انھی دنوں قاری محمد اسلم صاحب کسی سلسلے میں دیپال پور گئے تو ان کی ملاقات مولانا محمد رفیق سلفی سے ہوئی اور دورانِ گفتگو میں انھیں ان کی علمی قابلیت کا پتا چلا۔ انھوں نے اس کی اطلاع حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کو دی۔ مولانا سلفی نے حافظ عبدالسلام بھٹوی سے بات کی تو انھوں نے فرمایا کہ وہ لائق استاذ ہیں۔ چنانچہ خط لکھ کر انھیں گوجراں والا بلایا گیا۔ یہاں دلچسپ لطیفہ یہ ہوا کہ مولانا نے ان سے پوچھا: آپ بغیر مطالعہ کے کون سی کتاب پڑھا سکتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا: بغیر مطالعہ کے تو میں قاعدہ یسرنا القرآن بھی نہیں پڑھا سکتا۔

اس مختصر گفتگو یا چند لفظی انٹرویو کے بعد انھیں مدرس مقرر کر لیا گیا۔ حدیث کی سنن نسائی، فقہ کی شرح وقایہ اور بعض دیگر کتابوں کی تدریس ان کے ذمے لگائی گئی۔ ۴۸ سال سے یہ جامعہ محمدیہ میں درس و تدریس میں مشغول ہیں۔ اس طویل مدت میں بے شمار علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا، جن میں سے چند حضرات کے نام درج ذیل ہیں:

ڈاکٹر فضل الٰہی اسلام آباد، حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی، مولانا محمد یاسین ناصر، مولانا محمد عظیم حاصل پوری، مولانا غلام ضیاء، مولانا محمد زکریا شیخوپوری، مولانا محمد مالک بھنڈر، مولانا محمد اسماعیل بلوچ، مولانا محمد زکریا میاں محمد باقر مرحوم کے پوتے۔

مولانا محمد رفیق سلفی جب گوجراں والا گئے، اسی وقت مولانا محمد اسماعیل سلفی نے انھیں وہاں کی ایک مسجد میں خطیب مقرر کر دیا تھا۔ خطابت کے علاوہ اس مسجد میں وہ درسِ قرآن بھی دینے لگے تھے۔ وہ منجھے ہوئے مدرس اور بہت اچھے خطیب ہیں۔

اب ان کی اولاد کے بارے۔!

ان کی اولاد سات بیٹے ہیں اور دو بیٹیاں۔ بڑے بیٹے کا نام محمد سلفی ہے۔ وہ عالم دین ہیں اور مسجد قدس (گوجراں والا) میں خطبہ جمعہ دیتے ہیں۔ دوسرے حافظ احمد، تیسرے حافظ عبداللہ، چوتھے محمد یحییٰ تھے جو کشمیر میں شہید ہو گئے، پانچویں ضیاء الدین، چھٹے حافظ ثاقب اور ساتویں بیٹے کا نام کاشف تھا جو وفات

پا گئے ہیں۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ مولانا محمد رفیق سلفی کی عمر دراز فرمائے اور وہ قرآن وحدیث کی تبلیغ و تدریس میں مصروف رہیں۔ ان کی اولاد کو بھی اس سلسلے میں باپ کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق ارزانی ہو۔ آمین یا رب العالمین۔

(یہ سطور ۱۶۔ مئی ۲۰۱۳ء کو سپردِ قلم کی گئیں)

ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی

(ولادت ۱۹۴۳ء)

۲۰۰۰ء میں یہ فقیر حج بیت اللہ کے لیے گیا تو مدینہ منورہ میں میرے عزیز دوست ڈاکٹر طاہر محمود سے ملاقات ہوئی۔ وہ اس وقت مدینہ یونیورسٹی میں کسی موضوع پر پی ایچ ڈی کر رہے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ پروفیسر ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی ان کے استاذ ہیں اور انھوں نے آج رات کے کھانے کی دعوت دی ہے۔ میں یہ نام اس سے پہلے سن چکا تھا اور ان کے کچھ حالات بھی میرے علم میں آئے تھے۔ نہایت خوشی ہوئی کہ آج ان سے ملاقات ہوگی اور اس خالص علمی شخصیت سے بات چیت کا موقع ملے گا۔

مغرب کے بعد ہم ان کے مکان پر پہنچے۔ دروازے پر ضیا اعظمی کے نام کی تختی نصب تھی۔ وہ انتظار کر رہے تھے۔ میں نے سر سے پاؤں تک انھیں دیکھا۔ پورا قد، گداز جسم، بھرا ہوا چہرہ، کشادہ پیشانی، چوڑا سینہ، مضبوط کندھے، موٹی آنکھیں، گندمی رنگ میں سرخی کی آمیزش۔ نہایت تپاک سے ملے۔ سبک لہجے اور نرم زبان سے گفتگو کا آغاز کیا۔ شیریں اسلوبِ کلام اور متانت سے بھرپور طریق گفتار۔ دس گیارہ اور حضرات تشریف فرما تھے، جنھیں خاص طور پر بلایا گیا تھا۔ یہ ایک دلچسپ مجلس تھی جو تقریباً ڈیڑھ گھنٹا جاری رہی اور ڈاکٹر صاحب کے بارے میں مجھے بہت سی معلومات عطا کر گئی۔ اس کے بعد جون ۲۰۰۸ء میں عمرے کے لیے گیا تو ۲۸ جون کو ہفتے کے روز صبح ساڑھے چھے بجے کے قریب ڈاکٹر عبدالرحمٰن فریوائی (جو سعودی عرب کے دار الحکومت ریاض کی ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں) مکہ مکرمہ میں میری قیام گاہ پر پہنچے۔ ڈاکٹر فریوائی کو میری آمد کی اطلاع حافظ احمد شاکر کے فرزندِ گرامی عزیزی حماد شاکر نے دی تھی اور پھر انھوں نے ریاض سے مکہ مکرمہ میں جناب عزیز شمس صاحب سے رابطہ کر کے میرے ہوٹل کا پتا کیا اور بذریعہ جہاز ریاض سے مکہ مکرمہ آئے اور مجھے ملے۔ یہ اچانک ملاقات تھی۔ ان سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔

اب میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن فریوائی کی تحویل میں تھا۔ ہم نے ایک پاکستانی ہوٹل میں ناشتہ کیا۔ پھر رابطہ عالم اسلامی کے دفتر گئے اور مختلف مقامات میں حاضری دی۔ بعد ازاں جدے آئے۔ وہاں ڈاکٹر فریوائی کے بعض شاگردوں اور دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ رات کا کھانا ان کے دوست شیخ عبدالجبار عبدالغنی سلفی کے ہاں کھایا اور شب کے ساڑھے گیارہ بجے ٹیکسی لی اور مدینہ منورہ کو روانہ ہوئے۔ ڈھائی بجے مدینہ منورہ پہنچے۔ یہ نہایت

بہجت انگیز سفر تھا۔ تمام راستے میں میری آنکھیں کھلی رہیں اور میں ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ ہر طرف روشنی کا سیلاب۔ آنے جانے کی دو طرفہ کشادہ سڑکیں اور نہایت عمدہ فضا۔ مدینہ منورہ میں بابِ مجیدی کے سامنے ایک ہوٹل میں کمرہ لیا اور ایک گھنٹا وہاں آرام کیا۔

اس کے بعد مسجد نبوی کو روانہ ہوئے اور با جماعت نمازِ فجر ادا کی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے نور کی بارش ہو رہی ہے۔ مسجد نبوی سے باہر نکل کر ڈاکٹر اعظمی کو ٹیلی فون کیا۔ وہ مسجد ہی میں تھے۔ ان کے انتظار میں ہم وہیں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر صاحب آ گئے۔ وہ اپنی گاڑی میں سوار تھے۔ ہمیں اپنے گھر لے گئے۔ وہیں ناشتہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب سے آٹھ سال بعد ملاقات ہوئی تھی۔ شکل و شباہت اور قد و قامت تو ظاہر ہے، وہی آٹھ برس پہلے والی تھی، لیکن داڑھی پر سفیدی نے غلبہ پا لیا تھا اور صحت کمزوری کی طرف مائل ہو گئی تھی۔ شام کو ریاض سے کتابوں کی نشر و اشاعت کے بین الاقوامی ادارے دار السلام کے بانی و ناظم مولانا عبدالمالک مجاہد آ گئے۔ رات کا کھانا ڈاکٹر اعظمی صاحب کے ہاں کھایا۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن فریوائی اور عبدالمالک مجاہد صاحب تو رات کو ریاض چلے گئے۔ میں نے مکہ مکرمہ جانا تھا، لیکن ڈاکٹر صاحب نے مجھے روک لیا اور ہم دونوں کافی دیر ان کی علمی سرگرمیوں کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ دوسرے دن مکہ مکرمہ گیا۔ ڈاکٹر اعظمی صاحب کا کمرہ مختلف موضوعات کی بے شمار کتابوں سے مزین تھا، جن میں زیادہ تر عربی کتابیں تھیں، چند اردو کی بھی تھیں۔

اب آیئے اس مردِ ذی منزلت کے ضروری کوائفِ حیات کی طرف۔!

ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی ۱۹۴۳ء میں ہندوستان کے صوبہ یوپی کے ضلع اعظم گڑھ کے ایک قصبے میں پیدا ہوئے۔ ان کے آبا و اجداد ہندوؤں کے آریہ مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد برادری کی سرکردہ شخصیت تھے اور کلکتے میں ان کا اچھا خاصا کاروبار تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے مڈل تک اپنے قصبے کے مڈل سکول سے تعلیم حاصل کی۔ پھر اعظم گڑھ کے شبلی کالج میں داخلہ لیا، جس میں ہائی کلاسوں کا بھی انتظام تھا۔ یہیں سے ان کے کاروانِ حیات نے ایک نیا موڑ کاٹنا شروع کیا۔ ۱۹۵۹ء میں جب کہ ان کی عمر سولہ سال کی تھی، انھوں نے میٹرک کا امتحان دیا۔ گھر آئے تو ایک شخص نے ان کو مطالعہ کے لیے مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کی کتاب "دینِ حق" کا ہندی ترجمہ دیا۔

مطالعہ کا انھیں پہلے سے شوق تھا۔ یہ کتاب پڑھی تو دل پر ایک عجیب قسم کی دستک ہوئی۔ اسے کئی دفعہ پڑھا اور اندر کی دنیا میں خوش گوار تبدیلی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ پھر کہیں سے حاصل کر کے ان کی اور کتابیں پڑھیں جو ہندی زبان میں منتقل ہو چکی تھیں۔ اسی اثنا میں انھیں خواجہ حسن نظامی کا ہندی ترجمہ قرآن

مل گیا۔ وہ پڑھتا تو حالات مزید بدل گئے۔ آہستہ آہستہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ انھوں نے نماز بھی سیکھ لی اور چوری چھپے نماز پڑھنا بھی شروع کر دی۔ پھر باقاعدہ اسلام قبول کر لیا لیکن اس کا اعلان نہیں کیا۔

ان کے نماز پڑھنے اور خفیہ طور پر اسلام قبول کرنے کا علم ان کے بعض رشتے داروں کو بھی ہو گیا۔ انھوں نے بذریعہ خط کلکتے ان کے والد کو اطلاع دی کہ بیٹا ہاتھ سے نکل رہا ہے اور راہِ اسلام پر گامزن ہو گیا ہے۔ وہ فوراً اعظم گڑھ پہنچے، لیکن بیٹے سے براہِ راست کچھ نہیں کہا۔ البتہ ان کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتے رہے۔ پھر خیال کیا کہ شاید اس پر جن بھوت کا کوئی اثر پڑا ہے۔ یہ اثر دور کرنے کے لیے پنڈتوں اور پروہتوں کی خدمات حاصل کی گئیں، وہ کچھ منتر پڑھتے اور ان پر جھاڑ پھونک کرتے، لیکن ان پر کسی قسم کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ منتر پڑھ کر کچھ کھانے پینے کو دیتے تو یہ بسم اللہ پڑھ کر کھا پی لیتے۔

پھر والد صاحب نے انھیں الہ آباد بھیج دیا۔ وہاں کے کئی پنڈتوں اور پروہتوں نے جھاڑ پھونک کے ساتھ ساتھ انھیں سمجھانے کی کوشش بھی کی۔ یہ بھی ان سے ہندو مذہب کے بارے میں بحث کرنے لگے۔ آخر یہ بھی کہا گیا کہ تم نے ہندو مذہب چھوڑنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو مسلمان ہونے کے بجائے عیسائی مذہب اختیار کر لو۔ موجودہ دور میں مسلمان پسماندہ حالت میں ہیں اور عیسائی ان کے مقابلے میں خوش حال ہیں اور ان کا مذہب اسلام سے بہتر ہے۔ انھوں نے جواب دیا، میں مسلمانوں سے متاثر ہو کر اسلام قبول نہیں کر رہا ہوں بلکہ اسلام سے اثر پذیر ہو کر حلقۂ اسلام میں داخل ہو رہا ہوں۔

اب ایک اور حربہ استعمال کیا گیا۔ والدین اور بہن بھائیوں نے بھوک ہڑتال کر دی اور فیصلہ کیا کہ جب تک یہ لڑکا اسلام ترک نہیں کرے گا اور پہلے کی طرح ہندو مذہب کی پابندی کا اعلان نہیں کرے گا، اس وقت تک وہ کھانے کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ یہ سخت پریشان کن صورت حال تھی، لیکن اللہ نے اس میں بھی ان کو استقامت بخشی اور مسئلہ حل ہو گیا۔

پھر ایک اور معاملہ سامنے آیا۔ وہ ایک مولوی صاحب کو لے آئے، جنھوں نے فرمایا کہ اسلام کسی شخص کو والدین کی مرضی کے بغیر اپنے حلقے میں شمولیت کی اجازت نہیں دیتا۔ جب تک آپ کے والدن زندہ ہیں، آپ اسلام کو بے شک اپنے دل میں رکھیں لیکن نماز روزے سے اجتناب کریں۔ مولوی صاحب کی اس بات پر انھیں تعجب تو ہوا مگر اسلام کا حکم سمجھتے ہوئے، اسے تسلیم کر لیا۔ اس وقت انھیں اس قسم کے معاملات کا زیادہ علم بھی نہ تھا۔ اب گھر کے تمام افراد ان پر بہت خوش تھے۔ کچھ روز کے بعد پتا چلا کہ مولوی صاحب کا تعلق ایک ایسے فرقے سے ہے جو خود کو مسلمانوں سے علیحدہ سمجھتا ہے اور ان کے اس فتوے یا مشورے کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ پتا چلنے کے بعد انھوں نے دوبارہ نماز پڑھنا شروع کر دی اور ساتھ ہی ہندو مذہب سے

برأت کا اعلان کر دیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن یہ مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے کہ مقامی ہندوؤں کا ایک جتھا مسجد میں گھس آیا اور نمازیوں پر حملہ کر دیا۔ اب انھوں نے مسجد میں سب کے سامنے بلند آواز سے قبول اسلام کا اعلان کیا اور کہا کہ ہندومت سے میرا ہرگز کوئی تعلق نہیں ہے۔

پھر انھیں ایک نہایت متعصب ہندو تنظیم آر ایس ایس (راشٹریہ سیوک سنگھ) کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ انتہائی تشدد پسند تنظیم ہے۔ ان کے مسلمان دوستوں کو اس کا پتا چلا تو انھوں نے شہر سے باہر ایک ایسے دوست کے گھر ایک کمرے میں انھیں بند کر دیا، جہاں ڈھور ڈنگر بندھے ہوئے تھے۔ اب ہندو تنظیم کے ارکان نے ان کی تلاش شروع کی، لیکن وہ تلاش میں ناکام رہے۔ یہ رمضان کا مہینا تھا۔ وہیں آخری روزے رکھے اور وہیں عید کی نماز پڑھی۔ ایک ہفتہ اسی طرح گزرا۔ بعد ازاں ان کی خواہش پر انھیں بدایوں کے ایک دور دراز قصبے کی درس گاہ میں بھیج دیا گیا۔ یہ مقام بہ ظاہر ہندو تنظیم کے ارکان کی رسائی سے محفوظ تھا۔ وہاں دینی تعلیم کے ساتھ انھوں نے اردو زبان بھی سیکھنا شروع کر دی، اس لیے کہ تمام اسلامی احکام اردو زبان میں منتقل ہو چکے ہیں۔ ڈیڑھ سال کا عرصہ گزرا ہوگا کہ ہندو تنظیم کے کارکن ان کی تلاش میں وہاں پہنچ گئے۔ لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے اس کی اطلاع انھیں اور مدرسے کے اربابِ اہتمام کو ہو چکی تھی، اس لیے یہ وہاں سے بہ آسانی نکل گئے۔

اب ان کی منزل جنوبی ہند کا صوبہ مدراس تھا۔ وہاں کی مشہور دینی درس گاہ ''دارالاسلام'' کے ارباب حل وعقد پہلے سے ان کے بارے میں معلومات رکھتے تھے۔ انھوں نے ان کا انتہائی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ یہاں انھیں تقریباً پانچ سال پوری یک سوئی اور دلجمعی سے دینی تعلیم حاصل کرنے کا موقع میسر آیا۔

اس دار العلوم میں کم وبیش پانچ سال گزارنے کے بعد انھوں نے کچھ عرصے کے لیے اپنے آبائی قصبے میں جانے کا فیصلہ کیا اور وہاں اسی دوست کے ہاں مقیم ہوئے، جنھوں نے سب سے پہلے ان کو مولانا مودودی کی کتاب دین حق کے ذریعے اسلام اور اس کی تعلیم سے روشناس کرایا تھا۔ لوگوں کو ان کی آمد کی خبر ہوئی تو بہت بڑی تعداد میں ان سے ملاقات کے لیے آئے۔ عجیب تر بات یہ ہے کہ ان سے ملاقات کرنے والوں میں ہندو بھی شامل تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوؤں نے جب دیکھا کہ اس قدر مصائب اور شدائد کے باوجود وہ اسلام پر قائم رہے اور کوئی لالچ اور خوف انھیں راہِ حق سے دور نہ کر سکا تو ان کی نفرت عقیدت میں بدل گئی۔ اسی دوران میں عید الفطر آ گئی۔ مسلمانوں نے اعلان کر دیا کہ عید کی نماز ضیاء الرحمٰن اعظمی پڑھائیں گے اور خطبۂ عید بھی وہی دیں گے۔ اس اعلان کے نتیجے میں نہ صرف قصبے اور قرب و جوار کے ہزاروں مسلمان

بڑے بڑے جلوسوں کی شکل میں عیدگاہ میں جمع ہونے لگے بلکہ عیدگاہ کے چاروں طرف ہزاروں ہندو بھی ان کی تقریر سننے کے لیے پہنچ گئے۔ وہ لوگ اس بات پر بے حد حیران تھے کہ مسلمانوں نے ایک ایسے شخص کو جو ابھی چند سال پہلے ہندو تھا، اپنی مذہبی پیشوائی اور امامت کے منصب پر کس طرح فائز کر دیا۔ وہ اسلام کے اس پہلو اور ان کی تقریر سے بہ درجہ غایت متاثر ہوئے۔

اس موقعے پر وہ اپنے والدین سے بھی ملے۔ ان میں بھی خاصی تبدیلی آ چکی تھی بلکہ اگر انھیں ایسے حالات سے دوچار ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا جو بیٹے کو پیش آ چکے تھے تو ممکن ہے وہ بھی حلقہ بگوشِ اسلام ہو جاتے۔

۱۹۶۶ء میں وہ مدراس کے دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہوئے تو مزید تعلیم کے لیے مدینہ یونیورسٹی پہنچے اور انھیں فوراً داخل کر لیا گیا۔ وہاں کا نصاب انھوں نے چار سال میں مکمل کیا اور بعد ازاں ۱۹۷۰ء میں جلالۃ الملک جامعہ عبدالعزیز مکہ مکرمہ (جسے اب جامعہ ام القریٰ کہا جاتا ہے) میں ایم اے میں داخلہ لیا اور ایک تحقیقی مقالہ لکھا۔ ان کے ایم اے کے مقالے کا عنوان تھا ''ابوہریرہ فی ضوء مرویاتہ، فی شواہدہ وانفرادہ''۔ ایم اے کے امتحان کے بعد ۱۹۷۳ء میں انھیں رابطۂ عالم اسلامی سے منسلک کر لیا گیا اور رابطہ میں ایک اہم ذمہ دارانہ منصب پر فائز کیے گئے۔ یہ ایک بڑا اعزاز تھا جو انھیں حاصل ہوا، لیکن اس کے بعد بھی انھوں نے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور جامعہ ازہر (قاہرہ، مصر) سے پی ایچ ڈی کیا۔ ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ نبی ﷺ کے ان عدالتی فیصلوں پر مشتمل ہے جو آپ نے اپنی حیاتِ بابرکات میں صادر فرمائے۔ اس کا عنوان ہے ''اقضیۃ رسول اللہ ﷺ''

۱۹۷۹ء میں وہ مدینہ یونیورسٹی سے وابستہ ہو گئے اور وہاں کلیۃ الحدیث (حدیث فیکلٹی) میں پروفیسر کے طور پر خدمات انجام دینے لگے۔ وہ طویل عرصے تک مدینہ یونیورسٹی میں پڑھاتے رہے اور دنیا کے مختلف ممالک کے بے شمار علماء وطلبا نے ان سے استفادہ کیا جو متعدد مقامات میں مصروف عمل ہیں۔

اب آیئے ان کی تصنیفی کاوشوں کی طرف۔!

اللہ نے جہاں ان کو درس وتدریس اور تقریر وخطابت کی صلاحیتوں سے نوازا ہے، وہاں تحریر ونگارش کی نعمت بھی فراوانی سے عطا فرمائی ہے۔ وہ بلند پایہ مصنف اور نامور اہل قلم ہیں۔ انھوں نے عربی، اردو، ہندی تینوں زبانوں میں لکھا، جس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

۱۔ قرآن کے سائے میں (ہندی): تعلیم یافتہ ہندوؤں کے خاص قسم کے مزاج کو سامنے رکھ کر اس کتاب میں انھیں اسلام کی دعوت دی گئی ہے۔ اپنے موضوع کی یہ ایک اہم کتاب ہے۔

۲۔ تلواروں کے سائے میں (اردو): اس کتاب میں اسلام کے ابتدائی دور سے لے کر دورِ حاضر تک

کے ان اصحابِ دعوت وعزیمت کا ذکر کیا گیا ہے، جنھوں نے زبان وقلم اور مال و جان سے راہِ حق میں جہاد کیا اور مستقل مزاجی کے ساتھ اس کی تبلیغ و اشاعت کو اپنا اصل مطمحِ نظر قرار دیے رکھا۔

۳۔ گنگا سے زمزم تک (اردو): اس کتاب میں فاضل مصنف نے اپنے قبول اسلام کی داستان بیان کی ہے اور اس سلسلے میں جن مصائب و آلام سے انھیں گزرنا پڑا، اس کی پوری تفصیل ضبطِ تحریر میں آ گئی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے احیاے اسلام کی ان تحریکوں کا بھی ذکر کیا ہے جو بیسویں صدی میں ابھریں اور اسلام اور ملت اسلامیہ کے خلاف ان سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا تذکرہ بھی اس میں آ گیا ہے جو بعض عناصر کی طرف سے کی گئیں۔ نیز اس دور کی ممتاز عالمی اسلامی شخصیتوں کے بارے میں بھی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔

۴۔ ابو هريره في ضوء مروياته، في شواهده و انفراده (عربی): دراصل یہ ان کا ایم اے کا تحقیقی مقالہ ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ دین اسلام کا قصرِ رفیع کتاب وسنت کی بنیادوں پر استوار ہے اور حدیث رسول ﷺ کو تسلیم کرنا انتہائی ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے ان اعتراضات کا جواب مدلل صورت میں دیا ہے جو حدیث سے متعلق بعض حلقوں کی طرف سے کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک اعتراض یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ۹ھ میں جنگ تبوک کے موقع پر ایمان لائے اور نبی ﷺ کی وفات تک صرف تین برس کے عرصے میں تقریباً ساڑھے پانچ ہزار احادیث روایت کیں، جب کہ اس اثنا میں کچھ عرصہ یمن کے قاضی بھی رہے۔ دربار رسالت ﷺ میں ان کی حاضری کی مدت بہ مشکل تین سال بنتی ہے۔ اس قلیل مدت میں انھوں نے ساڑھے پانچ ہزار احادیث کیسے روایت کر لیں، جب کہ بعض صحابہ کرام بیس بیس سال سے بھی زیادہ عرصے تک نبی ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر رہے، لیکن ان سے مروی احادیث بڑی مشکل سے چند سو ہوں گی، لہٰذا ثابت ہوا کہ احادیث کا بڑا حصہ ناقابلِ اعتبار ہے۔ ڈاکٹر اعظمی صاحب نے اس اعتراض کا نہایت تفصیل سے جواب دیا ہے۔ یہ ایسی کتاب ہے، جس کا اردو میں بھی ترجمہ ہونا چاہیے۔

۵۔ اقضية الرسول ﷺ (عربی): ڈاکٹر صاحب ممدوح کا یہ پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔ اس میں نبی ﷺ کے ان فیصلوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو آپ نے اپنی ۲۳ سالہ نبوت کی حیات طیبہ میں سربراہِ مملکت اور قاضی کی حیثیت سے صادر فرمائے۔ اس کا اردو ترجمہ پروفیسر غلام احمد حریری مرحوم نے کیا تھا جس نے زبان و انداز کے اعتبار سے بڑی مقبولیت حاصل کی۔

کتاب "اقضية الرسول ﷺ" دراصل اندلس کے ممتاز محدث وفقیہ ابوعبداللہ محمد بن الفرج مالکی کی

تصنیف ہے، جنھوں نے علمی حلقوں میں ابن الطلاّع کے نام سے شہرت پائی۔ وہ ۴۰۴ھ میں پیدا اور ۴۹۷ھ میں فوت ہوئے۔ اس کتاب میں انھوں نے نہایت محنت سے رسول اللہ ﷺ کے وہ احکام و قضایا علیحدہ علیحدہ عنوانات قائم کر کے جمع کر دیے ہیں جو حدیث کی مختلف کتابوں میں درج تھے۔

یہ مہتم بالشان قلمی کتاب ایک مدت سے اصحابِ علم کی نظروں سے اوجھل تھی اور اس کے جو چند نسخے دور دراز ملکوں کی بعض لائبریریوں میں موجود تھے، وہ پرانے رسم الخط میں لکھے ہوئے تھے اور انھیں حاصل کرنا، انھیں پڑھنا اور ان سے استفادہ کرنا نہایت مشکل تھا، لیکن ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی کو اللہ نے توفیق مرحمت فرمائی اور اس کتاب تک ان کی رسائی ہوئی۔ انھوں نے اسے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کا موضوع بنایا اور وہ گراں قدر خدمت سرانجام دی، جس پر اہلِ ذوق ان کے نہایت ممنون ہیں اور اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔

انھوں نے کتاب میں مندرج احادیث کی تخریج کی، جرح و تعدیل کے اصول کی روشنی میں احادیث کی صحت و عدم صحت کو واضح کیا۔ علاوہ ازیں اس موضوع سے متعلق انھوں نے مختلف فقہی مسالک بھی بیان کر دیے ہیں۔ ایک اہم کام یہ کیا کہ ''استدراکات'' کے عنوان سے رسول اللہ ﷺ کی وہ احادیث بھی درج کر دیں جو کتاب میں شامل نہیں تھیں۔ آخر میں مراجع اور اعلام وغیرہ کا اندراج کر دیا گیا ہے، جس سے کتاب کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔

۶۔ الدراسة في اديان الهند (عربی): اس کتاب میں برصغیر کے چار مذاہب (۱) ہندو مذہب (۲) بدھ مذہب (۳) جین مذہب اور (۴) سکھ مذہب کا تحقیقی صورت میں جائزہ لیا گیا ہے اور ان کے عقائد و تصورات کی وضاحت کی گئی ہے۔

۷۔ اليهودية و النصرانية: یہ بھی عربی زبان میں ہے جس میں یہودیت و نصرانیت کے آغاز و ارتقا اور تحریف و تغیر وغیرہ امور سے متعلق بحث کی گئی ہے۔

۸۔ دراسات في الجرح و التعديل (عربی): اصول حدیث کی ایک نہایت اہم اصطلاح ''الجرح والتعدیل'' ہے۔ ڈاکٹر اعظمی نے اس کتاب میں جرح و تعدیل کے اصول کی تشریح بھی کی ہے اور متعدد جلیل القدر ائمہ حدیث کے ضروری کوائف حیات اور ان کی خدماتِ حدیث کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

۹۔ المدخل في السنن الكبرٰى للبيهقي (عربی): یہ امام بیہقی رحمہ اللہ کی کتاب ''السنن الکبریٰ'' کے مقدمہ کی تحقیق ہے۔ یہ مقدمہ نایاب تھا اور اس کا ایک نسخہ ایشین سوسائٹی کلکتہ کی لائبریری میں موجود تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس پر تحقیق بھی کی ہے اور اس پر مقدمہ بھی لکھا ہے۔

۱۰۔ السنن الصغری للبیهقی (عربی): یہ امام بیہقی کی مشہور کتاب ''السنن الصغریٰ'' ہے جو چار جلدوں پر محیط ہے، ڈاکٹر صاحب نے اس پر کام کیا ہے۔

۱۱۔ امالی ابن مرویه المتوفی ۴۱۰ھ (عربی): ڈاکٹر صاحب کی تحقیق مع مقدمہ۔

۱۲۔ فتح الغفور فی وضع الایدی علی الصدور (عربی): علامہ محمد حیات سندھی (متوفی ۱۱۶۳ھ) کی اس کتاب پر مقدمہ اور تحقیق۔

۱۳۔ معجم مصطلحات الحدیث و لطائف الاسانید (عربی)

۱۴۔ التمسك بالسنة فی العقائد و الاحکام (عربی): اس کا اردو ترجمہ پروفیسر ڈاکٹر طاہر محمود نے کیا۔

۱۵۔ الجامع الکامل فی الحدیث الصحیح الشامل: یہ نہایت اہم کام ہے، جس کو ڈاکٹر اعظمی صاحب نے مرکزِ توجہ ٹھہرایا۔ احادیث کا یہ وہ عدیم المثال مجموعہ ہے جو پورے کا پورا صحیح احادیث پر مشتمل ہے۔ اس خوب صورت مجموعے کا نام انھوں ''الجامع الکامل فی الحدیث الصحیح الشامل'' رکھا ہے۔ یہ بے حد محنت طلب کام ہے، جس کی تکمیل کا انھوں نے عزم کیا۔ بے شمار کتب حدیث موجود ہیں جن میں لا تعداد احادیث درج ہیں۔ ان کتابوں سے چھان بین کر کے صحیح احادیث جمع کرنا بہت مشکل کام ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب موصوف کو اللہ تعالیٰ نے توفیق بخشی کہ شب و روز کی مسلسل جدوجہد سے انھوں نے یہ خدمت سرانجام دی۔ ۲۰۰۱ء کے آس پاس انھوں نے اس اہم کام کا آغاز کیا تھا اور ۲۰۰۸ء تک اس کی نو ضخیم جلدیں مکمل ہو چکی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ آئندہ پانچ سال (۲۰۱۳ء) تک یہ کام تکمیل کی منزل کو پہنچ جائے گا۔ ان کے اندازے کے مطابق تمام جلدیں مکمل ہونے پر صحیح احادیث کی تعداد کم و بیش پندرہ ہزار تک ہوگی۔ کتاب کا آغاز انھوں نے علم و ایمان سے متعلق احادیث سے کیا، کیوں کہ اسلام میں علم و ایمان ہی کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ اس کے بعد نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، جہاد، نکاح، طلاق، میراث وغیرہ کے سلسلے کی احادیث مندرج ہیں۔

میں نے ۱۹۔ اگست ۲۰۱۳ء کو ڈاکٹر اعظمی صاحب سے مدینہ منورہ ٹیلی فون کر کے دریافت کیا کہ یہ کتاب اب کس منزل میں ہے تو انھوں نے فرمایا کہ کتاب مکمل ہوگئی ہے اور بائیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ بیس جلدیں کمپوزنگ کے مرحلے سے گزر چکی ہیں۔ کتاب تقریباً پندرہ ہزار صحیح احادیث کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

اسی سلسلے میں میں نے ریاض ڈاکٹر عبدالرحمٰن فریوائی کو ٹیلی فون کیا تو ان کے صاحب زادے عبدالمحسن صاحب نے بتایا کہ وہ چند روز کے لیے ہندوستان تشریف لے گئے ہیں، میں نے ان سے ہندوستان کا فون

نمبر لیا اور ان سے رابطہ کر کے ڈاکٹر اعظمی صاحب کے متعلق بعض معلومات حاصل کیں۔

کتاب کی تکمیل پر میں نے ڈاکٹر اعظمی صاحب کو مبارک باد دی اور بہ درجہ غایت مسرت ہوئی کہ تنہا ایک شخص نے اتنا عظیم الشان کام کیا۔ حضرت امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی رفیع المرتبت تصنیف ''الجامع الصحیح'' میں مقدمہ ابن الصلاح کے مصنف شہیر کے بقول سات ہزار دو سو پچھتر (۷۲۷۵) صحیح احادیث درج فرمائی ہیں جنھیں ہم اصل اور بنیادی کتاب قرار دیتے ہیں، لیکن ڈاکٹر اعظمی صاحب کی کتاب ''الجامع الکامل فی الحدیث الصحیح الشامل'' کو اس کے تکملہ سے تعبیر کرنا چاہیے۔ اب اس خاک نشین کے خیال میں کہا جا سکتا ہے کہ مختلف کتب احادیث میں منقول تمام صحیح احادیث ایک ہی کتاب ''الجامع الکامل فی الحدیث الصحیح الشامل'' میں درج کر دی گئی ہیں اور بائیس جلدوں میں پھیلی ہوئی یہ کتاب طباعت کی منزل سے گزر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے عاجزانہ دعا ہے کہ وہ ان احادیث کے جامع ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی کی اس منفرد نوعیت کی عظیم خدمت کو شرفِ قبولیت سے نوازے اور اسے دنیا و آخرت میں اس کا بہترین اجر عطا فرمائے اور ان کے لیے یہ صدقہ جاریہ ثابت ہو۔ آمین یا رب العالمین۔

۱۶۔ لغات القرآن: ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی کی یہ کتاب ہندی زبان میں ہے اور دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ ہندوستان میں چھپ گئی ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ بھی ہو گیا ہے۔ اردو ترجمہ پروفیسر ڈاکٹر عبدالرحمٰن فریوائی کر رہے ہیں جو ریاض (سعودی عرب) کی ایک یونیورسٹی میں علومِ حدیث کے استاذ ہیں ڈاکٹر اعظمی نے اس کتاب میں خالص علمی انداز میں حسب ذیل امور کی وضاحت فرمائی ہے۔

☆ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل فرمودہ وہ کتاب ہے، جس میں دنیا کے ہر طبقے کے لوگوں کو مخاطب فرمایا گیا ہے۔ ان میں یہودی، عیسائی، ہندو سب شامل ہیں۔

☆ نبی ﷺ کو دنیا بھر کے تمام لوگوں کے لیے بشیر و نذیر اور آپ کے وجودِ گرامی کو پوری انسانیت کے لیے باعث رحمت قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ (الانبیاء: ۱۰۷)

''اے پیغمبر! ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لیے پیکرِ رحمت بنا کر بھیجا۔''

آپ کی نبوت تمام لوگوں کے لیے ہے۔

﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا﴾ (الاعراف: ۱۵۸)

''اے پیغمبر فرما دیجیے کہ لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا فرستادہ ہوں۔''

☆ قرآن مجید اور حدیثِ پاک کی روشنی میں اللہ پر، فرشتوں پر، انبیاء پر، قرآن پر، قیامت پر، تقدیر پر،

جنت و دوزخ اور دیگر امورِ غیبیہ پر ایمان لانا اور ہر ان سب کو صحیح سمجھنا ضروری ہے۔

☆ شرک، بت پرستی، بداخلاقی اور کارِ معصیت سے دامن کشاں رہنا چاہیے۔

☆ قرآن مجید میں نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج بیت اللہ، نکاح، طلاق اور معاملات وغیرہ سے متعلق جو احکام دیے گئے ہیں، کتاب میں ان کی تفصیل بیان کی گئی ہے اور ان کی حکمت سے مطلع کیا گیا ہے۔

☆ انبیاء علیہم السلام کی تاریخ، ان کی دعوت، ان کے واقعاتِ زندگی اور ان کے کارناموں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور پھر ان کی دعوت کے نتیجے میں ان کی قوم کے لوگوں نے انھیں جن اذیتوں میں مبتلا کیا، ایک خاص اسلوب میں اس کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

☆ کتاب میں ڈاکٹر اعظمی صاحب نے بتایا ہے کہ قرآن مجید میں متعدد بادشاہوں اور مختلف ادوار کی بہت سی شخصیتوں کا ذکر کیا گیا ہے اور جن حالات سے وہ گزرے، ان کی وضاحت کی گئی ہے۔

☆ قرآن مجید کی روشنی میں اخلاق، احسان، نیکی، صلہ رحمی، لوگوں سے میل جول کے طریقے، حسنِ سلوک، ہمدردئ خلائق، مسلمانوں اور غیر مسلموں سے بہتر انداز سے پیش آنا، ان کا اور ان کے مذہب کا احترام کرنا وغیرہ امور کی وضاحت کی گئی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اپنے موضوع کی یہ نہایت اہم کتاب ہے۔ اس میں تبلیغ اسلام کے اصول و اسلوب کی خوب صورت طریقے سے صراحت کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ جس قدر شیریں الفاظ اور میٹھے لہجے سے تبلیغ کی جائے گی اسی قدر موثر ثابت ہوگی۔ پھر خود مبلغ کا عمل بھی اس کی گفتگو سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ گفتار کے ساتھ کردار کو بھی بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

(یہ سطور ۱۹۔ اگست ۲۰۱۳ء کو لکھی گئیں۔ اس مضمون کے سلسلے میں کچھ معلومات تو مجھے خود ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی سے حاصل ہوئیں اور کچھ باتوں کا علم ڈاکٹر طاہر محمود، ڈاکٹر عبدالرحمٰن فریوائی اور مکرم و محترم جناب عزیز شمس صاحب سے چلا اور بعض باتوں کا پتا اس انٹرویو سے چلا جو ڈاکٹر اعظمی صاحب سے پروفیسر الیف الدین ترابی نے لیا اور جنوری ۱۹۷۸ء کے ''اردو ڈائجسٹ'' میں چھپا اور پھر اس کے حوالے سے ڈاکٹر عبدالغنی فاروق کی کتاب ''ہم کیوں مسلمان ہوئے'' میں شائع ہوا۔)

ڈاکٹر محمد سلیمان اظہر

(ولادت.....۱۹۴۴ء)

مولانا عبداللہ گورداس پوری کا تذکرہ میں نے اپنی ایک کتاب ''بزم ارجمنداں'' میں کیا ہے۔ افسوس ہے مولانا ممدوح ۷۔مئی ۲۰۱۲ء کو اپنے مسکن بورے والا میں وفات پا گئے۔ ڈاکٹر محمد سلیمان اظہر ان کے بڑے بیٹے ہیں جو اپنے قلمی نام محمد بہاء الدین سے معروف ہیں اور زیادہ تر اسی نام سے ان کا تحریری سلسلہ جاری رہتا ہے۔ انھوں نے آج سے تیرہ سال قبل ۲۰۰۰ء میں مرزائیت کے خلاف ''تحریک ختم نبوت'' کے نام سے کتابی صورت میں لکھنا شروع کیا تھا۔ اس کی پہلی جلد پر ''حرفے چند'' کے عنوان سے اس فقیر نے مقدمہ لکھا۔ اب تک اس کتاب کی تیرہ جلدیں چھپ چکی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ''تاریخ اہل حدیث'' کے نام سے بھی وہ لکھ رہے ہیں۔ اس کی چار جلدیں معرضِ اشاعت میں آ چکی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف سے میری آخری ملاقات یکم جنوری ۱۹۸۵ء کو اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور میں ہوئی تھی، جب کہ میں وہاں ایم اے کا زبانی امتحان لینے گیا تھا اور ڈاکٹر صاحب اس یونیورسٹی میں اسلامیات کے پروفیسر تھے۔ یہ آج سے اٹھائیس برس قبل کی بات ہے۔ اس کے بعد اس یونیورسٹی میں ایسے حالات پیدا ہوئے کہ وہ ملازمت چھوڑ کر برطانیہ چلے گئے اور وہیں ملازمت کرتے ہوئے ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچے۔

اب آئندہ سطور میں ان کے حالات ملاحظہ ہوں۔

وہ ۱۹۴۴ء کے لگ بھگ دھاری وال ضلع گورداس پور (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد محترم مولانا عبداللہ صاحب فریضۂ خطابت انجام دیتے تھے۔ تقسیم ملک کے نتیجے میں یہ خاندان مختلف مقامات کے چکر لگاتا ہوا ضلع وہاڑی کے شہر بورے والا پہنچا اور پھر یہیں آباد ہو گیا۔ اسی شہر میں ڈاکٹر محمد سلیمان اظہر نے شعور کی وادی میں قدم رکھا اور تحصیل علم کا آغاز کیا۔ قرآن مجید ناظرہ قاری خدا بخش مرحوم سے پڑھا اور صرف ونحو کی بعض کتابیں، قرآن مجید کا ترجمہ اور حدیث کی ابتدائی کتابیں اپنے والد محترم سے پڑھیں۔ وہاں کے ہائی سکول میں میٹرک کا امتحان دیا اور سکول کے استاذ مولانا محمد افضل سے عربی کی تعلیم حاصل کی۔ وہیں کے ڈگری کالج میں ۱۹۶۸ء میں بی اے پاس کیا۔ پھر پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور علوم اسلامیہ میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد اسی یونیورسٹی سے ایم اے عربی کیا۔

کچھ عرصہ جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) میں طلباء کو انگریزی پڑھاتے رہے۔ بعد ازاں محکمہ تعلیم سے منسلک ہو گئے اور سیالکوٹ کے ایک کالج میں تدریسی خدمات انجام دینے لگے۔ لاہور کے ایک کالج میں بھی کچھ عرصہ ان کا سلسلہ تدریس جاری رہا۔ بعد ازاں بہاول پور یونیورسٹی میں تاریخ اسلامی اور تقابل ادیان کے مضامین پڑھاتے رہے۔ برطانیہ کی اڈنبرا یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کیا۔ پھر اسی یونیورسٹی میں پوسٹ ڈاکٹورل فیلو کی حیثیت سے بعض تحقیقی کام کیے۔ ۱۹۹۰ء کے عشرے کے ابتدائی برسوں میں لیسٹر یونیورسٹی سے سوشل ورک میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد بحالیٔ مجرمین کے ایک محکمے میں وابستہ ہوئے اور وہیں سے ریٹائر ہو گئے۔

جامعہ سلفیہ میں قیام کے زمانے میں انھوں نے مختلف موضوعات پر تحریری کام کیا۔ متعدد رسائل و جرائد میں ان کے مضامین شائع ہوئے، جن میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' ہفت روزہ ''اہل حدیث''، ماہنامہ ''المعارف''، ماہنامہ ''محدث'' (لاہور)، ماہنامہ ''ترجمان الحدیث''، ماہنامہ ''الحق'' اور ماہنامہ ''صراط مستقیم'' (برمنگھم) شامل ہیں۔ ہندوستان کے بعض رسائل میں بھی ان کے رشحاتِ قلم کی اشاعت ہوئی اور وہ رسائل ہیں دو ماہی ''اشاعۃ السنۃ'' دہلی، ماہنامہ ''محدث'' بنارس، ماہنامہ ''البلاغ'' بمبئی اور پندرہ روزہ ''ترجمان'' دہلی۔

''تحریک ختم نبوت'' ڈاکٹر صاحب کا ایک وقیع کام ہے جو وہ بڑی محنت سے کر رہے ہیں۔ اس میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ مرزائیت کی مخالفت میں سب سے پہلے اہل حدیث علمائے کرام میدان عمل میں اترے اور مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم نے مرزا قادیانی کے خلاف فتوائے تکفیر مرتب کیا۔ ڈاکٹر صاب کا یہ موقف بالکل مبنی بر حقیقت ہے۔ یہ فتویٰ تحریر کر کے انھوں نے اپنے استاذ عالی قدر حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ کی خدمت میں پیش کیا اور اس پر ان کے دستخط کرائے۔ بعد ازاں ہندوستان کے مختلف مقامات کے دو سو علمائے کرام سے خود مل کر یا اپنے نمائندے بھیج کر اس فتوے سے ان کو مطلع کیا اور انھوں نے اس پر تصدیقی دستخط کیے اور مہریں ثبت فرمائیں۔ اس فتوے کی اشاعت سے مرزا صاحب انتہائی پریشان ہوئے اور اس پر انھوں نے بہت کچھ لکھا۔ تقریباً سو سال بعد یہ فتویٰ نومبر ۱۹۸۶ء میں حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی نے دارالدعوۃ السلفیہ لاہور کی طرف سے کتابی شکل میں شائع کیا جو ۱۸۸ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کا نام ہے ''پاک و ہند کے علمائے اسلام کا اولیں متفقہ فتویٰ''۔

بہرکیف اس فتوے کے بعد مرزائیت کے خلاف اہل حدیث علمائے کرام نے تحریری، تقریری اور مناظراتی صورت میں جو کوششیں کیں اور اللہ کے فضل سے کر رہے ہیں، وہ اس موضوع کی تاریخ کا عدیم المثال حصہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب ممدوح نے اسے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ انھوں نے اپنی تصنیف ''تحریک ختم نبوت''

میں، جس کی اب تک تیرہ جلدیں شائع ہو چکی ہیں، مولانا بٹالوی کے رسالہ اشاعۃ السنۃ اور دیگر علما کی مرزائیت کے ردّ میں تصانیف کے بہت سے حصے شامل کر دیے ہیں۔ ان تصانیف میں قاضی محمد سلیمان منصور پوری، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی، مولانا عبداللہ معمار اور بعض دوسرے حضرات کی تصانیف شامل ہیں۔ اس طرح ڈاکٹر صاب کی یہ تصنیف پھیلتی جا رہی ہے۔ متعدد جلدوں پر مشتمل کتاب کا جہاں یہ فائدہ ہے کہ اس میں ایک خاص موضوع سے متعلق بہت سا مواد یک جا ہو جاتا ہے، وہاں یہ مسئلہ بھی پیش آتا ہے کہ اسے دوبارہ چھاپنا مشکل ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی ہے کہ ایک جلد گم ہو جائے تو پورا سیٹ ناقص ہو جاتا ہے۔

ان شاء اللہ ہمارے دیرینہ دوست ڈاکٹر محمد سلیمان اظہر کی یہ محنت رنگ لائے گی اور لوگ اس سے مستفید ہوں گے۔

ڈاکٹر صاحب کی دوسری اہم ترین تصنیف تاریخ اہل حدیث ہے، افسوس ہے، اس کی اب تک کی مطبوعہ جلدیں میرے پاس نہیں ہیں لیکن معلوم ہوا ہے کہ چار جلدیں ہندوستان میں چھپ چکی ہیں۔ اس کتاب کی مختلف جلدوں میں بھی انھوں نے بعض علمائے ذی مرتبت کی تحریریں خاص سلیقے سے شامل کر دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی انھیں اس کارِ خیر کی بہتر جزا دینے والا ہے، ہم عاجز بندے ان کے لیے دعا ہی کر سکتے ہیں اور کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب سے ملاقات پر اٹھائیس برس کا طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ اس اثنا میں ان سے ٹیلی فون پر تو کئی مرتبہ گفتگو ہوئی، لیکن بالمشافہ ملاقات کبھی ہو گی یا نہیں ہو گی، اس کا کچھ پتا نہیں۔

میانہ قد، گندمی رنگ، گول سا چہرہ، داڑھی مونچھ صاف، سنجیدہ طبع، نرم گفتار، پڑھنے لکھنے میں مگن، اچھی صحت۔ یہ تھے جنوری ۱۹۸۵ء کے ڈاکٹر محمد سلیمان اظہر۔ اس وقت محمد بہاء الدین سے نہ وہ خود واقف تھے، نہ کسی رشتے دار یا ملنے والے کا ان سے کوئی تعلق تھا۔ خود محمد بہاء الدین کی بھی ان سے کوئی جان پہچان نہ تھی۔ ان کا رابطہ ان سے اس وقت ہوا جب برطانیہ کے دورِ ملازمت میں قادیانیت کے خلاف ان کا قلم باقاعدگی سے حرکت میں آیا۔

ڈاکٹر محمد سلیمان اظہر کی بھی اللہ تعالیٰ عمر دراز کرے اور ان کے ہم زاد (یا ہم ذات یا ہم قلم) محمد بہاء الدین کو بھی صحت و عافیت کے ساتھ رکھے اور دونوں باہمی تعاون سے تصنیفی خدمات سرانجام دیتے رہیں۔

(یہ سطور ۱۲۔ اگست ۲۰۱۳ء کو لکھی گئیں)

مولانا محمد ابراہیم خلیل فیروز پوری

(ولادت ۱۹۴۴ء)

لمبا قد، چوڑا سینہ، کشادہ جبیں، متناسب الاعضا، دھیما اسلوبِ گفتگو، سادہ مگر صاف ستھرا لباس مشتمل بر شلوار قمیص، سر پر ٹوپی، خیر خواہی اور ہم دردی کے پیکرِ پر خلوص۔ یہ ہیں مولانا محمد ابراہیم خلیل فیروز پوری۔ اعوان برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ سلسلۂ نسب یہ ہے: محمد ابراہیم خلیل بن مولوی نور محمد بن مولوی عبدالعزیز بن حاجی محمد عیسیٰ بن پیر بخش بن مصاحب خاں بن ملک بلاقی بن سلطان تاجہ۔

یہ خاندان دراصل ضلع میاں والی میں سکونت پذیر تھا۔ مولانا محمد ابراہیم خلیل سے چھے پشت پہلے ایک شخص مصاحب خاں کا نام آتا ہے۔ یہ بزرگ میاں والی کی سکونت ترک کر کے ضلع فیروز پور کے موضع نول میں اقامت گزیں ہوئے۔ تقسیم ملک (اگست ۱۹۴۷ء) تک ان کی آل اولاد وہاں رہی۔ تقسیم کے بعد یہ لوگ وہاں سے نکلے اور ضلع اوکاڑہ کی تحصیل دیپال پور کے ایک گاؤں ساہیوال آ گئے۔

مولانا محمد ابراہیم کی ولادت ۱۹۴۴ء میں موضع نول میں ہوئی۔ قیامِ پاکستان کے وقت یہ تین سال کے بچے تھے۔ والد صاحب (مولوی نور محمد) ان کے زمانۂ بچپن ہی میں وفات پا گئے تھے۔ تعلیم و تربیت کا اہتمام ان کے تایا مولوی محمد مرحوم نے کیا اور ابتدائی کتابیں انھی نے پڑھائیں۔

۱۹۵۸ء میں مولانا یوسف صاحب کے جاری کردہ دار الحدیث (راجو وال ضلع اوکاڑہ) میں داخلہ لیا۔ اس دار الحدیث میں انھوں نے مولانا عبیداللہ صاحب (ڈھولن ہٹھاڑ) مولانا عبدالرشید جیتوی، مولانا محمد صدیق بابر خانوی اور دار الحدیث کے مہتمم مولانا محمد یوسف صاحب سے استفادہ کیا۔ مولانا محمد یوسف صاحب کا مولانا محمد ابراہیم خلیل نہایت احترام سے نام لیتے ہیں۔ ''سیدی و مولائی و مخدومی حضرت مولانا محمد یوسف صاحب مہتمم مدرسہ دار الحدیث'' کے الفاظ سے ان کا ذکر کرتے ہیں۔

مولانا محمد یوسف صاحب سے انھوں نے جو سند لی، اس کے مطابق ان سے مندرجہ ذیل کتابیں پڑھیں:

تفاسیر قرآن میں سے جامع البیان، جلالین، اسرار التاویل اور اصولِ تفسیر کی الفوز الکبیر۔

کتبِ احادیث میں سے صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد اور سنن نسائی۔ اصولِ حدیث میں سے عجالہ نافعہ، شرح نخبۃ الفکر فی مصطلح اہل الاثر۔

کتبِ فقہ میں سے قدوری، شرح وقایہ اور ہدایہ۔ اصولِ فقہ میں سے اصول شاشی اور حسامی۔

علم نحو کی انھوں نے مولانا محمد یوسف سے یہ کتابیں پڑھیں: شرح مائۃ عامل، ہدایۃ النحو اور کافیہ۔

علم صرف کی زرادی، صرف میر، فصول اکبری اور شافیہ۔

عربی ادبیات کی نفحۃ الیمن، العبرات، متنبّی اور حماسہ۔

فارسی کی گلستان اور بوستاں۔

ان کتابوں کے علاوہ دیگر درسی کتابیں دار الحدیث کے دوسرے اساتذہ سے پڑھیں۔ اس طرح انھوں نے مروّجہ نصاب کی تقریباً تمام کتابوں کی تکمیل مولانا محمد یوسف کے جاری فرمودہ دار الحدیث میں کی۔ یہ بہت بڑی بات ہے کہ ایک طالب علم شروع سے لے کر آخر تک پورا آٹھ سالہ نصاب ایک ہی دار العلوم میں مکمل کرے۔ یہ ہمارے دینی مدارس کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔

عیسوی حساب سے ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۵ء اور قمری حساب سے ۱۳۷۵ھ سے ۱۳۸۴ھ تک وہ دار الحدیث راجووال میں تحصیل علم کرتے رہے۔

۱۳۸۵ھ (۱۹۶۵ء) میں جامعہ محمدیہ (اوکاڑہ) میں داخل ہوے۔ وہاں بخاری شریف، مؤطا امام مالک، مسلم شریف، تفسیر بیضاوی، فوز الکبیر، نور الانوار مولانا محمد عبدہ الفلاح سے اور ہدایہ اور الفیہ مولانا جمعہ خاں ایرانی سے پڑھیں۔ مولانا محمد عبدہ الفلاح مرحوم ومغفور پاکستان کے مشہور مدرس ومعلم تھے، مولانا محمد ابراہیم خلیل نے ان سے بہت استفادہ کیا۔

اسی سال راولپنڈی گئے اور وہاں مولانا غلام اللہ خاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوے اور ان کے مدرسہ تعلیم القرآن میں داخل ہو کر ان کے دورۂ تفسیر قرآن میں شرکت کی اور سند لی۔

۱۳۹۴ھ (۱۹۷۴ء) میں حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی کے دورۂ تفسیر قرآن میں شمولیت کی اور حق دارِ سند قرار پاے۔

۱۹۶۷ء میں لاہور بورڈ سے فاضل عربی کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۶۹ء میں فارسی فاضل کا۔ ۱۹۷۰ء میں ملتان بورڈ سے میٹرک کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔

۳۱ر نومبر ۱۹۶۶ء کو مدرسہ دار السلام مسجد ربانی حجرہ شاہ مقیم (ضلع اوکاڑہ) میں خطابت کا فریضہ انجام دینا شروع کیا۔ یہ سطور ۱۵-نومبر ۲۰۱۲ھ کو لکھی جا رہی ہیں اور مولانا ممدوح اللہ کے فضل سے اس مسجد کے خطیب ہیں۔

۱۰ر مارچ ۱۹۷۹ء کو حجرہ شاہ مقیم کے گورنمنٹ ہائی سکول میں معلم مقرر کیے گئے اور ۸-مارچ ۲۰۰۸ء کو

سکول کی ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔

مولانا محمد ابراہیم خلیل فیروز پوری تصنیف و تالیف اور مقالہ نگاری سے بھی گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ اب تک انھوں نے جو تحریری خدمات سرانجام دیں، وہ خاص اہمیت کی حامل ہیں اور اس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ امام ابن رجب حنبلی کی عربی تفسیر سورہ نصر کا اردو ترجمہ: یہ ترجمہ اخبار ''الاعتصام'' میں چھپا۔ ان کی یہ پہلی تحریری کاوش تھی۔ صاف اور سلیس ترجمہ۔

۲۔ تجہیز و تکفین کا شرعی طریقہ: اس کتاب کی تصنیف کا پس منظر یہ ہے کہ انھوں نے ایک دفعہ جہری جنازہ پڑھایا جو کچھ لمبا ہو گیا۔ جنازے کے بعد ایک شخص نے ان سے کہا یہ آپ نے جنازہ پڑھایا ہے یا عید کی نماز پڑھائی ہے۔ اس شخص کے نزدیک جہری نمازِ جنازہ پڑھانا کچھ عجیب سا معاملہ تھا۔ اس کے بعد مولانا ممدوح نے اس موضوع پر کتاب لکھ دی۔

۳۔ مرحوم دوست عبداللہ سلیم کی یاد میں: دارالحدیث کمالیہ کے مہتمم اور مولانا محمد ابراہیم خلیل فیروز پوری کے استاذِ محترم مولانا محمد یوسف کے چار بیٹے تھے، جن کے نام علی الترتیب یہ ہیں: عبداللہ سلیم، حافظ عبدالرحمٰن، حافظ عبیداللہ احسن اور عبیدالرحمٰن محسن-! مولانا کے سب بیٹے ما شاء اللہ لائق اور صالح فطرت ہیں۔ عبداللہ سلیم جو سب سے بڑے تھے، عین عالم جوانی میں ۲۱ ستمبر ۱۹۹۳ء کو بعارضۂ قلب اچانک وفات پا گئے۔ وہ مولانا محمد ابراہیم خلیل فیروز پوری کے دوست اور استاذ زادہ تھے۔ ان کے حالات میں انھوں نے یہ کتاب لکھی جو چھپ چکی ہے۔ میں نے اپنی ایک کتاب ''قافلہ حدیث'' میں مولانا محمد یوسف اور ان کے مرحوم فرزند عبداللہ سلیم کے حالات لکھے ہیں۔ یہ کتاب مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور نے شائع کی تھی۔

۴۔ الفیوض المحمدیہ: اس کتاب میں مولانا محمد ابراہیم خلیل فیروز پوری نے پنجاب کے لکھوی خاندان کے علمائے کرام کے تذکار بیان کیے ہیں۔ یہ ان کی ایک اہم تصنیف ہے۔ متحدہ پنجاب میں اہل حدیث کا اولین دینی مدرسہ اسی خاندان کے ایک بزرگ حافظ احمد نے ۱۷۲۰ء کے آس پاس موضع لکھو کے ضلع فیروز پور میں قائم کیا تھا۔ اس وقت محدود پیمانے پر تھوڑے سے بچے اس میں قاعدے سپارے اور قرآن مجید پڑھتے تھے، لیکن اس کے بعد اس مدرسے نے بڑی شہرت پائی اور بے شمار لوگوں نے اس چھوٹے سے گاؤں کے علمائے کرام سے علمی اور روحانی فیض حاصل کیا۔ اس کتاب میں لکھوی حضرات کے بہت سے عقیدت مندوں اور شاگردوں کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ حضرت حافظ محمد لکھوی کے واقعاتِ حیات بالخصوص تفصیل سے ضبطِ تحریر میں لائے گئے ہیں۔ زیرِ مطالعہ کتاب (چمنستان حدیث)

کے بعض مقامات پر اس کتاب کے حوالے دیے گئے ہیں۔

۵- تطہیر الاعتقاد عن ادران الالحاد: یہ صاحبِ سبل السلام علامہ محمد بن اسماعیل کا ایک رسالہ ہے۔ مولانا محمد ابراہیم خلیل نے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے جو ابھی شائع نہیں ہوا۔

ان کتابوں کے علاوہ مولانا ممدوح نے مختلف رسائل و جرائد میں مضامین لکھے، جن میں خصوصاً علماے اہل حدیث کے بارے میں انھوں نے قارئین کے لیے بہترین معلومات فراہم کیں۔

۶- فتاویٰ حصاریہ و مقالات علمیہ، ایک بہت بڑا علمی کام ہے جو انھوں نے اپنے استاذِ عالی قدر مولانا محمد یوسف مہتمم دار الحدیث راجووال کے فرمان پر کیا۔ جماعت اہل حدیث کے مرحوم و مغفور عالم مولانا عبدالقادر عارف حصاری کے فتوے موضوع وار مرتب کر دیے۔ یہ ترتیب سات جلدوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس میں مولانا حصاری کے مقالات و مضامین بھی شامل ہیں۔ اس کا نام ''فتاویٰ حصاریہ و مقالات علمیہ'' رکھا گیا ہے۔ یہ ایک منفرد قسم کا علمی ذخیرہ ہے۔ اس کی کتابت ہو چکی ہے۔ یہ فتاوے چھپ گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ مولانا محمد ابراہیم خلیل فیروزپوری کی زندگی دراز فرمائے اور انھیں کتاب و سنت کی زیادہ سے زیادہ خدمت کی توفیق بخشے۔ آمین

(۱۵۔ نومبر ۲۰۱۲ء)

حافظ احمد شاکر

(ولادت ستمبر ۱۹۴۴ء)

حافظ احمد شاکر استاذی المکرّم حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے فرزند ارجمند ہیں۔ان کا حلیہ یہ ہے: پورا قد، چوڑا چہرہ، کشادہ پیشانی، موٹی آنکھیں، کھلا سینہ، گندمی رنگ، خوش کلام، خوش مزاج اور خوش خوراک ،ملنسار، حسن اخلاق کے مالک، دوستوں کے دوست، مہمان نواز، سادہ مگر اچھا لباس۔ بہت عرصے سے ہفت روزہ ''الاعتصام'' کی زمام ادارت ان کے ہاتھ میں ہے۔اخبار جاری رکھنا نہایت مشکل کام ہے۔لیکن یہ نہایت مشکل کام وہ کسی نہ کسی طرح باقاعدگی سے کر رہے ہیں۔قلم رواں ہے اور اداریے میں خوب صورت انداز میں اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہیں۔اخبار کے علاوہ مصباح القرآن کے نام سے حفظ قرآن کا مدرسہ بھی جاری ہے، جس میں کتنے ہی بچے قرآن مجید حفظ کر چکے ہیں۔

حافظ صاحب کی ولادت ستمبر ۱۹۴۴ء میں ہمارے شہر کوٹ کپورہ میں ہوئی تھی۔اس زمانے میں حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی فیروز پور میں اقامت گزیں تھے اور وہاں کی جامع مسجد اہل حدیث گنبداں والی میں خطابت و تدریس کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ میری درخواست پر حافظ صاحب نے اپنے حالات میں یہ مضمون خود ہی لکھا ہے اور اس کا عنوان رکھا ہے۔''حرف شناسی سے لفظ شناسی تک''۔مضمون اگرچہ مختصر ہے، تاہم اس اختصار میں بہت سی تفصیلات پنہاں ہیں جن سے یہ فقیر کافی حد تک آگاہ ہے۔آیے اس خوب صورت عنوان کے خوب صورت مضمون کا مطالعہ کرتے ہیں۔

حضرت والد صاحب رحمہ اللہ کے بتانے کے مطابق میری ولادت ۱۳۶۳ھ رمضان المبارک کو کوٹ کپورہ ریاست فرید کوٹ میں ہوئی جو اندازے کے مطابق ستمبر ۱۹۴۴ء بنتی ہے۔ولادت کے بعد چھے ماہ تک میری صحت بہت اچھی رہی، پھر اس کے بعد میں دق الاطفال (سوکڑا) کی بیماری میں مبتلا ہو گیا جو دو سال تک رہی جس نے عمر بھر کے لیے اعضائے رئیسہ کمزور کر دیے۔اس حساب سے قیام پاکستان ۱۹۴۷ء کے وقت میری عمر تین سال تھی۔ فیروز پور سے ہجرت کرنے کے بعد والد صاحب رحمہ اللہ گوندلاں والا منتقل ہو گئے یہاں کے مختصر عرصے کی رہائش اور میرے چھوٹے بھائی محمد کی وفات مجھے یاد ہے۔بعد ازاں ہم لاہور چینیاں والی مسجد میں منتقل ہو گئے، جہاں اس وقت قاری فضل کریم صاحب مرحوم پڑھاتے تھے۔نیز ان کے ساتھ قاری محمد

اسماعیل رحمہ اللہ بھی فریضہ تدریس ادا کرتے تھے۔ وہاں قیام کا عرصہ میرے ذہن میں نہیں، غالباً چند ماہ ہی ہو گا۔ بعد ازاں حضرت مولانا محمد داؤد غزنوی رحمہ اللہ کے حسب ارشاد والد صاحب شیش محل روڈ لاہور کے مکان میں منتقل ہو گئے کیونکہ وہ اس وقت دارالعلوم تقویۃ الاسلام کی مسند صدر المدرسین پر فائز تھے۔ ہم اب تک جہاں آئے تھے، وہیں رہ رہے ہیں۔

ابتدائی قاعدہ اور ناظرہ قران مجید کا اکثر حصہ والدہ مرحومہ سے پڑھا اور کچھ والد صاحب سے بھی۔ صحت کمزور تھی اس لیے ناظرہ پڑھتے پڑھتے دیر ہو گئی۔ ان دنوں دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں حضرت والد صاحب سے مولانا ابوبکر صدیق سلفی پڑھا کرتے تھے۔ انھوں نے اردو لکھائی پڑھائی اور حساب کی شد بد کے لیے مجھے ان کے پاس بھیجنا شروع کر دیا۔ اس دوران ناظرہ پڑھتا رہا۔ قرآن کریم جب نصف ہوا تو والدین رحمۃ اللہ علیہم نے شیرینی تقسیم کی اور ختم قرآن پر بھی اپنی حیثیت کے مطابق گھر میں زردہ پکا کر ان حالات کے مطابق پرتکلف دعوت کا اہتمام کیا۔

والدہ مرحومہ کی خواہش تھی کہ میں حفظ قرآن قاری فضل کریم سے کروں، لیکن عمر چھوٹی، صحت کمزور اور فاصلہ زیادہ ہونے کے باعث یہ نہ ہو سکا۔ شیش محل روڈ کے آس پاس بھی کوئی مدرسہ نہ تھا اس لیے شیش محل روڈ کے مغربی جانب ارائیں بلڈنگ کے قریب کی مسجد میں قاری غلام محی الدین امام مسجد تھے جو بچوں کو حفظ بھی کراتے تھے۔ والد صاحب رحمہ اللہ نے مجھے وہاں داخل کرا دیا۔ میرے ساتھ میرے محلے کے گجر برادری کے دو ہم عمر ساتھی محمد یونس اور محمد اسماعیل بھی تھے۔ انھوں نے تو غالباً پانچ چھے پارے حفظ کر کے چھوڑ دیا تھا لیکن میری پڑھائی جاری رہی۔ سورہ کہف پر میرا سبق تھا کہ مجھے شدید قسم کا ٹائیفائیڈ ہو گیا جو ۲۱ دن بعد ٹوٹا۔ میں چونکہ پہلے ہی کمزور تھا اس لیے مزید کمزور ہو گیا۔ اس کے بعد والدہ رحمہا اللہ اکتوبر ۱۹۵۶ء کی گوجراں والا میں منعقدہ مرکزی جمعیت اہل حدیث کانفرنس کے بعد بیمار ہو گئیں جو چھے ماہ تک بیماری میں مبتلا رہ کر ۱۹۔ اپریل ۱۹۵۷ء کو وفات پا گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی بیماری کے آخری ایام یعنی شعبان ۱۳۷۷ھ میں میرے حفظ قرآن کے اختتام کی تقریب کا گھر ہی میں اہتمام کیا گیا جس میں میرے استاد گرامی قاری غلام محی الدین مرحوم اور تایا جی حافظ قاری محمد عبداللہ، مولانا محمد داؤد غزنوی اور مولانا محمد اسماعیل رحمہم اللہ کی شرکت یاد ہے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے بزرگ تھے جن کے نام مجھے یاد نہیں۔ مہمانوں کی تواضع آب زمزم اور مدینہ منورہ کی ان کھجوروں سے کی گئی جو تایا جان حافظ قاری محمد عبداللہ بھوجیانی ایک سال قبل حج سے واپسی پر لائے تھے اور غالباً دیگر مٹھائیاں بھی تھیں۔ والدہ کا شوق تو بڑی دعوت کا تھا لیکن ان کی طویل بیماری اور حالات کی ناسازگاری کے باعث ان کی یہ آرزو تشنہ تکمیل ہی رہی۔

مولانا محمد داؤد غزنوی دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں والد صاحب کو بطور شیخ الحدیث لائے تھے لیکن (والد صاحب نے خود کو شیخ الحدیث کبھی کہا نہ سمجھا بلکہ مجھے بطور وصیت اپنے نام کے ساتھ لفظ شیخ الحدیث لکھنے سے منع کر دیا تھا) وہ خود کو صدر المدرسین کہلاتے تھے۔ لیکن کچھ عرصے بعد مولانا غزنوی رحمہ اللہ نے تحشیہ حدیث کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی جس کو انھوں نے فوراً قبول کر لیا کہ یہ ان کی زندگی کا مقصد بھی تھا۔ مولانا غزنوی نے اعزازیہ برقرار رکھنے کا فرمایا لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد اعزازیہ دینے سے بوجوہ معذرت فرمالی۔ ان حالات میں اس وقت والد صاحب کا کوئی باقاعدہ ذریعہ معاش نہ رہا جب کہ اس عالم میں انھوں نے التعلیقات السلفیہ علی سنن النسائی کا تحشیہ ترتیب دیا اور کتابت بھی شروع کرا دی تھی، نیز اس عرصے میں انھوں نے المکتبۃ السلفیۃ بھی باقاعدہ شروع کر دیا تھا جس کی پہلی کتاب شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی الفوز الکبیر فی اصول التفسیر مختصر حواشی کے ساتھ مولانا عبدالقادر ندوی مرحوم کے تعاون سے شائع بھی ہو چکی تھی۔ اس کے بعد حیات ولی، پیارے رسول کی پیاری دعائیں جیسی کتابیں منظر عام پر آئیں۔ یہ سب اشاعتی کام قرض حسنہ یا مضاربت کی بنیاد پر ہوئے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ہمارے گھر میں صرف وہ پیسے آتے تھے جو حافظ عبدالرحمان گوہڑوی رحمہ اللہ احاطہ تھانیدار خان بہادر نجم الدین کے گھر سے جزوقتی تدریس کے عوض لے کر آتے تھے۔ اس عرصے، یعنی اکتوبر ۱۹۵۶ء میں والدہ علیل ہو گئیں، ان کا علاج بھی قرض پر چلتا رہا۔ ساتھ ہی ساتھ سنن نسائی کی طباعت بھی شروع ہو چکی تھی اور ان کی وفات سے پہلے یا اس سے کچھ بعد سنن نسائی کی طباعت بھی مکمل ہو گئی تھی۔

رمضان المبارک ۱۳۷۷ھ میں والدہ کی وفات ہوئی تھی۔ اسی شوال ۱۳۷۷ھ میں والد صاحب مجھے مدرسہ تجوید القرآن کوچہ کندیگراں موتی بازار لاہور میں قاری فضل کریم صاحب کی خدمت میں منزل کی دہرائی کے لیے چھوڑ آئے تھے۔ ایک سال مدرسہ تجوید القرآن میں دونوں وقت جاتا رہا اور پہلا رمضان ۱۳۷۸ھ کا میں نے مسجد عزیزیہ مصری شاہ میں تراویح میں سنایا۔ محراب پہلا تھا، منزل بھی کچی پکی تھی اور زبان میں لکنت بھی بہت زیادہ تھی۔ میاں عبدالمجید مالواڈا رحمہ اللہ مسجد کے متولی تھے، وہ تراویح وہیں پڑھتے تھے۔ مسجد کے نمازیوں نے بڑی برداشت اور حوصلے سے میرا قرآن سنا جس کے لیے میں ان کا ہمیشہ شکر گزار رہا ہوں۔

۱۳۷۸ھ کے شوال سے میں نے مدرسہ تجوید القرآن ایک وقت جانا شروع کر دیا اور مدرسے سے واپسی پر انارکلی میں سید انور حسین نفیس رقم کی خدمت میں خوش خطی اور فارسی پڑھنے کے لیے حاضر ہونے لگا۔ خطاطی الف، ب، ج، د، ر سے آگے نہ بڑھی اور فارسی کے بھی چند ہی سبق پڑھ سکا اور پھر افسوس کہ یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ ظہر کے بعد حضرت حافظ محمد اسحاق صاحب رحمہ اللہ کو ابواب الصرف یاد کر کے سنانا شروع کر دی

اور بعد عصر حافظ عبدالرحمٰن گوہڑوی رحمہ اللہ سے عربی کا معلم پڑھنے لگا۔ اسی سال یعنی ۱۳۷۸ھ میں مدرسہ تجوید القرآن میں مولانا قاری سید حسن شاہ صاحب مرحوم بطور مدرس تجوید تشریف لائے۔ جن چند طلباء نے ان سے ترتیل قرآن کی مشق شروع کی ان میں یہ احقر بھی تھا۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے سورہ فاتحہ کی مشق شروع کرائی۔ سورہ فاتحہ ابھی آدھی ہوئی تھی کہ سال ختم ہو گیا اور مدرسہ تجوید القرآن میں میری باقاعدہ حاضری بھی ختم ہو گئی لیکن حضرت شاہ صاحب کی توجہ، شفقت اور محنت سے نصف سورہ فاتحہ سے قرآن مجید کی مکمل صحت لفظی یعنی مخارج وصفات کی ادائیگی کی راہنمائی مل گئی۔ غفرلہم اللہ تعالیٰ اجمعین۔

رمضان ۱۳۷۹ھ میں دوسرا محراب سنانے کے لیے مجھے پتوکی اس وقت ضلع لاہور (اب ضلع قصور) شیخاں والی مسجد میں بھیجا گیا جس کے خطیب و امام مولوی محمد بشیر صاحب تھے۔ انھوں نے بڑی محبت اور شفقت سے رہائش اور کھانے کا اپنے گھر میں اہتمام کیا۔ وہاں ختم قرآن کے دن آندھی اور بارش کے باوجود سائیکل پر ۸ کلومیٹر کا سفر کر کے گوہڑ سے حافظ عبدالرحمٰن گوہڑوی رحمہ اللہ کے والد مرحوم حاجی باباں تشریف لائے جس سے مجھے بڑا حوصلہ ملا۔ ان کی یہ شفقت مجھے ہمیشہ یاد رہی۔

شوال ۱۳۷۹ ہجری میں درس نظامی کی تعلیم کے لیے حضرت والد صاحب سامان وغیرہ لے کر اوکاڑہ کے کسی دینی مدرسے میں داخلے کے لیے لے گئے۔ وہاں جامعہ محمدیہ میں ان دنوں حافظ محمد بھٹوی مرحوم شیخ الحدیث تھے اور مولانا معین الدین لکھوی مرحوم ومغفور ناظم۔ ان دونوں بزرگوں نے والد صاحب کو مشورہ دیا کہ احمد کو آپ لاہور اپنے پاس ہی پڑھائیں۔ لیکن والد صاحب کی یہ شدید خواہش تھی بلکہ ایک بنیادی نکتہ تھا کہ دینی تعلیم گھر سے باہر رہ کر مدارس میں داخل ہو کر ہی صحیح طور سے حاصل ہو سکتی ہے، اس لیے وہ مجھے اپنے استاد گرامی حضرت مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی رحمہ اللہ کی خدمت میں لے کر گئے تو انھوں نے حکماً فرمایا کہ احمد کو کافیہ تک وہیں لاہور میں پڑھائیں۔ پھر حدیث پڑھنے کے لیے میرے پاس بھیج دینا۔ اس کے بعد والد صاحب مجھے واپس لاہور لے آئے اور دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں داخل کرا دیا جہاں اس وقت مولانا حافظ محمد اسحاق شیخ الحدیث، مولانا حافظ عبدالرشید گوہڑوی، مولانا عبدالرشید صاحب مجاہد آبادی اور مولانا محمد خان جیسے اکابر تدریس کی مسندوں پر رونق افروز تھے۔ میں نے پہلے سال میں نحو میر، صرف میر، بلوغ المرام، الطریقۃ السہلہ حافظ عبدالرشید صاحب گوہڑوی رحمہ اللہ سے، ترجمہ قرآن مولانا عبدالرشید مجاہد آبادی سے، ابواب الصرف حافظ محمد اسحاق رحمہ اللہ سے پڑھیں۔ حافظ عبدالرحمٰن گوہڑوی رحمہ اللہ سے بعد نماز عصر عربی کا معلم کے بعض حصے پڑھے۔ تیسرا محراب ۱۳۸۰ھ کا میں نے حاجی محمد ادریس بھوجیانی کی خواہش پر ٹوبہ ٹیک سنگھ میں سنایا۔ اس دوران المکتبۃ السلفیہ کو والد صاحب اور حافظ عبدالرحمٰن چلاتے رہے۔ مجھے ان کی شراکت کی تفصیلات کا کوئی

علم نہیں۔شوال ۱۳۸۰ھ میں دار العلوم تقویۃ الاسلام ہی میں پڑھائی شروع کر دی اور مشکوٰۃ شریف اول، ہدایۃ النحو، القرأۃ الرشیدہ حافظ عبدالرشید صاحب گوہڑوی سے اور شرح مائۃ عامل، ترجمہ قرآن مجید اور بعض دیگر کتابیں مولانا عبدالرشید مجاہد آبادی سے پڑھیں۔ رمضان ۱۳۸۱ھ میں میرا چوتھا محراب تھا جو میں نے لاہور آؤٹ فال روڈ میں میاں دین محمد مرحوم کی کوٹھی میں سنایا اور اگلے سال پھر دار العلوم تقویۃ الاسلام میں داخل ہوا اور اس سال مدرسے میں حافظ محمد اسحاق صاحب مرحوم سے مشکوٰۃ نصف ثانی اور مولانا عبدالرشید صاحب سے تفسیر جامع البیان، فصول اکبری، حافظ عبدالرشید صاحب سے کافیہ، القرأۃ الرشیدہ، ترجمتین اور ظہر کے بعد والد صاحب سے سنن نسائی، اور شرح نخبۃ الفکر پڑھنا شروع کر دیا۔۱۳۸۲ھ میں پھر دار العلوم تقویۃ الاسلام میں اصول الشاشی، مقامات حریری وغیرہ مولانا عبدالرشید صاحب سے اور القرأۃ الرشیدہ، ترجمتین وغیرہ اور حافظ عبدالرشید گوہڑوی سے اور سنن ترمذی حضرت مولانا حافظ محمد اسحاق صاحب سے پڑھنا شروع کر دیں اور ظہر کے بعد گھر میں والد صاحب سے موطا امام مالک اور سنن ابن ماجہ پڑھنے لگا۔مشکوٰۃ جلد ثانی اور سنن ترمذی میں ہماری جماعت کم وبیش پندرہ ساتھیوں پر مشتمل تھی جن میں حافظ صلاح الدین یوسف، مولوی عطاء اللہ بمبو چک (فیصل آباد) حافظ محمد اشرف سعید، مولوی عطاء الرحمان مرحوم، حافظ عبدالمجید کرولوی، مولوی عبداللطیف کرولوی مرحوم، مولوی محمد لقمان، حکیم محمد جمیل مرحوم، مولوی عبدالواحد سلفی بیروی، مولوی نذیر احمد بیروی، امان اللہ گل، مولوی سعد اللہ مرحوم، مولوی امین گوہڑوی مرحوم وغیرہ شامل تھے۔ حافظ صاحب کا انداز تدریس تو کامل و مدلل ہوتا ہی تھا لیکن حافظ صاحب کی طلباء سے شفقت ایک گراں مایہ نعمت تھی اور تربیت و نگرانی اس پر مستزاد۔

۱۳۸۳ء کا محراب میں نے اپنے خالو مولوی عبدالکریم مرحوم کی خواہش پر منجھورو (ضلع سانگھڑ سندھ) میں سنایا جہاں میری سگی خالہ تھیں جن کی شادی اپنی خالہ کے گھر ہوئی تھی جو رشتے میں میری نانی تھیں۔ یہاں میں ایک دو ناغوں کے ساتھ کم وبیش دس سال تراویح سنانے کے لیے جاتا رہا۔اس وقت میری نانی مرحومہ کے سات بیٹے عبدالکریم، عبدالرحمٰن، عبدالواحد، محمد یوسف، محمد علی، عبداللطیف اور عبدالشکور حیات تھے اور ایک بیٹا عبدالغفور وفات پا چکا تھا۔ اب ان میں سے صرف آخر الذکر دو بھائی عبداللطیف اور عبدالشکور بقید حیات ہیں۔ان کے والد میاں محمد عبداللہ، حضرت شاہ محمد شریف گھڑیالوی کے مرید اور مولانا عبدالواحد غزنوی رحمہ اللہ سے فیض یافتہ تھے۔ وہ بہت متدین اور مزاج کے سخت تھے لیکن اتنے ہی عابد و زاہد بھی تھے۔

شوال ۱۳۸۳ھ کو دار العلوم تقویۃ الاسلام میں داخل ہو کر سنن ابی داؤد وغیرہ شروع کی ہی تھیں کہ بعض وجوہ کی بنا پر دار العلوم سے مجھے تعلیم ترک کرنی پڑی تو والد صاحب مجھے جامعہ مدنیہ لے گئے جس کا دفتر تو مسلم

مسجد بیرون لوہاری گیٹ تھا لیکن اس کی تعلیم جامع مسجد نیلا گنبد میں تھی۔ مولانا حامد میاں مرحوم نے داخلے کے حکم کے ساتھ نیلا گنبد میں جماعت کی تعیین کے لیے مولانا محمد اسلم کی خدمت میں بھیج دیا۔

شرح وقایہ مولانا حامد میاں خود پڑھاتے تھے۔ نور الانوار مولانا دین محمد سے، شرح جامی مولانا حکیم عبدالحکیم سے اور مرقات مفتی عبدالحمید سے پڑھنا شروع کر دیں۔ مرقات کے بعد مولانا نے شرح تہذیب بھی پڑھا دی۔ منطق میں مولانا کے صاحب زادے مفتی عبدالرشید میرے ہم سبق تھے۔ اس احقر پر مولانا حامد میاں کی شفقت اس قدر تھی کہ مجھے صبح اپنے گھر (تکیہ جانی شاہ مزنگ) حاضر ہو کر سبق کی تکرار کا حکم فرمایا اور اپنے اس ناکارہ شاگرد کو ناشتہ بھی اپنے گھر سے کرواتے۔ رحمہ اللہ رحمتہ واسعتہ۔

۱۹۶۴ء یعنی ۱۳۸۴ شوال تا ۱۳۸۵ شعبان جامعہ مدنیہ میں قطبی مفتی عبدالحمید صاحب سے، میبذی (کا کچھ حصہ) مولانا ظہور الحق صاحب سے، ہدایہ اولین اور مختصر المعانی۔ مولانا کریم اللہ سے، مختصر المعانی کے کچھ اسباق حکیم محبوب الٰہی سے پڑھے۔ ہدایہ اولین اور مختصر المعانی میں مولانا عبدالسلام کیلانی اور شیخ الحدیث مولانا حافظ ثناء اللہ مدنی حفظہ اللہ میرے ہم سبق تھے۔ پھر ۱۹۶۵ء میں جامعہ اسلامیہ گوجراں والا میں داخلہ لے کر مولانا ابوالبرکات احمد رحمہ اللہ سے صحیح بخاری، شرح نخبۃ الفکر (مکمل) سراجی ...... ذوی الارحام تک...... مختصر المعانی کے تینوں فن، حسامی اور مولانا نذیر احمد رحمہ اللہ آف کھوکھر کے سے صحیح مسلم پڑھی۔ اسی سال (۱۹۶۵ء) میں پاک بھارت جنگ ہوئی جس کا پہلا ہفتہ میں نے لاہور میں گزارا۔

۱۹۶۵ء میں قیام گوجراں والا کے زمانے میں جامع مسجد اہل حدیث چوک نیائیں میں تجوید وقرأت کی جماعت کا آغاز ہوا جسے قاری محمد اسلم صاحب مرحوم پڑھاتے تھے۔ قاری صاحب سے مدرسہ تجوید القرآن کوچہ کندیگراں میں ہم مسلک ہونے کی وجہ سے تعارف تھا۔ وہاں ملاقات ہوئی تو روایت حفص پڑھنے کا مشورہ دیا بلکہ اصرار کیا تو والد صاحب رحمہ اللہ سے اجازت لے کر نماز ظہر کے بعد قرأت کے اسباق میں حاضر ہونا شروع کر دیا، جس میں قاری عبدالرحیم طور، قاری محمد اکرام اور قاری محمد شفیق میرے شریک سبق تھے۔ آخر الذکر دونوں رفقاء نابینا تھے۔ اس جماعت کا امتحان محترم المقام قاری فضل کریم صاحب مرحوم نے لیا تھا اور مدرسہ محمدیہ شعبہ تجوید کی پہلی سند بھی اس احقر کے نام جاری ہوئی تھی، جس پر استاد گرامی کے علاوہ محترم المقام ممتحن قاری فضل کریم کی مہر اور مخدومنا المکرّم مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ کے دستخط ثبت ہیں۔

مروجہ تعلیم سے فراغت (جو دراصل علوم سے تعارف ہوتا ہے) کے بعد والد صاحب رحمہ اللہ کی خواہش تھی کہ میں حفظ قرآن کی تعلیم دوں۔ گوجراں والا میں تعلیم کے دوران ذی القعدہ میں گوندلاں والا میں اپنے عزیزوں کے ہاں میری شادی ہو چکی تھی اور رمضان المبارک ۱۳۸۶ جنوری ۱۹۶۶ میں عزیزم حماد کی ولادت

بھی ہو چکی تھی۔ والد صاحب نے شادباغ شمالی لاہور کی ایک مسجد میں بات بھی کر لی تھی لیکن (ماشاء الله کان و ما لم یشا لم یکن) کے تحت نہ ہو سکا۔ پھر مجھے المکتبۃ السّلفیہ میں حافظ عبدالرحمٰن گوہڑوی کے نگرانی میں بٹھا دیا گیا۔ یہاں یہ عرض کر دوں کہ والد صاحب رحمہ اللہ نے ۱۹۶۴ء میں المکتبۃ السّلفیہ کے سامنے کرائے کا ایک مکان لے کر اہل محلّہ کے بچوں کے لیے حفظ قرآن کی تعلیم کا اہتمام کر لیا تھا جس کے پہلے مدرس قاری فضل الرحمٰن تھے۔ بعد میں پنڈی گھیپ کے ایک بزرگ استاد قاری محمد نواب صاحب تشریف لائے جن کی تدریس اتنی نتیجہ خیز تھی کہ اس کے بعد کسی اور استاد کی تدریس کا ایسا نتیجہ نہ نکل سکا۔ ان کی شفقت اور ترغیب سے علی الصبح حفظِ قرآن کے طلباء کا سبق سننے، اور نیا سبق دہرانے کی خدمت کی توفیق رب رحیم و کریم نے مجھے عطا فرمائی جو افسوس کہ چند سالوں سے زیادہ جاری نہ رہ سکی۔ پھر ۱۴۰۱ھ ۱۴۰۲ھ میں دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں علی الصبح دو گھنٹے کی تدریس کا اللہ تعالیٰ نے موقع عطا فرمایا جس میں شرح نخبۃ الفکر (مکمل)، اصول الشاشی (مکمل)، ہدایۃ النحو، ترجمہ قرآن کے علاوہ شاید تلخیص المفتاح یا مختصر المعانی دہرانے کا موقع بھی ملا۔ تیسرے سال میں مقامات حریری جیسے اسباق شروع ہوئے لیکن افسوس کہ تدریس کا تسلسل جاری نہ رہ سکا۔

حافظ محمد اشرف سعید

(ولادت ۱۴۔ دسمبر ۱۹۴۴ء)

میانہ قد، متوازن جسم، گورا رنگ، گول چہرہ، موٹی آنکھیں، گفتگو میں تھوڑی سی لکنت کی ملاوٹ۔ شیریں کلام۔ پورے چہرے پر پھیلی ہوئی سفید داڑھی، سادہ مگر صاف ستھرا لباس، دوستوں کے دوست، باعمل عالم، مطالعہ کتب کے شائق، نرم مزاج، طبیعت میں ہمدردی کے آثار کا غلبہ۔ یہ ہیں حافظ محمد اشرف سعید۔

یہ لاہور ہی کے رہنے والے ہیں اور مسلم آباد شالامار ٹاؤن میں سکونت پذیر ہیں۔ ان کی اور ان کی بہن صفوراں بی بی کی عمر صرف چھے برس کی تھی اور چھوٹے بھائی محمد انور چار سال کے تھے کہ ۱۹۵۰ء میں والدہ وفات پا گئیں۔ والد صاحب ریلوے میں ملازم تھے۔ انھوں نے محکمے سے دو سال کی رخصت لی۔ محمد انور والدہ کے بغیر بہت اداس ہو گیا تھا اور والد اس بچے کی وجہ سے سخت پریشان تھے۔ ان کا آبائی گاؤں "یار پورہ" تھا۔ وہ کبھی بچوں کو لے کر گاؤں چلے جاتے، کبھی کسی رشتے دار کے پاس چلے جاتے، کبھی اپنے گھر مسلم آباد آ جاتے۔ اس طرح انھیں بچوں کی پرورش کے سلسلے میں بڑی تکلیفیں اٹھانا پڑیں۔

محمد اشرف کچھ بڑے ہوئے تو محمود بوٹی کے پرائمری سکول میں داخل کرا دیے گئے۔ پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے کہ ان کو اور ان کے چچازاد بھائی عبدالمجید کو جامع مسجد اہل حدیث قدس چوک دال گراں (لاہور) میں داخل کرا دیا گیا۔ وہاں انھوں نے جو ابتدائی تعلیم حاصل کی وہ یہ تھی: ترجمہ قرآن مجید پانچ پارے، عربی کا معلم حصہ اول و دوم۔ علم صرف کی ابتدائی کتاب میزان منشعب، شیخ سعدی کی کریما اور گلستان۔ بلوغ المرام کا کچھ حصہ معروف عالم حافظ عبدالرحمٰن مدنی سے پڑھا۔

اس کے بعد یہ شیش محل روڈ پر دارالعلوم تقویۃ الاسلام چلے گئے۔ دارالعلوم کے مہتمم حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی تھے اور اساتذہ تھے مولانا حافظ محمد اسحاق حسینوی، مولانا عبدالرشید مجاہد آبادی اور حافظ عبدالرشید گوہڑوی۔

دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں تدریس کا بہت اچھا انتظام تھا اور اساتذہ بھی جلیل القدر تھے۔ نہایت ذمہ داری اور محنت سے پڑھاتے تھے اور طلباء پر شفقت فرماتے تھے۔ حافظ محمد اسحاق حسینوی نے ۴ جولائی ۲۰۰۲ء کو وفات پائی اور حافظ عبدالرشید گوہڑوی نے ۱۸ جنوری ۲۰۱۰ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ مولانا عبدالرشید مجاہد

آبادی نے اللہ کی مہربانی سے جامعہ الدراسات الاسلامیہ کے نام سے لاہور میں دارالعلوم جاری کیا ہے اور وسیع مسجد بھی تعمیر ہو چکی ہے۔ مولانا خود تدریس وخطابت کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ وہ منجھے ہوئے مدرس اور مشہور خطیب ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی زندگی دراز فرمائے اور حافظ محمد اسحاق اور حافظ عبدالرشید گوہڑوی کا ٹھکانا جنت الفردوس ہو۔ آمین

حافظ محمد اشرف سعید نے ان تینوں اساتذہ سے مندرجہ ذیل کتابیں پڑھیں۔

حافظ عبدالرشید گوہڑوی سے مشکوٰۃ شریف حصہ اول۔ ترجمہ قرآن مجید دس پارے، عربی کا معلم حصہ سوم وچہارم وقرأۃ الرشیدہ حصہ چہارم۔ عربی ادبیات کی کتابیں سبعہ معلقہ، مقامات حریری، حماسہ اور تاریخ ادب العربی۔ علم نحو کی نحو میر اور کافیہ۔ علم صرف کی انتہائی کتاب شافیہ۔ فقہ کی شرح وقایہ حصہ اول اور ہدایہ اولین۔

مولانا عبدالرشید مجاہد آبادی سے یہ کتابیں پڑھیں۔

ترجمہ قرآن مجید آخری دس پارے۔ ترجمہ مکمل ہونے کی تقریب میں مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے آخری دو سورتوں (معوذتین) کی تفسیر بیان فرمائی۔ نہایت شان دار تفسیر۔ افسوس ہے ہمارے عام طلباء کو اساتذہ کی تقریریں لکھنے کی عادت نہیں۔

خود میں بھی انہی بدنصیب لوگوں میں ہوں، جنھوں نے کسی موضوع پر کسی عالی قدر استاد کی کوئی تقریر نہیں لکھی۔ اب اس پر نادم ہوتا ہوں، لیکن اس ندامت سے کیا حاصل۔ بہرحال مولانا غزنوی کی بیان فرمودہ تفسیر نہایت شان دار تھی۔

ترجمۂ قرآن کے علاوہ محمد اشرف نے مولانا عبدالرشید مجاہد آبادی سے جو کتابیں پڑھیں وہ ہیں مشکوٰۃ شریف حصہ دوم۔ تفسیر جامع البیان۔ تفسیر بیضاوی، فصول اکبری، ہدایۃ النحو، مرقات۔ علم فقہ کی قدوری، شرح وقایہ حصہ دوم اور ہدایہ آخرین۔ اصول فقہ کی اصول شاشی اور نورالانوار۔

حافظ محمد اشرف سعید کے زمانہ طالب علمی میں دارالعلوم تقویۃ الاسلام کے شیخ الحدیث حضرت حافظ محمد اسحاق حسینوی تھے جو حسین خاں والا (تحصیل پتوکی ضلع قصور) کے رہنے والے تھے، بہت بڑے مدرس، جید عالم، بہت اچھے مصنف اور بہت اچھے مترجم خالص دیہاتی زندگی، سادہ بود و باش لیکن علم وعمل کی چلتی پھرتی تصویر۔

حافظ محمد اشرف سعید نے حضرت حافظ محمد اسحاق حسینوی سے مندرجہ ذیل کتابیں پڑھنے کی سعادت حاصل کی۔

جامع ترمذی، سنن ابی ابوداؤد، صحیح مسلم اور صحیح بخاری، موطا امام مالک، حجۃ اللہ البالغہ۔ اصول حدیث کی شرح نخبۃ الفکر اور مقدمہ ابن الصلاح۔

حافظ محمد اشرف نے دینی مدارس کی پوری مروجہ تعلیم حاصل کی اور انھیں رفیع المرتبت اساتذہ کی خدمت میں زانوئے ادب تہہ کرنے کے مواقع میسر آئے۔

دارالعلوم تقویۃ الاسلام سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد یہ شرق پور مولانا محمد یحییٰ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وہاں دو سال میں قرآن مجید حفظ کیا اور یہ حافظ قرآن ہو گئے۔

۱۹۶۸ء میں ان کے والد صاحب نے حج بیت اللہ کیا۔

تعلیم اور حفظ قرآن کے بعد ان کا کاروان زندگی دوسرے دور میں داخل ہوتا ہے۔ ۱۹۶۹ء میں ان کی شادی ہو جاتی ہے لیکن یہ بالکل بے کار ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ والد صاحب زندہ تھے اور ان کی دعاؤں سے کسی نہ کسی طرح زندگی کی گاڑی چل رہی تھی۔

اللہ نے مہربانی فرمائی کہ یہ ۱۹۷۴ء میں پاکستان منٹ میں ملازم ہو گئے۔ اس ملازمت کا اس علم سے کوئی تعلق نہ تھا جو انھوں نے حاصل کیا تھا، لیکن ان پر اللہ نے یہ کرم فرمایا کہ اہل علم سے باقاعدہ تعلق رکھا اور ان کی مجلسوں میں حاضری کو ضروری قرار دیا۔ کتابوں کا مطالعہ بھی جاری رکھا اور طلباء کو کتابیں پڑھاتے بھی رہے مثلاً ترجمہ قرآن پڑھایا۔ درسی کتابوں میں سے نحو میر، ہدایۃ النحو، کافیہ، بلوغ المرام، ابو داود، ترمذی، صحیح بخاری، تفسیر جامع البیان اور دیگر کتابیں شائقین علوم کو پڑھائیں۔ پندرہ سال ایک مسجد میں خطبہ جمعہ کا سلسلہ جاری رکھا۔ رمضان المبارک میں قرآن مجید نماز تراویح میں سناتے رہے۔

چھبیس سال پاکستان منٹ میں سرکاری ملازمت کرنے کے بعد ریٹائر ہو گئے۔ اب ماشاء اللہ بچے کاروبار کرتے ہیں اور ان کا وقت پوتے پوتیوں اور دیگر اہل خانہ کے جھرمٹ میں گزرتا ہے۔ اس کے ساتھ مطالعہ کتب کا شغل بھی جاری رہتا ہے۔ مختلف موضوعات کی عربی، اردو، فارسی کی کتابیں خاصی تعداد میں ان کے پاس موجود ہیں اور پڑھنے کا انھیں شوق ہے۔ اس طرح زندگی کے شب و روز خوش گوار طریقے سے گزر رہے ہیں۔

مطالعہ کتب کے علاوہ قلم و قرطاس سے بھی دلچسپی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ مدت پہلے ایک بہت عمدہ کام انھوں نے اپنے ذمے لیا اور وہ مکمل بھی ہو گیا۔ حضرت نواب صدیق حسن خاں رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث سے متعلق جو بے حساب خدمات سرانجام دی ہیں ان میں ایک اہم خدمت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب ''الادب المفرد'' کا اردو ترجمہ ہے جو انھوں نے توفیق الباری کے نام سے کیا۔ نواب صاحب نے اگست ۱۸۹۰ھ میں وفات پائی۔ یہ سطور ۹۔ اپریل ۲۰۱۳ء کو تحریر کی جا رہی ہیں۔ اس حساب سے ان کی وفات پر ایک سو تیئس برس کا طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ اس زمانے کی اردو زبان اب بہت حد تک بدل گئی ہے۔ حافظ

محمد اشرف سعید نے اپنے انداز میں اس کی تسہیل کی اور ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں اس کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا جو آہستہ آہستہ اختتام کو پہنچا۔ یہ ایک علمی اور ضروری کام تھا جو انھوں نے کیا۔ اللہ تعالیٰ انھیں اس کی جزائے خیر عطا فرمائے۔

اس کے بعد انھوں نے ثلاثیات بخاری کا اردو ترجمہ کیا۔ یہ بھی مکمل ہو گیا ہے۔

میں حیران تھا کہ حافظ محمد اشرف سعید یاروں کے یار کیوں ہیں۔ اب اس کی وجہ سمجھ میں آئی۔ ان کا آبائی گاؤں ''یار پورہ'' ہے اور یہ اپنی نسبت ''یار پوری'' کرتے ہیں۔ گاؤں کا یہ نام مجھے بہت پسند آیا۔ ان کی عادات کے عین مطابق۔ یہ یاروں کے یار ہیں۔ بہت اچھے پریمی۔ یار پوری یعنی پریم نگری۔ یار پورہ اور پریم نگر کے ایک ہی معنی ہیں۔ وادیٔ محبت سے تعلق رکھنے والے۔ پریم نگر کے باسی۔

پروفیسر عبدالرحمٰن لدھیانوی

(ولادت ۳۰- مارچ ۱۹۴۵ء)

میانہ قد، گندم گوں، خوش مزاج، خوش گفتار، خندہ رو، میل جول میں فراخ حوصلہ، صالحیت کی نعمت سے متمتع، عمدہ کردار، نیک اطوار، سادگی پسند، سر پر قراقلی ٹوپی، شلوار قمیص میں ملبوس، اہلِ علم کے قدر دان، حلیم الطبع، نرم خو۔ یہ ہیں پروفیسر عبدالرحمٰن لدھیانوی جن کے آئندہ سطور میں احوالِ زندگی معرضِ بیان میں لانا مقصود ہے۔

پروفیسر عبدالرحمٰن لدھیانوی ۳۰- مارچ ۱۹۴۵ء کو ہندوستانی پنجاب کے ضلع لدھیانہ کی تحصیل سمرالا کے قصبہ پوادت میں پیدا ہوئے۔ تقسیم ملک کے وقت ان کی عمر دو سال ساڑھے چار ماہ کی تھی۔ ان کا تعلق جاٹوں کی گریوال برادری سے ہے۔ اگست ۱۹۴۷ء میں ان کے خاندان نے ترکِ وطن کر کے ضلع وہاڑی میں بورے والا کے قریب چک ۱۶۶، ای بی میں سکونت اختیار کی۔ اس گاؤں میں ان کے بعض رشتے دار پہلے سے آباد تھے۔

اس وقت اس گاؤں میں سکول نہیں تھا۔ دو میل کے فاصلے پر چک نمبر ۱۶۰، ای بی میں پرائمری سکول تھا۔ عبدالرحمٰن کو اس سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ ان کے بڑے بھائی پروفیسر علی محمد ظفر مرحوم اور دیگر عزیزوں سمیت گاؤں کے تقریباً پچاس بچے روزانہ پیدل سکول جاتے تھے۔ وہاں سے پرائمری پاس کر کے عبدالرحمٰن نے گورنمنٹ ہائی سکول بورے والا میں داخلہ لیا۔ اسی سکول میں میٹرک پاس کیا۔

۱۹۶۱ء میں میٹرک پاس کر کے گورنمنٹ کالج بورے والا میں داخل ہوئے۔ کالج میں داخلے پر تھوڑا عرصہ گزرا تھا اور یہ گیارھویں جماعت میں تھے کہ ان کے والد محترم (چودھری عبدالکریم) نے کالج کی تعلیم ترک کر کے بیٹے کو دینی تعلیم دلانے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں وہ بورے والا میں مولانا عبداللہ گورداس پوری سے ملے اور ان سے کسی مدرسے میں داخل کرانے کی درخواست کی۔ مولانا عبداللہ مرحوم عبدالرحمٰن کو جانتے تھے۔ سکول کے زمانۂ طالب علمی میں وہ ان کی اقتدا میں نمازیں بھی پڑھتے رہے تھے اور قرآن مجید کا کچھ ترجمہ بھی ان سے پڑھا تھا۔

مولانا عبداللہ گورداس پوری انھیں جامعہ سلفیہ میں داخل کرانے کے لیے لائل پور لے گئے (جسے بعد میں ہمارے ایک فوجی حکمران نے "فیصل آباد" نام رکھ کر مشرف بہ اسلام کر دیا)۔ میٹرک پاس ہونے کی وجہ سے

انھیں وہاں کے نصابِ تعلیم کے مطابق دوسری جماعت میں داخل کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں نہ پڑھی جا سکیں، جب کہ یہ کتابیں پڑھنا ضروری تھا۔ ان کتابوں کی تکمیل کے لیے وہاں کے تین مدرسوں (مولانا کرم دین مرحوم، مولانا علی محمد نومسلم مرحوم اور شیخ الحدیث حافظ بنیامین طور مرحوم) نے باہم مشورہ کر کے انھیں رینالہ خرد (ضلع اوکاڑہ) کے مدرسہ محمدیہ بھیج دیا۔ یہ مدرسہ استاذ پنجاب حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کے صاحب زادوں (حافظ شفیق الرحمٰن لکھوی اور حافظ عزیز الرحمٰن لکھوی) نے جاری کیا تھا جو اللہ کی مہربانی سے اب بھی جاری ہے۔ لکھوی علمائے کرام چوں کہ صرف ونحو میں بالخصوص مہارت رکھتے ہیں، اس لیے پروفیسر عبدالرحمٰن نے دو سال وہاں تعلیم حاصل کی اور اس فن میں لکھوی علما سے استفادہ کیا۔ پھر حافظ عزیز الرحمٰن لکھوی مرحوم نے ان کو کتبِ حدیث کی تعلیم کے لیے دار العلوم تقویۃ الاسلام (لاہور) جانے کا مشورہ دیا۔ اس دار العلوم میں انھوں نے ۱۹۶۷ء تک تعلیم حاصل کی اور وہیں درس نظامی سے فراغت پائی۔

دار العلوم تقویۃ الاسلام ہی کے دوران تعلیم میں انھوں نے ایف اے اور فاضل عربی کے امتحانات پاس کیے۔ پھر گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا۔ اس کالج میں پروفیسر عبدالقیوم شعبہ عربی کے سربراہ تھے۔ انھوں نے ان پر بڑی شفقت فرمائی اور ہر موقعے پر ان کی راہنمائی کرتے رہے۔ اسی کالج سے انھوں نے بی اے کا امتحان دیا۔

اس وقت دار العلوم تقویۃ الاسلام کے مہتمم سید ابوبکر غزنوی مرحوم تھے۔ انھوں نے ان کو دار العلوم میں مدرس مقرر کر دیا اور یہ دو سال وہاں خدمتِ تدریس سرانجام دیتے رہے۔ پھر انھی کے مشورے سے اورنٹیل کالج لاہور میں باقاعدہ عربی ایم اے میں داخلہ لے لیا اور ایم اے عربی کرنے کے بعد لیکچرار تعینات کیے گئے۔ جن اداروں میں تدریسی خدمات سرانجام دیں وہ ہیں: علی الترتیب گورنمنٹ کالج لاہور، گورنمنٹ کالج پھالیہ ضلع گجرات، گورنمنٹ کالج بھائی پھیرو ضلع قصور، گورنمنٹ ایف سی کالج لاہور اور گورنمنٹ کالج شیخوپورہ۔

دسمبر ۱۹۹۱ء میں محکمہ تعلیم کے صوبائی دفتر ڈی۔ پی۔ آئی آفس لاہور میں بہ طور ڈپٹی ڈائریکٹر (لائبریریز) ان کی تقرری ہوئی۔ پھر محکمانہ ترقی کے نتیجے میں اسی دفتر میں ڈائریکٹر جنرل بنا دیے گئے۔ ڈائریکٹر (ایڈمن) کے ریٹائر ہونے پر انھیں ڈائریکٹر (ایڈمن) کالجز کا قلم دان سونپ دیا گیا۔ اس دوران ڈائریکٹر پلاننگ اور ایڈیشنل ڈی۔ پی۔ آئی کا اضافی چارج بھی ان کے پاس تھا۔ ۲۹- مارچ ۲۰۰۵ء کو اس سرکاری عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

مختلف دینی اداروں میں انھوں نے جن اساتذہ کرام سے تعلیم حاصل کی ان میں مندرجہ ذیل حضرات

کے اسمائے گرامی شامل ہیں:

حضرت حافظ عبداللہ محدث روپڑی، مولانا حافظ محمد اسحاق حسینوی، مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی، مولانا محمد صادق خلیل، مولانا حافظ بنیامین طور، مولانا علی محمد نومسلم، مولانا کرم الدین، مولانا حبیب الرحمٰن لکھوی، حافظ شفیق الرحمٰن لکھوی، حافظ عزیز الرحمٰن لکھوی، حافظ عبدالرشید گوہڑوی، سید ابوبکر غزنوی اور مولانا عبدالرشید مجاہد آبادی۔

یہ سطور ۱۷ نومبر ۲۰۱۲ء کو لکھی جا رہی ہیں۔ اس تاریخ تک ان میں سے حافظ شفیق الرحمٰن لکھوی اور مولانا عبدالرشید مجاہد آبادی اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے بہ قید حیات ہیں اور خدمت تدریس و خطابت سرانجام دے رہے ہیں۔ اللہ ان کی زندگی دراز فرمائے اور یہ اس کے دین کی خدمت میں مصروف رہیں۔ ان کے علاوہ سب حضرات وفات پا چکے ہیں۔ رحمھم اللہ تعالیٰ۔

پروفیسر عبدالرحمٰن لدھیانوی کے خاندان نے روپڑی علمائے کرام کی تبلیغ سے متاثر ہو کر مسلک اہل حدیث اختیار کیا۔ ان کا علاقہ ضلع لدھیانہ روپڑ سے قریب تھا اور روپڑی علما کی اس نواح میں تبلیغی سلسلے میں آمد و رفت رہتی تھی۔ اس خاندان کے لوگوں کو ان بزرگوں کی تقریروں میں شامل ہونے اور مناظرانہ بحثیں سننے کے مواقع میسر آئے اور یہ ان سے اثر پذیر ہو کر متبع کتاب و سنت ہو گئے۔

گزشتہ سطور میں ہم پروفیسر عبدالرحمٰن لدھیانوی کے دورِ طالب علمی اور دورِ ملازمت سے آگاہ ہوئے۔ اب آیئے ان کے دورِ خطابت کی طرف!

میں جون ۱۹۶۷ء میں لاہور کے علاقہ سانده میں آیا۔ اس سے دو سال پہلے مئی ۱۹۶۵ء میں اخبار الاعتصام کی ادارت سے فارغ ہو چکا تھا اور ادارہ ثقافت اسلامیہ میں ریسرچ فیلو کی حیثیت سے تصنیفی خدمات سرانجام دیتا تھا۔ ایک دن شام کے بعد حضرت الاستاذ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی غریب خانے پر تشریف لائے۔ باتیں کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا تم نماز کہاں پڑھتے ہو؟ میں نے عرض کیا قریب ہی بریلوی حضرات کی مسجد ہے، اس میں نماز پڑھتا ہوں۔ فرمایا راج گڑھ میں ایک اہل حدیث بزرگ حاجی محمد چراغ نے اپنی زمین میں اپنے خرچ سے مسجد تعمیر کرائی ہے، وہ یہاں سے کتنی دور ہے؟ عرض کیا: معلوم نہیں وہ مسجد کہاں ہے اور کتنی دور ہے۔

فرمایا: چلو میں تمھیں وہ مسجد دکھاتا ہوں۔ عشاء کی نماز اسی مسجد میں پڑھیں گے۔

اس زمانے میں سانده اور راج گڑھ میں آبادی اور مکانوں کی تعمیر کا یہ حال نہیں تھا جو اب ہے۔ کھلی جگہ پڑی تھی، کہیں کہیں کوئی مکان نظر آتا تھا۔ ہم وہاں پہنچے تو اس مسجد میں ایک نوجوان کھڑے تھے، جنھیں میں

جانتا تھا۔ وہ تھے مولانا عبدالغفور جو دارالعلوم تقویۃ الاسلام کے سند یافتہ اور مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے اس وقت کے شاگرد تھے جب مولانا ممدوح بہ طور شیخ الحدیث اس دارالعلوم میں کتب حدیث پڑھاتے تھے اور حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی رحمہ اللہ دارالعلوم کے مہتمم تھے۔

میں نے عبدالغفور کو وہاں دیکھا تو تعجب سے پوچھا: تم کہاں؟ اس اجاڑ میں تمھیں ڈر نہیں لگتا؟ عبدالغفور نے عشاء کی اذان دی۔ اذان سن کر صرف ایک نمازی آئے، وہ تھے اس مسجد کے بانی حاجی محمد چراغ، جن کا مکان اس وقت مسجد کے قریب تھا۔ ہم کل چار نمازی ہوئے۔ حاجی صاحب نے بڑے احترام سے مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کو سلام کیا۔ مولانا سے پہلے سے ان کی واقفیت تھی اور انھی نے حاجی صاحب کے کہنے پر اپنے شاگرد عبدالغفور کو اس مسجد میں امام و خطیب کے طور پر بھیجا تھا۔ اس مسجد کا یہ ابتدائی دور تھا۔ وہاں آبادی بھی بہت محدود تھی، اس لیے مولانا عبدالغفور تھوڑا عرصہ ہی اس مسجد میں رہے۔ اس کے بعد شاد باغ چلے گئے تھے اور وہاں کی مسجد اہل حدیث میں خطابت کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ یہ ۴۵-۴۶ برس قبل کی بات ہے۔ وہ خوش بیان خطیب اور صاحبِ کردار عالم تھے۔ مرضِ فالج کی گرفت میں آ گئے تھے۔ اب معمر بھی ہو گئے ہیں اور بہت کمزور بھی خطابت و امامت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

استاذ مکرم مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی نے بتایا کہ حاجی محمد چراغ کا اپنی تعمیر کردہ مسجد کے اردگرد کافی رقبہ تھا۔ اس سستے زمانے میں وہ بارہ سو روپے مرلے کے حساب سے زمین فروخت کرتے تھے۔ لیکن اہل حدیث کے لیے دو سو روپے فی مرلہ رعایت تھی۔ انھوں نے مجھے فرمایا تم مجھ سے بات کرتے تو میں تمھیں اس علاقے میں جگہ لینے اور مکان بنانے کا مشورہ دیتا۔

یہ مسجد ۱۹۶۵ء میں حاجی محمد چراغ نے تعمیر کرائی تھی۔ اب اس مسجد میں پروفیسر عبدالرحمٰن لدھیانوی کی خطابت کے بارے میں سنیے!

مجھے ایک دن ایک بزرگ قاضی رفیع الدین نے بتایا کہ راج گڑھ میں حاجی محمد چراغ والی مسجد میں ایک نوجوان عبدالرحمٰن خطبہ جمعہ دیتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ عبدالرحمٰن لدھیانوی ہوں گے۔ گیا تو خطبہ شروع ہو چکا تھا اور چھ سات آدمی خطبہ سن رہے تھے۔ وہ لوگ مجھے اب تک یاد ہیں۔ جمعے کے بعد ان سے تعارف ہوا۔

۱- حاجی محمد چراغ مسجد کے اصل بانی، جنھوں نے مسجد کے لیے زمین دی اور اپنے خرچ سے اس کی تعمیر کرائی۔

۲- قاضی رفیع الدین۔ یہ سانده رہتے تھے اور سیشن کورٹ میں ٹائپسٹ تھے۔

۳- صدیقی صاحب، ان کا نام ذہن سے نکل گیا ہے۔ مسجد کے قریب ان کی کوٹھی تھی۔ اردو سپیکنگ تھے۔

دھیمے اور میٹھے انداز میں بات کرتے تھے۔ جمعے کی نماز کے بعد مجھ سے مسئلے پوچھا کرتے تھے۔ خود پروفیسر صاحب نے ان سے کہا کہ روزانہ پیش آنے والے مسائل بھٹی صاحب سے پوچھا کریں۔ صدیقی صاحب عرصہ ہوا وفات پا گئے ہیں۔

۴- ایک صاحب دیوبندی مسلک سے وابستہ تھے۔ ساٹھ کے پیٹے میں ہوں گے۔ مولانا اشرف علی تھانوی کے مرید تھے۔ میں اس زمانے میں "فقہائے ہند" کے نام سے کتاب لکھ رہا تھا جو دس جلدوں میں مکمل ہوئی۔ وہ مجھ سے برصغیر کے علمائے کرام کے بارے میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ لیکن فقہی مسلک کے بارے میں جیسا کہ ان میں سے اکثر حضرات کی عادت ہے، طبعِ خشک رکھتے تھے۔ تاہم مجھ سے ان کا طرزِ کلام بالعموم ہمیشہ اعتدال کے دائرے میں رہا۔

۵- ان دیوبندی بزرگ کے ایک بیٹے بھی وہیں جمعہ پڑھتے تھے۔ وہ گورنمنٹ کالج (لاہور میں) نفسیات کے استاذ تھے۔ ان کے چہرے پر بیماری کے آثار نمایاں تھے۔ انھیں مرزا صاحب کہا جاتا تھا۔

٦- شیخ محمد اسحاق۔ ان کی سکونت تو میرے خیال میں مغل پورہ کی طرف تھی، لیکن کرشن نگر کے مین بازار میں بیگ اور پرس وغیرہ بناتے تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ اپنے بڑے بیٹے کو کسی طرح اس مسجد کا امام اور خطیب بنایا جائے۔

۷- ایک اور صاحب تھے پروفیسر محمد انور وڑائچ۔ وہ رہنے والے تو لاہور ہی کے تھے، لیکن پروفیسر عبدالرحمٰن کے ساتھ گورنمنٹ کالج پھالیہ میں فارسی پڑھاتے تھے اور ان کے ساتھ ہی ہر ہفتے وہاں سے لاہور آیا کرتے تھے۔ بعد میں ان کا تبادلہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ہو گیا تھا۔ مدت ہوئی ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ معلوم نہیں وہ کہاں میں اور کس حال میں ہیں مجھے بھول گئے یا جانتے ہیں۔ لیکن مجھے وہ بہت یاد آتے ہیں۔

ان حضرات میں اس فقیر کو آٹھویں نمبر پر شمار کیجیے۔ شاید دو چار اور ہوں گے۔ یہ تھی کل تعداد اس وقت اس مسجد میں جمعہ پڑھنے والوں کی۔ اس سے اندازہ کر لیجیے کہ پنج وقتہ نمازوں میں کتنے لوگ آتے ہوں گے۔

چند روز بعد عید آئی تو مسجد کے سامنے کی گراؤنڈ میں پڑھی گئی۔ اس میں بھی حاضری چند افراد پر مشتمل تھی۔

اللہ تعالیٰ حاجی محمد چراغ کی مغفرت فرمائے کہ انھوں نے مسجد کے لیے بھی جگہ دی اور اس کے سامنے وسیع گراؤنڈ بھی چھوڑی۔ میں جب بھی اس مسجد اور گراؤنڈ کو دیکھتا ہوں تو حاجی صاحب مرحوم یاد آ جاتے ہیں اور بے ساختہ ان کے لیے منہ سے دعا نکلتی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ دوسرے لوگوں کا کیا معاملہ ہے۔ ان میں سے کوئی اس مرحوم بزرگ کو یاد کرتا ہے یا نہیں۔ اب ماشاء اللہ یہ مسجد بھی وسعت اختیار کر گئی ہے اور عیدین

کے موقع پر گراؤنڈ بھی نمازیوں سے بھر جاتی ہے۔ دور دور سے نمازی اس میں جمعہ وعیدین کی ادائیگی کے لیے آتے ہیں۔ پنج وقتہ نمازوں میں بھی لوگ، خاصی تعداد میں حاضر ہوتے ہیں۔ اس میں حفظ قرآن کا مدرسہ بھی جاری کیا گیا ہے۔ بے شبہ پروفیسر عبدالرحمٰن لدھیانوی کی تگ و دو کا نتیجہ ہے۔ وہ اپنے رفقاے کار کے تعاون سے یہ خدمت سر انجام دے رہے ہیں۔ اللہ ان سب حضرات کو جزاے خیر سے نوازے۔ میں طویل مدت سے اسی مسجد میں جمعہ پڑھتا ہوں اور منبر و محراب سے دور ایک کونے میں بیٹھتا ہوں۔

ابتدا میں پروفیسر صاحب نے اس مسجد کی جو مجلسِ انتظامیہ بنائی تھی، اس میں مجھے شمولیت کے لیے کہا تھا، لیکن میں نے یہ کہہ کر معذرت کر دی تھی کہ اس قسم کی کمیٹیوں میں شمولیت اور ان کی میٹنگوں میں حاضری میرے لیے مشکل ہے۔

یہاں دار العلوم تقویۃ الاسلام میں ان کے طالب علمی کے زمانے کی ایک اور بات سنیے جو خود انھوں نے ایک مرتبہ اپنے خطبہ جمعہ میں بیان کی تھی۔ سید ابوبکر غزنوی مرحوم و مغفور کے عہدِ اہتمام میں یہ اس دار العلوم میں داخل ہوئے تھے۔ سید صاحب نے مطبخ کا انتظام ان کے سپرد کیا تھا۔ ان کا اسلوبِ کلام کچھ ایسا تھا کہ یہ گھبرا گئے۔ میں اس زمانے میں اخبار ''الاعتصام'' کا ایڈیٹر تھا اور اس کا دفتر اس بلڈنگ کی دوسری منزل میں تھا۔ یہ میرے پاس آئے اور کہا میں پریشان ہوں، یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، یہیں رہیے اور تعلیم حاصل کیجیے۔ مرحوم سید صاحب سے بھی میں نے بات کی اور مسئلہ حل ہو گیا۔ اب معلوم نہیں یہ واقعہ پروفیسر صاحب کو یاد ہے یا نہیں۔ اس قسم کے واقعات کون یاد رکھتا ہے۔

پروفیسر صاحب نے اللہ کی مہربانی سے ہمیشہ خدمت قرآن و حدیث کو اپنا مطمحِ نظر قرار دیے رکھا۔ ۱۹۸۳ء میں انھوں نے ریڈیو پاکستان لاہور کے پروگرام صراط مستقیم میں ''حکمت کے موتی'' کے عنوان سے تقریروں کا سلسلہ شروع کیا تھا، جس میں اخلاقیات، معاشرتی آداب، حقوق اللہ اور حقوق العباد وغیرہ مسائل سے متعلق احادیث کی تشریح کی جاتی تھی۔ پاکستان ٹیلی ویژن سے بھی ان کے اس قسم کے چند پروگرام نشر ہوئے۔

۱۹۸۷ء میں انھوں نے ہفت روزہ ''اہل حدیث'' میں اسی قسم کے عنوانات پر مشتمل احادیث کی تشریح کا آغاز کیا جو اب تک جاری ہے۔ ایک ہزار سے زائد احادیث کی تشریح معرضِ اشاعت میں آ چکی ہے، جنھیں وہ کتابی شکل میں لانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ٹی وی چینل ''پیغام'' میں بھی وہ درسِ حدیث دیتے ہیں۔ بچیوں کے دینی مدارس کے لیے بھی وہ حدیث کی نصابی کتاب مرتب کر رہے ہیں جو ان شاء اللہ جلد چھپ جائے گی۔ حدیث کی ایک کتاب ''عمدۃ الاحکام'' کے ترجمہ و تشریح کا کام بھی جاری ہے۔

جماعت کے تنظیمی سلسلے میں بھی انھوں نے خدمات سرانجام دیں۔ پہلے لاہور شہر کی جمعیت کے امیر بنائے گئے۔ پھر صوبہ پنجاب کی جمعیت کے منصب امارت پر فائز رہے۔ مرکزی جمعیت کے نائب امیر اور شعبۂ خدمت خلق کے ناظم بھی رہے۔ اب اس سے سبک دوش ہو کر کنٹرولر امتحانات وفاق المدارس السّلفیہ پاکستان کے طور پر خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ علاوہ ازیں ناظمِ رابطہ مدارس وعلماے کرام مرکزی جمعیت پاکستان بھی ہیں۔

اللہ تعالیٰ انھیں کتاب وسنت کی مزید توفیق بخشے۔

(۱۷۔ نومبر ۲۰۱۲ء)

مولانا محفوظ الرحمٰن فیضی مئوی

(ولادت ۱۹۴۶ء)

ہندوستان کے بعض علاقوں میں مسلمان بہت بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ متعدد شہروں، قصبوں اور دیہات میں اہل حدیث کے بے شمار مدارس جاری ہیں اور ان میں ملک کے معروف وممتاز اساتذہ شائقین علم کو تعلیم دے رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے تصنیف وتالیف کے سلسلے بھی قائم ہیں اور وعظ وتبلیغ کے کارواں بھی مختلف مقامات میں جاتے اور لوگوں کو راہِ حق پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں۔

جن شہروں میں اہل حدیث کثیر تعداد میں سکونت پذیر ہیں اور ان کے وہاں دینی مدارس و جامعات کے علاوہ لڑکے اور لڑکیوں کی عصری تعلیم کے لیے سکول اور کالج بھی جاری ہیں جن میں سیکڑوں بچے زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو چکے ہیں (اور ہو رہے ہیں) ان میں ایک شہر کا نام "مئو ناتھ بھنجن" ہے۔ یہاں طلباے علم کے لیے دینی تعلیم کا بھی انتظام ہے اور عصری تعلیم کا بھی۔!

اس شہر کی جامعہ اسلامیہ فیض عام سے جن حضرات نے فیض پایا وہ فیضی کہلاتے ہیں۔ ان میں ایک عالم دین کا اسم گرامی مولانا محفوظ الرحمٰن فیضی ہے۔ یہ اس شہر میں ۱۹۴۶ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا مختصر سلسلۂ نسب یہ ہے: محفوظ الرحمٰن بن منظور الحسن بن حافظ ثناء اللہ۔!

انھوں نے متعدد اساتذہ کرام سے تعلیم حاصل کی اور بیس برس کی عمر میں ۱۹۶۶ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔ مولانا شمس الحق سلفی، مولانا ابو الوفا عظیم اللہ فیضی، اور مولانا مفتی حبیب الرحمٰن فیضی سے سند و اجازۂ حدیث کا شرف حاصل کیا اور پھر ۱۹۶۷ء میں اسی جامعہ اسلامیہ فیض عام میں مدرس مقرر کر لیے گئے۔ وہاں انھوں نے عربی اور فارسی علوم وفنون کی تعلیم دینا شروع کی۔ تحصیل علم کے لیے بھی بڑی محنت کی تھی اور تدریس کی ذمہ داری ان کے سپرد ہوئی تو اس میں بھی بے حد محنت کرنے لگے۔ یہ سطور ۲۳۔ مئی ۲۰۱۴ھ کو سپرد قلم کی جا رہی ہیں۔ آج کل وہ اپنی اس مادرِ علمی میں شیخ الحدیث اور صدر مدرس کے منصبِ عالی پر فائز ہیں۔ مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند میں بھی انھیں اعزاز کا مقام حاصل ہے۔ اس کی مجلس شوریٰ کے رکن اور صوبائی جمعیت اہل حدیث مشرقی یوپی کے امیر ہیں۔

مولانا محفوظ الرحمٰن فیضی قلم وقرطاس سے بھی رابطہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے اردو اور عربی دونوں زبانوں

میں دادِ تحقیق دی۔ بعض عربی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ان کی قلمی کاوشوں کی تفصیل درجِ ذیل ہے:

(۱) مہدی موعود: یہ کتاب اردو زبان میں ہے اور تین سو صفحات پر محیط ہے۔ اس موضوع سے متعلق تمام احادیث کا استقصا کیا گیا ہے اور ان کی روشنی میں مہدی موعود کے اوصاف تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ نیز متعدد محققین کی تصریحات سے ان احادیث کے معناً متواتر ہونے کا ثبوت فراہم کیا گیا ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ عقیدۂ مہدی موعود اسلامی عقائد میں سے ہے۔ اس سلسلے میں جو لوگ شکوک وشبہات میں مبتلا ہیں، دلائل کی روشنی میں ان کی تردید کی گئی ہے۔ (۲) شیخ الامام محمد بن عبدالوہاب کے بارے میں دو متضاد نظریے (۳) تذکرہ مولانا محمد احمد ناظم صاحب (۴) دین و مذہب اور کمیونزم (۵) نماز نبوی (۶) مبادی عروض وقوافی (۷) اصول دین (ترجمہ) (۸) قبروں پر مساجد کی تعمیر اور اسلام (ترجمہ) (۹) اتباع سنت اور تقلید ائمہ اربعہ کی نظر میں (ترجمہ) (۱۰) مبادئ اصول حدیث۔ اس رسالے میں حدیث کی تمام قسموں کا اختصار مگر جامعیت سے ذکر کیا گیا ہے۔

(۱۲) ثنائیات موطا الامام مالک: یہ مولانا محفوظ الرحمٰن فیضی مئوی کی عربی تصنیف ہے جو بڑے سائز کے ۱۲۶ صفحات پر مشتمل نہایت محققانہ کتاب ہے۔ اس میں مختلف موضوعات کی ان احادیث کی نشان دہی کی گئی ہے، جن میں نبی ﷺ اور امام مالک رحمہ اللہ کے درمیان صرف دو راویوں کا واسطہ ہے۔ محدثین کی اصطلاح میں انھیں ثنائیات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بعض حضرات نے چالیس ثنائیات کی نشان دہی کی ہے۔ لیکن مولانا محفوظ الرحمٰن فیضی نے اس موضوع کو مرکزِ تحقیق ٹھہرایا تو ۱۵۳ ثنائیات کا سراغ لگا لیا۔

مقدمہ کتاب میں مولانا ممدوح نے امام مالک رحمہ اللہ کے حالات بیان کیے ہیں، ان کے شیوخ کا تذکرہ کیا ہے، پھر ان کے شیوخ کے ان شیوخ کا ذکر کیا ہے جن سے انھوں نے موطا میں ثنائیات روایت کیں اور وہ ہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم۔

اس موضوع کی یہ اہم ترین کتاب ہے۔ اس میں مولانا فیضی نے امام مالک رحمہ اللہ کی بعض اصطلاحات کا ذکر بھی کیا ہے جو وہ موطا میں استعمال کرتے ہیں، پھر امام ہی کی زبانی ان کا مطلب بیان کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں بعض شروح موطا اور راویانِ موطا کا ذکر ہے۔ موطا امام مالک جو اہل علم میں متداول ہے، اس کے راوی یحییٰ اللیثی مصمودی اندلسی (۱۵۱-۲۳۴ھ) ہیں۔ مقدمہ کتاب ساٹھ (۶۰) صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور اس روح پرور موضوع کے دل کش معلومات کا مجموعہ! کتاب ۲۰۱۲ء (۱۴۳۳ھ) میں کویت سے شائع ہوئی۔ ۱۴ مئی ۲۰۱۰ء کو مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے دفتر (دہلی) کی طرف سے میرے نام کتابوں کا ایک بنڈل آیا، جس سے میرے دوست ڈاکٹر محمد بہاء الدین کی تصنیف تحریکِ ختم نبوت مطبوعہ دہلی کی چھے جلدیں برآمد ہوئیں اور ایک

’’ثنائیات موطا الامام مالک‘‘۔ اس کتاب کے ٹائٹل پیج پر یہ الفاظ مرقوم ہیں:

اھداء المؤلفی الٰی فضیلة المکرم الشیخ محمد اسحاق بتی حفظه الله ،
لاھور -پاکستان-

محفوظ الرحمٰن الفیضی

۱۸-۴-۱۴۳۴ھ، ۱-۳-۲۰۱۳ء

مجھے یہ کتاب دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی۔ مسرت کی ایک وجہ یہ تھی کہ میں ’’چمنستانِ حدیث‘‘ میں مولانا محفوظ الرحمٰن فیضی کا تذکرہ کرنا چاہتا تھا۔ مجھے کتاب دیکھ کر خیال گزرا کہ ممکن ہے مقدمے میں ان کے کچھ حالات مل جائیں۔ میں نے شروع سے آخر تک سارا مقدمہ پڑھا لیکن ان کے حالات میں مجھے کچھ نہیں ملا۔ پھر ذہن میں آیا کہ گیارہ بارہ سال قبل مجھے علی گڑھ سے مولانا رفیق احمد سلفی نے ازراہ کرام ایک کتاب بھیجی تھی، جس کا نام ہے ’’علم الحدیث مطالعہ وتعارف‘‘۔ یہ کتاب حدیث سے متعلق بہترین مقالات کا جاں فزا مجموعہ ہے۔ یہ مقالات ہندوستان کے متعدد اصحاب تحقیق نے ایک سیمینار میں پڑھے تھے جو ۱۸، ۱۹۔ اکتوبر ۱۹۹۸ء کو علی گڑھ میں منعقد ہوا تھا۔ مولانا رفیق احمد سلفی نے ان مقالات کو مرتب کر دیا تھا اور نگران تھے مولانا عبدالمعید مدنی۔ اس کتاب میں ہر مقالہ نگار کا مختصر الفاظ میں تعارف کرایا گیا ہے۔ نیز ہندوستان کے بعض بڑے مدارس کے اساتذہ کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ میں نے وہ کتاب دیکھی تو اس میں مولانا محفوظ الرحمٰن فیضی کا مختصر تذکرہ مرقوم ہے جو گزشتہ سطور میں قارئینِ کرام کے مطالعہ میں آیا۔

’’علم الحدیث – مطالعہ وتعارف‘‘ مجھے مولانا رفیق احمد سلفی نے یہ الفاظ لکھ کر بھیجی تھی۔

نقوش عظمت رفتہ، بزم ارجمنداں اور کاروانِ سلف کے عظیم مصنف محترم مولانا محمد اسحاق بھٹی حفظہ اللہ کی خدمت میں سرسید کی ’’سرزمین‘‘ کا ایک علمی تحفہ۔

نیاز مند
رفیق احمد سلفی علی گڑھ

۱۲-۲-۲۰۰۱ء

بے شبہ یہ سرسید کی سرزمین کا علمی تحفہ ہے۔ میں نے اس سے بہت استفادہ کیا۔ یہ علمی تحفہ اردو بازار لاہور میں دار الکتب السّلفیہ کے ناظم ہنادشا کر نے خوب صورت انداز میں شائع کر دیا ہے۔ خوانندگانِ مکرم اس کا مطالعہ کریں گے تو بہت سی معلومات سے آگاہ ہوں گے۔

مولانا عتیق اللہ سلفی

(ولادت یکم اگست ۱۹۴۷ء)

چھوٹا قد، مختصر مگر متحرک جسم، گورا رنگ، نرم کلام اور شیریں زبان، خوش خلق اور اعمالِ خیر کی انجام دہی میں تیز، بلند کردار اور پیکر حسنات، تبلیغ توحید اور دعوتِ کتاب وسنت میں ہر آن آمادہ و تیار، سادہ لباس اور سادہ معاشرت، سب کے بہی خواہ اور ہم درد۔ یہ ہیں مولانا عتیق اللہ سلفی جن کا تذکرہ آئندہ سطور میں کرنا مقصود ہے۔ لیکن اس سے پہلے ان کے نسب نامے سے واقف ہونا ضروری ہے جو یہ ہے: عتیق اللہ بن صوفی عبدالجلیل بن صوفی عین دین بن بدر الدین بن احمد بن شہادت بن مستقیم بن حافظ مقیم بن سلیمان بن نور محمد بن حبیب۔

یہ نسب نامہ جس سے ہم آگاہ ہو سکے ہیں، مولانا عتیق اللہ سلفی کے دس آبا و اجداد اور اسلاف پر مشتمل ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ یہ لوگ علم وعمل کی نعمت سے کہاں تک بہرہ مند تھے، لیکن ان کے نام ایسے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ امورِ دین سے باخبر بھی تھے اور اس پر عامل بھی۔ ان میں ایک بزرگ حافظ قرآن بھی ہیں، جن کا نام حافظ مقیم ہے۔ اللہ ان سب کی مغفرت فرمائے۔ آمین

ان اسمائے عشرہ میں سے دو بزرگوں کے متعلق جہاں تک یہ فقیر جانتا ہے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ نیکی و پاک بازی میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے، وہ تھے مولانا عتیق اللہ سلفی کے والدِ گرامی صوفی عبدالجلیل اور ان کے جدِ امجد صوفی عین دین۔

صوفی عبدالجلیل کو دیکھنے اور ان سے میل ملاقات رکھنے والے تو ان کے قرابت داروں میں متعدد لوگ موجود ہیں جو ان کی عادات و اطوار اور واقعات و احوال کے بہت سے پہلوؤں سے باخبر ہیں، لیکن ان کے والد صوفی عین دین کو دیکھنے والے ان کے عزیزوں میں سے شاید ایک دو کے سوا اس دنیائے فانی میں کوئی نہیں ہوگا، اور جو ہیں وہ بھی رختِ سفر باندھنے والے ہیں۔ یہ دنیوی زندگی عارضی ہے اور ختم ہونے والی ہے۔ انشاء اللہ خاں انشا نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔

کمر باندھے ہوئے چلنے پہ یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

میں نے صوفی عین دین کو دیکھا ہے اور بارہا دیکھا ہے۔ جب یہ سطور لکھ رہا ہوں تو قدرے چھوٹے قد، گٹھے ہوئے جسم اور کھدر کا کرتا پہنے اور کھدر ہی کا تہبند باندھے سانولے رنگ کے وہ بزرگ مجھے صاف نظر آرہے ہیں، نماز پڑھتے ہوئے بھی، بارگاہِ الٰہی میں دعا مانگتے ہوئے بھی، قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے بھی، اپنے گھر میں اور گلی میں آہستہ آہستہ چلتے پھرتے بھی، ان کا مکان مسجد کے سامنے تھا، ان کا خیر و صلاح کا مجسمہ مسجد میں آتے ہوئے بالکل سامنے دکھائی دے رہا ہے۔ یہ سطور لکھتے ہوئے میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ لوگ ان کے پاس آتے، دعا کراتے۔ عورتیں اپنے بچوں کو لے کر آتیں، ان کی تکلیف بیان کرتیں۔ وہ کچھ پڑھتے اور بچوں پر پھونک مارتے۔ اللہ نے ان کی پھونک میں کچھ ایسا اثر بھر دیا تھا کہ تکلیف رفع ہو جاتی اور بچے اچھے بھلے ہو جاتے۔

صوفی عین دین کے ایک ہی بیٹے تھے اور وہ تھے صوفی عبدالجلیل۔ شکل و شباہت اور لباس میں انھیں اپنے باپ کا مثنیٰ کہنا چاہیے۔ ان کی آواز میں کھنک بھی تھی اور نرمی بھی۔ صوفی عبدالجلیل عمر میں مجھ سے کئی سال بڑے تھے، لیکن قرآن مجید کا ترجمہ ہم نے اپنے وطن کوٹ کپورہ میں حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے اکٹھے پڑھا۔ وہ صحیح معنوں میں صوفی تھے۔ صاف دل اور صاف ذہن۔ ردائے صالحیت اوڑھے ہوئے۔ تہجد گزار اور متبع قرآن و سنت۔ مجھ پر شفقت کا برتاؤ کرتے تھے۔ عمر کے آخری دور میں ان کی یادداشت جواب دے گئی تھی۔ انھی دنوں کی بات ہے کہ ایک مرتبہ میں ان کے گاؤں (چک ۳۶ گ ب) گیا اور ان سے ملا۔ لیکن وہ مجھے پہچان نہیں سکے۔ قریب بیٹھے ہوئے بعض لوگوں نے انھیں میرے متعلق سمجھانے کی کوشش کی، میرے مرحوم والد کا نام لے کر بتایا کہ یہ ان کا بیٹا ہے اور لاہور رہتا ہے، لیکن کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی۔ ان کا حافظہ انھیں داغِ مفارقت دے گیا تھا۔

صوفی عبدالجلیل کی شادی صوفی محمد کی بھتیجی اور ان کے بڑے بھائی مولوی عبداللہ مرحوم کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ مولوی عبداللہ کو ہم نے نہیں دیکھا لیکن صوفی محمد اس فقیر کے مشفق تھے۔ ان سے میل جول کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ خیر و صلاح کا چلتا پھرتا مجسمہ، لمبے قد، تیکھے نقوش اور سرخی مائل گورے رنگ کے خوب صورت مگر سادہ مزاج آدمی۔ سب ان کا احترام کرتے تھے۔ ان کے والد مکرم کا اسم گرامی حاجی نور الدین تھا۔ وہ حضرت مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے مرید تھے۔ درمیانے قد، گورے رنگ، نورانی چہرے اور حسنِ اعمال و بلندیٔ کردار کی دلکش تصویر، محلے کے بچوں کو صبح و شام اپنے گھر میں پٹ سن کے بٹے ہوئے لمبے چوڑے پیھڑے پر بیٹھ کر قرآن مجید پڑھاتے اور انھیں نیک عمل کرنے کی تلقین فرماتے۔ کوٹ کپورہ میں عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کے امام تھے۔ عمر رسیدہ ہو گئے تو ان کے بیٹے صوفی محمد مرحوم عیدین کی نماز پڑھانے لگے تھے۔

لیکن جب ۱۹۳۳ء میں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی وہاں خطیب و مدرس کی حیثیت سے تشریف لے گئے اور صوفی محمد صاحب ان سے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھنے لگے تو عیدین کی نماز کی امامت و خطابت کا منصب انھوں نے مولانا ممدوح کے سپرد کر دیا تھا۔

حاجی نور الدین جدی پشتی زمینوں کے مالک تھے اور صاحبِ حیثیت بزرگ تھے۔ وہاں کے مسلمان تو ان کی تکریم کرتے ہی تھے، غیر مسلم بھی اکرام سے پیش آتے اور ان سے دعاے خیر کی درخواست کرتے۔

حاجی صاحب موصوف نے تقسیم ملک کے زمانے میں ایک بڑے قافلے کے ساتھ پاکستان میں داخل ہو کر ۳۰ ستمبر ۱۹۴۷ء کو گنڈا سنگھ والا (ضلع قصور) میں وفات پائی۔ میں ان کے جنازے میں شامل تھا۔ ان کے بیٹے صوفی محمد مرحوم نے اس سے بہت سال بعد چک ۳۶ گ ب میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ موضع بڈھیمال کے حضرات کے ساتھ ایک گاؤں (چک ۳۶) میں آباد ہو گئے تھے، جو ہمارے گاؤں (چک ۵۳ گ ب ڈھیساں منصور پور) سے اٹھارہ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔

صوفی محمد مرحوم کے ایک ہی بیٹے تھے حاجی فضل الرحمٰن۔ وہ میرے بچپن کے دوست تھے۔ اپنے بزرگوں کی طرح نیک اور ملنسار و خوش اخلاق۔ اپنے اس دیرینہ دوست کی وفات پر مجھے انتہائی صدمہ پہنچا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ حاجی فضل الرحمٰن کی ایک بہن زندہ تھی جو بے اولاد تھی۔ وہ بھی اگست ۲۰۱۳ء میں وفات پا گئی۔ بڑی نیک خاتون تھی۔ اس کے مرحوم شوہر حاجی محمد میرے دوست تھے۔

میں عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ مولانا عتیق اللہ سلفی کے ددھیال اور ننھیال دونوں باہم قریبی رشتے دار تھے اور دونوں کو بارگاہِ خداوندی سے صالحیت کی نعمتِ عظمیٰ سے نوازا گیا تھا۔ اس طرح جہاں تک میں جانتا ہوں مولانا عتیق اللہ سلفی نجیب الطرفین ٹھہرے۔ اس فقیر کو بالخصوص یہ سعادت حاصل ہے کہ ان کے بزرگ مجھ پر شفقت فرماتے تھے۔

اکبر الہ آبادی کے الفاظ میں کہنا چاہیے ؎

گزر چکی ہے یہ فصلِ بہار ہم پر بھی

اب آئندہ سطور میں مولانا عتیق اللہ سلفی کے واقعاتِ زندگی ملاحظہ ہوں۔

یہ دو بھائی تھے اور ایک بہن۔ بڑے بھائی مولوی بارک اللہ تھے جو ۱۹۴۰ء کو کوٹ کپورہ میں پیدا ہوئے۔ پاکستان آ کر تعلیم حاصل کی اور ۱۰ جون ۱۹۹۷ء کو چک ۳۶ میں گردن توڑ بخاری کی زد میں آئے اور وفات پا گئے۔ ان کا تذکرہ میں نے اپنی ایک کتاب ''گلستانِ حدیث'' میں کیا ہے جو مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور نے شائع کی۔ بہن کا نام عالم بی بی ہے۔ اس کی شادی صوفی محمد مرحوم کے پوتے ماسٹر عبداللہ سعید سے ہوئی تھی۔

کئی بیٹیوں کی ماں ہے۔ کچھ عرصہ پیشتر ماسٹر عبداللہ سعید موٹر سائیکل پر اپنے گاؤں سے ستیانہ بنگلہ گئے اور وہیں ایک حادثے میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

یہ بہت دو بڑے صدمے تھے، جو اچانک اس گھرانے کو پہنچے اور شدید ذہنی کوفت کا باعث ہوئے۔

مولانا عتیق اللہ سلفی کی ولادت یکم اگست ۱۹۴۷ء (۱۴ رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ) کو اپنے آبائی مسکن کوٹ کپورہ میں ہوئی۔ اس وقت یہ شہر ریاست فرید کوٹ میں شامل تھا۔ آزادی کے بعد ہندوستان کی حکومت نے ریاستیں ختم کر دیں اور فرید کوٹ کو ضلع بنا دیا گیا۔ پاکستان ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کو معرضِ قیام میں آیا تھا۔ مولانا عتیق اللہ عمر کے اعتبار سے مملکتِ پاکستان سے چودہ دن بڑے ہیں اور باشندگانِ پاکستان میں سے میرے جیسے بے شمار لوگوں سے اعمال خیر کی انجام دہی میں بہت بڑے ہیں۔

ان کی پیدائش سے کچھ عرصہ قبل ان کی والدہ نے (جو صوفی محمد کی بھتیجی اور حاجی نور الدین کی پوتی تھیں) خواب میں دیکھا کہ انھیں کوڑا کرکٹ میں سے ایک حدیث ملی ہے۔ یہ حدیث انھوں نے اٹھائی اور اپنے پاس رکھ لی۔ ان کے دادا حاجی نور الدین مرحوم خواب کی تعبیر میں مہارت رکھتے تھے۔ پوتی نے اپنے پیکر صالحیت دادا سے خواب بیان کیا تو انھوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمھیں بیٹا عطا فرمائے گا جو حدیث کا عالم اور خادم ہوگا۔ کوڑا کرکٹ سے مراد ایسا ماحول ہے، جس کے غلط اثرات سے وہ اپنے آپ کو بھی محفوظ رکھے گا اور دوسروں کو بھی بچانے کی کوشش کرے گا۔

یہ خواب بالکل صحیح ثابت ہوا۔ مولانا عتیق اللہ سلفی (ہمارے علم کے مطابق) خود بھی موجودہ دور کے غلط اثرات سے بچنے کی سعی کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس سے محفوظ رہنے کی تلقین فرماتے ہیں۔ ان کا قائم کردہ دار العلوم جو مرکز الدعوۃ السّلفیہ کے نام سے موسوم ہے، اس کا بہت بڑا ثبوت ہے۔

تعبیر رؤیا (یعنی خواب کی تعبیر) کو ایک خاص علم کی حیثیت حاصل ہے، جس کا ذکر سورہ یوسف میں فرمایا گیا ہے۔ بعض صحابہ کرام اور تابعین وائمہ عظام اس میں کامل آگاہی رکھتے تھے۔ ان کے بعد کے دور کے بہت سے علمائے کرام بھی اس سے خوب آگاہ تھے۔ ماضی قریب کے مولانا محمد حنیف ندوی (متوفی ۱۲- جولائی ۱۹۸۷ء) کو اللہ تعالیٰ نے اس علم میں بڑی مہارت عطا فرمائی تھی۔ حاجی نور الدین مرحوم بھی اس سے باخبر تھے۔ میں یہاں خود اپنے متعلق ایک واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں جو کسی کتاب میں میں نے لکھا بھی ہے۔

۱۹۳۶ء میں ہم تین تقریباً ہم عمر لڑکے کوٹ کپورہ میں حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے حلقۂ درس میں شامل تھے۔ میرے ان دونوں ساتھیوں میں سے ایک کا نام محمد رفیق اور دوسرے کا محمد جمیل تھا۔ محمد رفیق نے چھوٹی عمر میں اپنے والدین کے ساتھ حج بیت اللہ کیا تھا، اس لیے ہم اسے ''حاجی'' کہا کرتے تھے۔

ایک روز محمد جمیل صبح صبح آیا۔ اس کے چہرے پر بشاشت کی لہریں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے نہایت مسرت کے ساتھ ایک خواب بیان کیا۔ ہمارے ہاں ایک بڑا کنواں تھا جو معلوم نہیں کب سے پانی سے خالی تھا، اسے ''نائی والا کھوہ'' کہا جاتا تھا، جمیل نے بتایا کہ رات میں نے خواب میں دیکھا کہ ہم تینوں نائی والا کھوہ کی منڈیر پر بیٹھے ہیں اور کنواں پانی سے بھرا ہوا ہے۔ (مجھ سے کہا) تم نے اس میں چھلانگ لگا دی ہے۔ ڈرتے ڈرتے تھوڑا سا حاجی (محمد رفیق) بھی اس میں اتر گیا ہے، لیکن میں (جمیل) اس میں نہیں اترا۔ آرام سے منڈیر پر بیٹھا رہا۔

ہمارے ذہن میں اس کی تعبیر یہ آئی کہ جمیل جو کنوئیں میں نہیں اترا اور پانی سے محفوظ رہا، یہ علم حاصل کر لے گا اور حاجی رفیق بھی حصول علم کی کچھ منزلیں طے کر لے گا، لیکن میں (محمد اسحاق) جو کنوئیں میں گر گیا ہوں، علم سے محروم رہوں گا۔ میں اس خواب سے بے حد پریشان ہوا، لیکن جمیل بہت خوش تھا اور قہقہے لگا رہا تھا۔ حاجی رفیق بھی کافی حد تک خوش تھا۔ یہ دونوں کسی نیک آدمی سے اس کی تعبیر پوچھنا چاہتے تھے، لیکن میں نہیں چاہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس کی یہی تعبیر بتائی جائے گی جو ہمارے ذہن میں آئی ہے۔ اس تعبیر سے میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ لیکن انھوں نے ایک نیک آدمی میاں عید محمد سے (جسے لوگ ''عیدو'' کہا کرتے تھے) اس کی تعبیر پوچھ ہی لی۔ وہ حاجی نور الدین صاحب سے بہت متاثر تھے۔ انھوں نے کہا میرے خیال میں اس خواب کی کوئی تعبیر ہے، لیکن میرے ذہن میں نہیں آ رہی، تم حاجی نور الدین کے پاس جاؤ۔ ان سے خواب بیان کرو، وہ تمھیں اس کی صحیح تعبیر دیں گے۔ میں ان کے پاس نہیں جانا چاہتا تھا، اس لیے کہ وہ وہی کچھ کہیں گے جو ہم آپس میں کہہ رہے ہیں۔ لیکن وہ دونوں بالخصوص جمیل حاجی نور الدین صاحب کی خدمت میں جانے اور تعبیر لینے پر مصر تھے۔ چنانچہ ہم حاجی صاحب کے درِ دولت پر حاضر ہوئے۔ وہ بچوں کو قرآن مجید پڑھا رہے تھے۔ جمیل نے خواب بیان کیا۔ حاجی صاحب اونچی آواز سے بات کرتے تھے۔ فرمایا:

تم میں سے پانی میں کس نے چھلانگ لگائی؟

جمیل نے میری طرف اشارہ کر کے کہا: اس نے۔

اب میرا جی دھڑکنے لگا کہ معلوم نہیں حاجی صاحب اس کا کیا جواب دیں گے۔

میری طرف منہ کر کے فرمایا تم پڑھ جاؤ گے۔ جو پانی میں تھوڑا اترا ہے وہ بھی کچھ پڑھ جائے گا۔ جو نہیں اترا، وہ نہیں پڑھ سکے گا۔

میں نے عرض کیا: حضور! میں تو کنوئیں میں گر گیا ہوں۔ پڑھ کیسے جاؤں گا؟

فرمایا: خواب میں پانی میں گرنا اچھا ہوتا ہے۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ جمیل نے پڑھنا چھوڑ دیا۔ اس نے عین جوانی میں اگست ۱۹۴۷ء میں پاکستان

آتے ہوئے راستے میں وفات پائی۔ مجھے اس کی وفات کا بے حد افسوس ہوا۔

حاجی محمد رفیق دہلی چلا گیا اور دہلی سے حضرت مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی کے ساتھ کھنڈیلہ (ریاست جے پور) جا پہنچا۔ وہاں مولانا ممدوح سے چند کتابیں پڑھیں، پھر دہلی آ کر حضرت مولانا احمد اللہ پرتاپ گڑھی دہلوی سے مدرسہ زبیدیہ میں کتب حدیث پڑھیں اور سند لی۔ ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو فوج میں بھرتی ہو گیا اور کئی سال کلکتہ، بمبئی، مدراس، بنگال، مولمین اور برما وغیرہ علاقوں میں رہا۔ چھے سال بعد جولائی ۱۹۴۵ء میں جنگ ختم ہوئی تو اپنے وطن (کوٹ کپورہ) آ گیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد اسی گاؤں میں سکونت اختیار کی، جہاں ہم نے بسیرا کیا۔ وہ ۳-نومبر ۱۹۹۶ء کو ہمارے گاؤں میں فوت ہوا۔ اسے مطالعہ کا بہت شوق تھا اور اس کے پاس کافی کتابیں تھیں۔ وہ میرا جگری دوست تھا۔ اس کی وفات میرے لیے بڑے صدمے کا باعث تھی۔ میں اس کے جنازے میں شریک تھا۔

جمیل کے خواب کے مطابق میں جو کنوئیں میں گر گیا تھا، اب تک اللہ کے فضل سے زندہ ہوں۔ حاجی نورالدین کی تعبیرِ خواب کی روشنی میں کچھ تعلیم حاصل کر سکا ہوں یا نہیں، اس کے متعلق صرف یہی عرض کروں گا کہ مختلف موضوعات کی کتابیں پڑھنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ کبھی ان کے حصول اور مطالعہ میں کامیاب ہو جاتا ہوں اور کبھی نہیں ہو سکتا۔ قلم کی مزدوری میرا پیشہ ہے اور اہلِ علم کے حالات لکھنا شب و روز کا مشغلہ۔

بات مولانا عتیق اللہ سلفی کی والدہ مرحومہ کے اس خواب کے بارے میں ہو رہی تھی، جس کی تعبیر مرحومہ کے دادا حاجی نورالدین مرحوم نے دی۔ درمیان میں اس فقیر نے قارئین کو اپنے متعلق خواب اور اس کی تعبیر کا ایک اور واقعہ سنانا شروع کر دیا۔ اب یہ بات ختم ہوئی۔ اپنے متعلق مولانا محمد حنیف ندوی کی تعبیر رؤیا کا واقعہ بیان کرنے کو بھی جی چاہتا ہے۔ لیکن بات لمبی ہو جائے گی۔ آیے آگے چلتے ہیں اور وہی بات کرتے ہیں جو اس محفل کا اصل موضوع ہے۔

مولانا عتیق اللہ سلفی نے ناظرہ قرآن مجید اپنے والد محترم سے پڑھا۔ قرآن کا ترجمہ بھی انھی سے پڑھنا شروع کیا۔ اس کے ساتھ ہی اپنے گاؤں کے سرکاری پرائمری سکول میں بھی داخلہ لیا۔ چوتھی جماعت میں تھے کہ حضرت علامہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی کتاب ''رحمۃ للعالمین'' پڑھی جو تین جلدوں میں نبی ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے موضوع کی بہترین کتاب ہے۔ اردو زبان کی اس کتاب کے عربی اور انگریزی زبانوں میں بھی ترجمے ہو چکے ہیں۔ [1]

---

[1] میں نے قاضی صاحب مرحوم کے حالات میں ''تذکرہ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری'' کے نام سے مستقل کتاب لکھی ہے، جو ۵۰۰ صفحات پر محیط ہے اور مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ لاہور نے شائع کی ہے۔

مولانا عتیق اللہ سلفی اپنے سکول کے ذہین طالب علم تھے۔ ۱۹۶۰ء میں انھوں نے پانچویں جماعت کا امتحان بورڈ میں دیا اور فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوئے۔ ان کے نانا صوفی محمد مرحوم اپنے اس نواسے کو دینی تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ اس کا ذکر انھوں نے حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی سے کیا۔ وہ انھیں مولانا عبداللہ ویرووالوی کی خدمت میں ان کے مدرسہ دار القرآن والحدیث (جناح کالونی فیصل آباد) لے گئے۔ لیکن مولانا موصوف نے یہ کہہ کر انھیں مدرسے میں داخل کرنے سے انکار کر دیا کہ داخلے کی آخری تاریخ قمری مہینے کے مطابق ۱۵ شوال تھی اور یہ اس سے ایک دن بعد ۱۶ شوال کو آئے ہیں، حافظ صاحب نے داخلے کے لیے اصرار کیا اور بچے کی ذہانت اور شوقِ تعلیم کے متعلق بتایا تو وہ کچھ نرم پڑ گئے۔ وہاں اخبار ''الاعتصام'' پڑا تھا۔ انھوں نے اخبار اٹھایا اور اس کے ایک مضمون کی چند سطریں سنانے کا حکم دیا۔ انھوں نے صحیح تلفظ کے ساتھ وہ سطریں سنا دیں اور داخل کر لیے گئے۔

مولانا موصوف ذہانت اور شوق علم کے علاوہ ابتدائی زندگی ہی سے عملِ خیر کی طرف راغب تھے۔ روزانہ قرآن کی تلاوت کرتے، بالالتزام نمازِ تہجد پڑھتے اور ہر قمری مہینے میں نفلی روزے رکھتے۔ زیادہ گفتگو سے بچتے اور پڑھنے لکھنے میں مصروف رہتے۔ کتبِ حدیث کا مطالعہ کرتے وقت کسی سے کوئی بات نہ کرتے۔ کوئی طالب علم اپنی طرف متوجہ کرنا بھی چاہتا تو اس کی طرف دھیان نہ دیتے۔ انھوں نے مدرسہ دار القرآن و الحدیث ہی میں تعلیم مکمل کی اور جن اساتذہ کرام کے سامنے زانوے شاگردی تہہ کیے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ مولانا عبداللہ ویرووالوی ناظم مدرسہ دار القرآن والحدیث (فیصل آباد)۔

۲۔ مولانا غلام اللہ امرتسری ۳۔ مولانا عبدالغفار حسن ۴۔ مولانا حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی

۵۔ مولانا عبداللہ امجد چھتوی۔ اور بعض دیگر حضرات۔

مدرسے سے باہر بے مقصد اِدھر اُدھر گھومنے پھرنے کی بالکل عادت نہ تھی۔ سفر میں بھی کوئی نہ کوئی کتاب ان کے ہاتھ میں ہوتی۔ ایک دفعہ بس پر ستیانہ سے فیصل آباد جا رہے تھے۔ بیٹھنے کے لیے کوئی سیٹ نہ ملی، کتاب ہاتھ میں تھی۔ فیصل آباد تک کھڑے کھڑے کتاب کا مطالعہ کرتے رہے۔

درسی علوم کی تحصیل کے بعد باقاعدگی سے اپنے گاؤں کی مسجد میں بچوں کو پڑھانے، گھروں میں جا کر تعلیم دینے اور دعوت و تبلیغ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ صبح کے بعد گھر سے نکلتے اور شام کو گھر آتے۔ پیدل دیہات میں جاتے، لوگوں کے پاس کھیتوں میں جاتے، مسجدوں میں، تھانوں اور کچہریوں میں جاتے اور انھیں نماز پڑھنے، برائیوں کے ارتکاب سے رکنے، سچ بولنے، لوگوں سے اچھا برتاؤ کرنے، پڑوسیوں اور رشتے داروں سے حسنِ سلوک سے پیش آنے، حقوق اللہ اور حقوق العباد پورا کرنے، تعلیم حاصل کرنے، قرآن کی تلاوت

کرنے کی تلقین کرتے۔ جیسا ماحول دیکھتے، اس کے مطابق گفتگو فرماتے۔ بعض اوقات ریل میں سوار ہو جاتے اور مسافروں کو اللہ اور رسول (ﷺ) کے احکام سنانا شروع کر دیتے۔ اس سلسلے کے چند واقعات سنیے!

☆......سب سے پہلے وہ اپنے گاؤں کی مسجد میں ناظرہ قرآن اور اس کا ترجمہ پڑھانے لگے۔ اس کے لیے وہ لوگوں کے گھروں میں بھی جاتے اور انھیں علم دین سے آشنا کراتے۔ تقریباً ڈیڑھ سو طلبا کو دین کی تعلیم سے روشناس کرایا۔

☆......ایک مرتبہ اپنے قریبی گاؤں چک ۳۷ گ ب گئے۔ وہاں ایک پیر صاحب کا میلہ لگا ہوا تھا۔ بے شمار لوگ میلہ دیکھنے آئے تھے۔ نقلیے اور بھانڈ بھی موجود تھے۔ سٹیج لگی ہوئی تھی۔ مولانا عتیق اللہ بھی تبلیغ کے لیے پہنچ گئے۔ کچھ آگے بڑھے تو ایک شخص نے مولانا سے کہا کہ یہ لوگ آپ کو وعظ تقریر نہیں کرنے دیں گے۔ لیکن مولانا ہجوم میں سے گزرتے ہوئے سٹیج کے قریب آ گئے۔ کچھ لوگوں نے ان کو روکنے کی کوشش کی تو ایک طاقت ور جوان محمد اکرم جٹ آگے بڑھا۔ لوگوں سے اس نے کہا مولانا تقریر کریں گے اور ہمیں قرآن حدیث کے مسائل بتائیں گے۔ اگر ان کو کسی نے کچھ کہا تو وہ یہاں سے جان بچا کر نہیں جا سکے گا۔ اس نے مولانا کا ہاتھ پکڑا اور انھیں سٹیج پر کھڑا کر کے کہا: آپ بے دھڑک ہو کر تقریر کریں اور ہم لوگوں کو دین کے مسائل سنائیں۔ چنانچہ انھوں نے تقریر کی اور لوگوں نے سنی۔

☆......مولانا ممدوح ایک مرتبہ کہیں سے تبلیغ دین کرنے کے بعد اپنے گاؤں جا رہے تھے کہ ایک بوڑھے شخص کو دیکھا جو سر پر خاصا بوجھ اٹھائے جا رہا تھا۔ مولانا نے آگے بڑھ کر اس کا بوجھ خود اٹھا لیا اور رسول اللہ (ﷺ) کی سیرت و کردار پر عمل کیا جو ابتدائے وحی کے وقت حضرت خدیجہ نے آپ ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرمائی تھیں کہ اللہ آپ ﷺ کو کبھی پریشان نہیں کرے گا کیونکہ آپ ﷺ رشتہ داری کو ملاتے ہیں اور لوگوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ (بخاری)

☆......ان کے گاؤں سے کچھ فاصلے پر ایک گاؤں چک ۳۰ گ ب ہے۔ مولانا ممدوح عرصہ دراز تک وہاں نماز جمعہ پڑھاتے رہے۔ وہاں پیدل جاتے اور پیدل ہی واپس آتے۔ اپنی ذات کے لیے وہاں کے لوگوں کو کبھی کوئی تکلیف نہیں دی۔ جمعے کے علاوہ بھی وہاں ان کی آمد و رفت رہتی تھی۔

☆......ایک دفعہ مولانا عتیق اللہ اور مولانا عیش محمد دونوں ایک تھانے میں تبلیغ کرنے چلے گئے۔ پولیس والوں کو چند مسائل سنائے تو تھانے دار نے سخت الفاظ میں ان سے کہا مولویو! یہاں سے بھاگ جاؤ۔ دوبارہ آئے تو حوالات میں بند کر دوں گا۔ لیکن یہ دونوں دوسرے دن پھر چلے گئے۔ اب مولانا عیش محمد تھانے کے باہر کھڑے ہو کر دعا کرنے لگے اور مولانا عتیق اللہ اندر چلے گئے اور السلام علیکم کے بعد کہا: تھانے دار

صاحب! صرف پانچ منٹ اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کے چند ارشادات سنانا چاہتا ہوں۔ اگر اجازت ہو تو سناؤں؟ اس نے کہا اجازت ہے، ضرور سنایے۔ انھوں نے مناسب الفاظ میں چند مسائل بیان کیے جن کا پولیس کے سامنے بیان کرنا ضروری تھا۔ اس کے بعد واپس آ گئے۔ ❶

☆...... مولانا عتیق اللہ کو وعظ و تبلیغ کا بڑا شوق تھا۔ جہاں چند آدمیوں کو دیکھتے، انھیں حالات کے مطابق مسائل بتانا شروع کر دیتے۔

☆...... ایک شخص اپنی زمین میں ہل چلا رہا تھا۔ مولانا اس کے پاس گئے اور کہا پانچ منٹ کے لیے رک کر مجھ سے دین اسلام کی چند باتیں سن لیں۔ اس نے جواب دیا: میں کام بند کر کے آپ کی بات نہیں سن سکتا۔ کہا: ٹھیک ہے۔ تم ہل چلاؤ اور اپنا کام کرو۔ میں تمھارے ساتھ ساتھ چلتا ہوں اور تمھیں دین اسلام کی چند باتیں بتاتا ہوں۔ چنانچہ وہ ہل چلاتا گیا اور مولانا اس کے ساتھ چلتے ہوئے اسے مسائل بتاتے گئے۔

☆...... ان کے گاؤں کے قریب ایک گاؤں چک ۳۵ گ ب ہے۔ وہاں میلہ لگا ہوا تھا۔ مولانا اس میلے میں تبلیغ دین کے لیے گئے۔ اس گاؤں کے ایک شخص بشیر احمد نے انھیں تبلیغ سے روکا اور تھپڑ مار کر کہا چلے جاؤ یہاں سے۔ ہمیں تمھاری تبلیغ کی ضرورت نہیں۔ مولانا سیدھے مسجد میں گئے۔ دو رکعت نفل پڑھے اور کہا یا اللہ تیرا شکر ہے کہ تیری راہ میں مجھے مار پڑی۔ پھر اس شخص کے لیے دعا کی کہ اسے سیدھی راہ نصیب ہو۔ دوسرے دن وہ شخص مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان سے معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ آئندہ کبھی میلے میں نہیں جاے گا۔ گزشتہ گناہوں سے توبہ کر کے مسلک اہل حدیث اختیار کر لیا اور پکا نمازی ہو گیا۔

☆...... مولانا عتیق اللہ کو علماے کرام سے ہمیشہ تعلق رہا۔ وہ ان کی خدمت میں حاضر ہونا اپنے لیے سعادت قرار دیتے ہیں۔ سید مولا بخش شاہ کولوی مرحوم سے انھیں بڑی عقیدت تھی اور ان سے دعا بھی کرایا کرتے تھے۔ ❷

☆...... مولانا عتیق اللہ کو یہ سعادت بھی حاصل ہوئی کہ انھیں تعلیم کے لیے مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا تھا، لیکن انھیں وہاں ان کے والد کی بیماری کی اطلاع ملی تو سید مولا بخش کولوی سے مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ انھوں نے فرمایا: گھر جاؤ اور ماں باپ کی خدمت کرو۔

☆...... مولانا عتیق اللہ بچوں کو قرآن مجید ناظرہ و ترجمہ پڑھانے کے بھی بے حد شائق تھے۔ یہ سلسلہ

---

❶ مولانا عیش محمد کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی تصنیف ”تذکرہ صوفی محمد عبداللہ مرحوم و مغفور“۔

❷ سید صاحب ممدوح کے حالات میں نے اس کتاب میں خاصی تفصیل سے لکھے ہیں جو گزشتہ صفحات میں خوانندگانِ محترم کے مطالعہ میں آئے۔

انھوں نے شروع کیا تو فیصلہ کر لیا کہ اس میں ناغہ نہیں کیا جائے گا، باقاعدگی سے ہر روز یہ کارِ خیر انجام دیا جائے گا۔ بارہا ایسا ہوا کہ وہ کسی ضروری کام سے لاہور آئے اور شام کو واپس چلے گئے تاکہ صبح بچوں کو قرآن پڑھا سکیں۔ چھوٹی عمر میں ان کا ایک بچہ فوت ہو گیا، دوسرے دن وہ تدریس کے لیے مسجد میں تشریف لے گئے۔ لوگ تعزیت کے لیے ان کے گھر آتے تو مولانا پیغام بھجواتے کہ آپ بیٹھیں، میں سبق پڑھا کر آؤں گا۔ تقریباً بیس سال وہ گاؤں میں بچوں کو پڑھاتے رہے۔

☆......ایک مرتبہ انھوں نے تجارت بھی شروع کی تھی۔ تجارت یہ تھی کہ وہ دیہات سے صاف ستھرا گھی اکٹھا کرتے اور اسے لاہور اور فیصل آباد جا کر فروخت کرتے۔ یہ سلسلۂ تجارت کچھ عرصہ چلا، پھر بند ہو گیا کیونکہ ان کا افقِ ذہن اس سے بہت بلند تھا اور وہ خدمتِ دین کی طرف پرواز کر رہا تھا۔

☆......صوفی عبداللہ مرحوم و مغفور سے وہ نہایت متاثر تھے اور ان سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ ان سے انھوں نے بیعت بھی کی اور دعا بھی کرائی کہ اللہ انھیں اپنے دین کی خدمت کے مواقع عطا فرمائے اور وہ کوئی ایسا کام کریں، جس سے لوگوں کو دینی اور علمی فائدہ پہنچے۔ صوفی صاحب نے ان کی درخواست پر تقریباً پون گھنٹا دعا فرمائی اور انھیں یقین ہو گیا کہ اللہ نے دعا قبول فرما لی ہے۔ صوفی صاحب نے نصیحت فرمائی کہ لوگ کچھ بھی کہیں، نہ کسی کی سنو نہ کسی سے جھگڑا کرو۔ اندھے گونگے ہو کر دینی کام کرتے رہو اور اسی کو اپنا مقصدِ حیات قرار دے لو۔ [1]

☆......آیئے اب دیکھتے ہیں مولانا عتیق اللہ نے ستیانہ بنگلہ میں کب اور کس طرح مدرسہ بنایا اور یہ جگہ انھوں نے کس طرح خریدی۔

ستیانہ ان کے گاؤں سے اڑھائی تین میل کے فاصلے پر ہے۔ فیصل آباد اور تاندلیاں والا جانے کے لیے یہیں سے بس پر سوار ہوا جاتا ہے۔ تھوڑا بہت گھریلو سودا سلف بھی یہیں سے خریدا جاتا ہے۔ عام لوگوں کی طرح مولانا عتیق اللہ کی بھی یہاں آمد و رفت رہتی تھی۔

ستیانہ اس علاقے کے دیہات کا مرکزی مقام ہے۔ یہاں ان کے گاؤں کے ایک شخص محمد ادریس کا چھوٹا سا چائے کا ''کھوکھا'' تھا۔ مولانا ممدوح کسی سلسلے میں یہاں آتے تو محمد ادریس کے پاس بھی آتے اور اس سے سلام دعا ہوتی۔ نماز کا وقت ہوتا تو وہیں اس کے ''پھٹے'' پر نماز پڑھ لیتے۔ انھوں نے سوچا کہ یہاں مسجد ہونی چاہیے، جس میں دل جمعی سے نماز پڑھی جا سکے۔ وہاں کچھ خالی جگہ پڑی تھی۔ ادریس سے بات کی

[1] صوفی عبداللہ مرحوم کے حالات میں میں نے ایک مستقل کتاب لکھی ہے جو مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ لاہور نے شائع کی۔ یہ کتاب کئی مرتبہ چھپ چکی ہے۔ اس میں صوفی صاحب کی قبولیتِ دعا کے بہت سے واقعات لکھے گئے ہیں۔

تو اس نے بتایا کہ یہاں کی یونین کونسل کا سیکرٹری میرے پاس آیا کرتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ادریس نے اس سے بات کی تو اس نے اس خالی جگہ میں نماز پڑھنے کی اجازت دے دی۔ لیکن جب ادریس نے وہاں مٹی ڈالنا شروع کی تو قریب کے گاؤں چک ۳۹ گ ب کے نمبر دار نے تحصیل دار سے شکایت کر دی کہ یہ شخص اس سرکاری جگہ پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ پولیس نے ادریس کو گرفتار کر کے تحصیل دار کے سامنے پیش کیا۔ تحصیل دار ادریس کو جانتا تھا۔ اس نے اسے چھوڑ دیا اور بات ختم ہوگئی۔ یہ ستیانہ میں مسجد تعمیر کرنے کی پہلی کوشش تھی، جو کامیابی سے ہم کنار نہ ہوئی۔

اب آگے چلتے ہیں۔ وہیں چک ۳۷ گ ب کے محمد اکرم جٹ کی زمین تھی۔ اس سے قیمتاً زمین لینے کی بات ہوئی تو وہ زمین دینے پر آمادہ ہوگیا اور چودہ سو روپے اس کی قیمت مقرر ہوئی۔ یہ ۱۹۷۵ء کی بات ہے۔ چودہ سو روپے اس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی۔ مولانا کے پاس اتنی رقم نہ تھی، تاہم سودا طے ہوگیا اور قیمت ادا کرنے کے لیے چند روز کی مہلت لے لی گئی۔ مولانا عتیق اللہ اور مولانا عیش محمد فیصل آباد گئے اور ایک شخص نے اس نیک کام کے لیے چودہ سو روپے انھیں دے دیے اور قیمت ادا کر کے رجسٹری کرالی گئی۔

اب اس کی تعمیر کا مسئلہ سامنے آیا تو مولانا نے اپنی والدہ سے بات کی۔ اس نیک بخت خاتون نے اپنا چاندی کا زیور بیٹے کے حوالے کیا اور کہا میرے پاس تو یہی ہے، اسے اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور دعا کرو کہ یہ میرے لیے صدقہ جاریہ ثابت ہو۔ ان کی بیوی نے بھی جو کچھ نقدی یا زیور کی صورت میں اس کے پاس تھا، ان کو دے دیا۔

یہ مرحلہ طے ہوگیا تو مسجد کی تعمیر شروع کی گئی۔ لیکن بعض لوگوں نے مسجد تعمیر کرنے کی مخالفت کی لیکن محمد اکرم جٹ جس نے یہ زمین دی تھی اور مولانا عتیق اللہ کو اچھی طرح جانتا تھا، مخالفوں کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس نے کہا یہاں ہر صورت میں مسجد تعمیر ہوگی۔ اس نے مولانا سے کہا آپ مزدوروں اور کاری گروں کو لائیں اور اللہ کا نام لے کر اللہ کے گھر کی تعمیر شروع کریں۔ اللہ نے کرم فرمایا اور چھوٹی سی مسجد تعمیر ہوگئی جس میں نماز با جماعت کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوگیا۔

اس کے بعد لاہور اور فیصل آباد کے ان لوگوں نے جو مولانا سے گھی خریدا کرتے تھے، کچھ رقم دی تو نو تعمیر مسجد کے ساتھ کی اور جگہ بھی خرید لی گئی۔ اس اثنا میں ڈاکٹر محمد راشد رندھاوا یہاں تشریف لائے۔ انھوں نے مالی مدد کی۔ بہرحال یہ اس قصبے میں اہل حدیث کی پہلی مسجد تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی یہاں اکثر آمد و رفت رہی اور انھوں نے بڑی مالی اعانت کی۔ ان کے صائب مشوروں کا سلسلہ بھی جاری رہا اور اب تک جاری ہے۔ حاجی محمد یونس مرحوم کا تعاون بھی جاری رہا۔

۱۹۷۸ء میں مسجد کی تکمیل ہوئی اور اسی سال رمضان المبارک کے بعد اس میں حفظ قرآن کے مدرسے کا

آغاز کر دیا گیا۔ اس کے لیے ایک بہت اچھے قاری کی خدمات حاصل کی گئیں، جن کا نام قاری مطیع الرحمٰن تھا۔ قاری صاحب متقی اور تہجد گزار تھے۔ ایک روز تہجد کے لیے اٹھے اور اسی وقت دل کا عارضہ لاحق ہوا۔ پھر فوراً سفر آخرت اختیار کر گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

پہلے سال شعبۂ حفظ قرآن میں تیس طالب علم داخل ہوے۔ بعد ازاں یہ تعداد مسلسل بڑھتی گئی۔ نوبت اللہ کی مہربانی سے یہاں تک پہنچی کہ اس شعبے میں چھے استاد علاحدہ علاحدہ بچوں کو قرآن پڑھانے اور حفظ کرانے لگے۔ اس طرح سیکڑوں بچوں نے قراءات و تجوید کے ساتھ قرآن یاد کیا۔ ان میں سے بہت سے قرائے کرام مختلف مقامات میں بچوں کو قرآن حفظ بھی کرا رہے ہیں اور قراءات و تجوید کا فن بھی سکھا رہے ہیں۔ الحمد للہ اب تک تحفیظ قرآن کا یہ شعبہ قائم ہے اور حفظ و قراءات کا کام باقاعدگی سے جاری ہے۔

بعد ازاں ایک اور اہم قدم اٹھایا گیا۔ ۱۹۸۰ء کے ماہِ رمضان میں پاکستان کے نامور عالم دین اور استاذ الاساتذہ حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی نے اس مدرسے میں قرآن مجید کی تفسیر پڑھانے کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ سلسلہ ہر سال رمضان میں ۱۹۸۴ء تک چار سال جاری رہا۔ اس دورۂ تفسیر میں مختلف مدارس کے بہت سے طلبا شرکت کرتے تھے۔ ان کے قیام و طعام کا انتظام مدرسے کی طرف سے کیا جاتا تھا۔

حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی کے چار سالہ دورۂ تفسیر کے بعد یہ ذمہ داری ان کے بھانجے اور داماد مولانا عبداللہ امجد چھتوی نے سنبھالی۔ ۱۹۸۵ء سے لے کر اب تک یہ ذمہ داری وہ پورے اہتمام اور احسن طریقے سے انجام دے رہے ہیں۔ اللہ نے ان کو علم و عمل دونوں نعمتوں سے نوازا ہے اور وہ منجھے ہوے مدرس ہیں۔ ❶

قرآن مجید کی تفسیر بہ درجہ غایت اہم اور نازک ترین معاملہ ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو تقریری اور تحریری صورت میں اس افشردۂ نور کی تشریح کرتے اور اس کے مطالب و معانی سے لوگوں کو آشنا کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔

اب اس میدان میں ان کے قدم آگے بڑھتے ہیں۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر محمد راشد رندھاوا ستیانہ گئے تو مولانا عتیق اللہ نے ان سے کہا کہ نہر کے کنارے کچھ سرکاری رقبہ ویران پڑا ہے۔ اگر ہمیں یہ رقبہ مل جائے تو یہاں دینی تعلیم کا مدرسہ بنا لیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا آپ دعا کریں، میں اس کے حصول کی کوشش کروں گا۔ اس وقت پنجاب کے وزیر اعلیٰ میاں نواز شریف تھے۔ ایک روز وہ کسی مرض کے علاج کے لیے ڈاکٹر صاحب کے کلینک گئے تو موقع پا کر ڈاکٹر صاحب نے ان سے اس رقبے کے بارے میں بات کی۔ چنانچہ سرکاری قیمت پر وہ رقبہ انھیں مل گیا۔ وہ رقبہ کافی نشیب میں تھا، جس کو ہموار کرنے کے لیے بڑی محنت

---

❶ حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی کے تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب ''قافلہ حدیث'' اور مولانا عبداللہ امجد چھتوی کے واقعاتِ حیات کے لیے دیکھیے راقم کی تصنیف ''دبستان حدیث''۔ یہ دونوں کتابیں مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور نے شائع کی ہیں۔

کرنا پڑی۔ یہ رقبہ اب ایک انجمن کی تحویل میں ہے، جس کے ارکان ہیں ڈاکٹر محمد راشد رندھاوا، حاجی محمد نذیر، حاجی بنیامین اور مولانا عتیق اللہ سلفی۔ ❶

۱۹۹۰ء میں اس کی تعمیر کا کام شروع ہوا، جس کے تمام اخراجات کا ذمہ ایک ہی شخص ڈاکٹر محمد عارف قریشی نے لیا اور رہائش کے لیے کمرے تعمیر کرانے کی ذمہ داری ڈاکٹر راشد رندھاوا کے بھائی خالد صاحب نے لی۔ ۱۹۹۳ء میں مدرسے کی عمارت مکمل ہوگئی تو اسے مدرسہ حفظ القرآن سے الگ ایک مستقل مدرسہ بنا دیا گیا اور اس کا نام ہے مرکز الدعوۃ السلفیہ۔

یہ مدرسہ اللہ کے فضل سے کامیابی سے چل رہا ہے اور اچھی خاصی تعداد میں طلبا تعلیم حاصل کر رہے ہیں، جنھیں کئی لائق اور تجربہ کار فاضل معلم تعلیم دینے پر مامور ہیں۔ شیخ الحدیث کے منصب جلیلہ پر مولانا عبداللہ امجد چھتوی فائز ہیں جن کی حیثیت ماشاء اللہ استاذ الاساتذہ کی ہے، بلکہ ان کے بہت سے شاگرد بھی استاذ الاساتذہ کے مقام کو پہنچ گئے ہیں۔ مدرسہ تحفیظ القرآن اور مرکز الدعوۃ السلفیہ کی زمامِ اہتمام مولانا عتیق اللہ سلفی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ صبح اپنے گاؤں (چک ۳۶ گ ب) سے اس مدرسے میں ستیانہ جاتے ہیں اور شام کو واپس گاؤں آتے ہیں۔ دوپہر کا کھانا ساتھ لے جاتے ہیں۔ مدرسے سے نہ کچھ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں، نہ نگرانی و اہتمام کا کوئی معاوضہ لیتے ہیں۔ مولانا سید ابوبکر غزنوی مرحوم سے ان کے بڑے اچھے مراسم تھے۔ ان کی سادگی کی بنا پر سید صاحب مرحوم انھیں ''میرا پینڈو یار'' کہا کرتے تھے۔ ❷

---

❶ ڈاکٹر محمد راشد رندھاوا کے حالات کے لیے راقم کی کتاب ''تذکرہ صوفی محمد عبداللہ'' کی طرف رجوع کیجیے۔ شائع کردہ مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ، لاہور۔

❷ سید ابوبکر غزنوی حکومتِ پاکستان کے ایک وفد کے ساتھ اپریل (۱۹۷۶ء) کے شروع میں لندن میں منعقد ہونے والے اسلامک فیسٹیول میں شرکت کے لیے لندن گئے، جہاں انھوں نے مقالہ پڑھنا تھا، لیکن ۴ اور ۵ اپریل کی درمیانی شب کو سڑک عبور کرتے ہوئے تیز رفتار کار کی زد میں آ گئے۔ حادثہ اتنا شدید تھا کہ ہنسلی ٹوٹ گئی، دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئیں اور ریڑھ کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی۔ فوراً ہسپتال میں داخل کرا دیے گئے، لیکن افاقہ نہ ہوا، ۲۴۔اپریل ۱۹۷۶ء کو وہیں وفات پا گئے۔ ۲۹۔اپریل کو پی آئی اے کے جہاز سے ان کی میت لاہور آئی۔ اسی روز نمازِ مغرب کے بعد یونیورسٹی گراؤنڈ میں مولانا معین الدین لکھوی نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی، جس میں بے شمار لوگ شامل تھے۔ میں نے اسی دن ریڈیو پاکستان لاہور میں ان سے متعلق تقریر کی اور روز نامہ ''امروز'' میں جو اس عہد کا مشہور اور بڑا اخبار تھا، ان پر مضمون لکھا۔

اس کے بعد اپنی تین کتابوں (قافلہ حدیث، تذکرہ صوفی عبداللہ اور برصغیر کے اہل حدیث خدام قرآن) میں علاحدہ علاحدہ مضامین لکھے۔ نیز پنجاب یونیورسٹی کے اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں مقالہ لکھا۔ وہ حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے فرزند گرامی تھے۔

مولانا عتیق اللہ سلفی کی کوشش اور تحریک سے یہ دار العلوم کسی ایسی ساعتِ سعید میں جاری ہوا تھا کہ اس سے ہر سال کتنے ہی طلبا فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں۔ ان میں سے بعض مختلف مدارس میں فریضۂ تدریس انجام دے رہے ہیں، بعض خطابت میں مصروف ہیں اور بعض کتابوں کی نشر و اشاعت کے بین الاقوامی ادارے دار السلام میں علمی خدمات کی انجام دہی میں مشغول ہیں۔ یہ ادارہ بہت سال ہوے مولانا عبدالمالک مجاہد نے قائم کیا تھا، جس کا صدر دفتر تو ریاض (سعودی عرب) میں ہے، لیکن متعدد ملکوں میں اس کی شاخیں قائم ہیں۔ لاہور میں پنجاب سیکرٹیریٹ کے قریب اس کا بہت بڑا دفتر ہے، جس میں کثیر تعداد میں اہل علم کام کرتے ہیں اور بے شمار اردو، انگریزی کتابیں اس کی طرف سے معرضِ اشاعت میں آ چکی ہیں۔ اس کے ناظم حافظ عبدالعظیم اسد ہیں۔

مرکز الدعوۃ السّلفیہ کے بعض فارغ التحصیل طلبا مدینہ یونیورسٹی میں بھی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اس طرح اس دار العلوم کی شہرت اور خدمات کا دائرہ اللہ کے فضل سے بہت وسیع ہے۔ اس سے فارغ التحصیل ہونے والوں کی تعداد اب تک سات سو سے آگے نکل گئی ہے۔

تحفیظ القرآن اور درس نظامی کی تدریس کے علاوہ ۱۹۹۰ء میں ایک پرائمری سکول بھی جاری کیا گیا۔ اس میں تین اساتذہ کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ ۱۹۹۳ء میں اس سکول کے پانچویں جماعت کے امتحان میں جو بورڈ میں دیا گیا۔ تمام بچے اول پوزیشن میں کامیاب ہوئے۔ سکول کے ہیڈ ماسٹر مسعود احمد تھے، چیئرمین تھے ڈاکٹر محمد راشد رندھاوا اور نگران مولانا عتیق اللہ کو بنایا گیا تھا۔

۱۹۹۶ء میں ڈاکٹر رندھاوا صاحب کے کہنے اور لوگوں کے اصرار پر اسے مڈل سکول بنا دیا گیا اور پھر تین سال بعد ۱۹۹۹ء میں ستیانہ اور اردگرد کے لوگوں کے کہنے پر اسے ہائی سکول کا درجہ دے دیا گیا۔ اس کا نام رکھا گیا مسلم ماڈل ہائی سکول۔ اس سکول کے نتائج ہمیشہ بہت اچھے رہے اور تحصیل و ضلع بھر میں اس سکول کے طالب علموں نے پہلی پوزیشن حاصل کی بلکہ ایک طالب علم پورے پنجاب میں اول آیا۔ سکول کے ہیڈ ماسٹر مسعود احمد صاحب اور دوسرے اساتذہ بڑی محنت سے تعلیم دیتے ہیں۔ جناب مسعود احمد صاحب کی سکول سے دلچسپی کا یہ حال ہے کہ انھوں نے سرکاری ملازمت چھوڑ دی اور اس سکول کو اپنی سرگرمیوں کا محور قرار دے لیا۔

سکول کے غریب بچوں کو فیس میں رعایت کی جاتی ہے اور یتیم بچوں سے فیس لی ہی نہیں جاتی۔ بلکہ ان کی مدد کی جاتی ہے۔ ان کو کپڑے اور وردی دی جاتی ہے۔ کتابیں بھی دی جاتی ہیں۔

سکول کا اور مدرسہ تحفیظ القرآن کا لوگوں پر بے حد اثر ہوا۔ ان کے بچے قرآن بھی حفظ کر رہے ہیں اور

دسویں جماعت تک سکول کی تعلیم بھی حاصل کر رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ ابتدا میں شدید مخالفت کرتے تھے، وہ منتظمین مدرسہ کے قریب آ گئے ہیں اور ان سے عقیدت مندی کا اظہار کر رہے ہیں۔

اب مولانا عتیق اللہ اور ان کے رفقاے کرام نے نہر کے قریب اور زمین خرید لی ہے اور وہاں مسلم سائنس کالج کی تعمیر شروع کر دی گئی ہے۔ یہ نیک کردار حضرات ان شاء اللہ اس اہم منصوبے میں بھی کامیاب ہوں گے۔ تعمیر کا کام ہو رہا ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ تھوڑے عرصے کے بعد اللہ نے چاہا تو کالج میں تعلیم کا آغاز کر دیا جائے گا۔

یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ مرکز الدعوۃ السلفیہ میں پہلے الشفا کے نام سے ایک ڈسپنسری بنائی گئی تھی۔ بعد ازاں اسے اسپتال کی شکل دے دی گئی۔ ڈاکٹر محمد راشد رندھاوا کچھ عرصے کے بعد لاہور سے وہاں تشریف لے جاتے ہیں اور اسپتال کی نگرانی کرتے اور مریضوں کا چیک اپ کرتے ہیں۔ یہ بہت بڑا کارِ خیر ہے، جس کا وہ التزام کرتے ہیں۔ مریضوں کے لیے ایمبولینس کا انتظام بھی ہے۔

مولانا عتیق اللہ نے چک ۳۹ کی جامع مسجد میں مدرسہ عائشہ کے نام سے بچیوں کا ایک مدرسہ بنایا ہے، جس میں دین کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس مدرسے کی نگرانی انھوں نے اپنے ذمے لے رکھی ہے۔ یہ ایک اہم دینی خدمت ہے۔

اسی نام سے انھوں نے اپنے گاؤں (چک ۳۶ میں بھی) مدرسہ جاری کیا ہے، جس میں گاؤں کی بچیوں کو ان کی اہلیہ بھی پڑھاتی ہیں اور ان کی دو بہوئیں بھی یہ خدمت انجام دیتی ہیں۔ اس مدرسے میں حدیث کی کتابوں کا درس حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی کے صاحب زادے مولانا عبدالکبیر دیتے ہیں۔

مولانا عتیق اللہ چھے مرتبہ حج بیت اللہ کر چکے ہیں۔

مولانا کی اولاد ماشاء اللہ چھ بیٹے ہیں اور دو بیٹیاں۔

بڑے بیٹے کا نام عبدالخالق ہے۔ وہ مدرسے میں کچھ دیر طلبا کو پڑھاتے بھی ہیں اور میڈیکل سٹور بھی چلاتے ہیں میڈیکل سٹور مولانا کا ذاتی ہے اور ان کا ذریعہ معاش۔

دوسرے بیٹے عبدالباسط ہیں جو مدرسے میں سات سال سے بلا معاوضہ پڑھا رہے ہیں اور مولانا کے مختلف کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔

تیسرے بیٹے عبدالماجد ہیں۔ وہ مدرسے میں تعلیم بھی حاصل کرتے ہیں اور بڑے بھائی کے ساتھ میڈیکل سٹور میں بھی کام کرتے ہیں۔

چوتھے حافظ محمد احمد دینی مدارس کی تعلیم کے حساب سے پانچویں جماعت کے طالب علم ہیں۔

پانچویں حماد عبداللہ ابھی سکول میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ چھٹے عبدالرحمٰن ہیں۔ یہ پرائمری پاس کر کے قرآن مجید حفظ کر رہے ہیں۔

یہ سطور ۷۔ دسمبر ۲۰۱۲ء کو لکھی جا رہی ہیں۔ اس کتاب کی اشاعت تک ان شاء اللہ وہ قرآن حفظ کر کے آگے حصولِ علم میں مشغول ہو جائیں گے۔

یہ بھی سنتے جایے کہ مولانا عتیق اللہ کی زرعی زمین جو والد مرحوم سے وراثت میں ملی، چھے ایکڑ ہے۔

مولانا ممدوح ما شاء اللہ باہمت اور مستقل مزاج ہیں۔ تبلیغ دین ان کا اصل موضوع ہے۔ اس کی جو صورت بھی ہو، وہ اس پر عمل کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ انھیں نیک مقاصد میں کامیابی عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین .

حافظ عبدالحمید ازہر

(ولادت ۱۰۔ دسمبر ۱۹۴۸ء)

میانہ قد، گندمی رنگت میں سرخی کی جھلک۔ ناک نقشہ خوب صورت۔ صاف گو۔ علم اور حلم کا دل پذیر مجموعہ۔ مزاج میں اعتدال۔ اچھے خطیب اور اچھے مدرس۔ طبیعت میں صالحیت اور حسنات کا غلبہ۔ لمبی داڑھی۔ عمدہ خصال اور خوش گفتار۔ شلوار قمیص عام پہناوا۔ ہمارے اس عزیز القدر دوست کو جو حافظ عبدالحمید ازہر کے نام سے موسوم ہیں، اللہ نے بہت سی خصوصیات سے نوازا ہے۔

والد محترم کا نام حکیم فیض محمد تھا۔ اس خاندان کے لوگ ضلع امرتسر کے موضع بھوجیاں کے علمائے کرام سے متاثر تھے، اسی لیے ان کے والد کا نام مولانا فیض محمد بھوجیانی کے نام پر رکھا گیا تھا۔ جدِ امجد کا اسم گرامی حکیم مولا بخش تھا۔ ان کا تعلق ایک گاؤں "سُر سنگھ" سے تھا۔ انھیں مقامی مسلمانوں میں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور سب لوگ "میاں جی" کہتے تھے۔ ایک بزرگ شیخ حبیب اللہ تھے، نیک طینت اور پسندیدہ خصائل کے مالک۔ انہی کی تلقین سے حکیم مولا بخش نے مسلک اہل حدیث قبول کیا تھا۔ پھر ان کی عقیدت کا مرکز غزنوی علمائے کرام اور مولانا نیک محمد قرار پائے۔ حکیم مولا بخش کی کوشش سے موضع سُر سنگھ میں ایک خاصی بڑی مسجد کی تعمیر شروع ہوئی، لیکن مسجد ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ملک کی تقسیم کا اعلان ہو گیا اور ان لوگوں کو وہاں سے نکلنا پڑا۔

حافظ عبدالحمید ازہر کے نانا حاجی عبدالکریم تھے۔ ان کا تعلق سکونت ایک گاؤں "دبلیئر" سے تھا۔ یہ گاؤں ضلع لاہور میں تھا۔ وہاں سکھوں کی اکثریت تھی۔ حاجی عبدالکریم اپنے خاندان کے ساتھ وہاں سے نکلے اور موضع "پٹی" میں آ بسے۔ یہ خاصا بڑا قصبہ تھا اور ضلع لاہور میں واقع تھا۔ اس میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور مسلمانوں میں بھی اہل حدیث حضرات کی تعداد زیادہ تھی۔ لیکن تقسیم ملک کے نتیجے میں اس قصبے کو ضلع لاہور کی حدود سے نکال کر ضلع امرتسر میں شامل کر دیا گیا اور وہ ہندوستان کے حصے میں آیا۔ تقسیم ملک سے پہلے حافظ عبدالحمید ازہر کے ددھیال و ننھیال عزت و احترام کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ملک تقسیم ہوا تو وہاں سے قصور آ گئے اور اس شہر کے کوٹ اعظم خاں میں سکونت پذیر ہو گئے۔ یہیں ۱۰۔ دسمبر ۱۹۴۸ء کو حافظ عبدالحمید ازہر کی ولادت ہوئی۔ پاکستان کی پیدائش ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کو ہوئی۔ عیسوی تقویم کے مطابق یہ عمر کے اعتبار سے

پاکستان سے چار دن کم سولہ مہینے چھوٹے ہیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ پاکستان کو ہمیشہ قائم رکھے اور یہ چھوٹی بڑی ہر آفت سے محفوظ رہے اور حافظ عبدالحمید ازہر کی زندگی صحت و عافیت کے ساتھ دراز ہو اور لوگ ان کی خطابتی اور تحریری مساعی سے مستفید ہوتے رہیں، آمین۔

عبدالحمید ازہر کچھ بڑے ہوئے تو گورنمنٹ ہائی سکول میں داخل کرا دیے گئے۔ سکول کی تعلیم کے دوران ہی ناظرہ قرآنِ مجید پڑھنے کے بعد قصور کی جامع مسجد فریدیہ میں قاری نور احمد کھرل سے (جو قاری اظہار احمد تھانوی کے شاگرد تھے) حفظِ قرآن کا آغاز کیا اور اللہ نے ان کو حفظ و تجوید کی نعمتِ عظمیٰ سے نوازا۔

۱۹۶۵ء میں میٹرک پاس کیا۔ انہی دنوں مولانا محمد اسحاق گوہڑوی رحمانی اپنے دوست شیخ عبدالکریم کی تعزیت کے لیے (جو ایک حادثے میں وفات پا گئے تھے) قصور تشریف لائے۔ حافظ عبدالحمید ازہر کے دادا اور نانا انھیں مولانا موصوف کے پاس لے گئے اور آئندہ تعلیم کے لیے رائے طلب کی۔ اس رائے کے نتیجے میں جولائی ۱۹۶۵ء میں عبدالحمید ازہر کو ان کے ماموں مولانا عبدالعظیم انصاری اپنے ساتھ چینیاں والی مسجد (لاہور) لے آئے اور وہاں کے دارالحدیث میں داخل کرا دیے گئے۔ [1]

جب چینیاں والی مسجد میں عبدالحمید ازہر کی تعلیم کا آغاز ہوا، اس وقت مولانا محمد اسحاق رحمانی وہاں صدر مدرس تھے اور مولانا عبدالعزیز نائب مدرس اور ہم سبق طلباء میں مولانا محمود احمد بن حافظ عبدالغفور (مریدکے) اور مولانا محمد عثمان (حال مدرس جامعہ اہل حدیث لاہور شامل تھے۔

اس سے اگلے سال بہ طور نائب مدرس وہاں مولانا عبدالخالق قدوسی شہید کا تقرر ہوا۔ صرف و نحو کی بعض کتابیں، ترجمہ قرآن اور بلوغ المرام مولانا محمد اسحاق رحمانی سے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ مشکوٰۃ شریف اور عربی ادب کی ابتدائی کتابیں مولانا عبدالخالق قدوسی سے پڑھیں۔

چینیاں والی مسجد کے مدرسے میں کچھ کمزوری کے اسباب ابھرے تو حافظ عبدالحمید ازہر گوجراں والا کی جامعہ محمدیہ چلے گئے۔ وہاں مولانا عبدالحمید ہزاروی سے سنن نسائی، مولانا جمعہ خاں سے نور الانوار اور مولانا بشیر الرحمٰن سے دیوانِ حماسہ وغیرہ کتابیں پڑھیں۔ حافظ عبدالمنان نور پوری سے بھی استفادہ کیا۔ اسی دوران ڈاکٹر فضل الٰہی صاحب کی قیادت میں طلبا کا ایک وفد جامعہ محمدیہ اوکاڑہ گیا، جہاں مولانا معین الدین لکھوی کے زیرِ صدارت طلبا کا جلسہ منعقد ہوا۔ اس وفد کے شرکاء میں حافظ عبدالحمید ازہر بھی تھے۔ وہیں ان کی

---

[1] مولانا محمد اسحاق رحمانی کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو میری کتاب ''برصغیر میں اہل حدیث کی سرگزشت'' شائع کردہ مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ لاہور اور مولانا عبدالعظیم انصاری کا تذکرہ میں نے اپنی کتاب ''قافلہ حدیث'' کی فہرست موجودین میں کیا ہے۔ لیکن کتاب چھپنے سے پہلے ہی وہ وفات پا گئے تھے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون . کتاب مکتبہ قدوسیہ لاہور نے شائع کی ہے۔

ملاقات حافظ ڈاکٹر عبدالرشید اظہر سے ہوئی جو جلد ہی دوستی میں بدل گئی۔ ان کی ترغیب پر حافظ عبدالحمید ازہر جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) چلے گئے۔ وہاں انھوں نے مندرجہ ذیل اساتذہ سے مندرجہ ذیل کتابیں پڑھیں۔

مولانا ثناء اللہ ہوشیار پوری سے سنن ابی داود، موطا امام مالک اور حجۃ اللہ البالغہ۔

مولانا علی محمد سلفی سے جامع ترمذی اور دیوان متنبّی۔

حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی سے صحیح بخاری۔

ہم سبق طلبا تھے ڈاکٹر شمس الدین نورستانی، حافظ مسعود عالم اور بعض دیگر حضرات۔

ڈاکٹر محمد امان الجامی اور شیخ علی مشرف العمری جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی طرف سے جامعہ سلفیہ میں بہ طور مبعوث خدمات انجام دیتے تھے۔ حافظ صاحب نے ان سے بھی استفادہ کیا۔

۱۹۷۲ء میں جامعہ سلفیہ کا الحاق جامعہ اسلامیہ (مدینہ منورہ) سے ہوا۔ پہلے سال دو طالب علموں کے داخلے کی منظوری آئی۔ سالانہ امتحانات میں حافظ مسعود عالم اول اور حافظ عبدالحمید ازہر دوم آئے۔ اس امتحان کے نتیجے میں ان دونوں کو جامعہ اسلامیہ میں داخل کر لیا گیا۔

یہ مدینہ منورہ پہنچے تو شیخ عبدالعزیز بن باز، ڈاکٹر تقی الدین ہلالی، شیخ امین الشنقیطی مصنف اضواء البیان کی زیارت کا موقع ملا۔ وہیں مولانا عبدالغفار حسن، شیخ حماد الانصاری، شیخ مختار شنقیطی، شیخ عبدالروف اللبدی سے استفادہ کیا۔ علامہ ناصر الدین البانی جامعہ اسلامیہ کی مجلس مشاورت کے رکن کی حیثیت سے تشریف لایا کرتے تھے۔

شیخ جابر الجزائری تفسیر اور شیخ عبدالمحسن العباد بدایۃ المجتہد کے استاد تھے۔

۱۹۷۷ء میں حافظ عبدالحمید ازہر کو لیسانس (بی اے آنرز) کی ڈگری شاہ فہد کے ہاتھوں ملی۔ اس وقت وہ مملکتِ سعودیہ کے ولی عہد تھے، بعد ازاں خادم حرمین شریفین ہوئے۔

دراسات علیا میں حافظ صاحب ممدوح کو قسمِ اصول الفقہ میں داخلہ ملا، لیکن کسی وجہ سے اس کی تکمیل نہ ہو سکی۔

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی نصابی تعلیم مکمل کر کے واپس وطن آئے تو مبعوث کی حیثیت سے ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۹ء تک پہلے مدرسہ تدریس القرآن والحدیث راولپنڈی میں اور پھر جامعہ سلفیہ اسلام آباد میں تدریسی خدمات سر انجام دیں۔ اس اثنا میں ان سے جن خوش بخت حضرات نے کسب علم کیا وہ ہیں ڈاکٹر عبدالغفار بخاری، مولانا محمد یونس عاصم مرحوم (سابق شیخ الحدیث جامعہ سلفیہ اسلام آباد)، مولانا محمد رفیق اختر کاشمیری، مولانا عصمت اللہ شیخ الحدیث جامعہ محمدیہ مظفر آباد۔ مولانا عبدالوحید استاذ الحدیث جامعہ سلفیہ مسجد مکرم گوجراں

والا اور بعض دیگر اصحابِ علم۔

حافظ عبدالحمید ازہر تحریر و نگارش کا بھی ذوق رکھتے ہیں اور ان کا قلم کتاب و سنت کی خدمت کے لیے ہمیشہ رواں رہتا ہے، چنانچہ مختلف جماعتی جرائد میں ان کے رشحاتِ قلم خوانندگانِ محترم کے مطالعہ میں آتے ہیں اور ان کے لیے اضافۂ معلومات کا باعث بنتے ہیں۔ مضامین کے علاوہ ''اہل حدیث کا تعارف'' کے نام سے ان کی ایک کتاب بھی ہے، جس پر حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی نے تقریظ رقم فرمائی تھی۔

خطابت کا ملکہ بھی اللہ نے ان کو ودیعت فرمایا ہے۔ وہ جامعہ محمدی اہل حدیث میں خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے ہیں۔

حافظ صاحب ممدوح کے ایک بھائی کا نام حافظ عبدالوحید ہے۔ وہ جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ کے سند یافتہ ہیں اور جامعہ کی طرف سے گولڈ میڈلسٹ ہیں۔

ایک بھائی علامہ محمد سعید عابد تھے جو اسلامیہ گورنمنٹ ڈگری کالج قصور کے وائس پرنسپل تھے۔ افسوس ہے انھوں نے ۱۹۔ مئی ۲۰۱۱ء کو بعارضہ قلب اپنے مسکن قصور میں وفات پائی۔ میں ان کے جنازے میں شامل تھا۔

پنجابی کے مشہور شاعر محمد شریف انجم مصنف ''حرا دا چانن'' (جو قصور میں مقیم ہیں) حافظ عبدالحمید ازہر کے خالہ زاد بھائی ہیں۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ اس گھرانے کے وفات شدگان کی مغفرت فرمائے اور زندوں کو کتاب و سنت کی خدمت کی توفیق بخشے۔

(یہ سطور ۱۴۔ اکتوبر ۲۰۱۳ء کو تحریر کی گئیں)

مولانا عبدالرؤف خاں ندوی

(ولادت ۲۷- اپریل ۱۹۴۹ء)

ہندوستان کے علماے کرام خطابتی، تبلیغی، تدریسی اور تصنیفی صورت میں بے حد خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ پاکستان کے بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ وہاں کے مسلمان اور علماے کرام ناموافق حالات میں گھرے ہوئے ہیں، لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ میرا وہاں کے بعض علما سے کتابوں کے سلسلے میں بھی رابطہ رہتا ہے اور ان کے تراجم و تذکار سے متعلق بھی ٹیلی فون یا خطوط کے ذریعے ان سے روابط قائم ہیں۔ ان میں سے جو حضرات یہاں تشریف لاتے ہیں ازراہِ کرم اس فقیر کو بھی یاد فرماتے ہیں۔ ان سے مل کر اور ان سے گفتگو کر کے بڑی مسرت ہوتی ہے۔ میں چوں کہ اُسی نواح میں پیدا ہوا اور وہیں جوانی کو پہنچا، اس لیے اپنے قدیم علاقے کے متعلق ان حضرات سے معلومات حاصل کرنے کی سعی کرتا ہوں۔

پاکستان کے اہل علم تحریری اعتبار سے اسلام کی ترویج و اشاعت کا کام زیادہ تر اردو زبان میں کرتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ یہ نہایت اہم اور ضروری کام ہے جو یہ لوگ بڑے اہتمام سے کر رہے ہیں، لیکن ہندوستان کے اصحابِ علم مسلمان یہ خدمت چار زبانوں میں سرانجام دیتے ہیں، عربی میں، اردو میں، ہندی میں اور انگریزی میں۔ ہندی وہاں کی سرکاری زبان ہے جو بالعموم گھروں میں بولی اور پڑھی جاتی ہے۔ اس زبان میں جو اسلامی لٹریچر شائع ہوتا ہے، وہ غیر مسلموں کے گھروں میں بھی جاتا ہے اور وہ لوگ اسے پڑھتے اور اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ بسا اوقات یہ تاثر قبولِ اسلام کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں، جن میں ایک مثال ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی کی ہے جو ہندی زبان میں اسلام سے متعلق بعض کتابیں پڑھ کر دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ پھر حالات نے ایسی کروٹ لی کہ مدینہ یونیورسٹی تک پہنچے۔ پہلے وہاں تعلیم حاصل کی، پھر وہاں پروفیسر ہوئے اور اب کئی سال سے نبی ﷺ کی حدیث مبارکہ کے بارے میں بڑی بنیادی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ وہ مدینہ منورہ میں اقامت فرما ہیں اور اس فقیر کو وہاں ان کی خدمت حدیث سے مطلع ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب کا تذکرہ اس کتاب کے گزشتہ صفحات میں کیا گیا ہے جو قارئین کرام کے مطالعہ میں آیا۔

یہاں میں ایک اور ہندوستان عالم مولانا عبدالرؤف خاں ندوی کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو ہندوستان کے صوبہ

یو پی کے ضلع بلرام پور کی تحصیل تلسی پور کے موضع ہرہٹہ میں ۲۷- اپریل ۱۹۴۹ء کو پیدا ہوے۔ ان کے جس نسب نامے سے میں مطلع ہو سکا ہوں، وہ یہ ہے: عبدالرؤف بن محمد نام دار بن ولی محمد بن نبی بخش بن خرم خاں ...... بیان کیا جاتا ہے کہ یہ سب حضرات علم کی دولت سے بھی بہرہ مند تھے اور تقویٰ و تدین میں بھی اپنے علاقے میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔ علم و عمل کی یک جائی اللہ کے فضل سے اب تک اس خاندان میں برابر چلی آ رہی ہے۔

عبدالرؤف خاں نے ابتدائی تعلیم ساتویں جماعت تک اپنے آبائی گاؤں ہرہٹہ کے مدرسہ ضیاء الاسلام میں پائی۔ بالکل شروع کی بعض کتابیں میاں عبدالحلیم مرحوم سے پڑھیں۔ دینیات، ادب اردو، تاریخ اور ابتدائی عربی اور فارسی کتابیں اپنے چچا مولانا عبداللہ سعیدی سے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ ہندی، حساب، سائنس، جغرافیہ اور انگریزی وغیرہ کی نصابی تعلیم ماسٹر محمد سلیم خاں سے حاصل کی۔

ان کے والد گرامی انھیں دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ میں تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ چنانچہ یہ وہاں پہنچ گئے۔ داخلے کا امتحان ڈاکٹر سعید الرحمٰن ندوی اور پروفیسر محمد اجتباء حسینی نے لیا اور وہاں کے طریق تعلیم کے مطابق انھیں دوسری جماعت میں داخل کیا گیا۔ مسلسل چھے سال یہ وہاں تعلیم حاصل کرتے رہے اور ۱۹۶۶ء میں سندِ فراغ لی۔ پھر ندوے کے آخری سال میں حضرت مولانا عبیداللہ رحمانی کے مشورے سے خطیب بغدادی پر عربی میں مقالہ لکھا۔ ندوے کی جمعیت الاصلاح کی طرف سے دو مرتبہ انعام بھی حاصل کیا۔ اپنے دور طالب علمی میں ندوے کے یہ لائق اور ذہین طالب علم تھے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں انھوں نے جن اساتذہ کرام سے تحصیل علم کی وہ تھے مولانا محمد اویس ندوی نگرامی، مولانا عبدالحفیظ ندوی بلیاوی، مولانا محمد اسباط قاسمی، مولانا محمد اسحاق سندیلوی ندوی، مولانا ابوالعرفان ندوی، مولانا محمد رابع حسنی ندوی، ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، مولانا عبدالماجد ندوی، مولانا اجتباء حسینی ندوی، مولانا تقی الدین ندوی اور دیگر متعدد حضرات۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فراغت کے بعد انھوں نے جامعہ ریاض العلوم دہلی کا عزم کیا۔ وہاں شیخ الحدیث مولانا عبدالسلام بستوی اور مولانا سید تقریظ احمد سہسوانی سے صحاح ستہ کی تکمیل فرمائی اور بعض دیگر کتابیں پڑھیں۔ یہ نصاب تین سال میں مکمل ہوا اور وہ مستحق سند قرار پاے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد انھوں نے خطابت کا سلسلہ شروع کیا اور اپنے علاقے میں اور دوسرے علاقوں میں مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کی تنظیم کے لیے بھی کوشاں ہوے اور اس میں اللہ نے ان کو کامیابی عطا فرمائی۔ اس کے ساتھ ہی ایک کام یہ کیا کہ بعض دوستوں کے مشورے سے ۱۹۹۱ء میں مجلس تحقیق اسلامی

کے نام سے ایک تصنیفی ادارہ قائم کیا۔ اس ادارے کا مقصدِ قیام یہ تھا کہ مسلمانوں کو اہم اور ضروری مسائل سے آگاہ کرنے کے لیے حالات کی روشنی میں اردو اور ہندی میں کتابیں تصنیف کر کے مفت تقسیم کی جائیں۔ ان کتابوں میں اپنے دورِ گزشتہ کے علمائے کرام کا تذکرہ بھی کیا جائے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل کتابیں لکھی گئیں جن کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے اور لوگوں نے ان کتابوں کا بڑے شوق سے مطالعہ کیا۔

١- اسلامی آدابِ معاشرت (حصہ اول، حصہ دوم، حصہ سوم) از مولانا عبدالرؤف خاں ندوی۔ طبع اول دو ہزار۔ تینوں حصے مشتمل بر صفحات ٥٤٤۔

٢- خانہ سازِ شریعت اور آئینۂ کتاب وسنت: از مولانا عبدالرؤف خاں ندوی۔ طبع اول دو ہزار، طبع دوم دو ہزار، طبع سوم گیارہ سو، صفحات ٤٦٢۔

٣- عورت اسلام کے سایے میں: از مولانا عبدالرؤف خاں ندوی۔ طبع اول دو ہزار، طبع دوم دو ہزار، طبع سوم گیارہ سو، صفحات ٣٢٠۔

٤- نقوش وتاثرات: از مولانا عبدالرؤف خاں ندوی۔ طبع اول گیارہ سو، طبع دوم ایک ہزار، صفحات ٢٤٥۔

٥- کتاب الدعاء: از مولانا عبدالرؤف خاں ندوی، طبع اول دو ہزار، طبع دوم گیارہ سو، طبع سوم ایک ہزار، طبع چہارم ایک ہزار، صفحات ١٨٤۔

٦- رسول اکرم ﷺ کی نماز: طبع اول دو ہزار، طبع دوم گیارہ سو، صفحات ٣٧٦۔

٧- پرانے چراغ: از مولانا عبدالرؤف خاں ندوی طبع اول دو ہزار۔

یہ سات کتابیں زیب عنوان عالم مولانا عبدالرؤف خاں ندوی کی تصانیف ہیں۔

اب مسلسل نمبروں کے ساتھ دوسرے اہل علم کی تصانیف کے نام پڑھیے جو مجلس تحقیق اسلامی نے شائع کیں۔

٨- ہندوستان میں اشاعتِ اسلام: از علامہ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری۔ اس کتاب کا ہندی زبان میں بھی ترجمہ کر دیا گیا ہے۔ اردو اور ہندی دونوں ایڈیشن پہلی مرتبہ دو دو ہزار کی تعداد میں شائع کیے گئے۔

٩- خصوصیات اسلام: از علامہ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری، اردو کی اس کتاب کا بھی ہندی میں ترجمہ کر دیا گیا ہے۔ یہ بھی اردو ہندی دونوں ایڈیشن پہلی مرتبہ دو دو ہزار کی تعداد میں چھپے۔

١٠- اسلام کا نظامِ زکوٰۃ: از امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، طبع اول دو ہزار۔

١١- اسلام اور چھوت چھات: از قاضی عابد علی بلہوری، اس کتاب کا بھی ہندی زبان میں ترجمہ ہو گیا ہے۔ پہلی مرتبہ اردو ہندی ایڈیشن دو دو ہزار کی تعداد میں شائع کیے گئے۔

١٢- ضعیف اور موضوع روایات: از مولانا عبدالسلام رحمانی، طبع اول ایک ہزار، طبع دوم ایک ہزار۔

۱۳- آئینۂ حج: از مولانا شمیم احمد سلفی، طبع اول ایک ہزار۔ پھر یہ کتاب طبع دوم، طبع سوم، طبع چہارم اور طبع پنجم تک ایک ایک ہزار کی تعداد میں چھپی۔

۱۴- نماز کے موضوع پر تین اہم رسائل: از علامہ عبدالعزیز بن باز ترجمہ مولانا زبیر احمد مدنی: یہ ترجمہ شدہ کتاب تین مرتبہ پانچ ہزار کی تعداد میں شائع ہوئی۔

۱۵- ہم نماز کیوں پڑھیں؟ از مولانا شمیم احمد سلفی، یہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں چار مرتبہ سات ہزار کی تعداد میں معرضِ اشاعت میں آئی۔

۱۶- حقوق الزوجین: از مولانا شکر اللہ فیضی، طبع اول دو ہزار۔

۱۷- تقویٰ: از مولانا زبیر احمد مدنی، طبع اول گیارہ سو۔

۱۸- آہنگِ قدسی: از ماسٹر عبدالقادر قدسی، طبع اول گیارہ سو۔

۱۹- معاشرے کی تباہ کاریاں: از مولانا منظور احمد مدنی، طبع اول دو ہزار۔

یہ انیس کتابیں ہیں جن میں سے سات مولانا عبدالرؤف خاں ندوی کی تصانیف ہیں اور اب تک ہزاروں کی تعداد میں چھپ چکی ہیں۔ باقی دیگر مصنفین کی ہیں، جن میں سے بعض کے ہندی ترجمے بھی کر لیے گئے ہیں۔ یہ ماشاء اللہ بہت بڑی خدمت ہے جو مولانا عبدالرؤف خاں ندوی اور ان کے رفقاء (ارکان مجلس تحقیق اسلامی) نے سر انجام دی۔ تصنیفی اعتبار سے خدمتِ اسلام کا یہ سلسلہ جاری ہے اور ان شاء اللہ جاری رہے گا۔

مولانا عبدالرؤف خاں ندوی کی اولاد تین بیٹے ہیں اور پانچ بیٹیاں۔

بڑے بیٹے محمد ظفر محمدی ہیں۔ دینی علوم کے ساتھ ساتھ وہ مختلف سکولوں اور کالجوں میں انگریزی اور ہندی بھی پڑھ چکے ہیں اور ایک سکول میں معلم ہیں۔ شادی شدہ اور صاحبِ اولاد۔

دوسرے بیٹے کا نام محمد اقبال ہے۔ یہ بھی مختلف تعلیم گاہوں میں عربی، اردو، ہندی اور انگریزی کے کورس مکمل کر چکے ہیں۔ برسرِ روزگار ہیں اور شادی شدہ ہیں۔

تیسرے محمد سلمان ہیں۔ یہ لیبیا میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

مولانا ممدوح کی بیٹیاں بھی اللہ کے فضل سے تعلیم یافتہ ہیں اور ان کے شوہر بھی علم و عمل کی دولت سے بہرہ ور ہیں۔ مولانا کی بہوئیں بھی زیورِ تعلیم سے آراستہ ہیں۔ یعنی گھر کے تمام افراد کو اللہ نے علم سے بھی نوازا ہے اور عمل سے بھی۔ سب اپنے اپنے گھروں میں خوش و خرم ہیں۔

یہ سطور ۱۲- دسمبر ۲۰۱۲ء کو لکھی گئی ہیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ مولانا کو خیر و عافیت کی دراز زندگی عطا فرمائے

اور وہ ہمیشہ اسلام کی خدمت میں مشغول رہیں۔ ان کے افراد خانہ کو بھی اللہ تعالیٰ صحت و خیریت کی نعمت سے نوازے رکھے۔

پاکستان میں بھی اللہ کی مہربانی سے بے شمار علماے کرام بستے ہیں اور لاتعداد سرمایہ دار آباد ہیں، کیا کسی انجمن یا کسی فرد نے ہزاروں صفحات پر مشتمل کتابیں مفت چھاپ کر تقسیم کی ہیں؟ اس فقیر کے علم کے جواب نفی میں ہے۔

افسوس ہے مجھے مولانا موصوف کی زیارت کا شرف حاصل نہیں۔ اگر ان سے کبھی میل ملاقات کا موقع ملا ہوتا تو اپنے خوانندگانِ محترم کو ان کے حلیے اور لباس وغیرہ سے بھی آگاہ کرنے کی کوشش کرتا۔

نوٹ: ...... میں اپنی اس کتاب ''چمنستانِ حدیث'' کی پروف ریڈنگ کر رہا تھا کہ مولانا عبدالرؤف خاں کی تازہ تصنیف ''کاروانِ سلف'' حصہ اول (مطبوعہ ٢٠١٣ء) موصول ہوئی۔ یہ کتاب مشرقی یوپی کے ممتاز علماے اہل حدیث (مرحومین) کے حالات اور ان کی خدمات پر مشتمل ہے۔ کتاب ٤١٦ صفحات پر محیط ہے۔ اس کے اگلے حصے لکھے جا رہے ہیں۔ علماے کرام کے حالات میں ان شاء اللہ یہ بہت معلومات افزا کتاب ہوگی۔

ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر

(ولادت ۸ جنوری ۱۹۵۱ء)

مجھے یاد پڑتا ہے ۱۹۸۵ء کے ماہ جنوری کا پہلا ہفتہ تھا کہ میں ایم اے اسلامیات کے زبانی امتحان کے لیے اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور گیا، وہاں ایک ہوٹل میں ایک نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ میانہ قد، متوازن جسم نہ زیادہ دبلے پتلے نہ فربہ، گندمی رنگ، سادہ لباس، علمی انداز گفتگو، پتا چلا کہ ان کا نام عبدالرؤف ظفر ہے اور مشہور عالم و محقق مولانا عبدالقادر صاحب حصاری کے نواسے ہیں۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کی طرف سے برطانیہ میں پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ ان سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ ان کے نانا مولانا عبدالقادر حصاری میرے مہربان تھے اور میرے ''الاعتصام'' کے زمانہ ادارت میں ان کے بے شمار مضامین اس اخبار میں شائع ہوئے۔ دینیات کے ہر پہلو پر ان کی وسیع نظر تھی۔ پوری تحقیق سے قلم کو حرکت دیتے تھے۔ وہ لاہور تشریف لاتے تو مجھے ضرور ملتے۔ ان سے خط کتابت کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ میں نے اپنی ایک کتاب ''کاروان سلف'' میں ان پر مضمون لکھا ہے۔ انھوں نے ستمبر ۱۹۸۱ء میں وفات پائی۔ اب ان کے نواسے عبدالرؤف ظفر کے ان ضروری حالات سے مطلع ہونے کی کوشش کرتے ہیں، جن کا تعلق ان کی علمی زندگی سے ہے۔

ان کے ددھیال وننھیال ہندوستان کے صوبہ ہریانہ کے ضلع حصار کے رہنے والے تھے اور وہاں کی راجپوت برادری کی شاخ جھورڑ سے ان کا تعلق تھا۔ تقسیم ملک کے بعد یہ لوگ ضلع بہاول نگر کے ایک گاؤں ''پنج کوسی'' میں آباد ہوئے۔ وہیں ۸ جنوری ۱۹۵۱ء کو عبدالرؤف ظفر کی ولادت ہوئی۔ ان کے والد کا نام عبدالغفار تھا جو عالم دین تھے۔ عبدالرؤف ظفر نے ناظرہ قرآن مجید اپنے گاؤں (پنج کوسی) کے مولانا محمد صدیق سے پڑھا۔ وہیں سکول میں داخلہ لیا۔ چھ جماعتوں تک کا سکول جسے لوئر مڈل سکول کہا جاتا تھا، ان کے گاؤں سے دو میل کے فاصلے پر تھا۔ وہاں انھوں نے چھ جماعتیں اول درجے میں پاس کیں۔

ساتویں جماعت کے لیے ''جنڈ والا'' کے مڈل سکول میں داخل ہوئے جو ان کے گاؤں سے پانچ میل کے فاصلے پر تھا۔ سائیکل پر سکول جاتے تھے اور اپنی جماعت کے مانیٹر تھے۔ اس سکول میں ان کے استاد تھے مولانا عبدالعزیز، چودھری غلام رسول اور ماسٹر محمد اسلم وٹو۔

اس سکول سے مڈل پاس کرنے کے بعد چشتیاں کے ہائی سکول میں داخلہ لیا۔ وہاں مدرسہ ضیاء القرآن

والحدیث کے نام سے درس نظامیہ کی تعلیم کا سلسلہ جاری تھا۔ سکول کی تعلیم کے ساتھ ساتھ عبدالرؤف ظفر نے اس مدرسے میں پڑھنا شروع کر دیا اور مدرسے کے نصاب کے مطابق باقاعدگی سے صرف ونحو، ترجمہ قرآن، تفسیر، حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ ہائی سکول میں ان کے اساتذہ میں چودھری غلام رسول، ماسٹر فقیر محمد اور سید عبدالمجید شاہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اور مدرسہ ضیاء القرآن والحدیث میں مولانا عبدالقدوس کلیم ہزاروی اور مولانا عبدالستار صاحب پکھی والا کے اسمائے گرامی لائق تذکرہ ہیں۔

مدرسہ ضیاء القرآن والحدیث (چشتیاں) میں یہ چھ سال بڑی محنت سے تعلیم حاصل کرتے رہے۔ مدرسے ہی میں ان کی رہائش تھی۔ مدرسے کے ہر امتحان میں ہمیشہ اول آئے۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد چشتیاں کے گورنمنٹ ڈگری کالج میں داخلہ لیا۔ ایف اے بھی وہیں فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور بی اے بھی اسی کالج میں کیا۔

درس نظامی مکمل کرنے اور بی اے کا امتحان دینے کے بعد ۱۹۷۳ء کے آخر سے ۱۹۷۵ء تک ہارون آباد (ضلع بہاول نگر) کی ایک مسجد میں خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے رہے۔ اس کے ساتھ ہی سکول میں تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اسی دوران ملتان سے ۱۹۷۴ء میں بی ایڈ کیا۔

۱۹۷۶ء میں بطور ایس ایس ٹی پڑھانا شروع کیا۔ پہلے ضلع رحیم یار خان کے قصبہ لیاقت پور کے قریب چک ۸۷ پی کے ہائی سکول میں معلم رہے۔ پھر ضلع بہاول نگر کے قصبہ ڈونگا بونگا میں ۱۹۷۸ء تک تدریس کی۔ اسی سال ایم اے اسلامیات کا امتحان اول پوزیشن میں پاس کیا اور جنوری ۱۹۷۹ء میں زرعی یونیورسٹی (فیصل آباد) میں بطور لیکچرار اسلامیات تقرر ہوا۔ جون ۱۹۷۹ء میں اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور میں ایم اے عربی کا امتحان دیا اور پوری یونیورسٹی کو ٹاپ کیا۔ اس کے نتیجے میں قائداعظم سکالرشپ کے تحت ۱۹۸۳ء کے آخر میں پی ایچ ڈی کے لیے برطانیہ چلے گئے اور گلاسکو یونیورسٹی سکاٹ لینڈ میں داخلہ لیا۔ وہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ تبلیغ اسلام بھی کرتے رہے۔ اسی سلسلے میں چار ماہ کے لیے ۱۹۸۷ء میں سعودی عرب میں قیام رہا۔ ڈیڑھ سال منیلا، ہالینڈ اور بیلجیئم بھی رہے۔ بین المذاہب کانفرنس میں شرکت کے لیے جرمنی بھی گئے۔ ۱۹۸۸ء میں پی، ایچ، ڈی کی ڈگری لی اور ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر کہلائے۔

اکتوبر ۱۹۸۸ء میں واپس اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور آئے۔ ۱۹۸۹ء میں اسسٹنٹ پروفیسر۔ ۱۹۹۴ء میں ایسوسی ایٹ پروفیسر اور ۱۹۹۵ء میں پروفیسر ہو گئے۔ ۱۹۹۱ء میں سیرت چیئر کے ڈائریکٹر بنا دیے گئے۔

سیرت کے موضوع پر انھوں نے اسلامیہ یونیورسٹی میں کئی کانفرنسیں منعقد کیں، جن میں بہت سی علمی شخصیتوں نے مقالے پڑھے اور سیرت چیئر کی طرف سے خود ان کی بھی دس گیارہ کتابیں شائع ہوئیں۔ وہ

یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات کے چیئرمین بھی رہے۔

جنوری ۲۰۱۱ء میں اسلامیہ یونیورسٹی سے ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کنٹریکٹ پر کام کرتے رہے۔

اپریل ۲۰۱۲ء میں انھیں سرگودھا یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم چودھری نے سرگودھا یونیورسٹی میں خدمات سرانجام دینے کی پیش کش کی۔ چنانچہ یہ ۳۰ اپریل ۲۰۱۲ء کو اسلامیہ یونیورسٹی سے استعفا دے کر سرگودھا یونیورسٹی چلے گئے اور وہاں بطور چیئرمین شعبہ علوم اسلامیہ کام کرنے لگے۔ یہ سطور ۲۹ مارچ ۲۰۱۳ء کو لکھی جارہی ہیں اور وہ سرگودھا یونیورسٹی میں مصروف عمل ہیں۔

ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر بہت محنتی اہل علم اور قرآن وحدیث کے مخلص ترین خادم ہیں۔ حدیث کے موضوع پر انھوں نے چھوٹی بڑی متعدد کتابیں لکھیں۔ مختلف رسائل وجرائد میں اس سلسلے میں ان کے مقالات بھی شائع ہوتے رہے۔ ان میں مندرجہ ذیل رسائل وجرائد شامل ہیں۔

''فکر ونظر'' اسلام آباد، ''الدراسات الاسلامیہ'' اسلام آباد۔ ''معارف الاسلامی'' علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، ''مجلّہ تحقیق'' پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ ''اورنٹیل کالج میگزین'' پنجاب یونیورسٹی لاہور، ''القلم'' پنجاب یونیورسٹی۔ ''محدث'' لاہور۔ ''بینات'' کراچی۔ ''السیرۃ العالیہ'' کراچی۔ ''اسلامک کلچر'' لندن۔ ''معارف'' اعظم گڑھ انڈیا۔ ''تحقیقات اسلامی'' انڈیا۔ علاوہ ازیں اردن، لندن، قاہرہ کے بعض مجلات میں ان کے مقالات شائع ہوئے۔

ان کے پی ایچ ڈی کے مقالے کا عنوان ''اسماء الرجال المصابیح'' تھا۔ علم حدیث سے متعلق ان کی مطبوعہ کتابوں میں ایک کتاب ''علوم الحدیث فنی، فکری اور تاریخی مطالعہ'' ہے۔ ایک کتاب کا نام ''اسوہ کامل'' ہے، جس پر ۲۰۰۹ء میں انھیں صدارتی ایوارڈ ملا۔ ایک اور کتاب کا نام ہے ''عصر رواں سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں''۔ اللہ تعالیٰ ان کا حامی وناصر ہو۔

(یہ سطور ۲۹۔ مارچ ۲۰۱۳ء کو تحریر کی گئیں۔)

قاری عبدالشکور مدنی

(ولادت ۳۔ مارچ ۱۹۵۲ء)

میانہ قد، گداز جسم، سانولا سا رنگ، گول چہرہ، کھلی پیشانی، شلوار قمیص میں ملبوس، خوش مزاج، عمدہ خصال۔ یہ ہیں قاری عبدالشکور مدنی۔ والد کا نام حافظ علم الدین اور دادا کا اللہ بخش۔!

۳۔ مارچ ۱۹۵۲ء کو فیصل آباد کے محلّہ مدن پورہ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کا آغاز مدن پورہ میں کیا۔ حفظ قرآن کا آغاز بھی وہیں ہوا۔ تیسری اور چوتھی جماعتیں فیصل آباد کے محلّہ محمد پورہ کے ایک سکول میں پڑھیں۔ پھر ان کے والد حافظ علم الدین امام وخطیب کی حیثیت سے تحصیل سمندری کے چک ۱۴۳ گ ب چلے گئے تو عبدالشکور نے وہیں پرائمری پاس کی اور قرآن مجید بھی (پونے دو سال میں) وہیں حفظ کیا۔

بعد ازاں فیصل آباد کی جامعہ تعلیمات اسلامیہ میں داخلہ لیا جسے مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف مرحوم نے جاری کیا تھا۔ وہاں انھوں نے مولانا محمد بشیر سیالکوٹی (دار العلم اسلام آباد) مولانا حافظ عبدالعزیز علوی (موجودہ شیخ الحدیث جامعہ سلفیہ) مولانا فاروق احمد راشدی (موجودہ شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ گوجراں والا) اور مرحوم مولانا محمود احمد غضنفر سے استفادہ کیا۔ ایک اور استاذ مولانا غلام احمد تھے، ان سے انھوں نے معقولات کی کتابیں پڑھیں۔

جامعہ تعلیمات اسلامیہ سے جامعہ سلفیہ چلے گئے۔ وہاں صحیح بخاری حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی سے پڑھی۔ شرح عقیدہ طحاویہ اور بدایۃ المجتہد جامعہ سلفیہ میں سعودی عرب کے مبعوث شیخ محمد بن امان علی الجامی سے پڑھیں، سعودی عرب ہی کی طرف سے بہ طور مبعوث ایک استاذ علی مشرف تھے، ان سے بھی بعض نصابی کتابیں پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ جامعہ سلفیہ ہی میں مولانا ثناء اللہ ہوشیار پوری سے مؤطا امام مالک، حجۃ اللہ البالغہ، محیط الدائرہ اور بعض دیگر کتابوں کی تکمیل کی۔ مولانا محمد بنیامین طور مرحوم بھی اس وقت جامعہ سلفیہ کی مسند تدریس پر متمکن تھے، ان سے صحیح مسلم، علم معانی کی مطول، علم الفرائض کی سراجی اور بعض دیگر نصابی کتابوں کا درس لیا۔ حضرت حافظ مفتی ثناء اللہ مدنی سے بدایۃ المجتہد اور التاریخ الاسلامی وغیرہ کتابیں پڑھیں۔ مولانا علی محمد سلفی سے علم حدیث کی جامع ترمذی، فقہ کی ہدایہ اور اصول فقہ کی نور الانوار وغیرہ کتابیں پڑھیں۔ میٹرک اور ایف اے کے امتحانات پرائیویٹ طور پر پاس کیے۔

جامعہ سلفیہ کی طرف سے مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ ملا۔ وہاں جن اساتذہ کرام کے حضور زانوے شاگردی تہہ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، وہ تھے شیخ عبدالمحسن بن العباد، مولانا عبدالغفار حسن، ڈاکٹر محمود احمد الوائلی، شیخ شیبۃ الحمد، شیخ غنیمان، شیخ محمود الشناوی مصری، ڈاکٹر محمود احمد اور شیخ محمد مختار الشنقیطی۔

۱۹۷۸ء میں مدینہ یونیورسٹی سے سندِ فراغت ملی تو یہ پاکستان آئے اور تدریس کا آغاز کیا، جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ سعودی عرب کے دار الافتاء کی طرف سے انھیں الجامعۃ الاسلامیہ لاہور میں بہ طور مبعوث استاد مقرر کیا گیا۔ ماہانہ تنخواہ سعودی حکومت ادا کرتی تھی۔ اب بھی ان کی تنخواہ وہیں سے ملتی ہے۔

۲۔ اس سے کچھ عرصہ بعد ان کا تبادلہ علماء اکیڈمی منصورہ (لاہور) میں کر دیا گیا۔ یہاں ججوں اور وکیلوں کے لیے ایک سالہ اور ششماہی ریفریشر کورس کا سلسلہ شروع تھا، جس میں مختلف مکاتبِ فکر کے علمائے کرام (اہل حدیث، حنفی اور شیعہ) حدیث اور اصول حدیث وغیرہ موضوعات پر لیکچر دیا کرتے تھے۔ لیکچر دینے والوں میں قاری عبدالشکور مدنی، مولانا محمد ادریس کاندھلوی، مولانا گلزار احمد مظاہری اور مولانا خلیل حامدی شامل تھے۔

۳۔ تقریباً دو سال قاری عبدالشکور مدنی بہ طور مبعوث استاذ مسجد چینیاں والی کے مدرسے میں پڑھاتے رہے۔ اس وقت اس مسجد کے خطیب علامہ احسان الٰہی ظہیر تھے۔

۴۔ بعدازاں سعودی قونصلیٹ نے ان کو دوبارہ علماء اکیڈمی منصورہ بھیج دیا۔

۵۔ پھر سعودی حکومت نے ان کا تبادلہ جامعہ محمدیہ (جی ٹی روڈ) گوجراں والا میں کر دیا۔ وہاں یہ تقریباً چار سال فریضہ تدریس انجام دیتے رہے۔ اس وقت وہاں ان کے علاوہ اساتذہ کرام تھے مولانا عبدالحمید ہزاروی، حافظ عبدالمنان نورپوری (مرحوم)، حافظ عبدالسلام بن محمد بھٹوی، مولانا محمد رفیق اور مولانا جمعہ خاں۔

۶۔ دو سال وہ گورنمنٹ کالج کاموں کی میں فرسٹ ائیر اور سیکنڈ ائیر کے طلباء کو اسلامیات اور عربی پڑھاتے رہے۔

۷۔ اٹھارہ بیس سال سے جامعہ اہل حدیث قدس (لاہور) میں تفسیر، اصول تفسیر، حدیث، اصولِ حدیث، علم فقہ، عربی ادبیات اور صرف ونحو وغیرہ کی کتابیں پڑھا رہے ہیں۔

آج سے تقریباً ۳۵ سال قبل ۱۹۷۸ء میں انھوں نے تدریس کا سلسلہ شروع کیا تھا جو اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے باقاعدہ جاری ہے۔ یہ بہت بڑی خدمتِ دین ہے جو یہ انجام دے رہے ہیں۔ اس طویل مدت

میں ان سے بے شمار علما وطلبا نے اکتساب علم کیا۔ ان میں سے کتنے ہی لوگ اب یا تو مدارس میں پڑھا رہے ہیں یا کسی اور طریقے سے کتاب وسنت کی نشر واشاعت میں مشغول ہیں۔ ان کے تلامذہ کی وسیع فہرست میں مندرجہ ذیل حضرات شامل ہیں:

مولانا خالد مرجالوی، مولانا محمد مالک بھنڈر، سید ضیاء اللہ شاہ بخاری، امیر حمزہ، طاہر نقاش، ابونصر جاوید، مولانا محمد شمعون، مولانا صلاح الدین غوری اور دیگر بہت سے اہل علم۔

تدریس کے علاوہ قاری عبدالشکور مدنی نے قلمی کام بھی کیا اور بعض اہم کتابیں شائع بھی کیں اور لکھی بھی۔ ان کی شائع کردہ کتاب جو خاص طور پر قابل ذکر ہے، ان کے استاذ مکرم حضرت حافظ مفتی ثناء اللہ مدنی کا ''فتاویٰ ثنائیہ مدنیہ'' ہے۔ اس کی جلد اول جو معرض اشاعت میں آ چکی ہے، بڑی تقطیع کے ۸۸۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس پر ان کا طویل مقدمہ ہے۔ یہ ایک عظیم خدمت ہے جو حضرت مفتی صاحب نے سرانجام دی اور قاری عبدالشکور مدنی نے اس کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ اس فتاوے کی دوسری اور تیسری جلدیں زیر طبع ہیں۔ یہ فتاویٰ قاری عبدالشکور مدنی کے مسکن ۲۱۴۔ بی، سبزہ سکیم لاہور سے مل سکتا ہے۔ نیز جامعہ اہل حدیث قدس چوک دالگراں لاہور سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

امام ترمذی کی "الوصائل فی شرح الشمائل" کی تبویب وتنسیق بھی قاری صاحب ممدوح نے کی۔

"السنن و الآثار فی التصاویر و التماثیل" عربی میں ان کی قلمی کاوش ہے۔

علاوہ ازیں ہفت روزہ ''الاعتصام'' اور ''تنظیم اہل حدیث'' میں ان کے مضامین چھپتے رہتے ہیں۔

قاری صاحب اچھے خطیب بھی ہیں اور جامع مسجد مسلم جھلاراں جوڑے پل لاہور میں خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے ہیں۔

(یہ مضمون ۲۱۔ جولائی ۲۰۱۳ء کو لکھا گیا)

حافظ ابو عبداللہ محمد شعیب

(ولادت ۱۴۔ ستمبر ۱۹۵۴ء)

پورا قد، معتدل جسم، گندمی رنگ، پیشانی پر سجدے کا نشان، چوڑا سینہ، متبع سنت اور صالحیت سے بہرہ ور، ٹخنوں سے اوپر شلوار، سادہ لباس، سر پر سیاہ رنگ کا عمامہ، نرم گفتار، منجھے ہوئے مدرس، اپنے کام سے کام رکھنے والے، صابر وشاکر اور حلیم الطبع۔ یہ ہیں حافظ محمد شعیب۔ ان کی کنیت ہے ابو عبداللہ۔

حافظ محمد شعیب کے آبا واجداد کا تعلق کوٹ کپورہ (ریاست فرید کوٹ مشرقی پنجاب) سے تھا۔ ان کے والد کا اسم گرامی مولوی محمد ادریس تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم کا تو پتا نہیں کہاں ہوئی، البتہ یہ یاد ہے کہ کچھ عرصہ تحصیل علم کے لیے وہ دہلی رہے تھے، لیکن کس عالم دین سے کیا پڑھا، یہ معلوم نہیں، تاہم نیک، خوش اخلاق، لوگوں کے ہم درد اور میل جول والے شخص تھے۔ کسی سے خفگی کا اظہار نہیں کرتے تھے، نہ تلخ کلامی سے پیش آتے تھے۔ اگست ۱۹۴۷ء میں اپنے اعزہ واقارب کے ساتھ چک ۳۶ گ ب (تحصیل جڑاں والا ضلع فیصل آباد) آئے اور یہیں آباد ہو گئے۔ ان سطور کے راقم پر شفقت فرماتے تھے۔ اپنے گاؤں میں دکان داری کرتے تھے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں نہایت مخلص تھے۔ اپنے عزیزوں اور دوستوں کے جنازے میں شرکت کی پوری کوشش کرتے تھے۔

ایک مرتبہ میں ایک وفات پر چک ۳۶ گ ب گیا۔ ابھی اس گاؤں میں داخل نہیں ہوا تھا کہ مولوی محمد ادریس سے ملاقات ہوئی۔ یہ سات آٹھ آدمی تھے۔ معلوم ہوا کہ ایک گاؤں چک نمبر ۲۳ میں مولوی محمد چراغ کاہلوں کے جنازے میں جا رہے ہیں۔ میں جس مرحوم کی تعزیت کے لیے چک ۳۶ جا رہا تھا، ان کی وفات دو دن پہلے ہوئی تھی۔ کہنے لگے جنازے میں شامل ہونا چاہیے، بعد میں جانا تو بس افسوس کرنا ہے۔ مولوی محمد ادریس کی یہ بات بالکل صحیح تھی۔

۱۴۔ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۴ھ (۱۵۔ فروری ۱۹۸۴ء) کو انھوں نے چک ۳۶ میں وفات پائی۔ مجھے ان کی وفات کا پتا چلا تو لاہور سے وہاں پہنچا اور جنازے میں شریک ہوا۔ اس وقت میرے بزرگ دوست اور فرید کوٹ جیل کے سیاسی ساتھی قاضی عبیداللہ مرحوم بھی وہیں تھے۔ وہ مولوی محمد ادریس کے قریبی رشتے دار تھے۔ قاضی عبیداللہ کا تذکرہ میں نے تین کتابوں کے مختلف مقامات میں کیا ہے، اپنی خود نوشت سوانح ''گزر گئی گزران'' میں، ''نقوش عظمت رفتہ'' کے اس مضمون میں جو ہندوستان کے سابق صدر گیانی ذیل سنگھ کے متعلق

لکھا اور ''بزم ارجمنداں'' کے مضمون مولانا ابوالکلام آزاد میں۔ ان کے علاوہ بھی شخصیات سے متعلق بعض مضامین میں ان کا ذکر ہوا ہے۔ ان کی نرینہ اولاد ایک ہی لڑکا تھا، بڑا ذہین اور پڑھا لکھا۔ اس کا نام محمد فاروق تھا۔ وہ جوانی کی عمر میں گھر سے نکلا اور واپس نہیں آیا۔ معلوم نہیں کدھر گیا اور اس کے ساتھ کیا گزری۔ یہ چوبیس پچیس برس پہلے کا واقعہ ہے۔

مولوی محمد ادریس کی نرینہ اولاد پانچ بیٹے ہیں حافظ محمد الیاس، محمد زبیر، حافظ محمد شعیب، محمد عزیر اور محمد اسماعیل۔ لیکن یہاں صرف حافظ محمد شعیب کے بارے میں چند باتیں عرض کرنا مقصود ہے۔

حافظ محمد شعیب ۱۴۔ ستمبر ۱۹۵۳ء کو چک ۳۶ گ ب میں پیدا ہوئے۔ کچھ بڑے ہوئے تو سکول میں داخل کرا دیے گئے اور ساتھ ہی مسجد میں اپنے ایک بزرگ صوفی محمد مرحوم سے (جو بے حد صالح شخص تھے اور مولانا عتیق اللہ سلفی ناظم مرکز الدعوۃ السلفیہ ستیانہ بنگلہ کے نانا تھے) قرآن مجید پڑھنے لگے۔ دس سال کی عمر میں پرائمری بھی پاس کر لی اور ناظرہ قرآن مجید پڑھ کر ایک سپارہ حفظ بھی کر لیا۔ اس وقت اس نواح میں حفظ قرآن کا کوئی مدرسہ نہ تھا، اس لیے یہ اپنے ننھیال بہاول نگر چلے گئے۔ وہاں جامع العلوم عیدگاہ میں حافظ محمد شریف صاحب سے تین سال میں قرآن بھی حفظ کر لیا اور منزل بھی پختہ ہو گئی۔ بعد ازاں اپنے گاؤں میں والدِ مکرم کے فرمان کے مطابق مولوی محمد عمر مرحوم سے فارسی کی بعض ابتدائی کتابیں پڑھیں۔

اس زمانے میں مولانا عائش محمد نے چک ۳۶ میں مدرسہ رحمانیہ کے نام سے مدرسہ جاری کیا تھا، وہاں حافظ محمد شعیب نے شوال ۱۳۸۷ میں داخلہ لیا۔ تین سال اس مدرسے میں درس نظامی کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ وہاں ان کے استاذ تھے حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی، مولانا عائش محمد، مولانا عتیق اللہ سلفی، مولانا محمد امین اور مولانا محمد خالد سیف۔ اس اثنا میں چھٹی جماعت کا امتحان بھی دیا۔

اس کے بعد شوال ۱۳۹۰ھ (دسمبر ۱۹۷۰ء) میں جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) چلے گئے۔ دو سال جامعہ سلفیہ میں تعلیم حاصل کی۔ وہاں مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی، حافظ بنیامین طور، مولانا علی محمد حنیف، مولانا ثناء اللہ ہوشیارپوری، قاری عبدالرحیم طور اور مولانا عبید الرحمٰن سے استفادہ کیا۔

جامعہ سلفیہ میں دو سال پڑھنے کے بعد فیصل آباد کے مدرسہ دار القرآن والحدیث میں داخلہ لیا۔ اس مدرسے کے بانی مولانا عبداللہ ویروالوی تھے۔ پھر اسی مدرسے میں درس نظامی کی تعلیم مکمل کی اور سندِ فراغت لی۔ یہاں ان کے اساتذہ تھے مولانا عبداللہ ویروالوی، مولانا محمد خاں، مفتی غلام محمد رحمانی، صوفی گلزار احمد اور مولانا محمد داؤد۔

مدرسہ دار القرآن والحدیث سے مروجہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد فیصل آباد ہی کے ادارہ علوم اثریہ میں داخلہ لیا۔ یہ ادارہ ۱۹۶۸ء میں قائم ہوا تھا، اس کا مقصدِ قیام یہ تھا کہ اس میں فارغ التحصیل طلبا کو داخل کیا

جائے گا اور ان کے رجحان و استعداد کے مطابق انھیں کسی موضوع میں تخصص کرایا جائے گا۔ اس کی پہلی میٹنگ مولانا محمد اسحاق چیمہ کے مکان پر ہوئی تھی اور جو حضرات اس میں شامل ہوئے تھے، وہ تھے مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا عبداللہ لائل پوری (جھال خانوآنہ) مولانا محمد عبدہ الفلاح اور ان سطور کا راقم عاجز۔ اس کے اغراض و مقاصد اس فقیر نے تحریر کیے تھے جو بالاتفاق منظور کیے گئے تھے۔ اس کا نام ادارہ علوم اثریہ مولانا محمد حنیف ندوی نے رکھا تھا تاکہ اس کے فیض یافتہ حضرات اثری کی نسبت سے شہرت پائیں۔ جامعہ سلفیہ کا نام بھی مولانا محمد حنیف ندوی نے رکھا تھا، یہ نام رکھنے کی وجہ بھی یہ تھی کہ اس کے فارغ التحصیل سلفی کہلائیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ان دونوں اداروں میں استفادہ کرنے والوں میں سے نہ کسی نے سلفی کہلایا نہ اثری۔ یعنی انھوں نے جس درس گاہ میں تعلیم حاصل کی اور جس کی وجہ سے انھیں دینی اور دنیوی فائدے ہوئے اور شہرت ملی، اس کی طرف اپنی نسبت کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

بہرحال حافظ محمد شعیب نے مدرسہ دارالقرآن والحدیث سے سند لینے کے بعد ادارہ علوم اثریہ میں داخلہ لیا اور وہاں جن اساتذہ کرام سے مستفید ہوئے وہ تھے مولانا عبداللہ (جھال خانوآنہ)، مولانا محمد عبدہ الفلاح، مولانا ارشاد الحق اثری، مولانا عبدالحمید اثری اور مولانا محمد خالد سیف۔

اس سے اگلے سال ۱۳۹۵ھ (۱۹۷۵ء) میں حکیم عبدالرحیم اشرف کی جاری کردہ جامعہ تعلیمات اسلامیہ کے تخصص فی الدعوہ کے دو سالہ کورس میں داخلہ لیا۔ یہاں مصری اساتذہ شیخ محمد محمود احمد الفریان، شیخ محروس اور شیخ عبدالوہاب سے عربی تکلم و انشا اور بعض دیگر فنون میں استفادے کے ساتھ ساتھ ناظم جامعہ حکیم عبدالرحیم اشرف، مولانا عبدالغفار حسن اور دوسرے علمائے کرام کے محاضرات اور علمی توجہات سے ان کی معلومات میں بہت اضافہ ہوا۔ بقول ان کے "حکیم صاحب محترم کی شفقت سے بعض ابتدائی اسباق کی تدریس کا بھی موقع ملا۔"

یہاں ان کے طالب علمی کے دور کا ایک مرحلہ مکمل ہوا۔ اس دور میں وہ جن اساتذہ کرام سے خاص طور پر متاثر ہوئے ان میں "مولانا محمد خالد سیف کی علمی گہرائی، حافظ بنیامین صاحب کی سہلِ تفہیم اور حکیم عبدالرحیم اشرف کی نیکی اور سنت سے محبت شامل ہے۔"

حافظ محمد شعیب فرماتے ہیں:

"حکیم صاحب سنت سے محبت کرنے والے اور اسے عملاً اپنانے والے تھے۔ نفل و نوافل کی بات ہو یا ذکر و اذکار کی، نفلی روزوں کا معاملہ ہو یا کسی سنتِ رسول کا، ان کا مقامِ عام علما سے بہت اونچا تھا۔ وہ مسجد سے نکلتے وقت پہلے بایاں پاؤں باہر نکال کر بائیں جوتے پر رکھتے، پھر دایاں پاؤں باہر نکال کر جوتا پہنتے اور پھر بایاں جوتا پہنتے۔ یہ تھی ان کی سنت رسول (ﷺ) سے وہ عملی

محبت جو میں نے کسی اور عالم میں نہ دیکھی۔"

حافظ محمد شعیب حکیم عبدالرحیم اشرف مرحوم کے احسانات کا تذکرہ کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

"جامعہ تعلیمات سے فراغت سے قبل ہی محترم حکیم صاحب نے جامعہ میں تدریس کی پیش کش کر کے ایک اور عظیم احسان مجھ پر کیا۔ فجزاہ اللہ خیرا۔"

شوال ۱۳۹۷ھ (ستمبر ۱۹۷۷ء) میں جامعہ تعلیما اسلامیہ میں حافظ محمد شعیب کے تدریسی دور کا آغاز ہوا جو دو سال جاری رہا۔ اس اثنا میں حکیم صاحب (جنھیں وہ اپنا عظیم محسن قرار دیتے ہیں) ان کے کاغذات برائے داخلہ مدینہ یونیورسٹی سعودی عرب بھیجنے کا وعدہ پورا کر چکے تھے۔ داخلے کا اطلاعی خط انھیں اواخر ۱۳۹۹ھ (۱۹۷۹ء) میں موصول ہوا۔ پھر چند روز میں دفتری کارروائی مکمل ہوئی تو حافظ محمد شعیب اور ان کے ساتھی محرم ۱۴۰۰ھ (دسمبر ۱۹۷۹ء) میں سعودیہ پہنچ گئے۔ حافظ صاحب فرماتے ہیں:

"میں اس عظیم محسن کا یہ عظیم احسان سر پر لے کر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخل ہو گیا۔ فالحمد للہ و جزاہ اللہ خیرا۔"

مدینہ یونیورسٹی میں ان کا داخلہ کلیۃ الحدیث میں ہوا تھا۔ یہ چار سال کا نصاب تھا جو انھوں نے وہاں مکمل کیا۔ ہر سال حج اور عمرے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ یونیورسٹی کے خرچ پر سالانہ چھٹیوں میں پاکستان آتے اور چھٹیاں اپنے گاؤں میں گزارتے۔ کتابیں وہاں عام ملتی تھیں اور حکومت کی طرف سے جوریاں انھیں دیے جاتے تھے، ان سے بھی کتابیں خریدتے تھے اور کتابیں پاکستان لے آتے تھے۔ انھیں مطالعہ کا شوق تھا اور زیادہ وقت مطالعہ ہی میں صرف ہوتا تھا۔ شعبان ۱۴۰۳ھ (جون ۱۹۸۳ء) میں مدینہ یونیورسٹی سے فراغت پائی اور سند لی۔

وہاں سے مکہ مکرمہ آ گئے اور رابطہ عالم اسلامی کے تحت قائم معہد تدریب الدعاۃ میں یک سالہ تخصص کا موقع ملا۔ اب انھیں بیت اللہ شریف میں عبادت کرنے اور پڑھنے لکھنے کے مواقع حاصل ہوئے۔ مکہ مکرمہ کے دورانِ قیام ہی میں والد صاحب کی وفات کی اطلاع ملی۔ مگر بُعدِ مسافت کی وجہ سے جنازے میں حاضر نہ ہو سکے۔ ان کے چار بھائی جو کراچی میں مقیم تھے، وہ بھی ایسی مجبوریوں کا شکار ہوئے کہ باپ کے جنازے میں شرکت سے محروم رہے۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ان کے والد کی وفات کا حادثہ ۱۴۔ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۴ھ (۱۵۔ فروری ۱۹۸۴ء) کو پیش آیا تھا اور اس مردِ صالح کے جنازے میں بے شمار لوگ شامل تھے۔

بہرکیف رابطہ عالم اسلامی کے معہد تدریب الدعاۃ سے فراغت کے بعد ادارات البحوث العلمیہ والافتاء والدعوۃ والارشاد میں تقرری کا معاملہ سامنے آیا۔ یہ محکمہ شیخ ابن باز رحمہ اللہ کے تحت قائم تھا۔ یہ مسئلہ بھی اللہ کی مہربانی سے حل ہو گیا اور یہ ربیع الثانی ۱۴۰۵ھ (جنوری ۱۹۸۵ء) کو واپس پاکستان آ گئے۔

اس وقت مکتب الدعوۃ الاسلامیہ کا دفتر لاہور میں تھا، اس سے رجوع کیا اور کاغذات پیش کیے تو ان کی تقرری جامعہ ستاریہ کراچی میں ہوگئی۔ وہاں پہلے سے ان کے بھائی بہ سلسلہ ملازمت موجود تھے، اس لیے رہائش گھر میں تھی اور تدریس جامعہ ستاریہ میں۔ پانچ سال وہاں خدمت تدریس انجام دی۔ تعطیلات کے زمانے میں اپنے گاؤں آ جاتے تھے۔

پانچ سال کے بعد مکتب میں وہاں سے تبادلے کی درخواست دی اور لکھا کہ یہاں میں نے علما و اساتذہ اور دینی و سیاسی جماعتوں سے بہت کچھ سیکھ لیا ہے، اس لیے کسی اور جگہ بھیجا جائے۔ مکتب کی طرف سے جواب آیا "ینقل الی الجامعہ السّلفیہ اسلام آباد۔" اب یہ جامعہ سلفیہ اسلام آباد آ گئے۔ اس کے مہتمم اس وقت سید حبیب الرحمٰن شاہ تھے، ان سے ملے اور مسندِ درس پر بیٹھ گئے۔ صرف دو سال وہاں رہے۔ ذو القعدہ ۱۴۱۰ھ (جون ۱۹۹۰ء) میں ان کا تبادلہ مدرسہ دار القرآن والحدیث فیصل آباد کر دیا گیا۔ اسی مدرسے سے انھوں نے سندِ فراغت لی تھی۔ فیصل آباد سے ان کا گاؤں چک ۳۶ صرف ۳۶ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے، تقریباً ہر جمعے کو (یعنی چھٹی کے روز) وہاں چلے جاتے تھے۔ پھر شوال ۱۴۱۳ھ (اپریل ۱۹۹۳ء) کو انھیں جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن جانے کا حکم ہوا۔ اس کے صدر (یا مہتمم) مولانا عبدالقادر ندوی تھے جنھیں حافظ صاحب "مردِ درویش" قرار دیتے ہیں۔ وہاں چھے سال ان کا قیام رہا۔ ماموں کانجن میں بھی ان کے متعدد قریبی عزیز جامعہ تعلیم الاسلام سے وابستہ تھے۔

ماموں کانجن سے شوال ۱۴۱۹ھ (فروری ۱۹۹۹ء) میں ان کا تبادلہ مرکز الدعوۃ السّلفیہ ستیانہ بنگلہ میں کر دیا گیا۔ اس کا شمار ماشاء اللہ پاکستان کے بہت بڑے اور مشہور مدارس میں ہوتا ہے۔ اس کے ناظم مولانا عتیق اللہ سلفی اور شیخ الحدیث مولانا عبداللہ امجد ہیں۔ متعدد لائق اساتذہ یہاں خدمت تدریس انجام دے رہے ہیں۔ اس نواح میں اس دار العلوم کے مدرسین کرام اور ناظم مولانا عتیق اللہ سلفی کا بہت اثر ہے اور درس و تدریس کا سلسلہ باقاعدگی کے ساتھ بہترین طریقے سے جاری ہے۔ مولانا عتیق اللہ سلفی کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں قارئین کے مطالعہ میں آ چکا ہے۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ حافظ محمد شعیب صاحب کی زندگی دراز فرمائے اور وہ خیر و عافیت سے کتاب و سنت کی خدمت میں مشغول رہیں۔ حافظ صاحب اللہ کی مہربانی سے اس مرکز میں مصروفِ درس و تدریس ہیں۔ حافظ صاحب تحریر و نگارش سے بھی رابطہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے بعض عربی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا جو دار السلام لاہور کی طرف سے معرضِ اشاعت میں آئیں۔ ان کی اردو زبان صاف ہے۔ اگر سلسلۂ تحریر جاری رکھا تو ان شاء اللہ اس میدان میں کامیاب ہوں گے۔

(یہ سطور ۲۴۔ اگست ۲۰۱۳ء کو لکھی گئیں)

حافظ مسعود عالم

(ولادت ۲۲۔ اکتوبر ۱۹۵۳ء)

چوڑا چہرہ، کشادہ پیشانی، خندہ رو، سرخی مائل گندمی رنگ، گداز جسم، موٹی آنکھیں، پورا قد، خوش لباس اور خوش کلام، نیک سیرت اور بلند اخلاق، ماتھے پر سجدے کا نشان، لمبی مہندی سے رنگین داڑھی، گردن سے نیچے تک سر پر پٹے۔ یہ ہیں حافظ مسعود عالم۔ نسب نامہ یہ ہے: مسعود عالم بن مولانا محمد یحییٰ بن میاں بشیر احمد بن فضل دین۔

تقسیم ملک سے قبل یہ خاندان اس وقت کے جغرافیائی اعتبار سے مشرقی پنجاب کے ضلع حصار کے ایک گاؤں میں آباد تھا، اور یہ لوگ سخت قسم کے راجپوت تھے۔ ''راج'' تو ان کے پاس نہیں تھا، لیکن یہ ''پوت'' بڑے جرأت مند تھے۔ تقسیم ملک کے بعد حکومت ہند نے مشرقی پنجاب کے تین صوبے بنائے۔ ایک صوبہ بدستور پنجاب رہا۔ دوسرے کو ہماچل پردیش کے نام سے موسوم کیا اور تیسرا صوبہ ''ہریانہ'' بنایا گیا اور ضلع حصار کو صوبہ ہریانہ میں شامل کیا گیا۔

حافظ مسعود عالم کے والد (مولانا محمد یحییٰ) اگست ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ خیز دور میں اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان آئے۔ ان کے حلقۂ احباب میں انھیں پرانے وطنی تعلق کی بنا پر محمد یحییٰ حصاری کہا جاتا تھا۔ پھر جب انھوں نے شرق پور کو اپنا مسکن بنایا اور وہاں درس و خطابت کی وادی میں قدم رکھا تو مولانا محمد یحییٰ شرق پوری کی نسبت سے شہرت پائی۔ یہی شہرت ان کی اصل پہچان ہوگئی۔ وہ صالح عالم دین تھے۔ ان کے حالات اس فقیر کی ایک کتاب ''ہفت اقلیم'' میں بیان کیے گئے ہیں۔

مولانا محمد یحییٰ شرق پوری کی شادی تقسیم ملک کے بعد ایک باعمل شخص حاجی محمد رفیق کی صاحب زادی سے ہوئی جو ہمارے شہر کوٹ کپورہ کے رہنے والے تھے اور ان کا محلّہ ہمارے محلے سے متصل تھا۔ پاکستان آکر وہ خانیوال کے قریب چک نمبر ۴۱ میں سکونت پذیر ہوئے۔ وہ استاد مکرم حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے عقیدت مند تھے اور شادی انہی کے مشورے سے ہوئی اور ایسی ساعتِ سعید میں ہوئی کہ جس کے نتائج نہایت بابرکت نکلے۔ حافظ مسعود عالم کی ولادت اپنے ننھیال میں ۲۲ اکتوبر ۱۹۵۳ء کو ہوئی۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، حافظ مسعود عالم کے والد بھی پیکر صالحیت تھے اور ان کے ننھیال بھی پارسائی

میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ اس حیثیت سے میرے خیال میں حافظ صاحب ممدوح کے لیے ''نجیب الطرفین'' کی اصطلاح کا اطلاق بالکل صحیح قرار پائے گا۔

مولانا محمد یحییٰ شرق پوری کے ہم نام اور جگری دوست حافظ محمد یحییٰ عزیز میر محمدی تھے۔ دونوں کا شمار اپنے عہد کے قافلہ خیر کے اہم ارکان میں ہوتا تھا۔دونوں اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے ہیں۔اسی قسم کے لوگوں کو ان کی حسنات کی وجہ سے مرنے کے بعد زندہ تابند کہا جاتا ہے۔ اگر کسی صاحب کا جذبہ صالحیت مجروح نہ ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ وارث شاہ نے بھی انہی اوصاف کے حامل افراد کے لیے کہا تھا۔

وارث شاہ اوہ سدا ای جیوندے نیں

جھناں کیتیاں نیک کمایاں نیں

حافظ مسعود عالم کے ددھیال و ننھیال سے متعارف ہونے کے بعد اب آیئے ان کے حصول علم کی طرف!

تعلیم کا آغاز انھوں نے اپنے والد گرامی مولانا محمد یحییٰ سے کیا۔اردو لکھنا پڑھنا بھی انہی سے سیکھا۔ ناظرہ قرآن مجید بھی انہی سے پڑھا۔درس نظامی کی ابتدائی کتابیں بھی انہی سے پڑھیں۔ مقامی مسجد میں نو سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا۔ والد صاحب دعوتی اور تبلیغی دوروں پر کہیں جاتے تو یہ مولانا محمد حسین کلیم سے ابتدائی درسی کتابیں پڑھتے جو رشتے میں ان کے چچا تھے۔بعض کتابیں مولانا عبداللطیف سے پڑھیں جو ساہیوال کے علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس طرح ان تینوں مولانا محمد یحییٰ، مولانا محمد حسین کلیم اور مولانا عبداللطیف سے مندرجہ ذیل کتابیں پڑھیں۔

مولانا محمد یحییٰ ان کے والد بھی تھے، مرشد بھی تھے اور نہایت شفیق استاد بھی تھے۔ان سے انھوں نے جو کچھ پڑھا اس کی تفصیل یہ ہے۔

ترجمہ قرآن، صرف ونحو اور عربی ادب کی ابتدائی کتابیں مراح الارواح، علم صرف کی انتہائی کتاب شافیہ کا کچھ حصہ۔شرح شروذ الذھب (از ابن ہشام) مغنی اللبیب کا کچھ حصہ، الکامل للمبرد کے بعض مقامات۔ عربی کتابوں کے مطالعہ کی راہ پر بھی انہی نے لگایا۔امام ابن تیمیہ کی تصنیف قاعدۃ الجلیلہ فی التوسل والوسیلہ کا مطالعہ انہی کی تاکید و تلقین سے کیا۔ اس کتاب سے مولانا کو اس قدر دلچسپی تھی کہ بیٹے سے بار بار پوچھتے کہ اس کی سمجھ آ رہی ہے یا نہیں۔

مولانا محمد حسین کلیم سے صرف ونحو اور عربی ادب کی چند ابتدائی کتابیں پڑھیں۔

مولانا عبداللطیف سے بھی بعض ابتدائی درسی کتابیں پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔اسی دوران فارسی کی کتابیں گلستان، بوستان، کریما اور پندنامہ وغیرہ خود ہی پڑھ ڈالیں۔

نبی پور پیراں (ضلع ننکانہ) کے مولانا عبدالجبار شرق پور تشریف لائے تو ان سے عربی ادب کی نصابی کتابیں مقامات حریری، حماسہ اور بعض دیگر کتابیں پڑھیں۔

۱۹۶۸ء میں جامعہ اسلامیہ گوجراں والا میں داخلہ لیا۔ ۱۹۷۰ء تک تین سال وہاں رہے اور مندرجہ ذیل اساتذہ سے استفادہ کیا۔

حضرت حافظ محمد گوندلوی کے ترجمہ قرآن میں کبھی کبھی شامل ہو جاتے تھے۔ لیکن ان سے مستقل طور پر کوئی کتاب نہیں پڑھی۔

مولانا محمد اعظم سے مشکوٰۃ جلد ثانی اور علم نحو کی کتاب کافیہ پڑھنے کا شرف حاصل کیا۔

قاری محمد اشرف سے فقہ، اصول فقہ، منطق، فلسفہ اور بعض دیگر فنون کی کتابیں پڑھیں۔

مولانا ابوالبرکات احمد مدراسی سے جامع ترمذی، سنن نسائی، مقدمہ ابن الصلاح، شرح نخبۃ الفکر، تفسیر جامع البیان، الکامل للمبرد، الفیہ ابن مالک، شرح ابن عقیل کا درس لیا۔ جامعہ اسلامیہ میں داخلے سے قبل اپنے والد محترم سے عمدۃ الاحکام زبانی یاد کر چکے تھے۔ الفیہ ابن مالک بھی زبانی یاد کرنا شروع کیا تھا، لیکن مکمل نہ ہو سکا۔ بعد ازاں مدینہ یونیورسٹی میں داخل ہوئے تو پورا یاد کیا۔

قاری محمد یحییٰ بھوجیانی سے عربی ادب کی کتابیں پڑھیں۔ قاری صاحب ممدوح عربی ادب کے ماہر استاد تھے۔

گوجراں والا کی جامعہ اسلامیہ میں حافظ مسعود عالم نے مندرجہ بالا اساتذہ سے تین سال تعلیم حاصل کی اور مختلف موضوعات کی مذکورہ کتابیں ان سے نہایت محنت اور شوق سے پڑھیں۔ وہاں سے شرق پور گئے تو ۱۹۷۰ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ان کے انگریزی کے استاد جناب حسن علی عباسی صاحب تھے۔

۱۹۷۱ء میں جامعہ سلفیہ فیصل آباد میں داخلہ لیا اور ۱۹۷۳ء تک تین سال وہاں تحصیل علم میں مصروف رہے۔ اس عرصے میں درج ذیل اساتذہ سے حصول فیض کیا۔

مولانا عبدالرحمٰن مدنی جامعہ سلفیہ کے مشفق استاد اور مدیر تعلیم تھے۔ ان سے مستفید ہونے کی سعادت حاصل کی۔

مولانا ثناء اللہ ہوشیارپوری سے ابوداؤد، صحیح مسلم، بدایۃ المجتہد اور حجۃ اللہ البالغہ پڑھیں۔ مولانا موصوف کا شمار اپنے عہد کے فاضل اساتذہ میں ہوتا تھا۔

حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی سے صحیح بخاری پڑھی۔ علاوہ ازیں ان سے بعض ایسی کتابیں پڑھیں جو

جامعہ سلفیہ کے نصاب میں شامل نہ تھیں۔ ان کے والد مکرم مولانا محمد یحییٰ شرق پوری نے حافظ عبداللہ صاحب سے خاص طور پر بیٹے کی تعلیم اور تربیت کا خیال رکھنے کی درخواست کی تھی۔

حافظ محمد بنیامین طور سے حافظ مسعود عالم نے جامعہ سلفیہ میں علم منطق کی قطبی اور اس فن کی بعض انتہائی کتابیں پڑھیں۔ نیز ان سے مختصر المعانی اور مطول کا درس لیا۔

۱۹۷۲ء اور ۱۹۷۳ء میں جامعہ سلفیہ کے لیے چند سعودی اساتذہ کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ ان میں ایک استاد شیخ علی مشرف العمری تھے۔ ان سے انشا اور کتاب التوحید پڑھی۔ ایک استاد کا تعلق ایتھوپیا سے تھا اور ان کا اسم گرامی شیخ محمد عمان علی الجامی تھا۔ ان سے فتح القدیر (از امام شوکانی) شرح عقیدہ طحاویہ، بدایتہ المجتہد وغیرہ کتابیں پڑھنے کا موقع ملا۔

سعودی عرب کی طرف سے ایک مصری عالم علامہ محمد خدری آئے تھے۔ ان سے اصول فقہ اور عقائد سے متعلق بعض کتابیں پڑھیں۔

۱۹۷۳ء میں جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) سے فارغ ہوئے تو اسی سال ماہ شوال میں مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا اور وہاں انھوں نے جن عالی قدر اساتذہ کے حضور زانوئے شاگردی تہ کیے اور ان سے جو کتابیں پڑھیں، اس کی تفصیل یہ ہے۔

ڈاکٹر محمود حامد الوائلی سے فقہ اور اصول فقہ کی نصابی کتابیں پڑھیں۔ شیخ عبدالمحسن العباد سے فقہ وعقائد، شیخ عبداللہ الغمانی شارح صحیح بخاری سے کتاب التوحید اور کتب عقائد۔ ابو طالب شاہین سے صرف ونحو کی کتابیں۔ شیخ عبدالرؤف اللغوی سے جواردن کے رہنے والے تھے اور لائق استاد تھے، دو سال علم صرف اور علم نحو کی کتابیں پڑھیں۔

ڈاکٹر عبدالعظیم السناوی سے انشا وخطابت کا درس لیا۔

شیخ علی حسن العماری سے علم بلاغت، معانی اور فن بدیع کی کتابوں کی تکمیل کی۔

ڈاکٹر محمود شیخون سے کتب حدیث پڑھیں۔

ڈاکٹر محمود شامی سے اسانید اور حدیث کے سلسلے میں استفادہ کیا۔

ڈاکٹر محمود الحسان سے توحید، اسماء وصفات، عقیدہ طحاویہ، الحمویہ وغیرہ میں مستفیض ہوئے۔

برصغیر کے ممتاز عالم مولانا عبدالغفار حسن بھی اس زمانے میں مدینہ یونیورسٹی میں طلباء کو تعلیم دیتے تھے، ان سے کتب حدیث پڑھنے کا شرف حاصل کیا۔

شیخ حماد بن محمد الانصاری، جلیل القدر عالم اور حافظ حدیث تھے، ان سے عقائد کی کتابیں پڑھیں۔

شیخ ابوبکر الجابر الجزائری سے تفسیر اور اصول تفسیر کی کتابیں پڑھیں جو مدینہ یونیورسٹی کے نصاب میں شامل تھیں۔

شیخ محمد مختار الشنقیطی سے تفسیر اور اصول میں استفادہ کیا۔شیخ عمان الجامی سے جنھوں نے جامعہ سلفیہ فیصل آباد سے واپس جا کر مدینہ یونیورسٹی میں سلسلہ تدریس شروع کیا تھا، بعض فنون کی کتابیں پڑھیں۔

اس طرح حافظ مسعود عالم نے مختلف مدارس و جامعات کے متعدد اساتذہ سے حصول فیض کیا اور وہاں کے نصاب کی تکمیل کی۔ان کے رفقائے تعلیم بھی بڑے اہم لوگ تھے اور ان کی خدمات کے دائروں نے بڑی وسعت اختیار کی، مثلاً جامعہ اسلامیہ گوجراں والا میں ان کے ہم جماعت یا ہم درس تھے حافظ محمد حنیف شرق پوری، حافظ محمد الیاس اثری، سید محمد اکرم شاہ، حکیم محمود، مولانا ثناء اللہ سیالکوٹی، مولانا محمود احمد میر پوری اور دیگر متعدد حضرات۔ ان میں سے بعض مدینہ یونیورسٹی میں ان کے ساتھ حصول علم کرتے رہے۔فارغ التحصیل ہونے کے بعد ان حضرات نے درس و تدریس اور خطابت و تقریر میں بڑا نام پایا۔ان میں سے بعض حضرات وفات پا چکے ہیں اور بعض اللہ کے فضل سے زندہ ہیں اور مختلف مقامات میں مصروف عمل ہیں۔

ان کے مدینہ یونیورسٹی کے رفقائے درس بھی کثیر تعداد میں تھے جن میں پاکستانی اور ہندوستانی طلباء کے علاوہ عرب اور افریقی ممالک کے طلباء اور متعدد اساتذہ کے فرزندان گرامی شامل تھے۔

۱۹۷۹ء میں انھوں نے مدینہ یونیورسٹی کا نصاب مکمل کیا اور اسی سال جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) میں ان کی تقرری عمل میں آ گئی۔ اس وقت مفتی حافظ ثناء اللہ مدنی جامعہ سلفیہ کے مدیر تعلیم تھے۔پھر انہی کی کوشش اور تجویز سے حافظ مسعود عالم کو مدیر تعلیم بنایا گیا۔تقریباً پانچ سال وہ اس منصب پر فائز رہے۔

۱۹۸۶ء میں وہ بطور استاد جامعہ ابوبکر کراچی تشریف لے گئے۔ ۱۹۹۱ء تک چھے سال وہاں تدریسی خدمات سرانجام دیں۔اس اثناء میں انھوں نے وہاں صحیح بخاری، صحیح مسلم، تفسیر فتح القدیر اور حجۃ اللہ البالغہ جیسی اہم کتابیں پڑھائیں۔

۱۹۹۱ء میں دوبارہ جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) آ گئے۔ یہاں تفسیر جامع البیان، صحیح مسلم، ابو داؤد، بدایۃ المجتہد، اصول شاشی اور دیگر کتابوں کی تدریس ان کے سپرد ہوئی۔

وہ تجربہ کار اور منجھے ہوئے مدرس ہیں۔یہ سطور ۳ فروری ۲۰۱۳ء کو لکھی جا رہی ہیں۔۱۹۷۹ء سے اب تک یعنی ۳۴ سال کے لمبے عرصے میں ان سے بے شمار علماء وطلباء نے تعلیم حاصل کی اور اللہ کے فضل سے کر رہے ہیں۔ان میں سے کس کا نام لیا جائے اور کس کا چھوڑا جائے۔ بہرکیف تلامذہ کی اس طویل فہرست میں چند حضرات کے نام یہ ہیں: ڈاکٹر عبدالقادر، پروفیسر عبدالرزاق ساجد، حافظ منیر احمد اظہر مدرس جامعہ سلفیہ، مولانا

محمد صدیق مدرس جامعہ سلفیہ، قاری حبیب اللہ مدرس جامعہ سلفیہ، حافظ عبدالعظیم اسد ناظم مکتبہ دارالسلام لاہور، مولانا حفیظ الرحمٰن اسلام آباد اور حافظ عبدالرؤف اسلام آباد۔

ان سطور کی تحریر تک جامعہ سلفیہ میں حافظ مسعود عالم موطا امام مالک، حجۃ اللہ البالغہ اور تاریخ التشریع الاسلامی کی تدریس فرما رہے ہیں۔

علاوہ ازیں وہ ایک اور ادارے میں بھی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ فیصل آباد کے ممتاز عالم دین حافظ محمد شریف نے فیصل آباد کی گلستان کالونی میں مرکز التربیۃ الاسلامیہ کے نام سے ایک تدریسی ادارہ قائم کیا ہے، حافظ مسعود عالم اس ادارے میں تفسیر، عقیدہ طحاویہ، الحمویہ، خلاصۃ التفاسیر، اصول تفسیر، الفوز الکبیر، مقدمہ فی اصول التفسیر اور عربی زبان وادب کے اسباق پڑھاتے ہیں۔

اب آیے حافظ مسعود عالم کی خطابت کی طرف۔ وہ بہت اچھے خطیب ہیں اور لہجہ مقررانہ ہے۔ جامعہ ابوبکر کراچی کی تدریس کے زمانے میں کچھ عرصہ انھوں نے جامعہ کی مسجد میں فریضہ خطابت انجام دیا اور کچھ عرصہ مسجد عمر بن عبدالعزیز ڈیفنس میں خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے رہے۔

فیصل آباد کی گلستان کالونی کی جامع مسجد ابوہریرہ میں تقریباً چار سال خطابت کی۔ اپنے شہر شرق پور میں بھی کچھ مدت ان کا سلسلہ خطابت جاری رہا۔ اب کم وبیش پندرہ سال سے جامع مسجد ابوبکر شادمان کالونی (فیصل آباد) میں جمعہ پڑھا رہے ہیں۔

درسی کتابوں کے علاوہ حافظ صاحب کا عام مطالعہ بھی وسیع ہے۔ مطالعہ کتب کی ابتدائی ترغیب ان کو حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی نے دی اور بعض کتابوں کے مطالعہ کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی۔ مولانا عبدالغفار حسن کی علمی مجالس نے بھی انھیں متاثر کیا۔ پھر ان کے والد (مولانا محمد یحییٰ شرق پوری) کے جگری دوست حافظ محمد یحییٰ عزیز میر محمدی کی نصیحتیں بھی ان کے لیے بے حد فائدہ مند ثابت ہوئیں۔ حافظ صاحب مرحوم کو یہ چچا کہا کرتے تھے اور وہ ان پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔

اب حافظ مسعود عالم کی شادی اور اولاد کے متعلق سنیے!

ان کی شادی ۱۹۸۰ء میں حافظ محمد یوسف کی صاحب زادی سے ہوئی جو تقسیم ملک کے بعد چونیاں (ضلع قصور) میں سکونت پذیر ہوئے اور پھر وہاں سے مستقل طور پر فیصل آباد چلے گئے۔ نیک سیرت اور صالح فطرت بزرگ ہیں۔ اہل علم سے محبت کا برتاؤ کرنے والے۔

حافظ مسعود عالم کی اولاد چار بیٹیاں ہیں اور تین بیٹے۔ تین بیٹیوں کی شادی ہو چکی ہے۔

تین بیٹوں میں سے ایک بیٹے اسعد مسعود زرعی یونیورسٹی فیصل آباد سے ایم ایس سی کر رہے ہیں۔

دوسرے بیٹے سعد مسعود ہیں۔ وہ غلام اسحاق خان انسٹیٹیوٹ ٹوپی خیبر پختونخوا سے بی ایس سی کر رہے ہیں اور تیسرے بیٹے سعدون مسعود ہیں۔ وہ بین الاقوامی تعلقات کے موضوع پر قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم اے کر رہے ہیں۔ اس کتاب کی اشاعت تک یہ تینوں ان شاء اللہ تعلیم سے فارغ ہو کر ملازمت کر رہے ہوں گے۔

حافظ مسعود عالم خوش اخلاق اور عالی کردار عالم ہیں۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو: ۲۳ فروری ۲۰۱۲ء کو جامعہ سلفیہ کے مدرس اور جامعہ کے ماہنامہ ترجمان الحدیث کے مدیر حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی کے والد وفات پا گئے۔ اتفاق سے اسی روز شام کو حافظ مسعود عالم کی صاحب زادی کی شادی تھی اور وہ سخت مصروف تھے۔ حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی نے حافظ صاحب کو والد کا جنازہ پڑھانے کے لیے ٹیلی فون کیا تو وہ بے حد مصروفیات کے باوجود ان کے گاؤں پہنچے۔ اپنی مصروفیات کا بالکل تذکرہ نہیں کیا۔ ان سے اظہار تعزیت کیا اور جنازہ پڑھا کر واپس فیصل آباد آ گئے۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ حافظ مسعود عالم اور ان کے اہل و عیال کو ہمیشہ خوش رکھے اور ان کی علمی و اصلاحی خدمات کا سلسلہ جاری رہے۔ آمین یارب العالمین۔

(۳۔ فروری ۲۰۱۳ء)

مولانا عبدالمالک مجاہد

(ولادت نومبر ۱۹۵۵ء)

بہت سال ہوئے، غالباً جون کا مہینا تھا۔ دن کے گیارہ بجے تھے۔ میں شدتِ حدت سے سہما ہوا اندر ایک کونے میں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ خیال گزرا اس تپتے موسم میں مجھ سے ملنے والا کوئی نہیں آسکتا، یوں ہی کسی بچے نے گلی سے گزرتے ہوئے دروازے پر ہاتھ مار دیا ہے۔ دو منٹ گزرے ہوں گے کہ پھر دستک ہوئی۔ میں باہر نکلا تو دیکھا کہ سر پر رومال لیے میرے بے تکلف عزیز دوست قاضی محمد اسلم سیف فیروز پوری (مرحوم) کھڑے ہیں۔ تعجب سے پوچھا: اس وقت آپ کہاں؟

میں نے ان کا ہاتھ پکڑا اور بیٹھک میں بٹھایا۔ انھیں جواب کا موقع دیے بغیر فوراً اندر گیا اور گھر میں سکنجبین بنانے کو کہا۔

بولے جلدی سے میرے ساتھ چلو، باہر سڑک پر عبدالمالک مجاہد کھڑے ہیں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں اور آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں اس وقت نہ عبدالمالک مجاہد صاحب کو جانتا تھا اور نہ ان کے کسی معاملے کا مجھے علم تھا۔ میں نے کہا انھیں سڑک پر کیوں کھڑا کیا، یہیں لے آتے اور بات ہو جاتی۔

جواب دیا: آپ کو ساتھ لے کر کہیں جانے کا پروگرام ہے۔

یہ عبدالمالک مجاہد سے میری پہلی ملاقات تھی۔

نستعلیق نوجوان۔ نہایت احترام سے ملے۔ گفتگو ہوئی تو پتا چلا کہ وہ حضرت قاضی محمد سلیمان منصور پوری کے پوتے قاضی عبدالباقی سے ملنا چاہتے ہیں اور ان کا ارادہ ''رحمۃ للعالمین'' کا انگریزی ترجمہ چھاپنے کا ہے جو قاضی صاحب کے فرزند گرامی قاضی عبدالعزیز منصور پوری نے کیا ہے اور قاضی عبدالباقی نے اس کی ترتیب وتہذیب کے سلسلے میں بہت محنت کی ہے۔

قاضی عبدالباقی اس زمانے میں لاہور کے علاقہ ماڈل ٹاؤن میں رہتے تھے۔ میل ملاقات اور حسنِ گفتار میں اپنے اسلاف کا خوب صورت نمونہ۔ فارسی اور اردو کے شاعر اور انگریزی لٹریچر میں مہارت رکھتے تھے۔ قدسی تخلص کرتے تھے۔ میرے ان سے ۱۹۵۰ء سے مراسم قائم تھے۔ مجھے وہ کسی معاملے میں اپنے گھر بھی بلا

لیتے اور دفتر بھی۔ وہ بھی بسا اوقات میرے غریب خانے پر یا دفتر تشریف لے آتے تھے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے، انھوں نے ۱۴۔ مارچ ۲۰۰۸ء کو دبئی میں اپنے فرزند شاہد فرید قاضی کے ہاں وفات پائی۔

بہرکیف ہم دوپہر کو تقریباً ساڑھے گیارہ بجے قاضی عبدالباقی کے مکان پر پہنچے۔ وہ خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ میں نے عبدالمالک مجاہد اور قاضی محمد اسلم سیف فیروزپوری کا تعارف کرایا۔ مجاہد صاحب نے ان سے اپنے ادارے کے اغراض و مقاصد اور بعض مطبوعات کے متعلق تفصیلات بتائیں اور ''رحمۃ للعالمین'' کا انگریزی ترجمہ شائع کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ تقریباً ایک گھنٹے کی گفتگو کے بعد یہ دونوں حضرات تو تشریف لے آئے، لیکن قاضی صاحب نے مجھے روک لیا۔ میں ساڑھے پانچ بجے تک ان کے پاس رہا۔ میری کوشش اور خواہش تھی کہ ترجمہ ادارہ دارالسلام کی طرف سے شائع کیا جائے۔ جلد ہی پوری دنیا میں اس کی شہرت پھیل جائے گی۔ لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ پھر کچھ عرصے کے بعد انھوں نے خود ہی اسے تین جلدوں میں شائع کردیا۔ ازراہِ نوازش اس کے دو سیٹ مجھے بھی عنایت کیے۔ ایک سیٹ میں نے ادارہ دعوۃ السّلفیہ کی ''مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی لائبریری'' میں جمع کرادیا اور ایک میرے پاس موجود ہے۔

اب جناب عبدالمالک مجاہد کے حالات قدرے تفصیل سے ملاحظہ کیجیے۔

میانہ قد، گداز جسم، مضبوط کاٹھی، گندمی رنگ میں سرخی کی آمیزش، گول چہرہ، کشادہ پیشانی، چوڑا سینہ، ابھری ہوئی ناک۔ آنکھوں پر نظر کی عینک، شلوار قمیص اور واسکٹ پہنے ہوئے۔ سر پر قراقلی ٹوپی۔ نرم مگر فیصلہ کن اندازِ کلام۔ یہ ہیں مولانا عبدالمالک مجاہد جنھوں نے دارالسلام کے نام سے دینی کتابوں کی نشرواشاعت کا بہت بڑا ادارہ قائم کیا ہے۔ اس کا مرکزی دفتر سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض میں ہے اور اس کی شاخیں ایشیا اور یورپ کے متعدد ملکوں میں قائم ہیں۔ لاہور میں اس کا دفتر جو ایک بڑی بلڈنگ میں پھیلا ہوا ہے، پنجاب سول سیکرٹریٹ کے قریب ہے اور اس کے مختلف شعبوں میں سو سے زائد آدمی مصروفِ کار ہیں۔ اس کے جنرل منیجر حافظ عبدالعظیم اسد ہیں۔

عبدالمالک مجاہد کی ولادت کیلیاں والا ضلع گوجراں والا میں نومبر ۱۹۵۵ء کو ہوئی۔ ان کے والد کا نام محمد یونس اور دادا کا غلام مصطفیٰ تھا۔ سیراجٹ برادری سے ان کا تعلق ہے۔ اس خاندان کے زیادہ تر لوگ خطاطی کے پیشے سے منسلک تھے۔ بعض افراد کا مشغلہ طبابت تھا اور کچھ حضرات امامت کراتے تھے۔ ان تین کاموں کے بارے میں ان لوگوں کی طرف یہ لطیفہ نما بات منسوب ہے کہ ہم لوگ امامت اللہ کی رضا کے لیے، طبابت خدمت خلق کے لیے اور کتابت اپنے گھریلو مصارف پورے کرنے کے لیے کرتے ہیں۔

یہ تین بھائی ہیں۔ سب سے بڑے محمد ایوب سیرا۔ ان سے چھوٹے عبدالمالک اور ان سے چھوٹے محمد

طارق شاہد۔ متحدہ کے پنجاب میں حافظ محمد لکھوی کی پنجابی نظم کی کتابیں احوال الآخرت، زینت الاسلام اور انواع محمد وغیرہ عام طور پر گھروں میں پڑھی جاتی تھیں۔ عورتیں، مرد اور بچے یہ کتابیں بڑے شوق سے اونچی آواز میں خوش الحانی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ ان کتابوں میں قرآن وحدیث کے حوالوں سے بے شمار مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ عبدالمالک مجاہد کی والدہ بھی یہ کتابیں پڑھتی اور بچوں کو سنایا کرتی تھیں۔ علاوہ ازیں قرآن مجید کی تلاوت ان کا معمول تھا اور عبدالمالک نے قرآن مجید والدہ ہی سے پڑھا۔

ان کے والد (بقول ان کے) ''درمیانے درجے کے کاتب تھے اور دادا جناب غلام مصطفیٰ اعلیٰ درجے کے خوش نویس تھے۔'' وہ عین جوانی میں مرضِ طاعون سے وفات پا گئے تھے۔ اس وقت ان کے والد محمد یونس صرف چودہ پندرہ روز کے بچے تھے۔ شدید بیماری کے دوران انھوں نے گھر والوں سے کہا: ''مجھے میرا یونس بیٹا تو دکھا دو، میں نے تو اسے اچھی طرح دیکھا بھی نہیں۔'' قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی کتاب ''رحمۃ للعالمین'' کی پہلی یا دوسری اشاعت کی کتابت انھوں نے کی تھی۔

اس وقت دیہات میں بلکہ بعض قصبوں میں بھی بجلی کا کوئی تصور نہ تھا۔ عبدالمالک مجاہد کے والد محمد یونس رات کو لیمپ کی روشنی میں کتابت کرتے تھے۔ لاہور کا کشمیری بازار اس زمانے میں تاجرانِ کتب کا مرکز تھا۔ وہیں کے بعض دکان داران سے کتابت کراتے تھے۔ وہ لاہور آتے، دکان داروں سے کام لے جاتے اور چند روز کے بعد کام مکمل کر کے انھیں دے دیتے اور پہلی اجرت وصول کر کے مزید کام لے جاتے۔ یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ کیلانی کاتبوں کی اس زمانے کے کاتبوں اور تاجرانِ کتب میں بڑی شہرت تھی۔

عبدالمالک مجاہد کے عہدِ طفولیت میں کیلیاں والا میں اہل حدیث کی ایک ہی مسجد تھی جس کے امام وخطیب ان کے عم محترم مولانا محمد ادریس کیلانی تھے۔ یہ پنجابی میں تقریر کرتے تھے اور زبان میں بڑا اثر تھا۔ فجر کی نماز کے بعد بہت سے بچے بلکہ نوجوان بھی ان سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ وہ مولانا محمد اسماعیل سلفی اور مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے شاگرد تھے۔ خطِ نسخ اور خطِ نستعلیق میں مہارت رکھتے تھے۔ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کی شرح نسائی کی جو ''التعلیقات السلفیہ'' کے نام سے شائع ہوئی، کتابت انھی مولانا محمد ادریس نے کی تھی۔ ہفت روزہ ''الاعتصام'' جب گوجراں والا سے شائع ہوتا تھا، کچھ عرصہ یہ اس کی کتابت بھی کرتے رہے۔ میرے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ میری ایک کتاب ''برصغیر میں علم فقہ'' کی کتابت بھی انھوں نے کی تھی۔ اس سلسلے میں میں ان کے گاؤں گیا تھا اور ایک دن اور ایک رات وہاں رہا تھا۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ 1973ء میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے چھپی۔ اب ''کتاب سرائے اردو بازار لاہور'' نے بہت خوب صورت انداز میں شائع کی ہے۔ مولانا محمد ادریس کیلانی خوش نویس تو تھے ہی اس کے ساتھ ہی

خوش مزاج عالم دین بھی تھے۔ پچاس سال سے زائد عرصے تک اپنے گاؤں کی مسجد میں تبلیغ دین کا فریضہ ادا کرتے رہے۔ ان کے فرزندانِ گرامی بھی نیک اطوار اور ملنسار ہیں۔ ایک بیٹے کا نام پروفیسر محمد اقبال کیلانی ہے، انھوں نے کیمسٹری میں ایم ایس سی کیا۔ وہ طویل عرصے سے ریاض (سعودی عرب) کی ایک یونیورسٹی جامعۃ الملک سعود میں ہیں۔ وہ تیس بتیس علمی کتابوں کے مصنف ہیں اور ریاض میں سکونت پذیر ہیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ مولانا محمد ادریس کیلانی کی مغفرت فرمائے اور ان کی آل اولاد کو اپنے دین کی خدمت کے زیادہ سے زیادہ مواقع عطا فرمائے۔

عبدالمالک مجاہد نے اپنے اس چچا مولانا محمد ادریس کیلانی سے بہت کچھ سیکھا۔ ان کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیا اور ان سے صحاح کی کتاب ابن ماجہ سبقاً سبقاً پڑھی۔ اس زمانے میں استاد اپنے شاگردوں پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔ عبدالمالک ان کے شاگرد ہی نہیں برادری میں بھتیجے بھی لگتے تھے۔ عبدالمالک کہتے ہیں: ''میں ان کا سب سے چہیتا شاگرد تھا۔'' اس زمانے میں یہ سرِشام ہی رات کا کھانا کھا کر مولانا محمد ادریس کے گھر چلے جاتے۔ مغرب اور عشاء کے درمیان وہ آرام کر رہے ہوتے۔ یہ ان کے پاؤں دباتے، اور ان سے سوالات کرتے۔ وہ ہر سوال کا شافی جواب دیتے۔ اس طرح مولانا محمد ادریس کیلانی رحمہ اللہ سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا۔ انھیں سوال کرنے کی عادت تھی۔ جو چیز معلوم نہ ہوتی بلا جھجک اپنے بزرگوں سے پوچھتے اور اپنے علم میں اضافہ کرتے۔

اب آتے ہیں عبدالمالک مجاہد کے سکول میں داخلے اور ابتدائی تعلیم کی طرف!

کیلیاں والا کا پرائمری سکول ان کے مکان کی پچھلی جانب مغرب کی طرف واقع ہے۔ یہ چھت پر کھڑے ہو کر سکول کی طرف دیکھتے اور بچوں کو اونچی آواز میں الف۔ ب۔ ت۔ ث پڑھتے ہوئے دیکھ کر ان کا بھی ان کے ساتھ پڑھنے کو جی چاہتا۔ اس طرح ان سے سنتے سنتے حروف تہجی انھیں حفظ ہو گئے۔ ذہن تیز تھا اور پڑھنے کا شوق تھا، گنتی بھی انھیں یاد ہو گئی تھی۔ ایک دن ان کے والدان کو سکول میں داخل کرانے کے لیے گئے تو ہیڈ ماسٹر عطا محمد نے کہا یہ ابھی بہت چھوٹا ہے، کچھ بڑا ہو جائے تو داخل کر لیا جائے گا۔ لیکن جب والد کے کہنے پر انھوں نے ان کا ٹیسٹ لیا تو یہ کامیاب رہے اور انھیں سکول میں داخل کر لیا گیا۔ چند ہفتوں کے بعد والد نے ماسٹر صاحب سے ان کی پڑھائی کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے جواب دیا: ''اگر یہ بچہ پڑھتا رہا تو اپنے خاندان کا نام روشن کرے گا۔''

عبدالمالک مجاہد کی خوش نصیبی یہ تھی کہ سکول کے اساتذہ بھی محنت کرتے اور ذمے داری سے پڑھاتے تھے اور گھر میں بھی یہ کھیل کود میں زیادہ وقت صرف کرنے کے بجائے پڑھنے میں توجہ دیتے تھے۔ والدہ

پڑھاتی رہتی تھیں۔ والد کاتب تھے اور انھیں تختی پر لکھنے کی مشق کراتے تھے، اس لیے ان کا خط (ہینڈ رائٹنگ) دوسرے لڑکوں کی نسبت بہتر تھا۔انھوں نے اس سکول میں تیسری جماعت تک تعلیم حاصل کی اور اپنے ہم جماعت لڑکوں سے امتیازی نمبروں میں کامیاب ہوئے۔

اب عبدالمالک مجاہد کے والد اپنے مسکن کیلیاں والا کی سکونت ترک کرکے حافظ آباد کا قصد کرتے ہیں۔ انھوں نے کسی زمانے میں حافظ آباد کے محلّہ بہاول پورہ میں دس مرلے کا پلاٹ خریدا تھا۔۱۹۶۴ء میں وہاں جانے اور مکان بنانے کا ارادہ کیا، چنانچہ بیل گاڑی پر سامان لدوایا اور حافظ آباد جا پہنچے۔ وہاں مکان تعمیر کرایا اور اس میں رہائش اختیار کرلی۔ کھلا مکان تھا اور یہ لوگ وہاں خوش تھے۔ وہاں کے ایک سکول میں عبدالمالک نے چوتھی جماعت میں داخلہ لیا۔لیکن ان کے والد کا وہاں جی نہیں لگا۔ اسی دوران ۱۹۶۵ء میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جنگ شروع ہوگئی اور یہ لوگ دوبارہ اپنے گاؤں کیلیاں والا آگئے۔ جنگ کی وجہ سے لوگوں کے کاربار بند ہوگئے تھے۔ ان کے والد کا سلسلہ کتابت بھی ماند پڑگیا۔ چوتھی جماعت کا امتحان عبدالمالک نے حافظ آباد میں اور پانچویں کا کیلیاں والا میں دیا۔اچھی پوزیشن میں پرائمری میں کامیابی حاصل کی۔

چند ماہ کے بعد حالات نے پلٹا کھایا تو یہ لوگ پھر حافظ آباد چلے گئے اور وہاں یہ ایم بی ہائی سکول نمبر ایک میں چھٹی جماعت میں داخل ہوگئے۔ ان کے بڑے بھائی محمد ایوب بھی اسی سکول میں ساتویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ اس زمانے میں سکول کی ماہانہ فیس چار آنے تھی لیکن اگر دو بھائی زیر تعلیم ہوتے تو دوسرے بھائی کی آدھی فیس معاف ہوجاتی تھی۔ اس طرح محمد ایوب کی فیس چار آنے تھی اور عبدالمالک کی دو آنے۔ اس سکول میں بھی یہ تعلیم کے سلسلے میں دوسرے طلباء کی نسبت اللہ کی مہربانی سے نمایاں رہے۔

سکول میں ان کے ہم جماعت طلبا کی اکثریت بریلوی طلبا کی تھی، اہل حدیث کی تعداد بہت کم تھی۔ نور بشر، حاضر ناظر اور علم غیب وغیرہ مسائل سے متعلق بحثیں جاری رہتی تھیں۔ عبدالمالک کو اس قسم کے مسائل سے دلچسپی تھی اور اپنے والد سے انھوں نے سوال وجواب کی صورت میں بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ نیز یہ والد سے قرآن مجید کا ترجمہ بھی باقاعدہ پڑھتے تھے۔ روزانہ صبح کے وقت قرآن کی تلاوت ان کا معمول تھا۔مختلف موضوع کی کتابیں بھی پڑھتے رہتے تھے۔ پھر گفتگو کا ڈھنگ بھی آتا تھا۔ اس لیے بحث ومباحثے میں ان کا پلہ بھاری رہتا۔ والد محترم کو ان سے بہت پیار تھا۔ وہ ان کو اپنے پاس بٹھائے رکھتے۔ والد تاریخ سے خاصی دلچسپی رکھتے تھے اور بے شمار تاریخی واقعات انھیں ازبر تھے۔ وہ یہ واقعات عبدالمالک کو سناتے۔ وہ پکے اہل حدیث تھے، اس لیے وہ عقیدہ توحید کو عبدالمالک کے دل ودماغ میں راسخ کرتے رہے۔ حافظ آباد میں یا اس کے

گردو نواح میں کوئی جلسہ ہوتا تو ان کے والد خود بھی بالالتزام جلسہ سننے جاتے اور اپنے بیٹوں کو بھی ہمراہ رکھتے۔ اس زمانے میں مولانا محمد یحییٰ حافظ آباد کے سرکاری پڑاؤ والی مسجد کے خطیب تھے۔ بچپن کا دور انہی کی اقتدا میں جمعہ پڑھنے میں گزرا۔ مولانا محمد یحییٰ حافظ آبادی پنجابی زبان کے خطیب تھے۔ اصلاح معاشرہ پر بالخصوص بہت اچھی تقریر کرتے تھے۔ عبدالمالک کے گھرانے نے ان سے کافی کچھ سیکھا۔ عبدالمالک کو کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ والد نے بھی رہنمائی اور بہتر تربیت کی۔ وہ لاہور جاتے تو مختلف مصنفین کی کتابیں ناشرین سے رعایتاً لے آتے، جنھیں خود بھی پڑھتے اور عبدالمالک بھی اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ ان کا مطالعہ کرتے۔ والد کی تمنا تھی کہ ان کا یہ بیٹا علم میں ترقی کرے، انھیں اپنے بیٹے سے بہت سی توقعات تھیں۔ ١٩٧٠ء میں میٹرک پاس کیا تو حافظ آباد کے اہل حدیث مدرسہ دارالحدیث محمدیہ میں داخلہ لیا۔ یہ مدرسہ مسجد مبارک میں قائم تھا۔ ان کے اساتذہ کی فہرست میں حافظ محمد اسماعیل اسد، مولانا محمد رفیق اور دیگر حضرات شامل تھے۔

دارالحدیث محمدیہ کے اساتذہ ان پر شفقت فرماتے تھے۔ یہ بھی اساتذہ کی خدمت کے لیے کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے۔ ان کے کپڑے دھوتے، ان کے جوتے صاف کرتے، ان کے پاؤں دباتے۔ اس وقت یہ دارالحدیث محمدیہ کے واحد طالب علم تھے جو میٹرک پاس تھے۔ انھوں نے وہاں دیگر طالب علموں کی بہ نسبت اساتذہ کرام سے بہت کچھ حاصل کیا۔ حدیث کے سبق میں اہم مسائل پیش آتے تو یہ نہایت ادب کے ساتھ اساتذہ سے ان مسائل کو پوری طرح سمجھنے کے لیے سوال کرتے اور اساتذہ ان کے سوالوں سے خوش ہوتے اور تسلی بخش جواب دیتے۔ سبق کے اوقات کے علاوہ بھی بعض دفعہ یہ اساتذہ کی خدمت میں جاتے اور ان سے کوئی نہ کوئی علمی نکتہ سمجھنے کی کوشش کرتے۔

مسجد مبارک، جس میں دارالحدیث محمدیہ قائم تھا، حافظ آباد کی خاصی بڑی مسجد تھی۔ اس کے منصب خطابت پر مولانا حکیم محمد ابراہیم فائز تھے جو اس شہر اور علاقے کے ممتاز خطیب اور مشہور عالم تھے۔ روزانہ فجر کی نماز کے بعد وہ قرآن مجید کا درس دیا کرتے اور عبدالمالک اس درس میں بالالتزام حاضر ہوتے اور مولانا کے قریب بیٹھ کر ان کے ارشادات سنتے۔ ان کے اسلوب خطابت، اندازِ تدریس اور طریق درس قرآن سے ان کو بہت فائدہ پہنچا اور بہت سے علمی نکات سے ان کا ذہن آشنا ہوا۔

حافظ آباد کے دوران طالب علمی میں ان کا رابطہ اسلامی جمعیت طلبہ سے بھی ہوا۔ یہ اس کے دائرۂ رکنیت میں تو شامل نہیں ہوئے، البتہ کچھ عرصہ ان طلباء کی رفاقت میں گزارا۔ ان کو تقریر کرنے کا شوق تھا۔ یہ جمعیت کے اجتماع میں تقریر کرتے اور اپنے شوق کی منزل کو پہنچ جاتے۔ ہر جمعے کو جمعیت کا اجلاس ہوتا تھا، جس میں

درس قرآن کا التزام کیا جاتا تھا،عبدالمالک اس اجلاس میں درس دیتے تھے۔علاوہ ازیں مسائل حاضرہ پر بحث ہوتی، جس میں عبدالمالک حصہ لیتے اور تقریر کے انداز میں گفتگو کرتے۔شہر میں کوئی مذہبی یا سیاسی جلسہ منعقد ہوتا تو اس میں بھی شرکت کرتے اور مقررین کی تقریریں غور سے سنتے۔

حافظ آباد سے چار پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر دوآبہ رائس ملز بنی تو عبدالمالک نے وہاں ملازمت کر لی اور جو کام ان کے سپرد ہوا، اسے محنت سے انجام دیا، جس سے رائس ملز کے مالک اور افسر بہت متاثر ہوئے اور وہاں ایک محنتی کارکن کی حیثیت سے ان کی شہرت ہوئی۔ ان کی کوشش سے دوآبہ رائس ملز ورکرز یونین قائم ہوئی، جس کے یہ پہلے چیف آرگنائزر اور جنرل سیکرٹری تھے۔

انھی دنوں حافظ آباد میں جمعیت شبان اہل حدیث کو ازسرنو منظم کیا گیا، جس کے یہ ناظم اعلیٰ منتخب ہوئے، صدر کوئی اور صاحب تھے اور نائب صدر تھے میاں فضل حق مرحوم کے بھتیجے چودھری محمد عارف۔

دوآبہ رائس ملز کے قریب ایک گاؤں ''چک چٹھہ'' ہے۔ وہاں عبدالمالک احناف کی مسجد میں جاتے۔ اس مسجد کے خطیب عربی میں خطبہ پڑھتے اور جمعے کے بعد عبدالمالک اردو میں تقریر کرتے۔

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، عبدالمالک کا خاندانی پیشہ خطاطی ہے۔ انھوں نے بھی خطاطی کا فن سیکھا۔ عربی زبان سے انھیں خاص تعلق ہے، اس لیے یہ عربی زبان میں خطاطی کرتے رہے۔ صحیح بخاری کے کچھ حصے کی کتابت کی۔ قرآن مجید کی کتابت سیکھنے کی سعادت سے بھی بہرہ ور ہوئے۔

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی مرحوم جو لاہور کے علاقہ وسن پورہ میں سکونت پذیر تھے اور بہت سی کتابوں کے مصنف اور قرآن مجید کے مترجم ومفسر تھے، وہ رشتے میں ان کے چچا تھے۔ وہ اپنے دور کے معروف خطاط بھی تھے۔ انھوں نے قرآن مجید کی کتابت بھی کی۔ ان سے ان کا رابطہ رہتا تھا۔ وہ ان سے شفقت کا برتاؤ کرتے تھے، ان سے بھی انھوں نے استفادہ کیا۔

ہائی سکول کی تعلیم کے زمانے میں بعض طلبا نے اپنے نام کے ساتھ تخلص کا لاحقہ کیا۔ کسی نے حزین، کسی نے ندیم، کسی نے نسیم تخلص اختیار کر لیا۔ عبدالمالک نے اپنے لیے ''مجاہد'' تخلص پسند کیا، چنانچہ انھیں عبدالمالک مجاہد کہا جانے لگا، لیکن ان کے کسی تعلیمی سرٹیفکیٹ میں یہ تخلص درج نہیں ہے، صرف عبدالمالک لکھا ہے۔

مجاہد صاحب کو اوائل عمر ہی سے مشاہیر سے ملنے اور ان کی باتیں سننے کا اشتیاق تھا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن کی کتابت ان کے تایا محمد یوسف کیلانی نے کی تھی۔ مجاہد صاحب اس تعلق کی بنا پر مولانا سے ملاقات کے لیے ایک روز دس بجے کے قریب ان کے مکان پر اچھرے پہنچے لیکن ان کے ملازم نے کہا کہ مولانا سخت مصروف ہیں، اس وقت ان سے ملاقات نہیں ہوسکتی، عصر کے بعد آئیں اور ملاقات کریں۔

انھوں نے کہا میں بہت دور سے سفر کر کے محض مولانا سے ملاقات کے لیے حاضر ہوا ہوں، دوبارہ میرا یہاں آنا مشکل ہے، لیکن وہ نہیں مانا۔ اتنے میں اچانک بجلی بند ہوگئی اور مولانا باہر تشریف لے آئے۔ عبدالمالک نے آگے بڑھ کر مولانا کو سلام کیا اور کہا میں کیلیاں والا سے آیا ہوں اور محمد یوسف کیلانی کا بھتیجا ہوں۔ مولانا یہ سن کر خوش ہوئے اور انھیں لائبریری میں لے گئے۔ خاصی دیر ان سے باتیں ہوئیں۔

ایک مرتبہ اپنے والد کے ساتھ اندروں موچی دروازہ مکتبہ تعمیر انسانیت میں شیخ قمرالدین مرحوم کی خدمت میں جانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ انھوں نے پوچھا: برخوردار قرآن مجید پڑھتے ہو؟ انھوں نے اثبات میں جواب دیا تو شیخ صاحب مرحوم نے جیبی سائز کی چند چھوٹی چھوٹی سورتیں عنایت کیں جو کاغذ اور طباعت کے اعتبار سے بڑی خوب صورت تھیں۔

اب عبدالمالک مجاہد کی زندگی کا دھارا بدلتا ہے اور حالات ایسی کروٹ لیتے ہیں کہ یہ ۲۹۔ مارچ ۱۹۸۰ء کو سعودی عرب پہنچ جاتے ہیں۔ اس وقت ان کی عمر 24 برس سے کچھ اوپر تھی۔ پاکستان میں ویزا شہزاد ایجنسی کی معرفت خریدا گیا تھا اور اس سلسلے میں ان کے چچا مولانا عبدالرحمٰن کیلانی اور ان کے صاحب زادے نجیب الرحمٰن کیلانی نے ان سے بہت تعاون کیا تھا۔ انھوں نے پہلی دفعہ ہوائی جہاز کا سفر کیا تھا۔ یہ سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض گئے۔

ان کا خاندانی کام خطاطی تھا۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا، اس کام سے یہ بھی واقفیت رکھتے تھے۔ کچھ دن تکلیف میں گزرے۔ پھر اللہ نے تکلیف رفع کر دی اور انھیں کام مل گیا۔ مہینا گزرا تو پہلی تنخواہ ایک ہزار ریال ملی اور ساتھ ہی سیٹھ نے کہا: ''تمھاری قیمت اور کارکردگی تو ایک ہزار سے کم ہے مگر میں تمھیں ایک ہزار دے رہا ہوں۔'' انھوں نے شکریہ ادا کیا اور یہ ہزار ریال ہدیے کی طرح چومتے ہوئے گھر بھیج دیے۔

تین مہینے انھوں نے یہ ملازمت کی۔ اس اثنا میں ان کا اقامہ بن چکا تھا۔ سیٹھ نے ان سے کہا: ہماری طرف سے تم آزاد ہو، جہاں جی چاہے ملازمت کرو۔ لیکن تمھیں ہماری رہائش چھوڑنا ہوگی۔

یہ وہاں سے نکلے اور کوشش کر کے مروہ ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں ملازمت کر لی۔ وہاں تنخواہ چودہ سو ریال تھی۔ کسی نہ کسی طرح رہائش کا انتظام بھی ہو گیا۔ جس شخص کے ساتھ رہائش ملی، وہ راولپنڈی کے رہنے والے تھے۔ چند روز ان کی طرف سے کچھ مشکلات پیش آئیں۔ پھر عزت واحترام کا برتاؤ کرنے لگے۔ پانچ ماہ انھوں نے اس کمپنی میں کام کیا۔

اب ان کی قسمت کا ستارہ مزید چمکنے لگا اور کسی ذریعے سے وزارت تعلیم میں ملازمت کے آثار پیدا ہوگئے۔ اس محکمے میں لڑکیوں کے سرٹیفکیٹ لکھنے کے لیے خطاط کی ضرورت تھی۔ وہاں ایک محمود نامی مصری

خطاط تھا جوان سے بڑی شفقت سے پیش آیا اور کہا میں ملازمت کے لیے تمھاری پوری مدد کروں گا۔ وہاں ہر روز انٹرویو ہوتا تھا اور ان کی فائل آگے بڑھتی جاتی اور امید کی کرن روشن ہوتی جاتی تھی۔

ایک دن دفتر کے سعودی مدیر نے ان سے کہا: تم پاکستانی ہو، تمھیں عربی پڑھنا نہیں آتی ہوگی۔ تم کیسے کام کرو گے؟ انھوں نے نہایت اعتماد کے ساتھ جواب دیا اور کہا جناب مجھے عربی آتی ہے۔ میں نے پاکستان میں عربی زبان پڑھی ہے۔ آپ جو مسودہ چاہیں مجھ سے پڑھوالیں۔ مدیر نے ایک مسودے کی کاپی انھیں دی اور کہا اسے پڑھ کر سناؤ۔

وہاں کئی لوگ بیٹھے تھے۔ انھوں نے مسودہ پکڑا اور بہ آواز بلند تیزی سے پڑھنا شروع کر دیا۔ صحیح یا غلط جس طرح عربی پڑھ سکتے تھے، پڑھتے چلے گئے۔ پہلا صفحہ ختم کر کے داد طلب نگاہوں سے مدیر کی طرف دیکھا۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر اچانک مدیر کا قہقہہ بلند ہوا۔ کمرے میں بیٹھے لوگ بھی محظوظ ہوئے۔

مدیر نے ان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا: تم نے مسودہ پڑھنے میں متعدد غلطیاں کی ہیں، مگر تم تیز آدمی ہو، ہمیں یقین ہے جلد ہی غلطیوں پر قابو پالو گے اور صحیح راہ پر آجاؤ گے۔ دفتر میں بیٹھے ہوئے دیگر لوگوں نے بھی مسکراتے ہوئے مدیر کی تائید کی اور ان کی نوکری پکی ہوگئی۔ مگر ابھی ان کو سعودی عرب آئے محض آٹھ نو ماہ ہوئے تھے، اس لیے وہ کہنے لگے کہ جب آپ کو سعودی عرب آئے ہوئے ایک سال ہو جائے تو پھر آجانا تمھیں نوکری مل جائے گی۔

مصری خطاط محمود ان کی ملازمت پر بہت خوش تھا۔ مگر قانونی رکاوٹ پیش آئی تو کہنے لگا عسى أن تكرهوا شيأ فهو خير الكم۔ چند روز کے بعد فون آگیا کہ تم وزارت تعلیم کے ادارہ تعلیم البنات میں چلے جاؤ، تمھیں وہ کنٹریکٹ پر کام دے دیں گے۔ وزارتِ تعلیم کے اس دفتر میں ۲۵۰۰ سے زائد سرٹیفکیٹ لکھنا تھے۔ یہ چھپے ہوئے سرٹیفکیٹ تھے جن میں نام، ولدیت، عمر، سکول کا کام اور دیگر معلومات لکھنا تھیں۔ معاوضہ تین ریال فی سرٹیفکیٹ مقرر ہوا۔ عبدالمالک نے یہ سارا کام محض پینتیس دن میں مکمل کر لیا اور کم وبیش آٹھ ہزار ریال کما لیے۔ گھر کے جتنے قرضے تھے اتر گئے۔ موٹر سائیکل خرید لی اور اگلے مرحلے کی طرف چل پڑے۔ اس دوران وزارتِ تعلیم کے عہدے داران کے کام سے بڑے متاثر ہوئے بلکہ دوست بن گئے۔ عربی زبان بولنے کی استعداد بھی خاصی بڑھ گئی۔

کام کے دوران یہ روزانہ یا دوسرے دن گھر خط لکھتے اور والدین کو اپنے معمولات سے آگاہ کرتے۔ والد صاحب بھی بذریعہ خط گھریلو حالات کی اطلاع دیتے رہتے تھے۔ بہر کیف اللہ نے ان پر انتہائی کرم فرمایا، جو کام کیا اور جہاں کیا ہمت اور محنت سے کیا، جس میں دیانت داری کا عنصر ہمیشہ موجود رہا اور اللہ نے اس کا

بہتر بدلہ دیا اور آگے بڑھنے کی راہیں کھلتی گئیں۔ کوئی آئی بھی تو جلد ہی رفع ہوگئی اور بعد عسر یسراً کا معاملہ رہا۔
وزارتِ تعلیم کا کام ختم ہوا، پیسے ملے تو شکرانے کا عمرہ کرنے مکہ اور پھر وہاں سے مدینہ گئے۔ مدینہ سے واپسی پر ہوائی جہاز میں المدینہ اخبار ملا تو اس میں اشتہار تھا کہ ہمیں عربی خطاط کی ضرورت ہے۔ یہ ایئرپورٹ سے سیدھے اس دفتر جا پہنچے۔ انٹرویو دیا اور نوکری مل گئی۔ تنخواہ کم وبیش تین ہزار ریال ہوگئی۔ نقشوں کے اوپر ہاتھ سے غرفۃ، صالۃ، مطبخ، غرفۃ نوم، غرفۃ اطفال وغیرہ لکھنا ہوتا تھا، جس کے لیے ایسے خطاط کی ضرورت تھی جو ان الفاظ کو خوب صورتی کے ساتھ لکھ سکے۔

وہ لوگ ان کے کام، گفتگو، محنت، ذمے داری، وقت پر حاضری، ایفائے عہد اور طریق کار وغیرہ سے خوش تھے۔ اصل بات بھی یہی ہے جو شخص وعدہ پورا نہیں کرتا اور ہر شخص کو باتوں کے جال میں پھنسانے اور ٹرخانے کی کوشش کرتا ہے، اس کا سلسلۂ کار زیادہ دیر نہیں چل سکتا، وہ بدنامی کی زد میں آجاتا ہے۔

اسی دفتر کی معرفت انھوں نے وزارت الدفاع والطیر ان میں بھی گیارہ سال کام کیا اور بڑی شان سے کیا۔ ان کے اب شہزادہ فیصل بن محمد بن سعود الکبیر سے تعلقات پیدا ہوگئے تھے اور یہ تعلقات اتنے بڑھے کہ شہزادے کو ان کے والد مکرم کی وفات کا پتا چلا تو ان کے پاس تعزیت کے لیے آئے۔ انھیں تسلی دی۔ اپنے بعض عزیز واقارب کی وفات کے متعلق بتایا۔ پھر ان کو اپنے خرچ سے پاکستان بھیجنے کا انتظام کیا۔
پہلے مدیر جوازات (ڈائریکٹر پاسپورٹ آفس) کو ٹیلی فون کیا کہ عبدالمالک میرا خاص مہمان ہے، اس کا فوراً دخول خروج لگائیے۔ پھر اپنے لیٹر پیڈ پر ان کے نام خط لکھ کر دیا کہ حاملِ رقعہ وہ شخص ہے جس کے بارے میں تھوڑی دیر پہلے میں نے آپ سے ٹیلی فون پر بات کی تھی۔ اس کا کام فوراً ہونا چاہیے۔ چنانچہ ان کے پاکستان پہنچنے کا انتظام ہوگیا، لیکن یہ والد کے جنازے میں شامل نہ ہوسکے۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ۔

اب آیے عبدالمالک مجاہد کے قیام دارالسلام کی طرف!

وزارت الدفاع والطیر ان میں ان کی ملازمت کا سلسلہ بہت اچھی طرح چل رہا تھا۔ وزارت الدفاع والے ہر سال حج کے لیے جاتے تو ان کو بطور مترجم ساتھ لے جاتے۔ اس دوران انھوں نے انگلش زبان پر بھی خاصا عبور حاصل کرلیا تھا۔ بوقت ضرورت یہ اردو اور انگلش کے ترجمان کا فریضہ بھی سرانجام دیتے۔ ادارے میں بڑی عزت تھی، کتنے ہی جرنیلوں اور افسروں سے ذاتی تعلقات قائم ہوگئے تھے۔ اس وقت وہ دن رات محنت کرکے مہینے میں کم وبیش دس ہزار ریال کما لیتے تھے۔ یہ معقول آمدنی تھی، جس سے وہ مطمئن تھے۔ لیکن کچھ مدت سے ایک منصوبہ ان کے ذہن میں گردش کررہا تھا، وہ تھا وسیع پیمانے پر قرآن وحدیث اور

ان سے متعلقہ کتابوں کی طباعت واشاعت کا۔! وزارۃ الدفاع کی نوکری کے دوران پرنٹنگ پریس اور اس کے متعلقہ معاملات میں رسائی حاصل کر لی۔نشرواشاعت کی باریکیاں بھی اس دوران سیکھ لیں۔اپنے دفتر میں یہ سارے امورانجام دیتے۔شہزادے کا ان پر بھرپور اعتماد تھا۔یوں بھی خوش اخلاقی کی وجہ سے لوگ عزت اور محبت سے پیش آتے تھے۔

اس منصوبے کی تکمیل کے لیے جو انھوں نے سوچا تھا، اچھے خاصے سرمایہ کی ضرورت بھی تھی اور بہت سے ضروری سامان کی بھی۔اس باب میں انھوں نے اپنے دوستوں اور قریبی عزیزوں اور دیگر حضرات سے مشورہ کیا۔پھر یہ ہوا کہ اللہ پر توکل کر کے کام کا آغاز کر دیا گیا اور اس کا مرکز اسی شہر ریاض کو بنایا گیا جس میں یہ لوگ سکونت پذیر تھے۔یہاں مختلف افکاروخیالات کے بے شمار لوگوں سے ان کے ذاتی مراسم قائم ہو گئے تھے۔نیز وہاں کے تعلیمی اداروں اور کالجوں، یونیورسٹیوں کے معلمین اور اصحابِ مناصب سے بھی ان کا میل جول تھا، پھر یہ شہر سعودی عرب کا دارالحکومت تھا اور یہاں ہر ملک کے لوگ موجود تھے، جن سے بہ آسانی رابطہ ہوسکتا تھا۔مطلب یہ کہ اس منصوبے کی تکمیل اور ترقی کے لیے ہر قسم کی سہولتیں یہاں موجود تھیں۔

پھر یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے ان کے منصوبے کے مطابق ۱۹۹۰ء میں یہ عظیم الشان کام شروع ہو گیا۔قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ شائع کیا گیا۔البانی ترجمہ معرض اشاعت میں آیا، چینی ترجمہ بھی چھپا۔اردو زبان میں تفسیر احسن البیان کی اشاعت کا مرحلہ طے ہوا۔یہ تفسیر ہمارے دوست حافظ صلاح الدین یوسف کی علمی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔اس میں اردو ترجمہ حضرت مولانا محمد جونا گڑھی دہلوی مرحوم ومغفور کا لگا گیا ہے۔مولانا جونا گڑھی اردو کے ممتاز مصنف ومترجم تھے۔تفسیر احسن البیان لاکھوں کی تعداد میں چھپی اور لاتعداد لوگوں کے مطالعہ میں آئی اور مسلسل آرہی ہے۔حج بیت اللہ کا فریضہ ادا کرنے والے ہر ہندوستانی اور پاکستانی حاجی کو واپسی پر یہ تفسیر عطا کی جاتی ہے۔دارالسلام نے اب تک ۲۴ زبانوں میں قرآن کریم کے تراجم اور دنیا کی مختلف زبانوں میں ۱۵۰۰ سے زائد کتب شائع کی ہیں۔

نشرواشاعت کا کام کوئی آسان کام نہیں ہے، اس کے لیے بے حد سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے۔اس مقصد کے لیے سعودی عرب کے ممتاز عالم دین اور محسن اہل حدیث شیخ عبداللہ بن محمد المتعاز کو اپنا حصہ دار بنایا۔شیخ سلیمان الفیز بھی حصہ دار بن گئے۔پھر ڈاکٹر محمد محسن خان بھی شریک ہو گئے۔ان لوگوں نے سرمایہ فراہم کیا۔خود ان کا اپنا بھی کچھ پس انداز تھا۔شروع شروع میں خاصی مشکلات آئیں، ملازم زیادہ نہ تھے، سارا کام خود کرتے رہے۔بعض اوقات کتابوں کے کارٹن بھی اٹھائے۔کوئی خاص مہمان آجاتا تو چائے بھی بناتے۔اس زمانے میں اپنے دل کو سمجھانے کے لیے اور دیگر لوگوں کو اطمینان دلانے کے لیے اکثر کہا کرتے

تھے کہ ”جس طرح مجھے کل کے سورج طلوع ہونے پر یقین ہے اسی طرح مجھے اللہ کے فضل وکرم سے دارالسلام کی کامیابی پر یقین ہے۔“ والدہ محترمہ ریاض میں ان کے پاس رہتی تھیں۔ وہ اپنے بیٹے کے کام اور ان کی اہلیہ اپنے شوہر کی سرگرمیوں سے بے حد خوش تھیں۔ ہر وقت بیٹے اور بہو کو دعائیں دیتی تھیں۔ بہو ان کی حقیقی بھانجی تھیں۔ ایک دن بہو سے خوش ہو کر دعا دی، شالا سات بیٹوں کا منہ دیکھو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے واقعی سات بیٹے عطا فرمائے جن میں سے ایک بیٹا عبیداللہ پیدائش کے بعد جلد ہی وفات پا گیا۔

ادارہ دارالسلام (ریاض) کی طرف سے صحیح بخاری کا انگریزی ترجمہ چھپا، اور بھی متعدد اہم ترین کتابوں کی اشاعت ہوئی اور اللہ کی مہربانی سے ہو رہی ہے۔ اس ادارے میں مختلف ملکوں کے بہت سے لوگ کام کر رہے ہیں۔ کچھ لوگ کمپیوٹر پر مصروف کار ہیں، کچھ پریس میں طباعت کے شعبے میں اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں، علمائے کرام ترجمہ وتصنیف میں لگے ہوئے ہیں اور کتنے ہی لوگ دفتری امور کی انجام دہی میں مشغول ہیں۔ کام کے متعدد شعبے ہیں اور ہر شعبے میں سلسلۂ کار جاری ہے۔

یہی حال لاہور کے دارالسلام کا ہے۔ یہاں ۴۔ مئی ۱۹۹۴ء کو کام کا آغاز ہوا اور اس کی نظامت حافظ عبدالعظیم اسد کے سپرد ہوئی جو عبدالمالک مجاہد صاحب کے قریبی عزیز ہیں۔ علم کی دولت بھی اللہ نے عطا فرمائی ہے اور عمل کی نعمت بھی ان کے حصے میں آئی ہے۔ یہاں بھی کئی شعبے ہیں، مثلاً تصنیف وترجمہ، خطاطی، ڈیزائننگ، پروف ریڈنگ، کمپوزنگ، پریس، طباعت، بائینڈنگ وغیرہ۔ کتابوں کی فروخت کا ایک مستقل شعبہ ہے، جس میں کئی لوگ کام کرتے ہیں۔ انگریزی کا ایک مستقل شعبہ ہے، جس کی زمام کار پروفیسر محمد یحییٰ صاحب کے سپرد ہے۔ پروفیسر صاحب ممدوح حضرت مولانا سلطان محمود جلال پوری مرحوم کے فرزند گرامی ہیں۔ اس طرح مختلف شعبوں میں لوگ کام کر رہے ہیں اور پورا نظام بہتر انداز سے چل رہا ہے۔

عبدالمالک مجاہد صاحب نے دارالسلام کے سلسلے میں بہت سے ملکوں کے سفر بھی کیے اور سفروں کا سلسلہ بالعموم جاری رہتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے قلم وقرطاس سے بھی رابطہ رکھا۔ اس دوران جدہ سے نکلنے والے ہفت روزہ اردو میگزین میں سیرت کے اوراق کے نام سے ۱۶۹ کالم لکھے۔ ہر کالم دو صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ اسی دوران ۱۸ سے زائد اہم کتابیں تصنیف کیں جو دارالسلام کی طرف سے معرضِ اشاعت میں آئیں۔ ان کتابوں نے تعداد کے اعتبار سے اشاعت کے ریکارڈ قائم کیے۔ بیشتر کتابوں کے دیگر زبانوں میں تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ آئیے مندرجہ ذیل سطور کی وساطت سے ان کتابوں سے آگاہ ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

۱۔ رسول اللہ ﷺ کے دو سو سنہرے ارشادات: ۱۲۸ صفحات کی یہ کتاب نبی ﷺ کے دو سو فرامین گرامی

پر مشتمل ہے۔ اس کا انداز یہ ہے کہ پہلے نبی ﷺ کا فرمان لکھا گیا ہے، پھر سلیس اردو میں اس کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی احادیث کا مجموعہ ہے جو مردوں، عورتوں، بچوں سب کے لیے انتہائی مفید ہے۔ متعدد بچوں، عورتوں اور مردوں نے ان احادیث کو زبانی یاد کیا ہے۔

۲۔ آفتاب نبوت کی سنہری شعاعیں: اس کتاب میں مصنف نے نبی ﷺ کی سیرت طیبہ کے بہت سے پہلو شگفتہ اردو زبان میں بیان کیے ہیں۔ کتاب ۴۰۰ صفحات پر محیط ہے۔

۳۔ خاتون اول حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی زندگی کے سنہرے واقعات: نبی ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا بڑا دخل ہے۔ یہ نبی ﷺ کی اولیں زوجہ مکرمہ ہیں اور پہلی خاتون ہیں جو دائرۂ اسلام میں داخل ہوئیں۔ ۲۲۴ صفحات کی اس کتاب میں مصنف نام دار نے ان کے واقعات حیات خوب صورت زبان میں تفصیل سے بیان کیے ہیں۔

۴۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زندگی کے سنہرے واقعات: فاضل مصنف نے اس کتاب میں (جیسا کہ نام سے ظاہر ہے) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی پُرنور زندگی کے زریں واقعات درج کیے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مردوں میں اولیں مسلمان اور پہلے خلیفہ راشد تھے۔ اس عظیم المرتبت شخصیت سے متعلق یہ ایک بہترین کتاب ہے۔ مشتمل بر ۳۲۰ صفحات۔

۵۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی زندگی کے سنہرے واقعات: دوسرے خلیفۂ راشد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا شمار عشرہ مبشرہ میں ہوتا ہے، یعنی ان دس عالی بخت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت میں جن کو زندگی ہی میں لسان نبوت کی طرف سے جنت کی خوش خبری سے نوازا گیا تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بہت بڑے فاتح اور کشور کشا خلیفہ تھے۔ اس کتاب میں ان کی شب و روز کی مساعی حسنہ کا دل نشیں اسلوب میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ ۳۱۹ صفحات کی اس کتاب کے مطالعہ سے بے شمار واقعات نظر وبصر کے زاویوں میں سما جاتے ہیں۔

۶۔ والدین: اطاعت و نافرمانی واقعات کی زبانی: قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے بعد ماں باپ کی فرماں برداری کا حکم دیا ہے۔ احادیثِ مبارکہ میں نبی ﷺ نے اطاعتِ والدین کی تاکید فرمائی ہے۔ ۴۰۰ صفحات کی اس کتاب میں مصنف نے تفصیل سے اس موضوع پر بحث کی ہے اور اسے اپنے والد مکرم محمد یونس سپرا اور والدۂ محترمہ رضیہ بیگم کے نام سے منسوب کیا ہے۔

۷۔ سنہرے فیصلے: یہ کتاب ۳۰۸ صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور اس میں دورِ نبوت، خلافت راشدہ اور تاریخ اسلام میں عدل و انصاف کے متعدد درخشندہ واقعات کا تذکرہ دل کش انداز میں کیا گیا ہے۔ ان

واقعات پر نظر ڈالنے سے مسلمانوں کے ماضی کا حسن پوری طرح اجاگر ہو جاتا ہے۔

٨۔ سنہرے نقوش: یہ کتاب عجیب وغریب اسلامی واقعات کی نشان دہی کرتی ہے اور مسلمانوں کو راہِ مستقیم پر گام زن رہنے کا ذریعہ بنتی ہے۔۳۸۴ صفحات میں پھیلی ہوئی اس کتاب میں مندرج واقعات سے قاری کے دل پر ایسے زریں نقوش ابھر آتے ہیں جو اسے کامرانی کی راہ دکھاتے ہیں۔

٩۔ روشنی کے مینار: یہ کتاب نبی ﷺ کے ۳۱ صحابہ کرام کے تذکار سیرت کا شان دار مجموعہ ہے جو ۴۰۰ صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔ ہر صحابی کی زندگی کا ہر واقعہ روشنی کے مینار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے اپنے دل ودماغ کو معطر کرنے کی سعی کرنا چاہیے۔

١٠۔ سنہرے اوراق: لائق مصنف نے اس کتاب میں تاریخ اسلام کے روشن ترین واقعات کو شگفتگی کے ساتھ صفحات قرطاس پر مرتسم کیا ہے۔ یہ وہ واقعات ہیں، جن سے مطلع ہونا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔ صفحات ۳۷۵۔

١١۔ سنہرے حروف: یہ کتاب جو ۴۰۰ صفحات پر محیط ہے، نبی ﷺ، آپ کے خلفائے راشدین، سلف صالحین، نامور سلاطین اور تاریخ اسلام کے بہت سے تابندہ ستاروں کے سبق آموز واقعات قاری کے علم میں لانے کا ذریعہ بنتی ہے۔

١٢۔ سنہری کرنیں: یہ کتاب مسلم خواتین کی اعلیٰ اقدار کا بہترین مرقع ہے اور ۳۸۹ صفحات کا روح پرور مجموعہ ۔اس کے مطالعہ سے بے شمار اہم واقعات کی نقاب کشائی ہو جاتی ہے۔

١٣۔ سنہری دعائیں: اس کتاب میں وہ دعائیں درج کی گئی ہیں، جو نبی ﷺ دن رات کے مختلف اوقات میں پڑھا کرتے تھے۔ یہ کتاب ہر گھر میں ہونی چاہیے اور اس میں مندرج دعائیں پڑھی جانی چاہئیں۔ کتاب ۱۷۵ صفحات پر مشتمل ہے۔

یہ تیرہ کتابیں ہیں جو ساڑھے چار ہزار سے زائد صفحات پر محیط ہیں۔ ان کے علاوہ میرے سنہرے سفر نامے، اخلاق نبوی ﷺ کے سنہرے واقعات، معرکہ قادسیہ کے علاوہ دیگر کتنے ہی عناوین پر کام جاری ہے۔

بچوں کے لیے بھی متعدد کتب لکھی گئی ہیں۔

بچوں کے لیے سیرت انبیاء علیہم السلام ۔ پندرہ حصوں پر مشتمل۔

ان کتابوں کے علاوہ جناب عبدالمالک مجاہد صاحب نے مختلف جرائد ورسائل میں بہت سے عنوانات پر بے شمار مضامین لکھے اور اللہ کے فضل سے مسلسل لکھ رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ماشاء اللہ ان کی ہمت تیز رفتار ہے اور ان کے قلم کو پر لگے ہوئے ہیں جو اسے نوع بہ نوع فضاؤں میں اڑائے لیے جا رہے ہیں۔

وہ ایک مدت سے بہ یک وقت کئی کام کر رہے ہیں، جن کے عنوانات کچھ اس قسم کے ہیں:

☆ دارالسلام کی کتاب وسنت پر مبنی مطبوعات کی نشر واشاعت کے لیے بہت سے ملکوں کے سفر۔

☆ نشر واشاعت کے کام کی نگرانی۔

☆ کام کرنے والوں سے روابط اور معاملات طے کرنا۔

☆ مختلف افکار کے حامل لوگوں سے میل جول۔

☆ خود اپنی تحریر ونگارش کے لیے وقت نکالنا۔

☆ مختلف مقامات پر درس قرآن اور خطبات جمعہ کا اہتمام۔

اس سے ملتے جلتے اور بھی بہت کام ہیں جو وہ اللہ کی مہربانی سے ایک خاص پروگرام کے تحت سرانجام دے رہے ہیں۔ اللہ کرے یہ سلسلۂ کار چلتا رہے اور گاڑی بخیر وعافیت شاہ راہِ مستقیم پر رواں رہے۔

☆ اب تک دارالسلام کی طرف سے پندرہ سو سے زائد کتابیں چھپ چکی ہیں۔ پانچ سو پچاس انگریزی میں اور تین سوتیں اردو میں، باقی عربی اور دیگر زبانوں میں۔

☆ دنیا کی پچیس زبانوں میں قرآن مجید کے ترجمے اب تک شائع کیے جا چکے ہیں۔

☆ صحاح ستہ کا انگریزی ترجمہ 38 جلدوں میں چھپا۔

☆ دنیا کے تیس ملکوں میں دارالسلام کی شاخیں قائم یا ان کے مقرر کردہ سول ایجنٹ کام کر رہے ہیں۔ عالم اسلام کا (غالباً) عربی اور دیگر زبانوں میں یہ سب سے بڑا قرآن وحدیث پر مبنی اشاعتی ادارہ ہے۔

☆ یہ اعزاز بھی اس ادارے کو حاصل ہے کہ اس کی طرف سے پوری صحاح ستہ ایک جلد میں چھاپی گئی ہے۔

☆ نوبل قرآن دنیا کا سب سے معروف اور مقبول انگریزی ترجمہ ہے جو دارالسلام نے شائع کیا۔ احادیث مبارکہ کی روشنی میں اس کے مختصر حواشی بھی ہیں۔ یہ انگریزی ترجمہ ڈاکٹر محمد محسن خاں صاحب نے کیا جو علمی دنیا کی ایک قابل شخصیت ہیں۔

☆ پاکستان کے بعض مقامات میں ایک ٹرسٹ کے ذریعے تدریسی ادارے قائم کیے گئے ہیں، مسجدوں کی تعمیر کا سلسلہ بھی جاری ہے اور ڈسپنسریاں بھی قائم کی گئی ہیں۔ ان مقامات میں منڈی وار برٹن، کیلیاں والا، حافظ آباد، شرق پور اور بعض دیگر مقامات شامل ہیں۔

عبدالمالک مجاہد صاحب کی زندگی جن حالات میں گزری اور گزر رہی ہے، اس کے بعض اہم گوشوں سے خوانندگانِ محترم مطلع ہو چکے ہیں اور ان کی اشاعتی خدمات کی ایک جھلک ہمارے سامنے آ چکی ہے۔ یہ بھی معلوم ہو چکا کہ ان کے تعلقات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ دیگر مقامات کے علاوہ سعودی عرب کے علمائے کرام

سے بھی ان کے گہرے مراسم ہیں اور بعض ارباب حکومت سے بھی انھیں قربت حاصل ہے۔

مولانا عبدالمالک مجاہد صاحب کا قائم کردہ دارالسلام وہ منفرد قسم کا ادارہ ہے، جس میں خالص کتاب وسنت کی روشنی میں عمدگی سے کام ہو رہا ہے۔ ہم گناہ گاروں کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس ادارے کو ہمیشہ قائم رکھے اور اس کی خدمت کا سلسلہ شب و روز جاری رہے۔ آمین

(یہ سطور ۱۵۔نومبر ۲۰۱۳ء کو لکھی گئیں)

مولانا نجیب اللہ طارق

(ولادت ۲۴۔ دسمبر ۱۹۵۵ء)

تقسیم ہند سے قبل کا پنجاب دریائے اٹک کی لہروں سے لے کر دلی کی دیواروں تک بڑے بڑے انتیس اضلاع پر مشتمل تھا، جن میں ایک ضلع گورداس پور تھا جو تقسیم کے نتیجے میں ہندوستان کو دیا گیا۔ پنجاب کے متعدد دیگر اضلاع کی طرح اس ضلع میں بھی مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ ان کی بے شمار مسجدیں تھیں جو نمازیوں سے بھری رہتی تھیں۔ دینی مدرسے تھے، جن میں طلبا دینیات کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ مختلف مقامات میں مسلمانوں کے تبلیغی جلسے منعقد کیے جاتے تھے، جن میں علمائے کرام تقریریں کرتے اور لوگوں کو قرآن و حدیث پر عمل پیرا ہونے اور اپنی زندگی کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی تلقین فرماتے تھے۔ یہ سلسلہ بغیر کسی روک ٹوک کے صدیوں سے جاری تھا۔ علما کے مواعظ حسنہ سے متاثر ہو کر غیر مسلم بھی دائرہ اسلام میں داخل ہوتے اور قرآن و حدیث کی اشاعت کا ذریعہ بنتے تھے۔ لیکن اگست ۱۹۴۷ء کے بعد اس نواح میں اسلام کی تبلیغ کے دروازے بند ہو گئے اور مشرقی پنجاب کے بارہ ضلعوں اور آٹھ ریاستوں میں سے سات ریاستوں میں کوئی اسلام کا نام لینے والا نہ رہا۔ صرف ریاست مالیر کوٹلہ میں جو مسلمانوں کی ریاست تھی، مسلمان باقی رہے، اب بھی وہاں مسلمان موجود ہیں اور ریاست ضلع سنگرور میں شامل ہے۔

ضلع گورداس پور کے ایک قصبے کا نام ''دینا نگر'' تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے اس قصبے میں ایک ارائیں خاندان آباد تھا۔ اس خاندان کے چار حقیقی بھائیوں نے علم دین حاصل کیا اور حالات کے مطابق قرآن و حدیث کی تبلیغ کرنے لگے۔ ان کے نام یہ تھے: مولانا عبدالغنی دینا نگری، مولانا عبدالمجید دینا نگری، مولانا عبدالحمید دینا نگری اور مولانا محمد یوسف۔ ان علمائے کرام کے والد کا اسم گرامی مولانا کرم الٰہی تھا اور وہ ۹۔ ستمبر ۱۹۱۴ء کو انتقال کر گئے تھے۔

اب چند الفاظ میں اسی ترتیب سے ان چاروں کا تعارف:

۱۔ مولانا عبدالغنی دینا نگری کے بارے میں یہ تو معلوم نہیں کہ وہ کب پیدا ہوئے اور کہاں تعلیم حاصل کی اور کن اساتذہ سے کی، البتہ یہ معلوم ہے کہ تقسیم سے پہلے ہندوستان کے بعض علاقوں میں ان کا وعظ و تقریر کا سلسلہ جاری رہا۔ وہ تبلیغی جلسوں میں جاتے اور خطاب کرتے تھے۔ قیام پاکستان کے زمانے

میں وہ حافظ آباد کے قریب ایک گاؤں ''کڑیال'' میں مقیم ہوئے اور وہیں وفات پائی۔ مجھے ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہے۔ ان کی تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا۔

۲۔ مولانا عبدالمجید دینا نگری کی بھی مولانا عبدالغنی کی طرح نہ تاریخ وفات کا پتا چل سکا اور نہ یہ معلوم ہو سکا کہ انھوں نے کہاں تحصیل علم کی اور کن اساتذہ سے کی۔ تقسیم ملک کے بعد وہ ضلع سیالکوٹ کے قصبہ بھوپال والا میں آگئے تھے۔ پھر حضرت مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی نے ان کو جہلم بھیج دیا تھا۔ وہ مرکزی جمعیت اہل حدیث کی مجلس عاملہ کے رکن تھے، جب کہ میں اس کا آفس سیکرٹری تھا۔ اس حیثیت سے ان سے میل ملاقات کے مواقع میسر آتے رہتے تھے۔ وہ جہلم کی مسجد اہل حدیث کے خطیب تھے اور وہاں فریضہ تدریس بھی سرانجام دیتے تھے۔ میں اور مولانا محمد حنیف ندوی ایک مرتبہ اخبار ''الاعتصام'' کی توسیع اشاعت کے سلسلے میں جہلم گئے تو پتا چلا کہ وہاں کی جماعت اور عام لوگوں پر ان کا بہت اثر ہے اور وہ ان کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ اس کے بعد بھی بعض جماعتی معاملات میں تین چار مرتبہ میں جہلم گیا اور ان کے ہاں قیام کیا۔ وہ مہمان نواز اور بلند اطوار عالم تھے۔

تقسیم ملک سے قبل آزادئ وطن کی مختلف تحریکوں میں مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی کئی مرتبہ گرفتار ہوئے اور کئی سال جیلوں میں رہے۔ وہ چینیاں والی مسجد کے خطیب تھے۔ جیل سے مسجد انتظامیہ کو پیغام بھجوا دیتے تھے کہ فلاں عالم کی بہ طور خطیب خدمات حاصل کی جائیں۔ یہ بہت بڑا اعزاز تھا جو مولانا کی طرف سے ان کے زمانہ اسارت میں کسی عالم کے حصے میں آتا تھا۔ اس اثنا میں مولانا غزنوی کے فرمان کے مطابق مولانا عبدالمجید دینا نگری نے بھی اس مسجد میں چند خطباتِ جمعہ ارشاد فرمائے تھے۔ زیب عنوان مولانا نجیب اللہ طارق انہی مولانا عبدالمجید دینا نگری کے پوتے ہیں اور ان کا تذکرہ آئندہ سطور میں آئے گا۔

۳۔ مولانا عبدالمجید کے ایک بھائی مولانا عبدالحمید دینا نگری تھے۔ تقسیم ملک کے بعد وہ لائل پور (موجودہ فیصل آباد) چلے گئے تھے اور وہیں فوت ہوئے۔ ان سے بھی اس فقیر کو ملاقات کا شرف حاصل تھا۔ ان کی بھی تواریخ ولادت و وفات کا پتا نہیں چل سکا۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ انھوں نے کہاں تعلیم حاصل کی اور کن اساتذہ فن سے فیض پایا۔

مولانا عبدالمجید نے البتہ یکم جولائی ۱۹۷۹ء کو لاہور میں وفات پائی۔

۴۔ ان حضرات کے ایک بھائی مولانا محمد یوسف تھے۔ ۱۹۰۰ء میں دینا نگر میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد مکرم سے پائی۔ پھر مکمل تعلیم مدرسہ غزنویہ امرتسر سے حضرت مولانا نیک محمد اور وہاں کے دیگر اساتذہ کرام سے حاصل کی۔ کچھ عرصہ مدرسہ غزنویہ میں پڑھاتے بھی رہے۔ پرجوش

مقرر اور منجھے ہوئے مدرس تھے۔ تقسیم ملک سے بہت سال پہلے کلکتے چلے گئے تھے۔ وہاں اے ایل جوزف اینڈ سنز کے نام سے عطریات اور سنو وغیرہ کا کام کرتے تھے۔ کلکتہ شہر اور اس کے قرب و جوار بلکہ پورے بنگال میں ان کی تقریر و خطابت کا سلسلہ جاری رہتا تھا اور قیام کلکتہ کی وجہ سے انھیں مولانا محمد یوسف کلکتوی کہا جاتا تھا۔ تقسیم ملک کے بعد کراچی آ گئے تھے۔ کراچی اُنھوں نے کاروبار بھی کیا، ایک دار العلوم بھی جاری کیا اور اس میں درس و تدریس میں مصروف ہوئے۔ ''الارشاد'' کے نام سے ماہانہ رسالہ جاری فرمایا۔ ۱۹۵۳ء کی تحریک تحفظ ختم نبوت میں قید ہوئے، کچھ عرصہ حافظ آباد کے ایک مدرسے میں پڑھاتے رہے جو میاں فضل حق مرحوم نے جاری کیا تھا۔

مولانا محمد یوسف کلکتوی لاہور تشریف لاتے تو اس خاک نشین کو بھی یاد فرماتے۔ ان کو قریب سے دیکھنے اور ان کی باتیں سننے کا پہلی دفعہ اتفاق ایک میٹنگ میں ہوا جو مرکزی جمعیت اہل حدیث کے دفتر میں جماعتی تنظیم سے متعلق مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی کی تجویز سے دسمبر ۱۹۵۵ء میں ہوئی تھی۔ میں ان دنوں اخبار ''الاعتصام'' کا ایڈیٹر تھا۔ اس میٹنگ میں مولانا غزنوی کے علاوہ مولانا محمد اسماعیل سلفی، مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا محی الدین احمد قصوری، مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، مولانا محمد علی قصوری ایم اے کینٹب اور ان سطور کا راقم شریک تھے۔

مولانا محمد یوسف کلکتوی ملنسار، خوش مزاج، بلند ہمت، اہل علم کے قدر دان اور طلبا کے لیے نہایت مشفق تھے۔ نادار طلبا کو نقد پیسے دیتے، انھیں موسم کے مطابق اپنی گرہ سے کپڑے سلا کر دیتے۔ جن طلبا کے گھروں میں کوئی کمانے والا نہ ہوتا، ان کو گزر اوقات کے لیے روپے اور ضرورت کی چیزیں عنایت فرماتے۔ مولانا موصوف کا تذکرہ میں نے اپنی ایک کتاب ''گلستانِ حدیث'' میں کیا ہے۔ ان کے ایک لائق شاگرد ملک بشیر احمد نے ان کے متعلق پوری کتاب لکھ دی ہے جو ۲۸ صفحات پر محیط ہے۔ لیکن ان چاروں اصحابِ علم بھائیوں کے وارثوں نے ان کے بارے میں چار صفحے بھی نہیں لکھے ہوں گے۔ یہ صرف ان کا مسئلہ نہیں ہے، الا ماشاء اللہ سب علمائے کرام کی اولاد کا یہی معاملہ ہے۔ ان کے اَسلاف کے متعلق ان سے کچھ پوچھا جائے تو شاید یہ تھا، شاید وہ تھا، شاید یوں تھا کی گردان شروع ہو جاتی ہے۔ پوچھنے والے کے کچھ پلے نہیں پڑتا۔ وہ ان کی ''شایدوں'' میں اُلجھا رہتا ہے۔

بات مولانا محمد یوسف کلکتوی کی ہو رہی تھی۔ وہ ۱۹۰۰ء میں دینا نگر ضلع گورداس پور مشرقی پنجاب میں پیدا ہوئے اور ۱۱ ستمبر ۱۹۷۰ء کو کراچی میں ان کی وفات ہوئی۔

یہ ہے مختصر الفاظ میں مولانا نجیب اللہ طارق کا خاندانی پس منظر۔

ان کے والد کا نام حکیم عبداللہ اور دادا عبدالمجید دینانگری تھا۔ مولانا عبدالمجید نے تقسیم ملک سے کئی سال پہلے ریاست دھول پور کے ایک قصبے ''باڑی'' کا مولانا کو اپنا مسکن قرار دے لیا تھا جو صوبہ یو پی کے شہر آگرہ سے کچھ فاصلے پر واقع ہے۔ میں ۱۹۴۲ء کے فروری، مارچ اور اپریل میں اس علاقے کے بعض مقامات کے چکر لگا چکا ہوں۔ اس وقت میری عمر سترہ اٹھارہ سال کی تھی۔ یہ میری آوارہ گردی کا زمانہ تھا اور بڑا مسرت انگیز زمانہ تھا۔ میں دو مہینے آگرے رہا۔ دھول پور میرا اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ یہ صاف ستھرا خوب صورت شہر دریائے چنبل کے قریب واقع ہے۔ قصبہ باڑی تو میں نے نہیں دیکھا لیکن ریاست دھول پور کے بعض قصبات و دیہات دیکھنے کا موقع ملا۔ مولانا عبدالمجید دینانگری قصبہ باڑی کی مسجد اہل حدیث میں خطابت و تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ آئندہ میرا قلم و قرطاس اور شخصیت نگاری سے واسطہ پڑے گا۔ اگر اس کا تھوڑا سا بھی علم ہوتا تو قصبہ باڑی میں ان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا۔

ان کے اس نواح کے شاگردوں میں سے ایک شاگرد محمد مبارک تھے، جن کی تاریخ ولادت ۱۱ نومبر ۱۹۳۸ء تھی۔ تقسیم ملک کے زمانے میں وہ ان سے حدیث کی کتاب مشکوٰۃ اور دیگر فنون کی کتابیں پڑھتے تھے۔ مولانا نے قصبہ باڑی سے پاکستان آنے کی تیاری کی تو محمد مبارک بھی ان کے ساتھ یہاں آ گئے۔ مولانا ان کو حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کی خدمت میں گوجراں والا لے گئے اور وہ ان کے مدرسے میں داخل کرا دیے گئے۔ کچھ عرصے بعد حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کسی سلسلے میں گوجراں والا گئے اور حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی سے ملے۔ اس وقت طالب علم محمد مبارک کی ان سے دُعا سلام ہوئی تو وہ لاہور آ گئے اور دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں داخلہ لے لیا۔ مولانا عبدالمجید دینانگری کے علاوہ انھوں نے حضرت محدث حافظ محمد گوندلوی، مولانا محمد اسماعیل سلفی، مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، مولانا محمد عبدہ الفلاح، مولانا محمد موسیٰ خاں اور سیّد ابوبکر غزنوی سے اکتساب علم کیا اور سند فراغت لے کر کراچی چلے گئے۔ وہاں انھوں نے ایم اے اسلامیات کا امتحان پاس کیا اور لائبریری کا کورس کر کے ایک سرکاری لائبریری میں لائبریرین کے طور پر کام کرنے لگے۔ پھر وہاں یونیورسٹی میں پروفیسر ہو گئے۔ پورے پاکستان میں ان کا کوئی رشتے دار اور سرپرست نہ تھا، لیکن وہ نہایت ذہین اور محنتی شخص تھے۔ اللہ نے ان کے لیے ترقی کے دروازے کھول دیے اور وہ تیزی کے ساتھ آگے بڑھتے گئے۔

ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ تحریری صورت میں انھوں نے بڑی اہم خدمات سر انجام دیں۔ مسلک اہل حدیث اور علمائے اہل حدیث پر کچھ لوگوں کو تنقید کرنے اور انھیں ہدف اعتراض ٹھہرانے کی عادت ہے۔ پروفیسر محمد مبارک نے ان لوگوں کے اعتراضات و تنقیدات کے خوب صورت انداز میں محققانہ جواب

دیے۔ان کے یہ رشحاتِ قلم اخبار ”الاعتصام“ اور جماعت اہل حدیث کے دیگر رسائل و جرائد میں چھپتے رہے۔ معلوم نہیں کسی اہل علم نے ان مضامین کو جمع کرنے کی طرف کبھی توجہ مبذول فرمائی ہے یا نہیں۔ اگر کوئی صاحب محنت کر کے مختلف رسائل و جرائد میں طبع شدہ یہ مضامین جمع کر دیں اور کوئی ناشر اس مجموعے کو شائع کر دے تو یہ بڑی علمی خدمت ہوگی۔

بات مولانا عبدالمجید دینا نگری کے بارے میں ہو رہی تھی اور قلم کا رُخ ان کے لائق شاگرد پروفیسر محمد مبارک کی طرف مڑ گیا جو ان کے لیے اس فقیر کی رائے میں ان شاء اللہ صدقہ جاریہ ہوں گے۔

مولانا ممدوح کی نرینہ اولاد چھ بیٹے تھے جو وفات پا گئے۔ صرف ایک بیٹا زندہ رہا جس کا نام عبداللہ تھا۔ ان کی ولادت قصبہ باڑی ریاست دھول پور ضلع آگرہ (صوبہ یوپی) میں ہوئی۔ سرکاری سکول میں مڈل تک تعلیم حاصل کی اور دینیات کی کتابیں اپنے والد مکرم مولانا عبدالمجید سے پڑھیں۔ صحیح مسلم تک ان سے کتب حدیث کا درس لیا۔ پھر دہلی چلے گئے۔ وہاں کے طبیہ کالج میں داخلہ لیا اور اس کا چار سالہ نصاب مکمل کیا۔ اس کالج سے انھیں جو سند ملی وہ ہرن کی کھال پر لکھی ہوئی ہے اور ان کے فرزند گرامی مولانا نجیب اللہ طارق کے بقول ان کے پاس موجود ہے۔

حکیم عبداللہ صاحب نے اپنے آبائی گاؤں دینا نگر میں طبابت شروع کی۔ پھر فوج میں بھرتی ہو گئے۔ یہ دوسری جنگ عظیم کا واقعہ ہے۔ فوج کی ملازمت کا زیادہ عرصہ ہندوستان کے صوبہ آسام میں گزرا۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستان آ گئے۔ فروری ۱۹۶۵ء میں فوج کی ملازمت سے سبک دوش ہوئے تو مارچ ۱۹۶۵ء میں فیصل آباد تشریف لے گئے۔ یہاں پیپلز کالونی میں سکونت پذیر ہوئے۔ کچھ عرصہ حکیم عبدالرحیم اشرف مرحوم کی اشرف لیبارٹری میں ملازمت کی۔ پھر واپڈا میں ملازمت کرنے لگے۔ ۲۰۰۵ء میں وفات پائی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

اب مولانا نجیب اللہ طارق کی تعلیم کے بارے میں۔

انھوں نے فیصل آباد کے رحمانیہ ہائی سکول میں میٹرک پاس کیا۔ سکول کی تعلیم کے دوران ہی میں ان کے جدامجد مولانا عبدالمجید نے کتاب ابواب الصرف کے باب یاد کرا دیے۔ ترجمہ قرآن بھی پڑھا دیا اور صرف ونحو کی بعض کتابیں بھی پڑھا دی تھیں۔

۱۹۷۲ء یا ۱۹۷۳ء میں جامعہ سلفیہ میں داخل ہوئے۔ جامعہ سلفیہ کی تعلیم کے دوران ہی میں ایف اے اور بی اے کے امتحانات پاس کیے۔ ۱۹۷۸ء میں جامعہ سلفیہ کا نصاب مکمل کیا تو میاں فضل حق مرحوم نے ان کے اور چودھری محمد یاسین ظفر کے داخلے کے کاغذات ریاض کی ایک یونیورسٹی میں بھجوائے لیکن کسی وجہ سے

اس یونیورسٹی میں داخلہ نہ ملا تو میاں صاحب مرحوم نے ان دونوں کو مدینہ یونیورسٹی میں داخل کرادیا۔ وہاں نجیب اللہ طارق نے کلیۃ الدعوۃ و اصول الدین میں گریجوایشن کیا۔ ۱۹۸۱ء میں وطن واپس آ کر جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) میں تدریس شروع کردی۔ بعد ازاں ۱۹۸۳ء میں کلیۃ الدعوۃ کی طرف سے دبئی چلے گئے۔ اسی سال ان کی شادی ہوگئی۔ دبئی میں ان کا قیام دس سال رہا۔ اس طویل مدت میں انھوں نے وہاں تدریسی خدمات بھی سرانجام دیں اور ریڈیو کی اُردو سروس میں ان کی تقریروں کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

پھر حالات نے پلٹا کھایا اور یہ ۱۹۹۴ء میں واپس جامعہ سلفیہ آ گئے اور خدمت تدریس انجام دینے لگے۔ ہمارے لائق فائق دوست مولانا محمد اسحاق چیمہ کی وفات ۲۳۔ مارچ ۱۹۹۳ء کو ہوئی تھی۔ پیپلز کالونی میں ان کا مکان تھا اور مکان کے قریب کی مسجد میں وہ درس قرآن دیا کرتے تھے، مولانا نجیب اللہ طارق کی سکونت بھی اسی کالونی میں ہے اور ۱۹۹۴ء سے یہ اسی مسجد میں خطبہ جمعہ اور درس قرآن دے رہے ہیں۔

مولانا نجیب اللہ طارق نے جامعہ سلفیہ میں جن اساتذہ کرام کے حضور زانوے شاگردی تہہ کیے وہ ہیں: (۱) حافظ مفتی ثناء اللہ مدنی، (۲) مولانا محمد صدیق لائل پوری، (۳) حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی، (۴) مولانا حبیب اللہ دھرم کوٹی، (۵) مولانا ثناء اللہ ہوشیار پوری، (۶) حافظ محمد بنیامین طور، (۷) مولانا قدرت اللہ فوق، (۸) مولانا محمد اکال گڑھی، (۹) سید عبدالشکور شاہ اثری، (۱۰) شیخ علی مرشد یمنی، (۱۱) مولانا عبدالوہاب بلتستانی، (۱۲) مولانا عبدالقادر بلتستانی، (۱۳) مولانا حسن راشد بلتستانی۔

مدینہ یونیورسٹی میں جن شیوخ سے تحصیل علم کی ان میں شیخ علی عبدالرحمٰن الحذیفی امام مسجد نبوی اور شیخ مجذوب جیسے متعدد رفیع المنزلت شیوخ شامل ہیں جو مصر، سعودی عرب، شام، سوڈان وغیرہ ممالک سے تعلق رکھتے ہیں۔

مولانا نجیب اللہ طارق پیغام ٹی وی سے ''روشنی'' کے زیرعنوان پروگرام پیش کر رہے ہیں، نیز محترم المقام حافظ محمد شریف صاحب کے قائم فرمودہ ''مرکز التربیۃ الاسلامیہ'' (فیصل آباد) میں بھی قرآن سے متعلق کچھ خدمت انجام دے رہے ہیں۔

ان کے شاگردوں کا حلقہ وسیع ہے جو جامعہ سلفیہ سے لے کر دبئی تک پھیلا ہوا ہے۔

مولانا ممدوح کے بارے میں چند اور باتیں سنیے جو خود انہی نے مجھے لکھ بھیجی ہیں اور میں نے ان کو واوین کی زنجیر میں جکڑ دیا ہے۔

❀ ایک مرتبہ انھوں نے اپنے والد مکرم حکیم عبداللہ صاحب سے اپنے شجرۂ نسب کے متعلق پوچھا تو حکیم صاحب نے اس شجرے میں ایک بزرگ ''نور شاہ'' کا نام لیا۔ یہ نام سن کر مولانا نے والد سے کہا:

’’کیا ہم پہلے سیّد تھے، بعد میں ارائیں بنے؟‘‘

والد نے جواب دیا: ’’تم سیّد بننے کی بات کرتے ہو، ہمارا تیسری پشت سے آگے مسلمان ہونا ہی مشکوک ہے۔‘‘

انھوں نے کہا: ’’پھر نور شاہ کا کیا مطلب ہے؟‘‘

والد محترم نے جواب دیا: ’’تم لفظ ’’شاہ‘‘ کو انگریزوں کے برنارڈ شاہ یا ہندوستان کے ہندو جرنیل مانک شاہ کے مطابق سمجھ لو۔

❀ مولانا نجیب اللہ طارق ما شاء اللہ بی اے پاس ہیں۔ ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ یہ دونوں نام ’’برنارڈ شاہ‘‘ اور ’’مانک شاہ‘‘ نہیں، بلکہ برنارڈ شا (Bernard Shaw) اور مانک شا (Manek Shaw) ہیں۔ جارج برنارڈ شا ۲۶۔ جولائی ۱۸۵۶ء کو آئرلینڈ میں پیدا ہوا، اور ۲۔ نومبر ۱۹۵۰ء کو اس کی موت واقع ہوئی۔ یوں تو یہ نقاد بھی تھا، صحافی بھی تھا، ناول نویس بھی تھا، لیکن اس کی اصل شہرت ڈراما نگاری کی تھی۔ اس نے ساٹھ سے زیادہ ڈرامے لکھے۔ مانک شا آزاد ہندوستان کا آرمی چیف تھا جو پارسی مذہب سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ ۳۔ اپریل ۱۹۱۴ء کو امرتسر (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوا اور ۲۷۔ جون ۲۰۰۸ء کو جنوبی ہندوستان کے علاقہ تامل ناڈو میں مرا۔

عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ ’’ہ‘‘ کے ساتھ لفظ ’’شاہ‘‘ نہیں، بلکہ ’’ہ‘‘ کے بغیر ’’شا‘‘ ہے۔

حکیم صاحب مرحوم اور مولانا نجیب اللہ طارق نے لفظ ’’شا‘‘ کو ’’شاہ‘‘ سمجھا جو صحیح نہیں۔

❀ ہمارے ہاں سیّد کو ’’شاہ‘‘ کہا جاتا ہے اور یہ معززانہ لفظ ایک خاص برادری کے لیے مخصوص ہے۔ مولانا نجیب اللہ طارق کی زندگی کا خاصہ حصہ عربوں میں گزرا ہے اور وہ کئی سال عرب اساتذہ سے تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں، انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ عربوں میں سیّد کا لفظ جناب، مکرم، محترم وغیرہ کے معنوں میں بولا جاتا ہے۔ قرآن میں اس کا اطلاق سورۂ یوسف میں شوہر پر ہوا ہے اور وہ (زلیخا کا شوہر) غیر مسلم تھا: ﴿وَ اَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ﴾ (یوسف : ۲۵)

آزادیٔ وطن کے بعد ہندوستان کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو اور وزیر خارجہ سورن سنگھ سعودی عرب کے دورے پر ریاض گئے تو وہاں کے اخباروں نے انھیں سیّد جواہر لال نہرو اور سیّد سورن سنگھ لکھا، اس لیے کہ یہ ان کی بولی میں تکریم کا لفظ ہے۔ ہمارے ملک کے اخباروں میں یہ ایک لطیفہ بنا رہا۔ برصغیر میں بعض اکابر اصحابِ علم کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے اور ہوتا ہے۔ مثلاً شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز، شاہ اسماعیل شہید دہلوی، یہ خاندان فاروقی تھا۔ مگر ان حضرات کی بزرگی اور بے پناہ صالحیت کی وجہ سے ان پر شاہ کا اطلاق کیا

جاتا ہے۔

❀ مولانا موصوف ارائیں برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ مجھے تھوڑا بہت مطالعہ کی عادت ہے۔ میں نے ارائیوں کے بارے میں کئی کتابیں پڑھی ہیں۔ ان میں ایک کتاب ''تاریخ قوم ارائیاں'' ہے جو چودھری اصغر علی بی اے بی ٹی (ہیڈ ماسٹر ڈی سی ہائی سکول پرانی، ضلع سانگھڑ صوبہ سندھ) کی تصنیف ہے۔ اپنے موضوع کی یہ پراز معلومات کتاب ہے۔ ایک کتاب کا نام ''سلیم التواریخ'' ہے۔ اس کے مصنف کا نام صوفی اکبر علی ہے۔

اس برادری کے بعض اہل علم نے اخبار بھی جاری کیے، جن میں برادری کے لوگوں کا تعارف کرایا جاتا اور ان کے احول و کفائف بیا کیے جاتے تھے۔ اس سلسلے کا پہلا اخبار یا رسالہ ''ارائیں میگزین'' کے نام سے ۱۹۱۴ء میں ملک شاہ محمد اور چودھری غلام حیدر نے جاری کیا۔ دوسرا اخبار فروری ۱۹۱۶ء میں ہفت روزہ ''الراعی'' قاضی فتح محمد بٹالوی کے زیر ادارت شائع ہونا شروع ہوا۔ ''ارائیں میگزین'' تو جلد ہی بند ہو گیا تھا، ''الراعی'' پر بھی کئی دور آئے۔ لیکن یہ سخت جان ثابت ہوا اور طویل عرصے تک جاری رہا۔ میرے ''الاعتصام'' کے زمانہ ادارت میں ''الاعتصام'' کے تبادلے میں آتا تھا۔ مضامین کے اعتبار سے اچھا اخبار تھا۔

❀ ارائیوں کی تاریخ بڑی دلچسپ ہے۔ میں نے اپنی ایک کتاب ''میاں عبدالعزیز مالواڈہ'' میں اس برادری کے متعلق خاصی تفصیل سے لکھا ہے۔ ارائیوں کا دعویٰ ہے کہ یہ دمشق (شام) میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی فوج میں شامل تھے۔ دمشق اور بیت المقدس کے درمیان ایک وسیع علاقہ ''اُریحا'' کے نام سے موسوم ہے۔ اس نام کا وہاں ایک شہر بھی ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہاں بنو اُمیہ اور ان کے معاونین کو آباد کیا تھا۔ وہاں کے رہنے والے ''اریحائی'' کہلائے۔ بعد میں یہ لفظ لب ولہجے کی تبدیلی کے مراحل طے کرتا ہوا برصغیر میں پہنچا تو ''ارائیں'' بن گیا۔ ان لوگوں کے اخلاف دمشق سے محمد بن قاسم کی فوج میں سندھ آئے اور اس علاقے کو فتح کیا۔ اس طرح ان کے قدم ہندوستان تک پہنچے اور یہ برصغیر کے مختلف علاقوں میں آباد ہوئے۔

❀ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ''ارائیں'' سلیم الراعی'' (سلیم چرواہے) کی نسل سے ہیں اور نو جوان عرب جرنیل محمد بن قاسم کی فوج جس نے ۷۱۴ء (۹۳ھ) میں خلیفہ ولید بن عبدالملک کے دورِ حکومت میں سندھ فتح کیا تھا، انہی لوگوں پر مشتمل تھی۔ سلیم الراعی کی وجہ سے بعض ارائیں حضرات اپنی نسبت اس کی طرف کر کے سلیمی کہلاتے ہیں۔

تعلیم یافتہ ارائیں اپنے آپ کو برصغیر کے قدیم ترین اور صحیح مسلمان قرار دیتے ہیں۔ لیکن حکیم عبداللہ

صاحب اور ان کے فرزند مولانا نجیب اللہ طارق (مدرس جامعہ سلفیہ) فرماتے ہیں کہ ”ہمارا تیسری پشت سے آگے مسلمان ہونا ہی مشکوک ہے۔“ فرمایئے کس کی بات مانی جائے، تاریخ دانوں کی یا ان باپ بیٹے کی جو ”شا“ کو ”شاہ“ قرار دے رہے ہیں؟

❀ یہ بھی حقیقت ہے کہ ارائیں، اعوان اور کھوکھر وہ برادریاں ہیں، جن میں شیعیت کے آثار یا تو ہوتے ہی نہیں یا بہت کم ہوتے ہیں۔ اعوان اور کھوکھر کہا کرتے ہیں کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد ہیں۔

ارائیں برادری کے بارے میں بہت سی ضروری معلومات اس فقیر کی کتاب ”تذکرہ یہاں عبدالعزیز مالواڈا“ میں مرقوم ہیں جو کتاب سرائے، الحمد مارکیٹ، اُردو بازار لاہور نے شائع کی ہے۔

مولانا نجیب اللہ طارق نے اپنے متعلق جو مختصر سی معلومات اس فقیر کو بھجوائی ہیں، ان میں لفظ ”شاید“ کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ اپنے دادا مولانا عبدالمجید دینا پوری کے بارے میں فرماتے ہیں:

❀ ”میرے دادا اگرچہ گورداس پور کے قصبہ دینا نگر کے رہنے والے تھے مگر (انھوں نے) زیادہ وقت آگرہ کے قصبہ باڑی میں گزارا۔ والد صاحب بھی شاید آگرہ میں پیدا ہوئے۔“

❀ دہلی کے طبیہ کالج سے ان کے والد حکیم عبداللہ صاحب کو جو سند ملی، اس کے متعلق ارشاد ہے: ”وہ شاید ہرن کی کھال کی تھی جو آج بھی میرے پاس موجود ہے۔“

❀ اگر ہرن کی کھال کی سند آپ کے پاس موجود ہے تو پھر شک کا صیغہ ”شاید“ استعمال کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی؟

❀ اپنے دادا کے چھوٹے بھائی مولانا محمد یوسف کلکتوی کی وفات کے متعلق فرماتے ہیں: ”شاید ۱۹۶۸ء یا ۱۹۶۹ء میں انتقال کر گئے۔“ (جیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کیا گیا وہ ۱۱۔ ستمبر ۱۹۷۰ء کو فوت ہوئے تھے۔)

❀ جامعہ سلفیہ میں ان کے دورِ طالب علمی میں مالدیپ کے طالب علم بھی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ انھوں نے مالدیپی زبان میں ایک قلمی ماہانہ رسالہ جاری کیا تھا۔ ان کے مقابلے میں نجیب اللہ طارق اور ان کے چند ساتھیوں نے ”الہلال“ نام کا اُردو رسالہ جاری فرمایا تھا۔ اب دونوں طرف کے طلبا کے درمیان قلمی محاذ آرائی شروع ہوگئی۔ ایسی صورت میں مقابلے کی تحریر کتابی شکل میں ہو یا اخبار اور رسالے کی شکل میں، اس کا نام ہمیشہ یاد رہتا ہے، اس لیے کہ اس کی حیثیت چھوٹے یا بڑے انداز میں ایک علمی نوعیت کی معرکہ آرائی کی ہوتی ہے، لیکن مولانا فرماتے ہیں: ”وہ مالدیپی زبان میں مختلف مضامین لکھ کر ایک قلمی رسالہ تیار کرتے تھے، اس کا نام شاید زمزم تھا یا کچھ اور تھا۔“

❀ مولانا نجیب اللہ طارق اپنے دادا مولانا عبدالمجید دینا نگری کے متعلق فرماتے ہیں: ''مولانا داود غزنوی نے انھیں جہلم بھیج دیا، وہاں وہ کافی عرصہ رہے اور پہلی اہل حدیث مسجد بنائی۔''

مولانا نجیب اللہ طارق کی خدمت میں گزارش ہے کہ جہلم کی جماعت اہل حدیث بہت پرانی ہے اور یہاں مسجد اہل حدیث بھی مولانا عبدالمجید دینا نگری کی تشریف آوری سے بہت پہلے سے تھی۔ اس مسجد کے ایک امام وخطیب کا نام میاں نعمان تھا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے چھوٹے بھائی مولوی سلطان محمود نے یہ مسند سنبھالی۔ انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا تو ایک شخص مولوی احمد علی کو اس منصب پر فائز کیا گیا۔ ان کا انتقال ہوا تو میاں نعمان کے فرزند گرامی میاں عبدالعزیز یہ خدمت انجام دینے لگے۔ پھر دسمبر ۱۹۰۶ء میں صوبہ بہار کے شہر آرہ میں آل انڈیا اہل حدیث کانفرس کا قیام عمل میں آیا تو اس سے کچھ عرصہ بعد حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری نے پنجاب میں اہل حدیث انجمنوں کے قیام کا سلسلہ شروع کیا۔ اسی اثنا میں انجمن اہل حدیث جہلم قائم کی گئی۔ پھر وہاں اس انجمن کی طرف سے سالانہ تبلیغی جلسے منعقد ہونے لگے۔ پہلا جلسہ ۱۹۱۸ء میں ہوا۔ انجمن اہل حدیث جہلم کا دسواں سالانہ تبلیغی جلسہ دسمبر ۱۹۲۸ء میں بصدارت حضرت قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری منعقد ہوا تھا۔ قاضی صاحب نے اس جلسے میں ''فرائض اہل حدیث'' کے عنوان سے تحریری خطبہ صدارت پڑھا جو ''خطبات سلمان'' میں چھپ چکا ہے۔

اس درازنفسی کا مطلب یہ ہے کہ مولانا عبدالمجید دینا نگری تو تقسیم ملک سے بھی کئی سال بعد جہلم گئے، لیکن مسجد اہل حدیث وہاں ۱۹۰۶ء سے بھی بہت عرصہ پہلے تعمیر کی گئی تھی۔ ائمہ وخطبا کی ترتیب کے اعتبار سے مولانا عبدالمجید دینا نگری اس مسجد کے چودھویں پندرھویں امام وخطیب تھے۔ اگر مولانا نجیب اللہ طارق صاحب مناسب سمجھیں اور اپنے جدامجد کے قیام کی وجہ سے جہلم کی جماعت اہل حدیث کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہیں تو اس فقیر کی کتاب ''دبستانِ حدیث'' میں حافظ عبدالغفور جہلمی سے متعلق میری گزارشات ملاحظہ فرمالیں۔

(۲۔ دسمبر ۲۰۱۳ء)

مولانا محمد یٰسین ظفر

(ولادت یکم جنوری ۱۹۵۶ء)

صحت مند، پورا قد، گندمی رنگ میں سرخی کی آمیزش، تیکھے نقوش، موٹی آنکھیں، کشادہ پیشانی، چوڑا سینہ، مضبوط کندھے، حلیم الطبع، متانت پسند، متحمل مزاج، شیریں گفتار، نرم لہجہ، بلند اخلاق، ملنسار، خوش لباس، مہمان نواز، دوستوں کے دوست، علماء کے قدردان، سب کے ہمدرد، طلباء کے لیے رحم دل، اچھے مقرر، تجربہ کار مدرس اور بہترین منتظم، بیدار مغز۔ حالات پر نظر رکھنے والے۔ یہ ہیں ہمارے دوست مولانا محمد یٰسین ظفر جو یکم جنوری ۱۹۵۶ء کو ملائیشیا کے دارالحکومت کوالالمپور میں پیدا ہوئے۔ ابھی وہاں تعلیم کا آغاز کیا ہی تھا کہ ۱۹۶۳ء میں ان کے والد چودھری فتح محمد اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان آ گئے اور چک نمبر ۹۵ گ ب نواں جمشید (تحصیل جڑاں والا ضلع فیصل آباد) میں قیام پذیر ہوئے۔ یٰسین ظفر نے پرائمری تک گاؤں میں تعلیم پائی اور مڈل درجہ اول میں چک نمبر ۹۸ گ ب میں پاس کیا۔

ان کے والد احناف کے دیوبندی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ بیٹے نے مڈل کے امتحان میں کامیابی حاصل کی تو انھوں نے اسے دینی تعلیم دلانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے وہ انھیں ساہیوال کے دارالعلوم جامعہ رشیدیہ میں داخل کرانا چاہتے تھے۔

اس مقصد کے لیے بیٹے کو ساتھ لے کر گھر سے چلنے لگے تو اتفاقاً گاؤں کی مسجد کے خطیب و امام مولانا غلام محمد مرحوم تشریف لے آئے۔ انھوں نے کہا ساہیوال یہاں سے دور ہے، بہتر ہوگا کہ اسے لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کے مدرسہ دارالقرآن والحدیث میں داخل کرا دیا جائے۔ خود مولانا موصوف نے بھی وہیں سے سند فراغ لی تھی۔ یٰسین کے والد کو یہ تجویز پسند آئی اور دوسرے روز مولانا ممدوح انھیں فیصل آباد لے گئے۔ مدرسے کے مہتمم حضرت مولانا عبداللہ ویرووالوی مرحوم نے بخوشی داخلہ دے دیا۔ دینی مدارس میں رمضان المبارک کے بعد عام طور پر ۱۰ شوال تک طلباء کو داخل کیا جاتا ہے، لیکن یہ اس سے دو مہینے بعد عید اضحیٰ سے دوسرے دن وہاں پہنچے تھے۔ بہرکیف مولانا غلام محمد کی وساطت سے داخلے کا مرحلہ آسانی سے طے ہوگیا۔

یہ ۱۹۷۱ء کا زمانہ تھا اور مشرقی پاکستان میں جنگ ہو رہی تھی۔ مغربی پاکستان کی سرحدوں پر بھی ہندوستانی فوج نے حملے شروع کر دیے تھے۔ ۱۶ دسمبر کو پاکستانی جرنیل عبداللہ نیازی نے ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں

ہندوستانی فوجوں کے جرنیل جگجیت سنگھ اڑورا کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اب پاکستان کی ۹۰ ہزار سے زائد فوج ہندوستان کی گرفت میں آ گئی تھی اور اسے مختلف مقامات میں قید کر دیا گیا تھا۔ دنیا کی جنگی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ اتنی بڑی تعداد میں کسی ملک کی فوج دشمن کی قید میں آئی۔ پانچ ہزار کے قریب فوجیوں پر دشمن نے کورٹ مارشل کا منصوبہ بنالیا تھا۔

اس جنگ کے نتیجے میں مشرقی پاکستان، بنگلہ دیش بن گیا اور اس کے بعد پاکستان میں بنگلہ دیش نامنظور کے نعرے گونجنے لگے۔ ہڑتالیں ہونے لگیں اور جلسے جلوس کے ہنگامے زور پکڑ گئے جس سے تعلیم کا سلسلہ بھی متاثر ہوا۔ دارالقرآن والحدیث کے مہتمم حضرت مولانا عبداللہ ویرووالوی مرحوم طلباء پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ کسی کو سیاسی جلسوں میں جانے اور جلوسوں میں شریک ہونے کی اجازت نہ تھی، ان کے نزدیک طلباء کا کام صرف پڑھنا اور اساتذہ کا کام پڑھانا تھا۔

سیاسی تحریکوں میں شامل ہونا اور ان میں حصہ لینا ہرگز ان کا کام نہیں۔ طلباء و اساتذہ کے متعلق ان کا یہ نقطہ نظر بالکل صحیح تھا۔ طلباء کو پڑھنے میں مشغول رہنا چاہیے اور اساتذہ کو پڑھانے میں۔ میدان میں آ کر نہ انتخابات میں کسی کی حمایت یا مخالفت کی جائے نہ جلسوں میں نعرے بازی۔

مولانا عبداللہ مرحوم سمیت مدرسے میں متعدد لائق ترین اساتذہ فرائض تدریس سرانجام دیتے تھے، جن میں مولانا محمد خاں، مولانا غلام اللہ ربانی، صوفی گلزار احمد، مولانا حافظ عبدالرحمٰن اور مولانا عبدالقیوم ایم اے کے اسمائے گرامی لائق تذکرہ ہیں۔ تمام اساتذہ بڑی محنت اور لگن سے پڑھاتے تھے۔

یٰسین ظفر تعلیم شروع ہونے کے چوں کہ دو مہینے بعد مدرسے میں داخل ہوئے تھے، اس لیے انھیں صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں بہت مشکل معلوم ہوتی تھیں، لیکن محنت اور دلچسپی سے پڑھتے تھے، اس لیے تمام کتابیں جلد ہی ازبر ہو گئیں۔ انھوں نے پانچ سال اس مدرسے میں تعلیم حاصل کی۔ اب ان کے دل میں میٹرک کا امتحان دینے کا جذبہ ابھرا، لیکن اس مدرسے میں میٹرک کا امتحان دینے کی اجازت نہ تھی۔ وہاں اسی مدرسے کے نصاب کے مطابق تعلیم حاصل کرنا ضروری تھا۔ اس کے لیے بعض اساتذہ سے مشورہ کیا تو انھوں نے جامعہ سلفیہ میں داخل ہونے کا مشورہ دیا۔ یہ ۱۹۷۴ء کی بات ہے۔ عیدالفطر کے بعد داخلے شروع ہوئے تو جامعہ سلفیہ کے ایک استاد حافظ عبدالستار حسن سے بات کی جن سے ان کے کچھ مراسم تھے۔ ان کی معرفت جامعہ میں داخلہ مل گیا۔ جامعہ کے صدر میاں فضل حق مرحوم تھے اور مدیر تعلیم مولانا عبیدالرحمٰن مدنی اور ناظم دفتر تھے مولانا محمد حنیف ونیس۔ میاں فضل حق کی کوشش سے جامعہ سلفیہ کا الحاق مدینہ یونیورسٹی سے ہو گیا تھا اور جامعہ کے بعض طلباء وہاں چلے بھی گئے تھے۔

جامعہ سلفیہ میں مولانا عبدالعلیم یزدانی، مولانا محمد یونس بٹ، مولانا عبدالواحد بلتستانی اور مولانا مسعود احمد جانباز محمد یٰسین ظفر کے ہم جماعت تھے اور وہاں جن اساتذہ سے فیض پایا وہ تھے حافظ ثناء اللہ مدنی، مولانا محمد عبدہ الفلاح، حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی، مولانا قدرۃ اللہ فوق، مولانا محمد صدیق، مولانا محمد اسحاق، مولانا عبداللہ بھٹوی، مولانا عبیدالرحمٰن مدنی، حافظ عبدالستار حسن، شیخ حسن راشد جو آج کل برمنگھم میں مقیم ہیں، شیخ علی مرشد، شیخ علی اسماعیل اور بعض دیگر حضرات۔

۱۹۷۷ء میں یٰسین ظفر نے جامعہ سلفیہ سے فراغت پائی۔ حافظ ثناء اللہ مدنی کی شفقت سے انھیں جامعہ سلفیہ کے ناظم لائبریرین مقرر کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ابتدائی درجوں کے طلباء کو پڑھانے بھی لگے تھے۔ اس وقت جامعہ کے مدیر تعلیم مولانا ابوحفص عثمانی تھے۔ وہ اس سے الگ ہو گئے تو یہ منصب حافظ ثناء اللہ مدنی کے سپرد ہوا، جب کہ مولانا یٰسین ظفر کو ناظم دفتر بنا دیا گیا۔ ایک سال انھوں نے یہ فریضہ انجام دیا۔ پھر ۱۹۷۸ء میں مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا اور وہ مدینہ منورہ چلے گئے۔

مدینہ یونیورسٹی میں انھیں کلیۃ الدعوۃ واصول الدین میں داخلہ ملا۔ اس کے ساتھ ہی یہ جامعہ سلفیہ کے مندوب کے طور پر بھی کام کرتے تھے۔ وہاں تعلیم کے دوران انھوں نے پاکستانی حج مشن میں تین سال بطور خدام الحجاج خدمات سرانجام دیں۔ اسی دوران ۱۹۸۰ء میں مصر کا مطالعاتی سفر کیا اور ڈیڑھ مہینا ان کا قاہرہ میں قیام رہا۔ وہاں بے شمار اہل علم سے ملاقات کے مواقع میسر آئے۔

۱۹۸۲ء میں مدینہ یونیورسٹی کا نصاب مکمل کیا اور سند لی تو مولانا محمود احمد میرپوری مرحوم اور مولانا عبدالکریم ثاقب کی کوشش سے بطور مبعوث برطانیہ میں ان کا تقرر ہوا۔ لیکن ابھی تقرری کے کاغذات تیار ہو رہے تھے کہ اتفاقاً میاں فضل حق مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے واپس جامعہ سلفیہ آنے کا حکم دیا۔ اب برطانیہ جانے کا معاملہ ختم ہوا اور یہ دسمبر ۱۹۸۲ء میں فیصل آباد جامعہ سلفیہ آ گئے۔ اس وقت جامعہ سلفیہ کے مدیر تعلیم حافظ مسعود عالم تھے اور اساتذہ کی جماعت میں حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی، مولانا قدرت اللہ فوق، مولانا محمد یونس بٹ، مولانا نجیب اللہ طارق اور مولانا عمر فاروق سعیدی شامل تھے۔ مدینہ یونیورسٹی نے ایک سال بعد تمام مبعوثین کی تنخواہیں بند کر دیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر مبعوث اساتذہ جامعہ سلفیہ سے چلے گئے، صرف مولانا یٰسین ظفر اور مولانا محمد یونس بٹ وہاں موجود رہے، جو آٹھ مہینے بلا تنخواہ خدمت تدریس انجام دیتے رہے۔

۱۹۸۵ء کے تعلیمی سال میں حافظ مسعود عالم جامعہ ابوبکر کراچی تشریف لے گئے۔ ان کی جگہ ڈاکٹر حافظ عبدالرشید اظہر مرحوم کو مدیر تعلیم بنایا گیا جو اس وقت مکتب الدعوۃ لاہور میں کام کرتے تھے اور ہفتے میں دو تین

دن کے لیے جامعہ سلفیہ آتے تھے۔ بعض وجوہ کی بنا پر انھوں نے بھی استعفا دے دیا۔

۱۹۸۶ء کے تعلیمی سال کے اختتام پر جامعہ سلفیہ کمیٹی کا اجلاس جامعہ کے محاسب حاجی سردار محمد کے مکان پر منعقد ہوا تو اس میں دیگر امور کے ساتھ جامعہ کے نئے مدیر تعلیم کے تقرر سے متعلق بھی غور ہوا۔ اس کے لیے میاں فضل حق نے مولانا یٰسین ظفر کا نام پیش کیا، جس کی تمام ارکان نے تائید کی اور تعاون کا یقین دلایا۔ موصوف ۲۸ سال سے اس منصب پر فائز ہیں اور بہترین طریقے سے خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ تدریس کا فریضہ بھی ادا کر رہے ہیں۔ وہ تاریخ اسلام، الادیان والفرق الضالہ، اسلام کا اقتصادی نظام، کتاب التوحید، فقہ السیرۃ اور السیاسۃ الشرعیہ کے اسباق طلباء کو باقاعدگی سے پڑھا رہے ہیں۔

مولانا ممدوح ۱۹۸۸ء سے مسلسل سعودی عرب کا دورہ کر رہے ہیں۔ ان دوروں میں انھوں نے وہاں کی سرکاری اور غیر سرکاری تنظیموں اور یونیورسٹیوں سے جامعہ سلفیہ کا تعارف کرایا اور اس کی تعمیر و ترقی کے لیے ان سے تعاون حاصل کیا۔ ان دوروں میں میاں فضل حق مرحوم ان کے شریک سفر ہوتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے میاں نعیم الرحمٰن طاہر کو جامعہ کے صدر بنایا گیا تو وہ ان کے ساتھ جانے لگے۔ وہ بھی ۲۴ اپریل ۲۰۱۱ء کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ بے شک میاں فضل حق اور ان کے بیٹوں اور خاندان کے اہل ثروت نے جامعہ سلفیہ کے ساتھ بے حد مالی تعاون کیا۔ انھوں نے اپنے دوستوں سے بھی اس کے لیے تعاون لیا۔ جامعہ کا قیام اپریل ۱۹۵۵ء میں عمل میں آیا تھا۔ میاں صاحب اس اجلاس میں شامل تھے، جس میں جامعہ کی بنیاد رکھی گئی، لیکن مرکزی حیثیت کی تنظیم میں گوجراں والا کے سالانہ اجلاس کے بعد شامل ہوئے جو ۱۳، ۱۴، ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو علامہ خلیل عرب مرحوم کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ اس طرح میاں صاحب کا شمار جامعہ کے بانیوں میں نہیں ہوتا، لیکن انھوں نے جامعہ کی تعمیر و ترقی کے لیے مالی تعاون سب سے زیادہ کیا۔ چونکہ ان کا شمار مال دار لوگوں میں ہوتا تھا، اور مال دار لوگوں سے ان کے تعلقات بھی تھے، اس لیے وہ بھی ان کی بات مانتے اور جامعہ کی مالی مدد کرتے تھے۔

بات مولانا یٰسین ظفر کے بارے میں ہو رہی تھی۔ وہ جامعہ سے تعاون کے سلسلے میں دو مرتبہ کویت اور عرب امارات بھی گئے اور اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔

بطور مدیر تعلیم انھوں نے جامعہ کی بڑی خدمت کی۔ ان کے عہد میں اس میں نظم و نسق قائم ہوا۔ اس کا تعلیمی معیار بلند ہوا۔ قابل ترین اساتذہ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ متعدد عالمی شہرت کی علمی شخصیات نے جامعہ کا دورہ کیا۔ جامعہ میں تشریف لانے والی اہم شخصیات کے تحریری طور پر تاثرات لیے گئے اور ان کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا گیا۔

جامعہ کی پرانی عمارت منہدم کر کے نئی شان دار عمارت بنائی گئی۔ جامعہ میں بہت بڑی نئی مسجد تعمیر کی گئی۔ جدید تعلیم کے حصول کا انتظام کیا گیا۔ امتحانات میں باقاعدگی ہوئی۔ طالب علم کے فارغ التحصیل ہونے کے بعد کسی موضوع پر مقالہ لکھنا ضروری قرار دیا گیا۔ نئی طرز کی جامعہ تعمیرات کرنے کے لیے کئی ایکڑ زمین خریدی گئی اور اس میں تعمیر کا آغاز کیا گیا۔

یہ منصوبہ ان شاء اللہ جلد مکمل ہو جائے گا۔

وفاق المدارس السلفیہ کے امتحانات کا سلسلہ باقاعدگی سے شروع ہوا۔ اس کا پہلا امتحان ۱۹۷۸ء میں ہوا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۸۶ء میں اس کا مرکزی دفتر جامعہ سلفیہ میں منتقل کیا گیا۔ اس کے ناظم بھی مولانا یٰسین ظفر ہیں۔ انھوں نے سرکاری اور غیر سرکاری تعلیمی اجلاسوں میں اس کی نمائندگی کا فریضہ انجام دیا۔

جامعہ سلفیہ کی طرف سے مختلف اوقات میں علمی مجلّے بھی شائع ہوتے رہے، جن کی ادارت مولانا ممدوح نے کی۔ ان مجلوں میں ماہنامہ الہدیٰ، ماہنامہ الجامعہ اور ماہنامہ السراج شامل ہیں۔ اب ماہنامہ ''ترجمان الحدیث'' شائع ہو رہا ہے۔ اس کے بانی دراصل علامہ احسان الٰہی ظہیر تھے اور وہی اس کے مدیر تھے۔ ان کی شہادت کے بعد اس کی ادارتی ذمہ داری پروفیسر ساجد میر نے اٹھائی۔ لیکن انھوں نے اسے ۱۹۹۲ء میں جامعہ سلفیہ کے حوالے کر دیا۔ اس کے مدیر اعلیٰ مولانا یٰسین ظفر ہیں اور مدیر ہیں حافظ فاروق الرحمان یزدانی۔ یہ مجلّہ مختلف علمی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اگرچہ بعض مالی مجبوریوں کی بنا پر اس کی اشاعت میں کچھ تعطل بھی آیا تاہم یہ جاری ہے اور اس کے مندرجات کا دلچسپی سے مطالعہ کیا جاتا ہے۔

مولانا یٰسین ظفر کو بہت سی قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کے مواقع ملے اور ان کانفرنسوں میں انھوں نے مقالے پڑھے۔ اس کی تفصیل یہ ہے: (۱) سیرت کانفرنس اسلام آباد (۲) دعوت اسلام کانفرنس بہ عنوان شیخ محمد بن عبدالوہاب برمنگھم برطانیہ (۳) بین الاقوامی کانفرنس بہ عنوان جنگی قیدی، اسلام اور بین الاقوامی قانون۔ اسلام آباد (۴) بین الاقوامی کانفرنس قوموں کی ترقی میں منصوبہ بندی کی اہمیت (۵) بین الاقوامی تعلیمی کانفرنس استنبول ترکی (۶) قیام امن میں مذہب کا کردار بنکاک تھائی لینڈ (۷) موجودہ عالمی چیلنجز اور اس کا حل، جکارتہ انڈونیشیا (۸) موجودہ تنازعات اور ان کا حل استنبول ترکی (۹) تعلیمی چیلنجز اور ان کا حل، اسلام آباد۔

علاوہ ازیں انھیں جن ممالک میں جا کر جامعہ سلفیہ کا تعارف کرانے کا موقع ملا وہ یہ ہیں: سعودی عرب، کویت، بحرین، متحدہ عرب امارات، مصر، برطانیہ، سری لنکا، مالدیپ، ترکی، انڈونیشیا، تھائی لینڈ۔

میاں فضل حق اور ان کے خاندان کے ساتھ ان کے گہرے مخلصانہ تعلقات تھے۔ میاں صاحب کے

ساتھ کم و بیش بیس سال سفر و حضر میں گزارے۔ میاں صاحب مرحوم ان پر بہت اعتماد کرتے تھے، بالخصوص جامعہ سلفیہ کے نظم و نسق کے سلسلے میں انھیں مکمل اختیارات حاصل تھے۔ میاں صاحب کی وفات کے بعد ان کے بیٹوں خاص طور پر میاں نعیم الرحمٰن طاہر کے ساتھ جامعہ کی ترقی اور نئی عمارت کی تعمیر کے بارے میں ہم آہنگی رہی۔

مولانا یٰسین ظفر نے جامعہ سلفیہ کے علاوہ بعض دیگر تدریسی اداروں کی تعمیر و ارتقا میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ ان اداروں میں صوبہ سندھ کا ایک معروف ادارہ جامعہ بحر العلوم السّلفیہ (میر پور خاص) قابل ذکر ہے۔ اس کے مہتمم حاجی محمد اسماعیل میمن تھے۔ وہ اپنے بعض رفقاء کے ساتھ ایک مرتبہ جامعہ سلفیہ تشریف لائے اور میاں فضل حق سے ملے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ جامعہ بحر العلوم کے نظم و نسق اور سلسلہ تعلیم کو بہتر بنانے کے لیے قابل اساتذہ فراہم کیے جائیں۔ میاں صاحب نے وہاں کے حالات معلوم کرنے اور مدرسے کا جائزہ لینے کے لیے مولانا یٰسین ظفر کو میر پور خاص بھیجا۔ انھوں نے وہاں کچھ دن رہ کر جو رپورٹ مرتب کی اور جو منصوبہ تیار کیا اسے پڑھ کر میاں صاحب نے جامعہ سلفیہ کے استاذ مولانا عبدالحی عابد کو اس کا شیخ الحدیث بنا کر وہاں بھیجا اور بعض دیگر اساتذہ کا انتخاب بھی کیا گیا۔ اس منصوبہ بندی کے مطابق مسلسل سات سال کام کیا گیا اور جامعہ بحر العلوم کا شمار بہترین تدریسی اداروں میں ہونے لگا۔ جامعہ بحر العلوم کے فارغ التحصیل طلباء کو ایک سال کے لیے جامعہ سلفیہ میں رکھا گیا، جہاں انھوں نے فراغت پائی اور تربیت حاصل کی۔ ان میں ایک ہمارے دوست مولانا افتخار احمد ازہری تھے۔ انھوں نے جامعہ سلفیہ سے فراغت کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے مصر کی جامعہ ازہر میں داخلہ لیا اور وہاں کا نصاب تعلیم مکمل کر کے واپس جامعہ بحر العلوم (میر پور) میں آ کر سلسلۂ تدریس کا آغاز کیا اور اس کے شیخ الحدیث مقرر کیے گئے۔ انھوں نے وہاں "بحر العلوم" کے نام سے ایک مجلّہ بھی جاری کیا، جس کے کئی خاص ضخیم نمبر شائع ہوئے۔ ان نمبروں میں حضرت شاہ محبّ اللہ راشدی اور حضرت شاہ بدیع الدین راشدی نمبر شامل ہیں۔

علاوہ ازیں متعدد کتابیں شائع کیں۔ ان کتابوں میں مقالات راشدی خاص طور پر قابل ہیں جو کئی جلدوں پر مشتمل ہیں۔ جامعہ بحر العلوم صوبہ سندھ کا بہترین تعلیمی ادارہ ہے، جس میں متعدد فاضل اساتذہ شائقین علم کو تعلیم دینے پر متعین ہیں۔ یہ ادارہ جہاں اس کے شیخ الحدیث مولانا افتخار احمد ازہری اور وہاں کے اساتذہ و معاونین کے لیے صدقہ جاریہ ہے، وہاں میاں فضل حق مرحوم اور مولانا محمد یٰسین ظفر کے لیے بھی باعث اجر و ثواب ہے۔

جامعہ سلفیہ کے قیام کے بعد فیصل آباد کے اردگرد کے دیہات میں تبلیغی اور دعوتی سلسلہ شروع کیا گیا تھا جو کچھ عرصے کے بعد ختم ہو گیا تھا۔ مولانا یٰسین ظفر نے کوشش کر کے اسے دوبارہ شروع کیا اور جامعہ کے

مدرس مولانا عبیداللہ اظہر بعض طلباء کو اپنے ساتھ لے جا کر دیہات میں تبلیغ کرنے لگے۔ دوبارہ شروع کرنے کے بعد ابتدا میں کچھ مشکلات پیش آئیں۔ پھر اللہ کی مہربانی سے آہستہ آہستہ سلسلہ ٹھیک ہو گیا اور دیہات کے لوگ اس میں دلچسپی لینے لگے۔

اسی طرح گرمیوں میں علاقہ گلیات، ایوبیہ، توحید آباد وغیرہ میں پہلی مرتبہ میاں فضل حق کی کوشش سے سلسلہ تبلیغ کا آغاز ہوا تھا۔ جامعہ کے انتہائی درجوں کے اساتذہ مولانا ثناء اللہ ہوشیارپوری مرحوم اور شیخ الجامعہ حافظ عبدالعزیز علوی نے ایک ماہ وہاں قیام کیا اور درس و تدریس فرمانے لگے۔ اب جامعہ کے بعض اساتذہ اور طلباء اس نواح میں جاتے اور فریضہ تبلیغ ادا کرتے ہیں۔ اس پورے علاقے میں تبلیغی جلسے منعقد کیے جاتے ہیں اور خطبات جمعہ کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ عرصہ دراز سے جاری ہے۔ اس باب میں میاں فضل حق، بعد ازاں میاں نعیم الرحمٰن اور ان کی وفات کے بعد ان کی اہلیہ محترمہ اور جناب حافظ صائم صاحب کی خدمات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

بہرکیف جامعہ سلفیہ کے لیے مولانا یٰسین ظفر کی مساعی ہر اعتبار سے قابل قدر ہیں۔ ان کی شب و روز کی محنت کا اعتراف کرنا چاہیے۔ اساتذہ بھی ان کے رویے سے خوش ہیں اور طلباء بھی مطمئن۔ اتنی بڑی تعداد سے دن رات نباہ کرنا، ہر ایک کے مزاج کے مطابق گفتگو کرنا، ان کی ضروریات کا خیال رکھنا اور آنے جانے والوں سے بھی میل جول رکھنا بہت مشکل کام ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے یہ سب کام بحسن و خوبی انجام دیے جا رہے ہیں۔

مالدیپ کے طلباء بھی جامعہ سلفیہ میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ مولانا یٰسین ظفر ان کا بالخصوص خیال رکھتے تھے۔ سیکڑوں کی تعداد میں یہ طلباء مالدیپ میں موجود ہیں اور وہ جامعہ کے بہت بڑے خادم ہیں۔ وہاں کے مشہور عالم مولانا محمد اسماعیل سے ان کے دوستانہ مراسم ہیں اور دونوں ایک دوسرے کا بے حد احترام کرتے ہیں۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ مولانا محمد یٰسین ظفر کو اپنے نیک مقاصد میں کامیابی عطا فرمائے۔ وہ جس خدمت میں مصروف ہیں اسے قبول فرمائے اور انھیں اجر جزیل سے نوازے۔ آمین۔

(۲۰۔ دسمبر ۲۰۱۳ء)

مولانا محمد یونس بٹ

(ولادت ۴۔ اپریل ۱۹۵۶ء)

گورا رنگ، پورا قد، گول چہرہ، کشادہ جبیں، چوڑا سینہ، موٹی آنکھیں، گداز جسم، کھلے ہاتھ پاؤں، چوڑے کندھے، خوش پوش، نرم کلام، اچھے خطیب، منجھے ہوئے مدرس، حسن اخلاق کی دولت سے مالا مال۔ یہ ہیں مولانا محمد یونس بٹ جو ۴۔اپریل ۱۹۵۶ء کو ساہیوال کے پرنامی محلے کے ایک دینی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسم گرامی محمد یعقوب اور دادا کا عبداللہ تھا۔ یہ لوگ تقسیم ملک کے زمانے میں امرتسر سے ساہیوال آئے اور پھر اسی شہر کو اپنا مسکن قرار دے لیا۔

ان کے محلے کی مسجد رحمانیہ میں جامعہ تعلیم الاسلام کے نام سے ایک مدرسہ جاری تھا، جس میں متحدہ پنجاب کے ممتاز عالم دین مولانا عبداللہ (کھپیاں والی) کے عالم و فاضل فرزند حافظ عبدالمنان مرحوم طلباء کو تعلیم دیتے تھے۔ محمد یونس بٹ ان سے زیادہ استفادہ تو نہ کر سکے تاہم انھیں ان کے دروس و خطبات سننے کا موقع ملا۔

اس مسجد کے امام ایک بزرگ حافظ مظفر احمد خاں تھے۔ وہ بچوں کو قرآن مجید حفظ کراتے تھے۔ بٹ صاحب نے ان سے چند سپارے حفظ کیے۔ اس وقت یہ ساہیوال کے گورنمنٹ ہائی سکول میں پڑھتے تھے۔ ۱۹۷۱ء میں میٹرک پاس کیا تو حافظ صاحب مرحوم کے ترغیب دلانے پر جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) آ گئے۔ جامعہ کا تعلیمی سال ختم ہونے میں صرف تین مہینے باقی تھے۔ انھوں نے محنت کر کے تین مہینوں میں اس سال کی تمام نصابی کتابیں پڑھ لیں اور امتحان میں اچھے نمبروں میں کامیابی حاصل کی۔

محمد یونس بٹ کو اللہ تعالیٰ نے ذہانت کی نعمت سے نوازا تھا۔ انھیں تحصیل علم کا شوق بھی تھا۔ دوسرے سال انھوں نے دو جماعتوں کا تحریری صورت میں امتحان دیا اور کامیاب ہوئے۔

دینیات کی پوری مروجہ تعلیم جامعہ سلفیہ میں حاصل کی۔ ان کے اساتذہ کرام تھے حافظ عبداللہ بڈھیمالوی، مولانا سلطان محمود جلال پوری، حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی، مولانا محمد صدیق، حافظ بنیامین طور، مولانا علی محمد سلفی، مولانا عبدالوہاب بلتستانی، مولانا قدرت اللہ فوق، مولانا عبدالسلام کیلانی، مولانا عبیدالرحمٰن مدنی، حافظ عبدالستار حسن، حافظ ثناء اللہ مدنی، ڈاکٹر حسن راشد بلتستانی، شیخ ابوبکر الجزائری، شیخ محمد مختار الشنقیطی اور

بعض دیگر حضرات۔ڈاکٹر محمد سلیمان اظہر اس زمانے میں جامعہ سلفیہ میں انگریزی پڑھاتے تھے، یونس بٹ صاحب میٹرک پاس تھے، انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے کچھ عرصہ انگریزی پڑھی۔

مولانا محمد یونس بٹ ہمیشہ متحرک اور فعال رہے۔جامعہ کے طلباء میں تقریری اور خطابتی ذوق پیدا کرنے کے لیے ''النادی الاسلامی'' کے نام سے ایک تنظیم بنائی گئی تھی۔بٹ صاحب اس کے سرگرم رکن تھے۔اسی طرح انھوں نے چند طلباء کے ساتھ مل کر ''بزم اطفال'' تشکیل دی جو ہر مہینے ایک قلمی مجلّہ جاری کرتی تھی۔اس کا مقصد طلباء کی تحریر و کتابت سے شناسائی پیدا کرنا تھا۔

جامعہ سلفیہ میں بٹ صاحب کے ہم جماعت مولانا محمد یٰسین ظفر (موجودہ پرنسپل جامعہ سلفیہ) مولانا عبدالعلیم یزدانی (خطیب جامع مسجد اہل حدیث جھنگ) مولانا عبدالواحد بلتستانی،مولانا محمد علی جوہر بلتستانی اور چند دیگر حضرات تھے جو اب مختلف مقامات میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں،اور جامعہ میں ان کے قریبی دوستوں میں سے ڈاکٹر حافظ عبدالرشید اظہر (مرحوم) حافظ عبدالحمید ازہر (اسلام آباد) حافظ مسعود عالم (جن کا ترجمہ گزشتہ صفحات میں مرقوم ہے) مولانا مبشر احمد مدنی،مولانا محمد شریف چنگوانی (ناظم مرکز ابن القاسم الاسلامی ملتان) کے نام قابل ذکر ہیں۔

مولانا محمد یونس بٹ ۱۹۷۱ء میں جامعہ سلفیہ میں داخل ہوئے تھے، چھے سال انھوں نے جامعہ میں تعلیم حاصل کی۔۱۹۷۷ء میں اس سے فارغ ہوئے اور سند لی۔ان کا شمار جامعہ سلفیہ کے ذہین طلباء میں ہوتا تھا۔

تحصیل علم کے ساتھ ساتھ ہمارے اس لائق تکریم دوست نے ۱۹۷۷ء کی اس تحریک میں بھی حصہ لیا اور کچھ عرصہ جیل میں رہے جو پاکستان کی جمہوری حکومت کے خلاف امریکہ کی انگیخت پر بعض سیاسی اور دینی جماعتوں نے شروع کی تھی۔اس ہنگامے کا مرکز لاہور تھا۔شاہ احمد نورانی لاہور آئے تو انھوں نے اس کا نام تحریک نظام مصطفیٰ رکھ دیا حالاں کہ اس میں نظام مصطفیٰ کے مطالبے کی کوئی بات نہ تھی۔اس تحریک کے نتیجے میں ملک میں مارشل لا نافذ ہوا۔مارشلائی حکومت میں تمام جماعتوں کو وزارتیں دی گئیں اور اہل حدیث حضرات کے حصے میں صرف قید اور پولیس کے ڈنڈے آئے۔لیکن چونکہ ان کی نیت نیک تھی اور ہم لوگ ماشاء اللہ ہر کام نیک نیتی سے حصولِ ثواب کے لیے کیا کرتے ہیں،اس لیے بارگاہ الٰہی سے انھیں ثواب مل گیا ہوگا۔جن لوگوں کو وزارتیں دی گئیں تھیں،کچھ عرصے کے بعد فوج نے ان کو بھی چلتا کیا اور تمام محکموں پر خود قابض ہوگئی۔پھر گیارہ سال کسی کو بولنے نہیں دیا گیا۔وہ نظام مصطفیٰ جس میں ہمارے عزیز دوست مولانا محمد یونس بٹ صاحب سمیت بہت سے اہل حدیث حضرات نے حصہ لیا تھا،کدھر گیا اور کہاں گم ہوا،اس کا آج تک کسی کو پتا نہ چلا۔یہ بھی عدم پتا افراد کی فہرست میں شامل ہوگیا۔اب اسے چراغ رخ زیبا لے کر

ڈھونڈتے رہیے۔

میں نے کہیں لکھا ہے کہ میں اس ہنگامے کے زمانے میں ادارہ ثقافت اسلامیہ سے منسلک تھا اور ''فقہائے ہند'' کے نام سے کتاب لکھ رہا تھا۔ اس سلسلے میں میرا زیادہ تر وقت پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری میں گزرتا تھا۔ یہ لائبریری ان دنوں انارکلی بازار کے قریب کچہری روڈ پر تھی۔ ایک دن میں نیلا گنبد کی مسجد میں عصر کی نماز پڑھ کر باہر نکلا تو دیکھا کہ چوک میں مولانا فضل الرحمٰن بن محمد ازہری چند لوگوں سے باتیں کر رہے تھے۔ مولانا ممدوح ان دنوں مسجد مبارک اہل حدیث میں خطبہ جمعہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ انھوں نے مجھے فرمایا کل آپ جمعہ مسجد مبارک میں پڑھیں، اس لیے کہ میری ''درخواست'' پر کل جمعہ مفتی محمود پڑھائیں گے۔

(مفتی صاحب اس ''تحریک'' کے قائدین میں سے تھے اور مسلکاً دیوبندی حنفی تھے۔)

میں نے مولانا فضل الرحمٰن ازہری سے عرض کیا کہ میں نے کبھی کسی کے خلاف تعصب کا اظہار نہیں کیا۔ میرے نزدیک "صلوا خلف کل بر و فاجر" کی رو سے مفتی صاحب یا ان جیسے کسی اور کی اقتدا میں نماز ہو جاتی ہے، لیکن کل میں ان کی اقتدا میں جمعہ نہیں پڑھوں گا اس لیے کہ یہ خالص سیاسی جمعہ ہے جو مفتی صاحب کی اقتدا میں پڑھا جائے گا۔ کیا کبھی کسی حنفی عالم نے بھی کسی اہل حدیث خطیب کو اپنی مسجد میں جمعہ پڑھانے کے لیے کہا ہے۔؟ آپ نے ان کو جمعہ پڑھانے کی ''درخواست'' کر کے غلطی کی ہے۔ میں اس غلط کام میں شریک نہیں ہوں گا۔

معلوم نہیں میرے قابل احترام فاضل دوست مولانا فضل الرحمٰن بن محمد ازہری صاحب کو اس فقیر کی یہ بات یاد ہے یا نہیں، لیکن مجھے یاد ہے۔

چلیے چھوڑیے ان باتوں کو۔ مجھے دراصل عرض یہ کرنا ہے کہ مولانا محمد یونس بٹ ۱۹۷۷ء میں جامعہ سلفیہ سے سند فراغ لینے کے بعد اللہ کی مہربانی سے اسی سال مدینہ یونیورسٹی میں داخل ہو گئے اور وہاں کے کلیۃ الشریعہ میں چار سال تعلیم حاصل کی۔ وہاں انھوں نے جن اساتذہ کرام سے استفادہ کیا۔ ان میں شیخ عبدالمحسن محمد العباد، شیخ عبدالحلیم حسن ہلالی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ ۱۹۸۲ء میں وہ مدینہ منورہ سے واپس آئے اور آتے ہی جامعہ سلفیہ میں سلسلہ تدریس شروع کر دیا۔ انھوں نے پاکستان میں ابتدا سے آخر تک پوری مروجہ تعلیم جامعہ سلفیہ میں حاصل کی اور تدریس کا آغاز بھی اسی جامعہ میں کیا۔ بلاشبہ یہ اس پر داد کے مستحق ہیں۔ دوران تعلیم جامعہ سلفیہ کے علاوہ کسی مدرسے میں نہیں گئے۔ اللہ تعالیٰ اس مرد باہمت اور عالم استقلال پیشہ کو خوش رکھے۔ آمین۔

اب آیئے ان کے تلامذہ کی طرف: یہ بھی ماشاء اللہ علم و تدریس اور ترجمہ وتصنیف میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ان میں سے چند حضرات کے نام پڑھیے: مولانا عبدالخالق مدنی (کویت) ڈاکٹر عبدالقادر، ڈاکٹر طاہر محمود (اسلام آباد) ڈاکٹر عتیق الرحمٰن، قاری نوید الحسن لکھوی، قاری عبداللطیف ساجد، حافظ مسعود رشید۔ان کے علاوہ بے شمار حضراتِ علما وطلبا۔

یہ سطور ۱۶ فروری ۲۰۱۳ء کو لکھی جارہی ہیں اور بٹ صاحب کو جامعہ سلفیہ کی مسند درس پر متمکن ہوئے تیس برس سے زائد عرصہ بیت چکا ہے۔

اس اثنا میں ان سے بے شمار تشنگان علوم نے اپنی علمی پیاس بجھائی اور اب وہ خود تدریسی، تحریری اور خطابتی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔اللہ ان سب کا حامی و ناصر ہو۔

جامعہ سلفیہ میں انھوں نے وہاں کے نصاب کے مطابق مختلف موضوعات کی جو کتابیں پڑھائیں اور پڑھا رہے ہیں ان میں یہ کتابیں شامل ہیں:

نخبة الاحاديث، ترجمته القرآن، شرح ابن عقيل، تلخيص المفتاح، سراجى، البلاغته الواضحة، الفوائد الجليله، اصول التخريج، اصول القدريس، اصول الفقه، شرح نخبة الفكر، بدايته المجتهد، جامع ترمذى، سنن ابى دائود، صحيح مسلم، صحيح بخارى دوسرا حصه۔ مشكوٰة المصابيح، تفسير فتح القدير، شرح العقيدة الطحاويه، حاضر العالم الاسلامى، تقابل الاديان، تاريخ الادب العربى، فتح المجيد، كتاب التوحيد، الروضة النديه، ديوان متنبى، ديوان حماسه اور حجته الله البالغه۔

دینی مدارس کا انداز تدریس ملاحظہ ہو کہ ایک مدرس تفسیر بھی پڑھا رہا ہے، حدیث بھی پڑھا رہا ہے۔اصول حدیث بھی پڑھا رہا ہے، علم نحو بھی پڑھا رہا ہے، تاریخ ادب عربی بھی پڑھا رہا ہے، علم میراث بھی پڑھا رہا ہے، عربی ادبیات بھی پڑھا رہا ہے، عقائد کی کتابیں بھی پڑھا رہا ہے اور پڑھانے سے پہلے ان تمام موضوعات کی کتابوں کا دلجمعی سے مطالعہ کرتا ہے۔یعنی پوری تیاری کے ساتھ کلاس میں آتا اور ہر موضوع کے طلباء کے سوالات کا وضاحت سے جواب دیتا ہے۔سکولوں، کالجوں اور سرکاری یونیورسٹیوں سے یہ بالکل الگ انداز تدریس ہے۔وہاں ایک استاد صرف ایک مضمون پڑھاتا ہے اور وہ بھی صرف ایک گھنٹا یا پون گھنٹا اور جو تنخواہ لیتا ہے، وہ چالیس پچاس ہزار سے لے کر لاکھوں تک پہنچتی ہے۔پھر چھٹیاں بھی بے حساب کی جاتی ہیں۔

جامعہ سلفیہ میں تدریس کے دوران (۱۹۸۴ء میں) بٹ صاحب نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے

عربی کا امتحان پاس کیا۔

بٹ صاحب تدریس کے ابتدائی زمانے ہی سے جامعہ سلفیہ کے نظم ونسق میں بھی حصہ لیتے رہے ہیں۔طلباء کی نگرانی کرنا، ان کی ضروریات کا خیال رکھنا، ہرقسم کا ریکارڈ ترتیب دینا، دفتری امور باقاعدگی سے انجام دینا،طلباء کے امتحانات کے پرچے چھپوانا اوراس قسم کے بہت سے کاموں کی انجام دہی میں ان کا بہت بڑا حصہ ہےاوروہ بہترین منتظم ہیں۔

مولانا محمد یونس بٹ بہت اچھے خطیب بھی ہیں۔وہ ۱۹۹۸ء سے جامعہ سلفیہ کی مسجد میں خطبۂ جمعہ ارشاد فرمارہے ہیں۔رمضان المبارک میں وہ روزانہ نماز فجر کے بعد درس قرآن دیتے ہیں۔

بٹ صاحب ترجمہ وتصنیف کا بھی ذوق رکھتے ہیں۔انھوں نے ایک عربی کتاب صفات الامر بالمعروف ونہی عن المنکر کا اردو ترجمہ کیا جو بین الاقوامی اشاعتی ادارے دارالسلام (لاہور) کی طرف سے ''راہ حق کے تقاضے'' کے نام سے چھپا۔ایک اورعربی کتاب شیخ علی محمد صلابی کی تصنیف ''السیرۃ النبویہ'' ہے۔اس کا بھی انھوں نے ترجمہ کیا اوراسے بھی دارالسلام نے شائع کیا۔علم فرائض پربھی انھوں نے کتاب لکھی ہے جو ابھی تک چھپی نہیں۔ممکن ہے اس کتاب (چمنستان حدیث) کی اشاعت تک چھپ جائے۔

یہ حضرات جامعہ سلفیہ کی آبرواورجلیل القدر خدامِ کتاب وسنت ہیں۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ اس عالی نصیب عالم ومعلم کوخوش رکھے اور یہ ہمیشہ کتاب وسنت کی خدمت میں مشغول رہیں۔آمین یارب العالمین۔

(۱۶۔فروری ۲۰۱۳ء)

مولانا عبدالمعید عبدالجلیل (علی گڑھ)

(ولادت ۱۹۵۶ء)

موجودہ دور کے ہندوستانی علماء کی فہرست ماشاء اللہ بڑی طویل ہے اور علم وحرکت کے مختلف میدانوں میں ان کی تگ ودو کا سلسلہ بھی قابل رشک ہے۔ ان میں ایک مشہور عالم مولانا عبدالمعید ہیں۔ ان کے والد کا اسم گرامی عبدالجلیل ہے، اس لیے وہ عبدالمعید عبدالجلیل کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ اسی نام سے ان کے بہت سے مضامین پندرہ روزہ ''ترجمان'' (دہلی) میں پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ترجمان ہی میں ان کا ایک مرتبہ ایک طویل مضمون اس فقیر کے متعلق چھپا، جس کا عنوان تھا ''محمد اسحاق بھٹی کی تذکرہ نگاری۔ ہم عصر تذکرہ نگاروں کے پس منظر میں''۔ بعض ہندوستانی اہل علم سے خط کتابت یا ٹیلی فون کے ذریعے رابطہ ہو جاتا ہے، لیکن مولانا عبدالمعید سے نہ کبھی میری خط کتاب ہوئی، نہ کبھی ٹیلی فون پر بات چیت کا موقع ملا۔ مگر انھوں نے میرے متعلق جو مضمون لکھا، وہ بہت سی معلومات کا احاطہ کیے ہوئے تھا اور ظاہر ہے اسے پڑھ کر انسانی فطرت کے مطابق مجھے خوشی ہوئی۔ یہ مضمون ''ترجمان'' کے حوالے سے پہلے ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں چھپا۔ پھر ایک کتاب میں شائع کیا گیا جو فیصل آباد کے مولانا محمد رمضان یوسف سلفی نے مرتب کی ہے۔ ابتدا میں ایک خاصا طویل مضمون جناب مرتب کا اپنا تحریر کردہ ہے، باقی متعدد دیگر حضرات کے مضامین ہیں جو انھوں نے پاکستان کے مختلف رسائل وجرائد میں میرے بارے میں لکھے۔ اس کتاب کا نام ہے ''مورخ اہل حدیث محمد اسحاق بھٹی۔ حیات وخدمات''۔ ۲۴۰ صفحات کی یہ کتاب ادارہ جامعہ رحمانیہ ناصر روڈ سیالکوٹ کی طرف سے حضرت مولانا محمد علی جانباز مرحوم ومغفور کے فرزند گرامی صاحب زادہ عبدالحنان ایم اے کے اہتمام میں خوب صورت انداز میں شائع کی گئی ہے۔ اس میں مولانا عبدالمعید عبدالجلیل کا مضمون پندرہ صفحات میں پھیلا ہوا ہے جو صفحہ ۱۸۴ سے شروع اور ۱۹۹ پر ختم ہوتا ہے۔ مضمون انھوں نے میری کتابیں اور مضامین پڑھ کر لکھا۔ اس غائبانہ کرم فرمائی پر میں ان کا بے حد شکر گزار ہوں۔

مولانا عبدالمعید ہندوستان کے صوبہ یوپی کے ضلع بلرام پور کے ایک گاؤں چیوٹھوا میں ۱۹۵۶ء میں پیدا ہوئے۔ ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزرا کہ اس گاؤں کی زمینداری ان کے پردادا کو گھوڑ دوڑ کے انعام میں ملی تھی۔ اسی وقت سے یہ لوگ اس گاؤں میں آباد ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ اصلاً ہندوستانی نہیں ہیں،

صدیوں پہلے ان کے اجداد میں سے کوئی صاحب ترکستان سے غوری فوج کے ساتھ ہندوستان آئے اور پھر یہیں کے ہو

عبدالمعید نے تعلیم کی ابتدا گاؤں کے مکتب سے کی اور بسم اللہ موضع ''بیت ناز'' کے میاں محمد یونس نے کرائی۔ ایک حادثے میں میاں صاحب کا انتقال ہو گیا تو عبدالمعید کو تلو کپور (ڈہوا) کے مکتب میں داخل کرا دیا گیا اور پھر وہیں درجہ اول و دوم کی تعلیم مکمل ہوئی۔ درجہ سوم میں کچھ دن بسکو ہر کے مدرسہ محمدیہ میں پڑھتے رہے۔ انہی دنوں خود ان کے گاؤں میں مدرسے کی تعمیر ہوئی تو اس میں آ گئے۔ پھر کچھ دنوں بعد سرکاری پرائمری سکول میں درجہ پنجم میں داخل کرا دیے گئے۔ درجہ پنجم مکمل کرنے کے بعد دوبارہ مدرسے میں چلے گئے۔ پڑھنے میں اتنے تیز اور ذہین تھے کہ مکتب کی پانچ سالہ تعلیم تین سالوں میں مکمل کر لی۔ ڈھائی سال اردو میڈیم میں گزرے اور آدھا سال ہندی میڈیم میں۔

ہندی میں درجہ پنجم میں کامیابی کے بعد ان کے والد ان کو عصری تعلیم دلانا چاہتے تھے، لیکن یہ دوبارہ مدرسے میں جانے پر مصر تھے۔ آخر باپ کو بیٹے کی بات ماننا پڑی اور انھوں نے گاؤں کے مدرسہ محمدیہ میں فارسی پڑھنا شروع کر دی۔ فارسی کے چند ابتدائی رسائل پڑھے اور اس زبان سے کچھ شناسائی ہوئی تو مولانا عبداللہ بسکوہری سے گلستان اور بوستان پڑھیں۔ یہ مکمل ہوئیں تو اخلاقِ محسنی پڑھنے لگے۔

دو سال فارسی پڑھنے کے بعد عربی تعلیم کا آغاز ہوا اور باکورۃ الادب، پنج گنج اور نحو میر وغیرہ کتابیں پڑھائی گئیں۔ یہ کتابیں بھی فارسی کے استاذ مولانا عبداللہ بسکوہری سے پڑھیں۔ بعد ازاں مولانا عبدالسمیع رحمانی سے وہاں کے نصاب کے مطابق تیسری جماعت میں ترجمہ قرآن، بلوغ المرام، ازہار العرب، ھدایۃ النحو اور علم الصیغہ وغیرہ کتابیں مکمل کیں۔ مذکورہ بالا سب کتابیں اپنے گاؤں کے مدرسہ محمدیہ میں پڑھی گئیں۔

۱۹۶۹ء کے آخر میں نئے تعلیمی سال کا آغاز ہوا تو یہ جامعہ رحمانیہ (بنارس) چلے گئے اور وہاں تیسری جماعت میں داخلہ ملا۔ تیسری اور چوتھی جماعتوں کی تکمیل وہیں کی اور دو سال میں وہاں کے ایک فاضل مدرس مولانا عزیز احمد ندوی سے خوب استفادہ کیا۔ اس کے بعد جامعہ سلفیہ (بنارس) میں داخلہ لیا، لیکن جامعہ میں چند مہینے ہی رہے ہوں گے کہ موضع بونڈیہار کے مدرسے میں چلے گئے۔ اب نیا تعلیمی سال شروع ہوا تو دوبارہ جامعہ سلفیہ آ گئے۔ ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۷ء تک وہاں تعلیم حاصل کی۔ وہیں دراصل ان کا شعور بیدار ہوا اور نصابی کتابوں کے علاوہ دوسری کتابوں کے مطالعہ کی عادت پڑی۔ جامعہ میں ان کے ہم سبق و ہم درس طلبا میں جناب عزیر شمس اور ڈاکٹر بدر الزمان نیپالی جیسے شائقین علم کے نام آتے ہیں، جنھوں نے آگے چل کر بڑا نام پایا، بالخصوص عزیر شمس صاحب نے بہت سے تحقیقی کام کیے۔

جامعہ سلفیہ میں طالب علمی کے دور میں شیخ الجامعہ اور اساتذہ کے نزدیک عبدالمعید کو اس قدر قابلِ اعتماد گردانا گیا کہ ہاسٹل کے کمروں کی تقسیم کے بعد اس کی نگرانی ان کے سپرد ہوئی۔ پھر خود انھوں نے چار چار کمروں کے الگ الگ نگران مقرر کیے۔ تحریر و تقریر کے سلسلے میں طلباء کی ایک خاص ٹیم تیار کرنے کی ذمہ داری بھی ان کو سونپی گئی۔ یہ اہم کام انھوں نے بڑی محنت اور دلچسپی سے کیا۔

اس زمانے میں عربی اور اردو کی مختلف موضوع کی کتابوں کا انھوں نے خوب مطالعہ کیا۔ جامعہ کی لائبریری کی کتابیں بھی پڑھ ڈالیں اور ندوۃ الطلباء کی لائبریری کے نئے اور پرانے رسائل و جرائد لجمعی اور غور سے پڑھے۔ کتبِ تاریخ کا بالخصوص مطالعہ کیا، پھر رجال اور ان میں سے بھی رجال اہل حدیث پر خاص توجہ رہی۔ برصغیر اور دیگر علاقوں کی سیاسی تاریخ بھی ان کا موضوعِ مطالعہ تھی۔ بنارس کی ہندو یونیورسٹی کے شعبہ ہائے اردو، عربی اور فارسی کو بھی انھوں نے کھنگالا۔ بنارس شہر کی دوسری لائبریریوں کی بھی سیر کی اور بے شمار کتب و رسائل ان کی نظر سے گزرے۔ غرض جامعہ سلفیہ کی طالب علمی کے پانچ سالوں میں انھوں نے اپنی دلچسپی کی لاتعداد کتابوں کا مطالعہ کیا جس سے انھیں بے حد فائدہ پہنچا اور فکر و عمل کی راہیں متعین کرنے میں مدد ملی۔ ادبی ذوق پیدا ہوا، تحقیقی زاویہ نظر نے کروٹ لی اور سوچ بچار کی نئی منزلیں سامنے آئیں۔

۱۹۷۷ء میں انھوں نے جامعہ سلفیہ کا نصاب مکمل کیا اور سندِ فراغ لی۔ اسی سال جامعہ محمدیہ مالیگاؤں میں انھیں مدرس مقرر کر لیا گیا۔ اس اثنا میں ندوۃ العلماء لکھنؤ جانے کا منصوبہ بھی زیرِ غور آیا اور علی گڑھ کے طبیہ کالج میں داخلے کی بھی تیاری ہوئی، لیکن ۱۹۷۸ء میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے وائس چانسلر شیخ عباد ہندوستان آئے تو انھوں نے اہل حدیث کے مشہور مدارس کا دورہ کیا۔ جامعہ محمدیہ مالیگاؤ کے سالانہ جلسے میں بھی شرکت فرمائی۔ اس وقت مولانا عبدالمعید وہیں مدرس تھے۔ انھوں نے شیخ عباد سے ملاقات کی۔ شیخ نے جامعہ سلفیہ (بنارس) کے دس طلبا کے لیے جامعہ اسلامیہ میں داخل کرنے کی خاص طور پر بشارت سنائی۔ ''عشرہ مبشرہ'' کی اس فہرست میں مولانا عبدالمعید کا نام بھی مرقوم تھا اور یہ اپنے رفقا کے ساتھ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ وہاں انھوں نے ''كلية اللغه'' میں داخلہ لیا۔ بعد میں اس پر افسوس ہوا کہ ''كلية الحديث'' میں داخلہ کیوں نہ لیا گیا۔

چار سال یہ كلية اللغة میں پڑھتے رہے۔ اس کے بعد ایم اے میں داخلے کے لیے انٹرویو دیا، جس میں یہ کامیاب ہوئے، لیکن کئی ہندوستانی طالب علم چار سالہ نتیجے کے اعتبار سے ان سے آگے تھے، اس لیے داخلے کے لیے انھیں ترجیح دی گئی، وہ داخل ہو گئے اور یہ داخل نہ ہو سکے۔ بعد ازاں جامعہ ام القریٰ (مکہ مکرمہ) میں داخلے کے لیے کوشش کی گئی، لیکن اس میں بھی داخلہ نہ ملا۔

۱۹۸۲ء میں وہ اپنے وطن ہندوستان واپس آئے اور جامعہ سلفیہ (بنارس) میں بہ طور مدرس خدمت انجام

دینے لگے۔ اب مختلف مقامات ومضامین میں ان کے داخلے اور امتحانات کا قصہ سنیے۔ ۱۹۸۴ء میں انھوں نے اقتصادیات میں بی اے کرنے کا پروگرام بنایا اور اس کے لیے بنارس ہندو یونیورسٹی کے ڈی اے وی کالج میں داخلہ لیا۔ لیکن امتحان دینے کی نوبت نہ آئی، اس لیے کہ ۱۹۸۵ء کے آخر میں یہ بنارس چھوڑ کر بہ طور مبعوث فیجی چلے گئے تھے۔ فیجی میں ساؤتھ پیسفک یونیورسٹی کے انگلش کورس میں داخلہ لیا لیکن امتحان یہاں بھی نہ دے سکے۔ ۱۹۸۷ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں ایم اے میں داخلہ لیا لیکن فیجی سے نہ آ سکے، اس لیے امتحان نہ دیا جا سکا۔ اس طرح چار پانچ سال نئے نئے امتحانوں میں پھنسے رہے۔ امتحان نہ دینا بھی ایک مستقل امتحان تھا۔

اب ایک اور امتحان کی باری آتی ہے جو طویل عرصے کے بعد اللہ کی مہربانی سے دیا گیا اور اس میں کامیاب ہوئے۔ ۱۹۹۶ء کے اخیر میں فیجی سے ہندوستان واپسی ہوئی اور علی گڑھ میں رہے لیکن کئی سال کسی امتحان کی طرف توجہ نہ ہوئی اور لکھنے پڑھنے میں وقت گزرتا گیا۔ پھر ۲۰۰۱ء میں ایم اے فائنل کا امتحان دیا اور اسی سال یو جی سی کا NET کا امتحان پاس کیا۔

۲۰۰۱ء ہی میں لکھنؤ یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے لیے داخلہ لیا۔ اب اس کی تکمیل کے لیے کوشاں ہیں۔

اس موقع پر ان کے اساتذہ کا پتا کرنا بھی ہمارے فرائض میں شامل ہے۔ اگر ان کے حالات نہیں بیان کر سکتے تو ان کے اسمائے گرامی ہی لکھ دیے جائیں۔ سب کے ناموں کا علم نہیں ہو سکتا تو جن کا علم ہے، انھی کا ذکر کر دیا جائے۔ تو آیئے ان میں سے چند حضرات کے اسمائے گرامی کا ذکر کرتے ہیں۔ انھوں نے اگر پانچ برس کی عمر میں حصول علم کا آغاز کیا ہو تو ۱۹۸۲ء یعنی جامعہ اسلامیہ (مدینہ منورہ) سے فراغت تک اتنے اساتذہ سے مختلف مضامین کی کتابیں پڑھی ہوں گی کہ شاید سب کے نام خود ان کے ذہن میں بھی نہیں رہے ہوں گے۔

بہرکیف ان میں سے چند حضرات کے نام جو بقول ان کے بہت مشہور ہیں، یہ ہیں: مولانا محمد ادریس آزاد رحمانی، مولانا عبدالمعید بناری، مولانا شمس الحق صاحب شیخ الجامعہ، مولانا عبدالوحید رحمانی، ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری، مولانا عابد حسن رحمانی، ڈاکٹر عبدالعظیم شناوی مصری، ڈاکٹر محمد احمد العرب، ڈاکٹر عبدالباسط بدر۔

اب مولانا عبدالمعید کی تدریس کا قصہ سنیے جو بڑا دلچسپ ہے۔ وہ تدریس کو ”دنیا کا سب سے معزز ترین پیشہ“ قرار دیتے ہیں، لیکن ساتھ ہی فرماتے ہیں ”تدریس سے مجھے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہے۔“ وہ ۱۹۸۲ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔ یہ سطور ۹۔ مئی ۲۰۱۳ء کو لکھی جا رہی ہیں۔ اس حساب سے تعلیم سے ان کی فراغت پر ۳۱ سال گزر چکے ہیں۔ اس طویل مدت میں انھوں نے جتنا عرصہ تدریس کی، اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

۱۔ ایک سال جامعہ محمدیہ مالیگاؤں میں ۱۹۷۷ء سے ۱۹۷۸ء تک۔ وہاں کے نصاب کے مطابق پہلی

جماعت سے پانچویں جماعت کے طلباء کو پڑھایا۔

۲۔ ۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۵ء تک تین سال جامعہ سلفیہ (بنارس) میں رہے۔لیکن تدریس ڈیڑھ سال کی۔ اس اثنا میں مقدمہ ابن خلدون، تاریخ الادب العربی اور بعض دوسری کتابیں پڑھائیں۔

۳۔ چندروز دوافریقی طلباء کو انگلش اور عربی کے ذریعے پڑھایا۔

۴۔ فیجی میں تدریس کیا تھی؟ بقول ان کے یہ "ایک مذاق تھا۔" ابتدا میں آٹھ طلبا کو عربی کا ایک کورس پڑھ شروع کیا، لیکن یہ تجربہ نا کام رہا۔ پھر دو طالب علموں کو دو سال پڑھایا اور پورا کورس مکمل کرایا، اس کورس میں شامل تھے "اللغة العربية لغير الناطقين بها" کے دو اجزا اور "قصص النبيين" کے تین اجزا مع قواعد نحو۔ قرآن مجید کا ترجمہ اور چند دیگر کتابیں۔

۵۔ وہیں ایک پولس طالب علم کو جو پہلے سے تھوڑی عربی جانتا تھا کچھ دن بلوغ المرام پڑھائی۔

۶۔ ایک اور تعجب انگیز بات یہ کہ مقدمہ ابن خلدون، تاریخ ادب عربی اور حدیث وفقہ کی بڑی بڑی کتابیں پڑھانے والے اس معلم نے فیجی میں عربی کے نام پر طلباء کو بالکل ابتدائی قاعدہ الف با بھی پڑھایا۔ یہ بھی ایک تدریسی حادثہ ہے۔ قرآن مجید ناظرہ با ترجمہ پڑھانا تو بے شبہ ہر پڑھے لکھے مسلمان پر فرض ہے۔

۷۔ فیجی میں انھوں نے ہائی سکول اور جونیئر ہائی سکول اور مڈل معیار کی اردو زبان کی تدریس بھی کی۔ گیارھویں جماعت کے طلبا کو یہ انگلش میں اسلامیات پڑھاتے رہے۔

۸۔ وہاں کی مختلف مساجد میں درس قرآن کا ہفت روزہ سلسلہ بھی جاری رہا۔

اب آیے مولانا عبدالمعید کی تصنیف وتالیف کی طرف۔

مولانا ممدوح تصنیف وتالیف اور صحافت سے خاص طور پر دلچسپی رکھتے ہیں اور مختلف موضوعات کے سلسلے میں ان کا قلم رواں رہتا ہے۔ ادب وسیاست، سیر وسوانح، تاریخ وتنقید، عقاید اور فقہ وفتاویٰ کے میدانوں میں ان کا اشہبِ قلم خوب جولانیاں دکھاتا ہے۔ اللہ نے ان کو پانچ زبانوں میں اظہارِ فکر کی صلاحیت سے نوازا ہے اور وہ زبانیں ہیں عربی، فارسی، اردو، ہندی اور انگریزی۔ اگرچہ حالات اور ضرورت کی روشنی میں انھوں نے ان سب زبانوں میں لکھا ہے، لیکن اردو میں زیادہ لکھا۔ ان کی اب تک کی تحریرات کی تعداد چھے ہزار صفحات سے زیادہ ہے۔ ان میں انگریزی مواد دوسو صفحات تک پہنچتا ہے۔ یہ صرف کتابوں کے صفحات ہیں، رسائل وجرائد میں تحریر شدہ صفحات ان سے الگ ہیں۔ ان کی بعض ایسی تحریریں بھی ہیں جو اردو سے عربی میں منتقل کی گئیں۔ اور وہ بھی ہیں جن کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا گیا۔ مندرجہ ذیل سطور میں ان کی کتب ومضامین کے نام ملاحظہ فرمایے:

(۱) تعریب کتب الشیخ عبدالرؤف الرحمانی (۲) جحود السنة ورد الآیات علیہ (۳) اخلاق المومن فی

القرآن (۴) اسباب سقوط الخلافۃ (۵) اللہجات العربیہ (۶) رحلۃ اقبال فی جاوید نامہ الی السماء (۷) السید النواب صدیق حسن بین المعارضۃ والتائید (۸) حقیقۃ الحمد والتسبیح فی القرآن (۹) خصائص دعوۃ الشیخ محمد بن عبدالوہاب (۱۰) ترجمۃ أجزاء من کتاب سید بادشاہ کا قافلہ (۱۱) جزء من تاریخ المجاہدین السلفیین (۱۲) الصحوۃ السلامیۃ وحقیقتہا (۱۳) مقالات وبحوث عدیدۃ فی العربیۃ (۱۴) ابوالحسن علی الندوی بأفکارہ وآراءہ (۱۵) مہاترات الحزبین (۱۶) عقیدۃ المؤمن (ترجمہ) (۱۷) سلفی دعوت (ترجمہ) (۱۸) فتح الباب تہذیب وتنقیح (۱۹) ترجمہ خصائص التصور الاسلامی (۲۰) حیاتی احمد۔ امین (ترجمہ) (۲۱) دراسۃ فی السیرۃ (ترجمہ بعض اجزاء) (۲۲) صفۃ صلاۃ النبی (ترجمہ بعض اجزاء) (۲۳) سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ (۲۴) الاسلام بین جہل ابناءہ وعجز علماءہ (ترجمہ) (۲۵) شذ العرف (بعض طلبا کے لیے) (۲۶) نعتیہ مجموعہ (ترجمہ) (۲۷) العمدہ (۱۲ اجزاء) ترجمہ (پی ایچ ڈی مقالے کے لیے) مفت خوروں کے لیے (۲۸) شاہ ولی اللہ پر ایک باب (پی ایچ ڈی کے لیے) (۲۹) فارسی شاعری پر ایک باب (ایم اے کے لیے) (۳۰) نزہۃ الخواطر پر ایک نظر (۳۱) خمار زہد (۳۲) حریم محبت (۳۳) سفر نامۂ حج (۳۴) اسلام میں طہارت کا تصور (۳۵) ایمانیات (۳۶) علمیات (۳۷) کمیونزم (۳۸) ایرانیات (۳۹) سید واڑیات (۴۰) البانیات (۴۱) چند اہل حدیث علما (بلاد عرب) (۴۲) تصوف: چند حقائق (۴۳) زمزم سے گنگا تک (۴۴) شعبان (۴۵) عیدین (۴۶) تراویح (۴۷) انتہا پسندی (۴۸) سنت متضاد رویے (۴۹) چند علماء کی سوانح (۵۰) کربلا (۵۱) تبلیغی جماعت (۵۲) غلام یحییٰ کی کتاب علم العربیہ پر ایک نظر (۵۳) حدائق بخشش کا ایک جائزہ (۵۴) رد باطل (۵۵) المفسدون فی الارض (۵۶) نفاق (۵۷) اسلمۃ المعرفۃ (ترجمہ) (۵۸) لندنی بھائی (۵۹) مسلمان۔ حسینی ندوی کی تقریر ایک جائزہ (۶۰) دیوبندیات (۶۱) فتاویٰ (۶۲) یہ قبریں یہ آستانے (۶۳) دیوان (اردو) (۶۴) دیوان عربی (۶۵) ترجمہ قرآن (۶۶) اسلامی تنظیم کیوں اور کیسے (۶۷) قادیانیات (۶۸) انتقادات (۶۹) خاک سے کاخ تک (۷۰) سعودی عرب۔ ایک تعارف (۷۱) یادحرم پیش لفظ جائزہ (۷۲) مخالفین البانی پر رد (۷۳) اختلافات امت (۷۴) ترجمہ ازالۃ الخفاء الی العربیہ (ایک ربع مکمل) (۷۵) ترجمہ محمدیہ پاکٹ بک (۷۶) الاتجاہات الفکریہ فی شبہ القارۃ الہندیۃ (۷۷) علمیات (۷۸) تقلیدات (۷۹) ادبیات (۸۰) رافضیات (۸۱) اسلام اور رواداری (۸۲) شرک (۸۳) دعوت دین کے اوصاف (۸۴) توحید (۸۵) تحفظ انسانیت (۸۶) ہندوستان کی آزادی میں جماعت اہل حدیث کا حصہ (۸۷) نقد کا منہجی اصول (۸۸) عظمت صحابہ کے چند نقوش (۸۹) تحریکی رجحان (جماعت اسلامی پر نقد) (۹۰) معیار عظمت (۹۱) علماء کے اوصاف (۹۲) صدایات (۹۳) مقدمے (۹۴) اداریے (۹۵) تبصرے (۹۶) رقاق (۹۷) امام

حرم کے خطاب (۹۸) نام نہیں عقیدہ وعمل اہم ہے (۹۹) اصلاح قلب (۱۰۰) خارجیت (۱۰۱) جمعیت کا حال زار (۱۰۲) خصائص امت (۱۰۳) شورائیت (۱۰۴) دعوت اسلامی۔ ایک خاکہ (۱۰۵) اسلام اور امن عالم (۱۰۶) عظمت صحابہ (۱۰۷) دانشوری (۱۰۸) مدارس میں جدید کاری (۱۰۹) اسلام کا اقتصادی نظام (۱۱۰) امریکیات (۱۱۱) اتنی رفعت اتنی پستی (۱۱۲) فھل انتم منکبون

تصنیف وتالیف اور ترجمہ کے علاوہ مولانا عبدالمعید نے ملک اور بیرون ملک میں دعوتی کام بھی بہت کیا۔ کانفرنسوں میں شرکت کی، تقریریں کیں، خطباتِ جمعہ کا سلسلہ جاری رہا۔ قرآن وحدیث کے درس دیے، مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کی طرف سے بھی اور خود اپنے طور پر بھی تبلیغی دورے کیے، ریڈیو پر تقریریں کیں۔ ان کی تقریروں اور دعوتی انداز کی گفتگو سے لوگ متاثر ہوئے اور بدعات ورسوم کو ترک کر کے قرآن وحدیث کے احکام پر عمل کرنے لگے۔ جو لوگ ان کی تقریروں اور تحریروں سے اثر پذیر ہوئے، ان میں سے بعض افراد آج کل امریکہ، کنیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور فیجی وغیرہ میں دعوتی خدمت انجام دے رہے ہیں اور تبلیغ اسلام میں سرگرم ہیں۔

اب آخر میں مولانا کی شادی اور اولاد۔

مولانا ممدوح کی شادی ۴۔ جون ۱۹۷۷ء کو ہوئی تھی۔ اس خاتون کا نام جمیلہ خاتون تھا اور ان کے والد کا نام تھا چودھری محمد یوسف۔ اپنی اس اہلیہ کے ساتھ مولانا نے حج بیت اللہ کیا، اس کی رفاقت میں آسٹریلیا گئے، سنگاپور گئے۔ ۹ سال فیجی رہے۔ دہلی، بمبئی، لکھنؤ، مالیگاؤں، بنارس کی سیر کی۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے پانچ اولادیں ہوئیں۔ ایک بیٹی اور چار بیٹے۔ وہ خاتون بیس برس ان کے عقد میں رہی۔ ۱۹۔ فروری ۱۹۹۷ء کو داغ مفارقت دے گئی۔

دوسری شادی ۲۶۔ جولائی ۱۹۹۷ء کو ہوئی، اس سے ایک بیٹے اور دو بیٹیوں کی ولادت ہوئی۔ پہلی بیوی سے جو بچے پیدا ہوئے، ان کے نام یہ ہیں: بڑی بیٹی حمیدہ، اس سے چھوٹے چار بیٹے، سعید، زیاد، عرفان اور فوزان۔

دوسری بیوی سے جن بچوں کی ولادت ہوئی، ان کے نام یہ ہیں: بڑا بیٹا سلمان، اس سے چھوٹی دو بیٹیاں عائشہ اور کلثوم۔

مولانا نے اپنی زندگی میں بے شمار دور دیکھے اور لاتعداد لوگوں سے ان کی ملاقات ہوئی۔ بعض لوگوں کی طرف سے انھیں تکلیفیں بھی پہنچیں۔ وہ علی گڑھ میں اقامت فرما ہیں اور ایک رسالہ ''الاحسان'' نکال رہے ہیں۔ بمبئی، علی گڑھ اور بسکوہر میں کئی ادارے ان کی نگرانی میں چل رہے ہیں۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ مولانا کی پریشانیاں دور فرمائے اور وہ کتاب وسنت کی تبلیغ واشاعت میں مشغول رہیں۔

(یہ سطور ۹۔ مئی ۲۰۱۳ء کو لکھی گئیں)

مولانا شمیم احمد ندوی

(ولادت دسمبر ۱۹۵۶ء)

جنوبی ایشیا کے ملک نیپال کی سرحدیں ہندوستان سے ملتی ہیں۔ اس میں مسلمان خاصی تعداد میں آباد ہیں، جن میں اہل حدیث، دیوبندی، بریلوی وغیرہ سب شامل ہیں۔ اہل حدیث کے وہاں مدارس بھی ہیں، مساجد بھی ہیں اور مستند علماے کرام بھی ہیں جو اپنے انداز میں حالات کے مطابق قرآن وحدیث کی روشنی میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی عالم دین پاکستان تشریف لائیں تو ازراہِ کرام اس فقیر کو بھی یاد فرماتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ اس خاک نشین کو گھر بیٹھے نیپال کے دیوبندی علما سے ملاقات کا شرف حاصل ہو گیا۔ کسی غائبانہ تعارف کی بنا پر غریب خانے پر ان کا ورود ہوا، سلام دعا ہوئی اور گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔ لیکن یہاں ہم ایک ایسی اہل حدیث شخصیت کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں، جو علم وعمل کی نعمت سے بھی بہرہ ور ہیں اور مال و دولت کے اعتبار سے بھی اللہ نے انھیں آسودگی عطا فرمائی ہے۔

ان سے متعلق اصل کہانی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ سو سال سے زیادہ عرصہ گزرا ہندوستان کے صوبہ یوپی کے موجودہ ضلع بلرام پور کے ایک دور افتادہ گاؤں "دلکو پور" میں ایک بزرگ حاجی نعمت اللہ خاں سکونت پذیر تھے۔ ان کا شمار گاؤں کے اصحابِ ثروت اور سربرآوردہ لوگوں میں ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ نماز روزے کے پابند اور احکامِ شریعت پر سختی سے عامل تھے۔ تقویٰ شعار اور عابد و زاہد۔ ان کے زمانے میں علاقہ نیپال میں زرعی زمین ہندوستان کی بہ نسبت کم قیمت پر مل جاتی تھی، اس لیے ہندوستان کے کچھ لوگ نیپال گئے اور وہاں زرعی زمینیں خرید کر کاشت کاری کرنے لگے۔

حاجی نعمت اللہ خاں نے بھی اپنے بھائیوں حاجی محمد اسحاق اور حاجی محمد امین کے مشورے سے اس مقصد کے لیے نیپال کا قصد کیا اور ہندوستان اور نیپال کی سرحد سے بالکل متصل کوہ ہمالیہ کے قریب موضع "جھنڈا نگر" میں ایک وسیع وعریض قطعہ اراضی خریدا۔ جھنڈا نگر ان دنوں ہندوؤں اور مسلمانوں کی ملی جلی آبادی پر مشتمل ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ جھنڈا نگر کی اس زمین کے ساتھ بیس پچیس کیلومیٹر کے فاصلے پر حاجی نعمت اللہ خاں نے کچھ اور مواضعات بھی خرید لیے، جن کے نام ہیں کدر ہوا، چنن پور، سون پور، سگا نگر، ہرہوا، ہرہٹی، مدرہوا، کھیری اور بنکٹوا۔ یہ تمام مواضعات کاشت کاری کے لیے خریدے گئے تھے اور اس کے نتیجے میں حاجی

نعمت اللہ خاں اس علاقے کے ایک بڑے زمیندار کے طور پر مشہور ہوئے۔ حاجی صاحب اور ان کے بھائیوں نے محنت کر کے ان تمام دیہات کے رقبے میں کاشت کاری شروع کر دی اور اللہ کی مہربانی سے وہ اس میں کامیاب رہے۔ ان کے کارندے بھی ہمت اور دیانت داری سے کام کرتے تھے، جس کی وجہ سے اللہ نے برکت پیدا کی اور کام کی رفتار میں روز بروز تیزی آنے لگی۔

اس زمانے میں جھنڈا نگر اور اس کے قرب و جوار میں کوئی مسجد نہ تھی۔ حاجی نعمت اللہ خاں نے جھنڈا نگر کی اپنی زمین میں ایک مسجد بھی بنالی اور اس کے ساتھ دینیات کی تعلیم کے لیے مدرسہ بھی تعمیر کر لیا۔ مسجد میں امام مقرر کر لیا گیا اور وہاں کے مسلمان اس مسجد میں با جماعت نماز پڑھنے لگے اور مدرسے میں ان کے بچوں نے قرآن مجید اور دینیات کی تعلیم شروع کر دی۔ یہ بے نام مدرسہ تھا جسے لوگ مدرسہ جھنڈا نگر کہنے لگے۔ یہ آج سے ٹھیک سو سال قبل ۱۹۱۴ء کی بات ہے۔ اس مدرسے میں تعلیم کا دائرہ بڑھا اور پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا تو اسے اس کے بانی کے نام سے ”مدرسہ نعمت العلوم“ کہا جانے لگا۔ کچھ عرصے کے بعد اس کی رونق مزید بڑھی تو اسے ”مدرسہ سراج العلوم جھنڈا نگر“ کے نام سے موسوم کیا گیا۔ پھر جلد ہی ایک وقت آیا کہ اس میں طلبا کثرت سے آنے لگے اور اسی نسبت سے مدرسین کی خدمات بھی حاصل کی گئیں۔ پورے نیپال اور ہندوستان میں اس کی شہرت پھیل گئی بلکہ ان دونوں ملکوں کی حدود سے بھی آگے نکل گئی تو اسے ”جامعہ سراج العلوم السّلفیہ“ کہا جانے لگا۔ اس کی بنیاد کچھ ایسی ساعتِ سعید میں رکھی گئی تھی اور ایسے متقی اور اخلاص پیشہ لوگوں کے ہاتھوں سے اس کا آغاز ہوا تھا کہ یہ مدرسہ (یا جامعہ) تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کرنے لگا۔

حاجی نعمت اللہ خاں کا ایثار ملاحظہ ہو کہ انھوں نے اپنے گاؤں سون پور کی تمام زمینیں جو کم و بیش چھ سو بیگھے خام یعنی ایک سو ایکڑ، چار مربعے، پر مشتمل تھیں، مدرسے کی تعمیر و ترقی کے لیے وقف کر دیں۔ سرکاری ریکارڈ کے مطابق پورے ملک نیپال میں اتنا بڑا وقف کسی مذہبی ادارے کے پاس نہیں ہے۔ اس قدر وسیع و عریض زمینیں ہندوستان کے مسلمان بادشاہ تو بے شک دینی تعلیم کے اداروں اور صوفیا کی خانقاہوں کو دیا کرتے تھے، لیکن انفرادی طور پر اتنی بڑی قربانی کی مثال شاید ہی مل سکے۔ پھر انگریزی دورِ حکومت میں کسی مسلمان کا اتنا بڑا ایثار بہت بڑی بات ہے۔

حاجی نعمت اللہ خاں نے ہمالہ کے پڑوس میں ہمالیائی حوصلے کے ساتھ پوری سو ایکڑ اراضی ایک مدرسے کو عطا کر دی۔ اس سراپا خلوص شخص کے حالات جماعت اہل حدیث کے اصحابِ قلم کو جتنی تفصیل سے مل سکیں، لکھنے چاہئیں۔ ایک مرتبہ مولانا سید تقریظ احمد سہسوانی مرحوم کے فرزند گرامی سید ابن احمد نقوی نے دہلی سے میری توجہ اس طرف دلائی تھی کہ علمائے کرام کے حالات کے علاوہ ان اصحابِ ثروت کے حالات سے بھی

لوگوں کو آگاہ کرنا چاہیے جنھوں نے مدارس کی بے حساب مالی مدد کی اور علماے کرام ان مدارس میں تدریسی خدمات سرانجام دینے لگے۔ مالی معاونین کے اس گروہ میں دہلی کے دودمان حاجی علی جان کے ارکان، حاجی حمید اللہ مرحوم، دار الحدیث رحمانیہ کے بانی شیخ عبدالرحمٰن عطاء الرحمٰن اور دیگر بہت سے حضرات شامل ہیں۔ اسی طرح پاکستان میں بھی بے شمار لوگ ہیں جو اپنی استطاعت کے مطابق فریضہ تعاون سرانجام دے رہے ہیں۔ ان کا تذکرہ ضرور ہونا چاہیے تاکہ ان کے مالی ایثار کے واقعات پڑھ کر دوسرے لوگ بھی اس کارِ خیر میں حصہ لیں۔ کتبِ احادیث میں مال دار صحابہ کرام اور دینی ضرورت کے وقت ان کے مال خرچ کرنے کے واقعات مذکور ہیں۔

حاجی نعمت اللہ خاں کے چار بیٹے تھے عبدالرؤف خاں، عبدالرحیم خاں، عبداللہ خاں اور عبدالرحمٰن خاں۔ ان میں سے عبدالرؤف خاں کو حاجی صاحب نے دین کی خدمت کے لیے خالص دینی تعلیم دلائی اور انھوں نے دہلی کے دار الحدیث رحمانیہ سے تعلیم حاصل کی اور مولانا عبدالرؤف خاں رحمانی کے نام سے شہرت پائی۔ وہ بہت بڑے مدرس، بہت بڑے مصنف اور بہت بڑے مقرر تھے۔ وہ خطیب الاسلام کے لقب سے ملقب تھے اور پورے ہندوستان میں ان کی آواز گونجتی تھی۔ عالی ظرف اور عمدہ خصال عالم۔ ان سطور کے راقم سے ان کی خط کتابت کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ حاجی نعمت اللہ خاں کی وفات کے بعد ان کے بھائی حاجی محمد اسحاق خاں جامعہ سراج العلوم السّلفیہ جھنڈا نگر کے ناظم مقرر کیے گئے تو مولانا عبدالرؤف خاں رحمانی کو ان کے معاون بنایا گیا۔ بعد ازاں اس کی نظامت بھی مولانا کے سپرد کر دی گئی اور انھوں نے (چار برسوں کو چھوڑ کر) تادمِ وفات بہ طور ناظم کام کیا۔ اس کے علاوہ تصنیف و تالیف، وعظ و خطابت اور درس و تدریس کے فرائض بھی بحسن و خوبی سرانجام دیتے رہے۔

اب یہ کہانی ایک اور موڑ کاٹتی ہے اور اس کا رخ زیبِ عنوان شخصیت مولانا شمیم احمد ندوی کی طرف ہو جاتا ہے جو ان گزارشات میں مرکزی کردار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ، کشادہ پیشانی، لمبا قد، کرتا پائجامہ، ٹوپی اور واسکٹ یا شیروانی میں ملبوس، یہ ہیں شمیم احمد ندوی جو دسمبر ۱۹۵۶ء میں اپنے آبائی گاؤں ''کدر بٹوا'' میں پیدا ہوئے۔ حاجی نعمت اللہ خاں کے پوتے، مولوی عبدالرحیم خاں کے بیٹے اور مولانا عبدالرؤف خاں رحمانی کے بھتیجے۔ ابھی تین چار سال کے بچے تھے کہ والد محترم (مولوی بعدالرحیم خاں) مرضِ تپ دق میں مبتلا ہو کر عین عالمِ جوانی میں انتقال کر گئے۔ ان کے چچا حضرات نے جو صالح سرشت لوگ تھے، ان کی تعلیم و تربیت کا بہترین انتظام کیا اور والدہ نے بھی اپنی بیوگی کا غم فراموش کر کے اپنے اس اکلوتے بیٹے کو علم کی نعمت سے بہرہ مند کرنے کی پوری کوشش کی، جس میں اللہ نے ان کو کامیابی سے نوازا۔

ناظرہ قرآن مجید اور ابتدائی درجات کی اردو، ہندی اور فارسی کتابیں مولوی زین اللہ سے گھر میں پڑھیں۔ پھر حساب کی کچھ تعلیم بھی انہی سے حاصل کی۔ جھنڈا نگر کے مکتب میں بھی کچھ دن حصولِ تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ انھیں اور مولانا عبدالرؤف ندوی کے پوتے منظور احمد خاں کو (جو بعد میں ڈاکٹر منظور احمد خاں ہوئے) دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ بھیج دیا جائے، چنانچہ سید ابوالحسن علی ندوی کے نام مولانا عبدالرؤف خاں رحمانی کا سفارشی خط لے کر مولانا کے چھوٹے بھائی مولوی عبدالرحمٰن خاں لکھنؤ گئے اور ان دونوں کو ندوہ کے شعبۂ مکتب کے درجہ چہارم میں داخل کر لیا گیا، وہاں ان کے نگران و مربی مولانا محمد مرتضیٰ مظاہری تھے۔ یہ ۱۹۶۶ء کی بات ہے۔

دونوں ذہین لڑکے تھے اور حصولِ علم کے شائق بھی۔ اس لیے جلد ہی اپنے ہم جماعت لڑکوں سے آگے نکل گئے اور پورے مکتب میں ان کی ذہانت کی شہرت پھیل گئی۔ مکتب اور دارالعلوم ندوہ میں انھوں نے ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۶ء تک گیارہ سال تعلیم حاصل کی اور وہاں کا نصاب نہایت محنت اور شوق سے مکمل کیا۔ ندوہ میں ان کے اساتذہ تھے مولانا محمد اویس نگرامی، مولانا ابوالعرفان ندوی، مولانا برہان الدین سنبھلی، مولانا عبدالستار، سید رابع ندوی، مولانا سعید الرحمٰن اعظمی، مولانا نذر الحفیظ ندوی ازہری، مولانا عبدالنور ندوی ازہری اور بعض دیگر حضرات۔

دارالعلوم ندوہ میں یہ دونوں تحریری اور تقریری مقابلوں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ طلباء کی ثقافتی اور ادبی انجمنوں میں بھی یہ پیش پیش رہے۔ امتحانات میں بھی انھوں نے ہمیشہ اول پوزیشن حاصل کی اور اس طرح ندوہ میں تعلیم پانے والے طلبا میں قابلیت وذہانت کے اعتبار سے ان دیہاتی بچوں شمیم و منظور نے بڑی شہرت پائی۔

۱۹۷۶ء میں مولانا شمیم احمد ندوی سندِ فضیلت لے کر واپس وطن آئے تو زمینداری کا سلسلہ بھی سنبھالا جو اللہ کی مہربانی سے بہت پھیلا ہوا تھا اور جس کا انتظام ان کے چچا زاد مولانا عبدالرؤف رحمانی کے اکلوتے فرزند حاجی عبدالرشید خاں کے سپرد تھا۔ علاوہ ازیں گڑ بنانے والی ایک مل بھی تھی۔ اپنے ہم جماعت و ہم درس مولانا عبدالرؤف رحمانی کے پوتے ڈاکٹر منظور احمد کی شراکت میں اینٹوں کا بھٹہ بھی لگایا اور لکڑی کے کاربار کے لیے آرا مشین بھی نصب کرائی، اور بھی بعض تجارتی سلسلے شروع کیے۔ اس کے ساتھ ہی جامعہ سراج العلوم کے انتظام میں بھی دلچسپی لینے لگے۔ دور و نزدیک کے مقامات میں دعوت و تبلیغ کی جدوجہد بھی شروع کر دی۔ خطباتِ جمعہ کا بھی اپنے گاؤں میں باقاعدہ اہتمام ہونے لگا۔ لکھنے پڑھنے اور درس و تدریس کو بھی مرکزِ التفات قرار دیا۔ اس طرح مختلف کاموں کی طرف توجہ ملتفت ہوئی اور اللہ نے توفیق مرحمت فرمائی تو ہر کام ایک خاص انداز سے انجام پانے لگا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد مولانا عبدالرؤف خاں رحمانی نے ان کو جامعہ سراج العلوم کی مجلس عاملہ کا رکن بنا لیا تھا اور پھر تھوڑے عرصے بعد اس کے نائب ناظم مقرر کر لیا گیا۔ اس طرح آہستہ آہستہ انھیں جامعہ کے انتظامی سلسلے میں اپنے عم محترم مولانا عبدالرؤف رحمانی کے دست و بازو کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ مولانا رحمانی نے ان کو تحریر و نگارش کی تربیت بھی دی اور جامعہ سے متعلقہ امور میں لوگوں سے میل جول اور خط کتابت کے معاملات سے بھی آگاہ کیا۔

پھر جب انھیں اندازہ ہوا کہ یہ جامعہ سے متعلق سب امور سے آگاہ ہو چکے ہیں اور اس بڑے ادارے کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو انھیں اس کے ناظم منتخب کر لیا اور ایک دفتر بھی ان کے لیے بنا دیا، جس میں بیٹھ کر وہ جامعہ سے متعلق ضروری امور انجام دیتے تھے۔

طلبا کے سالانہ امتحانات کے سلسلے میں مولانا شمیم احمد ندوی نے فیصلہ کیا کہ وہی طالب علم امتحان میں شرکت کر سکتا ہے جس کی ہر مضمون میں پچھتر فی صد حاضری ہو، جس کی حاضری اس سے کم ہوگی وہ امتحان میں شریک نہیں ہو سکتا۔ اس سے طلبا نے اور بعض دیگر حضرات نے اختلاف کیا، لیکن وہ اپنے اس فیصلے پر قائم رہے، جس کے آگے چل کر بہت اچھے نتائج مرتب ہوئے اور جامعہ کے معیار تعلیم میں اضافہ ہوا۔

مذکورہ بالا مناصب کے علاوہ ماہنامہ ''السراج'' کی ادارت کا منصب بھی مولانا شمیم احمد ندوی کو ملا۔ جامعہ سراج العلوم (جھنڈا نگر) کی طرف سے ''السراج'' کے نام سے اولیں شمارہ جون ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا، جس کے مدیر مسئول مولانا ممدوح تھے۔ انھوں نے اس کا پہلا اداریہ ''اسی کے نام سے آغاز ہے اس ماہنامے کا'' کے عنوان سے لکھا۔ اس کے بعد ہر مہینے بالالتزام ان کے تحریر شدہ اداریے اس رسالے میں چھپنے لگے اور اللہ کے فضل سے باقاعدہ چھپ رہے ہیں۔ ان اداریوں میں تعلیمی، دعوتی، سیاسی، معاشرتی اور اسلامی امور پر بحث کی جاتی ہے۔ نیز عالمی مسائل کا تجزیہ بھی کیا جاتا ہے۔ ان کا لکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ جب اور جہاں وقت ملا بیٹھ گئے اور اداریہ لکھ لیا۔ رسالے کے اجرا پر انیس سال کا عرصہ بیت چکا ہے، اس دوران میں انھوں نے مختلف مسائل پر بے شمار اداریے اور مضامین سپرد قلم کیے۔

مولانا شمیم احمد ندوی ہمیشہ کاموں کے ہجوم میں گھرے رہتے ہیں۔ ۳۰۔ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو ان کے عم مکرم جامعہ سراج العلوم السّلفیہ کے ناظم و مہتمم مولانا عبدالرؤف خاں رحمانی نے وفات پائی۔ ان کے بعد جامعہ کے تمام معاملات کا بوجھ ان کے کندھوں پر آ پڑا۔ جامعہ کے خرچ اخراجات، طلباء کی ذمے داری، اساتذہ کے مشاہرے، کارکنوں کی تنخواہیں، لائبریری کا انتظام اور کتابوں کی خرید و فروخت، لوگوں سے میل ملاقات وغیرہ سب امور سے نمٹنا ان کی ذمے داری میں شامل ہے۔ پھر طلبا کی خطابتی اور تحریری تربیت۔ جامعہ کے تعمیراتی

کام نہایت اہمیت رکھتے ہیں جو اللہ کی مہربانی سے بہ طریقِ احسن انجام پا رہے ہیں۔

تعمیرات کے سلسلے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ گزشتہ کچھ عرصے میں ایک وسیع جامع مسجد تعمیر ہو چکی ہے۔ نیز دس کمروں پر مشتمل درس گاہ، سولہ کمروں پر محیط دار الاقامہ، دار الاقامہ کی اسی قسم کی دوسری بلڈنگ، پچاس ہزار لیٹر کا واٹر ٹینک، ایک ایڈمنسٹریشن بلڈنگ، ایک شفا خانہ، چودہ دکانوں پر مشتمل تجارتی کمپلیکس، مطبخ کی ایک بڑی بلڈنگ، بحمد اللہ یہ سب کام مکمل ہو گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈائننگ ہال کی تعمیر شروع ہے۔ خطیب الاسلام کمپلیکس کا بھی افتتاح ہو گیا ہے۔ جامعہ کی پرانی بلڈنگ منہدم کر کے نئی وسیع بلڈنگ بنائی جا رہی ہے۔ جامعہ کی بعض عمارتیں دو منزلہ اور سہ منزلہ بنائی گئی ہیں۔

ایک بہت اچھا تعلیمی کام مولانا شمیم احمد ندوی نے یہ کیا کہ ۲۰۰۰ء میں ایک مکتب قائم کیا، جس میں دینیات کے اردو، عربی وغیرہ نصاب میں انگریزی، سائنس، سوشل سٹڈیز، جنرل نالج اور جدید حساب کے مضامین بھی شامل کر دیے گئے۔ ابتدا میں یہ سکول درجہ پنجم تک تھا۔ اس میں جامعہ کے علاوہ دوسرے طلبا بھی داخلہ لینے لگے تو یہ سلسلہ جونیئر ہائی سکول تک پہنچا۔ پھر اسے ہائی سکول بنا دیا گیا اور اب یہ نیپال کے محکمہ تعلیم کی طرف سے باقاعدہ تسلیم شدہ سکول ہے۔ اس میں عربی، دینیات، فارسی، ہندی، انگریزی، سائنس، حساب وغیرہ سب مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کا تصنیف شدہ ”چمن اسلام“ کا سلسلہ بھی اس کے نصاب میں شامل ہے۔ اس اسکول میں غیر مسلم بچے بھی شوق سے داخلہ لیتے ہیں اور اس کے نصاب کے مطابق تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان کے والدین اس نصاب سے بہت خوش ہیں۔ اس وقت چھے سو کے قریب طلبا و طالبات اس اسکول میں زیر تعلیم ہیں اور تدریسی عملہ بیس اساتذہ پر مشتمل ہے۔ اس کا نام ”الھلال سکنڈری اسکول“ ہے۔ اللہ تعالیٰ خوش رکھے مولانا شمیم احمد ندوی کو انھوں نے یہ بہت اچھا سلسلہ جاری کیا ہے۔

مولانا شمیم احمد ندوی نیپال کے مسلمانوں کے دینی اور رفاہی کاموں میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔ اس علاقے میں سیلاب آ جائے یا قحط پڑ جائے تو بلا امتیاز مذہب و ملت لوگوں کی بھرپور مدد کرتے ہیں۔ ان کے لیے گندم، آٹا، چاول، کپڑے، لحاف، مہیا کرتے ہیں۔ ان کے پاس خود مدد کے لیے پہنچتے ہیں۔ ان کی مالی مدد بھی کرتے ہیں۔ غریب گھرانوں کے لیے ہر موسم میں ضرورت کی چیزیں مہیا کرتے، ان کی بیٹیوں کی شادیوں کے لیے ان کی مالی امداد کرتے، غریب گھروں میں پانی کے نل اور ہینڈ پمپ کی ضرورت ہو تو ان سے تعاون کے لیے تیار رہتے ہیں۔ کہیں مسجد کی تعمیر اور مدرسے کے قیام کا معاملہ ہو تو انھیں اس راہ میں مالی امداد کر کے خوشی ہوتی ہے۔ رمضان المبارک میں بالخصوص وہ لوگوں کی بھرپور مدد کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں

ان کا ہاتھ کھلا اور دل کشادہ ہے۔ بعض مال داروں کو دیکھا گیا ہے کہ ضرورت مند کے لیے پیسا خرچ کرنا ان کے لیے انتہائی مشکل ہوتا ہے۔ لیکن مولانا شمیم احمد ندوی کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ پیسا خرچ کر کے مسرت محسوس کرتے ہیں۔

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ نیپال پر بہت طویل مدت سے ہندو راج چلا آ رہا تھا اور ایک خاص خاندان کی وہاں حکومت تھی۔ کئی سال پہلے وہاں ایسا انقلاب آیا کہ حکمران خاندان کو ختم کر دیا گیا اور بادشاہت کی جگہ جمہوریت نے لے لی۔ جب جمہوری نظام کے لیے دستور سازی کا مرحلہ سامنے آیا تو تمام مذاہب اور ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے اپنے اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے کوششیں کیں۔ مسلمانوں کے بھی سب فرقوں نے مل کر ''نیپال نیشنل مسلم فورم'' کے نام سے اپنی تنظیم قائم کی۔ اس تنظیم میں جماعت اہل حدیث، دیوبندی، بریلوی اور جماعت اسلامی سبھی جماعتیں شامل تھیں۔ تنظیم کے صدر دو منتخب کیے گئے تھے ایک جماعت اہل حدیث کے مولانا عبداللہ مدنی اور دوسرے صاحب بریلوی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ جنرل سیکرٹری جماعت اسلامی کے ایک صاحب کو بنایا گیا تھا جب کہ نائب ناظم دو تھے، ایک دیوبندی اور ایک بریلوی۔

''نیپال نیشنل مسلم فورم'' نے بہت کام کیا اور حکومت کی طرف سے اس کے بہت سے مطالبات تسلیم کیے گئے۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا شمیم احمد ندوی متحرک اور مستعد اہل علم ہیں اور ماشاءاللہ بہت کام کر رہے ہیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ عمل خیر میں ان کا حامی و ناصر ہو۔ آمین

(یہ سطور ۲۹۔ مئی ۲۰۱۳ء کو لکھی گئیں)

حافظ محمد عباس انجم

(ولادت ۸۔اپریل ۱۹۵۷ء)

غالباً ۱۹۷۷ء کی بات ہے، رمضان المبارک سے دو تین دن پہلے میں حضرت الاستاذ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ نماز تراویح کے لیے ایک حافظ کا انتظام کر دیجیے۔ انھوں نے دوسرے دن جن حافظ صاحب کو بھیجا ان کا حلیہ یہ تھا: اکیس بائیس سال کے نوجوان، چھریرا بدن، سرخی مائل گورا رنگ، تیکھے نقوش، چہرے کے سارے رقبے پر پھیلی ہوئی سیاہ داڑھی۔ معصوم سی شکل، شلوار قمیص پہنے ہوئے۔ نرم لہجے میں بولے میرا نام محمد عباس انجم ہے۔ ضلع گوجراں والا کے قصبہ گوندلاں والا کا رہنے والا ہوں۔ آج کل لاہور کے اخبار ''پاکستان'' میں تھوڑی سی تنخواہ پر کام کرتا ہوں۔ بیڈن روڈ پر اخبار کا دفتر ہے۔ میں سورج غروب ہونے سے پہلے یہاں آیا کروں گا۔ روزہ یہیں افطار کیا جائے گا۔ رات بھی یہیں رہوں گا۔ سحری کے بعد فجر کی نماز پڑھ کر اور کچھ دیر سو کر اپنے دفتر چلا جایا کروں گا۔ رمضان کا پورا مہینا یہی معمول رہے گا۔

میں نے کہا بالکل ٹھیک ہے۔ آپ کے یہاں رہنے، ہمارے ساتھ روزہ افطار کرنے اور کھانے پینے سے ہمیں خوشی ہوگی۔

اس طے شدہ معاہدے کے مطابق پورا مہینا حافظ محمد عباس انجم کا یہی معمول رہا۔ رمضان کی ستائیسویں یا اٹھائیسویں رات کو انھوں نے قرآن مجید ختم کیا اور اس سے دوسرے دن تشریف لے گئے۔ اس کے بعد اس طرف ان کا آنا نہیں ہوا۔

اپنے متعلق انھوں نے جو واقعات لکھ کر مجھے بھیجے ہیں، ان میں اس واقعہ کا ذکر وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''سرمایہ اہل حدیث مولانا محمد اسحاق بھٹی حفظہ اللہ ''الاعتصام'' کے دفتر تشریف لائے اور مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے کہا رمضان آ رہا ہے۔ ہمارے گھر ساندہ میں تراویح کے لیے حافظ چاہیے۔ مولانا نے مجھے بھیجا تو میں نے بھٹی صاحب اور ان کے اہل خانہ کو نماز تراویح پڑھائی۔ فراغت پر بھٹی صاحب نے باقاعدہ خدمت کے ساتھ مجھے رخصت کیا''

اس سے آگے لکھتے ہیں!

"بھٹی صاحب کو اللہ تعالیٰ صحت و عافیت سے نوازیں۔ ان کی یادداشت کا واقعہ بھی سناتا جاؤں۔ وہ گوجراں والا میں کسی جنازے پر تشریف لائے۔ میرے اندازے کے مطابق کم از کم پندرہ برس بیت چکے تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ ہی عرصہ ہوگا۔ پھر درمیان میں کوئی رابطہ بھی نہ تھا۔ میں نے عرض کی بھٹی صاحب آپ نے مجھے پہچان لیا؟ فرمایا لو: آپ تو ہمارے امام حافظ محمد عباس ہیں"

محمد عباس انجم ضلع گوجراں والا کے قصبہ گوندلاں والا میں ۸۔ اپریل ۱۹۵۷ء کو پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد رفیق ہے اور دادا کا اسم گرامی مستری قائم دین تھا۔ محمد عباس انجم نے ہوش سنبھالا تو اپنے دادا کو دیکھا کہ وہ زمینداروں کے ہلوں کے پھالے بناتے، درانتیوں کے دندانے تیز کرتے اور اسی قسم کے کئی دوسرے کام کرتے تھے۔ والد کی آٹا پیسنے کی چکی اور روئی دھننے اور چاول چھڑنے کی مشین تھی۔ اس طرح محنت مزدوری سے گھر کے خرچ اخراجات کا سلسلہ چلتا تھا۔ ان کے والد اللہ کے فضل سے زندہ ہیں اور کچھ عرصے سے انھوں نے آٹا پیسنے کی چکی وغیرہ کا کام چھوڑ دیا ہے اور اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ مشینری کی خرید و فروخت کا کام کرتے ہیں۔

ان کے دادا مستری قائم دین کو جو زمینداروں کا کام کرتے تھے، اس کا معاوضہ سال بھر کے بعد گندم کی گانٹھوں کی صورت میں ملتا تھا، جو وہ کھیتوں سے سر پر اٹھا کر کھلیان میں لاتے تھے۔ پھر ان پر پھلے چلاتے اور ان سے گندم کے دانے نکال کر لایا کرتے تھے۔ جانوروں کے لیے چارہ بھی لایا جاتا تھا۔ اس سارے کام میں محمد عباس اپنے دادا کے ساتھ ہوتے اور ان کی مدد کرتے۔ اب انھیں تعلیم کے لیے سکول میں داخل کرا دیا گیا تھا۔ سکول سے واپس آ کر یہ دادا کے علاوہ آٹے کی چکی کے کام میں والد کا ہاتھ بھی بٹاتے تھے۔

حافظ محمد عباس کے گھرانے کے تمام لوگ مرد اور عورتیں نماز روزے کے پابند اور سخت قسم کے توحید پرست تھے۔ ان کے دادا مستری قائم دین تہجد گزار تھے اور آدھی رات اللہ سے دعا کرتے ہوئے اس قدر روتے کہ ہچکی بندھ جاتی اور اس کی آواز سب گھر والوں کو سنائی دیتی۔ والد نے قرآن نہیں پڑھا، لیکن نہایت متدین اور اللہ کی وحدانیت پر یقین رکھنے والے ہیں۔ دادا، دادی، نانی، والدہ، پھوپی سب باقاعدہ قرآن مجید پڑھتے۔ ان میں سے بعض خواتین نے محلے کی بہت سی عورتوں کو قرآن مجید پڑھایا بھی۔

حضرت حافظ محمد گوندلوی محدث کا گاؤں بھی وہی ہے جو مستری قائم دین کا ہے یعنی گوندلاں والا۔ یہ دونوں چھوٹی عمر میں گاؤں میں اکٹھے ایک ہی استاد سے تعلیم حاصل کرتے تھے اور اکٹھے کھیتوں میں اپنے مویشی چراتے تھے۔ اس لیے دونوں کا آپس میں بڑا تعلق تھا اور دونوں ابتدائی عمر سے عمل خیر کی طرف راغب تھے۔ پھر آگے چل کر حضرت حافظ صاحب باقاعدگی سے تحصیل علم میں مشغول ہو گئے۔ لیکن مستری قائم دین کو یہ مواقع میسر نہ آئے اور وہ مزدوری کرنے لگے۔

فجر کی نماز کے بعد مستری قائم دین چارپائی پر بیٹھ جاتے اور گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا باترجمہ قرآن کی تلاوت کرتے۔حضرت حافظ محمد لکھوی رحمتہ اللہ علیہ کی پنجابی اشعار کی کتابیں اس زمانے کے پنجاب میں بہت پڑھی جاتی تھیں۔ان کی تفسیر محمدی جو سات جلدوں پر مشتمل ہے، پنجاب کے لوگوں میں بڑی مقبول تھی اور بے حد شوق اور اہتمام سے اس کا مطالعہ کیا جاتا تھا۔مستری قائم دین بھی باقاعدہ اسے غور سے پڑھتے تھے۔فرمایا کرتے کہ اس تفسیر کے مصنف حافظ محمد لکھوی میرے اَن دیکھے استاد ہیں۔کام کرانے والے جو لوگ ان کے ہاں آتے، انھیں وہ تفسیر محمدی کے پنجابی اشعار جھوم جھوم کر سناتے اور ان کی تشریح بھی کرتے۔کوئی عالم آجاتا تو اس سے تفسیر کے حل طلب مقامات کا مطلب پوچھتے۔

محمد عباس چھوٹی عمر میں جب مسجد کے امام صاحب سے قاعدہ پڑھ کر گھر آتے تو لوہا گرم کرنے والی بھٹی پر پہیہ لگا کر ان کے دادا ان سے اس پہیے کے چکر لگواتے۔آگ بھڑکتی اور لوہا اور پھالے یا درانتی وغیرہ گرم ہو جاتے تو ہتھوڑے سے اسے کوٹا جاتا۔یہ چونکہ بچے تھے، بعض دفعہ ضد کرتے اور دادا کی بات نہ مانتے تو وہ ڈانٹ ڈپٹ سے کام لیتے۔کسی وقت کام سے بچنے کے لیے یہ روتے تو انھیں حافظ محمد لکھوی کی احوال الآخرت یا تفسیر محمدی کا کوئی شعر سناتے اور کہتے: یہ ایک شعر لاکھ روپے کا ہے۔اس طرح بچپن میں یہ اپنے دادا کے ساتھ کام میں مصروف رہتے۔

سکول کی تعلیم کے زمانے میں یہ قرآن بھی حفظ کرتے تھے۔جس دن انھوں نے قرآن مجید کے چار پارے حفظ کیے، اسی دن ان کا پانچویں جماعت کا نتیجہ نکلا اور یہ کامیاب ہوئے۔اب انھوں نے والدین سے کہا کہ میں سکول میں پڑھوں گا یا قرآن حفظ کروں گا، ان میں سے ایک کام ہوگا، بیک وقت دو کام نہیں ہو سکتے۔انھوں نے کہا تم وہی کرو جو تمھارا جی چاہتا ہے۔جواب دیا میں قرآن حفظ کرنا چاہتا ہوں۔

دادا نے کہا، سوچ لو۔قرآن تب یاد رہتا ہے جب رات کی نیند بھی ختم ہو جائے اور دن کا آرام بھی۔کہا ان شاء اللہ میں ضرور قرآن یاد کروں گا۔پھر اللہ نے ایسے اسباب پیدا کر دیے کہ قرآن مجید حفظ ہو گیا۔ان کے دادا ان سے بہت پیار کرتے اور ان پر نظر عنایت رکھتے تھے۔وہ چاہتے تھے کہ میرا یہ پوتا حافظ قرآن بھی ہو اور عالم فاضل بھی ہو۔یہ بھی دادا کے فرماں بردار تھے۔ان کی تمنا اللہ نے پوری فرما دی۔یہ حافظ قرآن بھی ہو گئے اور عالم بھی بن گئے۔

اب ابتدائی دور سے حفظ قرآن تک کے اساتذہ گرامی کے متعلق سنیے:

انھوں نے سب سے پہلے قاعدہ مولانا محمد اسلم گوندلوی سے پڑھا۔اس کے بعد ناظرہ قرآن مجید شاہ عبدالحی مرحوم سے پڑھا اور پھر نصف قرآن قاری ریاض الحق سے گوندلاں والا کی مسجد ٹھیکے داراں میں پڑھا،

جہاں حضرت حافظ محمد گوندلوی کا مدرسہ قائم تھا۔قاری ریاض الحق سے چار پارے حفظ بھی کیے۔پھر یہی قاری صاحب اپنے اس شاگرد کو حفظ قرآن کے لیے گوجراں والا کی جامعہ اسلامیہ میں قاری محمد یحییٰ بھوجیانی کے ہاں لے گئے۔ وہاں حفظ قران کا انتظام نہیں تھا، تاہم انھوں نے وہیں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ان کی رہائش وہاں اپنے تایا کے گھر میں تھی۔

حفظ قرآن کے بعد قاری محمد یحییٰ بھوجیانی مرحوم نے ان کے گھر جا کر ان کے والدین سے کہا کہ یہ بچہ پڑھنے میں تیز ہے اور پڑھنا چاہتا بھی ہے، اسے کام میں لگا کر ضائع نہ کرو۔اس کو درسِ نظامی کی پوری تعلیم دلاؤ۔ چنانچہ انھیں جامعہ اسلامیہ میں داخل کرا دیا گیا اور یہ تحصیل علم میں مشغول ہو گئے۔ جامعہ اسلامیہ میں انھوں نے حضرت حافظ محمد گوندلوی، مولانا ابوالبرکات احمد مدراسی، مولانا محمد اعظم، حافظ محمد الیاس اثری اور قاری محمد یحییٰ بھوجیانی سے درسی کتابیں پڑھیں اور تقریباً بیس سال کی عمر میں علوم دینیہ کی تعلیم سے فارغ ہو گئے۔

جامعہ اسلامیہ میں ان کے ہم درس تھے، شیخ القراء قاری محمد ادریس عاصم (لاہور) حافظ ثناء اللہ زاہدی (صادق آباد) پروفیسر حافظ عبدالستار حامد (وزیر آباد) پروفیسر محمد اسلم (ریحان چیمہ)، مولانا محمد ارشد (بیگم کوٹ) مولانا محمد بشیر (گجرات) اور بعض دیگر حضرات!

جامعہ اسلامیہ سے فراغت کے بعد مزید تعلیم کے لیے یہ مدینہ یونیورسٹی میں داخل ہونا چاہتے تھے، لیکن گھر کے مالی حالات اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔والد صاحب نے کہا کوئی کام کرو اور گھر کی گاڑی چلاؤ۔ انھوں نے کتابت سیکھی، اور بھی کئی قسم کے کام کرنے کی کوشش کی، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔بعض مقامات پر امامت و خطابت کی کوشش بھی کی۔آخر گوجراں والا کے علاقہ ماڈل ٹاؤن کی مسجد صدیقیہ میں خطابت و امامت کا سلسلہ شروع کیا جو بیس اکیس سال سے جاری ہے۔ جامعہ محمدیہ جی ٹی روڈ میں تدریس کا موقع بھی مل گیا۔بچیوں کے بعض مدارس میں بھی فریضہ تدریس انجام دیا۔ جامعہ اسلامیہ گوجراں والا میں تیرہ چودہ سال ان کا سلسلہ تدریس جاری رہا۔ترجمہ و تصنیف کا کام بھی ہونے لگا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے کرم فرمایا اور آہستہ آہستہ حالات بدل گئے اور پریشانی کا دور ختم ہو گیا۔

جامعہ محمدیہ میں جن علما و طلبا نے ان سے تعلیم حاصل کی، ان کی طویل فہرست میں مندرجہ ذیل حضرات شامل ہیں۔

حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی مدرس جامعہ سلفیہ فیصل آباد و مدیر ماہنامہ ترجمان الحدیث۔ مولانا محمد مالک بھنڈر، مدرس جامع مسجد مکرم گوجراں والا، حافظ ذوالفقار علی مدرس جامعہ ابوہریرہ لاہور، مولانا محمد خالد بشیر مرجالوی مدرس جامعہ محمدیہ گوجراں والا، حافظ عبدالمنان راسخ فیصل آباد اور دیگر بہت سے حضرات۔

ان کے ترجمہ وتصنیف کا سلسلہ اس طرح سے ہے۔

(۱) تفہیم الاسلام شرح بلوغ المرام دو جلدوں میں۔

(۲) پیغمبر امن ﷺ

(۳) جواہر اسلام

(۴) مقالات گوندلوی

(۵) گناہ چھوڑنے کے انعامات

(۶) جناتی اور شیطانی چالوں کا توڑ

(۷) اصحاب رسول کا تذکرہ

(۸) الادب المفرد کی شرح دو جلدوں میں

(۹) تفسیر للنساء: یہ کتاب ان آیات کی تفسیر پر مشتمل ہے جو خواتین سے متعلق ہیں۔

(۱۰) جمع الفوائد۔ چار جلدوں میں

(۱۱) جرابوں اور پگڑی کا مسح

(۱۲) صحیح احادیث کی روشنی میں سیرت نبوی ﷺ۔

(۱۳) تداوی بالقرآن۔ (ان کے علاوہ انھوں نے اور کتابیں بھی تصنیف کیں اور بعض عربی کتابوں کے اردو میں ترجمے کیے۔ ان میں سے بعض چھپ گئی ہیں اور بعض غیر مطبوعہ ہیں۔

حافظ محمد عباس انجم کی شادی ان کے تایا کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ سب سے پہلی اولاد بیٹا تھا، جس کا نام محمد رکھا۔ وہ معذور تھا۔ نہ اٹھ سکتا تھا، نہ بیٹھ سکتا تھا۔ ساڑھے گیارہ سال کی عمر میں وفات پا گیا۔ ایک بیٹی بھی معذور تھی جو سات سال کی عمر میں فوت ہوگئی۔ اس کے بعد ایک بیٹی پیدا ہوئی جو ماشاء اللہ بیٹے بیٹیوں والی ہے۔ حافظ صاحب کے ایک بیٹے کا نام ابوبکر ہے۔ وہ حافظ قرآن اور درس نظامی کے فارغ ہیں۔ گوجراں والا کی ایک مسجد میں خطیب ہیں اور شادی شدہ ہیں۔ ان سے چھوٹی ایک بیٹی ہے۔ یعنی ان کی اولاد اب ایک بیٹا ہے اور دو بیٹیاں۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے ان کے گھریلو حالات بالکل ٹھیک ہیں۔ بعد عسر یسرا والا معاملہ ہے۔

جیسا کہ ابتداء میں عرض کیا گیا، پندرہ بیس برس کے بعد ان سے گوجراں والا میں ایک جنازے میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت انھوں نے مجھے اپنے گھر لے جانے اور کھانے کے لیے بہت اصرار کیا، لیکن میں نے معذرت کی اور واپس لاہور آ گیا۔ اللہ تعالیٰ انھیں اور ان کے اہل وعیال کو خیر وعافیت سے رکھے۔ آمین۔

(یہ سطور ۲۹۔ اپریل ۲۰۱۳ء کو لکھی گئیں)

مولانا عبداللطیف اثری

(ولادت ۶ مارچ ۱۹۵۹ء)

ہندوستان کے صوبہ یوپی کے بے شمار مقامات میں اہل حدیث کثیر تعداد میں آباد ہیں اور علماے کرام درس و تدریس اوتصنیف وتالیف کے ذریعے سے کتاب وسنت کی تبلیغ واشاعت کو اپنا مطمحِ نظر ٹھہراے ہوئے ہیں۔ ان علما کی خوش نصیب جماعت میں ایک معروف عالم مولانا عبداللطیف اثری کا نام بھی آتا ہے، جن کے والد کا اسم گرامی حبیب اللہ ہے۔ مولانا عبداللطیف اثری ضلع بلرام پور کے موضع شنکر نگر میں ۶ مارچ ۱۹۵۹ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے مولد ومسکن موضع شنکر نگر کے مدرسہ محمدیہ نصرۃ الاسلام میں حاصل کی۔ وہاں کے نصاب کی رو سے اس مدرسے میں درجہ پنجم پاس کرنے کے بعد شعبۂ حفظ وتجوید سے قرآن مجید مع تجوید حفظ کرنے کا شرف حاصل کیا۔ اس کے بعد عربی کی ابتدائی جماعتیں یہیں پڑھیں۔ اس سے آگے کی تعلیم کا یہاں انتظام نہیں تھا، لہٰذا اسی ضلعے کے ایک قصبے بونڈ ہیار کے مدرسہ سراج العلوم میں داخلہ لیا۔ اس مدرسے میں صرف ایک سال رہے۔ پھر مئو ناتھ بھنجن چلے گئے اور وہاں کی جامعہ اثریہ دارالحدیث میں داخل ہوئے۔ وہیں سے سندِ فراغت لی۔ اس کے بعد الہ آباد بورڈ سے مولوی، عالم، فاضل دینیات اور فاضل ادب کے امتحانات دیے اور ان میں کامیاب ہوے۔ جامعہ اثریہ میں تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے اپنے نام کے ساتھ اثری کی نسبت اختیار کی۔

ہندوستان کے جن حضرات نے مئو ناتھ بھنجن کی جامعہ اسلامیہ فیض عام سے فراغت پائی، وہ فیضی کہلائے، جنھوں نے جامعہ اثریہ کا نصاب مکمل کیا، وہ اثری کی نسبت سے مشہور ہوئے اور جن اصحابِ علم نے جامعہ سلفیہ (بنارس) میں تعلیم پائی، انھیں سلفی کہا جانے لگا۔ لیکن ہمارے ہاں فیصل آباد کی جامعہ سلفیہ کا کوئی فارغ التحصیل سلفی نہیں کہلاتا۔

مولانا عبداللطیف اثری مئو ناتھ بھنجن کے جامعہ اثریہ سے فارغ التحصیل ہوئے تو انھیں وہیں مدرس مقرر کرلیا گیا اور عربی ادب، فقہ اور بلاغت کی جن کتابوں کی تدریس ان کے ذمے لگائی گئی، وہ تھیں دیوان متنبّی، البلاغۃ الواضحہ، شرح وقایہ اور اس قسم کی دوسری کتابیں۔ مختلف علوم وفنون کی تمام کتابیں انھوں نے نہایت ذوق وشوق سے پڑھانا شروع کیں۔ بعد ازاں تفسیر بیضاوی اور صحیح بخاری جیسی انتہائی درجے کی کتابوں کی

تدریس کا فریضہ بھی انجام دینے لگے۔ جامعہ اثریہ کے ادارہ تحقیقات ونشریات سے متعلق کام بھی ان کے سپرد ہوا اور ادارے کی کئی کتابیں ان کی نگرانی میں چھپیں۔

پھر جامعہ اثریہ کی طرف سے ''آثار جدید'' کے نام سے ماہانہ رسالہ جاری ہوا تو انھیں اس کے ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ یہ خدمت بھی یہ محنت اور مستعدی سے سرانجام دینے لگے۔ مضامین کی فراہمی اور ان کی ترتیب، پھر رسالے کے لیے خود بھی کسی موضوع پر مضمون لکھنا۔ یہ سب مشکل کام ہیں، اللہ کی مہربانی سے یہ سفر بھی خوش اسلوبی سے طے ہونے لگا۔

تدریس وصحافت کی اہم ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ مئو ناتھ بھنجن کے مکتبہ الفہیم کے ارباب انتظام کے کہنے پر انھوں نے تحقیقی کام بھی شروع کر دیا، جس کی طباعت کی ذمہ داری اصحابِ مکتبہ نے قبول کی۔ مولانا محمد جونا گڑھی کی متعدد کتابوں پر مراجعہ اور تحقیق کا کام کیا اور حوالے جدید انداز سے دیے گئے۔ وہ کتابیں ہیں (۱) ارشاد محمدی (۲) امام محمدی (۳) درایت محمدی (۴) سیف محمدی (۵) شمع محمدی (۶) دلائل محمدی (۷) عصائے محمدی (۸) نکاح محمد (۹) طریق محمدی (۱۰) ہدایت محمدی (۱۱) ایمان محمدی (۱۲) فضائل محمدی (۱۳) سراج محمدی

ان کے علاوہ جن کتابوں پر مولانا عبداللطیف اثری نے کام کیا، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ ملبہات ابن حجر کا اردو ترجمہ
۲۔ کیا خضر زندہ ہیں؟ الروض النضر فی حال الخضر کا اردو ترجمہ
۳۔ ایک ہاتھ سے مصافحہ: مولفہ مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری صاحب تحفۃ الاحوذی (تحقیق وتعلیق)
۴۔ بدعت کی حقیقت: (تخریج، تعلیق، تحقیق)
۵۔ حدیث خیر وشر: مولفہ مولانا عبدالمتین میمن جونا گڑھی (تحشیہ وتعلیق)
۶۔ حدیث نماز: مولفہ مولانا عبدالمتین میمن جونا گڑھی (تحشیہ وتعلیق)
۷۔ تحریک آزادیٔ فکر اور شاہ ولی اللہ کی تجدیدی مساعی۔ تصنیف مولانا محمد اسماعیل سلفی (تخریج وتعلیق)
اس کتاب پر ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری نے ایک جامع مقدمہ لکھا۔
۸۔ حقیقۃ الفقہ: مولفہ مولانا یوسف جے پوری (تحقیق، تعلیق، تخریج)
۹۔ کتاب الجنائز: مولفہ مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری (تحشیہ وتعلیق)
۱۰۔ کتاب التوحید: ڈاکٹر صالح بن صالح الفوزان (تحشیہ وتعلیق)
۱۱۔ تحریک اہل حدیث کا مدوجزر: مولفہ مولانا محمد اسماعیل سلفی (تحشیہ وتعلیق)

۱۲۔ خطبات ظہیر: علامہ احسان الٰہی ظہیر کے خطبات

۱۳۔ تقاریر علامہ احسان الٰہی ظہیر (جمع، ترتیب، تصحیح)

۱۴۔ اہل حدیث اور احناف کے درمیان اختلاف کیوں؟ تالیف مولانا محمد جونا گڈھی (تحشیہ وتعلیق)

۱۵۔ احکام اسلام کی حکمتیں (جمع وترتیب)

۱۶۔ خاتمۂ اختلاف: مولفہ مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی (تصحیح وتعلیق)

۱۷۔ وہابی تحریک سے متعلق غلط فہمی کا ازالہ (مراجعہ ونظر ثانی)

۱۸۔ الوسیلہ: علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ (تصحیح وتہذیب)

۱۹۔ بلوغ المرام عربی (اعتنا وتصحیح)

یہ ساری کتابیں مکتبہ الفہیم مئوناتھ بھنجن، یو، پی ہند کے زیر اہتمام شائع ہو چکی ہیں۔

درج ذیل کتابیں زیر طباعت اور بعض تکمیل کے مرحلے میں ہیں۔

۲۰۔ تفسیر سراج البیان: از مولانا محمد حنیف ندوی (تصحیح)

۲۱۔ تیسیر القرآن (تصحیح)

۲۲۔ فتاویٰ شیخ الحدیث علامہ عبیداللہ رحمانی مبارک پوری (جمع، ترتیب، تخریج)

۲۳۔ فتاوی مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری (جمع، ترتیب، تخریج)

۲۴۔ فتاوی حافظ عبداللہ غازی پوری پر کام جاری ہے۔

تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کے علاوہ اپنے ملک ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان میں منعقد ہونے والے سیمیناروں میں بھی مولانا عبداللطیف اثری شرکت کرتے اور ان میں مقالے پڑھتے ہیں۔ انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، ادارہ دعوۃ القرآن علی گڈھ، جامعہ محمدیہ مالیگاؤں، ادارہ دار العلوم مئو، جامعہ سراج العلوم جھنڈانگر نیپال، صفا پبلک سکول ملیح آباد، لکھنؤ وغیرہ کے سیمیناروں میں مقالے پڑھے۔

ان کا مساجد میں درس قرآن کا سلسلہ بھی جاری ہے، خصوصاً رمضان شریف میں باقاعدہ درس ہوتا ہے۔ یہ مجلہ ''افکار عالیہ'' کے ایڈیٹر ہیں۔ اس میں ان کی خطابتی اور تقریری سرگرمیوں کی تفصیل چھپتی رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں کتاب وسنت کی خدمت کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرمائے، آمین۔

(یہ سطور ۱۹۔ مئی ۲۰۱۳ء کو لکھی گئیں)

مولانا عبدالمنان سلفی

(ولادت دسمبر ۱۹۵۹ء)

ان کا مختصر سلسلۂ نسب یہ ہے: عبدالمنان سلفی بن مولانا عبدالحنان فیضی بن مولانا محمد زمان رحمانی بن نبی احمد۔ ان چاروں حضرات کا مولد و مسکن ایک ہی گاؤں ہے اور وہ ہے ہندوستان کے صوبہ یوپی کے ضلع سدھارتھ نگر کا گاؤں انتری بازار۔ اس گاؤں کو ”محمود واگرانٹ“ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ خاصی آبادی کا گاؤں ہے، جس میں اہل حدیث حضرات کی اکثریت ہے اور اس مسلک سے تعلق رکھنے والے علمائے کرام بھی وہاں خاصی تعداد میں فروکش ہیں۔ مدرسہ بحر العلوم کے نام سے یہاں اہل حدیث کا تعلیمی ادارہ تقریباً ایک صدی سے قائم ہے۔ یہ گاؤں ہندوستان اور نیپال کی سرحد پر واقع ہے، اس لیے اس مدرسے میں ان دونوں ملکوں کے طلباء تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

عبدالمنان کے نسب نامے میں ہم نے دیکھا کہ عبدالمنان کو سلفی لکھا گیا ہے، اس لیے کہ انھوں نے جامعہ سلفیہ بنارس سے سند فراغت لی۔ ان کے والد مولانا عبدالحنان کو فیضی کی نسبت سے پکارا جاتا ہے، اس لیے کہ انھوں نے مدرسہ فیض عام مئو ناتھ بھنجن میں تعلیم مکمل کی اور اس ادارے کی سند سے بہرہ یاب ہوئے۔ ان کے دادا مولانا محمد زمان نے رحمانی کی نسبت سے شہرت پائی اس لیے کہ وہ دہلی کے مرحوم دارالحدیث رحمانیہ کی سند سے مفتخر ہوئے۔ باپ، بیٹا اور دادا تینوں نے الگ الگ تین درس گاہوں سے سند لی اور جس سے سند لی، اسی کی طرف نسبت ہوئی۔ نبی احمد سمیت ان دونوں باپ بیٹے کا تذکرہ زیر مطالعہ کتاب ”چمنستان حدیث“ میں کیا جا چکا ہے۔ آئندہ سطور میں مولانا عبدالمنان سلفی کے بارے میں چند گزارشات پیش کی جاتی ہیں۔ اس خانوادے کی اب پانچویں نسل چل رہی ہے، جنھوں نے قرآن و حدیث کی تبلیغ و اشاعت اور علوم دینیہ کی تدریس و ترویج کو اپنا مقصدِ حیات قرار دے رکھا ہے۔ یہ بہت بڑا اعزاز ہے جو اس خانوادۂ عالی قدر کے حصے میں آیا اور یہ پوری استعداد کے ساتھ اس اعزاز کی حفاظت کے لیے کوشاں ہیں۔

عبدالمنان سلفی کی ولادت دسمبر ۱۹۵۹ء کو موضع انتری بازار میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم درجہ پنجم تک اپنے آبائی وطن انتری بازار کے مدرسہ بحر العلوم میں مولوی محمد شفیع اور ماسٹر محمد ابراہیم سے پائی، جب کہ قرآن مجید مولانا محمد ابراہیم رحمانی سے پڑھا جو ان دنوں مدرسہ بحر العلوم کے شعبہ عربی میں مدرس تھے۔ ابتدائی تعلیم سے

لے کر کچھ آگے کی تعلیم ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۸ء تک چار سال میں حاصل کی۔

عربی اور فارسی کی ابتدائی کتابیں اپنے جدِّ امجد مولانا محمد زمان رحمانی سے گھر میں پڑھیں۔ پھر باقاعدہ تعلیم کے لیے جامعہ سراج العلوم جھنڈا نگر میں داخل کرادیے گئے۔ یہاں انھوں نے دیگر مؤقر اساتذہ کے علاوہ مولانا عبدالرؤف خاں رحمانی کے حضور بھی زانوے شاگردی تہ کیے۔

۱۹۷۳ء میں یہ جامعہ سراج العلوم سے ضلع سدھارتھ نگر کے قصبہ ''اکرہرا'' کے المعہد الاسلامی میں چلے گئے۔ وہاں ایک سال تعلیم حاصل کی۔ وہاں سے نکل کر جامعہ سلفیہ بنارس کی شاخ جامعہ رحمانیہ بنارس میں داخلہ لیا۔ پھر جامعہ سلفیہ بنارس میں عالم کا چار سالہ اور فضیلت کا دو سالہ کورس مکمل کیا اور ۱۹۸۲ء میں سندِ فراغت لی۔

علاوہ ازیں جو امتحانات سرکاری طور پر دیے اور ان میں سیکنڈ یا فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوئے وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) ادیب۔ جامعہ اردو علی گڑھ (۲) ادیب ماہر۔ جامعہ اردو علی گڑھ (۳) ادیب کامل۔ جامعہ اردو علی گڑھ (۴) مولوی۔ امتحانات عربی و فارسی بورڈ (اتر پردیش) الہ آباد (۵) عالم۔ امتحانات عربی و فارسی بورڈ (اتر پردیش) الہ آباد (۶) فاضل دینیات امتحانات عربی و فارسی بورڈ (اتر پردیش) الہ آباد (۷) معلم اردو۔ جامعہ اردو علی گڑھ (۸) ایم اے عربی لکھنؤ یونیورسٹی (۹) ڈپلوما برائے پروفیشنل عربی، قومی کونسل برائے فروغ اردو (حکومتِ ہند) (۱۰) دورۂ ''تدریب المعلمین'' جامعۃ الملک سعود، معہد اللغۃ العربیہ

اب آیے مولانا عبدالمنان سلفی کی خدمت تدریس کی طرف۔ انھوں نے مختلف اوقات میں مندرجہ ذیل مقامات میں خدمتِ تدریس سرانجام دی۔

۱۔ مدرسہ عربیہ قاسم العلوم گلرہا، بدل پور، بلرام پور۔ ۱۹۸۲-۱۹۸۳ء (ایک سال)

۲۔ جامعہ اسلامیہ سنابل (سابق معہد الاسلامی) (قائم کردہ مولانا عبدالحمید رحمانی) نئی دہلی ۸۵-۱۹۸۴ء (دو سال)

۳۔ مدرسہ عربیہ قاسم العلوم گلرہا، بدل پور (دوسری بار) ۱۹۸۷ء تا ۱۹۸۹ء (۵ سال)

۴۔ مدرسہ خدیجۃ الکبریٰ کرشنا نگر (نیپال) ۱۹۸۹ء تا ۱۹۹۶ء (۷ سال)

۵۔ جامعہ سراج العلوم السلفیہ جھنڈا نگر (نیپال) جون ۱۹۹۶ء تا مئی ۲۰۱۳ء (۱۷ برس) آج کی تاریخ (۲۸ مئی ۲۰۱۳ء) تک وہیں ہیں۔

۶۔ کلیہ عائشہ صدیقہ، شاخ جامعہ سراج العلوم جھنڈا نگر (نیپال) ۱۹۹۸ء تا ۲۰۰۳ء (۵ سال)

جن کتابوں کی انھوں نے تدریس کی وہ ہیں تفسیر جلالین، زبدۃ التفسیر من فتح القدیر، فتح المنان تسہیل الاتقان فی علوم القرآن، صحیح مسلم، جامع ترمذی، مشکوٰۃ المصابیح، شرح العقیدۃ الواسطیہ، شرح العقیدۃ الطحاویہ، فقہ السنہ للسید سابق۔ تاریخ التشریع الاسلامی ...... کتابوں کی اس فہرست سے معلوم ہوا کہ انھیں تفسیر، علوم القرآن، حدیث، فقہ، تاریخ، عقیدہ وغیرہ تمام مضامین کی تدریس کی سعادت حاصل ہے۔

مولانا ممدوح تحریر و نگارش سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے مضامین متعدد رسائل و جرائد میں شائع ہوئے، جن میں الہدیٰ (دربھنگہ)، الاسلام (دہلی)، ترجمان (دہلی)، تنویر (بنارس)، قومی مورچہ (بنارس) نور توحید (جھنڈانگر)، ماہنامہ السراج (جھنڈانگر) شامل ہیں۔

زمانہ طالب علمی میں وہ ندوۃ الطلبہ جامعہ سلفیہ بنارس کے سالانہ میگزین ''المنار'' کے مدیر اعلیٰ رہے۔ اس طرح طالب علمی کے زمانے سے ان کا قلم وقرطاس سے رابطہ قائم ہے۔ ان کے اب تک رسائل وجرائد میں جو مضامین مختلف موضوعات پر شائع ہوئے ان کی تعداد دوسو کے قریب ہوگی۔

انھوں نے متعدد موضوعات پر کتابیں بھی تصنیف کیں، جن میں سے بعض شائع ہوگئی ہیں اور بعض شائع نہیں ہوئیں۔ جو شائع ہوئیں وہ ہیں فتنہ قادیانیت، تحفہ رمضان المبارک، مناسک حج، عمرہ وقربانی، مختصر آداب حج وعمرہ وزیارت (یہ کتاب اردو، ہندی دونوں زبانوں میں ہے)، معلم نماز (یہ بھی اردو اور ہندی میں ہے) ان کتابوں کے نام سے ہی ان کے موضوع کا پتا چل جاتا ہے۔

جو کتابیں ابھی تک شائع نہیں ہوسکیں ان میں نکاح کے احکام وآداب اردو ترجمہ وشرح اربعین نووی۔ مولانا عبدالحنان فیضی کے فتوے (جو دو ہزار کے قریب ہیں اور مرتب ہو چکے ہیں)، مولانا عبدالحنان فیضی کے دروس بخاری (مرتب شدہ جلد اول) حدیث کی تشریعی حیثیت، فقہِ اسلامی کی تاریخ اور مسائل کے استنباط میں محدثین کا رول، منہج سلف کے احیا میں مولانا ابوالکلام آزاد کا حصہ وغیرہ متعدد چھوٹی بڑی کتابیں۔ ان غیر مطبوعہ مسودات میں بعض مسودے پندرہ پندرہ بیس بیس صفحات پر مشتمل ہیں، انھیں کتابی شکل میں شائع کرنے سے بہتر ہے کہ ''ترجمان'' دہلی یا ''السراج'' وغیرہ جرائد میں چھپوا دیا جائے۔ ''السراج'' تو خود انھی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ ان کے ایک غیر مطبوعہ مقالے کا عنوان ہے: ''اعضاء کی پیوندکاری اور شریعت کا حکم''۔ یہ فل سکیپ کے ۲۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ معلوم نہیں انھوں نے اعضاء کی پیوندکاری کے بارے میں کیا موقف اختیار کیا ہے۔ یہ اس دور کا اہم ترین مسئلہ ہے۔ یہ مضمون ہندوستان کے کسی رسالے (معارف یا ترجمان) میں چھپنا چاہیے اور اہل علم کو دعوت دینی چاہیے کہ وہ اس موضوع پر اظہارِ خیال کریں۔ بے شک تقلید وعدم تقلید، فرقہ ناجیہ اور بدعات وغیرہ مسائل کو بھی اہمیت حاصل ہے، لیکن ان کے علاوہ بھی بہت سے مسائل ہیں جو تحقیق طلب ہیں، جیسے یہی اعضاء

کی پیوند کاری کا مسئلہ۔ ہمارے علما کو چاہیے کہ اس قسم کے مسائل کو بھی موضوع بحث بنائیں۔

درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے علاوہ مولانا عبدالمنان سلفی اپنے علاقے کے مشہور مقرر اور خطیب بھی ہیں اور باقاعدہ خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے ہیں۔ ریڈیو نیپال میں ''روشنی'' کے عنوان سے ان کی تقریریں نشر ہوتی ہیں۔ ماہِ رمضان میں روزانہ اور غیر رمضان میں ہفتے میں دو بار ریڈیو میں ان کا دعوتی پروگرام چلتا ہے، جسے حلقہ سامعین میں پسند کیا جاتا ہے۔

دہلی کے اسلامی ٹی وی چینل سے بھی ان کی تقریروں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

مولانا عبدالمنان سلفی نے بہت سے سیمیناروں اور کانفرنسوں میں بھی شرکت کی اور مقالے پڑھے۔ وہ بڑے فعال اور متحرک اہل علم ہیں اور ہر کارِ خیر میں حصہ لیتے ہیں۔

مولانا ممدوح کے اساتذہ کرام میں یہ حضرات شامل ہیں: مولانا عبدالرؤف خاں رحمانی، مولانا محمد زمان رحمانی، مولانا عبدالحنان فیضی، ڈاکٹر محفوظ الرحمٰن مدنی، مولانا شمس الحق سلفی، مولانا محمد ادریس آزاد رحمانی، ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری، مولانا انیس الرحمٰن مدنی اعظمی اور دیگر متعدد حضرات۔

اب ان کے چند تلامذہ کرام کے اسمائے گرامی پڑھیے: مولانا سید معراج ربانی مقیم سعودی عرب، مولانا منصور احمد مدنی مقیم سعودی عرب، مولانا نور الہدیٰ محمد الیاس مدنی سعودی سفارت خانہ دہلی، مولانا مجیب الرحمٰن سراجی نیپال، مولانا عتیق الرحمٰن سراجی سدھارتھ نگر، ڈاکٹر اختر خاں سلفی پروفیسر شعبہ اردو ہندو یونیورسٹی بنارس، مولانا اقبال عظیم جامعۃ الملک سعود ریاض۔ ان کے علاوہ بہت سے اہل علم۔

یہاں مولانا سلفی کی شادی اور اولاد کا ذکر بھی میرے خیال میں ضروری ہے۔ ان کی شادی آج سے ۳۴ برس پیشتر اکتوبر ۱۹۸۰ء میں ہوئی۔ اس وقت یہ اکیس بائیس سال کے جوانِ رعنا تھے۔ بقول ان کے ''الحمدللہ سرِ دست اولاد کی مجموعی تعداد ۱۴ ہے، جن میں آٹھ بیٹے ہیں اور چھے بیٹیاں ہیں۔'' تکلف برطرف اولاد کی اس تعداد میں 'سرِ دست' کا لفظ قابلِ غور ہے اور بہ ظاہر یہ لفظ ۱۴ کی تعداد میں اضافے کی گھنٹی بجا رہا ہے۔ اگر ۱۴ پر ہی محدود رہا جائے تو مولانا ممدوح اولاد کی گنتی کے اعتبار سے ماشاء اللہ پانچویں مغل بادشاہ شہاب الدین شاہ جہان کے برابر کھڑے دکھائی دیں گے۔ اس کی بھی ایک ہی بیوی (ممتاز محل) سے ۱۴ بچے پیدا ہوئے تھے، مولانا کی بھی ماشاء اللہ ایک بیوی شاکرہ سے ۱۴ بچوں کی ولادت ہوئی۔ اب ہم اللھم زد فزد کی دعا کریں یا نہ کریں، اس کا فیصلہ مولانا کے فرمان 'سرِ دست' پر چھوڑ دینا چاہیے۔ اس کے بعد کی صورتِ حال کا ہمیں تو شاید علم نہ ہو سکے لیکن ہندوستان کے بعض لائق احترام قارئین کو ضرور پتا چل جائے گا۔

(یہ سطور ۲۸ مئی ۲۰۱۳ء کو لکھی گئیں)

قاری محمد ابراہیم میر محمدی

(ولادت یکم فروری ۱۹۶۰ء)

ضلع قصور کے ایک گاؤں کا نام "میر محمد" ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ کا پتا نہیں کیا ہے۔ شاید کوئی شخص میر محمد نامی ہوگا جس نے اس کی بنیاد رکھی ہوگی۔ یہ گاؤں جس علاقے میں واقع ہے، اسے "ماجھے" کا علاقہ کہا جاتا ہے اور ماجھے کا علاقہ بہت سے معاملات میں مشہور ہے، لیکن جہاں تک یہ فقیر جانتا ہے، اس گاؤں کی "مشہوری" ان "مشہوریوں" سے بالکل مختلف ہے۔ ہم اپنے آبائی وطن کوٹ کپورہ (مشرقی پنجاب) میں بچپن سے اس گاؤں اور اس کے باشندوں کے متعلق جو باتیں سنتے آئے ہیں، وہ سب ان کی صالحیت، تقویٰ شعاری اور دینیات کی درس و تدریس سے تعلق رکھتی ہیں۔ تقسیم ملک سے قبل مجھے اس گاؤں کے تین بزرگوں کی زیارت کا اور ان کی باتیں سننے کا شرف حاصل ہوا، جو نیکی اور پرہیز گاری کا روح پرور پیکر تھے۔ قد و قامت میں بھی ممتاز تھے اور خوب صورتی اور وجاہت سے بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو نوازا تھا۔ وہ تھے حافظ محمد، حاجی عبدالواحد اور حافظ دوست محمد۔ یہ تینوں بھائی اس خاک نشین پر شفقت فرماتے تھے۔ حافظ دوست محمد سے تو تقسیم ملک کے بعد بھی کئی مرتبہ ملاقات ہوئی۔ ایک دفعہ میں ان کے گاؤں بھی گیا تھا۔

ماضی قریب کے حافظ محمد یحییٰ عزیز میر محمدی اسی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ خوفِ الٰہی جن کا شیوہ اور عبادت خداوندی جن کا پیشہ تھا۔ وہ حافظ محمد میر محمدی رحمہ اللہ کے فرزند گرامی تھے۔ انھوں نے تبلیغ دین کو اپنا دن رات کا مشغلہ بنا لیا تھا اور اس کے لیے ضلع قصور کے ایک گاؤں "بنگا بلوچاں" کو اپنا مرکز قرار دے لیا تھا۔ وہ یہیں یکم و دو نومبر ۲۰۰۸ء کی درمیانی شب کو فوت ہوئے۔ ان کا تذکرہ میں نے تین کتابوں میں کیا ہے زیر نظر کتاب "چمنستان حدیث" میں، "برصغیر کے اہل حدیث خدام قرآن" میں اور "برصغیر میں اہل حدیث کی سرگزشت" میں۔ اللہ ان پر اور ان کے آبا و اجداد پر اپنی رحمت کی بارش برسائے۔ آمین

وہ شیریں الفاظ اور دل کش لہجے میں لوگوں کے ضمیر کو آواز دیتے اور انھیں امور خیر کی طرف راغب کرتے تھے۔ اب اس قسم کے بیدار بخت صلحاء اور خوش گفتار مبلغین سے دنیا خالی ہو رہی ہے۔

آیئے اب اسی خاندان اور اسی گاؤں کے ایک عالی اطوار عالم قاری محمد ابراہیم میر محمدی (فاضل مدینہ یونیورسٹی) سے ملاقات کرتے ہیں۔ میانہ قد، گورا رنگ، جاذب نظر نقش و نگار، حیاء کی دولت سے بھرپور

آنکھیں، باریک ہونٹ، سفید دانت، لبوں پر مسکراہٹ، سر پر چار خانہ رومال، شلوار قمیص زیب تن۔ میٹھی زبان، شیریں لہجہ، کم گو۔ یہ ہیں قاری محمد ابراہیم میر محمدی جو یکم فروری ۱۹۶۰ء کو موضع میر محمد (ضلع قصور) میں پیدا ہوئے۔

قاری صاحب کے والد کا اسم گرامی حافظ محمد عبداللہ تھا۔ وہ مولانا حافظ محمد بھٹوی مرحوم کے تلامذہ میں سے تھے۔ انھوں نے حدیث کی کتابیں پڑھ لی تھیں مگر کسی وجہ سے صحیح بخاری پوری نہ پڑھ سکے تھے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے بڑی خوبیوں سے نوازا تھا۔ کتاب وسنت کے مبلغ اور اس کے احکام پر عامل۔

قاری محمد ابراہیم صاحب نے تحصیل علم کا آغاز اپنے گھر سے کیا۔ قاعدہ والد صاحب سے پڑھا اور ناظرہ قرآن مجید کی تکمیل والدہ محترمہ سے کی۔ حفظ قرآن کی سعادت اپنے گاؤں موضع میر محمد کے مدرسہ حفظ القرآن والحدیث میں حاصل ہوئی۔ اس وقت میر محمد کے قریب قصبہ راجہ جنگ میں ضیاء السنہ کے نام سے مدرسہ جاری تھا، اس میں داخلہ لیا اور دینی تعلیم کے حصول میں مشغول ہو گئے۔ بعد ازاں جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) چلے گئے۔ جامعہ سلفیہ کے نصاب کا آخری سال تھا اور حدیث کی کتاب مسلم شریف پڑھ رہے تھے کہ مدینہ یونیورسٹی میں داخلے کی اطلاع آ گئی جو ان کے لیے بے حد خوش کن تھی۔ وہاں جا کر قرآن و حدیث کی تعلیم بھی اس کے نصاب کے مطابق مکمل کی اور قراءات وتجوید کا فن بھی حاصل کیا۔ وہ اس طرح کہ یونیورسٹی میں تعلیم کے ساتھ ساتھ کلیۃ القرآن میں چار سال پڑھا۔ پھر وہیں ایم فل کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ اعزاز بھی بخشا کہ جامعہ فہد کمپلیکس میں ساڑھے چار سپارے تک تلاوتِ قرآن کی ریکارڈنگ کرائی۔ کلیۃ القرآن کی تعلیم کے دوران میں وہاں کے ریڈیو پر بھی ان کی تلاوت کا سلسلہ جاری رہا۔ مدینہ یونیورسٹی سے فراغت کے بعد سعودی حکومت انھیں بہ طور مبعوث کسی دوسرے ملک بھیجنا چاہتی تھی لیکن یہ خود اصرار کر کے اپنے وطن واپس آ ے۔ یہ ۱۹۹۰ء کی بات ہے۔

یہاں آ کر انھوں نے جامعہ اسلامیہ لاہور ماڈل ٹاؤن میں اس کے لائق احترام ناظم حافظ عبدالرحمٰن مدنی صاحب کی مشاورت سے تجوید وقراءات اور ادارہ کلیۃ القرآن کا آغاز کیا۔ یہ سلسلہ اللہ کی مہربانی سے کامیاب رہا۔ اب تک بلاتفریق مذہب ومسلک ہزاروں طلبا اس ادارے سے استفادہ کر چکے ہیں۔ حافظ عبدالرحمٰن مدنی اور ان کے فرزندان گرامی (جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں) بڑی محنت اور مستعدی سے قرآن وحدیث کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ انھیں مزید خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔

دورانِ تدریس میں قاری صاحب ممدوح کو اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک قراءاتِ قرآن کی بڑی بڑی کانفرنسوں میں شرکت اور تلاوتِ قرآن کا شرف حاصل ہوا۔ مولانا عبدالمالک مجاہد کا قائم کردہ ادارہ ''دار

السلام" کتابوں کی نشر و اشاعت کا ایک منفرد نوعیت کا بین الاقوامی ادارہ ہے، جس کا مرکزی دفتر ریاض (سعودی عرب) میں ہے اور لاہور میں اس کا بہت بڑا دفتر سیکرٹریٹ کے قریب ہے، جس کے جنرل مینیجر حافظ عبدالعظیم اسد ہیں۔ اس ادارے کی طرف سے قاری صاحب نے پورے قرآن مجید کی تلاوت کی جو دفتر میں محفوظ ہے۔

بہت سالوں سے قاری صاحب کلیۃ القرآن و التربیۃ الاسلامیہ مرکز ادارہ اصلاح پاکستان بنگا بلوچاں پھول نگر (ضلع قصور) میں بہ طور نگران اور استاذ خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ یہ ماشاء اللہ پاکستان کا تجوید وقراءات اور درس نظامی کی تعلیم کا بہت بڑا تدریسی ادارہ ہے، جس سے اب تک ہزاروں طلباء اخذِ فیض کر چکے ہیں۔

قاری صاحب ممدوح نے جن جلیل المرتبت اساتذہ سے تعلیم حاصل کی ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: قاری محمد یحییٰ رسول نگری، قاری صدیق الحسن، مولانا حبیب الرحمٰن لکھوی، ڈاکٹر حافظ عبدالرشید مرحوم، قاری اظہار احمد تھانوی، حافظ مفتی ثناء اللہ مدنی، حافظ عبداللہ بھٹوی، مولانا محمد صدیق کریالوی لائل پوری، قاری محمد عزیر، حافظ عبدالستار اور بعض دیگر حضرات۔ قاری صاحب کے یہ تمام اساتذہ پاکستانی ہیں۔ مدینہ یونیورسٹی میں انھوں نے جن اساتذہ سے اکتسابِ علم کیا وہ اس فہرست میں شامل نہیں ہیں۔

قاری محمد ابراہیم میر محمدی نے پاکستان کے جن مدارس میں تعلیم حاصل کی، ان میں سے بعض مدارس میں جو حضرات ان کے رفقائے درس رہے، ان میں حافظ عبدالغفار روپڑی، حافظ محمد شریف (فیصل آباد) حافظ عبدالرؤف شارجہ، سید محمد یحییٰ شارجہ، مولانا مبشر احمد مدنی، قاری محمد حنیف بھٹی (فیصل آباد) اور سید عبدالحنان شامل ہیں۔

قاری صاحب تحریر و کتابت سے بھی رابطہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے کئی کتابیں تالیف کیں یا ترتیب دیں یا ان پر نظر ثانی فرمائی۔ ان میں سے بعض مطبوعہ ہیں اور بعض غیر مطبوعہ۔ ان کی مطبوعہ کتابیں جو میرے سامنے ہیں حسب ذیل ہیں: سب کا تعلق فنِ تجوید وقراءات سے ہے اور اس فن سے متعلق بہت سی معلومات پر مشتمل ہیں۔

۱۔ تحفۃ القاری: یہ اپنے موضوع کی نہایت اہم کتاب ہے جو محترم المقام قاری محمد ابراہیم میر محمدی مدظلہ العالی نے تالیف کی ہے۔ ۶۴ صفحات کی یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول میں ملتی جلتی آوازوں والے حروف کی پہچان اور ان سے متعلق عملی مشق کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ مثلاً ہمزہ اور عین۔ تا اور طا۔ ثا، سین اور صاد۔ حاء اور ہاء۔ ذال، زا، ظاء اور ضاد۔ قاف اور کاف۔ یہ متشابہ الصوت یا ملتی جلتی

آوازوں والے حروف ہیں، جناب قاری محمد ابراہیم صاحب نے ان حروف میں سے ہر حرف کے متعلق بتایا ہے کہ اسے کس طرح ادا کیا جائے۔ یہ قراءات وتجوید کا بھی بنیادی مسئلہ ہے اور عام گفتگو میں بھی اسے خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کا سمجھنا اور حروف کو صحیح طور سے ادا کرنا ضروری ہے۔

کتاب کے دوسرے حصے میں تجوید کے ضروری مسائل وقواعد بیان کیے گئے ہیں۔

۲۔ علم الفواصل: اس کتاب کا تعلق بھی تجوید وقراءات سے ہے۔

۳۔ علم الضبط: یہ حافظ محمد مصطفیٰ راسخ کی تصنیف ہے اور قاری محمد ابراہیم میر محمدی نے اس پر نظر ثانی وتنقیح فرمائی ہے۔

۴۔ القول السدید فی علم التجوید: اس کی جمع وترتیب کا فریضہ جناب قاری سلمان احمد میر محمدی نے انجام دیا ہے اور نظر ثانی وتنقیح قاری محمد ابراہیم میر محمدی نے کی ہے۔ قاری سلمان احمد میر محمدی کا شمار بھی اس فن کے ماہر اساتذہ میں ہوتا ہے، یہ قاری محمد ابراہیم صاحب کے چھوٹے بھائی ہیں اور کلیۃ القرآن الکریم بنگا بلوچاں میں خدمتِ تدریس پر مامور ہیں۔

یہ کتابیں کلیۃ القرآن الکریم والتربیۃ الاسلامیہ ادارہ الاصلاح البدر بنگا بلوچاں پھول نگر ضلع قصور نے شائع کی ہیں۔

ان کتابوں کے علاوہ ایک کتاب ''علم الرسم'' ہے۔ یہ علامہ علی محمد الضباع کی تالیف ہے اور حافظ محمد مصطفیٰ راسخ نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ یہ کتاب بھی اسی موضوع سے تعلق رکھتی ہے۔

بے شک قاری محمد ابراہیم میر محمدی (فاضل مدینہ یونیورسٹی) رفیع المرتبت عالم دین، نامور قاری اور ماہر فن تجوید ہیں۔ ان کے شاگردوں اور عقیدت مندوں کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو قرآن وحدیث کی زیادہ سے زیادہ خدمت کی توفیق بخشے۔ آمین یا رب العالمین

(یہ سطور ۸۔ جون ۲۰۱۳ء کو دائرۂ تحریر میں لائی گئیں)

مولانا محمد یاسین شاد

(ولادت یکم اکتوبر ۱۹۶۰ء)

میانہ قد، چوڑا چہرہ، گندمی رنگ، گداز جسم، خندہ رو، آنکھوں پر نظر کی عینک، سادہ لباس، سادہ مزاج، مطالعے کے شائق، کتابوں کے رسیا۔ یہ ہیں مولانا محمد یاسین شاد۔

ان کا خاندان تقسیم ملک سے پہلے ایک چھوٹی سی بستی ڈھانی موضع دبلی باس میں رہتا تھا جو (سابق ریاست) بیکانیر کے ضلع گنگانگر کی تحصیل ہنومان گڑھ میں واقع ہے۔ شیخ الحدیث مولانا عبداللہ امجد چھتوی کے آبا واجداد کا مسکن بھی یہی علاقہ تھا۔ بنجر زمینوں اور دور تک پھیلے ہوئے بڑے بڑے ریت کے ٹیلوں کا علاقہ۔ جاڑوں میں شدید سردی اور موسمِ گرما میں سخت گرمی۔ جفاکش لوگوں کا مرکز۔

محمد یاسین شاد کے دادا کا نام محمد رمضان تھا اور ان کے چار بیٹے تھے محمد یوسف، عبدالرحمٰن، شاہ محمد اور محمد صدیق۔ یہ سب لوگ مولانا عبداللہ امجد چھتوی کے اصحابِ علم آبا و اجداد (مولانا محمد، مولانا عبدالعزیز اور مولانا عبدالرشید) کی ہمسائیگی اور تبلیغ سے عامل بالحدیث ہوئے۔ مولانا عبداللہ امجد چھتوی کا خاندان قیامِ پاکستان کے بعد چک ۳۶ گ ب (تحصیل جڑاں والا ضلع فیصل آباد) میں آباد ہوا۔ مولانا ممدوح نے پاکستان آ کر تعلیم حاصل کی اور جلیل القدر علما و مدرسین میں ان کا شمار ہوا۔ کئی سال سے مرکز الدعوۃ السّلفیہ ستیانہ بنگلہ ضلع فیصل آباد میں شیخ الحدیث کے منصب عالی پر متمکن ہیں۔ بے شمار علما وطلبا نے ان سے استفادہ کیا اور اللہ کی مہربانی سے استفادے کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ مرکز الدعوۃ السّلفیہ کے جاری کنندہ مولانا عتیق اللہ سلفی ہیں۔ ان کا تذکرہ اس کتاب میں مرقوم ہے جو گزشتہ صفحات میں خوانندگانِ محترم کے مطالعہ میں آیا۔

مولانا محمد یاسین شاد کے والدِ گرامی کا نام عبدالرحمٰن تھا۔ انھوں نے ۸۔ستمبر ۱۹۹۶ء کو انتقال کیا۔ محمد یاسین کی ولادت یکم اکتوبر ۱۹۶۰ء کو موضع کوٹ کبیر تحصیل میلسی ضلع وہاڑی میں ہوئی۔ دینی تعلیم جن درس گاہوں میں حاصل کی، وہ ہیں دارالحدیث محمودیہ کوٹ کبیر، دارالحدیث محمدیہ ملتان، جامعہ سلفیہ فیصل آباد اور جامعہ محمدیہ اوکاڑہ۔ باقاعدہ سند یافتہ عالم دین ہیں اور اساتذہ کرام کے اسمائے گرامی ہیں حافظ عبدالسلام فتح پوری، مولانا محمد علی کوٹ کبیری، مولانا محمد رفیق، مولانا محمد یعقوب (گوجرہ) سید عبدالشکور شاہ اثری، حافظ عبدالستار حسن، مولانا عبداللہ امجد چھتوی، مولانا عبدالحلیم، مولانا عبداللہ سعید اور حافظ محمد لکھوی بن حضرت

مولانا محی الدین لکھوی۔ ۱۹۸۳ء میں وفاق المدارس السّلفیہ کا امتحان بھی پاس کرلیا۔

دینی تعلیم کے بعد انھوں نے ملتان بورڈ سے میٹرک اور فاضل اردو کے امتحانات پاس کیے۔ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے بی اے پاس کیا۔

اس کے بعد یکم ستمبر ۱۹۸۱ء سے ۳۰ دسمبر ۱۹۹۶ء تک سرکاری سکولوں میں اردو، اسلامیات اور عربی کے معلم کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے رہے۔ وہ ہیں مڈل سکول ساہو کا جہانواہ میلسی، گورنمنٹ ہائی سکول شمس آباد، ایم اے جناح ہائی سکول قاسم پور ملتان۔

۱۹۸۵ء میں میلسی سے نقل مکانی کر کے ملتان شہر کی آبادی پیپلز کالونی میں سکونت اختیار کی۔ ۱۹۹۶ء میں علالت کی وجہ سے ڈاکٹر کی رائے کے مطابق سرکاری تدریسی ملازمت سے ریٹائرمنٹ لی۔

۱۹۹۷ء کے آغاز میں اپنے والد مرحوم کے نام سے عبدالرحمٰن اسلامک لائبریری قائم کی۔ پھر ۲۰۰۷ء میں گلشن فیض نہر قاسم پور ہیڈ نو بہار (ملتان) میں ایک پلاٹ خریدا، اس میں ''مسجد السلام اہل حدیث'' کے نام سے مسجد بھی تعمیر کرائی اور لائبریری بھی وہیں لے آئے۔ وہاں ان کا خطباتِ جمعہ اور درس قرآن کا سلسلہ جاری ہے۔ ان کے چھوٹے بھائی مولانا احمد الدین سعودی فاضل بحر العلوم سعودیہ کراچی ان کے معاون ہیں۔

اس فقیر کو گزشتہ سال ملتان جانے کا اتفاق ہوا تو ان کی لائبریری بھی دیکھی اور مسجد کی زیارت بھی کی۔ لائبریری تفسیر، حدیث، تاریخ، سیرت، ادبیات، شعر و شاعری، سیاسیات، عمرانیات وغیرہ کی عربی، اردو کتابوں پر مشتمل ہے۔ انھیں کتابیں خریدنے کا شوق ہے اور اپنی مالی استطاعت کے مطابق کتابیں خریدتے رہتے ہیں۔

معاشی ذریعہ وہ پینشن ہے جو حکومت کے محکمۂ تعلیم کی طرف سے ملتی ہے۔ اس محدود آمدنی سے کتابیں بھی خریدی جاتی ہیں اور گھر کا گزارا بھی چل رہا ہے۔

مجھے ان کے بعض ناشرین کتب دوستوں نے بتایا کہ ہم سے بے تکلفی کے باوجود یاسین شاد نے کبھی کوئی کتاب مفت طلب نہیں کی۔ ہم خود کوئی کتاب مفت دے دیں تو یہ الگ بات ہے، ورنہ وہ قیمت ادا کر کے کتاب خریدتے ہیں۔ خود مجھ سے بھی انھوں نے کبھی کوئی کتاب طلب نہیں کی۔ میرے عزیز دوست محمد رمضان یوسف سلفی کی بھی یہی حالت ہے۔ وہ بھی کتاب خرید کر پڑھتے ہیں۔ مجھے یاد نہیں کہ انھوں نے کبھی کوئی کتاب مجھ سے مانگی ہو۔ دونوں کا تعلق جماعت غرباے اہل حدیث سے ہے۔ میں خود ہی انھیں ''غرباء'' سمجھ کر کبھی کبھار ''فی سبیل اللہ'' کوئی کتاب دے دوں تو دے دوں ورنہ وہ نہیں مانگتے۔ بڑے ''آکڑ باز'' غرباء ہیں۔

مولانا محمد یاسین شاد ایک مدت سے عارضۂ قلب میں مبتلا ہیں اور شوگر کے بھی مریض ہیں، لیکن مطالعہ کا

سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔

تحریر و کتابت سے بھی دلچسپی ہے۔مختلف موضوعات پر ان کی نگارشات جماعتی اخبارات (ہفت روزہ الاعتصام، اہل حدیث، تنظیم اہل حدیث، الارشاد کراچی، صحیفہ اہل حدیث کراچی، ترجمان السنہ، حرمین جہلم وغیرہ) میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ یہ دراصل ان لوگوں میں سے ہیں جو پڑھتے زیادہ ہیں اور لکھتے کم ہیں۔ میرے نزدیک ان کی یہ بہت اچھی عادت ہے،ضروری نہیں کہ کثرت سے لکھا جائے اور اخباروں میں اپنا نام چھپوانے کی لازماً کوشش کی جائے۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ ہمارے اس اہل علم "غرباء" دوست کو صحت و عافیت سے رکھے اور اس کی نصرت اسے حاصل رہے۔آمین یا رب العالمین.

(یہ سطور ۲۹ نومبر ۲۰۱۲ء کو لکھی گئیں)

مولانا رفیق احمد رئیس سلفی

(ولادت یکم جنوری ۱۹۶۳ء)

مولانا رفیق احمد رئیس سلفی کا تعلقِ سکونت ہندوستان کے شہر علی گڑھ سے ہے، جو سر سید احمد خاں مرحوم اور ان کی قائم کردہ مسلم یونیورسٹی کی وجہ سے تمام علمی دنیا میں مشہور ہے۔ ان سے میرا غائبانہ تعارف ۱۹۹۶ء کے آخر میں اس وقت ہوا جب میری کتاب نقوش عظمت رفتہ شائع ہوئی۔ کتاب پڑھ کر انھوں نے مجھے خط لکھا اور حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی سے متعلق اس میں شائع شدہ مضمون کے بارے میں خاص طور پر تحریر کیا کہ اس مضمون سے وہ بہت متاثر ہوئے اور اس کے بعض مندرجات پڑھ کر ان کی آنکھوں سے جاری ہو گئے۔ بعد ازاں ہماری خط کتابت شروع ہو گئی۔ پھر مختلف اوقات میں انھوں نے مجھے چند کتابیں بھیجیں، جن میں ایک کتاب کا نام ''علوم الحدیث: مطالعہ و تعارف'' ہے۔ یہ کتاب ان چھبیس مقالات کا علمی اور تحقیقی مجموعہ ہے، جو ۱۸، ۱۹ اکتوبر ۱۹۹۸ء کو علی گڑھ میں منعقدہ ایک سیمینار میں پڑھے گئے۔ یہ کتاب جناب حافظ احمد شاکر کے فرزند گرامی ہنادشاکر نے اپنے مکتبہ دارالکتب السّلفیہ (اردو بازار لاہور) کی طرف سے خوب صورت انداز میں شائع کر دی ہے۔ اس طرح پاکستانی قارئین بھی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں اور حدیث سے متعلق کام کرنے والوں کو اس کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔

مولانا رفیق احمد رئیس سلفی نے ایک اور کتاب مجھے ''علامہ عبدالعزیز میمن: حیات و خدمات'' ارسال کی۔ یہ کتاب اردو، عربی اور انگریزی کے ان مقالات پر مشتمل ہے جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اس سیمینار میں پڑھے گئے جو علامہ عبدالعزیز میمن کے متعلق ۲۴، ۲۵ فروری ۲۰۰۳ء کو منعقد ہوا۔

ایک کتاب انھوں نے اپنی تصنیف ''اسلام کے بنیادی عقائد'' بھیجی۔ یہ کتاب ادارہ علوم الحدیث علی گڑھ کی طرف سے ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی جو ہندوستان کی درس گاہوں کے مسلمان طلباء و طالبات کے لیے لکھی گئی ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پروفیسر عبدالحکیم بناری نے اسے اپنے خرچ سے شائع کیا۔ یہ کتاب میں نے مکتبہ قدوسیہ کے عمر فاروق قدوسی کو دکھائی تو انھوں نے اپنے مکتبے کی طرف سے شائع کر دی۔ پھر ایک بہت اچھا کام یہ کیا کہ اس کا انگریزی ترجمہ کرا کے چھاپ دیا۔ یہ اردو اور انگریزی ترجمہ بمبئی کے ایک ادارے دارالعلم نے بھی شائع کر دیا۔ اس طرح کتاب کی افادیت بہت بڑھ گئی اور یہ اردو اور انگریزی خواں دونوں حلقوں میں

پہنچی۔اس کا ہندی ترجمہ بھی کر دینا چاہیے تاکہ ہندی پڑھنے والے بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔

اب آتے ہیں مولانا رفیق احمد سلفی کے حالات اور واقعات حیات کی طرف:

ان کا آبائی وطن مشرقی یوپی کے ضلع بلرام پور کا ایک گاؤں ''گورا بھاری'' (Gaura Bhari) ہے جو راپتی ندی (خرد) کے کنارے آباد ہے۔

جغرافیائی لحاظ سے اس ضلعے کا یہ سرحدی گاؤں ہے۔اس کے آگے ضلع سدھارتھ نگر کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔رفیق احمد اسی گاؤں کے ایک زراعت پیشہ گھرانے میں یکم جنوری ۱۹۶۳ء کو پیدا ہوئے۔ان کے والد محترم کا اسم گرامی رئیس احمد تھا۔وہ ایک محنت کش کسان تھے۔انھوں نے تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔البتہ نماز کی تمام دعائیں انھیں زبانی یاد تھیں۔نوعمری میں لکھنؤ میں کسی نواب کے یہاں ملازم ہو گئے تھے اور وہیں رہ کر انھوں نے دنیا کے نشیب و فراز دیکھے تھے۔ذہانت اور حاضر جوابی میں عام پڑھے لکھے لوگ بھی ان کا مقابلہ نہیں کر پاتے تھے۔گاؤں میں رہنے کے باوجود ان کی سوچ بہت بلند تھی اور اپنے بچوں کو انھوں نے کھیتی باڑی کے کاموں سے دور رکھا تھا۔چھٹیوں میں رفیق احمد کبھی گھر پر ہوتے تو بعض اوقات کھیتوں میں جاتے جہاں ان کے والد کام میں مصروف ہوتے تھے۔وہ بیٹے کو دیکھتے ہی فوراً واپس بھیج دیتے۔ہل یا کدال کو کبھی ہاتھ نہ لگانے دیتے۔زندگی کے آخری دم تک ان کا یہی طرز عمل رہا اور اپنے کسی بیٹے کو گھر کے کاموں میں نہیں لگایا۔انھیں ہمیشہ تعلیم حاصل کرنے کی تاکید کرتے رہے۔

رفیق احمد سلفی کی والدہ مرحومہ کا نام زہرا خاتون تھا۔ان کی تعلیم گھریلو قسم کی تھی جو انھوں نے اپنے والد مرحوم سے حاصل کی تھی۔ان کے والد (یعنی رفیق احمد کے نانا) زیادہ پڑھے لکھے تو نہیں تھے،لیکن اپنی تعلیم کے مطابق اپنے گاؤں بھگور (Bhaggaur) ضلع بلرام پور میں بچوں کو قرآن اور دینیات کی تعلیم دیتے تھے اور مسلکاً بریلوی تھے۔ان کی والدہ نے جو کچھ تھوڑا بہت پڑھا اپنے والد ہی سے پڑھا۔

تنگ دست ہونے کے باوجود رفیق احمد کے والدین نے اپنے بچوں کو کبھی اس کا احساس نہیں ہونے دیا۔انھوں نے اپنی اولاد کی تعلیم کو اصل اہمیت دی اور ان کے تعلیمی اخراجات پورے کرتے رہے۔والد اور والدہ دونوں اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

پہلے والد کا انتقال ہوا۔اس وقت مولانا رفیق احمد سلفی علی گڑھ میں تھے۔یہ اپنے سب بھائی بہنوں سے بڑے ہیں۔اس لیے انھیں وہ ''بھیا'' کہتے ہیں۔والدین بھی پیار سے ''بھیا'' کہہ کر پکارتے تھے۔والد کی تمنا تھی کہ ان کی نماز جنازہ ''بھیا'' پڑھائے۔اللہ کی قدرت دیکھیے کہ والد کی وفات کے وقت یہ اتفاق سے کسی ضروری کام کے سلسلے میں علی گڑھ سے گاؤں پہنچ گئے اور والد کی نماز جنازہ پڑھائی۔

ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ میرا بیٹا رفیق احمد جمعہ پڑھائے، تقریر کرے اور میں سنوں۔ اللہ نے ان کی یہ خواہش بھی پوری فرما دی۔ انھوں نے طالب علمی کے زمانے ہی میں اپنے گاؤں میں جمعہ پڑھانے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا اور ان کے والد ان کا وعظ سنتے تھے۔

ان کی والدہ کی وفات والد مرحوم سے کئی سال بعد ہوئی۔ ان کی نماز جنازہ ان کے چھوٹے بھائی مولانا اشتیاق احمد رئیس مدنی داعی شعبہ جالیات دمام (سعودی عرب) نے پڑھائی۔

مولانا رفیق احمد کا گاؤں:

مولانا رفیق احمد رئیس مدنی کے گاؤں کے تمام لوگ اہل حدیث ہیں اور کتاب و سنت کے سخت متبع۔ گاؤں کے قبرستان کی تمام قبریں کچی ہیں۔ ان کے قریب کے دیہات کے لوگ بھی اہل حدیث ہیں۔ بعض دیہات میں متعدد جلیل القدر علمائے کرام اقامت گزین رہے۔

ایک گاؤں کا نام بجوا (Bijuwa) ہے۔ وہاں ایک بزرگ مولانا عبدالرحمٰن بجوادی قیام فرماتے تھے جو مشہور اہل حدیث مبلغ تھے۔ وہ اکثر دیہات میں جاتے اور لوگوں کو توحید کی تبلیغ کرتے اور بدعات کے ارتکاب سے روکتے۔ وہ تبلیغ کے لیے کھیتوں میں بھی لوگوں کے پاس پہنچتے اور انھیں دین کی باتیں سمجھاتے۔ وہ علم الفرائض میں مجتہدانہ بصیرت رکھتے تھے۔ ”رحمت الفرائض“ کے نام سے ایک کتاب بھی تصنیف کی۔ مولانا محمد داؤد راز مرحوم نے جب حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم و مغفور کا فتاویٰ ثنائیہ مرتب کیا تو ان کی درخواست پر اس کے وراثت سے متعلق باب پر مولانا عبدالرحمٰن بجوادی مرحوم نے نظر ثانی کی تھی۔ اس کے ابتدا میں انھوں نے ”سراجی“ کی تلخیص تحریر فرمائی ہے۔ وہ نہایت متقی، سادہ مزاج اور مخلص ترین عالم دین تھے۔ ان کی زبان میں بے حد اثر تھا۔ ان کی تحریک سے مولانا رفیق احمد رئیس کے گاؤں میں مدرسہ قائم ہوا، جس میں خود رفیق احمد نے بھی پرائمری تک تعلیم حاصل کی۔

بچیوں کی تعلیم کا مسئلہ سامنے آیا تو اس کے لیے کوئی خاص جگہ نہیں تھی۔ مولانا رفیق احمد سلفی کے چھوٹے بھائی مولانا اشتیاق احمد مدنی نے اس کار خیر کے لیے اپنا مکان پیش کر دیا اور اس میں تعلیم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ خود مولانا رفیق احمد کا مکان بھی یہی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ طالبات کی تعداد بڑھ گئی تو مدرسہ نسواں کے نام سے نئی جگہ خریدی گئی اور ضرورت کے مطابق عمارت بھی تعمیر ہوگئی۔ اس مدرسے میں کئی معلم تعلیم دینے پر متعین ہیں۔ مولانا محمد ظہور سنابلی جو مولانا رفیق احمد رئیس کے سالے ہیں، وہ صدر مدرس ہیں اور بڑی محنت اور لگن سے یہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔

رفیق احمد کی تعلیم کا آغاز:

اب دیکھتے ہیں رفیق احمد سلفی کی تعلیم کا آغاز کب ہوا۔ ان کے گاؤں میں مدرسہ نظام العلوم قائم تھا، جس میں ان کے تایازاد بھائی حبیب اللہ (مقیم بمبئی) تعلیم حاصل کرتے تھے۔ رفیق احمد کچھ بڑے ہوئے تو ان کے ساتھ یہ بھی اس مدرسے میں جانے لگے۔ پہلی اور دوسری جماعت کے بارے میں انھیں کچھ یاد نہیں، لیکن تیسری جماعت کا امتحان ہوا تو پورے سکول میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ اس پر مدرسے کے ناظم حاجی محمد شفیع نے اپنی جیب سے انھیں نقد انعام دیا۔ اس سے ان کا حوصلہ بڑھا اور پھر ہمیشہ پہلی پوزیشن حاصل کرتے رہے۔ مدرسے میں ان کے اساتذہ میں مولانا اکرام اللہ، مولانا عبدالمعبود، مولانا زین اللہ، ماسٹر محمد انیس خاں اور مولانا احسان اللہ زیادہ نمایاں تھے۔ یہ سطور ۲۔ اپریل ۲۰۱۳ کو لکھی جا رہی ہیں۔ اب مولانا احسان اللہ اس دنیا میں موجود ہیں، باقی سب حضرات سفرِ آخرت اختیار کر چکے ہیں۔

مولانا زین اللہ مرحوم کے بارے میں مولانا رفیق احمد رئیس سلفی فرماتے ہیں: ”وجیہ شخصیت کے مالک، کسا ہوا مضبوط ورزشی جسم اور رعب داب کا یہ عالم کہ گاؤں میں بڑے سے بڑے آدمی کو ان سے بات کرنے میں خوف محسوس ہوتا تھا۔ حق گوئی اور بے باکی ان کی وجہ امتیاز تھی۔ گاؤں میں ان کا وجود نعمت سے کم نہ تھا“۔

ان کے فرزند گرامی مولانا ابوالعاص وحیدی کا شمار بھی ہندوستان کے جید علماء میں ہوتا ہے۔ مولانا رفیق احمد سلفی کے کہنے پر انھوں نے اپنے والد عالی قدر کے حالات لکھ کر مولانا عبدالرؤف خاں ندوی کو بھیجے ہیں جو مشرقی یوپی کے علمائے اہل حدیث کے تذکارِ حیات مرتب کر رہے ہیں۔ مولانا عبدالرؤف خاں ندوی کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں قارئین کے مطالعہ میں آچکا ہے۔

مدرسہ نظام العلوم کے ایک مدرس ماسٹر محمد انیس خاں تھے جو مولانا رفیق احمد کے گاؤں ہی کے رہنے والے تھے۔ ایم اے (تاریخ) تھے۔ سائنس، ریاضی اور جغرافیہ کے مضامین پڑھاتے تھے۔ جماعت اسلامی کے رکن تھے، لیکن بقول مولانا رفیق احمد ”اس کی بہت سی باتوں سے اتفاق نہیں کرتے تھے“۔

انھوں نے مولانا مودودی کی کتاب خلافت و ملوکیت کئی بار پڑھی تھی اور اصحاب رسول (ﷺ) کے متعلق مولانا نے جو کچھ لکھا ہے اس سے وہ الجھن میں مبتلا تھے۔ ایک دن مولانا رفیق احمد نے ان کو حافظ صلاح الدین یوسف کی کتاب ”خلافت و ملوکیت کی شرعی حیثیت“ مطالعہ کے لیے دی جو مکتبہ ترجمان دہلی نے شائع کی ہے۔ انھوں نے یہ کتاب دلچسپی اور شوق سے پڑھی۔ پھر ایک ہفتے کے بعد حسب معمول انھیں دعوت پر بلایا اور فرمایا: ”اچھا ہوا مرنے سے پہلے یہ کتاب پڑھ لی اور صحابہ کرام کے بارے میں دل صاف ہو گیا۔ اگر اسی عقیدے اور فکر پر انتقال ہو جاتا تو نہ معلوم آخرت میں کیا حالت ہوتی“۔

وہ مسلکی اعتبار سے بڑے باحمیت تھے۔ جماعت اسلامی سے وابستگی کے باوجود فقہی فروعات میں ذرہ بھی لچک گوارا نہ تھی۔ ایک دفعہ جماعت اسلامی کے لوگوں نے کوشش کی کہ مدرسہ نظام العلوم کے تعلیمی نظام کو ان کی تنظیم سے وابستہ کر دیا جائے۔ اس کے لیے لکھنؤ سے جماعت کے بعض ذمہ دار ارکان ان کے گاؤں پہنچے اور صدر مدرس کی حیثیت سے انھوں نے ماسٹر محمد انیس خاں سے گفتگو کی اور کہا کہ دینیات کی کتاب ''چمن اسلام'' جو مولانا نذیر احمد رحمانی مرحوم کی تصنیف ہے اور ہندوستان میں جماعت اہل حدیث کے تمام مدارس میں داخل نصاب ہے، اس کی جگہ جماعت اسلامی کے افضل حسین صاحب کی کتاب ''سچا دین'' داخل کر لی جائے۔ ماسٹر صاحب نے سختی کے ساتھ اس کی تردید کی اور کہا: ''مسلک کے معاملے میں ہم کوئی سمجھوتا نہیں کر سکتے''۔

ماسٹر محمد انیس خاں بے اولاد تھے اور مولانا رفیق احمد سلفی کے گاؤں کی دو نسلوں کے استاد تھے۔ بعض جسمانی عوارض میں مبتلا تھے۔ موت اس طرح آئی کہ رات کو سوئے تو سوئے ہی رہ گئے۔ انا لله وانا الیه راجعون۔

مدرسہ دار التوحید میں:

صوبہ یوپی کے ضلع سدھارتھ نگر میں اس نواح کے ایک معروف قصبہ ''اٹوا بازار'' کے بجانب مشرق ڈھائی تین کلومیٹر کے فاصلے پر ایک قدیم دور کی درس گاہ ''اتحاد قوم'' کے نام سے قائم تھی۔ اس درس گاہ کا نام اب ''دار التوحید'' رکھا گیا ہے۔ ۱۹۷۳ء میں اپنے گاؤں کے مدرسے کی تعلیم مکمل کر کے مولانا رفیق احمد دار التوحید پہنچے اور وہاں کے نصاب کے مطابق درجہ ششم میں داخل کیے گئے۔ اس وقت اس مدرسے میں جو اساتذہ تعلیم دیتے تھے وہ تھے مولانا سلیم الدین، مولانا انعام اللہ قاسمی، مولانا محمد یحییٰ، مولانا کتاب اللہ زاہد اور مولانا محمد اقبال۔ اس سے کچھ عرصہ بعد تین اساتذہ اور آئے، وہ تھے مولانا ولی اللہ فیضی، مولانا شریف اللہ سلفی اور مولانا یار محمد صاحب۔ درجہ ششم اور ہفتم میں اردو، ہندی، ریاضی، انگریزی، تاریخ، جغرافیہ، فارسی اور عربی کی تعلیم بڑی محنت اور توجہ سے دی جاتی تھی۔

مولانا کتاب اللہ زاہد سے مولانا رفیق احمد رئیس نے عربی کی پہلی کتاب ''منہاج العربیہ'' پڑھی۔ بڑی پابندی سے وہ عربی پڑھاتے اور اردو سے عربی اور عربی سے اردو ترجمہ کراتے تھے، جسے ترجمتین کہا جاتا ہے۔ باقاعدہ اسباق سنتے، مفردات یاد کراتے اور ترجمتین دیکھتے۔ جس طالب علم کا کام مکمل نہ ہوتا یا آموختہ یاد کر کے نہ آتا، اسے سخت سزا دیتے۔ غصے سے ان کا سرخ و سفید چہرہ لال ہو جاتا اور آنکھوں میں سرخ ڈورے دکھائی دیتے۔ ان کی کلاس میں کوئی طالب علم کوئی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔

مولانا رفیق احمد رئیس نے ان سے عربی پڑھی اور بڑی محنت سے پڑھی۔ ان کے انداز تعلیم سے وہ بہت متاثر ہیں۔ آج کل مولانا کتاب اللہ زاہد صاحب ندوۃ السنۃ ''اٹوا بازار'' کے شعبہ نسواں میں خدمات سرانجام

دے رہے ہیں اور مولانا رفیق احمد اپنے اس عالی قدر استاد کو سلام کرنا اور ان کی خدمت میں حاضری دینا، اپنے لیے بہت بڑی سعادت سمجھتے ہیں، جن کی خاص توجہ سے ان کی عربی تعلیم کی بنیاد مضبوط ہوئی۔

ندوۃ السنۃ کے زیر نگرانی عصری تعلیم کا ایک ادارہ "الفاروق مانیٹری سکول" ہے۔ اس ادارے کے روح رواں مولانا شبیر احمد مدنی اور مولانا محمد ابراہیم مدنی ہیں۔ اس کے ایک پروگرام میں شرکت کا دعوت نامہ مولانا رفیق احمد کو آیا تو یہ اس میں شریک ہوئے۔ انھوں نے اس میں عصری تعلیم کی اہمیت اور مسلمانوں کی ترجیحات سے متعلق خطاب کرنا تھا۔ وہاں مہمانوں کا استقبال کرنے والوں میں ان کے استاد مکرم مولانا کتاب اللہ زاہد بھی تھے۔ انھوں نے اپنے اس شاگرد کو دیکھ کر نہایت خوشی کا اظہار کیا۔ یہ بھی اپنے استاد کی بہ درجہ غایت تکریم بجا لائے۔

مدرسہ دارالتوحید کے درجہ ششم میں مولانا رفیق احمد کے اردو ادب کے استاد مولانا سلیم الدین تھے۔ انھوں نے شادی نہیں کی تھی۔ مدرسے کے طلباء ہی ان کی آل اولاد تھے۔ بڑی شفقت اور دلچسپی سے اردو ادب کی نصابی کتابیں پڑھاتے تھے۔

مدرسے کے ناظم کا نام حکیم جمیل احمد خاں تھا۔ اس علاقے کی وہ محترم و معتبر شخصیت تھے۔

اس مدرسے کے ایک استاد مولانا محمد اقبال تھے۔ وہ درجہ ششم میں اردو، ہندی اور ریاضی کی تعلیم دیتے تھے۔ گداز جسم اور گندمی رنگ، ہشاش بشاش اور چہرے پر مسکراہٹ۔

مدرسہ دارالتوحید میں مولانا محمد یحییٰ سے بھی انھوں نے استفادہ کیا جو آج کل جامعہ رحمانیہ بنارس میں تدریسی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ مولانا رفیق احمد نے ان سے علم صرف کی چند کتابیں پڑھیں۔ علم فقہ کی قدروی بھی ان سے پڑھی اور عربی ادب کے اسباق بھی ان سے پڑھنے کا موقع ملا۔

ایک اور استاد مولانا انعام اللہ قاسمی تھے۔ ان سے انھوں نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا رسالہ "دینیات" پڑھا۔ انہی سے علم منطق کی کتاب مرقاۃ پڑھی۔ علم نحو کی دو کتابیں نحو میر اور ہدایۃ النحو بھی انہی سے پڑھیں۔ وہ مدرسے کے صدر مدرس تھے اور بڑی رعب دار شخصیت کے مالک تھے۔

فقہ و فتاویٰ پر مجتہدانہ نظر رکھتے تھے۔ قلم بھی مضبوط تھا۔ دہلی کے ماہنامہ "التوعیہ" میں تفسیر قرآن لکھنا شروع کی تھی، لیکن یہ سلسلہ تھوڑا عرصہ ہی جاری رہا۔ یہ ایک دن ہدایۃ النحو پڑھا رہے تھے کہ ایک غیر مسلم ان کی خدمت میں آیا جس سے ان کی کافی جان پہچان تھی۔ اس نے ان سے پوچھا آپ ان بچوں کو کیا پڑھا رہے ہیں؟ فرمایا عربی کی کتاب پڑھا رہا ہوں۔ اس نے کہا میں نے کبھی عربی زبان نہیں سنی۔ ذرہ پڑھ کر سنائیے۔ مولانا نے اسے زیر درس کتاب ہدایۃ النحو سنانا شروع کی اور کئی صفحے زبانی سنا دیے۔ یہ کتاب انھیں

زبانی یاد تھی۔

ایک مرتبہ رات کو مولانا رفیق احمد رئیس کو کھانسی آنے لگی۔ ساری رات کھانستے رہے۔ مولانا انعام اللہ کا کمرہ ان کے قریب تھا۔ انھوں نے ان کی کھانسی کی آواز سنی تو پریشان ہوئے اور شبہ ہوا کہ کوئی خطرناک بیماری لاحق ہو گئی ہے۔ مولانا شریف اللہ سلفی اپنی بڑی بہن کی عیادت کے لیے بستی (شہر) جا رہے تھے۔ مولانا انعام اللہ نے رفیق احمد کو ان کے ساتھ بھیج دیا کہ کسی اچھے سے ڈاکٹر سے ان کا چیک اپ کرائیں اور ان سے دوا لیں۔ انھوں نے ڈاکٹر سے رابطہ کیا تو اس نے کہا کوئی بیماری نہیں، بس نزلہ زکام کچھ زیادہ ہو گیا ہے۔ دوا دی اور چند روز میں وہ تندرست ہو گئے۔

مدرسہ دارالتوحید قصبہ اٹوابازار کے قریب بہت اچھی درس گاہ ہے اور اس کے قرب و جوار کے متعدد دیہات میں اہل حدیث بہت بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ بعض بستیاں تو صرف اہل حدیث افراد پر مشتمل ہیں اور وہ اپنے مسلک کے مخلص ترین خادم ہیں۔

مدرسہ مفتاح العلوم ٹکریا میں:

ضلع سدھارتھ نگر ہی میں ایک گاؤں ٹکریا ہے۔ وہاں "مدرسہ مفتاح العلوم" کے نام سے درس گاہ قائم ہے۔ کچھ عرصہ مولانا رفیق احمد رئیس وہاں بھی پڑھتے رہے۔ جامعہ سلفیہ بنارس کے دو قابل احترام استاد (مولانا عزیز الرحمٰن سلفی اور مولانا عبدالسلام مدنی) اسی گاؤں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مدرسہ مفتاح العلوم میں انھوں نے مولانا شکر اللہ فیضی، مولانا سلامت اللہ اثری اور مولانا اشفاق احمد فیضی، سے استفادہ کیا۔ یہ تینوں حضرات وفات پا چکے ہیں۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

جامعہ سراج العلوم جھنڈا نگر میں:

یہ دارالعلوم ہندوستان کے مشہور عالم مولانا عبدالرؤف خاں رحمانی جھنڈا نگری کے والد مکرم حاجی نعمت اللہ خاں نے اپنی ذاتی زمین میں نیپال اور ہندوستان کی سرحد پر قائم کیا تھا۔ یہ بہت بڑا تدریسی ادارہ ہے اور اس کی بہت وسیع مسجد ہے۔ یہ پوری عمارت حاجی نعمت اللہ مرحوم نے اپنی کوشش اور اپنے خرچ سے تعمیر کی۔ انھوں نے اپنے ایک بیٹے عبدالرؤف کو دہلی کے دارالحدیث رحمانیہ میں اس دور کے ممتاز و معروف اساتذہ سے تعلیم دلائی اور پھر ایک وقت آیا کہ انھوں نے خطیب الہند اور خطیب الاسلام کے طور پر شہرت پائی۔ علاوہ ازیں ان کے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا دائرہ بھی بہت وسیع تھا۔ دیانت و امانت میں بھی وہ اپنی مثال آپ تھے۔ وہ جامعہ سراج العلوم کے ناظم تھے۔

ان کی دیانت کی مثال دیتے ہوئے مولانا رفیق احمد رئیس فرماتے ہیں:

”سخت گرمی تھی کہ ناظم صاحب کے گاؤں ”کدر بٹوا (Kudar Betwa) سے ان کے پوتے آگئے۔ انھوں نے دو چار لڈو منگوا کر پوتوں کو پانی پلایا۔ تھوڑی دیر بعد مولانا کے اکلوتے صاحب زادے جناب عبدالرشید صاحب آگئے۔ ناظم صاحب نے کہا: عبدالرشید! تمھارے بچوں کو لڈو منگا کر پانی پلایا ہے، وہ روپے مدرسے کے تھے، ادا کر دو۔ صاحب زادے نے جیب سے مطلوبہ روپے نکال کر مولانا رحمانی رحمہ اللہ کے ہاتھ پر رکھ دیئے“۔

اندازہ فرمائیے مدرسے کے پیسے کے سلسلے میں وہ کس قدر احتیاط سے کام لیتے تھے۔

مولانا رفیق احمد فرماتے ہیں:

مولانا عبدالرؤف رحمانی ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتے تھے۔ وہ بیک وقت تین چار خوش خط طلباء کو سامنے بٹھا کر ان سے مختلف مضامین کے خطوط کے جواب املا کراتے۔ کسی کو مدرسے کے مالی تعاون پر شکریے کا خط لکھوایا جا رہا ہے، کسی کو جلسے میں شرکت کی دعوت قبول کرنے کے متعلق اطلاع دی جا رہی ہے، کسی کو کسی فقہی مسئلے کا جواب دیا جا رہا ہے اور کسی سے خیر خیریت دریافت کی جا رہی ہے۔

مولانا عبدالرؤف رحمانی کی اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، وہ نہایت مصروف اور تیز فہم اہل علم تھے۔ ان کا تذکرہ اس کتاب میں ایک مستقل مضمون کی صورت میں کیا گیا ہے۔

جامعہ سراج العلوم جھنڈانگر میں مولانا رفیق احمد رئیس سلفی نے جن اساتذہ سے فیض حاصل کیا، ان میں مندرجہ ذیل حضرات شامل ہیں۔

۱۔ مولانا عبدالرشید مدنی: یہ جامعہ سلفیہ بنارس کے سند یافتہ اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے فارغ التحصیل ہیں۔ باعمل عالم، تجربہ کار مدرس، طلباء کے مشفق و ہمدرد، خوش طبع اور متحمل مزاج۔ کتب فقہ پر خاص طور سے عبور تھا۔ مولانا رفیق احمد سلفی نے ان سے ملاجیون کی اصول فقہ سے متعلق تصنیف نورالانوار پڑھی۔

۲۔ مولانا عبدالحنان فیضی: انھوں نے جامعہ سلفیہ بنارس میں تحصیل علم کی اور پھر اسی جامعہ میں استاد کی حیثیت سے بھی خدمت انجام دی۔ جامعہ سراج العلوم میں ان کے والد مکرم اور لائق تکریم دادا بھی خدمت تدریس میں مشغول رہے۔ ان کے خاندان کے متعدد حضرات درس و تدریس کا فریضہ ادا کر رہے ہیں۔ اس اعتبار سے کہنا چاہیے کہ ایں خانہ ہمہ آفتاب است۔

۳۔ مولانا رحمت اللہ اثری: دنیا کے ہنگاموں سے دور صرف علوم دینیہ کی تدریس سے دلچسپی رکھتے تھے۔ نصابی کتابوں پر عبور حاصل تھا۔ مولانا رفیق احمد سلفی کے زمانہ طالب علمی میں یہ جامعہ سراج العلوم میں صدر مدرس کے منصب پر فائز تھے۔ جامعہ سے الگ ہو کر موضع یوسف پور کے ایک سرکاری سکول

میں ٹیچر ہو گئے تھے۔ پھر وہیں سے ریٹائر ہوئے۔ منجھے ہوئے مدرس تھے، اور نہایت محنت سے طلباء کو پڑھاتے تھے۔

۴۔ مولانا شریف اللہ سلفی: انھوں نے جامعہ سلفیہ بنارس سے فراغت پائی۔ مدرسہ دارالتوحید میں مولانا رفیق احمد نے ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیے تھے۔ اور اپنے اس شاگرد کی ذہانت کی وجہ سے وہ ان پر شفقت فرماتے تھے۔ جامعہ سراج العلوم میں بھی وہ لائق شاگرد کے مہربان تھے۔ ان کو جامعہ سلفیہ بنارس میں داخل ہونے کا مشورہ انھی نے دیا تھا اور خود ہی ان کے داخلے کا فارم بھر کر جامعہ کے دفتر بھیجا تھا۔ اب وہ جامعہ عالیہ عربیہ مئوناتھ بھنجن میں شیخ الجامعہ کے منصب عالی پر فائز ہیں اور اپنے اس شاگرد رشید پر ان کی تحریری اور تبلیغی صلاحیتوں کی وجہ سے بہت خوش ہیں۔

۵۔ مولانا عبدالمجید مدنی: جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے فارغ التحصیل ہیں۔ وہاں سے فراغت کے بعد سے جامعہ سراج العلوم میں پڑھا رہے ہیں۔ خاموش طبع اور متانت پسند مدرس ہیں۔

۶۔ مولانا خورشید احمد مدنی: یہ بھی جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے سند یافتہ ہیں۔ شیخ الجامعہ کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ تحریر و نگارش کا ذوق بھی رکھتے ہیں اور ان کے رشحات قلم مختلف رسائل و جرائد میں چھپتے رہتے ہیں۔

۷۔ مولانا عبدالعلیم ماہر: یہ مشرقی یوپی کے رہنے والے ممتاز عالم دین ہیں۔ ان کے گاؤں کا نام ''سمرا'' ہے جو بہت سے علماء و ادباء کا مسکن ہے۔ نصابی کتابوں پر ماہرانہ نظر رکھتے ہیں اور طلباء ان کے طریق تدریس سے بہت مطمئن ہیں۔ مولانا رفیق احمد سلفی نے ان سے علم نحو کی مشہور کتاب کافیہ پڑھی۔ سالانہ امتحان میں ان کو اور ان کے رفیق درس مولانا عبدالرحیم سلفی (مقیم بمبئی) کو پورے سو سو نمبر ملے تھے۔

جامعہ سلفیہ میں:

جامعہ سراج العلوم جھنڈانگر سے رفیق احمد جامعہ سلفیہ (بنارس) چلے گئے۔ جامعہ سلفیہ بنارس میں ۱۹۶۳ء میں قائم ہوا اور اس میں ۱۹۶۶ء میں تعلیم کا آغاز ہوا۔ جامعہ سلفیہ سے متعلق ضروری معلومات خود مولانا رفیق احمد رئیس سلفی کی زبان ہی سے سنیے جو وہاں تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''ہندوستان میں جماعت اہل حدیث کا سب سے ممتاز ادارہ اور سلفی مسلک وعقیدے کا ترجمان جامعہ سلفیہ بنارس ہے۔ اس ادارے کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اسے ہماری مرکزی اہل حدیث تنظیم نے جو پہلے آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کہلاتی تھی، قائم کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے لیے پوری جماعت کا دل دھڑکتا ہے۔ جامعہ کی مجلس انتظامیہ بھی اپنی ذمہ داری سمجھتی ہے کہ وہ جماعت کی تمناؤں پر پوری اترے۔ ابھی جامعہ

نے اپنی زندگی کی کل سینتالیس بہاریں دیکھی ہیں لیکن اس عرصے میں اس نے اپنے فارغین سے ہندوستان کی دینی، تعلیمی، علمی اور دعوتی مجلسوں کو آباد کر دیا ہے۔تقریباً تمام صوبوں میں اس کے فارغین درس و تدریس، وعظ و ارشاد اور تصنیف و تالیف کی محفلیں سجائے ہوئے ہیں۔ان کی اپنی ایک شناخت ہے اور بیرون ہند بھی وہ اپنی علمی اور دعوتی خدمات کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ مجھے بھی اس عظیم ادارے میں داخلہ پانے اور مکمل چار سال وہاں رہنے اور وہاں کے اساتذہ اور اس کی علمی فضا سے استفادے کی سعادت حاصل ہے۔

''اس دور میں داخلہ امتحانات شفوی ہوا کرتے تھے جسے بعد میں تحریری کر دیا گیا ہے۔ میرا امتحان داخلہ استاد گرامی شیخ انیس الرحمٰن اعظمی حفظہ اللہ نے لیا تھا۔ جماعت خامسہ کا میں امیدوار تھا اور اسی میں مجھے داخلہ ملا۔خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔اب تک جن مدارس میں پڑھا تھا، ان کے مقابلے میں یہاں کی ہر چیز جدا اور خوب سے خوب تر۔ہاسٹل بہت صاف ستھرا، ہر طالب علم کے لیے ایک بیڈ اور ایک میز، کھانے کا نظام بالکل منفرد، باورچی خود کھانا کمرے پر پہنچا کر جاتا اور کمرے کے تمام ساتھی ایک ساتھ مل کر کھانا کھاتے۔کلاس روم سفید چادر سے آراستہ، کتابیں رکھنے کے لیے ہر طالب علم کی ڈیسک علاحدہ، کلاس روم میں جانے کے لیے یونیفارم کی شرط، یہ تمام مناظر پڑھنے لکھنے اور کچھ بن کر نکلنے پر آمادہ کرتے تھے۔ندوۃ الطلبہ کی مستقل لائبریری جس میں مطالعہ کے لیے تمام ضروری کتابیں دست یاب، رسائل و جرائد کی بہتات، ہر جمعرات کو اجلاس، جس میں اردو عربی تقریروں کی مشق کرائی جاتی۔کھیل کا میدان جہاں والی بال کھیلنے کی پوری سہولت۔مطالعہ کے لیے دارالحدیث کا وسیع ہال جہاں رات کے ڈیڑھ دو بجے تک طلبا مطالعہ میں مصروف۔ یہ ہے جامعہ سلفیہ کا اندرونی منظر جو میں نے دیکھا اور جس کے اثرات آج بھی دل و دماغ میں موجود ہیں۔نصاب سے ہٹ کر غیر درسی کتابوں کے مطالعے کا جامعہ میں عام رواج تھا۔مختلف فن کی کتابیں ذوق وشوق کے ساتھ پڑھی جاتی تھیں۔ کتنی کتابوں کا مطالعہ ان چار سالوں میں کیا، اس کا کوئی حساب نہیں ہے۔علامہ شبلی نعمانی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی سیرۃ النبی اسی دور میں حرفاً حرفاً پڑھی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ کتنی دماغ میں محفوظ ہیں اور کتنی نکل گئیں۔ یہاں بتانا صرف یہ تھا کہ جامعہ سلفیہ میں طلبہ کا علمی ذوق کتنا عمدہ تھا اور انھوں نے ایک خوش گوار ماحول بنا دیا تھا۔''

اساتذہ:

جامعہ سلفیہ (بنارس) میں جن اساتذہ کرام سے مولانا رفیق احمد سلفی نے تعلیم حاصل کی، ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

مولانا عبدالوحید رحمانی، ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری، مولانا شمس الحق سلفی، مولانا عبدالمعید بنارسی، مولانا

صفی الرحمٰن مبارک پوری، مولانا محمد رئیس ندوی، مولانا عابد حسن رحمانی۔ یہ سب حضرات وفات پا چکے ہیں، رحمہم اللہ تعالیٰ۔ جو حضرات اللہ کی مہربانی سے آج کی تاریخ ۲۵ اپریل ۲۰۱۳ء تک زندہ ہیں اور درس و تدریس کی بزم سجائے ہوئے ہیں، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

مولانا انیس الرحمٰن اعظمی، مولانا عزیز الرحمٰن سلفی، مولانا محمد مستقیم سلفی، مولانا عبدالسلام مدنی، مولانا جمیل احمد مدنی اور مولانا عبدالمعید مدنی۔

مذکورہ بالا مرحومین و موجودین اساتذہ کرام میں سے بعض حضرات تدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف میں بھی امتیازی شان رکھتے ہیں۔ ان میں سے بعض نے برصغیر کے مشہور مصنفین کی تحقیقی اور تاریخی اردو کتابوں کے عربی میں ترجمے بھی کیے ہیں۔

جامعہ سلفیہ بنارس کے جلیل القدر اساتذہ سے مولانا رفیق احمد نے چار سال تعلیم حاصل کی اور سند فراغ لے کر سلفی کہلائے۔

علی گڑھ میں:

جامعہ سلفیہ سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد مولانا رفیق احمد سلفی کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ مزید تعلیم حاصل کی جائے یا درس و تدریس سے رشتہ جوڑا جائے۔ اساتذہ اور احباب سے مشورے جاری تھے کہ اسی دوران ان کے ہم زلف ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی پروفیسر اسلامک اسٹڈیز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا خط ملا کہ آپ علی گڑھ آ جائیں۔ اس سے پہلے یہ انھی کے مشورے سے علی گڑھ ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی میں تصنیفی تربیت کے لیے درخواست دے چکے تھے۔ اب علی گڑھ گئے اور پھر کچھ مہینوں کے بعد ادارہ تحقیق میں انٹرویو کے لیے بلا لیے گئے۔ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب (دارالمصنفین اعظم گڑھ کے موجودہ ناظم) اور مولانا سید جلال الدین عمری (موجودہ امیر جماعت اسلامی ہند) نے انٹرویو لیا۔ دونوں صاحبان نے فیصلہ ان کے حق میں کیا اور اس طرح یہ ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی کے ریسرچ اسکالر بن گئے۔

یہ تصنیفی تربیت کا دو سالہ کورس ہے جس میں دینی مدارس اور عصری جامعات کے طلبہ کو داخلہ دیا جاتا ہے۔ یہاں انھوں نے ادارے کے مجوزہ نصاب کے مطابق تفسیر ابن کثیر، بلوغ المرام، مباحث فی علوم القرآن اور السنۃ و مکانتھا فی التشریع الاسلامی کا حرفاً حرفاً مطالعہ کیا۔ اس کے علاوہ اسلامی عقائد، عبادات، معاشیات، سیاسیات اور سماجیات پر منتخبہ کتابیں پوری توجہ اور یک سوئی سے پڑھیں۔ دینی جماعتوں، اسلامی تحریکات، ہندوستانی مذاہب، اشتراکیت، سرمایہ داری اور ہندوستان کی دینی و ثقافتی تاریخ بھی مطالعہ کا حصہ رہی۔ مضمون نگاری کی تربیت اس طرح دی جاتی تھی کہ ہر مہینے کوئی نہ کوئی مضمون لکھ کر پیش کرنا ہوتا تھا۔ بسا

اوقات مولانا سیّد جلال الدین عمری مضمون پڑھ کر مشورے دیتے اور کمی کی نشان دہی کرتے۔ ان کی ایک نصیحت یہ تھی کہ کوئی بھی پیراگراف لکھو تو خود یہ دیکھنے کی کوشش کرو کہ جو تم کہنا چاہتے ہو وہ بات اس میں آئی یا نہیں؟ بار بار دیکھنے اور الفاظ اور جملے بدلنے میں ذرا بھی کوتاہی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ اسی سے تحریر میں نفاست آتی ہے۔ زور بیان پیدا ہوتا ہے اور ادبیت نمایاں ہوتی ہے۔ یہ دو سالہ تصنیفی تربیت کا کورس مولانا رفیق احمد سلفی کی آئندہ علمی زندگی کے لیے بہت اہم ثابت ہوا اور تصنیف و تالیف، ترجمہ نگاری اور صحافت کے ذوق کو جلا ملی۔ ادارے کا دو سالہ کورس مکمل ہونے والا تھا کہ پروفیسر محمد معین فاروقی اور مولانا عبدالمنان اثری صاحبان کے حکم سے ماہنامہ ''دعوت سلفیہ'' علی گڑھ کی ادارت کی ذمہ داری قبول کر لی۔ یہ رسالہ ادارہ دارالحدیث علی گڑھ کا ترجمان تھا۔ ادارے کے صدر حاجی نذیر احمد تھے۔ علی گڑھ شہر اور ضلعے کی جمعیت اہل حدیث کے صدر بھی وہی تھے۔ علی گڑھ میں جماعت اہل حدیث کو منظم کرنا اور ان دونوں بزرگوں (مولانا عبدالخالق اثری اور پروفیسر محمد معین فاروقی) کے تعاون سے دینی پروگرام کرنا پہلی ترجیح تھی۔ مولانا رفیق احمد سلفی کے یہاں مستقل قیام کی صورت یہ بنی کہ قدیم شہر علی گڑھ میں جماعت اہل حدیث کی مرکزی مسجد (جو موتی مسجد کے نام سے معروف ہے) میں امامت و خطابت کی ذمہ داری قبول کر لی۔ اس طرح ماہنامہ ''دعوت سلفیہ'' علی گڑھ کی ادارت کے ساتھ ساتھ امامت و خطابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ رسالہ تو ۱۹۸۶ء سے شروع ہو کر ۱۹۸۹ء میں بند ہو گیا لیکن موتی مسجد میں امامت و خطابت کا سلسلہ ۱۹۹۲ء تک جاری رہا۔

موتی مسجد میں امامت و خطابت اور ''دعوت سلفیہ'' کی ادارت کے علاوہ انھوں نے شہر علی گڑھ کے ایک پرائیویٹ مسلم ہائی سکول میں تدریس کی ذمہ داری بھی قبول کر لی۔ اردو اور دینیات کی کلاسیں ان کے ذمے تھیں اور یہ سکول میں ہونے والے پروگراموں کی نگرانی بھی کرتے تھے اور بچوں کو تقریر اور نعت گوئی اور نظم خوانی کے لیے تیار بھی کرتے تھے۔ اب سکول سے اپنی بعض مجبوریوں کی وجہ سے الگ ہو چکے ہیں۔ لیکن ان کے شاگردوں کی پوری ایک جماعت جواب جوان ہو چکی ہے، وہ جماعت ان سے آج بھی تعلق رکھتی ہے۔ ان میں سے کئی شاگردوں نے بحمد اللہ اہل حدیث مسلک قبول کر لیا ہے اور وہ شہر علی گڑھ میں جماعت کے دست و بازو بن گئے ہیں۔

علی گڑھ ہی میں جماعت کے علمی کاموں کو آگے بڑھانے کے لیے پروفیسر محمد معین فاروقی سابق پروفیسر شعبہ حیاتیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، مولانا محمد عبدالمنان اثری سابق انگلش استاد سٹی ہائی سکول مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور پروفیسر ڈاکٹر اکرام اللہ خان جواہر لال نہرو میڈیکل کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی سربراہی میں جمعیۃ البر الاسلامیہ (جامعہ اردو روڈ علی گڑھ) کی تاسیس عمل میں آئی۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ

کے متخصص مولانا محمد عزیر شمس، ڈاکٹر وصی اللہ عباس، ڈاکٹر لیث محمد بستوی اور جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ میں زیر تعلیم جامعہ سلفیہ بنارس کے فارغین نے اس علمی اور تحقیقی ادارے کو پروان چڑھایا۔ بحمد اللہ اس کی اپنی عمارت ہے۔ آفس کے علاوہ اس میں ایک لائبریری بھی ہے جس میں قرآن، حدیث، تفسیر، فقہ، فتاویٰ، تاریخ اور سیرت سے متعلق مراجع و مصادر کی اہم کتابیں موجود ہیں۔ ان حضرات کے تعاون سے یہ ایک بہترین کام علی گڑھ میں ہو رہا ہے۔ یہ ادارہ یونیورسٹی کیمپس کے دامن میں ہے اور یونیورسٹی کے اقامتی ہال محسن الملک ہال سے بالکل متصل ہے۔ وہاں یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ آتے ہیں اور مراجع و مصادر کی کتابوں سے استفادہ کرتے ہیں۔ طلبہ سوالات پوچھنے اور دینی رہنمائی کے لیے بھی تشریف لاتے ہیں۔ مولانا رفیق احمد سلفی وہاں عشاء تک بیٹھتے اور علمی اور دعوتی خدمات انجام دیتے ہیں۔

علی گڑھ میں دعوتی و تبلیغی مصروفیات:

علی گڑھ میں مولانا رفیق احمد رئیس سلفی کی دعوتی سرگرمیوں کا سلسلہ جاری ہے۔ پہلے یہ مسلم یونیورسٹی کے علاقہ سول لائنس میں کرائے کے مکان میں رہ رہے تھے۔ ۲۰۱۱ء میں اپنا مکان تعمیر کر لیا ہے اور اب اسی میں ان کی رہائش ہے۔ یہ محلہ ہمدرد نگر (بی) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان کے گھر کے قریب ایک اہل حدیث مسجد بھی ہے جسے مولانا مختار احمد ندوی رحمہ اللہ نے ادارہ اصلاح المساجد ممبئی کی جانب سے تعمیر کرایا تھا۔ اس کے لیے زمین کا انتظام ایک بزرگ حاجی نذیر احمد سلفی مرحوم (محلہ سرائے میاں علی گڑھ) نے کیا تھا۔ انھی نے جماعت اہل حدیث کو علی گڑھ میں مستحکم کرنے کے لیے ایک مرکز کی تعمیر فرمائی۔ اس مسجد میں مولانا رفیق احمد منگل کے دن نماز عشا کے بعد جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ''فقہ کتاب وسنت'' (مصنف: محمد صبحی بن حسن حلاق، اردو ترجمہ: مولانا محمد فاروق سعیدی) پڑھاتے ہیں۔ ایک مسجد میں مستقل طور پر جمعے کا خطبہ بھی دیتے ہیں اور شہر کی بعض مساجد میں درس کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ کسی مسجد میں قرآن کا درس، کسی میں حدیث کا۔ علی گڑھ شہر میں اہل حدیث کی دس مسجدیں ہیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اقامتی ہالوں میں کم و بیش تیس ہزار طلبہ قیام کرتے ہیں۔ ہر ہال میں ایک مسجد بھی ہے جس میں یونیورسٹی کی طرف سے امام مقرر ہیں۔ صاحب توفیق طلبہ پابندی سے نماز پڑھتے ہیں اور ان مساجد میں مختلف دینی جماعتوں کی دینی اور دعوتی سرگرمیاں بھی جاری ہیں۔ اہل حدیث طلبہ بھی اپنے پروگرام کرتے ہیں۔ کئی ہالوں میں قرآن اور حدیث کے دروس ہوتے ہیں۔ اس دعوتی مہم میں مولانا رفیق احمد سلفی کی بھی شرکت رہتی ہے۔ محسن الملک ہال میں یہ ہر بدھ کو بعد نماز مغرب قرآن مجید کا درس دیتے ہیں۔ طلبہ کی خواہش تھی کہ مکمل قرآن کا ترجمہ اور اس کی مختصر تفسیر سنی جائے چنانچہ اللہ کے فضل سے یہ سلسلہ جاری

ہے۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً سرسید ہال، ہادی حسن ہال، علامہ اقبال ہال، سلیمان ہال، ڈاکٹر ایمبید کر ہال، وقار الملک ہال وغیرہ میں خاص موضوعات پر محاضرات ہوتے ہیں اور طلبہ اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ ان دعوتی سرگرمیوں کا نتیجہ یہ ہے کہ اب یونیورسٹی کی تمام مساجد میں جہری نمازوں میں آمین کی آواز گونجتی ہے۔ کتنے ہی ڈاکٹر، انجینئر اور دیگر علوم وفنون سے وابستہ طلبہ نے جو بریلوی یا دیوبندی گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے، اہل حدیث مسلک اختیار کیا اور وہ آج ملک کے مختلف حصوں میں اپنے دائرہ عمل میں دعوت کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

طلبہ کے علمی ذوق کا یہ حال ہے کہ انھوں نے ایک بار خواہش ظاہر کی کہ ہمیں حدیث کی صحت اور ضعف کے متعلق کچھ باتیں بتائی جائیں۔ یہ ایک مشکل کام تھا۔ عصری تعلیمی ادارے میں تعلیم حاصل کرنے والے سائنس اور دوسرے عصری علوم کے طلبہ کو اصول حدیث سمجھانا آسان نہیں ہے۔ لیکن مولانا رفیق احمد نے ان کو پروگرام منعقد کرنے کے لیے کہا۔ بلیک بورڈ کا بھی انتظام کروایا اور پھر مسلسل ڈھائی گھنٹوں تک بلیک بورڈ کی مدد سے انھیں سند، متن، راوی، صحیح، حسن، ضعیف، موضوع وغیرہ کی مثالوں کے ذریعے تفہیم کرائی۔ حدیث پر کیے جانے والے اعتراضات کی حقیقت بتائی اور بتایا کہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ بالکل آخری دور میں اسلام لائے اور سب سے زیادہ احادیث یہی روایت کرتے ہیں۔ طلبہ کو بتایا کہ کم وبیش تین سال سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قرب رہا۔ تین سال میں تقریباً گیارہ سو دن ہوتے ہیں۔ ان سے مروی روایات کو ان ایام پر تقسیم کریں تو تعداد کل پانچ چھے احادیث یومیہ پڑتی ہیں۔ کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ کوئی مشکل کام ہے۔ اسی طرح احادیث کی تعداد کو لے کر غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ مولانا رفیق احمد سلفی نے طلبہ کو بتایا کہ احادیث شمار کرنے کا محدثین کا اپنا انداز ہے، وہ اسناد کی بنیاد پر احادیث شمار کرتے ہیں۔ بسا اوقات ایک متن کی سیکڑوں سندیں ہوتی ہیں۔ اس طرح کے دو لیکچر یونیورسٹی کیمپس میں ہوئے اور طلبہ کو یہ معلوم ہوا کہ فن حدیث کتنا اہم اور وسیع علم ہے۔ ان لیکچروں کی وجہ سے کئی طلبہ اہل حدیث ہو گئے۔

مولانا رفیق احمد سلفی کی طرف سے فراہم کردہ معلومات کے مطابق یہ بھی سنتے جائیے کہ علی گڑھ میں جمال پور اور ہم درد نگر دو ایسے محلے ہیں جہاں مسلم نوجوان بڑی تعداد میں تعلیم یافتہ ہیں۔ وہ قرآن وحدیث بہت شوق کے ساتھ سنتے ہیں۔ تبلیغی جماعت کی گھسی پٹی باتوں سے وہ تنگ آ چکے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ دو نوجوان جن میں ایک کا نام ارشد ہے جو ایک محکمے میں سرکاری ملازم ہیں اور دوسرے جاوید احمد جو یونیورسٹی کے میڈیکل کالج میں ملازم ہیں، اپنے اپنے محلے میں درس قرآن کا انتظام کیے ہوئے ہیں۔ ہر اتوار کو نماز ظہر

کے بعد اور نماز عشا کے بعد ان دونوں محلوں میں مولانا رفیق احمد درس قرآن دیتے ہیں۔اس میں نوجوان خاصی تعداد میں شرکت کرتے ہیں۔اسی طرح (علی گڑھ کی) نبی نگر کالونی میں مرکزی مسجد ہے۔وہاں ڈاکٹر اکرام اللہ خاں پروفیسر شعبہ شعاعیات، جواہر لال نہرو میڈیکل کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ رہتے ہیں۔ان کے زیر انتظام اسی مسجد میں درس قرآن دیا جاتا ہے۔

علی گڑھ قدیم شہر کا ایک نیا محلہ اکبر کالونی کے نام سے موسوم ہے۔یہاں کچھ اہل حدیث آباد ہیں۔انھوں نے اپنی کوشش سے مسجد کے لیے زمین حاصل کی اور پھر مولانا ممدوح نے مجلس الدعوہ الاسلامیہ دہلی کے مدیر مولانا عزیز عمر سلفی سے درخواست کر کے ''مسجد ابن باز'' کے نام سے مسجد تعمیر کرائی۔ یہ مسجد ماشاء اللہ بہت آباد ہے۔شبینہ مدرسہ بھی اس میں قائم ہے اور مسجد کے امام صاحب درس وتدریس اور دعوت و تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔یہاں کی آبادی ان غریب مسلمانوں پر مشتمل ہے جو بابری مسجد کی شہادت کے موقع پر دیہات سے اپنی جان بچا کر یہاں آ گئے تھے۔یہاں کے نوجوانوں نے ایک مدرسہ قائم کرنے کا ارادہ کیا ہے۔مولانا نے علی گڑھ کے بعض مخلص دوستوں کے تعاون سے ساڑھے تین لاکھ روپے میں مسجد کے قریب ہی ایک زمین کا بیع نامہ کرا دیا ہے۔کوشش کی جارہی ہے کہ اس پر تعمیرات کا سلسلہ شروع کرا دیا جائے۔یہ مدرسہ اس بستی کی بنیادی ضرورت ہے۔اگر ان کے بچے زیور علم سے آراستہ ہوگئے تو ان شاء اللہ ان کے عقائد بھی درست ہو جائیں گے اور یہ ایک باعزت زندگی گزار سکیں گے۔

بہرکیف مولانا رفیق احمد رئیس سلفی علی گڑھ میں بڑی مستعدی سے علمی اور تنظیمی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

علی گڑھ ہی میں ان کے بعض دوستوں نے اصرار کر کے ایم ٹی ایچ (ماسٹر آف تھیالوجی) کا فارم پرائیویٹ امتحان کے لیے ۲۰۰۶ء میں بھروا دیا تھا۔ یہ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ دینیات کا دو سالہ کورس ہے۔مولانا امتحان میں شریک ہوئے اور فائنل میں امتیازی نمبروں سے کامیابی ملی۔فیکلٹی آف دینیات اور شعبہ دینیات کے دونوں گولڈ میڈل ان کے ہاتھ آئے۔ بعد میں پی ایچ ڈی کے داخلہ ٹیسٹ میں بھی شامل ہوئے اور اس میں پہلی پوزیشن حاصل کی اور پی ایچ ڈی میں داخلہ مل گیا۔مقالے کا موضوع ہے: ''نواب صدیق حسن خاں بہ حیثیت مفسر قرآن''

علمی اور تصنیفی کام:

مولانا رفیق احمد سلفی کی مضمون نویسی کا آغاز جامعہ سلفیہ بنارس میں طالب علمی کے دور ہی میں ہوگیا تھا۔ حکیم اجمل خاں صاحب کے رسالہ ''مجلہ اہل حدیث'' میں پہلا مضمون ''اسلام کا تصور جنگ'' کے موضوع پر

شائع ہوا تھا۔دوسرا مضمون اسی زمانے میں ترجمان دہلی میں چھپا تھا۔ترجمہ اور تصنیف و تالیف کا باقاعدہ کام علی گڑھ آنے کے بعد شروع ہوا۔بعض علمی اور تصنیفی کاموں کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

(۱)خمینیت :افکار و عقائد:

یہ مصری عالم سعید حوی کی ایک عربی کتاب ہے جو ایرانی انقلاب کے بعد خمینی صاحب کے بعض معتقدات سے پردہ اٹھاتی ہے۔ان کی کتاب ''الحکومتہ الاسلامیۃ'' میں جو باتیں اسلامی عقیدے کے خلاف درج ہیں، مصنف نے انھیں اپنا موضوع بنایا ہے۔مولانا عبدالوہاب خلجی نے اسے اپنے ادارے المکتبۃ العلمیہ دہلی سے ۱۹۸۹ء میں شائع کیا۔

(۲)مسلمان عورت کا شرعی لباس:(ص:۱۶)

ادارہ علوم الحدیث، علی گڑھ، جنوری ۲۰۰۳ء۔علامہ محمد ناصرالدین البانی رحمہ اللہ کی کتاب ''حجاب المرأۃ المسلمۃ'' کے ایک باب کی ترجمانی اس کتابچے میں کی گئی ہے اور عورتوں کے شرعی لباس کی تعیین کی گئی ہے۔مولانا رفیق احمد نے اس میں اپنی جانب سے بعض باتوں کا اضافہ بھی کیا ہے۔علی گڑھ کے ایک دوست محمد شعیب شمسی صاحب نے اپنی طرف سے اس کو شائع کر کے مفت تقسیم کیا۔

(۳)مفتاح اللغتہ العربیۃ حصہ دوم:(ص:۸۲)

سرسید بک ڈپو علی گڑھ، اکتوبر ۲۰۰۵ء۔جامعہ اردو علی گڑھ کے امتحان ادیب ماہر کے لیے یہ ایک نصابی کتاب ہے۔اسے جامعہ اردو کے سابق وائس چانسلر جناب محمد قاسم صدیقی صاحب نے تیار کرایا تھا۔اس میں مولانا رفیق احمد نے مرکبات،افعال اور اسم ظرف و اسم آلہ وغیرہ کی تفہیم کرائی ہے اور عربی سے اردو اور اردو سے عربی ترجمہ کرنے کی مشقیں تیار کی ہیں۔

(۴)اسلامی سیاست کی فکری و عملی بنیادیں:(ص:۴۷)

الدارالعلمیہ، دہلی ۲۰۰۴ء۔مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کے سابق ناظم عمومی مولانا عبدالوہاب خلجی نے یہ کتاب اپنے ادارے کی طرف سے شائع کی ہے۔یہ شیخ عبدالرحمٰن بن ناصر السعدی کی ایک کتاب کا ترجمہ ہے۔

(۵)اسلام کے بنیادی عقائد:(ص:۶۳)

ادارہ علوم الحدیث، علی گڑھ، ستمبر ۲۰۰۱ء۔مولانا عبدالمنان اثری سکریٹری ادارہ علوم الحدیث، علی گڑھ کے مشورے سے یہ کتاب عصری درس گاہوں کے مسلم طلبہ و طالبات کے لیے تیار کی گئی ہے۔اس کی اشاعت کا پورا خرچہ پروفیسر عبدالحکیم بنارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اٹھایا۔اس میں اسلام کے عقیدہ توحید اور دیگر ارکان ایمان کو سوال و جواب کے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔اللہ نے اس کتاب کو بڑی مقبولیت بخشی۔اس کا

ایک ایڈیشن مکتبہ قدوسیہ لاہور سے نومبر ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا۔ تیسرا ایڈیشن مولانا اکرم مختار صاحب نے اپنے ادارے دارالعلم ممبئی سے دسمبر ۲۰۰۶ء میں شائع کیا۔ مکتبہ قدوسیہ نے اس کا انگریزی ترجمہ "Fundamental Belifs of Islam" کے نام سے ۲۰۰۳ء میں شائع کیا۔ اس انگریزی ایڈیشن کی اشاعت دارالعلم ممبئی سے بھی دسمبر ۲۰۰۶ء میں عمل میں آئی۔

(۶) شرف اصحاب الحدیث: (ص: ۸۰)

خسرو قاسم، رائے پورہ لاج، سرسید نگر علی گڑھ، دسمبر ۲۰۰۹ء۔ یہ علامہ خطیب بغدادی رحمہ اللہ کی معروف کتاب کا ترجمہ ہے۔ محترم خسرو قاسم صاحب نے اسے شائع کیا ہے اور انہی کی خواہش پر کتاب کے آخر میں چالیس متفق علیہ احادیث کا ترجمہ بھی شامل کیا گیا ہے۔

اس کتاب کا ایک ایڈیشن دارالعلم ممبئی نے اپریل ۲۰۰۸ء میں شائع کیا۔

(۷) کتاب زندگی: (ص: ۳۶۸)

المنار پبلی کیشنز، دہلی ۲۰۰۷ء۔ امام بخاری رحمہ اللہ کی مشہور کتاب "الادب المفرد" کا ترجمہ سید عبدالقدوس ہاشمی نے کیا تھا۔ لیکن اس میں کئی مقامات پر متن کتاب سے ترجمے کی ہم آہنگی نہیں تھی۔ مزید یہ کہ مترجم نے کئی جگہوں پر متن کتاب میں بعض احادیث کے سلسلے میں غیر ضروری اشکالات تحریر کر دیے تھے۔ بعض احادیث کی صحت پر بھی سوال اٹھائے تھے۔ مترجم کی تمام غیر ضروری تحریریں حذف کر دی گئی ہیں۔ مولانا عبدالعزیز سلفی اور مولانا عارف جاوید محمدی کے فرمان کے مطابق اس پر نظر ثانی کی گئی ہے۔

(۸) صحیح الادب المفرد: (ص: ۴۴۸)

دارالعلم، ممبئی ستمبر ۲۰۰۷ء۔ کتاب زندگی سے سید عبدالقدوس ہاشمی کے اپنے تصحیح شدہ ترجمے کو علامہ البانی رحمہ اللہ کی کتاب "صحیح الادب المفرد" کے عربی متن کے ساتھ منسلک کر دیا ہے۔ اس طرح صحیح احادیث کا اب یہ نہایت عمدہ مجموعہ ہے۔ عربی متن کے سامنے اردو ترجمہ ہے۔

(۹) مکاتیب رحمانی: (ص: ۱۵۴)

مکتبہ ترجمان، دہلی دسمبر ۱۹۹۵ء۔ یہ شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی رحمہ اللہ کے ان ۵۹ مکاتیب کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنے شاگرد مولانا محمد امین اثری رحمہ اللہ کو لکھے تھے۔ مولانا رفیق احمد سلفی نے خطوط نقل کیے۔ ترتیب دی، حواشی تحریر کیے اور خطوط میں جو فقہی یا علمی مسائل زیر بحث آئے ہیں، ان کی فہرست مرتب کی۔ شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی کی حیات مبارکہ کو قریب سے دیکھنے اور ان کے علمی مقام و مرتبہ اور محدثانہ عظمت کو سمجھنے کے لیے خطوط کا یہ مجموعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مولانا رفیق احمد نے کتاب پر مقدمہ بھی

لکھا ہے جس میں مولانا محمد امین اثری رحمہ اللہ کی حیات وخدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۱۰) مکاتیب حضرت شیخ الحدیث: (ص: ۲۳۲)

فردوس پبلی کیشنز، نئی دہلی ۲۰۰۲ء۔ یہ شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی رحمہ اللہ کے ان ایک سو بیس (۱۲۰) خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے مولانا عبدالسلام رحمانی کو لکھے تھے۔ اس کے ضروری حواشی مولانا عبدالسلام رحمانی صاحب نے خود تحریر کیے ہیں۔ مولانا رفیق احمد نے انھیں نقل کیا، مرتب کیا، کمپوزنگ کرائی اور تصحیح کی۔ فقہی اور علمی مسائل جو خطوط میں زیرِ بحث آئے ہیں، ان کی فہرست بنا کر ابتدا میں شامل کی تاکہ ایک نظر میں ان مسائل تک پہنچا جا سکے، جو خطوط میں موجود ہیں۔ کتاب کی برقی کتابت اور اس کی خوب صورت سیٹنگ مولانا عبدالسلام رحمانی کے داماد جناب محمد راشد خاں صاحب نے کی ہے۔ وہ دہلی کے ایک روزنامہ اخبار میں کام کرتے ہیں۔ مولانا رفیق احمد سلفی نے ازراہِ کرم یہ کتاب مجھے بھی بھیجی تھی۔

(۱۱) علوم الحدیث: مطالعہ وتعارف: (ص: ۵۲۸)

جمعیت اہلِ حدیث، علی گڑھ، نومبر ۱۹۹۹ء۔ یہ ۱۸، ۱۹ اکتوبر ۱۹۹۸ء کو علی گڑھ میں منعقد ہونے والے سیمینار میں پیش کیے گئے مقالات کا مجموعہ ہے۔ مقالات کی تعداد ۲۶ ہے۔ اس کے افتتاحی اجلاس کو مولانا عبدالمعید مدنی، مولانا عبدالوہاب خلجی، مولانا عبدالحمید رحمانی اور شیخ صلاح الدین مقبول احمد مدنی نے خطاب فرمایا تھا جب کہ سیمینار کے اختتام پر اپنے تاثرات مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا عبدالوہاب حجازی، مولانا خورشید احمد سلفی، مولانا ابوالقاسم عبدالعظیم مدنی اور مولانا عاشق علی اثری نے ظاہر فرمائے تھے۔ مولانا رفیق احمد سلفی نے کوشش کر کے تمام شرکاے سیمینار کا تعارف حاصل کیا، جسے مجموعے کے آغاز میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اس طرح حدیث پاک کے مختلف گوشوں کو نمایاں کرنے والی یہ ایک اہم کتاب بن گئی ہے۔ اہلِ علم اس سے استفادہ کرتے ہیں اور اپنی کتابوں میں اس کے حوالے پیش کرتے ہیں۔ مولانا رفیق احمد سلفی نے علی گڑھ سے ان سطور کے راقم کو بھی یہ کتاب ارسال فرمائی تھی۔ اس کتاب کا ایک نیا ایڈیشن حافظ احمد شاکر کے فرزند ہناد شاکر نے اپنے مکتبہ دار الکتب السلفیہ اردو بازار لاہور کی طرف سے شائع کیا ہے۔

ہناد شاکر صاحب نے اس کی چند کاپیاں مولانا رفیق احمد سلفی کی خدمت میں علی گڑھ بھیجیں۔ حدیث کے مختلف پہلوؤں کو علمی وتحقیقی انداز میں پیش کرنے والی یہ ایک بیش قیمت کتاب ہے۔

(۱۲) مدارس کے نصابِ تعلیم میں قرآن کا مقام اور اس کا منہج تدریس: (ص: ۴۰۰)

قرآن اکیڈمی، صفا شریعت کالج، ڈومریا گنج، سدھارتھ نگر، جولائی ۲۰۰۷ء...... یہ ان چھبیس علمی وتحقیقی مقالات کا مجموعہ ہے جو یکم ودو مارچ ۲۰۰۵ء کو اس سیمینار میں پڑھے گئے تھے جسے صفا شریعت کالج نے منعقد

کیا تھا۔ سیمینار کا مرکزی عنوان وہی تھا جو مجموعہ مقالات کا عنوان ہے۔ مختلف مکاتب فکر کے اہل علم اس سیمینار میں تشریف لائے تھے جنھوں نے ہندوستانی مدارس میں قرآن، تفسیر اور اصول تفسیر کی تدریسی صورت حال کے متعلق مقالات پڑھے تھے۔ مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ایڈیٹر البعث الاسلامی (دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) نے سیمینار کا افتتاح فرمایا تھا اور سامعین کو خطاب کیا تھا۔ ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی ڈین فیکلٹی دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے بھی اس کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کیا تھا۔ خطبہ صدارت ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری رحمہ اللہ نے پڑھا تھا۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا سیمینار تھا جس میں کلام الٰہی کے طریق درس و تدریس کو موضوع بنایا گیا تھا۔ مولانا رفیق احمد سلفی نے مقالات پر نظر ثانی کی، ان کی کمپوزنگ کرائی، تصحیح کی اور مقدمہ لکھا۔

(۱۳) اذان کے احکام و مسائل: (ص: ۱۲۳)

الدار السلفیہ ممبئی، جولائی ۲۰۰۴ء۔ یہ شیخ عبداللہ بن عبدالرحمٰن الجبرین کی عربی کتاب ''المفید فی تقریب احکام الاذان'' کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں اذان سے متعلق جملہ مسائل کتاب و سنت کی روشنی میں بیان کیے گئے ہیں۔

(۱۴) نماز تہجد: فضائل و احکام: (ص: ۱۵۰)

الدار السلفیہ ممبئی، جون ۲۰۰۴ء۔ یہ کتاب شیخ محمد بن سعود بن محمد عریفی کی عربی کتاب "کانوا قلیلا من اللیل ما یھجعون" کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب میں سنن ونوافل کی شرعی حیثیت، نماز تہجد، نماز وتر، صحابہ کرام اور سلف صالحین کی شب بیداری کے حالات اور تہجد اور وتر سے متعلق فتاویٰ درج ہیں۔ دینی تربیت کے باب میں اس کتاب کا اسلوب خاص انفرادیت کا حامل ہے۔

(۱۵) کتاب المناقب: (ص: ۱۰۰)

رائے پورہ لاج، سرسید نگر، علی گڑھ ۱۹۹۶ء۔ اس کتاب میں حضرت علی، فاطمہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کے فضائل و مناقب کے سلسلے میں علامہ جزری، امام احمد بن حنبل اور امام ابونعیم اصفہانی رحمہم اللہ کی بعض تحریروں کو جمع کر کے ان کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ کوشش یہ کی گئی ہے کہ صرف مشہور اور صحیح اور حسن روایات ہی درج کتاب کی جائیں۔

(۱۶) معذوروں کا روزہ: (ص: ۸۰)

اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، طبع اول ۲۰۰۸ء۔ شیخ قیام الدین محمد یونس مدنی (مقیم حال قطر) اعظم گڑھ کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے ایم۔اے کیا ہے اور ایم۔اے کا مقالہ

''الصوم لاھل الاعذار'' کے عنوان سے تحریر فرمایا تھا۔ یہ کتاب ''معذوروں کا روزہ'' اسی عربی مقالے کا ترجمہ ہے۔شریعت نے کن کن معذروں کو تسلیم کیا اور انھیں روزہ نہ رکھنے کی رخصت دی ہے؟ یہ کتاب اس سوال کا تفصیل سے جواب دیتی ہے۔آئمہ کرام اور فقہاے اسلام کے یہاں اس سلسلے کی جو بحثیں ملتی ہیں، فاضل مصنف نے ان کو بڑی جامعیت سے بیان کر دیا ہے۔اپنے موضوع کی یہ مفصل کتاب ہے۔

(۱۷) جنازہ کے مختصر احکام ومسائل: (ص:۵۲)

دارالعلم ممبئ، اپریل ۲۰۰۸ء...... یہ علامہ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ کی معروف کتاب ''احکام الجنائز و بدعہا'' کا ملخص ترجمہ ہے۔ علامہ البانی نے اپنی اس مہتم بالشان کتاب کی خود تلخیص فرمائی ہے لیکن یہ اس تلخیص کا ترجمہ نہیں۔البتہ ترجمے کے وقت تلخیص سامنے ضرور رہی ہے۔اس کا پہلا ایڈیشن فردوس پبلی کیشنز دہلی سے شائع ہوا تھا جب کہ دوسرا ایڈیشن مولانا اکرم مختار صاحب نے دارالعلم ممبئ سے شائع کیا۔

(۱۸) قرآن کریم: منہاج فکر وعمل (ص:۴۸)

مکتبہ فہیم مئو، جون ۲۰۰۹ء۔قرآن کریم کے بارے میں موجودہ دور کے مسلمانوں کا جو رویہ ہے اور جس طرح وہ اس کی تعلیمات کو نظر انداز کر رہے ہیں، یہ کتاب اس صورت حال کو واضح کر کے بتاتی ہے کہ اس سے خود مسلمانوں ہی کو نہیں دنیا کو کتنا نقصان ہو رہا ہے۔قرآن خوانی کی رسم اور رمضان میں شبینہ کر کے اگر ہم سمجھتے ہیں کہ قرآن کا حق ادا ہو گیا تو یہ ہماری بہت بڑی بھول ہے۔اسی طرح صرف منتخب آیات کا درس دیتے رہنا کوئی مثبت طرز عمل نہیں ہے بلکہ مکمل قرآن کی تصویر ہمارے سامنے آنی چاہیے۔اسی سے کلام الٰہی کی معنویت اور اہمیت واضح ہو سکتی ہے۔

(۱۹) تعمیر ملت اور دینی ادارے (ص:۱۲۸)

مکتبہ فہیم، مئو، جون ۲۰۰۹ء...... مسلمانوں میں تعلیم کی کمی ان کی تمام پریشانیوں کا باعث ہے۔ جہالت کی وجہ سے غربت بھی پیدا ہوتی ہے اور معاشرے میں جینے کا سلیقہ بھی نہیں آتا۔آگے چل کر یہی جہالت مسلم معاشرے میں جرائم کے در آنے کا موقع فراہم کرتی ہے اور بہت سے نوجوان صحیح راہ سے ہٹ کر اپنے والدین اور عزیزوں کے لیے مصیبت بن جاتے ہیں۔اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ موجودہ دور کے مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال کیا ہے؟ اسے کیسے تبدیل کیا جا سکتا ہے اور ملک وملت کی تعمیر میں مسلمان کیا کردار ادا کر سکتے ہیں۔

(۲۰) رفع الالتباس عن مسائل اللباس:

(از نواب صدیق حسن خاں بھوپالی) غیر مطبوعہ۔اسلامی لباس کیا ہے؟ کتاب وسنت میں اس کا تصور کیا

ہے؟ احادیث پاک میں اس کے متعلق کون کون سے مسائل زیر بحث آئے ہیں؟ کون سا لباس جائز ہے اور کون سا ناجائز؟ یہ کتاب ان تمام پہلوؤں پر بحث کرتی ہے۔

(۲۱) تحصیل الکمال بالخصال الموجبۃ للظلال:

(نواب صدیق حسن خاں بھوپالی) غیر مطبوعہ۔ عرش الٰہی کے سائے میں جگہ پانے والے خوش قسمت حضرات کا تذکرہ اس کتاب میں کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں جو احادیث آتی ہیں ان کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ایک طرح سے اس خاص مسئلے پر اس کتاب کی حیثیت جزو حدیث کی ہے۔

(۲۲) تطهير الثوب بقبول التوب:

(نواب صدیق حسن خاں بھوپالی) غیر مطبوعہ۔ اسلام میں توبہ کی اہمیت اور اس کے مقام سے یہ کتاب بحث کرتی ہے۔ توبہ کرنے کا طریقہ بتاتی ہے اور کن گناہوں سے کس طرح توبہ کرنی چاہیے، اس کے آداب بیان کرتی ہے۔ نواب صاحب نے یہ کتاب تربیت اور تزکیہ کے لیے تصنیف فرمائی تھی۔

(۲۳) اختیار السعادۃ بایثار العلم علی العبادۃ:

(نواب صدیق حسن خاں بھوپالی) غیر مطبوعہ۔ عبادت کو برتری حاصل ہے یا علم کو؟ علم کے بغیر عبادت کس طرح کی ہوتی ہے اور بے علم عابدوں کو کیا کیا خطرات لاحق رہتے ہیں؟ ان تمام سوالوں کا جواب نواب صاحب نے اپنی اس کتاب میں دیا ہے۔ نصوص کتاب وسنت سے علم کی فضیلت بیان کی ہے اور اقوال وآثار سلف سے اپنی باتوں کو مدلل کیا ہے۔

(۲۴) رفو الخرقہ بشرف الحرفہ:

(نواب صدیق حسن خاں بھوپالی) غیر مطبوعہ۔ برصغیر کے مسلمان ۱۸۵۷ء کے بعد نہ صرف جسمانی طور پر انگریزوں کے غلام بن گئے تھے بلکہ ان کا ذہن ومزاج بھی غلاموں کی طرح بن گیا تھا۔ نئے حالات میں کون سی راہ اختیار کرنی چاہیے اور کیسے اپنے وجود کو باقی رکھنا چاہیے، وہ کچھ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے۔ کام کرنا اور کوئی پیشہ اختیار کرنا اپنے لیے باعث شرم سمجھ رہے تھے۔ خاص طور پر وہ حضرات جو علماء، پیروں اور سجادہ نشینوں کی اولاد میں سے تھے۔ نواب صاحب نے اس کتاب میں بتایا ہے کہ اپنے ہاتھوں سے کام کرنا، حلال روزی کے لیے کوئی پیشہ اپنانا ہرگز شرم کی بات نہیں ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں تمام جائز پیشوں کی تفصیل پیش کی ہے اور ہر پیشے کے بارے میں بتایا ہے کہ اس کا موجد کون ہے؟

(۲۵) اتباع الحسنہ فی جملۃ ایام السنہ:

(نواب صدیق حسن خاں بھوپالی) غیر مطبوعہ۔ سال کے بارہ مہینوں اور بعض مہینوں کے مخصوص ایام

میں کون کون سی عبادات یا دینی اعمال انجام دینے کی ہدایت احادیث میں دی گئی ہے۔نواب صاحب نے اس کی تفصیلات اس کتاب میں پیش فرمائی ہیں اور جن بدعات کو مسلمانوں نے رواج دے لیا ہے، ان کی نشان دہی کی ہے۔صحیح اعمال اور سنت سے ثابت عبادات کے مختصر مسائل اور احکام بھی کتاب میں بیان کیے گئے ہیں۔

نواب صاحب کی مذکورہ بالا چھے کتابوں کی تسہیل اور تخریج مولانا عارف جاوید محمدی صاحب کے حکم سے کی گئی ہے۔کتابیں کمپوزنگ اور تصحیح کے مراحل سے گزر کر مولانا موصوف کے پاس پہنچ گئی ہیں۔ ان کتابوں پر مولانا رفیق احمد سلفی کے کام کی نوعیت مندرجہ ذیل ہے:

- جدید اردو املا کی رعایت کی گئی ہے۔
- کوشش کی گئی ہے کہ نواب رحمہ اللہ کے الفاظ تبدیل نہ کیے جائیں، قارئین کی سہولت کے لیے کہیں کہیں مشکل الفاظ کی جگہ آسان الفاظ لکھ دیے گئے ہیں۔
- جملوں کی ساخت اور ہیئت کی قدامت کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔
- مضامین اور موضوعات کے اعتبار سے پیراگراف بنائے گئے ہیں اور رموز اوقاف کے ذریعے جملوں کو واضح کیا گیا ہے۔
- قرآنی آیات کے حوالے سورہ اور آیت نمبر کے ساتھ متن کتاب میں ہی شامل کر دیے گئے ہیں۔
- قرآنی آیات کا ترجمہ مولانا محمد جونا گڑھی رحمہ اللہ کے ترجمہ قرآن سے مستفاد ہے۔
- جن احادیث کا ترجمہ نہیں تھا، ان کا ترجمہ متن میں ہی بڑھا دیا گیا ہے۔
- نصوص کتاب وسنت کے علاوہ دیگر عربی عبارتوں کا ترجمہ بھی متن ہی میں پیش کر دیا گیا ہے۔
- فارسی اشعار کا اردو میں ترجمہ کر دیا گیا ہے۔

(۲۶) تفسیر احسن البیان کا ایک نیا ایڈیشن:

(ادارہ علوم الحدیث، جامعہ اردو روڈ علی گڑھ ۲۰۱۲ء) مولانا حافظ صلاح الدین یوسف کی اردو تفسیر جسے سعودی عرب کے مجمع الملک فہد نے شائع کیا اور مملکت سعودیہ کی کوششوں سے اردو دنیا میں مسلسل تقسیم ہو رہی ہے، جامع تفسیر ہے۔لیکن سعودی ایڈیشن میں عربی اور اردو ذرا باریک ہے، کم پڑھے لکھے لوگ اس سے مستفید نہیں ہو پا رہے ہیں۔اسی طرح کمزور نظر والے افراد بھی اس سے محروم ہیں۔مولانا رفیق احمد سلفی سے ایک دوست انجینئر اشرف حسین فاروقی مقیم حال لکھنؤ نے ایک دن اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ کسی طرح اس کو بڑا کیا جائے تا کہ ہم بھی اس سے استفادہ کر سکیں۔انھوں نے اس کے مصارف برداشت کرنے کی بھی

منظوری دی۔ مولانا ممدوح نے یہ کام شروع کر دیا ہے۔ اسے اپنے ایک عزیز شاگرد محمد بن عامر سے جو کمپیوٹر میں مہارت رکھتے ہیں، اسے بڑا کروایا اور تفسیری حواشی کے مضامین کی جو فہرست حافظ صاحب نے اس کے اولین ایڈیشن میں شامل کی تھی، اسے سعودی ایڈیشن سے ہم آہنگ کیا اور مضامین قرآن کی ایک الگ فہرست جو مکتبہ دارالسلام ریاض کے فضلاء کی تیار کردہ تھی، اس کے ساتھ ملحق کی اور پھر اسے شائع کرایا۔ اسی کام سے اندازہ ہوا کہ اس پر نظر ثانی کرنے والے علمائے کرام ڈاکٹر وصی اللہ محمد عباس اور ڈاکٹر اختر جمال لقمان سلفی نے اس میں کیا تبدیلیاں کی ہیں اور کس طرح اسے مزید مستند بنایا ہے۔ یہ ایڈیشن لوگوں کو کافی پسند آیا۔ پہلا ایڈیشن ختم ہو چکا ہے، دوسرے کی تیاری ہو رہی ہے۔ اللہ اس خدمت کو قبول فرمائے اور اپنی کتاب پاک کی برکتوں سے نوازے۔ اس کام میں مولانا رفیق احمد کے علی گڑھ کے ایک مخلص دوست محمد رئیس سوداگر صاحب کی بھی شراکت رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اور انجینئر اشرف حسین فاروقی کو دین و دنیا کی ترقیوں سے بہرہ ور فرمائے۔ آمین۔

ان کے علاوہ ایک بڑا پروجیکٹ مولانا رفیق احمد سلفی کے ہاتھ میں ہے جس کی سرپرستی چند مخلص دوست فرما رہے ہیں۔ لیکن ان کا تاکیدی حکم ہے کہ جب تک کام مکمل نہ ہو جائے، اس کا ذکر نہ کیا جائے۔ اللہ کرے کہ یہ کام مولانا کے ہاتھوں پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے تو یہ ان کی زندگی کا سب سے اہم اور مہتم بالشان کام ہوگا اور ان شاء اللہ آخرت کے لیے ان کا زادِ سفر بھی۔

مولانا اکرم مختار صاحب نے ان سے کئی کتابوں کی تصحیح کرائی ہے اور انھوں نے ایک علمی خدمت سمجھ کر اپنے اسلاف کی ان کتابوں کو تیار کر کے قابل اشاعت بنایا ہے۔ ان میں امام ابن تیمیہ، امام ابن قیم الجوزیہ اور علامہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی کتابیں بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ان میں مولانا محمد حنیف ندوی کی اہم کتاب مطالعہ قرآن بھی شامل ہے۔ برقی کتابت سے پہلی بار کتاب دارالعلم ممبئی نے بہت خوب صورت انداز میں شائع کی ہے۔

مولانا عبدالوہاب خلجی سابق ناظم اعلیٰ مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند سے مولانا رفیق احمد رئیس سلفی کے علمی روابط کئی سالوں سے قائم ہیں۔ ان کی نظامت کے دور میں کئی علمی کام ان کے ہاتھوں انجام پائے ہیں۔ اسی طرح ان کے ذاتی ادارے ''دارالعلمیہ'' دہلی سے بھی تعلق رہا ہے۔ بعض عربی کتابوں کا اردو ترجمہ انھوں نے مولانا سے کرایا ہے۔ دو تین کتابوں کے علاوہ کوئی اور کتاب کسی وجہ سے وہ شائع نہیں کر سکے۔ ذیل میں چند کتابوں کے نام لکھے جا رہے ہیں جن کے مسودے محترم خلجی صاحب کے پاس ہیں، امید ہے وہ دیر سویر انھیں شائع فرما دیں گے۔

(۱) احکام التصویر فی الشریعۃ الاسلامیہ (۲) تذکرۃ الغافلین بما شرع فی صلۃ الارحام و برالوالدین من الکتاب والسنۃ والاجماع (۳) تبصرۃ اولی الالباب فی تحریم الکبر والاسبال و ما یحرم علی النساء فی لباسھن (۴) رسالۃ الحج (۵) تلبیس مردود فی قضایا حیۃ (۶) التلازم بین العقیدۃ والشریعۃ (۷) مجمل اعتقاد ائمۃ السلف۔

ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی سابق پروفیسر اسلامک سٹڈیز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، آبجیکٹو اسٹڈیز، نئی دہلی کے ایک علمی پروجیکٹ ''اسلام کی علمی اور ثقافتی تاریخ'' کے نگران مقرر کیے گئے تھے۔ ان کے کہنے پر مولانا رفیق احمد نے موضوع احادیث کے چودہ مجموعوں پر تبصرہ کیا تھا اور ان کے اہم مضامین کی تلخیص پیش کی تھی۔ ان میں امام ابن قیم، ابن جوزی، امام سیوطی، علامہ سخاوی، ملا علی قاری، علامہ طاہر پٹنی اور مولانا عبدالحی لکھنوی کی کتابیں بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ دیکھیے یہ موسوعہ کب شائع ہوتا ہے۔ یہ بڑا اہم کام تھا جو انھوں نے مکمل کیا۔

صحافتی خدمات

اب مولانا رفیق احمد رئیس سلفی کی صحافتی خدمات!

۱۔ ماہنامہ ''دعوت سلفیہ'' علی گڑھ:

یہ رسالہ ادارہ دارالحدیث پھول چوراہا علی گڑھ سے حاجی نذیر احمد سلفی اور جناب عبدالسمیع کی نگرانی میں شائع ہوتا تھا۔ اس کے تین شمارے نکلے تھے کہ اس کی ادارت مولانا رفیق احمد نے سنبھال لی۔ ۱۹۸۶ء سے ۱۹۸۹ء تک اس کی ادارت کی۔ اس عرصے میں انھوں نے اس رسالے میں بے شمار مضامین لکھے۔

۲۔ ماہنامہ ''نداء الصفا'' نئی دہلی:

یہ رسالہ صفا شریعت کالج ڈومریا گنج سدھارتھ نگر کا ترجمان تھا۔ مولانا عبدالواحد مدنی اس کے بانی اور سرپرست تھے۔ ان کی خواہش پر مولانا رفیق احمد سلفی نے ۲۰۰۴ء میں اس کی ادارت کی ذمہ داری قبول کی۔ ۲۰۰۹ء تک یہ رسالہ جاری رہا۔ پھر بند ہوگیا۔ مولانا رفیق احمد نے اس میں بہت سے مضامین اور اداریے لکھے جو قارئین نے پسند کیے۔

۳۔ ماہنامہ ''التذکیر'' علی گڑھ:

یہ رسالہ مولانا رفیق احمد کے ایک دوست ڈاکٹر محمد عاطف نے جاری کیا تھا اور مولانا ممدوح کو اس کے مدیر بنایا گیا تھا۔ صرف تین شماروں کے بعد اس کی اشاعت بند ہوگئی۔

مولانا رفیق احمد سلفی کے مضامین و مقالات کی اشاعت اللہ کی مہربانی سے جاری ہے۔ دہلی کے ماہنامہ ''نوائے اسلام'' میں ان کے افکار عالیہ مستقل طور پر چھپتے رہتے ہیں۔ بہت عرصہ پہلے ممبئی سے چند اہل حدیث

نوجوانوں نے ''دی فری لانسر'' کے نام سے اردو انگریزی میں ایک ماہنامہ رسالہ جاری کیا تھا، مولانا اس میں باقاعدگی سے حالات حاضرہ سے متعلق مضامین لکھ رہے ہیں۔لوگ یہ مضامین دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔

مولانا رفیق احمد سلفی کی قلمی کاوشوں میں ایک اور کاوش کا بھی ذکر کر دیں تو میرا خیال کوئی حرج نہیں ہو گا۔ وہ یہ کہ میری ایک کتاب کا نام ''بزم ارجمنداں'' ہے۔جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ کتاب شخصیات سے متعلق ہے۔اس کی اولین شخصیت جن پر میں نے طویل مضمون لکھا، وہ مولانا ابوالکلام آزاد ہیں۔ بے شمار لوگوں کی طرح میں بھی مولانا آزاد کا عقیدت مند ہوں۔ مجھے ان کی تقریر سننے کا شرف بھی حاصل ہے اور ان کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان سے گفتگو کرنے کی سعادت سے بھی بہرہ مند ہوں۔ کئی سال ہوئے ''بزم ارجمنداں'' کا یہ مضمون پٹنہ کی خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری کی طرف سے شائع کیا گیا تھا اور اس پر لائبریری کے ڈائریکٹر جناب محمد ضیاء الدین انصاری نے مقدمہ لکھا تھا۔ اب یہی مضمون کتابی شکل میں مکتبہ الفہیم (مئو، یوپی) کے اصحاب انتظام چھاپ رہے ہیں۔مولانا رفیق احمد رئیس سلفی نے ان کی درخواست پر ''عہد حاضر کا عظیم اسلامی مفکر اور سیاسی مدبر'' کے عنوان سے اس پر مقدمہ تحریر فرمایا ہے۔ یہ مقدمہ کئی صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔

بھائی بہن:

ماشاء اللہ یہ چھے بھائی بہن ہیں۔مولانا رفیق احمد سلفی سب سے بڑے ہیں۔ان سے چھوٹے سہیل احمد ہیں۔یہ ممبئی رہتے ہیں اور کاروبار کرتے ہیں۔ان کی مالی حالت اللہ کے فضل سے بہت اچھی ہے۔خرچ اخراجات کے سلسلے میں ان کا ہاتھ کھلا ہے۔ مستحقین کی مالی مدد کرتے ہیں۔ان کے بچے باقاعدہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ بھائیوں کی مشترکہ زمین جاداد کی دیکھ بھال کی ذمہ داری انھی کے سپرد ہے۔

تیسرے بھائی مولانا اشتیاق احمد رئیس مدنی ہیں۔ انھوں نے مدینہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔پھر اپنے ملک کی مختلف درس گاہوں میں پڑھاتے رہے۔ آج کل سعودی عرب کے شہر دمام میں شعبہ دعوت و تبلیغ سے منسلک ہیں۔تقریر و تدریس میں مہارت رکھتے ہیں۔تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری ہے۔

چوتھے اور سب سے چھوٹے بھائی کا نام مشتاق احمد ہے۔والدگرامی کی وفات کے بعد مولانا رفیق احمد انھیں اپنے پاس علی گڑھ لے آئے تھے۔یہاں انھوں نے تعلیم حاصل کی۔ٹیپو سلطان کے دارالسلطنت میسور کے ایک کالج میں بھی پڑھتے رہے۔اب وہ بنگلور میں ملازمت کرتے ہیں۔

مولانا رفیق احمد سلفی کی دو بہنیں ہیں۔ بڑی کا نام شکر النساء ہے۔ یہ اپنے شوہر کے ساتھ ممبئی رہتی ہیں۔شوہر کا کاروبار ماشاء اللہ بہت اچھا ہے۔ بچے تعلیم یافتہ ہیں اور یہ گھرانا ہر اعتبار سے خوش حال ہے۔

چھوٹی بہن کا نام یاسمین ہے۔ان کی شادی گاؤں میں ہوئی۔ان کے بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور اللہ کے فضل سے آسودہ حال خاندان ہے۔

اہل وعیال:

مولانا رفیق احمد رئیس سلفی کی شادی ۱۹۸۳ء میں ان کے گاؤں میں ان کے خاندان ہی میں ہوئی۔ بیوی کا نام ''ساہرۃ'' ہے۔ماشاء اللہ معنی کے اعتبار سے بہت اچھا نام ہے۔مولانا کے بقول ان کی اہلیہ بڑی سلیقہ شعار اور وفادار ہیں۔

مولانا کی اولاد پانچ بیٹیاں ہیں اور دو بیٹے۔ بڑی بیٹی حمیرا رفیق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز میں ایم اے کر رہی ہیں۔اردو، ہندی اور انگلش تو پڑھنا ضروری تھا ہی اس کے علاوہ ترکی زبان بھی اس بچی نے پڑھ لی ہے۔وہ پی، ایچ، ڈی کرنے کی خواہاں ہیں۔دوسری بیٹی زہیرا رفیق بھی مسلم یونیورسٹی میں پڑھ رہی ہیں۔ان کا مضمون تاریخ ہے۔تیسری بیٹی عفیفہ رفیق مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ انجینئرنگ میں داخل ہے۔ چوتھی بیٹی امیمہ رفیق اور پانچویں عاتکہ رفیق ہیں۔ یہ سکول میں تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔

بڑا بیٹا حذیفہ رفیق کالج میں چلا گیا ہے اور اس سے چھوٹا حماد رفیق ایک سکول میں داخل ہے۔

مولانا رفیق احمد رئیس سلفی کے بچے بچیوں نے تجوید کے ساتھ قرآن مجید پڑھا ہے اور دینی تعلیم کے حصول میں بھی کوشاں ہیں۔دعا ہے اللہ تعالیٰ ان سب کا حامی وناصر ہو۔

(یہ مضمون ۲۷۔اپریل ۲۰۱۳ء کو لکھا گیا)

پروفیسر مولا بخش محمدی

(ولادت یکم دسمبر ۱۹۶۵ء)

پاکستان کے صوبہ سندھ میں بے شمار اصحابِ علم پیدا ہوئے، جنھوں نے مختلف مقامات میں بے پناہ علمی خدمات سرانجام دیں اور دے رہے ہیں۔ ان میں پروفیسر مولا بخش محمدی کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ ان کی ولادت یکم دسمبر ۱۹۶۵ء کو گوٹھ حاجی مکو تحصیل ڈیپلو تھرپارکر میں ہوئی۔ عمر کی چند منزلیں طے کیں تو حصولِ علم کا آغاز کیا اور درجہ بہ درجہ جن عالی مرتبت اساتذہ سے اخذِ فیض کے مواقع میسر آئے، وہ تھے سید محب اللہ شاہ راشدی، مولانا اللہ بخش تونیہ، مولانا عبدالحمید المری، مولانا محمد عمر جونیجو، مولانا محمد ادریس جونیجو، مولانا محمد اسحاق جونیجو، مولانا محمد ہاشم نہڑی، مولانا محمد طالب، مولانا یار محمد بلوچ، مولانا عبدالخالق نہڑیو اور دیگر حضرات۔ ان میں سے بعض وفات پا چکے ہیں اور بعض بہ فضل الٰہی زندہ ہیں۔

پروفیسر مولا بخش محمدی کو اللہ نے توفیق بخشی اور انھوں نے درس نظامی کی پوری تعلیم حاصل کی۔ پھر فاضل عربی، فاضل فارسی اور فاضل اردو کے امتحانات پاس کیے۔ علاوہ ازیں ادیب سندھی کا امتحان پاس کیا۔ ایم اے اسلامیات کے امتحان میں نمایاں پوزیشن حاصل کی۔ اس طرح علوم شرقیہ میں اعلیٰ ڈگریوں کے حق دار قرار پائے۔

تکمیل تعلیم کے بعد انھوں نے مدرسہ مظہر العلوم میں درس نظامی کی تدریس شروع کی اور عربی ادب، فقہ، اصول فقہ اور علم معانی کی کتابیں طلبا کو پڑھائیں۔ اسی اثنا میں یکم اگست ۱۹۸۶ء کو ہائی سکول ڈتل لغاری میں اورینٹل ٹیچر کے طور پر ان کی تقرری عمل میں آئی۔

بعد ازاں پبلک سروس کمیشن کا امتحان دیا تو اللہ نے اس میں کامیابی سے نوازا اور ۲-فروری ۱۹۹۲ء کو گورنمنٹ کالج مٹھی میں بہ حیثیت لیکچرر پوسٹنگ ہوئی۔ محکمانہ ترقی کے نتیجے میں اب اسی کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے فرائض تدریس سرانجام دے رہے ہیں۔ شعبۂ اسلامیات اور شعبۂ السنۂ شرقیہ کے نگران بھی ہیں۔

پروفیسر صاحب موصوف قلم و قرطاس سے بھی رابطہ رکھتے ہیں۔ اردو، فارسی اور سندھی میں ان کا قلم رواں رہتا ہے۔ سندھی زبان میں ان کی ایک کتاب ''اسلام چا آہی'' ہے۔ اس کتاب میں اسلام کی مبادیات

کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

سندھی زبان کی ایک اور کتاب میں انھوں نے سندھ کے علماے حدیث کے خاکے تحریر فرمائے ہیں۔

مشاہیر سندھ اور اسلام میں حکمرانوں کی ذمہ داریاں وغیرہ عنوانات پر انھوں نے اردو، سندھی اور فارسی میں تقریباً ایک سو مضامین و مقالات سپردِ قلم کیے جو روزنامہ عبرت، ہلالِ پاکستان، روزنامہ خادم وطن، ماہنامہ محدث، ترجمان الحدیث، المنبر، صحیفہ اہل حدیث، دعوتِ اہل حدیث، السندھ، رہبر ڈائجسٹ، حرمین وغیرہ متعدد رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔

پروفیسر مولانا بخش محمدی مستعد اور باہمت اہل علم ہیں۔ وہ مٹھی کی جامع مسجد اہل حدیث میں خطبۂ جمعہ بھی ارشاد فرماتے ہیں۔

یہ سطور ۲۹-نومبر ۲۰۱۲ء کو لکھی جا رہی ہیں۔ اب تک انھوں نے بہت سی اہم تدریسی اور تحریری خدمات سر انجام دی ہیں۔ ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ انھیں زیادہ سے زیادہ دینی خدمات کے مواقع عطا فرمائے اور وہ کتاب و سنت کی اشاعت میں مشغول رہیں۔

مولانا محمد رمضان یوسف سلفی

(ولادت ۴ دسمبر ۱۹۶۷ء)

میانہ قد، مناسب خدوخال، خوش اخلاق، مہمان نواز، اہل علم کے قدردان، ہم ذوق لوگوں سے میل ملاقات رکھنے والے۔ سادہ مگر صاف ستھرا پہناوا۔ پڑھنے لکھنے کے شائق۔

مولانا محمد رمضان یوسف سلفی اگرچہ ان معنوں میں مولانا نہیں ہیں، جن معنوں میں یہ لفظ بولا جاتا ہے، لیکن ان کی تحریری سرگرمیوں کا دائرہ (جیسا کہ آگے آئے گا) خاصا وسیع ہے۔

ان کے والد کا نام محمد یوسف اور دادا کا منشی تھا۔ یہ لوگ دراصل مشرقی پنجاب کے ضلع ہوشیار پور کے ایک گاؤں "میانی پٹھاناں والی" کے رہنے والے تھے۔ تقسیم ملک کے زمانے میں وہاں سے نکلے اور لائل پور کے قریب چک نمبر ۲۶۸ ر۔ب پکی پنڈوری میں آ بسے۔ وہیں ۴ دسمبر ۱۹۶۷ء (۲۔ رمضان المبارک ۱۳۸۷ء) کو محمد رمضان کی ولادت ہوئی۔ اس سے دس سال بعد ۱۹۷۸ء میں اس خاندان نے اس گاؤں کی سکونت ترک کی اور شہر لائل پور آ گئے۔ (جسے فیصل آباد کہا جاتا ہے)

۱۳۔ دسمبر ۱۹۷۹ء کو محمد رمضان کے والد محمد یوسف وفات پا گئے۔ اس وقت یہ سکول میں پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے اور عمر بارہ سال کی تھی۔

اب گھر کے حالات بدل گئے، تعلیم چھوڑ دی اور نٹ بولٹ بنانے والے کارخانے میں ملازمت کرنے لگے۔ اٹھارہ سال یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس اثنا میں تین سال ایک ہوزری میں اونی مفلر بھی بنائے۔ لیکن اس مزدوری کے دوران میں حصول علم کی کوشش بھی جاری رہی۔ قاعدہ یسرنا القرآن گاؤں کی مسجد کے امام مولوی عماد الدین مرحوم سے اس وقت پڑھا تھا جب یہ پرائمری سکول کے طالب علم تھے۔ فیصل آباد آ کر نثار کالونی کی مسجد اہل حدیث میں قاری منیر احمد سے ناظرہ قرآن مجید پڑھا۔ بعد ازاں محمدی مسجد میں حکیم ثناء اللہ ثاقب سے قرآن مجید کے چند پاروں کا ترجمہ پڑھا۔ نماز عشا کے بعد حکیم صاحب موصوف مسجد میں صحیح بخاری کا درس دیا کرتے تھے، اس میں یہ باقاعدہ شرکت کرتے رہے اور پوری صحیح بخاری کا درس سنا، جس سے انھیں بہت فائدہ پہنچا اور حدیث مبارکہ سے تعلق پیدا ہوا۔ مختلف اہل علم کی مجلسوں میں بیٹھنے اور ان کی علمی باتیں سننے کا بھی انھیں شوق تھا۔ یہ مجلسیں بھی ان کے لیے فائدے کا باعث ہوئیں اور انھیں تحریر و نگارش کی وادی

میں لے آئیں۔

انھیں تاریخی کتابوں سے زیادہ دلچسپی تھی۔ گھر میں بجلی نہیں تھی۔ دن کو کام کرتے اور گھر آ کر رات کو ان کتابوں کا لالٹین کی روشنی میں مطالعہ کرتے۔ ان کے خاندان کے پہلے شخص جنھوں نے مسلک اہل حدیث اختیار کیا، ان کے ماموں محمد شریف تھے۔ انھوں نے ان کو پڑھنے کے لیے جو کتابیں دیں، ان میں مترجم مشکوٰۃ شریف بھی تھی۔ انھوں نے پوری مترجم مشکوٰۃ شریف پڑھی اور بہت سے دینی مسائل سمجھ میں آئے۔ محمد شریف نے ۵ جنوری ۲۰۰۵ء کو وفات پائی۔

ان کی والدہ نے بھی بیٹے کے لیے دعائیں کی اور پڑھنے لکھنے میں اس کی حوصلہ افزائی کرتی رہیں۔

۱۹۸۸ء میں نثار کالونی کی محمدی مسجد میں ناظرہ قرآن کے سالانہ امتحان میں محمد رمضان سلفی نے دوسری پوزیشن حاصل کی اور ۹۶ء فی صد نمبر لیے۔ اس مبارک تقریب کے موقع پر مسجد میں جلسہ منعقد ہوا تو انھیں انعام میں حکیم محمد صادق سیالکوٹی مرحوم کی کتاب الصلوٰۃ دی گئی۔ اس کتاب کے مطالعہ سے ان کا ذہن بالکل بدل گیا اور مطالعہ کے شوق میں مزید اضافہ ہوا۔ یہ کتاب واقعی بہت عمدہ ہے۔ اردو میں اس موضوع کی یہ پہلی کتاب ہے جو مفصل بھی ہے اور زبان و انداز کے اعتبار سے اپنے اندر بے حد جاذبیت بھی رکھتی ہے۔ یہ کتاب بہت چھپی اور بہت پڑھی گئی۔ اس اہم کتاب کے انعام سے محمد رمضان کا حوصلہ بڑھا اور معلومات کے حصول میں ان کی کوشش میں تیزی آئی۔ اب انھوں نے قاری احمد نواز صابر، مولانا ارشاد الحق اثری اور مولانا عبدالحئی انصاری کی خدمت میں حاضر ہونا شروع کیا۔ ان حضرات نے ان کی راہنمائی کی جو حصول معلومات میں ان کے لیے سودمند ثابت ہوئی۔

اب ان کی تحریری کاوشوں کا تذکرہ۔

۱۳ مئی ۱۹۹۰ء کو اہل حدیث یوتھ فورس قصور نے نوجوانوں کے درمیان تحریری مقابلے کا اہتمام کیا۔ اس میں محمد رمضان یوسف سلفی نے بھی حصہ لیا اور مضمون لکھا: ''رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا عالم شباب''۔

یہ ان کی پہلی قلمی کوشش تھی، جس میں انھیں گیارھویں پوزیشن حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ اعزازی سند اور چند کتابیں بطور انعام ملیں۔ اب انھوں نے تحریری میدان میں قدم رکھا اور آگے بڑھنے کی سعی کی اور مضمون لکھا۔ ''فرضیت نماز اور نصیحت بے نمازاں'' یہ مضمون ۴ مارچ ۱۹۹۱ء کے پندرہ روزہ ''صحیفہ اہل حدیث'' (کراچی) میں چھپا۔ یہ ان کا اولین مضمون تھا جو کسی رسالے میں شائع ہوا۔

اس کے بعد یہ سلسلہ مضمون نویسی تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ مختلف عنوانات پر کم و بیش ڈیڑھ سو مضامین لکھے، جن میں سیرت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چند پہلو، شان صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، جمال مصطفیٰ صلی

اللہ علیہ وسلم، فضائل عشرہ ذی الحجہ، سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چند پہلو، لباس خضر میں راہزن وغیرہ مضامین شامل ہیں۔

ان کے علاوہ ایک سو کے قریب اہل حدیث علمائے کرام کے تراجم سپرد قلم کیے۔ یہ مضامین جن رسائل و جرائد میں شائع ہوئے، وہ ہیں ترجمان السنہ لاہور، الاعتصام، اہل حدیث، تنظیم اہل حدیث، الاخوہ، ترجمان الحدیث فیصل آباد، دعوت اہل حدیث حیدر آباد، المنبر فیصل آباد، صراط کراچی، الحرمین جہلم، ترجمان دہلی، نوائے اسلام دہلی، صراط مستقیم برمنگھم، السراج جھنڈانگر، حدیبیہ کراچی، صحیفہ اہل حدیث کراچی، روزنامہ ایکسپریس، روزنامہ پاکستان، علم و آگہی فیصل آباد، تفہیم الاسلام احمد پور شرقیہ، خاتم النبیین ڈسکہ، نداء الاحسان لاہور۔

علاوہ ازیں محمد رمضان سلفی پندرہ روزہ صحیفہ اہل حدیث (کراچی) کی مجلس ادارت کے رکن اور ماہنامہ صدائے ہوش (لاہور) کے اعزازی ایڈیٹر ہیں۔

اللہ کے فضل سے محمد رمضان سلفی مصنف بھی ہیں اور ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں۔

○ چار اللہ کے ولی

اس کتاب میں مولانا عبدالوہاب دہلوی، مولانا حافظ عبدالستار دہلوی، مولانا عبدالغفار سلفی اور مولانا عبدالجلیل خاں جھنگوی کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب مکتبہ ایوبیہ کراچی نے شائع کی۔

یہ چاروں بزرگان گرامی جماعت غرباء اہل حدیث سے تعلق رکھتے ہیں۔ مولانا عبدالوہاب دہلوی نے اس جماعت کی بنیاد رکھی تھی۔

○ مولانا عبدالوہاب دہلوی اور ان کا خاندان

یہ کتاب مولانا عبدالوہاب دہلوی اور ان کی اولاد کے چودہ علماء کے تراجم پر مشتمل ہے۔ یہ بھی مکتبہ ایوبیہ کراچی کی طرف سے معرض اشاعت میں آئی۔

○ عقیدہ تحفظ ختم نبوت میں علمائے اہل حدیث کی خدمات

○ مولانا ثناء اللہ امرتسری

○ مولانا محمد ادریس ہاشمی اور ان کی خدمات

○ ڈاکٹر عبدالواحد نومسلم

○ تذکرہ علمائے جماعت غرباء اہل حدیث

○ مسنون دعائیں

○ مورخ اہل حدیث محمد اسحاق بھٹی ...... حیات و خدمات:

اس کتاب میں اس فقیر کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۲۴۰ صفحات پر محیط ہے۔اس کتاب کے آغاز میں ایک طویل مضمون تو خود مرتب کتاب (محمد رمضان سلفی) کا ہے، جس میں اس فقیر کے متعلق خاصی تفصیل سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔ پھر پاکستان و ہندوستان کے متعدد اصحاب قلم کے مضامین ہیں جو انھوں نے میرے بارے میں مختلف رسائل و جرائد میں لکھے۔ یہ کتاب فروری ۲۰۱۱ء میں حضرت مولانا محمد علی جانباز مرحوم و مغفور کے قائم کردہ تدریسی ادارہ جامعہ رحمانیہ ناصر روڈ سیالکوٹ کی طرف سے شائع کی گئی۔اس کے ناشر ہیں صاحب زادہ عبدالحنان جانباز ایم اے بن حضرت مولانا محمد علی جانباز۔

اللہ کے رنگ دیکھیے ایک غریب گھرانے سے غربت کی حالت میں محمد رمضان سلفی کی زندگی کا آغاز ہوا۔ایک کارخانے میں برسوں آتش و آہن سے تعلق رہا اور نٹ بولٹ بناتے رہے۔ ہوزری میں اونی مفلر تیار کرنے کا کام کیا۔اسی کام کے دوران میں رفتہ رفتہ کچھ تعلیم بھی حاصل کر لی اور قلم و قرطاس سے رابطہ قائم کر لیا اور مقالہ نگار و مصنف کے طور پر شہرت پائی۔ اللہ انھیں خوش رکھے اور دین اسلام کی زیادہ سے زیادہ خدمت کے مواقع فراہم کرے۔

ان کا تعلق جماعت غربائے اہل حدیث سے ہے۔

(۲۰۔اپریل ۲۰۱۳ء)

قاری نوید الحسن لکھوی

(ولادت ۱۱ جنوری ۱۹۶۹ء)

نکھرا ہوا گندمی رنگ، خوب صورت نقش و نگار، کھلی پیشانی، پورا قد، متناسب الاعضاء، خوش پوش و خوش کلام، فن قرأت و تجوید کے ماہر اور شیریں آواز۔ مقبول خطیب اور نامور مدرس۔ یہ ہیں قاری نوید الحسن لکھوی۔ والد کا اسم گرامی قاری محمد یوسف لکھوی تھا اور دادا کا محمد یعقوب لکھوی۔ نانا تھے جلیل المرتبت عالم اور کاروان شیوخ الحدیث کے اہم رکن حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی، جن سے لاتعداد شائقین علم نے حصول فیض کیا۔

قاری نوید الحسن لکھوی کا تذکرہ کرنے سے پہلے ان کے والد مکرم قاری محمد یوسف لکھوی سے متعارف ہونا ضروری ہے۔ انھوں نے موضع میر محمد (ضلع قصور) میں قرآن مجید حفظ کیا۔ جامعہ محمدیہ اوکاڑہ میں درس نظامی کی مروجہ کتابیں پڑھیں اور قراءات و تجوید کا فن قاری اظہار احمد تھانوی سے حاصل کیا، جو پاکستان کے معروف قاری تھے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد قاری محمد یوسف کافی عرصہ فیصل آباد کی جامع مسجد اہل حدیث امین پور بازار میں امامت و خطابت اور تدریس کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ بعد ازاں ڈچکوٹ (ضلع فیصل آباد) کی جامع مسجد میں اس خدمت پر مامور رہے۔ تیرہ چودہ سال ان کا سلسلہ تدریس و خطابت جاری رہا۔ اس عالم ذی وقار نے ۲۸ نومبر ۱۹۹۰ء کو وفات پائی۔

ان کی نرینہ اولاد چار بیٹے تھے۔ سب سے بڑے یہی قاری نوید الحسن ہیں۔ دوسرے حافظ ندیم حسین تھے جو تیس سال کی جوان عمر میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ تیسرے ہیں رانا تنویر قاسم جو انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں علوم اسلامیہ کے پروفیسر ہیں اور چوتھے توقیر عاصم ہیں جنھوں نے جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) سے سند فراغ لی۔ اب کاروبار کر رہے ہیں۔

ان سطور میں قاری نوید الحسن لکھوی کا تذکرہ کرنا مقصود ہے۔ وہ ۱۱ جنوری ۱۹۶۹ء کو فیصل آباد میں پیدا ہوئے اور ڈچکوٹ کے سرکاری سکول میں پرائمری پاس کی۔ پھر تاندلیاں والا کے قریب چک کمیانہ ۴۰۵ چلے گئے، جہاں ان کے صاحبِ مرتبت نانا حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی نے ایک دینی مدرسہ جاری فرمایا تھا۔ اس مدرسے میں حفظ قرآن کا انتظام بھی تھا، قاری نوید الحسن نے وہاں قرآن مجید حفظ کیا۔ حفظ قرآن کے بعد

فیصل آباد کے مدرسہ دارالقرآن والحدیث میں داخلہ لیا۔ یہ تدریسی ادارہ حضرت مولانا عبداللہ ویروالوی نے جاری فرمایا تھا۔ اس مدرسے میں انھوں نے دو سال درس نظامی کی بعض کتابیں پڑھیں۔ بعدازاں جامعہ سلفیہ میں داخلہ لیا اور اس کے نصاب کے مطابق ۱۹۹۲ء میں تعلیم مکمل کی اور سند فراغت لی۔ علاوہ ازیں وفاق المدارس کا امتحان پاس کیا، فاضل عربی بھی کیا اور میٹرک کا امتحان بھی دیا اور کامیاب ہوئے۔

دورانِ تعلیم ۱۹۸۷ء اور ۱۹۸۸ء میں افغانستان کے ''جہاد'' میں بھی شریک ہوئے، جس کے نتائج ہم اہل پاکستان اب تک بھگت رہے ہیں اور خدا جانے کب تک بھگتتے رہیں گے۔

قاری نوید الحسن کے والد گرامی (جیسا کہ پہلے عرض کیا) خطیب بھی تھے اور ماہر فن قاری بھی۔ ایک روز وہ اپنے استاذ مکرم قاری اظہار احمد تھانوی سے ملاقات کے لیے گئے تو نوید الحسن بھی ان کے ساتھ تھے جو اس وقت کم عمر تھے۔ قاری اظہار احمد صاحب نے ان سے کہا آپ اپنے اس بیٹے کو بھی قاری بنا دیجیے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایسے اسباب پیدا فرما دیے کہ یہ قرأت و تجوید کے بہت بڑے ماہر ہو گئے۔ بچپن ہی میں انھیں اس فن سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ سکول کے زمانے میں بھی یہ قراءات کے مقابلوں میں حصہ لیتے تھے اور دار القرآن والحدیث اور جامعہ سلفیہ کی تعلیم کے زمانے میں بھی ایسے مواقع پر پیش پیش رہتے تھے اور اللہ تعالیٰ کامیابی عطا فرماتا تھا۔

یہاں ان کے اساتذہ کا ذکر بھی ہو جانا چاہیے، جن سے انھوں نے مختلف اوقات میں تعلیم حاصل کی۔ ابتدا میں اپنے والد عالی قدر سے استفادہ کیا۔ قراءات و تجوید کے لیے حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی کے فرزند گرامی قاری محمود الحسن بڈھیمالوی کے سامنے بھی زانوئے شاگردی تہ کیے جو مشہور قاری ہیں اور قرأت کے متعدد مقابلوں میں حصہ لے چکے ہیں۔ صالح اور باعمل عالم۔ قاری نوید الحسن کے ماموں ہیں۔

ان کے علاوہ انھوں نے قاری محمد یونس رحیمی صاحب کی خدمت میں بھی حاضری دی اور ان سے استفادہ کیا۔

درسی کتابیں جن علمائے ذی شان سے پڑھیں، وہ ہیں مولانا ثناء اللہ ہوشیار پوری، مولانا علی محمد سلفی، مولانا حافظ عبدالعزیز علوی، مولانا محمد یونس بٹ، مولانا عبدالرحیم (لودھراں) مولانا محمد اسماعیل مالدیپی اور بعض دیگر حضرات۔ دوستوں اور رفقائے درس کی وسیع فہرست میں مولانا محمد یوسف طیبی شیخ الحدیث جامعہ دراسات کراچی، ڈاکٹر عتیق الرحمٰن فاضل مدینہ یونیورسٹی، ڈاکٹر جمیل احمد سابق وزیر انصاف مالدیپ وہاں کے موجودہ وزیر داخلہ مولانا سید سبطین شاہ نقوی (سرگودھا) شامل ہیں۔

قاری نوید الحسن نے جامعہ سلفیہ سے سند فراغ لی تھی اور وہاں کے اساتذہ ان پر شفقت فرماتے تھے، ان

کی خواہش تھی کہ اسی ادارے میں تدریسی خدمات انجام دی جائیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ خواہش پوری فرما دی۔ ان کے استاد مکرم مولانا محمد اسماعیل مالدیپی نے جامعہ کے ناظم تعلیم چودھری محمد یاسین ظفر سے بات کی اور انھیں مدرس مقرر کر لیا گیا۔

۱۹۹۲ء سے یہ جامعہ سلفیہ میں خدمت تدریس میں مصروف ہیں۔ یعنی تیس سال کی عمر میں اس عظیم و معروف ادارے کی مسند درس پر متمکن ہوئے اور اللہ کی مہربانی سے بڑی محنت اور دلجمعی سے یہ کار خیر انجام دے رہے ہیں۔

قاری نوید الحسن ماشاء اللہ خطابت میں بھی اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ ان کے والد گرامی (قاری محمد یوسف) خطیب تھے، والدہ چاہتی تھیں کہ یہ بھی والد کی طرح خطابت کا سلسلہ شروع کریں، لیکن یہ اس طرف آنے سے گریزاں تھے، بالآخر ماں کی تمنا اور دعا رنگ لائی اور مئی ۱۹۹۵ء میں فیصل آباد کے محلہ طارق آباد کی مسجد کے خطیب مولانا عبدالرحیم اچانک چلے گئے تو انھوں نے وہاں خطبہ جمعہ دیا۔ ان کے انداز خطابت سے لوگ متاثر ہوئے اور مستقل طور پر انھوں نے یہ سلسلہ جاری رکھنے پر اصرار کیا۔ چنانچہ ۲۰۰۷ء تک وہاں فریضہ خطابت انجام دیا۔ بعد ازاں سرگودھا روڈ پر مرکز المکرّم کے اصحاب انتظام انھیں اپنے ہاں لے جانے پر مصر ہوئے تو طارق آباد کی مسجد کی مجلس منتظمہ نے اس شرط پر رضامندی ظاہر کی کہ ان کی مسجد میں پروفیسر عبدالرزاق ساجد جمعہ پڑھایا کریں چنانچہ یہ شرط منظور ہوئی۔ اب طارق آباد کی مسجد کے خطیب پروفیسر عبدالرزاق ساجد ہیں اور مرکز المکرّم کی مسجد کا خطبہ قاری نوید الحسن ارشاد فرماتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بطور خطیب بھی اللہ کی مہربانی سے انھیں مقبولیت حاصل ہے۔ خطابت میں کامیابی کی وجہ ایک تو اللہ کا خاص کرم ہے۔ دوسری وجہ ان کے نزدیک ماں کی دعائیں ہیں، جنھیں بارگاہ الٰہی میں شرف قبول حاصل ہوا۔

قاری صاحب کو اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے فن قراءات کے مقابلے میں متعدد ملکوں میں پاکستان کی نمائندگی کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ جن ملکوں میں انھیں اس سلسلے میں دعوت دی گئی اور وہاں انھوں نے اپنے اس پاکیزہ ترین فن کا مظاہرہ کیا، ان میں مصر، سعودی عرب، امارات، سری لنکا اور مالدیپ شامل ہیں۔ مالدیپ تو یہ دو مرتبہ وہاں کی سرکاری دعوت پر بھی تشریف لے گئے۔ ان ملکوں کی محافلِ قرأتِ قرآن میں بہت سے قاری حضرات شریک ہوئے اور بے شمار لوگوں نے سامعین کی حیثیت سے ان مجالس میں شرکت کی۔ قاری صاحب ممدوح نے وہاں ایسے دلکش اسلوب سے قرأت فرمائی جس سے مختلف ملکوں کے قرائے کرام بھی متاثر ہوئے اور سامعین نے بھی بڑی تحسین کی۔ یہ اللہ کا خاص فضل ہے جس سے یہ نوازے گئے۔

۲۰۰۵ء میں اسلام آباد میں وفاقی حکومت کی طرف سے قومی سیرت کانفرنس کا انعقاد ہوا تھا، جس میں اس وقت کے وزیر اعظم شوکت عزیز بھی شامل ہوئے تھے۔ اس کانفرنس میں فن قرأت میں نمایاں خدمات

سرانجام دینے کی وجہ سے قاری نوید الحسن کو بھی دعوت شرکت دی گئی اور قومی اعزاز دیا گیا تھا۔

مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ٹی وی پیغام چینل میں مستقل طور پر قاری صاحب کی تلاوت قرآن نشر کی جاتی ہے۔ بطور ممتحن بھی انھیں حفظ و قرأت قرآن کے مدارس میں مدعو کیا جاتا ہے۔

قاری صاحب کو قرأت کے لیے عام پبلک جلسوں میں بھی بلایا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ انھیں دیوبندی مکتب فکر کی ایک بڑی کانفرنس میں تلاوت قرآن کا موقع ملا۔ اس وقت ایک دیوبندی عالم مولانا محمد رفیق جامی سٹیج پر تشریف فرما تھے۔ قاری صاحب کی تلاوت ختم ہوئی تو مولانا موصوف نے ان سے پوچھا: آپ کون ہیں یعنی آپ کا مسلک کیا ہے؟

انھوں نے جواب دیا: میں اہل حدیث ہوں۔

اس کے بعد لطیفے کی بات یہ ہوئی کہ مولانا نے تقریر شروع کی تو فرمایا: لوگو قیامت کی ایک اور نشانی پوری ہو گئی ہے اور وہ نشانی یہ ہے کہ اہل حدیث جماعت میں بھی اچھے قاری پیدا ہو گئے ہیں۔ اندازہ فرمایئے، مولانا محمد رفیق جامی کے نزدیک قیامت کی نشانیاں کس قسم کی ہیں۔ میرے خیال میں مولانا محمد رفیق جامی کی اس قسم کی باتیں کرنا بھی قیامت کی نشانیوں میں سے ہے۔

اب آخر میں قاری نوید الحسن کی شادی اور اولاد کے متعلق۔

اپریل ۱۹۹۵ء میں ان کی شادی ماسٹر ظفر اللہ لکھوی کی صاحب زادی سے ہوئی۔ ظفر اللہ لکھوی صاحب سے تقسیم ملک سے قبل سے میرے تعلقات قائم تھے۔ وہ نہایت نیک اور شریف آدمی تھے۔ ان کے ایک داماد حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی کے فرزند گرامی پروفیسر احمد ساقی ہیں۔ ان کے بقول ظفر اللہ صاحب ضرورت سے زیادہ شریف تھے۔ جس طرح کی معصومانہ سی باتیں وہ تقسیم ملک سے پہلے کیا کرتے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد بھی ان کا اسی قسم کا انداز کلام رہا، وہ اوکاڑہ میں سکونت پذیر تھے۔ ایک مرتبہ لاہور تشریف لائے اور مجھ سے ملے۔ رات میرے پاس ہی رہے۔ مجھے ان سے مل کر اور ان کی باتیں سن کر بے حد خوشی ہوئی۔ انھوں نے اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے اوکاڑہ میں وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بہرکیف قاری نوید الحسن کی شادی ماسٹر ظفر اللہ لکھوی کی دختر نیک اختر سے ہوئی۔ یہ سطور ۶ فروری ۲۰۱۳ء کو لکھی جا رہی ہیں۔ ان کی اولاد دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ بڑا بیٹا ماشاء اللہ حافظ قرآن ہے اور سرکاری سکول میں نویں جماعت میں پڑھتا ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ قاری نوید الحسن لکھوی، ان کی آل اولاد اور عزیز واقربا سب کو خوش رکھے اور وہ اس کے دین کی خدمت کرتے رہیں۔

(۶۔ فروری ۲۰۱۳ء)

مولانا محمد رفیق زاہد

(ولادت ۲۴- جنوری ۱۹۶۹ء)

دراز قامت، گول چہرہ، مناسب ناک نقشہ، شیریں گفتار، علماء کے قدر دان، طبعی طور سے متواضع، اپنے کام سے کام رکھنے والے، سادہ لباس اور سادہ مزاج، لائق مدرس اور اچھے منتظم۔ یہ ہیں مولانا محمد رفیق زاہد جن سے مَیں طویل مدت سے متعارف ہوں۔

مولانا موصوف ۲۴ جنوری ۱۹۶۹ء کو ضلع قصور کے ایک گاؤں گہلن ہٹھار میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی۔ مسلمان گھرانوں کے بچوں کی طرح پہلے قرآن مجید ناظرہ پڑھا۔ اس گاؤں میں ایک بزرگ حافظ عبداللطیف اقامت فرما ہیں، جن سے گاؤں کے تقریباً ہر گھر کے بچوں نے قرآن مجید پڑھا۔ محمد رفیق زاہد کو بھی انہی سے ناظرہ قرآن پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

والدین ناخواندہ ہیں، لیکن بیٹے کو حصول علم کا شوق تھا۔ اپنے گاؤں گہلن ہٹھاڑ کے سرکاری سکول میں چھے جماعتیں پڑھیں۔ پھر کچھ عرصے کے بعد میٹرک پاس کر لیا۔ دینی تعلیم کا آغاز ۱۹۷۹ء میں اپنے گاؤں کے مدرسہ ضیاء الاسلام سے کیا۔ اس وقت اس مدرسے کے مہتمم اور صدر مدرس مولانا محمد صدیق سلیم تھے جو حضرت مولانا محمد یوسف شیخ الحدیث مدرسہ دار الحدیث راجووال کے شاگرد ہیں۔ دیگر مدرسینِ کرام تھے مولانا محمد یعقوب ڈوگر، سید عباس شاہ، مولانا محمد یاسین سلیم اور حافظ عبداللہ بھٹوی۔ یہ محمد رفیق زاہد کے ابتدائی تعلیمی دور کے اساتذہ ہیں۔

محمد رفیق زاہد اپنے خاندان میں دینی تعلیم کے اولیں طالب علم تھے۔ انھوں نے نہایت مشکل حالات میں دینی تعلیم حاصل کی۔ مالی استطاعت بھی نہ تھی اور خاندان کے کسی فرد کا تعاون بھی حاصل نہ تھا، بلکہ سب لوگ حوصلہ شکنی کرتے تھے۔ بس دل میں ایک جذبہ تھا جو اس راہ پر چلا رہا تھا اور شدید مخالفت کے باوجود جذبہ کامیاب رہا اور علم کی دولت حاصل ہو گئی۔

۱۹۸۴ء میں انھوں نے معروف درس گاہ جامعہ رحمانیہ لاہور (جاری کردہ جناب حافظ عبدالرحمٰن مدنی) میں داخلہ لیا۔ یہاں جن اساتذۂ عالی قدر سے جو کتابیں پڑھیں اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

☆......مولانا عبدالرحمٰن عظیمی سے — عمدۃ الاحکام

☆......حافظ عبدالوہاب روپڑی سے — مشکوٰۃ المصابیح

☆......مولانا عبدالرشید راشد سے — سنن نسائی، جامع ترمذی، سنن ابوداؤد

☆......پروفیسر سعید مجتبیٰ سے — صحیح مسلم

☆......حافظ مفتی ثناء اللہ مدنی سے — صحیح بخاری

پھر اللہ تعالیٰ نے ایسے مواقع پیدا فرما دیے کہ ۱۹۸۹ء میں جامعہ ملک سعود ریاض (سعودی عرب) میں داخلہ مل گیا۔ وہاں ان کے اساتذہ تھے ناسف مصطفیٰ عبدالعزیز مصری، مصطفیٰ شعرانی سوڈانی، شیخ آدم سوڈانی، شیخ عبداللہ ظافر سعودی اور دیگر حضراتِ گرامی۔

۱۹۹۴ء میں جامعہ ملک سعود (ریاض) کا نصاب مکمل کر کے وطن واپس آئے تو جامعہ سعدیہ قصور میں فریضہ تدریس انجام دینے لگے۔ پھر کچھ عرصہ فاروق آباد (ضلع شیخوپورہ) کے مدرسہ تعلیم الاسلام میں پڑھایا۔ بعدازاں مولانا محمد یوسف کے جاری فرمودہ دارالحدیث (راجووال ضلع اوکاڑہ) میں تقرری عمل میں آئی اور مولانا محمد یوسف صاحب کے زیرِ نگرانی طلبا کو پڑھانا شروع کیا۔

پھر یہ ہوا کہ ۱۹۹۹ء میں مولانا عارف جاوید محمدی کے کہنے پر گوجراں والا چلے گئے۔ وہاں لجنۃ المساجد کے دفتر میں کفالۃ الایتام، کفالۃ الدعاۃ اور دفتر کے دیگر امور کی انجام دہی ان کے ذمے ہوئی۔ ان معاملات میں مولانا عارف جاوید محمدی کی راہنمائی انھیں حاصل تھی۔ اسی اثنا میں دارالحدیث راجووال کی تعمیرِ نو کا سلسلہ شروع ہوا اور اللہ کے فضل سے پایۂ تکمیل کو پہنچا، جس میں مولانا محمد رفیق زاہد کی کوششوں کو بڑا دخل ہے۔

حالات نے پھر پلٹا کھایا اور یہ ۲۰۰۶ء میں دوبارہ راجووال آ گئے اور دارالحدیث میں خدمت تدریس انجام دینے لگے۔ تدریس کے علاوہ یہ اس دارالحدیث کے مدیر تعلیم بھی ہیں۔ تمام مفوّضہ فرائض پوری ذمہ داری سے انجام دے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑی ہمت اور استعداد سے نوازا ہے۔

اب ان کی اولاد کے بارے میں چند باتیں:

یہ سطور ۳۱-نومبر ۲۰۱۲ء کو معرضِ تحریر میں لائی جا رہی ہیں۔ اب تک مولانا محمد رفیق زاہد کی سات اولادیں ہیں، پانچ بیٹیاں اور دو بیٹے۔ بڑے بیٹے کا نام اپنے سراپا صالحیت استاد کے نام پر نعیم الحق نعیم رکھا اور چھوٹے کا اسامہ۔

بڑا بیٹا درس نظامی کی تیسری جماعت میں پڑھتا ہے اور دوسرے نے اپریل ۲۰۱۱ء میں قرآن مجید حفظ کرنا شروع کیا ہے۔ مولانا ممدوح نے بیٹے بیٹیوں سب کو دینی تعلیم دلانے کا عزم کر رکھا ہے۔

ان کے خاندان میں اب بچوں کو دینی تعلیم دلانے کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ بڑے بھائی کا بیٹا حافظ قرآن بھی ہے اور عالم دین بھی۔ وہ خطابت کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں اور ایک مدرسے میں بچوں کو قرآن بھی حفظ کرا رہے ہیں۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اعمالِ خیر کی توفیق بخشے۔

(۳۰۔نومبر۲۰۱۲ء)

مولانا محمد ادریس اثری

(ولادت یکم اپریل ۱۹۶۹ء)

نکلتا ہوا قد، تیکھے نقش و نگار، چوڑا سینہ، کشادہ پیشانی، کسرتی سا جسم، تجربہ کار مدرس، اچھے مبلغ، صاف ستھرا مگر سادہ لباس ۔ یہ ہیں صاحب ترجمہ مولانا محمد ادریس اثری، جو ضلع خانیوال کے گاؤں چک نمبر ۸۶۔۱۵۔ایل میں یکم اپریل ۱۹۶۹ء کو پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد شفیع ہے۔ وہ کاشت کار تھے۔

محمد ادریس اثری نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے سکول میں حاصل کی اور قرآن مجید اپنے ماموں مولانا محمد صادق سے پڑھا۔ اس کے بعد ملتان چلے گئے۔ وہاں میٹرک میں داخلہ لیا اور اس کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کا ترجمہ بھی پڑھا اور صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں ملتان ہی میں مولانا عبدالبصیر اور مولانا عبدالعزیز سے پڑھیں۔ ۱۹۸۵ء میں جب کہ سولہ سال کی عمر تھی اپنے بڑے بھائی کے ساتھ مغل ہارڈ ویئر سٹور پر کام کرنے لگے۔ ان کے نانا میاں دین محمد سلفی العقیدہ بزرگ تھے اور علماء سے تعلق رکھتے تھے۔ نانا کی صالحیت اور علماء سے تعلق کا محمد ادریس پر بے حد اثر پڑا۔ اسی اثنا میں انھیں علامہ احسان الٰہی ظہیر، مولانا حبیب الرحمٰن یزدانی، مولانا محمد حسین شیخوپوری اور بعض دیگر علمائے کرام کی تقریریں سننے کا موقع ملا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دل میں دینیات کی تعلیم حاصل کرنے کے جذبے نے کروٹ لی اور انہی مقررین حضرات کی طرح تقریر کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ ۱۹۸۷ء میں یہ جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن کی سالانہ کانفرنس میں گئے اور علما کی تقریریں سنی تو تحصیل علم کا مزید داعیہ ابھرا۔

اب انھوں نے دینیات کی تعلیم کے لیے کئی بار استخارہ کیا اور پھر ایک خواب دیکھا جو ان کے لیے مسرت کا باعث تھا اور یہ ۱۹۸۸ء میں دارالحدیث محمدیہ جلال پور پیروالا چلے گئے۔ وہاں حضرت مولانا سلطان محمود، مولانا محمد رفیق اثری، مولانا اللہ یار، مولانا عبدالرشید ریاستی سے تحصیل علم کرنے لگے اور اس میں اس قدر محنت کی کہ دو جماعتیں ایک سال میں پڑھ ڈالیں اور امتحان ہوا تو ۹۹ فی صد نمبر لے کر اول پوزیشن حاصل کی۔ اس کامیابی پر مولانا عبدالجبار ڈیروی نے ان کو انعام میں مشکوٰۃ المصابیح عطا فرمائی اور مدرسے کی طرف سے بھی چند کتابیں دی گئیں، جس سے ان کا حوصلہ بڑھا۔

اگلے سال تیسری جماعت میں گئے تو پھر اسی طرح محنت کی اور پہلی پوزیشن لی۔ چوتھی جماعت میں بھی

اپنی کلاس میں اول آئے۔صرف ونحواور دیگر مضامین میں سب ہم جماعت طلباء سے آگے نکل گئے۔۱۹۹۱ء میں جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) میں داخلہ لیا، وہاں بھی ہر مضمون میں اول آنے کی روایت قائم رہی۔۱۹۹۲ء میں جامعہ سلفیہ کے طلباء کے ساتھ مل کر فیصل آباد بورڈ میں فاضل عربی کا امتحان دیا اور سارے بورڈ کو ٹاپ کیا، جس کے نتیجے میں بورڈ کی طرف سے سند افتخار اور گولڈ میڈل کے حق دار قرار پائے۔جامعہ سلفیہ میں حافظ عبدالعزیز علوی، مولانا محمد یاسین ظفر، حافظ محمد شریف، حافظ مسعود عالم، مولانا علی محمد حنیف سلفی، مولانا ثناء اللہ ہوشیار پوری، مولانا محمد یونس بٹ، حافظ عبدالستار حماد اور جامعہ کے دیگر اساتذہ کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیے۔۱۹۹۴ء میں حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی سے صحیح بخاری ختم کی اور سند فراغ لی۔فراغت کے بعد انھیں جامعہ سلفیہ کی طرف سے مثالی طالب علم قرار دے کر انعام سے نوازا گیا۔

جامعہ سلفیہ سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد اساتذہ کے مشورے سے جامعہ ہی میں مدرس مقرر کر لیے گئے۔لیکن پھر میاں فضل حق مرحوم اور چودھویں محمد یٰسین ظفر کی باہمی رائے سے ایک سال کے لیے ان کی خدمات میر پور خاص (سندھ) کے تدریسی ادارے جامعہ بحر العلوم سلفیہ کے سپرد کر دی گئیں۔ایک سال کے بعد ان کا تقرر بطور استاد ستیانہ بنگلہ کے مرکز الدعوۃ السّلفیہ میں کر دیا گیا۔یہ ۱۹۹۶ء کی بات ہے۔اس سال کے رمضان المبارک میں انھوں نے طلباء کو صرف ونحو کی کتابیں پڑھانا شروع کیں، جسے دورہ صرف ونحو کہا جاتا تھا۔اس دورے کا آغاز وہاں پہلی مرتبہ ہوا تھا۔۱۹۹۶ء ہی میں اپنے ماموں محمد ابراہیم کی صاحب زادی سے مومن آباد فیصل آباد میں ان کی شادی ہوئی۔

مولانا محمد ادریس اثری آٹھ سال مرکز الدعوۃ السّلفیہ میں پڑھاتے رہے۔اس مرکز تدریس میں ان کو مولانا عبداللہ امجد چھتوی، سید عبدالشکور شاہ اثری، حافظ عبدالغفار اعوان مدنی، مولانا عتیق اللہ سلفی، مولانا محمد یونس سالک، مولانا بشیر احمد، مولانا عبداللہ بھٹوی، مولانا عبدالرشید صدیقی اور بعض دیگر اساتذۂ کرام کی رفاقت حاصل تھی۔

۲۰۰۲ء میں ان کی تقرری صدر مدرس اور شیخ الحدیث کی حیثیت سے اسلامک ایجوکیشن انسٹی ٹیوٹ مہنتاں والا (تحصیل دیپال پور ضلع اوکاڑہ) میں ہوئی۔اس علاقے میں کتاب وسنت کی تبلیغ و تدریس کا یہ بہت بڑا ادارہ ہے۔مدرسے کی عمارت بھی بہت عمدہ ہے، اس سے ملحق مسجد بھی شان دار ہے۔طلباء کی رہائش کا انتظام بھی بہت اچھا ہے۔مولانا محمد ادریس اثری جب وہاں گئے، اس وقت صرف دس طالب علم تھے اور ایک استاد۔اب ایک ہزار کے قریب طلباء وہاں تعلیم حاصل کرتے ہیں اور متعدد اساتذہ انھیں پڑھانے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، صرف ونحو، عربی ادبیات وغیرہ ہر فن کی تعلیم بڑی محنت سے

دی جاتی ہے۔

اس ادارے میں تین قسم کے شعبے ہیں۔ایک شعبہ درس نظامی، دوسرا شعبہ اسلامیہ کالج، تیسرا شعبہ ہے ہائی سکول انگلش میڈیم۔

مجھے ۱۴ فروری ۲۰۱۳ء کو مولانا عبدالخالق مدنی (کویت) اور مولانا عبدالرشید ضیا (مدرس مرکز الدعوۃ السلفیہ ستیانہ بنگلہ) کی رفاقت میں وہاں جانے کا اتفاق ہوا۔مولانا محمد ادریس، حافظ محمد عباس اور دیگر اساتذہ سے مل کر اور طلباء سے گفتگو کر کے بے حد مسرت ہوئی۔

اس ادارے میں پہلی جماعت میں طالب علم کو داخل کیا جاتا ہے اور پھر درس نظامی اور بی اے تک برابر سلسلہ تعلیم چلتا ہے۔مدینہ یونیورسٹی کے ساتھ اس کا الحاق کیا جارہا ہے۔ یہاں کے بعض طلباء مدینہ یونیورسٹی میں تعلیم بھی حاصل کر رہے ہیں اور اس کے فارغ التحصیل حضرات مختلف مدارس میں بہ حیثیت مدرس خدمات انجام دے رہے ہیں۔

مولانا محمد ادریس اثری نے علم نحو کے موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی ہے، جس کا نام ہے الثمرات النقیہ للدورۃ النحویہ۔مولانا ممدوح ماشاءاللہ مدرس وخطیب بھی ہیں اور قلم وقرطاس سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔

(۱۷۔ مارچ ۲۰۱۳ء)

مولانا محمد مالک بھنڈر

(ولادت ۱۹۷۰ء)

گوجراں والا شہر اور ضلعے پر اللہ کا یہ خاص کرم ہے کہ یہاں اتنے علما و مدرسین، صلحا و اولیا اور خطبا و ادبا پیدا ہوے کہ انھیں شمار میں لانا ممکن نہیں اور انھوں نے اس قدر علمی، ادبی، تصنیفی، خطابتی، تدریسی خدمات سر انجام دیں کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ خدمات کا یہ سلسلہ جاری ہے اور ان شاء اللہ جاری رہے گا۔ اس علاقے کے لاتعداد مرحومین و موجودین اصحابِ علم کو یہ فقیر ذاتی طور پر جانتا ہے اور ان کی خدمات کی بوقلمونی سے بھی آگاہ ہے۔ ان میں ہر مسلکِ فقہی کے لوگ شامل ہیں۔ ان میں سے کتنے ہی بزرگانِ عالی قدر کا تذکرہ یہ فقیر اپنی مختلف کتابوں میں کر چکا ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ مرحومین کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور موجودین کو اپنے دین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کے مواقع میسر فرمائے۔ آمین

خدامِ دین کے اس طائفہٗ ذی شان میں ایک عالم مولانا محمد مالک بھنڈر (BHINDER) ہیں جو ۱۹۷۰ء (۱۳۹۰ھ) میں ضلع گوجراں والا کی تحصیل نوشہرہ کے موضع ماڑی بھنڈراں میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حاجی عبدالرحمٰن تھا جو چھوٹے درجے کے زمیندار خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ علمائے دین کے بے حد قدردان تھے اور ان کے مواعظ نہایت شوق سے سنتے تھے۔ انھوں نے نذر مانی تھی کہ اللہ تعالیٰ انھیں بیٹا عطا فرمائے تو وہ اسے اللہ کے دین کے حصول اور اس کی تبلیغ کے لیے وقف کر دیں گے۔ چنانچہ اللہ نے انھیں بیٹا دیا جس کا نام محمد مالک رکھا گیا۔

محمد مالک نے ناظرہ قرآن مجید اپنے گاؤں کے امام و خطیب مولانا محمد اسماعیل سے پڑھا اور سرکاری سکول میں مڈل تک وہیں تعلیم حاصل کی۔ سکول کے اساتذہ میں سید عبدالغفار شاہ اور سید محمد الیاس شاہ ان پر بڑی شفقت فرماتے تھے اور نہایت محنت سے طلبا کو پڑھاتے تھے۔ میٹرک انھوں نے گوجراں والا کے گورنمنٹ ہائی سکول سے اعلیٰ نمبروں میں ۱۹۸۶ء میں پاس کیا۔ ان کا شمار مڈل سکول کے بھی اور ہائی سکول کے بھی محنتی اور ذہین طلبا میں ہوتا تھا، اور ہائی سکول کے معلمین کی جماعت میں چودھری غلام مصطفیٰ جیسے مشفق و ممتاز معلم شامل تھے۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد ۱۹۸۶ء میں محمد مالک بھنڈر نے جامعہ محمدیہ (جی ٹی روڈ گوجراں والا) میں

داخلہ لیا اور وہاں مولانا محمد عبداللہ، مولانا عبدالحمید ہزاروی، حافظ عبدالمنان نور پوری، حافظ عبدالسلام بھٹوی، مولانا محمد رفیق سلفی، مولانا حفیظ الرحمٰن لکھوی، قاری عبدالشکور مدنی، حافظ محمد عباس انجم، مولانا جمعہ خاں، قاضی عبدالرزاق اور قاری ابوبکر عثمانی کے حضور زانوے شاگردی تہہ کیے۔ ۱۹۹۳ء (۱۴۱۳ھ) میں سندِ فراغت لی۔

جامعہ محمدیہ میں طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے تعلیم چھوڑ کر گورنمنٹ کالج برائے ایلمنٹری اساتذہ گکھڑ میں داخلہ لیا اور وہاں ڈی، ایم کا کورس کیا۔ اس کے بعد پھر جامعہ محمدیہ میں آ کر تعلیم مکمل کی۔

جامعہ محمدیہ میں ان کے ہم جماعت طلبا میں حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی، مولانا مختار احمد عثمانی (جدہ) مولانا طاہر نقاش، مولانا جاوید سیالکوٹی، پروفیسر مطیع الرحمٰن، حافظ عبداللہ شرق پوری اور بعض دیگر حضرات شامل تھے۔

جامعہ محمدیہ سے سندِ فراغت لینے کے بعد اس کے مہتمم و نگران مولانا عبداللہ مرحوم و مغفور کے حکم کے مطابق انھوں نے اسی جامعہ میں خدمتِ تدریس انجام دینا شروع کر دی۔ وہاں انھوں نے جن درسی کتابوں کی تدریس کی ان میں کتبِ حدیث میں سے بلوغ المرام، سنن ابن ماجہ، سننِ ابی داود، جامع ترمذی، اصول حدیث کی تدریب الراوی اور شرحِ نخبۃ الفکر۔ میراث کی سراجی اور فقہ المواریث۔ اصول فقہ کی الوجیز اور اصول شاشی شامل ہیں۔ علاوہ ازیں مختلف فنون کی بعض دیگر کتابیں بھی پڑھاتے رہے۔ ۲۰۰۹ء (۱۴۳۰ھ) تک وہاں ان کا سلسلۂ درس جاری رہا۔

پھر اسی سال جامعہ اسلامیہ سلفیہ مکرم مسجد ماڈل ٹاؤن (گوجراں والا) تشریف لے آئے۔ یہ سطور ۱۸۔ مئی ۲۰۱۳ء کو لکھی گئی ہیں، اب تک یہ اسی جامعہ میں مشغولِ درس و تدریس ہیں۔ یہاں قرآن مجید کا ترجمہ و تفسیر، صحیح مسلم اور حدیث و فقہ اور دوسرے فنونِ متداولہ کی کئی کتابوں کی تدریس ان کے فرائض میں شامل ہے۔ جامعہ اسلامیہ سلفیہ سے سہ ماہی مجلّہ ''المکرم'' شائع ہوتا ہے، اس میں بھی ان کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔

مکرم مسجد گوجراں والا شہر کی ایک وسیع اور خوب صورت مسجد ہے، جس کی تعمیر کی ایک خاص تاریخ ہے، جس کے مرکزی کردار ہمارے مرحوم دوست سابق ایم پی اے اسماعیل ضیا اور حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ کے مرحوم و مغفور فرزند حکیم محمود سلفی تھے۔ حکیم صاحب مرحوم نامور عالم اور ممتاز طبیب تھے۔ اب ان کے صاحب زادے حافظ محمد اسعد اس مسجد میں خطبۂ جمعہ ارشاد فرماتے ہیں۔ اس نوجوان فاضل خطیب کو اللہ تعالیٰ نے کلام و بیان کی نعمت سے خوب نوازا ہے اور وہ اسی لہجے اور اسی انداز سے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتے ہیں جو اللہ نے ان کے جدِّ امجد استاذ الاساتذہ حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ کو عطا فرمایا تھا۔ حضرت مرحوم اس فقیر کے رفیع المرتبت استاذ اور جلیل المنزلت محسن تھے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کے لائق پوتے حافظ محمد اسعد کی عمر دراز فرمائے اور وہ ہمیشہ قرآن و حدیث کی ترویج و اشاعت کرتے رہیں۔

بہرکیف مولانا محمد مالک بھنڈر جامعہ اسلامیہ سلفیہ میں خدمتِ تدریس انجام دینے پر مامور ہیں جوکرم مسجد میں حافظ محمد اسعد نے جاری کی ہے۔ گوجراں والا کی ایک مسجد میں وہ خطبہ جمعہ بھی دیتے ہیں۔ ان کے والد مکرم حاجی عبدالرحمٰن بھنڈر کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا جمعہ پڑھائے، وعظ کرے اور وہ سنیں۔ اللہ نے ان کی یہ خواہش پوری کی۔ انھوں نے اپنے اس بیٹے کو جمعہ پڑھاتے دیکھا اور ان کا وعظ اور خطبہ سنا۔

درس و خطابت کے علاوہ مولانا محمد مالک بھنڈر کا قلمی کام بھی قابلِ تحسین ہے۔ حافظ عبدالمنان نورپوری مرحوم سے لوگ بذریعہ خطوط دینی مسائل پوچھا کرتے تھے۔ حافظ صاحب ان کو تحریری صورت میں جو جواب دیتے، اس کی ایک نقل محفوظ فرمالیتے تھے، سائل کا خط بھی اپنے پاس رکھ لیتے تھے۔ اس طرح بہت سے سوالات اور ان کے جوابات جمع ہو گئے تھے۔ جسے مختلف دینی مسائل کے بہت بڑے ذخیرے سے تعبیر کرنا چاہیے۔ المکتبۃ الکریمیہ کے نیک اطوار اور خوش کردار ذمے داروں جناب سیف اللہ صاحب اور محمد مسعود لون صاحب نے اسے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس ذخیرے کو مسائل کے موضوعات کی صورت میں مرتب کرنا بہت اہم کام تھا۔ یہ کام مولانا محمد مالک بھنڈر کے سپرد کیا گیا۔ انھوں نے نہایت محنت اور احتیاط سے کئی سال میں کام مکمل کیا اور علم و تحقیق کے اس گلستان کو ''احکام و مسائل'' کے نام سے شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ اس کی دو جلدیں معرضِ اشاعت میں آ چکی ہیں۔ تیسری جلد تکمیل کا آخری مرحلہ طے کر رہی ہے اور چوتھی جلد کی ترتیب کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ جلد اول بڑے سائز کے ۶۳۲ صفحات اور جلد دوم ۸۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ المکتبۃ الکریمیہ داد کا مستحق ہے کہ اس نے دونوں جلدیں نہایت خوب صورت انداز میں شائع کی ہیں۔ بہترین کاغذ، عمدہ کمپوزنگ، بہت اچھی طباعت، مضبوط اور دیدہ زیب جلد۔ المکتبۃ الکریمیہ کے مالک یہ بنیادی اور اہم کام جلد از جلد مکمل کرنا چاہتے ہیں۔

مولانا محمد مالک بھنڈر ۱۹۹۴ء یعنی انیس سال سے درس و تدریس میں مشغول ہیں۔ اس عرصے میں سیکڑوں شائقین علوم نے ان سے استفادہ کیا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ان سب عزیزوں کو قرآن و سنت کی تبلیغ و تدریس کی توفیق عطا فرمائے۔ ان کے شاگردانِ کرام کی وسیع فہرست میں مولانا محمد عظیم حاصل پوری، مولانا خاور رشید بٹ، حافظ ابوسفیان سلفی، حافظ محمد افضل شیخوپوری، حافظ عثمان، عبداللطیف، مولانا سعید الرحمٰن ہزاروی شامل ہیں جو مختلف مقامات میں تدریس و خطابت کے ذریعے بھی خدمت سرانجام دے رہے ہیں اور تصنیف و تالیف کی صورت میں بھی۔

اللہ تعالیٰ ان کی مساعی کو شرفِ قبول بخشے۔ آمین

(یہ سطور ۱۸۔ مئی ۲۰۱۳ء کو لکھی گئیں)

مولانا عبدالرشید ضیا

(ولادت ۱۹۷۱ء)

ضلع فیصل آباد میں بے شمار علمائے کرام پیدا ہوئے جنھوں نے بے حساب علمی خدمات سرانجام دیں اور اللہ کی مہربانی سے دے رہے ہیں۔ان میں ایک عالم دین مولانا عبدالرشید ضیا ہیں جو ۱۹۷۱ء میں بمقام چک نمبر ۲۴ گ ب (تحصیل جڑاں والا) پیدا ہوئے۔ پرائمری تک جڑاں والا کے ایک سرکاری سکول میں تعلیم حاصل کی۔چھٹی جماعت میں داخل ہوئے تو دل میں دینی تعلیم کا جذبہ ابھرا اور کتاب وسنت کی تبلیغ کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ سکول کی تعلیم ترک کی اور جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن کا عزم کیا۔وہاں جن لائق احترام اساتذہ سے جو کتابیں پڑھیں، اس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ مولانا محمد لقمان بن مولانا عبداللہ گورداس پوری سے ترجمہ قرآن اور شرح مائۃ عامل۔

۲۔ مولانا رضی اللہ بڈھیمالوی سے بلوغ المرام، سنن ابی داؤد، شرح وقایہ اور بعض دیگر درسی کتابیں۔

۳۔ مولانا محمد علی حامد سے زراوی، کافیہ، سنن ابن ماجہ، جامع ترمذی، دیوان حماسہ۔

۴۔ مولانا عبدالرشید اثاروی سے موطا امام مالک، صحیح مسلم، بدایۃ المجتہد، نورالانوار اور بعض اور کتابیں۔

۵۔ مولانا رفیع الدین فردوسی سے ترجمہ قرآن (آخری دس پارے) تفسیر جامع البیان، تلخیص المفتاح، مختصر المعانی وغیرہ۔

۶۔ حافظ بنیامین طور سے مطول، حجۃ اللہ البالغہ، تفسیر بیضاوی، سراجی، صحیح بخاری، الفیہ ابن مالک، شرح تہذیب اور بعض دیگر نصابی کتب۔

ان حضرات کے علاوہ حافظ مقصود احمد، پروفیسر ابوبکر حمزہ، حافظ عبدالعلیم (موجودہ مدرس جامعہ سلفیہ) حافظ نصراللہ (ملتان) سے استفادہ کیا۔اس طرح تمام علوم متداولہ جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن کے اساتذہ گرامی سے حاصل کیے اور سند فراغت لی۔

۱۹۸۸ء میں میٹرک کا امتحان دیا۔اسی سال رمضان المبارک میں مرکز الدعوۃ السلفیہ ستیانہ بنگلہ میں شیخ الحدیث مولانا عبداللہ امجد چھتوی کے دورہ تفسیر قرآن میں شرکت کی اور قرآن سے متعلق ان کے افکار عالیہ سے فیض یاب ہوئے۔

۱۹۸۹ء میں فاضل عربی کا اور ۱۹۹۰ء میں ایف اے کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے۔ ۱۹۹۲ء میں جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن سے فراغت پائی اور سند حاصل کی۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد جامعہ تعلیم الاسلام ہی میں سلسلہ تدریس شروع کیا اور دو سال وہاں رہے۔ اس اثنا میں وہاں ابتدائی جماعتوں کی مختلف کتابیں پڑھائیں اور عربی ادبیات کی انتہائی درجوں کی کتابیں دیوان حماسہ اور مقامات حریری بھی پڑھائیں۔ اضافی وقت میں طلباء کو فاضل عربی کی تیاری کراتے رہے۔

دو سال کے بعد عارف والا چلے گئے اور وہاں کی جامعہ اشاعتہ الاسلام میں تیرہ سال خدمت تدریس انجام دی۔ بعد از اں ایک سال مرکز الدعوۃ السّلفیہ ستیانہ بنگلہ میں تدریس کی۔ دوبارہ پھر عارف والا گئے اور پانچ سال وہیں قیام رہا۔ جنوری ۲۰۰۳ء میں وہاں سے مرکز الدعوۃ السّلفیہ ستیانہ بنگلہ آ گئے اور دس سال سے وہیں سلسلہ تدریس جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ہر رمضان المبارک میں طلباء کو دورہ نحو کراتے ہیں۔

یہ سطور ۴ مارچ ۲۰۱۳ء کو سپرد قلم کی جارہی ہیں۔ مولانا ممدوح گزشتہ بیس سال سے مسند درس پر متمکن ہیں۔ اس طویل مدت میں ان سے لاتعداد طلباء نے تحصیل علم کی۔ ان سب کے نام ان کو بھی یاد نہیں ہوں گے۔ ان میں سے چند حضرات کے نام درج ذیل ہیں۔

پروفیسر ضیاء اللہ سمندری، پروفیسر محمد خالد میاں والی، پروفیسر امجد سمندری، پروفیسر خبیب تاندلیاں والا، قاری ذکاء اللہ سلیم (برطانیہ) حافظ شبیر احمد عثمانی (برطانیہ) مولانا محمد امین ثاقب فاضل مدینہ یونیورسٹی (لاہور) مولانا منیر احمد مدرس جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن، مولانا ساجد الرحمٰن ناظم جامعہ اشاعت الاسلام عارف والا، مولانا عبدالرحمٰن فردوسی ناظم جامعہ رحمانیہ کہروڑ پکا، مولانا عبدالرزاق سلفی جامعہ اسلامیہ پیر محل۔

مولانا عبدالرشید ضیاء ترجمہ و تصنیف سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کے رشحاتِ قلم ہفت روزہ الاعتصام (لاہور) ہفت روزہ اہل حدیث (لاہور) ہفت روزہ تنظیم اہل حدیث (لاہور) شباب المسلم (خوشاب) اور مجلّہ کریمیہ (سمندری) میں چھپتے رہتے ہیں۔

اب تراجم و تصانیف:

۱۔ کتاب السنہ (ابن ابی عاصم) کا ترجمہ، تخریج، فقہ الحدیث

۲۔ القول الجلی فی التوسل بالنبی والولی کا اردو ترجمہ۔

۳۔ الحجاب عبرۃ عبرۃ کا اردو ترجمہ۔ اسے ''دارالسلام'' نے شائع کیا۔

۴۔ علامہ ابن حزم کے حالات اور ان کی فقہ سے متعلق عربی کتاب کا ترجمہ۔

۵۔ ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم وبنات الرسول صلی اللہ علیہ وسلم۔شائع کردہ دارالسلام۔

۶۔ صحیح ابوعوانہ (جلد اول) ترجمہ وتخریج،فقہ الحدیث،شائع کردہ اسلامی کتب خانہ لاہور۔

۷۔ سنن ابی داؤد،ترجمہ وتخریج وحکم الحدیث،فقہ الحدیث یہ اہم کام جاری ہے۔

تدریس اور ترجمہ وتصنیف کے ساتھ ساتھ مرکز الدعوۃ السلفیہ میں طلباء کو مناظرے کا طریقہ بھی باقاعدہ سمجھاتے ہیں اور اس کی حیثیت ایک مستقل کلاس کی ہے۔ مرکز الدعوۃ السلفیہ کی فتاویٰ کمیٹی کے بھی رکن ہیں۔نیز مختلف مسائل کے بارے میں ان کے فتوے مجلّہ کریمیہ (سمندری) میں شائع ہوتے ہیں۔

مولانا عبدالرشید ضیاء کا حلیہ یہ ہے:

پورا قد، بھرا ہوا معتدل جسم، گندمی رنگ، خوش گفتار، خوش لباس، دوستوں کے دوست، ملنسار، مشفق استاد، اچھے خطیب، بہترین مدرس۔

۴ مارچ ۲۰۱۳ء تک (جب کہ یہ سطور لکھی گئیں) ان کی اولاد تین بیٹے ہیں اور تین بیٹیاں۔ سبھی تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ بیٹوں کے نام علی الترتیب یہ ہیں۔عکاشہ رشید،عکرمہ رشید،خزیمہ رشید۔

دعا ہے۔اللہ تعالیٰ اس گھرانے کا حامی وناصر ہو۔آمین یارب العالمین۔

(۴۔مارچ ۲۰۱۳ء)

قاری سلمان احمد میر محمدی

(ولادت یکم اکتوبر ۱۹۷۲ء)

موضع میر محمد ضلع قصور سے تعلق رکھنے والے ایک قاری سلمان احمد ہیں۔ والد کا اسم گرامی حافظ عبداللہ ہے۔ قاری صاحب ممدوح قاری محمد ابراہیم اور قاری صہیب احمد کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ابتدائی تعلیم والد صاحب سے حاصل کی اور ناظرہ قرآن بھی انہی سے پڑھا۔ حفظِ قرآن کا آغاز قاری محمد اسحاق مرحوم سے موضع میر محمد کے مدرسہ حفظ القرآن میں کیا۔ ان سے چودہ پارے حفظ کیے تھے، پھر میر محمد سے دو میل کے فاصلے پر راجہ جنگ کے مدرسہ ضیاء السنہ میں داخل ہوئے۔ وہاں قاری صدیق الحسن کا سلسلۂ حفظ و تجویدِ قرآن جاری تھا۔ ان سے پورا قرآن حفظ کیا۔

سکول کی تعلیم کا آغاز گورنمنٹ مڈل سکول میر محمد سے کیا۔ اس کے ساتھ حفظ قرآن کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ وہاں مڈل تک تعلیم حاصل کی اور ۲۶ جنوری ۱۹۸۷ء کو مع تجوید کے حفظ قرآن سے فراغت پائی۔ ۱۹۹۱ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ بعد ازاں حافظ عبدالرحمٰن مدنی کی جاری کردہ جامعہ رحمانیہ ماڈل ٹاؤن لاہور میں داخلہ لیا (اسے اب جامعہ لاہور الاسلامیہ کہا جاتا ہے)۔ وہیں درس نظامی اور قراءات سبعہ وعشرہ کی تکمیل کی۔ اساتذہ کے اسمائے گرامی ہیں مفتی حافظ ثناء اللہ مدنی، مولانا حافظ عبدالرحمٰن مدنی، مولانا عبدالحلیم (مقیم سعودی عرب)، مولانا عبدالرشید خلیق، ڈاکٹر حافظ محمد اسحاق زاہد (کویت)، مولانا محمد رمضان سلفی، حافظ شفیق احمد مدنی، حافظ عبدالسلام صاحب۔

ہم جماعت حضرات میں قاری صہیب احمد، قاری فیاض احمد، قاری عبدالولی (صومالی)، قاری عبیداللہ غازی شامل ہیں۔

قاری سلمان احمد نے ایک عرصے تک کلیۃ الشریعہ جامعہ رحمانیہ اور کلیۃ القرآن میں قرآن مجید کی تحفیظ و تجوید کا سلسلہ جاری رکھا۔ اب کئی سال سے اپنے عالم فاضل بھائیوں (قاری محمد ابراہیم صاحب اور قاری صہیب احمد) کی رفاقت میں ادارۃ الاصلاح بنگا بلوچاں میں پڑھا رہے ہیں۔ اللہ نے اپنے اسلاف کی طرح انھیں علم کی دولت سے بھی نوازا ہے اور عمل کی توفیق بھی عطا فرمائی ہے۔

مختلف مقامات کے تدریسی اداروں میں ان سے متعدد طلبا نے کسب علم کیا، جن میں مولانا محمد اکرم بھٹی،

حافظ شاہد محمود، عطاء الرحمٰن ہزاروی، قاری احمد صدیق، قاری عارف بشیر، قاری عبدالسلام، قاری یحییٰ عباس، قاری عبدالرشید اسلم، قاری عمران سلیمان اور دیگر بہت سے حضرات کے نام آتے ہیں۔

تجوید کے موضوع پر ان کی چند قلمی خدمات بھی ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ القول السدید فی علم التجوید (مطبوعہ)

۲۔ اصول تجوید کی توجیہات (غیر مطبوعہ)

۳۔ الدرہ اور الشاطبیہ کی تلخیص (غیر مطبوعہ)

قاری سلمان احمد صاحب چوں کہ ایک مدت سے تدریسی سلسلے سے منسلک ہیں، اس لیے انھوں نے اپنے تجربے کی روشنی میں اساتذہ کرام سے کہا کہ:

☆ استاد کو ہر سبق کا خلاصہ شروع یا آخر میں عام فہم الفاظ میں شاگردوں کے سامنے بیان کرنا چاہیے۔

☆ بچوں کو ان کی قابلیت کے مطابق تعلیم دینی چاہیے۔

☆ دوران سبق طلباء سے سوالات پوچھتے رہیں تا کہ ان کا خیال ادھر اُدھر نہ ہو۔

☆ کلاس میں بچوں سے بے تکلف نہیں ہونا چاہیے۔ اس سے بچوں کے استفادے میں کمی واقع ہوتی ہے۔

☆ موقع ومحل کے مطابق بچوں کو سرزنش کرنی چاہیے۔

☆ تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت پر بھی توجہ دینی چاہیے۔

قاری سلمان احمد ماشاء اللہ بڑے ذہین اور صاحب استعداد ہیں۔ انھوں نے قاری محمد ادریس صاحب عاصم کے تجوید قرآن کے مدرسۃ العالیۃ لسوڑے والی (لاہور) میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ جامعہ رحمانیہ میں دوسری کلاس میں پوری جامعہ میں اول پوزیشن کے حق دار قرار پائے۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کا حامی و ناصر ہو۔ آمین۔

(۹۔ جولائی ۲۰۱۳ء)

مولانا محمد سلیم اعظم بلوچ شیخوپوری

(ولادت ۱۰۔ اپریل ۱۹۷۳ء)

میانہ قد، گندم گوں، مناسب جسم نہ فربہ نہ دبلے پتلے، کچھ چوڑا چہرہ، صحت مند، خوش کلام، سادہ مگر صاف ستھرا لباس، اچھے مقرر، علما کے قدر دان۔ یہ ہیں مولانا محمد سلیم اعظم بلوچ۔ والد کا نام محمد اعظم اور دادا کا فتح شیر بلوچ۔ شیخوپورہ شہر کی بستی بلوچاں میں ۱۰۔ اپریل ۱۹۷۳ء کو پیدا ہوئے۔ اسی بستی میں ان کا تمام خاندان آباد ہے۔ یہ لوگ جدی پشتی اسی شہر کے رہنے والے ہیں۔ گھر کا پورا ماحول دینی تھا۔ اسی ماحول میں محمد سلیم نے آنکھ کھولی اور وادیٔ شعور میں داخل ہوئے۔

محلے کی مسجد کے امام مولانا احمد الدین سے ناظرہ قرآن مجید پڑھنا شروع کیا۔ اس کے ساتھ ہی سرکاری سکول میں داخل کرا دیے گئے۔ ان کے والد مکرم محمد اعظم سرکاری ملازم تھے۔ ۱۹۸۳ء میں ان کا تبادلہ مرید کے میں ہو گیا تو یہ بھی وہیں چلے گئے۔ خوش قسمتی سے جامعہ عربیہ کے نام سے وہاں ایک دینی ادارہ قائم تھا، جس کے مہتمم ممتاز عالم دین حافظ عبدالغفور پنجاں والی کے فرزند گرامی مولانا حافظ محمود احمد تھے، محمد سلیم بلوچ نے قرآن مجید کی تعلیم اسی ادارے میں قاری اقبال احمد (حال مقیم سعودی عرب) سے حاصل کی۔ قاری صاحب نہایت مشفق اور مہربان استاذ تھے۔ جامعہ عربیہ کے ساتھ ساتھ سرکاری سکول میں بھی ان کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد یہ کالج میں داخل ہوئے اور ایف اے پاس کیا۔

ایف اے پاس کرنے کے بعد باقاعدہ طور پر دینیات کی تعلیم شروع کر دی اور جامعہ عربیہ مرید کے میں حافظ فیاض احمد صاحب سے ترجمہ قرآن اور کتب احادیث کی تکمیل کی۔ استاذ مکرم حافظ صاحب ممدوح آج کل بھلوال (ضلع سرگودھا) کے کالج میں پروفیسر ہیں۔ جس زمانے میں مولانا محمد سلیم جامعہ عربیہ مرید کے میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، اس زمانے میں علامہ احسان الٰہی ظہیر، مولانا حبیب الرحمٰن یزدانی اور حافظ عبداللہ شیخوپوری کی خطابت کا بڑا شہرہ تھا، محمد سلیم بلوچ کو تقریر کا شوق تھا، چنانچہ انھوں نے بھی اس میدان میں اُترنے کا فیصلہ کیا۔ اتفاق سے انھی دنوں جامعہ عربیہ میں تقریری مقابلے کا انعقاد ہوا۔ اس میں انھوں نے بھی حصہ لیا اور اساتذہ نے ان کی تقریر کو پسند کیا، جس سے ان کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ یہ ۱۹۹۰ء کی بات ہے۔

حسن اتفاق سے ان کے گھر کے قریب ہی مسجد مقدس اہل حدیث تھی۔ یہ وہاں سیّد بارک اللہ شاہ کے

فرزند گرامی سیّد عبداللہ شاہ سے فاضل عربی کی تیاری کرنے لگے اور امتحان بھی دے دیا، پھر وہیں جمعۃ المبارک کا خطبہ دینا شروع کر دیا۔ اگست ۱۹۹۳ء میں ان کے والد صاحب کا تبادلہ مرید کے سے ان کے آبائی شہر شیخو پورہ میں ہو گیا۔

خطبہ جمعہ کا آغاز انھوں نے مرید کے میں ہی کر دیا تھا۔ پھر اگست ۱۹۹۳ء میں جب شیخو پورہ آئے تو ۱۹۹۴ء میں وہاں کی قدیم مسجد مبارک اہل حدیث واقع جنڈیالہ روڈ میں انھیں خطیب مقرر کر لیا گیا۔ ان سے قبل اس مسجد میں مولانا حافظ عبداللہ شیخو پوری اور مولانا محمد حسین فرائض خطابت انجام دیتے رہے تھے۔ لیکن ۱۹۹۴ء سے اب تک اس مسجد میں خطباتِ جمعہ کا فریضہ یہی مولانا محمد سلیم اعظم ادا کر رہے ہیں۔ اللہ کے فضل سے یہ اپنا کاروبار کرتے ہیں۔ مسجد کی انتظامیہ سے خطابت کا کوئی پیسا نہیں لیتے۔

مولانا محمد سلیم اعظم کھلے دل کے اہل علم ہیں۔ ان کے گھر میں کئی مرتبہ علمائے کرام کا اجتماع ہوا، جس میں شیخو پورہ شہر اور دیگر مختلف مقامات کے حضرات نے شرکت فرمائی۔ حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی کی کوشش سے شہر میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کی تنظیم سازی کے متعلق اجلاس انھی کے مکان پر منعقد ہوا تھا۔ یزدانی صاحب ان دنوں شیخو پورہ کی ایک مسجد میں خطیب تھے۔

ایک مرتبہ مولانا محمد سلیم کے ہاں میاں محمد جمیل صاحب تشریف لے گئے۔ ان کا مقصد ملک میں توحید کی دعوت عام کرنا اور لوگوں کو صراطِ مستقیم پر گامزن رہنے کی تلقین کرنا ہے۔ وہ کئی سال سے یہ خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ مولانا محمد سلیم اعظم کے ہاں تشریف لے جانے کا بھی یہی مقصد تھا۔ مولانا نے ان کا خیر مقدم کیا اور چالیس سے زائد علمائے کرام ان کے ہاں تشریف لائے، جن میں میاں محمد جمیل نے اپنی تحریک دعوت کی وضاحت کی اور سب نے اس دعوت کو ضروری سمجھا اور اسے پھیلانے کا عزم کیا۔

مولانا محمد سلیم نے آٹھ سال مولانا محمد حسین شیخو پوری کی خدمت میں گزارے اور سفر و حضر میں ان کے ساتھ رہے۔ ان کے اندازِ خطابت سے یہ بہت متاثر ہیں اور جس نہج سے وہ لوگوں کو دین حق کی تبلیغ کرتے تھے، وہ نہج لوگوں کے لیے بے حد فائدہ مند تھا۔ وہ دین اسلام کے مخلص ترین مبلغ اور بہترین داعی تھے۔ وہ حاضرین کے ذہن میں اُتر کر بات کرتے اور موثر ترین لہجے میں ان سے مخاطب ہوتے تھے۔

مولانا محمد سلیم اعظم نے ان سے بہت کچھ سیکھا اور ان کے طریق دعوت کو اپنے لیے نشانِ راہ بنایا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے خطباتِ جمعہ میں بے شمار لوگ دُور دُور سے آتے اور نہایت شوق سے کلمۂ حق سنتے ہیں۔ نوجوان بھی کثیر تعداد میں ان کے خطبوں میں حاضری دیتے ہیں۔

وہ مثبت انداز میں کتاب و سنت کی روشنی میں خطاب کرتے ہیں اور سامعین پورے غور سے ان کی بات

سنتے ہیں۔ ان کا دائرۂ دعوت وتبلیغ صرف شیخو پورہ اور ضلعے تک محدود نہیں، وہ پنجاب کے دُور دراز علاقوں میں جاتے اور آسان اور عام فہم الفاظ میں وعظ کرتے ہیں۔

بہت عرصہ پیشتر ان کے ددھیال اور ننھیال کے اکثر لوگ مسلک احناف سے وابستہ تھے، اب وہ سب لوگ اہل حدیثیت کے دائرے میں داخل ہو چکے ہیں اور جمعہ و جماعت انہی کی اقتدا میں ادا کرتے ہیں۔

مولانا محمد سلیم اعظم کو اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی کہ انھوں نے دو مرتبہ عمرہ ادا کیا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں یہ علم و عمل کا دلکش پیکر ہیں۔ عمدہ فضائل اور بہترین عادات کے مالک۔ ان سے بات ہوئی تو بولے:

''لوگ حق سنتے اور قبول کرتے ہیں۔ ضرورت مخلصانہ، جذبے اور دینی تڑپ کی ہے۔''

اپنے متعلق فرمایا:

''میں کوئی بہت بڑا مبلغ یا عالم دین نہیں ہوں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے خدمت دین کی وجہ سے علمائے حق کے خادموں کی صف میں شامل کر دیا ہے۔ یہ اس کا عظیم احسان ہے۔''

مولانا محمد سلیم اعظم کی شادی ۲۵۔ اکتوبر ۲۰۰۲ء کو کوئی۔ یہ سطور ۲۔ دسمبر ۲۰۱۳ء کو لکھی جا رہی ہیں۔ ان کی اولادِ نرینہ چار بیٹے ہیں۔ بڑے بیٹے کا نام ثمامہ، دوسرے کا عبدالحنان، تیسرے کا عبدالصبور اور چوتھے کا عبدالسلام ہے۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ مولانا محمد سلیم اعظم کو اپنے دین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کے مواقع عطا فرمائے اور ان کی اولاد اور تمام رشتے دار و متعلقین علم و عمل کی نعمت عظمیٰ سے بہرہ ور ہوں۔ آمین

(۳۔ دسمبر ۲۰۱۳ء)

قاری محمد صہیب احمد میر محمدی

(ولادت یکم نومبر ۱۹۷۵ء)

لمبا قد، کسرتی جسم، گورا رنگ، موٹی آنکھیں، سفید دانت، تیکھی ناک، باریک ہونٹ چوڑے شانے، کھلا ماتھا۔ مردانہ حسن کا دلکش نمونہ، لبوں پر مسکراہٹ کا غلبہ۔ خوش آواز اور خوش گفتار۔ صاف لہجہ، اخلاقِ حسنہ کی دولت سے مالا مال۔ مہمان نواز۔ جاذبِ نظر شخصیت کے مالک۔ شلوار قمیص میں ملبوس۔ سر پر چار خانہ قسم کا سرخ رنگ کا رومال۔ یہ ہیں قاری محمد صہیب احمد میر محمدی۔

یکم نومبر ۱۹۷۵ء کو موضع میر محمد ضلع قصور میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسم گرامی حافظ محمد عبداللہ تھا جو باعمل عالم اور تقویٰ شعار بزرگ تھے۔ یہ لوگ صدیوں سے اس گاؤں میں آباد ہیں اور راجپوت برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ شرافت و نجابت اور صاف ستھرے کردار کی وجہ سے نہ صرف اپنے علاقے میں بلکہ پورے پنجاب کے دینی حلقوں میں اللہ تعالیٰ نے ان کو تکریم کا مقام عطا فرمایا ہے۔

صہیب احمد نے ابتدائی قاعدہ والد گرامی سے پڑھا اور ناظرہ قرآن بھی گھر میں والدین سے پڑھا۔ والد چوں کہ حافظِ قرآن تھے، اس لیے لائق بیٹے کو بھی روزانہ کوئی نہ کوئی آیت یاد کرانے کی کوشش کرتے۔ مسجد میں نماز کے لیے جاتے تو انھیں ساتھ لے جاتے۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو مقامی سرکاری سکول میں داخل کرا دیے گئے اور ساتھ ہی حفظِ قرآن کا سلسلہ شروع کرا دیا گیا۔ اس وقت میر محمد کے مدرسے میں ایک بزرگ قاری محمد اسحاق بچوں کو قرآن حفظ کراتے تھے۔ صہیب احمد سکول کی تعلیم کے ساتھ ساتھ قاری محمد اسحاق سے قرآن حفظ کرنے لگے اور چند پارے حفظ بھی کر لیے۔

ان کے گاؤں میر محمد کے قریب قصبہ راجہ جنگ میں مدرسہ ضیاء السنہ جاری تھا، جس میں ایک معروف استاذ قاری محمد صدیق الحسن بچوں کو قرآن مجید حفظ کراتے تھے، صہیب احمد کے والد مکرم نے بیٹے کو اس مدرسے میں داخل کرا دیا۔ چند پارے وہاں یاد کیے۔ پھر واپس گاؤں آ گئے۔ وہاں کبھی والد صاحب سے اور کبھی قاری محمد اسحاق سے حفظ کا سلسلہ جاری رکھا۔ سکول کی تعلیم بھی ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ اس طرح گاؤں کے سکول میں پرائمری اور پھر مڈل پاس کیا۔

مڈل پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ ہائی سکول راؤ والا میں داخلہ لیا۔ سکول کی تعلیم کے ساتھ ساتھ روزانہ

قرآن مجید بھی حفظ کرتے رہے۔ اسی سکول سے میٹرک پاس کیا۔ پھر ڈگری کالج قصور میں داخل کرا دیے گئے۔ کالج کی تعلیم جاری تھی کہ ان کے بڑے بھائی قاری محمد ابراہیم صاحب مدینہ یونیورسٹی سے ایم فل کر کے واپس وطن آئے۔ گھر کے زیادہ تر افراد چاہتے تھے کہ کالج کی تعلیم جاری رہنی چاہیے لیکن قاری محمد ابراہیم صاحب اور والد گرامی نے کالج کی تعلیم ترک کر کے قرآن مجید حفظ کرنے اور دینی تعلیم حاصل کرنے پر اصرار کیا۔ چنانچہ کالج چھوڑ دیا گیا۔ اس وقت یہ ساڑھے بیس پارے حفظ کر چکے تھے۔ رمضان المبارک کی ۷ یا ۸ تاریخ تھی۔ رمضان کے بائیس دنوں میں انھوں نے قاری محمد ابراہیم صاحب سے قرآن مجید کے باقی دس پارے حفظ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن عید کے بعد حفظ کی تکمیل ہوئی اور شوال کے پہلے عشرے میں سادہ سی تقریب کی گئی۔

بعد ازاں حافظ عبدالرحمٰن مدنی صاحب کی جاری کردہ جامعہ رحمانیہ (جسے اب جامعہ لاہور الاسلامیہ کہا جاتا ہے) کے کلیۃ القرآن الکریم میں داخلہ لیا اور یہاں قاری محمد ابراہیم صاحب سے قراءات السبع اور قراءات العشر کی تکمیل کی۔ اسی جامعہ میں مروجہ دینی علوم پڑھے۔ اسی جامعہ میں ایف اے کیا۔ فاضل عربی کا امتحان بھی یہیں دیا اور بی اے بھی یہیں پاس کیا۔ اس طرح یہ تمام امتحانات اس وقت کی جامعہ رحمانیہ نیو گارڈن ٹاؤن بابر بلاک لاہور میں پاس کیے۔

قاری صہیب احمد صاحب نے جامعہ رحمانیہ (لاہور) میں مندرجہ ذیل اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔

۱۔ رانا طاہر محمود صاحب سے عمدۃ الاحکام

۲۔ ڈاکٹر حافظ محمد اسحاق زاہد سے مشکوۃ المصابیح

۳۔ شیخ محمد شفیق مدنی سے فقہ اور اصول فقہ

۴۔ قاری عبدالحلیم صاحب سے کتب صرف اور ابوداؤد

۵۔ شیخ عبدالرشید خلیق سے علم نحو اور عربی فاضل کی کتابیں

۶۔ مولانا محمد رمضان سلفی سے علم نحو، ترجمہ قرآن، صحیح مسلم

۷۔ حافظ عبدالرحمٰن مدنی صاحب سے ترجمہ قرآن اور صحیح بخاری کے چند ابواب

۸۔ حافظ مفتی ثناء اللہ مدنی سے علم المیراث اور صحیح بخاری

۹۔ مولانا عبدالسلام ملتانی سے جامع ترمذی

جامعہ رحمانیہ کے زمانۂ طالب علمی میں قاری صہیب احمد کے مشہور ہم جماعت تھے محمد اجمل بھٹی، مولانا محمد شفیع طاہر اور قاری سلمان احمد۔

اب سنیے قاری صہیب احمد صاحب کے مدینہ یونیورسٹی میں داخلے کی کیا صورت ہوئی؟

وہ جامعہ رحمانیہ کے نصاب کے مطابق آٹھویں سال میں تھے کہ مدینہ یونیورسٹی کے شیوخ کی سرپرستی میں ایک دورہ تدریبیہ منعقد ہوا، جس کا دورانیہ ایک مہینے کا تھا۔ اس کے اختتام پر امتحان ہوا تو قاری صہیب احمد کو ۹۸ فی صد نمبر ملے اور اللہ نے کرم فرمایا کہ اس امتحان کا نتیجہ ان کے مدینہ یونیورسٹی میں داخلے کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ یہ چار سال وہاں تعلیم حاصل کرتے رہے اور ممتاز پوزیشن میں کامیاب ہوئے۔ آخری سند مدینہ منورہ کے گورنر کے ہاتھوں وصول ہوئی۔

زمانۂ طالب علمی میں انھیں جو اعزازات ملے اس کی تفصیل درج ذیل ہے اور قابلِ رشک ہے۔

۱۔ گورنمنٹ ہائی سکول کی تعلیم کے دوران نویں جماعت کے مقابلۂ تلاوتِ قرآن میں پورے ضلع قصور میں اوّل پوزیشن حاصل کی۔

۲۔ متعدد تقریری مقابلوں میں متعدد انعامات حاصل کیے۔

۳۔ جامعہ رحمانیہ میں دورانِ طالب علمی کے آخری چار سال امامت کے فرائض سرانجام دیے۔

۴۔ آخری سال تجوید کی پوری جماعت کی تدریس ان کے سپرد رہی۔

۵۔ وقف القرآن، شاطبیہ، اصول، اطیب النشر چھ مہینے جامعہ میں پڑھاتے رہے۔

۶۔ جاوید غامدی کے قراءات قرآنیہ پر اعتراضات کے جواب میں ماہنامہ ''محدث'' (لاہور) میں تین قسطوں پر مشتمل مضمون لکھا۔

۷۔ مدینہ یونیورسٹی کی جامع مسجد میں دو سال امامت کرائی۔

۸۔ تین سال تک سعودی ریڈیو میں قراءاتِ سبعہ کے حلقات کی ریکارڈنگ کرائی۔

۹۔ مدینہ یونیورسٹی کی جانب سے رمضان اور حج کے مواقع پر پاکستانی حضرات کو درس دیتے رہے۔

۱۰۔ طلباء میں تلاوت وفہم قرآن کا ذوق پیدا کرنے کے لیے ہر ہفتے بزمِ ادب کے انعقاد کا اہتمام کیا اور مختلف مقامات میں رمضان المبارک میں نمازِ تراویح اور شبینوں میں شرکت کی۔

۱۱۔ لاہور کی بادشاہی مسجد کے شبینے میں شمولیت کی۔

۱۲۔ مدینہ یونیورسٹی کی طرف سے سعودی حکومت کے دار الحکومت ریاض میں سیرۃ النبی (ﷺ) کے موضوع پر لیکچر دیے اور ترجمہ قرآن کی ریکارڈنگ کرائی۔

۱۳۔ مدینہ یونیورسٹی کے زمانۂ طالب علمی میں نمازِ تراویح میں پہلا پورا قرآن مجید جامع مسجد احد میں، پھر مدینہ یونیورسٹی کی جامع مسجد میں اور آخری سال ریاض کی جامع الفاروق میں سنانے کی سعادت حاصل

ہوئی۔ جامع ابن باز میں فریضہ امامت انجام دیا۔

حفظ قرآن کے زمانے میں اللہ کے فضل سے قاری صہیب احمد صاحب کی قوتِ حافظ کا یہ عالم تھا کہ سورہ مریم، سورہ طٰہ، سورہ کہف، سورہ بنی اسرائیل، سورۂ نحل ایک ایک دن میں یاد کر لیں۔ یعنی یہ پانچ سورتیں پانچ دن میں حفظ کر لی گئیں اور بہت سی احادیث درس کی تیاری کے سلسلے میں زبانی یاد کیں۔ ہر درس میں بیس بائیس حدیثیں پڑھتے تھے۔ اس طرح اب تک پانچ ہزار سے زیادہ حدیثیں ان کے سینے میں محفوظ ہوگئی ہیں۔ ماشاء اللہ۔

اب آیئے قاری صہیب احمد صاحب کی خدمتِ تدریس کی طرف!

مدینہ یونیورسٹی سے فراغت کے بعد وہ پاکستان تشریف لے آئے اور ابھی درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا ہی تھا کہ ریاض کے اہل علم کے شدید اصرار پر واپس چلے گئے۔ وہاں امامت اور حلقاتِ قرآنیہ کے قیام کی ذمہ داری سنبھالی اور علوم شرعیہ کے درس و تدریس میں مشغول ہوگئے۔ شیخ ابن باز کے سیکرٹری کے اصرار پر تدریس کے علاوہ جامع ابن باز کی نیابت امامت کا فریضہ بھی سرانجام دینے لگے۔

بعد ازاں پھر پاکستان آگئے۔ اس زمانے میں مشہور عالم دین حافظ محمد یحیٰی میر محمدی (جو ان کے ماموں تھے اور جن کا تذکرہ اس کتاب میں موجود ہے) دعوت و تبلیغ میں مصروف تھے اور ان کا طریق دعوت لوگوں کے لیے بڑی جاذبیت کا باعث تھا۔ انھوں نے ان کو واجعل لی وزیرا من اھلی کی دعا کے ساتھ پاکستان آنے اور مرکز ادارۃ الاصلاح (بنگا بلوچاں) کا کام سنبھالنے کا حکم دیا۔

چنانچہ انھوں نے اور ان کے بڑے بھائی قاری محمد ابراہیم میر محمدی نے ان کے حکم کی تعمیل کی اور مرکز میں خدمات سرانجام دینے لگے۔

قاری محمد ابراہیم اور قاری صہیب احمد نے یہاں کلیۃ القرآن الکریم و التربیۃ الاسلامیہ کے نام سے ادارہ قائم کیا اور منصوبہ یہ بنایا کہ اس ادارے کا فارغ التحصیل بہ یک وقت عالم دین بھی ہو اور بہت اچھا قاری بھی ہو۔

جب اس منصوبے کے تحت انھوں نے مرکز میں تدریس کا آغاز کیا تو صرف دو طالب علم اس میں داخل تھے۔ اس پر بہت سے لوگ ان کا مذاق اڑاتے تھے اور کہا جاتا تھا کہ ان دو بچوں کے لیے مکہ اور مدینہ کی سکونت ترک کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہیں رہتے پیسے بھی کماتے اور مقدس مقامات میں لوگوں کو تعلیم بھی دیتے۔ لیکن اللہ کی رحمت کا دائرہ لامتناہی ہے۔ وہ اپنے دین کو دنیا میں پھیلانے کے لیے ایسے اسباب پیدا کر دیتا ہے کہ جن کا انسان کو تصور بھی نہیں ہوتا۔

ابتدا میں قاری صہیب احمد نماز کے بعد خود ہی قرآن کے درس کا اہتمام کرتے، تدریس کے لیے کتابیں بھی خود ہی لاتے اور مدرسے کے دیگر چھوٹے موٹے کام بھی خود ہی انجام دیتے۔ پھر حالات نے کروٹ لی۔ پہلے قاری محمد شفیق صاحب کی خدمات حاصل کی گئیں۔ وہ بچوں کو قرآن مجید حفظ کراتے تھے۔ پھر قاری سلمان احمد صاحب اور پھر قاری محمد ابراہیم صاحب نے درس و تدریس اور قراءات و تجوید کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ رفتہ رفتہ معاملہ آگے بڑھتا گیا اور کام کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ اس طرح حافظ محمد یحییٰ عزیز میر محمدی کے ولی ارادوں کی تکمیل ہونے لگی۔ اب اللہ کی مہربانی سے وہاں پانچ سو سے زیادہ طالب علم تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ شعبہ حفظ قرآن بھی ہے، قراءات سبعہ اور قراءات عشرہ کا انتظام بھی ہے۔ وفاق المدارس السّلفیہ کے مطابق درس نظامی کی تعلیم دی جاتی ہے اور اس کے باقاعدہ امتحانات ہوتے ہیں۔ بچیوں کی تعلیم کا انتظام بھی ہے۔ کھلی فضا اور صحت افزا مقام میں یہ دارالعلوم جاری ہے۔ بہترین دارالاقامہ ہے۔ پچیس چھبیس اساتذہ تعلیم دے رہے ہیں۔ بچیوں کو پڑھانے کے لیے الگ استانیوں کا انتظام ہے۔ نماز کے لیے وسیع مسجد دارالعلوم سے الگ ہے۔ ''الاحیاء'' کے نام سے قاری محمد ابراہیم اور قاری صہیب احمد کی نگرانی میں ماہانہ رسالہ شائع ہوتا ہے۔ اس کی ادارت کے فرائض نوجوان عالم سید محمد علی انجام دیتے ہیں اور مرکز میں تدریس بھی کرتے ہیں۔ یہ خالص علمی اور تحقیقی ماہنامہ ہے۔ کمپوزنگ کاغذ اور طباعت وغیرہ شان دار۔ اس ماہنامے کا مطالعہ اہل علم کو ضرور کرنا چاہیے۔ اس رسالے کی ادارت پر یہ فقیر سیّد محمد علی صاحب کو مبارک باد پیش کرتا ہے۔

یہاں یہ یاد رہے کہ تجوید کے ساتھ قرآن پڑھانے کا سلسلہ اہل حدیث میں سب سے پہلے مولانا سید داؤد غزنوی نے ۱۹۳۰ء میں لاہور کی مسجد چینیاں والی میں شروع کیا تھا۔ اس کے لیے انھوں نے استاذ القراء قاری عبدالکریم صاحب مرحوم کی خدمات حاصل کی تھیں۔ وہ طویل عرصے تک اس مسجد میں شائقین کو اس بابرکت فن کے ساتھ قرآن پڑھاتے اور حفظ کراتے رہے۔ اس کے بعد اس پاکیزہ فن کے حصول کی ایسی خوش کن لہر چلی کہ اس کے لیے ادارے جاری ہوئے اور بے شمار بلند بخت لوگوں نے یہ فن پڑھا اور اس میں مہارت حاصل کی۔ اس موضوع پر کتابیں بھی لکھیں اور پاکستان سے باہر اہل حدیث قاریوں نے بین الاقوامی مقابلوں میں شرکت کی اور انعامات کے مستحق گردانے گئے۔ اس موقعے پر اس کی تفصیل میں جانا مقصود نہیں، صرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔

لاہور میں قاری محمد ادریس عاصم کا ایک بہت بڑا مدرسہ ہے جس میں فنِ تجوید و قراءات کی تعلیم دی جاتی ہے، وہ اس موضوع کی تقریباً دو درجن کتابوں کے مصنف و مترجم ہیں اور ان کے شاگرد کئی ملکوں میں یہ

پاکیزہ تعلیم دے رہے ہیں۔ ان کے صاحب زادے عزیز القدر قاری ابوبکر کو بھی اللہ تعالیٰ نے یہ علم عطا فرمایا ہے اور وہ والد مکرم کے ساتھ ہی طلبا کو اس کی تعلیم دیتے ہیں۔

حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی کے فرزند گرامی قاری محمود الحسن بڈھیمالوی اور ان کے نواسے قاری نوید الحسن لکھوی کا شمار بھی اس فن کے خوش نصیب ماہرین میں ہوتا ہے۔ بہرکیف پاکستان اور ہندوستان میں اہل حدیث قراء کرام کی بہت بڑی تعداد اللہ کی مہربانی سے موجود ہے اور وہ بے شمار مقامات میں اس علم کی تعلیم سے طلباء کو بہرہ مند کر رہے ہیں۔

کئی سال ہوئے جامعہ سلفیہ فیصل آباد میں مصر سے چند قاری حضرات کو تشریف لانے کی دعوت دی گئی تھی، وہیں پہلی دفعہ اس فقیر کو قاری صہیب احمد صاحب سے قرآن مجید سننے کی سعادت حاصل ہوئی۔ یہ روح پرور محفل نمازِ عشا کے بعد شروع ہوئی تھی۔ قاری صہیب احمد نے خالص عربی لہجے میں مصری قاریوں کا تعارف کرایا اور ہر قاری صاحب کو تلاوت کی دعوت دی۔ خود بھی سامعین کو قرآن مجید سنایا۔ اس مجلس میں قاری نوید الحسن لکھوی بھی تشریف فرما تھے۔ انھوں نے بھی تلاوت کی۔ یہ مبارک مجلس رات گئے تک جاری رہی اور سامعین پر وجد کی سی کیفیت طاری رہی۔

قرآن مجید وہ افشردۂ نور اور کتابِ ہدیٰ ہے، جس کا محض پڑھ لینا اور سن لینا ہی باعث برکت اور ذریعہ ثواب ہے، اور کوئی شخص اگر اس کے معانی ومطالب سے آگاہ ہے تو وہ انتہائی خوش نصیب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قاری صہیب احمد کو اس کے پڑھنے، پڑھانے اور سنانے کی توفیق بخشی۔ جزاہم اللہ خیر الجزا

ان کے قائم کردہ ادارے بنگا بلوچاں میں داخلے کے لیے ایسی شرائط عائد کی گئی ہیں جو خاص امتیاز اور انفرادیت رکھتی ہیں، مثلاً نماز اشراق پڑھنا، چاشت اور تہجد کا اہتمام کرنا۔

پاکستان میں یہ پہلا ادارہ ہے جس میں طالبات کو قراءاتِ عشرہ کی تکمیل کرائی جاتی ہے۔ اس ادارے سے اب تک سیکڑوں طلبا فن تجوید سے بہرہ مند ہو چکے ہیں۔

قاری صہیب احمد صاحب نے حسب ذیل سندات حاصل کیں:

☆......شہادت حفظ قرآن الکریم

☆......شہادت تجوید القرآن الکریم

☆......شہادت قراءات العشر المتواترہ

☆......اجازۃ القراءات العشر المتواتر

☆......شہادت علوم الشرعیہ

☆......شہادت العالیہ فی العلوم الشرعیہ

☆...... الاجازۃ العالیہ فی کلیۃ القرآن الکریم و الدراسات الاسلامیہ بالجامعہ الاسلامیہ مدینہ منورہ سال ۱۴۲۰ھ-۱۹۹۹ء

☆......شہادۃ الطالب المثالی فی کلیۃ القرآن الکریم والدراسات الاسلامیہ بالجامعۃ الاسلامیہ بالمدینۃ المنورہ سال ۱۴۲۰ھ-۱۹۹۹ء

موجودہ مناصب یہ ہیں:

☆......ڈائریکٹر کلیۃ القرآن الکریم والتربیۃ الاسلامیہ بنگا بلوچاں، پھول نگر ضلع قصور

☆......جنرل سیکرٹری ادارۃ الاصلاح ٹرسٹ پاکستان

☆......نگران جمعیت تحفیظ القرآن الکریم والحدیث الشریف پاکستان

قاری صاحب کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:

☆...... نخبة الصحیحین: ابتدائی درجوں کے طلبا کے لیے ۱۰۰ حدیثوں کا انتخاب

☆......مومن کی زینت داڑھی: نام سے اس کا مطلب ظاہر ہے۔

☆...... عورت کا زیور پردہ: اس کے مندرجات کا علم نام سے ہو جاتا ہے۔

☆......مومن کی نماز: اس کا مطلب بھی واضح ہے۔

☆......قرآن مجید کے حقوق

☆......آپ عمرہ اور حج کیسے کریں؟

یہ کتابیں ادارۃ الاصلاح ٹرسٹ پاکستان، البدر (بنگا بلوچاں) پھول نگر ضلع قصور کی طرف سے شائع کی گئی ہیں۔

☆......الذکر واثرہ فی حیاۃ الفرد والمجتمع ۔عربی زیر طبع

☆......المرشد الوجیز فی علم التجوید: اردو۔زیر طبع

☆......الھمزۃ و وجودھا فی القرآن و اثرھا فی الاداء: اردو زیر طبع

☆......جبیرۃ الجراحات فی حجیۃ القراء ات: عربی، زیر طبع

☆......تربیۃ الاولاد من خلال وصایا لقمان: عربی، زیر طبع

قاری صہیب احمد صاحب کی چند مزید خدمات ملاحظہ ہوں۔

نہایت مسرت کی بات ہے کہ اس مرکز میں بہ یک وقت کئی کام ہو رہے ہیں، تدریسی بھی، تصنیفی بھی،

حفظِ قرآن اور تجوید کا بھی، تبلیغ کا بھی۔

☆......سعودی عرب میں قیام کے دوران انھوں نے ٹی وی پروگرام کیے۔

☆......مکتب الدعوہ ریاض نے ان سے پورا قرآن مجید مع اردو ترجمہ ریکارڈ کرایا۔

☆......تسجیلات الخالی الاسلامیہ مدینہ منورہ نے مکمل قرآن ریکارڈ کرایا۔

یہ بہت بڑا اعزاز ہے جو دیارِ مقدس میں اللہ نے ان کو عطا فرمایا۔

علاوہ ازیں کئی مرتبہ انھیں کویت کی وزارۃ الاوقاف والشئون الاسلامیہ کی طرف سے نمازِ تراویح اور قیام اللیل پڑھانے کے لیے بلایا گیا۔

کافی عرصے سے یہ پاکستان کے ٹی وی چینل ''پیغام'' میں اخلاقیات کے سلسلے میں پروگرام کر رہے ہیں جو اپنے انداز کا ایک اہم پروگرام ہے۔ اسی چینل سے تجوید قرآن کا پروگرام شروع کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے، جس کی ریکارڈنگ ہو رہی ہے۔ یہ قاری صاحب ممدوح کا ایک منفرد نوعیت کا پروگرام ہوگا۔

قاری صاحب سے دینی کتابوں کی نشر و اشاعت کے مشہور عالمی ادارے ''دارالسلام'' نے پورے قرآن مجید کی ریکارڈنگ کرائی۔ لغت عربی کے سلسلے میں بھی بعض اہم چیزیں ان سے اس ادارے نے ریکارڈ کرائیں۔

بلاشبہ قاری صاحب ممدوح کا شمار فنِ تجوید کے ممتاز علماء اور زبانِ عربی کے نامور اساتذہ میں ہوتا ہے۔ عربی بولتے ہیں تو خالص عرب ہونے کا گمان گزرتا ہے۔ قرآن مجید کے سلسلے میں انھوں نے جو خدمات سر انجام دی ہیں اور دے رہے ہیں، وہ بے حد اہمیت رکھتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی اور ان کے بڑے بھائی قاری محمد ابراہیم صاحب اور چھوٹے بھائی قاری سلمان احمد کی اور ان کے رفقائے کار و معاونین کی خدمات کو شرف قبولیت سے نوازے اور ان کی علمی اور تدریسی سرگرمیوں میں مزید اضافہ فرمائے۔ اس فقیر کو ان کے تدریسی مرکز میں کئی دفعہ حاضری کا موقع ملا اور دیکھا کہ بہترین انداز سے بہترین کام ہو رہا ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ اس میں زیادہ سے زیادہ برکت پیدا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

(یہ سطور ۱۸۔ جون ۲۰۱۳ء کو سپردِ قلم کی گئیں)

مولانا محمد ارشد کمال

(ولادت ۱۶-نومبر ۱۹۷۹ء)

میانہ قد، نکھرا ہوا گندمی رنگ، مناسب نقش و نگار، خوب رو، خوش مزاج، منکسر و متواضع، کم گو، شلوار قمیص میں ملبوس، صحت مند، کھلی پیشانی، حلیم الطبع۔ یہ ہیں مولانا محمد ارشد کمال۔ اب ملاحظہ ہوں ان کے متعلق چند باتیں۔

تقسیم ملک کے زمانے میں جو ہنگامے ابھرے اور افراتفری پھیلی اس کے نتیجے میں جو لوگ مشرقی پنجاب سے پاکستان آئے، ان میں محمد ارشد کمال کا خاندان بھی شامل تھا۔ یہ لوگ گجر برادری سے تعلق رکھتے ہیں اور ضلع ہوشیار پور کی تحصیل شکر گڑھ کے ایک گاؤں آسروں کے رہنے والے تھے۔ پاکستان آ کر یہ خاندان ضلع قصور کی تحصیل چونیاں کے چک ۱۸ میں آباد ہوا۔ اسی گاؤں میں ۱۶-نومبر ۱۹۷۹ء کو محمد ارشد کی ولادت ہوئی۔ ان کے والد کا نام شیر محمد اور دادا کا رحیم بخش تھا۔

محمد ارشد ۱۹۸۷ء میں چک ۱۸ کے گورنمنٹ مڈل سکول میں داخل ہوئے اور پرائمری تک تعلیم حاصل کی۔ اس اثنا میں قرآن مجید بھی پڑھ لیا۔ گاؤں کی مسجد میں قاری محمد رفیق سے دوبارہ قرآن مجید پڑھا۔

اس کے بعد ۹-مئی ۱۹۹۶ء کو انھیں رینالہ خورد (ضلع اوکاڑہ) کی جامعہ ابو ہریرہ میں داخل کرا دیا گیا جہاں استادِ پنجاب حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کے صاحب زادۂ گرامی حافظ شفیق الرحمٰن لکھوی اور دیگر اساتذہ کرام فرائض تدریس انجام دیتے تھے۔ وہاں انھوں نے علم صرف کی ابتدائی کتابیں مولانا محمد طفیل اختر آبادی سے پڑھیں اور بلوغ المرام، مشکوٰۃ المصابیح، علم الصیغہ، نحو میر اور صرف میر حافظ شفیق الرحمٰن لکھوی سے پڑھیں۔ قرآن مجید کے ابتدائی آٹھ پاروں کا ترجمہ بھی ان سے پڑھا۔

نویں پارے سے تیسویں پارے تک قرآن مجید کا ترجمہ مولانا عبداللہ فاروق سے پڑھا۔ سنن نسائی بھی انھی سے پڑھی۔

مقامات حریری مولانا اللہ نواز سے اور فقہ کی قدوری اور ہدایہ مولانا محمد زمان نورستانی سے پڑھنے کا موقع ملا۔ مولانا خلیق الرحمٰن لکھوی، مولانا حفیظ الرحمٰن لکھوی اور مولانا سعید الرحمٰن لکھوی سے بھی بعض کتابیں پڑھیں۔ یہ تمام کتابیں مئی ۱۹۹۶ء سے ۲۰۰۱ء تک پانچ سال میں پڑھیں۔

جنوری ۲۰۰۱ء میں جامعہ لاہور الاسلامیہ گارڈن ٹاؤن میں داخلہ لیا۔ وہاں جامع ترمذی کا درس مولانا محمد رمضان سلفی سے لیا اور بعض دیگر درسی کتابوں کے لیے مولانا عبدالرشید راشد، مولانا شفیق الرحمٰن مدنی اور دوسرے قابل احترام اساتذہ کے حضور زانوے شاگردی تہہ کیے۔

دسمبر ۲۰۰۲ء میں جامعہ محمدیہ لوکو ورکشاپ (لاہور) چلے گئے۔ وہاں مولانا حافظ عبداللہ رفیق سے صحیح بخاری اور قاری جاوید انور صدیقی سے صحیح مسلم پڑھیں۔ اسی درس گاہ میں مولانا خاور رشید بٹ، مولانا عطاء الرحمٰن علوی، مولانا یحییٰ عارفی اور دیگر اساتذہ سے استفادہ کیا اور ۹۔ اکتوبر ۲۰۰۳ء کو یہیں سے سند فراغ لی۔

فراغت کے بعد جامع مسجد اہل حدیث کی دھوپ سڑی لاہور میں دو سال خطابت کا سلسلہ جاری رہا۔ چھے سال مرکز محمد بن اسماعیل بخاری (گندھیاں اوتاڑ ضلع قصور) میں فریضہ خطابت انجام دیا۔ اکتوبر ۲۰۰۹ء سے جامع مسجد الکوثر گلبرگ لاہور میں خطیب ہیں اور دسمبر ۲۰۱۴ء سے جامع مسجد ابوبکر صدیق اہل حدیث سکیم موڑ میں امامت کی ذمہ داری نبھا رہے ہیں۔ بعض مقامات میں تدریس کا سلسلہ بھی جاری ہے۔

مولانا محمد ارشد کمال تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اب تک انھوں نے مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف کیں۔

(۱) عذاب (۲) المسند فی عذاب القبر (۳) گناہوں کو مٹانے والے اعمال (۴) نیکیوں کو برباد کرنے والے اعمال (۵) سیدنا ثعلبہ بن حاطب (۶) تحفۂ مسلم (۷) تحفۃ السائلین (۸) اسلامی مہینے اور ان کا تعارف (۹) استقامتِ دین (۱۰) حاضری نماز (۱۱) تخریج احادیث مشکوٰۃ المصابیح (۱۲) ہفتے کے دن اور ان کا تعارف

مولانا محمد ارشد کمال باہمت عالم ہیں اور کسی نہ کسی تصنیفی کام میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ سطور ۳۰ نومبر ۲۰۱۲ء کو لکھی جا رہی ہیں اور اب تک ان کی مذکورہ بالا بارہ کتابیں معرضِ تصنیف میں آ چکی ہیں۔ مختلف موضوعات پر جماعتی اخبارات میں ان کے مضامین بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔

(۳۰۔ نومبر ۲۰۱۳)

حافظ ریاض احمد عاقب اثری

(ولادت یکم مئی ۱۹۸۲ء)

چھریرا بدن، سرخی مائل رنگ، مناسب خدوخال، نرم کلام، خوش مزاج، خوش اخلاق، مہمان نواز، صاف ستھرے لباس میں ملبوس، باذوق اہلِ علم، تحریر و نگارش کے دلدادہ، علما کے قدردان اور ان سے استفادے کے خواہاں۔ یہ ہیں حافظ ریاض احمد عاقب اثری جو یکم مئی ۱۹۸۲ء (۷ رجب ۱۴۰۲ھ) کو چک ۲۵۵/b.w تحصیل دنیاپور ضلع لودھراں میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسم گرامی چودھری محمد یوسف ہے اور جاٹوں کی چھٹہ برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔

ریاض احمد ۱۹۸۸ء میں چھے برس کے ہوئے تو پرائمری سکول میں داخل کرا دیے گئے۔ سکول کی تعلیم کے ساتھ قرآن مجید بھی پڑھتے رہے۔ پرائمری پاس کرنے کے ساتھ ہی قرآن مجید ناظرہ پڑھ لیا۔ اب سکول کی تعلیم ختم ہوئی اور والدہ کی خواہش کے مطابق گاؤں کی مسجد میں قاری عبدالستار سے قرآن مجید حفظ کرنے لگے۔ گاؤں میں چوں کہ حفظ کا باقاعدہ مدرسہ نہ تھا، اس لیے وہاں سے نکلے اور مختلف مدارس میں پہنچے۔ اللہ تعالیٰ نے کرم فرمایا اور قرآن مجید حفظ کر لیا۔ حفظ قرآن کا یہ مرحلہ ۱۹۹۳ء سے ۱۹۹۵ء تک دو سال میں طے ہوا۔ پھر اسی سال گاؤں کی مسجد میں نماز تراویح میں قرآن مجید سنا بھی دیا۔ اس طرح حفاظ کی اصطلاح میں پہلا مصلیٰ (یا مصلاً) انھوں نے تیرہ سال کی عمر میں سنایا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ ماشاء اللہ باقاعدگی سے جاری ہے۔

اب درس نظامی کے مطابق ان کی تحصیل علم کا آغاز ہوتا ہے۔

۱۹۹۶ء میں اپنے پھوپھی زاد بھائی محمد ادریس گل کے کہنے سے (جو اس وقت تھانہ بہاء الدین زکریا ملتان کے ایس ایچ او تھے) مرکز ابن القاسم الاسلامی ملتان میں داخلہ لیا۔ ۲۰۰۲ء تک اس درس گاہ میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ یہاں انھوں نے حسب ذیل اساتذہ کرام سے استفادہ کیا۔

۱- مولانا عبدالبصیر کدنوی سے مشکوٰۃ جلد اول اور صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں پڑھیں

۲- مولانا عطاء اللہ جدانی سے صرف و نحو اور بعض دیگر کتابوں کی تحصیل کے علاوہ ترجمۂ قرآن مجید پڑھا۔

۳- مولانا عبداللہ بھٹوی سے مشکوٰۃ المصابیح جلد ثانی، علم صرف کی فصول اکبری اور بعض دیگر درسی کتابیں پڑھیں۔

۴- حافظ محمد رفیق یوسف مدنی سے بلوغ المرام، ابن ماجہ اور سننِ نسائی کا درس لیا۔

۵- مولانا مفتی محمد بن عبداللہ شجاع آبادی سے کتب حدیث میں سے جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، صحیح مسلم، صحیح بخاری کی تکمیل کی۔ ان کتابوں کے علاوہ حجۃ اللہ البالغہ، تفسیر نیل المرام، عقیدہ طحاویہ اور تیسیر المنطق بھی انہی سے پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

۶- مولانا مفتی اللہ بخش ملتانی سے حافظ ریاض احمد عاقب نے صحیح بخاری جلد اول، تفسیر بیضاوی، الہدایہ، سراجی، اصول شاشی اور چند دوسری درسی کتابیں پڑھیں۔

ان کے مندرجہ بالا تمام اساتذہ کو درس و تدریس میں مہارت حاصل ہے اور طلبا ان کے اندازِ تعلیم سے بہت متاثر ہیں۔

حافظ ریاض احمد تحصیل علم میں تیز تھے۔ مرکز ابن القاسم الاسلامی میں تعلیم کے دوران میں انھوں نے ملتان بورڈ سے میٹرک اور ایف اے کے امتحان بھی دیے اور فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوئے۔ مرکز ابن القاسم سے فراغت کے بعد وفاق المدارس السّلفیہ کی طرف سے درجہ عالیہ و عالمیہ کے امتحان میں پورے پاکستان میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔

اب آگے چلیے!

۲۰۰۱ء (۱۴۲۲ھ) کو جامعہ سلفیہ دعوۃ الحق کوئٹہ میں مدینہ یونیورسٹی کی طرف سے دورۂ عربیہ ثقافیہ کا انعقاد ہوا تو حافظ ریاض احمد نے اس میں شرکت کی اور ممتاز محقق و مصنف ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی (سابق چیئرمین شعبہ حدیث جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ) سے حدیث، شیخ عبداللہ الشمسان سے عقیدہ اور شیخ غازی عبداللہ سے تفسیر کے اسباق پڑھے۔

۲۰۰۲ء میں ڈاکٹر حافظ عبدالکریم (ناظم اعلیٰ مرکزی جمعیت اہل حدیث) نے اپنے قائم کردہ مرکز المودّہ ڈیرہ غازی خاں میں عربی زبان و ادب کے موضوع پر مسابقہ کرایا اور اس میں کامیاب ہونے والوں کو عمرے کا ٹکٹ دیا گیا، ان میں حافظ ریاض احمد کا نام بھی آیا اور یہ اس ٹکٹ پر ۲۰۰۲ء میں عمرے کی سعادت سے بہرہ مند ہوئے۔ ان دنوں مکہ مکرمہ میں جن حضرات کے حلقہ ہائے دروس سے انھیں استفادے کا موقع ملا، ان کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں۔

۱- شیخ صالح فوزان الفوزان (رکن ہیئت کبار علما)
۲- شیخ محمد صالح الحمید (امام مسجد الحرام و چیئرمین امور حرم مکی)
۳- شیخ قاری سعود الشریم (امام مسجد الحرام و قاضی مکہ مکرمہ)
۴- شیخ قاری عبدالرحمٰن السدیس (امام کعبہ و استاذ جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ)

۵- جامعہ مسجد ملک عبدالعزیز میں شیخ عبداللہ الجبرین کے دورۂ تدریسیہ میں شرکت کی اور مستفید ہوئے۔

یہ مرحلہ طے کرنے کے بعد ۲۰۰۲ء میں فیصل آباد کے مرکز التربیۃ الاسلامیہ میں داخلہ لیا اور تین سال میں دورۂ تخصص کیا۔ وہاں مندرجہ تحت اساتذہ سے اخذ فیض کیا:

۱- مولانا ارشاد الحق اثری (خطیب جامع مسجد مبارک فیصل آباد)

۲- حافظ مسعود عالم (استاذ جامعہ سلفیہ فیصل آباد)

۳- حافظ محمد شریف (استاذ و بانی مرکز التربیہ الاسلامیہ فیصل آباد)

۴- پروفیسر عبدالرزاق ساجد

۵- شیخ عبدالجبار سلفی

اسی اثنا میں بہاء الدین زکریا یونیورسٹی (ملتان) میں بی اے کا امتحان دیا اور امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوئے۔

مرکز التربیۃ الاسلامیہ کی تعلیم کے دوران ہی میں ۲۰۰۳ء کو مرکز کے طلبا کے ہم راہ جامعہ محمدیہ (گوجراں والا) جا کر الشہادۃ العالیہ کا امتحان دیا اور اس میں کامیابی حاصل کی۔ وہاں حضرت حافظ عبدالمنان نور پوری سے استفادہ کیا اور اجازۂ حدیث لیا۔

مذکورہ بالا اساتذہ کے علاوہ حافظ ریاض احمد عاقب نے حافظ مفتی ثناء اللہ مدنی، مولانا محمد رفیق اثری، مولانا حافظ عبدالعزیز علوی، مولانا حافظ ثناء اللہ زاہدی اور مرحوم و مغفور ڈاکٹر حافظ عبدالرشید اظہر سے بھی صحیح بخاری کے بعض اجزا پڑھ کر سنداتِ حدیث حاصل کیں۔ اسی طرح مولانا شمس الحق ملتانی سے صحیح بخاری کی آخری حدیث پڑھ کر ان کے تلامذہ میں شمار ہوئے۔

ہندوستان کے مولانا محمد اسرائیل سلفی ندوی اور مولانا محمد اعظمی سلفی سے مکاتبتاً اجازۂ حدیث حاصل کیا۔ ان دونوں علمائے کرام اور حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے درمیان صرف ایک واسطہ ہے۔ اس طرح حافظ ریاض احمد عاقب اثری اور حضرت میاں صاحب کے درمیان دو واسطے ہوئے اور موجودہ دور میں ان کی سند عالی قرار پائی۔

تعلیم کی ان منزلوں سے گزرنے کے بعد ۲۰۰۵ء میں حافظ ریاض احمد مرکز ابن القاسم الاسلامی ملتان کی مسند تدریس پر متمکن ہوئے اور درج ذیل کتابوں کی تدریس ان کے ذمے ہوئی۔

بلوغ المرام، سنن نسائی، جامع ترمذی، سنن ابی داود، تفسیر نیل المرام، تفسیر سعدی، بدایۃ المجتہد، سراجی، عقیدہ واسطیہ، البلاغۃ الواضحہ، حجۃ اللہ البالغہ، فقہ السنہ، اصول شاشی، عمدۃ الاحکام، ہدایۃ النحو، تیسیر مصطلح

الحدیث، شرح نخبۃ الفکر اور بعض دیگر کتابیں۔

ان کتابوں میں ہر موضوع کی کتابیں شامل ہیں، تفسیر بھی، حدیث بھی، اصولِ حدیث بھی، فقہ بھی، اصول فقہ بھی، میراث بھی، علم نحو بھی، ادب بھی، بلاغت بھی، عقیدہ بھی۔ اندازہ فرمایئے کہ یہ کتنی اہم بات ہے کہ درس نظامیہ کا مدرس ہر موضوع کی کتاب پڑھاتا ہے اور پڑھانے سے پہلے رات کو ان سب موضوعات کی کتابوں کا باقاعدہ مطالعہ کرتا ہے۔ وہ فجر کی نماز کے بعد پڑھانا شروع کر دیتا ہے اور ظہر تک باقاعدہ پڑھاتا ہے۔ پھر نماز ظہر کے بعد عصر کی نماز تک یہ سلسلہ چلتا ہے۔

اب کے برعکس سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے پروفیسروں کی خدمتِ تدریس پر غور کیجیے۔ ایک پروفیسر صرف ایک مضمون پڑھاتا ہے۔ ہر ہر موضوع کے الگ الگ پروفیسرز ہیں۔ اردو پڑھانے والا الگ ہے، فارسی پڑھانے والا الگ ہے۔ انگریزی پڑھانے والا الگ ہے۔ پھر دونوں قسم کے استادوں کی تنخواہوں پر غور کیجیے۔ صرف ایک مضمون پڑھانے والا کالج اور یونیورسٹی کا پروفیسر پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ ہزار روپے بلکہ بعض استاد ایک ایک لاکھ روپے سے بھی زیادہ تنخواہ لیتے ہیں، لیکن درس نظامیہ کے اس قدر لائق اور محنتی استاذ کو زیادہ سے زیادہ آٹھ یا دس ہزار روپے دیے جاتے ہیں۔ پھر مدرسوں کی انتظامیہ کے بعض جاہل اور نالائق ارکان جب جی چاہے اسے ملازمت سے الگ کر دیتے ہیں اور ارشاد ہوتا ہے کہ کل سے تمہاری ملازمت ختم جب کہ سکول، کالج اور یونیورسٹی کے کسی استاذ کو اس طرح ملازمت سے سبک دوش نہیں کیا جا سکتا۔

بات حافظ ریاض احمد عاقب کی تدریس کے بارے میں ہو رہی تھی۔ وہ اور ان کے ساتھی اساتذہ محنت اور دلجمعی سے پڑھاتے ہیں اور ہر موضوع کی کتابیں پوری ذمے داری سے پڑھاتے ہیں۔ آج کل حافظ صاحب مرکز ابن القاسم میں شیخ الحدیث کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ صحیح بخاری کی تدریس ان کے ذمے ہے۔

وہ ایک مسجد میں خطبہ جمعہ بھی ارشاد فرماتے ہیں۔ ملتان کے گردونواح میں تبلیغی دورے بھی کرتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر کہنا چاہیے کہ وہ ہمیشہ ڈیوٹی پر رہتے ہیں۔ کسی دن فارغ نہیں ہوتے۔ مرکز ابن القاسم کی تدریس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ایم۔ اے اسلامیات بھی کرلیا اور بی ایڈ کا امتحان بھی دے دیا۔ وہ باہمت طالب علم اور باہمت استاذ ہیں۔

اب آیئے ان کے سلسلۂ تصنیف و تالیف کی طرف!

۱۔ حضرت مولانا عبدالتواب صاحب مرحوم و مغفور ملتان کی بہت بڑی علمی شخصیت تھے۔ وہ ممتاز مصنف، جلیل القدر مدرس اور متعدد علمی اور تحقیقی کتابوں کے ناشر و مترجم تھے۔ وہ حضرت میاں سید نذیر حسین

دہلوی رحمہ اللہ کے شاگرد تھے۔ ان کے حالات ملنا بہت مشکل تھے۔ حافظ ریاض احمد عاقب نے ان کے احوالِ زندگی تلاش کیے اور ''مولانا عبدالتواب محدث ملتانی'' کے نام سے تین سو صفحات کی کتاب تصنیف کر دی۔ یہ ان کا قابل قدر کارنامہ ہے۔ اس کتاب میں مولانا مرحوم کی خدمات تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔

۲- فتنوں سے بچاؤ کی تدبیر: نبی ﷺ نے آخری زمانے میں پیدا ہونے والے جن فتنوں سے امت کو آگاہ کیا ہے، مصنف نے اس کتاب میں ان فتنوں کی نشان دہی کر کے ان سے محفوظ رہنے کی تدابیر بیان کی ہیں۔

۳- رمضان المبارک، فضائل و مسائل کے آئینے میں: اس کتاب میں حافظ صاحب نے قرآن و حدیث کی روشنی میں رمضان المبارک کے کے فضائل و مسائل کی وضاحت کی ہے۔

۴- عشرۂ ذوالحجہ و قربانی احکام و مسائل کے آئینے میں: اس کتاب میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے عشرۂ ذوالحجہ اور قربانی سے متعلق مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

۵- عدالت صحابہ قرآن کی روشنی میں: اس کتاب میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے متعلق اہل سنت کے عقیدے اور زاویۂ فکر کی قرآنی دلائل سے صراحت کی گئی ہے۔

۶- ماہِ رمضان کے تقاضے: اس کتاب کے مشمولات کا اس کے نام سے پتا چل جاتا ہے۔

۷- دلائلِ توحیدِ باری تعالیٰ: کتاب کا مطلب اس کے نام سے ظاہر ہے۔

۸- القول المدلل: مسئلہ تثویب کے معنیٰ و مفہوم پر مشتمل ہے۔

۹- اکمال الحاجہ شرح خطبۃ الحاجہ: اس رسالے میں خطبۂ مسنونہ کی اردو میں مختصر شرح بیان کی گئی ہے۔

۱۰- داعیِ حق مولانا سلطان محمود ملتانی اور ان کا علمی خانوادہ: اس کتاب میں مولانا سلطان محمود ملتانی اور ان کے اخلاف مولانا عبدالحق ملتانی، مولانا عبدالعزیز ملتانی، مولانا شمس الحق اور مولانا شرف الحق کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

۱۱- اربعین اعتقادی: پہلے اسے ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے متعدد شماروں میں شائع کیا گیا تھا۔

۱۲- عقیدۂ ختم نبوت: یہ رسالہ مطبوع ہے۔

حافظ ریاض احمد عاقب اثری کی عربی تالیفات یہ ہیں:

۱- تسہیل الاصول فی معرفۃ حدیث الرسول: عربی زبان کی یہ کتاب اصول حدیث کے قواعد و ضوابط پر مشتمل ہے اور سوال و جواب کی صورت میں ہے۔ اس کی کمپوزنگ ہو چکی ہے، فاروقی کتاب خانہ ملتان

دہلوی رحمہ اللہ کے شاگرد تھے۔ ان کے حالات ملنا بہت مشکل تھے۔ حافظ ریاض احمد عاقب نے ان کے احوالِ زندگی تلاش کیے اور ''مولانا عبدالتواب محدث ملتانی'' کے نام سے تین سو صفحات کی کتاب تصنیف کر دی۔ یہ ان کا قابل قدر کارنامہ ہے۔ اس کتاب میں مولانا مرحوم کی خدمات تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔

۲- فتنوں سے بچاؤ کی تدبیر: نبی ﷺ نے آخری زمانے میں پیدا ہونے والے جن فتنوں سے امت کو آگاہ کیا ہے، مصنف نے اس کتاب میں ان فتنوں کی نشان دہی کر کے ان سے محفوظ رہنے کی تدابیر بیان کی ہیں۔

۳- رمضان المبارک، فضائل و مسائل کے آئینے میں: اس کتاب میں حافظ صاحب نے قرآن و حدیث کی روشنی میں رمضان المبارک کے کے فضائل و مسائل کی وضاحت کی ہے۔

۴- عشرۂ ذوالحجہ و قربانی احکام و مسائل کے آئینے میں: اس کتاب میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے عشرۂ ذوالحجہ اور قربانی سے متعلق مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

۵- عدالت صحابہ قرآن کی روشنی میں: اس کتاب میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے متعلق اہل سنت کے عقیدے اور زاویۂ فکر کی قرآنی دلائل سے صراحت کی گئی ہے۔

۶- ماہِ رمضان کے تقاضے: اس کتاب کے مشمولات کا اس کے نام سے پتا چل جاتا ہے۔

۷- دلائلِ توحیدِ باری تعالیٰ: کتاب کا مطلب اس کے نام سے ظاہر ہے۔

۸- القول المدلل: مسئلہ تثویب کے معنیٰ و مفہوم پر مشتمل ہے۔

۹- اکمال الحاجہ شرح خطبۃ الحاجہ: اس رسالے میں خطبۂ مسنونہ کی اردو میں مختصر شرح بیان کی گئی ہے۔

۱۰- داعیِ حق مولانا سلطان محمود ملتانی اور ان کا علمی خانوادہ: اس کتاب میں مولانا سلطان محمود ملتانی اور ان کے اخلاف مولانا عبدالحق ملتانی، مولانا عبدالعزیز ملتانی، مولانا شمس الحق اور مولانا شرف الحق کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

۱۱- اربعین اعتقادی: پہلے اسے ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے متعدد شماروں میں شائع کیا گیا تھا۔

۱۲- عقیدۂ ختم نبوت: یہ رسالہ مطبوع ہے۔

حافظ ریاض احمد عاقب اثری کی عربی تالیفات یہ ہیں:

۱- تسہیل الاصول فی معرفۃ حدیث الرسول: عربی زبان کی یہ کتاب اصول حدیث کے قواعد و ضوابط پر مشتمل ہے اور سوال و جواب کی صورت میں ہے۔ اس کی کمپوزنگ ہو چکی ہے، فاروقی کتاب خانہ ملتان

کے پاس ہے۔

۲- انعام الباری، بحکم علیٰ معلقات البخاری: اس میں صحیح بخاری کی معلق روایات کی اقسام اور حکم پر بحث کی گئی ہے۔ نیز بتایا گیا ہے کہ معلق روایت کیا ہوتی ہے۔ یہ کتاب طبع ہو چکی ہے۔

۳- فتح الوہاب فی جمع الرواۃ الواردۃ فی الانساب

۴- ترغیب اللبیب الی تعریف ابن ہشام و کتابہ مغنی اللبیب

۵- منحۃ الاحوذی فی جمع الرواۃ الذین تکلم فیہم الامام الترمذی

۶- تحفۃ الباری شرح ثمانیات البخاری: زیر ترتیب

۷- فتح المعبود فی جمیع الرواۃ المدلسین الواردۃ فی سنن ابی داود

عربی میں ان کی بعض اور کتابیں بھی زیر ترتیب ہیں۔

بعض عربی کتابوں کے انھوں نے اردو ترجمے کیے ہیں۔

مختلف موضوعات پر ان کا قلمی سلسلہ جاری ہے۔ اہل حدیث کے تقریباً تمام اہل حدیث رسائل و جرائد میں ان کے مقالات شائع ہو رہے ہیں۔ مختصر سے تفصیل حسب ذیل ہے:

ہفت روزوں میں الاعتصام، اہل حدیث، تنظیم اہل حدیث۔

پندرہ روزوں میں صحیفہ اہل حدیث کراچی، دعوتِ اہل حدیث حیدر آباد، جریدِ ترجمان دہلی۔

ماہناموں میں تفہیم الاسلام احمد پور شرقیہ، ترجمان حدیث، فیصل آباد، تنویر الہدیٰ گوجراں والا، الحدیث حضرو، حرمین جہلم اور دیگر متعدد رسائل و جرائد میں ان کے رشحات قلم کی اشاعت جاری رہتی ہے۔

یہ سطور ۲۶- نومبر ۲۰۱۲ء کو لکھی۔ اس تاریخ تک حافظ ریاض احمد عاقب اثری کا تدریسی اور تصنیفی کام موجودہ دور کے مدرّسوں اور مصنفوں میں سے میرے خیال میں سب سے زیادہ مبنی بر تحقیق ہے۔ جہاں تک یہ فقیر جانتا ہے وہ عربی اور اردو کے مصنّف ہونے کے باوجود نہایت متواضع اور منکسر ہیں۔ علمائے کرام کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں کتاب و سنت کی خدمت کے مزید مواقع عطا فرمائے۔

(۲۶۔ نومبر ۲۰۱۲ء)

ترجمۃ القرآن
شیخ الاسلام حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ

تفسیر
استاذ الاساتذہ مولانا عبدالرشید

نظر ثانی
شیخ الحدیث مفتی محمد عبیداللہ خان عفیف

منہج سلف صالحین کے مطابق تفسیر بالحدیث کا بہترین انداز

تفسیر ابن کثیر، تفسیر طبری، تفسیر ثنائی، فتح القدیر و دیگر تفاسیر کا حسن انتخاب

- احادیث اور اقوال سلف صالحین کی روشنی میں مفصل حواشی
- عقائد باطلہ کا جامع اور مدلل رد
- علما اور عوام کے لیے یکساں مفید
- استاذ العلماء حضرت مولانا عبدالرشید حفظہ اللہ کے طویل تدریسی تجربے کا نچوڑ
- فہم قرآن کی منزلوں کو قریب تر کرنے میں مدد و معاون
- فی سبیل اللہ تقسیم کے لئے خصوصی رعایت